افکار



ندیم نمبر

افکار

محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، راولپنڈی
اور جنرل ہیڈ کوارٹرز آرمی ایجوکیشن سے منظور شدہ

جاری شدہ ــــــ ۱۹۴۵ء
ٹیلی فون ــــــ ۲۱۴۰۷۹

ندیم نمبر

افکار

مدیر
صہبا لکھنوی

قیمت ندیم نمبر
★ ★ ★
تیس روپے

رجسٹری سے ۲۸ روپے
معمولی ڈاک سے ۲۲ روپے
بیرونی ملکوں سے
۵ پونڈ ★ ۱۵ ڈالر

مکتبۂ افکار رابسن روڈ کراچی

بریڈ فورڈ آفس
۲۴- پارک ہل ڈرائیو۔ بریڈ فورڈ ۸ (یارکس۔ انگلینڈ)

تخلیقی لمحے کی دعا

خیالو! ۔ مرے ذہن پر جب اترنا
تو مٹی کی خوشبو بھی ہمراہ لانا
جو تخلیق کا جزوِ اعظم ہے
جس سے پیمبر بھی اٹھے، مصوّر بھی، شاعر بھی، محبوب بھی، فلسفی بھی
وہی، جس کے جنگل، سمندر، پہاڑ اور صحرا فقط آدمیت کی خدمت پہ مامور ہیں
جس پہ انسان نے اپنی محنت کے شہکار اگائے ہیں
جس سے تمدن نے، تہذیب و تاریخ نے
نام پائے ہیں

میں اس سے کٹ کر خلا میں گیا تو مرا وزن کھو جائے گا
اور مرا وزن مٹی سے ہے
اور میں مٹی سے ہوں
اور مٹی میں مجھ کو بدلنا بھی ہے ۔
اے خیالو! ۔۔۔ اسی مہرباں کی وہ خوشبو بھی ہمراہ لانا
جو انسان کو انساں بناتی ہے
عزت سے جینا تو غیرت سے مرنا سکھاتی ہے
اور آخر کار، ماں بن کے، اپنے تھکے ماندے بچوں کو آغوش میں لے کے،
گردش کا جھولا جھلاتی ہے

۲۳- نومبر ۷۴ء

ندیم

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود

کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبالؒ)

ترتیب

سرورق :۔۔۔۔ عزیز کارٹونسٹ

پیغامات، تاثرات

آئینہ خانے میں

اذنِ کلام

(غیر مطبوعہ و یادگار تخلیقات)

سازِ ارتقا

تخلیقِ فن

اُفقِ فن

چہرۂ گیتی

ہم سفر

نذرِ ندیم

معیارِ وفا

راہِ انتظار

سال ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۰

شمارہ ۔۔۔۔۔۔۔ ۵۸، ۵۹

جنوری ۔ فروری ۱۹۷۵ء

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی • طابع: ایجوکیشنل پریس۔ کراچی • دفتر: مکتبۂ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی

کتابت: انوری بیگم دہلوی

اشاریہ

سب سے پہلے چند حقائق:۔

- جوش نمبر کا پہلا ایڈیشن ۔ نومبر ۱۹۶۱ء میں شایع ہوا اور یہ نمبر ۷۴۲ صفحات پر مشتمل تھا
- جوش نمبر کا دوسرا ایڈیشن (بہ اضافہ) اگست ۱۹۶۳ء 〃 〃 ۷۶۲ 〃 〃
- حفیظ نمبر ــــــــ اگست ۱۹۶۳ء 〃 〃 ۶۲۰ 〃 〃
- فیض نمبر ــــــــ اپریل ۱۹۶۵ء 〃 〃 ۷۷۶ 〃 〃
- ندیم نمبر ــــــــ جنوری ۱۹۷۵ء میں پیش خدمت ہے اور یہ نمبر ۹۶۸ صفحات پر مشتمل ہے

اس میں کیا ہے اور کیا نہیں۔ یہ میرا مسئلہ نہیں۔ آپ کا، تبصرہ نگاروں کا اور یارانِ نقد کا مسئلہ ہے!
مجھے یہ بات کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ "ندیم نمبر" شایع کرکے میں نے ندیم صاحب پر یا اردو ادب پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ میرا اور میرے ہر معاصر کا فرض ہے کہ وہ اپنے اکابر کی خدمات کا اُن کی زندگی میں ہی اعتراف کرکے زندہ دوستی کا علم سربلند رکھے۔ یہ نہ ہو کہ منٹو مرحوم کی طرح اپنے نمبر کے لئے اُسے مرنا پڑے۔
ندیم صاحب کو حیرت ہے کہ میں نے اس نمبر کا کیوں اعلان کیا؟ سچ ہے۔ اس نوع کی حیرتوں سے میں اپنے تینوں ممدوحین ۔ یعنی جوش صاحب، حفیظ صاحب اور فیض صاحب کو بھی دوچار کر چکا ہوں۔ لہٰذا آج جو کچھ میں عرض کروں گا اُس میں اظہار صداقت (اسے آپ محض ایک اصطلاح نہ سمجھیں) بھی ہوگا، حکایت جاں بھی اور تیس سال کے تلخ و شیریں تجرباتِ ادارت اور جاں کاہی کی روداد بھی۔ افکار اپنی عمر کے تیس سال پورے کر رہا ہے اور میری عمر پچاس سے تجاوز کر چکی ہے۔ اس لیے "ندیم نمبر" کو آپ میری عمر کا آخری دستاویزی سرمایہ سمجھ لیں تو بہتر ہے کہ اب تن و جاں، طاقت و توانائی، حوصلہ و عزم، جذبہ و شوق، اور جنونِ ادب، سبھی کچھ سرد پڑتے جا رہے ہیں۔ پھر میرے سامنے میاں بشیر احمد کے "ہمایوں" کا مآل بھی ہے اور مولانا صلاح الدین احمد کے "ادبی دنیا" کا بھی۔ میں نے شاہد احمد دہلوی کے "ساقی" کی تباہی بھی دیکھی ہے، اور "ادب لطیف" کے طویل ترین دور کے مدیر، میرزا ادیب کی خستہ حالی بھی۔ سو میں بھی کبھی اور کسی دور میں کسی غلط فہمی، یا خوش فہمی کا شکار نہیں ہوا۔ مجھے اپنے اور "افکار" کے مستقبل کا علم ہے۔ میرے بعد "افکار" زندہ نہیں رہ سکے گا۔ یہ طے ہے۔ اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں۔ ہر مدیر کے ساتھ اُس کے رسالہ کی موت نوشتہ

نقد بر ہے اور بس۔ ایسا کیوں ہے؟ میرے خیال میں اس کا جواب ڈھونڈنے کے لیے تاریخ ادب کے صفحات کا مطالعہ کافی ہوگا۔

"ندیم نمبر" اور ندیم صاحب کے بارے میں میرا کچھ کہنا اگر ضروری رسم ہے تو مختصراً عرض ہے کہ ندیم صاحب سے میرے قلمی روابط کا آغاز شاید ۱۹۴۰ء میں ہوا تھا جب میں محض ایک نوعمر شاعر تھا اور بس۔ اُن سے زیادہ قریب رہنے کا مجھے بہت کم موقع ملا۔ پھر بھی میں سدا سے اُن کا گرویدہ ہوں۔ بعض باتوں میں مجھے اُن سے نظریاتی اختلافات بھی رہے۔ لیکن یہ تو میرا حق تھا۔ اس کے باوجود میں اُن کے ادبی کارناموں کا ہمیشہ سے معترف ہوں۔ سچ پوچھیے تو ندیم صاحب کی زندگی، شخصیت اور اُن کا فن گوناگوں وسعتوں کا حامل ہے۔ اتنی پہلو دار شخصیت کے فنی کمالات کو ایک مختصر سے نمبر میں سمیٹ لینا میرے لیے کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اگر مجھے وسائل اور سہولتیں نصیب ہوتیں تو میں ندیم صاحب کی شاعری، فن افسانہ نگاری، تنقید نگاری اور صحافت کے ہر پہلو پر علیحدہ علیحدہ ضخیم دستاویزی اشاعتیں مرتب کر دیتا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بعد کی نسل اس کام کو ضرور پایۂ تکمیل تک پہنچائے گی کہ ندیم صاحب تاریخ ادب کا ایک درخشاں باب ہیں، جن سے کسی دور کا مورخ بھی صرفِ نظر نہیں کر سکے گا۔

اور آخر میں رسمی شکریے۔ اس خاص اشاعت کے سلسلے میں یوں تو وہ تمام اربابِ قلم آپ کے اور میرے شکریے کے مستحق ہیں، جو "ندیم نمبر" میں شامل ہیں اور وہ بھی جو "مصروفیات" اور "ناگزیر وجوہ" کی بنا پر اس یادگار اشاعت میں شریک ہونے سے قاصر رہے۔ بے شمار افکار دوستوں اور ندیم شناسوں کا تذکرہ بھی مجھے کرنا تھا۔ لیکن اس ضخیم اشاعت میں صرف یہی دو صفحے مجھے مل سکے ہیں۔ اس لیے سب رفیقوں کے نام نہیں گنوا سکتا بس چند نام جو قدم قدم پر مجھے حوصلہ دیتے رہے اور جنھوں نے انتہائی پریشان کن اور صبر آزما حالات میں۔ میدان چھوڑ کر فرار ہونے سے مجھے بچا لیا۔ قتیل شفائی، فتح محمد ملک، موجد، سحر انصاری، محمد علی صدیقی، محسن بھوپالی، خاطر غزنوی، منصور عاقل ابو مختار، شعیب عباسی، پاشا رحمٰن، احمد علی، خالد حسن، احمد طاہر اور مظفر حسن، غیاث الدین عزیز کارٹونسٹ اور ملک کی بلند پایہ خوش نویس خاتون انوری بیگم کا میں دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جن کے مثالی اور پُرخلوص تعاون سے ہی یہ خاص اشاعت تکمیل تک پہنچ سکی۔

آخر میں ندیم صاحب کا بھی سپاس گزار ہوں، جنھوں نے بے پناہ مصروفیات کے باوجود دیر سویر میری فرمائشوں کی تکمیل فرمائی، اور ہر ممکن تعاون کیا۔

صہبا لکھنوی

۱۳ر جنوری ۷۵ء

پیش کلام

"فنون"
- زمان پارک، لاہور

۱۰ - ستمبر ۱۹۷۴ء

برادرم صہبا صاحب، سلام محبت

آپ کو اصرار ہے کہ میں "افکار" کے "ندیم نمبر" کے لئے "خودنوشت" کی قسم کی کوئی چیز لکھوں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ ایک شاعر اور ادیب تو اپنے حالات و افکار کو عمر بھر اپنے شعر و ادب میں منتقل کرتا رہتا ہے، چنانچہ میری "خودنوشت" میری نظموں، غزلوں، قطعوں، افسانوں اور مضمونوں میں موجود ہے۔ ان میں وہ سب کچھ ہے جو ایک "خودنوشت" میں ہونا چاہئے۔ وہ حالات اور وہ ماحول جن سے میری شخصیت صورت پذیر ہوئی (یہاں میں نے شخصیت کا لفظ اس کے سطحی معنوں میں استعمال کیا ہے)، وہ تضادات جن میں مجھے پسنا پڑا، وہ ثقافتی دباؤ جن میں میرے بچپن کی تربیت و تہذیب ہوئی ــــ اپنی ماں اور اپنے سرپرست چچا کے اثرات ــــ، وہ نظریات و معتقدات

جن کی توانائی نے مجھے زندگی اور اس کی آلودگیوں سے محبت کرنا سکھایا،
وہ رشتے اور رابطے، وہ رنجشیں اور یگانگتیں، وہ کامرانیاں
اور محرومیاں، وہ اندھا دھند پیار اور بے سبب نفرتیں جن
سے زندگی کی رنگا رنگی عبارت ہے — ان سب کی محض جھلکیاں
ہی نہیں، جزئیات کی حد تک مکمل تفصیلیں میرے شعروں اور
افسانوں میں جمع ہیں۔ اس صورت میں محض رسم پوری کرنے کے لیے
اگر میں یہ بتانے بیٹھ جاؤں کہ میں فلاں سال، فلاں مقام پر،
فلاں والدین کے ہاں پیدا ہوا، اور آٹھ برس کی عمر ہی میں یتیم
ہو گیا، مگر اپنے ایک چچا کی صورت میں ایک فرشتۂ رحمت کی
امداد سے تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہو سکا، اور عہدِ جوانی ہی
سے ملازمتوں کا آغاز کیا اور تحریکوں میں حصہ لیا اور نظر بندیاں
بھگتیں، اور اپنے اصولوں کو مصلحتوں کی زد سے بچانے کے لیے فلاں
فلاں آزمائشوں میں سے گزرا، اور حق بات کہنے کی پاداش
میں اپنے ملک کی حکومت سے لے کر اپنے قریبی، ہم نظریہ احباب
کے نزدیک بھی معتوب ٹھہرا، تو یہ ایسی باتوں کی تکرار ہو گی جن
کے بارے میں اہلِ ادب کو وافر معلومات حاصل ہیں۔ میں
اپنے ابتدائی حالاتِ زندگی، اپنے پہلے مجموعۂ کلام "جلال و جمال"
کے "خود نوشت دیباچے" میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں اور
اب عمر کے اس مرحلے میں ہوں جب دو برس بعد (۲۰ نومبر،

۱۹۷۶ء میں ساٹھ برس کا ہو جاؤں گا۔ اس صورت میں مجھے سوانحی نوٹ لکھنے کی بجائے مکمل سوانح عمری لکھنی چاہیے اور وہ میں، بشرط زندگی، لکھوں گا۔ ان دنوں سے ابتدا کروں گا جب مڑے ہوئے نقوش کا ایک خوب صورت منہ لڑکا اپنے گاؤں کی پہاڑیوں اور وادیوں میں جھاڑیوں کی خشک ٹہنیاں اور مویشیوں کا خشک گوبر چنتا تھا کہ اس کی بیوہ ماں گھر کا چولھا گرم کر سکے، اور اس دور تک پہنچوں گا جب "افکار" کے سے معیاری ادبی رسالے نے اس کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک ضخیم نمبر نکالا۔ اس کے باوجود اگر آپ میری زندگی کے بارے میں کچھ سننا چاہتے ہیں تو یہ شعر سن لیجیے:

درد سینے میں چمکتے ہیں کہ تیری آنکھیں
زندگی! میں ترے احساں نہیں گنوا سکتا

اس وقت مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جب آپ نے 'افکار' کا "ندیم نمبر" نکالنے کا فیصلہ کیا تو آپ کے خلوص نیت کا علم ہونے کے باوجود مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وجہ اس حیرت کی یہ تھی کہ میرا فن ادب کے فیشن ایبل حلقوں میں بہت کم بار پا سکا ہے۔ اس کا بھی ایک سبب ہے، اور وہ یہ ہے کہ میں کم آمیز بھی ہوں، کم گو بھی ہوں اور "سیلف پبلسٹی" (Self Publicity) کو شاعر و ادیب کے منصب

کے منافی سمجھتا ہوں ۔ اگر مجھے پہچانا جانے لگا ہے تو میں خوش
ہوں کہ مجھے میرے فن ہی کے حوالے سے پہچانا گیا ہے اور اس
میں رسوخ و رسائی کا کوئی دخل نہیں ہے ۔ جب میں یہ کہتا ہوں
تو میں ضروری عاجزی سے کام نہیں لے رہا ہوں کہ میں نے اب تک
جو کچھ لکھا ہے، اس سے مطمئن ضرور ہوں مگر وہ کارنامے کی
ذیل میں نہیں آتا ۔ اس کے باوجود اگر آپ نے میرے
فن اور میری ذات کو اس قابل سمجھا ہے تو میری سمجھ میں نہیں
آتا کہ اس کو آپ کی کرم فرمائی قرار دوں یا اسے آپ کی
خوش ذوقی سمجھوں ۔

زندہ فن کاروں کی تحسین انہیں یقیناً بہت بڑی روحانی
قوت بخش سکتی ہے ۔ یہ قوت مجھے بھی حاصل ہوئی ہے مگر
میرا عالم یہ ہے کہ جب تک زندہ رہوں گا، اپنے فنی معیار ہی
کو اس درجے سے بھی نکھارتا رہوں گا کہ برادرم صہبا آپ کو "ندیم نمبر"
کی اشاعت کے سلسلے میں مستقبل کے مورخینِ ادب سے
شرمندہ نہ ہونا پڑے ۔

آپ کا مخلص

صہبا لکھنوی

احمد ندیم قاسمی

(زندگی، شخصیت اور فن کا مستند جائزہ)

خاندانی نام	احمد شاہ
ادبی نام	احمد ندیم قاسمی
تخلص	ندیم
تاریخ و سن پیدائش	۲۰ر نومبر سنہ ۱۹۱۶ء

مقام: انگہ۔ تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا (پنجاب)

اب وجد

والد کا نام: پیر غلام نبی عرف نبی چن ۔ وفات سنہ ۱۹۲۴ء

قبیلہ : اعوان

بزرگوں سے سنا ہے کہ اب وجد عرب سے ایران اور ایران سے یہاں آئے اور ملتان میں قیام کیا۔ جب تحصیل خوشاب کے کوہستانِ نمک اور اس کی مشہور وادی سون سکیسر پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا تو وادیٔ سون میں تبلیغ اسلام کے لیے ان بزرگوں کو ملتان سے بلوایا گیا یہاں انھوں نے ایک گاؤں اسلام آباد کے نام سے آباد کیا جس کے کھنڈروں کے بعض نشان اب تک موجود ہیں۔ نادر شاہ کی یلغار کے دنوں میں اسلام آباد کو خطرہ لاحق ہوا تو لوگ آس پاس کی پہاڑی گپھاؤں اور جنگلوں میں جا چھپے اور جب خطرہ ٹلا تو ایک پہاڑی کی ڈھلوان پر گاؤں انگہ آباد کیا۔ یہ بزرگ تبلیغ اسلام میں بھی مصروف رہے اور کاشتکاری کو بھی اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔

والدہ اور بہن بھائی

عمر میں سب سے بڑی ایک بہن تھیں (انتقال سنہ ۱۹۶۰ء) جن کے اکلوتے صاحبزادے، ظہیر بابر، اس وقت پاکستان کے معروف صحافی ہیں۔

بڑے بھائی کا نام پیرزادہ محمد بخش ہے۔ آپ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں اور اپنے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں لائل پور میں مقیم ہیں۔
آپ کی والدہ کا انتقال سنہ ۱۹۵۶ء میں ہوا۔

ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم

انگہ کی مسجد میں قرآن مجید کا درس : سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء
پرائمری کی جماعتیں انگہ کے پرائمری اسکول سے پاس کیں — سنہ ۱۹۲۱-۲۵ء
گورنمنٹ مڈل اینڈ نارمل سکول کیمبل پور : سنہ ۱۹۲۵-۲۹ء
گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج ۔ کیمبل پور (اس زمانے میں ہائی کلاسز بھی کالج سے منسلک ہوتی تھیں) سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء
گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ : سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء
میٹریکولیشن : سنہ ۱۹۳۱ء
صادق ایجرٹن کالج بہاولپور : سنہ ۱۹۳۱-۳۵ء
بی۔اے پنجاب یونیورسٹی : سنہ ۱۹۳۵ء

شادی

سنہ ۱۹۴۸ء میں خاندان کے قریبی عزیزوں میں ہوئی، جو وادیٔ سون ہی کے ایک گاؤں سوڑکی میں مقیم ہیں۔

اولاد

۱۔ ناہید ندیم ۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے کا امتحان دیا ہے۔ شعر بھی کہتی ہیں۔ حال ہی میں آپ کی شادی ہوئی ہے۔
۲۔ نشاط ندیم ۔ سنہ ۱۹۷۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کیا ہے۔ حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔
۳۔ نعمان ندیم ۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں سیکنڈ ایر کے طالب علم ہیں۔

ملازمت

۱۔ ریفارمز کمشنر لاہور کے دفتر میں محرر (تنخواہ بیس روپے ماہانہ) سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء
۲۔ ہفتہ وار "تہذیب نسواں" کے لیے غیر ملکی افسانوں کے تراجم۔
۳۔ ٹیلی فون آپریٹر اوکاڑہ (صرف نو دن کام کیا)
۴۔ ایکسائز سب انسپکٹر سنہ ۱۹۳۹-۴۱ء

ادارت

۱۔ ہفت روزہ "پھول" لاہور سنہ ۱۹۴۰-۴۵ء
۲۔ ہفت روزہ "تہذیب نسواں" لاہور سنہ ۱۹۴۱-۴۵ء
۳۔ ماہنامہ "ادب لطیف" لاہور سنہ ۱۹۴۳-۴۵ء
۴۔ ماہنامہ "سویرا" لاہور : سنہ ۱۹۴۷-۴۸ء
(ابتدائی چار شمارے)
۵۔ ماہنامہ "نقوش" لاہور : سنہ ۱۹۴۸-۴۹ء
(ابتدائی دس شمارے)
۶۔ ماہنامہ "سحر" ۔ لاہور : سنہ ۱۹۵۰ء
(صرف ایک شمارہ)
۷۔ روزنامہ "امروز" لاہور : سنہ ۱۹۵۳-۵۹ء
۸۔ ماہنامہ "فنون" لاہور سنہ ۱۹۶۳ء سے تاحال

پہلا شعر

پہلا شعر سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء کے دوران کہا
افسوس کہ یہ شعر دستیاب نہیں۔

تلمذ

باقاعدہ کسی سے اصلاح نہیں لی۔ البتہ اختر شیرانی اور

مولانا عبدالمجید سالک کے مشفقانہ مشوروں سے بہت کچھ حاصل کیا۔

معنوی اُستاد

ان اساتذہ میں اوّلیت آپ کی والدہ کو حاصل ہے جنھوں نے آپ کو جرأت اور غیرت مندی کے ساتھ زندہ رہنا سکھایا۔ والدہ کے بعد آپ کے سرپرست چچا، پیر حیدر شاہ مرحوم ہیں، جنھوں نے قرآن مجید کی تفسیر پڑھائی اور آپ کے علم و ادب کے ذوق کو نکھارا۔

بعد میں اختر شیرانی کی قربت و محبت اور مولانا عبدالمجید سالک کی رہنمائی اور شفقت سے آپ فیضیاب ہوئے۔

علم و مطالعہ

اردو اور عربی کے طالب علم ہونے کی وجہ سے ابتداً آپ نے عربی کے اکابر شعرا و ادبا کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ فارسی کا مطالعہ بعد میں شروع ہوا اور مرزا غالب تک کے تمام شعرا کو آپ نے نہایت لگن اور ذوق و شوق سے پڑھا۔ علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے علمی کارناموں کے علاوہ اردو میں غالب اور اقبال اور فارسی میں غالب اور عرفی نے بطور خاص متاثر کیا۔ انگریزی کے توسط سے یا بعض اردو تراجم کے ذریعے ہومر اور افلاطون سے لے کر ایلیٹ اور پاؤنڈ تک کو پڑھ ڈالا، نیز روس، فرانس، جرمنی اور انگلستان کی فکشن کا سلسلہ وار مطالعہ کیا۔ شاعری میں گوئٹے اور شیکسپیئر اور فکشن میں ٹالسٹائے اور فلابیر نے موہ لیا۔ فلسفہ کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا ہے۔ پھر بھی اس سے بے پناہ شغف ہے۔ برٹرینڈ رسل تضادات کے باوجود آپ کو بہت پسند ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ تضادات سے کوئی فلسفی نہیں بچا ہے۔ فلسفۂ تاریخ میں آپ ابنِ خلدون اور ٹوائن بی کا اب تک نہایت شوق سے مطالعہ کرتے ہیں۔ علم نفسیات کے زعماء میں آپ کسی سے مطمئن نہیں۔ البتہ فرائڈ اور ژنگ کو ضرور پڑھا ہے اور اُن کے کمالات کے قائل ہیں۔

سیاسیات کو جزوِ زندگی سمجھتے ہیں مگر عملی سیاست کے جو معیار ہمارے ہاں ہر سطح پر رائج ہیں اُن سے دامن کشاں ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ وہ شعوری طور پر جھوٹ نہیں بول سکتے، اس لیے سیاست بھی نہیں کر سکتے۔ وہ امریکہ کے جیفرسن کے اعلان آزادی کو "سیاسی ادب پارہ" تصور کرتے ہیں اور اسے اقوام متحدہ کے منشور سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ جدید دور کے سیاست دانوں میں انھیں قائداعظم کی استقامت اور ماؤزے تنگ کا علمی اور عملی تبحر بہت عزیز ہے۔

مذہبیات میں وہ صرف قرآن پاک سے متاثر ہیں یا پھر مجدد الف ثانی، ابوالکلام آزاد، شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کی مذہبیات سے متعلق تحریروں سے۔

سائنس کی ایک ہی شخصیت اُن کا آئیڈیل ہے۔ اور وہ ہے آئن اسٹائن۔ شاید اس لیے کہ وہ سائنس اور

پہلی مطبوعہ نظم

سنہ ۱۹۳۱ء میں مولانا محمد علی کے سانحۂ ارتحال پر پہلی نظم کہی جو روزنامہ "سیاست" لاہور میں "مولانا محمد علی جوہر" کے عنوان سے شایع ہوئی۔

پہلا شعری مجموعہ

"دھڑکنیں" (قطعات) مطبوعہ سنہ ۱۹۴۱ء جو کئی اضافوں کے ساتھ "رم جھم" کے نام سے سنہ ۱۹۴۴ء میں شایع ہوا۔

فلسفے کے مشاغل کے ساتھ ساتھ وائلن بھی بجالیتا تھا۔

سیاحت

۱۹۵۶ء میں صرف ایک بار پاکستانی اخبارات کے مدیروں کے وفد میں شامل ہو کر چین گئے اور وہاں ایک ماہ قیام کیا۔ دوران قیام جنوب میں کینٹن، شمال میں منچوریا اور مغرب میں سنکیانگ تک سیر کی۔ سفر کے دوران میں ہانگ کانگ اور بنکاک میں بھی مختصر قیام کیا۔

قید و بند

مئی ۱۹۵۱ء سے نومبر ۱۹۵۱ء تک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند رہے دوسری بار بھی اسی ایکٹ کے تحت اکتوبر ۱۹۵۸ء سے فروری ۱۹۵۹ء تک نظر بند رہنا پڑا۔ اسیری کے دوران آپ نے جن جیلوں کی سیر کی وہ یہ ہیں:- لاہور سنٹرل جیل، لاہور ڈسٹرکٹ جیل، کیمبل پور ڈسٹرکٹ جیل، راولپنڈی سنٹرل جیل اور شاہی قلعہ لاہور

صحافت

مزاحیہ کالم نگاری کی مشق مولانا عبدالمجید سالک کے معروف کالم "افکار و حوادث" سے شروع کی پھر ۱۹۵۲ء میں جب مولانا چراغ حسن حسرت — (سندباد جہازی) روزنامہ "امروز" سے علیحدہ ہوگئے تو آپ نے اُن کا کالم "حرف و حکایت" لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۵۳ء میں جب آپ "امروز" کے مدیر ہوگئے تو "حرف و حکایت" کے کالم کے لیے فرضی نام "پنج دریا" منتخب کیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۹ء تک جاری رہا۔ ۱۹۵۹ء میں آپ اس روزنامے کی ادارت سے الگ ہوگئے اور اسی سال روزنامہ "ہلال پاکستان" لاہور میں "موج در موج" کے عنوان اور "پنج دریا" کے نام سے فکاہی کالم لکھنے لگے۔ جب "ہلال پاکستان" پر ایوب حکومت کا عتاب نازل ہوا تو آپ — "روزنامہ احسان" لاہور سے وابستہ ہوگئے اور "مطائبات" کے عنوان اور "پنج دریا" کے نام سے کالم نگاری کا سلسلہ جاری رکھا۔ کچھ عرصے بعد جب روزنامہ "امروز" کی ملکیت سرکاری سے نیم سرکاری ہوگئی تو آپ ایک بار پھر اسی میں "حرف و حکایت" لکھنے لگے، لیکن اس بار آپ نے اپنا نام "پنج دریا" کے بجائے "عنقا" رکھ لیا۔

اسی دوران آپ نے روزنامہ "جنگ" کراچی میں "لاہور لاہور ہے" کے عنوان سے ہفتہ وار کالم شروع کیا۔ اس کی نوعیت تہذیبی اور سیاسی سرگرمیوں کے

ندیم کی آرزوئیں

- بقیہ زندگی گاؤں میں جاکر بسر کریں۔
- وہاں ایک طویل آزاد نظم اور ایک جدید انداز کی مثنوی لکھیں۔
- دو چار نہیں تو ایک ناول ضرور لکھیں جس کا خاکہ رُبع صدی سے ذہن میں محفوظ ہے۔
- خود نوشت — پوری نہیں تو کم سے کم ۱۹۴۷ء تک کے دور کی بہر صورت مکمل کر لیں۔ یہ اس کی پہلی جلد ہوگی دوسری جلد میں ۱۹۴۷ء سے اب تک کے حالات لکھنا چاہتے ہیں۔

—— ہماری دعا ہے کہ ——

ندیم صاحب کی یہ آرزوئیں ضرور پوری ہوں۔

جائزے کی تھی - یہ کالم ۱۹۶۲ء میں شروع ہوا تھا اور کئی سال تک جاری رہا۔ ۱۹۷۰ء میں جب "امروز" کے مدیر ظہیر بابر اس روزنامے کی ادارت سے نواب زادہ شیر علی خاں کی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کے طور پر مستعفی ہو گئے تو نتیجتہً آپ بھی "امروز" سے الگ ہو گئے۔ اسی کے ساتھ "جنگ" کی کالم نگاری کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور آپ روزنامہ "حریت" کراچی سے منسلک ہو گئے اور "موج در موج" کے عنوان سے روزانہ فکاہی کالم اور "لاہوریات" کے عنوان سے ہفتہ وار کالم لکھنے لگے - بعد میں یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ عوامی حکومت کے قیام پر ظہیر بابر نے ایک بار پھر روزنامہ "امروز" کی ادارت سنبھالی تو آپ بھی اپریل ۱۹۷۲ء میں دوبارہ "امروز" میں "حرف و حکایت" اور "جنگ" میں "لاہور لاہور ہے" لکھنے لگے جس کا سلسلہ تا دمِ تحریر جاری ہے۔

بحیثیت نقاد

۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۲ء تک آپ نے "تہذیب و فن" کے عنوان سے روزنامہ "امروز" لاہور میں علمی، ادبی، تہذیبی اور فنی موضوعات پر ہر ہفتے مضامین لکھے جن کی تعداد تقریباً چار سو ہو گی۔

ان اہم اور رنگا رنگ موضوعات پر مضامین کے علاوہ آپ کے دیگر تنقیدی مضامین مثلاً "حقیقت اور فنی حقیقت"، "پنجاب کے لوک گیت" "میرے بھی صنم خانے" کا جائزہ، "ہمارے نئے ناول نگار" "حافظ محمود شیرانی - ایک بے مثال محقق"، "اردو افسانے کا تدریجی ارتقا"، "فیض —— دستِ صبا کے آئینے میں" "جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء اور اردو شعر و ادب" "کچھ جدید اردو غزل کے بارے میں" "جدید ادب میں "ذات کی گمشدگی"" "ترقی پسند ادب کے دفاع میں" متعدد مضامین بطور خاص قابلِ ذکر ہیں - دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ کی شاعری و افسانے کے تو متعدد مجموعے شایع ہو گئے۔ لیکن تنقیدی مضامین کا صرف ایک مجموعہ اب تک شایع ہو سکا ہے - حالانکہ بحیثیت نقاد آپ نے پیشہ ور نقادوں کے مقابلے میں بہت زیادہ لکھا ہے۔ متعدد موضوعات پر لکھا ہے اور بلند معیار کا لکھا ہے۔

بحیثیت دیباچہ نگار

اتنے بہت سے دیباچے لکھے ہیں کہ نام اور تعداد تک یاد نہیں - جہاں دیباچہ نہیں لکھ سکے وہاں "فیلپ" لکھ دیے۔ اس کے پیچھے صرف ایک ہی جذبہ کار فرما رہا کہ مصنف کی حوصلہ افزائی ہو اور اعلیٰ ادب کی تخلیق کا تسلسل برقرار رہے - چند قابلِ ذکر کتابیں جن کے دیباچے آپ نے لکھے ہیں یہ ہیں :-

پہلا افسانوی مجموعہ

بھوپال : مطبوعہ ۱۹۴۰ء

ندیم پر تحقیقی کام

۱ - ندیم کی شاعری اور شخصیت
مصنف : جمیل ملک
۲ - تاشقند یونیورسٹی میں ایک تاجک نے ندیم کے فن پر تھیسس

غیر مطبوعہ ترجمہ

آپ نے عالمی ادب کے کئی نمایندہ منظوم شاہپاروں کو اردو میں منتقل کیا - گوئٹے کا معروف ناول "سارو آف ورتھر" کا آپ نے بڑی محنت سے ترجمہ کیا ہے جو ابھی تک شایع نہیں ہو سکا۔

- تلخیاں ـــ ساحر لدھیانوی
- موج خوں ـــ احمد ریاض
- ترنجن ـــ احمد راہی (پنجابی)
- ہاڑے ـــ فیروز سائیں (〃)
- نواز کے افسانے ـــ نواز (〃)

ریڈیو کی خدمات

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء تک پشاور ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ رہے اور بحیثیت اسکرپٹ رائٹر خدمات انجام دیں۔ اس دوران میں متعدد ریڈیائی کھیل لکھے جو کافی پسند کیے گئے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اعلان آزادی کے موقع پر پشاور ریڈیو کے پروگراموں کا آغاز آپ ہی کے نغموں اور ترانوں سے ہوا تھا۔ پھر ایک دور ایسا بھی آیا جب ریڈیو کے ارباب بست وکشاد نے آپ کی تخلیقات کو "شجر ممنوعہ" ٹھہرا دیا تھا۔ یہ پابندی کم وبیش پندرہ برس جاری رہی۔

ٹی وی میں

آپ کی تقریباً تمام مشہور و مقبول کہانیاں ڈراموں کی صورت میں ٹیلی ویژن اسکرین پر پیش کی جا چکی ہیں۔ گزشتہ دنوں آپ کے مختصر ڈراموں کا سلسلہ وار پروگرام "ایک چہرہ، کئی چہرے" کے عنوان سے ٹیلی کاسٹ ہو کر کافی مقبول ہوا۔ لاہور ٹی وی کے ادبی پروگراموں میں آپ اکثر حصہ لیتے ہیں۔

فلمی دنیا میں

- ۱۹۴۰ء میں منٹو مرحوم کی دعوت پر ایک فلم "دھرم پتنی" کے مکالمے اور گیت لکھے۔ مگر یہ فلم نہ بن سکی۔
- ۱۹۴۱ء میں منٹو مرحوم اور کرشن چندر کی کہانی "بنجارا" کے گیت لکھے۔ یہ کہانی بھی سیلولائڈ پر منتقل نہ ہوسکی۔
- ۱۹۴۸ء میں ۔ منٹو کی کہانی "آغوش" کے مکالمے لکھے۔
- سبطین فضلی کی ایک کہانی کے مکالمے لکھے لیکن فلم نہ بن سکی۔
- ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ ایک فلم "دوراستے" کے مکالمے لکھے۔

عنقا یا انقا!

"عنقا" کی دلچسپ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ نے روزنامہ "پاکستان ٹائمز" لاہور میں بعض نزاعی ادبی مسائل پر انگریزی میں چند مضامین لکھے اور اپنے نام کے ابتدائی حروف 'اے'، 'این'، 'کیو'، کے آخر میں ایک اور 'اے' کا اضافہ کر دیا چنانچہ انگریزی کا 'ANQA' جب اردو میں منتقل ہوا تو "انقا" کے بجائے "عنقا" بن گیا۔

انعام و اعزاز

۱۹۶۴ء میں آپ کے مجموعۂ کلام "دشت وفا" پر آدم جی ادبی انعام دیا گیا اور ۱۹۶۸ء میں آپ کو حکومتِ پاکستان نے ادب وفن میں حسن کارکردگی کا انعام اعزاز دیا۔ سچ پوچھیے تو یہ اعزاز ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران تحریر کردہ ان مضامین پر دیا گیا جو آپ نے نظریۂ پاکستان کی ادبی اور تہذیبی وضاحت کے سلسلے میں لکھے۔ بلاشبہ یہ اعزاز ایسا ہی ہے جیسا کہ لاہور، سیالکوٹ اور سرگودھا کو "نشان استقلال" سے نوازا گیا۔ آپ کو وطن سے اس اعزاز پر فخر ہے۔

• ۱۹۶۷ء میں حمایت علی شاعر کی فلم "لوری" کے مکالمے لکھے۔
اس وقت بھی متعدد فلمی کہانیاں اور مکالمے لکھ رہے ہیں۔ خدا انجام بخیر کرے۔

تصانیف

شعری مجموعے

(۱) دھڑکنیں (قطعات)
مطبوعہ ۱۹۴۱ء
ترمیم و اضافہ کے بعد یہی کتاب "رم جھم" کے نام سے شائع ہوئی۔
مطبوعہ ۱۹۴۴ء

(۲) جلال و جمال (نظمیں اور غزلیں)
مطبوعہ ۱۹۴۷ء

(۳) شعلۂ گل (نظمیں، غزلیں) مطبوعہ ۱۹۵۳ء

(۴) دشتِ وفا (نظمیں، غزلیں، قطعات) ،، ۱۹۶۴ء

(۵) محیط (نظمیں، غزلیں، قطعات، نیا مجموعہ زیرِ ترتیب

افسانے

(۱) چوپال مطبوعہ ۱۹۴۰ء
(۲) بگولے ،، ۱۹۴۱ء
(۳) طلوع و غروب ،، ۱۹۴۲ء
(۴) گرداب ،، ۱۹۴۳ء
(۵) سیلاب ،، ۱۹۴۴ء
ان دونوں مجموعوں کا انتخاب
(۶) "سیلاب و گرداب" کے نام سے دستیاب ہے۔
(۷) آنچل مطبوعہ ۱۹۴۵ء
(۸) آبلے (طویل مختصر افسانے) ،، ۱۹۴۶ء
(۹) آس پاس مطبوعہ ۱۹۴۸ء
(۱۰) در و دیوار ،، ۱۹۴۹ء
(۱۱) سناٹا ،، ۱۹۵۲ء
(۱۲) بازارِ حیات ۱۹۶۰ء
(۱۳) برگِ حنا ،، ۱۹۶۳ء
(۱۴) گھر سے گھر تک ،، ۱۹۶۷ء
(۱۵) کپاس کا پھول ،، ۱۹۷۳ء

چند مقبول ترین تخلیقات

• انسان عظیم ہے خدایا (نظم)
• پتھر (نظم)
• ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد (افسانہ)
• پرمیشر سنگھ (افسانہ)

تنقید

تعلیم اور ادب و فن کے رشتے
مطبوعہ ۱۹۶۴ء

مرتبہ کتب

(۱) انگڑائیاں ـ اردو کے معروف افسانہ نگاروں کے منتخب افسانے مطبوعہ ۱۹۴۴ء

(۲) نقوشِ لطیف ـ اردو کی خواتین افسانہ نگاروں کے منتخب افسانے اُن کے سوانح اور ادبی نظریات کے ساتھ۔ مطبوعہ ۱۹۴۵ء

(۳) منٹو کے خطوط ـ ندیم کے نام سعادت حسن منٹو کے خطوط کا مجموعہ۔ مطبوعہ ۱۹۶۶ء

بچّوں کی کتابیں

۱ - تین ناٹک		مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ء
۲ - دوستوں کی کہانیاں		مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ء
۳ - نئی نویلی کہانیاں		" سنہ ۱۹۴۴ء
۴ - بچوں کے لیے نظمیں - زیر ترتیب

بین الاقوامی حیثیت

- ندیم کے افسانوں کے دو مجموعے اور نظموں کا ایک مجموعہ روسی زبان میں منتقل ہو کر شایع ہو چکے ہیں۔
- افسانوں کا ایک مجموعہ چینی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔
- انگریزی، چیک اور یورپ کی کئی زبانوں کے علاوہ پشتو، پنجابی، ہندی، سندھی، بنگلہ، مراٹھی، گجراتی، فارسی وغیرہ میں بھی آپ کی متعدد کہانیاں اور نظموں کے ترجمے چھپ چکے ہیں۔
- راولپنڈی کے پروفیسر سجاد شیخ نے ندیم کے (۱۵) افسانوں کو انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ یہ مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

زیر طبع

(۱) مضامین کے دو انتخابات
(۲) ۲۲ برس کے مزاحیہ کالموں کا انتخاب
(۳) سیاسی نوعیت کے مضامین کا انتخاب "جو لاہور لاہور ہے" اور "لاہوریات" کے زیر عنوان شایع ہوتے رہے۔
(۴) محیط ــــ نظمیں، غزلیں، قطعات نیا شعری مجموعہ !

ـــــ چند دلچسپ انتسابات ـــــ

افسانوں کا مجموعہ "آبلے"
سعادت حسن منٹو کے نام
اس کے دماغ سے زیادہ اس کے دل سے متاثر ہو کر

افسانوں کا مجموعہ "گھر سے گھر تک"
چودھری محمد صادق رحیانیاں کے نام
جو میرے عزیز دوست ہیں اور مولانا مودودی کے بڑے معتقد ہیں

ندیم

اصلاح شدہ کلام

یہ اصلاح شدہ صفحات دورِ اولیں کی یادگار ہیں اس لئے ان کی اہمیت مسلّم ہے۔
اعلان تاشقند کے فوراً بعد ندیم صاحب نے یہ دونوں غزلیں کہی تھیں اور پھر انہیں قطع برید
کے بعد قابلِ اشاعت بنایا گیا تھا۔ اصلاح شدہ کلام کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں۔ (صہبا)

۳

آج کے دور میں انصاف کے معنی یہ ہیں
~~[illegible]~~ روح مر جائے مگر جسم بچایا جائے

اب تو کچھ اور ہی اعجاز دکھایا جائے
~~اب تو خورشید کو مشرق میں چھپایا جائے~~
شام کے بعد بھی سورج نہ بجھایا جائے

۱

۲

~~بجلیاں کیا~~ گل ہیں کمیاب اگر، خون تو ارزاں ہوگا
کسی عنواں تو کوئی رنگ جمایا جائے

کون شاہوں کو گداؤں سے الگ پہچانے
اب تو خلعت میں بھی پیوند لگایا جائے

؟

آج اناالحق سے بڑی کوئی حقیقت ہی نہیں
مومنو، دار پہ کس کس کو چڑھایا جائے

نئے انساں سے تعارف جو ہوا تو بولا
میں ہوں سقراط، مجھے زہر پلایا جائے

موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو
پہلے جینے کا ~~قرینہ تو~~ کا سلیقہ تو سکھایا جائے

~~کون ہے جو مرا تنہائی~~ کوئی بھی تیرے سوا مونسِ تنہائی نہیں
اک خدا ہے مگر اس کو بھی چھپایا جائے

میں محبت کا پجاری ہوں، عقیدے کا نہیں
نہ بتوں کو مرے رستے سے ہٹایا جائے

[illegible]

میں وہ ~~فن کار ہوں~~ شاعر ہوں جو شاہوں کا ثنا خواں نہ ہوا

یہ وہ ہے فن جرم جو مجھ سے کسی عنواں نہ ہوا

~~حرف اک جرم ہے بے طلعت میں کٹی عمر عزیز~~ کو گنہ پر مری اک عمر اندھیرے میں کٹی

مجھ سے اس موسم کے میلے میں چراغاں نہ ہوا

آنکھ کو اور دکھاتی ہے مگر ذہن کچھ اور

بانجھ سنورے تھے مگر احساسِ بہاراں نہ ہوا

کل جہاں پھول کھلے ، جشن ہیں زخموں کے وہاں

دل وہ گلشن ہے جو اجڑا تو بیاباں نہ ہوا

یوں تو ہر دور میں گھٹتے رہے انساں کے نرخ

ان غلاموں میں کوئی یوسفِ کنعاں نہ ہوا

ہیں خود آسودہ ہیں یہ گوشہ نشیں یا پتھر ہیں

زخم کھا کر بھی جنھیں درد کا عرفاں نہ ہوا

ساری دنیا متلاطم نظر آتی ہے ندیم

مجھ پہ اک حشر ہوا اور بپا زنداں نہ ہوا

۶-۱-۱۹۶۶ء

جوش ملیح آبادی - حفیظ جالندھری - فیض احمد فیض - ن۔م راشد

پروفیسر مجنوں گورکھپوری - ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری - پروفیسر حمید احمد خاں - عبدالرحمٰن چغتائی

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی - جسٹس ایس اے رحمان - ڈاکٹر نبی بخش بلوچ - پروفیسر مجتبیٰ حسین

پروفیسر انجم اعظمی - شان الحق حقی - ڈاکٹر محمد صادق - سید الطاف علی بریلوی

سید ضمیر جعفری - مرزا ظفر الحسن

پیغامات، تاثرات

جوش ملیح آبادی

"سچ بولنا، ہمیشہ خطرناک رہا ہے، لیکن میں ہزاروں بار مجروح ہونے کے بعد بھی سچ بولنے کی "خوئے بد" سے باز نہیں آتا۔

اور اس بنا پر یہ لکھ رہا ہوں کہ اس دور کے جس قدر بھی شاعر ہیں احمد ندیم قاسمی کو اُن سب سے بمراحل بہتر سمجھتا ہوں۔

ندیم صرف اچھے شاعر ہی نہیں، اچھے انسان بھی ہیں، اور چونکہ اچھا انسان ہر دور میں نایاب رہا ہے، اس لیے میں ندیم کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ اور مجھے اُن سے محبت بھی ہے۔"

حفیظ جالندھری

"احمد ندیم قاسمی" پر ایک "معمولی مضمون" لکھ کر یہ سمجھ لینا درست نہیں کہ سخن فہمی اور انسان شناسی کا فریضہ ادا ہو گیا ہے۔ میں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو ڈیڑھ سو صفحے لکھ دینے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تو ابھی اس شخصیت کے بارے میں اظہار رائے کی تمہید ہی ہے۔

آپ کا صحیفۂ "افکار" چار پانچ سو صفحے میری رائے کے لیے وقف کر ہی نہیں سکتا۔ اس لیے یہ چند الفاظ قبول فرمائیے۔

اگرچہ احمد ندیم قاسمی سے میرے ایسے قریبی دوستانہ تعلقات کبھی نہیں رہے، جو اُن کے اردگرد کے سلسلۂ احباب کو حاصل ہیں۔ البتہ اہلِ قلم کے جو طبقے اُن کو اپنے حلقے میں شمار کرتے ہیں اُن میں سے اکثر کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اور ان کی قلم کاری

کے حسن و قبح سے بھی بے خبر نہیں۔ ایک مدت سے احمد ندیم قاسمی صاحب کا شعور اور حسن کارانہ تخلیقاتِ نظم و نثر میرے مطالعے میں ہیں۔ مجھے تو اس حلقے میں ایک بھی ایسا نظر نہیں آیا جسے کسی جہت سے بھی احمد ندیم قاسمی کا مماثل کہہ سکوں۔
احمد ندیم قاسمی کی شاعری محض مشاعروں کی واہ واہ کے لیے نہیں۔ اُن کی انشا پردازی ادیبوں اور نقادوں سے داد طلب نہیں ہے۔ اس دورِ شعر و ادب میں میرے نزدیک احمد ندیم وہ کام کر رہے ہیں جو مخلوق کی بھلائی کے لیے، بگڑے ہوئے کردار کو درست کرنے کے لیے، گمرہی کی رفتار کو وہ راستہ دکھانے کا جو قرآن نے بتایا ہے، ہر شاعر اور ہر ادیب کا فرض ہونا چاہیے۔ احمد ندیم قاسمی جس ملک اور جس ملت میں شامل ہیں۔ اُس کی بقا بھی چاہتے ہیں، اُس کی خرابیوں کی اصلاح بھی۔ وہ اپنے گھر کی خرابیوں کو دور کرنے کے درپے ہیں۔ لیکن اس کو محض اس لیے دوسروں کے حوالے کر دینے کو تیار نہیں کہ اس گھر کی چند خرابیاں ان کو ناپسند ہیں۔ وہ اپنی جان، ایمان، اپنے فن اور اپنے شعور کے ذریعے ہم سب کی عزّ و بقا کے طالب ہیں۔ افکار چاہے تو میں احمد ندیم قاسمی پر اپنی تحریر کو مکمل کرنے کے بعد کتابی صورت میں شایع کرنے کے لیے حاضر کر دوں گا ——
اس وقت افکار کے صفحے پر یہ سطور سلام اور دعا ہی میری رائے شمار فرمایئے ——

فیض احمد فیض

محبی و مکرمی صہبا صاحب!
آپ نے ہم عصر ادیبوں سے متعلق خاص شماروں کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، وہ اپنی جگہ قابلِ ستایش بات تھی ہی۔ لیکن اب کے جو آپ ندیم قاسمی نمبر نکال رہے ہیں تو اس میں ایک خوش گوار اضافہ اور ہوا۔ یعنی ایک مدیر دوسرے مدیر کے بارے میں خاص نمبر چھاپ رہا ہے جو غالباً منفرد بات ہے۔
ندیم صاحب سے خلوص و رفاقت کا پرانا رشتہ ہے، آپ نے مہلت دی ہوتی تو تفصیل سے کچھ لکھنے کی کوشش کرتا، ادب، صحافت اور شاعری میں ان کا مقام مسلّم ہے اس لیے وہ توصیف و تعارف کے تو محتاج نہیں، البتہ ان کی شخصیت اور شاعری کے کئی پہلو ایسے ہوں گے، جو آپ کے قارئین کی نظر میں نہیں، آپ کی کاوش ان کے لیے یقیناً بصیرت افروز ثابت ہو گی اور اس ضمن میں کئی دستاویزیں ایسی ہوں گی جو ندیم نمبر کی وجہ سے محفوظ ہو جائیں گی،
مجھے امید ہے کہ یہ اشاعت مقبول اور مستحسن ہو گی!　　　——— فیض

ن۔م۔ راشد

جناب صہبا صاحب —— خدا آپ کو خوش رکھے۔ آپ کا ۲ر فروری کا لکھا ہوا خط ملا، ممنون ہوں!
کراچی میں مختصر ملاقات کے دوران میں میں نے آپ سے جو "گلہ" کیا تھا وہ صرف محبت کا گلہ تھا۔ اور مفہوم اس کا صرف اس قدر تھا کہ برسوں میں آپ نے کبھی اس نیاز مند کو اس قابل نہ سمجھا کہ "افکار" کا کوئی پرچہ ہی بھجوا دیں۔ ملک سے باہر ہوں تو کیا، اتنا بھی گم نام نہیں ہوں —— کہ کسی سے میرا پتہ معلوم نہ ہو سکے۔ اسی وجہ سے "افکار" کے لیے لکھنے

کی تحریک بھی نہیں ہوئی۔ اس وقت پاکستان میں دو اور ہندوستان میں دو رسالوں کے مدیر وقتاً فوقتاً خط لکھتے رہتے ہیں۔ اپنے رسالے بھجواتے رہتے ہیں۔ اور لبعض دفعہ ایسے سوالات پوچھ لیتے ہیں کہ ان کی مدد سے لکھنے کی تحریک ہوتی ہے۔

آپ نے کسی خاص شمارے کے لیے اس نیازمند سے پیغام کا مطالبہ فرمایا ہے۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن میں اس قسم کے پیغامات سے ہمیشہ گریزاں رہا ہوں۔ ایسے "پیغامات" میں آدمی کسی کے حق میں کلمۂ خیر کے سوا کیا کہہ سکتا ہے۔ بعینہٖ جیسے اگر آدمی کسی کے عرس میں شرکت کرے تو سوائے کلمۂ خیر کے کیا کہہ سکتا ہے۔ میں ادب میں تنقید کا قائل ہوں۔ مربیانہ داد و دہش کا قایل نہیں۔ اس کے علاوہ جن صاحب کے بارے میں آپ خاص شمارہ مرتب کر رہے ہیں افسوس ہے کہ انھوں نے آج تک کوئی ایسا موقعہ نہیں دیا کہ میں اُن کے بارے میں تنقید سے کمتر کوئی چیز لکھ سکوں۔ جو شخص اپنی کتابوں کے اشتہارات میں اپنے آپ کو "عظیم شاعر عظیم مفکر، عظیم انسان" کہلانے کی اجازت دیتا ہو[1] اُس کی سلامت طبع پر شک گزرتا ہے۔ اللہ اللہ "عظمت" کا اتنا ارزاں ہو جانا! اس کے علاوہ جو اپنے رسالے کو خود اپنی ذات کی توضیح کے لیے استعمال کرے اور اس میں ایسے مضامین شایع کرے جن میں اپنے مقابلے میں ہر شعر کہنے والے کو ہیچ گردانا گیا ہو، اس کے ذوق سلیم کو کیا کہوں؟

جہاں تک اس نیازمند کے بارے میں خاص نمبر شایع کرنے کا تعلق ہے میں آپ کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا — "یارلائے اُسے بالیں پہ مری پر کس وقت!"، میں اس سال اگست میں چونسٹھ برس کی عمر کو جا لگوں گا۔ اب اتنی ہمت نہیں کہ بیٹھ کر "خودنوشت" تک لکھ سکوں۔ اور میں جانتا ہوں کہ آپ اس کے علاوہ بہت سی اور چیزوں کا تقاضا بھی کریں گے۔ ہمت نہیں! پھر میں "ترقی پسند" بھی نہیں ہوں کہ جوش، فیض اور قاسمی صاحب کی محفل میں در آؤں۔

آپ کے خاص شمارے والوں میں ایک حفیظ صاحب ہیں جو اصطلاحاً ترقی پسند نہیں۔ لیکن انھوں نے "شاہنامہ اسلام" لکھ کر شاعری میں اپنے مقام کو بھی معرض خطر میں ڈالا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ بقول آپ کے آپ کو ترقی پسندی سے وابستگی رہی ہے۔ اور یہ کہ آپ نے "کیمونزم کو کبھی نہیں اپنایا"۔ لیکن میرے نزدیک دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ "ترقی پسندی" کیمونزم ہی کا ادبی چولا ہے[2]۔ بلکہ کیمونزم میں "دخول" کے بغیر ترقی پسندی کے ساتھ "جماع" مکمل نہیں ہو سکتا!

میرے بارے میں خاص شمارہ شائع کرنے سے آپ کو "خسرالدنیا والآخرۃ" کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔		والسلام

مخلص

راشد

---

[1] یہ سراسر زیادتی ہے۔ ندیم صاحب نے اپنے ایک خط میں "جشن ندیم" منعقد کرنے کی تجویز پر راقم الحروف کو جو خط لکھا ہے۔ اس کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ اس عبارت سے راشد صاحب کے الزام کی نفی ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک بار پھر عرض کروں گا کہ اس تقریب کا نام "جشن ندیم" نہیں ہونا چاہیے۔ "جشن" کا لفظ میرے کردار اور مزاج اور پھر میری عمر بھر کی کمائی، کی نفی ہے۔ یہ جشن تو افکار کے ندیم نمبر کا ہوگا، سو اسے افکار کے ندیم نمبر کی افتتاحی تقریب کہہ لیجیے۔"

[2] چہ خوب؟		(صہبا)

پروفیسر مجنوں گورکھپوری

احمد ندیم قاسمی اپنے دور کے انتشار و اضطراب کو شعر بنا دینے کی اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری زندہ رہنے اور مقابلہ کرنے کی تاب پیدا کرتی ہے۔ وہ اقبال کے توسط سے غالب سے متاثر ہیں۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

عہدِ حاضر کے اردو ادب میں احمد ندیم قاسمی صاحب کی شخصیت اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ بیک وقت بلند پایہ شاعر اور صاحبِ طرز نثر نگار ہیں۔ آزاد، پابند نظم ہو یا تخلیقی و تنقیدی نثر، ہر سمت ان کا قلم رواں ہے۔ تقریباً ۳۵ سال سے انہوں نے ادب کی خدمت کو وظیفۂ حیات بنا رکھا ہے اور یار و اغیار کی تحسین و نفرین سے بے نیاز اور حکومتوں و اداروں کی سرپرستی سے مستغنی اپنے راستہ پر مستقل مزاجی سے گام زن ہیں۔ کیونکہ ان کے فن و کردار میں تضاد نہیں، اسی لیے ان کی تحریروں میں اثر اور خلوص کی تابانی ہے۔ یہ ان کے ریاض کا کرشمہ ہے کہ عمر کے ساتھ ان کے قلم کی رفتار زیادہ تیز ہوتی جاتی ہے۔ ماحول کی تاریکی میں تلاش و تحقیق کا مشعل لیے وہ صنم کدہ سے چلتے چلتے خانۂ کعبہ تک جا پہنچے ہیں۔ ترقی پسندی کا مفہوم ان کے ذہن میں ایک ایسی تحریک نہیں جو وقت کے تقاضہ کو پورا کر چکی اور نہ انجمن سازی ہے۔ بلکہ ایک ایسا فلسفۂ حیات جو ہر ملک اور ہر دور کے مسائل کی کلید ہے۔

احمد ندیم قاسمی سے مجھے شرفِ نیاز حاصل نہ ہوا کرے۔ لیکن ان کی آواز کو میں دیر سے پہچانتا ہوں۔ بنگال کا قحط برپا زمانۂ جنگ کی ہولناکی، تقسیم ہند کی انسان کشی برپا، پاکستان کی افراتفری، ہر موضوع اور ہر موڑ پر انھوں نے اپنے فن کو ان قدروں کا ترجمان بنایا جن کی بقا پر انسانیت کے حال و مستقبل کا انحصار ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے کبھی مصلحت سے کام نہیں لیا اور حرفِ حق کے اظہار سے گریز نہیں کیا۔ تذبذب کے اس دور میں ان سے بہتر حق گو اور حق شناس سخن ور مشکل سے ملے گا۔

مدیر افکار حضرت صہبا لکھنوی کا بڑا احسان ہے کہ جب اپنا نام لکھنے کو کاغذ اور روشنائی میسر نہیں۔ وہ ہم عصر مستند شاعروں اور ادیبوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سامان اس ذوق و شوق سے مہیا کرتے ہیں۔

پروفیسر حمید احمد خاں

مجلس ترقی ادب۔ لاہور

۲۳ر اکتوبر ۱۹۷۳ء

برادرم[1] السلام علیکم!

آپ کا ۳ر اکتوبر کا نوازش نامہ وصول ہوئے دو ہفتے سے زیادہ گذر گئے۔ میں بصد معذرت "ندیم نمبر" سے غیر حاضر رہنے پر مجبور ہوں۔ توفیق تو باندازہ ہمت نصیب ہوتی ہے اور ہمت جوانی

---

[1] افسوس کہ آج پروفیسر حمید احمد خاں ہم میں نہیں ورنہ وہ "ندیم نمبر" دیکھ کر ضرور خوش ہوتے۔ (صہبا)

اور صحت کا عطیہ ہے۔ اس لیے توفیق پر میرا حق بہت کم باقی رہ گیا ہے۔ روزانہ دفتری کام کے
بعد رہی سہی سکت اپنی دو زیر طبع (اقبال کی شخصیت اور شاعری اور تعلیم و تہذیب) کے
پروف دیکھنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے معذور تصور فرمائیں گے۔
تاہم امتثال امر کے طور پر ایک مختصر نثر پارہ "ندیم نمبر" کے لیے منسلک ہے۔

خیر طلب - حمید احمد خاں

مدیر مجلہ "افکار" مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنی خاص اشاعتوں میں زندہ ادبا و شعرا کے تعارف و تحسین کا بصیرت افروز سلسلہ قایم کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی اُن ہم عصر ادیبوں میں ہیں جن سے مستقبل میں ضرور انصاف ہوگا۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ "افکار" کو اس کارِ خیر کا آغاز کرنے والوں میں شامل رہنے کا شرف حاصل ہوا۔

پاکستانی ادب کی روایت میں احمد ندیم قاسمی کا ایک خاص مقام ہے۔ میں نے روایت کا لفظ پوری احتیاط سے استعمال کیا ہے، گو مجھے تسلیم ہے کہ احمد ندیم قاسمی "روایتی" انداز کے ادیب ہرگز نہیں ہیں۔ اقبال کی وفات کے بعد ہمارے ادب میں فرد اور معاشرے کی علیحدگی بڑی تیزی سے نمودار ہوئی۔ سید احمد خاں اور اقبال دونوں اپنی اپنی طرز کے انقلاب پسند ادیب تھے لیکن دونوں نے ملی روایات کو اظہار و ابلاغ میں شامل رکھنے پر اصرار کیا۔ یہ اصرار اقبال کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس علیحدگی کے اوّلین نقیب ہمارے بعض ہر دل عزیز اہلِ قلم بنے جن میں احمد شاہ بخاری، بلکہ سید امتیاز علی تاج تک کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس سے مراد اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں ہے کہ بخاری صاحب یا تاج صاحب خدانخواستہ پاکستان کی تہذیبی روایت کے خلاف تھے۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ نفسِ اجتماعی کے بجائے نفسِ انفرادی کی آواز مؤثر طور پر بیسویں صدی کے نوجوان ادیبوں نے اٹھائی۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ پرانی غزل میں کہنے کو ایک فردِ واحد بولتا ہے۔ لیکن اس ذاتی تخصیص میں بھی دراصل پورا معاشرہ بول رہا ہوتا ہے۔ چنانچہ غزل گو شاعر جب اپنے معاشرے کے اہم عناصر پر سخت تنقید بھی کرتا ہے تو اپنے معاشرے کا ترجمان ضرور رہتا ہے۔ غزل کے احساس و ابلاغ میں فکر و بیان کی اس "عمومیت" کے دستور سے ہمارے زمانے کے اکثر شعرا نے روگردانی کی اور اس طرح نفسِ انفرادی کے تصورات میں واضح انہماک کا آغاز غزل میں بھی ہوا۔ میراجی کی منظومات اس انفرادیت پسندی کی علامت قرار دی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس اجتہاد میں میراجی تنہا نہ تھے۔ اردو کی پوری دنیا نے یہ روش اختیار کی۔ اس سلسلے میں بہت سے نام گنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مفرد کا علیحدہ اور مستقل وجود مابعدِ اقبال کے اردو شعر کی ایک نمایاں خصوصیت ہے اور یہ خصوصیت روایت شکنی کی تحریک کا صرف ایک پہلو ہے۔

اشتراکی مسلک کے ادیب انفرادیت پسند نہیں ہیں۔ لیکن اُن کا جماعتی احساس پاکستان کی تہذیبی روایت سے وابستہ نہیں رہا۔ اس فہرست میں بڑے بڑے نام آتے ہیں۔ لیکن انسان کی معاشی بہبود سے وابستہ لگاؤ رکھتے ہوئے بھی ہمارے یہ شعرا پاکستانی قومیت اور پاکستان کی تہذیبی روایت سے الگ رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے شعر میں ضمیرِ جمع متکلم کا منشا الیہ قوم کے اندر نہیں، واضح طور پر قوم کے عمرانی و جغرافیائی حدود کے باہر ہوتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی اس ضمیرِ جمع متکلم کو دوبارہ پاکستان کی قومی اور جغرافیائی حدود کے اندر لے آئے ہیں۔ وہ ایک "ترقی پسند" ادیب ضرور ہیں۔ لیکن ان کی "ترقی پسندی" پاکستانی روایت کی ہم نوا ہے۔ یہ ایک کارنامہ ہے جس کے لیے پاکستانی ادب کی تاریخ قاسمی صاحب کو شکریے سے یاد رکھے گی۔

عبدالرحمٰن چغتائی

مجھے ندیم قاسمی سے ایک ذاتی لگاؤ ہے اور اس کا ایک ہی سبب ہے کہ مجھے ان کے فن کا پورا پورا اعتراف ہے۔ وہ اپنے معاشرے میں ایک عالمگیر شہرت سے روشناس ہیں۔ علم و ادب میں وہ کونسا جذبہ ہے۔ جو ان کی بصیرت سے اوجھل ہے۔ غزل۔ نظم۔ افسانہ۔ نثر۔ تنقید اور صحافت ان کا روزمرہ کا مشغلہ ہے۔ اس کے ساتھ حرف و حکایت اور پُر معنی طنز و مزاح لکھنے والے اپنے ہاں خال خال بھی نظر نہیں آتے۔ تجریدی ابسٹرکٹ آرٹ پر کسی کو نشانہ بنانے میں آرٹسٹ ہوتے ہوئے میں کبھی توجہ نہیں دیتا۔ ہو سکتا ہے تنگ نظری اور تعصب کا کوئی پہلو پیدا کر لیا جائے۔ لیکن میرا مطالعہ ہے۔ جب بھی موقع ہاتھ آیا ندیم قاسمی نے تجریدی آرٹسٹوں کے خلاف صحیح قدم اٹھانے یا اپنا نقطۂ نگاہ پیش کرنے میں کبھی کوتاہی سے کام نہیں لیا۔

ہو سکتا ہے۔ ندیم قاسمی کے متعلق میرے تاثرات خوش فہمی پر مبنی ہوں۔ شاعروں سے بالاتر انھوں نے طنز و مزاح میں اُستادوں کو بھی قدم چومنے پر مجبور کیا ہو۔ وہ فن کرنے میں استادوں کا درجہ رکھتا ہے۔

میرے خیال میں روزمرہ کی زندگی سے نپٹنے کے لیے ایک تنگ دلی سی اُبھر آتی ہے۔ مگر جلال و جمال تخلیق کرنے میں فن کار کے لیے یہ وصف ایک صنعت کی صورت ابھر آیا ہے۔ یہی اس کو ودیعت کیا جاتا ہے اور اسی سے وہ روشناس ہوتا ہے۔

ندیم قاسمی کو اگر تڑپنے تڑپانے کا موقع ملا بھی ہو گو داستانِ عشق کو دور رکھنے کا اُسے کامل تجربہ ہے۔ ندیم قاسمی نے شاعر رہ کر شاعری کو ذریعۂ اظہار بنایا ہے اور جذبات پر حکیمانہ نگاہ ڈالی ہے، جن سے شاعر اور اس کی شاعری پروان چڑھتی ہے۔ اور حقیقت بن کر شخصیت اور انفرادیت میں نمودار ہوتی ہے۔ ذاتی خود ستائی، جذبات آرائی سے رجائیت کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ اور یہی وہ رجائیت ہے۔ جو آرٹسٹ کے لیے ایک ایسا لامتناہی راستہ تخلیق کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جو نمائش اور خود فریبی سے بالاتر شاعر کو فکر، تخیل اور تخلیقی قوتوں سے برسرِ پیکار رکھتی ہے۔

ندیم قاسمی کی شاعری میں اس کی انفرادیت سامنے آتی ہے۔ اس کی انفرادیت سے اپنی ثقافتی قدروں کا رشتہ وابستہ ہے۔ اس کی شاعری اس کے والہانہ جذبے کا اظہار ہے۔ جو انسان دوستی اور انسانیت کے تاثرات کا مجموعہ ہے۔ اس کی نظموں، غزلوں اس کے ادب اور فن پاروں میں یہاں تک کہ وہ جب سڑکوں، بسوں، راہ چلتے لوگوں کو نشانہ بناتا ہے اور معاشرے کی خرابیوں کے متعلق اپنے جنون کا اظہار کرتا ہے۔ تو اس کے سامنے اچھے لوگ اچھے کردار اور انسانیت کے تقاضوں کا جواز اور ایک ایسے معاشرے کا تصور مقصود ہوتا ہے۔ جس کا وہ خود ایک فرد ہے۔

اس کی تحریروں میں ان مسکراہٹوں کی زہر آلود تلخی جھلکتی ہے۔ جو معاشرے کی برائیوں کے لیے تریاق کا اثر رکھتی ہے۔

اگرچہ اس کے اور میرے تعلقات مجلسی طور پر نہیں کچھ فاصلے پر اُبھرتے اور پلتے رہے ہیں۔ لیکن اس پر بھی میں اسے اپنے قریب محسوس کرتا ہوں اور کبھی دوری کا احساس ہی نہیں ہوا۔

مجھے ان کی ایک ملاقات یاد ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت ہے اور میری نظروں میں اس کی بڑی اہمیت ہے کہ وہ میرے ہاں تشریف لائے تو ان کے ہمراہ ایک برقعہ پوش محترمہ تھیں۔ جب برآمد ہوئیں تو وہ ہاجرہ مسرور تھیں۔ جن کا مجھ سے

تعارف ہوا۔

خدیجہ مستور ہوں یا ہاجرہ مسرور دیکھتے دیکھتے وہ اپنی تخلیق اور ذہانت کی بنا پر ادبی دنیا کی روحِ رواں بن گئیں اور ندیم قاسمی کی عقیدت مندی سے ایک دوسرے کی مددگار بھی ثابت ہوئیں۔ توانائی اور انتادِ طبع سے ایک ایسا آہنگ بلند ہوا کہ پھر زندگی کے کسی رخ نہ کوئی پردہ رہا نہ برقع، سوائے ادب کی تخلیق کے معیار اور اقدار و کردار کی تشکیل سے پردہ پردہ نہ رہا۔

احمد ندیم قاسمی اصلاح اور تنقید کے سلسلہ میں ایک ایسے شدید جذبے کے مالک ہیں کہ ان کے قلم کے سامنے آیا ہوا سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اس کا عزم ثقافتی قدروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کی ہر تحریر واضح ہے اس کے سامنے ایک عظیم مقصد ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

شعبۂ اردو۔ جامعہ کراچی

صہبا صاحب مکرم ——— السلام علیکم!

آپ نے ندیم نمبر کا اعلان کیا تھا تو میں نے وعدہ کیا تھا کہ قاسمی صاحب کے بارے میں مضمون لکھوں گا۔ لیکن جیسا کہ آپ کے علم میں ہے۔ کچھ کثرتِ کار اور کچھ میری صحت' آلام جسمانی اور افکارِ روحانی کا ایسا ہجوم رہا کہ یہ ممکن نہ ہوا' اب کہ آپ کا رسالہ طباعت کے آخری مراحل میں ہے اس کا موقع نہیں۔ لیکن انگلی کاٹ کر شہیدوں میں شامل ہونے کے لیے یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

غالباً سنہ ۱۹۴۰ء کے آس پاس میں نے ترقی پسند تحریک کے بارے میں ایک مفصل مضمون لکھا تھا جو نگار میں شایع ہوا تھا' یہ اس تحریک اور اس سے متعلق شاعروں اور ادیبوں کے سلسلے کا پہلا تفصیلی تنقیدی جائزہ تھا' اس میں قاسمی صاحب کے بارے میں میں نے لکھا تھا کہ تحریک سے وابستہ حضرات میں قاسمی صاحب ان لوگوں میں ہیں' جو شدت اور انتہا پسندی کا شکار نہیں ہوئے' اور جن کی شاعری افسانوں اور تنقید میں ایک صحت مند توازن' سلامتی طبع اور استقامت ذہنی کے آثار ملتے ہیں۔ سو پچھلے تیس پینتیس سال کی اُن کی تخلیقات اسی خیال کی تائید کرتی ہیں۔ اس شدت اور انتہا پسندی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک ایسی تحریک جس سے بہت کچھ مفید اور تعمیری مقاصد حاصل ہو سکتے تھے۔ چند لوگوں کی وجہ سے بدنام اور ناکام ہو کر رہ گئی۔ اس پوری مدت میں قاسمی صاحب نے اپنی روش نہیں بدلی اور اب تک اس پر قایم ہیں۔

قاسمی صاحب کے فن کے باب میں آپ کے اس خصوصی نمبر کے لیے بہت کچھ لکھا گیا ہوگا اور لکھا جائے گا۔ میں بھی اُن کی شاعری اور افسانوں کے متعلق انگریزی اور اردو میں کچھ لکھ چکا ہوں اس لیے اس کا اعادہ نہیں کرتا' البتہ اُن کی شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے قاسمی صاحب کو ویسا ہی پایا جیسے وہ اپنی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ سادگی اور خلوص اُن کی شخصیت اور فن کے بنیادی عناصر ہیں۔ میں نے کم لوگ ایسے دیکھے جن میں فرشتوں کی سی معصومیت ملتی ہے اور بلاشبہ قاسمی صاحب ایسے ہی انسان اور فن کار ہیں۔ وہ ایسے شاعر نہیں جن کے بارے میں قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ یقولون ما لا یفعلون' کہ وہ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں' قاسمی کے قول اور عمل میں ایسا تضاد نہیں ملتا' وہ جو کچھ ہیں ویسے ہی اپنے فن میں اور ویسے ہی اپنی روزمرہ زندگی میں ہیں۔

اُن کے نظریات سے شاید بعض حضرات کو اختلاف بھی ہو لیکن یہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ انھوں نے اپنے فن کو مالِ تجارت سمجھا۔ انھوں نے نہ خود کو فروخت کیا نہ اپنے فن کو، نہ انھوں نے زمانہ سازی کو مسلک بنایا، نہ کسی کی مدح سرائی سے کوئی عہدہ، کوئی املاک یا ذاتی فائدہ حاصل کیا اور نہ کسی جابر کے جبر کے سامنے سر جھکایا، یہ عظمت فن کی ایک بڑی نشانی ہے اور قاسمی بلاشبہ ایک عظیم انسان اور عظیم فن کار ہیں ——— اپنی ذاتی زندگی میں وہ یاروں کے یار اور دوستوں کے غمگسار ہیں۔ کسی کو اُن کی مدد کی ضرورت ہو تو وہ بلا تامل اس کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے ان کا حلقہ ارادت مندوں صرف فن کاروں، شاعروں، ادیبوں، نقادوں اور صحافیوں تک محدود نہیں، مجھے یاد ہے چند سال پہلے انھوں نے اپنے ایک دوست محمد شفیع صاحب کے ایک عزیز کے سلسلے میں مجھ سے سفارش کی، وہ کام ہو گیا تو قاسمی صاحب کو ایسی خوشی ہوئی گویا یہ ان کا اپنا ذاتی مسئلہ تھا۔ کچھ عرصہ بعد میں انگلستان گیا، شفیع صاحب ایڈنبرا میں تھے۔ انھوں نے بڑے اصرار سے مجھے ایڈنبرا بلایا اور ہفتہ بھر مجھے اور میرے کنبہ کو اپنا مہمان رکھا، وہ کاروباری آدمی ہیں اور ان کا کاروبار ماشاء اللہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ لیکن اُن کے ڈرائنگ روم میں سب سے نمایاں چیز قاسمی صاحب کی تصویر تھی۔ انھوں نے مجھے قاسمی صاحب کی شعر خوانی کے ٹیپ سنائے۔ اُن کی جملہ تصانیف کا سٹ دکھایا اور ہفتہ بھر تک اس محبت سے قاسمی صاحب کا تذکرہ رہا جیسے اس سے زیادہ اہم اور کوئی موضوع نہ ہو۔ یہ کمال شخصیت کا ہے اور شخصیت کے کمال سے ہی فن کا کمال حاصل ہوتا ہے۔ جس کی اپنی شخصیت ناقص ہوگی، جس کا اپنا دامن داغدار ہوگا اور جو عظیم انسان نہ ہوگا وہ عظیم فن کار کیسے ہو سکتا ہے!

ابھی چند دن پہلے قاسمی صاحب نے مجھے ایک خط لکھا، یہ خط دفتری نوعیت کا تھا اور انھوں نے مجلس ترقی ادب لاہور کے ناظم کی حیثیت سے لکھا تھا، "ٹائپسٹ نے آغاز خط میں محترم "ڈاکٹر صاحب السلام علیکم" ٹائپ کر دیا، قاسمی صاحب نے دستخط کرنے سے پہلے اسے کاٹ کر برادرم کر دیا، یہ ایک چھوٹی سی بات ہے لیکن اس سے اُن کے مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ بڑائی کی اکثر نشانیاں بہت چھوٹی ہوتی ہیں، لیکن ان چھوٹی نشانیوں میں ہی کردار کی عظمت مضمر ہوتی ہے۔

زندگی رہی تو قاسمی صاحب اور اُن کے فن کے بارے میں کبھی تفصیل سے بھی لکھوں گا۔

والسلام آپ کا

ابواللیث صدیقی

جسٹس ایس۔ اے رحمان

۶۵ شاہراہِ اقبال۔ گلبرگ۔ لاہور

مکرمی صہبا صاحب ——— السلام علیکم

خط محررہ ۶ رمارچ ۱۹۷۴ء موصول ہوا۔ آپ کے "افکار" کے ادبی دنیا کی ممتاز شخصیتوں کی تحسین کا جو سلسلہ اُن کی زندگی میں جاری کیا ہے، ایک نہایت صحت مند روایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں آپ کے مجوزہ "ندیم نمبر" کا تہِ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں ———

مخلص

ایس۔ اے رحمٰن

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

یونیورسٹی آف سندھ حیدرآباد

محترم صہبا لکھنوی صاحب ——— تسلیم!

آپ کا گرامی نامہ مؤرخہ ۶ر مارچ ۱۹۷۵ء موصول ہوا۔ سن کر مسرت ہوئی کہ آپ جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے سلسلہ میں 'ماہنامہ افکار' کا ندیم نمبر مرتب کر رہے ہیں۔ مبارک باد۔

مخلص نبی بخش بلوچ
(وائس چانسلر)

پروفیسر مجتبیٰ حسین

بلوچستان یونیورسٹی۔ کوئٹہ

صہبا صاحب ——— تسلیم!

آپ ندیم نمبر نکال رہے ہیں۔ بڑا اچھا کام ہے۔ کام آپ نے اب تک سب ہی اچھے کیے ہیں۔ میری مراد نمبر نکالنے والے کام سے ہے۔ ندیم صاحب پر آپ نے مجھ سے مضمون مانگا ہے۔ ندیم صاحب کی ادبی شخصیت اور حیثیت ایسی ہے کہ مضمون نہیں، مقالات تو ان کی طلب ہیں۔ میں نے مدت ہوئی ایک طویل مضمون میں جو آپ ہی کے یہاں چھپا تھا۔ ندیم صاحب پر بھی کچھ سرسری طور پر لکھا تھا۔ اس کا لب و لہجہ ممکن ہے معاندانہ ہو، مگر اس وقت بھی، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے یہی لکھا تھا کہ ندیم صاحب کے ذہن میں رومانیت کی ملائمت رچی ہوئی ہے۔ ان کی شاعری نہ کڑوی بات کہہ سکتی ہے نہ سن سکتی ہے۔ ندیم صاحب کی نرم مزاجی ان کی شاعری کی قوت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ جہاں وہ تیز اور تند لہجے کی طرف آتے ہیں ان کی شاعری کا بنیادی مزاج درشت فضا میں اجنبی بن جاتا ہے۔

آپ ان کی غزلیں، نظمیں، افسانے یہاں تک کہ ان کے اخبار کا کام دیکھیے، سب میں میانہ روی اور نرم گفتاری ملے گی۔ وہ کٹھن راہوں سے بھی سہل سے گذر جاتے ہیں اور اتنی مدت گذر جانے اور اتنے روح فرسا واقعات اور حادثات کے رونما ہونے کے باوجود ان کا لہجہ تلخ نہیں ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس سے اُن کی مہذب اور مربوط شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔ خیال کیجیے کتنی مدت سے وہ لکھ رہے ہیں۔ اس مدت میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے کتنے چولے بدلے ہیں۔ جدید و قدیم کی کن الجھنوں میں مبتلا رہے ہیں۔ اپنے فن سے زیادہ اپنی ذات کے کتنے ادبی اشتہارات ہمارے ادبا اور شعرا نے رسالوں میں چھپوائے ہیں۔ جھنجھلاہٹوں، غصوں، توڑ پھوڑ اور لایعنیت کے کیسے نمونے سامنے آئے ہیں۔ مگر ندیم صاحب طوفانوں میں رہتے ہوئے بھی طوفانوں سے بے نیاز رہے ہیں۔ ایک درویشانہ شان ہے۔ بڑی خاموشی، ایک سوئی ہوئی لگن کے ساتھ وہ لکھتے رہے۔ اس طرح بہت کم لوگ رہ سکتے ہیں۔ اچھے اچھے شاعر اپنا رنگ چھوڑ کر دوسروں کا رنگ اپنانے میں لگے ہیں۔ مگر ندیم صاحب کی شاعری ہر نوع کی سنسنی خیزی سے بچی رہی۔ انھوں نے شاعری میں کوئی کھیل نہیں رچایا۔ وہ اپنے معاصرین کے پیچھے بھی اپنی دُھن پر جمے رہے اور اس دور میں بھی جب ان کے بعض معاصرین سینگ کٹوا چکے ہیں یا کٹوانے کے چکر میں ہیں ان کی شاعری

ان کی شخصیت کی تصدیق کرتی ہے۔ اُن کی شاعری خالص دیسی شاعری ہے اور یہ کتنی تقویت کی بات ہے۔ میراجی کی طرح انھوں نے دیسی بدیسی شاعری کا کوئی ملغوبہ تیار نہیں کیا۔ اصل میں میراجی نے شاعری ہی نہیں کی۔ انھوں نے شاعری کا تجربہ کیا ہے۔ تجربہ کرنے اور شاعری کرنے میں بڑا فرق ہے۔ ذات اگر اہم نہ ہو تو ذات کی شاعری غیر اہم ہو جاتی ہے۔ ندیم صاحب نے راشد کی طرح "ٹکنیکل شاعری" بھی نہیں کی ہے۔ ان کے یہاں روپ ہے بہروپ نہیں۔ انسانوں کی ضرب تقسیم انھیں نہیں آتی ہے یا وہ انسانوں کو تقسیم نہیں کرنا چاہتے۔ ان کی شاعری محبت کی شاعری ہے۔ یہی افسانوں میں بھی ہے۔ ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد، میں بھی محبت ہی ئے اُجڑے دیار کی تلاش ہے۔ اُن کی شاعری اور اُن کے افسانوں کو ملا کر پڑھیے، آپ کو دونوں میں ایک ہی شخصیت ملے گی۔ وہی آدمی جو نظموں اور غزلوں میں آنسو پیتے ہوئے مسکراتا رہا ہے۔ وہی افسانوں میں سیدھے سادے آدمیوں کے ساتھ ہنستا اور آنسو بہاتا ہے ــــــ اس میں "دکھاوا" (PRETENTION) نہیں ہے۔

ندیم صاحب کی ادبی تخلیقات میں جو آدمی ملتا ہے وہ بڑا بامروت، ملنسار، عاشق مزاج اور صوفی طبع ہے۔ یہ آدمی گاؤں کی پگڈنڈیوں سے چل کر شہر تک پہنچا ہے۔ لیکن شہر میں یہ ذرا اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا اصل گھر گاؤں میں ہے۔ اس گاؤں نے جہاں انھیں نرم بنایا ہے وہاں انھیں تلخ حقیقتوں سے بھی آگاہ کیا ہے۔ مگر حقایق کی تلخی کو، اس صوفی نے جو ندیم میں ہے گوارا بنا دیا ہے۔ میں ندیم صاحب کو اصطلاحی معنوں میں صوفی نہیں کہہ رہا ہوں، نہ میرا یہ مطلب ہے کہ ان کی شاعری میں کسی قسم کا تصوف پایا جاتا ہے۔

صہبا صاحب بات یہ ہے کہ ندیم صاحب کے یہاں نظم و نثر دونوں میں جو گاؤں کی مٹی کی مہک ہے اُس میں ایک ایسی طہارت اور دل جوئی ہے جو کہیں اور نہیں ملتی۔ ان کے یہاں ایک "ارضی تصوف" ہے۔

خیر تصوف کی بات سے الجھنا نہیں چاہیے، یہ توضمنی طور پر نکل آئی۔ ندیم صاحب اسی دور کے شاعر اور افسانہ نگار ہیں اور دونوں اصناف میں یکساں طور پر معتبر ــ وہ ادب سے اور ادبی تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہیں۔ ان کی ادبی شخصیت پہلودار ہے۔ اس پہلودار شخصیت پر جم کر لکھنے کی ضرورت ہے۔

میں خط پر انھیں "ٹرخانا" نہیں چاہتا۔ فرصت ہوتی تو تفصیل سے لکھتا۔ جامعہ بلوچستان نے مجھے اتنا عدیم الفرصت بنا دیا ہے کہ جب آپ کا خط ملا تو مجھے آپ سے اپنا وعدہ یاد آیا اور اسی کے ساتھ وہ وعدہ بھی جو میں اپنے حلبہ سے کر چکا ہوں۔ میں آپ سے بہت نادم ہوں۔

ندیم صاحب کی تخلیقات اور ان کی شخصیت نے ایک پوری نسل کی ادبی تربیت کی ہے۔ وہ ادیب بھی ہیں اور ادب ساز بھی ہیں۔ اُن کی اہمیت سے انکار ادب کی ارتقائی سمتوں سے بے خبری ہے۔ پیار کی باتیں تو بہت سے شاعر اور ادیب کرتے ہیں ــــ مگر جس بے لوث پیار کی خوشبو ندیم صاحب کے یہاں ہے وہ کہیں اور کم ملتی ہے۔

اس دور کی اہم اور مستند شخصیت پر نمبر نکال کر آپ فی الحقیقت اس دور کے ادب کو اہم و مستند بنا رہے ہیں۔

باقی باتیں پھر ہوں گی ــــ

اب باتوں کے سوا رہا بھی کیا ہے ــ

ــــــ مجتبیٰ حسین

پروفیسر انجم اعظمی

برادرم صہبا! ــــــــ

آپ قاسمی صاحب کا نمبر نکال رہے ہیں۔ میرا جی بھی چاہتا تھا اور قاسمی صاحب اس کے حق دار بھی ہیں کہ ان پر مضمون کیا کتاب لکھی جائے۔ لیکن میں اپنی چند در چند مجبوریوں کی وجہ سے ایک مختصر مضمون بھی نہیں لکھ سکا اور اب آپ سے اور احمد ندیم قاسمی صاحب سے بے حد شرمندہ ہوں۔

قاسمی صاحب اپنے عہد کے نمایندہ شاعر، اہم افسانہ نگار، نقاد اور صحافی ہیں۔ اور واقعی ایک انسان ہیں مخلص، دردمند، دوسروں کے کام آنے والے، سب کا دکھ بانٹنے والے۔ ان پر بحیثیت انسان، بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے اور اس کا قوی امکان ہے کہ کسی نہ کسی نے ضرور آپ کے ندیم نمبر کے لیے لکھا ہوگا ــــ "ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد" ــــ ان کا عظیم افسانہ ہے ــ "پرمیشر سنگھ" ان کی انسان دوستی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ "انسان عظیم ہے خدایا" ان کا یہ مصرع اور نظم زندگی کے سفر کے ساتھی ہیں۔ ان کے ابتدائی دور کے رومانی افسانوں میں پنجاب کے دیہاتوں کی دل کش فضا میں طالب علمی کے زمانے سے آج تک کبھی بھلا نہیں سکا۔ ان کے رومانی قطعات اور نظمیں بھی مجھے اب بھی ویسی ہی اچھی لگتی ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ہے قاسمی صاحب کا فن بلیغ اور اس میں زندگی کے شعور کا عکس گہرا ہوتا گیا ہے مسلسل ارتقا بہت کم لوگوں کے فن میں ملتا ہے لیکن قاسمی صاحب اس عہد کے ان چند خوش نصیب ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے وقت کے ساتھ اپنے تجربے، مشاہدے اور فن کی ہم آہنگی کو برابر قایم رکھا۔ ان کے بہت سے معاصرین ان پر کھل کر رائے دینے سے گریز کریں گے۔ یہ ادبی بدعت ہمارے زمانے میں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ لیکن ادب کا طالب علم قاسمی صاحب کے ادبی کارناموں کو کسی قیمت پر فراموش نہیں کرسکتا۔

زندگی کے تاثرات ہوں۔ یا کرداروں کا مطالعہ، یا ماحول کی عکاسی، سب پر احمد ندیم قاسمی کے قلم کو پورا عبور حاصل ہے۔ البتہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ قاسمی صاحب پہلے افسانہ نگار ہیں یا شاعر۔ ان کی دونوں حیثیتیں بے حد نمایاں ہیں۔ ادب کی تاریخ میں وہ شاعر اور افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔ صہبا صاحب کیا کہوں مجھے ان پر کم از کم ایک مضمون لکھنا تھا لیکن اس کے بجائے یہ معذرت نامہ بھیج رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ندیم نمبر بہت عمدہ نکالیں گے۔

ــــــــ انجم اعظمی

شان الحق حقی

بزرگ ادبی شخصیتوں پر کئی یادگار نمبر شایع کرنے کے بعد اب "افکار" نے اسی سلسلے میں ایک اور ادیب شہیر اور شاعر بزرگ احمد ندیم قاسمی کو موضوع قلم بنایا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ نمبر یونہی مرتب نہیں ہوجاتے۔ ان میں بڑی جان کھپانی پڑتی ہے۔ کاغذ کی اس گرانی و کم یابی کے زمانے میں یہ بڑا حوصلہ مندانہ اقدام ہے۔ ورنہ اس سے ان کو ملے گا بھی کیا؟ ادبی صحافت پر جو اوس پڑی ہوتی ہے خاصی روح فرسا اور حوصلہ شکن ہے۔ ایسے کارزیاں کے پیچھے پڑنا معاشی اعتبار سے ایک دیوانگی بلکہ گناہ ہے کہ ادب سے معیشت کا کوئی مطلب حل نہیں ہوتا۔ ناظرین ہی نہ ہوں تو مشتہرین بھی کیوں پوچھیں۔ شرما شرمی کچھ بھولی

ہیں ڈال دیتے ہیں ۔" جوگی کا بر ن ہم نے لیا یار کی خاطر" یہ دریوزہ گری بھی علم و ادب کے لیے کرنی پڑتی ہے ورنہ سوچیے کہاں سے چھپے اور کون چھاپے ۔ کس برتے پر چھاپے ۔

مشتہرین کا ذکر آیا تو قلم پہ یہ بات آئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ بعض لوگ ابھی تک اشتہاروں کو بھی ادب ہی کی طرح کارِ زیاں سمجھتے ہیں ۔ اگر ساری دنیا اسی خیال کی ہو جائے تو ادب و صحافت کا چراغ بالکل ہی گل ہو جائے ۔ ذرائع نشر و اشاعت جو جمہوری معاشرے کے لازمی ادارے ہیں، ٹھٹھر کر رہ جائیں ۔ اشتہارات ایک تجارتی ضرورت کے علاوہ ایک سماجی ذمہ داری بھی ہیں جو کامیاب تجارتی اداروں پر عاید ہوتی ہے ۔ یہ ترقی یافتہ معاشروں میں صنعت و تجارت کا مانا ہوا اصول ہے ۔ جدید جمہوری معاشرہ ایسے تجارتی اداروں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا، بلکہ برداشت ہی نہیں کر سکتا جو صرف کمائی سے سروکار رکھیں اور ان سے ادب، صحافت، ثقافت کو کوئی فیض نہ پہنچے خصوصاً اس صورت میں کہ پبلسٹی اور تعلقات عامہ کے مصارف بالآخر معاشرے کے افراد ہی برداشت کرتے ہیں جو صنعتی و تجارتی اشیاء کے خریدار ہیں ۔ ایک جائز اور معینہ حد تک (جس کی صراحت ملکی قوانین میں موجود ہے) اشتہارات کے مصرف کو مصارف پیداوار میں شامل کرنا ہر پھلتے پھولتے تجارتی ادارے پر لازم آتا ہے ۔ ورنہ یہ ہماری ہی جیبوں سے جاتے ہیں ۔ پھر اشتہارات میں خسّت سے کام لینا ایک مجہول حرکت ہے جو ایسے خسیس اداروں کے لیے بھی بے برکتی ہی کا باعث ہو سکتی ہے ۔

ہم مخلوط اقتصادیات پر کاربند ہیں اور رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف بڑھ رہے ہیں ۔ اس عبوری دور میں جب کہ نشر و اشاعت کے ادارے تنہا حکومت پر انحصار نہیں رکھتے بلکہ بڑی حد تک آزاد اور خود کفیل ہیں ۔ اشتہارات میں بیش از بیش اضافہ معاشرے کی عمومی ترقی اور ادب و ثقافت کی بقا کے لیے ضروری ہے ۔ ورنہ صرف اللہ کا نام باقی رہ جائے گا اور یہ جو تھوڑی بہت رونق ہمارے شہروں میں نظر آتی ہے، یہ بھی ماند پڑ جائے گی ۔ جیسے کہ سنا ہے یورپ کے شہروں میں تیل کی کمی کے باعث سڑکوں کی جگمگاہٹ ختم ہو گئی ہے ۔ ان روشنیوں کے لیے تیل کنوؤں اور ٹنکیوں ہی کے ذریعے نہیں، مشتہرین کے ذریعے شہریوں کی جیب سے بھی آتا ہے ۔

احمد ندیم قاسمی کو ادب کے میدان میں قدم رکھے کم از کم ایک صدی کی تہائی گزر چکی ہے ۔ میری دعا ہے کہ وہ ایک صدی پوری کریں ۔ ان کی جان سے دور، نہ معلوم کیوں یہ احساس ہے کہ جو اٹھ جائے گا اس کا جواب پھر نہیں آئے گا ۔ اب ایسے لوگ جم ہی جم رہ گئے ہیں، جن سے ہم اپنی زبان میں بات کر سکیں ۔ اگلی نسل نے پہلے ہی اور بولی بولنی شروع کر دی ہے ۔ میں زمانے کے ساتھ قدم ملانے کا قایل ہوں ۔ مگر یہ بھی ایک خام خیالی ہے ۔ کس میں اتنا سانس ہے کہ دنیا کے ساتھ چل سکے ؎

بہت ہم کو پیچھے زمانے نے چھوڑا
چلے تھے بہت ہم زمانے سے آگے

نسلی خلا پیدا ہونا لازم ہے ۔ میں احمد ندیم قاسمی کا لہجہ اور محاورہ سمجھ سکتا ہوں کہ ہم نے ایک ہی دور میں لکھنا پڑھنا اور سوچنا سیکھا ہے ۔ یہاں لہجے اور محاورے سے میری مُراد ٹکسالی لہجے یا محاورے سے نہیں ہے ۔ یہ اردو، انگریزی یا پنجابی سندھی وغیرہ کا معاملہ بھی نہیں ہے ۔ شخصیت کی پہچان اور ذہنی و جذباتی ہم آہنگی کا معاملہ ہے ۔ سو مجھے یہ زعم ہے کہ میں احمد ندیم قاسمی کی بات زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں اور وہ میرے دل کو زیادہ لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کا اپنا

تاثر کیا ہوگا۔

بڑا شاعر کسی ایک دور میں چمک کر ختم نہیں ہو جاتا۔ احمد ندیم قاسمی کے ہاں ایسے عناصر موجود ہیں جو ہمیشہ دنیا کی سمجھ میں آتے رہیں گے۔ لیکن یہ کوئی نہیں کر سکتا کہ آیندہ دنیا کی ساری باتیں احمد ندیم قاسمی کی سمجھ میں بھی آجائیں گی۔ میں نے ان کو اپنے دور سے وابستہ کر کے دراصل ان کے ساتھ ایک اپنائیت جتانے کی کوشش کی ہے۔ جیسے کوئی کسی کو اپنے شہر یا اپنے حلقے میں کھینچ کر اس سے ایک تعلق کا اظہار کرے۔ زمانہ ایک زیادہ بڑے حلقے کا نام ہے۔ اس حلقے میں میرا مقام مادی یا اعتباری طور پر ان سے بہت قریب تو نہیں پھر بھی کچھ دوریاں ضرور رہتی ہیں۔ انھیں کھینچ دیجیے تو ہم قریب آجائیں گے۔ ڈھیل دیدیجیے تو دور چلے جائیں گے۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو پچیس برس سے دیکھتے آ رہے ہیں اور میں ان کو کچھ زیادہ عرصے سے پڑھتا بھی آرہا ہوں۔ اس رُبع صدی میں انھوں نے اپنا قد کافی اونچا کر لیا ہے۔ اب وہ پورے سنِ بلوغ کو پہنچ چکے ہیں۔ لیکن شاعر کے بارے میں آپ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کب وہ بانس کے بھوت کی طرح اور تھوڑا سا اونچا ہو جائے۔ اور اسے اور بھی گردن اونچی کر کے دیکھنا پڑے۔ مجھے تو اب بھی انارکلی کی سڑک سے 'فنون' کے سائن بورڈ کی طرف ٹوپی سنبھال کے دیکھنا پڑتا ہے۔

دراصل ہمارے گرد اپنائیت کے کئی اور حلقے بھی ہیں۔ وہ کئی حلقوں کے میر ہیں اور ان میں کہیں ادھر اُدھر میں بھی دبکا ہوا مل جاؤں تو شاید کوئی پہچان لے۔ وہ کئی بازاروں میں رونق افزا ہیں۔ ایک بازار غزل کا ہے جس میں میں نے بھی اپنا ٹنڈیر اڈال رکھا ہے۔ پھر نظم، تنقید، افسانہ، صحافت، یہ سب ان کے میدان ہیں جن میں میری ان سے صاحب سلامت رہی ہے۔ مگر بعض میں تو میں نے صرف لہو لگا کے شہیدوں میں نام کیا ہے اور وہ ان میدانوں کے غازی ہیں۔ ان کی زندگی ایک مدت سے ادب کے لیے وقف ہے۔ یہ بڑی سعادت ہے۔ بڑی بات ہے۔ بڑا مقام ہے۔ جس پر ہم جیسے دنیا زدہ کبھی فائز نہیں ہو سکتے۔

میں اپنی اس خوش نصیبی پر ناز کرتا ہوں کہ میں نے بڑے قدآور ادیبوں کا دور دیکھا ہے۔ لہٰذا الحمد للہ ہم اقبال کے معاصر رہے ہیں، اور حسرت کے، اور اصغر کے اور فانی کے اور جوش کے، حفیظ کے اور فیض کے۔ یہ تو چند ہی چوٹی کے نام ہیں۔ ایسے اور بھی قد ہیں، اور انہی میں سے ایک اونچے پربت کا نام احمد ندیم قاسمی ہے۔

میں نے ان کی ذات سے ہمیشہ خلوص محسوس کیا ہے۔ مگر خلوص جتانے کی چیز نہیں ہوتی۔ لہٰذا کبھی اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ انھوں نے خود ہی اس کا احساس کیا ہو تو کیا ہو۔ مثلاً ایک بار کسی صاحب نے مجھے لکھا کہ ان کی ایک محفل میں میری بابت کچھ ایسی باتوں کا چرچا سننے میں آیا جو بظاہر غلط اور تعجب خیز تھیں۔ میں نے وہ خط انہی کی خدمت میں روانہ کر دیا کہ وہی اس کے جھوٹ سچ کو اچھی طرح جان سکتے تھے۔ مجھے ان کی طرف سے کوئی بدگمانی دل میں رکھنا منظور نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے اس صفائی کی قدر کی ہوگی۔ اور انھوں نے کچھ اپنی طرف سے بھی صفائی کر دی تھی۔

ڈاکٹر محمد صادق

احمد ندیم قاسمی کا شمار صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے اور پاکستان کے کسی بھی گزشتہ یا موجودہ ادیب کے مقابلے میں ان کے یہاں اچھی کہانیوں کی تعداد زیادہ ہے۔

احمد ندیم قاسمی حقائق کی زبان ہی سے سب کچھ کہلواتے ہیں اور پڑھنے والے پر خود کو تھوپنے کی کوشش نہیں کرتے۔ جیساکہ بہ یم چند عموماً کرتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی کہانیوں کا مجموعی تاثر کم کر دیتے ہیں۔ وہ معروضی نقطۂ نگاہ سے زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مواد کے انتخاب اور اس کی پیش کش سے اس امر کی نشان دہی ہوتی ہے کہ وہ زندگی کو کس طرح دیکھتے ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ ان کی قدرتِ مکالمہ نگاری ہے۔ ان کی کہانیوں کی عورتیں اور مرد بولتے ہوئے کردار ہوتے ہیں اور یہی عمل ان کی کہانیوں کو حقیقی بنا دیتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی زندگی کے ایک خاموش اور فکر انگیز تماشائی ہیں۔ وہ زندگی کو جیسا دیکھتے ہیں ویسی ہی اس کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی پختہ تخلیقات میں نمود و نمائش یا مبالغہ کا عنصر بہت کم ہے۔

(انگریزی مضمون سے ایک اقتباس)

سید الطاف علی بریلوی

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔ کراچی

محبی و مکرمی جناب صہبا صاحب ——— السلام علیکم!

نامۂ گرامی مورخہ ۷ر مارچ سے یہ معلوم ہو کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ عنقریب "افکار" کا "ندیم نمبر" نکالنے والے ہیں۔ اور کہ بس اس کے لیے کوئی پیغام لکھ کر آپ کو ارسال کروں۔

علامہ سید سلیمان ندوی صاحب مرحوم نے اپنے مختصر قیام کراچی کے دوران ایک کتاب "یاد رفتگاں" شائع کی تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے تمام باکمالوں کے بارے میں وہ شذراتِ تعزیت یک جا کیے تھے جو انھوں نے "معارف" اعظم گڑھ میں وقتاً فوقتاً چھاپے تھے۔

قریب قریب ہر صاحب کمال کی وفات پر یہی لکھا کہ اب اس کی جگہ لینے والا دوسرا پیدا نہ ہوگا اور فضل و کمال کی جو جگہ خالی ہوئی ہے۔ وہ کبھی پُر نہ ہو سکے گی۔ لیکن میرا ناچیز نظریہ ہے کہ یہ بات خلاف فطرت ہے۔ کوئی زمانہ باکمالوں سے خالی نہیں رہتا۔ حالات و ضروریات زمانہ کے مطابق "قدرت پہلے لوگوں سے بھی اچھے آدمی پیدا کرتی رہتی ہے۔

لاہور کی بڑی بڑی قابل ہستیاں ہماری اپنی یاد میں پیوند خاک ہو گئیں۔ لیکن پھر بھی " لاہور لاہور ہے"۔ آج بھی وہاں بکثرت مشاہیر علم و ادب کا نہ صرف اجتماع ہے بلکہ روز افزوں اجتماع ہے۔ ان قابلِ قدر ہستیوں میں جناب احمد ندیم قاسمی ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ قدرت نے نثر و نظم پر جو دسترس ان کو بخشی ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ ان کی تحریر دل کا سوز و گداز نیز معنی آفرینی کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ میری احمد ندیم قاسمی صاحب سے بالمشافہ کبھی ملاقات نہ ہوئی اور ہمیشہ آرزو ہی رہی کہ کبھی لاہور جانا ہو تو ان کی خدمت میں حاضری دی جائے۔ مگر پھر خیال آیا کہ وہ بے انتہا مصروف ہوں گے، بے مقصد ملاقات ان کے ضیاع وقت کا باعث ہوگی۔ تاہم ٹی۔ وی کی بدولت میری محرومی کی کافی تلافی ہو جاتی ہے اور جب بھی وہ نظر آتے ہیں تو ان کی درازیٔ عمر کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔

مزید کیا عرض کروں "چہ کند بے نوا ہمیں دارد" لیجیے میں نے آپ کی فرمائش پوری کر دی۔ اللہ حافظ۔ مخلص

سید الطاف علی بریلوی
مدیر "العلم"

سید ضمیر جعفری

احمد ندیم قاسمی ہماری ادبی تاریخ میں ایک ستون، ایک مینار، ایک سنگِ میل، ایک تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (اور یہ سب کچھ وہ ہمارے دیکھتے دیکھتے بلکہ روکتے روکتے بن گئے ہیں) زندگی نے، اُن کے فن وفکر سے توانائی بھی حاصل کی ہے اور رعنائی بھی۔ وہ انسان کی عظمت اور محبت کے شاعر ہیں۔ ذرّوں میں ستارے بننے کی یہ جو ایک امنگ آج نظر آ رہی ہے اس میں ندیم کے دل کی روشنی بھی شامل ہے۔ اُردو زبان وادب کی خالص گنگا جمنی فضا کو، راوی، چناب، جہلم اور سندھ کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کرنے میں ندیم کے شعروافسانہ نے ایک عہد ساز کردار ادا کیا ہے۔ ہمارے دَور کو ندیم کا ممنون ہونا چاہیے بلکہ میرے محترم دوست (اُردو کے البیلے مزاح نگار) کرنل محمد خاں صاحب کے بقول یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ——— "ندیم اُردو ادب کا سب سے بڑا تو میا یا ہوا بنک ہے۔ ہم سب اس کے مقروض ہیں" اور اس بات میں کیا شبہ ہے کہ اقبال کے بعد عصرِ جدید میں جو دو چار شاعر ماہ وسال کی مسند پر ایک دوسرے کے دوش بدوش بیٹھنے کے لائق ہوتے ہیں، اُن میں ندیم شامل ہیں۔

چند برس بیشتر، راولپنڈی میں ہم لوگوں نے جناب قدرت اللہ شہاب کی قیادت میں ندیم صاحب کے ساتھ ایک "شام" منائی تھی، جو اگلی صبح تک روشن سے روشن تر ہوتی چلی گئی تھی۔ اس تقریب میں ان پر ایک مضمون میں نے بھی پڑھا تھا۔ عنوان تھا۔ "اردو ادب کا ہنسگلا ڈیم" وہ مضمون ابھی تک غیر مطبوعہ پڑا تھا۔ میری خواہش تھی کہ وہ مضمون "افکار" کے ندیم نمبر میں شامل ہو جائے۔ لیکن اُس کی نقل میرے پاس موجود نہ تھی۔ دراصل مسودہ ندیم صاحب سے ہوتا ہوا، ہمارے ایک اور عزیز دوست کے قبضے میں چلا گیا تھا، جو بذاتِ خود ندیم کے فکر وفن پر ایک مبسوط کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ میں ابھی تک اس اُمید میں تھا کہ میرا وہ مضمون مجھے مل جائے گا۔ کہ دفعتاً نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ ابھی کچھ دیر پہلے جب میں مجتبیٰ سلطان رشک (مدیر نیرنگ خیال) سے ملنے اُن کے ہاں آیا تو انھوں نے کہا۔ "آپ اپنے آپ کو حراست میں سمجھیں" معلوم ہوا۔ صہبا صاحب نے اُن کو فون کر رکھا تھا کہ ضمیر ہاتھ آ جائے تو جانے نہ پائے۔ ندیم نمبر کے لیے کچھ نہ کچھ لکھوا کر ہی چھوڑنا۔ آخری کاپیاں پریس سے نکل رہی ہیں۔ سو، میں یہ سطور "حراست" میں لکھ رہا ہوں۔ مگر یہ میری اپنی محبت کی حراست ہے۔

اللہ ارادت کے ہاتھوں میرے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے ہیں۔ ندیم دل میں اتر جانے والا ادیب ہے، تو روح میں سما جانے والا انسان بھی ہے۔ اُن کی وسیع انسانی ہمدردی، اور طبیعت کی کشادگی اور ملائمت پر بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ وہ مٹی کا نہیں، ریشم کا بنا ہوا ہے۔ وہ ادب میں اگر ہمارا "مانیٹر" ہے تو ذاتی طور پر نہایت من موہنا دوست بھی ہے۔ اُس کا ذکر کرتے ہوئے، میں ایک ایک جملہ چوم چاٹ کر لکھنا چاہتا تھا۔ مگر اس وقت عجلت اور بوکھلاہٹ کی وجہ سے کیفیت کچھ اس طرح کی ہے، جس طرح کوئی بھاگتا، ہانپتا کانپتا مسافر ریلوے اسٹیشن کے پھاٹک پر ہو اور گاڑی چھوٹ چکی ہو۔ یا پھر کرکٹ کا "دبی" اُکھڑا ہوا اُفسر، پھٹر کھلاڑی جو ہر گیند پر کیچ "ہوتے ہوتے بچ رہا ہوں"۔ تو جناب، اس وقت میں جو لکھا جا سکا ہے، مضمون تو خیر قطعاً نہیں ہے، نہ یہ پیغام ہے، کرکسرِ نفسی سے اگر قطع نظر بھی، پیغام دینے کے لیے جس علمی تن وتوش اور یک ذہنی

قسم کے "ادبی ہیڈ کوارٹر" کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مجھے میسر نہیں ہے۔ یہ تو ندیم کو میرا سلام ہے۔ میری ارادت کا سلام!

مرزا ظفر الحسن

احمد ندیم قاسمی پیر بھی ہیں اور غالب کے رشتے سے پیر بھائی بھی۔ سخن فہم ہی نہیں غالب کے بہت بڑے طرف دار بھی۔ شاعر، افسانہ نگار، مدیر، کالم نویس، کتابیں چھاپنے والے ادارے کے سربراہ اور کتابیں چھپوانے والوں کے سرپرست بھی۔ اخبار، ڈرامہ، ریڈیو، ٹی وی غرض ابلاغ عام کے تمام ذرائع موصوف کی دسترس میں ہیں۔ نثر اور نظم دونوں سے یکساں سلوک اور دونوں پر یکساں عبور کی اپنی آپ مثال۔ ایسی ہمہ صفت شخصیت کے تعلق سے خاص نمبر نکالنے کے لیے جس جنون کی ضرورت ہے وہ مدیر افکار ہی میں ملتا ہے۔ فیض جیسے کم نویس اور قاسمی جیسے پُر نویس دونوں کے خاص نمبر نکالنے کا سلیقہ صرف صہبا لکھنوی کو آتا ہے۔

میری اور ادارۂ یادگارِ غالب کے تمام ارکین کی نیک تمنائیں افکار کے قاسمی نمبر کے لیے وقف ہیں جس کا ایک خاص فائدہ یہ بھی ہوگا کہ احمد ندیم قاسمی کی اپنی تخلیقات اور ان پر جو مضامین لکھے گئے ہیں ان سب کو غالب لائبریری کے لیے جمع کرنے میں سہولت ہوگی ورنہ ہمارے اس کام میں بے شمار الجھنیں ہوتیں اور تاخیر بھی۔ اب شعبۂ احمد ندیم قاسمی کی تکمیل زیادہ آسانی کے ساتھ اور جلدی ہو سکے گی۔



آدم کا بھرم ندیم سے ہے



کسی تصور سے پہلے پہلے ندیم کا ہمکلام ہونا



ندیم ۔ اپنے بڑے بھائی م۔ ب پیرزادہ کے ساتھ ــــ سنہ ۱۹۴۰ء کی ایک یادگار تصویر









تمام دہر کا دولھا ہوں میں ندیم ہوں میں





میں شاعر ہوں بس اتنا جانتا ہوں

علاقائی لباس میں
ندیم کی تین تصویریں



ندیم، اپنے ایک بھتیجے
سید محمد قاسم کے ساتھ
(اگست ۱۹۶۸ء)



ندیم ۔ اور ان کے بڑے بھائی م۔ ب پیرزادہ
(جولائی ۱۹۶۷ء)





ندیم اپنے بچوں کے ساتھ (دائیں سے) نشاط ندیم - نعمان ندیم - ناہید ندیم (اکتوبر [illegible])



ندیم۔ نعمان ندیم کے تسمے باندھ رہے ہیں۔ جب شعر پاس بیٹھے ہیں (۱۹۶۲ء)



باپ اور بیٹا ــــ ایک مطالعہ



ندیم اور نعمان ندیم ــ (نومبر ۱۹۷۲ء)



ندیم اپنی بہنوں خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے ساتھ (نومبر ۱۹۶۱)

تقریباً ربع صدی پہلے کی ایک خاندانی تصویر

دائیں سے:
م۔ ب۔ پیرزادہ (ندیم کے بڑے بھائی)
ظہیر بابر (ندیم کے بھتیجے)
اور ندیم

انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور کے زیر اہتمام منعقدہ یوم غالب ۱۹۵۰ء کے موقع پر ترقی پسند اہل قلم کا ایک یادگار گروپ فوٹو



(فرش پر۔ دائیں سے) صفدر میر، ابراہیم جلیس، احمد راہی، جاوید قمر۔ (کرسیوں پر۔ دائیں سے) سید انور، ندیم، قتیل شفائی (کھڑے ہوئے۔ دائیں سے) — عارف جلالی، عارف عبدالمتین، ظہور نظر

بابائے اردو ـ پروگریسو پیپرز لاہور کے دفاتر میں

(دائیں طرف سے) سید سبط حسن (ایڈیٹر لیل و نہار) مولوی عبدالحق ـ مظہر علی خان (ایڈیٹر پاکستان ٹائمز) احمد ندیم قاسمی (ایڈیٹر امروز) میاں محمود احمد (جنرل منیجر پاکستان ٹائمز)

سید وقار عظیم کے مکان پر مجلس مشاورت کے ۱۹۵۸ء میں ایک یادگار گروپ فوٹو

(دائیں سے) کرسیوں پر: ندیم ـ جگر مراد آبادی، حکیم عبدالجلیل، ڈاکٹر صاحب، ... ـ رکھے ہوئے: حمید ہاشمی، ... صدیقی، کلیم عثمانی، حسن کلیم، پروفیسر ...، شفیق ...، خورشید ...، احسن ...، اشفاق، ایوب شاہد، نسیم اور دیگر۔

پاکستان رائٹرز گلڈ لاہور کے زیر اہتمام روسی ادیبوں کے وفد کا خیر مقدم

دائیں سے، رفعت ملک، اندریک، صوفی تبسم، رکن وفد، رکن وفد، رکن وفد، کنٹرریہ یاتانا، میرزا ادیب، وفد کا قیری، قتیل شفائی

پیکنگ کے قریب ایک دیہی کوآپریٹو فارم پر پاکستانی صحافیوں کے وفد کا اجتماع

دائیں سے چھٹے نمبر پر احمد ندیم قاسمی اور بائیں سے چھٹے نمبر پر فیض احمد فیض

جہلم کے ایک مشاعرے میں — دائیں سے، ابوالاثر حفیظ، سید ضمیری، سلطان رشک، قتیل شفائی اور ندیم۔

ملتان میں قدرت اللہ شہاب کے ساتھ ایک شام ۔ ۱۹۶۸ء صدارت احمد ندیم قاسمی (دائیں سے پہلے نمبر پر) سردار عبدالجبار صدر بزم ثقافت ملتان

(دائیں سے) بیگم ایلس فیض، معروف جرنلسٹ اقبال سنگھ، فیض احمد فیض (ایڈیٹر پاکستان ٹائمز) احمد ندیم قاسمی (ایڈیٹر امروز)

(دائیں سے) فارغ بخاری، مشہور آرٹسٹ وجد، احمد ندیم قاسمی اور رضا ہمدانی

: سن رائٹرز کلب لاہور کے استقبالیہ کا ایک دلچسپ منظر (۲ اکتوبر):

ندیم — مسز بی آر گراڈن کے ہمراہ — جو ایشیائی سوسائٹی (نیو یارک) کے رکن کی حیثیت سے لاہور آئی تھیں۔

فن
اور
فنکار
★
مشہور
آرٹسٹ
زوبی
احمد ندیم قاسمی
کا
مجسمہ
بنا رہے ہیں



دائیں سے
[illegible]
ہاجرہ مسرور
احمد ندیم قاسمی
[illegible]
[illegible]



محکمۂ تعلیم لاہور کے
زیرِ اہتمام تعلیمی سمینار
(۵ فروری ۱۹۷۳ء)
دائیں سے :-
ڈاکٹر لطیف
صوفی تبسم
احمد ندیم قاسمی
اور
شفیع محمد ملک



مظفر آباد (آزاد کشمیر)
کے ایک مشاعرہ میں
ندیم اپنا کلام سنا رہے ہیں
بائیں سے :-
[illegible]
مظفر وارثی
[illegible]
اور
[illegible]



کراچی میں احمد ندیم قاسمی
اپنے مرحوم دوست
ایوب احمد کرمانی کے ساتھ
(سنہ ۱۹۵۲ء)



لاڑکانہ کے کل پاکستان
مشاعرہ کا ایک گروپ
(۱۹ر نومبر سنہ ۱۹۶۶ء)
کرسیوں پر دائیں سے :-

قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی
اور صمد رضوی ساز (مرحوم)

کھڑے ہوئے دائیں سے :-
شوکت عابدی، حمایت علی شاعر
سید احمد، احمد دھلوی
اور محسن مہربانی

پنجاب یونیورسٹی کی مجلس ادب کے زیر اہتمام
"ادیب اور فنکار کے فرائض"
پر مجلس مذاکرہ کا ایک گروپ فوٹو، ۱۰ مئی ۱۹۷۰ء



(دائیں سے) منیر نیازی - مہمان خصوصی - ندیم اور ڈاکٹر انور سجاد



ناصر کاظمی اور ندیم ڈھاکے میں (۱۹۶۲ء)



امجد اسلام امجد اور احمد ندیم قاسمی پنجاب یونیورسٹی لٹریری سوسائٹی کے
سالانہ مشاعرے "یادگار غالب" میں



لائل پور کے مزدور افسانہ نگار قمر یورش - ندیم کو اپنا افسانہ سنا رہے ہیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام شعراء کا ایک یادگار اجتماع (۱۹۶۲ء)



اگلی صف میں فرش پر بیٹھی ہوئی خواتین میں ام عمارہ اور بانو اختر شہود شامل ہیں ۔ کرسیوں پر دائیں سے : ڈاکٹر حنیف فوق ، نظیر صدیقی ، ناصر کاظمی ، ندیم ، رئیس امروہوی ، جوش ، قتیل شفائی ، ڈاکٹر محمود حسین ، ڈاکٹر عندلیب شادانی ، اور آخر میں ڈاکٹر معز الدین آسانی سے پہچانے جا سکتے ہیں۔



مادام سن یات سن کی آمد پر لاہور میں میاں افتخار الدین کی دعوت کا ایک منظر

دائیں سے: حمید اختر، ندیم، ہاجرہ مسرور، میاں افتخار الدین، مادام سن یات سن، مظہر علی خاں، فیض احمد فیض، افتخار علی ظہیر بابا، احمد علی خاں



سرگودھا کے مشاعرہ کا ایک گروپ فوٹو

(دائیں سے پہلی صف میں) محسن احسان، جعفر طاہر، وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، ایئر مارشل ظفر چودھری، ضمیر جعفری، غلام جیلانی اصغر، حمد نزد، کشور ناہید، رشید قیصرانی، سلطان رشک (دوسری صف میں) منیر، سعید، سجاد نقوی، جمیل یوسف، نور سعید، مشتاق قمر، رشید نثار، اختر جاوید، فتح محمد ملک اور افضل منہاس نظر آرہے ہیں۔



انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کانفرنس میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق پہلے کھلے اجلاس کی صدارت کر رہے ہیں اور انجمن کے جنرل سکریٹری احمد ندیم قاسمی کانفرنس کے نام موصولہ پیغامات سنا رہے ہیں
(کراچی ۱۲ جولائی ۱۹۵۲ء)

ملتان برنس کلب کے زیر اہتمام ۳ روزہ مشاعرہ منعقدہ ۲ نومبر ۱۹۶۵ء ایک گروپ فوٹو

احمد ندیم قاسمی صدر جلسہ اپنی مشہور نظم "۶ ستمبر" سنا رہے ہیں۔ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے حضرات میں خالد شیرازی، قتیل، عرش صدیقی، استاد دامن، شہرت بخاری، حافظ لدھیانوی، مسعود اشعر اور حمایت علی شاعر بھی شامل ہیں



ڈنبور کے ایک مشاعرے میں فیض کی صدارت ۔ ندیم کا کلام



ملتان کی ایک شام (دسمبر ۱۹۷۳ء) مسعود اشعر، ندیم، محمد خالد اختر اور ظہور نظر



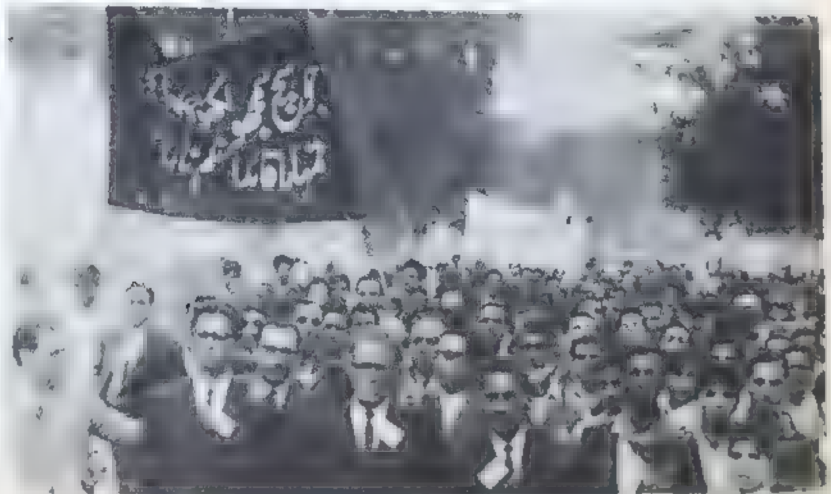
احمد ندیم قاسمی کے اعزاز میں ایوان اردو کراچی کے استقبالیہ کا گروپ فوٹو (۲۸ فروری ۱۹۷۷ء) حمید الدین شاہد، ابراہیم جلیس، ہاجرہ مسرور، مسلم ضیائی
پروفیسر ممتاز حسین نظر آ رہے ہیں۔

عوامی جمہوریہ چین کے دورے کی ایک تصویر۔ امپیریل پیلس ہوٹل میں ندیم سفید کوٹ اور دھاری دار ٹائی میں نظر آرہے ہیں۔





مزار اقبال پر۔ موجد، ندیم اور حکیم حبیب اشعر



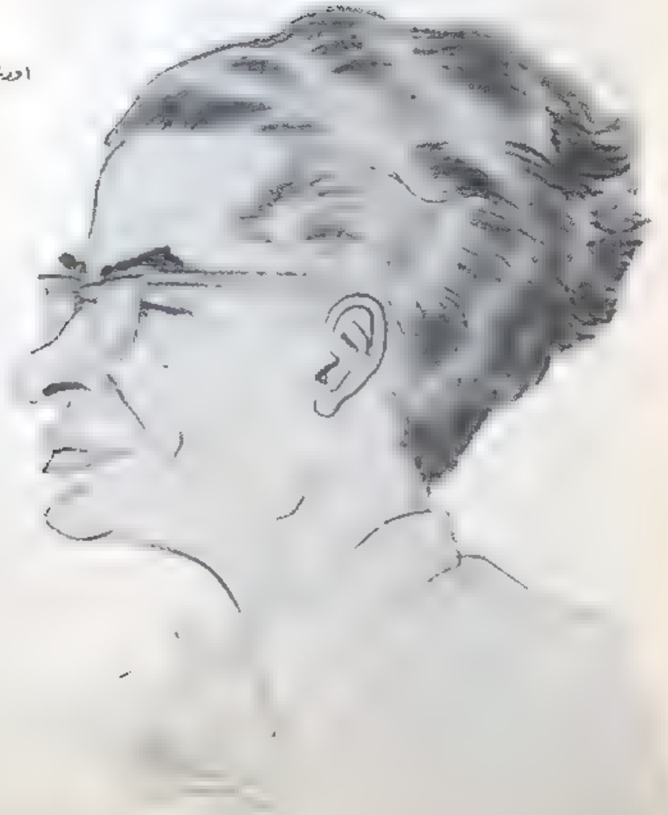
ایوب حکومت کے خلاف ۱۲ دسمبر ۱۹۶۸ء کو لاہور کے ادیبوں کا احتجاجی جلوس شاہراہ قائداعظم سے ندیم کی قیادت میں گزر رہا ہے۔ گروپ فوٹو میں ندیم کے علاوہ احمد راہی، شہزاد احمد، حبیب جالب، عابد حسن منٹو، محمد حنیف رامے اور افتخار جالب پہچانے جا سکتے ہیں۔





ندیم
اسحٰق شور
خاطر غزنوی
اور عزیز کارٹونسٹ
کی نظر میں







اک دہکتا ذہن بھی ہوں، اک سلگتا دل بھی ہوں

اذنِ کلام

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذنِ کلام

ندیم

پسِ آئینہ

مجھے جمالِ بدن کا ہے اعتراف، مگر
میں کیا کروں کہ ورائے بدن بھی دیکھتا ہوں

یہ کائنات فقط ایک رُخ نہیں رکھتی
چمن بھی دیکھتا ہوں اور بن بھی دیکھتا ہوں

مری نظر میں ہیں جب حُسن کے تمام انداز
میں فن بھی دیکھتا ہوں، مکرِ فن بھی دیکھتا ہوں

نکل گیا ہوں فریبِ نگاہ سے آگے
میں آسماں کو شکن در شکن بھی دیکھتا ہوں

وہ آدمی کہ سبھی روئے جس کی میّت پر
میں اس کو زیرِ کفن خندہ زن بھی دیکھتا ہوں

میں جانتا ہوں کہ خورشید ہے جلال مآب
مگر غروب سے خود کو رہائی دیتا نہیں

میں سوچتا ہوں کہ چاند اک جمال پارہ ہے
مگر وہ رُخ، جو کسی کو دکھائی دیتا نہیں

میں سوچتا ہوں، حقیقت کا یہ تضاد ہے کیا
خدا، جو دیتا ہے سب کچھ، خدائی دیتا نہیں

وہ لوگ ذوق سے عاری ہیں، جو یہ کہتے ہیں
کہ اشک لوٹتا ہے اور سنائی دیتا نہیں

بدن بھی آگ ہے اور روح بھی جہنم ہے
مرا قصور یہ ہے، میں دہائی دیتا نہیں

ندیم

سیّاح کی ڈائری کا ایک ورق

یوں تو جنگل کا گھنا پن ہے بلا کا، لیکن
ان گرانڈیل درختوں پہ نہ پتّے ہیں نہ پھول
یوں تو یہ ٹھنٹھ، ستاروں کی خبر لاتے ہیں
دیکھ لے اِن کو، تو ہنسنے لگے صحرا کی ببول

کتنی شاخیں ہیں، مگر کوئی شگوفہ ہی نہیں
جو نمو کا نہ سہی، حسن کا اظہار کرے
ایک چڑیا بھی نہیں ہے جو اُڑانیں بھر کر
سالہا سال کے سنّاٹوں کو بیدار کرے

یہ وہ جنگل ہے جو جنگل کی روش بھول گیا
اسی عالم میں اسے کتنے ہی جُگ بیتے ہیں
کچھ یہاں ہے، تو درختوں کے کرودوں نیچے
یاوہ کیڑے، کہ جڑوں کا جو لہو پیتے ہیں

ندیم

غرق ہو کر اُبھرنے کی ایک کہانی

سمندر کنارے کے اک گاؤں میں
کچھ عجب سی حکایات مشہور تھیں
ایک یہ تھی
کہ مدت ہوئی
بط کی صورت کی اک سُرخ کشتی
ہرے جنگلوں سے لدے اُس جزیرے کے ساحل سے نکلی
اِدھر نیلے پھولوں کے غرغل میں لپٹے ہوئے اِس جزیرے کی جانب رواں تھی

یہ سب لوگ بارات لے کر گئے تھے
دلہن لے کے واپس چلے تھے
دُلہن اُس مچھیرے کی بیٹی تھی، جو بعد میں کفر بکتا ہوا مر گیا تھا
یہ لڑکی مچھیرن تھی، پر ہو بہو جل پری تھی
کہ جو حسن اس کے لبوں، اس کی آنکھوں میں جھلمل جھلکتا تھا
جو حُسن اس کے بدن میں تھا

جو حسن اس کی صدا میں تھا
جو حسن اس کی محبت میں تھا
آج تک اس سے انسان محروم ہیں

جب یہ کشتی نفیری کی آواز میں لپٹی لپٹائی چلنے لگی
اور مچھیرن کے سینے میں
دولھا سے
اک جست بھر کر
لپٹنے کی خواہش مچلنے لگی
تو وہ طوفان آیا
جسے لوگ اب تک عناصر کا شہکار کہتے ہیں

پھر یوں ہوا
جب یہ طوفاں تھما
دور اُفق تک فقط ہانپتا، ناچتا، موج در موج پانی تھا
اور کچھ نہ تھا

لوگ کہتے ہیں
وہ جس نے طوفان بھیجا ہے
کشتی ڈبوئی ہے

اس پر بھی قادر ہے
اک روز کشتی ترا دے
سو مدّت ہوئی
صبح سے شام تک شام سے صبح تک لوگ اُفق تا اُفق اور کراں تا کراں دیکھتے ہیں
کہ شاید کسی موج نے اپنی قدرت دکھائی ہو
کشتی اُبھر آئی ہو

چاندنی رات تھی
اور میں اِس حکایت سے مسحور
ساحل پہ بیٹھا
سمندر کی موجوں پہ کرنوں کے خاکوں میں وہ جل پری دیکھتا تھا
کہ جس کے لبوں اور آنکھوں میں جھلمل جھلکتا ہوا حُسن
انسان کے حسن سے مختلف حسن تھا
اور ابھی مجھ سے اس کے بدن اور اس کی صدا اور اس کی محبت کے سب رنگ سمٹے نہیں تھے
جب اک موج کا کوہسار گراں اپنی جانب رواں دیکھ کر میں اُٹھا
اور پلٹنے کو تھا
جب یہ کشتی نمایاں ہوئی ۔ بط کی صورت کی اک سرخ کشتی
جسے سطح پر، آخرِ کار، قدرت اُٹھا لائی تھی
یہ الگ بات ہے ۔ اہلِ کشتی کو بھول آئی تھی

ندیم

دوری

تو بہت دُور ہے
اور دُوری خدا ہے
مگر تُو خدا تو نہیں ہے
خدا لمس سے ماورا ہے
تجھے میں نے چھو کر بھی دیکھا ہے
بانہوں میں لے کر سمیٹا بھی ہے
تجھ کو سوچا بھی ہے اور سمجھا بھی ہے
تو فقط دُور ہے
تو خدا کی طرح دُور ہے

میں نے دُوری کے اعجاز دیکھے ہیں
انسان نے دُور پا کر خدا کو
اسے ان گنت دیوتاؤں میں بدلا ہے
پھر ان گنت بُت بنائے ہیں
اُن کے لبوں پر سکوتِ مسلسل کی مہریں لگائی ہیں
صدیوں کے یخ فرش پر ان بُتوں کی قطاریں سجائی ہیں

اور تُو دھڑکتی ہوئی زندگی کی حرارت سے لبریز ہے
تیری نس نس میں گاتا لہو دوڑتا ہے
مساموں سے بُو پھوٹتی ہے
لبوں پہ صدا ہے
بدن رقص کا زاویہ ہے
تو انسان ہے، یعنی تو رنگ ہے، شاعری ہے، غنا ہے

سُنا ہے کہ انسان اگر دُور جاتے بھی ہیں
لوٹ آتے بھی ہیں
تُو خدا بھی نہیں
تُو کوئی دیوتا بھی نہیں
اور اس پر ستم یہ کہ تُو لوٹتا بھی نہیں



ندیمؔ

بیسویں صدی کا انسان

مجھے سمیٹو
میں ریزہ ریزہ بکھر رہا ہوں
نہ جانے میں بڑھ رہا ہوں
یا اپنے ہی غبارِ سفر میں ـــ ہر پَل اُتر رہا ہوں
نہ جانے میں جی رہا ہوں
یا اپنے ہی تراشے ہوئے نئے راستوں کی تنہائیوں میں ہر لحظہ مر رہا ہوں

میں ایک پتھر سہی، مگر ہر سوال کا 'بازگشت بن کر' جواب دوں گا،
مجھے پکارو، مجھے صدا دو
میں ایک صحرا سہی، مگر مجھ پہ گِھر کے برسو
مجھے مہکنے کا ولولہ دو
میں اک سمندر سہی، مگر آفتاب کی طرح مجھ پہ چمکو
مجھے بلندی کی سمت اُڑنے کا حوصلہ دو

مجھے نہ توڑو کہ میں گُلِ تر سہی
مگر اوس کی بجائے لہو میں تر ہوں
مجھے نہ مارو
میں زندگی کے جمال اور گہما گہمیوں کا پیامبر ہوں
مجھے بچاؤ، کہ میں زمیں ہوں
کروڑوں کُرّوں کی کائناتِ بسیط میں صرف میں ہی ہوں جو خدا کا گھر ہوں

ندیم

فنا کی سمت ہے رُخ زندگی کے دھارے کا
مری نظر کو نہیں حوصلہ نظارے کا

ابھی کچھ اور بھی اصنام ڈھائے جائیں گے
کہ آدمی ابھی محتاج ہے سہارے کا

فضائے عصرِ رواں میں رچی ہے دم زدگی
غزال بھول گئے ہیں چلن طرارے کا

حیات، برف کے کہسار کھودنے میں کٹی
مجھے گماں سا ہوا تھا یہاں شرارے کا

میں اشک پونچھ تو لوں شب گزیدہ آنکھوں سے
میں منتظر ہوں تری صبح کے اشارے کا

گواہ ہے، کہ کبھی ڈوبتا نہیں خورشید
بس اتنا کام ہے ظلمات میں ستارے کا

محبت ایک سمندر ہے، وہ بھی اتنا بسیط
کہ اس میں کوئی تصور نہیں کنارے کا

ندیمؔ فن کے مجھے پینترے نہیں آتے
جو بات حق ہو تو کیا کام استعارے کا

ندیم

کہیں وہ میری محبت میں گھُل رہا ہی نہ ہو
خدا کرے، اسے یہ تجربہ ہوا ہی نہ ہو

سپردگی مرا معیار تو نہیں، لیکن
میں سوچتا ہوں، ترے روپ میں خدا ہی نہ ہو

میں تجھ کو پا کے بھی کس شخص کی تلاش میں ہوں
مرے خیال میں کوئی ترے سوا ہی نہ ہو

وہ حذر کر کہ مرے دل کو بھی یقیں آ جائے
وہ گیت گا کہ جو میں نے کبھی سُنا ہی نہ ہو

وہ بات کر جسے پھیلا کے میں غزل کہہ لوں
سُناؤں شعر جو میں نے ابھی لکھا ہی نہ ہو

سحر کو دل کی طرف یہ دھواں سا کیسا ہے
کہیں یہ میرا دیا رات بھر جلا ہی نہ ہو

ہو کیسے جبرِ مشیت کو اس دعا کا لحاظ
جو ایک بار ملے، پھر کبھی جُدا ہی نہ ہو

یہ ابر و کشت کی دنیا میں کیسے ممکن ہے
کہ عمر بھر کی وفا کا کوئی صِلہ ہی نہ ہو

مری نگاہ میں وہ پیڑ بھی ہے بد کردار
لدا ہوا ہو جو پھل سے، مگر جُھکا ہی نہ ہو

جو دشت دشت سے پھولوں کی بھیک مانگتا تھا
کہیں وہ توڑ کے کشکول، مر گیا ہی نہ ہو

طلوعِ صبح نے چمکا دیے ہیں ابر کے چاک
ندیمؔ یہ مرا دامانِ مدعا ہی نہ ہو

ندیم

نئے انساں کی جو رعنائی ہے
ادھ کھلی نیند کی انگڑائی ہے

لفظ معنی سے جدا اُس کے بغیر
وہ مری قوتِ گویائی ہے

اس کو تکتا ہوں کہ دم توڑتا ہوں
آنکھ روشن ہے کہ پتھرائی ہے

کتنا سادہ ہوں، کہ میں سمجھا تھا
دن حریفِ شبِ تنہائی ہے

روز مرتا ہوں تو جیتا بھی ہوں
یہ مرا شغلِ مسیحائی ہے

آئینہ لا کے مقابل رکھ لے
زندگی انجمن آرائی ہے

میرا بھائی بھی ہے دشمن میرا
میرا دشمن بھی مرا بھائی ہے

موت کشتوں کے لگائے پشتے
اور خدا ہے کہ تماشائی ہے

برگِ گل تھا سرِ سیلاب ہوا
جستجو دشت میں لے آئی ہے

لوگ شہروں میں بھی تنہا کیوں ہیں
رُخ پہ کیوں وحشتِ صحرائی ہے

کس نے دنیا کی حقیقت سمجھی
جس نے سمجھی وہی سودائی ہے

روشنی کے لیے گھر پھونک دیا
میری دشمن مری دانائی ہے

کتنی صدیوں سے میں پیاسا ہوں ندیم
کتنی صدیوں سے گھٹا چھائی ہے

ندیم

اک بُت مجھے بھی گوشۂ دل میں پڑا ملا
واعظ کو وہم ہے کہ اسی کو خدا ملا

حیرت ہے، اُس نے اپنی پرستش ہی کیوں نہ کی
جب آدمی کو پہلے پہل آئینہ ملا

خورشیدِ زندگی کی تمازت، غضب کی تھی
تو راہ میں ملا تو شجر کا مزا ملا

مجھ سے بچھڑ کے، یوسفِ بے کارواں ہے تو
مجھ کو تو خیر، درد ملا، تجھ کو کیا ملا

دن بھر جلائیں میں نے اُمیدوں کی مشعلیں
جب رات آئی، گھر کا دیا تک بجھا ملا

یارب! یہ کس نے ٹکڑے کیے روزِ حشر کے
مجھ کو تو گام گام پہ محشر بپا ملا

ماضی سے یوں تو مجھ کو عقیدت رہی مگر
اس راستے میں جو بھی نگر تھا، لُٹا ملا

دشتِ فراق میں وہ بصیرت ملی ندیمؔ
جو مجھ سے چھن گیا تھا، وہی جابجا ملا

ندیم

اتنی بلندیوں سے، تہوں میں اُتر نہ جا
احسان کر چکا ہے تو احسان دھر نہ جا

پتھرا گئی ہیں در پہ جو آنکھیں لگی ہوئی
کترا کے اُن سے، شہرِ وفا سے گزر نہ جا

ہر شخص تجربات کی دنیا ہے۔ سب سے مل
دانائیاں سمیٹ کے پیارے! بکھر نہ جا

میں نے کہا نہ تھا کہ طلسمِ انا نہ توڑ
اب اپنا سامنا جو کیا ہے تو ڈر نہ جا

اس شہرِ ناسپاس میں ہیں سنگ زن سبھی
بلور کے لباس میں بیرونِ در نہ جا

دنیا کو ایک طُرفہ تماشا سمجھ کے دیکھ
اس آئنے کے سامنے، باچشمِ تر نہ جا

عزمِ سفر کیا ہے تو رختِ سفر بھی باندھ
منزل ہے آسمان، تو بے بال و پر نہ جا

دل میں اٹھا ہے درد، تو اظہارِ درد کر
آنسو اُمڈ پڑے ہیں تو منہ پھیر کر نہ جا

صحرائے بے جہت سے حرم کا بھی رُخ نہ کر
دعویٰ جنوں کا ہے تو کسی کے بھی گھر نہ جا

لاکھوں چراغ لا کہ ہوا تیز ہے۔ بہت
صرف اک دیا جلا کے سرِ رہ گزر نہ جا

برحق ہے موت اگر، تو ہے برحق حیات بھی
یوں جیتے جی تو موت کی ہیبت سے مر نہ جا

کھو جائے گی وہاں ترے گیتوں کی گونج بھی
دربارِ شاہ میں پئے عرضِ ہنر نہ جا

دستک سے دستِ فن کو نہ آلودہ کر ندیم
سب جا رہے ہیں جانبِ در، تُو مگر نہ جا

ندیم

کھڑا تھا کب سے زمیں پیٹھ پر اُٹھائے ہوئے
اب آدمی ہے قیامت سے لَو لگائے ہوئے

یہ دشت سے اُمڈ آیا ہے کس کا سیلِ جنوں
کہ حسنِ شہر کھڑا ہے نقاب اُٹھائے ہوئے

یہ بھید — تیرے سوا — اے خدا! کسے معلوم
عذاب ٹوٹ پڑے، مجھ پہ کس کے لائے ہوئے

یہ سیلِ آب نہ تھا، زلزلہ تھا پانی کا
بکھر بکھر گئے قریے مرے بسائے ہوئے

عجب تضاد میں کاٹا ہے زندگی کا سفر
لبوں پہ پیاس تھی، بادل تھے سر پہ چھائے ہوئے

سحر ہوئی تو کوئی اپنے گھر میں رُک نہ سکا
کسی کو یاد نہ آئے دیے جلائے ہوئے

خدا کی شان، کہ منکر ہیں آدمیت کے
خود اپنی سکڑی ہوئی ذات کے ستائے ہوئے

جو آستین چڑھائیں بھی، مسکرائیں بھی
وہ لوگ ہیں مرے برسوں کے آزمائے ہوئے

وہ آدمی ہوں، کہ پیوندِ خاک ہو کر بھی
تنا رہوں گا، سر افلاک سے ملائے ہوئے

یہ انقلاب تو تعمیر کے مزاج میں ہے
گرائے جاتے ہیں ایواں بنے بنائے ہوئے

یہ اور بات، مرے بس میں تھی نہ گونج اس کی
مجھے تو مدتیں گزریں یہ گیت گائے ہوئے

مری ہی گود میں کیوں کٹ کے گر پڑے ہیں ندیم
ابھی دعا کے لیے تھے جو ہاتھ اٹھائے ہوئے

ندیم

کتنے بہت سے رُوپ ہیں، حضرتِ آدمی کے بھی
ولولے داوری کے بھی، وسوسے کافری کے بھی

عشق جنوں سہی، مگر عشق فقط جنوں نہیں
ہوتے ہیں کچھ مطالبے، عشق سے، آگہی کے بھی

بُت شکنی کا مرتبہ، یوں تو بلند ہے، مگر
اپنے ہی خاص لطف ہیں، صنعتِ آذری کے بھی

یوں تو سمیٹ شوق سے، توشۂ آخرت، مگر
وہ جو ہیں زندہ، ان پہ کچھ قرض ہیں زندگی کے بھی

کیسے مرا فقیہہِ شہر میری سمجھ میں آسکے
دعوے قلندری کے بھی، رنگ سکندری کے بھی

یوں تو ہے شعر کا جمال، لفظ کا کے سے اتّصال
میں نے چکھے ہیں ذائقے اس میں پیمبری کے بھی

ظلمتِ عمر کاٹ دی میں نے یہ سوچ کر ندیم
چادرِ شب میں جا بجا، تارہیں روشنی کے بھی

ندیم

جب ترا حکم ملا، ترک محبت کردی
دل مگر اس پہ وہ دھڑکا کہ قیامت کردی

تجھ سے کس طرح میں اظہارِ تمنّا کرتا
لفظ سوجھا تو معانی نے بغاوت کردی

میں تو سمجھا تھا کہ لوٹ آتے ہیں جانے والے
تو نے جا کر تو جدائی مری قسمت کردی

تجھ کو پوجا ہے کہ اصنام پرستی کی ہے
میں نے وحدت کے مفاہیم کی کثرت کردی

مجھ کو دشمن کے ارادوں پہ بھی پیار آتا ہے
تیری اُلفت نے محبت مری عادت کردی

پُوچھ بیٹھا ہوں میں تجھ سے ترے کوچے کا پتہ
تیرے حالات نے کیسی تری صورت کردی

کیا ترا جسم ترے حسن کی حدّت میں جلا
راکھ کس نے تری سونے کی سی رنگت کردی

احمد ندیم قاسمی

چند یادیں

ندیم صاحب کا یہ یادگار مضمون ۔ دراصل اُن کی خودنوشت کا ایک حصہ ہے ۔ جس کی نقل شاید ندیم صاحب کے پاس بھی محفوظ نہیں ۔ یہ مضمون ۔ ماحول راولپنڈی میں چھپا تھا جو چند شماروں کے بعد بند ہو گیا ۔ اس قیمتی مضمون کی فراہمی کے لیے ہم فتح محمد ملک کے شکر گزار ہیں ۔

——————(صہبا)

میں اپنی زندگی کے موٹے موٹے واقعات کو اتنی بار دُہرا چکا ہوں کہ اب بار بار انہی کی تکرار بھدی معلوم ہوتی ہے ۔ اپنے قلم سے اپنے حالاتِ زندگی کبھی تفصیل سے لکھنے کا ارادہ ہے مگر یہ تفصیل سوانح نگاری کی وسعت چاہتی ہے اور اس کے لیے مہینوں کی فرصت چاہیے جو ان دنوں ناپید ہے ۔ البتہ میں آپ بیتی کے ضمن میں اپنی چند یادیں اور چند محسوسات پیش کیے دیتا ہوں جن کی میری زندگی سے وابستگی عیاں ہے ۔ محسوسات کا یہ مجمل تذکرہ تسلسل سے محروم نہیں ۔

میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس کے افراد اپنی روایتی وضع داری نباہنے کے لیے ریشم تک پہنتے تھے اور خالی پیٹ تک سو جاتے تھے ۔ بقول غالب ؏

خوں خوردنم نہفتہ و می خوردن آشکار

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مدرسے جانے سے پہلے میرے وہ آنسو بڑی احتیاط سے پونچھے جاتے تھے جو اماں سے محض ایک پیسہ حاصل کرنے میں ناکامی کے دُکھ پر بہہ نکلتے تھے ، لیکن میرے لباس کی صفائی ، میرے بستے کا ٹھاٹ اور میری کتابوں کی "گیٹ اَپ" کسی سے کم نہ ہوتی تھی ۔ گھر سے باہر احساسِ برتری طاری رہتا تھا اور گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سارے آبگینے چور ہو جاتے تھے جنھیں میری طفلی کے خواب تراشتے تھے ۔ پیاز یا سبز مرچ یا نمک مرچ کے مرکب سے روٹی کھاتے وقت "زندگی" بڑی سفاک معلوم ہونے لگتی تھی ۔ اور جب میں اپنے ہی خاندان کے بچوں میں کھیلنے جاتا تھا تو آنکھوں میں غرور ہوتا تھا اور دل میں غصہ ۔ خاندان کے باقی سب گھرانے کھاتے پیتے تھے ، زندگی پر ملمع چڑھائے رکھنے کا

تکلف صرف ہمارے نصیب میں تھا۔ والد گرامی پیر تھے۔ یادِ الٰہی میں کچھ ایسی استغراق کی کیفیتیں طاری ہونے لگیں کہ مجذوب ہوگئے۔ اور جن عزیزوں نے ان کی گدی پر قبضہ جمایا، انھوں نے ان کی بیوی، ایک بیٹی، دو بیٹوں اور خود اُن کے لیے کل مبلغ ڈیڑھ روپیہ ماہانہ (نصف جس کے بارہ آنے ہوتے ہیں) وظیفہ مقرر کیا۔ تین پیسے روزانہ کی اس آمدنی میں اماں مجھے روزانہ ایک پیسہ دینے کے بجائے میرے آنسو پونچھ لینا زیادہ آسان سمجھتی تھیں اور آج جب میں اپنی نظموں اور افسانوں کے معاوضے کا کچھ حصہ ہر مہینے ان کی خدمت میں پیش کرتا ہوں[1] تو وہ رو دیتی ہیں، اور فرماتی ہیں کہ میں روتی تو جب بھی تھی، مگر وہ آنسو میرے اپنے آنسو تھے۔ اب جو رو رہی ہوں تو یہ وہ آنسو ہیں جنھیں میں تم دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں قتل کر دیتی تھی کہ گھرانے کی عزت پر پانی نہ پھر جائے۔

گھرانے کی اس عزت کے احساس نے مجھے وقت سے پہلے حساس بنا دیا۔ اور ممکن ہے اسی گداز نے مجھے فن کار بنایا ہو۔ اگر بچپن میں مجھے ماں کی محبت نہ ملتی تو ممکن ہے آج میں نہایت خطرناک کلبی اور قنوطی ہوتا۔ لیکن عالم یہ تھا کہ جب ہم بہن بھائی اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتے، وہ چرخہ کاتتیں اور ہم پونیاں بناتے، وہ چکی پیستیں اور ہم مل کر گیت گاتے، وہ کوٹھے کی لپائی کرتیں اور ہم سیڑھی سے چپٹے کھڑے رہتے۔ بہرحال جب ہم سب اکٹھے ہوتے (والد گرامی ۱۹۲۴ء میں انتقال فرما گئے تھے) اور بارش ہونے لگتی تو اماں دہلیز کے پاس بیٹھ جاتیں۔ ہم تینوں اُن کے آس پاس ٹھنس جاتے۔ باہر آنگن میں بلبلے اَن گنت گنبدوں کا فرش بچھاتے اور آنگن کی بیریوں کے پتے اُڑتے ہوئے اندر ہمارے پاس آ جاتے اور باہر گلیوں میں ننگ دھڑنگ بچے پرنالوں کے نیچے نہاتے اور چیختے تو اماں ہمارے سر پر ہاتھ پھیرتیں اور روتیں، اور بڑے دُکھ سے آپ ہی آپ کہتیں۔ "بوند بوند کے ساتھ فرشتہ اترتا ہے، اے پاک فرشتو! خدا کے دربار میں جا کر مجھ دکھیا کی طرف سے عرض کرو کہ میں نے تو جو دُکھ بھوگنے سو بھوگے، ان میرے بچوں کو کوئی دُکھ نہ دینا۔ میں نے انھیں بڑی مشکل سے پالا پوسا ہے۔ یہ پڑھیں لکھیں، نیک اور لائق بنیں اور دنیا میں نام پیدا کریں۔ اللہ ان کی قسمتوں کے کانٹوں کو پھول بنا دے، اور یہ نہ ہو سکے تو یہ کانٹے میری قسمت میں لکھ دے۔ یہ بچے میرا اثاثہ ہیں، یہ بچے میرا غرور ہیں۔ مال تو سب تیرا ہی ہے پر تو نے مجھے یہ مال عطا فرمایا ہے تو بس اتنا کر کہ میں ان کا دُکھ نہ دیکھوں۔ بوند بوند کے ساتھ فرشتہ اترتا ہے اور میں بوند بوند کو پکار رہی ہوں۔ میری پھٹی ہوئی پوروں والی کٹی ہوئی ایڑیوں کی لاج تیرے ہاتھ میں ہے یا رب العٰلمین!" پھر وہ زیر لب کوئی آیۂ کریمہ پڑھتیں اور ہم تینوں "چھو" کرتیں۔ اور یہ "چھو" ہوتے ہی زندگی کی ڈالیاں پھولوں سے لد جاتیں۔ جھنکاروں اور چہکاروں کا ایک طوفان امڈ پڑتا اور ہم موسلا دھار بارش میں ناچتے کودتے اپنی بیریوں کے بیر چُننے بھاگ جاتے۔ آپا پکارتیں "کیڑا ہے بیر میں!"

اور میں گول مٹول احمد شاہ ناچتے ہوئے اپنی بھدی آواز میں گاتا:۔

کیڑا ہے بیر میں
دانہ ہے ڈھیر میں
رتی ہے سیر میں
کھا جاؤ

---

[1] افسوس کہ اب وہ ہم میں نہیں۔

" تم اصل میں میراثی ہو" بھائی جان کہتے ۔ "تمھیں تو ہم نے رحم کھا کر اپنے گھر میں رکھ لیا ہے ۔ تمھیں ایک روز چیل پنجوں میں دبائے اڑائے لیے جا رہی تھی ۔ ابا کو رحم آگیا ۔ چیل سے چھین کر تمھیں اپنے ہاں ڈال لیا ۔ پر جب سے تم نے بولنا سیکھا ہے سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ تم "ڈھاڈی" ہو ۔ کوئی سی بات کرو اس کا گانا بنا لیتے ہو سور !"

"گانا گا لیتے ہو سوُر

کھانا کھا لیتے ہو سوُر

بھانا بھا لیتے ہو سوُر

دھانا دھا لیتے ہو سوُر

ٹھانا ٹھا لیتے ہو سوُر"

یہ مہمل ردیف بھی رکتی جب بھائی جان بیر کی گٹھلی تاک کر میری موٹی سی ناک پر مارتے اور میں ایک دردمند فریادی بن کر اماں کے حضور اپنی بے گناہی ثابت کرنے چلا جاتا ۔

مجھے زندگی میں بے انتہا محبت میسر آئی ہے ۔ بھائی کی محبت ، بہنوں کی محبت ، محبوبہ کی محبت ، دوستوں کی محبت ، میری ادبی کاوشوں کو سراہنے والوں کی محبت ۔ لیکن ماں کی محبت کا میں اس لیے سب سے زیادہ سپاس گزار ہوں کہ اس محبت نے مجھے پتھر نہیں بننے دیا ۔ اگر میرے ادب میں PATHOS کا کہیں وجود ہے تو یہ میری اماں کی دین ہے ۔ اور اگر میں انفرادی دکھ کے حصار سے نکل آیا ہوں تو یہ بھی انھی کی دین ہے ۔

نو برس کی عمر میں مجھے اماں سے الگ ہو کر تعلیم کے سلسلے میں کیمبل پور جانا پڑا ۔ چچا جان وہاں سول آفیسر تھے ۔ انھوں نے ہم دونوں بھائیوں کی تعلیم کا بیڑا اٹھا لیا تھا ۔ مجھے یاد ہے کہ بعض سنسان دوپہروں کو ہم دونوں بھائی ڈرائنگ روم کے صوفوں پر آ کر بیٹھ جاتے اور رو رو کر اماں کی باتیں کرتے ۔ پھر اچانک بھائی جان کو یاد آ جاتا کہ وہ مجھ سے دو برس بڑے ہیں ، وہ میرے آنسو پونچھتے ، مجھے تسلیاں دیتے ، مجھ پر زیادہ رقت طاری ہوتی تو غصے بھی ہو جاتے ، پیٹ بھی ڈالتے مگر انھی بھائی جان نے ایک اتوار کو مجھے اپنے پاس بلایا ۔ "شاہ ! ذرا ادھر تو آؤ !"

میں ان کے پاس گیا ۔ وہ پلنگ پر بیٹھے تھے اور ہر طرف کتابیں بکھیر رکھی تھیں ۔ "پلنگ پر آ جاؤ ۔" میں پلنگ پر بیٹھ گیا ۔

"شاہ !" انھوں نے کہا "اماں یاد آ رہی ہیں ، اس لیے آؤ روئیں ۔"

"چلیے ، شروع کیجیے" میں نے کہا ۔

وہ بھرے بیٹھے تھے ، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے ۔ میں نے زار زار ان کا ساتھ دیا ۔ اور جب ہم خوب رو لیے تو انھوں نے میرے آنسو پونچھے اور بولے "بس اب جی ہلکا ہو گیا ۔۔ ہو گیا نا !"

"ہو گیا !" میں نے کہا ۔ اور ہو بھی گیا تھا سچ مچ ۔۔

سو میری زندگی پر سب سے عظیم اثر میری اماں کا ہے ۔ میرے آنسو بہنے میں اب اتنے جلد باز نہیں رہے ۔ اب میں اپنے قلم اور اپنے عمل سے جی ہلکا کر لیتا ہوں ۔ اب جب میں دیکھتا ہوں کہ اس دور کی بیشتر ماؤں نے اپنے بچوں کے لیے تیرے کی کالک سے روشنائی بنائی ہے اور بوند بوند کے ساتھ اترنے والے فرشتوں کو اپنے بچوں کے تحفظ کا واسطہ

دیا ہے، اور جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے جیسے کروڑ ہا اربوں بیٹوں نے ایک پیسے کے حصول میں ناکامی کے دکھ پر آنسو بہائے ہیں، اور ماؤں کی آغوش میں منہ چھپا چھپا کر رو ئے ہیں، جب میں یہ سب کچھ دیکھتا ہوں کہ میں دھرتی کا بیٹا ہوں، دھرتی سب کی ماں ہے، تو میرے احساسات میں تموج نمایاں ہوتا ہے۔ میرے قلم میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور میں ارتقائے حیات کی رفتار کی تصویریں اپنے شعروں اور کہانیوں میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو بالکل ایسی آسودگی محسوس ہوتی ہے جیسے ماں بیٹے سے کہے کہ بیٹا یہ میری ایڑی سے کانٹا تو نکال دو۔ اور بیٹا کانٹے کو نکال کر اور اسے سوئی کی نوک یا اپنی ہتھیلی پر رکھ کر زبانِ حال سے کہے کہ آج میں نے ایک بہت بڑی عبادت کی ہے!

میں جب اپنے بچپن کا تصور کرتا ہوں تو ماں کے بعد جو چیز میرے ذہن پر چھا جاتی ہے وہ حسنِ فطرت ہے۔ یقیناً یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ مظاہرِ فطرت سے موانست کا یہ جذبہ کب، کیسے اور کیوں پیدا ہوا، مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ جب بھی میں اپنا ماضی یاد کرتا ہوں تو لہلہاتے ہوئے کھیتوں، امڈتے ہوئے بادلوں، ڈھلی ہوئی پہاڑیوں اور چکراتی، بل کھاتی اور قدم قدم پر پہلو بچاتی ہوئی پگڈنڈیوں کی ایک دنیا میرے ذہن میں آباد ہو جاتی ہے۔ بہیکڑ کے پھول کی جڑ میں مٹھاس کا موتی، لانبی لچکتی گھاس کی چوٹی پر جانے کی کوشش میں چیونٹی سے بھی کہیں چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی استقامت، چٹختی ہوئی چٹانوں کی جھریوں میں سے پھوٹتے ہوئے جنگلی پھولوں کے پودے، گھنی پھلاہیوں کے سائے میں دھرتی کی بھینی بھینی خوشبو، درنیلے پہاڑ کے دامن میں آئینے کی طرح چمکتی ہوئی جھیل پر سورج کی کرنوں کی سٹرک، بادل کی گرج کے ساتھ تانبے کی چادروں کی طرح بجتے ہوئے پہاڑ، مکی کے بھٹوں کے لانبے رنبے سنہرے بالوں میں مکی کی مہک، یہ اور دوسری تفاصیل جو کبھی کبھی میرے افسانوں اور شعروں کا پس منظر بن جاتی ہیں، میری زندگی کے اسی دور کا جمع کیا ہوا اثاثہ ہے جب میں وادیوں اور گھاٹیوں میں اُپلے چننے نکلتا تھا۔ یا اپنے میلے کپڑوں کی پوٹلی لیے اونچی پہاڑیوں پر پیالوں کے سے تالابوں میں کپڑے دھونے جاتا تھا یا بعد میں مسان یا میانوالی یا خوشاب کے دور دراز ریلوے اسٹیشن میری منزل قرار پائے اور سناٹے میں لپٹی ہوئی راتوں کو اونٹ کی گھنٹی یا خچر کے ٹاپوں نے چونکا چونکا دیا۔ اس وقت میں بادل کی گرج سے بے طرح ڈرتا تھا۔ بجلی کے لشکارے کے ساتھ ہی میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا اور روتی آواز میں بھائی جان سے کہتا "لالہ! اب بادل گرجے گا؟" نہ "ہاں!" وہ کہتے۔ "پھر؟" میں پوچھتا۔ اور پھر یہ گرج کسی نہ کسی طرح میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرا ہی جاتی۔ اور میں خوف زدہ ہو کر رو دیتا۔ اس وقت تک مجھے مظاہرِ فطرت کے اس پہلو پر غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ لیکن بعد میں جب کڑک کا یہ خوف ایک دم میرے ذہن سے نکل گیا اور دوسرے لوگوں کو کڑک سے گھبراتا دیکھ کر مجھ میں مسکرانے تک کی ہمت پیدا ہو گئی تو ایک بار —— شاید کالج کے دنوں میں —— مجھے یہ خیال آیا کہ کیا انسان کبھی عناصر پر قابض ہو سکے گا؟ پھر جب میں نے طوفان میں اڑتے ہوئے چھپر دیکھے، اور سیلابوں میں گاؤں کے گاؤں کو ڈوبا پایا، اور جب کسی گھر میں بھڑکی ہوئی آگ کے شعلوں کو اوپر ہوا میں تالیاں بجاتے اور ناچتے دیکھا، جب میرا ایک دور کا عزیز بیٹھے بٹھائے آسمان سے گرتی ہوئی بجلی کا شکار ہو گیا۔ جب کوئٹے کے زلزلے میں میرے چند عزیز دوستوں کے رشتہ دار موت کے گھاٹ اتر گئے، اور جب میں نے یہ سنا کہ ان میں بیشتر تعداد بچوں سے بچوں کی تھی، تب عناصر پر انسان کے قابض ہونے کا سوال ایک عزم بن کر میرے ذہن میں اُبھرتا تھا۔ مگر ابھرا نہیں رہ سکتا تھا اس لیے کہ میں بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھا اور خدا کا خوف، اس سے آگے کچھ سوچنے ہی نہیں دیتا تھا۔ اور پھر چچا جان مرحوم کا یہ

یہ فرمان کہ خدا کے وجود کے بارے میں سوچنا تک کفر ہے۔ وہ ہے۔ بس! وہ کیوں ہے اور کیسے ہے؟ یہ خیال صرف کافر ہی کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے اپنی ایک نظم "تذبذب" میں جو "جلال و جمال" میں شامل ہے، کہا ہے ؎

خدا وہ کیا ہے سمجھ لے جسے حقیر ادراک!
کہاں خرد کی اڑانیں، حریم ذات کہاں
کہاں وہ زندہ و پائندہ حسنِ لامحدود
مرے خیال کے دھندلے تاثرات کہاں

بہت آگے چل کر میرے ذہن میں یہ خیال گھر کر سکا کہ جب انسان بڑے ناز سے ؎

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم

کہہ سکتا ہے تو پھر یہ کیوں نہ کہے کہ ؎

تو وقت ہے، روح ہے، بقا ہے
وہ حسن ہے، رنگ ہے، صدا ہے
تو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے!
وہ ایک مسلسل ارتقا ہے!
وہ ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا!

دراصل آج میرا جو بھی نظریہ ہے، وہ ایک دم میرے ذہن پر پھٹ نہیں پڑا، بلکہ میں نے اسے نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بالکل تدریجی یا صحیح لفظوں میں بالکل جدلیاتی انداز میں قبول کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں مذبذب نہیں ہوں، میں مانتا ہوں کہ نظریہ بدلتا رہتا ہے، لیکن اس تبدیلی کا رجحان ارتقائی ہوتا ہے۔ نیچر سے میری ابتدائی معصومانہ محبت اور نیچر کے مظاہر پر قبضہ کرنے کا عزم ——— ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فاصلہ ہے، لیکن میں اس دوسرے سرے پر کود کر نہیں پہنچا، شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں مجھے اپنا آج کا یہ شعر عزیز ہے کہ ؎

اب کیا ہے فرشتوں کے تعارف کی ضرورت
انسان نے انسان کو پہچان لیا ہے

تو وہاں مجھے اپنے ماضی کی اس یادگار سے بھی نفرت نہیں کہ ؎

الٰہی! خیالوں کے خلوت کدے میں کوئی شعبدہ باز سا آ بسا ہے
وہ پردے ہٹے، وہ کوئی مسکرایا ——— مجھے ہو بہو تو نظر آ رہا ہے

ہمارے ملک میں طبقاتی شعور تو شاید صرف سائنٹفک تعلیم ہی سے پیدا ہو سکے اور اپنے مقدر پر راضی برضا ہو کر بیٹھ رہنے اور توکل کے عقیدے پر قناعت کر لینے کی نہیں شاید انتہا درجے کی محنت ہی سے چھٹ سکیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت

ہے کہ غریبی اور امیری کا خوفناک تفاوت یہاں کے اوسط درجے کے انسان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ درست ہے۔ کہ اس قسم کا حساس عموماً جذباتی ہوتا ہے اور انسان کڑھنے اور اپنے دل کو خون کرنے سے آگے کچھ سوچتا ہی نہیں، لیکن غریبوں اور درمیانی طبقے کے لوگوں کی امیروں سے نفرت ایک ایسی حقیقت ہے جسے نہ مذہبی اغوت آنکھوں سے اوجھل کر سکتی ہے اور نہ مقدر پرستی۔ دیہات میں تو یہ تفاوت اور بھی تیز نظر آتا ہے، شاید اس لیے کہ ہزار ڈیڑھ ہزار کی آبادی میں کل ایک یا دو آدمی ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کے پسینے کی کمائی پر سانپ بن کر بیٹھے رہتے ہیں۔ میں نے جب پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیے تو مناظرِ فطرت کے حسن اور اسلامی روایات کے طنطنے کے ساتھ ساتھ مجھے اس معاشرتی اور معیشتی تفاوت نے بھی متاثر کیا اور میں رومانوں اور خوابوں سے اٹے ہوئے ذہن کا وہ چور دروازہ بند نہ کر سکا جس میں سے آنکھوں دیکھی سفاک حقیقتیں اندر سرک آتی تھیں۔ مگر اس وقت یہ حقیقتیں مجھ پر محض رقت کی کیفیت طاری کر سکتی تھیں اور میں اسی کیفیت کو اپنی کہانیوں میں منتقل کر دیتا تھا۔ بہت بعد میں مجھے یہ سوچنے کا خیال آیا کہ فلاں غریب ہے تو آخر کیوں غریب ہے؟ فلاں نے اپنی بیٹی بیچ دی تو کیوں بیچ دی؟ فلاں نے چوری کی ہے تو کیوں کی ہے؟ فلاں بے گناہ نے تھانیدار کے سامنے ناک سے لکیریں کھینچیں تو کیوں کھینچیں؟ اور فلاں چپکے سے بیگار پر کام کرنے چلا گیا تو کیوں چلا گیا؟ اور جب میں نے سب کچھ سوچا تو ہر حقیقت کے پیچھے مجھے روپوں کی تھیلی چھنچھناتی سنائی دی۔ میں اخلاقی اور روحانی قدروں کا منکر نہیں ہوں، میں داڑھی مونچھیں منڈا دینے یا کوٹ پتلون پہن لینے کو مشرقی اخلاق کی بے حرمتی نہیں سمجھتا۔ لیکن انسان سے محبت کرنے، خلوص برتنے، سچ بولنے، بے تعصب اور بے ریا رہنے، نڈر ہو کر سچائی کا اعلان کرنے اور ظالم کی طرف بر سرِ بازار انگلی اٹھا کر اسے ظالم کہہ دینے کو بہترین اخلاق تصور کرتا ہوں، اور جب میں علی الاعلان سچ بولتا ہوں تو مجھے انسان کی روح کائنات پر پھیلتی محسوس ہوتی ہے۔ بہرکیف اخلاقی اور روحانی قدروں کا احترام کرتے ہوئے بھی میں نے یہی محسوس کیا کہ اگر انسانی طبقوں کا یہ تفاوت ختم ہو جائے، یا اگر ایسا ہو کہ کوئی انسان کسی انسان کا محتاج نہ رہے اور ہر انسان محض اپنے لیے نہیں بلکہ ساری انسانیت کے لیے اچھے اچھے کام کرے، اور آدمی اپنی انفرادیت کی کچھ اس ڈھب پر پرورش کرے کہ اس کے مدِ نظر ہمیشہ اجتماعی مفاد ہو، تو جینے کا لطف آ جائے۔ قیامِ پاکستان کے سلسلے میں اپنے علاقے میں مجھ سے جو کچھ ہو سکا محض اسی بنا پر کیا کہ ہمارے رہنماؤں کی تقریروں میں انسانی مساوات کی بہشتیں آباد ہوتی تھیں اور وہ ملیشیا پہنتے تھے اور ہمارے دہقانی کارکنوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور جلسہ گاہ میں پہنچ کر بھی اپنے چہرے پر سے سفر کی دھول نہیں پونچھتے تھے۔ میرا سیاسی شعور ناپختہ تھا، اس لیے میں دور تک نہ دیکھ سکا۔ اپنی ناک سے ذرا سا آگے دیکھ لینے کی ہمت بڑی آزمائشوں کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ میں پشاور ریڈیو اسٹیشن میں پاکستانی نغمے لکھ رہا تھا جب ایک پروگرام اسسٹنٹ نے ریڈیو اسٹیشن کی چھت پر چڑھ کر اپنے ریوالور سے ہوا میں فائر کیے اور اسٹیشن ڈائرکٹر نے سبز جھنڈا کھول دیا۔ یہ ۱۴/ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کی تاریخ تھی اور اس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔ دنوں تک میں سرشاری کے عالم میں رہا۔ اور پھر ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے واپس آتے ہوئے میں نے سڑک پر ہندوؤں اور سکھوں کی لاشیں دیکھیں اور بعد میں یہ بھی دیکھا کہ غیر مسلم عورتیں کپڑوں کی گٹھڑیوں کی طرح تانگوں میں ٹھونس کر بھگائی جا رہی تھیں، اور میں نے ایک جلتے ہوئے گھر میں ایک بچے کی چیخیں سنیں اور پھر جب پشاور شہر میں ہندوؤں کے محلے کو آگ لگا دی گئی تو میں صدر پشاور میں حواس باختہ بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا جب ایک دوست کی ننھی سی لڑکی میرے پاس بھاگی آئی، مجھ سے چمٹ گئی اور روتے ہوئے بولی: "چچا جان، وہ دیکھیے آسمان جل رہا ہے!"

آسمان جل رہا تھا! بچی نے غلط نہیں کہا تھا۔ آسمان جل گیا اور اس کی بجھی ہوئی راکھ اپنی پر آ کر گری جھنوں نے اسے دیا سلائی دکھائی تھی۔ میرے ذہن میں دھڑاکے سے ہونے لگے۔ ملک کی سیاسی صورتِ حال نے مجھے قدم قدم پر چکرا ڈالا۔ یہ کیا ہو رہا ہے، ہم کہاں جا رہے ہیں، ہم کہاں جا کر رکیں گے، اس وقت میں نے یہی استفہامیہ ایک باعی میں منتقل کر دیا تھا ؎

کیا اپنا سراغ خود نہیں پاؤ گے؟
کیا پھر کوئی اجنبی بلا لاؤ گے؟
یہ راہ تو اس موڑ پر مڑ جائے گی
اے اہلِ وطن، کہو، کہاں جاؤ گے؟

امیر تیمور کے انصاف اور شہنشاہ اورنگ زیب کی نرم دلی اور عدل گستری اور بنوامیہ اور بنوعباس کے دور کے بغداد کے امن و سکون کے بارے میں اب مجھ سے ریڈیو فیچر نہیں لکھے جا سکتے تھے، میرا ایک ڈرامہ "شکست و فتح" ریڈیو پر خاصا مقبول ہوا ہے۔ لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ میں نے تیمور کی خوفناک شخصیت کو عدل و انصاف کے تخت پر بٹھلاتے ہوئے اپنے ضمیر کی کتنی پکاروں کا گلا گھونٹ دیا۔ میں آج بھی حضرت عمرؓ کا قصیدہ تک لکھنے کو تیار ہوں، میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زہد و اتقا کا معترف ہوں اور میں ٹیپو کی وطن دوستی سے پیار کرتا ہوں، لیکن جب مجھے دارا شکوہ پر ایک فیچر لکھنے کا حکم ملا اور میں نے اس فیچر میں اورنگ زیب کے مظالم کو ذرا دا شگاف انداز میں بیان کیا تو "لسنر" چیخ اٹھے اور مجھ سے جواب طلبی ہو گئی۔ میں اپنے وطن کے گیتوں اور رقصوں کی کہانیاں پیش کرنا چاہتا تھا، میں اپنے ہم وطنوں کی امنگوں اور ولولوں کی تصویریں کھینچنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہر روز نئے سے نئے فیچروں کے ذریعے اپنے رہنماؤں کو اُن کے وعدے یاد دلاتا رہوں مگر جب میں نے ان امور میں اپنے قلم کی نوک کو مڑا ہوا پایا تو میں پشاور سے بھاگ آیا، اور لاہور میں آ کر میں نے بہت کچھ لکھا اور اگرچہ مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے ندامت سی محسوس ہوتی ہے، مجھ پر اور دوسرے ترقی پسند مصنفین پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے نئے وطن کی مصلحتوں سے آنکھیں پھیر کر اندھا دھند لکھا، لیکن کم از کم میں اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جو کچھ لکھا وہ ذرا سا ڈر کر بھی لکھا۔ ورنہ اگر حکومت کے عتاب کا ڈر نہ ہوتا تو مجھے تو ذی اقتدار طبقے کو نہایت کریہہ قسم کے ناسور اور نہایت گھناؤنے انداز کے زخم دکھانا تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ ادھر بھی متوجہ ہوں ــ یہی تعمیری تنقید ہے، لیکن میں نے جھجک جھجک کر بھی جو کچھ لکھا اُس نے مجھے آخر کار جیل میں لا ڈالا۔ چھ مہینے تک میں یہی سوچتا رہا کہ مجھے یہاں کیوں بھیجا گیا ہے، مجھے تو ابھی اپنا وہ شہپارہ لفظوں میں منتقل کرنا ہے جو ذی اقتدار جماعت کی ناراضی کا صحیح جواز بن سکتا ہے۔ میں تو ابھی تک کھل کر بات کہنے کا انداز ہی سیکھ رہا تھا ــ اور یہاں پہلے تو میرے ہم وطنوں نے ہی مجھ پر فتووں کی بوچھار کر دی اور اس کے بعد ایک خوش گوار صبح کو میرے گھر کے دروازے پر پولیس کے ایک انسپکٹر نے کہا "یُو آر انڈر اریسٹ!" ــــ تو کیا اپنا شہپارہ لکھ کر مجھے پھانسی کا منتظر رہنا چاہیے!

یہ چند بکھری ہوئی یادیں تھیں، جو اپنی شخصیت کو دوسروں پر ٹھونسنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے ادب کے پس منظر کو ذرا سا واضح کر دینے کے لیے میں نے مدیر "ماحول" کے ارشاد کی تعمیل میں قلم بند کر دیں۔ میں نے ابھی کچھ بھی تو نہیں لکھا، چند نظمیں، چند غزلیں اور چند کہانیاں لکھ کر میں اپنے ان فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو گیا جو ہر باشعور اور غیرت مند انسان کی طرح مجھے بھی تفویض ہوتے ہیں۔ میں ادب اور فن کی شاہراہ کا ایک مسافر ہوں، بہت دور کا سفر کرنے کے ارادے ہیں، اور مجھے اعتراف ہے کہ میں ابھی ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کر سکا۔ زندگی کا حسن اور کائنات کی حقیقت اور اس کائنات میں انسان کی مرکزی حیثیت! — یہ اور بے شمار دوسری باتیں ابھی میرے ذہن میں پک رہی ہیں، تکمیل کا دعوٰی نہیں، فن کی تکمیل کا دعوٰی فن کی تو خیر نہیں، فن کار کی موت ضرور ہے، اسی لیے اپنے آپ کو طالبِ علم کہنے سے مجھے خوشی ہوتی ہے اور مزید جستجو کا ذوق تازہ ہوتا ہے۔

چھتیس برس کا ہونے کو آیا ہوں، شادی شدہ ہوں، دو بیٹیاں ہیں، ایک کا نام ناہید ہے اور ایک کا نشاط، معاش کی مصیبتیں بے شمار ہیں، مگر اب مجھے مصیبتوں سے بھڑتے رہنے اور کبھڑتے ہوئے مسکراتے اور ہنستے رہنے کا ڈھب آ گیا ہے، اسی لیے بڑے مزے سے زندہ ہوں۔

احمد ندیم قاسمی

ایک ریاستی کالج

ندیم صاحب کا یہ مضمون ہمیں م۔ اسلم ملک نے ندیم صاحب کے خط کے ساتھ ارسال کیا ہے جس کے لیے ہم اُن کے شکرگزار ہیں۔

ندیم صاحب کے زمانۂ طالب علمی کا یہ انتہائی اہم، دلچسپ اور معرکہ آرا مضمون ہے جو نہ صرف اپنے عہد کی زندہ تاریخ ہے بلکہ سچ پوچھیے تو ندیم صاحب کی سوانح عمری کا ایک یادگار باب بھی۔ اسی جذبے سے ہم اسے "ندیم نمبر" میں محفوظ کر رہے ہیں۔

یہ مضمون پہلی بار "امروز" لاہور میں چھپا تھا۔ پھر اسے م۔ اسلم ملک نے ۱۹۷۳ء میں جب وہ صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کے مجلہ "نخلستان ادب" کے مدیر تھے اور ۶۰ سالہ نمبر مرتب کر رہے تھے اسے باجازت ندیم صاحب "نخلستان ادب" میں شامل کیا۔ اس سلسلے میں م۔ اسلم ملک کو ندیم صاحب نے جو خط لکھا ہے اُس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ———— صبا

معرفت ماہنامہ فنون

۴۷۔ انارکلی۔ لاہور——

۱۱ر فروری ۱۹۷۲ء

مکرمی ملک صاحب —— تسلیم!

یاد فرمائی کا شکریہ۔ "ایک ریاستی کالج" کی اشاعت پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر ایک بات عرض کر دوں۔ اس کی اشاعت کو بعض ارباب بہاول پور نے بہت سختی سے محسوس کیا تھا اور اس امر پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ میں نے اپنی درس گاہ کی "بے حرمتی" کی۔ درحقیقت میری نیت بُری نہیں تھی۔ مجھے تو اس درس گاہ سے آج بھی محبت ہے۔ میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اُن زمانوں میں درس و درس گاہ کے معیار کیا تھے اور میں نے مبالغہ شمہ بھر بھی

نہیں کیا۔ بہرحال آپ بعض لوگوں کے اعتراضات برداشت کرنے پر تیار ہوں تو بسم اللہ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔

حسب ارشاد چند اشعار بھی نذر ہیں ——— مخلص

ندیمؔ

صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کا یاد آدم ہی بنا تھا پہلے ہی روز انگریزی کے ایک پروفیسر نے ڈیرہ غازی خاں کے ایک لڑکے سے پوچھا WHAT IS LITERATURE? "لٹٹ ٹیٹ ریچ ۔ ریچ ریچر!" لڑکے پر لرزہ طاری تھا اور وہ صادق ایجرٹن کی عظیم الشان عمارت کے ایک وسیع و عریض کمرے میں، ایک سو بیس نوجوانوں میں کھڑا اپنے آپ کو قطعی تنہا محسوس کر رہا تھا بڑی مشکل سے اس نے اپنے خشک گلے کو بھگویا اور کرب کے سے انداز میں بولا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ SIR, LITERATURE IS A BUNDLE OF BOOK (لٹریچر کتابوں کے ایک گٹھر کو کہتے ہیں) پروفیسر مرلی دھر اسٹیج سے اترے۔ لڑکے کے پاس آئے اور اس کے منہ پر ایک زناٹے کا طمانچہ مار کر واپس اسٹیج پر جا پہنچے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "FOOLS" وہ دہاڑے "IT IS SHAME TO TEACH YOU DUFFERS" وہ غصے میں دندناتے ہوئے باہر چلے گئے اور سب لڑکے کچھ ایسے اداس ہو گئے جیسے وہ ننھے ننھے بچے ہیں اور ان کے رنگ رنگ کے غباروں میں اچانک سوئیاں چبھ گئی ہیں ——— یعنی کالجوں میں بھی پٹائی ہوتی ہے! میٹرک کے نوے فی صدی لڑکوں کو امتحان سے کامیابی کی دو مسرتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو حساب الجبرے سے چھٹکارا اور دوسرے عربی فارسی کے استادوں کے ڈنڈوں اور ہیڈ ماسٹر صاحب و م اقبال لنہ کے بیدوں سے نجات! لیکن یہاں ایک سو انیس لڑکے ایک سو بیسویں لڑکے کی طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے اور ایک سو بیسواں لڑکا بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا اور باہر کالج کے سینئیر لڑکے ان فولوں اور ڈفروں کی تواضع کے لیے کیل کانٹے سے لیس کھڑے تھے!

پھر پہلے ہی روز دودھ کی ایک دوکان پر جانے کا اتفاق ہوا۔ حاجی صاحب (پروپرائٹر) نے پوچھا "سائیں ٹھیک نہ کھیرنی"؟ ———

"کھیر" ادھر سے جواب ملا۔ اگرچہ اس دوسری جنس "کھیرنی" کا مطلب سمجھ میں نہ آیا۔ خوش تھے دودھ پینے آئے تھے اور کھیر مل رہی تھی۔

اور پھر حاجی صاحب نے ایک "عظیم الدہانہ" منگر (برتن) سامنے رکھ دیا۔ اس میں سیدھا سادا دودھ تھا۔ "میں نے کھیر کہا تھا" احتجاج ہوا۔

"یہی کھیر ہے" حاجی صاحب مسکرا کر بولے "آپ پنجاب سے آئے ہیں اس لیے آپ نہیں جانتے کہ یہاں دودھ کو کھیر کہتے ہیں"۔

"اور یہ کھیرنی کیا چیز ہے"؟ ہم معمے کو حل ڈھونڈھ رہے تھے۔ "کھیرنی کھیر کو کہتے ہیں"۔ منطق کے اس پھیر میں ہم چکر پھیر رہے تھے کہ تشریح ہوئی ۔ "پنجابی لوگ جس چیز کو کھیر کہتے ہیں اسے یہاں کھیرنی کہا جاتا ہے۔

"تو پھر کھیر ہی دیئے" ہم نے "ہی" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"وہ آپ کے کام کی نہیں" حاجی صاحب مروت کے لہجے میں بولے "اس میں اس حرامزادے میرے بیٹے نے چند مکھیاں پکا دیں، الائچی کے دھوکے میں۔ آپ کھیر پیجیے" اور وہ اپنے کام میں یوں مگن ہوئے جیسے ہم کھیر پیے بغیر اُٹھ گئے تو وہ ہمارے سر پر کوئی منگر دے ماریں گے!

صادق ایجرٹن کالج اپنی صورت کے ظاہری ٹھاٹ کے لحاظ سے لاہور کے بیشتر کالجوں سے کہیں زیادہ شاندار تھا۔ اس کے کھیل کے میدان، اس کے لان، اس کے ہوسٹل سب بہت اچھے تھے لیکن غلام گردشوں میں طلبہ کے کمربند قمیصوں سے نیچے لٹکے نظر آتے تھے، خشخشی بالوں والے طلبہ کی تعداد بے پناہ تھی۔ ان کی ٹوپیوں کے پھندنے ماتھے پر رہتے تھے۔ پروفیسر اردو میں اور طلبہ ریاستی زبان میں بولتے تھے۔ ہوسٹل میں تقریباً ہر لڑکے کے پاس مٹی کا لوٹا رہتا تھا اور یہ لوٹے باہر برآمدے میں قطار اندر قطار یوں دھرے رہتے تھے جیسے لاہور کے ہوسٹلوں میں پھولوں سے لدے گملے۔ مباحثوں اور ڈرامے کا ذوق تک نہ تھا۔ گروپ میٹنگوں میں "اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا" گا کر پڑھی جاتی تھی۔ پرنسپل کے ہاتھوں میں ہمیشہ ایک بید رہتا اور پروفیسر لوگ اسٹاف روم میں نتھنوں میں نسوار چڑھاتے اور آٹے نمک کا بھاؤ ڈسکس کرتے تھے۔ ہال میں نواب بہاول پور اور شہنشاہ جارج پنجم کی تصویروں پر مکڑیوں کی نسلوں نے جالے بُن رکھے تھے اور ہر طرف مکھیوں کے پنجرے لٹکے رہتے تھے۔ باہر شہر میں بڑی بڑی سڑکوں پر کھجوریں بکتی تھیں اور میلی کچیلی کاغذی عرضیاں یوں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتی تھیں جیسے ان میں مصری کی ڈلی ہوتی ہیں۔ شام کے سات بجے کے بعد چوکیدار "خبردار" پکارنے لگتے تھے۔ ہر طرف ایسا خوفناک سناٹا طاری ہوتا تھا کہ نہ جاگتے بنے نہ سوتے۔

پنجاب کے تین نوجوان جو چند ہی روز ہوئے صادق ایجرٹن کالج میں "بھرتی" ہوئے تھے، ایک سڑک پر گھوم رہے تھے کہ اچانک ایک خوبصورت کار رُکی۔ دو ریاستی فوجی باہر آئے اور لڑکوں سے پوچھا:

"تم کون ہو؟"

"ہم لڑکے ہیں۔"

"تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

"ہم یہاں ہوا خوری کرنے آتے ہیں۔"

"ہمارا مطلب ہے تم بہاول پور میں کیوں آئے ہو؟"

"اس لیے کہ ہمارے پاس بہاول پور ہی کا ٹکٹ تھا۔"

دونوں فوجی بہت برافروختہ ہوئے اور کڑک کر بولے:

"تمہیں معلوم نہیں کہ اس کار میں حضور ہز ہائی نس نواب صاحب بہاول پور تشریف فرما ہیں۔"

"ہمیں کیا معلوم" لڑکے قدرے گھبرائے "ہم تو پنجابی ہیں اور یہاں کالج میں پڑھنے آئے ہیں۔"

"تم ہز ہائی نس کے کالج میں پڑھتے ہو اور ہز ہائی نس کو سلام تک نہیں کرتے۔"

"ہم کیا جانیں کہ یہ کار ہز ہائی نس کی ہے۔"

" یاد رکھو کہ ریاست بہاول پور کی حدود میں تمھیں جس کار پر جھنڈی نظر آئے وہ ہز ہائی نس کی کار ہے۔ کسی دوسرے شخص کو کار پر جھنڈی لگانے کی اجازت نہیں۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ ہز ہائی نس کی کار دیکھ کر اپنی جگہ پر رک جائے اور فرشی سلام کرے۔ سائیکل والے سائیکلوں سے اتر جائیں تانگے اور موٹر والے اپنے " وہیکل " روک لیں اور سلام کریں۔ تم نے کوتاہی کی اس لیے فلاں تاریخ کو ڈیرہ نواب صاحب میں حاضر ہو کر وجہ بیان کرو کہ کیوں نہ تم پر بغاوت کا مقدمہ چلایا جائے۔

فوجیوں نے ان سے نام اور پتے پوچھے اور کار میں بیٹھ کر چلے گئے اور تینوں نوجوان جو وسطی پنجاب کے رہنے والے تھے دیر تک وہاں دم بخود کھڑے رہے۔ چند روز تک کالج میں انہی لڑکوں کی کوتاہی موضوع بنی رہی۔ پرنسپل نے انھیں سخت سست کہا۔ پھر وہ ڈیرہ نواب صاحب میں " حاضر آئے " مگر ہز ہائی نس نے اپنے الطاف خسروانہ کو بروئے کار لا کر انھیں بڑوں کا ادب کرنے کی تلقین فرمائی اور اسیروں کو رہا کر دیا اور پھر وہ بی۔ اے فائنل تک موٹر چھوڑ ہر لاری اور ٹرک کو بالالتزام فرشی سلام کرتے رہے۔

عربی کے مولوی صاحب عموماً ریاستی زبان میں تعلیم دیتے تھے لیکن ایک دن اسلام کے شاندار ماضی کا ذکر کرتے ہوئے اردو میں فرمانے لگے " ظفر علی خان کا اسلامی دبدبہ دیکھو، کہتا ہے :

اک گرز کی طاقت ہے مرے خامے کے اندر
اس گرز سے البرز کو بھی سرمہ بنا دوں

اور پھر وہ لاہور والا اقبال کہتا ہے کہ :

یتیمی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرانشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

ایک لڑکے نے بڑے بھولپن سے کہا " مولوی صاحب جہاں آرا تو کسی لڑکی کا نام معلوم ہوتا ہے " مولوی صاحب کی نرم دلی اور خوش گفتاری مسلّم تھی۔ مگر یہ فقرہ ان کے موڈ کے خلاف تھا اس لیے فوراً غصے میں آ کر بولے " تم سب حرامزادے ہو "۔

یہاں سے وہاں تک لڑکوں کے چہرے فق ہو گئے اور وہ ایک دم بنچوں پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولوی صاحب کی نیک دلی کو اچانک اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ فوراً اپنے لہجے کو بدل کر بولے " تم سب میرے بچے ہو! "

مولوی صاحب نے اپنی گالی واپس لے لی تھی۔

ایک روز یہی مولوی صاحب باہر برآمدے میں بیٹھے لڑکوں کو پڑھا رہے تھے کہ ادھر سے ایک اور مولوی صاحب گزرے اور عربی کے مولوی صاحب کو سلام کیا۔ ان دونوں حضرات کے درمیان ریاستی زبان میں جو گفتگو ہوئی وہ درج ذیل ہے۔

مولوی صاحب نمبر ۱　　　گیا ہا دیں ؟　　　(کیا تم گئے تھے)

مولوی صاحب نمبر۱ـ کن ؟ (کدھر ؟)

" نمبر۱ـ اُن ! (ادھر)

نمبر۲ـ کو ! (نہیں)

نمبر۱ـ کھلا ای (لعنت ہو تجھ پر)

اس کے بعد وہ امراء القیس اور متنبی کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کی ٹک شاپ کا جواب برعظیم ایشیا کے تمام دار العلوموں کی ٹک شاپیں پیش نہیں کرسکتیں۔ اس معاملے میں بھی بہاول پور اپنی ریاستی روایات پر بڑی سختی سے کاربند تھا۔ یہ ٹک شاپ ایک خوانچے پر مشتمل تھی جس کا رقبہ چھ مربع فٹ ہوگا۔ یہ عین ہوسٹل گیٹ سے باہر دھری رہتی تھی اس کا محافظ یوپی کا ایک نحیف ونزار بڈھا تھا۔ جو کسی زمانے میں انگریز افسروں کا بٹلر رہ چکا تھا۔ خوانچے میں مختلف خانے تھے، جن میں بھنے ہوئے چنے، کھجوریں، مکھانے، گڑ کی ریوڑیاں، کھانڈ کی ریوڑیاں، مونگ پھلی، خشک بیر اور پاسنگ شو سگریٹ وغیرہ رکھے رہتے تھے۔ "کالجیٹ" حضرات بڈھے سے قرضے پر کھاتے تھے یہ قرضہ دو یا چار برس تک چلتا تھا اور پھر وہ قرضہ ادا کیے بغیر اپنے اپنے شہروں کو روانہ ہو جاتے تھے اور کالج کے منتظمین ان کی اس دست درازی میں اس لیے مخل نہیں ہوسکتے تھے کہ بڈھا کالج کی حدود سے آدھ فٹ باہر تھا۔ بعد میں سُنا کہ اس ٹک شاپ کے سسٹم میں بڑی بڑی انقلابی دفعات نافذ ہوئی ہیں۔ یعنی اب ٹک شاپ کا منیجر بڈھے کی بجائے ایک نوجوان ہے ٹک شاپ پر ہمیشہ ٹاٹ یا کھیس کا ایک ٹکڑا پھیلائے رکھنا اشد ضروری ہے۔ ورنہ مکھیوں کی یلغار کا خطرہ رہتا ہے اور اگر کوئی "کالجیٹ" مثال کے طور پر ٹک شاپ والے کو دس روپے کا قرضہ ایک مہینے کے اندر اندر ادا نہ کرسکے تو کالج کی طرف سے اس پر دو آنے جرمانہ ہوجاتا ہے۔

اقتصادیات کے پروفیسر صاحب یکتائے روزگار شخصیت تھے۔ صاف ستھرا مغربی لباس پہنتے تھے۔ پتلے دبلے مگر ناک نقشے سے اچھے خاصے۔ انھیں دیکھنے سے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اکنامکس کے آگے پیچھے کے مسائل کے بارے میں سوچ تک نہیں سکتے۔ ان دنوں کارڈوں اور لفافوں کے عجیب وغریب نرخوں کے باعث طلبہ کے پاس پائیاں بہت تعداد میں جمع رہتی تھیں۔ حالت یہ تھی کہ ادھر پروفیسر صاحب کرسی پر آکر بیٹھے، اُدھر مختلف گوشوں سے پروفیسر صاحب پر پائیوں کا مینہ برس گیا۔ یہ پائیاں پروفیسر کی ترکی ٹوپی، ماتھے، ناک، ہونٹ، ٹھوڑی اور سینے پر لگ کر میز پر گرتی تھیں اور وہ مسکراتے ہوئے ان پائیوں کو چن چن کر جیب میں رکھتے جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بھی اکنامکس کا ایک اصول ہے۔ ان کے پیریڈ میں بلاناغہ بلی کے بولنے کی آواز آتی تھی۔ پہلے تو وہ حسب معمول مسکراتے رہے۔ لیکن ایک روز فرمایا اور حکم دیا کہ جو لڑکا بلی کی بولی بولتا ہے وہ کھڑا ہوجائے!

ہم نے کہا "پروفیسر صاحب۔ بلی کی بولی بولنے کے جرم میں بلی ہی کو کھڑا کیا جاسکتا ہے ہمارا کیا قصور؟ . . .

"LEAVE THE CLASS" انھوں نے کہا اور ہم کلاس سے باہر آگئے۔

دوسرے روز کلاس میں آتے ہی انھوں نے حکم دیا کہ ہمارے سوا باقی سب لڑکے کمرے سے نکل جائیں۔ دم بخود لڑکے آہستہ آہستہ کھسک کر باہر گیلری میں آگئے۔ اب کمرے میں پروفیسر صاحب تھے اور ہم۔ پروفیسر صاحب نے کہا۔

"دیکھو کل تمھارے جانے کے بعد بلی نہیں بولی۔ اس کا مطلب یہ ہے یہ بولی تم ہی بولتے ہو۔ آج میں پنتالیس منٹ تک نگرانی کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس شرارت میں ایک روز کا ناغہ ہو جائے۔ یہ تمھاری شکست اور میری فتح ہو گی۔ اس لیے چپ چاپ بیٹھ کر "مارجنل یوٹلیٹی" کے بارے میں پڑھتے رہو۔"

ہم عجیب مصیبت میں مبتلا ہو گئے اور پھر ہم شکست بھی نہیں کھانا چاہتے تھے۔ آدھے گھنٹے تک یونہی بیٹھے رہے کہ اچانک پروفیسر صاحب گری ہوئی پنسل اٹھانے کے لیے جھکے اور ہم نے ایک زناٹے کی میاؤں کی! پروفیسر صاحب تیورا کر اٹھے اور پھر ہمیں گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ باہر گیلری میں ایک دم ساٹھ ستر لڑکے قہقہے مار کر ہنس دیے۔ اور پھر پروفیسر صاحب نے دروازے پر جا کر کہا:

"COME IN, COMIN, I AM THE VANQUISHED AND HE IS THE VICTOR BUT CULPRIT HAS BEEN PICKED UP AND I MESSAGE HIM TO DISCONTINUE THIS HOBBY IN THE INTEREST OF ECONOMICS"

(اندر آ جاؤ۔ میں شکست خوردہ ہوں اور یہ فاتح ہے۔ لیکن مجرم پکڑا جا چکا ہے اور میں اس سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اب اس شغل کو اکنامکس کے نام پر آیندہ کے لیے چھوڑ دے)

ہم اس شغل سے تائب ہو گئے۔ البتہ جب کانووکیشن کے موقع پر ڈگری حاصل کرنے گئے اور اقتصادیات کے یہ پروفیسر صاحب ہمیں بڑے تپاک سے ملنے آئے تو ہم نے خلوص و عقیدت کے اظہار کے درمیان ہلکی سی میاؤں بھی عرض کر ہی اور وہ کچھ ایسے بے اختیار ہو کر ہنسے کہ کانووکیشن کے موقع پر وزیر اعظم کی موجودگی میں بھرے ہال کے سامنے منہ میں رومال ٹھونسے رہے۔

ایک لڑکے کے بالوں کی تعریف ہو رہی تھی۔ جو صاحب تعریف کر رہے تھے "اگر میرے اس قسم کے خوبصورت بال ہوتے اور کوئی مجھے ایک لاکھ روپیہ بھی دیتا تو میں ان کو استرے کے حوالے نہ کرتا۔"

خوبصورت بالوں والے لڑکے نے کہا: "اگر تم مجھے ایک روپیہ دو تو میں ابھی اُسترے سے سر منڈوانے کو تیار ہوں۔" لڑکا مان گیا۔ نائی بلایا گیا اور خوبصورت بال غائب ہو گئے۔ ہکا بکا لڑکا اپنے کمرے سے ایک روپیہ لے آیا۔ اور ڈھیلے ڈھالے ہاتھوں سے فتح مند نوجوان کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

اب ایک روپے کی شرط پر سر منڈانے کی وبا چل نکلی اور جب لڑکے دھڑا دھڑ سر منڈانے لگے تو شرط میں اس اصول کا اضافہ کیا گیا کہ روپیہ منڈے ہوئے سر پر بجا کر دینا چاہیے۔ ایک لڑکے کے سر پر ایک پہلوان قسم کے نوجوان نے روپیہ بجایا تو اس کا تالو چھل گیا اور یوں بڑی مشکل سے یہ وبا تھمی۔ ایک روز "سر منڈی برادری" نے فیصلہ کیا کہ آج کل اقتصادیات کے پروفیسر صاحب باہر دھوپ میں پڑھاتے ہیں۔ اس لیے منڈے ہوئے سروں پر خوب تیل چپڑ کے جاؤ اور بیک جنبش دست ان کے سامنے ٹوپیاں اتار دو۔ سورج چپڑے ہوئے سروں پر چمکے گا اور پروفیسر صاحب کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔ اس تجویز پر عمل کیا گیا۔ پروفیسر صاحب نے اچانک اپنے سامنے آٹھ دس منڈے ہوئے تاباں درخشاں سر دیکھے تو بولے: "یہ ابتدائی انسانوں کے سر تم کہاں سے اٹھا لائے ہو!"

پروفیسر کی چوٹ سخت تھی۔ اس لیے لڑکوں نے جھینپ کر ٹوپیاں پہن لیں۔

کالج میں ایک مشاعرہ ہوا۔ شہر کے ایک بزرگ کو صدر بنایا گیا۔ یہ صاحب شاعری کے بجائے اپنی امارت کے باعث صدر قرار دیے گئے تھے۔ بہت تنومند اور "دبیز گردن" تھے۔ داد زبان کی بجائے ہاتھ سے دیتے تھے۔ کالج کے ایک لڑکے فتح محمد صادق نے غزل پڑھی۔ مقطع سُن کر صدر صاحب پھڑک اٹھے اور صادق کو داد دی، یعنی اپنا مگدر نما ہاتھ صادق کی پیٹھ پر جما کر مارا۔ صادق چیخ کر بیہوش ہو گیا۔ نبضیں ڈوبنے لگیں پتلیاں اوپر چڑھ گئیں اس کے منہ پر پانی چھڑکا گیا۔ صدر صاحب نے جیب سے خمیرہ گاؤ زبان عنبری جواہر والا کی ڈبیا نکال کر خمیرہ چٹایا (یعنی دوسری داد دی) اور جب فتح محمد صادق کو ہوش آیا تو وہ زیرِ لب کہہ رہا تھا آداب عرض!

آداب عرض!

کالج میں نہ جانے کس نوعیت کی جوبلی پر ایک ڈرامہ اسٹیج ہوا۔ آغا حشر کاشمیری مرحوم کا ڈرامہ "عشق و فرض" اس مقصد کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ دو مہینے ریہرسلیں ہوتی رہیں۔ ہم ڈرامے کے ہیرو یعنی سہراب تھے اور مشہور ریڈیو فیچر رائٹر آغا شمن گورگانی ہیروئن یعنی گرد آفرید! ڈرامے کی ابتدا میں "سہیلیوں" نے حمد گائی۔ ہال کھچا کھچ بھرا تھا کسی کی آواز آئی "یہ تو سہیلے ہیں" سارا ہال ہنسنے لگا۔ "سہیلیوں" نے گھبرا کر گانا بند کر دیا۔ ڈائرکٹر نے پردہ گرانے کا اشارہ کیا تو اس دوران میں "سہیلیاں" ایک قدم پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ اس لیے پردے کا بھاری بھرکم بانس ان کی کھوپڑیوں پر پڑا۔ اس صدمے سے ایک "سہیلی" بیہوش ہو کر گر پڑی اور وہ یوں کہ اس کی ٹانگیں پردے کے باہر تھیں اور سر اندر اور جب اسے گھسیٹ کر پردے کے پیچھے لایا گیا اور پانی چھڑکا گیا تو سامعین نے سُنا کہ ڈرامہ اسٹار ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے ہیں۔

گرد آفرید مردانہ بھیس میں سہراب سے لڑ رہی ہے۔ تلواریں بج رہی ہیں سہراب کو ہدایت ملی ہے کہ وہ تلوار اٹکا کر گرد آفرید کو گرا دے تاکہ اس کے سر کی ٹوپی گر جائے اور نیچے سے گرد آفرید نکل آئے اور سہراب اس پر فدا ہو جائے۔ سہراب۔ (یعنی میں جناب) پر گھبراہٹ طاری تھی۔ تلواریں ٹین کی تھیں۔ لیکن آخر تلواریں تھیں اور بازوؤں کا مجمع تماشائی تھا۔ ہاتھ پیر پھول رہے تھے اس لیے سہراب نے گرد آفرید کو اڑنگے پر چڑھا کر اس زور کی پٹخنی دی کہ مردانہ لباس کی ٹوپی تو خیر گر گئی تھی کے ساتھ ہی گرد آفرید کے مصنوعی نسوانی بال بھی گر گئے اور اب اسٹیج پر گرد آفرید کی بجائے شمن گورگانی بیٹھے تھے اور سہراب (احمد ندیم قاسمی) سوچ رہا تھا کہ اب اظہارِ محبت کیسے کیا جائے۔ حالات کو مخدوش دیکھ کر شمن نے گرد آفرید کے بال سر پر رکھ لیے اور سہراب نے اس کی طرف ممنون نظروں سے دیکھ کر رٹے ہوئے مکالمے دہرانا شروع کیے۔

یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔

آفتاب جہاں تاب نے ۔۔۔۔۔۔۔"

لیکن لوگ کہتے ہیں کہ قہقہوں کے درمیان ہمارا اظہارِ محبت کسی نے نہیں سُنا تھا۔

ایک بار سہراب نے غصے میں آ کر ڈرامے کے ولن کو مارنے کے لیے میان سے خنجر نکالا اور پھر اُسے معاف کرتے ہوئے ٹین کے خنجر کو مخمل کی میان میں تیزی سے ڈالا، تو خنجر میان کو پھاڑ کر سہراب کی ہتھیلی میں گھس گیا اور وہ مکالمے بھول گیا۔ اور اگرچہ ابھی پندرہ منٹ کا پارٹ باقی تھا، مگر گھبرا کر بولا "اب جو ہم کل ذرا اطمینان سے تیری خبر لیں گے

اور پیچھے ہٹ کر اس نے خود ہی پردہ گرا دیا۔ PROMPTER کو اچانک کچھ دیر کے لیے باہر جانا پڑا۔ اس لیے ہم اپنی عینک لگائے PROMPT کرنے لگے کہ اچانک سین بدلا۔ اور ہماری ENTRI کی باری آگئی۔ ہم فوراً مسودہ رکھ کر عینک سمیت اسٹیج پر آگئے اور اپنے جرنیلوں کو ڈپٹنے لگے۔ اور جب سارے ہال نے شور مچایا کہ رستم و سہراب کے زمانے میں عینک کہاں استعمال ہوتی تھی اور...... کیا سہراب عینک لگاتا تھا...... تو ہم نے پیچھے ہٹتے ہوئے عینک ڈائرکٹر کے سپرد کردی اور ڈرامے کی روانی میں کوئی خلل پیدا نہ ہوا۔

ہمارے بیشتر استادوں کے ٹخنے بج رہے تھے اور حواس باختہ ہو رہے تھے اس لیے ہم سین پر سین کاٹتے گئے اور آخر اعلان کے برخلاف تین گھنٹے کا ڈرامہ ایک گھنٹہ دو منٹ میں ختم ہو گیا۔

اب ڈرامہ ختم ہو چکا ہے۔ لیکن سامعین کرام ہیں کہ اس وقفے کو انٹرول سمجھ کر سگریٹ پی رہے ہیں اور سوڈے کی بوتلیں کھلوا رہے ہیں اور اٹھنے کا نام نہیں لیتے اور ادھر ڈراما یونٹ کے چہروں پر ایک رنگ آتا ہے اور ابھی جاتا نہیں کہ دوسرا آجاتا ہے۔ بڑی لے دے کے بعد ہمیں اس کام کے لیے منتخب کیا گیا کہ سامعین کا شکریہ ادا کریں اور انھیں ڈرامے کے ختم ہونے کی اطلاع دیں۔ اختلاج پر بمشکل قابو پاکر ہم نے (سہراب نے) پردے کے پیچھے سے سر نکالا، تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ہمت بڑھی تو ہم نے کہا ــ "حضرات! کالج کی ڈرامیٹک سوسائٹی کی اس پہلی کوشش کو آپ نے جس توجہ سے دیکھا اور سنا اس کے لیے ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ آیندہ بھی ہمارے ساتھ اسی طرح گہرا تعاون کریں گے!"

"اور کیا ڈرامہ ختم ہو گیا؟" بہت سی آوازیں آئیں اور ہم بیک روم کی طرف بھاگے۔ بس اتنا معلوم ہو سکا کوئی ایک درجن کے قریب کرسیاں اسٹیج پر آکر گریں، اور دو ڈھائی سو کے قریب گالیاں پردے پھاڑ کر ہمارے آس پاس بکھر گئیں اور ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ پاؤڈر پسینے میں مل کر سہیلیوں کے چہرے پر پلستر بن کر چمٹ گیا تھا اور سہراب زخمی ہاتھ پر رومال باندھ رہا تھا اور گرد آفرید کہہ رہی تھی "بڑے آئے ہیرو کا پارٹ کرنے والے" ایسی پٹخنی دی کہ خدا کی قسم اگر معاملہ اسٹیج کا نہ ہوتا تو ہاتھا پائی ہو جاتی۔"

اور پروفیسر مرلی دھر ڈائرکٹر نے آکر اطلاع دی کہ "نامرادو تم سب سامعین کی طرف پیٹھ کیے بولتے رہے ہو تم نے میری ڈائرکشن کا ستیاناس کر دیا۔"

فرسٹ ایئر کے لونڈوں میں سے ہاکی کے اچھے اچھے کھلاڑیوں کا انتخاب مد نظر تھا، اس لیے ان کا آپس میں میچ قرار پایا۔ سینیئر لڑکوں نے انھیں REFRESHMENT پیش کرنے کی حامی بھری۔ ہاف ٹائم کے موقع پر سب کو بے حد لذیذ اور ٹھنڈا شربت پیش کیا گیا اور جب دوبارہ میچ شروع ہوا تو سب کے سب لڑکے ہاکیاں پھینک کر بال کے تعاقب میں بھاگنے لگے۔ پھر انھیں ہاکیاں یاد آئیں تو واپس آکر اٹھائیں اور ایک صاحب نے سرپٹ بھاگ کر مقابل کے گول میں اپنی ہاکی اسٹک پھینک دی اور "گول گول" کا شور مچا دیا۔ ہر طرف ایک ہلڑ مچ گیا۔ کچھ کھلاڑی بیٹھے خواجہ فرید کی کافیاں گا رہے تھے، کچھ سر کے بل کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ دو کھلاڑی سنٹر میں بیٹھے رو رہے تھے پھر اچانک لڑکھڑا کر اٹھتے ہوئے وہ اپنی ٹانگوں پر "بولی" کرنے لگے۔ پرنسپل نے کھیل ختم کر دیا اور کھلاڑیوں کی اس وحشت

کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ پتہ چلا کہ سینیئر لڑکوں نے ان سب کو بھنگ پلا دی ہے۔ وہ سخت خفا ہوئے اور ان کو دوسرے روز دفتر میں پیش ہونے کا حکم دیا۔ فرسٹ ایر کا ایک لڑکا ذرا ہوش میں تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ بھنگ کی تجویز پیش کرنے والا ایک نوجوان خواجہ محمد ہے، یہ سنتے ہی وہ تیورا کر گرا۔ کراہنے لگا اور بڑبڑانے لگا۔ "میں آسمان کی طرف جا رہا ہوں، میں فرشتوں سے کبڈی کھیل رہا ہوں، میں جنت کے ہاکی گراؤنڈ میں کھڑا ہوں اور ایک بدمعاش خواجہ محمد میرے ساتھ ہے۔ خواجہ محمد کو فرشتے گالیاں دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں "او خواجے" "او حرامزادے" "او الو کے پٹھے"۔

غرض اس نے خواجہ محمد پر گالیوں کا ایک طومار باندھ دیا اور جب خواجہ محمد غصے میں بپھرا ہوا اس پر جھکا تو وہ ایک آنکھ کھول کر بولا "آپ کے مزاج تو اچھے ہیں"۔

دیوالی کے موقع پر چند لڑکوں کے دلوں میں نہ جانے کیا سمائی کہ بہاول پور کے بازار سے نکل گئے اور ڈاکہ زنی کی تجویزیں سوچنے لگے۔ چند ہندو بزرگوں سے مٹھائی سے بھری ٹوکریاں چھین کر بھاگ گئے اور دوسرے لڑکوں نے ان بزرگوں سے ہمدردی شروع کر دی تاکہ ڈاکوؤں کو فرار میں آسانی ہو۔ بیس نوجوان مٹھائیوں کی ایک دوکان پر گئے۔ مولوی عبدالصمد جو نومسلم تھے اور بے حد شریر تھے۔ اس گروہ کے سرغنہ تھے۔ بولے "جلیبیاں لاؤ"۔

"کتنے کی؟" دکان دار نے پوچھا۔

اور مولوی عبدالصمد جلال میں آ گئے "یعنی تم ہماری پوزیشن نہیں دیکھتے اور پوچھتے ہو کتنے کی؟ کیا ہم چھٹانک دو چھٹانک کے گاہک معلوم ہوتے ہیں۔ اے لڑکو اس شخص نے ہماری ہتک کی ہے اس لیے دکان لوٹ لو"۔

دوکان جتنی لوٹی جا سکتی تھی، لوٹ لی گئی۔ گھڑسوار ریاستی پولیس کالج کے لڑکوں سے ویسے بھی دبتی تھی اس لیے بے توجہی سے آگے نکل گئی۔ اور ڈاکو آگے بڑھے۔

مولوی عبدالصمد نے کہا "سگریٹ لاؤ"۔

"کون سے"؟ دکان دار نے پوچھا "پاسنگ شو یا قینچی"؟

"منہ سنبھال کر بات کر"! مولوی صاحب کو پھر جلال آ گیا۔ کیا ہم گھس کھدے ہیں کہ پاسنگ شو پیتے پھریں۔ فائیو۔ فائیو اور فائیو، فائیو، فائیو کے سوا اگر ہمارے ہونٹوں نے کبھی کسی دوسری سگریٹ کو TOUCH کیا ہو تو ہمارے ہونٹوں میں کیڑے پڑیں۔ اے لڑکو! اس شخص نے ہماری پوزیشن پر تھوکا ہے اس لیے لوٹ لو"!

مونگ پھلی، ریوڑیاں، کھانڈ، کھجور — غرض مختلف نعمتوں سے جیبیں اور جھولیاں ٹھونس لی گئیں۔ دوسرے دن لاہور کے ہندو اخباروں کی LEAD کچھ اس قسم کی تھی۔

"بہاولپور کے مسلمان طلبہ نے ہندو دکان داروں کو لوٹ لیا — ایک لاکھ روپے کا نقصان — ریشمی کپڑے کے تھان ہوسٹل کے کمرے سے برآمد ہو چکے ہیں۔ ملزم فرار ہو گئے۔ ریاست بہاول پور میں اندھیر گردی"!!

ابھی ہم سنبھلنے نہیں پائے تھے کہ چپراسی ہم سب کے نام پرنسپل کا نوٹس لایا۔ یہ نوٹس ڈاکے کے سلسلے میں حاضری کا تھا۔ کوئی صاحب شاید سی۔ آئی۔ ڈی میں بھرتی ہونے کی مشق فرما رہے تھے، اس لیے مخبری کر دی۔ ایک ہندو لڑکے ذریعہ چند

کے سوا باقی سب کے نام صحیح تھے اور وزیر چند تو رات بھر ہم پر لعنت بھیجتا رہا بے چارا۔

اکیس ملزم کالج میں آئے تو معلوم ہوا کہ "مہا سبھا" یا کانگریس کے کسی لیڈر نے ہز ہائی نس اور وزیر اعظم کو بھی اطلاع دے دی ہے اور پرنسپل کے غصے کی انتہا نہیں اور شہر میں ہڑتال ہونے والی ہے۔ افضل نے کہا "ندیم تمہیں تو بی۔ اے فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے کی امید اور یہاں ابھی تک یہ بھی یاد نہ ہو سکا کہ رانا سانگا اکبر سے لڑا یا اورنگ زیب سے۔ اس لیے ہمارا کیا ہے فکر تمہاری ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

سرِ نیاز کا کیا ہے رہا رہا نہ رہا
خدا کرے کہ ترا آستانِ ناز رہے

اس نے شعر بڑی رقت سے پڑھا اور پھر ہم سب بے اختیار ہنس دیئے اور یوں انتہائی بے حیا اور ڈھیٹ ہو کر پرنسپل کے دفتر کی طرف بڑھے۔ وزیر چند نے رونی صورت بنا کر کہا "ندیم تم اپنی گول پگڑی میرے سر پر رکھ دو میں چہرے سے مسلمان لگتا ہوں۔ اس پگڑی سے ضرور ہندو گننے لگوں گا اور اگر مجھے مسلمان سمجھ لیا گیا تو بے گناہ مارا جاؤں گا۔ سنا ہے اندر دونوں دکان دار بھی پرنسپل نے بلا رکھے ہیں اور میں نے تو تم سے صرف مونگ پھلی کے چند دانے مانگ کر کھائے تھے۔"

میں نے پگڑی وزیر چند کے سپرد کر دی اور ہم پرنسپل کے سامنے حاضر ہوئے۔ دکان داروں سے کہا گیا کہ ملزموں کو چن لو۔۔۔۔

"یہ صاحبان بھی۔۔۔ وہ ڈر اور غصے کے ملے جلے جذبات سے اصلی مجرموں کو چنتے گئے۔ مولوی عبد الصمد کی داڑھی تھی اس لیے پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ دوکان دار میرے سامنے آئے غور سے دیکھا اور بولے "نہیں یہ صاحبان نہیں تھے" پھر وہ وزیر چند کے قریب گئے اور بولے "یہ صاحبان سب سے آگے تھے، اس مولوی صاحبان کے ساتھ!" وزیر چند نے کہا "غور سے دیکھو بھائی" دوکان دار نے کہا "ہم جانتے ہیں چوہدری، ہم نے تمہاری پگڑی بڑے غور سے دیکھی تھی" یہ وزیر چند بے گناہ پس گیا اور پھر کالج ہال میں سب کلاسوں کے طلبہ کو جمع کیا گیا۔ پرنسپل نے زبردست تقریر کی۔ ڈاکو لڑکوں پر پچاس پچاس روپے جرمانے کا اعلان ہوا۔ اور کہا "تم نہیں جانتے کہ ڈسپلن کے معاملے میں کتنا سخت ہوں۔ میں میٹھی چھری ہوں"۔۔۔۔

"آپ تو چھرے ہیں؟" ایک آواز آئی۔۔۔۔ اور باوجود غصے کے پرنسپل اپنی مسکراہٹ پر ضبط نہ کر سکے۔

کالج ہال میں چند پٹھان پشتو گیت اور رقص کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ایک خوش باش نوجوان منظور احمد جو اپنی پسند سے تخلص "ابلیس" فرماتے تھے۔۔۔ پشتو زبان جاننے کے دعوے دار تھے اور پشتو کچھ اس روانی سے بولتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ساری عمر قبائلی علاقہ میں رہے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ ان کی پشتو کی آزمائش ہو جانی چاہیے۔ ہمیں شبہ تھا کہ لہجہ پٹھانوں کا سا سہی مگر جو زبان بولتے ہیں وہ پشتو نہیں ہو سکتی۔ پرنسپل کو ابلیس صاحب کی مہارت اور تبحر کا قصہ سنایا اور اجازت چاہی کہ وہ اسٹیج پر ان پٹھانوں سے پشتو میں باتیں کریں۔ تجویز منظور ہوئی۔ ابلیس صاحب گھبرانے والے کب تھے۔ لپک کر اسٹیج پر پہنچے اور اچانک اپنی پشتو کا طوفان چھوڑ دیا۔ پٹھان کھڑے سنتے رہے۔ پھر جب ابلیس رکے تو پرنسپل صاحب نے پٹھانوں سے پوچھا "خان! کیا یہ لڑکا پشتو بولتا ہے؟"۔۔۔۔

ایک پٹھان نے کہا "صاحب بولتا تو پشتو ہے پر یہ کوئی عربی کا پشتو بولتا ہے!"۔۔۔۔

صادق ایجرٹن کالج بہاول پور کی بوالعجبیوں کی معراج یہ ہے کہ جب ہم گریجویٹ ہونے کے بعد۔۔۔۔ OLD STUDENTS کی حیثیت سے CONVOCATION میں اپنی ڈگریاں لینے گئے تو سب سے پہلے اپنے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ مولوی حاجی احمد صاحب سے ملنے گئے، وہ باہر آئے، ہمارے سلام کا جواب دیا اور بولے "ہوسٹل کی فیس ادا کرنے کا یہ وقت نہیں شام کو آنا" اور وہ اندر چلے گئے اور ہم جو چھ سات مہینے کے بعد کالج کی یادیں تازہ کرنے آئے تھے بوکھلا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

اس عجیب وغریب کالج کی چند خصوصیتیں ایسی بھی ہیں جن کی وجہ سے طلبہ وہاں جاتے تھے تو وہیں کے ہو رہتے تھے۔ ابتدائی دور میں پرنسپل مشتاق احمد ہدی کی موجودگی جو انگریزی اور اردو ادب پر حاوی تھے شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھاتے تھے اور جانتے تھے کہ ۱۶، ۱۷ برس سے ۲۰، ۲۱ برس کی عمر تک انسان کی ذہنیت میں کھلنڈرا پن، بغاوت، جوش اور جذبہ پوری قوت سے ابھرتے ہیں اور ان کے آگے بند باندھنا سخت ناعاقبت اندیشی ہے۔ پھر علی گڑھ کے مشہور پروفیسر پیرزادہ عبدالرشید تھے جو WORDSWORTH اور KEATS, SHLLY, BYRON کے شعروں کی تشریح کرتے ہوئے یہ کبھی نہ بھولتے تھے کہ وہ غیرفانی شاعری پر گفتگو کر رہے ہیں۔ ان کی محبوب شخصیت سے سارا کالج آباد نظر آتا تھا۔ پھر بہاول پور ہی کے پروفیسر مجید تھے، جو تاریخ پڑھاتے تھے اور جن کی پرنسپل شپ کے دوران ہم ڈاکہ زنی کے مرتکب ہوئے تھے۔ یہ ان کی شگفتہ مزاجی کا ثبوت ہے۔ انتہائی غصے میں بھی وہ چہری اور چھرے کے مذاق پر مسکرا دیے اور سب کو معاف کر دیا۔۔۔ اور پھر بہاول پور کے صحرا اور کھجوریں اور خواجہ فرید علیہ الرحمۃ کی کافیاں اور نرم وشیریں بولی "سائیں کن ویندے او" یہاں کے عوام کی حالت بالکل گداگروں کی سی تھی اور نظام حکومت سخت ترانہ۔ لیکن ان دنوں یہ سوچنے کی مہلت نہ تھی۔ شرارتوں کے طوفان تھے اور زندگی کے اُبلتے ہوئے ولولے تھے۔ جو اس ریاستی کالج میں بڑی بھونڈی شکلیں اختیار کر لیتے تھے۔

شخصیتوں میں سے صرف دو یاد ہیں۔ ایک بار حفیظ جالندھری تشریف لائے۔ وہ نواب بہاول پور کے پاس بالالتزام تشریف لاتے تھے اور "دنیوی شاہوں کی مداحی نہیں آتی مجھے" کہنے کے باوجود نہ جانے وہاں کیا کرنے آتے تھے۔۔ وہ کالج میں نہیں آئے۔ ایک بار سڑک پر جا رہے تھے کسی نے پہچان لیا۔ بہت سے لڑکوں نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور قصہ ختم ہو گیا۔۔ ایک بار مولانا ظفر علی خان نے بہاول پور میں قدم رنجہ فرمایا۔ کالج میں تشریف لائے۔ ہماری کلاس میں آئے، ہم کالرج کی ایک نظم پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے اس نظم کے چند بند زبانی سنا دیے۔ پھر پوچھا۔ "یہاں سب مسلمان لڑکے ہوں گے"۔۔۔

پرنسپل نے کہا "جی نہیں۔ ہندو اور سکھ بھی ہیں"۔۔۔

حضرت مولانا نے فرمایا "خیر سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اور یہ برطانوی سامراج کی کشتی ہے"۔۔۔

لڑکوں کے چہروں پر شفق پھول اُٹھی اور پرنسپل صاحب صرف مسکرا دیے۔۔۔ جیسے کہہ رہے ہیں۔ "میں کیا عرض کر سکتا ہوں"۔۔۔

احمد ندیم قاسمی

یادگار تحریریں

ایک تعارف، ایک دیباچہ

ذیل میں احمد ندیم قاسمی کے ابتدائی دور کی دو یادگار تحریریں پیش کی جا رہی ہیں۔ پہلی ایک "تعارف" ہے جو نوعمر افسانہ نگار رام لعل کے پہلے افسانوی مجموعہ "آئینے" کے لیے لکھا گیا تھا جسے ایسٹرن آرٹس اکیڈیمی لاہور نے جون ۱۹۴۴ء میں شایع کیا۔ یہ تعارف فروری ۱۹۴۴ء میں لکھا گیا تھا۔

دوسری تحریر — راقم الحروف کے دوسرے شعری مجموعہ "خاکے" کا "دیباچہ" ہے جو اشاعت پذیر نہیں ہو سکا۔ یہ دیباچہ نومبر ۱۹۴۶ء میں لکھا گیا تھا۔ اُن دنوں میں بھوپال میں تھا اور "افکار" کے ادارہ سے منسلک!

——— صہبا

(۱)

تعارف

اس مجموعہ کے مصنف کا نام اس قدر سیدھا سادہ ہے کہ آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے اور پوچھیں گے، کیا ادیبوں کے نام اتنے ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ اور پھر خاص کر اردو کے ادیبوں کے؟

نام کی سادگی کے علاوہ آپ کو ایک اور بات بھی کھٹکے گی اور آپ مجھ سے پوچھیں گے، اچھا، یہ رام لعل بھی کوئی افسانہ نگار ہیں؟ ہم نے تو ان کا نام پہلے کبھی نہیں سُنا! —

لیکن رام لعل واقعی بہت اچھا افسانہ نگار ہے۔ اوّل اوّل جب اُس نے مجھے اپنے افسانے مطالعہ کے لیے دیے تو میں نے رسمی تکلف کے زیر اثر انھیں پڑھنے کا وعدہ کر لیا۔ کئی دن گزر گئے اور اس مجموعہ کا مسودہ کتابوں کے انبار تلے دبا رہا۔ ایک روز میں ایک خاص کتاب کی تلاش میں تھا کہ یہ مسودہ نظر پڑا۔ پہلے افسانے کی ابتدائی سطریں ہی پڑھی تھیں کہ میں چونکا اور آخری افسانے کی آخری سطر پڑھ کر اٹھا۔ مجھے جو چیز رام لعل کے افسانوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور اچھوتی معلوم ہوئی وہ

اس کا شدید احساس ہے اور یہ احساس اس قدر صاف اور صحت مند ہے کہ رام لعل اس ضمن میں انفرادی حیثیت کا مالک ہے۔

رام لعل سے اُردو داں طبقہ متعارف نہیں۔ میں بھی ان بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا جو تعارف نگاروں کا خاصہ بن چکی ہیں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ رام لعل کی کہانیاں اپنا تعارف خود کرا لیں گی۔ میں یہاں صرف اُن تاثرات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جو ان افسانوں کے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔

موجودہ دور کے اُردو افسانہ نے جو شکل اختیار کرلی ہے وہ بہت حد تک تسلی بخش اور دل خوش کن ہے۔ ان افسانوں میں نئی تکنیک کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ رام لعل پلاٹ کا بہت زیادہ قائل معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن وہ پلاٹ کی اہمیت سے بے خبر بھی نہیں۔ ایک ننھی سی بات، ایک ذرا سا واقعہ اس کے حساس دل میں تھرتھراہٹ پیدا کردیتا ہے، اور وہ اپنی دیہاتی ذہنیت اور تعلیم یافتہ ماحول کے پس منظر پر پیاری اور خوبصورت تصویر اتار لیتا ہے۔ اس تصویر کا ایک ایک خط ایک ایک خم سحر انگیز ہوتا ہے۔ رنگ آمیزی میں بھی اُسے کافی دست رس حاصل ہے۔ اگر اُس کی زبان ذرا زیادہ صاف ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ اُس کی یہ کہانیاں اُردو ادب میں ایک بالکل نئے اور اچھوتے دور کا آغاز ہوتیں۔ اگرچہ اب بھی ان میں اتنی خوبیاں موجود ہیں کہ زبان کی لغزشیں قبول کی جاسکتی ہیں۔

رام لعل کا انداز تحریر مفکرانہ ہے۔ زندگی کے اس گرجتے دھارے میں اس کی تیز نگاہ ایک بے مایہ تنکے کو بھی دیکھ اور پرکھ سکتی ہے۔ وہ کف آلود لہروں میں گھری ہوئی چٹانوں کی طرف اتنا متوجہ نہیں ہوتا جتنا بلبلوں، تنکوں اور گردابوں کی طرف!

وہ نقاش بھی ہے اور عکاس بھی۔ وہ ذہنی تصویریں بھی تیار کرسکتا ہے اور کائنات میں بکھری ہوئی بے شمار تصویروں کا فوٹو بھی اتار سکتا ہے۔ وہ سوچتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے۔ اور یہی خوبی ہے جو اُس کی کہانیوں کو زندہ رکھے گی، کیونکہ بصیرت اور بصارت اگر الگ الگ ہوکر کام کریں تو زندگی زندگی نہیں رہتی۔

اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ چند مجبوریوں نے رام لعل کی کہانیوں کو منصۂ شہود پر آنے سے روکے رکھا۔ اور اُردو ادب کی خوش بختی ہے کہ رام لعل اپنے افسانوں کا مجموعہ چھپوا کر اُردو کے خزانے میں ایک بیش بہا اضافہ کررہا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر اردو دانوں کے دماغ رام لعل کی گم نامی سے اثر پذیر نہ ہوئے اور انھوں نے اس مجموعے کا شوق سے مطالعہ کیا تو اُن پر میرے ان گزارشات کی صداقت عیاں ہوجائے گی۔ یہ واضح رہے کہ میں رام لعل کو اتنا نہیں جانتا جتنا رام لعل کی کہانیوں کو۔ میں نہایت فخر سے یہ کہانیاں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

احمد ندیم قاسمی

(۲)

دیباچہ

یہ ایک عجیب و غریب حقیقت ہے کہ ان دنوں ترقی پسند شاعروں کے جدید ترین گروہ کے ذہنوں پر ترقیٔ معکوس کا عمل جاری ہے، اور اردو کی نئی شاعری کے علمبرداروں نے نوجوان شعرا کو فنی امکانات کی وسعتوں پر چھا جانے کے لیے بس

افق کی طرف روانہ کیا تھا، وہ اِس درجہ سمٹ سکڑ چکا ہے، کہ شعرا کی جدید تر پود مسلسل آگے بڑھتے جانے کی بجائے مسلسل پیچھے ہٹ رہی ہے، اور یقین و اعتماد کے خیابانوں میں قدم رکھنے سے پہلے ہی مایوسانہ پلٹ کر ذہنی عقدوں اور فکری معمول کے اُس خارستان میں اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ جس نے ہماری شاعری کو گذشتہ دو تین صدیوں سے جکڑ رکھا تھا، فکر اور زاویۂ فکر دونوں بدل چکے ہیں، مگر تذبذب و تشکک نوجوانوں کے خیالات پر اس شدت سے طاری ہے کہ ان کے نزدیک ہر عمل کا انجام دھندلکا اور ہر حرکت کی انتہا افتاد ہے۔

ذاتی طور پر میں اس اُلجھاؤ کو ماحول کا اثر کہوں گا، لیکن مصیبت یہ ہے کہ شاعر کی عظمت صرف اس بات میں نہیں کہ وہ اپنے گردوپیش کی کماحقہٗ عکاسی کرے، اور اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے زندگی کے نقوش کی ہو بہو تصویرکشی کر کے الگ ہو جائے، شاعر جس فن کی نمایندگی کرتا ہے، وہ تمام فنونِ لطیفہ بلکہ تقریباً تمام علوم انسانی میں بلند ترین درجہ رکھتا ہے، اس لیے صرف عکاسی اس فن کی نمایندگی کا حق ادا نہیں کر سکتی، در اصل اپنے ماحول کا پورا پورا جائزہ لے لینے کے بعد ان دھندلکوں سے نکلنے کے لیے نئی راہیں سجھانے اور ایک احسن اور اکمل انسانیت کی تعمیر ہی میں شاعر کی عظمت کا راز مضمر ہے، وہ لوگ جو شعرا کو محض ماحول کی کسوٹی پر پرکھ کر اچھے بُرے کا اعلان کر دیتے ہیں، فن کی ترقی میں مزاحم ہو رہے ہیں، اور میری تمنا ہے، کہ اردو شاعری کے نقاد اب "عبوری" اور "سیمابی" اور "بحرانی" قسم کی اصطلاحات کی رٹ کو ختم کر کے اس سیلاب کا ایک رُخ اور ایک رستہ مقرر کریں، تاکہ ہمارا فن مسلسل افراتفری اور بے مقامی کے ہولناک نتائج سے محفوظ رہے۔

اوپر کی سطور میں میں نے جن جدید تر شعرا کی طرف اشارہ کیا ہے، انھوں نے ایک خاص جذبہ کو اپنے تمام افکار کا محور بنا لیا ہے، اور اب تک صرف اُسی کے گرد گھوم رہے ہیں، انھیں شاید اس بات کا علم تک نہیں (اور اگر علم ہے تو اس سے اغماض برتنے کے مرتکب ہو رہے ہیں) کہ شدید حساس اور گہرا ادراک بڑی شاعری کے نمایاں ترین عناصر ہیں، جن احباب کو اس حقیقت کا علم ہے، انھوں نے صرف احساس یا صرف ادراک کو شاعری کا موضوع قرار دے لیا ہے، حالانکہ احساس و ادراک کا متوازن امتزاج ہی آفاقی شاعری کا خالق ہے۔

صہبا لکھنوی خوش قسمتی سے اُن معدودے چند نوجوان شعرا میں سے ہیں، جنھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی شاعری میں اس امر کا ثبوت پیش کیا ہے، کہ وہ محسوس کرتے ہوئے سوچتے بھی ہیں۔ اور سوچتے ہوئے محسوس بھی کرتے ہیں، اگرچہ صہبا اپنی جماعت کے بیشتر افراد کی طرح ابھی تک اپنے ذہنی عقدوں کا شکار ہیں، لیکن ان کی اکثر نظموں میں —— (داد بدایونی اور منیب الرحمٰن کی طرح) ان عقدوں کو کھولنے اور زندگی کا ایک واضح اور نمایاں نظریہ وضع کرنے کی تڑپ موجود ہے، اور یہی خوبی اُن کے مستقبل کی درخشانی کی زبردست دلیل ہے، مجھے امید ہے، کہ اگر صہبا اپنی فنی قوتوں کو ضبط و نظم سے استعمال کرتے رہے، تو وہ بہت جلد نئے کارواں کے قافلہ سالاروں میں شمار ہونے لگیں گے۔

انسان کے بنیادی جذبات میں کبھی کسی دور میں تغیر رونما نہیں ہوا، ظاہری صورتوں نے چاہے جتنے بھی رنگ اختیار کیے ہوں، لیکن یہاں بحث اُس جڑ سے ہے، جو آدمیت کے احساسات و تصورات کی گہرائیوں میں چلی گئی ہے، اور شاید یہی وجہ ہے، کہ وہ اشعار جو حسن و محبت سے متعلق ہوں، چاہے، کتنے ہی پرانے ہوں، ہمیں اب تک محبوب ہیں، اور آنے والی نسلوں کو بدستور محبوب رہیں گے، کیونکہ محبت اور حُسن پرستی کا جذبہ کبھی مٹ نہیں سکتا —— جذبات کے برعکس انسان کے

حالات مبہم تغیر کی زد میں ہیں، یہ سمندر کی سطح پر بکھرا ہوا جھاگ ہے۔ جو ہر نئی موج کے مس سے نئی صورت اختیار کر لیتا ہے
جو فنکار ان متغیر حالات اور بدلتے ہوئے ماحول کے گہرے مشاہدے سے عاری رہتا ہے، دیانت دار کہلانے کا مستحق نہیں۔

صہبا نے اپنی اکثر نظموں میں ماحول کا نہایت صحیح اور مکمل جائزہ لیا ہے، اور اس جائزے میں اپنے احساسات کو سمو کر ان نظموں کو ایک یادگار صورت بخشی ہے، ہندوستان کا شاعر جب اپنے ماحول کا جائزہ لیتا ہے تو ضروری بات ہے کہ مغربی استعمار کی انسان کشی سے متاثر ہو کر وہ موجودہ حالات کے انقلاب کے لیے پکارے گا، اور اگر اس کی قوتِ فکر احساس و ادراک کے مرکب سے عبارت ہے تو انقلاب کی ایک صورت معین کر دے گا، ورنہ صرف مروجہ طرزِ حکومت کو بدل ڈالنے کے لیے چیختا چلاتا رہے گا، اس طرح اگرچہ اس کی دعوتِ انقلاب محض توڑ پھوڑ اور تخریب کا پیغام بن کر رہ جائے گی ـــ (اور ہمارے اکثر ترقی پسند شعرا اس ٹریجیڈی کا شکار ہو چکے ہیں) لیکن یہ شور و شغب جدید تر شعرا میں سے کئی ایک کو سوچنے پر مجبور کر سکتا ہے، اس لیے اسے قطعی طور سے مردود قرار دینا عاقبت نااندیشی ہے، صہبا نے اس کے متعلق سوچا ہے، اگرچہ اُن کی دعوتِ انقلاب شروع شروع میں محض رواجی رہی، جو صدا میں "ملت کے غداروں کی فطرت کا مزاج" (؟) دیکھ کر وہ ہمیں کسی تعمیری پروگرام سے دوچار نہیں کرتے۔ بلکہ صرف یہ بتاتے ہیں، کہ وہ "آج ہاتھوں کو خون سے رنگنے کے لیے اٹھے ہیں"ـــــ نظم کی ابتدا بھی خون ہے، اور انتہا بھی خون، اور اس کے درمیان "پھونک ڈالوں گا"، "جھلس دوں گا"، "برق بن بن کر گردں گا"، "راکھ کر دوں گا" کے نعرے ہیں۔ ـــــ نظم پڑھنے کے بعد دنیا خاک و خون میں تھتھڑے ہوئے ایک بے ہنگم ملبے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتی ـــــ اسی طرح بھوک میں وہ زردار اور مفلس کے مسلسل تقابل کے بعد ہمیں کسی نتیجے تک نہیں پہنچاتے۔ لیکن چٹانیں، اور اس قبیل کی دوسری نظموں میں صہبا ایک ایسے حساس انقلابی کی صورت میں جلوہ گر نظر آتے ہیں، جس کے اندازِ فکر میں انفرادیت ہے، اور جو اپنے ماحول کو عام زاویوں سے الگ ہو کر ایک ایسے گوشے سے دیکھ رہا ہے، جہاں خوردبینوں اور دوربینوں کی ضرورت نہیں پڑتی، جہاں ساری کائنات بیک وقت شاعر کے سامنے اپنی تمام وسعتوں اور پہنائیوں سمیت موجود رہتی ہے ـ

صہبا سوچتے ہوئے شاعر ہیں، اُن کی اکثر نظمیں اُن کے گہرے تفکر کی تصویریں ہیں، وہ بہت حساس ہیں، اس لیے مسائل کو محض اچٹتی نظر سے نہیں دیکھتے، بلکہ تہوں میں ڈوب جاتے ہیں، ڈوبنے کے بعد ابھرنا اور ابھارنا یا زیادہ صحیح الفاظ میں ابھرنے کے راستے کی طرف اشارہ کر دینا ہر اچھے شاعر کا خاصہ ہے، اور صہبا نے بھی اس ضمن میں قابلِ تعریف کوششیں کی ہیں، لیکن بسا اوقات وہ تہوں کی روئیدگی میں اس قدر اُلجھ جاتے ہیں، کہ اُن کا ذہن اور پڑھنے والے کے خیالات ایک ابدی بھٹکاؤ کا شکار ہو جاتے ہیں، وہ بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں، اور بہت کچھ کہہ بھی لیتے ہیں، لیکن الجھ جاتے ہیں، اگرچہ وہ اپنی فنی قوتوں سے اس الجھاؤ کو بھی حسین بنا لیتے ہیں، لیکن میں اُس وقت کا منتظر ہوں جب وہ ایک پختہ یقین اور غیر متبدل اعتماد کے ساتھ اشعار کہیں گے اور اپنی انفرادیت کو اجالیں اور نکھاریں گے۔

ذہنی الجھاؤ مایوسی کا پیش خیمہ ہے، اسی لیے جب وہ زیر و بم میں کہتے ہیں ؎

خواہشوں کی تربتیں ہیں زندگی کے موڑ پر

تو ہم سوچنے لگتے ہیں کہ اس موڑ سے آگے اور اس قبرستان سے پرے بھی تو بہت کچھ ہوگا، اور پھر زندگی کے ہر موڑ

پر صرف تربتیں ہی تو نہیں ہوتیں۔

اسی طرح تار و پود میں وہ سوچتے ہیں ع

کتنی بے نور ہے بے رنگ ہے بے آب ہے زیست

تو ہر ذہین قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا، کہ زیست منور اور بوقلموں بھی تو ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ شاعر کی ابدی مایوسی سے قطع نظر بعض اوقات انسان پر ایسی حالتیں بھی طاری ہو جاتی ہیں جب زیست سچ مچ بے نور، بے رنگ اور بے آب نظر آنے لگتی ہے، اور ہماری طویل مسافت کا پہلا موڑ تربتوں سے پٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

باوجود ان مایوسانہ خیالات کے صہبا رجائیت کے سحر سے محروم نہیں، اور کیا عجب ہے کہ اُن کا احساسِ محرومی ہی حرکت و عمل کا پیغامبر ہو، ماحول میں وہ چونک کر پکار اٹھتے ہیں ؎

کروٹیں لینے کو بے تاب ہے دنیا کا نظام

ہونے والا ہے شکنجوں سے اب آزاد بشر

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شعاعِ امید ایک روز آفتابِ اقبال بن جائے۔ بہر کیف اس سے انکار نہیں کہ صہبا کا رجحان طلوع کی طرف ہے۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ دورِ جدید میں حقیقت پسندی اور صداقت نگاری کی تحریک ایک ہوّے (COMPLEX) کی صورت اختیار کر گئی ہے، اس رجحان کی نمائندگی کرنے والا گروہ قدیم و جدید علمِ تنقید سے شناسا ہونے کے باوجود نہ جانے اس روشن تر حقیقت اور تابندہ تر صداقت سے کیوں منکر ہے، کہ شاعری صرف عکاسی نہیں، شاعری ایک تخلیقی عمل ہے، اور یہ ضروری نہیں کہ ہر تخلیق گذشتہ ان گنت تخلیقات کے عین مین مشابہ ہو، شاعر حسن کار ہے، اور حسن کار اپنے ماحول کے علاوہ اپنے تخیل سے بیگانہ نہیں رہ سکتا، یہی وجہ ہے کہ جو شاعری گہرائی سے محروم ہے، وہ ابدی نہیں، محض ایک کوندا ہے جو لپکتا ہے تو آسمان و زمین چونک اُٹھتے ہیں، لیکن بجھتا ہے، تو آسمان بھی اُسے بھول جاتا ہے، اور زمین بھی!

میں ہمیشہ ہر اچھے شاعر کے کلام میں حسین حکمت اور جمیل گہرائی کا متلاشی رہا ہوں، اور مجھے خوشی ہے، کہ صہبا اس بے بدل قوت سے محروم نہیں، بلکہ اس کی ساری شاعری میں فلسفۂ زندگی کی ایک لہر سی دوڑتی چلی گئی ہے (یہاں یہ بحث مقصود نہیں کہ صہبا کا فلسفۂ زندگی کس نوعیت کا ہے، ایک نوجوان شاعر سے ایک منضبط لائحۂ عمل کی توقع رکھنا زیادتی ہے) تعاقب میں وہ کہتے ہیں ع

زندگی بھاگتے سایوں کا تعاقب ہی تو ہے!

کتنی بڑی سچائی کو کتنے مختصر الفاظ میں کتنی خوبصورتی سے سمو دیا ہے، لیکن صہبا اس حقیقت کے پاتال تک جاتے ہیں ع

بھاگتے سائے ۔ مشیت جنھیں لوٹا نہ سکی

اس بے چارگی میں بھی حرکت و عمل کے تسلسل کا احساس کتنا ہمہ گیر اور حیات افروز ہے!

اسی سچائی کو وہ ایک اور صورت میں یوں بیان کرتے ہیں ع

زندگی کیا ہے؟ حوادث کا حسیں الجھاؤ

اور پھر جائزہ اور خاکے تمام و کمال ـــ صہبا کا یہی کلام ہے جو اُس کے روشن مستقبل کی طرف ایک واضح اشارہ کر رہا ہے۔

صہبا سیاست و فلسفہ کے موضوعات پر لکھتے ہوئے یہ نہیں بھولتے کہ وہ شاعر ہیں، اور شاعری فن کے جمالیاتی تقاضوں سے بیگانہ رہ کر شاعری نہیں کہلا سکتی، اوپر کے ایک مصرعہ میں "حوادث کا حسیں الجھاؤ" کے الفاظ ہی صہبا کی اس خصوصیت کا ثبوت ہیں، لیکن صہبا نے چند ایسی نظمیں بھی کہی ہیں، جن کا موضوع اول و آخر محبت ہے، ان نظموں میں اُن کا غنائی نظریہ اس درجہ صحت مندانہ ہے کہ کئی نوجوان شعرا کی اندھی جنس پرستی اور صہبا کے فطری عشق میں ایک واضح امتیازی خط کھینچا جا سکتا ہے۔ فرائڈ اور انیس کی آرا کو نقش کا الحجر سمجھنے والے حضرات کو یہ نہیں بھولنا چاہیے، کہ نفسیات و جنسیات کے ممتد سے یہ غواص بھی تو آخر انسان تھے، اور ان کے نظریات میں ترمیم و تنسیخ کی وہ تمام گنجائشیں موجود ہیں جو سیاست دانوں اور ماہرینِ اقتصادیات کے معین و منضبط اصولوں میں پیدا کرلی گئی ہیں۔ اور جن سے مذہب کے الوہی احکام کو بھی خالی نہیں سمجھا گیا، صہبا نے صرف کتابوں میں عشق و محبت کے اسباب و علل کا ذکر پڑھ کر غنائی نظمیں نہیں کہیں۔ بلکہ اُن کے بیان کی بے ساختگی، اظہار کی نرمی اور جذبات کی صداقت سے صاف مترشح ہے، کہ وہ آپ بیتی بیان کر رہے ہیں، اور یہ ضروری نہیں، کہ ہر انسان کا جنسی تجربہ یکساں ہو، الزام میرے اس دعوے کی دلیل ہے، صہبا کو محبت کی عظمت و طہارت کا احساس ہے، وہ اسے محض شاعرانہ خیال آرائیوں کا ذریعہ نہیں بناتے بلکہ احساس میں کہتے ہیں ؎

ترے خاموش نالوں کی پکاروں سے بھی واقف ہوں
تری بہکی جوانی کے نظاروں سے بھی واقف ہوں
مگر تجھ سے بطورِ نذر بھی دل لے نہیں سکتا
تجھے دے کر بھی سب کچھ اک محبت دے نہیں سکتا!

اور اس مجبوری کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ محبت کے متعلق اپنا نظریہ بیان کرتے ہیں ؏

محبت جذبۂ بے اختیاری ہے، پرستش ہے،

بے اختیارانہ پرستش کی کیفیتوں کی تفصیل میں جانا اس مصرع کی جامعیت پر ظلم کرنا ہے،

صہبا نے ذہنِ انسانی کا خاصا مشاہدہ کیا ہے، اوپر اس کی کئی مثالیں درج کی جا چکی ہیں، لیکن جب صہبا خارجی مشاہدے کو داخلی گہرائیوں کا نمائندہ بنا کر پیش کرتے ہیں تو اُن کی قوتِ مشاہدہ کی ہمہ گیری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ؎

اونچے اونچے پیڑ صحرا میں، قطار اندر قطار
دور تک جیسے کھڑے ہوں خامشی کے پہرہ دار　　زیر و بم

اور ؎

سبزۂ گیتی کی یہ مستی بھری انگڑائیاں
لہلہاتے کھیت، کھیتوں کی حسیں پہنائیاں　　زیر و بم

نیز ؎

صبح کی چھاؤں، سرد انگارے
مضمحل چاند، مضمحل تارے
راہ رو جیسے ہوں تھکے ہارے

جنتِ موہوم

"مضمحل چاند، مضمحل تارے!" — ان چند الفاظ میں آسمان کی لٹتی ہوئی بساط کی مکمل تصویر موجود ہے۔ لکھنوی ہونے کی رعایت سے صہبا کو زبان کے معاملے میں حد درجہ محتاط ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ زبان کے اصولوں کا احترام کرنے کے باوجود کئی مقامات پر ان سے انحراف کر جاتے ہیں، گو یہ انحراف ایک بڑی حد تک اجتہاد کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ زبان میں ترقی کے امکانات سے صہبا آگاہ معلوم ہوتے ہیں، انھیں الفاظ کے انتخاب پر بھی اچھی قدرت حاصل ہے۔ اور وہ صرف قافیہ و ردیف کو ترنم کا ذریعہ نہیں قرار دیتے بلکہ الفاظ کی ایک اُمڈتی ہوئی لہر سے سارے مصرع میں موسیقی کی روح کو حل کر دینے کے قائل ہیں، کئی جگہ تو اُن کے قلم سے ایسے اشعار نکل گئے ہیں، کہ اُن کی صحیح لذت سے بہرہ اندوز ہونے کے لیے کسی موسیقار کی ضرورت نہیں پڑتی، یہ اشعار خود بخود ایک ترنم لرزش بن کر ہمارے احساسات میں تیر جاتے ہیں ؎

تو نے چاہا تھا مرے ساتھ چلے، ساتھ چلے
جو چلے راہ میں تھک جائیں گے، معلوم نہ تھا
دیکھ کر زیست کی گرتی ہوئی دیواروں کو
زلزلے آئیں گے اور آئیں گے، معلوم نہ تھا

زلزلے

اور ؏

اک خلش موہوم سی، اک ٹیس نا معلوم سی!

زیر و بم

اور ؎

کوئی احساسِ تگ و تاز نہیں، کچھ بھی نہیں
کوئی آہٹ، کوئی آواز نہیں، کچھ بھی نہیں

آہٹ

نیز ؎

کتنی بے نور ہے، بے رنگ ہے، بے آب ہے زیست
کتنی افسردہ ہے، پژمردہ ہے، بے خواب ہے زیست

تار و پود

اور ؎

کتنے شعلے ابھی بھڑکے نہیں، بھڑکے ہی نہیں
کتنے طوفاں ابھی مچلے نہیں، مچلے ہی نہیں

تار و پود

صہبا کا کلام اس قسم کے مترنم اشعار سے لبریز ہے۔

لیکن صہبا اپنی اچھی خاصی نمایاں انفرادیت کی پرواہ کیے بغیر کبھی کبھی مقبول شعرا کی تقلید پر اُتر آتے ہیں، اور (غیر شعوری طور پر ہی سہی) کئی ایسے الفاظ اور بندشیں نظم کر جاتے ہیں کہ بجائے ان کے، ہمارے ذہن پر کسی دوسرے

شاعر کا اثر نمایاں ہونے لگتا ہے "تعاقب" میں وہ فیض احمد فیض سے متاثر ہیں، "اجنبی راہیں" جو یوسف ظفر سے، اور "تم نے تو کہا تھا آؤں گی" میں اختر شیرانی سے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ یہاں نقالی کے مرتکب ہوئے ہیں، صہبا کی شاعرانہ قوتیں اتنی محدود نہیں، مقصد یہ ہے کہ وہ کئی شعراء سے وقتی طور پر اس قدر متاثر ہو گئے ہیں، کہ اپنی ذات کو پس منظر میں رکھنا گوارا کر لیا ہے۔ ویسے اپنے معاصرین سے ایک حد تک متاثر ہونا گناہ نہیں، اور میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں، کہ اگر اردو شاعری میں اکبر الہ آبادی اور حالی کا وجود نہ ہوتا، تو اقبال کا رنگِ سخن کچھ اور ہوتا، اور ڈاکٹر اقبال نہ ہوتے، تو جوش اب تک ——— "صنم دشمنِ ایماں" کو پہلو میں مچلتا دیکھتے رہتے، اور اگر جوش ہماری سیاسی اور معاشرتی زندگی کے "الاب" میں لہروں پر لہریں نہ پیدا کرتے، تو ترقی پسندی کی تحریک چند نوجوانوں کے ذہنوں میں گھٹ کر دم توڑ دیتی۔

صہبا کا تاریخی اور جدلیاتی مطالعہ نظریاتی زیادہ ہے اور فکری کم، لیکن ایک نئے اور نوجوان شاعر کی حیثیت سے وہ کامیاب ہیں، اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہیں، جہاں وہ "مجبوری"، "شکریہ" اور "وہ" ایسی معمولی نظمیں کہتے ہیں، "مشغلہ اور جواب" میں پرانے خیالات کو پرانے انداز میں دہراتے ہیں، "ناچ" کی خوبصورت ابتدا کرنے کے بعد آخر میں جا کر ساری نظم کو دھندلا دیتے ہیں، وہیں وہ "تار و پود"، "ادت"، "جائزہ" اور "مرحلہ" وغیرہ ایسی مکمل اور مؤثر کامیاب نظمیں کہہ سکنے پر بھی قادر ہیں، ساتھ ہی اُن کو اپنی کمزوریوں کا احساس ہے، اور ان کا "جواز" بھی اُن کے ہاں موجود ہے، "تمنائے" پڑھنے کے بعد ہم صہبا کے اعترافات کو سراہتے ہیں، لیکن کاش ان اعترافات اور اس جواز کی بنیاد الجھنوں کی بجائے اعتماد و یقین پر ہوتی۔

نظم میں نئی نئی فارموں کے کامیاب تجربے کرنے کے علاوہ صہبا آزاد نظم بھی کہتے ہیں، اگر وہ چند آزاد شاعروں کی نظموں سے اس لحاظ سے بلند ہے، کہ ردیف و قافیہ سے نظم کو محروم کر کے انھوں نے وزن کے انتخاب میں نہایت خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے اور مختصر و طویل مصرعوں کی رگوں میں موسیقی کی روح حلول کر ڈالی ہے۔

صہبا غزل سے باغی نہیں، یہ اُن کی سلامت روی کی ایک مثال ہے، وہ اس حسین و جمیل صنفِ شاعری میں ایک نئی روح پھونکنے کے قائل ہیں، اس مجموعے میں اُن کی شاید کل تین غزلیں شامل ہیں، لیکن یہ چند اشعار پڑھیے، نوجوان شعراء میں عمقِ نظر اور پختگی بیان کی، ایسی بہت کم مثالیں مل سکیں گی، اور پھر غزل تو انتہا درجہ کا تجربہ اور مسلسل مشق، یعنی فنی ریاضت چاہتی ہے ؎

عجب تیری دنیا کا عالم ہے یارب　　　نہ جینا ہی آساں نہ مرنا ہی آساں
زیست کے رنگیں گلستانوں سے کھیل　　　موت کیا ہے؟ ایک خونیں قہقہہ

پہلا مصرع موت کے متعلق طول طویل نظموں پر بھاری ہے، ایک اور غزل کا ایک شعر ہے ؎

پھونک دے پھونک دے بنائے قفس
آشیاں حدِ آشیاں تک ہے

میرے خیال میں لمبی چوڑی گرجتی دہاڑتی انقلابی نظموں سے وہ کام نہیں ہو سکتا جو صہبا کی غزل کے اس تنہا شعر کے بس میں ہے!

صہبا ایک ہونہار فن کار ہیں، اور اگر انھوں نے خیالات و احساسات پر نظم و ضبط رکھنے کے علاوہ، فوری طور پر متاثر ہو جانے سے بچ کر زندگی کی وسیع تر پہنائیوں پر منڈلانے کے بجائے ان میں ڈوب جانے کے رجحان کو قائم رکھا، تو وہ آیندہ دور میں اردو کے ایک منفرد شاعر تسلیم کیے جائیں گے، مجھے اُن کی قوتوں پر اعتماد اور اُن کی صلاحیتوں پر یقین ہے، اللہ تعالیٰ برکت اور استقامت دے!

احمد ندیم قاسمی

سازِ ارتقا

ہم گونج ہیں سازِ ارتقا کی

م۔ ب پیرزادہ

ندیم کا بچپن

مدیرِ [illegible] جناب [illegible] نے مجھے ندیم کی زندگی، شخصیت اور فن پر مقالہ لکھنے کا حکم دے کر مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ میں شعر و ادب کا قاری ضرور ہوں مگر ادیب نہیں ہوں۔ ندیم کے فن کے بارے میں میرے چند اپنے تاثرات ہیں مگر میں شاید انھیں مروجہ تنقیدی اصطلاحوں میں [illegible] پیش نہ کر سکوں۔ ندیم کی شخصیت کے بارے میں شاید مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا ہوگا۔ مگر اس کی شخصیت کے احاطے کے لیے مجھے ایک مختصر مضمون کی بجائے ایک ضخیم کتاب لکھنی چاہیے۔ البتہ ندیم کی زندگی —— خاص طور پر ابتدائی پندرہ برس تک کی زندگی کے بعض واقعات اس اعتماد کے ساتھ [illegible] سکتا ہوں کہ قارئین بھی دلچسپی محسوس کریں گے۔ وجہ یہ ہے کہ ندیم بچپن میں شرارتوں کی پوٹ تھا۔ اس کی یہی شرارتیں بعد میں سلیقہ اور تہذیب اختیار کر کے اس کے افسانوں کے بیشتر مقامات پر مزاحیہ چاشنی کی صورت میں نمایاں ہوئیں اور اس کے بعد اس کے فکاہی کالم تخلیق ہوئے جو اردو ادب میں مزاح اور طنز کے دورِ جدید کا عنوان ثابت ہوئے ہیں۔

ندیم کی اور میری عمر میں کل ڈیڑھ برس کا فرق ہے۔ چنانچہ ندیم سے اٹھارہ ماہ پہلے اس دنیا میں وارد ہونے کی وجہ سے اس کا بڑا بھائی کہلاتا ہوں۔ ورنہ ہم دونوں ہم عمر ہی ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں جب والد گرامی کا انتقال ہوا تو ندیم کی عمر آٹھ برس تھی۔ اور وہ اپنے گاؤں انگہ ضلع سرگودھا کے پرائمری اسکول میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا۔ میں ان دنوں رام موہن رائے ہائی اسکول میں [illegible] پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور اپنے چچا جان کے ہاں مقیم تھا جو وہاں مہتمم خزانہ تھے۔ تب والد گرامی کی رحلت پر یکایک مجھے معلوم ہوا کہ میں ساڑھے نو دس برس کا لڑکا اس گھرانے کا "سربراہ" ہوں۔ ہم عمر ہونے کے باعث اور آپس میں بے انتہا محبت کرنے کے سبب ہم عملاً ایک دوسرے کے دوست ہیں، مگر ندیم نے اس دوستی میں بھی میری سربراہی کے منصب کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ وہ اب تک میرا اسی طرح احترام کرتا ہے جیسے سرپرست کا کرنا چاہیے۔

میں نے ندیم کے بڑے بھائی کے منصب کو کس طرح نبھایا، یہ کبھی ندیم سے پوچھیے یا ممکن ہے ندیم خود نوشت سوانح کے پرانے منصوبے کو زیرِ عمل لائے تو اس کی تفصیل بیان کرے۔ بہرحال میں اپنے فرائض پوری طرح بجا لاتا رہا۔ ندیم کے سکون و آسائش کے لیے میں نے اپنی زندگی وقف کر دی اور حسبِ استطاعت اسے بے فکر رکھنے کی سعی کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ

ہیں اس میں کامیاب رہا ورنہ ہمیں جن حالات کا سامنا تھا ان کی دست برد سے اُردو کے اس عظیم شاعر، افسانہ نگار، مزاح نویس اور نقاد کا اپنے آپ کو بچائے جانا ناممکن تھا۔

اس وقت میری نظروں کے سامنے اس کا معصوم بچپن بھی ہے اور بے داغ جوانی بھی۔ پھر اس کی ملازمت کی جدو جہد کے قصے بھی ہیں اور اس کی آسودہ حالی بھی۔ اس کا فن بھی میرے سامنے ہے اور اس کے فن کے مخالفین بھی۔ جن کا ندیم کے پاس صرف ایک جواب ہے — اور وہ ہے اس کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ جیسے اسے بے چارے مخالفین پر ترس آ رہا ہے — میرے سامنے اس کے دوستوں کے جمگھٹ بھی ہیں، اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس کی بیشتر دوستیاں غیر شاعر اور غیر ادیب افراد کے ساتھ تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ انسان پر اس کی انسانیت کے حوالے سے فدا ہوتا ہے۔

میرے خیال میں مجھے ندیم کے بچپن کی بعض ایسی شرارتوں ہی پر اکتفا کرنا چاہیے جو اس وقت فوری طور پر میرے ذہن میں آئی ہیں، مگر اس سے پہلے بچپن کی اس زندگی کا ایک مختصر سا پس منظر شاید ضروری ہو۔

ہم نے دیہاتی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ پرائمری تک تعلیم اپنے ہی گاؤں کے پرائمری اسکول میں حاصل کی — (اس سے پہلے گاؤں کی مسجد میں قرآن شریف کی بھی تعلیم حاصل کی)، پھر ہماری تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ہمارے بزرگوار چچا جان پیر حیدر شاہ نے اٹھائی، جو اُن دنوں ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ پر فائز تھے۔ ہمارے لیے ان کے ہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ خدمت کے لیے نوکر، سواری کے لیے گھوڑے (وہ بنیے ندیم کبھی اچھا گھڑ سوار نہ بن سکا)، دودھ دہی کے لیے گائیں بھینسیں، اعلیٰ درجہ کا فرنشڈ مکان۔ اور سب سے بڑھ کر محترم چچا جان اور چچی جان کی بے اندازہ — بے حساب — بے انتہا شفقت —

ہمارا بچپن سراسر مذہبی ماحول میں بسر ہوا۔ ہم نے انہی پیاری ہستیوں سے نماز، ورد، اوراد و وظائف پڑھے۔ ہر حالت میں صبر و شکر کا درس بھی انہی سے لیا — غیرت مندی بھی انہی نے ہمیں سکھائی۔ یہ انہی کی ابتدائی تربیت ہے جس نے ہماری شخصیتوں میں وہ صلابت پیدا کر دی جس پر ہمیں بجا طور پر فخر ہے۔ گاؤں کی مسجد میں ناظرہ قرآن کے درس کی ابتدا تو ہو چکی تھی۔ ہم چچا جان اور چچی جان کے زیرِ تربیت آئے تو قرآنِ پاک کے ترجمے بلکہ تفسیر تک کی تعلیم کا آغاز ہو گیا۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۱ء تک ہمارا معمول رہا کہ ہمیں علی الصبح جگا دیا جاتا، ہم نماز پڑھتے، پھر ترجمۂ قرآن کا درس لینے چچا جان کے گھٹنوں سے لگ کر بیٹھ جاتے جو ہمیں سلیس انداز میں ضروری نکات سمجھاتے ہوئے ساتھ ساتھ سعدی اور اقبال کے شعر بھی پڑھتے جاتے۔ ندیم کی شعر دوستی نے ابتدا ہیں وہیں سے جلا پائی —

اس طرزِ تربیت میں پابندیاں بھی بے شمار تھیں جو ہمیں اُن دنوں تو زہر لگتی تھیں، مگر اب ان کے بارے میں سوچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہم ان پابندیوں سے آزاد ہوتے تو ہم بے مقدار ذرات کی صورت میں کسی معمولی سے بھی جھونکے کی زد میں آ کر کہیں بکھر بکھرا چکے ہوتے۔ بہرحال ایک پابندی یہ تھی کہ ہم بازار سے مٹھائی یا پھل خرید کر نہیں کھا سکتے تھے۔ یہ سب چیزیں ہمیں گھر ہی میں کھانے کو مل جاتی تھیں۔ اسکول سے واپس گھر آنے کے بعد ہمیں گھر سے نکلنے کی آزادی نہ تھی۔ ہمارے گھر کا وہ حصہ جس میں ہم بچوں کا کمرہ تھا ایک وسیع و عریض دالان پر مشتمل تھا۔ حکم تھا کہ اپنے ہم جماعت اور ہم عمر دوستوں کو اپنے مکان پر بلا لیا کرو اور وہیں کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، والی بال، بیڈمنٹن، گلی ڈنڈا، جو چاہو کھیلو۔ البتہ جس روز چچا جان

دوسرے پر جانے کا پروگرام بنانے، ہم اندر ہی اندر بے حد مسرور ہوتے، کہ اب دوسرے بچوں کی طرح کھل کھیلنے کی چھٹی ہوگی۔ دوستوں کے پاس جائیں گے۔ اسکول کے میدان میں جا کر کھیلیں گے۔ بازار کے چکر لگائیں گے اور اپنے جیب خرچ سے، جو عام طور پر خرچ ہونے کی بجائے جمع ہوا کرتا تھا، قسم قسم کی مٹھائیاں کھائیں گے۔ ندیم جسے ہم اس کے نام (احمد شاہ) کی رعایت سے "شاہ" کہتے تھے، کھل کھیلنے کے یہ پروگرام بنانے میں پیش پیش ہوتا۔ وہ بچپن ہی میں ہنس مکھ تھا۔ دماغ ہمہ وقت رنگ رنگ کی شرارتوں سے اٹا رہتا تھا۔ وہ بچپن میں خوب موٹا تھا۔ اس پہ اس کے بھن متھنے چہرے کی معصومیت سے دوسرے بچے دھوکا کھا جاتے تھے۔ اچانک جب اس کے خوبصورتی سے ترشے ہوئے موٹے ہونٹوں میں سے شگفتگی کا فوارہ چھوٹتا تو سب حیران رہ جاتے کہ یہ ننھا سا تو بڑا قیامت ہے۔ بذلہ سنجی اس کے مزاج کا ایک نمایاں پہلو تھی۔ اپنی اوصاف نے اسے ابتدائی جماعتوں ہی میں اسکول کا "ہیرو" بنا دیا تھا۔ سکول کا کوئی استاد ایسا نہ تھا جو اس ذہین اور بظاہر معصوم مگر بے حد طرار احمد شاہ کو نہ جانتا ہو۔ کوئی ادبی محفل، کوئی مباحثہ، کوئی مجلس، کوئی ٹورنامنٹ، کوئی دوڑوں اور چھلانگوں کا مقابلہ ایسا نہ تھا جس میں "شاہ" حصہ نہ لیتا ہو۔ ڈرامہ ہو رہا ہے تو "شاہ" اس میں کوئی اہم پارٹ ادا کر رہا ہے۔ مباحثہ ہے تو شاہ کھڑا تقریر کر رہا ہے۔ محفلِ لطائف ہے تو شاہ خود ساختہ لطیفے سنا سنا کر ساری محفل کو زعفران زار بنا رہا ہے۔ بیت بازی کے مقابلے میں خود ہی شعر موزوں کر کے پڑھ رہا ہے۔ مگر ان سب کے علاوہ اس کی بچپن کی شرارتوں نے جنہیں دیکھ کر ہمارے چچا جان کا سا سنجیدہ انسان بھی ہنسے بغیر نہیں رہتا تھا، شاہ کو کچھ زیادہ ہی پیارا بنا دیا تھا۔

چچا جان کو ولایتی مرغیاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ کئی قسموں اور نسلوں کی مرغیاں، مرغے، مویشی والی کھلی حویلی میں موجود رہتے۔ ایک دن یکایک مرغیوں نے بیک آواز جو شور مچانا شروع کیا تو پورے محلے کو سر پر اٹھا لیا۔ دو بلیوں کے لڑنے کی آوازیں بھی ساتھ آ رہی تھیں اور یہ آوازیں اتنی خوفناک تھیں کہ مرغیوں کی جان پر بن گئی تھی۔ نوکروں نے ہر طرف دیکھا بھالا مگر بلیاں پاس کی دیواروں یا پڑوس کی چھتوں پر کہیں موجود نہ تھیں۔ میں درختوں پر پھرتی سے چڑھ جاتا تھا ــــ (اور شاہ نیچے کھڑا مجھے حسرت سے تکتا رہ جاتا تھا) صحن میں بیری کا ایک بہت بڑا درخت تھا۔ میں فوراً اس کی چوٹی تک جا پہنچا۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر بلیاں کہیں نہیں تھیں۔ البتہ بلیوں کے غرانے کی آوازیں امڈی پڑ رہی تھیں۔ مرغیوں کا شور سن کر چچا جان بھی ادھر آ گئے۔ وہ بھی حیران تھے کہ یہ کیا تماشا ہے۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ شاہ موجود نہیں ہے۔ مجھے یونہی شبہ سا ہوا کہ کہیں وہی شرارت نہ کر رہا ہو۔ چنانچہ میں نے سراغ لگایا کہ مرغیوں کے ڈربے کے پاس ملازم کا جو بستر پڑا ہے اس میں گھس کر بلیاں لڑ رہی ہیں۔ میں نے تیزی سے اوپر کی چادر کھینچی تو نیچے دیکھا کہ شاہ انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کا درمیانی حصہ منہ میں رکھے بالکل بلیوں کی سی آوازیں نکال رہا ہے۔ چچا جان کو سامنے کھڑا دیکھ کر اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ چچا جان اخلاق و آداب کے معاملہ میں بہت سخت گیر تھے۔ خود میں بھی خوفزدہ ہوا کہ چادر کے نیچے سے یہ کیا نکل پڑا۔ مگر اچانک چچا جان، جو بہت کم ہنستے تھے، کھلکھلا کر ہنس پڑے اور اندر چلے گئے۔ تب ہم سب کی جان میں جان آئی۔

بھینسوں کے دودھ کو ابالنے کے بعد اسے باورچی خانہ میں ہلکی آنچ پر رکھ دیا جاتا تھا۔ یوں اس پہ بالائی کی موٹی تہہ جمی رہتی تھی۔ ایک دن ہم نے دیکھا کہ چچی جان خادمہ پر خفا ہو رہی ہیں کہ پچھلے چند روز سے دودھ پر سے آدھی بالائی کس طرح غائب ہو جاتی ہے۔ یہ بلی کا بھی کام نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح دیگچے کا ڈھکنا یا نیچے گرا ہوا ہوتا، ورنہ ٹیڑھا تو ضرور رکھا ہوتا۔

مگر ڈھکنا اپنے صحیح مقام پر ہوتا ہے اور بالائی غائب ہوتی ہے۔ خادمہ نے قسمیں کھا کھا کر رو رو کر انھیں یقین دلایا کہ یہ اس کا کام نہیں ہے۔ بعد میں بھی تین چار دن یہی سلسلہ جاری رہا تو ایک دوپہر کو خادمہ نے برتنوں کی الماری ایک طرف کھسکائی اور اس کے پیچھے چھپ بیٹھی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ سارا گھر دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کر رہا تھا۔ اس سناٹے میں "بلا" باورچی خانے میں دبے پاؤں داخل ہوا۔ ڈھکنا کھسکایا اور پھر پکڑا گیا۔ خادمہ نے شور مچا دیا ہم سب دوڑے آئے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ابھی جو شاہ کسی کام کے بہانے کمرے سے اٹھ کر گیا ہے وہی بالائی چور ہے اور ہم پچھلے چند دنوں سے اس کا چہرہ انار کے پھول کی طرح چمکدار سرخ ہو رہا ہے۔ جب چچی جان کمرے میں آئیں تو ہمارے دل دھک دھک کر رہے تھے کہ نہ جانے وہ ہمارے شہزادہ شاہ کے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔ مگر ادھر شاہ تھا کہ خادمہ کے شور مچانے پر کہہ رہا تھا۔

"اچھا کرتا ہوں جو پی جاتا ہوں، ہماری اپنی بھینسوں کا دودھ ہے، کوئی تمھارا دودھ ہے؟" اور چچی جان کسی ڈانٹ ڈپٹ کے بغیر مسکراتی ہوئی واپس چلی گئیں۔ شاہ نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑایا اور بھاگ گیا۔ اس کی اس حرکت کا ہمیں بھی فائدہ پہنچا ــــ اب ہر روز دوپہر کے کھانے پر ہم سب کے لیے بالائی سے بھری ہوئی ایک ایک پلیٹ بھی موجود ہوتی تھی ــــ

ایک دفعہ چچا جان نے پشاور سے چھ بوری مصالحہ دار گڑ منگایا اور یہ بوریاں ایک کمرے میں رکھوا دیں۔ ظاہر ہے کہ بادام، اخروٹ، کشمش اور پستے سے بھرا ہوا یہ گڑ ہم بچوں ہی کے لیے آیا تھا، مگر وہ نہ آج تقسیم ہوتا تھا نہ کل ــــ شاہ کی نیندیں اچاٹ ہو گئیں۔ مجھ سے کہنے لگا ــــ "یہ اچھی بات تو نہیں ہے نا لالہ۔ گڑ رکھا ہے تو لائیے اسے کھایا جائے ــــ ہم تو کچھ نہیں کہتے پر یہ بھی تو چچا جان کو سوچنا چاہیے کہ یہ چار گڑ کیا کہے گا؟" ــــ

چچا جان شاید سردیوں میں نشست پہ ہونے کے منتظر تھے مگر بارش ہو ہی نہیں چکی تھی۔ گڑ کے چاٹے پڑ ہی نہیں سکتے تھے مشتاق کے علاوہ ہمارا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو چکا تھا سو ہم نے (شاہ اور میرے علاوہ وہاں ہمارے دو اور چچا زاد بھائی بھی چچا جان کی سرپرستی میں زیر تعلیم تھے) طے کیا کہ شاہ کی خدمات حاصل کی جائیں۔ شاہ اس وقت مداری کا کوئی کھیل دیکھ کر نوکروں کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر رہا تھا۔ ہم نے اسے بلایا اور کہا کہ مصالحہ دار گڑ کھلاؤ تو جانیں۔ پہلے تو وہ جھجکا۔ عام گڑ ہوتا تو شاید انکار کر دیتا مگر پچھلی سردیوں میں وہ مصالحہ دار گڑ کا مزا چکھ چکا تھا، چنانچہ جوتے اتارے اور پنجوں کے بل چلتا ہوا یہ گول مٹول لڑکا (عمر آٹھ نو سال ہوگی) گڑ والے کمرے میں جا دھمکا۔ ایک بوری کا کونہ ادھیڑا نیچے جھولی رکھی اور جب وہ بھر گئی تو بوری کو بند کیا اور اچھلتا کودتا آن کی آن میں ہمارے پاس آیا اور میز کو گڑ کی بھیلیوں سے بھر دیا۔ اس روز ہم نے یوں پیٹ بھر کر گڑ کھایا کہ جب شام کو چچی جان نے دیکھا کہ بچوں نے بہت کم کھانا کھایا ہے تو انھیں ان کی صحت کی فکر پڑ گئی۔ بعد میں شاہ ہمیں اس قسم کی باتیں کر کے ہنستا رہا کہ جب چچی جان میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھ رہی تھیں کہ کہیں مجھے بخار تو نہیں ہے۔ تو مجھے گڑ کی ڈکار آتے آتے رہ گئی ــــ اب ہمارا روز کا معمول ہو گیا کہ اسکول سے گھر آ کر کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں جا کر شاہ کو مشن پر روانہ کر دیا ــــ پھر وہ جھولی بھرے اچھلتا کودتا آتا۔ گڑ کو میز پر الٹتا اور "تعریف اس خدا کی جس نے یہ گڑ بنایا" گاتا اور گڑ کھاتا جاتا۔

ایک دن چچا جان کچہری سے واپس گھر آئے تو اس کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک ان کی نظر بوری پر پڑی جس کا ایک گوشہ خالی ہو کر چیتھڑے کی طرح لٹک رہا تھا۔ انھوں نے یہ کہہ کر چچی جان کو بلایا کہ یہ آدھی بوری گڑ کہاں غائب ہو گیا۔

وہ بھی حیران رہ گئیں۔ آخر ہم چاروں کو اندر بلایا گیا اور پوچھا گیا۔ "یہ گڑ کہاں گیا؟" اور سہما ہوا، مگر مستقبل کا افسانہ نگار شاہ بولا "جی گڑ؟ — کیا ان بوریوں میں گڑ ہے جی؟ ہم تو سمجھے تھے جی کہ بھینسوں کے لیے کھلی آئی ہے۔" دونوں بزرگ اس دلیرانہ شہادت کے باوجود سمجھ گئے کہ پانی کہاں مر رہا ہے۔ تب چچی جان نے کہا۔

"قصور آپ کا ہے کہ گڑ منگایا اور رکھ لیا۔ کیا ہوا جو ذرا سا انھوں نے کھا لیا" تب ہمیں روزانہ صبح کو اسکول جاتے ہوئے جیب بھر گڑ ملنے لگا۔

ہمارے پڑوس میں ایک نوجوان پنساری کی دکان تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ہم بچے روزانہ قرآنِ پاک باترجمہ پڑھتے ہیں اور پانچوں نمازیں ادا کرتے ہیں اور آخری دس سورتیں ترجمے کے ساتھ فرفر سنا دیتے ہیں۔ وہ بہت نیک اور پیارا نوجوان تھا اور ہمیں کہتا تھا، کہ پیروں کے خاندان کے بچوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ جیسے تم ہو۔ مگر اسے یہ علم نہ تھا کہ ایک "پیرزادہ" "شاہ" ایک قیامت خیز منصوبہ بنائے بیٹھا ہے۔ ایک دن ہم چوری چھپے "داستان امیر حمزہ" پڑھ رہے تھے، جب عمرو عیار کا ذکر آیا کہ اس نے استاد کی پٹائی سے تنگ آکر اسے "جمال گوٹا" کھلا دیا تھا، اور اس بیچارے کو کئی روز تک دست آتے رہے تھے اور وہ نڈھال ہوگیا تھا۔ ہم تو سمجھے کہ یہ کوئی فرضی دوا ہے، مگر شاہ نے ایک روز پنساری کی دکان میں سجے ہوئے ڈبوں میں سے ایک ڈبے پر "جمال گوٹا" لکھا ہوا دیکھ لیا۔ کسی دن پنساری کی نظر بچا کر اس نے جمال گوٹے کے ڈبے میں سے مٹھی بھر دانے نکال لیے۔ انھیں پتھر پر پیس کر اس سفوف کی پڑیا بنائی اور اپنے پاس رکھ لی۔

گھر کے نوکروں اور کچہری کے اردلیوں کا معمول تھا کہ وہ اتوار کو ہمارے ہاں جمع ہو جاتے اور دوپہر کا کھانا وہیں کھاتے۔ اس روز حجام بھی ہم بچوں کی حجامتیں بنانے آتا تھا۔ اندر سے خادمہ ایک بڑے طشت میں ان کے لیے کھانا اور ایک جگ میں لسی لاتی۔ وہ کسی ملازم کو پکار کر یہ سامان اس کے حوالے کر دیتی اور سب ملازم مل کر کھانا کھاتے۔ ایک اتوار کو جب یہ سب لوگ جمع تھے اور شاہ سر کے بال ترشوا چکا تھا تو ملازمہ کی آواز آئی۔ شاہ تڑپ کر اٹھا اور ملازمین نادر اور سرخ رو سے کہا کہ تم تھکے ہوئے ہو، بیٹھو، میں لاتا ہوں۔ ملازم شاہ کی تعریف کرنے لگے اور شاہ نے اندر جا کر جمال گوٹے کی آدھی پڑیا لسی کے جگ میں اور آدھی سالن کی پانچ چھ پلیٹوں میں الٹ دی۔ پھر لکڑی سے اسے حل کیا اور اپنے قد کے برابر طشت اٹھائے واپس آگیا۔ سب سے پہلے سب نے ایک ایک گلاس لسی کا پیا اس کے بعد سالن کھا رہے تھے کہ سرخرو نے قے کر دی۔ ابھی سب سرخرو کو اس کی بدتمیزی پر ڈانٹ رہے تھے کہ نادر بوکھلا کر اٹھا اور صحن کے گوشے میں بیت الخلا کی طرف بھاگا۔ وہ وہاں بیٹھ بھی نہ پایا ہوگا کہ فضل الٰہی چپراسی بھی اس طرف لپکا اور شور مچا دیا کہ فوراً باہر آؤ ورنہ میں اندر آجاؤں گا۔ ان دونوں کا جھگڑا چل رہا تھا کہ فتح محمد چپراسی نے دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھ لیے، مگر وہ بیت الخلا کے پاس جا کر گر گیا۔ ہم نے حجام کو دیکھا تو وہ نیم بے ہوش ہو رہا تھا اور ہوا میں قینچیاں چلا رہا تھا۔ پہلے تو ہم بچے ہنستے رہے، جیسے یہ لوگ ہمیں محظوظ کرنے کے لیے ڈرامہ کھیل رہے ہیں۔ مگر جب ان لوگوں پر غشی طاری ہونے لگی اور ادھر ان کی شلواریں اٹ گئیں، تو ہمیں تشویش ہوئی کہ آن کی آن میں یہ کیا ہو گیا۔ شاہ بھی کچھ فکر مند نظر آنے لگا۔ میں نے پہلی بار اس کے چہرے پر سے دائمی مسکراہٹ کو غائب پایا۔ مگر اس وقت ہمیں کیا معلوم تھا کہ اصل قصہ کیا ہے۔ اندر چچی جان کو اطلاع بھجوائی گئی کہ نوکروں اور چپراسیوں کو ہیضہ ہو گیا ہے — ڈاکٹر بلوایا گیا۔ آخر دو تین دن کے علاج کے بعد یہ لوگ صحت یاب ہوئے، اور تب شاہ نے ہمیں بتایا کہ داستانِ امیر حمزہ

میں ہر بات تفصیل سے لکھی ہے۔ ہم نے پوچھا۔ کیسے؟ — اور اس نے ہمیں بتایا کہ میں نے عروسیدر کے جمال [illegible]
نوکروں اور چپراسیوں پر کیا تھا، جو صد فی صد درست نکلا۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ یہ کارستانی شاہ کی تھی۔

شاہ ابھی دسویں جماعت میں تھا کہ چچا جان کا تبادلہ کیمبل پور سے شیخوپورہ ہو گیا۔ ہم انٹرمیڈیٹ کالج کیمبل پور کے طالب علم تھے اور شیخوپورہ میں صرف ہائی اسکول تھا، اس لیے ہمیں مجبوراً کیمبل پور میں رکنا پڑا۔ یوں نومبر ۱۹۳۰ء میں شاہ ہم سے جدا ہو کر چچا جان کے ہمراہ شیخوپورہ چلا گیا۔ ۱۹۳۱ء کے شروع میں وہ میٹرک کا امتحان دے چکا تھا، ادھر ہمیں چند چھٹیاں ملیں تو ہم شیخوپورہ پہنچے۔ انھیں دنوں چچا جان نے شاہ کو بلایا اور پوچھا کہ کیا مولانا محمد علی جوہر کے نام سے آشنا ہو؟

شاہ نے مولانا کے بارے میں انھیں پوری تفصیل بتا دی تو چچا جان نے فرمایا "آج مسلمانوں کا یہ عظیم رہنما ہم سے ہمیشہ کے لیے چھن گیا ہے۔ حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔" پھر انھوں نے شاہ سے کہا کاغذ پنسل لے کر کوٹھی کی چھت پر جاؤ اور وہاں تنہائی میں مولانا مرحوم کے بارے میں اپنے تاثرات نظم بند کر لاؤ۔ شاہ ڈیڑھ دو گھنٹہ کے بعد دوسری منزل سے اُترا تو اس کے ہاتھ میں تیس چالیس اشعار کی ایک نظم تھی۔ اس نے اس نظم کو چچا جان کے سامنے جھجکتے ہوئے رکھ دیا۔ چچا جان نظم پڑھتے جاتے تھے اور مارے مسرت کے سرخ ہوتے جاتے تھے۔ ادھر اشعار میں چھپے ہوئے غم اور اُدھر پندرہ برس کے شاہ کے شاعر بن جانے پر مسرت کے ملے جلے جذبات نے اُن کی آنکھیں نم کر دیں۔ پھر انھوں نے ندیمؔ کا ماتھا چوما، ڈرائیور کو بلایا اور کار میں بیٹھ کر لاہور چلے گئے۔ شریر شاہ کی ذہانت کے اس رُخ سے ہم بے خبر نہ تھے۔ اس نے پانچویں چھٹی جماعت ہی سے شعر گھڑنے شروع کر رکھے تھے مگر ہم سمجھتے تھے کہ اس کا یہ شوق دل لگی سے آگے نہیں بڑھ پائے گا۔ اب ہم نے اسے ایک سنجیدہ شاعر کے روپ میں دیکھا تو بڑی حیرت اور بے حد مسرت ہوئی۔ — اگلے اتوار کو روزنامہ "سیاست" کے پورے صفحۂ اول پر "احمد شاہ احمد" کا لکھا ہوا مرثیہ، سبز، سرخ، سیاہ اور نیلے رنگوں میں بڑی شان سے شائع ہوا۔ چچا جان اور علامہ اقبال سیالکوٹ میں ایک ہی کالج میں زیرِ تعلیم رہ چکے تھے اور اس ہم مکتبی کے رشتہ سے اب تک ان کے درمیان دوستانہ روابط تھے۔ چچا جان یہ نظم علامہ صاحب کے پاس لے گئے اور بعد میں شیخوپورہ آ کر ہمیں بتایا کہ علامہ نے بڑی داد دی، اور فرمایا کہ اس بچے میں جو جوہر ہے اُس کی قدر کیجیے۔ — چچا جان نے دل و جان سے قدر کی مگر تین برس بعد ہی حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہو گیا — اور وہ اپنے "شاہ" کو "احمد ندیم قاسمی" بنتے نہ دیکھ سکے۔

میں محبت کا پجاری ہوں عقیدوں کا نہیں
ان بتوں کو مرے رستے سے ہٹایا جائے
(ندیمؔ)

ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمھاری یادیں
ہم کوئی تم تھے کہ وابستۂ غم ہو جائے
(ندیمؔ)

شہناز پروین سحر

بیگم ندیم سے انٹرویو

سوال :- کیا آپ کو معلوم تھا کہ آپ [illegible] شاعر آیا ؟

جواب :- یقیناً معلوم ہے۔ مگر کیا [illegible] بیوی بھی ہو گئی [illegible] شاعر ہو [illegible] ہو گیا [illegible] کوئی [illegible] اچھی [illegible] [illegible] ایک دنیا بڑھتی اور گنگناتی ہے۔

سوال :- کیا آپ شاعری کو سمجھتی ہیں ؟

جواب :- [illegible] شعر میں [illegible] کی بھرمار نہ ہو [illegible] سادہ ہو [illegible] بات حق ہو تو شعر صرف یہ کہ پڑھتی [illegible] [illegible] لطف حاصل کرتی ہوں۔

سوال :- کیا آپ کو شادی سے پہلے معلوم تھا کہ آپ کی شادی ایک شاعر سے ہو رہی ہے ؟

جواب :- جب [illegible] میری منگنی ہوئی تو مجھے اس بات کا بالکل علم نہیں تھا کہ وہ شاعر ہیں [illegible] [illegible] [illegible] ہو چکا [illegible] اپنے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تک [illegible] سے پتہ چلا کہ

سوال :- [illegible] شاعری [illegible] ذکر [illegible] آپ [illegible] ؟

جواب :- [illegible] حسن اور تہذیب کا ایک [illegible] [illegible] بیوی بھی مل سکتا ہے۔ [illegible] نہیں ہو سکتی کہ پنجابی، اردو اور دوسری زبانوں کے [illegible] شعرا اپنی بیویوں کے [illegible] [illegible] کے ساتھ ان کی [illegible] اور [illegible] کی پراسرار اور [illegible] بھی ہے۔

سوال :- کیا وہ آپ کے لیے شعر لکھتے ہیں ؟

جواب :- بہت ممکن ہے لکھے ہوں۔ مثلاً جب وہ دوبار نظر بندی کی سزا بھگت کر جیل سے نکلے اور جیل میں لکھی ہوئی غزلیں اور نظمیں چھپوائیں تو انہیں پڑھ کر محسوس [illegible] کی [illegible] [illegible] ہے۔

سوال :- کیا آپ [illegible] [illegible] شعر کہتے ہیں ؟

جواب :۔ مجھے پوچھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مجھے اپنے شوہر کی زندگی کی ایک ایک تفصیل کا علم ہے۔ پھر جہاں تک میں اپنے شوہر کی شاعری کو سمجھ سکی ہوں، وہ تو ساری انسانیت کے لیے شعر کہتے ہیں۔ اگر کوئی ایک شخصیت بھی ان کی مخاطب ہو تو یہ شخصیت ساری انسانیت کی نمائندگی کر رہی ہوتی ہے۔

سوال :۔ آپ کے شوہر آپ کو زیادہ وقت دیتے ہیں یا شاعری کو۔؟

جواب :۔ میرے شوہر نے عمر بھر محنت کی ہے۔ انھیں قلم کا مزدور سمجھ لیجیے۔ وہ صبح سے لے کر رات کے نو دس بجے تک پڑھتے ہیں اور اگر لکھتے ہیں تو اخباروں کے لیے مضامین اور کالم، یا دوسرے ہم قلم دوستوں کی کتابوں کے دیباچے اور تبصرے وغیرہ۔ شعر وہ صرف رات کو دس بجے کے بعد کہتے ہیں۔ اگر کوئی شاعر چوبیس گھنٹوں میں سے دو تین گھنٹے فکرِ شعر میں گزارے اور باقی وقت اپنے بیوی بچوں کو سکون اور آسودگی دینے کے لیے محنت کرے، تو اس کی شاعری پر مجھے یا کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بلکہ میں تو کبھی کبھی انھیں مجبور کرتی ہوں کہ وہ بچوں کے ساتھ گپیں مارنے اور شرارتیں کرنے کی بجائے شعر کہیں۔ ان کی فرصت کا ہر لمحہ میرے اور میرے بچوں کے لیے وقف ہوتا ہے اور فرصت کی یہ مدت شعر کہنے کے وقفے سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ مجھ پر ان کی شعر گوئی کسی صورت میں بار نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ کسی رات بارہ ایک بجے کی بجائے دو تین بجے اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں سے نکلیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا کیونکہ اس طرح ان کی صحت کے متاثر ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔

سوال :۔ اُس وقت آپ کی کیا حالت ہوتی ہے جب وہ آپ کی بجائے شاعری کو زیادہ اہمیت دے رہے ہوتے ہیں ؟

جواب :۔ اوّل تو کبھی کوئی ایسا موقع پیدا ہی نہیں ہوتا، لیکن ناگواری کا احساس اُس وقت یقیناً پیدا ہوتا ہے جب مجھے ان سے گھر کی کوئی بہت اہم بات کرنی ہو اور وہ الگ کمرے میں بند بیٹھے شعر کہہ رہے ہوں۔ ایسے موقعے شاذ نادر ہی پیدا ہوتے ہیں، عموماً نہیں۔ ویسے پچیس برس کی رفاقت کے بعد میں ان کی اس عادت کی عادی بھی ہو چکی ہوں اور انتظار کر لیتی ہوں کہ وہ شعر کہہ لیں تو میں اپنی بات کہوں۔

سوال :۔ اگر آپ کے بس میں ہو تو کیا آپ اپنے شوہر کو شاعری کرنے دیں ؟

جواب :۔ یقیناً کرنے دوں۔ جب مجھے معلوم ہے کہ وہ اوّل و آخر شاعر ہیں تو میں انھیں شاعری کے علاوہ کچھ اور کرنے پر مجبور کر کے ان کے جوہر کو کیوں دھندلاؤں ؟ اگر مجھے معلوم ہو، یا وہ خود حسرت سے کہیں کہ ہفتوں سے ایک مصرع تک نہیں کہا تو میں تو ان کے پیچھے پڑ جاتی ہوں کہ جائیے شعر کہیے۔ شاعری ہی نے تو انھیں اتنی شہرت اور عظمت دی ہے۔ پھر میں انھیں شاعری کیوں نہ کرنے دوں ؟

سوال :۔ کیا آپ نے کبھی اپنے شوہر کی کوئی غزل پھاڑی ہے ؟

جواب :۔ ہرگز نہیں۔ میں تو ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک ایک چٹ سنبھال کر رکھتی ہوں کہ ممکن ہے اس پر ان کی کوئی ایسی یادداشت درج ہو جو ان کی شاعری کے کام آئے۔ اگر دنیا میں کوئی ایسی مثال بھی موجود ہے کہ کسی بیوی نے اپنے شاعر شوہر کا کلام پھاڑ ڈالا ہو تو ان میاں بیوی کے تعلقات نہایت کشیدہ ہوں گے یا شوہر کا بیوی کے ساتھ سلوک اچھا نہیں ہوگا یا بیوی کا مزاج ایسا ہوگا کہ اسے شاعری کی بجائے دنیاداری کی دوسری نمائشیں عزیز ہوں گی۔ میرا یہ

ایسی صورت نہیں ہے اس لیے ہمارے درمیان مثالی افہام تفہیم کی فضا قائم ہے۔

سوال :۔ شاعری کی وجہ سے آپ کی اپنے شوہر سے کتنی لڑائیاں ہوتی ہیں ؟

جواب :۔ ویسے تو ہم کبھی کبھار لڑ بھی لیتے ہیں مگر شاعری کی وجہ سے کبھی کوئی ایک لڑائی بھی نہیں ہوئی۔ میاں بیوی کی لڑائیاں عموماً ساس نند کے رشتوں کی پیداوار ہوتی ہیں۔ مگر میری ساس اور میری نند اتنی پیاری اور مثالی اور محبت کرنے والی خواتین تھیں کہ اُن کی رحلت سے مجھے شدید محرومی کا جو احساس ہوا تھا وہ آج تک موجود ہے۔ لڑائی عموماً خرچ اخراجات کے مسئلے پر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ندیم صاحب روپیہ پیسہ خرچ کرنے کے معاملے میں بہت تیز ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اُن کے پاس جو روپیہ ہے، وہ اسے ایک دم خرچ نہیں کر دیں گے تو بیمار ہو جائیں گے۔ مثلاً میں پانچ دس روپے کے پھل لانے کو کہتی ہوں، تو وہ چالیس پچاس روپے کا ٹوکرا اٹھا لاتے ہیں۔ روپیہ خرچ کرنے کا معاملہ ہو تو آنے والا دن ان کے لیے بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ سو ان کی اس عادت پر بعض اوقات تلخی ہو جاتی ہے مگر شاعری ہمارے درمیان کبھی جھگڑے کا سبب نہیں بنی۔

سوال :۔ شاعری کی وجہ سے آپ کے شوہر بہت مقبول ہیں۔ کیا یہ بات آپ کے لیے باعثِ مسرت ہے ؟

جواب :۔ باعثِ مسرت بھی اور باعثِ فخر بھی۔ ندیم صاحب کے سے اتنے بڑے اور اتنے مشہور اور اتنے محبوب شاعر کی بیوی ہونا میری خوش قسمتی اور میرا اعزاز ہے۔

سوال :۔ آپ کا کیا جی چاہتا ہے کہ آپ کے خاوند کو کیا ہونا چاہیے ؟

جواب :۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ندیم صاحب جتنے بڑے شاعر ہیں، اس سے بھی بڑے شاعر ہوں۔ انہیں شاعر کے سوا اور کچھ نہیں ہونا چاہیے مگر شاعری کے بھی تو درجے ہوتے ہیں اور میرا جی چاہتا ہے کہ ندیم صاحب کا نام غالب اور اقبال کے سے شاعروں کی فہرست میں شامل ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ وہ شاعری کی بجائے چھوٹے بڑے افسر قسم کی کوئی چیز ہوں۔ اس طرح تو میں انہیں پہچان بھی نہیں سکوں گی۔ چند برس ہوئے ندیم صاحب کی شخصیت پر ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اس طرح کا تاثر دیا گیا تھا، جیسے مجھے اپنے شوہر کا شاعر ہونا ناپسند ہے یا مجھے معلوم ہی نہیں کہ وہ کتنے بڑے آدمی ہیں۔ افسوس کہ یہ باتیں بالکل بے بنیاد تھیں اور بے خبری میں لکھی گئی تھیں۔ میرے لیے تو شاعر ندیم ہی سب کچھ ہیں۔ ایک بار انہیں ایک بڑی سرکاری نوکری کی دعوت ملی تو ان کی طرح میں نے بھی اس دعوت کی سخت مخالفت کی۔ دراصل میں نہیں چاہتی کہ وہ بیوی بچوں کی خاطر کوئی ایسی ملازمت قبول کریں جس سے ان کی شاعری کو نقصان پہنچے۔ کبھی کبھی تو میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ اگر ندیم صاحب شاعر نہ ہوتے تو شاید ہماری یوں نہ نبھ سکتی۔ اُن کی شاعری تو ان کا حسن اور کردار اور مزاج ہے۔

سوال :۔ آپ کو اپنے شوہر کی کون سی عادت پسند ہیں ؟

جواب :۔ مجھے اُن کی صفائی ستھرائی پسند ہے۔ زندگی گزارنے کا وہ ایک خاص سلیقہ رکھتے ہیں اور یہ سلیقہ مجھے بہت عزیز ہے۔ وہ بے حد خوش مزاج ہیں، بے حد صاف گو ہیں۔ کبھی کوئی لگی لپٹی اٹھا کے نہیں رکھتے۔ اس طرح بعض دفعہ مشکلات میں بھی گھر جاتے ہیں مگر مجھے ان کی اس صاف گوئی سے پیار ہے۔ پھر مجھے اُن کی یہ عادت

(باقی صفحہ ۱۴۲ پر)

ناہید ندیم

میرے ابّا جی

(۱)

یوں تو میں بھی اسی طرح سے اپنے ابّا جی کے بارے میں کچھ کہوں گی جس طرح کوئی بھی اولاد اپنے اچھے باپ کے بارے میں کہتی ہے، لیکن میری باتیں اس وجہ سے ذرا مختلف ہوں گی کہ میرے ابّو احمد ندیم قاسمی ہیں، یا یوں کہہ لیجیے کہ احمد ندیم قاسمی میرے ابّو بھی ہیں۔ یوں احمد ندیم قاسمی سے میری عقیدت دو صورتوں میں پھوٹتی ہے۔ اوّل یہ کہ وہ میرے ابّو ہیں ــــ بہت ہی اچھے ابّو، اور دوم یہ کہ وہ ایک فن کار ہیں ــــ بہت ہی بڑے فن کار ــــ لیکن اطمینان رکھیے میری عقیدت جذباتی کم اور باشعور زیادہ ہے، وہ مجھ سے سچ ہی کہلوائے گی، اس میں مبالغہ نہیں ہوگا ــــ

میں اپنی عمر کے اس حصے میں ہوں جب انسانوں کے بارے میں کم عمری کے بنائے گئے تصورات کچھ ٹوٹنے لگتے ہیں اور کچھ مضبوط ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو بظاہر کچھ ہوتے ہیں۔ صاف ستھرے، اچھی اچھی باتیں کرنے والے، لیکن اندر اپنے دلوں میں وہ کتنی ہی صدیوں کی رنجشیں سمیٹے ہوتے ہیں۔ ہر ایسی شخصیت کا وہ خوبصورت بت جو ہم نے اپنے خیال میں سجا رکھا ہوتا ہے، اصلیت ظاہر ہونے پر ٹوٹنے لگتا ہے اور ہر طرف گرد و غبار پھیل جاتا ہے، لیکن مجھے خوشی ہے ــــ بے انتہا خوشی کہ میرے ابّا جی ایسے نہیں ہیں۔ ان کا جو کچھ ظاہر ہے اس سے کہیں زیادہ حسن ان کے باطن کا ہے نیک دلی، شرافت، ہمدردی، خلوص، فراخ دلی، پیار، اخلاق یہ سب کتنا ڈھیر سا حسن ہے۔

میں نے دوستی کے خلوص کی انتہا ابّو میں ہی دیکھی ہے۔ وہ اپنے عزیز دوستوں کا ذکر کچھ اس طرح سے کرتے ہیں کہ ہمیں وہ لوگ ابّو کا ہی ایک جزو نظر آتے ہیں۔ ان کے بہت سے دوستوں میں دو ہندو دوست بھی ہیں۔ (چچا نند اور چچا منوہر) جو طالب علمی کے زمانے سے ان کے ساتھی ہیں۔ ان دونوں کے پیار اور دوستی کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ابّو کی آنکھوں میں نمی جھلملاتی دیکھی ہے۔ برسوں پہلے ان میں سے ایک نے بھارت سے ان کے لیے ایک خوش رنگ کمبل بھیجا تھا۔ وہ کمبل اب پرانا ہو چکا ہے۔ اس میں پہلی سی گرمی بھی نہیں ہے۔ لیکن ابّو کو گھر کے دوسرے کمبلوں میں وہی عزیز ہے۔ اب بھی سردیوں میں وہ اس کے پھٹتے ہوئے گوشوں کو مزید پھٹنے سے بچانے کے لیے ان میں گرہیں ڈالتے اور وہی کمبل اوڑھے نظر آتے ہیں۔ ابّو مجھے اس وقت بے حد اچھے لگتے ہیں جب وہ کسی کا ذکر بہت پیار اور عقیدت سے

کر رہے ہوں۔ ایسے مواقع مجھے اکثر مل جاتے ہیں اس لیے کہ انھیں اچھے انسانوں سے بے حد پیار ہے اور انھیں ایسے جواہرات حاصل بھی ہو جاتے ہیں۔

مجھے آبا جی کی قوتِ برداشت پر بے حد حیرت ہوتی ہے۔ میں بعض اوقات سوچتی ہوں، اگر میں اُن کی جگہ ہوتی تو کب کی ٹوٹ پھوٹ کر بکھر بھی چکی ہوتی۔ اور شاید یہی قوت ہے جس کی زمین میں ابوجی امید کے ستارے بوتے رہتے ہیں۔ جن کے بارے میں انھیں یقین ہے کہ ع

ستارے بوئے گئے، آفتاب کاٹے گئے

اُن کے لیے ستاروں کی کاشت اور آفتابوں کی "برداشت" اس لیے بھی آسان ہو جاتی ہے کہ وہ بہت مستقل مزاج اور شگفتہ طبیعت کے مالک ہیں۔ یہی شگفتگی انھیں پریشانیوں میں سے تازہ دم باہر نکال لاتی ہے۔ اب مثلاً اُن کی طبیعت کتنی ہی خراب ہو (آبا جی کے گُردے میں پتھری ہے) لیکن وہ کم ہی کسی کو بتاتے ہیں۔ اور شدید درد کو بھی چپ چاپ برداشت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر کچھ لوگوں نے آبا جی کے خلاف بہت سی غلط باتیں کہیں اور کئی بہت سے تکلیف دہ اور بے بنیاد الزام لگائے لیکن آبا جی خاموش رہے۔ انھوں نے پروا ہی نہ کی۔ جب کہ مجھ جیسے کتنے ہی افراد انتہائی غصے اور دکھ کا اظہار کرنے کے لیے مضطرب رہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ میں ابوجی کے مقابلے میں بے حد معمولی لڑکی ہوں۔ میں تو یہ شعر ؎

دشمن بھی جو چاہے تو مری چھاؤں میں بیٹھے
میں ایک گھنا پیڑ سرِ راہ گذر ہوں

پڑھتے ہوئے اکثر سوچتی ہوں کہ کیا واقعی یوں ہونا چاہیے؟ لیکن آبا جی ایسی کوئی بات سوچ ہی نہیں سکتے کیونکہ یہ اُن کی اپنی تخلیق ہے۔ یہ بات انھوں نے اپنے لیے بالکل صحیح کہی ہے۔ اور یہ تو سب پر واضح ہی ہو گا کہ یہ وہ دشمن نہیں ہے جو ہمارے ملک و قوم کی بُرائی چاہتا ہے۔ اس کے بارے میں تو آبا جی کا تاثر نہایت شدید ہے ؎

میں محبت کا تو دیتا ہوں محبت سے جواب
لیکن اعدا کے لیے قہرِ قیامت ہوں میں

آبا جی بہت سادہ ہیں۔ اتنے کہ ہر شخص پر سچے دل سے اعتبار کر لیتے ہیں۔ اور جب تک کسی بُرے ذہن کی غلط سوچ کی واضح پہچان نہ ہو جائے انھیں بظاہر پتہ بھی نہیں چلتا۔ وہ شاید خامیوں کو پہچان کر بھی انھیں قبول نہیں کرنا چاہتے۔ جب تک کہ وہ حد سے نہ بڑھ جائیں۔ یہ اُن کی نیک دلی کا ثبوت ہے۔ ایک اور عجیب و غریب (کم از کم میرے لیے) کیفیت یہ ہے کہ بعض اوقات آبا جی کو معلوم بھی ہوتا ہے کہ فلاں میں کیسی کیسی تکلیف دہ خامیاں ہیں۔ لیکن وہ نہ تو اُس سے ویسا سلوک کرتے ہیں جس کا وہ مستحق ہے اور نہ ہی اُس پر ظاہر ہونے دیتے ہیں کہ وہ جو کچھ چھپا رہا ہے۔ ان سے مخفی نہیں ہے۔ اور یہ ابوجی ہی کا شعر ہے ؎

اُس کے اندر کوئی فنکار چھپا بیٹھا ہے
جانتے بوجھتے جس شخص نے دھوکا کھایا

شاید یہی وجہ ہے کہ جب ابّو جی کی شاعری میری سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگی اور اُن کے خیالات مجھ پر تھوڑے تھوڑے کھلنے لگے تو سب سے پہلے میرے ذہن میں یہ سوال اُبھرا کہ جب وہ انسان کو اتنا پسند کرتے ہیں، اُس کی اتنی تعریف کرتے ہیں تو یہ جو ہر طرف بُرے بُرے لوگ بکھر رہے ہیں۔ کیا یہ بھی اُس "انسان" کی تعریف میں شامل ہیں جو عظیم ہے اور جس کے بارے میں ابّو جی نے کہا ہے ؎

بڑھا تو راہیں تراشیں، رُکا تو قصر بنائے
اُڑا تو گیت بکھیرے، جُھکا تو پھول کھلائے

لیکن آہستہ آہستہ مجھ پر واضح ہو گیا کہ نہیں ۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔ ابّا جی کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کی بُرائیاں قابلِ نفرت تو ہیں لیکن وہ جبلّی طور پر بُرا نہیں ہے۔ اُس کو بُرا زمانے نے بنایا اس میں اس کا معاشرہ، اس کے معاشی حالات اور مروجہ طبقاتی تفاوت دخیل ہوتے ہیں۔ اگر ان حالات کو بدل دیا جائے تو اس کی واضح طور پر اصلاح ہو سکتی ہے۔ ؏

ہنسی آتی ہے مجھ کو امتیازِ دشت و گلشن پر

مرا غم صرف مرا غم تو نہیں کم کیوں ہو

مقبرے بنتے ہیں زندوں کے مکانوں سے بلند
کس قدر اوج پہ تکریم ہے انسانوں کی

یہ مسافت بھی تو فن کار کو طے کرنا ہے
کس کی محنت کا ثمر جا کے ٹپکتا ہے کہاں

مثلِ خورشید ہوئی ہے اُفقِ فن پہ طلوع
یہ حقیقت کہ جو شاعر ہے وہ انسان بھی ہے

مدعا ذہن میں محفوظ کیے بیٹھا ہوں
سننے والوں کو خماروں سے جگالوں تو کہوں

منتظر ہیں کہ کوئی تیشۂ تخلیق اٹھائے
کتنے اصنام ابھی دفن ہیں کہساروں میں

پھر ابّا جی کو تو انسان کی فطرت میں اچھائی سب پر غالب نظر آتی ہے ؎

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر
کسی بھی شہر میں جاؤں غریبِ شہر نہیں

اباجی بہت کام کرتے ہیں ـــ بے حد ـــ صبح سے آدھی رات تک کوئی نہ کوئی کام ـــ اور ہر کام بہت ضروری بھی ہوتا ہے (پھر اباجی کے پاس ہر وقت ایسے ڈیڑھ دو سو خطوط جمع رہتے ہیں جن کے جوابات دینے ہوتے ہیں) ہمارے ہاں یہ صورتِ حال بڑی افسوس ناک ہے کہ ایک شاعر، ادیب، یا مصنف اپنے آپ کو صرف اعلیٰ فن کی تخلیق میں محو نہیں رکھ سکتا۔ اسے اور بھی کئی کام کرنے پڑتے ہیں۔ مگر اباجی یہ کام بھی اسی ہی لگن سے کرتے ہیں۔ جیسے انھیں پورا نہ کر سکے تو وہ خود ادھورے رہ جائیں گے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ وہ وقت جو اباجی اِدھر اُدھر کے کاموں پر خرچ کرتے ہیں اگر صرف تخلیقِ فن کے لیے وقف کر دیں تو ہمیں کتنے اور عظیم شاہکاروں کی دولت مل جائے۔ مگر ممکن ہے اُنھیں اپنے غیر تخلیقی کاموں میں بھی تخلیقِ فن کا مواد مل جاتا ہو۔

اباجی کو کبھی سردیوں کی رات، کہ وقت فرصت ملے تو وہ بچوں کا کمبل لپیٹے اپنے بچپن کی بعض شرارتیں، بعض لطیفے، بعض لوگوں کی دلچسپ باتیں سناتے ہیں اور ہمیں ہنسا ہنسا کر خود بھی خوش ہوتے ہیں۔ ہماری دادی جان مرحومہ اور ہماری پھوپھی جی مرحومہ کو وہ جس جس طرح ہنساتے تھے ان واقعات کی تفصیل بھی سناتے ہیں۔ لیکن تب اباجی صرف ہمارے لیے مسکراتے ہیں۔ ان کے اپنے احساسات تو ان کی آنکھوں کو دھندلا دیتے ہیں۔ گرمیوں میں رات کو اباجی باہر صحن میں آجاتے ہیں اور تاروں بھرے آسمان کو دیکھ کر باتوں کا سلسلہ کچھ اس طرح سے شروع ہوتا ہے کہ ـــ

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" ـــ اور ـــ

ان ستاروں سے پرے اور ستارے بھی تو ہیں
جن کے پرتو سے منور ہیں کئی اور جہاں
ان جہانوں سے پرے اور جہاں بھی ہوں گے
میرے سیارۂ رنگیں کی طرح رقص کناں

پھر کائنات کی وسعت پر آتے ہیں ـ پھر مذہب کی باتیں ہوتی ہیں ـ یوں سلسلہ آگے چلتا چلا جاتا ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے ایک خوبصورت ریشمی رنگین دھاگا تھام رکھا ہے اور میں اُس میں ان باتوں کے موتی پروتی چلی جا رہی ہوں اور تب میں جانے کتنی بلندیوں سے ہو کر آتی ہوں اور میں نے کتنے رازوں سے پردہ اٹھا دیکھا ہے۔ اباجی زمین کے بارے میں کہتے ہیں ؂

دنیا ترے حسن کی قسم ہے
میں عرش سے فرش پر گرا ہوں

پھر اباجی انسان کی قوت کا اعتراف کرتے ہیں ؂

آدمی شش جہات کا دولہا
وقت کی گردشیں براتی ہیں

لیکن پھر اتنی وسیع و عریض کائنات میں انسان کی حیثیت بھی بتاتے ہیں، جو ایک حقیر ذرّے سے بھی کم ہے اور انسان اِس وسعت میں بے حس ہی دکھائی دیتا ہے اور پھر باتوں کا یوں اختتام ہوتا ہے کہ ــــ خیر جو کچھ بھی ہے ــــ انسان ہے بڑی بلا کی چیز ــــ ابھی تک معلومہ کائنات کی حسین ترین مخلوق ہے ــــ

ابوجی کے سر کی SHAPE بے حد خوبصورت ہے۔ یہ خصوصاً ایک بُت تراش کے لیے پسندیدہ ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ گردن کی شانوں سے اٹھان اور پھر سر کے پچھلے حصے کی سیدھی گولائی ــــ ایک مضبوطی ایک قوت کا تاثر دیتی ہے (میں نے کئی لوگوں پر غور کیا لیکن یہ قوت اِس صورت میں کہیں نہیں دیکھی) یہ قوت، یہ احساس بھی دلاتی ہے کہ اس عظیم فن کار میں توانائی کے سیکڑوں خزینے چھپے ہیں جن کی دریافت اگر ہم نہ کر سکے تو کتنی نسلیں خالی ہاتھ رہ جائیں گی ــــ

اباجی کا موسیقی، مصوری، بت تراشی اور خصوصاً حسن کا ذوق بہت اعلیٰ ہے۔ اگر اباجی کو مواقع ملتے تو وہ یقیناً ان فنون میں بھی شاہکار تخلیق کرتے۔ میں (شاید بیٹی ہونے کے ناطے سے) یہ سوچتی ہوں اگر اباجی ــــ "دورِ احیاء" میں اٹلی میں ہوتے تو وہ لیونارڈو اور مائیکل انجیلو وغیرہ کے ساتھی ہوتے۔ اس لیے کہ اُس وقت ایک شاعر اور ادیب اپنی بے پناہ قوتِ تخلیق کے باعث باقی فنون کو بھی نہایت خوبی کے ساتھ اپنا سکتا تھا۔ وہ جینیئس لوگوں کا ایک انوکھا زمانہ تھا۔ ایک اور بات کہوں کہ میں اپنے ابوجی کو "نارمل جینیئس" سمجھتی ہوں اس لیے کہ وہ جینیئس ہونے کے باوجود ابنارمل نہیں ہیں۔ ہوں گے تو کہیں اندر سے ہوں گے۔ مجھے تو دکھائی نہیں دیتے۔۔

فن کے کسی اعلیٰ ترین شاہکار کو دیکھ کر مجھے اباجی ایک ایسی کیفیت میں گم نظر آتے ہیں جو صرف اُس وقت طاری ہوتی ہے جب شاہکار روح کی گہرائیوں میں اُتر کر وہاں کے نازک ترین تاروں کو چھیڑ دے ــــ اس کیفیت کو کسی ماہرِ فن سے زیادہ کوئی ایسا ہی شاہکار تخلیق کر سکنے والا محسوس کر سکتا ہے۔ لیونارڈو کی بھی بہت تعریف کرتے ہیں۔۔ لیکن انہیں مائیکل اینجلو زیادہ پسند ہیں۔ اسی سے مجھے یاد آیا کہ اب تک میں نے اباجی سے جتنی تعریف غالبؔ کی سنی ہے کسی اور اُردو شاعر کی نہیں سنی۔۔ وہ تو کہتے ہیں ؎

ہو کیوں نہ مجھ کو اپنے مذاقِ سخن پہ ناز
غالبؔ کو کائناتِ سخن کا خدا کہوں

اور یہ عجیب بات ہے کہ مجھے اینجلو اور غالبؔ میں طبیعتوں کے فرق کے باوجود کچھ باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ یہ تو طے ہے کہ دونوں فن کار ابلتی ہوئی بے چین زندگی سے لبریز ہیں اور ان میں قوتِ تخلیق بے پناہ ہے اور یہ قوت ایک عجیب فن کارانہ نرمی اور نزاکت میں ڈھل گئی ہے۔ پھر جس طرح غالبؔ اپنی عظیم اردو شاعری پر، اپنی عظیم فارسی شاعری کو ترجیح دیتے تھے۔ اسی طرح اینجلو اپنی عظیم بت تراشی کو اپنی عظیم مصوری کے مقابلے میں بہت زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ اور یہ دونوں اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئے تھے۔ ان کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ ایسے لافانی فن کاروں کی عظمت کا اعتراف کرنے والا فن کار خود بھی زندہ، متحرک اور عظیم ہے۔ اور دعا ہے کہ وہ ہمیشہ زندۂ جاوید شاہکار تخلیق کرتا رہے ــــ

یہ جی میں آتی ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں
کہ خون بن کے رگِ سنگ میں اُتر جاؤں

اور ——

شعر کہنے کا مزا جب ہے کہ صدیوں تک ندیم
آئینے بنتے چلے جائیں مرے اشعار سے

مجھے اپنے شاعر ابّو! اپنے ادیب ابّو (میں نے صرف دو پہلوؤں کا ذکر کیا ورنہ اباجی کی شخصیت کے تو کئی پہلو ہیں) کی صحیح پہچان آج سے کچھ سال پہلے عجیب انداز میں ہوئی"۔ ہوا یوں کہ ایک دن میں نے ایک رسالہ اُٹھایا اور ایک افسانہ پڑھنا شروع کیا۔ جب آدھا افسانہ پڑھ لیا تو سوچا کہ یہ تو بہت اچھی تحریر ہے' آخر یہ کس کی ہے؟ میں نے جلدی جلدی صفحے اُلٹ کر دیکھا تو وہاں میرے اباجی کا نام لکھا تھا۔ میں بے حد خوش ہوئی' کیونکہ اس سے پہلے میں ابّوجی کی جو بھی چیز پڑھتی تھی' یہ سوچ کر پڑھتی تھی کہ اسے ایک بڑے فن کار نے لکھا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ یہ اچھی ہی ہوگی۔ لیکن اب میں نے اس اچھائی کو نام کی عظمت کی بجائے تحریر کی عظمت سے خود ہی محسوس کیا تھا۔ اس کی دریافت میں نے کسی سہارے کے بغیر خود کی تھی۔ اور تب میں نے سوچا کہ یہ واقعی میرے لیے کتنی قابلِ فخر بات ہے کہ میرے ابّو ——احمد ندیم قاسمی ہیں——
(اباجی اپنی تعریف سُن کر سنجیدہ رہتے ہیں یا پھر زیادہ سے زیادہ یہ کہ مسکرا دیتے ہیں۔ پُراعتماد مسکراہٹ — اور یہ سُن کر شاید آپ کو حیرت ہو کہ جب کوئی میرے ابّوجی کے خلاف بات کرے تو تب بھی مسکراہٹ کا یہی انداز ہوتا ہے۔ بلکہ اُس میں خود اعتمادی کا عنصر کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اُنھیں یقین ہوتا ہے کہ اس شخص کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا' اور ایسا ہوتا بھی ہے)

ابوجی کبھی کبھی بالکل بچوں کی سی حرکتیں بھی کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کا کوئی چھوٹا سا پیارا سا تحفہ پا کر بالکل بچوں کی طرح خوش ہوتے ہیں۔ پھر وہ اپنوں کو (جن میں بزرگ اور بچے زیادہ شامل ہیں) چھیڑتے رہتے ہیں۔ اُن کی نقلیں باقاعدہ ایکٹنگ کے ذریعے (مگر مہذب طریقے سے) کر کے دکھاتے ہیں۔ وہ بچوں کی طرح پیار اور توجہ چاہتے ہیں۔ اور یہ خواہش بھی رکھتے ہیں کہ اُنھیں غلط نہ سمجھا جائے۔ یعنی جو کچھ اُنھوں نے کہا ہے اس سے کوئی اور مطلب نہ نکالا جائے۔ بس یہی بات ہے جس کے پیدا نہ ہونے سے اباجی کو غصہ بھی (بظاہر تھوڑا سا) آسکتا ہے' دُکھ بھی ہو سکتا ہے اور وہ مایوسی بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ اباجی کا یہ بچپنا ہمیں بڑا پیارا ہے — کبھی ابّوجی سے کوئی گلاس ٹوٹ جائے' کوئی ضروری چیز لانا بھول جائیں' یا کچھ تیلی میں چھوڑ آئیں تو وہ بچوں کی سی معصومیت سے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے بڑے اچھے لگتے ہیں اور اپنے اس قصور کو بھی ہنسی کا سامان بنا ڈالتے ہیں۔

اباجی ہر سچے فن کار کی طرح بہت حساس ہیں۔ اور یہ حساس طبیعت خود اعتمادی کی گود میں خوب نکھری نظر آتی ہے۔ کئی بار اباجی کچھ چیزوں کو ہم سے کہیں زیادہ شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ اسی لیے جب اباجی ایسے واقعات سُناتے ہیں تو مجھے حیرت نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک دن ابّو نے پسینہ پونچھتے ہوئے بتایا کہ آج وہ دفتر سے گھر واپس آ رہے تھے تو اُنھیں شدید گرمی میں ایک چڑیا ایک گڑھے میں سے پانی پیتی دکھائی دی۔ ابّوجی دور ہی ٹھہر گئے کہ کہیں چڑیا ڈسٹرب نہ ہو جائے

اور جب چڑیا پانی پی کر اور نہا دھو کر اڑ گئی تو ابو جی گھر لوٹ چلے۔ یہاں مجھے ابو کا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

کبھی تو یوں ہو، بس اس خوف سے گزر نہ ہوا
کہ کوئی پھول نہ جھولے سے پاؤں دھر جاؤں

ابو جی اپنے بچوں کی کامیابیوں پر بہت خوش ہوتے ہیں اور ہر وقت ہماری ہمت بڑھاتے رہتے ہیں۔ مجھے یاد کہ انھوں نے کبھی بات کی تصدیق بھی [illegible] اچھے [illegible] کرایا، اچھی اچھی کتابیں پڑھنے کو مہیا کر کے ذہن کی تربیت کرتے ہیں۔ اباجی تخلیق کی [illegible] اگر کبھی ایسا ہو جائے تو دوسرے کی کوشش بھی [illegible] کرتے ہیں کہ ان سے ہمارا شکایت [illegible] اباجی ہمارے بڑے اچھے دوست ہیں۔ یہ خوبصورت بالوں والے بظاہر [illegible] رنگ ہے۔ لیکن اصل میں ہمارے دوست ہیں۔ ہم سب گھر والوں کو بہت عزیز ہیں۔ انھوں نے کبھی اپنے خیالات ہم پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم خود راستے ڈھونڈ کر ان تک پہنچیں۔ تب وہ ہماری اصلاح کر دیں۔ ہماری دعا ہے کہ ہمارے ابو جی کی خوب لمبی زندگی ہو۔ صحت، خوشی اور عزت سے بھرپور زندگی۔ اور یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ ابو جی [illegible] خوبصورت جگمگاتے [illegible] اور ہر قسم کی [illegible] سے آزاد پُرامن مستقبل [illegible] دیکھیں۔

ابو جی کے بارے میں میری باتیں تو ختم ہی نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ میں بہت چھوٹی تھی جب کبھی [illegible] مجھے [illegible] ہوگا۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ چنانچہ اب ان کے چند شعر میری زبانی سنیے کہ آپ کے لیے اس سے بہتر تحفہ کا میں تصور ہی نہیں کر سکتی ہے

یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں ہے کہ ندیم　　　　میرا کردار [illegible] کا نام

شب کے پہلو میں کہیں پھوٹ رہی تھی پو بھی　　　　کتنے ذہنوں میں اندھیرے نہ جہاں گیر ہوئے

دامنِ لالہ میں محفوظ ہے جب پھول ندیم　　　　رنگ ہوتا ہے [illegible]

اندازہ ہو رہا تھا تیری آوازِ پا کا تھا　　　　دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا　　　　میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

سب نے انسان کو معبود بنا رکھا ہے　　　　اور سب کہتے ہیں [illegible]

ہر سوچ پہ خنجر سا گزر جاتا ہے دل سے　　　　حیراں ہوں کہ سوچوں تو کس انداز میں سوچوں

ندیم فلسفۂ صبر کو دعائیں دیں　　　یا بن غریب کشی جو رہے غریب نواز

خنک شاخوں پہ نمو کے یہ نگینے کیا ہیں　　　زندگی ہے اگر اک پیڑ کی ڈھلتی چھایا

نجوم بجھتے رہیں، تیرگی امڈتی رہے　　　مگر یقینِ سحر ہے جنھیں اداس نہیں

سحر کا ایک ہی مفہوم ہے ـــ طلوعِ سحر　　　مجھے فریب نہ دیں روشنی کی تفسیریں

بھیک مانگے کوئی انساں تو میں چیخ اٹھتا ہوں　　　بس یہ خامی ہے مرے طرزِ مسلمانی میں

دھوپ کے ظلم کا قصہ تو ہزاروں سے سنا　　　کاش اس دشت پہ بادل کوئی برسا سکتا

دستک سے دستِ فن کو نہ آلودہ کر ندیم　　　سب جا رہے ہیں جانبِ در تو مگر نہ جا

اپنے خولوں ہی میں چھپ جائیں گے خوابیدہ ضمیر　　　نیز تا ریخ کی چٹکی سے نکل جائیں گے
اک عجب زلزلۂ خود نگری آئے گا　　　ذہن ہل جائیں گے معیار بدل جائیں گے

اور آخر میں سقوطِ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں ابو جی کی غزل کے چند اشعار، جن میں وہ کلیجہ شق کر دینے والے کرب کے باوجود اپنی رجائیت سے دست کش نہیں ہو سکے کہ یہی ان کا مزاج ہے ہے

لخت لخت چہروں کو آئینوں میں کیا دیکھیں　　　آؤ اپنے بارے میں اپنے ذہن سے سوچیں
آنکھ تک جھپکنے کا کس میں حوصلہ ہو گا　　　دیکھیں ٹکٹکی باندھے جب کئی کروڑ آنکھیں
شاید اس نظارے سے ریت دو جہاں چونکے　　　آؤ اپنے ملبے پر بیٹھ کر دعا مانگیں
تاج گر بھی جاتے ہیں، تاج مل بھی جاتے ہیں　　　تاج ڈھونڈنے والے پہلے اپنے سر ڈھونڈیں

آسمان صحرا ہے، تیرگی قیامت ہے
نجمِ نیم شب بن کر خود کو ڈھونڈنے نکلیں

(۲)

امی جی کے نزدیک ابا جی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بے حد حوصلہ مند اور خوش مزاج ہیں۔ لکھنے پڑھنے کی ہزار مصروفیات میں بھی اپنے آپ کو سنبھالے رکھتے ہیں۔ چھوٹی موٹی گھریلو الجھنیں جو ہر گھر میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ان پر میں تو پریشان ہو جاتی ہوں۔ لیکن ندیم صاحب خواہ کتنے فکر مند کیوں نہ ہوں، بظاہر نہایت پُرسکون رہتے ہیں۔ اب جیسے کبھی

آنا جانا ہو تو سنبھالنے کے کئی کام ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بڑے آرام و سکون سے تیاری کرتے ہیں۔ ہاں ایک بات یہ ہے کہ جب ہمیں بھی ساتھ جانا ہو تو پھر تو سب سے پہلے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر انھیں اکیلا کسی مشاعرے کے سلسلے میں جانا ہو تو اکثر اُس وقت اسٹیشن پہنچتے ہیں جب ریل چلنا شروع کر دیتی ہے۔ پھر اُن کے دوست انھیں ہاتھ بڑھا کر کھینچ لیتے ہیں۔ ایک دو بار تو اسٹیشن سے یہ کہتے ہوئے گھر واپس بھی آ چکے ہیں۔ کہ "سیٹی ہوئی رہ گئی گیٹ نہیں کھڑا کیا ہے" زیبا چچی بنی ٹھنی رہ گئی مگر کوئی تقریب پر نہ لے گئے۔ ندیم صاحب بہت ہنس مکھ ہیں۔ بچوں میں بیٹھیں تو اُن کے دوست بن جاتے ہیں اور بزرگوں کا احترام تو بے حد کرتے ہیں۔ لیکن اُن کو بھی نہایت سلیقے سے چھیڑ دیتے ہیں۔

ان کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ اپنے کپڑوں اور اپنی دوسری استعمال کی چیزوں کو عام مرد حضرات کے برخلاف خود ہی سنبھال کر رکھتے ہیں۔ میں نے کبھی اُن کی کوئی چیز اِدھر اُدھر بکھری نہیں دیکھی سوائے کتابوں کے۔ جو ہر طرف اور ہر جگہ موجود ہیں۔ اگر انھیں بغیر کتابوں والا کمرہ دیا جائے تو کہتے ہیں۔ میں یہاں اپنے آپ کو "اوپرا" (اجنبی) محسوس کر رہا ہوں۔

ندیم صاحب کی پسند بہت اچھی ہے۔ کپڑوں کے رنگ اور ڈیزائن کی پسند دوسرے مرد حضرات جیسی نہیں۔ بلکہ اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ رنگ نہایت اچھے اور ڈیزائن بہت مناسب چنتے ہیں۔ اُن کے ساتھ خریداری کو جائیں تو چیزیں تو بہت اچھی خریدی جاتی ہیں۔ لیکن جو جتنی رقم مانگے وہی چپ چاپ دے ڈالتے ہیں۔ ایک پُرلطف بات یہ ہے کہ مثلاً اگر پھلوں کی دکان پر جائیں اور دکان دار اعتماد دینے لگے تو ایک دم ڈھیروں پھل خرید کر رقم وہ جتنی کہے ادا کر کے گھر آ جاتے ہیں۔ اور پھر پھل نکال کر دیکھے جاتے ہیں اگر ان میں سے کچھ خراب نکلیں تو وہ اداس ہو جاتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ رقم ضائع گئی۔ بلکہ اس لیے کہ انھوں نے دوکان دار پر اعتماد کیا اور اُس نے انھیں دھوکا دیا۔ ندیم صاحب تو دھوکا دینے والے کو اچھے نہیں کہتے۔ احسان فراموش شخص کو تو وہ مجبور سمجھتے ہیں۔ لیکن دھوکے باز اور ریاکار لوگ اُن کے نزدیک تمام لوگوں میں سب سے بُرے انسان ہیں۔

ندیم صاحب بہت شریف اور نیک ہیں۔ سب سے پیار کرنے والے۔ ایسے شخص کی ایک خوبی میں کئی کئی خوبیاں ہوتی ہیں۔

لیجیے اب ندیم صاحب کی خامیاں بھی تو سنیے۔ پہلی خامی تو یہ ہے کہ حد سے زیادہ زیادتی کرنے والے کو بھی بالکل معاف کر دیتے ہیں۔ معاف کر دینا اچھی بات تو ہے۔ لیکن یوں لوگوں کو اُن سے مزید زیادتیاں کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں نہ اتنا کڑوا ہو کہ تھوک دیا جائے اور نہ اتنا میٹھا کہ سارا کھا جانے کو جی چاہے۔ حد تو یہ ہے کہ انھیں چھوٹی موٹی زیادتیوں کا تو پتہ بھی نہیں چلتا۔ میری یہ عادت ہے، اسے میری خامی ہی سمجھ لیجیے، کہ میں زیادتی کرنے والے پر ظاہر کر دیتی ہوں کہ وہ ہم سے کس قسم کا سلوک کر رہا ہے۔ جب کہ وہ تو کچھ بھی ظاہر نہیں کرتے۔ معاف کر دینا اور دوسروں کی خامیاں نظر انداز کر دینا ان کی فطرت ہے۔ بالکل پہلے کی طرح پیار اور خلوص کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ بس اسی بات پر مجھے غصہ آتا ہے اور کبھی کبھار ناراضی بھی ہو جاتی ہے۔

دوسری خامی یہ ہے کہ کھانا کبھی وقت پر نہیں کھاتے۔ اور آرام بھی بہت کم کرتے ہیں۔ میں کہتی رہتی ہوں کہ صحت خراب ہو جائے گی۔ لیکن نہیں مانتے۔ میں یوں تو ناراض ہو کر بھی دیکھ لیا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ان کی مصروفیت ہی ایسی ہیں۔

بہرحال یہ تو ہوگا ایک بات ... ہے کہ وہ گھر کی فکر کم کرتے ہیں اور اپنے خیالوں میں زیادہ مگن رہتے ہیں۔ لیکن ندیم صاحب سب سے پہلے گھر کی فکر کرتے ہیں۔ ہمیں ... دینے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ خود رات کو ڈیڑھ دو بجے تک جاگتے رہتے ہیں۔ لیکن جو کچھ بھی ہو انھیں سب سے پہلے اپنی صحت کا خیال تو رکھنا ہی چاہیے۔

اپنی انتہائی مصروفیت کی وجہ سے گھر کے کاموں میں زیادہ حصہ نہیں لے سکتے۔ (روشن دیا ابھی چھوٹی ہوتی تو بات کہاں) اُن سے گھر کی الجھنوں اور مسائل کے سلسلے میں مشورہ مانگیں تو حل مشکل ہی سے ملتا ہے ویسے یہ بہت بڑی بات ہے کہ گھریلو مسئلے کبھی الجھتے بھی نہیں ہیں۔

اگر بچے کسی بات پر مجھے تنگ کریں اور میں اُن کے پاس جاؤں کہ بچوں کو سمجھائیے تو وہ اتنے پیار سے اُن کی حمایت کرتے ہیں کہ بچے اور شوخ ہو جاتے ہیں۔ ہاں اتنا میں مانتی ہوں کہ بچوں کو یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے کون سا کام اچھا کیا ہے اور کون سا غلط۔

کھانے میں وہ زیادہ مصالحے والی چیزیں نہیں کھاتے۔ انھیں مزے دار کھانے پسند ہیں۔ لیکن پرہیز بے حد کرتے ہیں۔ اگر کھانے میں کوئی کمی ہو تو منہ سے کچھ نہیں کہتے۔ بس چہرے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ آج سالن میں نمک زیادہ ہے یا مرچیں اور۔۔۔۔ کبھی کبھی یہ کہہ دیتے ہیں کہ "آج کل نہیں بنتی۔ کہیں شیشی کی کمی آ گئی ضرور (آج بات نہیں بنی)۔۔۔ کسی چیز کی کمی ضرور رہی (یا) جیسا کہ کھانے والوں نے آج تک نہیں دیکھی۔ ہاں اولیٹن ملا دودھ شوق سے پیتے ہیں۔ یوں بھی مجھے اسی پر گزارا ہے۔

ندیم صاحب پیار کے بہت خواہشمند ہیں۔ پیار سے کہو تو پھر وہ ایسے کام بھی کروا لیتے ہیں جو پہلے نہیں کیے — لیکن ذرا تیزی سے بات کی اور بس — پھر انھیں بہت برا محسوس ہوتا ہے۔ چہرہ اتر جاتا ہے اور ڈھیروں اداسی اُن کے پاس چلی آتی ہے —

ہر روز دفتر سے آنے کے بعد سارے دن کی مکمل تفصیل، گھر سے نکلنے سے لے کر واپس آنے تک کے دلچسپ واقعات دلچسپ انداز میں سناتے ہیں۔

ہمارے گھر میں کوئی ان سے خوف زدہ نہیں جس طرح بعض گھرانوں پر والد صاحب کا رعب اور دبدبہ چھایا رہتا ہے۔ بلکہ سب ان کا انتہائی احترام کرتے ہیں اور ان سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ ملازم سمیت۔ سب کو یہ اپنے بچوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ ان کی غلط حرکتوں پر بھی پیار سے انھیں سمجھا دیتے ہیں۔ ندیم صاحب ہمارے پیارے پیارے ہیں۔

میرا بچوں کو نصیحت ہے کہ "میرے آباجی بہت مصروف رہتے ہیں۔ اتنے زیادہ لطیفے انھیں یاد ہیں کہ میں حیران ہوتی ہوں۔ وہ کہتی ہے کہ آباجی کبھی بھی ناراض ہوتے تو ہیں۔ لیکن کسی کو اداس دیکھ نہیں سکتے۔ ایسے فوراً منا لیتے ہیں۔ میرے آباجی چاہتے ہیں کہ ساری خوشیاں ہمیں مل جائیں۔ دیکھا انھیں دراصل یہ ہے کہ آباجی کی [illegible] کیوں نہ اپنا [illegible] ہمیں بات کی اجازت دے دیتے ہیں۔ اگر کوئی بات سمجھ نہ بھی آئے تو اس کی خرابی کی وضاحت کرتے ہیں۔ [illegible] اس طرح سنجیدہ سے ہو جاتے ہیں [illegible] جو ابھی کچھ دیر

پہلے مجھ کو چھیڑا جا رہا ہے کہتے۔

نعمان کے نزدیک ، اباجی مکمل نمونہ ہیں۔ ان میں کوئی خامی نہیں۔ اباجی نے کبھی سختی سے اپنی بات نہیں منوائی۔ ہمیں ہماری مرضی کا موقع دیتے ہیں۔ بس اچھی بات کی اچھائی ضرور سمجھا دیتے ہیں۔

ہم لوگ اباجی سمیت، گھر میں پوٹھوہاری پنجابی بولتے ہیں۔ اس پنجابی میں اردو کے بہت سے الفاظ شامل ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم کوئی ملا جلا لفظ کہیں یا لفظ صحیح نہ ہو تو اباجی ٹھیک کرتے جاتے ہیں اور یوں ہماری بول چال کی بھی اصلاح ہوتی جاتی ہے۔"

میری بہن نشاط نے کہا کہ "مجھے اباجی کی یہ عادت بہت پیاری لگتی ہے۔ جب وہ بیٹھے بیٹھے اچانک ہم بچوں کو اپنے ساتھ لپٹا لیتے ہیں۔ اور جب ہم پوچھیں "کیا بات ہوئی" تو کہتے ہیں۔ "بس یونہی پیار آ گیا تھا"۔

"اباجی اپنے بچپن کی باتیں بہت دلچسپ طریقے سے بتاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی معصوم شرارتیں۔ بھولپنے کی حرکتیں۔ بہت لطف آتا ہے"۔

نشاط کہتی ہے کہ "مجھے اباجی سے ایک بار بہت ہی خوف آیا تھا۔ ہوا یوں کہ ہم چھوٹے چھوٹے تھے۔ عید کی چھٹیوں میں گاؤں گئے۔ ایک دوپہر کو اباجی کھانا کھا کر چھوٹے کمرے کی بجائے خلاف معمول بڑے کمرے میں دروازہ بھیڑ کر سو گئے۔ وہ شاید بہت تھکے ہوئے تھے۔ اب مجھے اور ناہید آپی پریشانی کہ ہمارے کھلونوں اور گڑیوں کے ڈبے بڑے کمرے میں ایک پیٹی کے اوپر رکھے تھے۔ ناہید آپی بڑی تھیں۔ اس لیے انھوں نے مجھے یوں سمجھیے حکم دیا کہ آہستہ آہستہ جاؤ اور بکس میں سے کھلونے اور گڑیاں نکال کر لے آؤ۔ میں آہستہ آہستہ گئی۔ لیکن دروازے کو اندر دھکیلا ہی تھا کہ کھٹکا ہو گیا۔ اباجی کی آواز آئی۔ "کون ہے" [illegible] میں بغیر کچھ بولے باہر بھاگ آئی۔ ناہید آپی نے مجھے سمجھایا۔ "تھوڑی دیر صبر کرنا"۔ دروازہ تو کھلا ہی ہے [illegible] تھوڑی دیر صبر کرنا۔ چونکہ یہ ہمارے کھیل کا وقت تھا اور آج میرے گڈے کا ناہید آپی کی گڑیا سے بیاہ کرنا تھا۔ اس لیے میں نے پھر ہمت کی [illegible] بھی نکل گئی۔ آہستہ سے بکس کا ڈھکن اٹھانا چاہا۔ لیکن آواز ہو ہی گئی۔۔۔

"کیا بات ہے بھئی۔ یہ کون تنگ کر رہا ہے"؟ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں بغیر کوئی جواب دیے پھر واپس بھاگ آئی۔ اب کے آپی بہت ڈر گئی تھیں۔ انھوں نے مجھے ڈانٹ کہ میں نے شور کیوں کیا۔ کچھ دیر ہم چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ لیکن بور ہو گئیں۔ آپی نے میری جانب دیکھا اور کہا۔۔۔ "اب اباجی پھر سے سو گئے ہوں گے۔ جاؤ اور گڑیوں والا ڈبہ ہی نکال لاؤ۔ جہیز میں تمھیں تمام کودے دوں گی۔ لیکن دیکھو کوئی کھٹکا نہ کرنا"۔ میں نے کہا۔۔۔ "اب آپ چلی جائیں نا۔۔۔"

آپی منہ پھیر کر بولیں۔۔۔ "اچھا چلو پھر میں اپنی گڑیا نہیں بیاہتی"۔۔۔ "اوہ" میں اداس ہو گئی تو آپی نرم پڑ گئیں۔ کہنے لگیں۔۔۔ "دیکھو یہ کام تو چھوٹی بہن کے ذمے ہوتا ہے نا۔۔۔ لیکن اب کے تم چلی جاؤ۔ اگر اس بار بھی کام نہ بنا تو پھر میں جاؤں گی۔۔۔"

میں بادلِ ناخواستہ اٹھی۔ اندر گئی۔ باہر کی تیز دھوپ کی وجہ سے کمرہ اور تاریک ہو گیا۔ لیکن میں بکس تک پہنچ ہی گئی۔ اب اس اندھیرے میں مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ گڑ یا والا ڈبہ کون سا ہے؟ — کہ ایک دم سے بکس کا ڈھکن کھڑاک سے گر پڑا۔ ابو فوراً ہی اٹھ بیٹھے۔ لیکن اندھیرے میں انھیں شاید معلوم نہ ہو سکا کہ میں کون ہوں۔ میں ڈبے وہیں پھینک باہر بھاگ آئی — میں نے دیکھا کہ ابو ننگے پاؤں میرے پیچھے بھاگے چلے آرہے ہیں — میں ان سے "بچنے" کے لیے تیزی سے چھوٹے کمرے کی طرف دوڑی۔ مجھے اپنے قدم من من بھر کے معلوم ہو رہے تھے۔ اور ابو اب بھی میرے پیچھے تھے۔ بال بکھرائے، ننگے پاؤں۔ ابو نے پیچھے سے مجھے پکڑ لیا۔ اپنی طرف گھمایا۔ اور یہ جان کر کہ انھیں تنگ کرنے والی میں تھی۔ مجھے تھوڑا سا ڈانٹا اور پلٹ گئے۔ میری دھڑکن دوبارہ رک سی گئی، یہ سوچ کر کہ آباجی نے تو مجھے کچھ بھی نہ کہا — میں تو سمجھی تھی کہ آج پٹ جاؤں گی — کون بچہ میری طرح اتنا سستا چھوٹ سکتا ہے"! —

بیگم ندیم سے انٹرویو

صفحہ ۱۳۰ سے آگے

ناپسند نہیں ہے کہ وہ عورت ذات کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ ان کی یہ عادت نہیں کہ ادھر کسی عورت کو دیکھا اُدھر اُسے شاعری کا موضوع بنا لیا۔ بلکہ وہ عورت کو کبھی ماں کے روپ میں دیکھتے تھے، پھر بہنوں کے روپ میں دیکھنے لگے، اب بیٹیوں کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ یہ بڑی خوبی کی بات ہے اور ان کے اس جذبے کی میں دل سے قدر کرتی ہوں۔ جن عورتوں سے ان کا رشتہ ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کا سا ہے، ان کا میں بھی احترام کرتی ہوں اور یوں ان کے ان رشتوں کی قدر کرتی ہوں اور انھیں نبھانے کی کوشش کرتی ہوں۔

— — مگر کاش آپ نے مجھ سے یہ بھی پوچھا ہوتا کہ مجھے ان کی کون سی عادت ناپسند ہے۔ آپ کے پوچھے بغیر بتا دوں کہ میں ان کی سگرٹ نوشی کے ہاتھوں بہت تنگ ہوں۔ سگرٹ تو سبھی لوگ پیتے ہیں۔ مگر ندیم صاحب کے سگرٹوں کے ہاتھوں تو میرے گھر کی کوئی چادر، کوئی گدا، کوئی لحاف، کسی بھی پلنگ کی نواڑ محفوظ نہیں ہے۔ پلنگ پر بیٹھ کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر پڑھتے اور شعر کہتے ہیں۔ ایش ٹرے بھی پلنگ ہی پر رکھتے ہیں۔ کچھ لکھنے کے لیے جلتا ہوا سگرٹ ایش ٹرے میں رکھ دیتے ہیں اور پھر اسے بھول جاتے ہیں۔ اور سگرٹ انھیں اپنی یاد یوں دلاتا ہے کہ چادر یا گدے یا لحاف میں سے دھواں اٹھنے لگتا ہے۔ یقین مانیے کہ میرے گھر میں بستر کی کوئی ایک بھی چادر ایسی نہیں ہے جس پہ ندیم صاحب کے سگرٹ کی مہر آرپار ثبت نہیں ہے۔ نہ جانے ان کی یہ عادت کیسے چھوٹے گی!

سوال: اپنے شوہر کا کوئی ایسا شعر سنائیے جو آپ کو پسند ہو۔

جواب: بہت سے شعر پسند ہیں۔ آپ نے ایک ہی پوچھا ہے تو ایک ہی سنیے :-

مجھ کو نفرت سے نہیں، پیار سے مصلوب کرو
میں تو شامل ہوں محبت کے گنہگاروں میں

خدیجہ مستور

لالہ اور جھوٹ

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے، تو آج میرا بھی جی چاہ رہا ہے کہ گھر کی بھیدی بن کر لالہ کے پیچ کی لنکا کو ڈھا دوں۔ آپ حیران ہوں گے کہ آخر میں اس معزز ہستی کے لیے کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔

بات صرف اتنی ہے کہ لالہ ندیم بھی جھوٹ بولتے ہیں اور ایسے بے دھڑک بولتے ہیں کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہو۔ اس جھوٹ میں شرارت کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ اس لیے جب وہ جھوٹ بولتے ہیں تو ان کے ہونٹوں کا عجیب دلچسپ زاویہ بن جاتا ہے اور آنکھوں میں جھوٹ کی لذت کی چمک تیرنے لگتی ہے، اور بظاہر وہ بے حد سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ اس لیے صرف وہی شخص ان کے جھوٹ پکڑ سکتا ہے جو ان کے بہت قریب ہو۔ جھوٹ کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ کبھی دل داری کے لیے۔ کبھی تصور کی دنیا سجانے کے لیے اور کبھی محض شرارتاً۔

میں اگر یہ دعویٰ کروں کہ میں لالہ کے ان تمام اقسام کے جھوٹ بڑی مہارت سے پکڑ لیتی ہوں تو شاید غلط نہ ہوگا۔ اب وہ کون شخص ہوگا جسے لالہ فون کر کے کہیں کہ میں نے کل آپ کو کئی بار فون کیا، کسی نے رسیور اٹھایا ہی نہیں، تو وہ اُن کی بات پر ایمان نہ لے آئے اور جواب میں یہ نہ کہے کہ میں نے آپ کو کتنی بار فون کیا۔ آپ کے ملازم کو پیغام بھی لکھوایا۔ میں تو سمجھا تھا کہ ملازم نے بتایا ہی نہیں۔ ملازم کی فوراً صفائی پیش کر دیں گے۔ "بتایا تھا بے چارے نے، کیا کروں ٹیلیفون بھی دو دن خراب رہا۔"

مگر جب لالہ مجھے فون کر کے بڑی ہی سے کہیں گے کہ "بٹو آج صبح سے دس بارہ دفعہ فون کیا مگر تمھارا نمبر نہیں ملا"، تو میں فوراً کہوں گی "لالہ! جب میں آپ سے بات کرتی ہوں تو آپ میرے سامنے ہوتے ہیں۔ سمجھ گئے آپ؟ — میں آج چار دن سے آپ کو فون کر رہی ہوں۔ آپ نہیں ملے۔ یہ ناممکن ہے کہ آپ کو میرا پیغام نہ ملے۔" لالہ کی آواز میں غصہ ہوتا ہے "میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں جب فون کرتا تھا کہیں اور جا ملتا تھا۔ میں نے بار بار کوشش کی۔" میں بھی ہار نہیں مانتی "لالہ۔ اتنے فون نہ کیا کرو۔ ہزار بارہ سو بل آجائے گا۔ غریب ہو جاؤ گے۔" لالہ کی ہنسی کی آواز آتی ہے۔ "یار کبھی کبھی تو جھوٹ بھی بولنے دیا کرو۔"

یہ "کبھی کبھی" کی بات غلط ہے۔ نہ جانے کتنی بار جھوٹ بولتے ہیں۔ عزیزوں سے، رشتے داروں سے، دوستوں سے، نئی نسل کی کتابوں کے دست نگروں سے! ... جھوٹ کی اس قسم پر میں کبھی کبھی احتجاج کرتی ہوں۔
"لالہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے، سب غلط۔ وہ کتاب ان خصوصیات کی قطعی حامل نہ تھی۔"

اور لالہ بے بس ہو کر کہیں گے "تو کیا ہوا اگر آج یہ خصوصیات نہیں، تو کل پیدا ہو جائیں گی۔" اور پھر موضوع بدل کر وہ اپنے کسی دوست کا ذکر شروع کر دیں گے۔ "کل مجھے میرا وہ فلاں دوست ملا۔ ایسے لوٹ کر لاتا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو۔"

میں فوراً پوچھتی ہوں۔ "وہی نا جس نے فلاں فلاں سے تمھارے بے کل فشانیاں کی تھیں؟"

"غلط۔ بالکل غلط۔ ایسا قطعی نہیں ہو سکتا۔ تم یوں ہی دوسروں کے کہنے پہ یقین کر لیتی ہو۔"

پھر میں کبھی لالہ کے سامنے جھوٹ بولتی ہوں۔ "مجھے قطعی یقین ہے لالہ۔ لوگوں کو باتیں بنانے میں مزہ آتا ہے۔"

ایک بار مجھے لالہ سے بڑا ضروری مشورہ کرنا تھا۔ میں نے انھیں فون کیا کہ کل ضرور آ جائیے۔ جواب ملا۔ ضرور آؤں گا۔ تم چائے بنا رکھنا۔ بس دس بجے تک پہنچ جاؤں گا۔ دس بجے اور پھر سارا دن گزر گیا۔ لالہ نہ آئے۔ میں نے دوسرے دن فون کیا۔ کہنے لگے "کمال کرتی ہو۔ آیا کیوں نہیں۔ دس منٹ تک بیرونی گیٹ پر ٹیکسی رکوا کر کھڑا رہا۔ تم نے اتنا پہاڑ سا کتا پال رکھا ہے اور اسے باندھتی بھی نہیں ہو۔ (لالہ کو پتہ ہے کہ دن میں کبھی کھلا رہتا ہے اور کاٹتا نہیں۔ بس اس کی صورت خوفناک ہے) وہ پھاٹک کے پاس تشریف فرما تھا۔"

میرا غصہ فوراً ہوا ہو گیا اور ہنسی آ گئی۔ وہ سمجھے کہ میں ان کی کتے سے ڈرنے والی عادت پر ہنس رہی ہوں۔ منمنا کر بولے۔ "منحوس مت۔ مجھے کتے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ کہیں کاٹ کھانے کو آ جائے تو؟"

میں نے بتایا کہ لالہ ہمارا کتا پچھلے ہفتے مر گیا ہے۔

اسی سنجیدگی سے بولے: "پھر کسی پڑوسی کا کتا ہوگا۔" اس کے بعد لالہ نے قہقہے لگانے شروع کر دیے اور ظاہر ہے کہ دوسرے دن وہ آ گئے۔

ایک بار کہنے لگے۔ "ناہید نے تمھارے لیے ایک مٹھائی بنائی ہے۔" میں نے پوچھا۔ "ابھی باقی بچی ہے یا کھا لی؟" کہنے لگے "نہیں بھئی۔ اس نے بہت سی بنائی ہے۔" میں نے کہا شام کو آؤں گی۔ شام کو میں پہنچ گئی۔ جاتے ہی ناہید سے کہا، میٹھی مٹھائی کھلاؤ۔ وہ بے چاری پریشان ہو گئی۔ کہنے لگی "پھوپی ہمیں کیا پتہ تھا کہ آج آپ آ رہی ہیں۔ آپ بیٹھیے میں ابھی بناتی ہوں۔ لالہ نے ہنسنا شروع کر دیا "یار میں گھر میں کہنا ہی بھول گیا تھا کہ تمھیں کچھ بنانے بلا رہا ہوں!" یہ پہلا موقع تھا کہ میں لالہ کی آنکھوں کی چمک سے دھوکا کھا گئی تھی۔

اس قسم کے بے ضرر جھوٹ لالہ اکثر بولتے ہیں۔ مگر جب وہ خود کو بہلانے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں تو جانے کیوں میرا دل بھر آتا ہے۔

محمد خالد اختر

ایک آدمی، احمد شاہ نامی

احمد ندیم قاسمی کے بارے میں میں کیا جانتا ہوں؟ ایک انسان دوسرے انسان کے متعلق کیا کچھ جان سکتا ہے؟ ایک آدمی کا بہت تھوڑا روپ اس کے جاننے والوں دوستوں اور عزیزوں کے مشاہدے کے سامنے آتا ہے۔ صرف وہی جو خود اس کے اندرونی وجود کے آئینے میں منعکس ہوتا ہے اور اسے زندگی کی شاہراہ پر ہمارے قریب لاتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا معمہ ہے۔ اگر ہم ریلکے کے الفاظ میں "اندر کا آدمی"۔ اکثر ہم میں سے بیشتر کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ ایک بڑا ناول نگار دوستوئیفسکی، عالمی ... یا ہمارا کہانی نویس منٹو شاید اس حصے کو اپنی عکسی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، ہر کوئی نہیں! یہ کون جانے ایک انسانی دل کے اندر کونسی اُمنگیں، محرومیاں، خواہشیں پرورش پاتی ہیں کون سے بھسم کرنے والے ابتدائی جبلی جذبات واحساسات وہاں بستے ہیں۔ ہم سب یک رنگ نہیں ہیں اور مختلف حالات اور موقعوں پر ہمارے کردار و خیال مختلف ہوتے ہیں۔ وہ چہرہ جو ایک عوامی لیڈر بازاروں اور جلسوں میں اپنے مجمعے کے روبرو پیش کرتا ہے وہ چہرہ نہیں جو اس کے جگری یار اور لنگوٹیے ذاتی مجلس میں دیکھتے ہیں یا جیسا اس کے گھر میں اس کی بیوی اور بچے جانتے ہیں۔ طالسطائی کی بیوی نے اس کے مرنے کے دس سال بعد بتایا میکسم گورکی سے کہا "میں اس کے ساتھ اڑتالیس برس رہی مگر میں اسے کبھی نہ سمجھ پائی"۔ نپولین، دنیا کا فاتح، فرانس کی سپاہ کی آنکھ کا تارا، اپنی پہلی بیوی جوزیفائن بیوہارنیس کی نگاہوں میں ایک قدرے ڈھیٹ، مطلب پرست، باتونی شخص تھا جس کی باتیں اسے انتہائی بور کرتی تھیں۔ میں ایک دفعہ ایک بڑے قومی شاعر کے بیٹے سے جو اس کی پہلی بیوی سے تھا، کراچی میں ملا۔ وہ لمبی مونچھوں والا، گٹھیلا، خوش باش شخص تھا اور جب میں نے اُس کے مشہور اور محترم باپ کی شاعری میں قومی اور ملی جذبے کی تعریف کی اور اتنے عالی مرتبہ باپ کا بیٹا ہونے پر اس کی تہنیت کی تو اُس کی والرس مونچھوں کے پیچھے ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "تم اس کی قومی عظمت کو سینے سے لگاؤ۔ وہ ایک بہت کم ظرف، چھوٹا آدمی ہے، اور میں اس کا منہ تک دیکھنے کا روادار نہیں۔" سعادت حسن منٹو ایک شرافت منش، ہمدرد، دمساز اور صحیح معنوں میں انسان دوست HUMANE شخص تھا، جو دوسرے کا دکھ سن کر تلملا جاتا تھا۔ مگر بعض وقت اس کی بڑی بڑی اُبلتی آنکھیں جو انسانوں کی بے کسی اور تنہائی پر اشکبار رہتی تھیں پتھر ہو جاتی تھیں اور وہ اپنے کمرے میں بجلی کے پنکھے کے نیچے بیٹھے آشناؤں اور مداحوں پر جھنجھلاہٹ میں اس قسم کے الفاظ کے ساتھ برس پڑتا تھا "جاؤ، اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔ نواب زادے صوفوں پر بجلی کے پنکھے کے نیچے ایسے مزے سے بیٹھے ہیں جیسے اُن کا اپنا گھر ہے۔ اوئے تم لوگوں کو اپنے گھر میں یہ صوفے اور یہ پنکھے کی ٹھنڈی ہوا نصیب نہیں۔ کچھ پتہ ہے مجھ کو تمھاری ناز برداری کے لیے بجلی کا کتنا بل دینا پڑتا ہے؟ وہ دو گے؟" منٹو یہ سب کچھ ٹھیٹ پنجابی میں

کہتا، اور ایک بدنصیب نے جس پر یہ واردات گذری تھی مجھے خود یہ قصہ سنایا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ یہ کلمے کہتے وقت منٹو کا لب و لہجہ قطعاً مزاح اور چھیڑ چھاڑ کا نہیں تھا، جیسا کہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے طور میں اتنی تلخی، کمینگی اور بدتمیزی آ گئی تھی کہ اس کے بعد کسی بھلے مانس کے وہاں بیٹھے رہنے یا پھر اُدھر کا رُخ کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ منٹو کو لوگوں نے مختلف رنگوں میں دیکھا ہے، اور چونکہ اس نے بے باک، منہ پھٹ اور لگی لپٹی نہ رکھنے والی طبیعت پائی تھی، اس کے اندر کے آدمی کے احساسات کبھی کبھار اُبل پڑتے تھے، اور اس کے ملنے والوں کو متحیر یا محجوب کر دیتے تھے۔ وہ اپنے یا دوسروں کے راز رکھنے میں یقین نہ رکھتا تھا، اور میلے متعفن کپڑے کو ہر سر بازار دھونے میں اسے خاص لطف آتا تھا۔

اب ندیم، اس کے سب قریبی دوست جانتے ہیں، منٹو جیسے شوریدہ سر، ہر دم مضطرب، بے حیا اور لوہیمین کردار وں میں سے نہیں۔ ندیم کے متعلق کبھی اوپر دیے ہوئے واقعے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اُس نے کبھی مغلظ بکی ہوں، یا ملنے والوں کو کھڑے کھڑے گھر سے نکال باہر کیا ہو۔ اس کی گھریلو زندگی کا مجھے علم نہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ایک محبت کرنے والا، متحمل مزاج شوہر ہے، اور اس نے کبھی غضبناک ہو کر گھر کے برتن نہیں توڑے۔ گو وہ ایک کہنہ اور بلا کا سگرٹ نوش ہے، اس نے کبھی شراب نہیں چکھی اور بیئر یا وسکی کا ذائقہ اس کے ہونٹوں کے لیے ناآشنا ہے۔ کتنی بڑی محرومی ہے! لیکن ندیم اسے قطعاً محرومی نہیں جانتا، اور شراب نوشی کو سات نقلی گناہوں میں سے ایک گردانتا ہے۔ اپنے ایام شباب میں محکمہ اکسائز کی دو سال کی ملازمت بھی اسے اس لاابالی معصیانہ راہ پر نہ لا سکی۔ ہم اس اخلاقی ضبط کے لیے اس کا احترام کر سکتے ہیں یا خود مبتدی متوالے ہونے کی وجہ سے اس پر رحم کھا سکتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایک درویشانہ اور دین دارانہ ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی، اور اس کے بچپن کے اخلاقی ٹیبو اس کے خون میں رچ بس گئے ہیں۔ اس نے ان ٹیبوؤں، اور تحریموں سے چھٹکارا پانے کے جتن کبھی نہیں کیے۔ کیونکہ وہ اس کے لیے کڑے اخلاقی قوانین ہیں جن سے انحراف ذلت اور خواری ہے۔ میں سمجھتا ہوں ان اخلاقی تحریموں نے اس کی شخصیت کو کسی قدر گھونٹ کے رکھ دیا ہے۔ اس کی گفتگو پُر لطف، دل پذیر اور شگفتہ ہوتی ہے۔ اگر اس کے ہمراہ گفتگو کے راستے پر کچھ دیر چل کر تم ایک ایسے مکان پر آ نکلتے ہو جس کا آہنی دروازہ اور دریچے بند ہیں، اور جس میں سوائے اس کے کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ اس بے ہوا اور اُجاڑ مکان میں وہ اکیلا رہتا ہے۔ اپنے غائب اخلاقی آسیبوں، پچھتاووں، نامرادیوں اور تشنہ یادوں کے ساتھ! ندیم کے دو تین قریبی دوست ہیں، جن میں میں فخر سے خود کو بھی شمار کرتا ہوں۔ مگر میرا خیال ہے اس کا کوئی ایسا محرم نہیں جس کے سامنے اس کی اندرونی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہو۔ اپنی تنومند الھڑ جوانی میں اس نے ضرور کسی سُرمگیں آنکھوں والی دیہاتی دوشیزہ سے تپتی محبت کی ہوگی۔ مگر اس کے دوست اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، اور وہ اس کا ذکر تک نہیں کرتا۔ یہ کہے نہ جانے والی بات ہے۔ قدرے شرمناک۔ ہُش ہُش، مخرب اخلاق قسم کی چیز! اگر ندیم نے کبھی اپنی آپ بیتی لکھی تو بلا شبہ وہ ایک بے حد دلچسپ صحیفہ ہوگی۔ اس عہد کی ادبی اور تاریخی شخصیات کے متعلق چٹپٹی دلکش یادداشتوں سے بھری۔ ہاں! اس میں ندیم کس حد تک موجود ہوگا؟ میں نہیں کہہ سکتا۔ برٹرینڈ رسل یا کسی حد تک غالب اپنی سوانحی تحریروں اور خطوں میں اپنے متعلق بے باکی سے، صاف گوئی سے، سادگی سے سب کچھ بتا سکتے ہیں۔ رسل کو تو اس پر جان دینے والی ایک حاملہ محبوبہ کو چھوڑ دینے کے بارے میں بتانے میں بھی جھجک نہیں ہوتی۔ غالب کی ستم پیشہ ڈومنی، اور اس کی پُر عیش ہستی سب جانتے ہیں۔ ان انکشافات

نے ان کے قد و قامت میں کوئی کمی نہیں کی، بلکہ ان کی وجہ سے کیا وہ ہم سب کے زیادہ قریب نہیں آجاتے؟ ـــــ ندیم اخلاقی قدروں میں محصور، اور اپنے 'امیج' پر آنچ نہ آنے دینے کے بارے میں محتاط، اپنے 'اندر کے آدمی' میں ہمیں جھانکنے نہیں دے گا۔ سچ بات ہے کہ اس میں ایک وکٹورین شرم و حیا (PRUDERY) ہے، اور بعض وقت میں سوچتا ہوں کہ میرا یہ پیارا دوست اپنے اخلاقی عقیدوں میں ایک بوڑھی کنواری خالہ ہے! ـــ یہ 'پروڈری' ندیم کی طبیعت ہے اور اس کے لیے اسے الزام دینا یا اس کی ادبی حیثیت سے انکار کرنا حماقت ہے۔ حال ہی میں نئی نسل کی ایک دلیر، باصلاحیت، ذہین و فطین شاعرہ نے ایک رسالے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ چونکہ احمد ندیم قاسمی کے سامنے ہم جنسی کا ذکر کرنے سے اس کی بھنویں کھڑی ہو جاتی ہیں، اس لیے وہ بڑا شاعر نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں یہ انوکھی منطق ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ بڑے انگریزی شاعر بائرن، شیلے، جان کیٹس، یا براؤننگ ہم جنسی کے ذکر پر غیر آسودہ یا محجوب نہ ہوتے، اور اس کے باوجود کون یہ انکار کر سکتا ہے کہ وہ بڑے شاعر نہیں۔ ایک بڑے انسان اور شاعر ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ آزادہ رو، رواج کا باغی، اور منکرِ اخلاق ہو، یا ہم جنسی کے رموز و فوائد سے آگاہی رکھتا ہو۔ اگر ہماری شاعرہ ہم جنسی کا ذکر غالب یا میر کے سامنے کرتی تو وہ لاحول پڑھتے، اور انھیں اپنے کانوں پر یقین نہ آتا۔ وہ اس خاتون کو باؤلی کہتے اور تعجب کرتے کہ لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے، ان کی حیا کیوں چلی گئی اور آسمان کیوں نہیں گر پڑا؟ (خود وارث شاہ جو یقیناً 'پروڈ' نہیں تھا، زنگی جلتی ہوئی شاعری جو اس نے اپنی 'ہیر' میں کی ہے:) ایک خاتون سے ہم جنسی کا سن کر اپنا سینہ پیٹ لیتا، اور قربِ قیامت کے مضمون میں چند بیت فی البدیہہ باندھتا ـــ اور وہ چھوٹے شاعر نہ تھے۔ کیا یہ خاتون ایک 'انٹلیکچول' کی حیثیت سے یہ کہنا چاہتی ہے کہ ای ای کمنگز اور دوسرے ماہرینِ جنسیات کی نظمیں جان کیٹس کی 'نائٹنگیل'، یا رابرٹ براؤننگ کی 'لاسٹ رائیڈ ٹو گیدر' سے اعلیٰ تر اور بہتر شاعری ہیں؟ یا غالباً پرانی ۱۹۴۰ء سے پہلے کی شاعری اب مردہ ہے، اور نئی نسل کے لیے اس میں کوئی خوبصورتی، کوئی پیام نہیں ہے۔ خاتون نے ندیم کے بڑے شاعر ہونے سے انکار کیا ہے، اور غالباً اس کو ندیم کے بڑا تخلیقی فن کار ہونے میں شک ہے، کیونکہ ندیم صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ اردو زبان کا ایک اونچا افسانہ نگار بھی ہے۔ ہنری ملر اور بروز BURROUGHS بلاشبہ ہر قسم کی جنسی غلط روی (PERVERSION) کے علم میں بڑے گنی اور سیانے ہیں اور ان کی سہ حرفی الفاظ کی وسیع پُر مغز لغت سنسناہٹ پیدا کرتی ہے، مگر ان کی 'ٹراپک آف کینسر' اور 'نیکڈ لنچ' اپنے سارے فن یا بافت سازی کے ساتھ 'کینسر وارڈ' یا 'ہٹن ڈم' سے بڑے ناول نہیں ہیں۔ ڈی ایچ لارنس کا شروع کیا ہوا فیشن اب اپنی جدت کھونے کو ہے، اور نوبوکوف کی 'لولیتا' ـــ ایک ادھیڑ عمر آدمی کی نوخیز چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ جنسی کارگزاریوں کی کہانی۔ ایک اچھا ناول تھا اور اس نے اپنی اشاعت پر ایک سنسنی پیدا کر دی، مگر کم از کم ایک پڑھنے والے کے لیے ناول کے پہلے چند صفحات کے بعد آگے پڑھنا دشوار ہو گیا۔ اسے یہ ساری فن کاری انتہائی اکتا دینے والی اور بھونڈی لگی، اگرچہ اس کے چند ایک گرمانے والے حصے اپنے اثر کے بغیر نہ تھے۔ کیا خاتون شاعرہ کے خیال میں 'لولیتا'، ایمیلی برونٹے کی 'وودرنگ ہائیٹس' سے بڑا ناول ہے؟ کیا ہم ان سب کتابوں سے محبت نہیں کرتے جو سادگی سے، خوبصورتی سے، ہمارے ساتھ اُن چیزوں کی باتیں کرتی ہیں جو ہمارے دلوں کے قریب ہیں۔ مجھ کو دو ٹانگوں کے بیچ کے انسانی عضو کی افادیت تسلیم ہے، مگر بڑے ناول اس کی کارکردگیوں کی تفصیل کے بغیر بھی لکھے گئے ہیں، اور اس عضو کا خیال جس طرح ڈی۔ ایچ۔ لارنس پر مسلط تھا، وہ اکثر ایک بیمار اور مرض زدہ ذہن کی علامت ہوتا ہے۔ لارنس کی

بیوی فریدا نے اس کے مرنے کے بعد کسی سے کہا کہ "لارنس نامردی کا شکار تھا اور جنسی فعل کا نااہل! اور جس طرح ایک بھوکا آدمی بھوک مٹانے کا وسیلہ نہ رکھتے ہوئے روٹی کے سوا کسی چیز کا نہیں سوچ سکتا، لارنس ہمیشہ جنس کی پُراسرار تاریک قوت کا راگ الاپتا رہتا تھا (میں بحیثیت ایک ناول نگار اس کی عظمت سے انکار نہیں کر رہا!)

مگر اس خاتون کی مردانہ بات میں صداقت کی ایک قلیل مقدار ضرور ہے۔ شاید وہ صرف یہ کہنا چاہتی تھی کہ ندیم 'پروڈ' ہے — 'پروڈ' وہ ضرور ہے اور ایک بار اس نے "فنون" میں راجندر سنگھ بیدی کی ایک شاہکار کہانی کو اس بنا پر نہ چھاپا کہ وہ بہت ننگی تھی، وراس میں پستانوں کا ذکر تھا۔ ندیم فی الواقع اپنی اخلاقی تحریمات کی حدود میں اس 'فحاشی' کو سمجھنے سے قاصر ہے اور نئی پود کے اس وادی میں آزادی سے کھل کھیلنے پر حیران! مگر پھر اردو کے کتنے ہی اچھے فن کار 'پروڈ' نہیں؟ علامہ عباس پروڈ نہیں اور قرۃ العین حیدر ایک اتنی بڑی 'پروڈ' کہ جھنجھلاہٹ ہونے لگتی ہے۔ ہم ایک تخلیقی فن کار سے صرف اس بنا پر نہیں جھگڑ سکتے کہ اس کے کردار مردانہ اور زنانہ، کبھی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں سوتے — ہم جنسی کے ذکر پر ندیم کی بھنویں کھڑی ہو گئیں، کس ندیم کی؟ — ہو سکتا ہے اندر والے سمندر سے گہرے ندیم کا ردّ عمل کچھ اور ہو — زیادہ فطری اور سچا! —

ہاں میں، احمد ندیم قاسمی کے متعلق کیا جانتا ہوں! شاید بہت کم — شاید اتنا جتنا ایک دوست کو جاننے کا حق ہے۔ ہر انسان اپنی ذات میں ایک جزیرہ ہے اور محبت ہی دو انسانوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا وسیلہ ہے۔ میں احمد ندیم قاسمی سے اس وقت سے محبت کرتا ہوں جب قسمتوں نے ہمیں چھتیس سینتیس برس پہلے صادق ایجرٹن کالج بہاولپور کے ایوانوں میں اکٹھا لا پھینکا۔ میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا، وہ تھرڈ ایئر کا۔ مگر خوش قسمتی سے ہم ایک ہی پروفیسر کے گروپ موسوم بہ سوبجز میں شامل تھے۔ سوبجز کے اجلاس ہر ہفتے ہمارے پروفیسر کی صدارت میں ہوتے تھے۔ ہائی اسکول ہی سے مجھے رائڈر ہیگرڈ، فینی مور کوپر اور رابرٹ لوئی اسٹیونسن کے مہماتی ناول پڑھنے کی لت پڑ گئی تھی۔ اور میں ان کے طرز میں انگریزی میں جنگلی آدمیوں اور بحری قزاقوں کی کہانیاں لکھتا رہتا تھا۔ میں اپنے ذہن کی ایک عجیب خیالی دنیا میں گم صم رہتا تھا، مکمل طور پر مگن! ان میں سے چند کہانیاں میں نے سوبجز میں پڑھیں جن پر مجھے کافی داد ملی، اگرچہ گروپ کے چند لوگوں نے مجھ سے پوچھ کہ میں نے ان کو کہاں سے نقل کیا ہے۔ ندیم، جو اس وقت احمد شاہ ندیم تھا، سوبجز کے اجلاسوں میں اپنی نئی نئی نظمیں سنایا کرتا۔ ان نظموں میں ایک نئی نغمگی، تازگی اور اُجلاپن ہوتا تھا، ورہم ان کے جادو سے آ گئے تھے۔ یہ گٹھے جسے کا، فراخ رو، دیہاتی نوجوان ایک فطری شاعر تھا، اور اس وقت بھی ہم اس سے مستقبل میں بڑی چیزوں کی توقع رکھتے تھے، اور ہمیں یقین تھا کہ وہ جلد ہی شعر و ادب کی دنیا میں اپنا مقام حاصل کرے گا۔ وہ اپنے پروفیسر کا چہیتا طالب علم تھا، ور فورتھ ایئر میں آ کر سوبجز گروپ کا سکریٹری بن گیا تھا، ور کالج میگزین "نخلستان" کے اردو حصے کا ایڈیٹر بھی! — ادب سے ہی راسخ شغف رفتہ رفتہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا، ور جلد ہی ایک ایسی گہری، جذباتی، اور دلی وابستگی کی بنیاد بن گئی جو صرف اوائل جوانی میں ہی ممکن ہے، "ور زندگی کی حسین ترین چیزوں میں سے ایک ہے۔ تقریباً ہر شام کو میں ندیم کے ہوسٹل کے ماہٹروالے بالائی کمرے میں ہوتا۔ وہ مجھے اپنی اس روز کی نظم سناتا ور میں کبھی کبھار اسے اپنی لکھی ہوئی کسی مہماتی کہانی کا حصہ سناتا۔ ان دنوں میں بڑا ہو کر اسٹیونسن کی طرح لڑکوں کے لیے مہماتی ناول لکھنے کی اُمنگ رکھتا تھا، ور میں فوری طور پر ایک بحری قزاق بھی بننا چاہتا تھا، مگر اس خواہش کی تکمیل میں کئی ایک دقتیں

حائل تھیں) آہ، اوائل جوانی کے سنہری سپنے! یہ شاذ و نادر ہی پورے ہوتے ہیں۔ لیکن زندگی کی روکھی، پھیکی، کٹھن وادی میں اُن کی دمک مرتے دم تک انسان کے ساتھ رہتی ہے!

میں اپنے اوائل جوانی کے ان ایام کی یادوں میں زیادہ دیر تک کھونا چاہتا ہوں، مگر ندیم نے "جلال و جمال" کے طویل دیباچے میں ان ڈھالنے والے FORMATIVE دنوں کی اتنی کہانی پہلے ہی لکھ دی ہے جتنی وہ بتانا مناسب سمجھتا تھا۔ اس کی صلاحیتوں کا رُخ مختصر افسانے کی طرف موڑنے میں غالباً میرا بھی تھوڑا بہت ہاتھ ہے۔ میرے اُکسانے پر ندیم نے رائڈر ہیگرڈ کے طرز میں ایک لمبے مہماتی ناول کا آغاز کیا۔ اس نے اس کے اسّی یا نوّے صفحات لکھ لیے، اور مجھے پڑھنے کے لیے دیئے، اور پھر اس نے ہمت ہار دی۔ یہ اس کا GENRE نہیں تھا۔ وہ پنجاب کے دیہات کے اصلی لوگوں کی اصلی، جیتی جاگتی کہانیاں لکھنا چاہتا تھا۔ بحری قزاق اور جنگلی آدمی اس کی طبیعت کو راس نہ آئے۔ میں نے اسے مختصر افسانے لکھنے کا حوصلہ دلایا، اور جلد ہی وہ اس کام میں جُت گیا۔ کئی دفعہ شام کو گھر سے کالج گراؤنڈ آتے ہوئے میں اُسے گھاس پر لیٹے یا کسی بنچ پر بیٹھے اپنا افسانہ لکھنے میں منہمک پاتا۔ پہلی ہی کہانی شاید اختر شیرانی کے رسالے "رومان" میں اشاعت کے لیے قبول کر لی گئی، جس سے اس کی ہمت بندھی اور اس نے چند ایک اور کہانیاں لکھیں (ان میں سے بعض کہانیاں بعد میں اس کے پہلے مجموعے "چوپال" میں اشاعت پذیر ہوئیں)۔ اس طرح شاعر کے علاوہ وہ افسانہ نگار بھی بن گیا۔ ان دونوں اصناف سے وہ ان دنوں آسانی اور آسودگی کے ساتھ نپٹ لیتا تھا۔ اور کالج سے فراغت کے بعد اس نے اپنے فنِ افسانہ نگاری میں کمال حاصل کرنے کے لیے کئی سال بڑی ریاضت کی۔ اس کی مشہور اور بڑی کہانیاں کئی سال بعد کی پیداوار ہیں۔ مگر بہاولپور کالج کے وہ دو سال وہ عرصہ تھا جب اس کے ادبی ذوق کی کونپلیں نکلیں، اور مستقبل کا شاعر اور افسانہ نگار پیدا ہوا۔

کالج سے فراغت کے بعد ندیم بہاولپور سے چلا گیا، اور وہ پُر اذیت اور کرب ناک مہینے جو اس نے لاہور میں ڈگری ہاتھ میں لیے کسی چھوٹی سی ملازمت کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتے گزارے، ان کی تلخی اور ہولناکی وہ ابھی تک نہیں بھول سکا۔ جس دفتر میں وہ جاتا "کوئی آسامی خالی نہیں" کی تختی اس کا خیر مقدم کرتی۔ باہر کی دنیا کی نامہربانی اور بیدردی نے اس خام دیہاتی نوجوان کے حساس دل کو بُری طرح مجروح کیا، اور کئی بار اس نے خودکشی کرنے کی ٹھانی۔ اپنی بوڑھی ماں کی محبت اور اپنے ستارے میں ایمان نے اسے یہ انتہائی قدم اٹھانے سے روکا۔ بہت سے دن اس نے بغیر کچھ کھائے پیے گزارے۔ کئی راتیں لاہور کے گلی کوچوں میں چلتے چلتے کاٹیں۔ اس سارے عرصے میں ہم ایک دوسرے سے مستقل خط و کتابت کرتے رہے۔ اس کے خط شاید جذبات سے بھاری، لبریز اور لمبے ہوتے تھے۔ اس کی تلخ کامیوں، امنگوں اور ہماری دوستی کی پائداری اور عظمت کے مضمون سے بھرے ہوئے۔ وہ اکثر میرے پاس بیرنگ آتے تھے۔ کیونکہ ڈاک کے عام لفافے کا ٹکٹ اتنے فراواں مواد کی ترسیل کے لیے کفایت نہیں کرتا تھا۔ ہر خط میں وہ اپنی بوڑھی ماں کا ذکر ضرور کرتا، جس کی کوکھ نے اسے جنا تھا۔ اور جو اس کے نزدیک ساری دنیا کی عظیم ترین عورت تھی۔ ندیم اپنی ماں کو "حقیقتاً" پوجتا تھا۔ اس کی دلجوئی کی خاطر، اس خاطر کہ وہ اپنے بیٹے کے کارناموں پر غرور کر سکے۔ وہ ادب کے آسمان پر اپنا نام درخشاں سونے کے حروف میں رقم کرنے کے لیے تڑپتا۔ میں ندیم کو پنسل سے لکھے خطوں کے ذریعے جواب دیتا (اُن دنوں میں ہمیشہ پنسل سے لکھا کرتا تھا) وہ عموماً نوجوانی کے لاابالیانہ، ناسنجیدہ، کھلنڈرے بادبانی جہازوں اور بحری قزاقوں کی باتوں سے معمور ہوتے تھے (میں نے بحری قزاق بننے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا، اور یہ یقین

رکھتا تھا کہ اس کے علاوہ کوئی اور کیریر مجھے راس نہیں آ سکتا) نوخیز جوانی کی متوالی خود پرستی اور کھری خود غرضی میں ندیم کی دکھوں اور اذیتوں کی داستان مجھے ضروری حد تک دل گرفتہ نہ کرتی، اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے ملیے پُر درد خطوط پڑھنے کے بعد میں خون کے آنسو روتا تھا۔ خود نگر اور خود رحمی سے مغلوب نوجوانوں نے اکثر ایسے ناسٹلجک خطوط ایک دوسرے کو لکھے ہیں۔ ندیم کے چند خط میرے باپ کے ہاتھ آ گئے۔ وہ گھر کے پتے پر بھیجے جاتے تھے۔ اور میرا باپ تجسس کی وجہ سے انھیں کھول کر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک خط اُس نے سارے کنبے کے سامنے چٹخارے لے لے کر اور کیٹلی طنز یہ رائے زنی کے ساتھ پڑھا (میں غصے اور شرم سے کانوں کی لوؤں تک سرخ تھا!) اُسے پڑھنے کے بعد اور نوجوانی کی پُر جوش جذباتیت پر کٹ کٹ کرتے ہوئے، اس نے اس خط کے ورق میری طرف ان الفاظ کے ساتھ پھینکے "کون ہے تمھارا یہ دوست؟ کیا تم سمجھتے ہو اس کی دماغی حالت درست ہے؟ میرے خیال میں وہ سراسر پاگل ہے"۔ میں تعجب کرتا ہوں کہ اگر میرا باپ ندیم کے نام لکھا ہوا میرا کوئی خط پڑھ لیتا تو اپنے بیٹے کے متعلق وہ کیا رائے قایم کرتا۔ میری بحری قزاق بننے کی پُر جوش اُمنگ اس اچھے آدمی کو روز میں روٹیں تک ہلا دیتی۔ وہ مجھے آئی۔ سی۔ ایس کے مقابلے کے امتحان میں بٹھانا چاہتا تھا۔ وہ ایک میٹر آف فیکٹ قسم کا 'دنیا دار' سمجھ دار آدمی تھا۔ ایک ہر دل عزیز، محنتی اور قابل ریونیو آفیسر۔ اس کی شخصیت میں مقناطیسیت تھی، گفتگو میں چمک، اور لوگ چھوٹے بڑے اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور مجھے شک ہے کہ اپنی دنیوی کامیابی، خوش لباسی اور دینی قیاس آرائیوں کے باوجود اپنے اندرونی وجود میں وہ شاعری کی رمق کے بغیر نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی میز کے دراز میں اولیور گولڈسمتھ کی 'وکر آف ویکفیلڈ' کا ایک دبیز، سنہری حاشیے کا نسخہ موجود رہتا تھا۔ وہ اکثر اس کتاب کو بڑی مسرت سے پڑھتا، اور ہمیشہ مجھے اس کتاب کو پڑھنے کی تاکید کرتا۔ شاید اصل اندرونی آدمی ویکفیلڈ کے پادری کی طرح سادہ لوح، سادہ دل اور بے غرض تھا، اور بظاہر ملازمت کی مصروفیتوں اور ماحول کا چڑھا ہوا ملمع تھا (عجیب طور سے اقبال نے اسے کبھی اپیل نہ کیا، اور میں نے اسے کبھی اقبال کا کلام پڑھتے نہیں دیکھا۔ افرنگی قالین اور صوفوں پر اعتراض، پہاڑوں میں بسیرا کرنے کی تلقین، اس کے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ صاف پاگل پن!) وہ میرے مصنف بننے کی کوششوں پر دانت پیستا، اور ناراضگی کا اظہار کرتا۔ ادب سے میرا انہماک اس کے نزدیک وقت کا ضیاع تھا۔ اس کی جگہ بھلا میں آئی۔ سی۔ ایس کے مقابلے کے امتحان کی تیاری کیوں نہیں کرتا تھا۔ اب میں کبھی کبھار اپنے آپ سے پوچھتا ہوں، کیا میرا باپ صحیح نہیں تھا؟ کیونکہ برسوں کی خوش فہمی اور جگر سوزی اور جانکاہی کے بعد میں اس حقیقت کو جان گیا ہوں کہ میں ایک غیر اصلی، فرضی چیز ہوں، کہ ایک تخلیقی مصنف بننے کے قدرتی جوہر دیوتاؤں نے مجھے ودیعت نہیں کیے، کہ میں احمقانہ اور بے فائدہ طور پر ایک سراب کا پیچھا کرتا رہا ہوں۔ میں کبھی اسٹیونسن کی 'ویئر آف ہرمسٹن'، اور 'ماسٹر آف بینٹرے' جیسی کتابیں لکھ سکتا یا چھپوا سکتا!۔ اگر میں اپنے باپ کی نصیحت پر عمل کرتا تو شاید زندگی کے کسی اور میدان میں اپنی ہستی کی تکمیل اور آسودہ خاطری اور خوشی پا لیتا۔ مگر اب اپنے خول سے برآمد ہونا میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ افسوس، اب وقت گذر چکا!

اس بے ربط غیر متعلق انحراف کے لیے مجھے معاف کرو، مگر ندیم پر یہ مضمون ان دو دوستوں کی کہانی بھی ہے جو جوانسالی کی اُمنگوں اور سنہری سپنوں سے مخمور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ادب و سخن کی وادی میں ظفر و فتحیابی کے جھنڈے گاڑنے نکلے۔ ان میں سے ایک قدرتی شاعر اور کہانیاں لکھنے والا تھا، اور اپنی منزل پانے میں کامیاب ہوا، دوسرا بناوٹی (FAKE)

تھا، اور راہ میں تھک ہار کر رہ گیا، مگر اس کا کیا؟ دوستوں میں سے ایک نے کامرانی پائی، تو کیا یہ دوسرے دوست کی بھی کامرانی نہیں تھی؟ کیا دوسرے دوست نے بھی اس پُر تکان رہ نوردی میں خوش آواز دیویوں کے وہی نغمے نہیں سنے؟

ہماری لگاتار خط و کتابت تقریباً ایک سال تک جوش و خروش سے جاری رہی۔ کاش میں نے ندیم کے اس زمانے کے کچھ خطوط سنبھال کر رکھے ہوتے! وہ اب میرے پاس نہیں۔ ندیم نے میرے کچھ خطوط بحفاظت رکھے، اور جب اس کی پہلی کہانیوں کی کتاب "چوپال" دار الاشاعت پنجاب کے مطبع خانے سے چھپی تو ان خطوں کے کچھ ٹکڑے کتاب کے میرے نام انتساب میں درج تھے۔ چوپال میں ندیم کے ابتدائی زمانے کی کہانیاں ہیں۔ اور یہ کتاب غالباً اب بازار میں نہیں ملتی۔ یہ خط و کتابت ایک سال بعد کچھ کم ہونے لگی۔ ہم دونوں اس نوحہ خوانی سے کچھ اکتا گئے اور دوسری دلچسپیوں اور مشغلوں نے ہماری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ بالآخر یہ تقریباً ختم ہی ہو گئی۔ وہ کیسا زمانہ تھا! میں ندیم کے متعلق نہیں کہہ سکتا، لیکن خط لکھنا اب میرے لیے ایک مشکل، کٹھن اور اُکتا دینے والا مرحلہ بن کر رہ گیا ہے۔

لاہور میں اس بے کاری اور مایوسی میں ندیم کو بالآخر ایک سہارا ملا، ایک دوست جس نے اپنی شفقت کے پروں میں لے لیا، اور جس کے پاس وہ اپنے غم و اندوہ کا تریاق ڈھونڈنے کے لیے جانے لگا۔ یہ اختر شیرانی، تپتے جذبات اور "ایروس" (EROS) کا شاعر تھا۔ دو بالکل مختلف رنگ ڈھنگ کے آدمی ایک دوسرے کے قریب کیوں کر آ گئے، یہ مجھے بڑا عجیب لگتا ہے۔ اختر شیرانی اسکاٹ شاعر رابرٹ برنز کی طرح ایک شرابی اور عیاش تھا۔ مکمل آزاد مشرب، اور ایک رنگیلا عاشق۔ ندیم تب کالج سے نکلا ہوا ایک خام، صالح نوجوان شاعر تھا، جس کے لیے اپنے سے پندرہ سال بڑے شاعر کی اخلاقیات یقیناً بے حد کریہہ اور نفرت انگیز ہونی چاہییں تھیں۔ اختر شیرانی ان دنوں ایک ماہنامہ رسالہ "رومان" نکالتا تھا اور ندیم کی کچھ چیزیں، نظمیں اور کہانیاں "رومان" میں چھپیں۔ پنجابی برنز اپنے رند ہونے کے باوجود ایک فن کار تھا۔ اس نے اپنے نوجوان قلم کار کا جوہر پہچانتے ہوئے اس کا حوصلہ بڑھایا، اور اسے اپنے پاس آنے جانے کی اجازت دی۔ مجھے یاد ہے ندیم نے مجھے اپنے ایک خط میں لکھا "تم لاہور آؤ گے تو میں تمہیں اختر شیرانی سے ملاؤں گا۔ اس جیسا پیارا آدمی میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔" معلوم ہوتا ہے اختر شیرانی ایک بڑا فراخ دل شخص تھا، اور درد مندی اور انسانی محبت کے جذبات اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ ندیم کو کئی بار اختر کے گھر پناہ ملی۔ اختر کے اپنے وسائل محدود تھے، مگر اس نے کئی بار ندیم کو اپنے ہاں زبردستی کھانا کھلایا۔ اور ایک دو بار اسے کچھ رقم دینے کی بھی کوشش کی۔ میرا خیال ہے ایک وقت ان کے تعلقات کافی گہرے تھے، اور ندیم اپنا بہت سا وقت شرابی اور عیاش مزاج شاعر کی صحبت میں گزارتا تھا۔ اختر شیرانی کے لیے بڑی محبت اور قدر کے باوجود ندیم نے خود کو پنجابی برنز کے رنگ میں نہ رنگنے دیا، یا جیسا کہ ندیم کہے گا اس کا دامن معصیت سے آلودہ نہ ہوا، اور اس کی جوانی بے داغ رہی۔ اس نے اپنے ہر قسم کے اخلاق سے آزاد مربی کے ساتھ ہم نوشی سے اجتناب کیا، اور نہ اس کی ہمراہی میں مسلمانوں کے شمسکار کو نکلا۔ وراثت کے اخلاقی نمونہ بہت سخت تھے۔

انہی دنوں ندیم نے ایک خط میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ نور الٰہی محمد عمر کی طرح ہماری چیزیں دونوں کے مرکب نام "ندیم خالد" کے نام سے چھپیں۔ بس اس میں مت کھل تھا۔ میں نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا، جس کا میرے خیال میں ندیم نے قدرے برا مانا۔ مگر میرے پاس اپنی وجوہ تھیں۔ میں حقیقتاً اپنا نام چھپتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا، ادبی فلک پر جگمگانا چاہتا

تھا، مگر، اپنے دوست کی نگارش کے 'کریڈٹ' میں مجھے شریک ہونے میں عذر تھا، اور ندیم کی نظموں اور کہانیوں پر اپنا نام دیکھ کر میری 'انا' کو کوئی تسکین نہیں ہو سکتی تھی۔ اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھنے کا آسان طریقہ یہ ضرور تھا، مگر میں 'دھار مانگے ہوئے کلاہ اور چغے' میں ادب کی دنیا میں نہیں گھسنا چاہتا تھا۔ اور ساجھی سارنگ نوازی مجھے پسندیدہ نہ لگی۔ ہم کبھی اچھے ہم کار (COLLABORATOR) نہ ثابت ہوئے اور ہماری دوستی اس تجربے سے صحیح سلامت بچ کر نہ نکل پاتی۔ میں نہیں جانتا کہ نور الٰہی اور محمد عمر کے باہمی تعلقات کیسے تھے، اور اُن میں سے ایک، دوسرے کے بارے میں کیسے خیالات رکھتا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ ہم کاری کے چند سالوں کے بعد نور الٰہی، محمد عمر کی صورت سے سخت بیزار ہو گیا ہو، اور محمد عمر نور الٰہی کو سامنے آتا دیکھ کر پاس کی کسی گلی میں ڈبکی لگا جاتا ہو۔ جذباتیت ہمیشہ احمد ندیم قاسمی میں رچی بسی رہی ہے۔

وہ ادبی حلقوں میں جلد ہی جانا پہچانا ہو گیا۔ اس کی شاعری میں ایک سادگی، نغمگی، اور معصومیت تھی، جو ہر ایک کو بھا گئی۔ اس کی کئی غزلیں، سیاسی نظمیں 'انقلاب' میں چھپیں، اور ان میں سے ایک جو کافی اچھی اور زوردار تھی، میں نے 'سولجرز' کی میٹنگ میں پڑھ کر سنا دی۔ اختر شیرانی کے بعد مولانا عبدالمجید سالک نے جواں سال شاعر کو اخلاقی اور مالی سنبھالا دیا۔ سالک نیاز مندانِ لاہور کے حلقے کا روحِ رواں، 'انقلاب' میں ناقابلِ تقلید نکھری نثر میں 'افکار و حوادث' کا راقم، ادبی اور سیاسی حلقوں میں بارسوخ تھے۔ اس کی دلچسپ، شگفتہ، چٹکلوں سے بھری گفتگو نے ندیم کو گرویدہ کر لیا۔ اور ندیم نے بھی اس کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ عمروں کے تفاوت کی وجہ سے ندیم نے ہمیشہ اپنے تعلقات میں حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھا۔ مولانا عبدالمجید سالک کے توسط سے وہ 'نیاز مندانِ لاہور' کے گروپ کے مشاہیر اور دوسرے ادبی لوگوں سے متعارف ہوا۔ دارالاشاعت پنجاب کے امتیاز علی تاج کو اپنے بچوں کے ہفتہ وار رسالے "پھول" کے لیے ایک اچھے مدیر کی جستجو تھی۔ سالک کا امتیاز علی تاج سے بڑا یارانہ تھا، اور جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں (اور یہ کہنا بے رحمی نہیں) تاج کی مشہور تمثیل "انارکلی" کی نگارش کو سنوارنے، اس کے اسلوب کو نکھارنے میں سالک اور پطرس نے بڑی کاوش کی تھی۔ کیونکہ 'چچا چھکن' کا مصنف بھی اوریجنل ادیب نہیں تھا۔ سالک نے تاج سے "پھول" کی ادارت کے لیے ندیم کی سفارش کی، بلکہ ندیم کو اپنے دوست کے حوالے کر دیا۔ جس طرح یہ دیہاتی خام نوجوان ساٹھ روپے ماہوار پر "پھول" کا مدیر تعینات ہوا۔ دارالاشاعت پنجاب کا اصل مہتمم اور منتظم تاج کا بڑا بھائی سید حمید علی ایک مزاج دار، سخت گیر شخص تھا۔ ناک بہنے کی مستقل بیماری کی وجہ سے چڑچڑا اور بے حوصلہ۔ ندیم نے "پھول" کو بچوں کا ایک اول درجے کا پرچہ بنانے میں بھرپور محنت کی۔ لیکن وہ سید حمید علی کا تنخواہ دار ملازم تھا، اور اس ادارت میں اُسے خوشی حاصل نہ ہوئی۔ وہ اس ملازمت سے چمٹا رہا۔ کیونکہ روح اور جسم کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے دو وقت کی روٹی ضروری تھی۔ سالک جو ندیم سے اپنے بیٹے کی سی محبت کرتا تھا۔ اس کی دل جوئی کے لیے اکثر وہاں آ نکلتا، اُس کی غمی اور اُداسی کو بھانپ کر ہنسی مذاق کی باتیں کرتا، اور پھر کسی نہ کسی حیلے سے حمید علی سے اجازت لے کر اسے کسی ہوٹل میں کباب کھلانے لے جاتا۔ 'پھول' میں ندیم نے بچوں کی کتنی ہی اچھی نظمیں لکھیں۔ سالک کے کہنے پر ندیم نے اپنی کہانیاں کتاب کی صورت میں طباعت کے لیے جمع کیں، اور سید حمید علی اس کے جملہ حقوق دو سو روپے میں خریدنے پر راضی کیے گئے۔ اور اس کی پہلی کتاب موسوم بہ "چوپال" دارالاشاعت پنجاب کے مطبع سے شایع ہوئی۔ (ایک مصنف کی پہلی کتاب اس کے لیے ایک بڑا ناقابلِ یقین واقعہ ہوتی ہے، اور بعد کی زندگی میں کوئی مسرت اس پہلی کتاب کی مسرت کی طرح تاباں نہیں ہو پاتی۔

ایک دبیز مجلّد کتاب کی پیشانی پر اپنا نام دیکھ کر خوشی اور غرور سے وہ کچھ دن ہوا میں اڑا ہوگا۔ "چوپال" میرے نام منسوب تھی اور اس نے اس کی ایک جلد مجھے بھی بھیجی۔ میں اس کی خوشی میں برابر کا شریک ہوا۔ میں اپنے دوست کی کتاب کو چھپا ہوا پا کر اتنا خوش تھا جیسے یہ کتاب خود میں نے لکھی ہو۔ کافی عرصہ میں 'چوپال' کو اپنے سرہانے تلے رکھ کر سوتا رہا۔

اُن دنوں میں ہی ندیم کی ایک اور کتاب ایک ہندو مہاشے کے نام سے چھپی۔ میں نے وہ کتاب نہیں دیکھی اور میں نہیں سمجھتا کہ اس کا نسخہ اب بازار میں کہیں موجود ہے۔ یہ رسولِ اکرمؐ کی سوانح تھی اور مہاشہ جی نے اس کے لکھنے کا ندیم کو تین سو روپے معاوضہ دیا۔ اور پھر کتاب کو اپنے نام سے شایع کر دیا۔ یہ غالباً ڈھائی تین سو صفحات کی بڑے سائز کی کتاب تھی۔ ندیم کا تین چار ماہ کی جانکاہی کا نتیجہ۔ یہ ایک نادار فاقہ کش مصنف کے استحصال کی ایک دلچسپ مثال تھی۔ اور یہ غالباً واحد مثال نہیں ہے۔ ندیم اب شاذ ہی اس کا ذکر کرتا ہے۔ مہاشے جی کی چال بازی اور کتاب کا ضیاع اسے بھول چکا ہے۔ اس کتاب میں غالباً کوئی ادبی خوبی نہ تھی۔

وہ دارالاشاعت پنجاب سے قریب قریب ایک سال منسلک رہا۔ اور پھر اپنے ایک رشتہ دار میجر کی معاونت سے محکمہ اکسائز میں سب انسپکٹر جا لگا۔ اس ملازمت کے فرائض اس کی فطرت کے بالکل منافی تھے اور اس نے خود کو پانی سے باہر آئی ہوئی مچھلی کی طرح محسوس کیا ہوگا۔ اسے کئی بار ایسے کام کرنا پڑے جو وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ یقینی ہے کہ اکسائز کے محکمے میں ایسا سیدھا سادا، مکر و حیلہ سے عاری، رقیق القلب عہدے دار کبھی بھرتی نہیں ہوا ہوگا۔ پھر بھی میرا قیاس ہے کہ اس کی زندگی کا وہ اکسائز انسپکٹری کا عرصہ نسبتاً خوشی اور خاطر جمعی کا دور تھا۔ ایک اچھی آرام دہ فراغت کی سرکاری ملازمت، معاشرے کی طرف سے [illegible]، خوش باش بے فکرے دوستوں کی صحبت — زندگی بُری نہیں تھی! اسے قمار بازوں، شرابیوں، چرس پینے والوں اور انسانی سوسائٹی کی تلچھٹ سے ملنے جلنے، ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اور اس نے دریافت کیا کہ ان میں سے بعض کا دل سونے کا تھا، اور روح معصوم! وہ صرف اپنے حالات کے مارے تھے، اور عزت دار، [illegible] لوگوں سے زیادہ خلوص اور دردمندی اپنے اندر رکھتے تھے۔ یہ ماحول ایک کہانیاں لکھنے والے کے لیے ایک [illegible] اسکول تھا، کم از کم ایم اے کی ڈگری سے بہتر!

بلاشبہ وہ اس ملازمت کی جکڑبند سے بالآخر اُکتا گیا۔ وہ سب انسپکٹری کے مخصوص سانچے میں نہ ڈھل سکا، اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر ایک صبح اُس نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ پھر لاہور میں اپنے مقدر کے ستارے کی جستجو میں آ گیا۔ اس کے لیے ایک نثر نگار، کہانی لکھنے والے کے سوا اور کوئی کیریئر نہ تھا!

بہاولپور کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد — سال ۱۹۳۹ء تھا — میں لاہور لا کالج میں داخل ہوا۔ اس لیے نہیں کہ قانون سے یا کسی اور دنیوی کیریئر سے مجھے کوئی لگاؤ تھا، بلکہ محض اُس وقت تک دم لینے کا وقفہ حاصل کرنے کے لیے جب میں بحری قزاق بن سکتا تھا، یا تبت میں جا کر دلائی لاما کے چرن چھو کر مکتی حاصل کر سکتا تھا۔ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو اپنی طبیعت میں کسی کجی کی وجہ سے نارمل دنیاوی سانچے میں نہیں ڈھل سکتے، اور جن کے لیے ہمیشہ [illegible] رومانی خوابوں میں جینا مقسوم ہوتا ہے۔ قانون سے بھلا مجھ کو واسطہ! میں جو فطرتاً ایک لاقانونی اور جنگلی مخلوق تھا۔ وہ لوگ جو میری طرح خوابوں میں رہتے ہیں، اکثر شرمیلے، اپنے ہم جنسوں سے خائف اور مطلقاً غیر عملی ہوتے ہیں، اور ایسا ہی میں بھی تھا — ایک نحیف سا، کھویا کھویا، جھجکنے والا لڑکا، زندگی کی شکست و ریخت میں [illegible]

کہا جانے والا —— !

ندیم تب اپنی اکسائز انسپکٹری سے جدا ہو جانے کے بعد لاہور میں تھا، اور ہم اکثر ملا کرتے۔ اس زمانے کا لاہور، ملک کی تقسیم سے پہلے کا لاہور، ادبی ہنگاموں سے پُر رہتا تھا۔ "ادب لطیف"، "سویرا" جیسے خالص ادبی پرچے کافی تعداد میں چھپتے تھے اور پڑھے جاتے تھے۔ تب کے لاہور کو بہ صحیح معنوں میں علم و فن کی آماجگاہ کہہ سکتے ہیں۔ اردو زبان کے چوٹی کے نثر نگار، افسانہ نویس اور شاعر لاہور میں رہتے تھے۔ اس دھڑکتے ہوئے، اکیڑا آباد تاریخی شہر کی فضا کو اپنی صلاحیتوں کے اجاگر کرنے کے لیے سازگار پاتے ہوئے —! اس وقت کا لاہور کہاں گیا؟ اب ادب کے اجارہ دار بیشتر اوٹ پٹانگ ہو گئے ہیں یا لمبے بالوں والے، چشمہ پوش، انٹلیکچوئل نوجوان، جو چائے خانوں میں بیٹھ کر کاموں اور سارتر اور پاؤنڈ پر بحثیں کرتے ہیں، اور خود کو ان سے کسی طرح کم نہیں جانتے!

ندیم مجھے اپنے ہمراہ چراغ حسن حسرت کے ہاں لے گیا۔ حسرت کی ادارت میں ان دنوں ہفتہ وار رسالہ "شیرازہ" نکلا کرتا تھا۔ اردو کا ایک قسم کا "پنچ" میگزین۔ جس کا میں ایک مشتاق قاری تھا، اور جس میں اپنے نام کو چھپے ہوئے دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس بے عیب اردو نثر لکھنے والے سے مل کر مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ شلوار اور قمیص میں جھکی ہوئی گھنی مونچھوں والا ایک تندخو، ان گھڑ، الجیم، جسیم شخص، ایک ادبی آدمی کی ذہنی تصویر کے بالکل الٹ! — ان دنوں میرا خیال تھا کہ ادبی لوگوں کو کوئی فرشتوں جیسی نورانی مخلوق لگنا چاہیے۔ اپنی جھجک کے باعث میں اس خوفناک شخص کے سامنے کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔ سب باتیں ندیم نے کیں۔ اس تعارف کا یہ فائدہ ہوا کہ میرے دو تین ہلکے پھلکے مضامین "شیرازہ" کے لیے قبول کر لیے گئے اور میرا نام چھاپے میں نمودار ہوا۔

ایک دن ندیم نے مجھے ایک نوجوان سخنور کے بارے میں بتایا۔ ماسٹر آف آرٹس نوجوان جس نے "ادب لطیف" میں اپنی پہلی ایک دو کہانیوں سے ادبی دنیا کو ایک ہی ہلے میں مسخر کر لیا تھا، اور ہر کوئی اس کی باتیں کر رہا تھا۔ اس صبح ہم کرشن چندر سے اس کے داتا دربار کے قریب واقع اخباری دفتر میں جا ملے۔ ایک ہندو بیوہ خاتون نے انگریزی میں ایک ماہوار فیشن میگزین کی اشاعت کا آغاز کیا تھا اور اس کی ادارت کے فرائض نائب کرشن بہ مشاہرہ ماہوار، مشاہیرے پر کرشن چندر کو سونپے گئے۔ اس ہونے سے قد، منکسر مزاج، متفکر آنکھوں والے خوبصورت نوجوان کو میں نے پسند کیا۔ اس کی گفتگو دھیمی، الجھی ہوئی اور دلچسپ تھی۔ مگر زیادہ تر باتیں ایک لمبے، دبلے پتلے، بھیلی کی آنکھوں والے آدمی نے کیں، جو لوہے کی تاروں سے جڑا ہوا ایک پرندہ لگتا تھا، جس نے کسی طریق سے ایک میلے سوتی سوٹ کے اندر راستہ پا لیا ہو۔ بعد میں ندیم نے مجھے بتایا کہ یہ حضرت پروفیسر کنہیا لال کپور، مشہور طنز نگار تھے۔ اگر میں چاہتا تو ندیم مجھے دوسری ادبی شخصیتوں سے ملانے لے جاتا۔ وہ بیدی، اشک، دیوندر ستیارتھی اور دوسرے ادیبوں کو جانتا تھا۔ پھر محمد دین تاثیر، عبد المجید سالک، غلام رسول مہر، مولانا صلاح الدین احمد، پطرس بخاری جیسے نثر نگار بھی تھے جن سے اس کو خصوصی نیازمندی تھی۔ لیکن میں ان ادبی ستاروں سے ملنے سے کتراتا رہا۔ میں ادبی لوگوں کی صحبت میں نروس اور سہما سہما رہتا تھا اور اب بھی میرا یہی حال ہے۔

جیسا کہ قرائن سے ظاہر ہے، میں قانون کے پہلے سال میں فیل ہوا۔ میں نے قانون کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی اور امتحان کے پرچوں میں میں نے بڑے اوٹ پٹانگ، پُر مذاق اور غیر متعلق جواب دیے۔ ایبٹ کالج

میں داخلہ مل جانے سے لاہور میں میرا قیام مزید پانچ سال رہا۔ ندیم جب تو مجبوراً ایک فلیٹ میں اٹھ آیا تھا۔ اور وہاں ایک سرائے کے "کبیر" کی حیثیت سے رہتا تھا۔ جب بھی میں وہاں جاتا، کوئی ایک درجن کے قریب خوشاب سے آئے ہوئے دیہاتی کمروں کے مختلف کونوں میں چارپائیوں پر مزے سے بیٹھے ہوتے۔ اتنی وسیع مہمان داری اس سے کب تک نبھ سکتی تھی۔ بالآخر اسے یہ فلیٹ چھوڑ دینا پڑا۔ ان سالوں میں ہماری دوستی کی لو کچھ بجھنے لگی، اور پرانی چمک دمک اور پہلے والی تابانی ماند پڑ گئی۔ ان پانچ سالوں میں ہم سات آٹھ بار سے زیادہ نہ ملے ہوں گے۔ ندیم کا اس کھچاؤ میں کوئی قصور نہ تھا، ایک عجیب ذہنی بیماری کے بادل مجھ پر چھا رہے تھے۔ گھنے کثیف اور دم گھونٹنے والے! میں محسوس کرتا جیسے میں ایک گہرے تاریک گڑھے میں پڑا ہوں، اور کبھی سورج کو چمکتے نہیں دیکھ سکوں گا!

ندیم کے یہ سال ادبی حیثیت سے بہت نتیجہ خیز اور بارآور تھے۔ ہر سال اس کی ایک آدھ کتاب بازار میں آتی تھی۔ اس کے افسانوں کے مجموعے "بگولے"، "طلوع و غروب" اور "سیلاب و گرداب" میں چھپے ہوئے مزاحیہ مضامین کا انتخاب ــــ "کیسر کیاری"، اسی عرصے میں شائع ہوئے۔ اس کی نظموں اور غزلوں کی کتاب "جلال و جمال" اور دیہاتی رومان کے قطعات کے مجموعے "رم جھم" نے اس کی شاعری کی عظمت کا سکہ ان لوگوں پر بھی جما دیا جنھیں اس کے جینیئس کے بارے میں کوئی شک تھا۔ اسے اپنے نام کو آدھی درجن کتابوں کی پشت پر چھپا ہوا دیکھ کر مسرت ہوتی ہوگی۔ شاعری اور افسانہ نگاری میں اس کی انوکھی صلاحیتوں نے مولانا صلاح الدین احمد جیسے ناقدوں سے داد وصول کی۔ اس کے قلم نے پنجاب کے دیہات کے رومانس اور حسن کو تابناک، کھنکتے ہوئے الفاظ میں اپنی کتابوں میں مسخر کیا۔ نسبتاً کم عمر میں ــ چھبیس ستائیس سال کی عمر کو پہنچنے تک ــ وہ اردو ادب کی دنیا میں اپنی شہرت کو مستقل بنیادوں پر قائم کر چکا تھا، اور اگر اس غریب دیہاتی نوجوان کے دماغ کو اپنے معاصرین کی تحسین شیلی شراب کی طرح چڑھی تو یہ قدرتی تھا، اور ہم اسے اس پر الزام نہیں دے سکتے۔

مگر یہ سال اس کے لیے انتہائی تنگی اور عسرت کی تلخ کامیوں سے پر تھے، اور فکرِ روزگار نے اس کی پریشانی کو کم نہ کیا۔

آنے والے سالوں میں اس کی اپنی روزی کمانے کی جدوجہد، ناشروں اور مدیروں کی ناز برداریاں، مکتبہ جدید کے چوہدری نذیر احمد مرحوم کے ماہنامہ "ادبِ لطیف" کی ادارت، آل انڈیا ریڈیو میں دو تین سال کی ملازمت، میاں افتخار الدین کے اخبار "امروز" میں "پنج دریا" کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم نویسی۔ بعد میں خود اس کرسیِ ادارت پر تمکنت جب چراغ حسن حسرت اور دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ایوب نے خصوصیت بخشی تھی۔ پھر پروگریسو پیپرز کے حکومت کی تحویل میں آنے پر اس سے علیحدگی وغیرہ سب کچھ کے بارے میں میں ذکر نہیں کروں گا۔ اس پندرہ سال کے عرصے میں ہم کبھی کبھار یک جا ہوئے۔ ہماری خط و کتابت بند رہی۔ ان سالوں کی حقیقتی اور دلچسپ داستان ندیم کو خود لکھنی چاہیے۔ اور ممکن ہے وہ کبھی اس کو لکھے جب وہ زندگی کی پگڈنڈی پر دوپہر اور شام کے جھٹپٹے میں طے کیے ہوئے رستے کو مڑ کر دیکھنے کی فرصت میسر ہو گی! اور میری خواہش ہے کہ یہ داستان محض واقعات اور اپنے معاصرین کی حکایات کو ذکر میں نہیں لائے گی، بلکہ اس کے اندر کے آدمی کی کہانی بھی ہوگی۔ مجھے اس میں شبہ ہے کہ وہ اتنی جرأت، اتنی بے عداوت بے باکی بروئے کار لا سکے گا، جو ایسی خود نوشت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

اُسے اپنی "پردہ‌دری" کو جھاڑنا اور اس بہروپ کو جسے پہن کر ہم سب دنیا کے کاروبار کرتے ہیں، اپنے ہم نفسوں کے روبرو جاتے ہیں، اُتار پھینکنا ہو گا۔ اس کی مرنجان مرنج طبیعت، وضع داری، اخلاق پرستی، قدیم روش سے فطری لگاؤ — اس کی ظاہری شخصیت کی یہ خوبیاں اس کے اصلی اور سچی بات کہنے کی راہ میں آڑے آئیں گی!

۱۹۶۲ء میں ایک روح فرسا ملازمت کی بیڑیاں پہنے، جس کے لیے میں بالکل نااہل تھا، صحت، اُمنگ اور ذوقِ زیست میں لٹا ہوا، شدید خود رحمی اور خوف کا شکار، زندگی کے پُرتموج سمندر میں ایک تھکا ہارا تیراک، میں لاہور آیا۔ ندیم سے پھر ملاقاتیں ہونے لگیں، گو آغازِ دوستی کا وہ پہلا والہانہ شعلہ پھر نہ جلا۔ ندیم اپنی معاش کی کٹھن آزمائشوں کے باوجود میرے بارے میں حقیقتاً متشوش تھا۔ اور ہر ممکن طور پر میرے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتا۔ وہ میری حالت پر افسوس کرتا، اور رحم کا اظہار کرتا۔ کوئی آدمی کتنا ہی تباہ و برباد ہو، رحم کھایا جانا پسند نہیں کرتا، اور اپنے اس ہمدرد، حوصلہ مند اور خلیق دوست کا میرے لیے تردد، مجھے بعض اوقات ناگوار گزرتا۔ ایسا رحم، میں سمجھتا ہوں، ایک طرح کی بے رحمی ہے!

یہاں میرے بھارت بلڈنگ کے دفتر میں ایک دن ندیم میرے پاس آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے ایک ادبی مجلہ "فنون" نکالنے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کا ڈیکلریشن لے لیا گیا ہے، دفتر کے کمرے کا بندوبست بھی ہو گیا ہے، اور اس کا پہلا نمبر دو مہینے کے اندر اندر اشاعت پذیر ہو جائے گا۔ اس نے مجھ سے "فنون" کے لیے کچھ لکھنے کی فرمائش کی۔ میں کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پچھلے پانچ چھ سال سے اپنی گھونٹ دینے والی مایوسی میں میں نے اردو کی ایک سطر نہیں لکھی تھی، خط تک نہیں۔ اپنے "فیک" ہونے کو جانتے ہوئے میں نے مصنف بننے کی خواہش کسی افسوس کے بغیر ترک کر دی تھی۔ لیکن اتنے اچھے ہمدم سے میں کیونکر انکار کرتا، جب یہ اس کی دلی خواہش تھی کہ میں "فنون" کے لیے لکھوں۔ میں نے اس سے کچھ لکھنے کا وعدہ کر لیا — اس وقت سے میں باقاعدگی سے "فنون" میں لکھتا رہا ہوں۔ تبصرے، مزاحیہ مضمون، کہانیاں، اور اس مجلے کے چند ہی شمارے ایسے ہوں گے جن میں میرا نام نہ چھپا ہو! ندیم نے ہمیشہ اپنی تعریف سے میری ہمت بندھائی، اور جو چیز بھی میں نے "فنون" کے لیے بھجوائی، اس میں شائع ہوئی۔ ان تبصروں اور مضامین کو کوئی دوسرا ایڈیٹر آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ وہ ایک مربیانہ انداز اختیار کرتا اور زبان و بیان کی خامیوں کی طرف میری توجہ دلاتے ہوئے انھیں لوٹا دیتا۔ "فنون" میں میں جو چاہتا تھا لکھتا تھا۔ میرے بعض تبصرے ندیم کو اچھے اور متوازن نہیں لگے ہوں گے۔ تاہم وہ کسی قطع و برید اور ایک لفظ کے حذف کے بغیر چھپے۔ اس سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ وہ اتنا "پرووڈ" نہیں — اس طرح میرے ادبی کیریر کا پھر سے آغاز ہوا۔ میں اپنے "فیک" ہونے کی دل شکستگی کو بھول گیا۔ اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھنے کی مسرت کافی تھی!

میری صحت اسی طرح خراب تھی، میرے معدے کا نظامِ ہضم درست نہ ہوا۔ مگر ندیم کے "فنون" نے مجھے منزل بمنزل گرنے اور اپنے فطری ملکے (INSTINCT) کی مکمل معدومی سے بچا لیا!

احمد ندیم قاسمی کی عمر اب چھپن برس ہے۔ اس کے بال کھچڑی ہو چکے ہیں، مگر اس کی عام تندرستی اچھی ہے۔ وہ اب سمن آباد میں اپنے ایک متواضع، صاف ستھرے چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے۔ ایک نرم دل باپ، ایک اچھا، خیال

رکھنے والا شوہر، ہمیشہ خوش اخلاق، متواضع، ہنس مکھ، کسی قدر محتاط اور مطمئنًا راست رَو اور بُری عادتوں سے پاک!
آمدنی کے محدود ذرائع کے باوجود اس کا ہاتھ بڑا کھلا ہے، اور مجھے کچھ کچھ شک ہے کہ وہ روپے کی قدر وقیمت سے پوری طرح
واقف نہیں۔ وہ روپیہ جس کے نہ ہونے سے وہ ایک وقت پریشان حال رہتا تھا، اور اس کے پانچوں حواس ماؤف ہو چکے
تھے۔ انگریزی ادب اس نے زیادہ نہیں پڑھا، اور کالج میں شیکسپیئر اور نصاب کی کتابیں پڑھنے کے بعد اس نے زیادہ تعداد
میں مغربی ناول یا مختصر افسانے نہیں پڑھے ہوں گے۔ موپساں، ترگنیف، چیخوف کی کہانیاں، ایلیا اہرن برگ کے دو ایک
ناول، شاید کاموں اور سارتر کی اکا دکا کتاب! — ایک اوریجنل مصنف کے لیے، جیسا کہ وہ ہے، اسے گھاٹا نہیں کہا جاسکتا۔
ولیم شیکسپیئر اور وارث شاہ (میں ان کا ندیم سے موازنہ نہیں کر رہا) دو بڑے اوریجنل اور حیرت انگیز شاعر بنیادی طور پر —
"پڑھنے والے" نہیں تھے، انھوں نے بہت کم کتابیں چاٹی ہوں گی، مگر ان کا نفسیاتِ انسانی کا خلقی مشاہدہ، اور فطری قوتِ
بیان ایسی تھی جو بہت کم لوگوں کو قدرت ودیعت کرتی ہے۔ ندیم نے البتہ اردو کے کلاسیکی شعراء کے دیوان ایک طالبِ علمانہ
شغف سے مطالعہ کیے ہیں اور علم عروض کے متعلق اتنا کچھ جانتا ہے، جتنا کوئی جان سکتا ہے۔ اس کی "جلال وجمال" کے بعد کی
شاعری میں ایک کلاسیکی کاملیت (PERFECTION) اور گہرائی ہے۔ مگر ذاتی طور پر میں اس کے پہلے دور کی شاعری
سے اس کی سادگی، نکھار، اور سچی جذباتیت (PASSION) کی وجہ سے محبت کرتا ہوں۔ اس میں سوندھی سوندھی زمین کی
بو باس ہے۔ اس نے اردو زبان میں بڑے اچھے افسانے لکھے ہیں، اور مختلف اسالیب (GENRE) میں، اور اگرچہ اس
کی پہلی کہانیاں اپنی اصلی اور سچی دیہاتی فضا کے ساتھ قدرے جذباتیت سے لگی ہیں، اس کی بعد کی متعدد کہانیوں میں فارم
کی پرفیکشن اتنی نمایاں ہے کہ وہ واقعی شاہکار کہی جاسکتی ہیں۔ اس کے نکتہ چیں جو اس کو بڑا افسانہ نگار تسلیم نہیں کرتے،
اس کے پاسنگ بھی نہیں۔ ویسے ان صاحبان کے نزدیک بے چارے موپاساں اور ماہم بھی نااہل قصہ گو تھے، اور کہانی کہنے کے
فن میں بالکل اکھڑ! — ندیم نے شاعری اور افسانہ نگاری کے علاوہ دوسری اصناف میں بھی اپنی لیاقتوں کا استعمال کیا ہے۔
اس نے انگریزی کے گلبرٹ اور سلیوان کے ڈھب پر اردو میں 'اوپیرا' لکھے ہیں، طنزیہ اور مزاحیہ مضامین میں طبع آزمائی
کی ہے۔ ریڈیو، ٹیلی وژن اور فلم اسکرپٹ روانی سے اور قلم برداشتہ تحریر کیے ہیں۔ پھر اس کی روزانہ اخبار میں مزاحیہ کالم نویسی
ہے۔ ہر روز کی بے تکان مشقت اور تخلیقی فن کار کے لیے ایک بے روح عمل (HACK WORK)! یہ روزانہ کالم اس کی اور
اس کے کنبے کی بقا کے لیے ضروری ہیں، اس کا ذریعۂ معاش ہیں۔ کیونکہ اردو کی ادبی کتابیں بالکل نہیں بکتیں۔ ہوشیار ناشر ایک
کتاب کو محکمۂ تعلیم سے منظور کرا کے کتب خانوں میں کھپا دیتا ہے۔ مصنف کی اپنی جلدیں اس کے دوستوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔
اور ایک ہزار کا ایڈیشن ختم ہونے میں تین چار سال یا اس سے زیادہ کی مدت لگ جاتی ہے، اور اکثر یہ ختم نہیں ہو چکتا — منشی
پریم چند نے، جو اپنے زمانے میں اردو کے ایک شہرت یافتہ اور مقبول مصنف تھے، اپنی پچھلی عمر میں ایک دفعہ حساب لگایا کہ اپنے
درجن سے اوپر ناولوں اور افسانوں کے مجموعوں سے انھوں نے کل تیس روپے ماہوار سے زیادہ نہیں کمایا تھا۔ (ان زمانے
کے تیس روپے آج کل کے تین سو یا چار سو روپے سمجھ لو) اتنا خوش نصیب تھا پریم چند! ان دنوں اردو کا کوئی ادیب بھی اپنی
کتابوں سے اتنی آمدنی پیدا کر سکنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا (میں نسیم حجازی، ابن صفی، رضیہ بٹ کی بات نہیں کر رہا —)
کالم نگاری یقینًا ندیم کا اصل GENRE نہیں جس طور سے یہ چراغ حسن حسرت کا تھا یا عبدالمجید سالک کا، اس لیے

میں تعجب کی بات نہیں کہ بعض وقت اس کے کام اپنے شانے پر کسیک بیٹھتے ہیں، اور بعض وقت ناگزیر طور پر بے رخی برتنا پڑتا ہے اور آدمی کو کالم نگار کے ساتھ ہمدردی سی ہونی ہے:—

وہ ادبی دنیا کی اس بلندی پر پہنچ چکا ہے کہ ادبی انجمنوں، کالجوں کی مجالس اور ہر ایک قسم کے مشاعروں کی صدارت کے لیے اس کی کافی مانگ رہتی ہے۔ ایک بھلا انسان ہونے کی وجہ سے وہ انکار نہیں کر سکتا۔ اور اکثر طوعاً و کرہاً اسے یہ اعزاز اپنے سر پر سہنا پڑتا ہے۔ اس کی موجودگی جلسے کی شوکت بڑھاتی ہے، اس کو امتیاز بخشتی ہے، اور جلسے کے مہتمم ایک بڑے ادبی شیر کو سمجھ کر فخر و مسرت سے پھولے نہیں سماتے۔ بہرحال ادبی صدارتیں اس ملک کی ادبی چہل پہل (LITERARY GAME) کا ایک جزو ہیں۔ اور شاید ایک مصنف کی تمام تر شام کے لیے لازمی بھی۔ میرے دوست کے لیے اب یہ گیم پرانی ہو جانے کی وجہ سے کچھ بور ہو چلی ہے۔ میں نے بعض موقعوں پر اسے اپنے ماحول اور مشتاقوں کی کھیپ کو دیکھ کر پیلا پڑتے اور پھر بڑی وضع داری سے اس تاریخ پر اپنی کسی اور مصروفیت کی اوٹ میں صدارت کی دعوت کو ٹالتے ہوئے پایا ہے۔ ایسے مشکل موقعوں پر اس کا پی۔ اے اکثر اسی تاریخ کی کسی اور مصروفیت۔ (ENGAGEMENT) کی یاد دہانی کراتا ہے!

ایک ادبی مجلے کے مدیر کو خالص کاروباری شخص ہونا چاہیے، جو وہ اصلاً نہیں۔ وہ حساب کتاب نہیں رکھ سکتا، اور میں اکثر تعجب کرتا ہوں کہ وہ 'فنون' میں اشاعت کے لیے آنے والے مسودات کو کیونکر سنبھال کر رکھتا ہے۔ وہ کبھی گم نہیں ہوتے۔ ہر ایک مسودہ۔ نظم ہو یا نثر۔ وہ خود بغائر نظر پڑھتا ہے۔ اور ہمیشہ نئی قابلیت کو دریافت کرتا ہے۔ بالکل انجانے مبتدی لکھنے والوں کے افسانے اس طرح "فنون" میں جگہ پاتے ہیں۔ بہت کم مدیروں میں اصلی اور نقلی نگارش، اور کندن اور پیتل میں تمیز کرنے کی اہلیت ہوتی ہے، ورنہ وہ چیزیں، اکثر اونچے افسروں یا ڈاکٹر نقادوں یا سکہ بند افسانہ نگاروں کی لکھی ہوئی جو ان کے مجلوں میں آفاقی ادبی شاہکاروں کے دھوم دھڑکے کے ساتھ شائع ہوتی ہیں۔ ادب سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتیں محض بے سقف الفاظ کی صنعت گری! —— اور ندیم اپنی بردباری کے باوجود نئے مصنفوں کی وہ ننگی چیزیں بھی چھاپ دینے سے نہیں جھجکتا، اگر ان مصنفوں میں جوہر قابل کی آب ہو اور فن کی تپش ملے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ حالیہ اور قدرے حیران کن ہے۔ ایک دو سال پہلے یہ صورت نہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے بعض اچھی اور اعلیٰ پائے کی کہانیوں کو محض اس لیے اپنے رسالے میں نہ چھپنے دیا کہ ان میں جنسی عضو یا ان کی کارکردگی کا ذکر تھا۔ پھر اس کی یہ عادت بھی تھی، اور وہ اسے ایک مدیر کا استحقاق سمجھتا ہے، کہ وہ اچھے شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تحریروں میں سے بعض کھری بیٹر الفاظ اور فحش، غیر شستہ خیالات چھانٹ کر ان کی اصلاح کر دیتا تھا۔ کھری بیٹر الفاظ کی جگہ شرافت اور شستگی کے آئینہ دار الفاظ تحریر میں آ جاتے تھے۔ اکثر لکھنے والے کے معنی یا خاص تاثر کو جو وہ ان الفاظ سے پیدا کرنا چاہتا تھا زائل کرتے ہوئے اس تحریر کو ایک نیا رنگ دیتے ہوئے۔ بہرحال ایسی درستی لکھنے والے پسند نہیں کرتے اور صحافت دینے والے پیدا نہیں کرتے ہیں۔ کیوں، ندیم کا یہ رویہ اب بدل گیا ہے؟ یہ میں نہیں جانتا۔ کیا یہ ہو گئی کہ وہ اب بے حیثیت رہ گئے؟ کیونکہ فنون کے پچھلے چند شماروں میں جنس اور ایسی چیزیں بھی ہیں جنھیں دو تین سال پہلے وہ شاید نہ چھپنے دیتا۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ فنون کے لکھنے والے اپنے ندیم کی خلاق پستی کی ڈھیل کو بھانپ کر اب کھل کھیلنے لگے ہیں۔ یہ شاید اس لیے ہے اور جو بار بار ایڈیٹر کے لیے اچھا ہے۔ جب یہ چند ممنوعات سے سرکشی برتنا ادب کی اس طرح بھی ہے جیسے اینیما کے دبے ہوئے اشتعال کو۔

ندیم کی خط و کتابت کافی وسیع تھی (رکھتے ہیں اور یہ بند۔ ! سنو ہو ۔ یہ سو دو دوسرے دیو۔ کو لکھتے ہوں گے) ادب بھی اتنی کم نہیں۔ اس کی بیشتر مکاتیب نگار غالباً خواتین ہوتی ہیں، ذوقِ ادب و سخن میں مشق کرنے والی نوجوان نہر ٹین ایج لڑکیاں جن کی ادبی تمنا میں ہیں اور جو "فنون" میں اپنا نام دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ ہمیشہ سخن گزاری کے فن میں اُن کی کوششوں کو سراہتا ہے، ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مسرت محسوس کرتا ہے۔ اس طرح "فنون" نے کئی نئی پود کی شاعرات اور افسانہ نگاروں سے، جن میں اصلی لیاقت کی دمک ہے، پڑھنے والوں کو متعارف کیا ہے۔ ندیم دراصل بیہودہ کا حد بالی آزادی ورت جھجک اظہار سے خوش نہیں۔ وہ عصمت و غنیمت آپ کیوں نہیں ہو سکتیں "اور بنی نگارشں میں شائستہ او اچھے الفاظ کیوں نہیں لکھ سکتیں۔ زندگی کی ہر متبرک چیز کے منعقوان کا ہے۔ وہ روا در گستاخ (F..IPPANT) انداز لب و لہجہ کو لکھا۔ ش میں مبتلا کر دیتا ہے — ہائے دنیا کو کیا ہو رہا ہے، یہ اس کی سوچ ہے۔ اس نئی پود کی لکھنے والیوں کو وہ اپنے خطوں میں برادرانہ اور پدرانہ شفقت سے ایک متین لہجے میں نصیحت کرتا ہے کہ وہ نیکی، اخلاق کی بزرگ قدروں کا مذاق نہ اڑائیں، اور نیکی و عفت مآبی کی دامن سے نہ جھٹکیں!

کیا میں اپنے دوست کے مرقع میں رنگ بھرنے میں کامیاب ہوا ہوں؟ کیا اتنے بے ربط بگٹٹ الفاظ اندر کے آدمی کا کچھ مدھم سا ہیولیٰ قائم کر سکے ہیں؟ — شاید نہیں! وہ اسی طرح ایک جزیرہ ہے جیسے میں! — اور میں اس جزیرے کو اس کے درختوں کی خوشبو، اس کے چشموں کی منقاس، اس کی پہاڑیوں کی دل آویزی سے جانتا ہوں۔ کیسی زندگی اس نے گزاری ہے۔ اس نے بچپن میں قرآن پڑھا ہے اور سعدی کی گلستان بوستان! اپنے گاؤں کی چراگاہوں میں گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کبڈی کھیلی ہے۔ وہ مفلسی اور غربت کی تلخی جانتا ہے۔ اس نے نظمیں اور کہانیاں لکھی ہیں۔ وہ کالج میں والی بال کا کپتان تھا۔ اعصابی مرض نے اسے ایک لمبی مدت تک بے دم رکھا ہے۔ وہ جیل گیا ہے۔ اس نے چین دیکھا ہے۔ اپنے "ریڈیو" میں بدلے گیا۔ شادی کی ہے اور بچے بھی۔ وہ باپ بنا ہے۔ جو کچھ پانے کے لیے وہ زندگی کے سفر پر نکلا تھا، اس نے حاصل کیا ہے (واقعی اس نے حاصل کیا ہے؟) زندگی میں بہت سی چیزیں اس نے نہیں کیں۔ اُس نے پینگ نہیں اڑائی، اونٹ کا سفر نہیں کیا۔ راس لوئی اسٹیونسن کو نہیں پڑھا۔ ہم جنس کی محبت نہیں کی۔ کوہ پیمائی نہیں کی۔ بدیسی کی "نگوں اور نغموں" والے یونانی دیوتا کی شسبانی کے دل کش نغموں پر مست نہیں ہوا۔ نہ اُن کی تان پر اور بھی دیا شانہ ناچ ناچے ہیں۔ نہ ہی دریا سے برہنہ گلوں "ایرد" سے پانی میں پاؤں لٹکائے نہیں بلی اور اس کا دل اس کی نگین اور پر نہیں ٹوٹا۔ وہ اپنے بزرگ اسلاف کے بنائے ہوئے سیدھے راستے سے کہیں نہیں بھٹکا۔ وہ اپنے جتھے سے نہیں اکھڑا، اور شاہ صبحی کی دودنیا، سب ہستیوں اور آوارہ مزاج روحوں کی بیداری اس کے لیے اجنبی ہیں — — دنیا کی دوسری چیزیں!

میں نہیں سمجھتا وہ ان چیزوں کے لیے کبھی پچھتاتا ہے جو اُس نے نہیں کیں — اور یہ اچھا ہے —

یہ ہے وہ بامروت انسان کا درد رکھنے والا خوبصورت آدمی — — ایک آدمی، احمد شاہ ناہی!

سقراط نے زہر پی لیا تھا
ہم نے جینے کے دکھ سہے ہیں　　(ندیم)

مسعود اشعر

ندیم صاحب

نوجوان اکسائز انسپکٹر نے پولیس کی معیت میں ایک مکان پر چھاپہ مارا اور چرس برآمد کرلی۔ چرس ایک عورت کے قبضہ سے برآمد ہوئی تھی۔ (اگر اسے قبضہ کہا جا سکے؟) عورت نے اپنے جسم کے جس حصے میں چرس چھپا رکھی تھی، وہاں تک صرف پولیس والوں کی ہی رسائی ہوسکتی تھی، اکسائز انسپکٹر کے وہم وگمان میں بھی وہ مقام نہیں آسکتا تھا۔ عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تو عورت نے ہنگامہ کردیا کہ پولیس نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا ہے اور کسی دوسرے کے اختیارات پر ہاتھ ڈالا ہے۔ پولیس اس الزام کی تردید کررہی تھی اور صرف قبضے سے برآمدگی پر اصرار کررہی تھی۔ آخر عدالت نے اکسائز انسپکٹر سے پوچھا "شاہ صاحب آپ پیرزادہ ہیں آپ ہی سچی بات بتادیجیے"۔

اور اکسائز انسپکٹر نے سچی بات بتادی کہ وہ واقعی پیرزادہ تھا اور جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ شاید یہ بات میں غلط کہہ گیا کہ وہ پیرزادہ تھا اس لیے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا، کیونکہ ہمارے آس پاس اکثر پیرزادے ہی زیادہ جھوٹ بولتے نظر آتے ہیں ــ سچی بات یہ ہے کہ وہ احمد ندیم قاسمی تھا۔ اس لیے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔

احمد ندیم قاسمی جھوٹ کیوں نہیں بول سکتا تھا؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے کچھ زیادہ تحقیق وجستجو کی ضرورت نہیں ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری اور ان کے افسانوں کا سرسری مطالعہ ہی یہ معلوم کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ جھوٹ کیوں نہیں بول سکتا۔ جس شخص کے سینے میں ایک ایسا گداز دل ہو جو صرف محبت کرنا جانتا ہو۔ ساری دنیا سے محبت ــ جو کسی کو دکھ پہنچانا تو کجا، کسی کو دکھی دیکھ بھی نہ سکتا ہو ــ وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ کیونکہ جھوٹ بولنے سے کسی نہ کسی کو ضرور دکھ پہنچتا ہے۔ میں مصلحت آمیز جھوٹ کے بارے میں نہیں کہتا کہ اس سے کسی کی دل آزاری مقصود نہیں ہوتی دل داری مقصود ہوتی ہے۔ (دیکھیے ان کے افسانے "سفارش" میں) ندیم صاحب دکھ پہنچانے کے تصور ہی سے دکھی ہوجاتے ہیں۔

میرے ساتھ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ میں ندیم صاحب کی شخصیت کو ان کے فن سے علیحدہ کرکے نہیں دیکھ سکتا۔ حالانکہ کسی ادیب و شاعر کو اس کی تخلیقات کے حوالے سے پرکھنا نہایت خطرناک بات ہے۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ فن کار اپنے فن میں اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے یا اپنی شخصیت سے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ جب میں احمد ندیم قاسمی کے ساتھ محمد خالد اختر کو دیکھتا ہوں تو دونوں سچ غلط نظر آتے ہیں۔ محمد خالد اختر اپنے مضامین اور افسانوں میں جتنا منہ پھٹ جتنا تیز و طرار اور جتنا تیکھا نظر آتا ہے۔ اصل زندگی میں اتنا ہی مرنجان مرنج بے زبان، تنہائی پسند نیا و جہان سے بیزار سادہ سا

عالم کے غم اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ملتا ہے۔ دوسرا احمد ندیم قاسمی جو افسانوں اور شاعری میں جو کچھ ہے اصل زندگی میں بھی ہو بہو وہی نظر آتا ہے۔ رتی برابر فرق نہیں ہے۔ گویا محمد خالد اختر شخصیت کے اظہار کی نفی کرتا ہے اور احمد ندیم قاسمی شخصیت سے فرار کی۔ اس لیے دونوں کیلئے ترمیم کے محتاج ہیں۔ دراصل فن کے حوالے سے اپنے پسندیدہ فن کار کی شخصیت کا مکمل خاکہ تیار کر لینا لڑکپن کا مشغلہ ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ وہ عمر ایسی ہوتی ہے کہ اس وقت دل و دماغ پر جو بات اثر کر جائے پھر وہ اس وقت تک نہیں نکلتی جب تک اس کے بارے میں کسی تجربہ کن مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔ ندیم صاحب کے بارے میں میرے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ اُن کے پہلے افسانے نے میرے ذہن پر جو اثر مرتب کیا تھا وہ آج تک برقرار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی شخصیت کا جو خاکہ میرے ذہن نے تیار کیا تھا اسے بعد میں تقویت ہی ملی، مایوسی نہیں ہوئی۔ اُن کے افسانوں اور شاعری نے میرے دل اور دماغ پر اُن کی شخصیت کا جو نقش بنایا تھا، ایک طویل عرصے کی ملاقات اور چند سال تک اُن کی ماتحتی میں کام کرنے اور ملنے جلنے کے بعد بھی اب تک میں اُن دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکا ہوں۔

ماتحتی پر یاد آیا کہ ہر ماتحت کو اپنے افسر میں خوبیاں کم اور بُرائیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس لیے مجھے ندیم صاحب پر لکھتے ہوئے ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ کہیں خوبیاں بھی میرے قلم سے بُرائیاں بن کر نہ نکلیں۔

اب یہی دیکھیے کہ ندیم صاحب کی شخصیت پر لکھتے ہوئے سب سے پہلے اُن کے ایک بہت پرانے افسانے کا کردار سلیم یاد آ رہا ہے، جو انتہائی رومان پرور چاندنی، ہیجان خیز تنہائی اور ایک نوجوان عورت کی پیش قدمیوں کے باوجود سیم میاں ہی رہتا ہے۔ وہ جنوں کی گالیاں سننا پسند کرتا ہے۔ لیکن وہ نہیں بنتا جو جنوں اُسے بنانا چاہتی ہے۔ ماہرین نفسیات اس کردار کو یقیناً معاشرتی تحریمات (TABOOS) کا شکار اور نفسیاتی الجھنوں کا مریض، اور وہ بھی بزدل مریض قرار دیں گے۔ ندیم صاحب نے بھی غالباً ان الزامات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس افسانے کا نام "نامرد" رکھا ہے۔ اس اعتبار سے اس سے بڑی اور کوئی گستاخی نہیں ہو سکتی کہ ندیم صاحب کی شخصیت کے ساتھ اس کردار کا ذکر کیا جائے۔ لیکن شاید یہ میری ماتحتی کا اثر ہے کہ مجھے وہی کردار یاد آ رہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کردار مجھے بے حد پسند ہے۔ رہی اس افسانے کے عنوان کی بات تو اس سے مجھے شروع ہی سے اختلاف ہے۔ کیونکہ ندیم صاحب نے اس طرح نہ صرف پڑھنے والوں کو گمراہ کیا ہے۔ بلکہ اس طبقے کے ساتھ بھی زیادتی کی ہے جس کی نمائندگی وہ نوجوان کرتا ہے۔ نفسیات کے ماہرین خواہ کچھ بھی کہیں، لیکن سیم اس طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جس کے لیے پچھیں برس کا ساتھ جنوں کے وصل سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

جس وقت میں نے یہ افسانہ پڑھا اس وقت میری عمر مشکل سے پندرہ برس کی ہو گی۔ لیکن خدا جانے کیوں یہ کردار میرے دل و دماغ پر ایسا سوار ہوا کہ پھر احمد ندیم قاسمی کے تمام افسانوی کرداروں کو اس کردار کے حوالے سے دیکھنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ان کے قطعات کی صبوحی بھی یہ اثر زائل نہ کر سکی۔ غضب تو اس وقت ہوا جب میں سیم کی شخصیت کو ندیم صاحب کی شخصیت کا ہی پرتو سمجھنے لگا۔ اس میں جہاں ان کے دوسرے افسانوں اور نظموں کو دخل ہے۔ وہاں اُن کے ان خطوط کو بھی بڑا دخل ہے جو انھوں نے شادی رنگ کو لکھے اور مجھے چوری چھپے کتابیں اور رسالے پڑھنے کے شوق کے صلے میں مل گئے۔

جس لماری میں مجھے یہ خطوط رکھے ملے اس میں اور بھی بہت سے رسائل کے ایڈیٹروں اور شاعروں کے خط تھے۔ لیکن ندیم صاحب کے خطوں میں نہ جانے کونسی ایسی بات تھی کہ میں نے تلاش کر کر کے پڑھا اور بار بار پڑھا۔ جب تک میں

سمجھ سکا ہوں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ ندیم صاحب کے افسانوں کے کرداروں نے میرے اوپر گہرا اثر کیا تھا۔ دوسرے ان خطوں میں جو خلوص، دیانت اور سچائی نظر آئی، وہ کسی اور کے خطوں میں نہیں تھی۔ شہزاد عارفی نے اپنی اونچی ناک اور اکھڑ پن کی وجہ سے بڑے کٹھن دن گزارے۔ ندیم صاحب کو اس کا غم تھا۔ اور وہ جس انداز سے اُن کی دل جوئی کرتے، اور ساتھ ساتھ اپنے دوست بھی لکھتے، اس سے اُن کی شخصیت شفاف آئینہ کی طرح سامنے آجاتی تھی۔ اگر ذاتی خطوط (خاص طور سے وہ خطوط جو یہ سوچ کر نہ لکھے گئے ہوں کہ کبھی نہ کبھی انہیں چھاپا جائے گا) انسان کی شخصیت کے عکاس ہوتے ہیں۔ تو جن لوگوں نے ندیم کے نام منٹو کے خطوط پڑھے ہیں۔ وہ میری گواہی دیں گے کہ اُن میں بھی ہر جگہ ندیم صاحب کی شرافت اور دوستوں کے لیے پُر خلوص اور بے لوث محبت جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔

ندیم صاحب نے ابتدائی افسانوں میں جو کردار تخلیق کیے ہیں۔ وہ ان کی اپنی ذات کا پرتو ہیں۔ وہی شرافت، وہی زنانہ شرم و حیا، وہی انسان دوستی اور وہی جھجک منکسرانہ، جو ندیم صاحب میں ہے وہی ان کے کرداروں میں ہے۔

لیکن یہ جھجک منکسرانہ اور پارسائی اس وقت انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ جب اُن کے استاد اختر شیرانی بھی انھیں دیکھ کر بوتل چھپا دیتے ہیں۔ خدیجہ مستور تو اسے ندیم صاحب کی آنکھوں کا اثر کہتی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں ان کی پارسائی کی اس شہرت کو دخل ہے جس نے انھیں اردو شاعری کے زاہد خشک کے روپ میں ظاہر کیا تھا۔ اختر شیرانی کی بات تو بہت پرانی ہو گئی۔ آج سے تقریباً بیس برس قبل پرکاش پنڈت نے اردو شعراء کے بارے میں دہلی سے ہندی میں ایک کتاب شائع کی تھی۔ جس میں ندیم صاحب کا خاکہ اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

"آدرے! آدرے۔ ندیم صاحب آرہے ہیں"

گویا جب کسی قہقہہ بار محفل میں ندیم صاحب چلے جائیں تو ہنستے کھیلتے لوگ فوراً چہرہ پر سنجیدگی کا غلاف چڑھا لیتے ہیں۔ اور ادب ادب۔ احترام احترام" کا نعرہ بلند ہوتا ہے۔

خیر پرکاش پنڈت کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے۔ کہ اُس نے بڑ ہانکی ہو گی۔ کیونکہ جب وہ قتیل شفائی کے بارے میں یہ لکھ سکتا ہے:۔

"قتیل شفائی صبح اٹھ کر پہلے 'دنتر' ملتا ہے، پھر شعر کہتا ہے" تو اس سے بعید نہیں کہ وہ ندیم صاحب کے بارے میں بھی ایسی ہی ہوائی اڑا دے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ندیم صاحب کا ذکر ادب و احترام کے بغیر آ ہی نہیں سکتا، حتیٰ کہ ظہور نظر جیسے بھکڑ باز اور منہ پھٹ بھی، ندیم صاحب کے سامنے بے تکلفی کرنے سے پہلے نظریں جھکا لیتے ہیں۔ یا بے تکلفی کرتے ہوئے پلکیں جھپکاتے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ ادب و احترام کی فضا اس وقت بھی برقرار رہتی ہے جب ندیم صاحب خود نہایت بے تکلفی کے ساتھ ہر قسم کے لطیفے سنا رہے ہوتے ہیں۔ جی ہاں ندیم صاحب ہر قسم کے لطیفے سناتے ہیں۔ اور بقول ظہور نظر (جو خود برجستہ گوئی اور لطیفہ بازی کا ماہر ہے) ایسے نئے نئے لطیفے سناتے ہیں جو کسی نے بھی پہلے نہیں سنے ہوتے۔

ندیم صاحب کے نام کے ساتھ سنجیدگی، متانت اور بزرگی کچھ ایسے لازم و ملزوم سے ہو گئے ہیں کہ اگر آپ ندیم صاحب سے تین چار بار ملے نہیں ہیں، یا انھیں بے تکلف دوستوں کی صحبت میں نہیں دیکھا ہے تو آپ یقین نہیں کر سکتے کہ وہ اتنے

زیادہ بے تکلف ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے کہ ندیم صاحب کی جی شرافت کی وجہ سے اُن کے دوستوں یا ملنے والوں نے ابتدا سے ہی اُن کی شخصیت کے گرد بزرگی اور احترام کا ایسا حصار بنا دیا کہ ندیم صاحب اس سے باہر نہیں نکل سکے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ ندیم صاحب نے یہ بات دل سے کبھی پسند نہیں کی ہو گی۔ آپ جانتے ہیں کہ کوئی بھی شخص بالخصوص ایسا شخص جو شاعر اور افسانہ نگار بھی ہو یہ بات کبھی پسند نہیں کرتا کہ لوگ اس سے بھاگیں یا اُس سے اپنا چہرہ چھپائیں۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اختر شیرانی جب ندیم صاحب کی آمد پر بوتل چھپاتے ہوں گے تو ندیم صاحب پُر خوش نہیں ہوتے ہوں گے۔ بلکہ اس وقت اُن کو جو ذہنی کوفت ہوتی ہو گی اس کا ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ وہ یقیناً لوگوں کا ظاہر و باطن دونوں دیکھنا چاہتے ہوں گے۔ چنانچہ انھوں نے روایات کا لبادہ اتار پھینکنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے انھوں نے یہ انقلابی قدم اٹھایا کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ پھر اپنی زندہ دلی سے دوستوں کو یقین دلایا کہ میں زاہد خشک ہرگز نہیں ہوں۔ چنانچہ وہ اپنے گلاس میں سکوئیش ڈالے خم پر خم لنڈھانے والے دوستوں کی مستیوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔

ندیم صاحب کی ترقی پسندی محض کٹر مذہبی تربیت کا ردعمل ہی نہیں تھی، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر وہ ندیم کے بجائے کیفی اعظمی یا ظ۔ انصاری بن جاتے۔ بلکہ یہ صداقت اور حق و انصاف کی تلاش کے لیے ایک قدم تھا۔ اس کا واضح ثبوت اس بات سے مل سکتا ہے کہ تمام ترقی پسندوں میں ندیم صاحب واحد ادیب ہیں جنھوں نے کبھی اعتدال اور توازن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ایک مختصر سے عرصہ کے لیے یہ خطرہ ضرور پیدا ہو گیا تھا کہ ندیم صاحب بھی انتہا پسندی کے غار میں گر پڑیں گے۔ لیکن وہی تربیت اُن کے آڑے آئی اور وہ بچ گئے۔

میں نے اختر شیرانی کے حوالے سے عرض کیا تھا کہ ندیم صاحب کو نوجوانی میں ہی بزرگ بنا دیا گیا تھا۔ اور انھیں ایک زاہد خشک کے روپ میں پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن ندیم صاحب اس بات سے قطعاً خوش نہیں تھے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ۱۹۵۶ء یا ۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ امروز کے دفتر میں ایک نوجوان تشریف لائے۔ ندیم صاحب لکھنے میں مصروف تھے، وہ نوجوان ادب سے سلام کر کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے۔ ندیم صاحب نے حسبِ عادت قلم رکھ کر پوچھا:۔

"جی فرمایئے۔ کیسے تشریف لائے؟"

وہ نوجوان پہلے تو جھجکے پھر فرمانے لگے۔

"بس جی۔ آپ بزرگوں کی زیارت کرنے آ گیا تھا۔"

ندیم صاحب نے اس پر اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا اور بڑی نرمی سے بولے:

"میاں۔ ابھی سے تو ہمیں بزرگ نہ بنا دیجیے۔"؟

اخباروں کے دفتروں تو عام طور سے "عوام کے خادم" سماجی کارکن اور سیاسی رہنماؤں کی بیٹھک ہوتے ہیں۔ لیکن جس اخبار میں ادیب یا شاعر ایڈیٹر ہو اس کا دفتر دنیا بھر کے بے کار سے ادیبوں اور شاعروں کا مستقل اڈہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ندیم صاحب کے زمانہ میں امروز کے دفتر کا بھی یہی حال تھا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ کام بھی نہیں کرنے دیتے تھے۔ اب آپ جانتے ہیں کہ اخبار کا کام تو روز کا ہوتا ہے۔ اسے تو کسی حالت میں بھی دوسرے دن پر نہیں ٹالا جا سکتا۔ ان حضرات سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا،

تھا کہ حضراتِ کرام آپ تشریف لے جائیے۔ تھوڑا سا کام کرنے کی مہلت بھی دیجیے۔ آخرکار ایک بار انھوں نے تنگ آ کر اُن میں سے ایک صاحب پر مزاحیہ کالم لکھا جو سب سے زیادہ تنگ کرتے تھے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ دوسرے دن انھیں صاحب نے سب سے پہلے دفتر تشریف لا کر اس کالم کی داد دی۔ جب ان حضرات کا ہجوم بڑھنے لگا تو ندیم صاحب کے خیرخواہوں نے انھیں مشورہ دیا کہ اپنے کمرے کی ساری کرسیوں کے اگلے پائے بقدر ایک انچ چھوٹے کرا دیجیے۔ پھر یہ لوگ تنگ آ کر خود ہی بھاگ جائیں گے۔ لیکن ایک صاحب نے جو ان لوگوں کے رگ و ریشہ سے بخوبی واقف تھے۔ انھیں اطلاع دی کہ اگر ایسا کیا گیا تو دوسرے دن وہ لوگ اپنے ساتھ دو دو اینٹیں بھی لیتے آئیں گے، اور کرسیوں کے پایوں کے نیچے رکھ کر اطمینان سے بیٹھ کر چائے طلب کریں گے۔ «امروز» کے زمانہ میں ندیم صاحب سے ہماری ملاقات دن میں صرف کاپی کی تیاری کے وقت یا کبھی کسی ضروری بات کے لیے ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ہفتہ کی میٹنگ ملاقات کا ذریعہ تھی۔ اور یہ ملاقات بھی خالص کاروباری ہوتی تھی۔ اس لیے ہمیں یہ شکایت ہی رہی کہ کبھی اُن کے پاس بیٹھ کر ادب یا ادیبوں پر بات نہیں ہوئی۔ دراصل ندیم صاحب کی شرافت سے پورا فائدہ تو باہر کے لوگ اٹھا جاتے تھے۔ ہمارے لیے جو وقت بچتا وہ صرف دفتری امور کے لیے ہوتا تھا۔

ندیم صاحب کی شرافت سے دفتر کے چپراسی بھی خوب واقف تھے اور اُس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ امروز میں ایک چپراسی، نصیر شاہ تھے۔ ایک بار وہ ندیم صاحب کا کھانا لینے گئے۔ ندیم صاحب نے انھیں پیسے دیے کہ واپسی پہ بازار سے آم بھی لیتے آنا۔ جب وہ کھانا لے کر واپس آئے تو آم صرف چار تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ ایک سیر میں صرف چار آم چڑھے ہیں، تو فرمانے لگے آم تو پانچ تھے، مگر آپ کھانے والے چونکہ چار تھے۔ اس لیے ایک آم میں نے کھا لیا۔

ندیم صاحب کے چہرہ کی سنجیدگی بہت دھوکا دیتی ہے۔ بعض اوقات تو وہ اپنے مخاطب پر ایسے فقرے چست کر جاتے ہیں کہ اگر وہ اُن کے چہرے کی سادگی میں کھویا ہوا نہ ہو تو اُن سے لڑ پڑے۔ ایک بار ملتان کی ایک محفل میں ذکر آ گیا کہ ندیم صاحب ملتان بھی رہ چکے ہیں۔ اس پر ایک شاعر نے بہت زیادہ حیران ہو کر پوچھا۔

"اچھا، تو آپ ملتان بھی رہ چکے ہیں؟ لیکن آپ میرے زمانہ میں نہیں تھے"

ندیم صاحب نے نہایت سوکھے منہ سے جواب دیا۔

"جی ہاں میں جارج ششم کے زمانہ میں تھا"

ندیم صاحب نے اپنا لڑکپن اور نوجوانی بھاولپور میں گذاری ہے۔ چنانچہ اُن کے افسانوں میں یہی علاقہ پس منظر کا کام دیتا ہے۔

بھاولپور کے اسکول میں انھوں نے اپنے ساتھ ڈیسک پر بیٹھنے والے ایک ساتھی سے سب سے پہلے دوستی کی اور وہ بھی ایسی دوستی کہ اس میں بھی ندرت پیدا کر دی۔ ندیم صاحب (جو دراصل احمد شاہ ہیں) اور قاضی احمد شفیع تین سال، ایک ہی ڈیسک پر ساتھ ساتھ بیٹھے، ان کی دوستی اتنی گہری تھی کہ انھوں نے اپنے دستخطوں میں بھی اس دوستی کا ثبوت دیا۔ احمد شاہ اپنے دستخط اس طرح کرتے ہیں کہ Shah کے آخر کا 'h' اس طرح کھینچ دیا جاتا کہ وہ 'f' اور 'i' بن جاتا۔ اور احمد شفیع اپنے نام Shafi کے آخری 'f' اور 'i' کو اس طرح لکھتے کہ

وہ "تنہا" رہ جاتا۔ اگرچہ یہ معصومانہ حرکتیں تھیں۔ لیکن اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ندیم صاحب کے پاس کتنی گہری محبت کرنے والا دل ہے۔ اس کا ثبوت انھوں نے پھر ملتان میں دیا۔ جب ان کے عزیز ترین دوست پیرزادہ افضل نے محبت میں ناکام ہوکر خودکشی کی۔ افضل مرحوم کے والدین اُن سے ناخوش تھے چنانچہ جب انھوں نے سول ہسپتال میں دم توڑا۔ تو ان کے سرہانے احمد ندیم قاسمی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ان کی لاش لینے کے لئے بھی کوئی نہیں آیا۔ چنانچہ ندیم صاحب تنہا ان کی میت دوسری منزل سے اپنے ہاتھوں پہ اٹھا کر لائے۔ اور اسی طرح اُن کے گھر پہنچائی۔ ندیم صاحب دوست بناتے ہیں تو دوستی نبھاتے بھی ہیں۔

ندیم صاحب ابتدا میں چراغ حسن حسرت کے "شیرازہ" میں مزاحیہ مضامین لکھتے تھے۔ انھیں دنوں جہلم میں ایک صاحب نے اس اخبار میں مضامین لکھنا شروع کر دیئے۔ ندیم صاحب جب خانیوال متعین ہوئے تو اُن سے ملنے گئے۔ اور پھر ایسی دوستی ہوئی کہ اب تک اس کی شدت اسی طرح برقرار ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اب ندیم صاحب کو اپنی کتاب اُن کے نام معنون کرتے وقت یہ لکھنا پڑتا ہے۔

"چوہدری محمد صدق کے نام جو میرے بہترین دوست اور مولینا مودودی کے معتقد ہیں۔"

میں نے ابتدا میں ندیم صاحب کی ایکسائز انسپکٹری کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ وہ واقعہ ملتان کا ہے ورشت ۱۹۴۲ء کا۔ ندیم صاحب کہتے ہیں کہ اس ملازمت نے انھیں بہت کچھ سکھایا۔ پولیس کس طرح شریف لوگوں کے گھروں سے چرس برآمد کرلیتی ہے اور بدمعاشوں کو کس طرح چھوڑا جاتا ہے۔ اس ملازمت میں انھیں ایسے ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا کہ آخر انھیں ملازمت ہی چھوڑ دینی پڑی۔ ندیم صاحب کی سب سے بڑی عیاشی سگریٹ ہیں اور وہ بھی انھوں نے اس وجہ سے پینا شروع کیے تھے کہ وہ تنہا رہتے تھے اور تنہائی دور کرنے کے لیے کسی ساتھی کی ضرورت تھی۔ جس وقت ایکسائز انسپکٹر بھرتی ہوئے اس وقت ان کی عمر ۲۳۔۲۴ سال کی ہوگی۔ ایک تو ملازمت غیر شاعرانہ، دوسرے ہم سخن کی کمی۔ انھوں نے سگریٹ پینے شروع کر دیے۔ وہ ملتان کے ایک محلہ میں جسے پیل شوالا کہتے ہیں ایک چوبارہ پر رہتے تھے۔ ایک ملازم ساتھ تھا۔ ایک دن تنہائی سے گھبرا کر پاسنگ شو کا سگریٹ منگوایا اور گویا اپنی واحد عیاشی کا آغاز کیا۔ کہتے ہیں کہ مہینے کے شروع میں 'کریون اے' پیتے تھے، اور باقی دنوں میں وہی 'پاسنگ شو' یا 'کیپسٹن'۔ ندیم صاحب کو ملتان کا ایک واقعہ بہت یاد آتا ہے۔ وہ دوسری سواریوں کے ساتھ تانگے میں بیٹھے کہیں جا رہے تھے۔ اس تانگے میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے سڑک پر جانے والے آدمی سے اس طرح گفتگو کی۔

"اوئے گیا ہا وس ؟"

"کن ؟"

"اُن"

"کو"

"کھلا نہی۔"

اس کا اردو ترجمہ کچھ اس طرح ہوگا:۔

"اوئے گیا تھا؟"

"کہاں؟"

"وہاں"

"نہیں!"

"لعنت ہے!"

ندیم صاحب کہتے ہیں کہ کسی بھی زبان میں اتنی مختصر اور جامع گفتگو انھوں نے کبھی نہیں سنی۔

اگرچہ ندیم صاحب نے ابتدا میں مزاحیہ مضامین لکھے لیکن ان کا اصل مزاحیہ رنگ امروز کے فکاہی کالموں میں ہی چمکا۔ اور یہ اُن کے قلم کا کمال ہے کہ وہ اپنے فکاہی کالم میں جب چاہتے ہیں ہنساتے ہیں اور جب چاہیں رُلا دیتے ہیں۔ کیا آپ ایمان داری سے کہہ سکتے ہیں کہ ویت نام والے کالموں پر آپ کے آنسو نہیں نکل آئے؟ اختر شیرانی کے زمانے کا زاہد خشک آج اردو کا بہت بڑا فکاہی کالم نگار ہے۔

یہ بات کہنے کی شاید ضرورت نہیں ہے کہ احمد ندیم قاسمی اردو کے واحد مصنف ہیں جنھوں نے ادب کے ہر شعبہ میں کمال حاصل کیا۔ وہ شاعر ہیں۔ افسانہ نگار ہیں۔ مزاح نگار ہیں۔ حتیٰ کہ نہایت سلجھے ہوئے نقاد بھی ہیں۔ انگریزی میں تو ایسے بہت سے لوگ مل جاتے ہیں جنھیں ادب کے ہر شعبہ میں دسترس حاصل ہے۔ لیکن اردو میں سوائے ندیم کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ ندیم صاحب شعر کہتے ہیں تو شاعر کی طرح۔ افسانہ لکھتے ہیں تو اچھے افسانہ نگار کی طرح۔ تنقید لکھتے ہیں تو پوری سمجھ بوجھ کے ساتھ۔ یہ اُن کی شخصیت کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا نہیں۔ بلکہ اُن کی شخصیت کی جامعیت ہے۔ اسی لیے اُن کے اشعار پر افسانہ کے ڈرامائی عنصر اور افسانہ پر شعریت کا زبردست اثر ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ندیم صاحب نے ڈرامے پر زیادہ توجہ کیوں نہیں دی۔ حالانکہ اُن کے افسانوں میں جو ڈرامائی مرحلے آتے ہیں۔ اور وہ جتنے برجستہ مکالمے لکھتے ہیں۔ اُن سے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہایت کامیاب ڈرامہ نگار ہو سکتے ہیں۔ میرے اس دعوے کا ثبوت اس سے بھی مل جاتا ہے کہ ندیم صاحب شعر اور افسانہ دونوں ڈرامائی انداز میں پڑھتے ہیں۔ اشفاق احمد بہت اچھا افسانہ پڑھتے ہیں۔ لیکن ندیم صاحب کی آواز میں جو کھرج ہے وہ اتنی اثر انگیز ہے کہ بڑے سے بڑا ایکٹر بھی وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا۔ میں تو کہتا ہوں کہ "مجرم" اور "پاگل" کو افسانہ کی بجائے ندیم صاحب کو ڈرامہ کی شکل میں لکھنا چاہیے تھا۔ اور خوشی کی بات ہے کہ یہ افسانے ٹیلی وژن کے ڈرامے بن چکے ہیں۔

ندیم صاحب نے اچھے ادبی رسائل نکالنے کی طرح ڈالی۔ اور جو رسالہ بھی نکالا۔ اُسے ایک تحریک بنا دیا ——— "ادب لطیف" "سویرا" "نقوش" اور اب "فنون" ادب میں تحریک کا کام کر رہے ہیں۔ رسالہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انھوں نے ایک اور بڑی خدمت کی ہے اور وہ ہے نئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی۔ وہ جس شخص میں بھی ذرا سی صلاحیت دیکھتے ہیں اس کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

ایک اور بات بھی ہے وہ یہ کہ نئے لکھنے والوں کو یاد بھی رکھتے ہیں۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے میں اُس زمانے میں لاہور آیا تھا۔ ندیم صاحب جیل سے رہا ہو کر آئے تو مرزا ادیب کے ساتھ میں بھی انھیں سلام کرنے چلا گیا۔ تعارف ہوا

تو سب سے پہلے انھوں نے پوچھا "آپ لاہور کب آئے؟"

یقین جانیے اس ایک بات سے میرے دل میں اُن کی عزت ہزار گنا زیادہ ہو گئی۔ بھلا ایک بالکل نئے آدمی کو کون یاد رکھ سکتا ہے؟۔ پھر جب انجمن ترقی پسند مصنفین کے بکھرے ہوئے شیرازے کو دوبارہ جمع کرنے کی کوشش کی گئی تو مجھے بھی یاد کیا گیا۔ یہ ندیم صاحب سے دوسری اور تفصیلی ملاقات تھی۔ لیکن ندیم صاحب سے جنبیت مجھے نہ پہلی ملاقات میں محسوس ہوئی اور نہ دوسری ملاقات میں۔ پہلی بار ہی ایسا معلوم ہوا جیسے ندیم صاحب کو ہمیشہ سے جانتا ہوں۔ اس اعتبار سے مجھے قطعاً خوشی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اگر میں ندیم صاحب کو اپنے تصور کے احمد ندیم قاسمی سے تھوڑا بہت مختلف پاتا تو تھوڑی سی حیرت ہی ہو جاتی اور آپ جانتے ہیں کہ حیرت خوشی کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ لیکن ندیم صاحب نے مجھے حیران ہونے کا موقع نہیں دیا۔ اس اجلاس میں بہت سے ادبا و شعرا جمع تھے۔ درمردہ انجمن میں جان ڈالنے کی تدابیر سوچ رہے تھے۔ ایک کمیٹی بھی بنائی گئی۔ جس کے کنوینر احمد راہی تھے اور یکے از اراکین میں بھی تھا۔ غالباً یہ ۱۹۵۲ء کے آخر کی بات ہے۔ پھر تکی بلڈنگ میں اجلاس شروع ہو گئے اور ندیم صاحب سے ملاقات ہونے لگی۔

میں روزنامہ "احسان" سے روزنامہ "آثار" اور "زمیندار" تک چکر لگاتا رہا۔ اس عرصہ میں ندیم صاحب نے امروز کی ادارت سنبھال لی۔ اور ۱۹۵۴ء میں انھوں نے مجھے بھی امروز میں طلب کر لیا اور پھر ماتحتی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ایوب خاں کے مارشل لا کے بعد امروز حکومت کے قبضے میں چلا گیا اور ندیم صاحب نے اُسے چھوڑ دیا۔

پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مظہر علی خاں نے تو اسی وقت استعفا دے دیا تھا جب انھیں پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر حکومت کے قبضہ کی اطلاع ملی تھی۔ لیکن ندیم صاحب اور ہفت روزہ لیل و نہار کے ایڈیٹر سید سبط حسن نے چند روز حالات کا مطالعہ کیا۔ پہلے دن جب مرکزی وزارت اطلاعات کی طرف سے سکریٹری صاحب کا لکھا ہوا اداریہ "نیا دور" شایع کرنے کے لیے دفتر پہنچا تو ندیم صاحب کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ اداریہ کیسے چھپا اور انگریزی سے کس طرح اردو میں ترجمہ ہوا اور کس نے کیا؟ یہ الگ داستان ہے۔ ندیم صاحب نے اُسی وقت امروز چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن حکومت بالخصوص اطلاعات کے سکریٹری ندیم صاحب کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ بہت دباؤ ڈالے گئے لیکن ندیم صاحب نے اُن کی ایک نہیں مانی اور امروز چھوڑ دیا۔

سید سبط حسن کا معاملہ دوسرا تھا۔ حکومت اُن سے ناراض تھی۔ ندیم صاحب کا امروز سے نکلنا اردو ادب کے لیے نیک فال ثابت ہوا۔ ندیم صاحب کو یقیناً مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اردو کو "فنون" جیسا رسالہ مل گیا۔ البتہ صحافت نے انھیں نہیں چھوڑا۔ اُن کے حرف و حکایت کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جونہی اخبارات کو تھوڑی سی آزادی ملی، کئی اخبار ندیم صاحب کی طرف دوڑے اور ندیم صاحب کے کالم امروز کے ساتھ دوسرے اخبارات میں بھی شایع ہونا شروع ہو گئے۔ اب لوگ حیران ہوتے ہیں کہ ندیم صاحب بہت سا کام کیسے کر لیتے ہیں؟ اخبارات میں کالم لکھتے ہیں۔ رسالے کا کام کرتے ہیں۔ غزلیں، نظمیں اور افسانے بھی لکھتے ہیں۔ (اگرچہ افسانوں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے) گویا دن رات لکھتے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔

ندیم صاحب نہایت باضابطہ زندگی گذارتے ہیں۔ انھوں نے ہر کام کے لیے وقت مقرر کر رکھا ہے۔ وہ لکھنے

پڑھنے کا سب کام گھر پہ کرتے ہیں۔ فنون کے دفتر میں صرف ملاقاتیں کرتے ہیں۔ بلکہ ملاقات کرنے والوں کی باتیں سنتے ہیں۔ کیونکہ فنون کے دفتر میں بیٹھنے والے لوگ ندیم صاحب سے کم آپس میں زیادہ باتیں کرتے ہیں۔ ندیم صاحب کی اس باقاعدہ اور باضابطہ زندگی کے بارے میں ظہور نظر کا بیان ہے کہ یہ اُن کی تنہائی پسندی کا نتیجہ ہے۔ ندیم صاحب اپنی ساری خوش طبعی کے باوجود بے حد تنہائی پسند ہیں۔ اس لیے اُن کے ملنے جلنے کے اوقات نہایت محدود ہیں وہ زیادہ سے زیادہ تنہائی میں وقت گذارنا پسند کرتے ہیں۔ یا اسے یوں کہنا چاہیے کہ وہ اپنی زندگی میں اتنے نشیب و فراز سے گذر چکے ہیں کہ اب اُن میں مزید دُکھ جھیلنے کی ہمت نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے نظریات و عقائد کے بارے میں کوئی سودے بازی کرلی ہے۔ ندیم صاحب اپنے نظریات کے اعتبار سے خالص قوم پرست پاکستانی ہیں۔ اس بارے میں اُن نوجوانوں سے بھی اُن کے زبردست اختلافات رہتے ہیں، جو اُن کے عقیدت مند ہیں۔ یہ قوم پرستی پہلے بھی اُن کے اندر تھی اور آج بھی ہے۔

اس عقیدے پر وہ اتنی شدت کے ساتھ قایم ہیں کہ وہ کسی قسم کی سمجھوتہ بازی پسند نہیں کرتے۔ کہتے ڈر لگتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اُن کی ابتدائی تربیت کا اثر ہے۔

آخر میں مجھے پھر ندیم صاحب کے کئی افسانے اور اُن افسانوں کے کئی کردار یاد آ رہے ہیں۔ کسی زمانہ میں تسنیم سلیم چھتاری نے ندیم صاحب کے قطعات کی صبوحی کو مرکزی کردار بنا کر ایک افسانہ لکھا تھا۔ قطعات کی طرح نہایت رومینٹک افسانہ —— میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی ندیم صاحب کے افسانوں کے کرداروں کو اسی طرح جمع کروں کہ وہ ایک نہایت حقیقت پسندانہ کہانی بن جائے۔ کہ واقعی اُن میں داخلی ربط موجود ہے۔ لیکن خطرہ یہ ہے کہ اس طرح اگر کوئی پینٹر سامنے آئے گی تو وہ احمد ندیم قاسمی کی اپنی شخصیت ہوگی۔ اور اس کے لیے مجھے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ البتہ یہاں اُن کے افسانے "پاگل" کے چوہدری صاحب یاد آ رہے ہیں۔ جو اپنی شدید روایت پسندی کے باوجود نئی نسل کا ساتھ دیتے ہیں —— ندیم صاحب ہمیشہ نئی نسل کے ساتھ رہے ہیں اور ہمیشہ اُن کی رہنمائی کی ہے۔

آغا سہیل

ندیم — ایک دلکش شخصیت

"ٹیڑھی میڑھی کج رو غیر متوازن (ABNORMAL) اور عجیب و غریب شخصیتیں خود بخود انسان کے حافظے میں جگہ بنا لیتی ہیں۔ خواہ یہ غیر متوازن شخصیات اپنی ہیئت کذائی کے سبب عجیب و غریب نظر آتی ہوں، باقی ہر لحاظ سے متوازن و معتدل ہوں۔ بعض انسانی حافظہ جو بہر حال طبعی لحاظ سے معتدل اور متوازن ہوتا ہے، غیر متوازن شخصیات کو صرف اس لیے محفوظ کر لیتا ہے کہ وہ معتدل نہیں ہوتیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیدھی سادھی عمومی تصویروں میں جذب و کشش کا وہ پہلو مفقود ہوتا ہے جو کارٹونوں میں موجود ہوتا ہے۔ اس مفروضے کو ملحوظ رکھیے تو ڈاکٹر جانسن سے لے کر رابندر ناتھ ٹیگور تک، دیوندر ستیارتھی سے لے کر میرا جی اور نیاز حیدر تک آپ کو ہر شخصیت میں جاذبیت نظر آئے گی۔ اور آپ میری اس بات سے غالباً اتفاق کریں گے کہ ان شخصیات کے حاملین میں "بلا کے نقش ہوشیار" والی دیوانگی کی کوئی نہ کوئی رمق ضرور موجود رہتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی پنجاب کے ایک [illegible] اور پیری مریدی کرنے والے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اگر اسی روایت پر متوقف رہتے تو کچھ بعید نہیں تھا کہ خوب لمبی داڑھی رکھ کر دو دو ٹکڑوں والا خرقہ پہن کر گلے میں تسبیحیں اور مالائیں ایک کچی قبر کے آستانے پر مجاوری کرنے لگتے، یہ ڈیرہ جمایا ہوتا اور سال بہ سال عرس کے علاوہ جمعرات کی جمعرات دھمال ڈلواتے تو کسی کا اجارہ تھا کہ انھیں روک لیتا۔ یقین کیجیے اگر ندیم صاحب ایسا کرتے تو انھیں امروز اور جنگ کے لیے کالم لکھ لکھ کر پیٹ پالنے کی فکر نہ ہوتی [illegible] کھونا پڑتے۔ ممکن ہے اپنے ہاں شعر و شاعری بھی کرتے ہوتے تو وہ قیامت ڈھاتے کہ برصغیر مشرق سے غرب تک انھیں کا شہرہ ہوتا۔ طرفہ تماشا یہ کہ "بلا کے نقش ہوشیار" والی دیوانگی کے سبب اتنی سی زندگی ہی میں زندۂ جاوید بھی ہو چکے ہوتے اور [illegible] مذہب ہو جانے کی صلاحیت بھی پیدا کر لیتے۔

مجھے افسوس ہے کہ ندیم کسی اعتبار سے بھی غیر متوازن شخصیت نہیں رکھتے اور ہیئت کے لحاظ سے جس طرح ایک متوازن، معتدل، معقول اور سیدھی سادی شخصیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ بباطن بھی ایسے ہی NORMAL نرم رو اور نیک سے درست انسان واقع ہوئے ہیں۔

مجھ سے ایک بار ایک شخص نے کہا کہ ندیم کی تعریف صرف ایک لفظ میں ہو سکتی ہے، پوچھا وہ کیا؟ کہا "شریف"۔ خیر اگر غور نہ کیجیے تو میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ یہ لفظ صرف ندیم ہی کے لیے وضع ہوا ہے۔ لیکن اس معصوم سی تعریف میں

تضحیک کا ایک پہلو یہ ہے کہ گویا ندیم شرافت کے علاوہ اور کچھ جانتے ہی نہیں ۔ یعنی شرافت + شرافت = شرافت یقیناً ندیم شریف النفس آدمی ہیں ۔ لیکن شرافت کے نام پر جب انہیں دھوکے دیئے جاتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دھوکے باز کو یا اس کی چال کو جانتے بوجھتے ہوئے بھی دھوکہ کھاتے ہیں اور یہ وضع داری کچھ پنجاب کے شرفاء سے مخصوص نہیں ساری دنیا میں ایسے نیک نفس، فرشتہ صفت، مرنجان مرنج انسان ہوتے ہیں ۔ لیکن خال خال ۔ کمیاب بلکہ نایاب اور اس قدر نادر کہ نادر و کالمعدوم کی ضرب المثل انہی کی نسبت صادق آتی ہے ۔

غرض کہ ندیم کی شخصیت پر قلم اٹھانا صرف اس لیے مشکل ہے کہ وہ ایک متوازن شخصیت رکھتے ہیں ۔ حافظے کے کمرے میں جس قدر تصاویر بنتی ہیں سب کی سب معتدل اور متوازن ہیں ۔ اس سے قبل کوئی آٹھ نو سال پہلے بھی رقم برداشتہ خاکہ ندیم کے بارے میں لکھا تھا ۔ اس وقت بھی یہی معاملات درپیش تھے اور آج جب کہ ماہ و سال کی ایک سوا اُن پر سے گذر چکی ہے، مجھے ان کی شخصیت میں کسی قسم کی تبدیلی کا احساس نہیں ہوتا ۔ وہی لہجے میں مٹھاس، خندہ پیشانی سے اٹھ کر مصافحہ کرنا، مسکرا مسکرا کر باتیں کرنا، لطیفے سُنانا، دوستوں اور عزیزوں (حتیٰ کہ منافق قسم کے دوستوں تک) سے سلام، مصافحہ اور معانقہ میں سبقت کرنا، حال احوال (محض رسماً نہیں) دریافت کرکے نہ صرف دل جوئی کرنا بلکہ صحیح معنوں میں دامے درمے قدمے سخنے کام آنا اور حتی الامکان ان کا بوجھ بٹانا، آج بھی ندیم کا شیوہ ہے ۔

ان سطور کے لکھتے وقت مجھے ایک لطیفہ یاد آرہا ہے ۔ تاج سعید نے ارژنگ کے ندیم نمبر کے لیے مجھ سے قلم برداشتہ خاکہ ندیم صاحب پر لکھوایا، ارژنگ کے اس نمبر کے نکلنے کی ساعت ہی نہ آسکی اور وہ نامساعد حالات کی وجہ سے بند ہوگیا، پھر یہ بیل کسی وجہ سے منڈھے نہ چڑھ سکی اور مضمون کسی دوسری جگہ چھپ گیا ۔ یاران طریقت نے اس مضمون میں علاوہ دیگر عیوب کے ایک عیب یہ بھی نکالا کہ اس میں تو تحسین ہی تحسین ہے ۔ تنقید نام کو بھی نہیں ۔ سرفہ ستم یہ ہوا کہ ایک صاحب فرمانے لگے، "احمد ندیم قاسمی تمھیں کتنا وظیفہ دیتے ہیں" ۔ میں نے مزاحاً کہا "کیا بات ہے ہیں انکم ٹیکس والوں کو خبر کرنے کا ارادہ تو نہیں ہے؟[1]" ۔ اُن حضرت نے کچھ اس ڈھب سے اس بات کو پھیلایا کہ اکثر احباب مجھے ندیم کا حاشیہ بردار اور چاپلوس وغیرہ سمجھنے لگے ۔ ایک روز دل ہی دل زبانی سے میں نے ندیم صاحب سے کہا کہ آپ کی محبت نے مجھے طرح طرح کے خطاب دلوائے ہیں اور مشہور ہے کہ میں آپ کا وظیفہ خوار ہوں ۔ ۔ بولے وہ کون شخص ہے مجھے بتائیے ۔ میں بہ لطائف الحیل ٹال گیا ۔ لیکن یہ ضرور سوچتا رہا کہ کاش ندیم کا میں واقعی وظیفہ خوار ہوتا تو ہزاروں دکھ دھندوں سے چھوٹ جاتا ۔ لہٰذا اے ناظرین! سطور بالا میں جو کچھ ندیم کی توصیف میں لکھ گیا یا آئندہ سطور میں لکھا جائے گا اس کے لیے یقین رکھیے کہ اس کا تعلق اس وظیفے سے ہے جو ندیم سے مجھے شفقت محبت کی صورت میں برابر وصول ہوتا رہتا ہے ۔ آپ کو اختیار ہے، خواہ آپ اس کرائے کے خاکے کو پڑھیں یا نہ پڑھیں ۔ مجھے تو بہرحال لکھنا ہے ۔ میں لکھ کر رہوں گا ــــ وما علینا الا البلاغ ــــ

---

[1] حضرت خیر، العزیز خان آند (کمشنر انکم ٹیکس لاہور ریجن) ، خدا کے لیے اسے مزاحیہ فقرہ سمجھ کر نظر انداز کر دیجیے گا ۔ آپ کے محکمہ سے بہت خائف ہوں ــــــــ آغا سہیل

صاحبو دنیا کا دستور ہے کہ بغیر لالچ یا دباؤ کے کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔ لیکن میں نے اسی شہر لاہور میں ندیم کی وضع داریاں دیکھی بھی ہیں اور سنی بھی ہیں، کہ ضرورت مند لوگوں کے اس طرح کام آئے کہ دوسروں کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ اور اگر کسی نے اس بات کا احساس دلانا چاہا تو اپنا ذکر بھی تحسین کے ساتھ سننا منظور نہ کیا۔ اب یہ قدریں فرسودہ خیال کی جاتی ہیں اور ایسے وضع دار لوگ بیوقوف سمجھے جاتے ہیں۔ ناصر کاظمی مرحوم کا واقعہ ابھی اس قدر پرانا نہیں کہ لوگ بھول گئے ہوں۔ لیکن ندیم نے اپنی زبان سے کبھی اس حسن سلوک کا ذکر بھی نہیں کیا جس کے ناصر مرحوم بار بار زیر ممنونیت کرتا رہا۔ یاران طریقت کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ میو اسپتال کے ایک گوشہ میں بیماری سے نبرد آزمائی کرنے والا ناصر کیسے کیسے آلام و افکار کا شکار رہا اور ان آلام و افکار سے نجات دلانے میں ندیم نے کیا کردار ادا کیا۔ یہی نہیں، ناصر کی شاعرانہ حیثیت کو مسلمہ حقیقت بنانے میں نقوش کے دور ادارت سے لے کر فنون کے دور تک ندیم نے جو نہایت اہم کردار ادا کیا اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ شاعروں میں بالعموم اور لاہور کے شعراء میں بالخصوص جذبۂ رقابت اس درجہ غالب ہے کہ کسی کو پھلتے پھولتے نہیں دیکھ سکتے۔ ندیم نے شاعروں اور ادیبوں کا ایک قطعے کا قافلہ تیار کر دیا جو بساط ادب پر آج تک رواں دواں ہے اور جو دل کی گہرائیوں سے اس بات کا معترف ہوگا کہ ان کی ادبی حیثیتوں کے تعین میں ندیم نے کس قدر اہم کردار ادا کیا۔ تو صاحبو ندیم کو ان نوخیز و نوآموز ادباء و شعراء سے نہ کوئی لالچ ہے نہ ان کا کوئی دباؤ ہے۔ بس انہوں نے اپنے اوپر یہ اخلاقی فرض عاید کر لیا ہے کہ محض شعر و ادب کی تخلیق و تنقید ہی کافی نہیں اس کی آبیاری کے لیے نیا خون مہیا کرنا ضروری ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد مرحوم اس فرض کو بخوبی انجام دیتے تھے ان کے بعد ندیم نے اس کار خیر کو اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے۔ کتنے ہی ادیب و شاعر ندیم کے ساختہ و پرداختہ ہیں جو جذبۂ تشکر کے جذبات تک سے عاری ہیں۔ لیکن میں کسی کا نام لیے بغیر صرف اپنے بارے میں عرض کرتا ہوں کہ میری بری بھلی ٹوٹی پھوٹی جیسی بھی ادبی حیثیت ہے وہ محض ندیم اور احتشام حسین کی منت پذیر ہے۔ اپنی جہ مانگی، ورنہ موردی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ مجھے ندیم کی شخصیت کے باب میں چند سطریں لکھنے کی اجازت دیجیے۔

قریب تر شخصیت کے بارے میں لکھنا کس قدر مشکل ہے اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس مشکل سے دوچار ہوئے ہوں۔ جب باسول (BOSWELL) نے جانسن (JOHNSON) کے بارے میں لکھنے کا یا حالی نے غالب کے بارے میں سوانح مرتب کرنے کا ارادہ کیا ہوگا تو بڑی منصوبہ بندی کی ہوگی۔ اپنے موضوع کو ہر زاویے سے پرکھا ہوگا، ٹٹولا ہوگا اور شخصیت کے تمام معائب و محاسن پر نظر رکھی ہوگی، تب کہیں جا کر ان شاہکاروں کی تخلیق ہوئی ہوگی۔ ہمارے پیش نظر شخصیت تو اہم ہے۔ لیکن وہ منصوبہ بندی در سلیقہ [illegible] جو اس موضوع کے لیے ضروری شرط ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ میں ندیم سے اس قدر بھی قریب [illegible] [illegible] کر سکوں، اور اس لحاظ سے ان کے قریبی عزیز، احباب اور رشتہ دار جس طرح [illegible] [illegible] ان کی توقع مجھ سے نہ کیجیے گا میں نے تو ندیم کو جیسا دیکھا، مجھے [illegible] ہے بے تکلف لکھے دیتا ہوں۔

اندازہ ہے کہ قد ساڑھے پانچ فٹ ہوگا، وزن ایک من تیس، ورنہ پینتیس سیر تو [illegible] دو تین سیر یا کچھ زیادہ [illegible] رنگ سیچی گندمی۔ ناک نقشہ نہایت درجہ مناسب و جاذب و دلکش [illegible] [illegible] [illegible]

سگریٹ نوشی سے کسی قدر سیاہی مائل۔ آنکھوں پر چشمہ اور چشمے کے شیشوں سے جھانکتی ہوئی نہایت مشفقانہ آنکھیں۔ کشادہ پیشانی اور گھونگر والے بال جو اب تیزی سے سپید ہو رہے ہیں۔ ہاتھ میں چرمی تھیلا۔ انگریزی لباس زیب تن۔ نہایت نستعلیق چال سے انارکلی کا بازار طے کرتے ہوئے ۴۳ انارکلی تک پہنچیں گے اور لکھا کھٹ زینہ چڑھتے ہوئے اوپر چلے جائیں گے جہاں آج کل فنون کا دفتر واقع ہے۔ اختر کو آواز دے کر ڈاک وصول کریں گے۔ عبداللہ قریشی صاحب سے فنون کی طباعت و کتابت کے باب میں گفتگو کریں گے۔ کبھی فون پر کبھی کبھار باتیں کریں گے اور دوست احباب کی چائے اور سگریٹ سے خاطر مدارات کریں گے —— یہ ہیں ندیم صاحب۔ لیکن ٹھہریئے کیا آپ ندیم کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں اور کیا اسی قدر جاننا کافی ہے۔ شاید نہیں۔ کیونکہ انارکلی کے بازار میں ہر دوکاندار، ہر راہرو اور ہر خوانچہ فروش ندیم کے بارے میں صرف اتنا ہی نہیں جانتا۔ وہ تو یہ بھی جانتا ہے کہ امروز میں حرف و حکایت لکھنے والا عنقا، "لاہور نامہ" جنگ میں لکھنے والا صحافی۔ حریت میں "موج در موج" لکھنے والا اور ریڈیو پر روزانہ ۱۲ بجے دن میں دھرتی سے گزرتا ہے۔ مشاعروں میں غزلیں اور نظمیں سنانے والا، ریڈیو پر اپنا کلام پڑھنے والا اور ٹی وی پر نظر آنے والا، رسالوں اور اخباروں میں چھپنے اور کتابوں میں پڑھا جانے والا ندیم رکشوں اور ٹیکسیوں پر روزانہ سفر کرتا ہے۔ اُس کے گھر اور دفتر کے دروازے اپنوں اور پرائیوں کے لیے ہمہ وقت کھلے رہتے ہیں جو بیک وقت شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور صحافی ہے۔ انگہ ضلع سرگودھے کا یہ پیرزادہ جس نے کیمبل پور اور بہاولپور سے تعلیم کی تکمیل کی۔ بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گیا تھا اور اپنے شفیق چچا پیر حیدر شاہ کے زیر تربیت رہا جنہوں نے بی اے تک تعلیم دلوائی۔ لیکن ابھی تعلیم کی تکمیل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ شفیق چچا (۱۹۳۵ء) میں انتقال کر گئے۔ اس حادثے کے بعد ندیم کو گاؤں واپس آنا پڑا۔ چچا نے ندیم کی تعلیم کی تکمیل کے لیے رقم محفوظ کرا دی تھی اور اسی رقم سے ندیم نے اپنی تعلیم مکمل کی۔

ندیم دوران تعلیم میں پیرزادہ عبدالرحیم (بہاولپور) سے متاثر رہے۔ پیرزادہ انگریزی کے استاد تھے انھوں نے ندیم کی تعلیم میں خصوصی دلچسپی لی۔ انگہ کے قیام کے ابتدائی ایام میں ندیم نے قرآن مجید (ناظرہ) پڑھا تھا۔ لیکن کیمبل پور میں ترجمہ مع تفسیر حقانی (مولانا عبدالحق دہلوی) پڑھا۔ دینی علوم کے بعد دنیوی تعلیم سے شغف پیدا ہوا اور چچا کی نگرانی میں تعلیم مکمل کی ——

یہیں کہیں پر شاعر ندیم اور افسانہ نویس ندیم کی کھوج لگائی جا سکتی ہے۔ ندیم نے اکثر دوران گفتگو اپنے ابتدائی ایام کے سلسلے میں جن باتوں کا بے تکلفی سے اظہار کیا ان میں یہ بھی شامل ہے کہ کس طرح اپنی والدہ محترمہ کی خدمت کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنے ہاتھ سے اُن کے کپڑے تک دھوئے ہیں۔ اس قدر سادہ زندگی کی تعلیم ندیم نے اپنے چچا سے حاصل کی جو بیک وقت شعر و ادب کا ذوق بھی رکھتے تھے اور خاندانی روایتوں اور مذہبی قدروں سے شغف بھی، کہ آج ندیم اگر یہ کہیں کہ I AM WHAT MY UNCLE HAS MADE ME تو غلط نہ ہوگا۔ ندیم کا بیان ہے کہ ہمایوں، صوفی اور نگار جیسے رسائل کے مطالعہ کا موقع بھی چچا نے مہیا کیا اور ادبی تربیت کا باقاعدہ آغاز بھی ہمایوں، صوفی اور نگار سے ہوا۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۱ء میں پہلی نظم لکھی جو دراصل مولانا محمد علی جوہر کا مرثیہ ہے۔ ظاہر ہے کہ چونکہ ندیم کا سن پیدائش (۲۰ نومبر) ۱۹۱۶ء ہے لہٰذا اس وقت ان کی عمر کل پندرہ سال کی تھی۔ یعنی پندرہ سال کی عمر میں باقاعدہ تخلیقی عمل شروع ہو گیا۔ ندیم نے ۱۹۳۵ء

میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا اور عرصۂ دراز تک بے روزگاری کے زخم کھائے اور ۱۹۳۹ء میں ایکسائز کے محکمہ میں انسپکٹر کی اسامی پر تقرر ہوا۔ لیکن دو سال تک "حوتما دکرلا" اس ملازمت سے نباہ کیا۔ ۱۹۴۱ء میں اس سے پیچھا چھڑا کر لاہور آن براجے اور دارالاشاعت پنجاب کے ہفت روزہ "پھول" اور ہفت روزہ "تہذیب نسواں" کے مدیر مقرر ہوئے۔ چنانچہ ادب کے رنگ میں ایسا دھنسے کہ آج تک ناکوں ناک ڈوبے ہوئے ہیں اور ادب و صحافت اوڑھنا بچھونا بن گئی ہے۔ ادب لطیف، سویرا، نقوش، امروز اور فنون سے وابستگی رہی۔ مگر فنون وہ واحد ادبی رسالہ ہے جس کے خود مالک بھی ہیں اور مدیر بھی۔ اور اس لحاظ سے ادبی رسائل جن مصائب سے دوچار ہیں وہ ان کے مدیران و مالکان جن آلام کا شکار ہیں۔ ان کے شدت خود ہدف بنے ہوئے ہیں اور زخم پہ زخم کھا رہے ہیں، مگر رسالہ دم قدم کے ساتھ جاری ہے اور غالباً اس سے بھی زیادہ ناموافق حالات میں جاری رکھنے کا عزم مصمم رکھتے ہیں۔

تو یہ ہیں وہ باتیں جو کم و بیش ندیم کو جاننے پہچاننے والا ہر شخص جانتا ہے اور ندیم کو بخوبی جانتا بھی تھا ہے۔ میں نے اوپر ہی عرض کر دیا ہے کہ میں ان جاننے والوں سے "کچھ زیادہ" ضرور جانتا ہوں، لیکن "اتنا" نہیں جانتا جس قدر ان کے انتہائی قریبی احباب اور ان کے گھر والے جانتے ہوں گے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ندیم کو جاننے والوں کا ایک حلقہ وہ بھی ہے جنھوں نے ندیم کو کبھی نہیں دیکھا، مگر ان کی تخلیقات کے آئینے میں یا ان کے بارے میں لکھے جانے والے مضامین میں ان بیانات میں جو ندیم سے متعلق ہیں۔ پاکستان منتقل ہونے سے قبل میں بھی ندیم کو اسی حوالے سے جانتا پہچانتا تھا اور میں ہی ایسے سے تعلق رکھتا تھا جو اصل شخصیت کے دیدار سے محروم تھے۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ حضرت نشتر لکھنوی مرحوم ندیم صاحب کا ذکر جس تعلق خاطر سے کرتے تھے اس سے ملاقات کی تشویق ضرور پیدا ہوتی تھی۔ میں نے ان باتوں کا کسی قدر تفصیل سے ذکر ایک مضمون میں کیا ہے۔ لہذا اس کی تکرار مناسب نہیں۔ یہاں میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح ندیم کے پڑھنے والوں کا ایک حلقہ ہے اور اس حلقہ نے ندیم کو بدیدار نہیں دیکھا۔ اسی طرح پاکستان میں ایک اور حلقہ بھی موجود ہے جس نے ندیم کو دیکھا بھالا بھی ہے، اور پڑھا بھی ہے۔ لیکن مذکورہ حلقہ اول الذکر حلقہ کے بارے میں سوئے ظن میں مبتلا ہے اور وہ ندیم کے باب میں طرح طرح کی چہ می گوئیاں کرتا رہتا ہے۔ میری سمجھ میں بنائے مخاصمت نہیں آتی کہ آخر کیوں ہے، البتہ اس سے اگر کچھ مقصود ہوگا تو یہ کہ بازار ادب میں چند کھوٹے سکے چلانے کی خاطر ان سکوں کی ساکھ کم کی جائے۔ بہر نوع ندیم اس کم سوادی کا شکار ہوئے ہیں اور اس لحاظ سے ندیم لائق مبارکباد ہیں کہ ہر اہم آدمی کو بعض غیر اہم آدمی اس لیے غیر اہم بنانے کی ناکام سعی کرتے ہیں کہ اپنی اہمیت جتا سکیں چونکہ اس بات سے ندیم کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ اس سبب سے وہ اور ندیم لائق تہنیت ہیں۔

کسی شخص کو سمجھنے کے لیے اس کے ماحول کا سمجھنا ضروری ہے اور اس شخص کو مزید سمجھنے کے لیے اس کے مخالفین کی حیثیت کا تعین بھی ضروری ہے۔ چونکہ ندیم کے مداحوں، دوستوں اور چاہنے والوں کا بے حد وسیع حلقہ موجود ہے۔ لہذا ان پر ندیم کے مخالفین کی حیثیت واضح ہے۔ (اس سلسلے میں میرے خیال میں کسی تردد کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔) ندیم کو اور ان کے ماحول کو مختلف حوالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مذہبی لحاظ سے وہ پنجاب کے وسیع اور معزز پیر ولی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جہاں مذہب ہی اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے، مگر ندیم نے نہ مذہب کی کورانہ تقلید نہیں کی اور نہ پیر پرستی کا رستہ اپنانے دیا

وہ اس لحاظ سے کسی حد تک باغی شخص ہیں کہ انھوں نے خاندانی روایات کے مطابق بہت سی مجہول رسوم کو ترک کر دیا۔ البتہ انھیں اپنے راسخ العقیدہ مسلمان ہونے پر ضرور ناز ہے۔ وہ مسلمان جو فرقوں کے تنگنائے میں محدود و مسدود نہیں رہتا اور جس کی بانہیں تمام مسلموں اور غیر مسلموں کے لیے وا ہیں۔ تمام انسانوں کے لیے بانہوں کا حلقہ کھلا ہوا ہے۔ ان تمام انسانوں کے لیے جو بنی نوع انسان کے بہی خواہ اور سچے دوست ہیں۔ ندیم اُن کے سچے دوست ہیں۔ اُن کا دل سمندر کی طرح گہرا اور آسمان کی طرح وسیع ہے۔ اور وہ اول و آخر ایک ترقی پسند انسان ہیں اور ترقی پسند معاشرے کے قیام کے لیے کوشاں ہیں، ہاں، وہ مارکس اور انجلز سے نظریاتی مطابقت کے باوجود پاکستان کے سواد اعظم سے منحرف نہیں ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کے کٹر مارکسی اُن کو ترقی پسند ہی نہیں مانتے۔ یا اُن سے اتفاق نہیں کرتے۔ لیکن ندیم نے اس بات کی چنداں پروا نہیں کی۔

ثقافتی لحاظ سے ندیم پنجابی ہیں۔ لیکن ایسے پنجابی جن کی پنجابیت پر پیار آتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری اور اپنے افسانوں میں جس طرح پنجاب کو پیش کیا ہے وہ حقیقی پنجاب ہے اور اس پنجاب کے پیچھے چھپا ہوا انسان حقیقی پنجابی ہے لیکن یہ پنجابی اول و آخر جس طرح ترقی پسند ہے اسی طرح پاکستانی بھی ہے۔ یعنی اول و آخر پاکستانی۔ ثقافتی لحاظ سے ندیم اس حد تک پنجابی ہیں کہ پنجابی زبان میں بھی گفتگو کرتے ہیں اور اردو میں بھی۔ لیکن وہ انگریزی زبان کو بہر حال دورِ غلامی کی علامت سمجھتے ہیں اور معاشرے کو انگریزیت کی سنوبری سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ بعض نا سمجھ اس مخالفت سے یہ غلط استنباط کر بیٹھے ہیں۔ کہ ندیم سرے سے انگریزی زبان ہی کے مخالف ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ وہ انگریزیت کی لعنت سے اپنی قوم کو دور رکھنا چاہتے ہیں، تاکہ قومی تشخص ممکن ہو سکے۔ انگریزی زبان سے بحیثیت زبان کے انھیں کوئی پرخاش نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ علاقائی لحاظ سے ہم سندھی، پنجابی، بلوچی اور پٹھان ہو سکتے ہیں۔ لیکن قومی تشخص کے لحاظ سے پاکستانی اور صرف پاکستانی ہیں۔ جو لوگ "انگریزیت" کے حوالے سے پاکستانی ہیں یا پاکستانی ہونے کے مدعی ہیں۔ نہ وہ پنجابی، سندھی، بلوچی اور پٹھان ہیں اور نہ پاکستانی۔ ندیم کو بے شک اپنے پاکستانی اور پنجابی ہونے پر فخر ہے۔ اگر انھیں یہ فخر نہ ہوتا تو ان کے پاکستانی ہونے پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔ ان کی وفاداری انگریزوں کے زمانے میں بھی انگریزیت سے نہیں تھی اور نہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد ہو سکتی ہے۔ جو طبقہ پہلے بھی انگریزیت کا گرویدہ اور انگریزوں کا پرستار تھا وہ آج بھی انگریزیت کے حوالہ سے جس چیز اور جس نظامِ فکر کو مسلط کرنا چاہتا ہے، وہ آزاد قوم کے شایانِ شان نہیں اور یہی وہ طبقہ ہے جو نوکر شاہی سے عبارت ہے اور اسی انگریزیت سے ندیم کو بیر ہے، نہ کہ انگریزی زبان سے۔ بعض کم سواد یہ بھی کہتے سنے گئے ہیں کہ جن لوگوں کو "انگریزی" نہیں آتی، وہی انگریزی کی مخالفت کرتے ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ ایسے ہوں۔ لیکن ہمیں ان انگریزی خواں و انگریزی داں لوگوں کا علم ہے، جو اچھے اچھے انگریزوں سے زیادہ اچھی انگریزی جانتے رہے ہیں۔ لیکن اپنے قومی تشخص کے لیے "انگریزیت" سے ہمیشہ اجتناب کرتے رہے ہیں۔ ندیم بھی ایسی ہی انگریزیت کے مخالف رہے ہیں۔

ندیم اپنی روزمرہ اور نجی زندگی میں بے تکلفی سے پنجابی اور اردو استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت میں خانے نہیں بنے ہوئے ہیں۔ پنجاب بھی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں ثقافت کے نام پر محض پنجابی زبان سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ جنوب اور مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے پنجاب میں کشمیری، ملتانی، ہندکو، پنجابی، سرائیکی یا ریاستی، نیز دیگر چھوٹے

چھوٹے علاقوں کی اپنی بولیاں موجود ہیں۔ ندیم کا نام (سرگودھا) سے تعلق ہے اور موں سکیسر ان کا خاص علاقہ ہے۔ اگر اس علاقے کی پنجابی ملتان یا جھنگ میں نہ بولی جائے اور ملتان اور جھنگ میں نہ کی پنجابی دوسرے علاقوں میں بولی جائے تو لسانی اعتبار سے پنجاب پنجاب نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ ندیم اس لحاظ سے نہ صرف پنجابی ہیں اور نہ صرف پاکستانی، بلکہ فقط اور صرف پاکستانی ہیں۔ یعنی دوسرے لفظوں میں وہ کنویں کے مینڈک نہیں ہیں جسے آسمان صرف پنجاب میں نظر آتا ہو اور پنجاب کے باہر اس آسمان کا اُفق گم ہو جاتا ہو۔ جو سچا فن کار ہوتا ہے وہ تنگ دل، تنگ نظر اور محض لمحے کا پابند نہیں ہوتا۔ علاقے کیا ہیں۔ کبھی کبھی تو ملکی اور جغرافیائی سرحدوں کو توڑ کر بھی وہ اس انسان کو دریافت کر لیتا ہے تاکہ انسانی اقدار کے لیے کوئی بہترین نصب العین پیش کر سکے۔ ندیم ایسے ہی پنجابی ہیں اور ایسے ہی پاکستانی۔

ان گناہ گار آنکھوں سے اسی پنجاب میں ایسے ایسے حضرات بھی دیکھے ہیں جو مصلحت کے تحت یوں بدل جاتے ہیں جیسے موسم، اور یوں آنکھیں بدلتے ہیں جیسے طوطا۔ انھوں نے ایسے گرگے پال رکھے ہیں جو فن کاری کے پردے میں "فن" اور "فن کار" دونوں کا استحصال کر رہے ہیں محض اس لیے کہ اپنے چند کھوٹے سکے چلا سکیں اور دنیائے ادب میں بھی جاگیردارانہ تمرّد اور آمریت قایم کر سکیں۔ ندیم ایسے حلقوں میں یقیناً پسندیدہ شخصیت نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ ہر طرح کے استحصال کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے رہے ہیں اور غالباً اس سے بھی زیادہ شدت سے بلند کرتے رہیں گے۔ ندیم نے اس قسم کے گرگے شہر میں کبھی نہیں چھوڑے جو ان کے لیے سستی شہرت مہیا کریں۔ کیونکہ ندیم برصغیر کے پیچھے پیچھے پھیلے ہوئے قارئین کے دلوں میں اپنے فن کا اعتبار رکھتے ہیں۔ انھیں انجمن ہائے تحسین باہمی کی ضرورت نہیں جیسی کہ ایسے لوگوں کو ضرورت ہے بلکہ محتاجی ہے۔ ندیم کو یہ بھی احساس ہے کہ کلاہِ سکندری جو ہر طرح خراج کی منت پذیر ہوتی ہے بلکہ یہ بہترین قناعت اور خرقۂ درویشی مرنے کے بعد بھی اپنا بھرم قایم رکھتا ہے جسے وہ ہنسی خوشی جھیل گئے۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اپنے وقت کا نادر روزگار فن کار اگر مفلوک الحال بھی ہو تو غم نہیں۔ لیکن فن اگر کھرا ہے تو وہ اپنے وقت کی سرحدوں کو توڑ کر زمان و مکاں کی حدود سے نکل کر آفاقیت کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے اور زندۂ جاوید بن جاتا ہے جب کہ اس کے معاصرین اور اکثر رقیبِ تو [illegible] خود اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ وقت کا عفریت انھیں نگل جاتا ہے۔ لیکن فن کا زندہ رہتا ہے۔ عرفی کے معاصر کیسے کیسے بڑے ملا، گدا، علما اور سہ گل جیسے لوگ ادب میں ہوں گے جنھیں آج ہم جانتے بھی نہیں۔ لیکن اپنے وقت کا مفلوک الحال بے نوا غریب شاعر اپنی کج کلاہی سمیت زندہ ہے۔

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را
ہمت نخورد نیشترِ لا و نعم را

بے برگیِ من داغ نہد در دلِ ساماں
بے مہریِ من داغ کشد روئے درم را

ندیم بھی عرفیِ وقت ہیں، جنھوں نے نہ اپنے زمانے کے [illegible] آنوں اور نوابوں سے مفاہمت کی اور نہ کسی سرمایۂ صنعت کار اور جاگیردار سے سودے بازی کی۔ نواب لیاقت علی خاں اور ایوب خاں کے زمانوں میں ندیم کی نظر بندی [illegible]

جیں یا نہ اس بات کا یقین ثبوت ہیں۔ نیز ان کے افسانوں کے غیور اور مظلوم کردار اور ان کی شاعری کے موضوعات، اشعار مندرجہ بالا کی سی خودداری اور دم خم بھی رکھتے ہیں اور بجائے خود ندیم کی سیرت اور اشعار کی عملی تفسیر بھی ہے۔

ادبی لحاظ سے ندیم کی شخصیت کو متعدد حوالوں سے سمجھنا چاہیے، بحیثیت شاعر اور بحیثیت نثر نگار۔ اُن کی شاعری کی ابتدا محمد علی جوہر کے مرثیہ سے ہوئی۔ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت حریت و آزادی کی علامت بھی ہے اور مولانا موصوف تحریک آزادی کا وہ بطل جلیل بھی تھے جس سے برصغیر کی تحریک، آزادی کو شعور بھی عطا کیا اور جوش و خروش بھی۔ تو یہ ندیم کی شاعری کا نقطۂ آغاز ہے۔ چنانچہ شعر کے پردے میں محض باتیں کرنا ندیم کا شیوہ نہیں۔ وقت پڑنے پر پرچم بھی علم کیا اور حریت کے گیت بھی گائے۔ کسی نصب العین کو صحیح سمجھا تو ایمان داری سے سمجھا اور استواری سے اس پر قائم رہے خواہ اس کی خاطر جیلوں کی سیر کیوں نہ کرنا پڑتا ہو۔ اور شاعروں میں جیل جانے والوں میں دو نام ہیں، حضرت فیض اور ندیم صاحب۔ ہی ہیں لیکن نوعیتیں مختلف ہیں۔ آخر الذکر تین شعراء اس لحاظ سے لائقِ احترام ہیں۔ انھوں نے اپنے نصب العین کی خاطر جو بنی نوع بشر کی فلاح و بہبود سے متعلق تھا کسی استحصالی قوت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔ غرضکہ ندیم جو نظم گوئی سے بھی شغف رکھتے ہیں اور غزل گوئی سے بھی، ہر دو اصناف میں اسی نصب العین کو پیش کرتے ہیں جو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود سے عبارت ہو۔ رہا اسلوب بیان کا مسئلہ سو وہ ظاہر ہے کہ اگر منفرد متنوع نہ ہوتا تو نہ کوئی ندیم کو جانتا اور نہ ان کی عظمت کو تسلیم کرتا، نہ "افکار" کا یہ نمبر ندیم کے لیے مختص کیا جاتا اور ان کی شاعری پر مقالات لکھے جاتے۔ کیا اچھی بات ایک موقع پر حضرت فراق گورکھپوری نے ارشاد فرمائی۔ اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں دورانِ گفتگو کہنے لگے "اگر تلسی داس کی شہرۂ آفاق "رام چرتر مانس" (اودھی زبان کی رامائن) کے مواد پر غور کیجیے تو اس کی حیثیت اس سے زیادہ ہرگز نہیں ہے کہ راون سیتا جی کو اغوا کر کے لے گیا۔ اغوا کی ایسی وارداتیں برصغیر کے معمولات میں داخل ہیں۔ کسی بھی پولیس اسٹیشن کا روزنامچہ اٹھا کر دیکھ لیجیے تو آئے دن ایسی باتوں کے چالان درج ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ چالان اور یہ اغوا بجائے خود "ادب" نہیں ہیں، بلکہ وہ اسلوب یا طرز نگارش" ادب ہے، جو تلسی داس نے اسے عطا کیا"۔ لہذا قصہ مختصر ندیم کا اسلوب ہی اس مواد کو ادب کا درجہ عطا کرتا ہے نہ کہ محض نصب العین کچھ نہیں ہے اگر محض نصب العین ہے تو پروپیگنڈا ہے، اشتہار کا چیتھڑا ہے۔

ندیم ترقی پسند تحریک سے شروع ہی میں وابستہ ہو گئے اور ایک عرصہ تک انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کے سیکریٹری جنرل رہے۔ لیکن انھوں نے حتی الامکان اپنی شاعری کی شاعرانہ حدود کو پامال کر کے نصب العین کی ترویج و اشاعت نہیں کی اور نہ نصب العین سے علیحدہ ہو کر شاعری کی۔ گو اس طرح انھوں نے اپنے لیے خود مشکل راہ بنائی۔ لیکن صراطِ مستقیم سمجھ کر اسی ڈگر پر چلے اور اپنے پیچھے ایک قافلہ لے کر چلے، جو آج تک شعر و ادب کی خدمت بجا لا رہا ہے۔ یاد رہے کہ ترقی پسندی کی تحریک اپنے ابتدائی ایام میں کوئی آسان رستہ نہیں تھی جس پر ہم آنکھ بند کر کے چل پڑیں۔ اس ڈگر پر چلنے والا اپنا آپ ہادی و رہنما بھی ہوتا تھا اور خود ہی راہزن بھی۔ جو ذرا بھی بہک جاتا تھا وہی میراجی بن جاتا تھا۔

ادب کے حوالے سے ندیم نثر نگار شخصیت بھی ہیں اور میری رائے میں ایک منفرد و قیع نثر نگار جو بیک وقت نقاد بھی ہے مبصر بھی، ادبی شذرات لکھنے والا بھی، مقالہ نگار بھی، صحافی بھی، مزاح نگار بھی اور افسانہ نویس بھی۔ یہاں ندیم ہیئت و مواد کے لحاظ سے ایک مہتم بالشان مقام کے حامل نظر آتے ہیں۔ اُن کے تنقیدی شذرات اُن کے بہترین تبصرے نہایت پُر مغز

مقالات اور ان کے دلکش افسانے مواد کے لحاظ سے اگر اپنے نصب العین کو ملحوظ رکھتے ہیں تو ہیئت کے اعتبار سے ادب کا گرانقدر سرمایہ ٹھہرتے ہیں۔

مزید یہ کہ شاعر اور افسانہ نویس ندیم کی شخصیت اس شخصیت سے قطعاً مختلف نہیں ہے جو ہمیں نظر آتی ہے یعنی اس کے دونوں رُخ یکساں ہیں معنوی و صوری لحاظ سے ندیم فن کے پردے میں چھپ کر بھی ندیم ہی رہتے ہیں کچھ اور نہیں بنتے۔ وہ شعر و ادب میں خطیب نہیں بنتے بلکہ ایک عام انسان بن کر سامنے آتے ہیں۔ وہ انسان جس سے ہر انسان کو پیار ہو سکتا ہے۔ وہ لفظوں کے آہنگ اور معانی کی گہرائی میں بھی حسن و جمال کا نہایت حسین مرقع بناتے ہوئے چلتے ہیں، جس میں مصوری کا رنگ، موسیقی کا رس اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو رچی بسی ہوتی ہے۔ وہ مواد و ہیئت کے مابین بے حد نحیف پردہ قائم کرتے ہیں لفظوں کے طمطراق میں معنویت کا خون نہیں کرتے۔*

جہاں تک صحافی ندیم کا تعلق ہے ندیم نے فکاہیہ کالم بھی لکھے اور اداریے بھی۔ آج تک بطور روزگار وہ صحافی ہی ہیں۔ لیکن یہ ہمارے ملک کا، اور ملک کی معیشت کا ایک المیہ ہے کہ ادیب اور شاعر پیٹ پالنے کے لیے صحافت اختیار کرتا ہے یا استاد بنتا ہے، وکالت کرتا ہے، ملازمت کرتا ہے، صنعتی اداروں میں اپنی صلاحیتیں برباد کرتا ہے، ریڈیو، ٹی وی یا فلم کے بھاڑ میں خود کو جھونک دیتا ہے یا کچھ تجارت کرتا ہے اور ادب کو جز وقتی مشغلے کے طور پر اپنانے پر مجبور ہوتا ہے۔ ندیم بھی ایک ایسے ہی صحافی ہیں۔ بندگی بیچارگی کا سبب ہے۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ وہ اچھے اور کامیاب صحافی نہیں ہیں۔ ہیں لیکن وہ خود اس پیشے سے خوش نہیں۔ جو وقت فکاہیہ کالم لکھنے، صحافتی شذرات رقم کرنے، اخبارات کے پلندے پڑھنے میں ضائع ہو جاتا ہے وہ ہر طرح ایک ادیب، افسانہ نگار، شاعر ندیم کا قیمتی وقت ہے جسے بہرحال تخلیقی کاموں میں صرف ہونا چاہیے۔ وہ تخلیقی کام جو قوم و ملک کا سرمایہ بن سکے۔ ندیم بھی ہمارے اس جھوٹے معاشرے کا حصہ ہیں جس میں زندہ رہنے کے لیے ادب کے علاوہ کسی اور ذریعے سے معاش فراہم کرنا ادیب یا شاعر کا مقدر ہے اور ادب محض ایک جز وقتی مشغلہ ہے۔ اس کے باوجود اردو کے افسانوی ادب نے دنیا کے افسانوی ادب میں جو علمی مقام حاصل کیا ہے اس میں ندیم کا حصہ ناقابلِ فراموش ہے۔ اور صحافت نے پاکستان میں جو کردار ادا کیا ہے ندیم نے اُسے بھی اعتبار بخشا ہے۔

ندیم عرصے سے ایک ناول لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مجھ سے انھوں نے کئی بار ذکر کیا کہ مجوزہ ناول کے مکالمے تک ان کے ذہن میں محفوظ ہیں، لیکن یہ کیسا ستم ہے کہ کشاکشِ روزگار اتنا بھی موقع فراہم نہ ہونے دے کہ ندیم اس صنف کی طرف متوجہ ہوں۔ ورنہ اردو کی اس کساد بازاری میں ایک وقیع ناول دنیائے ادب کو دے سکتے ہیں ——— ندیم لکھنے کے لیے نہیں لکھتے، کچھ کہنے کے لیے لکھتے ہیں اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ فنی لحاظ سے مکمل بھی ہوتا ہے، شعریت بھی رکھتا ہے اور ابلاغِ خیال کی شرط بھی بدرجہ اولیٰ پوری کرتا ہے۔ ان کی تحریر و تقریر میں نہ ژولیدہ بیانی ہوتی ہے نہ گنجلک کہ مطلب خبط ہو جائے اور تحریر کے اس عجز کو مجبوراً "فن" قرار دینا پڑے جیسا کہ نئی زمانہ لحاظ سمجھتے۔ ان کا نظریہ تو یہ ہے بلکہ وہ صاف، واضح اور غیر مبہم تحریر و تقریر میں یقین رکھتے ہیں جس کی نفسیات منہم ہو اور عوام الناس سے بعد کو پیدا کیا جا سکے۔ یہ بھی ایک ایسا روپ ہے جو شخص اس شخص کے حصے میں آتا ہے جو منافق نہ ہو۔ عبدالرحیم خانخاناں جو ہندی، سنسکرت، عربی، فارسی، اردو (ہندوی) کا ماہر و متعدد زبانوں کا شاعر تھا اپنے ایک ہندی دوہے میں کہتا ہے ؎

رحمن پریت نہ کیجیے جوں کھیرے نے کین　　　اوپر سے تو دل ملا بھیتر پھانکیں تین

ندیم اندر اور باہر دونوں طرف سے یکساں مخلص، بے لوث و بے ریا انسان ہیں جو ادب کے پردے میں بھی ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے وہ سچ مچ ہیں، سچ ہے سچا ادب وہی جو شخصیت کا سچا آئینہ ہو۔

---

* ناصر کاظمی مرحوم ایک شاعرِ اعظم کے باب میں نہایت موثر پھبتی کستے تھے کہ فلاں صاحب الفاظ کے ہاتھی پر بیٹھ کر ... شکوہ سے نکلتے ہیں۔ لیکن "شکار" کرتے ہیں "معنویت" کی بھد کی ——— آغا سہیل

خواجہ حمید الدین شاہد

قاسمی خطوط کے آئینے میں

میرے دوست جناب احمد ندیم قاسمی کے نام کے ساتھ پچھلے ۳۲ برسوں کی [illegible] یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔
ہم ایک دوسرے سے سیکڑوں کوس دور تھے۔ کبھی ایک دوسرے کو دیکھا نہ تھا [illegible] اور نہ
کوئی خونی رشتہ۔ البتہ قلمی دوستی [illegible] ادب کی خدمت کا ذوق [illegible] مشترک تھا۔ جہاں [illegible] ادارۂ
ادبیات اردو حیدرآباد دکن سے استاد محترم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم و مغفور کی زیر نگرانی رسالہ "سب رس"
جاری ہوا تو میں بھی اس کی مجلس ادارت کا ایک رکن تھا۔ غیر منقسم ہندوستان کے [illegible]
سلسلے میں خط و کتابت مجھے ہی کرنی پڑتی تھی۔ [illegible] اس [illegible] ادیبوں اور
شاعروں سے مراسلت کرنے کا مجھے موقع ملا جن میں سے چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مولانا صلاح الدین، پروفیسر حامد حسن قادری، [illegible] خاں، جگر مرادآبادی، عبدالرحمن چغتائی، حفیظ جالندھری، جنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، اثر صہبائی، پروفیسر مسعود حسن رضوی، پروفیسر احتشام حسین، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جمیل ملک، سلام مچھلی شہری، پروفیسر شور، [illegible] مچھلی شہری، میرزا ادیب، [illegible] رشید [illegible] سلطان پوری، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، اوپندر ناتھ اشک، کرشن چندر، جگن ناتھ آزاد، [illegible] خلیفہ سید، ڈاکٹر زبیر صدیقی، الطاف مشہدی، احسان دانش، ایم اسلم، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ل، احمد وغیرہ۔

ان ہی میں سے ایک نام احمد ندیم قاسمی کا بھی ہے جن سے میری خط و کتابت کا آغاز غالباً اپریل ۱۹۴۱ء سے ہوا۔
رسالہ سب رس بابت مئی ۱۹۴۱ء میں ضلع سرگودھا تحصیل خوشاب کے ایک گاؤں انگہ کے اس ابھرتے شاعر کے قطعات
شائع ہوئے تھے۔ اس کے بعد ان کی حسب ذیل تخلیقات سب رس نے مختلف شماروں کی زینت بنیں:

۱۔ تلوار کا نغمہ (نظم) جولائی ۱۹۴۱ء

۲۔ انقلاب (سانیٹ) جولائی ۱۹۴۱ء

۳۔ محتسب اور میں (نظم) دسمبر ،،

۴۔ کیا کر رہا ہوں (نظم) جنوری ۱۹۴۲ء
۵۔ استعفیٰ (افسانہ) مارچ "
۶۔ بے وقت آمد (نظم) جولائی "
۷۔ شہر کی رانی (نظم) جنوری ۱۹۴۳ء
۸۔ جانے کون (نظم) مئی "
۹۔ شاہراہ حقیقت (نظم) اگست "
۱۰۔ ایک دوست کی خودکشی پر (نظم) مئی ۱۹۴۴ء
۱۱۔ آنکھ بچولی (ڈراما) جولائی ۱۹۴۵ء
۱۲۔ چھرولے (نظم) اکتوبر "
۱۳۔ کمبل (نظم) مارچ ۱۹۴۶ء
۱۴۔ غزل اکتوبر "

"ادب لطیف" بابت مئی ۱۹۴۱ء میں جو قطعات شایع ہوئے تھے ان میں سے دو کے سوا باقی سب "رم جھم" کے چھٹے ایڈیشن میں شامل ہیں۔ ان قطعات کے عنوانات یہ ہیں:
تنبیہ، نظام نو، چارہ ساز، درگزر، ساحل نشین۔
وہ دو قطعات جو "رم جھم" میں شریک نہیں ہیں ہوسکتا ہے کہ ان کے دوسرے مجموعے "دھڑکنیں" میں چھپے ہوں۔ مجھے یہ مجموعہ نہ مل سکا، اس لیے ان قطعات کو پیش کر رہا ہوں ؎

میرے ہونے میں کیا زیاں تیرا　　　روندتا ہے مجھے جہاں تیرا
مجھ سے دوری تجھے نہیں پھبتی　　　میں تو ہوں ایک ترجماں تیرا

کس قدر ہے بلند میرا مقام　　　نقش پا ہے مرا یہ ماہ تمام
عرش کے آس طرف ہے میرا وطن　　　میرے مذہب میں جنت ہے حرام

نظم "کیا کر رہا ہوں" ان کے مجموعہ کلام "جلال و جمال" کے صفحہ ۱۵۵ پر "میں زندہ ہوں" کے عنوان سے شایع ہوئی ہے۔ لیکن آخری شعر حذف کر دیا گیا ہے۔ جو یہ ہے ؎

تو ہی بتا ندیم کہ دنیا سمجھ سکے
کیا کر چکا ہوں اور یہ کیا کر رہا ہوں میں

"ایک دوست کی خودکشی پر" "جلال و جمال" کے صفحہ [illegible] پر "ایک [illegible]" کے عنوان سے شریک ہوئی ہے۔ شہر کی رانی، جانے کون، چھرولے اور کمبل یہ نظمیں "جلال و جمال" کے صفحہ ۱۵۵، ۱۸۲، ۲۱۴ اور ۲۴۲ پر درج ہیں۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء کے بعد سے "ادب لطیف" جناب احمد ندیم قاسمی کے شریک [illegible]

سے محروم ہوگیے اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی بند ہوگیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو جس کا اظہار قاسمی صاحب نے "رم جھم" (۱۹۵۲ء) کے "سرآغاز" میں کیا ہے:

"۔۔۔ دراصل ۱۹۴۶ء کے بعد اب تک کی زندگی کچھ ایسی افراتفری میں گذری ہے کہ میں اس نہایت حسین صنفِ شعر کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو سکا۔"

اس افراتفری کے نتیجے کے طور پر ہماری خط و کتابت یک لخت بند ہوگئی۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں سقوطِ حیدرآباد کے بعد میں بھی ذہنی الجھنوں میں مبتلا رہا۔ ۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۷ء مسلسل گیارہ برس تک ایک کو دوسرے کی خبر نہ ہوسکی لیکن میرے دل پر قاسمی صاحب کے خلوص و محبت کے گہرے نقوش مرتسم ہو چکے تھے جو مٹائے نہیں مٹ سکتے تھے۔

اگست ۱۹۵۶ء میں پہلی مرتبہ میں اپنے عزیزوں سے ملنے کی غرض سے سمندر کے رستے کراچی آیا تھا۔ جب واپسی کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ سمندری جہاز کے بروقت نہ مل سکے گا۔ اس سے مجھے پریشانی لاحق ہوئی کیونکہ مجھے عثمانیہ یونیورسٹی میں سالانہ چھٹیوں کے فوراً بعد اپنی ملازمت پر حاضر ہونا ضروری تھا۔ اب مجھے ٹرین کا سفر اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ چنانچہ میں کراچی سے لاہور پہنچا۔ لاہور سے امرتسر جانے والی ٹرین تین چار گھنٹے بعد روانہ ہونے والی تھی۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لاہور کے احباب سے ملنے کے لیے چل کھڑا ہوا۔ لاہور میرے لیے بالکل نیا تھا، رستوں سے ناواقفیت کے باوجود پوچھتے پاچھتے پاکستان ٹائمز کے دفتر پہنچ گیا اور جناب احمد ندیم قاسمی صاحب سے ملاقات کرنے کی میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ جناب فیض احمد فیض دفتر میں موجود نہیں تھے اس لیے ان کا دیدار نصیب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد اپنے عزیز دوست جناب حبیب اللہ اوج سے "امروز" کے دفتر میں ملا۔ پھر حضرت احسان دانش کے مکتبہ دانش مزنگ پر حاضری دی۔ وہ کسی کام سے یونیورسٹی گئے ہوئے تھے اس لیے ملاقات سے محروم رہا۔

جناب احمد ندیم قاسمی کا علمی و ادبی دنیا میں جو مقام ہے اس سے کون واقف نہیں؟ وہ ایک بلند پایہ شاعر، صاحبِ طرز افسانہ نگار، کامیاب ڈرامہ نویس اور روشن دماغ صحافی ہیں۔ دو درجن کے قریب کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ہر کتاب کے ایک سے زاید ایڈیشن شایع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکے ہیں۔ ان کی زندگی اور شاعری میں گہرا ربط ہے۔ دنیا کے نشیب و فراز اور خارجی ماحول کے اثرات نے ان کو زندگی کے حقایق سے قریب تر کر دیا ہے۔ ان کا موضوعِ سخن زندگی ہے جو نکہت فشاں، رقصاں، جوان، نیک کردار، تند ہے اور بے بس، بے چین، افسردہ اور سرگراں بھی۔ وہ ایک شائستہ انسان، سنجیدہ شاعر اور شگفتہ بیان ادیب ہیں۔ ان کے اسلوبِ بیان اور طرزِ نگارش میں ایک انفرادیت ہے جس نے ان کی تحریروں کو ممتاز بنا دیا ہے۔ انسان دوستی ان کی شاعری کا محور ہے۔ وہ انسانیت کے ہر دکھ کو اپنا ذاتی دکھ سمجھتے ہیں۔ اور یہ احساس ان کی فکر اور شخصیت میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ اس کو ان کی ذات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی اقدار، خدا ترسی، خدا پرستی اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے وہ علم بردار ہیں۔ ان کی شخصیت میں ترقی پسندی اور قدامت پرستی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ جس معاشرے میں انھوں نے آنکھیں کھولی ہیں اس کے حسن و قبح پر ان کی گہری نظر ہے۔ کسی مسئلے پر رائے زنی کرتے وقت صحت و توازن کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے ادب اور معاشرے میں ان کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

موجودہ دور کے صفِ اول کے دانشوروں اور فن کاروں میں جناب احمد ندیم قاسمی کے نام کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان و ادب کے ایک معمار کی حیثیت سے ان کی خدمات کا اعتراف بہرحال ضروری تھا۔ یہ زمانے کی ستم ظریفی ہے کہ ہم کو اپنے باکمالوں کی قدر و منزلت کرنے کا اُس وقت خیال آتا ہے، جب ہماری تعریف و تحسین کے فلک شگاف نعرے ان کو ابدی نیند سے جگا نہیں سکتے اور وہ ہماری ہر حق سے بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ زندہ قوم کے افراد اپنے محسنوں کی خدمات کا اعتراف اُن کی زندگی ہی میں کرتے ہیں۔ یہ شخصیت پرستی نہیں بلکہ اعترافِ حقیقت ہے۔ جناب صہبا لکھنوی مدیر افکار ساری اردو دنیا کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے مردہ پرستی کے بُت کو پاش پاش کرکے زندہ شخصیتوں پر "افکار" کے خاص نمبر بڑی محنت و کاوش اور خاص اہتمام سے شایع کیے جو اپنی افادیت اور اہمیت کے لحاظ سے کسی ادبی شہ پارے سے کم نہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ افکار کا "احمد ندیم قاسمی نمبر" بھی اپنا جواب آپ ہوگا۔

جناب احمد ندیم قاسمی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور ملاقات کرنے کے مجھے بہت کم مواقع ملے۔ پاکستان آنے کے بعد گزشتہ پندرہ سولہ برسوں میں میری ان سے صرف چار پانچ ملاقاتیں ہوئیں وہ بھی بہت ہی مختصر۔ البتہ ایک بار اُن کے ساتھ چند گھنٹے گزارنے کا موقع ملا۔ ۲۰ رفروری سنہ ۱۹۷۶ء کو ان کے اعزاز میں ایوانِ اردو کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا تھا۔ جس میں کراچی کے بیشتر ادیب، و شاعر شریک تھے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

محترمہ ہاجرہ مسرور، ڈاکٹر معین الحق، پروفیسر ممتاز حسین، ابراہیم جلیس، خواجہ معین الدین مرحوم، مرزا ظفر الحسن، سید بادشاہ حسین، مجیب خیرآبادی، تحسین سروری، عبدالرؤف عروج۔ اس پُر لطف صحبت کی یاد اب تک میرے دل میں تازہ ہے۔ کیونکہ مجھے پہلی مرتبہ ان کی شخصیت کی عظمت اور کردار کی بلندی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

مجھے اس بارے میں کچھ لکھنا نہیں ہے کہ جناب احمد ندیم قاسمی کا اردو ادب میں کیا مقام ہے۔ میں تو صرف ان کے خطوط کے آئینے میں ان کی شخصیت اور کردار کی ہو بہو تصویر دکھانا چاہتا ہوں کیونکہ میں نے ان کے خطوط میں ان کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے مکاتیب میں بے نقاب ہو جاتا ہے خواہ کوئی اپنے آپ کو لاکھ چھپانا چاہے۔ اس کی تحریر اس کے دلی جذبات اور کردار کی غمازی کرتی ہے۔ خط لکھتے وقت آدمی محتاط نہیں رہتا کیونکہ مکتوب الیہ اس کا دوست ہوتا ہے اور دوست سے کوئی بات چھپائی نہیں جاتی۔ اسے یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ اس کے خطوط کو مکتوب الیہ محفوظ رکھے گا اور کسی نہ کسی وقت ان کی اشاعت عمل میں آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ خطوط نگاری میں تصنع، تکلف اور ادبیت سے زیادہ شخصی اور ذاتی حسن و قبح کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

قاسمی صاحب نے میرے پہلے خط کے جواب میں یہ مکتوب روانہ فرمایا تھا:

بیرون لوہڑ دروازہ

ملتان شہر ۲۰ رمارچ سنہ ۱۹۶۱ء

محترمی تسلیم!

گرامی نامہ اور سب رسالے۔ یاد فرمائی کا بے حد ممنون ہوں۔ پرچہ مجھے بے حد پسند آیا ہے اور مجھے اس میں قدیم و جدید ادب کے ایک خوش گوار امتزاج کی ایک ایسی جھلک نظر آئی

جو آج کل نام نہاد ترقی پسند پرچوں کے صفحوں میں سے بہت تیزی سے غائب ہو رہی ہے۔ آپ کی یہ روش قابلِ ستائش ہے۔

میں انشاء اللہ ہر ماہ سب رس کی قلمی امداد کرتا رہوں گا۔ فی الحال ایک نظم ارسالِ خدمت ہے، قبول فرمائیے۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا

احمد ندیم قاسمی

اس کے تین ماہ بعد جو خط مجھے لکھا تھا اس میں انھوں نے مجھے میرے نام سے مخاطب فرمایا ہے جس سے ان کے خلوص و محبت اور ربط باہمی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس زمانے میں غالباً وہ محکمۂ آبکاری سے منسلک تھے۔ سرکاری مصروفیتوں کے باوجود اپنے رشحاتِ قلم سے سب رس کو نوازتے رہتے تھے اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سب رس ان کو کتنا عزیز تھا اور اس کے لیے انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہ خط ملاحظہ فرمائیے:

بیرون لوہاری دروازہ

ملتان شہر ۱۱ ستمبر ۴۲ء

محترم و مکرم خواجہ صاحب تسلیم و نیاز

میں شرمندہ ہوں کہ اس سے قبل آپ کے گرامی نامے کا جواب پیش خدمت نہ کر سکا۔ دراصل چند عزیزوں کی علالت اور محکمانہ مصروفیتوں نے ایک دم چین نہ لینے دیا۔ معذرت خواہ ہوں۔

آپ کے ارشاد کے مطابق میں نے برادرم سعادت حسن منٹو سے سب رس کی قلمی امداد کے متعلق خط و کتابت کی۔ لیکن انھیں دنوں ان کا نوجوان صاحبزادہ عارف وفات پا گیا اور چونکہ وہ بے حد حساس اور زود رنج ہیں اس لیے ان پر اس سانحہ کا ایسا اثر پڑا کہ اب تک بسترِ علالت پر ہیں اور مجھے خط بھی لکھتے ہیں تو بہت دیر سے۔ جب وہ اچھے ہوں گے تو میں پھر گفتگو کروں گا۔

سب رس کے لیے ایک نظم ارسالِ خدمت ہے، قبول فرمائیے۔ یہ بالکل تازہ نظم ہے اور مجھے بہت عزیز ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کی گراں بہا خدمات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں اور ساتھ ہی افسوس کرتا ہوں کہ میں دکن سے اس قدر دور ہوں۔

آپ کا احمد ندیم قاسمی

تیسرے خط میں مجھے "برادرم" کے اعزاز سے سرفراز فرمایا۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ واقعی ایک بھائی دوسرے بھائی کو لکھ رہا ہے۔ اپنی علالت کا ذکر ہے، عیادت کا شکریہ ہے، صحت کے لیے دعا طلبی ہے سب سے بڑھ کر اپنے ادبی کاموں سے آگاہی بخشی گئی ہے:

بیرون لوہاری دروازہ

ملتان ۔۔۔ ستمبر ۱۹۴۳ء

برادرم السلام علیکم

گرامی نامہ ملا، یاد فرمائی اور عیادت کا شکریہ! میں ہنوز اسی طرح بیمار ہوں، دعا فرمائیں ۔۔۔۔۔

ستمبر کا پرچہ مجھے مل گیا ہے۔ اکتوبر کے سب رس کا منتظر ہوں۔ ایک نظم ارسالِ خدمت ہے قبول
فرمائیے۔ میں آج کل ہندوستان کے بڑے بڑے شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کی نگارشات
کو ایک مجموعے کی شکل میں ترتیب دینے میں مصروف ہوں۔ یہ بہت بڑا کام ہے لیکن مجھے میرے
دوستوں اور مہربانوں کا سہارا نا امید نہیں ہونے دیتا۔ اسی ضمن میں آپ بھی میری امداد فرماسکتے ہیں
وہ یوں کہ آپ اپنے اثر سے کام لے کر ڈاکٹر محی الدین صاحب زور سے موجودہ اردو ادب کے متعلق ایک
مختصر سا مضمون لکھوا بھیجیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف مجھے جانتے ہوں گے۔ ان کی خدمت میں میری طرف
سے بصد نیاز یہ گذارش پیش کر دیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے مایوس نہیں فرمائیں گے۔ موجودہ ادب
کو پوری طرح سمجھنے والوں میں ڈاکٹر صاحب کا درجہ بہت بلند ہے۔
لوٹتی ڈاک میں آپ کے تسلی بخش جواب کا منتظر رہوں گا۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ — مخلص احمد ندیم قاسمی

چوتھے خط میں ڈاکٹر زور صاحب کے مضمون سے متعلق یاد دہانی کی گئی ہے۔ اور زیرِ ترتیب مجموعے کے مضمون
نگاروں کے ناموں کی تفصیل لکھی ہے۔ کتاب کے مندرجات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ وہی ادیب کرسکتا ہے جس کو اپنے
دوستوں پر کامل اعتماد ہو اور شعر و ادب کا سچا ذوق رکھتا ہو۔ اس خط کو پڑھ کر آپ بھی کچھ محسوس فرمائیں گے۔

ملتان ۲۶ ۱۰/۴۱

محترم و مکرم السلام علیکم!

بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے جناب ڈاکٹر صاحب[1] کی خدمت میں میری معروضات پیش
کردیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور میری امداد فرمائیں گے۔ یہ مجموعہ جنوری کے اوائل میں پریس میں جائے گا
چونکہ یہ سلسلہ جنبانی ابھی ابھی شروع ہوئی ہے۔ اس لیے فی الحال جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب
نے اپنا مضمون، جناب شاہد احمد صاحب دہلوی نے ڈرامہ، محمد حسن عسکری، منٹو اور شفیق الرحمٰن نے
اپنے افسانے اور اختر شیرانی، حامد علی خاں اور مجاز نے اپنی نظمیں بھیجی ہیں۔ جناب فراق گورکھپوری صاحب
نے ایک مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے نیز پروفیسر فیض احمد صاحب کے مضمون کی توقع ہے۔ مضامین کے
عنوان میں نے مقرر نہیں کیے۔ یہ لکھنے والے کی مرضی پر موقوف۔ موجودہ رجحانات کے مطابق وہ خود
ہی موضوع کا انتخاب فرمالیں گے۔ شعرا اور افسانہ نگاروں میں ان پر اردو کو ناز ہے اور ناز رہے گا۔
مضمون نگاروں کی فہرست میں مندرجۂ ذیل اصحاب ہیں۔
(۱) ڈاکٹر زور صاحب (۲) پروفیسر فراق گورکھپوری (۳) پروفیسر حمید احمد خاں (۴) پروفیسر
فیض احمد صاحب (۵) ن۔م راشد ایم۔اے (۶) مولانا عبدالمجید سالک مدیر انقلاب۔

۱؎ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

مجھے یقین ہے کہ میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب سے بھی ایک مضمون حاصل کر لوں گا۔ جناب ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں تاکیداً عرض کریں کہ ان کے مضمون کے بغیر میری کتاب میں ایک ایسا خلا پیدا ہو جائے گا جو ہر پڑھنے والے کو کھٹکے گا۔ موجودہ اردو ادب کے متعلق ان کی رائے صائب ترین ہے۔ اگر آپ اُن کا پتہ مجھے تحریر کریں تو بڑا احسان ہوگا۔ میں دو ماہ کی رخصت پر اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔ اس لیے مجھے 'سب رس' بھی مندرجہ ذیل پتہ پر بھیجئے۔ اور اس عریضے کا جواب بھی۔

ندیم معرفت پیرزادہ محمد بخش قاسمی بی۔ اے بی۔ ٹی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ ضلع سرگودھا (پنجاب)

میں آپ کے تسلی بخش گرامی نامے کا شدت سے انتظار کروں گا۔ قبلہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں نیاز!

اُمید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام　　نیاز کیش احمد ندیم قاسمی

یہ خط گزشتہ خطوط کے تقریباً ۴ سال بعد کا ہے۔ اس میں دماغی الجھنوں اور بیماری کا ذکر کیا گیا ہے۔ غالباً وہ اس زمانے میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ قاسمی صاحب نے سب رس کے لیے ہمیشہ بلا معاوضہ لکھا۔ سب رس کی مالی حالت اس قابل نہ تھی کہ کوئی اعزازیہ ان کی خدمت میں پیش کیا جاتا۔

انگہ۔ تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا (پنجاب)

۲۶ رمئی ۱۹۴۵ء

برادر محترم، سلام مسنون

بے حد شرمندہ ہوں کہ اتنے عرصے سے نہ آپ کو خط لکھ سکا اور نہ 'سب رس' کے لیے کوئی چیز پیش کر سکا۔ عفو خواہ ہوں اور مجھے امید ہے کہ میری مجبوریوں کے مدنظر آپ درگزر سے کام لیں گے یکم ستمبر ۱۹۴۴ء سے دل و دماغ کے چند خطرناک عوارض میں مبتلا ہوں۔ لاہور میں محض اس لیے پڑا رہا کہ 'ادب لطیف' کے مقدمات بھگتنے لگیں۔ ۲ مئی کو مجھے اور منٹو کو بری کر دیا گیا اور میں فوراً اپنے گاؤں آ گیا۔ سخت کمزور ہوں۔ لکھنا پڑھنا مدت سے چھوٹ چکا ہے، محض وقتی دلچسپی کے لیے ادب لطیف کی ادارت کا کام کرتا رہا ہوں مگر اب شاید ہی وہ بھی جاری رکھ سکوں۔ یہاں گاؤں میں موسم گرما گزاروں گا۔ میرا پتہ مستقل طور پر بدل دیں تاکہ سب رس باقاعدہ ملتا رہے۔ پتہ میں نے اوپر درج کر دیا ہے۔ میری صحت کے لیے دعا فرمائیں، بہت ناکارہ ہو چکا ہوں۔

سب رس کے لیے دو چیزیں ارسال ہیں۔ ایک تو ڈرامہ ہے جسے نقل کرانے میں اتنی تاخیر ہوئی کہ آپ کے گرامی نامہ کا وقت پر جواب نہ دے سکا۔ آج ہی میرے دو عزیز اسے نقل کر کے آئے ہیں۔ مسودہ حاضر ہے۔ میرا نہایت اچھا ریڈیائی ڈرامہ ہے، امید ہے آپ پسند کریں گے ـــــ دوسری چیز تازہ قطعات ہیں، میری یہ کتاب مہینے ڈیڑھ مہینے کے اندر چھپ جائے گی۔ اگر انھیں سب رس کی کسی قریبی اشاعت میں نمایاں مقام پر شائع کریں تو احسان ہوگا۔ یہاں سے بھی سب رس کے لیے انشاءاللہ باقاعدہ لکھتا رہوں گا، تندرست ہو لوں، فی الحال تو کسی کام کے قابل نہیں ہوں۔

تین چار سال ہوئے آپ نے محترمی ڈاکٹر زور صاحب سے مجھے قطب شاہی دور کی زبان کے عنوان سے ایک مقالہ دیا تھا۔ کیا وہ چھپ چکا ہے؟ اگر نہیں تو میں اُسے استعمال میں لے آؤں، امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

آپ کے گرامی نامے کا سخت انتظار رہے گا۔ والسلام　　آپ کا بھائی، احمد ندیم

میرزا ادیب

کچھ باتیں۔ کچھ یادیں

اگر آج کوئی شخص پنجاب ’بک ڈپو‘ میں جا کر ادبِ لطیف ‘ کے نوادر ڈھونڈنے کی کوشش کرے اور اسے خوش قسمتی سے ایک سرخ رنگ کا رجسٹر مل جائے تو وہ اُس کی پیشانی پر لکھا ہوا پائے گا ”ادبِ لطیف کے قلمی معاونین“ پہلا ورق خالی ہوگا دوسرے ورق پر سب سے پہلا نام حکیم احمد شجاع دیکھے گا۔ حکیم صاحب مرحوم نے چودھری برکت علی کو ایک ادبی پرچے کی اشاعت کی طرف توجہ دلائی تھی اور اس کا نام ادبِ لطیف۔ انھوں نے ہی تجویز کیا تھا۔ حکیم صاحب کے نام کے نیچے طالب گنوری کا نام ہوگا۔ طالب گنوری اس زمانے میں حکیم صاحب کے صاحبزادے انور پاشا کے اتالیق تھے اور ’ادبِ لطیف‘ کا اولیں شمارہ طالب صاحب نے مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد قاضی عبدالغفار کے حروف نظر آئیں گے۔ اس نام سے نظر ہٹ کر نیچے جائے گی تو دیکھنے والا یہ الفاظ پڑھے گا۔ پیرزادہ احمد ندیم قاسمی۔ آگے پتہ درج ہوگا۔ انگہ تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا۔

پیرزادہ احمد ندیم قاسمی!۔۔۔ جی ہاں۔ آج کے احمد ندیم قاسمی اس دور کے پیرزادہ احمد ندیم قاسمی تھے۔

ادبِ لطیف کے ’نوادر‘ کا ذکر آیا ہے تو ڈھونڈنے سے وہ سالنامہ بھی مل سکتا ہے جس کے ابتدائی دو صفحات پر ادیبوں اور شاعروں کے فوٹو چھپے تھے۔ شاید دوسرے صفحے پر جو تصویر دکھائی دے گی اس کا ’حلیہ‘ کچھ یوں ہوگا۔ ایک دبلا پتلا لمبوترا چہرہ۔ اور یہ چہرہ خصوصی طور پہ لمبوترا اس وجہ سے بھی نظر آتا ہے کہ اس کے سر پر ایک پگڑی بندھی ہے جس کے درمیان میں سے کلاہ اپنے وجود کا شدت سے احساس دلا رہا ہے۔ اس چہرے پر نظر ڈالتے ہی ذہن میں خیال آتا ہے کہ یہ کوئی دیہاتی ہے۔

اس تصویر کے نیچے لکھا ہوگا ’پیرزادہ احمد ندیم قاسمی۔

پیرزادہ صاحب اس وقت سرگودھا میں تھے اور میں ادبِ لطیف کے دفتر میں۔ میرا کام تھا ادبِ لطیف کے مدیرانہ فرائض ادا کرنا اور پیرزادہ صاحب ازراہِ نوازش کم و بیش ہر شمارے کے لیے اپنی ایک تازہ نظم اور ایک افسانہ بھیجتے تھے۔ دونوں چیزیں التزاماً شایع ہوتی تھیں اور یہ سلسلہ مدت تک جاری رہا تھا۔

میں خط لکھتا تھا تو انھیں برادرِ محترم کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور وہ اپنی تحریروں کے ساتھ جو چند سطریں لکھتے تھے ان کے آغاز میں ہوتا تھا ’برادرِ مکرم‘۔ ہمیں ایک دوسرے سے برادرانہ محبت تھی۔ مگر اس برادرانہ محبت کے باوصف مجھے جب کبھی اد۔

جہاں کہیں ان کا نام استعمال کرنا پڑتا تھا تو پیرزادہ احمد ندیم قاسمی ہی لکھتا تھا۔ سوچتا تھا کہ اگر ان کے نام کا کوئی جزو کم کر دیا تو یہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی اور وہ یقیناً بُرا مانیں گے۔

پھر ایک دن آیا کہ انھوں نے اپنے سر سے پگڑی اور اپنے نام کے سر سے پیرزادگی کا زریں تاج الگ کر دیا۔ اب وہ صرف احمد ندیم قاسمی تھے۔ اور میں انھیں اسی نام سے خط وکتابت میں مخاطب کرتا تھا۔ یہ تین جزو کا نام مجھے کافی طویل معلوم ہوتا تھا۔ چاہتا تھا کہ انھیں برادرِ محترم کی بجائے ندیم بھائی لکھوں اور ایک روز ــــ

یہ دن تو اپنے تمام اجزا کے ساتھ میرے ذہن میں زندہ ہے۔

یہ قیامِ پاکستان سے پہلے کا ذکر ہے۔ میں بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں رہتا تھا۔ یہ وہی بازار حکیماں ہے جسے حکیم احمد شجاع نے لاہور کا 'چیلسی' کہا ہے۔ اس بازار اور اس بازار کے گردونواح میں کئی مشاہیر اپنی پوری زندگی کا کچھ حصّہ گزار چکے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر اقبال، سر عبدالقادر، حکیم احمد شجاع اور آغا حشر۔ تو میں اس بازار میں رہتا تھا۔ ایک دن گھر سے نکل کر بھاٹی دروازے کی طرف جا رہا تھا کہ کانوں میں آواز آئی۔

"میرزا صاحب"

میں نے مڑ کر دیکھا ــــ

"آپ!ــــ"

"جی ــــ چند روز سے اپنے بھائی صاحب کے ہاں ہوں کل سرگودھا واپس چلا جاؤں گا۔"

"آپ یہاں کہاں رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا

احمد ندیم قاسمی صاحب مجھے اس جگہ لے گئے جسے آج بھی "شیش محل" کہتے ہیں۔ اسے شیش محل کہنے کی غالباً وجہ یہ ہے کہ اس روڈ کے ابتدائی حصے میں ایک بڑی پرانی اور شاندار عمارت سر اٹھائے کھڑی ہے۔ اس عمارت کی چھتوں پر شیشے جڑے تھے۔ معلوم نہیں آج بھی ہیں یا نہیں۔ یہاں کرکٹ کے مشہور کھلاڑی عبدالحفیظ کاردار کا خاندان رہتا ہے۔ اس وقت عبدالحفیظ کاردار بھی یہیں رہتے تھے۔

اس شاندار حویلی یا عمارت کے سامنے چودھری برکت علی کا مکان واقع تھا۔ اس مکان میں چودھری صاحب کے علاوہ چودھری نذیر احمد اور ان کے بھائی بھی رہتے تھے۔ انہی بھائیوں میں سے ایک اس وقت پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ ہیں۔ اور حنیف رامے کہلاتے ہیں۔

تو میں ذکر کر رہا تھا کہ اس روز احمد ندیم قاسمی مجھے شیش محل کی ایک گلی میں لے گئے۔ اور چند منٹ بعد ہم دونوں ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ کمرہ بڑا سادہ تھا۔ ایک طرف ایک چارپائی تھی اور اسی چارپائی پر ہم بیٹھے تھے۔

اس روز مجھے معلوم ہوا کہ ندیم صاحب جس ہستی کو اپنا بھائی صاحب کہہ رہے ہیں ان سے مجھے بڑی عقیدت ہے اور ہمیشہ سے ہے۔

حضرت مولانا غلام مرشد۔ میں ان کے حلقۂ ارادت میں اس وقت داخل ہوا تھا جب یہ بھاٹی دروازے کی اونچی مسجد میں بطور خطیب کے تشریف رکھتے تھے۔ جمعہ کے روز میرے ابا مرحوم دس بجے ہی مجھے اس مسجد میں لے جاتے تھے اور جب

جمعہ کی نماز ختم ہو جاتی تھی تو مجھے چھٹی ملتی تھی۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مولانا غلام مرشد کا وعظ سُن سُن کر مجھے اسلامی کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا اور میں نے اس دوران درجنوں ایسی کتابیں پڑھ ڈالیں جن کا تعلق اسلامی تاریخ، تعلیم اور تہذیب سے تھا۔ تو اس روز ہم دونوں کئی گھنٹے مولانا غلام مرشد کے مکان کے ایک کمرے کی چارپائی پر بیٹھے رہے —
ندیم صاحب نے اپنی کئی نظمیں سُنائیں۔
ایک نظم کی بحر میری سمجھ میں نہ آئی۔

"اس نظم کی بحر کیا ہے ندیم صاحب!" میں نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا!" —

"آپ نے نظم کیسے کہی ہے؟"

"جیسے دوسری نظمیں کہی ہیں!"

"آپ علم عروض ———"

"جی نہیں —"

"پھر کیسے شعر کہہ لیتے ہیں؟"

"بس کہہ لیتا ہوں — شعر کہتے وقت مجھے احساس رہتا ہے کہ یہ مصرع جو میں نے کہا ہے، موزوں ہے — اور اس احساس کے ساتھ مصرعے ہوتے رہتے ہیں — میں نے علم عروض کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی"

اس روز طے ہوا کہ میں ندیم صاحب سے ملنے انگہ، تحصیل خوشاب، ضلع سرگودھا جاؤں گا۔

چار دن گزرے ہوں گے کہ ندیم صاحب کا خط آیا۔

برادر مکرم۔

"آپ یہاں آ کر کیا کریں گے۔ روشنی ہی نہیں اور آج کل ماحول بھی ٹھیک نہیں — میں آپ کو مطلع کر دوں گا کہ میرے غریب خانے پر کب تشریف لائیں —"

اور ندیم صاحب نے یہ اطلاع آج تک نہیں دی۔

ہاں تو کہنا یہ ہے کہ اس طویل ملاقات کے بعد میں انھیں "برادر محترم" کی بجائے "ندیم بھائی" لکھنے لگا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل سے کوئی بوجھ اُتر گیا ہے۔

اسی زمانے کے قرب و جوار کا ایک اور واقعہ مجھے یاد ہے:-

اختر شیرانی مرحوم کے ایک عقیدت مند اور دوست مصری شاہ میں رہتے تھے۔ نام غالباً علی محمد تھا۔ مدت ہوئی نظر نہیں آئے خدا جانے کہاں ہیں۔ یہ برق صاحب اختر صاحب کا مجموعہ کلام شایع کرنے کے آرزومند تھے مگر اختر صاحب تھے کہ اپنی نظمیں فراہم ہی نہیں کرتے تھے۔

آخر برق صاحب کے پیہم اصرار پر اختر صاحب نے ایک مجموعہ مکمل کر ہی لیا۔ برق صاحب نے اس خوشی میں انھیں گھر پر بلایا اور کہا کہ آپ کو ایک نہایت لذیذ شے کھانے کو دوں گا۔ اور وہ اختر صاحب کو اپنے یہاں لے جانے کے لیے قلعہ گوجر سنگھ میں اختر صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ اتفاق سے اس وقت میں اور ندیم صاحب — دونوں اختر صاحب کے پاس بیٹھے

تھے۔ اختر صاحب انہیں بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔

کچھ دیر بعد وہ نہایت لذیذ شے آگئی۔ دودھ میں پکی ہوئی بڑی مزے دار میٹھی سویاں تھیں۔

اختر صاحب نے سویوں کی ورق لگی پلیٹ دیکھی تو یوں منہ بنایا جیسے یہ چیز انھیں پسند نہیں۔ گرمی اور ندیم صاحب کی بن آئی۔ دونوں نے اختر صاحب کی پلیٹ بھی خالی کردی۔

اس روز ندیم صاحب نے بتایا کہ مجھے سب سے زیادہ حلوہ پسند ہے۔ اور یہی چیز میری کمزوری بھی ہے۔ گویا حلوہ پسندی کی وجہ سے ہم دونوں ایک دوسرے کے اور قریب ہوگئے۔ اس دعوت میں اختر صاحب نے نہ جانے کیا کھایا اور کیا پیا۔ غالباً کھایا کچھ نہیں۔ کوئی چیز لی اور جب یہ چیز پینے لگے تو ہم سے دور جا بیٹھے۔ واپسی پر اختر صاحب، میں اور ندیم صاحب تانگے پر بیٹھے اور تانگہ نیمنگ روڈ پہ پہنچ گیا۔

نیچے اترے تو میں نے اور ندیم صاحب نے اپنی اپنی جیب میں ہاتھ ڈال دیئے۔

"میں دیتا ہوں" میں نے کہا

"نہیں ــــ میں دیتا ہوں" ندیم صاحب بولے

اختر صاحب نے خود ہی کرایہ ادا کردیا۔ اور ہم دونوں ان سے رخصت ہو کر میکلوڈ روڈ کی طرف جانے لگے۔

میں نے کہا۔ "ندیم صاحب! آج تو کمال ہوگیا"

"کیا ہوا؟" انھوں نے پوچھا

"میں کرایہ ادا کرنے لگا تھا اور جیب میں صرف ایک آنہ ہے"

ندیم صاحب مسکرانے لگے۔

"اور میری جیب میں تو ایک آنہ بھی نہیں ہے"

"اگر اختر صاحب اپنا ہاتھ روک لیتے تو ــــ"

ہم دونوں ہنس پڑے۔

ایک اور چھوٹا سا واقعہ یاد آگیا ہے۔

ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور لکھنؤ سے جیوانی آ کر لاہور کی نسبت روڈ پر دیال سنگھ پبلک لائبریری کے عقب میں رہنے لگی تھیں۔ اُن کی والدہ اور بہن بھائی بھی وہیں رہتے تھے۔ جب یہ خاندان لاہور میں آیا تو اس کا کوئی سہارا اور آسرا نہیں تھا۔ ندیم صاحب نے ہاجرہ اور خدیجہ کی ایک حقیقی بھائی کی طرح دستگیری کی اور ہر طرح معاونت کرتے رہے۔

ہاجرہ مسرور کی شادی تھی اور ندیم صاحب کچھ پریشان نظر آتے تھے۔ تھوڑے دنوں بعد ہی ان کی پریشانی کی وجہ معلوم ہوگئی۔ اصل میں مالی مسئلہ انھیں پریشان کر رہا تھا۔ شادی بڑی سادگی سے ہونے والی تھی، مگر سادہ سے سادہ شادی پر بھی کچھ نہ کچھ خرچ تو ضرور ہوتا ہے۔

ایک شام میں دفتر سے نکل رہا تھا کہ مجھ سے ملے اور کہنے لگے:

"چودھری صاحب نے ہاجرہ، خدیجہ اور میرے افسانوں کے مجموعے چھاپنے کے لیے لے لیے ہیں؟"

"جی ہاں"

"رقم چاہیے اور فوراً"

میں نے چودھری صاحب سے بات کی۔ انھوں نے کہا۔

"اس وقت دو کتابوں کا معاوضہ ادا کر سکتا ہوں۔" میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ ندیم صاحب بعد میں وصول کر لیں گے۔

دوسرے روز ملے تو میں نے چودھری صاحب کے فیصلے سے انھیں مطلع کر دیا۔

"میرا معاوضہ بھی ساتھ دیں۔"

"آپ بعد میں ——"

"ہاجرہ کی شادی اب ہے۔ بعد میں مجھے کیا ضرورت ہوگی۔"

اور میں جانتا ہوں کہ ندیم صاحب نے معاوضے کی رقم میں سے ایک پائی بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کی تھی جتنی رقم ملی تھی ساری کی ساری اس شادی پر خرچ کر دی تھی۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے — مگر یہ چھوٹا سا واقعہ ہرگز نہیں — اس واقعے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ندیم بھائی دوسروں کے لیے کتنی قربانی کر سکتے ہیں۔

میری ندیم صاحب سے دوستی بہت پرانی ہے۔ اتنی پرانی کہ اس کے بطن سے کم از کم چھتیس برس کی سیاہیاں اور اجالے گزر چکے ہیں۔ اس درمیان میں ہمارے درمیان اختلافات بھی پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ترقی پسند تحریک نے بڑی شدت اختیار کر لی تھی۔ میں اس تحریک کو [illegible] تھا۔ اسے اردو ادب کی سب سے بڑی اور سب سے صحت مند تحریک سمجھتا تھا — اب بھی سمجھتا ہوں، لیکن کچھ باتیں ایسی تھیں جو میری نظر میں کچھ غیر ادیبوں کی انتہا پسندی کی پروردہ تھیں اور میں ان باتوں کو تحریک کے حق میں براہِ راست نقصان دہ سمجھتا تھا —— ندیم صاحب مجھ سے ہم آہنگ نہیں تھے۔ میں نے ادبِ لطیف میں اپنے نظریے کا اظہار کرتے ہوئے انتہا پسندی کی مخالفت کی۔ ندیم صاحب نے "سویرا" میں ایک طویل مضمون لکھا اور میری مخالفت میں جو کچھ لکھ سکتے تھے لکھا!

یہ سب کچھ ہوا —— مگر ہماری محبت، ہماری دوستی اور ہمارے باہمی تعلقات کا رنگ اب تک اسی طرح چمک رہا ہے جس طرح ادبِ لطیف کے ابتدائی زمانے میں تابناک تھا —— اس پر ذرا بھی کوئی گرد و غبار نہیں ہے۔

مسافروں سے کہو رات سے شکست نہ کھائیں
میں لا رہا ہوں خود اپنے لہو سے بھر کے چراغ — (ندیم)

رات جل اٹھتی ہے جب شدتِ ظلمت سے ندیم
لوگ اس وقفۂ ماتم کو سحر کہتے ہیں — (ندیم)

ابراهیم جلیس

جلاوطن احمد ندیم قاسمی

۵ ۱۹ نومبر ۱۹۷۶ء کی نہایت ٹھنڈی اور برفیلی شام تھی ۔ میں ماسکو کے بین الاقوامی ہوائی اڈے شریمیتوا پر روسی ایروفلوٹ ایویشن ۱۱۰ سے برآمد ہوا تو بیک وقت شدید سردی اور شدت کی گرمی نے میرا استقبال کیا۔ شدید سردی تو ماسکو کی نقطۂ انجماد سے ۳۰ درجے نیچے والی سردی تھی اور شدت کی گرمی میرے روسی میزبانوں کے استقبال، ان کے گرم معانقوں اور حدت بخش مصافحوں میں تھی ۔

میرے ہنس مکھ میزبان مسٹر لوزی کوف نے رسمی تعارف اور استقبال کے بعد یہ خوش خبری سنائی کہ ۔

"آپ اُس شام ماسکو پہنچے ہیں جس شام ماسکو کے "ایوانِ دوستی" میں اردو کے عظیم افسانہ نگار اور شاعر احمد ندیم قاسمی کو خراجِ عقیدت اور گل ہائے تحسین پیش کرنے کے لیے ایک خصوصی تقریب منعقد کی جا رہی ہے ۔ اس لیے آپ پہلے اس تقریب میں شریک ہونا پسند کریں گے یا ہوٹل جا کر کچھ دیر آرام کرنے کو ترجیح دیں گے ؟" ——

میں نے مسٹر لوزی کوف سے کہا ــ

"مجھے نہیں معلوم کہ ہوائی اڈے سے ایوانِ دوستی قریب ہے یا وہ ہوٹل جہاں ہمیں ٹھیرایا جائے گا ۔ لیکن میری دلی خواہش ہے کہ "تقریب احمد ندیم قاسمی" میں شروع سے آخر تک شرکت کروں " ——

مسٹر لوزی کوف نے خوش ہو کر کہا ـ

"آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی ۔ میں نے بھی احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے روسی ترجمے پڑھے ہیں ۔ میں بھی ان کا بڑا مداح ہوں ۔ میں یہ ڈر رہا تھا کہ کہیں آپ پہلے ہوٹل جانے کو ترجیح دیں تو میں بھی اپنے محبوب افسانہ نگار ندیم قاسمی والی تقریب میں شرکت نہ کر سکوں گا یا دیر سے وہاں پہنچوں گا ۔"

ماسکو کے نہایت خوبصورت بین الاقوامی ہوائی اڈے شرمیتوا سے ایوانِ دوستی تک سارے راستے لزی کوف مجھ سے بڑے پُراشتیاق لہجے میں احمد ندیم قاسمی صاحب کے بارے میں پوچھتے رہے کہ

" کیا ندیم قاسمی اتنے ہی خوبصورت آدمی ہیں جتنے کہ وہ اپنے افسانوں اور نظموں میں نظر آتے ہیں ۔؟"

• کیا آپ کی ان سے روز ملاقات ہوتی ہے ؟

کیا ان کی بیوی بھی ادیبہ ہیں ؟

بچے کتنے ہیں ؟

ان کے پاس کار کونسی ہے ۔؟

گھر کیسا ہے ۔؟ وغیرہ وغیرہ ۔"

میں نے مسٹر لزی کوف کے ہر سوال کا نہایت مختصر جواب دیا تھا ۔ لیکن جب ہم ایوان دوستی کے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں داخل ہوئے اور احمد ندیم قاسمی کی قدآدم تصویر کے نیچے پروفیسر گینگوسکی کو احمد ندیم قاسمی کے فن اور ان کی شخصیت پر تقریر کرتے ہوئے سُنا تو میں یقیناً حیران رہ گیا کہ مسٹر گینگوسکی اگر مجھ سے زیادہ احمد ندیم قاسمی سے واقف نہیں تو کم از کم ان کی تقریر میں مسٹر لزی کوف کے مجھ سے پوچھے ہوئے ہر سوال کا نہایت مفصل اور جامع جواب موجود تھا ۔

پروفیسر گینگوسکی کے علاوہ مسٹر دانیلوف اور دیگر خواتین اور مرد روسی نقادوں اور ادیبوں نے روسی زبان میں احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور اُن کے فن پر واقعی بڑے پُرمغز مقالے پڑھے ۔

پھر مجھ سے بھی کہا گیا کہ میں بھی اپنے ذاتی مشاہدات اور تاثرات کی روشنی میں احمد ندیم قاسمی کے بارے میں کچھ بتاؤں ۔ میں نے جواباً کہا ۔

" میں اردو میں عرض کروں گا اور آپ میں سے بہت سے دوست اردو نہیں جانتے ۔"

تو پروفیسر گینگوسکی نے بتایا ۔

" آپ فکر نہ کریں ۔ یہاں حاضرین کی اکثریت اردو جانتی ہے اور اس کے علاوہ ہم نے آپ کے لیے اردو سے روسی میں ترجمہ کرنے والے کا بھی بندوبست کر رکھا ہے ۔"

میں نے قاسمی صاحب کے فن پر تو کچھ بھی نہیں کہا ۔ کیونکہ ہمارے روسی دوستوں نے قاسمی صاحب کے فن پر مجھ سے کہیں زیادہ ناقدانہ کام کیا تھا ۔ البتہ وہ اُس قاسمی کے بارے میں ضرور جاننا چاہتے تھے جو صرف ایک قادر الکلام شاعر اور عظیم افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک عظیم ترین انسان بھی ہے اور جو اپنی ذات کے بارے میں جتنا منکسر المزاج ہے اتنا ہی انسان کے بارے میں اتنا پُرغرور کہ عظمت آدم کے بارے میں خدا سے یوں مخاطب ہوا ۔

انسان عظیم ہے خدایا

میں نے علی گڑھ کی لٹن لائبریری میں ایک دن یونہی تفریحاً احمد ندیم قاسمی کے افسانے "طلائی مہر" کی ابتدائی چند سطریں پڑھیں تو پھر اس افسانے میں ایسا کھو گیا کہ جیسے ہی وہ افسانہ ختم ہوا' میں فی الفور احمد ندیم قاسمی کا گرویدہ ہو گیا۔ اس سے پہلے میں جانتا نہیں تھا کہ احمد ندیم قاسمی کیست؟ ۔ پھر میں نے احمد ندیم قاسمی کے افسانے، قطعات، منظوم افسانے وغیرہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھے ۔

پھر وہ دور بھی آیا کہ میں نے بھی افسانے لکھنے شروع کیے۔ اسی زمانے میں پتہ چلا کہ قاسمی صاحب ماہنامہ ادبِ لطیف کے ایڈیٹر ہو گئے ہیں ۔ میں نے ایک دن انھیں ایک خط اور افسانہ بھیجا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب ایک ہفتے کے اندر قاسمی صاحب کا نہ صرف جواب آیا بلکہ بڑی حوصلہ افزائی کی کہ آپ میں افسانہ نگاری کی بڑی صلاحیت ہے ۔ آپ ادب لطیف کے لیے مستقل لکھا کریں' وغیرہ وغیرہ ۔

قیامِ پاکستان کے بعد مہاجر بن کر لاہور پہنچا۔ یعنی اپنے گھر کا دروازہ چھٹا تو پاکستان میں سب سے پہلے احمد ندیم قاسمی کے دروازے پر ہی پہنچا ۔

مگر احمد ندیم قاسمی کا گھر پہلے ہی سے "دارالمہاجرین" بنا ہوا تھا۔ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور اور ان کے افراد خاندان اور مشرقی پنجاب سے قاسمی صاحب کے دیگر رشتہ دار ــــــ قاسمی صاحب بیچارے خود بے گھر سے لگ رہے تھے ۔ اس لیے دورِ حاضر کے ابن بطوطہ المعروف بہ ابن انشا نے بڑے حاتم طایانہ انداز میں ہمارا بستر بکسہ اٹھایا اور لے گئے اپنے گھر کہ یہاں جتنے دن چاہو رہو' چارپائی اور روٹی توڑو اور قاسمی صاحب کی جان چھوڑو ۔

ہر چند کہ ہم نے قاسمی صاحب کو زحمت میزبانی نہ دی تاہم صبح سے شام تک قاسمی صاحب کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے ۔

ان دنوں سعادت حسن منٹو بھی زندہ تھے۔ منٹو صاحب کو اس بات سے بڑی چڑ تھی کہ ہم سب احمد ندیم قاسمی کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں کہ سب ہی انھیں "قاسمی صاحب، قاسمی صاحب" کہتے ہیں ۔ منٹو صاحب کا کہنا تھا کہ ــــ

"قاسمی ہم سب کا ہم عمر ہے ۔ "صاحب" کیسے بن گیا ۔ تم لوگ اسے صرف قاسمی یا ندیم کہہ کر کیوں نہیں مخاطب کرتے ۔"

واقعی ــــ قاسمی صاحب میں "صاحبیت" نام کو نہ تھی پھر بھی ان کے چہرے پر ہمیشہ ایک بزرگی اور سنجیدگی طاری رہتی ــــ

پہلے پہلے تو میں یہ سوچتا تھا کہ احمد ندیم قاسمی جو نہ شراب پیتا ہے اور نہ کھلے عام عشق کرتا ہے ۔ اور مسکراتا بھی ہے تو بقدرِ کفایت مسکراتا ہے ۔ یہ شخص زندہ دلوں جیسے اشعار کیسے کہتا ہے اور مفرح قلب جیسے افسانے کیسے لکھ لیتا ہے ۔

ایک دن اے حمید اور احمد راہی سے میں نے شرط باندھی کہ قاسمی صاحب کو پچاس سے نا ید لطیفے اگر یاد ہوں تو میں اپنی اگلی کتاب کی ساری رائلٹی سے سارے دوستوں کی ایک بڑی پُر تکلف دعوت کروں گا ۔

اس شرط کی بھنک قاسمی صاحب کے کان میں بھی پڑ گئی ۔ اور اتفاق سے اسی شام لاہور کے بہت سے

ترقی پسند ادیب احمد ندیم قاسمی کی قیادت میں کراچی میں ہونے والے "یوم غالب" میں شرکت کے لیے بذریعہ ٹرین میل کراچی روانہ ہوئے۔

لاہور اور کراچی کے درمیان ریل کا سفر دو راتوں اور ایک دن کا سفر ہے۔ جب گاڑی لاہور سے روانہ ہوئی تو قاسمی صاحب نے مجھے چیلنج دیا۔

جلیس صاحب　آپ نے میرے بارے میں جو شرط باندھی ہے میں نے اسے قبول کر لیا ہے۔ اب یہاں سے کراچی تک میرے اور آپ کے درمیان لطیفوں کا مسلسل مقابلہ ہوگا۔ ایک لطیفہ میں کہوں گا تو دوسرا آپ کو فوراً سنانا پڑے گا۔ درمیانی وقفہ ایک منٹ سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ جس نے جوابی لطیفہ سنانے میں ایک منٹ کی بھی دیر لگائی وہ ہار جائے گا۔

میں نے جو اپنے آپ کو لطیفوں کا سب سے بڑا ذخیرہ باز سمجھتا تھا۔ یہ دیکھ کہ احمد ندیم قاسمی جیسا سنجیدہ اور "کم مسکراہٹ شخص" بھلا کہاں تک لطیفے سنا سکے گا۔ زیادہ سے زیادہ لاہور کینٹ اسٹیشن یا پھر اوکاڑہ منٹگمری (ساہیوال) تک ——— اس کے بعد قاسمی صاحب کی اگلی کتاب کی رائیلٹی ہوگی اور دستِ خود دہانِ خود!

مگر صاحب قاسمی صاحب نے جیسے صرف لاہور سے کراچی تک ہی نہیں بلکہ قطب شمالی سے قطب جنوبی تک ہر قسم کے لطیفے شیطان کی آنتوں کی طرح اپنے ذہن کی چرخی پر لپیٹ رکھے تھے۔ ان کے جو لطیفے شروع ہوئے تو کراچی سے لاہور تک کا دو دن اور ایک رات لمبا یعنی ۲۶ گھنٹے کا سفر ختم ہوا قاسمی صاحب کے لطیفے ختم نہ ہونے تھے اور نہ ہوئے۔

کراچی کینٹ اسٹیشن پر ہم اُترے اور اعتراف کیا۔

"قاسمی صاحب۔ مان گئے۔ جتنے لطیفے آپ کو یاد ہیں اتنے دنیا میں کسی کو بھی یاد نہ ہوں گے۔
میں ہارا۔ اب میرا پیچھا چھوڑیئے ——"

تو قاسمی صاحب نے کہا ——

"نہ نہ ——— اب کون تمھارا پیچھا چھوڑے گا۔ اب تو تم سے میرا زندگی بھر کا ایک ہی سوال ہے کہ
"دوں ایک لطیفہ ——؟"

میں نے کان پکڑے اور عرض کیا۔

قاسمی صاحب۔ ——— لطیفے کی بجائے ایک جھ نپڑی دے دیجیے۔ مگر خدارا یہ کبھی نہ کہیے کہ ———
"دوں ایک لطیفہ ——؟"

قاسمی صاحب نے اس ——— "دوں ایک لطیفہ" ——— کو جیسے میری چڑ بنا دی ہے۔ اب جب کبھی جہاں کہیں ان سے ملاقات ہوتی ہے اور کبھی ماحول بوجھل ہو جاتا ہے تو قاسمی صاحب ایک دم پوچھتے ہیں:

"دوں ایک لطیفہ ——!"

اور ساری محفل زعفران زار بن جاتی ہے ———

میں نے زندگی میں احمد ندیم قاسمی سے بڑا لطیفوں کا ذخیرہ باز اور کوئی نہیں دیکھا اور مجھے ان کا سب سے زیادہ لطیفہ جو پسند آیا وہ دراصل ان کی آپ بیتی بھی ہے۔

وہ واقعہ یوں ہے کہ جب ہم "یوم غالب" کے لیے لاہور سے کراچی کے لیے روانہ ہوئے تو حمید اختر نے پوچھا:

"قاسمی صاحب غالباً آپ پہلی بار کراچی جا رہے ہیں؟"——

قاسمی صاحب نے جواب میں کہا۔

"بھائی—— پہلی بار ہی جا رہا ہوں اور اس لیے جا رہا ہوں کہ کراچی میں سمندر ہے اور میں نے سمندر آج تک دیکھا نہیں۔ شاعری کے ہر بحر سے واقف ہوں مگر بحر ہند یا بحیرہ عرب نہیں دیکھا۔ اور یہ غالب تو محض بہانا ہے اصل میں تو میں سمندر دیکھنے جا رہا ہوں، ہر چند کہ غالب نے بھی اپنے دیوان کے کوزے میں سمندر کو سمو دیا ہے۔"

یوم غالب کی تقریبات کے بعد اردو کے مشہور افسانہ نگار "الوز" نے جو ان دنوں پاک بحریہ کے کمانڈر تھے، قاسمی صاحب کی خواہش پوری کرنے کے لیے ہم سب کو اپنے بحری جہاز پر دعوت دی تاکہ قاسمی صاحب سمندر دیکھیں اور حمید اختر وغیرہ سمندر بی ڈالیں—— جب ہم ساحل سمندر پر پہنچے تو اُس وقت سمندر میں طوفانی قسم کا مدوجزر تھا۔ لہر پہ لہر سوار ہو کر پوری قوت سے اچھل اُچھل کر ساحل کی طرف آ رہی تھی۔ جیسے موجوں کی فوج نے خشکی پر مسلسل یلغار شروع کر دی ہو۔

قاسمی صاحب چند لمحوں تک موجوں کی فوج کی یہ یلغار دیکھتے رہے اور پیچ پیچھے اُلٹے پاؤں بھاگنے لگے۔

ہم سب نے پوچھا:—— "قاسمی صاحب—— یہ کیا؟"—— تو قاسمی صاحب رُکے اور بولے:——

"یارو—— آیا تو میں تھا سمندر دیکھنے—— مگر یہ سمندر تو اُلٹا مجھے دیکھنے آ رہا ہے—! اور کچھ ایسا غصے میں معلوم ہوتا ہے جیسے کہہ رہا ہو—" ٹھہر اُوئے احمد ندیم قاسمی—— تو مجھے دیکھنے نو سو میل دور لاہور سے کراچی آیا ہے۔ تو مجھے دیکھے سو دیکھے—— پہلے میں ذرا تجھے دیکھ لوں——"

اس جواب پر اِدھر سے قہقہوں کی وہ موجیں اٹھیں کہ ان کے سامنے سمندر کی متلاطم موجیں یکھ جیسے حیران سر ٹپکتی رہ گئیں۔

قاسمی صاحب کو میں نے لاہور کی سڑکوں پر پاپیادہ یا موجد خستہ جان کے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بارہا دیکھا ہے۔ لیکن میں نے احمد ندیم قاسمی کو پاکستان سے باہر بڑے رشک سے دیکھا ہے کہ روس میں، چین میں، جاپان میں اور برطانیہ میں قد آور بین الاقوامی ادب نے ہمارے احمد ندیم قاسمی کو بڑے فخر سے اپنے کندھوں پر بہت اونچا اٹھا رکھا ہے۔

جہاں تک احمد ندیم قاسمی کے فن اور اس کی شخصیت کے صحیح اعتراف و احترام کا تعلق ہے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ احمد ندیم قاسمی کا پاکستان میں تو کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اصلی احمد ندیم قاسمی تو لاہور یا پاکستان میں نہیں بلکہ سوویت یونین میں عوامی جمہوریہ چین میں، برطانیہ میں، کیوبا میں افریقہ میں اور ویت نام وغیرہ میں رہتا ہے۔

جب تک ہماری قوم زندگی ہی میں اپنے فن کار کو جائز خراج تحسین پیش نہیں کرے گی۔ ہر پاکستانی احمد ندیم قاسمی یوں ہی جلاوطن ہی رہے گا——

ابن انشا

کچھ باتیں اس جلال و جمال کی

قاسمی صاحب کے متعلق کیا کہیے اور کیا لکھیے۔ بظاہر اس میں کوئی دشواری نظر نہ آئے گی۔ ایک پیرا اُن کی شاعری پر، ایک افسانہ نگاری پر۔ ایک اُن کی دوسری خصوصیات پر اور [illegible] کچھ ان کے چال چلن کے بارے میں سرٹیفکیٹ، کہ ہماری اطلاع کے مطابق نہایت شریف اور نیک خو آدمی ہیں۔ لیکن صاحب لکھنے بیٹھے تب معلوم ہوا۔ ہم جیسا قلم برداشتہ لکھنے والا کبھی لکھتا ہے لکھ کر پھاڑتا ہے۔ یوں نہیں یوں۔ اِدھر سے پہلے، اُدھر سے پہلے۔ سچ یہ ہے کہ وہ آپ کی ذات میں اس کے تار و پود میں اس طرح گُھلے ملے ہوتے ہیں کہ ان کو الگ دیکھنا مشکل ہے۔ اُن پر لکھنا ہمیں اپنے آپ پر لکھنا معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اپنے کو تو اپنے سے الگ کر کے دیکھ بھی سکتے ہیں، اکثر دیکھا ہے، قاسمی صاحب کو نہیں۔

قاسمی صاحب کہیے کہ ندیم کہیے، یہ اپنی ذات سے ہمارے نئے ادب کی تاریخ ہیں۔ ہم اُن کو ندیم صاحب ہی کہا کرتے تھے اور آس پاس کوئی نہ ہو تو اب بھی ندیم ہی کہتے ہیں۔ وہ خود بھی اپنے کو ندیم ہی لکھتے ہیں۔ لیکن محلس میں کئی بار ایسا ہو جاتا ہے کہ آپ تو ان کا ذکر کر رہے ہیں اور پاس سے کسی صاحب نے گردن اونچی کر کے کہا۔ ہاں ندیم کا ذکر ہے۔ بھئی کیا کہنے ہیں۔ لیکن اس کی نئی فلم کچھ اچھی نہیں رہی۔ اُچھل کود بہت کرتا ہے۔

بعضوں کو آپ دیکھتے ہیں۔ یا اُن سے ملتے ہیں تو آپ کو محبت ہو جاتی ہے۔ بعضوں سے آپ کو محبت پہلے ہوتی ہے۔ ملنا بعد میں ہوتا ہے۔ ندیم صاحب سے ہماری [illegible] اور محبت اُن کی تحریروں کے واسطے سے شروع ہوئی۔ ان کی دیہاتی نظموں سے، ان کی "دھڑکنیں" سے یعنی قطعات سے اور ان کے "چوپال" سے یعنی افسانوں سے۔

اک عجب اپنائیت ان کی ذات میں بھی ہے، تحریروں میں بھی ہے۔ اس اپنائیت کا فیض بھلے ہی سب کے لیے عام ہو۔ لیکن آپ کو تو اپنی ذات سے غرض ہے۔ آپ اپنی پیاس بجھایئے۔

اُن سے پہلی ملاقات سنہ [illegible]ء کے اواخر میں ہوئی، یاد پڑتا ہے۔ میو ہسپتال کے آس پاس جہاں فوٹوگرافر پچھلی صدی کے کیمروں سے کالے کپڑے میں منہ چھپا کر تصویریں کھینچتے ہیں اور پس منظر کے لیے دیواروں پر باغوں اور محلوں کی سینریاں ٹنگی رہتی ہیں۔ ہم مشرقی پنجاب سے اُکھڑ کر آئے تھے وہ کہیں اور سے۔ شاید ریڈیو سے حال ہی میں اُکھڑے تھے۔

فسادات کی ٹریجڈی نے ہمارے احساسات پر مزید دھار رکھ دی۔ پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہونے لگے۔ پھر نہ جانے کیا کیا ہوا۔ بہرحال ربط و ضبط کے ساتھ ساتھ قربت اور مودت میں ترقی ہوتی گئی۔ غیر محسوس طور پر۔ لوم لائم اور حریفوں کی کلوخ اندازی اور رجعت پسندوں کی یورش اور داو بلے نے ہمیں اور قریب کر دیا۔ ہم بھی جس حد تک ہماری دھیمی طبیعت اجازت دیتی تھی، شمشیر برہنہ رہتے تھے۔ ظلم پر چپ رہنے کو غداری سمجھتے تھے۔ صداقت کے لیے سر کٹانا ثواب سمجھتے تھے، حق پر اڑ جانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اب ہم سمجھدار ہوگئے ہیں۔ اب ایسا نہیں سمجھتے۔

ندیم صاحب کو بیک وقت نظم اور نثر لکھنے میں جو فائدہ ہوا اسے تو وہ جانیں۔ نقصان البتہ ہوا۔ ایک روز شکایت کرنے لگے کہ ظہیر کاشمیری میری ہمیشہ اس عنوان سے تعریف کرتے ہیں کہ ندیم صاحب بہت اچھے افسانہ نگار ہیں۔ اور میرزا ادیب فرماتے ہیں کہ ان کی شاعری کا کیا کہنا۔ افسانوی انتخابات سے البتہ مجھے باہر رکھتے ہیں کہ شاعر کا افسانوں کے مجموعے میں کیا کام؟ یہ شکایت بھی بسبیل تفنن تھی۔ لیکن ایسا کوئی ہمارے ہاں ملے گا کہ شاعر بھی درجہ اول کا ہو افسانہ نگاری کی بھی صفِ اول میں ہو۔ ایڈیٹر بھی باکمال ہو، کالم نگار بھی۔ تنقید بھی شعور سے کرتا ہو۔ اور مشاعرے اور دوسری کاروبارِ دنیوی کو نبھاتا ہو اور اس سارے عالم میں اصول اور انسان دوستی اور حق پرستی کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹتا ہو۔ بے پناہ قوت اور بے پناہ خلاقی کے اس پیکر کو ہم ربع صدی سے دیکھ رہے ہیں ——— بلکہ حیرت کرتے ہیں ———

"دھڑکنیں" چھپی اور اس وقت کی نوجوان نسل کے ہونٹوں پر رواں ہو گئی۔ دلوں میں ترازو ہو گئی۔ اس کے کئی ٹکڑے اب بھی بے خیالی میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ مثلاً پہلا مصرعہ تو ہم بھول رہے ہیں۔ باقی تین مصرعے ہیں ہے

ترک پہ تکلے کی پلتا ہے روئی کا باریک سا دھاگا
کوئی مرے دل میں کہتا ہے یہ تو ہوس ہے عشق نہیں ہے
دیا جلا پروانہ آیا، دیا بجھا پروانہ بجھا گا

یا پھر وہ ہے

مانا کہ زمانے میں وفا مل نہیں سکتی
لیکن مرے دل پر تو یہ چرکے نہ لگاؤ

اور وہ ہے

دو بیگھہ زمیں کاشت کی خاطر مجھے دے کر
تم کرتے ہو چھپ کر مری لڑکی کو اشارا
محنت تو بکا کرتی ہے عزت نہیں بکتی
افلاس کا مارا ہوا دہقان پکارا

یوں کہیے کہ یہ کتاب ہم نوجوانوں کی بائبل تھی۔ ہماری ستیت اور شعور دونوں کو جلا بخشنے والی اور دونوں کو آسودہ رکھنے والی۔ ۱۹۴۹ء میں ہم نے لاہور چھوڑا اور پھر اس شہر میں ہمارا آنا جانا گاہے گاہے کا رہ گیا۔ ندیم صاحب نسبت روز

پر دیال سنگھ لائبریری کے عقب میں رہتے تھے۔ نقوش کے ایڈیٹر تھے اور مکتبہ افسانہ خواں کا بورڈ اس گھر پر ترچھا لٹکا رہتا تھا۔ ہم عموماً شام کو لاہور پہنچتے تھے اور صبح سویرے اُن کے گھر پر حاضری دیتے تھے۔ اُن دنوں ہمارا شمار شاعروں میں ہوا کرتا تھا، اور ان دنوں ہم نے جو نظمیں لکھیں اور جس قسم کی نظمیں لکھیں۔ بغداد کی ایک رات۔ شنگھائی کے مضافات۔ امن کا آخری دن۔ ان میں ندیم صاحب کے بڑھاوا دینے کا بہت ہاتھ ہے۔ وہ ہمارے گورو تھے، مرشد تھے۔ شام کو چائے کی محفلیں بھی ہوتی تھیں۔ ہم، اے۔ حمید، احمد راہی، حمید اختر وغیرہ سبھی مفلوک الحال، چھوٹے کینڈے کے لوگ تھے۔ میکلوڈ روڈ کے چوک کے ہوٹلوں میں لطیفہ گوئی اور لطیفہ سازی بھی ہوتی تھی۔ قاسمی صاحب نے ایک دو ہم پر بھی چپکائے، ایسے کہ اب تک اُتارے سے نہیں اُترتے۔

کراچی اور لاہور میں بہت فاصلہ ہے لیکن ہم میں اور ندیم صاحب میں ایسا کچھ فاصلہ پھر کبھی نہ تھا۔ ملنا نہیں تو خط و کتابت کی لین ڈوری بندھی رہتی تھی۔ ایک دوسرے کی خبر رہتی تھی۔ پھر یہ امروز کے ایڈیٹر ہو گئے اور اس اخبار کو نیا اسلوب دیا۔ انہی دنوں انھوں نے اپنی کالم نویسی کی صلاحیتوں کو پہچانا۔ پہلے 'پنج دریا' تھے۔ پھر ایک افتاد میں لمبا سانحہ پڑا۔ جیل بھی گئے۔ اکڑوں بیٹھ کے کنکر کی دال اور مٹی کی روٹیاں بھی کھائیں۔ لیکن ہنستے کھیلتے کھائیں۔ پھر دوسرے دور میں لکھنا شروع کیا تو 'عنقا' بنے ―― یہ مخفف سمجھیے محمد ندیم قاسمی کا۔ یوں احمد اسے بنتا ہے۔ انقا سے عنقا ―― اتنا تصرف جائز ہے۔ اسی ایڈیٹری کی کرسی پر تھے کہ مارشل لا آیا۔ لگانے والوں نے بہت کہا کہ قاسمی صاحب یہ مارشل لا آپ کے لیے نہیں ہے۔ آپ ہمارے محترم ہیں۔ اسی کرسی پر رہیے۔ بلکہ اس پر ایک اور گدّی ہم رکھے دیتے ہیں۔ ہمیں تو فلاں فلاں کو نکالنا ہے۔ آپ خدانخواستہ کمیونسٹ نہیں ہیں۔ لیکن یہ نہ مانے۔ اور کہا کہ اگر فلاں فلاں قصور وار ہیں تو میں بھی ہوں۔ بس خانہ آباد دوست زیادہ کہہ کر رخصت ہو گئے۔ قدرت اللہ شہاب نے ہمیں بتایا کہ میں اُن کو منانے اُن کے گھر پر گیا۔ لیکن یہ اصول سے دست کش نہ ہوئے۔ نوکری سے ورنہ بھی کتنے بڑے اخبار کی معززانہ ایڈیٹری سے دست کش ہو گئے۔ اس کے بعد اُن پر فلاکت کا دور۔۔ لیکن بشیمانی کا دور نہیں آیا۔ مستعفی ہونے میں بھی دو دن تو لگتے ہی ہیں۔ مارشل لا والوں نے پہلے ہی دن ایک اداریہ لکھ کر بھیج دیا۔ "A NEW ERA" کہ یہ ادھر پاکستان ٹائمز میں چھپتا ہے، اُدھر امروز میں اُس کا ترجمہ چھپنا چاہیے۔ دوسرے روز امروز میں "نیا ورق" کے نام سے جو اداریہ چھپا وہ دیکھنے اور پڑھنے کا تھا۔ قاسمی صاحب نے اُس کا منشا و مفہوم الفاظ کی بھول بھلیوں میں ایسا گم کیا کہ ڈھونڈو تو سِرا ملتا ہے، دوسرا ملتا نہیں۔ صاحبانِ اقتدار سمجھ تو گئے اور جھنجھلائے بھی کہ قاسمی صاحب نے ہماری کھیر کو دلیا کر دیا۔ لیکن کہہ کچھ نہ سکتے تھے۔ کہتے بھی تو کسے کہتے، یہ تو خود ہی خیرباد کہہ کر چلے آئے۔

ادیب اور دانشور ہونا اور بات ہے، صداقت شعاری اور بات ہے۔ قاسمی صاحب ہم لوگوں میں، ہم میں سے بہتوں میں اس لیے ممتاز ہیں کہ ہمیشہ آزادہ رو رہے۔ مصلحت کا شکار نہیں ہوئے۔ عہدوں کے پیچھے نہیں بھاگے۔ ریڈیو پر دربارِ سرکار دربار میں کبھی اُن کا داخلہ ممنوع تھا۔ اُن کو کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ اُن کو کیا کچھ نام نہیں دیا گیا۔ لیکن انھوں نے سب کچھ سہا اور اپنا کام کرتے رہے۔ کہتے ہیں ایک بار منٹو سے کسی نے کہا تھا کہ ان پر مضمون لکھیے۔ منٹو نے کہا۔ ان پر کیا لکھوں۔ سارے ورق خالی چھوڑ دوں گا۔ آخری صفحے پر لکھ دوں گا ― 'بہت شریف آدمی ہے'۔ ―― منٹو صاحب کا یہ خیال غلط تھا ――

ندیم صاحب ان معنوں میں شریف آدمی نہیں تھے جن معنوں میں منٹو کہہ رہے تھے۔ اُن کے جمال کو تو انھوں نے دیکھا تھا، جلال کو نہیں سے

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

تتمہ

قاسمی صاحب کی ذات وصفات کا احاطہ تنے چھوٹے سے مضمون میں کرنا مشکل ہے۔ جتنا کچھ انھوں نے لکھا ہے شاید ہمارے کسی اور ادیب نے نہ لکھا ہو۔ یہ ہم معیاری لکھنے والوں کی بات کر رہے ہیں۔ دو دو سو ڈھائی ڈھائی سو ناول لکھ ڈالنے والوں سے موازنہ مقصود نہیں۔ آج کل ٹیلی وژن پر ہم اُن کی لکھی ہوئی سیریز دیکھ رہے ہیں۔ ایک چہرہ، کئی چہرے؛ یہ ٹیلی وژن کی مقبول ترین اور بہترین سیریز میں سے ہے اور زبردستی کی گپ شپ اور دوسرے زوائد سے پاک۔ قاسمی صاحب انسان کے بنیادی طور پر نیک ہونے میں یقین رکھتے ہیں اور یہ عقیدہ ان کے اُن سارے افسانوں میں جاری وساری ہے۔ انھوں نے کبھی قارئین کو چونکانے کی کوشش نہیں کی۔ نہ جنسی برہنیت کو اپنے فن کے پاس آنے دیا۔ انھوں نے جہاں وادیٔ سون سیکسر کی سرسبزی اور شادابی کو اپنی تحریروں میں منعکس کیا۔ وہاں اُس وادی کے کسانوں کی مظلومیت کو بھی کبھی فراموش نہ کیا۔ ان کی تحریریں زندگی کے گمبھیر سے گمبھیر مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔ یوں دیکھیے تو وہ اپنی ذات میں ایک شگفتہ رو شگفتہ مزاج شخص ہیں۔ اپنی گفتگو اور اپنے کالموں میں انبساط و نشاط کا بہتا دریا ہیں۔ جانِ محفل ہیں۔ اس سے الگ دیکھیے تو دردمندی اور دل سوزی کا پیکر ہیں۔ خطہرا اور پوشیدہ لوگوں کے کام آنے والے۔ مدد کرنے والے۔ نوآموزوں کو بڑھاوے دے کر ادب کے بامِ بلند پر چڑھانے والے۔ کام میں آگے اور نام میں پیچھے رہنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ اور صرف لکھنے والے ہی نہیں۔ ذوق وشوق سے پڑھنے والے بھی۔ عالمی ادب کے ایسے غواص۔ نکتہ شناس۔ غرضیکہ ہر پہلو سے ہمارے عہد کی آبرو، عقیدتوں کا مرجع، محبتوں کا مرکز۔

مسرت لغاری

احمد۔ ندیم۔ قاسمی۔ ایک تثلیث

ندیم نے ادب کی مختلف اصناف اپنا کر اور پھر انھیں درجہ کمال تک پہنچا کر اپنے فن کے قدردانوں کو جس الجھن میں بتلا کر رکھا ہے اُس کی سزا تو یہی ہو سکتی ہے کہ ندیم کے بارے میں کچھ بھی نہ لکھا جائے۔ یہ کبھی نہیں کہ وہ ناقابلِ یقین حد تک شریف ہیں۔ ان کی شش جہت شخصیت سے حسد اگر دامن گیر ہوتا ہے۔ طنز و مزاح ہو یا تنقید وہ قدم بڑھا کر پیش قدموں سے جا ملتے ہیں ۔ افسانہ نگاروں میں جناب احتشام حسین کے الفاظ میں صفِ اول میں بڑی معزز جگہ رکھتے ہیں ۔ اُدھر ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب ہیں کہ کسی صورت یہ نہیں مانتے کہ ندیم افسانہ نگار پہلے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں ندیم شاعر پہلے اور افسانہ نگار بعد میں ہیں۔ ندیم کے آدھے سے زیادہ مداح یہی کہتے ہیں۔ خود ندیم بھی کہتے ہیں کہ میری شاعری افسانہ نگاری کی نسبت زیادہ اچھی ہے ۔ شعر نہ کہوں تو آدھا مر جاتا ہوں ۔ کسی زمانے میں ڈرامے لکھنے کا جنون سوار ہوا تھا تو مکالمہ نگاری میں قلم توڑ دیا تھا ۔ اب صرف مضمون نگاری کا میدان رہ گیا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا فنون کا ایڈیٹر اور پندرہ سولہ کتابوں کا مصنف اب لکھ لکھ کر تھک گیا ہوگا ۔ مگر ندیم اس میدان میں بھی کامیاب رہے ۔ یوں ندیم کی شخصیت متنازعہ فیہ بن گئی۔ بلکہ کچھ روز ہوئے ندیم کے پڑھنے والوں کو خدا نے ایک اور ایسے سے دوچار ہونے سے بچایا ہے ۔ ہوا یوں کہ فنون کے اجراء اور ارتقاء کے سلسلے میں مرزا ادیب صاحب نے لاہور ریڈیو سٹیشن سے ایک پروگرام ترتیب دیا۔ فنون کے معاون کی حیثیت سے ہم بھی شاملِ بحث تھے۔ سٹوڈیو سے باہر نکلے تو کہیں سے ایک بنسری نواز بغل میں چار پانچ بنسریاں دابے سامنے سے گذرا۔ ساتھ کچھ سازندے بھی تھے ۔ ندیم صاحب وہیں ٹھہر گئے، وجہ معلوم کی تو ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگے اے کاش میں یہ سب کچھ سیکھ سکتا۔ وہ تو شکر ہوا وہاں بیٹھ نہ گئے اور موسیقی والوں پر خدا نے رحم فرمایا۔ ورنہ ندیم سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ یہ معرکہ بھی سر کر لیتے۔ اگر انھوں نے یہ فن سیکھ لیا تو خود ہم بھی ندیم کے خلاف ووٹ دیں گے ۔ آخر برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے ۔

ایک جماعت کہتی ہے ندیم ایک بلند پایہ شاعر ہیں اور بس ——— دوسرا گروہ کہتا ہے ندیم اچھے شاعر ہیں تو ہوں گے لیکن اُن کی افسانہ نگاری لاجواب ہے ———

کوئی جلال و جمال، شعلۂ گل، دردشت وفا کو نہیں بھول سکتا تو کوئی پرمیشر سنگھ، سناٹا، گھر سے گھر تک ———

طلوع و غروب اور گرداب و سیلاب کے مصنف کا مرتبہ منوانے پر تلا ہوا ہے۔ مجھے ان دونوں گروہوں سے اختلاف کا حوصلہ تو نہیں البتہ میری اپنی ایک الگ رائے ضرور ہے۔

میرے نزدیک احمد ندیم قاسمی شاعر اور ادیب بعد میں ہیں، ایک اچھے انسان پہلے ہیں۔ اُن کے اندر ایک بہترین انسان چُھپا بیٹھا ہے، جو ندیم کو عمدہ شاعری اور اعلیٰ درجہ کی افسانہ نگاری کے لیے تحریک دیتا رہتا ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ اختلافات سے بچنے کی خاطر یہ رعایت برتی جائے کہ احمد ندیم قاسمی کو اُن کے نام کی طرح ایک تثلیث تسلیم کر لیا جائے ــــــ

ندیم شاعر ــــ قاسمی افسانہ نگار ــــ اور احمد شاید ایک بہترین انسان ــــ یوں تو یہ کہنا بہت آسان ہے، کہ فلاں شخص شریف ہے یا بہترین انسان ہے لیکن اس کی تفصیل میں جانے کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہے ــــ اس کی اہمیت تو کچھ وہی شخص جان سکتا ہے جو ریاضت کی وادیِ پُر خار سے لہولہان ہو کر نکلا ہو۔ جس نے بُرائی کا تصور کیے بغیر سینکڑوں بُرائیاں جھیلی ہوں ــ جو زمانے کے ہاتھوں جل بُھن کر کباب ہوا ہو۔ تب کہیں جا کر ایک اچھے انسان کا درجہ پایا ہو اور یہ سب کچھ سہہ جانا احمد ندیم قاسمی کا حوصلہ ہے ــ زمانے نے کس کو بخشا ہے؟ ــــ وہ تو اپنی تسلی کے لیے انسان کو مسلسل سولی پر چڑھائے رکھتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ندیم نے یہ ساری منازل کیسے طے کی ہوں گی؟ ــــ کیا وہ سر سے پاؤں تک برداشت کی ایک قوت بن گئے تھے؟ ــــ نہ اپنی عاقبت سنوارنے کا جنون ہے نہ اس کمینی دنیا سے صلے کی کوئی پروا۔ خدا نے اُن میں لاتعداد خوبیاں رکھنے کے ساتھ ایک بہت بڑی کمزوری بھی رکھ دی ہے، اور وہ ہے کسی کو پریشان نہ دیکھ سکنا ــــ ندیم نے اپنی زندگی میں اب تک جو کچھ برداشت کیا ہے انسانیت کی خاطر کیا ہے ــــ ان کا قلم انسانوں کا شعور جگانے اور انھیں انسان بنانے کے لیے کوشاں ہے۔ اور ندیم کا یہی روپ مجھے پسند ہے۔

ندیم سے ہماری قرابت داری کی عمر دس سال ہے۔

یہ اُن دنوں کا واقعہ ہے جب ابھی ہم میٹرک میں تھے ایک دن کہیں سے ایک ادبی رسالہ ہاتھ لگ گیا، اس میں ندیم کی شاعری اور افسانہ نگاری کو پہلو بہ پہلو دیکھا ــ چونکتے ہوئے ــــ نام بھی کچھ مانوس مانوس سا لگا ــ ان کا لکھا خاص طور پر غور سے پڑھا ــــ سمجھ تو خیر اُس وقت جتنی آئی ہو گی آئی ہو گی۔ اتنا ضرور ہوا کہ یہ نام پلّو میں باندھ لیا ــــ دل و دماغ نے ملاقات کی سازش بھی بنائی۔ لیکن ماحول سازگار نہ تھا۔ ماحول تو خیر اُن دنوں ادبی رسالے پڑھنے کے لیے بھی سازگار نہ تھا۔ کہاں حرم، حور اور زیب النساء جیسے رسالوں کا "شدید کرفیو زدہ ماحول" اور کہاں خشک ادبی رسالہ ــــ اب تک یاد نہیں پڑتا یہ رسالہ ہمارے پاس کیونکر پہنچا تھا؟ ــــ کون لایا تھا؟ اُن دنوں تو حرم و حور کے افسانے متعدی مرض کی طرح نوجوان نسل کو لگے ہوئے تھے۔ لڑکیاں بالیاں سارا دن خوابوں کی سرزمین پر لڑکھڑایا کرتیں گرمیوں کی پیلی دوپہروں اور سردیوں کی کالی راتوں میں آٹھ آٹھ گھنٹے مسلسل ان خوشبودار تحریروں سے آنکھیں پھوڑی جاتیں ــــ زیادہ سے زیادہ پُراسرار اور اُداس بننے کی ریہرسل ہوا کرتیں، بلکہ حالت یہ ہوتی تھی کہ خدانخواستہ گھر میں کوئی بڑے سے بڑا انقلاب رونما ہو جائے نوجوان نسل ٹس سے مس نہ ہوتی تھی اور رسالوں اور ناولوں میں دنیا و مافیہا سے بے خبر گم رہتی ــــ اُن دنوں ہمارا کسی ادبی رسالے کی زیارت کرنا، اسے چھونا اور پڑھنا ایک بہت بڑا معرکہ تھا۔ آہستہ آہستہ

ہمارے ذہن میں ایک فخر سا بیٹھتا گیا۔ بلکہ بعض اوقات تو مارے فخر کے ہم کئی کئی دن تک اپنی ہم جولیوں کو اپنے ساتھ بات کرنے کے قابل بھی نہیں سمجھتے تھے۔ بڑی آئی ہیں ہم سے بات کرنے والی۔ حرم اور حور کی ماری ہوئیں ۔۔ ہم، جو بڑے بڑے (ضخامت کے اعتبار سے) رسالے پڑھ کر کتنے "بڑے" ہو گئے تھے۔

خیر بڑے تو ہم یوں بھی ہو گئے تھے ۔ بی۔ اے پاس کیا تو ذہن میں ایک دم قانون پڑھنے کا سودا سمایا۔ قانون کا کالج لاہور میں تھا ـــــ اور ندیم بھی لاہور میں ـــــ اُدھر خاندانی روایات کے مطابق گھر کا ماحول اتنا محدود کہ آنکھیں رکھنے کے باوجود کبھی گھر کی ڈیوڑھی تک کا علم نہ ہو سکا کہ ؎

کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے؟

ڈیرہ اسمٰعیل خاں ایسے پس ماندہ علاقے میں گھر کی اونچی پتھریلی دیواروں کے پیچھے بیٹھ کر مڈل پاس کیا۔ بعد میں چھُپ چھُپ کر مزید علم حاصل کرنے کا جرم کیا۔ جب جرم کرنے کی عادت پڑ گئی تو ایک دن ایک بہت بڑی نیت جرم کا اظہار بھی کر ڈالا، یعنی لاہور جانے کا ـــــ جواب میں کیا کچھ نہ ہوا۔ خیر افرادِ خانہ و محلہ اور ماحول سے لڑتے جھگڑتے جب لاہور پہنچے تو داخلوں کی آخری تاریخوں کو گذرے ہوئے بھی دو مہینے گزر چکے تھے۔ البتہ قانون کی پناہ گاہ میں داخلے کا قانون نرم تھا۔ لیکن ہمیں ماحول پسند نہ آیا۔ واپس جانا شکست تھی ۔۔ سی افراتفری میں ایم۔ اے اردو کی کلاس میں جا بیٹھے ایک سال یونہی گذر گیا۔ دوسرے سال میں آئے تو ایک دن اچانک غل ہوا کہ کالج کے بڑے دفتر میں ایم۔ اے کے مقالے بٹ رہے ہیں۔ اب ذہن میں ندیم صاحب کا نام کوندے کی طرح لپکا۔ بڑے خلوص سے یہ نام پلّو سے کھولا اور پرچی ہاتھ میں لیے قطار میں جا کھڑے ہوئے۔ باقاعدہ جرح ہوئی۔ سوال، تھا شاعری پر لکھو گی یا افسانہ نگاری پر ـــــ؟ مارے شوق کے کہا دونوں پر ـــــ اعتراض اٹھا مقالہ طویل ہو جائے گا۔ عرض کیا یہ ہماری ذاتی محنت کا معاملہ ہے۔ اور اگلے ہی لمحے ہم انارکلی میں تھے ۔۔ دفتر کا اتہ پتہ معلوم کیا۔ ایک صاحب نے ایک دیوار کے اندر سیاہ سیڑھیوں کی ایک لمبی آنت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"فنون کا دفتر اوپر ہے اگر ہمت کر سکیں تو؟ ـــــ"

سیڑھیوں کی آسمان کی جانب غیر معمولی اٹھان دیکھ کر ایک لحاظ سے تو بے حد خوشی ہوئی کہ چلیے کوئی بات نہیں۔ ندیم صاحب اپنے مقام پر تشریف رکھتے ہیں ۔۔ نگہت لغاری (ہماری بہن) ہمارے ساتھ تھیں اُن کو سیڑھیوں کے منہ پر بصد حسرت و یاس کھڑا کیا اور خود اُن کو وصیت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بسم اللہ پڑھی۔ خدا خدا کر کے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ساری سیڑھیاں ہی آدھی آدھی ہیں ہر قدم پر جوتی کی ایڑی ہوا میں رہ رہ گئی۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس دوران ہم ندیم صاحب کے مرتبے کے ضرور قائل ہو چکے تھے۔ دفتر کی بناوٹ بتا رہی تھی کہ یقیناً بہت بڑے ادیب ہوں گے۔ ویسے بھی یہ ہماری پُرانی روایت ہے کہ ادیب جوں جوں اپنے فن میں اوپر اٹھتا جاتا ہے معاشرہ اس کے لیے دنیاوی آسائشیں بلکہ زندگی کی بنیادی ضروریات بھی غیر ضروری قرار دیتا چلا جاتا ہے۔ بہرحال سیڑھیوں کی اندھیر نگری سے نکلے تو کھُلی فضا کے بجائے ایک مختصر سا کمرہ نظر پڑا اُس کے ساتھ ہی ایک قدرے بڑا کمرہ تھا۔ پہلی نظر میں کچھ یوں لگتا تھا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو پہلو سے لپٹائے کھڑی ہو ـ جی ہاں یہی ڈیڑھ کمرہ یا مارے مروت کے دھوپ

ادھورے دو کہ پیچھے "فنون" کا مرکز تھے۔ معلوم ہوا ندیم صاحب بڑے کمرے میں تشریف رکھتے ہیں۔ ساتھ کی کمری میں فنون کی کاپیاں چھت تک لگی ہوئی تھیں۔ ہمیں بھی دو ڈھائی قدم کی جگہ وہیں ملی ۔ اتفاق سے عین اُسی لمحے ایک بیرا چائے لیے ہمارے پاس سے گزرا اور پھر نہ رقعہ چلا، نہ پرچی چلی، نہ تعارف کا چکر پڑا ۔ بس اس عام سے لڑکے نے عام سے لہجے میں جا کر اطلاع دی اور ندیم صاحب عام سے انداز میں تیز تیز چلتے ہوئے ہماری جانب آگئے ۔ بڑی خوش خلقی سے سلام دعا کی ۔ پھر یہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے کہ آپ بھی یہاں تشریف لے آئیے ۔ ہم خراماں خراماں، اُن کے پیچھے تشریف لے گئے ۔ دل پر ذرا بھی رعب نہ پڑا کہ یہ احمد ندیم قاسمی ہیں ۔ بلکہ کسی قدر مایوسی ہوئی کہ ہائے اللہ ادیب یوں تھوڑی ہوتے ہیں جیسے یہ ہیں ۔ کمرے میں گئے تو وہاں بھی دہ درجنوں آدمیوں میں یوں بے تکلفی اور سادگی سے جا کر بیٹھ گئے جیسے اپنے گھر میں عزیزوں رشتہ داروں میں گھر کے بیٹھے ہوں ۔ ۔ نہ بیٹھنے کے انداز میں کوئی تکلف، نہ لہجے میں کوئی بناوٹ ۔ ہم بھی کونے میں ایک کرسی پر لگ گئے ۔ تھوڑی دیر بعد اُن حضرات کو رخصت کیا اور ہماری جانب متوجہ ہوئے اور اب جو ہمارا سر ہماری جانب متوجہ ہوئے تو دل پٹاخ سے بولا ۔ بی بی ذرا سنبھل کر ــــ ایک بڑے ادیب سے مخاطب ہو رہی ہو ۔ ٹھہر ٹھہر کر مدعا بتایا ۔ کچھ خاموش سے ہو گئے جیسے کہہ رہے ہوں یہ تکلیف کیا ضروری تھی؟ خیر ہم نے تھوڑی بہت تفصیلات معلوم کیں ۔ وہیں سے خدیجہ مستور صاحبہ سے فون پر اُن کے لالہ کے بارے میں چند باتیں پوچھیں اور رخصت ہوئے ۔ اس دوران نگہت صاحبہ یہ سوچ کر واپس جا چکی تھیں کہ ابھی تو چق کے اُس پار چیٹ کی باریابی بھی نہ ہوئی ہوگی ۔ سچ ہے ادیب اگر اپنے مرتبے کے اعتبار سے دروازے کی پرلی جانب والوں کو انتظار میں رکھ کر ادھ موا نہیں کر سکتے تو کم از کم مصروف تو ہو سکتے ہیں ۔ اگر سب لوگ احمد ندیم قاسمی بن جائیں تو ڈپٹی کمشنری چٹائی پر بیٹھ کر ہونے لگے ــ

یہ تھا ندیم صاحب سے پہلی ملاقات کا قصہ!

دوسری ملاقات بھی اسی مقالے کے سلسلے میں ہوئی ۔ تیسری بھی ۔ اور چوتھی بھی اور پھر صورت کچھ یوں ہوئی کہ ملاقاتیں مقالہ ہو گئیں اور درمیان سے لفظ مقالہ اڑ گیا ــ جب ہم تخلیق و تحقیق کی دشوار گذار راہ پر آدھی سے زیادہ مسافت طے کر چکے تو اچانک ایک دن معلوم ہوا کہ حکام یونیورسٹی ہوش میں آگئے ہیں ۔ انھیں احساس ہو گیا ہے کہ فیصلہ غلط ہوا ہے ۔ زندہ لوگوں پر کچھ لکھوانا سراسر غلطی ہے ۔ احکام جاری ہوئے کہ زندوں پر مقالے منسوخ کر دیے گئے ہیں ۔ شکر خدا کا کہیں یہ حکم جاری نہ ہوا کہ آئندہ "زندوں" کے لکھے ہوئے مقالے بھی منسوخ قرار دیے جائیں گے کیونکہ جو کچھ مرے ہوتے مرے ہوؤں کے بارے میں لکھ سکتے ہیں وہ زندہ لوگ مرے ہوؤں کے بارے میں ہرگز نہیں لکھ سکتے ــ خیر سخت طیش آیا ۔ مارے رنج و غم کے بھاگے بھاگے ندیم صاحب کو دردِ دل سنانے فنون کے دفتر پہنچے ــ ٹوٹی سانسوں کے درمیان اپنی بپتا سنائی ۔ ندیم صاحب کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ بجائے ہمارے غم میں شریک ہونے کے ہنس پڑے فرمایا ــ تو گویا بی بی آپ کے اس کام کے لیے ہمارا فوت ہونا ضروری قرار پایا ہے؟ ــــــ

مختصر یہ کہ ہماری حوصلہ شکنی کا یہ زمانہ سنہ ۶۶ء کا ہے ــــ

مقالہ تو خیر منسوخ ہو گیا ۔ ہمیں یہ فیصلہ اس لیے بھی زیادہ بُرا نہ لگا کہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے ۔ اسی

بہانے ایک اچھے انسان سے ملاقات تو ہو گئی ورنہ جس زمانے میں ہم رہ رہے ہیں اُس میں تو ایسے خوبصورت اتفاقات کے امکان مدتوں تک ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا یہ سوچ کر صبر کا گھونٹ پی لیا کہ چلیے یہ کام ہماری ذات پر اُدھار رہا۔ جب جی چاہا ندیم صاحب پر صرف مقالہ ہی نہیں انتقاماً ایک کتاب لکھیں گے اور یہ ارادہ آج بھی ذہن میں پورے وثوق کے ساتھ موجود ہے —

اب بظاہر مقالے کا کام ختم ہو گیا تھا اور ندیم صاحب سے کوئی واضح واسطہ نہ رہا لیکن خدا کو شاید کچھ اور منظور تھا۔ ہمارے تعلقات منقطع نہ ہونے پائے بلکہ میں تو سمجھتی ہوں مقالہ بھی محض بہانہ ثابت ہوا۔ قدرت نے ہمیں ندیم صاحب کی صورت میں ایک انتہائی مخلص اور شفیق ہستی سے متعارف کرایا۔ شفیق ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ناقابل یقین حد تک شریف بھی ہیں۔ انتہائی سادہ مزاج اور خاموش طبع — اگر آپ سنجیدگی سے اُن کے سامنے بیٹھے رہیں تو یہ بھی گم صم مفکروں کی طرح سر جھکائے بیٹھے رہیں گے۔ خود بہت کم بات چھیڑتے ہیں لیکن اتفاق سے اگر آپ کی زبان سے بے تکلفی کا کوئی لفظ پھسل گیا ہے تو پھر آپ کا بچاؤ مشکل ہے۔ یہ آپ کو چٹکیوں میں اڑا کر رکھ دیں گے۔ اتنا ہنسائیں گے کہ اُن کی ساری باتیں لطیفہ ہو جائیں گی۔ خود بھی بھرپور انداز سے ہنستے ہیں، چاہے اندر سے کتنے ہی زخمی کیوں نہ ہوں۔ اُن کی بے ریا ہنسی کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی غم باقی نہیں رہا۔ ساری زندگی قہقہوں سے زعفران زار بن گئی ہے۔

اکہرے بدن کے ندیم صاحب کردار بھی اکہرا رکھتے ہیں۔ دوہرے کردار کو گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں — جو دل میں ہے۔ وہی زبان پہ— اپنی اس فطرت کی وجہ سے ایک آدھ دفعہ بچ گئے ہوں تو اتفاق سمجھیے، نہیں تو دوہرے کردار والوں سے اکثر بڑی خاموشی اور شرافت سے مار کھا جاتے ہیں — ہماری نظر میں تو سب سے بڑا گناہ دوہرا پن اور دل شکنی ہے اور یہ بات اکیلے ہم ہی نہیں، ندیم کے کم و بیش سارے ملنے والے حلفیہ کہتے ہیں کہ وہ ان دونوں جرائم سے کلیتاً بری ہیں۔ دل توڑنا انھیں آتا ہی نہیں۔ تبدیلیٔ ذائقہ یا یونہی ہنسی مذاق میں بھی کسی کی دل شکنی نہیں کرتے۔ بے شک ٹوٹے دلوں کو جوڑنے کا کام کوئی ان سے سیکھے۔ بہت سے لوگ جنھیں ادب اور شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں، ان سے اپنے دکھوں کا علاج کروانے آتے ہیں۔ سُنا ہے کچھ مدت ہوئی ایک صاحب ان کے پاس تشریف لے آئے، اور آتے ہی کہنے لگے۔ "ندیم صاحب میرا فلاں کام کروا دیجیے نہیں تو اپنی گردن پہ اُسترا پھیر لوں گا زندگی سے اتنا مایوس ہو گیا ہوں کہ —!

اب ندیم صاحب ہیں کہ بے چین بلکہ سخت پریشان ہیں کہ کیا کریں۔ خدا جانے انھوں نے کیا کیا پاپڑ بیلے۔ کیا کیا پریشانی اٹھائی، بہرحال اُن صاحب کا کام کرا دیا۔ وہ حضرت آج کل خوش ہیں۔ باقاعدہ زندوں کی طرح زندہ ہیں اور خودکشی کا ارادہ کرنے والوں پہ ہنستے پھرتے ہیں۔ اُن کو خوش دیکھ کر ندیم صاحب اپنی جگہ مسرور ہیں کہ چلیے مصائب اور دکھوں میں بسی ہوئی اُن کی جان کسی کے کام تو آئی — خودکشی یا زندگی میں دلچسپی ختم کر دینے کی دھمکی دے کر آپ ان سے بڑے سے بڑا کام نکلوا سکتے ہیں۔ بیٹری معصومیت سے دھوکہ کھا جائیں گے۔ اُدھر بہن سازی بھی لگی ہوئی ہے۔ درجنوں بہنوں کے دُکھ درد اور راز ان کے دل میں محفوظ ہیں۔ ندیم خالصتاً خیر کی قدروں کے علم بردار ہیں۔

کتنا بلند کتنا انوکھا مقام ہے — انسان ایک تسلسلِ شیریں کا نام ہے

اتفاق دیکھیے کہ آج تک ندیم صاحب کو جتنے بھی دوست ملے سب نے ان کے سامنے ایک آدھ دفعہ خودکشی

کا ذکر ضرور کیا بلکہ دو چار دل جلوں نے ٹوک کر بھی ہیں۔ باقیوں کی جانب سے انھیں مسلسل دھمکیاں موصول ہوتی رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ صاحب مزدوروں کی طرح محنت کرتے ہیں انھیں خطوط میں لیکچر دینے پڑیں یا زبانی سر کھپانا پڑے یہ ہرگز دریغ نہ کریں گے۔ مایوس انسانوں کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن سبیل نکالیں گے۔ "جلال و جمال" میں ملتان کے ایک صاحب کے نام کچھ اشعار ہیں جنھوں نے خودکشی کر لی تھی۔ اُن کے بارے میں خود ندیم صاحب نے ہمیں ساری تفصیل بتائی۔ بخدا ان کے حوصلوں پر حیرانی ہوتی ہے کس کس انداز سے موصوف کو خودکشی سے روکا اور پھر اسی سلسلے میں الٹا ایک جھوٹے مقدمے میں بھی ملوث ہو گئے۔ یوں کہ اندر ہوتے ہوتے بچے۔ بس خودکشی کا فلسفہ ندیم کی سمجھ میں بالکل نہیں آتا ——

ادھر خود میری زندگی میں بھی ایک عجیب سی بے چینی اور مایوسی پھیل گئی تھی۔ انسانیت کو ہر طرف سے دُکھوں درد ناانصافیوں میں گھرے دیکھ کر جی زندگی سے بیزار ہو گیا تھا۔

ندیم صاحب نے مجھے لکھا:

"آپ ساری دنیا کو قطعاً نہیں سمجھا سکیں گی، پیغمبر تک نہ سمجھا سکے۔"

میری بنیادی الجھن یہ تھی کہ علیم و بصیر کی موجودگی میں دنیا میں اتنی بڑی بڑی ناانصافیاں اور مظالم کیسے ہو جاتے ہو جاتے ہیں۔؟ غرض ایک عجیب سی الجھن مجھے درپیش تھی۔ تسلی کی خاطر گہری عبادتیں شروع کیں۔ لیکن سجدوں کو پھر منطق نے گھیر لیا۔ تقریباً سارے مذاہب کا مطالعہ کیا۔۔ کہیں بائیبل کی تفصیلات میں الجھی تو کبھی قرآن سرہانے رہا۔۔ یوگا پر کتابیں پڑھیں ۔۔ اقبال کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ لیکن انسان کی دائمی مظلومیت کے بارے میں کسی طرف سے بھی تسلی بخش جواب نہ ملا بلکہ تمام کتابوں میں خالی دلائل اور وعدے دیکھ کر طبیعت اور بھی بیزار ہوئی ۔۔ اس پر مستزاد یہ کہ ذہنی انتشار کے دنوں میں اپنی سروس کے سلسلے میں چند انتہائی پڑھی لکھی خواتین کی صریح ناانصافیوں کا شکار رہی ۔۔ جی چاہا ان ساری باتوں کے سلسلے میں ندیم صاحب کے ساتھ بحث کروں لیکن خاموش رہی۔ ان کے ساتھ کون بات کرے جو انسانی حوصلوں کو خدا کے حوصلوں سے بھی آگے لے جانا چاہتے ہیں۔ جو خدا کے "مستقل رحیم" ہونے کے بارے میں کہتے ہیں:۔

شکایت اپنی توکل سے ہے خدا سے نہیں
کہ میرا دامنِ اُمید ہی دریدہ رہا

آخر کار ان تمام الجھنوں اور جھگڑوں کا علاج خودکشی نظر آیا۔ غصے میں آ کر ندیم صاحب کو لکھ بھیجا کہ آئندہ میرا کوئی خط آپ کو نہیں ملے گا۔ جس دنیا میں آپ ہر وقت خیر کی قدروں کا پرچار کرتے رہتے ہیں اُس میں ہمارے لیے اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ۔۔ نہ کائنات بنانے کا فلسفہ سمجھ میں آتا ہے نہ کائنات کے بنانے والے کا۔ لگتا ہے وہ کسی گہری نیند میں ہے اور رہیں۔ اگر وہ "کن" کے بعد کے حالات کا ذمہ دار نہیں ہے تو پھر ہم بھی اُس کی دی ہوئی زندگی کو مکمل کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں ۔۔ نیکی کا معاوضہ اُس نے قیامت پہ اٹھا رکھا ہے جس کا انتظار اب ممکن نہیں رہا ۔۔ یوں بھی میرے خیال میں بات برابر ہو جاتی ہے۔ یعنی بُرے لوگ اس جہان میں آرام سے ہیں اور بھلے لوگ ایڑیاں

رگڑ رہے ہیں ـــــ اگلے جہان میں بڑے مزا بھگتیں گے اور نیک صاحبان کالی آنکھوں اور لمبے بالوں والیوں کے ساتھ بہشت میں ٹہلیں گے ـــ ایک گروہ شراب اور دودھ پیے گا اور دوسرا پیپ ـ پھر فرق کیا ہوا دونوں میں؟ـ صرف زمان و مکان کا فرق پڑا ـــــ وغیرہ وغیرہ

جواب میں مجھے ایک طویل خط ملا! ـــــ

"یہ جو آپ خطوط اور افسانوں میں خدا پرستی ہیں تو مجھے یقین ہے، وہ، اگر ہے تو خفا نہیں ہوگا بلکہ محظوظ ہوتا ہوگا ـــ مگر آخر ہم کیوں اتنے بے بس اور مجبور ہیں کہ اپنے معاشرے کی ہر زیادتی کو بھی اس خالق کائنات کے سر تھوپ دیں ـــــ؟ یہ آپ بہت اچھی طرح جانتی ہیں کہ معاشرہ کیسے خراب ہوتا ہے اس کے اسباب و علل کیا ہیں "اس خرابی سے تمام اہل اختیار ـ چھوٹے بڑے، کیسے غیر شعوری طور پر خراب ہوتے ہیں اور اس خرابی کو اپنا فن اور ROUTINE ـ سمجھنے لگتے ہیں ــــ ایک جھوٹ کو ایک سو بار دہرا کر دیکھیے تو وہ آپ کو سچ معلوم ہونے لگے گا ـــــ پھر معاشرہ گذشتہ کتنی صدیوں سے جھوٹ بول بول کر بزعم خویش اتنا حق پرست بن چکا ہے کہ ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتا ـــــ چنانچہ خرابی خدا کی ذات پر اعتقاد رکھنے کی نہیں ہے معاشرے کی ساری خرابیوں کو خدا سے منسوب کرنے کی ہے اور معاشرے کی خرابی کی تمام تر ذمہ داری انسانوں پر عاید ہوتی ہے اور یہ انسان صرف ایک بہت بڑے اور منصفانہ سطح کے معاشرتی تغیر ہی سے درست ہو سکتے ہیں ـ پند و نصائح ان کے لیے بے معنی ہیں ـ میں نے ایک بار کہا تھا: ـ

صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ
گٹھڑیاں سر پہ اٹھائے ہوئے ایمانوں کی

تو جس معاشرے میں ایمان فروخت ہوتے ہوں اور خدا کو دھوکہ دیا جاتا ہو اس سے ہم خیر کی کیا توقع رکھیں ـــ رہی خدا کی پکڑ تو وہ واقعی سمجھ میں نہیں آتی ـ ہماری آنکھوں کے سامنے بدکردار اور بدسرشت لوگ نسل در نسل مادی آسودگیوں کی جنت میں زندگی بسر کرتے چلے جاتے ہیں اور خدا بظاہر اُن پر کوئی گرفت نہیں کرتا ـ جو سچ مچ کے نیک ہیں وہ افلاس و احتیاج کے جہنم میں جل رہے ہیں ـ جو عیاش اور اخلاق کش ہیں اُن کے مزے ہی مزے ہیں ـ یہ امتیازی سلوک سمجھ میں نہیں آتا مگر اسے سمجھنے کی کوشش کیوں نہ کی جائے کہ عیاشوں کا عیش بھی صرف اسی صورت میں جاری رہ سکتا ہے جب عام لوگ بے حس، بے حوصلہ اور غیر متحد ہوں ـ اگر وہ ایکا کر کے آگے بڑھیں تو آن کی آن میں یہ ساری بساط اُلٹ جائے تو یہاں بھی قصور خدا کا نہیں انسان کا نکلے گا ـ میرا ایک اور شعر سنیے: ـ

زباں ملی تو مجھے بولنا پڑا ورنہ
خدا کی طرح میں تا روزِ حشر چپ رہتا

وہ تو چپ رہے گا چاہے آپ جو بھی کریں ـ موسیٰ سے ذرا سا بولا تھا تو آپ نے دیکھ لیا ـ اُسے خاموش ہی رہنے دیجیے ـ اور آیئے مل کر سوچیں کہ ہم اپنی فکر اور اپنے ادب سے اس سفاک معاشرے کو کس حد تک بدل سکتے ہیں جو جھوٹوں کی تکریم کرتا ہے اور سچوں کی ہتک کا مرتکب ہوتا ہے ـــ آپ سچی ہیں ـ آپ کی ہتک ہوئی ہے، مگر تنہا آپ کی تو ہتک نہیں ہوئی ـ سچ اور صداقت اور دیانت کی پوری روایت کی ہتک ہوئی ہے اور اس کا ذمہ دار یہ سفاک، ناانصاف کش،

عدل دشمن اور زر پرست معاشرہ ہے اور بس "۔۔۔۔۔

اُن کا یہ خط پڑھ کر کافی تسلی ہوئی شدید انتہا پسندانہ خیالات بھی ذرا دیر کو دب گئے۔لیکن مکمل تسلی پھر بھی نہ ہوئی۔ ندیم صاحب نے انسان کے انسان پر مظالم اور ناانصافیوں کی وجوہات اور علاج لکھ بھیجا تھا۔میں کائناتی سطح کے مظالم کا جواب چاہتی تھی ۔۔۔۔۔ بہرحال بعد میں اس موضوع پر خطوط میں بھی اور زبانی بھی ان کے ساتھ کئی بحثیں ہوئیں۔ میں نے انسان کو اتنی زیادہ ذمہ داریوں سے لاد دینے پر ان سے ان کے خدا کا گلہ کیا تو کچھ چپ سے ہو گئے جیسے مجھے تسلی بھی دینا چاہتے ہوں اور میرے دلائل کی سچائی سے متاثر بھی ہوں ۔۔۔۔۔ اسی دوران اگلے دو تین ماہ میں ایک مرتبہ پھر میں اپنے کالج میں کسی محترمہ کی " انتہائی کمینگی " کا شکار ہوئی۔ بات شاید کچھ زیادہ بڑی نہ تھی لیکن اپنا " حساس پن " قاتل بن گیا۔ میں جو بڑے پیمانے پر انسان کے سکون کے بارے میں سوچتی تھی اور ندیم صاحب کی تحریروں اور ملاقاتوں کے بعد انسانوں سے ندیم کے سے حوصلوں کی توقع رکھنے لگی تھی۔ ایک دم تحت الثریٰ میں کھینچ لی گئی ۔۔۔۔۔ انسانیت کے سلسلے میں میری امید کا قطع ہو جانا ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ بلکہ ناقابل برداشت ۔۔۔ یوں کہ ندیم صاحب کی تسلیوں کے سارے سہارے بھی ہاتھ سے چھوٹ گئے اور میں نے خود کو اپنے "قاتل حساس پن" کے حوالے کر دیا ۔۔۔۔۔ ندیم صاحب ایک مرتبہ پھر اپنے پر بیتے ہوئے بڑے بڑے غموں اور ناانصافیوں کی ساری کہانیاں لے کر مجھے سمجھانے آئے۔ اتنے خلوص سے کہ مجھے قتل ہونے سے بچا لیا ۔۔۔ ملاقات کے اگلے روز اُن کا ایک خط ملا :۔۔۔۔

"۔۔۔۔۔ میری استدعا ہے کہ خدارا غصے کے عالم میں یا مایوسی کی حالت میں یا DISILLUSIONMENT کی کیفیت میں ایسی باتیں نہ سوچیے جو آپ کی شخصیت کی نفی کرتی ہوں ۔ جی ہاں یہ شخصیت کی نفی نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ آپ اس عمر میں، زندگی کے اس بھرپورپن کی صورت حال میں زندگی کو بے معنی کہہ کر عملاً اُس سے دست کش ہو جائیں ۔ اگر یہ زندگی بے معنی ہے تو سب کے لیے ہے، صرف آپ کے لیے نہیں ۔ پھر آپ یہ اعتراف تو کریں گی کہ زندگی کا ایک پہلو حسن بھی ہے ۔ اس حسن پر یوں بے نیازی سے ٹھوکر دینا کسی کو بھی اور ایک آرٹسٹ اور فن کار کو تو خصوصیت سے زیب نہیں دیتا ۔ اُس روز آپ کی باتیں سن کر مجھے بے پناہ دکھ ہوا۔ ایک آدھ بار غصہ بھی آیا ۔ ایک آدھ بار رقت بھی طاری ہوئی، مگر میں سوائے منت کرنے کے اور اپنی بساط کے مطابق آپ کو سمجھانے کے اور کچھ کر بھی تو نہیں سکتا "۔۔۔۔۔

آگے چل کر لکھتے ہیں ۔۔۔۔۔

"۔۔۔۔۔ آپ کو بہر صورت اور بہر شرط زندہ رہنا ہے کہ زندگی ایک ہی بار میسر آتی ہے اور جب انجام سبھی کا ایک ہی ہے تو اس انجام کو اپنے ہاتھوں سے کھینچ کر قریب تر لانا زندگی سے بھی زیادہ بے معنی بات ہے۔ میں آپ کی طرف سے اس مژدے کا منتظر ہوں کہ آپ سنبھل چکی ہیں۔ مانا کہ آپ کے اس سوال کا جواب نہ نگہت بی بی کے پاس ہے اور نہ میرے پاس ہے کہ جب ہر طرف اتنے ظالم، بے حس اور آدم خور قسم کے لوگ بستے ہوں تو کس بہانے زندہ رہا جائے، مگر ہم دونوں کے اس سوال کا جواب آپ کے پاس بھی تو نہیں

کہ زندہ کیوں نہ رہا جائے اور وقت سے پہلے کیوں مرا جائے اور اپنے بدخواہوں کی تمنا کو اپنے آپ کو
ضائع کر کے کیوں پورا کیا جائے ــــــ
میں آپ سے ایک اچھا، تندرست اور توانا جواب پانے کے لیے بے تاب ہوں "ــــــ

میں نے جواب میں وعدہ کر بھیجا کہ آئندہ مایوسی کی کوئی کیفیت خود پر طاری نہ ہونے دوں گی اور اپنے سامنے ندیم صاحب کے حوصلوں کا معیار رکھوں گی۔ بہرحال کچھ بھی تھا انھوں نے بڑے سلیقے سے مجھے میرے ذہنی کرب و اذیت سے نکالا اور سچ تو یہ ہے کہ ندیم کی یہ ہمدردیاں صرف ہم تک ہی محدود نہیں۔ وہ سب انسانوں کے لیے ایک سا احساس اور خلوص و ہمدردی کا ایک سا پیمانہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے دوستوں دشمنوں کو ایک ہی فہرست میں رکھا ہوا ہے :۔

دشمن بھی جو چاہے تو مری چھاؤں میں بیٹھے
میں ایک گھنا پیڑ سرِ راہ گزر ہوں

ــــــ

سب سے ہے عشق مجھے حسنِ نظر کے ہاتھوں
مجھ کو ہر شخص نے دیوانہ بنا رکھا ہے

بلکہ یہ آخری شعر جس غزل کا ہے وہ پوری غزل ہی مرصع ہے۔ ندیم صاحب نے یہ غزل لاہور کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی اور مجھے اپنی قلم سے لکھ کر بھیجی۔ آپ بھی پڑھیے :۔

سب نے انسان کو معبود بنا رکھا ہے
اور سب کہتے ہیں ــ انسان میں کیا رکھا ہے

منصفو! کچھ تو کہو، کیوں سرِ بازارِ حیات
مجھ کو احساس نے سولی پہ چڑھا رکھا ہے

جس کے ہر لفظ سے ہو حشر صداقت برپا
میں نے وہ گیت قیامت پہ اٹھا رکھا ہے

سب سے ہے عشق مجھے، حسنِ نظر کے ہاتھوں
مجھ کو ہر شخص نے دیوانہ بنا رکھا ہے

میری امید کی ستیزہ انگیز آنکھیں، سنگیں
میں نے ہر جوش کو سینے سے لگا رکھا ہے

گھومتی پھرتی ہیں سیہ تیر، بگولوں کی طرح
قیس نے دشت میں اک شہر بسا رکھا ہے

حسنِ تخلیق کا، دھرتی میں جبر میں یہ پھیلیں
ہم نے انسان کو گملے میں سجا رکھا ہے

ندیم

حقیقت بھی یہی ہے کہ ندیم کو ہر انسان سے عشق ہے۔ وہ انسان کی عظمت کے شدت سے قائل ہیں۔ ادیب برادری میں سے کسی پر کوئی مصیبت آئی ہے تو کڑکتی دھوپ میں میز بر دوش ندیم جلوس کی قیادت کر رہا ہے۔ کوئی بھوک ہڑتال کیے بیٹھا ہے تو یہ اس کے گھٹنے سے لگے بیٹھے ہیں اور اس کے مطالبات منوانے کے لیے ممکن حد تک کوشش کا یقین دلا رہے ہیں۔ کسی نے کوئی کام ذمے لگایا ہے تو دن رات کا چین گنوائے پھر رہے ہیں اور ایسے کاموں کے دوران یہ خیال تک نہیں رہتا کہ کون کون سے ضروری کام کرنے ہیں، دفتر میں کتنی ضروری ڈاک جمع ہو چکی ہے اور کس کس کو فوری جواب دینا ہے۔ خطوط کے سلسلے میں ہم اکثر شکوہ کرتے ہیں تو بے چارے گھبرا کر فوراً جواب دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ فون پر وقت بھی بتا دیتے ہیں کہ فلاں دن اتنے بجے کی ڈاک سے ہمارا خط آپ کو مل رہا ہے۔ ناراض یہ کسی سے نہیں ہو سکتے اور بعض اوقات تو ان کی اس فطرت کی وجہ سے ناراض ہونے والا بے چارہ ناراض ہو ہو کر خود ہی یہ عادت چھوڑ دیتا ہے۔

ان کی دوسری عادت جو ہمیشہ غصے اور ناراضگی کا سبب بنتی ہے، وہ ہے وقت کی پابندی نہ کرنا! فرماتے ہیں بے ساختگی سے جینا چاہیے۔ مشین بن کر نہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس سلسلے میں نوبت لڑائی تک آ جاتی ہے۔ ایک دن فون پر بتایا کہ دفتر سے میری واپسی آپ کے ہوسٹل میں ہوگی۔ وقت چار بجے کا دیا۔ مجھے یقین تھا، پانچ بج جائیں گے۔ ندیم صاحب اور وقت کی پابندی کریں۔ وقت کی پابندی کریں ان کے دشمن۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ چار بجے سے موسم خراب ہونا شروع ہوا۔ شدید آندھی آئی۔ اس قدر کہ بادل گھِر گھِر کر آ گئے، بارش کے امکانات صدفی صد روشن ہو گئے۔ اور بلا کی سردی۔ ایک بار تو خیال آیا موسم کا خیال کر کے گھر چلے گئے ہوں گے۔ لیکن دل نہ مانتا تھا۔ جانتی تھی بے شک دیر کر کے آئیں۔ آئیں گے ضرور۔ یہ بھی ان کی ایک خاص عادت ہے۔ بہر حال کوئی پانچ بجے کے قریب جب آندھی پورے زور پر تھی، یوں کہ دو فٹ کے فاصلے پر کھڑا آدمی دکھائی نہ پڑتا تھا، ریت کے اس طوفان میں ندیم صاحب کی مہین جان

کہاں نظر آسکتی تھی۔ میں سخت گھبرائی ہوئی برامدے میں گیٹ کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ بغل میں بیگ دابے حسبِ معمول مسکراتے ہوئے جلدی جلدی چلے آرہے ہیں۔ ذرا بھی ایک قدم برامدے کے اندر اور دوسرا باہر تھا کہ بادل پھٹ پڑا — سخت ہنسی آئی، لیکن دکھ بھی ہوا کہ موسم کے تیور دیکھ کر گھنٹہ بھر پہلے یا کم از کم وقت پر آجاتے تو کیا مضائقہ تھا۔ اُس شام دیر تک نشست رہی، کڑاکے کی سردی تھی اور ہم تینوں ہوسٹل کے برامدے میں یتیموں کی طرح کرسیوں پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ بیچ میں کئی دور چائے کے بھی ہوئے۔ لیکن سردی تھی کہ کسی طرح کم ہونے میں نہ آتی تھی۔ البتہ ندیم صاحب کی باتوں نے ضرور گرم کیے رکھا۔ ہنس ہنس کر مزا آگیا۔ انہی دنوں کا ایک واقعہ ہے۔ جب ملتان میں ایکسائز انسپکٹر تھے۔ کہنے لگے وہاں سے سروس چھوڑ کر لاہور آیا تو بڑی مدت بعد ایک صاحب ملتان سے تشریف لے آئے۔ باتوں باتوں میں میں نے انھیں بتایا کہ میں بھی کافی دن ملتان میں رہا ہوں۔ خوش ہو کر بولے "آپ کب تھے وہاں؟" میں کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ دماغ پر زور دے کر خود ہی فرمایا "تب شاید آپ میرے زمانے میں وہاں تھے ——" میں نے عرض کیا یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس کا زمانہ تھا۔ اتنا ضرور یاد پڑتا ہے کہ وہ جارج پنجم کا زمانہ تھا —— وہ صاحب تو یہ جا وہ جا ہوئے اور ادھر ہمارے لیے ہنسی ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ ایسے لگا زندگی کا سارا بوجھ اور تمام مہمات یہاں تک کہ ان کے وقت پر نہ آنے کا تکدر بھی جاتا رہا۔

حساس پن ندیم پر ختم ہے لیکن ساتھ ساتھ خودداری کا بھی وہ عالم ہے کہ ہمیشہ پردے میں ہی رہتے ہیں۔ بے جا تعریف یا خوشامد سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ہاں دل بڑھانے کے لیے تعریف کرتے ہیں جب کبھی ہم جیسوں کے کئی افسانے "نقوش" میں چھاپ کر اس کی اچھی کبھی بُری پر بالکل چپ ... اچھی چیز کی تعریف کریں گے چاہے وہ تحریر میں ایک آدھ جملہ ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ دوسری بڑی بات یہ ہے کہ یہ صاحب بدنیتی کے دائرے سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ ایمانداری ادب کے سلسلے میں ہو یا زندگی کے کسی اور شعبے میں، یہ کبھی بھی اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے — کہتے ہیں انسان کوئی غلط کام کرے تو اس کا ضمیر یوں پڑتا ہے بلکہ چیخ اٹھتا ہے۔ ندیم کو کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ ان کا ضمیر کبھی ہڑبڑا کر نہیں جاگتا۔ نہ ہی اس کو کبھی چیخنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سارا کام یہ صاحب خود نپٹا لیتے ہیں۔ وہ صرف "جاگنے" کا کام کرتا ہے اور بس۔ انھوں نے اس پر کوئی دوسری ذمہ داری نہیں ڈالی ہے!

اب سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ ندیم نے یہ سارے رموز کہاں سے سیکھے؟ —— صاف ستھری زندگی گزارنے کا یہ نکتہ کس نے سمجھایا؟ جہاں تک میری سوچ کا تعلق ہے ندیم کی تمام تر اخلاقی قدریں اور سحر کار شخصیت گھریلو پس منظر میں تیار ہوئی۔ بلکہ زیادہ صحت سے کہوں تو یہ کیوں نہ کہوں کہ ان کی ذات کا سارا حسن ان کی والدہ محترمہ کی تربیت اور ان کے غیر معمولی پیار اور شفقت کا مرہون ہے۔ ندیم کے دل میں ماں کی محبت کا جنون ہے —— وہ ماں —— جس نے ننھے منے حساس ندیم کو زمانے کے گرم و سرد سے حصار بن کر چھپا لیا۔ جس نے خوددار و غیور ہونے کا درس ... ندیم کے قید ہو جانے پر جب اس کے دوست حکومت کے نام رحم کی اپیل لکھ کر ان کے پاس لے گئے تو اس معزز خاتون نے یہ کہہ کر وہ اپیل نہ دینے دی کہ میرے بیٹے نے کبھی کسی سے معافی نہیں مانگی۔ پھر اس کا جرم بھی کون سا ہے؟ —— اگر حکومت اسی بات سے راضی ہے تو جاؤ میرے بیٹے کو قید میں رہنے دو —— اور پھر وہ ماں —— جس نے بڑی بہادری سے

خلوص سے دو دو فرائض ایک ساتھ انجام دیئے۔ جو شوہر کو عبادت میں مستغرق دیکھ کر اپنی تمام تر ممتا اور شفقتوں کے ساتھ ندیم کی ذات پر چھا گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کے غیر معمولی پیار نے ندیم کے دل میں بھی ایک انتہائی شفقت بھرے دل کی تخلیق کر دی اور آج ندیم اتنے زود حس اور رقیق القلب ہیں کہ آنسو اُبھرتا کسی کی آنکھ میں ہے اور ٹپکتا ندیم کی آنکھ سے ہے۔ وہ اس دنیا کے ہر جاندار کے لیے سراپا شفقت و خلوص بن گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :-

محبت میری فطرت، آدمیت میرا سرمایہ

نہیں کسی سے بگڑنا میرا سبھاؤ نہیں
مری سرشت میں گلزار ہیں الاؤ نہیں

اور واقعی ندیم کی سرشت میں کوئی تلخی نہیں۔ وہ پاکیزہ فطرت انسان ہیں۔ وہ کسی کو دُکھ نہیں دے سکتے۔ ندیم نے عام انسانوں کی نسبت بہت زیادہ دُکھ اٹھائے ہیں ——— رشتہ داروں کے مظالم اور عزیزوں اور دوستوں کی زیادتیاں بھی سہی ہیں۔ احساسات کی آگ میں بھی جلے ہیں، بلکہ بعض اوقات تو اُن کا احساس اتنا گداز ہو جاتا ہے کہ اشعار سے لگتا ہے ندیم کو سانس لینا بھی بار ہو رہا ہے۔ مسلسل مفلسی اور بدحالی نے اُن کی زندگی کو تلخیوں کی بھٹی میں جھونکا ہے۔ ماحول نے باغی بھی بنا دیا۔ لیکن یہ تمام واقعات اور مصائب انھیں نیک دلی اور خلوص کی راہ سے نہیں ہٹا سکے ——— اُن کی خودداری ہر حال میں بحال رہی۔ وہ اپنی ذات کی شکست و ریخت کے انتہائی خطرناک موڑوں سے گزرے ہیں۔ لیکن وہ قدم قدم پر یوں سنبھل کر پہاڑ کی طرح پر جم گئے ہیں۔ ندیم نے ایک ایک سانس لینے پر بڑی نیک نیتی سے محنت کی ہے۔ بلندیوں پر پہنچنے کے لیے زینے کا ایک ایک پتھر اپنے ہاتھوں سے چُنا ہے اور جس نے انسان بننے کے لیے اتنی زیادہ محنت کر ڈالی ہو وہ کسی سے کیسے نفرت کر سکتا ہے؟ ——— وہ خود جلال و جمال کے دیباچے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"——— لیکن مصائب اور حوادث نے مجھے ابدی مایوسی کے جہنم زار میں نہیں جھونکا ——— مجھ سے میرا جذبۂ خودداری اور غرورِ نفس نہیں چھینا۔ میرے خلوص اور انسانی محبت پر "ڈاکہ نہیں ڈالا" اور شاید یہ فرطِ گریہ کا ردِعمل ہے کہ میں اب مدتوں ہنس کر زندہ رہنا چاہتا ہوں" ———

وقت نے یہ کروٹ ضروری اور اب وہ خدا کے فضل سے ہنس کر جی رہے ہیں۔ لیکن اُن کی ہنسی کا بھی کچھ اعتبار نہیں۔ جانے وہ کتنے زخم چھپا کر ہنستے ہوں گے ——— وہ اگر خوش بھی ہوتے ہیں تو لوگوں کی خوشیوں پر ——— ندیم نے اپنی ذات کو نہ پہلے کبھی اپنے سامنے رکھا تھا اور نہ اب رکھتے ہیں ——— اور اب جبکہ وہ خود دُکھوں کے طوفان سے گذر آئے ہیں، دوسروں کے لیے روتے ہیں ——— دُکھوں کی یلغار میں تو کسی نے اُن کا ساتھ نہ دیا۔ لیکن آج اُن کی ہنسی مشترک ہے۔ اس ہنسی میں اُن لوگوں کی ہنسی بھی شامل ہے جو صرف خوشیوں کا ساتھ دینے والے ہوتے ہیں۔ وہ بقول منٹو "ہڈیوں کے گودے تک جذباتی" ہیں۔ ایک خط میں منٹو نے انھیں لکھا تھا ———

"——— ندیم صاحب ایسے گیت لکھیے جن میں احمد ندیم نظر آئے ——— وہ احمد ندیم جو سچ مچ روتا ہے، جو کہ محبت میں ناکام رہا ہے، جو شاعر کم اور غم زدہ انسان زیادہ ہے" ———

لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں کہ ندیم جذباتی اور غمزدہ ہیں۔ وہ انسانیت کی خاطر مر مٹنے والے بھی ہیں۔ ان کی شاعری اور افسانوں میں لفظ انسان اور انسانیت کی، تنی زیادہ تکرار ہے کہ حیرانی ہوتی ہے۔ ایک اکیلے ندیم کے سامنے انسانیت کے اتنے ڈھیر سارے رُخ کیسے اور کیونکر آئے ہوں گے ـــــ اُن کی ہر کہانی اور ہر شعر میں انسانیت کا کوئی نہ کوئی پیغام موجود ہے ـــــ بلکہ اگر ندیم نے محض ایک افسانہ "میں انسان ہوں" بھی لکھا ہوتا تو اُن کی ذات اور فطرت کے سارے انسانیت سے بھرپور رُخ ہمارے سامنے آجاتے ـــــ یہ افسانہ ـــــ جس میں آزادی حاصل کرنے کی سچی لگن بھی ہے اور اندوہناک مناظر بھی ہیں، جس میں آزادی کی خوشی کے ساتھ ساتھ فن کار کی گہری سوچ کا اتنا درد موجود ہے کہ وہ ہمیں ایک ایک لفظ کے دائرے میں بیٹھا روتا نظر آتا ہے ـــــ یہ کہانی ایک کہانی بھی ہے اور ایک تاثر بھی ـــــ اس میں انسان کے فاتح ہونے کا روپ بھی نظر آتا ہے اور ننگی انسانیت کا ماتم بھی ـــــ اس میں خالق سے گلہ بھی ہے۔ لیکن اُس کی رحمتوں کی امید بھی ہے ـــــ کہانی میں ندیم نے خود کو ایک تماشائی کی حیثیت سے پیش کیا ہے ـــــ لیکن وہ تماشے کے ایک ایک منظر میں خود موجود ہیں ـــــ درندہ صفت انسانوں کے ہاتھوں آزادی کے پروانوں کا قتلِ عام دیکھ کر وہ ایک ایک مقتول کے ساتھ قتل ہوتے نظر آتے ہیں ـــــ وہ بم کی طرح پھٹتی ہوئی انسانیت کو دیکھ کر درد سے بلبلاتے بھی ہیں اور آنکھوں دیکھے پر یقین رکھنے کے باوجود ایک درندہ صفت کو معصوم بچے کو ٹانگوں سے چیرتے دیکھ کر چیختے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں:ـــــ

> "ـــــ نہیں نہیں تم ایسا نہیں کرو گے ـــــ تم ایسا نہیں کر سکتے ـــــ یہ نیا انسان ہے ـــــ یہ مستقبل کا وارث ہے ـــــ اسے ایک نئی دنیا کو جنم دینا ہے ـــــ اس کی قدر کرو ـــــ اس کی پوجا کرو ـــــ اسے سلامی دو"ـــــ

دہشت و بربریت کی انتہا دیکھنے کے باوجود ندیم پُر امید ہیں۔ در اصل ندیم انسان کو کسی چھوٹے مقام پر دیکھنا برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ سب میں اچھائی اور برائی ڈھونڈتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ خود ایک بڑے انسان ہیں اور وہ بڑے انسان اس لیے ہیں کہ سب انسان اُن کو دوستوں کی طرح عزیز ہیں اور وہ سب کے لیے اسم بامسمیٰ ہیں۔ حسد و عناد کے الفاظ اُن کی لغت میں موجود نہیں ہیں ـــــ بعض اوقات تو ندیم کے زندگی گذارنے کے صاف ستھرے اصُولوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کی ساری انتہاؤں کو سمجھ لیا ہے ـــــ لیکن یہ انتہا آج ہی نہیں دیکھی، آج ہی نہیں سمجھی بلکہ آج سے تینتیس سال پہلے کا تیئیس سالہ نوجوان، ندیم بھی بڑی خود اعتمادی سے ہمیں یہ کہتا نظر آتا ہے:ـــــ

> بُرے بھلے کی مجھے خود خبر ہے میرے بزرگ
> کہ اپنے کاتبِ اعمال کا مشیر ہوں میں

پھر جوں جوں ندیم کے حوصلے غمِ زمانہ سے نبرد آزما ہوتے رہے اُن کی آواز میں، یوسی کی بجائے ایک فاتح کی گونج پیدا ہوتی گئی:ـــــ

> تباہیوں سے خود آگاہیاں نچوڑی ہیں
> کلائیاں غمِ ایام کی مروڑی ہیں

اور جب ندیم خود آگہی کے مقام تک آگئے تو دُکھوں کے ساتھ مکمل سمجھوتہ کرلیا اور ہمیشہ کے لیے پُر امید رہنا سیکھ لیا۔

اور دراصل یہی ندیم کا "بڑا پن" ہے:۔

میرا احساس مجھ سے کہتا ہے
وقت رستہ بدلتا رہتا ہے

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ندیم کے لہجے میں طوفانوں کی سی تندی اور تیزی آتی چلی گئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوچتے ہیں کہ جو خون بہنا ہے وہ منزل تک پہنچنے کا نذرانہ بن جائے۔ قیامت کے یہ آثار "جلال و جمال" سے لے کر "دشتِ وفا" تک جگہ جگہ مسلسل نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں ندیم کا لہجہ ضرور تبدیل ہوا ہے۔ لیکن وہ کمال و تمکین کے ساتھ پوری قوت سے آگے بڑھتے رہے۔ ان کے عزائم میں جوش اور سوچ میں گہرائی پیدا ہوتی چلی گئی:۔

کائنات ایک کھلونا ہے میری نظروں میں
جی میں جس طرح بھی آئے گی گھماؤں گا اسے
اس میں گوندھے ہوئے جوہر کو پرکھنے کے لیے
گاہ توڑوں گا اسے گاہ بناؤں گا اسے

اس دور کو نئی خوشیوں اور بہاروں کی نوید دینا ندیم کا اولین مشن ہے:۔

سفینہ محوِ سفر ہو تو نارسیدہ نہیں
قدم قدم پہ کنارے ہیں، تم سدھارو بھی
سینۂ سنگ کی حدت سے کھلیں گے گلزار
اسی شدت سے زمانے میں بہار آئے گی

وہ سکون کو زندگی کی موت اور بے قراریوں کو زندگی کی جان قرار دیتے ہیں:

دل میں جب بے کلی نہیں رہتی
زندگی، زندگی نہیں رہتی

ان کے نزدیک انسان کے ارادوں میں بے پناہ قوت پوشیدہ ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ اس کائنات میں عظمت کا سب سے بڑا نشان ہے بلکہ بعض اوقات تو ندیم نے انسان کو خدا سے زیادہ حسین اور طاقتور بتایا ہے:۔

تو سنگ ہے اور وہ شرر ہے
تو آگ ہے اور وہ اجالا
تو تخم ہے، نمو کا پاسباں وہ
تو دشت ہے وہ چراغِ لالہ
انسان نے تجھے حسیں بنایا
انسان عظیم ہے خدایا

اور پھر جب ندیم انسان کی عظمت کو ایک بار تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر وہ خالق کے ساتھ اُس کی کسی بھی

قسم کی بحث و تکرار کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ ساری ذمہ داری انسان پر ڈال رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں انسان کی تمام تر الجھنیں، دکھ اپنی جگہ ہیں۔ لیکن اس کی نیکی و عظمت کی اہمیت مسلّم ہے — وہ چاہتے ہیں کہ صلے کی پروا کیے بغیر انسان نیکی کرتا چلا جائے — نیکی اور صرف نیکی — انسانیت کے لیے درد کسی صورت اور کسی بھی صورت ختم نہ ہونے پائے چاہے زمانہ سازی اور بدنیتی و بدنامی ہونے کی وجہ سے ندیم کی طرح تین تین دن کے فاقوں کا شکار ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔ یہی انسان کی عظمت ہے — ندیم نے یہ سارے پتھر اپنے کلیجے پر رکھے ہیں — پیٹ پر بھوک کے پتھر بھی باندھے ہیں لیکن وہ انسان سے بدگمان نہیں ہوئے — وہ چاہتے ہیں کہ آج وہ دردمندی اور انسان دوستی کی انتہائی بلندیوں پر کھڑے مسکرا رہے ہیں — یہ حوصلہ صرف ندیم کا ہے جس نے یہ کہنے کے باوجود: —

زندگی اہلِ شر کے گھر کی کنیز
خیر کا کام مر کے کام آیا

شاید مفلسی میں وقت گذارا۔ یہ اور بات ہے نہ وہ گُر ہنر نہیں سیکھے۔ وہ اچھے اصول وضع کرنا اور پھر ان پر مٹنا جانتے ہیں۔ خیر کا کام اس کے کام آئے نہ آئے۔ خیر کی قدروں پر وہ ہرگز حرف نہیں آنے دیتے۔ یہ شعر پڑھ کر میں نے انھیں لکھ بھیجا تھا۔ اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ اگلا جہاں موجود ہے؟ اگر آگے بھی خلا ہوا تو —؟ — تڑپ کر لکھا — یہی تو میں چاہتا ہوں کہ صرف نیکی کی خاطر نیکی کی جائے — جہاں نیکی کے لیے صلے کی بات چلی، وہاں نیکی بدی بن گئی — اس کا سارا حسن غارت ہو گیا —" یہ ساری باتیں وہ صرف زبانی زبانی یا تحریروں ہی میں نہیں کرتے، بلکہ خود بھی ان پر سختی سے عمل پیرا ہیں۔ بہرحال ایک ایسے شخص کے ساتھ دوستی رکھنے یا خط و کتابت کرنے سے یقیناً روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے جو نیکی اور شرافت کے سارے اصول نبھانا جانتا ہو۔ لیکن میں اُن چند حضرات کو جو ندیم صاحب سے نئی نئی دوستی گانٹھنے چلے ہوں یا خط و کتابت کرنے کے خواہشمند ہوں، اُن کی دوستی کی چند قباحتیں بھی بتانا چاہتی ہوں تاکہ میرا لکھا سند رہے اور بوقتِ پریشانی کام آئے: —

(۱) ندیم سے دوستی کرتے وقت آپ کو ندیم کے حوصلوں کے برابر حوصلہ پیدا کرنا پڑے گا جو دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔

(۲) دوستی کے دوران کئی مرتبہ آپ کا دل جل کر راکھ ہو گا، وہ یوں کہ مثال کے طور پر ندیم صاحب سے آپ کی پکی دوستی ہو گئی ہے۔ آپ ان سے ملنے جاتے ہیں۔ اتفاق سے کوئی اور صاحب تشریف لے آتے ہیں، چاہے وہ اجنبی ہی کیوں نہ ہوں۔ ندیم صاحب انھیں انتہائی جوش و خروش سے خوش آمدید کہیں گے۔ اُن کے ساتھ ہنسیں گے، قہقہے لگائیں گے — بے شک وہ آپ کو بھی نظرانداز نہ کریں گے۔ لیکن آپ کی اس خوش فہمی کا سارا تصور تباہ و برباد ہو جائے گا کہ ندیم کی دوستی اور خلوص آپ کی ذات پر آ کر ختم ہو گیا ہے۔

(۳) آپ کے خطوط کا انتہائی خلوص سے جواب دیں گے — اُن کے خطوط میں آپ ملاقات کی سی خوش گواری پائیں گے بلکہ اُن کے اس اپنائیت کے اظہار پر آپ کی خوشی کا کچھ ٹھکانا نہیں رہے گا لیکن عین ممکن ہے کہ دوسرے دن آپ پر اچانک انکشاف ہو کہ اس سے زیادہ خلوص بھرے خطوط تو انھوں نے اپنے کئی اور جاننے والوں کو بھی لکھ رکھے ہیں۔ آپ مارے حسد کے کباب ہو جائیں گے۔ بھاگ کر اُن کے پاس پہنچیں گے اور کہنا چاہیں گے کہ دیکھیے جناب عالی یہ کیا غضب ہے؟ اس قسم کی زیادتی ہمارے ساتھ نہیں چلے گی۔ کیا دنیا میں مساوات کے ٹھیکیدار صرف آپ؟

رہ گئے ہیں؟ ـــــ لیکن یاد رکھیے آپ کچھ بھی نہیں کہہ سکیں گے کیونکہ یہ ساری باتیں کرنے سے پہلے آپ ان سے میل جول کا RISK لے کر ان کی شخصیت سے پوری طرح مسحور ہو چکے ہوں گے۔

(۴) انسانی زندگی میں ایک آدھ ایسا وقت ضرور آتا ہے جب اس نامرد دنیا میں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ دودھ کچو کے لگتے ہیں کہ زندہ رہنا ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی نہ کسی طرح اس سوچ کی بھنک ندیم صاحب کے کانوں میں پڑ گئی ہے تو آپ مارے گئے۔ اُن کی معصوم جان پوری قوت سے آپ کی اس سوچ سے نبرد آزما ہو جائے گی بلکہ یہ صاحب اُس وقت تک آپ کے سرہانے کرسی ڈال کر بیٹھے رہیں گے جب تک اپنی بات نہ منوالیں ـــ یہ اور بات ہے کہ اُن کے روکنے کا انداز اتنا قاتل ہوگا کہ آپ قتل ہو جائیں گے لیکن اصلی خودکشی کا حوصلہ نہیں کر پائیں گے۔ یاد رہے یہ صبر کی انتہائی کڑی قسم ہوگی۔

(۵) آپ کا خط جونہی ان کے ہاتھوں میں پہنچے گا فوراً جواب دیں گے لیکن بارہ میں سے دو کا ـــــ باقیوں کے لیے مہینوں کی ڈبکی لگا جائیں گے۔ بے شک مصروف ہوتے ہوں گے ـــ لیکن خط بھیجنے والا یہ کیوں سوچے ـــــ بعض اوقات کوئی اہم مسئلہ زیرِ بحث ہوتا ہے ـــ بہرحال اب کے آپ ان سے ناراض ہو جانے کا پختہ ارادہ کریں گے سب سے پہلے تو یہ سوچیں گے کہ آئندہ قسم ہے جو ان کو خط لکھا۔ دوسرے یہ کہ کہیں آمنا سامنا ہو گیا تو منہ موڑ کر گزر جائیں گے ـــ لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں آپ ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہ کر پائیں گے ـــــ خط بھی کسی نہ کسی بہانے سے آپ خود لکھیں گے بلکہ مجبور ہو جائیں گے اور منہ موڑ کر گزر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ـــ ایک دفعہ کہیں بہن جمیلہ ہاشمی بھی اسی چکر کا شکار ہو گئیں بعد میں آمنا سامنا ہوا تو انھوں نے کہا جائیے ندیم صاحب میں آپ سے نہیں بولتی ـــــ انھوں نے جھٹ کہا ـــ بی بی بولیں گی کیسے نہیں ـــ بول تو آپ رہی ہیں میرے ساتھ ـــــ!

خیر آپ کے لیے ایک تیر بہدف نسخہ یہ ہے کہ اپنے غم و غصہ کی تدفینی کے لیے انھیں لکھ بھیجیے کہ آپ بیمار ہیں ـــ بس یہ بات ان کے بس سے باہر ہو جائے گی۔ بھاگے بھاگے آئیں گے۔ اب آپ بے شک ڈاکٹر صاحب کو بھی اپنے پاس سے اٹھا دیجئے مسیحائی کا سارا کام یہ خود سنبھال لیں گے ـــ آپ بے فکر ہو کر لیٹے رہیے۔ طرح طرح کے گلے پچھلے گلے شکوے کرتے جائیے ـــ ہو سکے تو اونچی اونچی آواز میں بھی بولتے جائیے ـــ یہ سر جھکا کر سب کچھ سنتے جائیں گے اور جواب میں ہر قسم کی معذرت کر ڈالیں گے ـــ

(۶) ان کی اس قسم کی بے پروائیوں پر آپ کو سخت غصہ آیا کرے گا۔ جواب میں آپ بھی چاہیں گے کہ اے کاش آپ کی بھی کسی بات پر اُن کو غصہ آئے اور وہ بھی آپ ہی کی طرح تلملا اٹھیں ـــ لیکن معاف کیجیے ان کو غصہ میں دیکھنے کا آپ کا ارمان کبھی بھی پورا نہیں ہو سکے گا ـــ غصے کی مادہ ان کے خمیر میں کی ہی نہیں گئی۔ ویسے اگر اتفاق سے انھیں غصہ آ بھی جائے تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ خاموشی اختیار فرمالیں گے اور بس ـــــ یہ بے چارے لڑائی جھگڑے کے لفظ سے بالکل نابلد ہیں ـــ اس اعتبار سے آپ سراسر فائدے میں رہیں گے۔ البتہ ان کی خاموشی بھی قاتلوں کا سا کام کرتی ہے ـــ اُن کے خیال میں "بعض عناصر کو نظرانداز کر کے بھی تو مارا جا سکتا ہے" ـــ لیکن

یہ ان کے غصے کی آخری مگر شریفانہ حد ہوگی ۔ یہ زیادہ دیر تک کسی کو ناراض نہیں رکھ سکتے ۔ لکھنے کو تو انھوں نے ایک کتاب جلال و جمال تحریر رکھی ہے لیکن خود صرف لفظ "جمال" کی تفسیر و تشریح ہیں۔ دوسرے لفظ کو محض لفظی رعایت سمجھا جائے ـــــ زندگی کے جمال پر تو اُن کے اعتبار کا وہ حال ہے کہ ایک بار مجھے لکھ بھیجا :

"میرے پاس وقت ہو تو میں دن بھر ایک پھول کو دیکھتے رہنے میں گذار دوں اور ایک پل کے لیے بھی نہ اکتاؤں ـــ یہی زندگی اور زندگی کا حسن ہے"ـــــ

بہرحال اگر آپ ندیم صاحب کے ہاتھوں یہ تمام سودمند قسم کے نقصانات برداشت کر سکتے ہیں تو بے شک بسم اللہ کیجئے۔ آج ہی اُن سے دوستی گانٹھیے۔ اُن کے ندیم بن جائیے۔ اُن کی دوستی آپ کو سچا سکون قلب مہیا کرے گی۔ آپ اچھی اچھی بڑی بڑی اور عظمتوں کی باتیں اُن سے سنیں گے۔ خدانخواستہ کبھی آپ پریشان ہوں گے تو اس انداز سے تسلی دیں گے کہ آپ کا زندگی بھر پریشان رہنے کو جی چاہے گا تاکہ اُن کی اچھی باتیں ختم نہ ہونے پائیں۔ کبھی نصیحت کرنے پر آئیں گے تو ایسا طریقہ اختیار کریں گے کہ لفظ نصیحت کی روایاتی تلخی بھی ختم ہو جائے گی۔ لیکن ایک بات ضرور یاد رکھیے وہ یہ سب کچھ اس لیے نہیں کریں گے کہ خود بہت پرسکون زندگی گذار رہے ہیں۔ بلکہ صرف اس لیے کہ وہ دکھوں کی بھٹی سے گذر رہے ہیں اور سکھ اور سکون کی قیمت جانتے ہیں :۔

میری قسمت میں شب تھی لیکن میں
شمع بن کے سحر کے کام آیا

میرے نام ندیم صاحب کے جتنے خطوط ہیں میرے لیے روشنیوں کا مینار ہیں۔ انھوں نے مجھے اتنی اچھی اچھی نصیحتیں کر رکھی ہیں کہ بعض اوقات تو سچ مچ جینے کو جی چاہتا ہے۔ آٹھ دس ماہ ہوئے میری سروس ہوئی تو مجھے بڑے خلوص سے لکھ بھیجا۔

"ــــ یقین کیجیے آپ کے برسرِکار (برسرِروزگار نہیں) ہونے سے مجھے اتنی بے حساب خوشی ہوئی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا اس خوشی کا اظہار کیسے کروں ؟ ــــ عملی زندگی میں قدم دھرنے کا یہ پہلا مرحلہ مبارک ہو۔ مگر یاد رکھیے۔ بہت پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھائیے گا ــــ انسان ہے تو بہت پیاری مخلوق، لیکن صدیوں کے شکنجوں نے اُسے خاصا کمینہ بنا دیا ہے۔ آپ کی سی نیک اور اچھی اور امنگوں سے بھری لڑکی کو زندگی کی راہ ہموار نہیں مل سکے گی۔ ان نشیب و فراز سے آپ متاثر ہوں گی مگر اس تاثر کو اپنے اوپر مسلط کرنے کی بجائے اس سے کچھ سیکھیے گا۔ اُسے تجربہ بنا لیجیے گا۔ شکستہ خاطر نہ ہوجیے گا۔ ہمیشہ اس عزم کے ساتھ آگے بڑھیے کہ رکاوٹیں تو بہرحال ہوں گی جنھیں سلیقے اور استقامت سے طے کرنا ہی بہادری ہے ــــ مجھے یقین ہے کہ انشاءاللہ آپ ایسا ہی کریں گی ــــ اب میں آپ کے مستقبل کی آسودگی (روحانی آسودگی، ذاتی آسودگی) کی دعا کرتا ہوں اور مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ کے سلسلے میں میری دعا قبول ہو جاتی ہے۔ ورنہ بقول اکبر الہ آبادی :ــــ

دعائیں عرش پر جاتی تو ہیں، کچھ کر نہیں آتیں"

اور یہ حقیقت ہے کہ ندیم صاحب کی دعائیں اور نیک مشورے قدم قدم پہ ہمارا ساتھ دیتے رہے۔ ایک اور خط میں مجھے ایک نہایت مخلصانہ مشورہ دیا ہے (مشورے کے پس منظر میں ان کی انسان دوستی کا جذبہ ملاحظہ ہو)

"۔۔۔ اگر کسی عزیز یا دوست کے طرزِ عمل سے آپ کو صدمہ پہنچا ہے تو صدمے کو پوری طرح قبول کر لینے کی بجائے آپ اس صدمے کے دونوں رخوں کا جائزہ لیجیے۔ ہو سکتا ہے اس طرح متذکرہ صدمے میں کچھ کمی پیدا ہو جائے ۔۔۔ دراصل انسانی رشتے بہت مقدس ہوتے ہیں۔ انھیں توڑنا ایک روحانی حشر کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ چنانچہ انھیں توڑنے سے پہلے یا ان کے ٹوٹنے سے پہلے خود اپنے آپ سے تسلیم کر لینا بہت ضروری ہوتا ہے۔ تب انسان غیر جانب داری اور غیر جذباتیت سے حقیقت پسندی کے ساتھ معاملات کا جائزہ لے سکتا ہے اور تب اکثر یوں ہوتا ہے کہ غلط فہمیوں کا میل دھل جاتا ہے اور رشتوں کا تقدس پھر سے نکھر آتا ہے۔۔۔"

مجھے یاد نہیں پڑتا وہ کون بزرگ تھے، مگر مجھے کسی نے نصیحت کی تھی کہ تعلقات بنھانے کے لیے دو چیزوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ایثار کی اور درگزر کی، اور اگر انسانی رشتوں کی استواری کے سلسلے میں دوسرے کی کمزوریوں سے بھی پیار نہ کر سکے تو اُسے ہمیشہ ناکامیوں کا سامنا رہتا ہے۔ خود میں نے اس نصیحت کو آج سے ربع صدی پہلے ایک شعر میں یوں سمویا تھا:۔۔۔

"کچھ درگزر کا کھیل، کچھ ایثار کا کمال
ورنہ وہ کون ہے جو کسی سے نبھا سکے"

ندیم سب کے ساتھ نباہ کرنا جانتے ہیں اور وہ اس لیے کہ ان میں ایثار اور درگزر کی قوتیں اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں۔ انھیں انسانی رشتے بے حد عزیز ہیں۔ ایک خط میں مجھے لکھا ہے:۔۔۔

"۔۔۔ یہی رشتے خاندانی ہوں یا معاشرتی، انسانی زندگی کی متاع ہوتے ہیں۔ اگر کسی نے یہ رشتے نبھائے تو میں سمجھتا ہوں اس نے زندگی عبادت میں بسر کر دی۔۔۔۔"

زندگی ندیم کے نزدیک خدا کی بہت بڑی نعمت، اور موت تک کا ایک خوبصورت اور عجیب وقفہ ہے۔ اس کو دکھوں میں ضائع کر دینا بہت بڑی حماقت ہے۔ بیزاری اور تھکن کا احساس لیے زندہ رہنا تو کوئی زندگی نہیں ہے۔ وہ مصائب کے پہاڑوں سے ٹکرانے کے بعد صحیح سلامت بچ جانے ہی کو زندگی کا اصلی حسن سمجھتے ہیں ۔۔۔ ایک اور جگہ اسی خط میں لکھتے ہیں:۔۔۔

"۔۔۔ آپ اتنی چھوٹی عمر میں زندہ رہنے سے کیسے تھک سکتی ہیں؟ ہزار مصائب اور ہزار آزمائشوں کے باوجود بھی کیسے تھک سکتی ہیں؟ ۔۔۔ کیا آپ نے کبھی چٹان کے نیچے سے نکلتی ہوئی گھاس کی تر و تازگی دیکھی ہے؟ ۔۔۔ یہی زندگی ہے اور یہی زندگی بسر کرنے کا فن ہے۔۔۔"

زندگی کو کوکین کی طرح بسر کرنے کا فن ندیم بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ اسی خط میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:۔۔۔

"۔۔۔ وعدہ کریں کہ آپ پوری خود اعتمادی کے ساتھ، اپنے زخموں اور دکھوں سے لاپروا ہو کر نہیں

بلکہ انھیں ایک امانت سمجھ کر سینے سے لگا کر خود داری اور اولوالعزمانہ زندگی کی راہ پہ آگے بڑھتی رہیں گی۔ میں ہمیشہ آپ کے لیے دست بہ دعا رہوں گا۔"

سمجھ میں نہیں آتا کہ ندیم صاحب دوسروں سے اپنے جیسے حوصلوں کی توقع کیوں رکھتے ہیں؟ — بھلا سب لوگ ایک مقام پہ کیسے کھڑے ہو سکتے ہیں؟ — خصوصاً مجھ جیسی حساس لڑکی کہ جس کے ہنسی میں بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ندیم صاحب نے مجھے ایک بڑا فکر انگیز خط لکھا تھا —

"رہی یہ بات کہ ہنسی کی کوشش میں آنسو نکل آتے ہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں، ایک آرٹسٹ کے لیے یہ صورت حال ایک نعمت ہے۔ رونا نعمت تو یقیناً نہیں ہے اگر انسان کا جوہر آنکھوں کے راستے ٹپک جاتا ہے، مگر جو شخص رو نہیں سکتا اور مسلسل ہنستا چلا جاتا ہے اس پر رونے کو جی چاہتا ہے۔ میرا ایک شعر ہے:—

ہم دل کے گداز سے ہیں مجبور
جب خوش بھی ہوئے تو رو دیے ہیں

پھر میرا ایک بہت ہی پرانا شعر ہے —

مدت کے بعد اذنِ تبسم ملا مگر
وہ بھی کچھ ایسا تلخ کہ آنسو نکل پڑے

یہ میں صرف اس لیے لکھ رہا ہوں کہ ہنسنے کی کوشش میں رو دینے کی کیفیت صرف آپ پر ہی نہیں گذری، آپ جیسے ہزاروں لاکھوں انسانوں پر گذری ہے۔ اگر گریہ کی یہ کیفیت بے قابو نہ ہو جائے تو یہ ایسا وقت بھی آتا ہے جب رونے کی کوشش میں انسان کی ہنسی نکل جاتی ہے — یہاں میں نے رونے کی کوشش کا ذکر کیا ہے۔ ورنہ بے ساختہ رونا تو ایک نعمت ہے۔ میں تو خود اپنے پرانے افسانے پڑھتے ہوئے بعض اوقات زار زار رو دیا ہوں! — انسانی تعلقات اور رشتوں کے سلسلے میں امیدوں سے — پے در پے امیدوں سے — بچنے کا طریقہ ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ کسی سے بھی بہت زیادہ توقعات وابستہ نہ کیجیے۔ خود اپنے آپ سے بھی زیادہ توقعات وابستہ نہیں ہونی چاہئیں۔ کیونکہ قضا و قدر کے جس چکر میں ہم گرفتار ہیں، اس میں بھی توقعات پوری نہیں ہوتیں، بیشتر ناکام رہتی ہیں اور ہر توقع کی شکست حساس انسان کا المیہ بن جاتی ہے۔ میں مانتا ہوں بعض رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے انسان بے بسی کے عالم میں ان گنت توقعات وابستہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پھر ان میں سے ایک آدھ توقع کی شکست دنیا اندھیر کر دیتی ہے، ہر حساس انسان کو اس منزلِ کرب سے گذرنا ہوتا ہے — مگر تجربہ تو بہت بڑا استاد ہے، تجربے سے سیکھنا چاہیے۔ تعلقات استوار رہنے چاہییں مگر ایک RESPECTABLE فاصلے تک — یہ فاصلہ توقع کی شکست کا فاصلہ طے کر دیتا ہے۔ نہ کر سکے تو دکھ کی شدت میں کمی نہ و پیدا ہو جاتی ہے — بظاہر یہ ایک ناممکن العمل مشورہ ہے مگر اس کے سوا کوئی حل نہیں — مجھے آپ کی ذہانت سے توقع ہے

کہ آپ نے اس بارے میں بھی یقیناً سوچا ہوگا۔ اگر سوچا ہے تو پھر اس پر عمل کرکے دیکھیے۔ دراصل انسان کی اصل پرکھ برتنے سے ہوتی ہے اور برتنے سے ہی قربت اور برتنے کے لیے ایک مدت درکار ہوتی ہے۔ انسان بے حد پیچیدہ مرکب ہے۔ یہ ذہنی عمل شخصیت کو بہت کم نمایاں ہونے دیتا ہے۔ البتہ جب پیار کرنے والی دو شخصیتوں کے سب خول اتر جاتے ہیں اور پیار جب بھی قائم رہتا ہے تو یہ ذہنی آسودگی کی معراج ہے ——— مگر یہ معراج شاید پیغمبروں کو نصیب ہو سکتی ہے، عام انسانوں میں خوبیوں کے ساتھ کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں۔ اگر کوتاہیوں سے بھی پیار کرنا اور پیار نہ کیا جا سکے تو انھیں نظرانداز کر دیا جائے تو سبحان اللہ"! ———

بات دراصل یہ ہے کہ ندیم حد سے زیادہ حساس واقع ہوئے ہیں وہ انسان کے چھوٹے سے چھوٹے دکھ پر بھی تڑپ اٹھتے ہیں اس خوف سے کہ ان ہی چھوٹے چھوٹے دکھوں سے بڑے بڑے المیے اور سانحے جنم لیتے ہیں۔ لفظ المیہ ندیم کی اپنی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا اس لیے کہ وہ المیوں اور دکھوں کی گود میں پلے بڑھے ہیں۔ البتہ کسی دوسرے کو دکھوں سے دوچار ہوتے نہیں دیکھ سکتے ——— اور پھر جب ہماری پوری قوم سقوطِ مشرقی پاکستان کے تاریخی المیے سے دوچار ہوئی تو ندیم کے حوصلے جواب دے گئے ——— وہ اس غم پر بچوں کی طرح روئے ہیں۔ ان کا یہ دکھ کسی صورت کم ہونے میں نہیں آتا ——— وہ جو اتنے حساس اور مخلص ہیں کہ کسی کے چہرے پر اداسی کی لکیریں تک نہیں دیکھ سکتے۔ اے کاش ان کے غم کا کوئی اس وقت اندازہ لگا سکتا جب ان کو ہزاروں جانوں کے دردناک قتل کی خبر ملی ہوگی۔ ندیم نے ہزاروں بھائیوں کی شہادت اور ہزاروں بہوؤں بیٹیوں کے اجڑنے کی خبر کن کانوں سے سنی ہوگی؟ ——— جنگ بندی کے بعد دیر تک ان کا قلم روتا رہا ——— ان کی نظم "میں روتا ہوں" سچے جذبات کی بڑی شفاف تصویر ہے ——— ان کے روتے بلبلاتے احساسات کا منظم اظہار ہے ———

جنگ بندی کے تقریباً پندرہ روز بعد مجھے ان کا یہ خط ملا: ———

نہیں مسرت بی بی - یہ بات نہیں ہے - مجھے حیرت ہے آپ مجھے کبھی کبھی عنقا کیوں سمجھنے لگتی ہیں - میں اگر حاضر نہیں ہو سکا یا عریضہ نہیں لکھ سکا تو آپ کو مجھے معافی کا موقعہ تو دینا چاہیے -

بات یہ ہے کہ میں بے حد حساس ہوں - یہ میں کوئی انکشاف نہیں کر رہا ہوں - ہر فن کار سائنس کی حد تک حساس ہوتا ہے - آپ خود اور نکہت بی بی بے حساب حساس ہیں - میری مشکل یہ ہے کہ بقول ایک شاعرِ قدیم:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

چنانچہ دسمبر کا سارا مہینہ جنگ کے دوران ہر نازک دن [illegible] ذہنی طور پر لڑتا

اور پھر شہید کے ساتھ مرتا رہا ہوں۔ جب وہ یہ مشرقی پاکستان میں شکست
نے اور مغربی پاکستان میں جنگ بندی نے اس حد تک بوکھلا دیا کہ میں بہ خود کو
ایک ناقابل علاج مریض سمجھتا تھا اور رو رو دیا۔ شاید آپ نے
یہی روز لاہور میں میری نظم "جب روتا ہوں" پڑھی ہو یا ٹیلی ویژن پر سنی ہو۔
میرے اندر تو جیسے غدر سا برپا ماتم بچھ گیا اور میں آج تک اس کیفیت
کو ختم نہیں کر سکا۔ یہ مجھ سے نادان ہیں - مگر ہر حیران ہے کہ اتنا شدید
اثر کیوں ہے۔ اور میں سوچتا ہوں کہ انسان خود اپنی ذات میں ایک انجمن ہے،
جب اس کا دل مرتا ہے تو یہ انجمن کس خوفناک حد تک اجڑ جاتی
ہے۔ شاید میں آج کل ذہنی طور پر اجڑا ہوا ہوں۔ آپ جس بات پر
مجھ سے خفا ہیں، اس کی بنیاد میرا یہی اجاڑ پن ہے۔

میں آپ سے معذرت خواہ ہوں اور اب وعدہ کرتا ہوں کہ پھر ایسا
نہیں ہونے دوں گا۔ اب آپ بتائیے کہ کیا جب آپ میرے پاس حاضر
ہوں یا آپ کب میرے دفتر تشریف لا رہی ہیں۔

نکہت لودی کا خط بھی مل گیا ہے۔ اس کا جواب بالمشافہ عرض کرنا چاہتا
ہوں۔ انہیں تسلی دیجیے کہ کتابوں کی مارکیٹ ذرا سی سنبھلے تو ان کا
ناول ضرور چھپے گا۔ آج کل اس مارکیٹ میں حالات دگرگوں ہیں۔ انہیں
دعا — جواب کا منتظر ہوں۔   دعاگو ندیم

بہرحال میں شکر گزار ہوں — ندیم صاحب شاعر اور افسانہ نگار قاسمی صاحب کی جنھوں نے مجھے احمد شاہ صاحب سے متعارف کرایا۔ بات ناانصافی کی نہیں، بلکہ میں پوری سچائی اور خود اعتمادی سے کہتی ہوں کہ مجھے احمد شاہ ان دونوں حضرات کے درمیان سے پورے قد سے اٹھتے نظر آتے ہیں — اُن کا سارا فن اُن کی ذات کے گرد گھومتا ہے — وہ ذات — جو اخلاق کے سارے ضابطے، شرافت کے سارے اصول اور انسانی ہمدردی کے سارے آداب پوری تفصیل سے جانتی ہے — اور جو شخص کامیاب زندگی گزارنے کی اتنی ڈھیر ساری باتیں جانتا ہو وہ یقیناً شاعروں اور ادیبوں کا رہنما ہے — لیکن میری اس رائے سے یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ خدانخواستہ ندیم اور قاسمی کا قد بحیثیت شاعر اور افسانہ نگار کے چھوٹا ہے۔ بلکہ وہ موجودہ دور کے افسانہ نگاروں اور شاعروں میں اتنے ہی قد آور ہیں جتنا کہ خود احمد شاہ، شاعر ندیم اور قاسمی افسانہ نگار کے مقابلے میں بلند قد رکھتے ہیں ——

ضیا جالندھری

چند تاثرات

اردو ادب کے گذشتہ چالیس برس میں احمد ندیم قاسمی کی شخصیت ایک فعّال اہلِ قلم کی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ قاسمی نے ادب کی تقریباً ہر صنف میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ شعر اور افسانے کی دنیا میں تو ان کے کئی ایک مجموعے ان کی تخلیقی سرگرمی کے مظہر ہیں۔ انھوں نے مضامین اور مزاحیہ مضامین بھی بڑی تعداد میں لکھے۔ ریڈیو ٹیلی وژن کے لیے ڈھیروں ڈرامے، نغمے، ترانے اور تقریریں لکھیں۔ کئی ایک ادبی رسالوں کے مدیر رہے۔ ایک کے اب بھی ہیں۔ پبلشر بھی بنے۔ اخبار میں کالم نویسی بھی کی۔ بلکہ کر رہے ہیں۔ ادبی انجمنوں، مشاعروں، مجلسوں میں شرکت کرتے رہے۔ اور یہ سب کچھ ایک نہایت ذمّہ دار شوہر اور باپ ہوتے ہوئے۔ حال ہی میں انھوں نے اپنی "خانہ داری" کے ثبوت کے طور پر اپنا ایک گھر بھی تعمیر کروایا ہے اور بچیوں کی شادی بھی نہایت حسن و خوبی سے سرانجام دی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آخر یہ انسان کس مٹی سے بنا ہے۔ ان کی تحریروں کی افراط پر ایک زمانے میں یار لوگ جلے بھی کٹے تھے، مگر کوئی لکھنے بیٹھے اور نہ صرف اتنا بلکہ ایسا لکھے تو جانے کہ کتنا خون پسینہ ایک ہوا ہوگا۔

افکار نے ان کا نمبر نکالنے کا ارادہ کیا خوب۔ سخن تو ہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟ — قاسمی کی ادبی خدمات اتنی ہیں کہ ایک کی بجائے کئی نمبر بھی نکلیں تو کم ہیں۔ لیکن اب تک روایت کچھ یہی رہی کہ محفل سے رخصت ہونے کے بعد لوگ اس طرح یاد کرتے ہیں۔ خود افکار کے حفیظ ہوشیار پوری، مصطفےٰ زیدی نمبر اس کے گواہ ہیں۔ اور زندہ ادیبوں کے سلسلے میں بھی افکار نے جو نمبر شایع کیے وہ کچھ ایسے ادیبوں کے تھے جن کے پاس یا تو اب اور کچھ کہنے کو رہا نہیں تھا یا کم و بیش اپنا کام پورا کر چکے تھے جیسے حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی[1]۔ جہاں تک احمد ندیم قاسمی کا تعلق ہے انھیں تو ابھی اور بھی بہت کچھ کہنا ہے۔ ان کی رفتار، تخلیقات میں کسی قسم کی کمی ہوتی نظر نہیں آتی ———

ہر چند قاسمی نے ادب کی کئی ایک اصناف کو اپنایا ہے۔ لیکن ذاتی دلچسپی کی وجہ سے میری توجہ کا مرکز ان کی شاعری ہی

---

[1] اور فیض نمبر کے بارے میں کیا ارشاد ہے۔؟ (س)

رہی ہے۔ یہ اس صدی کی چوتھی دہائی کے آغاز کی بات ہے کہ جب ہم کالج کے ابتدائی سالوں میں تھے۔ اور اردو میں دو شعروں کے قطعات مقبول ہو رہے تھے۔ رباعی تو ایک پرانی صنف ہے۔ اقبال نے رباعی کی بحروں سے الگ قطعات کہے جن کا بہت شہرہ تھا۔ (اب بھی ہے) مگر اس سے مختلف انداز اور کیفیت میں کچھ شعرا نے قطعات کو ایک باقاعدہ صنف کے طور پر اپنایا۔ اختر انصاری کا مجموعہ آبگینے اسی زمانے کی یادگار ہے۔ (اس زمانے میں) ایک نئے شاعر احمد ندیم قاسمی کے قطعات ادبی دنیا اور دوسرے رسالوں میں شایع ہو کر بہت مقبولیت حاصل کر رہے تھے۔ خود ہمارے کالج کے درودیوار میں یہ قطعات گونجا کرتے تھے۔ اُسی زمانے کا ایک قطعہ ہے ؎

دو بیگھے زمیں کاشت کی خاطر مجھے دے کر		تم کرتے ہو چھپ چھپ کر مری بیٹی کو اشارا

افلاس کا مارا ہوا دہقان پکارا		محنت تو بکا کرتی ہے غیرت نہیں بکتی

جو ہر طالب علم کی زبان پر تھا۔ یہ قطعات بعد میں "رم جھم" کے نام سے کتابی صورت میں شایع ہوئے۔ ان قطعات میں ایک رومانوی فضا تھی۔ اور وہ بھی بیشتر سادہ لوح دہقانوں اور عام دیہاتیوں کی زندگی کے بارے میں قاسمی کو فطرت سے ہمیشہ ایک گہرا لگاؤ رہا ہے۔ جو اب بھی ان کی نظموں سے اکثر جھانکتا رہتا ہے۔ اور یہ لگاؤ ایک ایسے شاعر کا ہے کہ جس نے کھلی فضا میں سانس لیے ہیں اور صرف شہروں میں رہ کر یہ کوشش نہیں کی کہ آؤ اب ہم دیہات محسوس کریں۔ ان قطعات کے پس منظر میں کئی چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں۔ جو قطعے کے آخری مصرعے تک پہنچتے پہنچتے ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتی ہیں۔ یہاں احمد ندیم قاسمی شاعر نے احمد ندیم قاسمی افسانہ نویس کے اشتراک کا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال کے ردِ عمل کے طور پر اختر شیرانی کی ہلکی پھلکی رومانی شاعری کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ خاص طور پر نوجوان لکھنے والوں میں۔ اختر شیرانی کو آج تو وہ اہمیت نہیں دی جاتی، لیکن اسی زمانے میں اس کا جادو کئی ایک نئے لکھنے والوں کے سر چڑھ کر بولا تھا۔ فیض اور راشد کے اولیں مجموعوں کا بیشتر حصہ اس کا گواہ ہے۔ قاسمی بھی کچھ نہ کچھ اختر شیرانی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن اس حد تک نہیں جتنے راشد اور فیض ہوئے تھے۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے جب قاسمی نے ہمیں اپنی خوبصورت نظموں میں لہنگے کی لہروں کے تلے مکھن سے پاؤں رقص میں دکھائے اور کھمبوں کے نیچے بانکے سپاہیوں کو دیہاتیوں کی نظر سے دیکھنا سکھایا۔ اور پھر قاسمی کی شاعری نے کئی اطراف میں کئی پہلوؤں سے ارتقا کی منزلیں طے کیں۔

قاسمی نے محبت کو، فطرت کو، انسانوں کے باہمی رشتوں کو، زندگی اور کائنات کے مفہوم کو، اور سیاست و حالاتِ حاضرہ کے مسائل کو سمجھنے کی پیہم کوشش کی۔ اور ان پر بے شمار نظمیں لکھیں۔ نازک احساسات کی عکاسی میں، واضح طور پر سیاسی مسائل پر اور تصوف کی حدوں کو چھوتی ہوئی نرمی اور ابدی قوتوں کے بارے میں۔ قاسمی چونکہ بے تکان لکھتے ہیں اس لیے یہ ممکن ہے کہ ان کی تمام شاعری ایک ہی سطح پر نہ ہو۔ ان کی بہت اچھی نظموں کے ساتھ ساتھ ایسی نظمیں بھی ہیں جو اتنی اچھی نہیں ہیں۔ مگر یہ بات محض قاسمی کے ساتھ ہی نہیں، اکثر عظیم سے عظیم شاعروں کے یہاں بھی تمام کلام ایک ہی سطح پر نہیں ملتا۔

چونکہ عام طور پر احمد ندیم قاسمی کو ایک ترقی پسند شاعر کہا جاتا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے دو ایک باتیں ان کی ترقی پسندی کے بارے میں کہی جائیں۔ مجھے فتح محمد ملک سے اتفاق ہے کہ قاسمی کو محض ترقی پسندی کے لیبل سے

نہیں پہچانا جا سکتا ہے۔ قاسمی ترقی پسندی کے عام مفہوم کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔ اصل میں ترقی پسندی کا تصور پہلے پہل باقاعدہ طور پر اس صدی کی تیسری دہائی کے وسط میں پیش کیا گیا۔ پروفیسر احمد علی نے ان واقعات پر حال ہی میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ایک مدت تک ترقی پسندی ہر اس نئی ادبی تخلیق کا نام تھا جس میں حالات حاضرہ کے تجربات کو سمونے کی کوشش ہو۔ ان تمام تجربات کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا جن میں موضوع یا ہئیت کے سلسلے میں کوئی تجربہ کیا گیا ہو ادبی تخلیقات کے لیے کوئی نئی راہ دریافت کی گئی ہو ۔۔ یہ وہ نسل تھی جو مغربی ادب ہی سے نہیں، بلکہ مغربی زندگی سے بھی بے حد متاثر تھی۔ بات سرسید، حالی، بلکہ اقبال سے بھی آگے آ گئی تھی۔ اب یہاں مدرسوں کالجوں میں انگریزی ذریعہ تعلیم تو تھی ہی انگریزی پڑھے لکھوں کا ایک جم غفیر مغرب کے برابر آنے کی کوشش میں سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ انگلستان میں کئی سال گذارنے کے بعد تصدق حسین خالد نے نظم آزاد کو اپنایا اور اُسے اردو شاعری میں نہایت عمدگی سے متعارف کروایا۔ اس نے زبان اور انداز بیان کا ایسا شگفتہ اور بول چال سے قریب انداز اختیار کیا اور اس میں اتنی موسیقی سمو دی کہ نظم آزاد کے اردو میں قدم جم گئے۔ بعد میں لاہور میں بیٹھے بیٹھے میراجی نے انیسویں صدی کے فرانسیسی شعرا کے گہرے مطالعے سے متاثر ہو کر اور نفسیات کے جدید علم سے لیس ہو کر اس صنف کے موضوعات کو بہت وسعت دی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی فضا کے زیر اثر راشد بھی نظم آزاد کہنے والوں کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ اور اختر شیرانی کے اثر سے رفتہ رفتہ باہر نکل آئے۔ موضوعات میں دو اہم سلسلے یہاں سے شروع ہوئے۔ ایک ذاتی تجربات کا دوسرا کائناتی مسائل کا۔ ذاتی تجربات میں اب فرائڈ سے روشناس ہونے کے بعد جنس کا موضوع اپنے اندر تہہ در تہہ زاویے لیے لکھنے والوں کو دریافت کی دعوت دے رہا تھا۔ یوں تو جنس کا موضوع شعرا کی دلچسپی کا مرکز ہمیشہ رہا اور کھلم کھلا ہر طرح کی نظمیں کہی گئیں۔ مومن کی مثنویاں، امانت کی واسوخت، ریختی کا بیشتر کلام اسی کا ثبوت ہے اور اشارے کنایے میں تو طوائف شاعری کے پردے کے پیچھے سے ہمیشہ جھانکتی رہی۔ حتٰی کہ داغ کا کلام عموماً اس مقام کے گرد گھومتا ہے۔ لیکن اب جس قسم کے موضوعات سامنے آ رہے تھے، وہ اس سے پہلے اس طرح کبھی نہ کھنگالے گئے تھے۔ اور یہ عمل نظم ہی میں نہیں نثر میں بھی ہوا۔ اور عصمت چغتائی اور منٹو پر تو اعتراضات کی بوچھاڑ کے علاوہ موخرالذکر پر مقدموں کی بھی نوبت آئی۔ اور کچھ ایسا ہی حال میراجی کی بہت سی اور راشد کی ایک آدھ نظم کا بھی ہوا ۔۔ دوسرا موضوع تھا سیاست۔ اس میں ترقی پسندی کی تحریک[1] نے بڑھتے بڑھتے یہاں تک زیادتی کی کہ محض ایک ہی موضوع کو تمام شاعری کا مرکز قرار دیا۔ اشتراکیت اور وہ بھی ایک مخصوص انجمن کے تازہ بتازہ فیصلوں کی روشنی میں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی اسی نظریہ سازی یا مقصدیت میں ایک جارحیت یہ تھی کہ جو اس موضوع کا ان کے حکم کے مطابق پابند نہ ہو گا، وہ ترقی پسند نہیں۔ بہت سے ادیب اس انجمن یا اس کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ دوسرے جو شامل نہیں ہوئے۔ ان میں اکثر وہ بلِ نظر تھے جنہیں اس موضوع سے، اس نظریے سے تو کوئی اختلاف نہ تھا مگر وہ ادیب کی آزادی کے قائل تھے کہ اُسے صرف اسی موضوع پر لکھنا چاہیے جو اس کے اپنے نزدیک اہم ہو نہ کہ جو انجمن کہے۔ اگر دل سے کوئی اشتراکیت پر ایمان رکھتا ہے تو شوق سے وہ اس موضوع پر لکھے لیکن اگر ایسا نہیں تو اس موضوع پر لکھنے کی ہر کوشش ایک طرح کی بددیانتی ہو گی۔ اور ادب ۔۔ اچھا ادب بغیر خلوص کے پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ تخلیقی فن کار تو اس انجمن نے کم ہی پیدا

---

[1] ترقی پسند تحریک کے بارے میں ضیا صاحب کی تمام آرا سے ادارۂ افکار کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ (ص)

پیدا کیے ۔لیکن اس انجمن نے نقادوں کو سیکڑوں کی تعداد میں کھمبیوں کی طرح پیدا کردیے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان میں اکثر تو نقاد نہیں نقارچی ہیں ۔ جو سب کے سب ایک نقارے کی چوٹ سُن کر اپنے اپنے نقارے بجانے شروع کردیتے ہیں ۔ یہ لوگ جو انجمن کے فیصلوں کو دہراتے نہیں تھکتے تھے ۔زیادہ سے زیادہ "رائے گیر" کہلا سکتے ہیں ۔ان کی اکثر تجویزیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ لوگ ادب سے دور کا رشتہ بھی نہیں رکھتے ۔ اچھے اور بڑے ادب کو پرکھنا تو درکنار اُسے پڑھے بغیر ہی اپنی ہی ہانکے جارہے ہیں ۔ بنیادی کلیے یا نظریے سُن رکھے ہیں یا انجمن نے بتا رکھے ہیں اور یہ ایک ایسے ادیبوں اور شاعروں کا گروہ کا گروہ زبردستی پڑھنے والوں کے سر منڈھ رہے ہیں جن میں تخلیقی صلاحیتیں نام کو نہیں ہیں ۔ ان کھمبیوں میں بڑی کھمبیاں بھی ہیں چھوٹی بھی ۔ ان بیچاروں کو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ خود ان کے امام مارکس نے کہا تھا کہ میں اعلیٰ و ارفع ادب کا قائل ہوں ، مگر میں ایک سیاسی مبلغ ہوں ۔ میرے اسٹیج سے وہ ادب اشتراکی ادب کے نام سے پیش نہیں ہوسکتا جو میرے مسلک کے حق میں نہ ہو ۔ ایسے ہی جیسے ہمارے ایک حکمران نے پندرہ برس پہلے ادیبوں کے ایک بڑے جلسے میں کہا تھا ۔ تم کو آزادئ اظہار مبارک ۔لیکن اگر وہ میری حکومت کے راستے میں کہیں حائل ہوئی تو پھر تمھارا خدا ہی حافظ ہے ۔ یہ دونوں باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں کیونکہ یہ باتیں ادیبوں نے نہیں کہیں ۔ سیاست دانوں نے کہیں ہیں ۔ زندگی کے مسائل سمجھنے کے لیے ادیب سیاست دانوں سے کم نہیں ۔ لیکن ان کا پہلا اور بنیادی میدان ادب ہے ۔ بصورت دیگر ان کو ادب کے پھٹے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے ۔ سیدھا سادا سیاسی کام کرنا چاہیے کہ وہ نسبتاً بہت زود اثر ہوتا ہے ۔ ادیب تو اپنی پوری زندگی کے تجربوں کا نچوڑ اپنی ادبی تخلیق میں سمو دیتا ہے ۔ شرط یہ ہے کہ اظہار پُر خلوص ہونا چاہیے ۔ اس کے ذریعۂ اظہار ہی میں اُس کا فنی کمال مضمر ہے ۔

احمد ندیم قاسمی بھی ترقی پسند تحریک میں شامل تھے ۔ اور ایک زمانے میں اس کے سرگرم رُکن بھی ۔ لیکن جو چیز ان کو بچا گئی وہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو کبھی اتنا پابند نہیں کیا جتنا ان ادیبوں یا شاعروں نے کیا جن کی تخلیقی قوت کمزور یا ناپید تھی ۔ قاسمی نے ہمیشہ بے شمار اور متنوع موضوعات پر نظمیں کہیں ۔ ان کی ترقی پسندی کا بنیادی نقطہ انسان کی اس عظمت میں مضمر تھا کہ وہ دائم ارتقا کی منزلیں طے کر رہا ہے ۔ ان کی بچپن میں جو تربیت ہوئی تھی اس نے انھیں زندگی کے ازلی اور ابدی رشتے سمجھنے کی صلاحیت دی تھی ۔ فطرت سے ان کا گہرا لگاؤ اور زندہ و پائندہ محبت کرسکنے کی اہلیت نے ان کو محض اشتراکی شاعر بننے سے بچا لیا ۔

بطور ایک فن کار کے قاسمی نے ہیئت کے سلسلے میں جو تجربات کیے ہیں ان کا بھی سرسری سا ذکر شاید نامناسب نہ ہوگا ۔ قاسمی مزاجاً مغربی سے زیادہ مشرقی ہیں ۔ انھوں نے یوں تو آزاد نظمیں بھی کہی ہیں اور معرا بھی ۔ اور ان کی آزاد اور معرا نظمیں خوبصورت بھی ہیں ، مگر ہیئت کے تجربوں کے میدان میں وہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے عادی ہیں ۔ غزل سے انھیں آج بھی وہی لگاؤ ہے جو شروع میں تھا ۔ ان کی زیادہ تر نظمیں پابند ہیں اور عموماً ایسے بندوں (STANZAS) میں جن کا رواج آج سے کوئی تین چار دہائیں اُدھر ہوچکا تھا ۔ نظم کے ارتقا اور ساخت کا تصور بھی ان کا جدید مغربی ہونے کی بجائے مشرقی یا قدیم مغربی ہے ۔ یعنی اکثر نظموں کے بندوں میں وہ ایک کیفیت یا موضوع کی تکرار بھی کرتے ہیں ۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کا نظم کی ساخت کا شعور پختہ تر ہوتا جارہا ہے ۔ اور ان کی کئی ایک نظمیں فنی لحاظ سے

ساخت کے معاملے میں جدید مغربی تصور پر پوری اُترتی ہیں۔ اصل میں یہ جدید کا لفظ بھی بہت گمراہ کن ہے۔ اور ایک حد تک بڑا ظالم۔ بعض لوگ تو محض جدید کہلانے یا بننے کی کوشش میں مضحکہ خیز حرکتیں کرتے ہیں۔ نئے لکھنے والوں کا مزاج، حالات، اور تجربات اپنے سے پہلے آنے والوں سے مختلف ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن وہ بھی اپنے سے پہلے لکھنے والوں کی طرح انسانی تجربات سے دوچار ہوتے ہیں۔ شاعری صحافت تو ہے نہیں کہ روز کی تازہ خبر کی طرح ہوتی رہے۔ یہ تو ایک مسلسل ارتقا ہے۔ اور اپنی بات کہنے کا فن سیکھنے کی مستقل کوشش۔ لیکن اکثر نئے لکھنے والے جلدی سے جلدی شہرت پانے کے لیے یا شاعری کی اسٹیج پر اپنی کچی پکی تخلیقات کے واسطے جگہ حاصل کرنے کے لیے اپنے سے پہلے کے اچھے لکھنے والوں کو یوں رد کردیتے ہیں، جیسے یہ نئے لکھنے والے اُن سے کچھ بہتر تخلیقات پیش کر رہے ہوں۔ وہ یہ بات بالکل بھول جاتے ہیں۔ فیشن جتنا نیا اور عجیب ہوگا اس کی عمر اتنی ہی مختصر ہوگی جب تک کہ وہ ہنگامی کو دوامی سے منسلک کرنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ ہر اچھا فن کار اپنے زمانے میں جدید ہوتا ہے۔ اگر نئے ان کو سمجھنے کی اُن سے استفادہ کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھیں گے تو خود ان کی ادبی عمر اُن کی جوانی سے بھی کم رہ جائے گی۔ ہنگامی کو دوامی سے منسلک کرنے کی کوشش ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے اکثر بے چارے خود جب ڈھب کی بات نہیں کرسکتے تو دوسروں کو بُرا بھلا کہہ کر تسکین کر لیتے ہیں۔ بہرحال اگر اس قسم کی بچکانہ باتوں کو نظر انداز کردیا جائے تو یہ ضرور ہے کہ پُرانی بات پُرانے انداز میں دہرانا ادب نہیں۔ ہر نئی نسل نئے مسائل لے کر آتی ہے اور ان کے لیے نئے اظہار کے طریقے اُسی طرح تلاش کرتی ہے۔ جیسی اُن سے پہلے کے ادیبوں نے کی۔ اور اس بات کا شعور ہر اچھے ادیب کو ہوتا ہے۔ اور کسی بُرے ادیب کو نہیں ہوتا۔ اسی کوشش میں بعض لوگ دور نکل جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ میانہ روی سے کام لیتے ہیں۔ دور نکل جانے والے کبھی کبھی بڑی عظیم دریافت کرکے لاتے ہیں۔ کبھی ایسے کھو جاتے ہیں کہ لوٹ کر نہیں آتے۔ اور کچھ نادان چمکتی ریت کو سونا سمجھ کر اوٹ پٹانگ بڑ بھی ہانکتے ہیں۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں ان تلاش کرنے والوں نے بہت کچھ پایا۔ لیکن اپنے اندر ڈوب کر کم اور مغربی ادب کے مطالعے کے نتیجے کے طور پر زیادہ اردو ادب کو کئی طرح کی نئی ہیئتوں، نئے موضوعات سے روشناس کیا۔ آج بھی نئے لکھنے والے مغرب ہی سے "نثری نظم" اور نئی ہیئتیں مستعار مانگ کر "جدت" کا دعویٰ کرتے ہیں۔ معاشی اور معاشرتی مساوات تک مغربی ادب کی نقالی ہی کرتے ہیں۔ کچھ سمجھ دار لوگ ان کو مشرقی مذاہب سے بھی منسلک کردیتے ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں ابھی تک رامبو، بادلیئر، ایذرا پاؤنڈ، ایلیٹ جیسے نظریہ ساز پیدا نہیں ہوئے۔ جنھوں نے شاعری کو اپنی ذات کے تجربے اور علم کی روشنی میں دیکھا ہو۔ یاد رہے بات ہے کہ ہم نے شاعر بہت اعلیٰ پائے کے پیدا کیے، خواہ انھوں نے ہیئتیں باہر ہی سے کیوں نہ لی ہوں۔ اب کچھ نئے شاعر بھی تلاش میں ہیں اور اُن میں سے شاید کوئی اُردو شاعری میں مستقل اضافہ بھی کریں۔ لیکن ایک بات واضح ہے کہ شاعری اور اچھی شاعری تخلیق کرنے کے لیے محض دوسروں سے عمر میں چھوٹا ہونا یا باغی ہونا ضروری نہیں اور یہ کہ اچھی شاعری محض گروہ بندی سے نہیں ہوتی۔ ہر بڑا اور اچھا فن کار تنہا ہوتا ہے۔ اور اس کی ذاتی اور شخصی عظمت اور مبہم کوشش ہی سے بڑا ادب تخلیق ہوسکتا ہے۔ بڑا ادب ہمیشہ ایک فرد کی تخلیق ہوتا ہے۔ بات ہو رہی تھی احمد ندیم قاسمی کی اور ذکر آگیا ہیئت کے تجربات میں شدت کا۔ کہنا یہی تھا کہ قاسمی نے تجربات کے سلسلے میں شدت اختیار نہیں کی۔ وہ کسی ہیئت کے موجد نہیں۔ اور نہ انھوں نے شاعری میں کوئی نیا پیرایۂ اظہار دریافت کیا ہے۔ انھوں نے اُنہی تجربات کو

اپنایا ہے جو اردو شاعری کا جزو بن گئے ہیں۔ انھوں نے ن م راشد کی طرح آخری عمر میں "نثری نظم" بھی نہیں لکھی۔ اُن کو یہ ڈر کبھی نہیں رہا کہ وہ کہیں پُرانوں میں شمار نہ ہونے لگیں۔ لیکن انھوں نے انسان کے تجربات کی نئی نئی تہوں کو سمجھنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ اور اس کے لیے موزوں ترین الفاظ تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ وہ لفظ عموماً انہی معنوں میں استعمال کیے ہیں جو ہم اور آپ ان لفظوں سے سمجھتے ہیں۔ یہاں پر ایک بات اور وہ یہ کہ جب ہم مغرب سے ہئیت اور موضوعات کے تجربے مستعار لیتے ہیں تو نہ معلوم خود اپنے یہاں جو ڈھیروں امکانات ہیں اُن سے کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ہمارے اپنے لوک ادب کے علاوہ مختلف صوبائی زبانوں میں ہیئتوں، یہاں تک کہ خود بحور و اوزان کی نئی نئی اشکال موجود ہیں۔ پنجابی شاعری میں وزن اور آہنگ کا جس طرح استعمال ہوتا ہے۔ اُس سے اردو کو بے بہا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں حفیظ جالندھری اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے کچھ تجربے کیے۔ مگر بدقسمتی سے اس کے بعد پنجاب کے اردو میں لکھنے والے شاعروں نے خود پنجابی میں بھی لکھا تو اردو بحور میں۔ یعنی اُن بحور میں جو خود اُردو نے عربی فارسی سے مستعار لی ہیں ہمارے یہاں خوشہ چینی جب بھی ہوئی باہر سے ہوئی۔ پہلے فارسی اور عربی ادب سے اور اب مغربی ادب سے۔ حالانکہ ہمارے اردگرد خود ہماری اپنی زندگی کے آس پاس پنجابی شاعری کے علاوہ ہماری فلمی موسیقی میں پُرانی بحور اور آہنگ سے بالکل الگ آہنگ کے نئے نئے تجربے ہوئے ہیں۔ مگر ہمارے یہاں کے شعرا کے یہاں شاید ابھی موسیقی اور آہنگ سے وہ قریبی رابطہ قائم نہیں ہوا کہ وہ ان جہات میں نکلیں۔ سوائے فلمی شاعروں کے۔ مگر ان کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ ابھی تک ہندی ادب کے پنگل کے چند امکانات اور زحافات تک پہنچے ہیں۔ یہ بات کہہ کر میں صرف دوسروں کی شکایت نہیں کر رہا خود میں نے مروجہ بحور میں ہی شاعری کی ہے۔ کبھی کبھی پنگل میں طبع آزمائی بھی کی ہے۔ لیکن ایک احساس یہ ضرور رہا کہ ہماری زمین کا قدرتی آہنگ محض فارسی بحور تک محدود نہیں۔ ہمارے یہاں موسیقی کی بے شمار اقسام ہیں۔ لیکن ہم نے اپنے آپ کو ایک نہایت تنگ حلقے میں محدود کر لیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پہلے ان بحور کے مروجہ سانچوں کے خلاف بغاوت ہوئی اور آج کا نوجوان ان بحور سے یکسر باغی ہونا چاہتا ہے۔ اور اسی لیے کچھ نثری نظمیں کہی گئی ہیں۔ نثری نظم لکھنے والوں نے اب تک تو مروجہ آہنگ توڑنے ہی کی کوشش کی ہے۔ نیا آہنگ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اس بات کا شاید ابھی اُنھیں شعور ہی نہیں ہے کہ شاعری میں خواہ وہ کسی مروجہ بحر کی پابند ہو یا نہ ہو، ایک جذباتی آہنگ ایسا ضرور ہوتا ہے جسے موضوع اور تجربے کی صداقت کے لیے تلاش کرنا فن کار کا کام ہے۔ میرے خیال میں اس کے لیے ہمارے اپنے یہاں کی موسیقی اور صوبائی زبانوں سے آہنگ ہمیں کئی راستے سُجھا سکتے ہیں۔ محض یہ بات کہ اب پُرانی ہیئتوں کے استعمال سے تھکن کا احساس ہوتا ہے یا بغیر وزن کے شعر کہنا آسان ہے کوئی جواز نہیں۔ ہمارے نوجوان شعرا چونکہ محض مغربی شاعری سے متاثر ہیں اور وہ بھی ترجموں میں پڑھ کر۔ اس لیے ان کے مزاج میں کسی مقابل آہنگ کا رچاؤ نہیں۔ اور اپنی نظموں کے سلسلے میں بھی شاید وہ ان کے ترجموں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی تخلیقات کے صوتی آہنگ کی پروا نہیں کرتے۔ میرے نزدیک صوتی آہنگ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اور اس کے امکانات بے شمار ہیں۔ لیکن یہ کام اب آنے والوں کا ہے۔ قاسمی نے یوں تو گیت، ترانے اور نظمیں سبھی کچھ کہا ہے ——— لیکن بحور کے سلسلے میں وہ بھی اپنے عہد کے تمام دوسرے شعرا کی طرح مروجہ بحور کے پابند رہے ہیں۔ حتیٰ کہ نظم آزاد کہنے والوں نے بھی بحور فارسی عربی ہی کی استعمال کیں۔ مصرعوں میں رکن کم و بیش کر دیے۔ قافیے ردیف غائب۔ لیکن بحور وہی۔

اور اب جہاں کہیں نثری نظم نظر آتی ہے وہاں بحور بھی غائب اور آہنگ بھی ندارد۔ دیکھیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتے ہیں۔

قاسمی کی ایک بات جو مجھے بہت پسند آتی ہے، وہ ہے ان کی وطن دوستی۔ اکثر ترقی پسند شاعروں کے الہام کے سرچشمے ملک سے باہر ہیں۔ بعض تو براہِ راست ملک دشمنی کی حد تک باہر کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ مگر قاسمی ترقی پسند ہیں۔ اور وطن دوست۔ انھیں اپنے ملک سے جو محبت ہے اس کا اظہار انھوں نے جا بجا کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف وطن کی محبت کے بے شمار گیت گائے ہیں، بلکہ ہر مشکل موقع پر قلم کے علاوہ بھی جس طرح ممکن ہوا انھوں نے ملک کی خدمت کی ہے۔ وہ اپنے وطن اور اپنے مذہب دونوں سے دلی لگاؤ رکھتے ہیں۔ اس میں ان کی تربیتِ ذہنی بھی شامل ہے، بچپن کا ماحول بھی اور اپنی پسند بھی۔ مجھ سے میرے ایک ایسے دوست نے جو قاسمی کے بہت قریب ہیں۔ ذکر کیا کہ قاسمی کے پاس کچھ ترقی پسند ادیب پہنچے کہ آپ اس انجمن کو از سرِ نو ترتیب دیں۔ قاسمی نے کہا کہ ہاں، لیکن میں اس انجمن کے منشور میں پاکستان سے وفاداری کی شرط کا اضافہ چاہتا ہوں۔ یہ سُن کر وہ ادیب پھر آنے کا وعدہ کر گئے اور لوٹ کر نہیں آئے۔

ایک اور بات جس نے مجھے ہمیشہ بہت متاثر کیا۔ وہ قاسمی کی خودداری ہے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ قاسمی اگر اپنے اصولوں سے کسی طرح کا سمجھوتہ کرنا چاہتے تو وہ بہت سی مالی منفعت حاصل کر سکتے تھے۔ اصولوں سے سمجھوتہ تو ایک طرف بعض اہم پیش کش انھوں نے صرف اس لیے قبول نہیں کیں۔ کہ ان کے قبول کرنے سے ہی بعض حلقوں میں یہ شبہ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا کہ قاسمی نے کہیں کوئی غیر اصولی بات نہ کر دی ہو۔ وہ اپنے اصولوں پر بڑی سختی سے کاربند ہیں اور اپنی درویشی کو کسی قیمت پر فروخت کرنے کو تیار نہیں۔ انھوں نے بڑی بڑی صبر آزما مشکلوں کا سامنا کیا مگر پندار پر آنچ نہیں آنے دی۔

قاسمی کی سب سے بڑی خوبی جس کا ذکر میں آخر میں کرنا چاہتا ہوں، وہ ہے ان کی گرم اختلاطی۔ اور انسانیت سے بے پناہ محبت کی صلاحیت۔ اس کا ایک پرتو ان کا مزاج بھی ہے جس کی نرمی اور مٹھاس نے ہمیشہ دل پر ایک گہرا اثر چھوڑا۔ قاسمی عمر میں میرے بزرگ ہیں۔ اور شعر اس وقت سے کہتے ہیں جب ہمیں شعر ٹھیک سے پڑھنا بھی نہ آتا تھا۔ لیکن شروع ہی سے انھوں نے جس محبت اور شفقت کا برتاؤ کیا۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جنھوں نے قاسمی کو قریب سے دیکھا ہے۔ ادب کے نظریوں کے سلسلے میں تو اختلافات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن ذاتی اختلافات کے بعد بھی، بلکہ بعض اوقات ہمارے گستاخانہ رویے کے باوجود قاسمی کے تپاک، ان کی شفقت اور محبت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ قاسمی کی شخصیت کا یہی حسن ہے جو ان کی تخلیقات میں بھی آ جاگر ہے۔

زینتِ حلقۂ آغوش بنو
دور بیٹھو گے تو چرچا ہوگا

(ندیم)

کتنی حسّاس خامشی ہے
سوچوں بھی تو رات گونجتی ہے

(ندیم)

مختار زمن

آزادی کا نقیب

میں احمد ندیم قاسمی صاحب سے پہلی دفعہ ۱۹۵۶ء میں ملا۔ اور کم و بیش ایک ماہ تک سفر و حضر میں اُن کے ساتھ رہا۔

یہ وہ دور تھا جب پاکستان اور چین کے تعلقات پروان چڑھ رہے تھے۔ چودھری محمد علی پاکستان کے وزیر اعظم تھے۔ چین کی حکومت نے انھیں سرکاری دورے پر مدعو کیا اور اُن کے ساتھ صحافیوں کے ایک وفد کو بھی دعوت دی گئی تھی۔

وزیر اعظم کے دورے کی تاریخ طے ہو گئی۔ میں نے دو تین دن پہلے ہی براہ ہانگ کانگ چین جانے کا پروگرام بنایا۔ سامان سفر تیار کر کے ہوائی اڈے جانے ہی والا تھا کہ پرنسپل انفارمیشن آفیسر مجید ملک صاحب کا فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ "اپنا سفر ملتوی کر دو"۔ سخت مایوسی ہوئی۔ دوڑا ہوا اُن کے دفتر پہنچا کہ معلوم کروں قصہ کیا ہے۔ پتہ چلا چودھری محمد علی کی وزارت سیاسی بحران میں مبتلا ہو گئی اور اُن کا دورہ فی الحال ملتوی ہو گیا، آئندہ تاریخ کا بعد میں اعلان کیا جائے گا۔ پھر درویش بجان درویش آئندہ تاریخ کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی پندرہ دن بعد نئی تاریخ کا اعلان ہوا۔ ایک عجیب واقعہ یہ ہوا کہ اسی دن ایک دوست سے ملاقات ہوئی جو اختر شناسی یا غالباً روحانیات سے دلچسپی رکھتے تھے۔ کہنے لگے "برادرم جلد از جلد روانہ ہو جاؤ تاکہ چین کی سیر کر سکو۔ وزیر اعظم کا کیا ہے گئے گئے نہ گئے نہ گئے"۔

میں تو پہلے ہی پابہ رکاب تھا۔ کئی دن پہلے ہانگ کانگ پہنچ کر شمیراک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ دو تین دن بعد صحافیوں کا وفد بھی پہنچ گیا اور اسی ہوٹل میں ٹھہرا۔

یہ وفد بہت اعلیٰ پائے کا تھا۔ غالباً اس کا ادنیٰ ترین ممبر یہی خادم تھا۔ جو حضرات اس میں شامل تھے اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ فیض احمد فیض۔ احمد ندیم قاسمی۔ مولانا اختر علی خاں مرحوم (زمیندار) میر خلیل الرحمٰن (جنگ) محسن علی (مارننگ نیوز) عمر قریشی (جو ان دنوں صحافی تھے اور ٹائمز آف کراچی سے منسلک تھے)

قاسمی صاحب کے نام سے کون واقف نہیں۔ میں نے اُن کے افسانے پڑھ رکھے تھے اور اُن کی شاعری سے بھی

نابلد نہ تھا۔ ان کی تصویر رسالوں میں دیکھ چکا تھا۔ جب وہ فیض صاحب کے ساتھ ہوٹل میں نظر آئے تو میں فوراً پہچان گیا کہ موصوف وہی ہیں جنھوں نے پنجاب کے دیہات کی تصویر ادب اردو کے مرقع کو عطا کی ہے۔ سیاہ بھونرا سے گھنے گھونگھریالے بال، کھڑا کھڑا نقشہ، موٹے فریم کی عینک، نہایت سنجیدہ، رکھ رکھاؤ والا انداز، اور شستہ گفتگو کھرج میں بولتے اور الفاظ نہایت صاف طور پر ادا کرتے۔ مگر باوجود اس سنجیدگی کے مسکراہٹ لبوں پر تتلی کھڑی رہتی۔ ذرا بات کیجیے اور مسکراتے ہوئے لبوں سے جواب لیجیے ——— وہی انداز آج بھی موجود ہے۔ البتہ سیاہ بالوں کا ڈھیر اب چاندی کے تاروں میں تبدیل ہو چلا ہے ۔

ہانگ کانگ میں درزی ایک دن میں سوٹ سی کر دیتے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے قاسمی صاحب نے بھی ایک سوٹ سلوایا اور فیض صاحب نے بھی ۔

جب سب صحافی مشرقی و مغربی پاکستان سے آکر جمع ہو گئے، تو چینی ٹریول ایجنسی نے ہانگ کانگ ریلوے اسٹیشن سے ہمیں کینٹن روانہ کرنے کا پروگرام بنایا۔

صبح سویرے ہم سب لوگ اسٹیشن پہنچے۔ میں نے مقامی انگریزی اخبار خریدا۔ اس میں کوئی پانچ چھ سطروں کی خبر تھی کہ چودھری محمد علی کی وزارت ٹوٹ گئی ——— گویا ان کے سفرِ چین کا قصہ بھی ختم ہوا۔ میں نے جلدی سے اخبار تہہ کر کے بیگ میں رکھ لیا اور چپ سادھ لی۔ کسی کو نہیں بتایا کہ چودھری صاحب چین نہیں آئیں گے۔ بلکہ اب صرف ہم صحافی ہی پاکستان کے نمایندے اور "وی۔آئی۔پی" رہ گئے ہیں۔! اس وقت مجھے اپنے اختر شناس دوست کی بات بھی یاد آئی۔

جب گاڑی چین کی سرحد میں، کافی راستہ طے کر چکی۔ یعنی طارق کے سارے سفینے سوخت ہو کر راکھ ہو گئے تو میں نے ان بزرگوں کے سامنے مزے لے لے کر اعلان کیا کہ "حضرات پاکستان کی نمایندگی کی ذمہ داری اب آپ کے کاندھوں پر ہے۔ چودھری صاحب چین نہیں آئیں گے۔ دیکھیے یہ رہا اخبار!"

یہ سن کر مولانا اختر علی خاں، مرحوم بہت بگڑے کہ "صاحبزادے آپ عجیب آدمی ہیں۔ آخر ہانگ کانگ سے پہلے آپ نے کیوں نہ بتایا۔ ہم وہیں سے گھر واپس چلے جاتے۔"

میں نے عرض کیا کہ "حضرت اسی ڈر سے تو نہ بتایا کہ آپ واپس چلے جائیں گے تو پھر میرے رکنے کا بھی جواز نہ رہے گا۔ اور مجھے بھی واپس جانا پڑے گا اور چین دیکھنے کی حسرت رہ جائے گی۔"

فیض صاحب ہنسے، سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ کھنکھارے اور بولے "بھئی تم نے اچھا ہی کیا۔ مولانا تو اب ہمارے ساتھ پھنس ہی گئے ہیں۔"

قاسمی صاحب کی آنکھوں میں چمک اور لبوں پہ مسکراہٹ آئی۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اس پر اظہارِ اطمینان کیا کہ چودھری صاحب کی خبر مرحلہ پار کر کے بتائی گئی۔

ہمارا قافلہ کینٹن پہنچا۔ وہاں سے پیکنگ گئے۔ شمالی علاقوں کا دورہ کیا۔ دیوارِ چین دیکھنے گئے، اور سنکیانگ تک منزل سر کی ——— عجیب شب و روز تھے۔ نئے چین کی ہر ادا دلچسپ اور قابلِ غور تھی۔ قاسمی صاحب ہر شے کو

بغور دیکھتے، ہربات کو بغور سنتے اور شاید اہم نکتے اپنی نوٹ بک میں ٹانکتے رہتے ـــ ایک ماہ تک یہ سفر جاری رہا۔ ہم نے چین کی ترقی، چین کی صنعتیں، شہر، دیہات، رقص اور بیلے دیکھے۔ چواین لائی اور دوسرے زعما سے ملے۔

یہ معلوم تھا کہ قاسمی صاحب چینی انقلاب کے ثنا خوانوں میں ہیں۔ اس وقت تک چین اور روس کی نظریاتی اور سیاسی کشاکش کا ظہور نہیں ہوا تھا اور نہ چین اور روس کے الگ الگ حلیف بنے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ صدیوں کے دبے ہوئے، افیون گزیدہ چینیوں کو پہلی دفعہ سر اٹھا کر چلتے ہوئے دیکھ کر اُن کے دل کی کیا کیفیت ہوئی۔ یہ تو وہ خود ہی بتائیں گے۔ لیکن یہ اندازہ آپ بھی لگا سکتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی شریف الطبع ہو اور شاعرانہ مزاج بھی رکھتا ہو تو خلقت کو غلامی اور اُنکی استحصال سے نجات پاتے دیکھ کر اُس کے دل کی کیا کیفیت ہوگی۔

ایک دن میں اور عمر قریشی اُن سے باتیں کر رہے تھے۔ شاید عمر نے اُن سے پوچھا "قاسمی صاحب ایک اصولی بات بتائیے۔ آپ شاعر اور ادیب ہیں۔ اس لیے قلم کی آزادی آپ کے لیے بڑی اہم ہے۔ چین ہو یا کوئی اور ملک ہو۔ اگر قلم پر حکومت کا پہرہ ہے تو اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟"

قاسمی صاحب کا جواب دو ٹوک اور بلا جھجک تھا۔

بولے۔ اگر کروروں آدمیوں کو روٹی ملنے لگے، اور ان کی بنیادی ضرورتیں پوری کر دی جائیں اور اُن کی خوشیوں کا راستہ ہموار ہو جائے ـــ اور اس کی قیمت یہ ہو کہ قلم میرے ہاتھ سے لے لیں تو یہ کیا بُرا سودا ہے؟" ـــ یہ کہہ کر مُسکرائے اور چشمے کے پیچھے اُن کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

اس دورے کے بعد قاسمی صاحب کا جو تصور میرے ذہن پر مرتسم ہوا وہ کچھ اس قسم کا ہے کہ وہ ایک حلیم الطبع اور بُردبار آدمی ہیں۔ مگر کمزور طبیعت نہیں۔ ان کے خیالات سے آپ کا متفق ہونا ضروری نہیں، مگر ان کی معقولیت کا معترف ہونا ناگزیر ہے۔ جھگڑالو، ضدی اور "جمانے" والے آدمی نہیں ہیں۔ نظم و نثر اور صحافت کے سلسلے میں انھوں نے اتنا لکھا ہے کہ کم لوگ ان کی برابری کر سکتے ہیں۔ مگر ادب و انسانیت اور ملک و قوم کے لیے اپنی خدمات جلیلہ گِنوانے یا اُس کا بار بار ذکر کرنے کا چھچھور پن ان کی عادت میں داخل نہیں۔ چین کے دورے کے بعد کراچی میں ان سے کئی دفعہ ملاقات ہوئی اور وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملے۔

جب پاکستان پر بُرا وقت پڑا، ملک کے ٹکڑے ہوئے، پاکستانیوں پر بنگلہ دیش میں قہر ٹوٹا۔ اور اُن کا نام بہاری پڑا ـــ اس وقت انھوں نے بے باکی کے ساتھ جنگ کے کالموں میں سیاسی تبصرے لکھے۔ سیاسی ہڑ بازی اور چیخ پکار کے دور میں بھی اُن کے لہجے کی سنجیدگی قایم رہی۔ تنگ نظری اور عصبیت کی ہل چل مچانے والی آندھیوں میں بھی اُن کے قلم کا توازن برقرار رہا ـــ یہی اُن کی خوبی اور بڑائی ہے۔

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن

یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

فہمیدہ ریاض

ندیم صاحب

جب میں ان کے بارے میں سوچتی ہوں ...... (زیادہ تر میں ندیم صاحب کے بارے میں سوچنے سے بچتی ہوں) تو میرا دل شدید تکلیف سے دکھنے لگتا ہے۔ ہمارے تعلقات کشیدہ ہو چکے ہیں۔ تقریباً نو برس کی دوستی ایسے مقام پر ہے۔ جہاں اُس کی صورت نہیں پہچانی جاتی۔ اس کی وجہ صرف ہمارا نظریاتی اختلاف ہے۔ لیکن میں ندیم صاحب سے لاکھ اختلاف رکھنے کے باوجود اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی' کہ ندیم صاحب کا سیاسی موقف (جو کچھ بھی ہے) کسی خود غرضانہ موقع پرستی کا نتیجہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خلوص دل سے ان سب باتوں پر یقین کرتے ہیں' جو "فنون' کے اداریوں میں اور فتح محمد ملک صاحب کے تحریر کردہ "بین السطور" میں لکھی جاتی ہیں۔ لیکن ہمارا اختلاف اتنا شدید اور گہرا ہے کہ اب ہم دونوں کے لیے ایک دوسرے سے رابطہ قایم کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔

صہبا لکھنوی صاحب کا بے حد اصرار ہے کہ میں ندیم صاحب کی شخصیت پر کچھ لکھوں۔ میری معذرت تھی کہ میں اس موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر سکوں گی۔ میرے پاس کوئی کیمرہ نہیں۔ جو میں اُن کی تصویر میں اتار کر دے دوں۔ علاوہ ازیں مجھے غیر جانبداری کا بھی کوئی دعویٰ نہیں مگر وہ نہ مانے۔ اس لیے اب جو کچھ آپ پڑھیں گے وہ ان کے بارے میں میرے اپنے ہی خیالات ہوں گے۔ یعنی جیسی کہ ان کی شخصیت مجھے نظر آئی۔

جب پہلی بار میں نے ندیم صاحب کو اپنی ایک نظم بھیجی تو اُن کا جواب آیا۔

"نظم ذرا ڈھیلی ہے۔ کوئی دوسری ہو تو بھیجیے"

تب میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتی تھی۔ میرے لیے ندیم صاحب جیسے مشہور ادیب اولمپیا پہاڑ پر بسنے والے دیوتاؤں کی طرح تھے۔ اُن کی تحریر دیکھ کر میں خوشی سے پھولی نہ سمائی' اور فوراً اپنی تمام نظمیں اور ایک طویل خط انھیں بھجوا دیا۔ فوراً ہی ان کا جواب آیا۔

"یہ نظمیں تو بہت اچھی ہیں۔ کیا آپ واقعی کالج کے دوسرے سال میں ہیں۔!"

میں نے اُن کو لکھا۔ "یہ آپ "فنون" کے ٹائیٹل پر "اعلیٰ ادب کا پیمانہ" کیوں لکھواتے ہیں۔ یہ تو کسی خالص گھی کا اشتہار معلوم ہوتا ہے۔"

انھوں نے لکھا۔ "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں یہ الفاظ ہٹا دوں گا۔"

اس طرح انھوں نے ایک لکھنے والی کو جس نے محاورتاً ابھی قلم پکڑنا بھی نہیں سیکھا تھا ۔ سر پر چڑھا دیا ۔

کیوں ؟ ——

آخر کیوں —— ؟

گو میں فخر سے بے حال تھی مگر پھر بھی بار بار خود سے یہ سوال پوچھنے پر مجبور تھی ۔ کبھی کبھی ایک چور خیال دل میں آتا ۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں لڑکی ہوں —— ؟ لیکن پہلی نظم بھیجتے ہوئے بھی تو میں لڑکی ہی تھی ۔ بات صاف تھی ۔ ندیم صاحب کے لیے ایک بالکل گم نام مبتدی شاعر کی رائے میں بھی وزن تھا ۔ اس کی بھی اہمیت تھی ۔ اسی لیے وہ اس کی رائے کی اس طور پذیرائی کر رہے تھے ۔ ان کی اس سادگی میں ایسی معصومیت تھی کہ میں ندیم صاحب کی بالکل گرویدہ ہو گئی تھی ۔

ان جذبات کے باوجود ایک دو مہینوں میں ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ طبعاً ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں ۔ لیکن اگر ان ابتدائی دنوں میں ندیم صاحب میری اتنی ہمت افزائی نہ کرتے تو میں شاید شروعات کی مشق کے دوران ہی نظمیں لکھنا ترک کر دیتی ۔

اس کے بعد ہماری طویل خط و کتابت شروع ہو گئی ۔ ایک طرح سے میں ندیم صاحب کی دوست بن گئی تھی ۔ وہ اپنی چھوٹی "چھوٹی" مصروفیات مجھے قسطوں میں لکھتے اور میں اپنے سارے مسائل انھیں سنا ڈالتی ۔ میرے لیے ندیم صاحب ایسے بزرگ تھے جن کے پاس میرے سارے مسائل کا حل موجود تھا اور ندیم صاحب کے لیے میں دور دراز سندھ میں بسنے والی ایک ایسی لڑکی تھی جس سے ندیم صاحب نسبتاً آسانی سے اور زیادہ کھل کر بات کر سکتے تھے ۔ لیکن یہاں لفظ نسبتاً بہت اہم ہے ۔ مکمل طور پر کھل کر بات کرنے والے تو وہ آدمی ہی نہیں ہیں ۔ بہر حال ہمارے خطوط آتے جاتے رہے ۔ ایک بات البتہ ان کے خطوں میں بہت کھٹکتی تھی ۔ وہ مجھے بے شمار نصیحتیں کرتے تھے ۔ یہ کیجیے اور وہ نہ کیجیے ۔ اپنی صحت کا خیال رکھیے وغیرہ میں انھیں حضرتِ ناصح کہتی تھی جس سے وہ بہت چڑتے تھے ۔ بات یہ تھی کہ ندیم صاحب مجھے خاصا پسند کرتے تھے ۔ پتہ نہیں اس کو محبت کہا جا سکتا ہے یا نہیں ۔ محبت کی ایک قسم تو ہے ۔ سو اسی محبت میں وہ مجھے نصیحتیں کرتے جاتے تھے ۔ ہر بات کے انجام سے باخبر کرتے تھے ۔ اس سے مجھے بہت الجھن ہوتی تھی ۔ اور اس طرح اور زیادہ کھل کر بات کرنے میں مجھے جھجک سی محسوس ہونے لگی تھی ۔ انھیں نظمیں بھیجتے ہوئے بھی مجھے ایسا لگتا تھا گویا کسی بزرگ کے سامنے سر سے دوپٹہ اتر گیا ہو ۔ بار ہا انھوں نے میرے لیے کاغذ اور قلم تک بھیجے ۔ تاکہ میں لکھتی رہوں ۔ لیکن ہمارے ظاہری وجود کے نیچے جو ایک دھارا سا بہتا رہتا ہے ۔ اس میں ان کو شامل کرنا میرے لیے ناممکن تھا ۔ مثلاً اپنے تخیل کے عجیب رنگ میں انھیں دکھا سکتی تھی ۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں ان کو لکھوں :

"کل رات سیاہ گھوڑے پر سوار میرا محبوب مجھے لینے ہاسٹل کے باہر آئے گا ، اور میں اُس کے ساتھ فرار ہو جاؤں گی ۔ ہم کسی پہاڑی علاقے کی جانب بھاگ جائیں گے اور وہاں سیب کھا کر اور شبنم چاٹ کر ہم ہنسی خوشی رہیں گے ۔"

تو اُن کا جواب اس طرح ہوتا :

"فہمیدہ بی بی ۔ یوں تو آپ بہت سمجھدار ہیں ۔ مگر آپ سب کو اپنا جیسا نہ سمجھیں ۔ مجھے یقین ہے

کہ آپ سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیں گی۔"

ان کے اس طرح کے خط پڑھ کر میں اپنا سر پیٹتی اور بال نوچتی۔

اسی زمانے میں محمد خالد اختر سے میری بہت گہری دوستی ہوگئی تھی۔ ہم مستقل ایک دوسرے کو خط لکھتے تھے اور ایک دوسرے سے اتنا پیار کرتے تھے کہ اگر خطوں کا سلسلہ ایک دو ہفتے کے لیے بھی ٹوٹ جائے تو ہم دونوں بے چین ہو جاتے تھے۔ خالد کے خط پڑھ کر میں ناچتی پھرتی۔ کیونکہ وہ کچھ اس طرح کے ہوتے :۔

"کل رات میں ایک سیاہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی محبوبہ کے پاس جاؤں گا۔ پھر ہم دونوں لداخ کی طرف بھاگ جائیں گے۔ یہ بڑا سبک رفتار گھوڑا ہے۔"

اس پر میں فوراً انھیں اس مضمون کا خط لکھتی :۔

"بہت بہت مبارک باد۔ ضرور بھاگ جائیے اور مجھے ہر جگہ سے خط لکھیے۔ اس سفر میں اگر میں بھی شامل ہو سکتی تو کتنا اچھا ہوتا ——!"

خالد کے خط پڑھ کر مجھے سیاہ گھوڑے پر اور محبوب پر اور لداخ پر ...... سب پر یقین آجاتا۔ اور یہی یقین تو ہے جو زندگی کو جینے کے قابل بناتا ہے۔ جو شب و روز کے بے رنگ خاکوں میں چمکیلے رنگ بھرتا ہے۔ اور یہی تو انسانی زندگی کی خوبصورت سچائی ہے۔ کیونکہ ان میں سے ایک بات بھی خیالی یا غیر حقیقی نہیں۔ اسی دنیا میں لداخ بھی ہے۔ شبنم اور سیب بھی ہیں اور محبوب بھی ہیں —— وہ جو اپنے خوابوں میں اُن کے حسن کی جھلکیاں دیکھ کر اشتیاق سے بے تابانہ چل کھڑے ہوتے ہیں ایک دن اُن تک پہنچ بھی جاتے ہیں۔ ندیم صاحب۔ مجھے لگتا ہے خواب بالکل نہیں دیکھتے۔ کم از کم ان خطوں میں تو جو انھوں نے مجھے لکھے خوابوں کی کوئی نشانیاں نہیں ملتیں۔ صرف خشک نصیحتیں ہیں۔ اور بس! اس بات کو کیا آپ حقیقت پسندی کا نام دیں گے؟ —— یہ تو اس صلاحیت کا عدم وجود ہے کہ انسان کبھی اپنی طنابیں ڈھیلی بھی کر سکے۔ کبھی انجام پر تین حرف بھی بھیج سکے۔ اور جو اس کا دل چاہتا ہے کر گزرے۔ لیکن ندیم صاحب ضبط اور تحمل کا پیکر ہیں، اور ساتھ ہی معاشرے کی مروجہ روایات کا بہت احترام کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ محض روایتی آدمی نہیں بہت حساس ہیں اور ان کا دل شفقت و محبت سے بریز ہے۔ جس زمانے میں خالد کی طبیعت خراب تھی، تب ان کے خطوں میں صرف خالد کا تذکرہ ہوتا تھا۔ ندیم صاحب کے لیے اگر دل میں گرم جوشی پیدا بھی ہوتی، تو فوراً دب سی جاتی۔ حالانکہ میں انھیں بہت عزیز رکھتی تھی۔ مگر اس احترام سے کبھی چھٹکارا حاصل نہ کر سکی، جو بالکل بے معنی اور رسمی سا ہے۔ دراصل ندیم صاحب خود رسوم و قیود کے بہت پابند ہیں۔ میں کتنی بے تکلفی سے محمد خالد اختر کو صرف خالد یا سردار جعفری کو محض سردار کہہ سکتی ہوں۔ لیکن ندیم صاحب کے لیے میرے منہ اور قلم سے ہمیشہ ندیم صاحب یا قاسمی صاحب ہی نکلتا ہے۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ میں خالد کا یا سردار جعفری کا احترام نہیں کرتی۔ اس کے برعکس یہی سچی عزت اور حقیقی احترام ہے جو اس محبت پر بندشیں عاید نہیں کرتا جو عمر اور رتبے کے فرق کو مٹا کر محبت اور انسانوں کو شانہ بشانہ لا کھڑا کرتا ہے۔ لیکن ندیم صاحب جانتے ہیں کہ لوگوں سے فاصلہ کیسے قائم رکھیں۔

میں جب بھی ان سے ملی ہوں مجھے ایسا لگا ہے جیسے وہ رسیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ کیسی بندشیں ہیں جو انہوں نے خود پر عاید کر رکھی ہیں ۔۔۔ ! میں کچھ سمجھی ہوں اور کچھ نہیں بھی سمجھی ۔ بہرحال میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی۔ جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ندیم صاحب نے اپنا ایک بُت بنا یا ہے ۔ ایک ایسی تصویر ۔۔۔ جو انسان سے کہیں بڑی ہے ۔ میرا خیال ہے کہ عظیم انسان کا آورشی خاکہ تو ندیم صاحب کے سامنے ضرور تھا ۔ لیکن اس خاکے کے مطابق اپنی تصویر بنانے کے بدلے ندیم صاحب نے خود اپنے آپ کو اس خاکے میں فِٹ کر لیا ہے ۔ یعنی وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے کہ نظر آتے ہیں ۔ ایک بُردبار ۔ متحمل ۔ باوزن شخصیت ۔۔۔ اور یہ ایک بہت روایتی سا خاکہ ہے ۔

وہ دوسروں کا بہت خیال کرتے ہیں ۔ مگر کبھی کبھی یہ سوال دماغ میں سر اٹھاتا ہے کہ کیا وہ واقعی دوسروں کا خیال کرتے ہیں ۔۔؟ یا صرف اس بات کا کہ کس طرح تمام لوگ اسی روایتی سماج کے سسٹم میں فِٹ رہیں ۔ اگر کوئی آدمی معاشرے کے جبر کے خلاف بغاوت کا نعرہ لگا کر ایک مستی میں رقص کرے گا تو ندیم صاحب اس کے جذبے کو بہت سراہیں گے ۔ مگر فکر کے مارے کہ کہیں اس کا ٹخنہ نہ اتر جائے، وہ اس رقص کو فوراً روک دیں گے ۔

ان کے تمام خطوط پڑھتے چلے جایئے ۔ کہیں کسی چھوٹی سی کمینگی کا بھی نشان نہیں ملے گا ۔ نفرت، غصہ، حسد یہ رشک جلن یہ سب انسانی جذبات ہی تو ہیں ۔ جو بات آدمی کو قابلِ محبت بناتی ہے وہ تو یہ ہے کہ ان سفلی جذبات کے باوجود وہ پیار بھی کر سکتا ہے ۔ دوسروں کے لیے قربانیاں بھی دے سکتا ہے ۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ ندیم صاحب میں یہ چھوٹی چھوٹی انسانی خصلتیں وجود ہی نہ رکھتی ہوں ۔ مگر ندیم صاحب نے ان کا اس طرح گلا گھونٹا ہے کہ یہ جملہ انسانی اوصاف بچارے سانس بھی نہیں لے سکتے ۔ ان کی شخصیت میں ہر طرف عظمت ہی عظمت نظر آتی ہے ۔

اپنی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو یوں قابو میں کرنے کے لیے اُن کے پاس کیسی زبردست قوتِ ارادی ہو گی ۔ اس بات کے لیے احترام پیدا ہوتا ہے !

ندیم صاحب کی تقدیر میں محض عزت و احترام ہے ۔ عظمت کی بلندیوں پر وہ تنہا کھڑے ہیں ۔ کوچۂ ادب کے ہم جیسے خاک نشین اُن کی تعظیم میں سروقد تو کھڑے ہو سکتے ہیں مگر ندیم صاحب کبھی "اِدھر آبے آبے او چاک گریباں والے" کی پیار بھری پکار نہیں سُن پائیں گے ۔۔۔۔۔

پھر بھیانک تیرگی میں آگئے

ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے		(ندیم)

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا

میں تو دریا ہوں، سمندر میں اُتر جاؤں گا		(ندیم)

قتیل شفائی

عظیم فنکار، عظیم انسان

خدا کے بعد سب سے بڑا نام احمد کا نام ہے اور ندیم دوست سے تو غالب کو بھی لو ہے دوست آتی تھی پھر وہ احمد ندیم قاسمی بھی ہو صرف اپنے اسم گرامی کی حدود میں بھی شخصیت کی بہت بڑی وسعتوں کا مالک دکھائی دیتا ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب علامہ اقبال کا اسلوب پنجاب کی پوری شاعری پر چھایا ہو تھا۔ جو نیا شاعر سامنے آتا اقبال کی دلکشی کا لباس پہن کر سامنے آتا۔ اقبال کی وفات کے بعد برسوں تک تو اقبال کے مرثیے بھی اقبال ہی کی دلکشی میں لکھے جاتے رہے اور اقبال پسندوں کے اس ہجوم میں سبھی لوگ ایک ہی جیسی شکلوں میں نظر آنے لگے۔ صرف چند چہرے ایسے ستھے، جو اپنی الگ پہچان کے تمدنی معلوم دیتے تھے ان چہروں میں ایک نمایاں چہرہ حضرت احمد ندیم قاسمی کا تھا۔

یوں تو قاسمی صاحب کو تمام اصناف سخن پہ قدرت حاصل تھی۔ لیکن ان کے قطعات نے ایک زمانے کو چونکا رکھا تھا وہ اس لیے کہ ان قطعات کی فضا کوئی خیالی فضا نہ تھی۔ بلکہ اس میں پنجاب کے دیہات کا دل دھڑک رہا تھا اور پھر قاسمی صاحب کا قریۂ مشاہدہ، احساس کی شدت اور ان کے فن کا بے ساختہ پن ان قطعات کو امر بنا رہا تھا اور اس زمانے میں اختر شیرانی کے بعد سب سے زیادہ مقبولیت قاسمی صاحب کے حصے میں آ رہی تھی۔

قاسمی صاحب سے نیاز مندی کا سلسلہ جب سے جو شروع ہوا تو اب تک اس میں ۔ موفرق نہیں آیا۔ تیس برس کے تعلق کو اعزاز کوئی معمولی اعزاز نہیں وہ میرے جب بھی محترم تھے اب بھی محترم ہیں۔ میں انھیں بڑا بھائی کہوں، استاد کہوں، یا دوست کہوں سبھی دعوے بجا ہیں۔ مجھے تو قاسمی صاحب کی ذات میں کئی رشتوں کا حسن دکھائی دیا ہے اور میں نے ایک اکیلی ذات میں پوری کائنات کا لطف اٹھایا ہے۔

ضلع سرگودھا کی تحصیل خوشاب میں ایک چھوٹا سا گاؤں انگہ ہے جہاں کچھ برس پہلے تک بجلی اور پانی تک گزر نہ تھا اس گاؤں تک ذوق شعری اور جوہر علم کی رسائی کیونکر ہوئی؟ اس کا علم مجھے نہیں ہے۔ میں تو جانتا ہوں کہ اس گاؤں میں قاسمی صاحب کے خاندان کے کئی افراد اس زمانے میں اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور تھے۔ جب بڑے بڑے شہروں میں بھی مسلمانوں میں تعلیم کا فقدان تھا مگر شاعری کی دولت پھر بھی قاسمی صاحب کے حصے میں آئی اور اتنی حصے میں آئی ... کہ انھوں نے جھولیاں بھر بھر کے دولت سمیٹی۔ لیکن اس دولت کے انبار اب جو قاسمی صاحب کے آس پاس کھنکتے دکھائی دیتے ہیں ۔ ایک چھوٹے سے

گاؤں میں اتنا امیر آدمی کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

غالباً سن بیالیس کی بات ہے جب قاسمی صاحب "پھول" اور "تہذیب" کی ادارت کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھے۔ قاسمی صاحب کے بھائی مولانا غلام مرشد ایک عالم بے بدل ہیں اور مذہبی علوم پر اُن کی قدرت کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ادھر قاسمی صاحب شعر و ادب کے انسانیت نواز نظریوں کے علمبردار، جن پر مذہب کی زیادہ گرفت نہیں۔ اس کے باوجود دونوں قاسمی صاحب مولانا غلام مرشد صاحب کے ہاں بھاٹی دروازہ کے اندر قیام پذیر تھے۔ سوائے زندگی کی بنیادی اقدار کے ان دونوں میں کہیں بھی اتحاد فکر نہ تھا۔ لیکن مولانا کی جس شفقت اور قاسمی صاحب کی جس نیازمندی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کیا اس کے اظہار کا کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں۔ وہ تو خیر قاسمی صاحب اور مولانا صاحب میں بھائی چارے کا معاملہ بھی تھا۔ میں نے تو قاسمی صاحب کو ایسے لوگوں سے بھی نباہ کرتے دیکھا ہے جو نظریات و خیالات میں قاسمی صاحب سے بعد مشرقین رکھتے تھے۔ یہ وصف کسی کسی میں ہوتا ہے۔

میں نے قاسمی صاحب کو آج تک غصے کے عالم میں نہیں دیکھا۔ بالکل اسی طرح جیسے مولانا چراغ حسن حسرت کو میں نے کبھی قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے بڑے بڑے اختلافی مسائل پر بحث کرتے ہوئے بھی قاسمی صاحب کو دیکھا ہے اور ان پر بعض لوگوں کی زیادتیاں بھی دیکھی ہیں جو قاسمی صاحب کے دفتر میں بیٹھ کر ہر قسم کے آداب بھول جاتے ہیں۔ میں نے ایسے موقع پر انھیں کتنایا ہوا تو محسوس کیا ہے۔ لیکن غصے کا اظہار انھوں نے جیسے اپنے آپ پر حرام کر رکھا ہے۔ میری آج تک یہ حسرت پوری نہیں ہوئی کہ اس "صاحب جدل و جمال" کے جدل کی ایک چھوٹی سی جھلک دیکھ سکوں۔ دراصل قاسمی صاحب اپنے آپ کو اپنے اندر چھپا لینے کی بہت بڑی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے غموں کا اور خوشیوں کا بوجھ دوسروں پر لادنے کے قائل نہیں جو بھی کیفیت ہو وہ ان کی اپنی ملکیت ہوتی ہے۔ ہاں آپ از خود ان کا کوئی غم یا ان کی کوئی خوشی اپنی جھولی میں ڈال لیں تو یہ اور بات ہے

قیام پاکستان سے پہلے قاسمی صاحب نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور مسلم لیگ کے جھنڈے تلے قیام پاکستان کے لیے جان لڑا دی۔ لیکن جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو مسلم لیگ کے بدلے ہوئے کردار نے قاسمی صاحب کو اس سے بدظن کر دیا۔ اگر وہ چاہتے تو ہزارہا مصلحت پرستوں کی صف میں کھڑے رہتے اور اپنی سابقہ قومی خدمات کا تمغہ سینے پر سجا کر کوئی پرمٹ، کوئی کوٹھی یا کوئی مل الاٹ کرا لیتے اور اب تک لاکھوں کے مالک بن گئے ہوتے۔ لیکن ان کے سامنے تو صرف قیام پاکستان کی منزل تھی۔ انھوں نے مسلم لیگ کا ساتھ اس وقت دیا جب اس جماعت کا ساتھ دینا گھاٹے کا سودا تھا۔ جب مسلم لیگ فائدے کی چیز بن گئی تو قاسمی صاحب اس سے دور بہت دور چلے گئے۔

مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا۔ قاسمی ایک ایسا ہاتھی ہے جسے اپنی قوت کا اندازہ نہیں۔ مولانا کی یہ رائے قاسمی صاحب کے اس انکسار کی وجہ سے ہے جو انھیں روز ازل سے ودیعت کر دیا گیا ہے ورنہ میرا تجزیہ تو یہ ہے کہ انھیں نہ صرف اپنی قوت کا اندازہ ہے بلکہ وہ اسے برتنا بھی جانتے ہیں۔ ایک زمانے میں لوگ کہنے لگے تھے کہ قاسمی صاحب کی غزل کمزور ہوتی ہے۔ اس میں تغزل نہیں ہوتا۔ قاسمی صاحب نے یہاں اپنی قوت کا مظاہرہ کیا تو چند ہی برسوں میں ایسی غزل کہی جو اور کسی کا مقدر نہ تھی اور اب یہ عالم ہے کہ ہندوستان میں فراق کی غزل اور پاکستان میں قاسمی صاحب کی غزل ایک پوری نسل کی تربیت کر رہی ہے۔

(باقی صفحہ ۲۵۷ پر)

رشیدہ رضویہ

قاسمی صاحب

مدرسے میں ایک کہانی کی دھوم مچی تھی۔ بڑی جماعتوں کی لڑکیاں یہ کہانی بار بار پڑھتیں، اور ہائے وائے کرتی خوب آنسو بہاتیں۔ چھوٹی جماعتوں کی بچیوں کی کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ کہ بڑی لڑکیوں پر کیا افتاد پڑ گئی۔ ایسی کونسی داستانِ الم ہے۔ جس نے ان چلبلی ہنستی گاتی لڑکیوں کو مجسم غم و یاس بنا دیا۔ بچیوں کو تو الف لیلیٰ کے جنات اور پریوں اور ونڈر لینڈ کی ایلس نے بھی ایسا دیوانہ نہ کیا۔ جنوں پریوں کی دل آویز کہانیوں کے ساتھ ساتھ روسی ناولوں کے ترجمے اور منشی پریم چند کی دیہاتی کہانیاں کوئی تاثر نہ چھوڑتیں۔ بالکل بے جان اور سپاٹ محسوس ہوتیں۔ اور مجھے اس کہانی کی تلاش تھی جس کا ذکر اردو کی استانیوں سمیت بڑی لڑکیاں ہائے وائے کے ساتھ کرتی تھیں۔ اور ان لڑکیوں کے ذکر اذکار سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ یہ کہانی ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں، کی قبیل کی نہ تھی۔ اس کہانی میں کسی لڑکی کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ یہ کوئی عشقیہ رومانی داستان نہ تھی۔ بلکہ افسانوں کی عام روایات سے بالکل ہٹ کر تھی۔ لیکن عام روایات سے ہٹ کر ہونے کے باوجود یہ منٹو و عصمت کی کہانیوں سے بھی بالکل الگ تھلگ کھڑی لڑکیوں کے ذہن میں ستاروں کی طرح جگمگا رہی تھی منٹو و عصمت کے ناموں پر لڑکیاں الف توبہ اور چھی چھی خاصی کراہت سے کرتی تھیں۔ لیکن اس الگ تھلگ سی مختلف کہانی" کے مصنف کا ذکر بڑے احترام و عقیدت سے ہوتا تھا، چھوٹی بچیوں کو باوجود کوشش کے معلوم نہ ہو سکا۔ کہ کس مصنف اور کس کہانی نے مدرسہ بھر کو لوٹ لیا ہے۔ یہ بچیاں اس قابل ہی کہاں تھیں۔ کہ ان سے افسانوں، داستانوں کے تذکرے کیے جاتے۔ بچیاں اپنی جنوں، بھوتوں اور پریوں کی کہانیوں میں محو ہو گئیں، تو ایک روز میری ایک ہم جماعت بڑے فاتحانہ انداز میں ماہنامہ 'زیب النساء' کا وہ شمارہ لائی۔ جس میں وہ ہوش ربا، دیوانہ کن کہانی کسی ترقی پسند پرچے سے لے کر دوبارہ شائع کی گئی تھی۔ میں عموماً حساب کے گھنٹہ میں بیٹھ کر کہانیاں پڑھتی تھی۔ کیونکہ میری سمجھ نہ آتا تھا کہ یہ ذواضعاف اقل اور عادِ اعظم۔ دونوں تاریخی بھائی ابن خلدون اور البیرونی کی طرح دنیا کی سیاحت کے بجائے، یہاں حساب کے ہندسوں میں بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔ چونکہ زیب النساء کا وہ شمارہ حساب کے گھنٹہ میں پڑھنا ذرا دشوار عمل تھا۔ لہٰذا اپنی ہم جماعت کے ہمراہ چپکے سے جماعت سے باہر نکلی اور مدرسہ کے ایک گوشہ میں چھپ کر کہانی پڑھنا شروع کی۔ کہانی پڑھنے کے بعد میں نے بھی ہائے وائے

شروع کر دی۔ ہائے بے چارہ کریم۔ اس آدم زاد کے گھر میں ایک چڑیل کہیں سے آ گئی۔ اور اُس نے کریم کو بھون کر کھا لینے کے لیے آگ میں ڈال دیا۔ لیکن وہ کالا جن۔ جو کوّے کی صورت میں درخت کی اونچی شاخ پہ رہتا تھا۔ اُس نے کریم کو جلنے سے بچا لیا، اور پھر پتہ ہے چڑیل نے کیا کیا؟ ۔ وہ ہر روز کریم کے پاؤں میں جادو کے کانٹے چبھوتی اور اُس کے زخموں کو چھیل کر اُن میں نمک مرچ بھر کر پکاتی تھی۔ اور یوں کریم کو ہر روز جادو کے زور سے مُردہ کر دیتی اور زندہ کر دیتی۔ غرضکہ قاسمی صاحب کا افسانہ "پاؤں کا کانٹا" میں نے خالص اساطیری اور الف لیلوی انداز میں پڑھا اور سمجھا۔ اس سے پیشتر میں نے قاسمی صاحب کی کوئی کہانی نہیں پڑھی تھی، اور یہ کہانی منشی پریم چند کی کہانیوں کی طرح بے جان اور سپاٹ محسوس نہیں ہوئی۔ اس لیے یہ حقیقت تو میرے ذہن میں سما ہی نہیں سکتی تھی۔ کہ افسانہ "پاؤں کا کانٹا" کسی آدم زاد کا تحریر کردہ ہے۔ خیال یہی تھا، جس طرح بچوں کو فرشتے ماؤں کی گود میں ڈال جاتے ہیں۔ اُسی طرح الف لیلی اور اساطیری کہانیاں بھی فرشتے لکھتے ہیں۔ قاسمی صاحب فرشتہ تو ہو نہیں سکتے۔ کیونکہ ان کا خمیر اسی زمین سے اٹھا ہے۔ لیکن قاسمی صاحب میں شاعروں جیسی کوئی خصلت نہیں ہے۔ لہٰذا فرشتہ ہی ہوئے۔ نہ وہ ام الخبائث سے شغف رکھتے ہیں۔ نہ عورتوں کو غلط قسم کی چیز سمجھتے ہیں۔ نہ اُن کی نگاہوں میں وہ ہوس اور بھوک ہے۔ جو اکثر شعرائے کرام کی نگاہوں میں پائی جاتی ہے۔ عورت سے بات کرتے بار قاسمی صاحب کے الفاظ بھی کسی صورت نہیں بھٹکتے ہیں۔ ورنہ اکثر شعرائے کرام کا یہ عالم ہے۔ کہ اپنی پختہ عمر کا لحاظ کیے بغیر عورت کی آواز سنتے ہی ذہن کی بالکل نچلی سطح پہ اتر کر بڑی کم ظرفی اور گھٹیا پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ قاسمی صاحب مختصر اور محتاط گفتگو بڑی سنجیدگی اور ٹھہراؤ کے ساتھ کرتے ہیں۔ معلوم نہیں۔ افسانہ نگاری نے ایک شاعر کو ذہنی طہارت اور پاکیزگی دے رکھی ہے۔ اُس کے وجدان کو بے داغ۔ خیالات کو ارفع اور زندگی کو متوازن کرتی ہے۔ یا وہ طبعًا ہی ایسے ہیں۔ اُن کے اندر جو آدمی ہے۔ وہی اُن کی تحریروں میں بھی اپنی روشنی پھیلاتا رہتا ہے۔ ذہن اور نفس کی روشنی، بہت بڑی بات ہے۔ ذہن میں تاریکی ہو، تو چہرہ اور گفتگو ہی اُس کی غمازی کر دیتے ہیں۔ جو متانت اور شائستگی خود قاسمی صاحب میں ہے۔ وہی اُن کے کاموں۔ شاعری اور افسانوں میں پائی جاتی ہے۔ مَردوں کے تحریر کردہ افسانے عمومًا کرخت اور کھُردرے ہوتے ہیں۔ لیکن قاسمی صاحب کے افسانوں میں حیرت انگیز طور پہ لوچ۔ نرمی اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ یہ نرمی و نزاکت یقینًا قاسمی صاحب کے ذہنی تحیّر کی وجہ سے ہے۔ تصوّف میں جس "تحیّر" کو شرط قرار دیا جاتا ہے۔ قاسمی صاحب کے ہاں اُس کی کوئی کمی نہیں ہے۔

غالبًا اسی تحیّر کے پیشِ نظر مدرسہ سے کالج تک پہنچتے پہنچتے میں نے قاسمی صاحب کے بیشتر افسانے پڑھ ڈالے۔ لیکن کالج میں قاسمی صاحب کے افسانوں کی نہیں۔ بلکہ شاعری کی دھوم تھی۔ اور سینٹ جوزف جیسے ارستوکریٹ اور خالص انگلش وضع قطع کے کالج میں بڑی جماعتوں کی لڑکیاں بیٹھ کر "مہاراج ادھیراج" پڑھتی تھیں۔ اُن ہی دنوں یعنی ۱۹۵۲ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا کل پاکستان اجلاس کراچی میں ہوا۔ تو یہ نظم مجھے بھی اس اجلاس میں کھینچ لے گئی۔ لیکن وہاں ڈائس پہ ڈھیر سارے منوں ٹنوں کے حساب سے شاعر۔ ادیب اور اخبار نویس بیٹھے تھے۔ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ کون کون ہے۔ اور کیا ہے؟ والدہ مرحومہ کو "مہاراج ادھیراج" سننے کا بے حد اشتیاق تھا۔ لہٰذا کاغذ کے ایک پرزہ پہ اس نظم کی فرمائش لکھ کر میں ڈائس تک لے گئی۔ اور نہ جانے کن صاحب کے ہاتھ میں۔ دھندلا دھندلا سا یاد آتا ہے،

کہ غالبًا حمید اختر صاحب کے ہاتھ میں پُرزہ تھما دیا۔ خواتین کی پُرزور فرمائش پہ قاسمی صاحب نے یہ نظم پڑھی لیکن افسوس کہ اپنی موٹر کا ہارن مسلسل بجنے پہ آتاں سب بچوں، یعنی بہنوں بھائیوں کو سمیٹ کر نظم سننے سے پیشتر ہی جلسہ گاہ سے اُٹھ گئیں۔ اور یہیں کالج کی بڑی لڑکیوں کو قاسمی صاحب کے متعلق کچھ بھی نہ بتا سکی۔ قاسمی صاحب کے متعلق میں آج بھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لوگ سالہا سال سے متواتر قاسمی صاحب کی شخصیت اور اُن کے فن پہ اتنا کچھ کہہ رہے ہیں کہ میرے کچھ کہنے کی تو گنجائش ہی نہیں ہے۔ جب کہ میری قاسمی صاحب سے کوئی لمبی چوڑی ملاقات بھی نہیں ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۶۵ء کے اواخر میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۶۶ء کے اوائل میں ملاقات ہوئی۔ پہلی ملاقات دس منٹ کی۔ اور دوسری ملاقات تقریبًا سترہ منٹ کی تھی۔ پہلی ملاقات کے بعد مجھے قاسمی صاحب کے تمام چھوٹے بڑے افسانے دوبارہ پڑھنے کا اشتیاق ہوا۔ تو یہ حیرت انگیز انکشاف بھی ہوا۔ کہ وہ کہانی "پاؤں کا کانٹا" بھی احمد ندیم قاسمی کی تخلیق ہے۔ یہ کہانی میرے شعور میں اپنے اُسی ایک اساطیری انداز میں موجود تھی۔ اور آج بھی میرے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے۔ گو یہ انکشاف خوش کن ہونے کے علاوہ خاصا تکلیف دہ بھی تھا۔ کیونکہ بچپن میں دوسرے کی چیز بھی اپنی ملکیت معلوم دیتی ہے۔ اسی لیے ۱۹۶۶ء تک مجھے یہ معلوم نہ ہو پایا۔ کہ "پاؤں کا کانٹا" درحقیقت قاسمی صاحب کی چیز ہے۔ بہرحال اس انکشاف کے بعد قاسمی صاحب سے دوسری ملاقات نسبتًا زیادہ خوش گوار موڈ میں ہوئی۔ لیکن جب قاسمی صاحب نے اس سترہ منٹ کی ملاقات میں مجھ سے "فنون" کے لیے افسانہ طلب کیا۔ تو میرے ذہن میں کانٹے چبھنے لگے۔ اور جل کر۔ چڑ کر میں نے افسانہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ قاسمی صاحب کو اس بدلحاظی سے کبھی کب واسطہ پڑا ہوگا۔ وہ بھی ایک درجن حضرات کے سامنے! — تعجب سے کبھی مجھے اور کبھی اپنے درجن بھر عقیدت مندوں کو دیکھا کیے۔ لیکن ایک تو میری ملاقات کا مقصد یہ قطعی نہیں تھا۔ کہ میں اپنے افسانوں کے لیے "فنون" کی خواہاں تھی۔ اور پھر لاہور کے دو عدد جرائد کے بداخلاق۔ بداطوار مدیرانِ محترم نے اپنی چھچھوری اور گھٹیا باتوں سے مجھے ایسا بیزار کیا تھا، کہ میں نے پختہ ارادہ کر رکھا تھا کہ لاہور کے کسی بہتر سے بہتر ادبی جریدے کے شریف و نفیس مدیر کو بھی کوئی افسانہ یا مضمون ہرگز ہرگز نہیں دوں گی۔

افسانے کے بعد قاسمی صاحب نے بڑی شفقت و خلوص سے ناول کی فرمائش کی۔ غالبًا میں اس سے بھی انکار کر دیتی۔ کیونکہ لاہور سے جو ناشر کراچی وارد ہوتا۔ سیدھا میرے گھر کا رُخ کرتا۔ بعض ناشر صاحبان جانے کہاں سے چٹک مٹک قسم کی لڑکیوں کو پکڑ کر لے آتے کہ دیکھو ہمارا کتنا وسیع کاروبار ہے۔ نہ اسٹینو اور سیکریٹری بھی رکھ چھوڑی ہیں۔ مجھے ان ناشروں سے بڑی گھن آتی تھی۔ بدبختوں کی صورتیں مکروہ۔ ساتھ اطوار بھی اس قدر مکروہ! ایسے دولت مند تھے۔ تو اپنی زمینوں اور باغات کے بجائے مسودوں کی تلاش میں کراچی کے گلی کوچوں میں کیوں مارے مارے پھر رہے تھے؟ اور مجھے یقین تھا۔ کہ بدقسمتی سے اِن نام نہاد ناشروں کو اپنا کوئی ناول دے دیا۔ تو ناول کی اشاعت کے بعد یہ زمینوں اور باغات کے مالک ناشر دفعتًا اپنی غربت کا اعلان کر کے یہی رونا روئیں گے، کہ ناول کی تو محض چند کاپیاں نکلی ہیں۔ رائلٹی کہاں سے دی جائے۔ یہی نہیں، بلکہ رائلٹی طلب کرنے والے ناول نگاروں میں ناشرین کو دفعتًا دنیا بھر کی خرابیاں بھی نظر آجاتی ہیں۔ لہٰذا میرا ارادہ یہ بھی تھا۔ کہ لاہور کے کسی ناشر کو اپنا کوئی

(باقی صفحہ ۲۶۲ پر)

ایوب صابر

قوم پرست

پاکستان کے شاعروں اور ادیبوں میں اس وقت احمد ندیم قاسمی سے بڑا قوم پرست اور سچا پاکستانی مجھے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ برعظیم کی تقسیم سے قبل وہ اُسی مقام پر نظر آتے ہیں۔ جہاں فیض احمد فیض بڑی استقامت سے ایستادہ ہیں۔ تقسیم کے بعد فیض کے اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا رہا۔ اور ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد وہ فیض سے بہت دور نکل گئے۔ بہرحال اس قصے کو میں آگے چل کر چھیڑوں گا۔ سردست تو مجھے اپنی اُن یادداشتوں کو قلم کی گرفت میں لانا ہے جو کسی نہ کسی صورت میں احمد ندیم قاسمی سے وابستہ ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کو پہلی بار میں نے کراچی میں دیکھا تھا۔ یہ ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے عروج کا زمانہ تھا۔ اور خالق دینا ہال میں ترقی پسند شعراء اور ادبا، غالب کے حضور نذرانہ ہائے عقیدت پیش کر رہے تھے۔ میں ہال میں داخل ہوا تو مشہور طنز و ظرافت نگار ابراہیم جلیس غالب پر اپنا "کالم" پڑھ رہے تھے۔ اُن کی پُشت پر ایک صاحبِ ذوق مناسب مقامات پر تالیاں بجاتا جاتا تھا۔ اس کی شخصیت بڑی جاذبِ نظر تھی۔ میں نے احمد ندیم قاسمی کو تصویروں میں دیکھا ہوا تھا۔ مگر اُن سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے میں اُس وقت تک یہ معلوم نہ کر سکا کہ تالیاں بجانے والا احمد ندیم قاسمی ہے۔ جب تک اُن کو بھی مقالہ پڑھنے کے لیے بُلا نہ لیا گیا۔ تصویروں میں جس احمد ندیم قاسمی کو میں نے دیکھا تھا اُس کے ہونٹوں پر دو باریک "تلواریں" لٹکی ہوئی تھیں۔ اور یہ تلواریں مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ کیونکہ اُس زمانے میں میری اپنی مونچھوں کا بھی یہی برانڈ تھا۔ لیکن خالق دینا ہال میں جو احمد ندیم قاسمی غالب پر اپنا مقالہ پیش کر رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ صاف تھے۔ اور اس کو دیکھ کر میں مایوس ہو گیا تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب آتش جوان تھا اور ہر مرد کو مونچھوں کے پیمانے سے ناپتا تھا۔ پھر ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ خود میرا چہرہ بھی صاف ہو گیا۔ اور مجھے مونچھوں سے صاف چہروں سے مصالحت کرنی پڑی۔

مسلم لیگ سے بدظن ہونے اور مسلم لیگ کی بخشی ہوئی وزارتِ بحالیات کو ٹھکرانے کے بعد جب میاں افتخار الدین مرحوم نے لاہور سے روزنامہ امروز جاری کیا، تو کوہاٹ میں اس اخباری نمائندگی کا اعزاز مجھے بخشا گیا۔ اور میری سیاسی ڈائریاں اور مکتوبات اس میں باقاعدگی سے چھپتے رہے۔ بعد میں جب احمد ندیم قاسمی صاحب اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو مکتوبات کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔

اور احمد ندیم قاسمی نے ایک خط میں مجھے خبریں بھیجنے کے لیے تحریر کیا۔ مگر میں اپنی دیگر مصروفیات کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔ بہر حال، احمد ندیم قاسمی کی یہ تحریر میرے نام اُن کا پہلا مکتوب تھا۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ احمد ندیم قاسمی خود بھی 'امروز' سے علیحدہ ہو گئے۔ اور جن اصولوں کی بنا پر علیحدہ ہوئے، اُن کی وجہ سے میری نظر میں اُن کا مقام اور بھی بلند ہو گیا اور میں دل ہی دل میں اُن کی پرستش کرنے لگا۔ پرستش کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ بیچ بیچ میں ایک ایسا مقام بھی آیا کہ یہ سلسلہ عارضی طور پر ٹوٹ گیا۔ اور میں دل ہی دل میں پشیمان ہوا کہ ایک طویل مدت تک ایک غلط آدمی کو دیوتا سمجھ کر پوجتا رہا ہوں۔ بعد میں انھوں نے میرے ایک نہایت ہی تلخ خط کے جواب میں ایک ایسا شیریں خط بھیجا، میں ندامت سے جھک گیا اور میں دوبارہ اُن کی پرستش میں مصروف ہو گیا، اور یہ سلسلہ کئی بدگمانیوں کے باوجود اب تک جاری ہے:

نامناسب نہ ہوگا اگر لگے ہاتھوں اُن بدگمانیوں کا بھی ذکر کردوں۔ یہ بدگمانیاں پاکستان رائٹرز گلڈ کے انتخابات کے دوران پیدا ہوئیں۔ ان انتخابات میں احمد ندیم قاسمی بھی اس اعتبار سے ایک فریق ہوتے ہیں کہ ان کے حواری اپنے مطلب براری کے لیے اُن کا نام برابر استعمال کرتے ہیں۔ اور اپنے مطلب کے آدمیوں کو منوانے کے لیے بدترین سیاسی حربے استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مثلاً پچھلی بار جب میں پشتو گروپ کی طرف سے گلڈ کی مرکزی مجلسِ عاملہ کی رکنیت کے لیے کھڑا ہوا۔ تو میرے خلاف یہ پروپیگنڈا بڑے زور شور سے کیا گیا کہ ایوب صابر ایک متعصب پشتون اور جماعت اسلامی کا ممبر ہے۔ دوسری طرف جماعتِ اسلامی کے ہم نواؤں نے ناچیز کو ہمیشہ ایک کمیونسٹ کہہ کر دھتکارا۔ یہاں یہ بحث چھیڑنا بے کار ہے کہ راقم الحروف متعصب پشتون اور جماعت اسلامی کا ممبر ہے یا کمیونسٹ ہے۔ مگر یہ بتانا ضروری ہے کہ ماضی میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کو حکومت نے ایک سیاسی جماعت قرار دے دیا تھا۔ تو اس انجمن کا ایک رکن ہونے کی وجہ سے راقم الحروف کو دو اچھی سرکاری ملازمتوں اور فوج میں کمیشن حاصل کرنے سے ہاتھ دھونے پڑ گئے تھے۔ اور دو برس تک سرکاری ملازمت کے دروازے راقم الحروف پر بند تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ راقم الحروف کو ایک برس تک کرم ایجنسی میں بن باس بھی کاٹنا پڑا تھا۔

میں احمد ندیم قاسمی کے سر یہ الزام نہیں دھرتا کہ انتخابی دھاندلیوں میں وہ بہ نفسِ نفیس شامل ہوتے ہیں۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کے "چیلے" اپنی ہر دھاندلی کا آغاز انہی کے نام سے کرتے ہیں اور ہمیشہ کامیابیاں حاصل کرتے ہیں۔ یہ بحث بہت طویل ہے اور اس میں مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی بہت ہیں۔ مگر میں اس کو یہ کہہ کر سمیٹتا ہوں کہ اگر احمد ندیم قاسمی میں اپنے خوشامدیوں کی بے جا طرف داری کی کمزوری نہ ہوتی، تو وہ اپنے موجودہ قد سے بہت اونچے ہوتے۔ مجھے دکھ ہے کہ احمد ندیم قاسمی کا ذکر کرتے ہوئے چند ایسے حقائق بھی منظرِ عام پر لا رہا ہوں جن کی وجہ سے احمد ندیم قاسمی کا دامن داغ دار ہو رہا ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ میں ایک کھرا اور سچا آدمی ہوں اور دل کی باتیں دل میں رکھنے کا عادی نہیں۔ تاہم یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں احمد ندیم قاسمی کو ان کے حواریوں اور چیلوں سے زیادہ چاہتا ہوں۔

آج سے چند برس پیشتر تک میرا یہ دستور تھا کہ سال میں ایک بار لاہور ضرور جاتا۔ "خوش حال و اقبال" کے مصنف میر عبدالصمد خان ان دنوں سمن آباد کی ایک چھوٹی سی کوٹھی میں رہتے تھے۔ لاہور میں میرا قیام انہی کے ہاں ہوتا۔ میر عبدالصمد خان ایک تنہائی پسند آدمی ہیں۔ ہر ایرے غیرے سے میل جول رکھنا پسند نہیں کرتے۔ اُن کا حلقۂ احباب محدود ہے۔ لاہور میں انھوں نے

دس برس گذار دیے۔ مگر اپنے دفتر اور کوٹھی سے باہر کم ہی نکلے۔ میں لاہور اُن کے پاس پہنچا تو تنہائی کی زنجیریں وہ میرے پاؤں میں بھی ڈال دیتے۔ مگر چند احباب سے ملنے کے لیے مجھے بہرحال وقت نکالنا پڑتا۔ اور وہ زنجیریں توڑنی پڑتیں۔ ان چند احباب میں احمد ندیم قاسمی کا نام سرِفہرست ہوتا۔ پہلی بار جب قتیل شفائی صاحب مجھے اُن کے پاس لے گئے تھے تو میرا خیال تھا کہ رسمی تعارف کے باوجود وہ مجھے نہیں پہچان سکیں گے۔ مگر اُن کو تو وہ خط و کتابت بھی یاد تھی جو امروز کے زمانۂ ادارت میں انھوں نے میرے ساتھ کی تھی۔

میں پہلی بار لاہور ایک خاص مشن کے تحت گیا تھا۔ اور میرے پروگرام میں لاہور کے ادیبوں اور فلم سازوں سے ایک خاص موضوع پر بات چیت شامل تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انتظار حسین کے گھڑے ہوئے ایک لطیفے کی وجہ سے سرحد کے دانشور بگڑے ہوئے تھے۔ انتظار حسین نے اس لطیفے میں پشتونوں کی توہین کی تھی۔ اگرچہ بعد میں انھوں نے اخبارات میں تحریری معذرت نامہ چھپوا دیا تھا۔ مگر پشتون دانشوروں کے جذبات اس معذرت نامے سے سرد نہیں پڑے تھے۔ اس کے علاوہ اُس زمانے میں اردو اور پنجابی کی ہر فلم میں کسی نہ کسی پشتون کو گرا ہوا پیش کرنا لاہور، کراچی اور ڈھاکہ کے فلم سازوں کا معمول تھا، اور مجھے لاہور میں فلم سازوں سے پوچھنا تھا کہ کیا اُن کی نظر سے کوئی شریف پشتون کبھی نہیں گذرا؟ لاہور میں سب سے پہلے یہ سوال میں نے سیف الدین سیف صاحب سے کیا تھا۔ کیونکہ انھوں نے بھی اپنی ایک فلم "سات لاکھ" میں پشتونوں کے ساتھ وہی سلوک کیا تھا جو دیگر بے شعور فلم ساز کرتے رہتے تھے۔

سیف الدین سیف کے سامنے جب میں نے اپنے جذبات پیش کیے، تو انھوں نے پہلے تو دل کی گہرائیوں سے معذرت پیش کی۔ اور پھر بحث کو دوسری طرف موڑ کر لے گئے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ پنجابی فلموں میں پنجاب کی جن مٹیاروں کو پیش کیا جاتا ہے۔ کیا اُن میں اور پیشہ ور طوائفوں میں کوئی فرق محسوس ہوتا ہے؟۔ اور مجھے جواب دینا پڑا کہ "قطعاً نہیں" پھر وہ بولے:

"تو خان صاحب! آپ صرف پشتونوں کی بے عزتی پر کیوں سیخ پا ہوتے ہیں۔ کیا پنجاب پاکستان کا ایک حصہ نہیں ہے۔ اور کیا پنجاب کی مٹیاروں سے آپ کا کوئی رشتہ نہیں ہے؟"

سیف صاحب کے اس سوال سے میں کچھ بوکھلا سا گیا تھا۔ اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا جواب دوں۔ وہ میری اس بے بسی کو تاڑ گئے۔ اور بحث کو چائے کی پیالی میں ڈبوتے ہوئے کہنے لگے۔

"خان صاحب آپ بے فکر رہیں۔ میں لاہور کے فلم سازوں سے اس موضوع پر بات کروں گا۔ اور آپ بھی سرحد کے دانشوروں کو سمجھائیے کہ فلم ساز پنجابی، پشتون، سندھی، بنگالی اور بلوچ نہیں ہوتے انھیں اِن علاقوں کے کلچر سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اُن کا مطمعِ نظر تو صرف یہ ہوتا ہے کہ بینک بیلنس بڑھانے کے لیے کس کو بے عزت کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ خود پنجابی فلم ساز بھی پنجاب کو بے عزت کرتے رہتے ہیں۔"

سیف صاحب کے بعد جب ندیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اور میں نے انتظار حسین کا گھڑا ہوا لطیفہ اُن کو سنایا۔ تو پہلے تو انھوں نے بڑی سنجیدگی سے اس پھکڑپن کی مذمت کی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُن پر "حرف و حکایت" والا موڈ طاری ہو گیا۔ اُن کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس مسکراہٹ کی کوکھ سے ایک نیا لطیفہ پیدا ہوا۔ ندیم صاحب بولے

"انتظار حسین نے سوچ سمجھ کر لطیفہ نہیں گھڑا ہوگا۔ میں تو ایسے معاملات میں "پشتون" کی جگہ "سکھ" لگا دیتا ہوں۔ اور صاف بچ کر نکل جاتا ہوں"۔

ندیم صاحب سے میری پہلی ملاقات لاہور میں "فنون" کے دفتر میں ہوئی تھی۔ دوسری پشاور میں جشنِ خیبر کے مشاعرہ میں اور تیسری بھی پشاور ہی میں حلقۂ سخن کے مشاعرہ میں ہوئی تھی۔ اس آخری مشاعرے کا اہتمام احمد فراز نے ۱۹۶۶ء میں دفاعی فنڈ کے لیے کیا تھا۔ چونکہ دوسرے دن کوہاٹ میں بھی دفاعی فنڈ کے لیے ایک مشاعرہ منعقد ہونا قرار پایا تھا۔ اس لیے میں نے ندیم صاحب سے شرکت کی درخواست کی اور وہ اپنی مصروفیتوں کے بہانے تراشنے لگے۔ پھر جب میں نے اُن سے یہ کہا کہ "ندیم صاحب! ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جب کوہاٹ پر ہندوستانی طیاروں نے بمباری کی تھی تو اُس سے میرے خاندان کے سولہ افراد شہید ہوگئے تھے۔ اور آپ نے ان شہداء کا اور ان شہداء پر میری نظم "حدیثِ وطن" کا ذکر روزنامہ جنگ کے ایک کالم میں بڑی دل سوزی سے کیا تھا۔ اب آپ پشاور آئے ہیں۔ تو لگے ہاتھوں کوہاٹ بھی ہو آئیے۔ مشاعرہ پڑھنے کے لیے نہ سہی' میرے عزیزوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لیے سہی"

یہ سُن کر ندیم صاحب آب دیدہ ہوگئے' اور مجھے گلے لگاتے ہوئے بولے:

"میں کوہاٹ مشاعرہ پڑھنے ضرور جاؤں گا"۔

سابق صدر ایوب کے دورِ اقتدار میں ہر سال پشاور میں جشنِ خیبر کے موقع پر اردو کا ایک کل پاکستان مشاعرہ ضرور منعقد ہوتا۔ اور اس میں دیگر بڑے بڑے شعراء کے علاوہ ندیم صاحب بھی شریک ہوتے۔ اس طرح اُن سے سال میں ایک ملاقات تو ہو ہی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ اُن کی آمد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے پشاور میں "یوم کاکاجی" منانے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کی صدارت کے لیے فیض احمد فیض سے درخواست کی۔ وہ مان گئے۔ کیونکہ کاکاجی صنوبر حسین مومند سے اُن کے دیرینہ مراسم تھے۔ اور دونوں ایک ہی منزل کے راہی تھے۔ لیکن ہمیں شک تھا کہ فیض صاحب نہیں آئیں گے۔ چنانچہ احتیاطاً ہم نے ندیم صاحب سے بھی کاکاجی پر ایک مضمون پڑھنے کی درخواست کی۔ اور جب وہ بھی مان گئے' تو ہم مطمئن ہوگئے کہ چلو صدارت کا مسئلہ حل ہوگیا۔

ندیم صاحب پشاور میں ملک محمد رفیق خان کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جلسہ سے ایک گھنٹہ قبل ہم ان کی خدمت میں یاددہانی کے لیے حاضر ہوئے۔ وہ غسل خانے میں نہا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد باہر نکلے اور یہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے کہ "میں کاکاجی پر مضمون لکھتا ہوں"۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ دوسرے کمرے سے برآمد ہوتے تو مضمون اُن کے ہاتھ میں تھا۔ اگرچہ یہ مضمون انھوں نے قلم برداشتہ لکھا تھا۔ لیکن کاکاجی سے اپنی رفاقت کا حق ادا کردیا تھا۔ کاکاجی سے اُن کی رسم و راہ جیل میں بڑھی تھی۔ اور اس رسم و راہ کو صفحۂ قرطاس پر بڑے خلوص سے پھیلادیا تھا۔ پھر جب جلسے کا وقت ہوگیا۔ اور فیض صاحب حسبِ توقع دکھائی نہیں دیے۔ تو ہم نے صدارت کا بار بھی ندیم صاحب کے کندھوں پر ڈال دیا اور یوں ہماری آبرو رہ گئی۔

فیض صاحب اور ندیم صاحب کا مسلک بظاہر ایک ہی ہے۔ مگر میں نے ان دونوں کے درمیان ہمیشہ ایک حجاب سا محسوس کیا ہے۔ اس موضوع پر میں نے کئی ایسے احباب سے متعدد بار بات چیت کی۔ جن کو دونوں کی قربت حاصل ہے۔ مگر وہ اس بحث سے کتراتے رہے۔ ایک دوست نے ایک بار ڈرتے ڈرتے یہ کہہ دیا تھا کہ

"ندیم صاحب، فیض صاحب سے بڑے فن کار اور بڑے آدمی نہیں۔ اُن کی ٹکر کے اور اُن کے برابر کے فن کار اور بڑے آدمی ضرور ہیں۔ مگر فیض صاحب کے مقابلے میں اُن کی پذیرائی ملک کے اندر بھی کم ہوتی ہے اور ملک سے باہر بھی۔ یہاں تک کہ خود فیض صاحب نے ندیم صاحب کے بارے میں آج ایک توصیفی جملہ بھی نہیں لکھا[1] یہی وجہ ہے کہ ندیم صاحب کو بھی فیض صاحب کے بارے میں انتقاماً خاموشی اختیار کرنی پڑی۔"

میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ کون بڑا فن کار اور بڑا آدمی ہے۔ فیض یا ندیم؟ البتہ دونوں کے درمیان ایک فرق مجھے ضرور محسوس ہوا ہے۔ اور یہ فرق میری نظر میں ندیم کو فیض سے ممتاز کرتا ہے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میں اور اُس کے بعد بھی فیض نے یہ کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ پاکستانی ہیں۔ جبکہ ندیم ہمیشہ ایک قوم پرست پاکستانی کے روپ میں اُبھرے اور پاکستان کے عوام کے دلوں پر چھا گئے۔ فیض صاحب اپنے آپ کو ایک آفاقی اور امن دوست شاعر ثابت کرنے کی دھن میں پاکستان سے ہمیشہ دور رہے۔ اُن کے برعکس ندیم نے جب نے پاکستان کی مقدس سرزمین سے اور اس کے بچھے ہوئے عوام سے ہمیشہ بے پناہ عقیدت و محبت کا اظہار کیا اور اس طرح اپنی آفاقیت اور شہرت اور امن دوستی کو خطرے میں ڈالا۔ حالانکہ وہ فیض سے کسی بھی لحاظ سے کم آفاقی اور کم امن دوست شاعر نہیں ہیں۔ یہ الگ بحث ہے کہ فیض کو لینن پرائز مل گیا اور ندیم اس قسم کے تمغوں سے اب تک محروم اور بے نیاز ہیں۔ اس موضوع پر میں نے جب بھی فیض اور ندیم کے مشترک دوستوں سے تبادلۂ خیالات کیا۔ تو انھوں نے ڈرتے ڈرتے فیض کے مقابلے میں ندیم کی طرف داری کی۔ اس کے ساتھ ہی یہ استدعا بھی کی کہ اس بحث کو اخبارات اور رسائل میں موضوع بحث نہ بنایا جائے۔ یا اگر بنایا جائے۔ تو اُن کے نام قطعاً ظاہر نہ کئے جائیں۔ لہٰذا میں اُن احباب کے نام صیغۂ راز میں رکھنے پر مجبور ہوں۔ ویسے جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق ہے۔ مجھے فیض سے بھی اتنی ہی عقیدت اور محبت ہے جتنی ندیم سے ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ فیض مجھے کبھی پاکستانی محسوس نہیں ہوئے۔ جب کہ ندیم کو اگر فخر ہے تو اسی بات پر کہ وہ پاکستانی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے سوشلسٹ ادیب اور شاعر ندیم کو ایک متعصب پاکستانی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود ندیم سے زیادہ متعصب ہندوستانی ہیں۔

ندیم صاحب میں خوبیاں تو بے شمار ہوں گی۔ مگر اُن کا یہ عیب اُن کی تمام خوبیوں پر بھاری ہے کہ وہ ایک کھرے قوم پرست اور سچے پاکستانی ہیں۔ اور اُن قدرنا شناسوں کے درمیان عمر گذارنے پر مجبور ہیں۔ جو اپنے محبوب فن کاروں کے ساتھ وہ سلوک کبھی نہیں کرتے جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ شاید اس بے قدری کا ندیم صاحب کو خود بھی احساس ہے۔ تب بھی تو انھوں نے یہ چبھتا ہوا شعر کہا ہے کہ ؎

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

ویسے میری نظر میں یہ اعزاز کے ساتھ دفنانے والی بات بھی مشکوک ہی ہے۔ کیونکہ میں اپنی آنکھوں سے

---

[1] ندیم کی شاعری۔ مصنفہ جمیل ملک کے فلیپ پر ندیم کے بارے میں فیض کی رائے شامل ہے۔　(ص)

کئی ایسے بڑے فن کاروں کا بُرا حشر دیکھ چکا ہوں۔ جو اعزاز کے ساتھ دفنائے جانے کے مستحق تھے۔ مگر اُن کے جنازوں کو کندھا دینے والوں میں گنتی کے چند رفیقوں کے سوا اور کوئی بھی شامل نہ تھا۔ پاکستان میں اردو کا ایسا کون سا ادبی رسالہ ہے۔ جس کی آبیاری ندیم نے اپنے خونِ جگر سے نہیں کی۔ مگر ان رسائل میں ایسے کتنے ہیں جن کے مدیروں نے کبھی "ندیم نمبر" نکالنے کی ضرورت بھی محسوس کی ہو۔ اور تو اور اس معاملے میں تو محمد طفیل صاحب بھی خاموش ہیں۔ جن کے "نقوش" کو منصۂ شہود پر لانے والے ہی ندیم صاحب ہیں۔ محمد طفیل صاحب کی اپنی ایک "ترٗ" ہے۔ اور وہ اس ترٗ میں اتنے مست ہیں کہ کسی زندہ شاعر یا ادیب کو خاطر میں نہیں لاتے۔ چاہے وہ ان کو "محمد طفیل" سے "محمد نقوش" بنانے والے احمد ندیم قاسمی ہی کیوں نہ ہوں۔ صہبا لکھنوی کا دم غنیمت ہے کہ اُن کی ذاتی کاوشوں سے جہاں جوشؔ، حفیظؔ اور فیضؔ کی ادبی خدمات کا اعتراف اُن کی زندگی میں ہی کیا گیا، تو وہاں اب احمد ندیم قاسمی کو بھی سنگ زنی سے محفوظ کیا جا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صہبا لکھنوی کو افکار کا احمد ندیم قاسمی نمبر نکالنے پر اکسانے میں کچھ تھوڑا سا حصہ میرا بھی ہے۔ آج سے ایک برس قبل وہ کوہاٹ آئے تھے تو اس موضوع پر میں نے اُن سے بات کی تھی۔ اور اُن کو احمد ندیم قاسمی نمبر نکالنے کی راہ سجھائی تھی۔ جس کا جواب انھوں نے یہ دیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں ایک کاغذی خاکہ پہلے ہی سے مرتب کر چکے ہیں۔ اُن سے پہلے تاج سعید سے بھی اس موضوع پر گفتگو ہوئی تھی اور انھوں نے بھی "ماہنامہ اژرنگ" کا احمد ندیم قاسمی نمبر نکالنے کا اعلان کر دیا تھا اور ندیم کے عقیدت مندوں سے ڈھیر سارے مضامین بھی لکھوا لیے تھے۔ مگر ؏

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اژرنگ نامساعد حالات کا شکار ہو گیا اور تاج سعید کا احمد ندیم قاسمی نمبر نکالنے کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔

صہبا لکھنوی اس اعتبار سے بڑے عظیم ایڈیٹر ہیں کہ انھوں نے زندہ شاعروں اور زندہ ادیبوں کو اُن کی زندگی میں ہی خراجِ تحسین پیش کرنے کی روایت قائم کی۔ ورنہ ندیم بے چارہ نہ جانے کب تک اہلِ وطن کی سنگ زنی کا شکار رہتا اور خدا جانے موت کے بعد بھی اُن کو اعزاز کے ساتھ دفنایا جاتا یا ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو سعادت حسن منٹو وغیرہ کا ہوا تھا۔

عرفانہ عزیز

عکسِ گُل آفریں

احمد ندیم قاسمی کی ذات کا جائزہ کوئی سہل کام نہیں۔ اُن کی کم آمیزی اور وقار خودنگری نے ایک ایسا حصار اُن کی ذات کے گرد کھینچ رکھا ہے کہ نارسائی کا احساس ہوتا ہے دراصل فن کار کا احتساب اور اُس کے فن کا تجزیہ وہی صاحبِ وجدان کر سکتا ہے جس نے نواسنج کی ذات میں اُتر کر اُس کی چشمِ باطن کی صد رنگ تابانیاں دیکھی ہوں۔ مجھے ایسے لامتناہی سفر کا حوصلہ ہے نا یارا۔ ندیم صاحب کی فنی تخلیقات کی تشریح و توجیہہ کا مقدس فریضہ کوئی صاحب نقد و نظر ہی بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے۔ میں ندیم صاحب کی شخصیت کے اُن مثالی گوشوں کو سامنے لاؤں گی جن کے مشاہدے کا شرف مجھے حاصل ہے۔ اگر اُن کے فن کا ذکر بھی اس سلسلے میں آجائے تو یہ ضمناً ہوگا۔

ندیم صاحب سے میری پہلی ملاقات نومبر ۱۹۶۷ء میں بمقام ساہیوال ایک کُل پاکستان مشاعرے میں ہوئی۔ اس سے قبل اُن سے رسمی سا سلسلۂ مراسلت تھا۔ مجھے اُن کی شخصیت بڑی متوازن باوقار اور شگفتہ نظر آئی اور وہ جو "زاہد خشک" کا الزام اُن پر چند ہستیوں نے لگا رکھا تھا، نادرست معلوم ہوا۔ بات یہ ہے کہ ندیم صاحب کی ذات میں یک گونہ محجوبیت ہے جس میں مداخلت کا مجاز ہر ایک نہیں۔ اس ادبی تقریب کے بعد جب بھی لاہور جانا ہوا ندیم صاحب کے ساتھ کئی ادبی نشستوں کا اہتمام ہوا اُن کی شگفتہ کلامی سے بھی محظوظ ہوئے اور سیاست، تہذیب و فن اور ایسے ہی دیگر سنجیدہ موضوعات بھی زیرِ بحث آتے رہے۔ وہ جب کراچی تشریف لاتے تو والد گرامی اُنھیں بڑے اصرار سے بُلاتے اور پھر تصوف کے مسائل بھی زیرِ بحث ہوتے۔ یہ موضوع دراصل والد صاحب کا پسندیدہ موضوع ہے جہاں تک میں ندیم صاحب کو پرکھ سکی ہوں مفید روایات کا احترام وہ ضرور کرتے ہیں۔ لیکن کسی مخصوص مسلک یا مشرب کے وہ پیرو نہیں۔ تہذیب و ثقافت کی ہر وہ روایت جو اپنے اندر افادیت رکھتی ہے۔ ندیم صاحب نے اُس سے بغاوت نہیں کی۔

میرا مجموعی تاثر ندیم صاحب کے بارے میں یہ ہے کہ اُن کا خلوص مصلحت شناسی نہیں۔ یہ وہ خلوصِ فکر ہے جس کی اساس صداقت پر ہے۔ اس صداقت نے سکیسر کی غیور مٹی سے جنم لیا ہے چند خوبیاں ہیں جو ورثے میں ملی ہیں۔ چند عناصر ہیں جو تہذیب کی تخلیق ہیں۔ ایک ماحول وہ ہے جو احترام آدمیت کا وصف روح میں بیدار کرتا ہے۔ اور یہی ماحول ندیم صاحب کو

مُیسّر آیا۔ طمانیتِ خاطر انھیں ورثے میں ملی ہے۔ اُن کی جبیں رسمِ بندگی سے مانوس نہیں۔ ندیم صاحب فرقتِ خورشید
میں نوحہ گر نہیں، بلکہ سطوتِ فردا پہ ایمان رکھتے ہیں۔ وہ تفرقۂ رنگ و خوں سے بیزار ہیں اور اُن کا شہرِ جنوں جغرافیائی
حدود سے بہت بالا بہت دور ہے۔ وہ عالمگیر انسانی برادری پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اُس کے لیے آسودگی کے طالب ہیں۔
ندیم صاحب کو دیکھ کر کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ذات کے زندانی ہیں۔ وہ کسی جزدی تغیر کا پیکر نہیں، بلکہ غمِ دوراں
کی بنیادی وحدت کے عکاس ہیں۔ ندیم صاحب آدمیت کی یکتائی کے قائل ہیں۔ انسان خواہ دوست ہو یا دشمن۔ ندیم کی
گیرائی مائل بہ لطف ہے۔ انھوں نے جس رہ گزر پر کڑی دھوپ دیکھی وہیں شجرِ سایہ دار کا روپ دھار لیا۔

دشمن بھی جو چاہے تو مری چھاؤں میں بیٹھے
میں ایک گھنا پیڑ سرِ راہ گزر ہوں

ندیم آشنائے سوزِ تمام ہیں اُن کا ذوقِ جمال کائنات آرا ہے۔ یہی انفرادیت اُن کے اسلوبِ فن میں جھلکتی ہے۔
جہاں کہیں غمِ دوراں کا ذکر آیا ہے اُس میں ایک آن اور خودداری ہے۔ ہرچند کہ ندیم کی حیاتِ ناصبور کاہشِ دوام کا پیکر
رہی ہے۔ لیکن اُنھوں نے طلسمِ جبر کو توڑا ہے خود پہ بے خودی طاری نہیں کی۔ غالباً ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے جب متاعِ
لوح و قلم پر عتاب نازل ہوا تو احتساب کا ہدف ندیم بھی ہوئے۔ بعد میں قاضیٔ شہر کی عنایت سے معافی نامہ تیار ہوا۔ ندیم
صاحب کی والدہ محترمہ سے رجوع کیا گیا کہ اگر وہ معافی نامے پر دستخط کر دیں تو ندیم صاحب کو رہائی مل سکتی ہے۔ لیکن اُن
کی والدہ محترمہ نے کہا کہ ندیم کی رہائی تو ایک طرف، اگر غیور بیٹے کو اس بات کا علم بھی ہو گیا کہ مفاہمت کی کوشش کی گئی ہے
تو یہ تلخ حقیقت اُس کے حق میں زہرِ قاتل ثابت ہو گی۔ اپنی سادگی اور معصومیت کے باوصف اُن کی والدہ اس روز سے
واقف تھیں کہ ایک سچا فن کار سر بکف تو رہ سکتا ہے، نگوں سار نہیں رہ سکتا۔ اس واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ ندیم صاحب
کے مزاج کا تعین آغوشِ مادر ہی میں ہو گیا تھا جس کا اظہار آگے چل کر ندیم کے کردار و گفتار سے ہوتا ہے ؎

دستک سے دستِ فن کو نہ آلودہ کر ندیم
سب جا رہے ہیں جانبِ در تو مگر نہ جا

اس شعر کی حقیقت ۱۹۵۸ء میں کُھل کر سامنے آئی۔ جب صحافت ایوب آمریت کا شکار ہوئی۔ غالباً ۱۹۵۹ء
میں جب اُن کے دیگر رفقائے کار عتاب کا نشانہ ہوئے تو افسرانِ بالا ندیم صاحب کو بدستور امروز کا ایڈیٹر رکھنے پر مُصر تھے
اس سلسلے میں بعض برگزیدہ ہستیوں نے ندیم صاحب کو قائل کرنے کی بھی کوشش کی۔ لیکن وہ مفاہمت پر راضی نہ ہوئے
آخر حکام کو اُن کا استعفےٰ قبول کرنا پڑا۔ میاں افتخار نے ان کے گھر پہنچ کر بے اختیار انھیں گلے لگا لیا کہ اُنھوں نے صحیح ایثار
کا ثبوت دیا تھا۔ طبیعت کا یہ استغنا ندیم کی شخصیت کا بنیادی جزو ہے۔

ہرچند کہ ندیم کے ہاں دردِ وارفتہ کا سُراغ نہیں ملتا، بلکہ غم گزیدہ آرزوئیں زیرِ لب نوا سنج نظر آتی ہیں مگر لہجے
کی ملائمت اور نرمی کے باوصف ندیم کو اپنی آواز کی سچائی پر اعتماد ہے۔ وہ اپنے شیشۂ پندار کو سلامت رکھتے ہیں۔ مگر اُن
کی صدا کا پتھر آئینہ خانوں کو ریزہ ریزہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ؎

ٹوٹا تو کتنے آئینہ خانوں پہ زد پڑی
اٹکا ہوا گلے میں جو پتھر صدا کا تھا

وہ ارضِ وطن ہو یا ویت نام کی سرزمین، ندیم روشنی کے طلب گار ہیں۔ اس سلسلے میں ویت نام پر اُن کی نظم بے مثال ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے عوام سے اُن کا جذبۂ ہمدردی گہرا پائیدار اور سچا ہے۔ ان کا لہجہ تصنع اور غلو سے پاک رہتا ہے۔ ندیم کی انانیت بڑی مہذب ہے۔ لیکن ہر فن کار کی طرح خود پسندی کا جذبہ اُن میں طبعی ہے۔ وہ اُن بت تراشوں میں ہیں جو اپنا بت خود تراش کر اپنی جرأت پہ قربان ہو جاتے ہیں۔ ہر چند کہ اُن کا خرمن برقِ آفت کا شکار رہا ہے۔ لیکن وہ طلعتِ شمس و قمر کے تعاقب میں آفاق تک جا پہنچتے ہیں۔ شعاعِ خوں ہو یا روشنئ طبع وہ اسرارِ خودی کو تابندہ رکھتے ہیں۔ آزاد مقام رہ کر بھی انھوں نے مٹی کے گھروندوں کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے۔ بارہا انھیں مسندِ جاہ و شرف پیش کی گئی۔ لیکن انھوں نے قلندری کا سودا نہیں کیا وہ ناموسِ فن کے محافظ رہے ہیں۔

دراصل ندیم کی زندگی جلال و جمال کا متوازن امتزاج ہے۔ اُن کے جمالیاتی شعور میں بڑی شائستگی ہے اور احترامِ آدمیت کا جذبہ کہیں بھی شکست خوردہ نظر نہیں آتا۔ ستاروں کا خرام اور ڈوبتے چاند کی کرن انھیں حسنِ فسردہ کی یاد دلاتی ہے جو روایات کی گراں باری سے مضمحل ہے ؎

چاند جب دُور اُفق میں ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

ندیم کے ہاں وارداتِ قلبی بڑے مہذب پیرائے میں نظم کی گئی ہے۔ ندیم نے جبر کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کی ہے۔ ندیم لبِ رنگیں کو فغاں انگیز نہیں دیکھ سکتے۔ انھوں نے پیکرِ گل کو اپنی مسیحائی سے تبسم ریز کیا ہے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ اُن کے گُل و گلزار زخم خوردہ ہیں۔ مگر بارشِ سنگ میں بھی وہ نویدِ فصلِ گُل دیتے ہیں ؎

اے سنگ زنو بہار آئی
پتھر پہ کھلا گلاب میرا

ندیم کی رجز خوانی نے پژمردہ لہو کو سُرخی عطا کی ہے اور ارضِ وطن کو شاداب کیا ہے۔ اُن کی کہانیوں نے ہماری تہذیب کے نقوش روشن کیے ہیں۔ خواہ وہ کپاس کے پھول کی شکل میں ہوں، یا گنڈاسے کی صورت میں۔

دیہی زندگی کی معصومیت نہ صرف ندیم کا مخصوص موضوعِ فن ہے۔ بلکہ اس کی سچائی ندیم کے نرم لہجے اور دھیمے پن سے اب تک وفا کرتی نظر آتی ہے۔ ندیم ہماری تہذیب و ثقافت، ہماری ارضِ وطن اور عوامی امنگوں کا وہ پائندہ ترجمان ہے جسے وطن کی سالمیت کے لیے کسی ایثار سے گریز نہیں اور یہی وصف اُن کی عظمت کا ضامن ہے۔

انداز ہُو بہو تری آوازِ پا کا تھا
باہر نکل کے دیکھا تو جھونکا ہوا کا تھا　(ندیم)

یہ زمیں، یہ خلا کی رقاصہ
آدمِ نو کے انتظار میں ہے　(ندیم)

انور سدید

ندیم اور مشاعرے

مشاعرہ ہماری ثقافتی، تہذیبی اور ادبی روایات کا ایک اہم جزو ہے۔ اس کی ابتدا کے بارے میں واضح تحقیقی نتائج دستیاب نہیں۔ قدیم تذکروں سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے، کہ خانِ آرزو کے زمانے میں بھی مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ اور لوگ ان میں ذوق و شوق سے حصہ لیتے تھے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ جب شاعر اپنے تخلیقی ثمر کو دوسروں تک پہنچانے اور داد حاصل کرنے کا آرزومند ہوا۔ تو ایک ایسی محفل ظہور میں آئی جسے بآسانی محفلِ مشاعرہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مشاعرے کی روایات کو پروان چڑھانے میں ان لوک گیتوں کا بھی کچھ حصہ ضرور ہے۔ جن کے تخلیق کار تو گمنام ہوتے ہیں۔ لیکن جو گلی گلی۔ محفل محفل گائے جاتے ہیں۔ اور جو عرصہ دراز تک لوگوں کی زبانوں پر جاری وساری رہ کر ان کے جذباتی تشنج کا مداوا بنتے ہیں۔

تذکرہ نگاری کی اساس بیاض نویسی پر ہے۔ چھاپے کی ایجاد اور نشرواشاعت کے جدید وسائل مہیا ہونے سے پہلے اہلِ ذوق مشاعروں سے اپنی پسند کے اشعار بیاض میں جمع کرتے اور پھر شہروں شہروں یہ اشعار اپنے احباب کو تحفے کے طور پر بھیجتے۔ اس سے یہ استخراج مناسب ہے۔ کہ مشاعرہ محض مجلس آرائی کے لیے ہی منعقد نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا تھا۔ اسی سلسلے میں دلی، اور لکھنؤ کے مشاعروں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ نامور اساتذہ ان مشاعروں میں شریک ہوتے۔ اور عام آدمی کے شعری ذوق کی تسکین کرتے۔ کوئی نیا شاعر سامنے آنے کی کوشش کرتا تو پہلے استاد سے غزل کی اصلاح لیتا۔ پھر عوام سے قبولِ عام کی سند حاصل کرنے کے لیے غزل مشاعرے میں پڑھتا۔

شاعری ذریعہ عزت زیادہ اور وسیلۂ معاش کم تھی۔ معاشرہ شاعر کا احترام کرتا تھا۔ اور اساتذہ کو سر آنکھوں پر جگہ دیتا تھا۔ آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر خود شاعر تھے۔ اور شاعروں کی قدر دانی کرتے تھے۔ چنانچہ معاشرہ میں باوقار مقام حاصل کرنے کے لیے حکمت۔ منطق۔ فلسفہ اور اقلیدس کی طرح شاعری میں دسترس رکھنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے علوم کے مقابلے میں شاعری کو اتنی مقبولیت حاصل تھی۔ کہ بقول حافظ محمود شیرانی سلاطین و عمال۔ اُمرا و علما،

اہلِ دیوان کے علاوہ ہر طبقے کے پیشہ وروں پر شاعری کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ منیر نیچہ بند گر، محمد امان نثار معمار، حسین بخش پارچہ فروش، مفتون بزاز اور یک رنگ سنار وغیرہ کا شمار حروف شعرا میں ہوتا تھا۔ دلی اور لکھنؤ کے دورِ عروج میں مشاعرہ علمیت شعری، تنقید اور فنی ہمہ دانی کے اظہار کا ذریعہ بھی سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں رزم کا میدان بہت پٹ چکا تھا۔ بادشاہ اکنافِ ہند سے سمٹ کر محل کی چار دیواری میں سما گئی تھی۔ شعرا انھیں مشاعروں میں سخن آرائی اور زور آزمائی کے جوہر دکھاتے۔ اور اپنے حریفوں کو چاروں شانے چت کرنے کی کوشش کرتے۔ اس زمانے میں مشاعرے کا منظر دیدنی ہوتا تھا۔ ہر استاد شاعر اپنے ساتھ شاگردوں کی فوج ظفر موج لے کر آتا اور مشاعرہ جیتنے کی کوشش کرتا۔ داد و بیداد کے ڈونگرے برستے۔ ایک ایک مصرعے پر تکرار ہوتی۔ پھبتی، شخشخ جگت، بذلہ اور مذاق ہوتا اور کبھی کبھی مشاعرہ بزم سے رزم میں بھی تبدیل ہو جاتا۔ اگلی صبح مشاعرے کی روداد اور بہترین اشعار شہر میں گردش کرتے اور یوں مشاعرے کا تذکرہ مہینوں چلتا رہتا۔ آزاد نے ایسے کئی مشاعروں کے قلمی مرقعے آبِ حیات میں کھینچ کر اس دور کو زندہ کر دیا ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے دلی کی آخری شمع جلائی اور ایک ایسا خیالی مشاعرہ منعقد کیا جس سے دلی کی تہذیبی زندگی کے تابندہ نقوش اجاگر ہو گئے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ مشاعرے میں شاعر اور سامع کے درمیان کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ ادھر شاعر کوئی اچھا شعر پڑھتا ہے ادھر سامع کے دل میں ترازو ہو جاتا ہے۔ مشاعرے میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ شاعر اپنے سامع کے لطیف جذبات اور نازک احساسات کا نبض شناس ہو۔ شعر مستقیم انداز میں کہنے کی کوشش کرے۔ ابلاغ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو اور سامع اپنے تجربے کا عکس فوری طور پر شعر میں دیکھ لے۔ ن۔ م راشد کا قول ہے کہ سامع شاعر کو داد اس کے شعر پر نہیں دیتا، بلکہ اس تجربے پر صدائے تحسین بلند کرتا ہے جس سے وہ خود بھی گزر چکا ہے یا شاعر کی وساطت سے اس تجربے کی شعری تکمیل میں حصہ لیتا ہے۔ چنانچہ بیشتر شعرا مصرعۂ ثانی میں قافیہ کا انتخاب اور ردیف کی تکرار سامع پر چھوڑ دیتے ہیں اور جب تک سامع مصرعہ نہ اٹھائے۔ دوسرا شعر نہیں پڑھتے۔ وہ شاعر جو اس روش عام سے ہٹ کر قدرے ٹیڑھا OBLIQUE انداز اختیار کرتا ہے مشاعرے میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ وجہ یہ کہ قاری ابلاغ کی غیر مستقیم لکیر کے ساتھ زیادہ دور تک سفر نہیں کر سکتا اور راستے ہی میں ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ وہ شعرا جو مسلمہ صادق جذبوں کو شعر کا لطیف پیکر عطا کرتے ہیں۔ مشاعروں میں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں اور یوں ان کی جڑیں عوام میں گہری اترتی جاتی ہیں۔

مغلیہ سلطنت کے زوال اور سقوطِ دہلی کے بعد مشاعرے کا مجلسی ادارہ مجموعی طور پر روبہ زوال ہونا شروع ہو گیا تھا۔ تاہم بیسویں صدی کے ربع دوم کے دوران جب ادبی دنیا میں احمد ندیم قاسمی کا ورودِ مسعود ہوا۔ تو یہ ادارہ ابھی پوری طرح ختم نہ ہوا تھا نہ ہی میڈ اسپتال کے مشاعروں اور طلبہ کی بے داد نے اس کی ثقاہت کو ختم کیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آزادی سے قبل جب کسی کل ہند مشاعرے میں رئیس المتغزلین۔ جگر مراد آبادی۔ ابوالفصاحت بیخود دہلوی، جانشین داغ سائل دہلوی۔ رئیس الاحرار حسرت موہانی، شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی، شاعرِ شباب الطاف مشہدی، شاعر رومان اختر شیرانی۔ سیماب اکبر آبادی، جوش ملسیانی، احسان دانش، سید محمد جعفری، حاجی لق لق و غیرہ

کی شرکت کا اعلان ہوتا تو سامعین ذوق و شوق سے انتظار کرتے اور پورے احترام سے مشاعرے میں شرکت کرتے۔ اس زمانے میں تو اساتذہ کی فہرست بہت "طویل" تھی۔ لیکن مشاعرے کے اشتہار میں احمد ندیم قاسمی کا اسم گرامی ان نامور شعرا کے پہلو بہ پہلو نظر آتا۔ اور مشاعرے میں انھیں اچھے مقام پر پڑھنے کی دعوت دی جاتی۔ اتنے عظیم شعرا کی محفل میں نمایاں جگہ پانا اس بات کا ثبوت ہے کہ احمد ندیم قاسمی جن کی شاعری مولانا عبدالمجید سالک کے سائے تلے پروان چڑھ رہی تھی اور جو انقلاب کے صفحۂ ادبی پر طویل عرصے سے چھپ رہے تھے۔ اس زمانے میں ہی شہرت کا ہفت خواں طے کر چکے تھے۔ اور اب شبانہ روز محنت سے اپنی شاعری کو چمکا کر عوام کے دلوں پر سکہ چلا رہے تھے۔

اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اس زمانے میں کئی شعرا نے مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ترنم کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ ایسی شاعری جو فن کار کی خوش گلوئی کے سہارے مقبول ہو زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہتی اور آواز کا جادو ٹوٹتے ہی فن کار اپنی زندگی میں ہی موت کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے مشاعرے میں ترنم کا سہارا لیے بغیر مقبولیت حاصل کی اور پھر اس مقبولیت کو چار دہائیوں کے طویل عرصے تک قائم رکھا۔ ایک دہائی کو اگر ایک جگ کے برابر سمجھا جائے تو احمد ندیم قاسمی چار جگوں میں محض زندہ نظر نہیں آتے بلکہ ہر نیا جگ ان کی مقبولیت میں اضافے کا باعث بنتا رہا۔

احمد ندیم قاسمی مشاعرہ تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ ان کا تحت اللفظ شعر کا سادہ بیانیہ نہیں ہوتا کہ سامع کے دل پر اثر نہ کرے۔ قاسمی صاحب جس کرب سے خیال کو شعر میں ڈھالتے ہیں۔ اسی کرب سے اسے پڑھتے بھی ہیں۔ چنانچہ الفاظ کے پتھر ان کی داخلی رقت سے گداز ہو جاتے ہیں اور یہ گداز تحت اللفظ میں شامل ہو جاتا ہے اور احمد ندیم قاسمی سامع پر وہ اثر انگیز کیفیت پیدا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو جاتے ہیں، جو ان کے اپنے بطون کے کسی تہہ در تہہ گوشے میں منہ بند سیپ کی طرح موجود ہوتی ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ خارجی موسیقی الفاظ کے ساکت پیکروں کو دل کش آہنگ سے ہم کنار کر کے سماعت کو تسکین مہیا کر رہی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے تحت اللفظ کی جلالی و جمالی کیفیت یکسر الگ نوعیت کی ہے اور اس کی کامیابی کا اقرار ہر ذوق کے سامع پر فرض ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ قاسمی صاحب جوش ملیح آبادی، استاد قمر جلالوی اور ڈاکٹر صفدر حسین کی طرح شعر کو ڈرامائی ادائیگی سے ملوث نہیں کرتے۔ مشاعرے میں ان کے ایک ہاتھ میں چھوٹی سی بیاض ہوتی ہے اور دوسرے کو وہ نستعلیق جنبش تک نہیں دیتے۔ اس کے باوجود وہ شعر کا دروبست سامعین تک بڑی خوبی سے پہنچاتے ہیں اور کمال کامیابی سے داد حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ احمد ندیم قاسمی کے اشعار موسیقی کے خارجی آہنگ پر پورے نہیں اترتے۔ ان کی کئی غزلوں اور نظموں کی موسیقی ملک کے شہرت یافتہ نغمہ نگاروں نے ترتیب دی ہے اور انھیں نامور فن کاروں نے عمدگی سے گایا ہے۔ میرا مقصد صرف یہ عرض کرنا ہے کہ قاسمی صاحب جس سادگی اور پرکاری سے اپنے اشعار قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں، وہ موسیقی خارجی لہر کی محتاج نہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سب سے بڑی ظاہرہ رسید ان کا مشہور نغمہ:

اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے

کی۔ وہی پیش کی ہے تو وہ مجھے کبھی نہیں جچا۔ بلکہ طاہرہ سید کی آواز کے عقب سے ایک ایسی نرم، دھیمی اور رقت آمیز تحت اللفظ آواز ابھرتی ہوئی صاف محسوس ہوتی ہے جو صرف احمد ندیم قاسمی سے منسوب ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ احمد ندیم قاسمی کو مشاعرے میں کبھی اس قسم کی فرمائش سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ کہ "قاسمی صاحب وہ غزل سنائیے جو مہدی حسن نے گائی ہے۔"

کسی فلم کا کوئی گانا عوام میں مقبولیت حاصل کرے اور وہ فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے توسط سے ہو کر گلی کوچوں کوٹھوں اور شادی بیاہ کی محفلوں میں بھی گنگنایا جانے لگے تو اس گانے کو فلمی اصطلاح میں ہٹ (HIT) شمار کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصے سے یہ اصطلاح مشاعرے کی کامیاب غزل کے لیے بھی استعمال ہونے لگی ہے۔ اس لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو احمد ندیم قاسمی نے کئی ہٹ غزلیں اور نظمیں مشاعروں میں پڑھی ہیں۔ ایک زمانے میں حفیظ جالندھری کی "رقاصہ" بہت مشہور ہوئی تھی۔ چنانچہ حفیظ جالندھری جس محفل میں بھی شریک ہوتے ان سے یہ نظم ضرور سنی جاتی۔ اس قسم کی نظموں میں قاسمی صاحب کی "انسان عظیم ہے خدایا" بہت مشہور رہی۔ یہ نظم جب ہٹ ہوئی تو حفیظ کی "رقاصہ" بھی ماند پڑ گئی۔ ابھی اس نظم کی گونج ختم نہیں ہوئی تھی کہ ان کی نظم "پتھر" ہٹ ہو گئی۔ ہر چند اب یہ نظم بیسیوں لوگوں کو ازبر ہو گئی ہے اور ہزاروں مرتبہ سنی جا چکی ہے۔ لیکن مشاعرے میں لوگ اسے قاسمی صاحب کی زبان سے سننے کے لیے ہمیشہ بے قرار ہو جاتے ہیں اور پھر یہی نظم حاصل مشاعرہ قرار پاتی ہے۔ مشاعرے میں قاسمی صاحب کی جو تازہ غزل ہٹ ہوئی ہے، اس کا ایک مصرعہ یہ ہے ؏

میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

چنانچہ اب ہر مشاعرے میں اس غزل کی فرمائش بھی کی جاتی ہے۔

یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ احمد ندیم قاسمی سامع کے ساتھ چلنے کی کوشش تو کرتے ہیں، لیکن اپنے آپ کو یکسر اس کی فرمائش کے حوالے نہیں کر ڈالتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قاسمی صاحب مشاعرے میں پہلے اپنی پسند کی منتخب غزل سناتے ہیں۔ اس کے بعد "پتھر" کی فرمائش ہو تو وہ سامع کو مایوس نہیں کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ پی اے ایف پشاور کے ایک مشاعرے میں جس کی صدارت ایئر مارشل ظفر چوہدری کر رہے تھے "پتھر" کی فرمائش خواتین کی گیلری سے آئی۔ ہر چند یہ فرمائش لطیف اور معطر تھی، اور قاسمی صاحب کے لیے اس کا ٹھکرانا ممکن نہیں تھا، لیکن انھوں نے یہاں بھی پہلے اپنی پسند کی غزل سنائی، بعد میں "پتھر" پیش کی۔

اس بات کا اندازہ لگانا تو مشکل ہے کہ احمد ندیم قاسمی کے تحت اللفظ نے معاصر شعرا کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ البتہ مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں کہ گذشتہ دنوں پرنسپل غلام جیلانی صغیر کو ایک مذیانی مشاعرے میں سنا تو ان کے تحت اللفظ میں احمد ندیم قاسمی کی گونج صاف سنائی دی۔ کبھی جمیل یوسف کے لے کا کھرج پنجم لے میں مدغم ہونے لگتا ہے تو بے اختیار قاسمی صاحب یاد آتے ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ جیلانی صاحب اور جمیل یوسف کا تعلق بھی اس پہاڑی علاقے سے ہے جس کی سرحدیں احمد ندیم قاسمی کی وادی سون کے ساتھ بغل گیر ہو رہی ہیں۔ تاہم اگر متذکرہ شعرا نے تحت اللفظ کا یہ انداز قاسمی صاحب سے اکتساب کیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بعض شعرا پر اپنے انداز شعر گوئی کا اثر ڈالنے میں

کامیاب ہو گئے ہیں۔ اور یہ ان کی مقبولیت کا واضح ثبوت ہے۔

ہمارے عہد میں مشاعرہ اپنی تہذیبی اقدار تقریباً ختم کر چکا ہے اور اس کی کاروباری اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اب شاعر معاوضہ اور سفر خرچ پہلے طے کرتا ہے اور کچھ رقم پیشگی لیے بغیر شرکت کی حامی نہیں بھرتا۔ ادھر منتظم مشاعرہ پہلے خدمتِ ادب کی دہائی دیتا ہے۔ پھر کم سے کم نرخ پر شعرا کی بکنگ کرتا ہے۔ اس صورتِ حال میں دو مناظر بڑے عبرتناک ہوتے ہیں۔ ایک منظر مشاعرے سے پہلے کا ہے۔ اور اس میں منتظم شعرا کی منت سماجت اور خاطر و مدارات میں مصروف نظر آتا ہے۔ دوسرا مشاعرے کے بعد کا۔ اس منظر کی آنکھ مچولی میں شعرا منتظم کو تلاش کرتے ہیں اور منتظم مشاعرہ گاہ کی غلام گردشوں میں چھپتا پھرتا ہے۔ مجھے کسی مشاعرے کا منتظم بننے کی سعادت تاحال حاصل نہیں ہوئی۔ اس لیے میں اس پہلو سے قاسمی صاحب کے رویے پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ البتہ جن لوگوں کا قاسمی صاحب کے ساتھ اس قسم کا رابطہ ہوا ہے۔ وہ ان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ پرنسپل غلام جیلانی اصغر تو ان کی صرف اس ایک ادا پر مرمٹے ہیں کہ انھوں نے کالج کے مشاعرے میں جب بھی دعوت دی۔ قاسمی صاحب نے معاوضہ طے کیے بغیر قبول کی۔ اور جو کچھ لفافے میں بند کر کے انھیں پیش کیا گیا اسے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔ کبھی جیلانی صاحب نے بربنائے انکسار معذرت کی تو انھیں گلے لگا لیا۔ جیلانی صاحب راوی ہیں۔ کہ ندیم سے کمتر درجے کے شعرا بھی اس سے دگنے تگنے معاوضے پر چیں بر جبیں رخصت ہوئے اور آئندہ مشاعرے میں سابقہ کم معاوضے کا شکوہ بھی ضرور کیا۔ لیکن قاسمی صاحب نے معاوضے کی کمی بیشی کا تذکرہ کبھی نہیں کیا۔

اسکواڈرن لیڈر رشید قیصرانی جن دنوں پشاور میں متعین تھے تو ہر سال ایک محفل مشاعرہ سجاتے تھے اس مشاعرے کی خوبی یہ تھی کہ اس میں پاکستان فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل ظفر چوہدری ضرور شریک ہوتے۔ شعرا بلا معاوضہ تشریف لاتے اور احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا ایک ہی مائیکروفون سے غزلیں سناتے۔ پی۔ اے ایف کے ان مشاعروں میں قاسمی صاحب بھی شریک ہوئے اور بلا معاوضہ رخصت ہوئے۔ ان کی اس روش سے متاثر ہو کر کنٹونمنٹ سرگودھا کے ایگزیکٹو آفیسر صاحب نے بھی ایک مشاعرہ منعقد کیا، اور پی۔ اے۔ ایف پشاور کی تمام روایات کو برقرار رکھتے ہوئے شعرا کو پیشگی بتا دیا کہ معاوضہ پیش نہیں کیا جائے گا۔ قاسمی صاحب اس مشاعرے میں بھی تشریف لائے۔ گنڈ کے سالانہ جلسے کے دوران کچھ ممبران انجم اعظمی، سحر انصاری۔ احمد ظفر، عاشق کیرانوی۔ نگہت بریلوی وغیرہ ان سے ملنے کے لیے دفتر "فنون" گئے تو قاسمی صاحب، انھیں سرگودھا جاتے ہوئے سیڑھیوں میں مل گئے۔ ہر چند مشاعرہ بلا معاوضہ تھا اور دور دراز سے آئے ہوئے دوستوں سے مل بیٹھنا بھی ضروری تھا۔ لیکن قاسمی صاحب نے سب سے چھپتے چھپاتے ٹیلیکسیک کی اور ایگزیکٹو آفیسر صاحب کے مشاعرے میں شرکت کے لیے روانہ ہو گئے۔ گزشتہ سال جناب مرتضیٰ برلاس اسسٹنٹ کمشنر شورکوٹ نے جواں مرگ شکیب جلالی کی امداد کے لیے مشاعرہ کیا تو احمد ندیم قاسمی اس میں بھی بلا معاوضہ شریک ہوئے۔ اس قسم کا ایک مشاعرہ فالج زدہ ادیب انور گوئندی کی امداد کے لیے سرگودھا میں منعقد ہونے والا ہے۔ قاسمی صاحب نے اس میں بھی شرکت کے لیے انور مسعود صاحب سے بلا معاوضہ وعدہ کر رکھا ہے۔

قاسمی صاحب نہ صرف بیشتر مشاعرے پڑھتے رہے ہیں بلکہ مشاعروں کے بارے میں لکھتے بھی رہے ہیں۔ ان کے طنز حرف و حکایت میں اس کی جھلکیاں اکثر نظر آتی ہیں۔ ڈپٹی کمشنر ضیا احمد مرحوم کے اہتمام سے جو کل پاکستان مشاعرہ

سرگودھا میں منعقد ہوا تھا اس کا دیباچہ رپورتاژ قاسمی صاحب نے "ذکر ایک مشاعرے کا" لکھا۔ اور یہ امروز کی "قسمت نگاری" (ادبی ایڈیشن) میں شایع ہوا۔ دل ہی دل میں انھوں نے اسسٹنٹ کمشنر مرتضیٰ برلاس کے مشاعرے کی روداد بڑے دل سوزانہ رنگ میں بیان کی۔ میں نے یہ بات "دل سوزی" سے اس لیے کہی ہے کہ یہ مشاعرہ ان کے ایک مرحوم شاعر دوست کی یاد اور اعانت میں منعقد ہوا تھا، اور قاسمی صاحب اس دوست کو یاد کرکے بڑے اداس تھے۔

احمد ندیم قاسمی گذشتہ چار دہائیوں سے کامیابی سے مشاعرے پڑھ رہے ہیں۔ اور یہ محض یہ کہنا کہ وہ مشاعرے کے کامیاب ترین شاعر ہیں، کافی نہیں۔ مشاعروں میں ان کی کامیابی کا گراف بتدریج مائل بہ فراز رہا ہے اور اس میں نشیب بہت کم آئے ہیں۔ یہ مقام انھوں نے زہرہ نگاہ یا قتیل شفائی کی طرح ایک ہی اتفاقی جست میں حاصل نہیں کیا۔ بلکہ اس میں ان کی چار دہائیوں کی شبانہ روز محنت بھی شامل ہے۔ انھوں نے اپنے مشاہدات کو جس تیزی سے شعر کا قالب پہنایا ہے کہ اگر ان کا سارا کلام شایع ہو جائے تو ضخامت نظیر اکبرآبادی کی کلیات سے بڑھ جائے۔ ایک زمانے میں وہ [illegible] کے بیخود دہلوی، سائل دہلوی، جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی جیسے عظیم شعرا کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اب ان کا نام شہزاد احمد، شہرت بخاری، سید باقر رضوی، انجم رومانی، ظہیر کاشمیری اور اکبر لاہوری جیسے مشہور شعرا کے بعد لیا جاتا ہے۔ اور سامعین انھیں سننے اور ان کی آواز کو ٹیپ کرنے کے لیے، اونگھتے ہوئے طویل شب کو عبور کرنے پر ہمیشہ مائل رہتے ہیں۔

پروین سیّد فنا

آدم کا بھرم ندیم سے ہے

ندیم سے اپنا رشتہ بہت پرانا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ندیم سے میرا تعارف "سناٹا" افسانے نے کرایا۔ اسکول کی طالبہ کا ناپختہ ذہن رکھنے کے باوجود اس افسانے کے کرب میں روح کو جھنجھوڑنے والی کسک نے مجھے انتہائی متاثر کیا۔ اور یوں اپنے پسندیدہ افسانہ نگاروں میں میرے ذہن نے ندیم کا نام سرفہرست رکھ لیا۔

اُس وقت تک شاعر ندیم سے اپنا تعارف نہیں ہوا تھا۔ عمر کے اُس دور میں ہم بچیوں کے سروں پر پہلے پہل تو ساحر کی دل میں اُترنے والی ۔۔ سیدھی سادی، لیکن چونکا دینے والی نئی قسم کی شاعری سوار رہی ۔۔ اور اس کے بعد مدتوں مجاز اور فیض کی کومل سُروں جیسی دھیمی دھیمی آواز اپنے بے پناہ تاثر کے ساتھ مسحور کرتی رہی ۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک بار ندیم کی "شعلۂ گل" اردو کے کسی مباحثے میں بطورِ انعام ہاتھ لگی۔ اور یوں پہلی بار شاعر ندیم کو سنجیدگی سے پڑھا ۔ تو محسوس ہوا کہ اِس فن کار کے ہاں تو شُدہ سُروں کا خالص ۔ ٹھوس ۔ سچا اور قائم و دائم رہنے والا احساس موجود ہے۔

ہر لکھنے والا عمر کے ایک خاص دور میں شاعر یا ادیب کو آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق سمجھتا ہے۔ اس جذبے میں دراصل اس کے ذہن کے کسی گوشے میں خود لکھنے کی دبی ہوئی خواہش بھی شامل ہوتی ہے ۔ اپنا بھی کچھ یہی حال تھا ۔ اور ایک شب اچانک جب اظہار کے کرب نے غزل کی صورت اختیار کی تو ذہن نے بھی خود کو انتہائی اعتماد سے اس آسمانی مخلوق کی صف میں شامل کر لیا۔ پھر شعور و آگہی ۔۔ مطالعے اور مشاہدے کے مفہوم سے ناآشنا محض اپنے جذبے اور احساس کی شدت کو چند اشعار میں سمو کر کُل چار یا پانچ غزلوں کا اثاثہ لے کر ان میں سے ایک خط فیض کو لکھا ۔ اور دوسرا ندیم کو ۔۔۔ بچپنے ہی سے معیار کے سلسلے میں اپنی انتہا پسندی کا کچھ عجیب سا عالم رہا ہے۔ پہلے تو فیض کا بہت ہی پیارا سا جواب آیا ۔ وہی ان کی گداز شاعری اور دھیمی شخصیت ۔ نرم اور کومل لہجہ ۔۔ حوصلہ افزائی کے چند میٹھے الفاظ ۔ کلام کے موزوں ہونے کی جانب ہلکا سا اشارا ۔۔ مطالعے ۔ اور مشاہدے کا مشورہ ۔ ایک نئی لکھنے والی کے لیے یہی بہت تھی ۔ اور اس کے چند روز بعد ندیم کا خط ملا ۔ (ندیم ان دنوں امروز میں تھے) جس میں کھرے کھرے انداز میں غزل کے ہر شعر پر تنقید ۔ اغلاط کی واضح نشان دہی ۔ اور فن کے حصول کے لیے انتہائی محنت ۔ لگن اور ریاضت کا سنجیدہ مشورہ ۔ میں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ سخت غصے کے عالم میں ندیم کے خط کو پھاڑ کر پھینک دیا ۔۔۔ (آج سوچتی ہوں تو اپنی اس حماقت اور بچپنے پر ہنسی کے بجائے افسوس ہوتا ہے) اور شاعر ندیم سے اپنا رشتہ توڑ دیا ۔ اور فیض احمد فیض کے اکلوتے خط کی راہنمائی میں چپ چاپ

لکھنے کا فیصلہ کیا۔

پھر مدتیں گزر گئیں — میں لکھتی رہی — مشاعروں میں پڑھتی رہی۔ کبھی کبھار کسی مشاعرے میں ندیم سے علیک سلیک ہو جاتی۔ اور جب میرے ایک آدھ شعر پر ندیم اپنے انتہائی محتاط انداز میں داد بھی دے ڈالتے — تو عجیب سی روحانی خوشی محسوس ہوتی۔ اور پھر اس "انا" کی تسکین بھی ہو جاتی، جو ندیم کے پہلے خط سے مجروح ہوئی تھی۔

اس تمام عرصے میں ندیم کا فن اور اُس کی شخصیت انتہائی خاموشی سے مجھے متاثر کرتی رہی۔ ندیم کے فن کا خلوص۔ انسانیت کے لیے بے پناہ احترام — زندگی کی اعلیٰ اقدار کی جستجو کے لیے ایک فن کار کی سچی تڑپ — اور پھر انسان دوستی کا انتہائی شائستہ اور ستھرا معیار، اور یوں مجھے ندیم کی شخصیت سب سے علیحدہ۔ ایک ایسے مقام پر ایستادہ نظر آئی — جہاں فن اور انسانیت کی اعلیٰ ترین قدریں — آپس میں گڈمڈ ہو کر ایک کھری سچائی بن کر ابھرتی ہیں۔ اور ایسے انسان سے دوستی (ہمارے ہاں پڑھی لکھی خواتین کو بھی محض متقدمین — متوسطین — اور متاخرین سے عقیدت رکھنے کی اجازت ہے۔ خدا ندیم کو زندگی دے —) خیالات کی ہم آہنگی — زندگی کی آفاقی اقدار میں اشتراک اور پاکیزگیٔ نفس کی بدولت استوار ہو سکتی ہے۔ اور پھر ندیم سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری کرتے ہوئے، میں نے خود ہی ندیم کا پہلا خط پھاڑنے کی تلافی کر لی۔

فن کے سلسلے میں ندیم محنت اور شدید لگن کے قائل ہیں۔ پھر اس پر مستزاد خود تنقیدی — غزل میں ایک بھی شعر بھرتی کا ہو — فوراً اس کی نشان دہی کریں گے۔ اور شفقت سے لکھیں گے — "ایسا شعر تو ہر کوئی کہہ سکتا ہے، سو لامحالہ اپنا وہ شعر اپنی ہی بے رحم تنقید کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے فن کو اپنے ہی کڑے معیار کی کسوٹی پر پرکھنے کا سلیقہ ندیم ہی سے سیکھا ہے۔ البتہ جہاں کوئی فن پارہ پسند آ جائے — وہاں چند لفظوں میں اتنے سلیقے سے داد دیں گے۔ جو لفاظی کی بھاری بھرکم، تکلف آمیز تحسین پر کہیں بھاری ہو گی۔

جیسے ندیم کے فن پاروں میں کہیں ڈھیلا پن نہیں — کوئی جھول نہیں۔ اسی طرح اس کی شخصیت میں بھی کہیں جھول نظر نہیں آتا — وہ اپنے اعزاز میں منعقد ہونے والی کسی تقریب میں مداحوں کے جھرمٹ میں گھرا ہو۔ یا دو چار عزیزوں میں۔ اُس نے کبھی اپنی کسی بات سے "سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا" قسم کا شعوری تاثر نہیں دیا۔ شاید ندیم کی عظمت اس کی یہی بے پناہ سادگی ہے — اس کی نگاہ کی پاکیزگی سے لے کر — اس کی گفتگو کی شائستگی — اور خطوط میں اس کی تحریر کی پُر خلوص سنجیدگی تک کہیں ملمع کاری کا شائبہ تک نہیں — شاید یہی وجہ ہے کہ ندیم کے فن کی طرح اُس کی شخصیت کا سحر اس کے مداحوں کو نہایت سبک روی — کچھ اس طرح اپنے ترتیب کر لیتا ہے کہ پھر اس جادو کے ٹوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یوں ندیم کی دوستی کسی سطحی رو کے تحت ایک وقتی ابال کی نہیں۔ بلکہ اعتماد اور بھروسے کی یہ متاعِ بے بہا اس کے دوستوں کی تمام زندگی پر محیط ہو جاتی ہے۔

خط لکھنے کے معاملے میں ندیم اپنے موڈ کے مالک ہیں۔ بعض اوقات انتہائی باقاعدگی سے خط لکھیں گے اور کبھی اچانک خاموشی۔ اگر آپ میں ان کی یہ بے ضرر خاموشی برداشت کرنے کی قوت ہو تو خیر — ورنہ ندیم کا سکوت ہفتوں مہینوں سے چل کر بعض اوقات برسوں تک پہنچ جاتا ہے۔ یعنی اگر آپ نے ندیم کو یکم اکتوبر ۱۹۷۶ء کو خط بھیجا ہے۔ تو اُس کی رسید اگلے برس یعنی جنوری ۱۹۷۷ء میں ملے گی — لیکن یہاں اتنا ضرور کہہ دوں — کہ اگر خط میں کسی ناگہانی پریشانی کا تذکرہ ہو —

کوئی اہم مسئلہ درپیش ہو۔ تو ندیم فوراً خط لکھیں گے۔ پریشانی میں حوصلہ دیا گیا۔ ہمت بندھائیں گے۔ وہی ندیم جو مہینوں خبر نہ لے، اچانک یوں دل جوئی کرے گا۔ کہ تمام پریشانیاں سطحی معلوم ہونے لگیں گی۔ پھر اگر کوئی خوشی کی خبر ہو۔ تو ندیم فوراً مبارکباد کے خط بھیجے گا۔ کچھ کر آپ کی خوشیوں میں شریک ہوگا۔ جیسے یہ سب خوشیاں اور غم ان کے اپنے ہوں ——!

آلام و مصائب کے جھکڑوں میں بھی ندیم کا رکھ رکھاؤ اور سکون قابلِ دید ہے۔ پاکستان کے ٹوٹنے کا دکھ۔ اپنی شکست کے احساس کا ردِعمل کچھ اتنا شدید تھا۔ کہ ۱۶ دسمبر کی شب میرے لیے شبِ عاشور سے زیادہ غمناک تھی۔ میں نے ندیم کو انتہائی اکھڑا اُکھڑا سا خط لکھا۔ ندیم کا پُرسکون جواب آیا۔ جذبۂ تعمیر کی کرنوں میں لپٹے ہوئے چند الفاظ۔ زندگی پر بے پناہ ایمان و ایقان۔ راکھ کے ڈھیر میں کسی چنگاری کی جستجو۔ سلیقے سے زندہ رہنے اور سر اٹھا کر چلنے کا حوصلہ۔ اس دور پر ندیم کے کتنے احسانات ہیں ——!

ندیم کے خلوص کا یہ عالم ہے۔ کہ اگر کبھی اختلافِ رائے کے سلسلے میں دانستہ یا نادانستہ طور پر ان کی دل آزاری ہو بھی جائے۔ تو ندیم ترکی بہ ترکی جواب دینا تو درکنار خط میں ذکر تک نہیں کریں گے۔ اور ندیم کی یہ معصوم سی خاموشی جھگڑنے سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔

یوں تو ندیم انتہائی فراخ دل ہیں۔ اختلافِ رائے کا احترام کرتے ہیں۔ جبراً اپنی رائے قطعاً مسلط نہیں کریں گے۔ لیکن جہاں بات اصول کی ہو۔ یا اپنے دوست کا مفاد مدِنظر ہو۔ وہاں ڈٹ جاتے ہیں۔ اور اس طرح کہ آخر فتح ندیم ہی کی ہوتی ہے۔ اس کا ذاتی تجربہ مجھے یوں ہوا کہ میرے اولین مجموعے کا نام (جو زیرِ اشاعت ہے) میرے گھر کے چند عزیزوں نے "بقائے فنا" تجویز کیا (مجھے اپنے بچوں کے ناموں سے لے کر اپنی نظموں کے عنوانات تک کے سلسلے میں نہ معلوم کیوں ہمیشہ مشکل پیش آتی ہے) سو میں نے ندیم سے پوچھا۔ انھوں نے انتہائی خلوص سے سمجھایا۔ اور قائل کرنے کی کوشش کی کہ یہ نام قطعی موزوں نہیں۔ اسی اثنا میں ایک بزرگ شاعر سے بھی (جو اہلِ زبان ہونے کے ناتے اپنی زبان دانی کو اردو ادب میں حرفِ آخر سمجھتے ہیں) اس سلسلے میں سرسری تذکرہ ہوا۔ انھوں نے بھی "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کے سے انداز میں "دوامِ فنا" قسم کا نام تجویز کیا۔ میں بھی بلاوجہ سوچ میں پڑ گئی۔ کہ آخر کیا قباحت ہے؟ فانی نے بھی تو اپنے کلیات کو "باقیاتِ فانی" کہا تھا۔ جب ندیم میری ضد سے عاجز آگئے۔ تو انھوں نے اچانک ایک ذرا سی بات کہہ کر "کہ اس میں شاعرانہ تعلّی کا پہلو نکلتا ہے" مجھے فوراً قائل کر لیا۔ اور اچانک مجھے احساس ہوا کہ بقا یا دوام کا تاج خود اپنے سر پر رکھنے والوں پر تو مجھے ہمیشہ رحم آیا ہے۔ سو میں نے خود ہی اپنے مجموعے کو اپنی ایک نظم کے عنوان پر "حرفِ وفا" کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ندیم نے نہ صرف میرے اس فیصلے سے اتفاق کیا۔ بلکہ اسے پسند بھی کیا۔ بظاہر تو یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ لیکن انہی چھوٹے چھوٹے حقائق سے شخصیتوں کے کھرے پن کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ شاعر عام طور سے اپنے تخلص کا انتخاب زندگی اور فن کے ایسے ابتدائی دور میں کرتا ہے، جب وہ اپنے تخلص کی گہرائی و گیرائی اور اس کے مفہوم سے خود بھی پوری طرح آشنا نہیں ہوتا۔ یہ بچپن کا ایک لاشعوری عمل ہے۔ جس میں اپنی ذات کے لیے ایک شاعر اپنے احساس کو انتہائی سادگی اور خلوص کے ساتھ اپنی مکمل ترین صورت میں ایک لفظ میں مستور کر دیتا ہے۔ اور پھر بعد میں یہی تخلص اس کی پوری شاعری اور شخصیت میں کچھ اس طرح رچ بس جاتا ہے کہ اس کی جھلکیاں اس کے فن میں جگہ جگہ اپنی پوری تابانی کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ جیسے غالب کی غالبیت اس کی ہمہ گیر شخصیت کے ساتھ ساتھ غزل کی پوری کائنات پر محیط ہے۔ یا اقبال کی شاعری کی پرشکوہ عظمت جس سے اس کے

کلام اور شخصیت کی جلالی و جمالی کیفیات مکمل طور پر آجاگر ہوجاتی ہیں۔ یا حضرت جوش۔ جن کا جوش و خروش ان کی شخصیت اور کلام کے بحر بیکراں کی سطح پر پوری طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔

اور پھر فیض۔ جس کی مدھم شخصیت اور شاعری میں ایسے گہرے دریاؤں کا پُرسکون ٹھہراؤ موجود ہے جن کا پانی اگر کبھی کناروں سے اُچھل کر باہر بھی گر جائے تو بجائے نقصان کے فائدہ ہی پہنچائے گا۔

"احمد شاہ" نے جب اپنا تخلص ندیم رکھنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ تو خدا جانے اسے یہ احساس تھا بھی یا نہیں کہ ایک روز اُسے پوری انسانیت کا بھرم اپنی دوستی سے قایم رکھنا ہوگا؟

عظیم فن کار عظیم انسان

(صفحہ ۲۳۶ سے آگے)

غزل ہو یا نظم، قطعہ ہو یا رباعی، افسانہ ہو یا انشائیہ۔ تنقیدی مقالہ ہو یا اخباری کالم۔ قاسمی صاحب کی انفرادیت ہر مقام پر موجود نظر آتی ہے۔ لیکن شاعری کے علاوہ ان کا افسانہ ایک دائمی چیز ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگ انہیں بڑا شاعر سمجھتے ہیں اور بعض لوگ بڑا افسانہ نویس۔ بہرحال ان کی قوت تخلیق دونوں حیثیتوں سے زندہ رہے گی لیکن کبھی کبھی ایسی دلچسپ صورت حال بھی پیدا ہوجاتی ہے کہ بقول قاسمی صاحب۔ ایک روز ان کے دفتر میں ایک صاحب نے آکر پوچھا کہ کیا احمد ندیم قاسمی صاحب آپ ہی ہیں۔ قاسمی صاحب نے اثبات میں جواب دیا تو نووارد نے دریافت کیا، آپ شاعر احمد ندیم قاسمی ہیں یا افسانہ نویس احمد ندیم قاسمی۔؟ آپ نووارد کی غلط فہمی سے لطف اندوز ہوئے اور مزید لطف لینے کے لیے انھوں نے جواباً کہا۔ میں شاعر احمد ندیم قاسمی ہوں۔ افسانہ نویس احمد ندیم قاسمی نسبت روڈ پر رہتا ہے۔ یہ سن کر وہ صاحب افسانہ نویس احمد ندیم قاسمی کی تلاش میں نسبت روڈ چلے گئے۔

اصول کی خاطر قید و بند اور محرومیٔ روزگار کے حادثوں سے گذرنے والا ایک احمد ندیم قاسمی بھی ہے۔ یہ قاسمی قیام پاکستان سے لے کر گذشتہ چند برس تک کئی بار جیل جا چکا ہے۔ اس نے اصول کی خاطر "امروز" جیسے مقتدر روزنامہ کی ادارت سے استعفیٰ دیا۔ کئی سرکاری ملازمتوں کی پیشکش کو ٹھکرا دیا اور بیشتر موقع پرست ادیبوں کے رویے کے برخلاف کبھی کوئی سرکاری درباری رشوت قبول نہ کی بلکہ صرف اپنے قلم کی جائز کمائی پر گزارا کیا۔

احمد ندیم قاسمی کل بھی عظیم تھا، آج بھی عظیم ہے اور آنے والی کل میں بھی عظیم رہے گا۔ اس کی عظمتیں ہمارے ادب کا ایک اہم حصہ ہیں۔ اس کی عظمتیں انسانیت کے سنہرے زیور ہیں۔ اس کی عظمتیں آنے والی نسلوں کے لیے سنگ میل ہیں۔ وہ خود عظیم ہے۔ اس کی انسانیت عظیم ہے۔ اس کا فن عظیم ہے۔

خالدہ شفیع

ایک شریف آدمی

(بہت سی محترم ہستیوں سے معذرت کے ساتھ)

چ۔۔ اتنے شریف ادیب! ۔۔۔ منہ پھیکا پڑ گیا جیسے گونگلو[1] کھا لیا ہو۔۔ ہائے ان دنوں ہم کیسے کرارے مضامین و افسانے پڑھا کرتے تھے اور یہ تھے اپنے احمد ندیم قاسمی بالکل ہی سیدھے سادے اور شریف انسان ۔۔۔۔ اور ان کی تحریریں انہی کا پرتو ۔۔ ادیب اور فن کار کی جو خصوصیات ہمارے ذہن میں مرتب ہوئی تھیں، ان میں سے کوئی بھی تو موجود نہ تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم اسکول کے اعلیٰ درجوں میں زیر تعلیم تھے اور اے۔ آر خاتون، کی گھریلو رنگین عشقیہ داستانیں ۔ فاطمہ مبین کی آرائشِ لباس و زلف اور نسیم حجازی کی پرجوش باحیا ہیروئین اور تاریخی واقعات سے مزین ناولوں ۔ خواتین کے رسائل کی زنانہ بیماریاں اور الجھنیں عبور کر کے عصمت چغتائی ۔ مجاز ۔ قرۃ العین منٹو اور میراجی تک آ پہنچے تھے ۔ عصمت کی فراٹے بھرتی جملوں کی ریل ۔ زبان کا چٹخارہ شوخیٔ بیان ۔ طمانچے لگاتے حقائق ۔ چھری کی نوک پر رکھے اور جلتے توے پر بوند کی مانند تڑ تڑاتے طنز ۔ کیسے جان لیوا تھے ۔ مجاز میں گھل جانے ۔ پگھلا دینے والی خصوصیات تھیں جو نوجوانوں کو کیسا احساس بنا دیتی تھیں کہ شراب اور عشق نوجوانی کے لیے لازم و ملزوم لگتے تھے ۔ قرۃ العین ۔۔۔ معلومات کا دریا ۔۔ اس کی کہانیاں کیسے رنگیں خواب دکھاتی تھیں ۔ کتنی ہی لڑکیاں انٹلکچوئل بننے کی خواہش میں بے ڈھب ہو کر رہ گئی تھیں ۔ منٹو کے کھلے کھلے بے لباس جملے ۔۔ ٹھوس افسانے ۔۔ بلالی سے لونڈی ۔۔ ادیب کا کیا تصور قائم ہوا تھا کیا بتاؤں! ۔۔۔ میراجی ۔۔۔ بلکہ یہ کیسی بدعادتوں میں مبتلا ۔ ابکائیاں آنے لگتی تھیں ۔ ۔۔ ادھر واجدہ تبسم کو عصمت بننے کا شوق ہوا تو کوا چلا ہنس کی چال ۔۔۔ نہ جانے کیا کچھ لکھ گئیں ۔ پھر آذر زوبی، اور حمایت علی شاعر تو اپنے گھروں کو ہی داغ مفارقت دے آئے تھے فن کی خاطر ۔۔ یا خدا یہ کیسی راہداری ہے ۔۔۔ اس فنِ لطیف سے تعلق رکھنے والے کیسی کثیف دنیا کے باسی ہوتے ہیں ۔ اگر ان سے فن کو جدا کر دیا جائے تو محض لفنگا پن رہ جاتا ہے ۔۔۔ پھر کارلائل نے بھی تو کہا تھا اچھے ادیب سے اچھے کردار کی توقع رکھنا ایسا ہی ہے جیسے یہ شکایت کرنا کہ سورج اپنی گرمی سے میرا پائپ کیوں نہیں جلاتا ۔۔۔

---

[1] شلجم

یہ تو محض ہماری شرافت تھی کہ ان معززین کو فن کے ساتھ دیکھتے تھے، ورنہ ہمارے بزرگوں نے انھیں بغیر فن کے ہی دیکھا اور نتیجہ ظاہر ہے کہ انھیں صرف لفنگا پن نظر آیا۔ کتنی ہی لڑکیوں کو کالج کے مشاعروں میں شرکت کی اجازت نہ ملتی تھی اور کتنی ہی بے وقوف خواتین ادبی مجالس سے کترانے لگی تھیں۔ حالانکہ گرجنے والے اتنا برستے نہیں۔ ان دلوں تصورات و خیالات کی کیسی یلغار رہتی تھی۔ اس پُرخطر رہ گزار کی تمنا کرتے ہوئے انجانا خوف محسوس ہونے لگتا تھا۔ یہ راہ شجرِ ممنوعہ بن کر رہ گئی تھی اور نہ جائے ماندن اور نہ پائے رفتن کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی یہ اپنا کارنامہ سا لگتا ہے کہ ذہنی دلدل کے اس دور سے صحیح سلامت نکل آئے ــــ شاید اسی نقطے سے نفسیات کا آغاز ہوا اور ہم نے دکھتے دل سے یہ رائے قایم کرلی کہ بڑا آدمی بننے کے لیے کج روی لازمی ہے اور وہ بھی تگڑی قسم کی ــــ پھر جو ہم نے احمد ندیم قاسمی کو پڑھا کہ ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا

تو یقین جانیے کیا غیر معمولی آدمی لگا ؏

جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

شریف اور انتہائی شریف ــــ کیا یہ غیر معمولی پن نہ تھا کہ انھیں ئے سے کوئی غرض نہ تھی ــ عشق و محبت یونہی سا ڈھکا چھپا ــ کیا جنس اور کیا جنس کاریاں! ــ عورت کو خاتون سمجھنے والا ــــ لیکن تحریر اور کلام ضرور بڑے ادیب کی سی خصوصیات لیے ہوئے ــ دراصل ہر بڑا ادیب اپنے تحریر کردہ تجربہ کو جسم سے سہتا نہیں تو ذہن سے برتتا ضرور ہے ــ میرا ذہن ابھی اس بات کے لیے صاف نہ تھا کہ لکھنے والے کے لیے کج روی اور خصوصاً شراب علت ہے یا معلول ــــ یا بعد میں شراب شاید INCENTIVE کی حیثیت اختیار کرلیتی ہو ــــ کتنے ہی سوالات منڈلایا کرتے ــــ کیا ان کا اخلاق عام سماجی اقدار سے جدا ہونا چاہیے، تو پھر وہ کیونکہ سماج کی صحیح عکاسی کرسکتے ہیں، اور انھیں اعلیٰ معیارات تک لے جاسکتے ہیں۔ ہم نے نفسیات پڑھی اور پڑھتے چلے گئے۔ یہ مضمون احساسات اور جذبات کی بے ہودہ سرجری ہے اور مریضوں کی ــــــ SO CALLED ذہنی پلاسٹک سرجری۔ لیکن پھر بھی سرجری کی طرح کامیاب نہیں۔ ہماری پروفیسر تجزیہ بیان کرتی تھیں ــ جنییس کج رو نہیں ہوتے، بلکہ ان کا اپنا اخلاقی معیار ہوتا ہے جو عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے اس لیے انھیں کج رو کہہ دیا جاتا ہے۔ آپ ہی بتائیے ایسی صورت حال میں کوئی سیدھا سادھا انسان ادیب کہلا سکتا ہے، جو شراب پیتا ہی نہیں ــ گھڑی یا گھڑا رکھ کر پینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ــ جسے گھر والوں سے بے تحاشا محبت ہو۔ جو کچھ لکھتا ہو اس سے کہیں اعلیٰ کردار کا مالک ہو۔ پہلی بار ــ شاید پہلی بار امید کی ننھی سی کرن میرے پراگندہ ذہن کو روشن کر گئی۔ ایسے میں انھیں شریف نہ کہوں تو کیا کہوں جو عام لوگوں کے اخلاقی معیار پر پورا اُترنے کے ساتھ ساتھ منفرد و محترم انسان نکلا۔ ان میں شرافت کی جملہ خصوصیات موجود ہیں اور وہ بڑے ادیب بھی ہیں ــ ایسی متضاد خصوصیات اس دور میں آپ کو بہت کم نظر آئیں گی ــ کوئی ادیب ہو سکتا ہے یا شریف ــــ یا محض بے چارہ شریف ہو سکتا ہے یا ادیب ــ جو عورت کو محض جنسِ مخالف سمجھ کر چھچھوری حرکتیں نہیں کرتا ــــ اپنے دل میں چھپا کر بے تحاشا پیار اور بے پناہ احترام کرتا ہے ــــ جو کچھ کہتا ہے عملاً کرتا بھی ہے۔ گفتار کا غازی ہی نہیں، دیوانہ بہ کردار ہے۔ اسے کیا کہا جائے گا، شرافت کی ادنیٰ سی مثال لے[1]

---

[1] میرا بھتیجا چند سال پیشتر لاہور گیا تھا۔ اچانک ندیم صاحب سڑک پر جاتے نظر آئے تو اس نے مارے اشتیاق کے کچھ وقت ساتھ گزارنے کی درخواست کی۔ جو انھوں نے اسی وقت پوری کردی۔

سنیئے۔ اگر کوئی پرستار اچانک انھیں دیکھ کر سرِ راہ کہہ دے، میری خواہش ہے آپ کچھ دیر میرے ساتھ ابھی بیٹھ کر چائے پئیں تو وہ یہ خواہش پوری کر دیں گے ــــ حد تو یہ ہے شکلاً بھی ادیب لگتے ہیں ــ ورنہ اکثر ادیب، تو صرف شکلاً شریف لگتے ہیں۔ ادیب نہیں: ــــــ

نقوشِ کے شخصیات نمبر میں احمد ندیم قاسمی کو خدیجہ مستور کی تحریر سو تجربہ میں پڑھا۔ عظیم بیگ چغتائی کی شخصیت کے بعد یہ انتہائی دلچسپ شخصیت لگے۔ معلوم نہیں اس میں خدیجہ مستور کی تحریر کو زیادہ دخل ہے یا ان کی شخصیت کو سنجیدہ، گمبھیر، بھاری بھرکم ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت معصوم، مخلص اور شوخ بچہ کے مانند جو ستاتا ہے اور ستایا بھی جاتا ہے، دوسروں سے ہمدردی بھی کرتا ہے اور ان کی نقلیں بھی اتارتا ہے ــــ! ان کی کہانیاں اور کردار ہی دیکھ لیں۔ کیسے شریف اور کتنے سیدھے سادے ہیں۔ ابتدا میں کوئی خاص اثر نہیں چھوڑتے۔ لیکن جیسے پڑھتے جائیں ان کی شرافت، خلوص اور سادگی پر یقین آنے لگتا ہے اور ایک انسان کی یہی تعریف ہو سکتی ہے۔ ان کے عزیز کردار، تاجو۔ ناہید۔ عمران، نامرد۔ کریم سب انتہائی شریف انسان ہیں جو اعلیٰ قدروں پر یقین رکھتے ہیں۔ شرافت کے بل بوتے پر سفلی جذبات پر قابو پا لیتے ہیں ــــ اخلاقی حدود کا دامن نہیں چھوڑتے۔ انھیں انسانی وقار عزیز ہے جسے سطحی خواہشات کے ہاتھوں پامال نہیں ہونے دیتے۔ ان کی اکثر کہانیاں دیہات کی سیدھی سادھی کہانیاں ہیں جس کی ہیروئین اور کردار سادہ لوح لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے روزمرہ کے کئی ایک مسائل ہیں۔ لیکن وہ انسانوں کی طرح دکھ کو زہر بنا کر نہیں پیتے کہ جی سے گزر جائیں، بلکہ جامِ صحت سمجھ کر خوشی خوشی پی جاتے ہیں۔

> "ــــ دکھ اور سکھ انسان کی اپنی تخلیق ہیں۔ یہ صرف طرزِ نگاہ کا فرق ہے ــ ہمارے تصور کے کرشمے ہیں، ورنہ وہ جو مصیبتوں میں بھی اپنے لیے سکون و مسرت تلاش کر لیتے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے تو کہیں گے یہ دکھی لوگ عالمِ انسانیت میں مہلک وبا سے کم نہیں" ــــ
>
> (معطر لفافہ)

ایسے ہی افکار سے ان کی شرافتِ نفس اور خلوص اور زندگی سے پیار کے داخلی پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ لیکن شوخی، گہرا مشاہدہ اور طاغوتی قوتوں کی کارفرمائی کے باعث ان کی تحریروں میں ایسے جان دار طنز اور جان لیوا جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں:

> "ــــ راؤ صاحب کا پیٹ اچھلا اور کھلے دہانے سے ایک قہقہہ آم کی گٹھلی کی طرح ٹپک پڑا ــــ ایک بزرگ داخل ہوئے نہایت جابر قسم کے انسان معلوم ہو رہے تھے۔ بھوؤں کے درمیان ایک شکن یوں جمتی ہوئی تھی، جیسے چھرے کی نوک سے نہایت اہتمام سے تراشی گئی ہو" ــــ
>
> (تسکین)

معاشرے کے استحصالی کرداروں سے متعلق شہرت احساس لئے کیسے حقیقی، جان دار اور خوبصورت الفاظ کا روپ دھارا ہے کہ قاری کی روح میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔

دیہاتی زندگی سے ہٹ کر شہری زندگی پر تحریر کیا تو "گھر سے گھر تک" ایسا معرکہ آرا افسانہ لکھ ڈالا۔ شہر کی مصنوعی

کھوکھلی قدروں کا ایسے دل کش، دل نشین خاکہ اُڑایا کہ شہری زندگی کے بہت سے گوشوں پر یہی کہانی چھپی نظر آتی ہے ــ شرافت اور انسانیت پر اس قدر اعتماد کہ دوست دشمن بھی انھیں اسی رشتے میں بندھے نظر آتے ہیں ــ پرمیشر سنگھ، بھی پڑھی سنی اور دیکھی ۔ کاش روحانی لحاظ سے انسانیت کے نام پر تمام لوگ اتنے بلند ہو جائیں ــ ترقی پسند ادیب کہلائے تو بھی محض شرافت کی بنا پر ــ مروت میں آکر پرجوش رکن بنے کہ عوام کی بدحالی نے متاثر کیا ۔ یہاں زیادہ اہمیت تحریک کے مثبت اور منفی پہلوؤں سے نہیں، بلکہ اُس جذبے سے ہے جو تحریک کی شکل اختیار کرتا ہے ۔ ادب محض سماجی خدوخال دکھانے کا آئینہ ہی نہیں، بلکہ ایسی دوربین بھی ہے جو دور کی چیزیں نزدیک دکھا کر لوگوں کو متحرک رکھتا ہے اس طرح زندگی کے نت نئے تجربات اور تحریکیں ادب کو آگے بڑھاتی ہیں ۔ کوئی بھی تحریک یا نیا تجربہ ادب میں اضافہ تو کر سکتا ہے ــ لیکن ادب محض تحریک کا نام نہیں ــ ادب صرف چند نظریات کی بازگشت نہیں ہو سکتا ۔ یہ انسانی زندگی سے پھوٹنے والی وہ روشنی ہے جو انسان کو ماضی و حال کی اعلیٰ قدروں کے ذخیرے کے ساتھ آگے بڑھاتی ہے ۔ اس روشنی میں احمد ندیم قاسمی بھی شامل ہیں ۔ کتابی تحریری اور نظریاتی حد تک اعلیٰ کردار اور اخلاق باقی رہنا آسان ہے ۔ لیکن عملاً بے حد مشکل ۔ اس قدر زیرک بالغ و پختہ ہونے کے باوجود معصوم بچوں کی طرح ماں کو چاہنا، بہنوں سے بے پایاں محبت ۔ اپنی سادہ لوح اور دیہاتی بیوی سے بے پناہ پیار حیرت ناک ہے ــ جس ادیب کی بیوی کو یہ علم نہ ہو اُس کا شوہر کیا کرتا ہے ۔ جس نے ہجرت کر کے پاکستان آنے والوں کو نہ صرف پناہ دی ہو، بلکہ گھر کا فرد بنا کر خاندان کی عزت اور وقار بڑھایا ہو ۔ جس نے چار سال تلاشِ معاش میں گزارے، اور جب سب انسپکٹر آب کاری ہوئے تو طبعِ نازک پر یہ سروس بھاری سل بن کر گری اور یہ استعفیٰ دے کر پھول ۔ تہذیبِ نسواں اور ادبِ لطیف کی ادارت سنبھال بیٹھے ۔ غالباً یہی شرافت احمد ندیم قاسمی کی رگ رگ میں ہے ۔ سیاسی فتنے نے انھیں ادیب بنا دیا اور ادیب ہونے کے ناتے شرافت سے باز نہیں آتے ۔ اس کے نت نئے مظاہرے کرتے رہتے ہیں ۔

اب اس دور میں جب کہ احمد ندیم قاسمی کو عزت، شہرت اور ادبی عظمت حاصل ہو چکی ہے، اُن کے کئی مجموعے بھی چھپ چکے ہیں، اُن کی شرافت میں کوئی کمی نہیں ۔ انھیں اپنی ادیب برادری کا ایک خاندان کے بزرگ کی طرح ہمیشہ خیال رہتا ہے وہ اپنے کالموں میں مختلف مسائل و حقائق نہایت بے باکی اور دیانت سے پیش کرتے رہتے ہیں ۔ سب سے زیادہ قابلِ ستائش بات یہ ہے کہ وہ محبِ وطن ہیں اور پاکستانی کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں ــ دراصل کسی کو محبِ وطن کہنا اور کسی کا محبِ وطن کہلوانا آسان نہیں ۔ یہ ہفت پہلو مسئلہ ہے ۔ بے شمار پیچیدگیاں لیے ہوئے ۔ بہت سے ادیب آفاقیت کا پرچار تو کرتے ہیں ۔ لیکن اس کی الف تک بھی نہیں سمجھتے ۔ آفاقیت اور ہمہ گیری وسعتِ تجربہ اور علم و مشاہدہ سے پیدا ہوتی ہے ۔ اس کے لیے پہلے سے حد بندی کرنا کونسی آفاقیت ہے ــ !

ہمارے ہاں اب بھی بہت سے ادیب خود کو پاکستانی کہلوانے سے ہچکچاتے ہیں ۔ شاید اس لیے کہ آفاقیت پر زد پڑ سکتی ہے ۔ لیکن دراصل ان میں اعتماد کی کمی ہے، وسیع النظری کا فقدان ہے ورنہ محبِ عالم تو محبِ وطن ہونے کے بعد ہی ہوا جا سکتا ہے ــ احمد ندیم قاسمی نے جا بجا وطن دوستی کا اظہار ہی نہیں کیا، بلکہ دوسرے ادیبوں کو بھی للکارا ہے ۔ ملک کے سنگین حالات میں ادیبوں کا رویہ قابلِ ذکر ہے ۔ ملک میں درپیش مسائل اور جنگوں کے بعد ندیم کا رویہ اور کردار جس قدر حقیقی، منصفانہ اور وطن پرستانہ رہا ہے شاید ہی کسی ادیب کا ہو ــ انھوں نے برِ صغیر کے ادیبوں کو

جھنجھوڑا ہے، ان کے مُردہ ضمیر کو بیدار کرنے کی انتھک کوششیں کی ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ مجھے ادیب سے زیادہ مصلح قوم نظر آنے لگتے ہیں۔ اس طرح ہم انھیں قومی ادیب بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہر اچھے بُرے وقت میں ہم سب کے ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں، بلکہ راستہ دکھانے کو کبھی کبھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ پھر اس خیال سے کہ زیادہ دور تو نہیں نکل گئے وہ ہماری خاطر لوٹ آتے ہیں۔ غالبًا احمد ندیم قاسمی کا سورج اپنی گرمی سے سب کے پائپ جلانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

کیا اب بھی احمد ندیم قاسمی شریف کہلوانا پسند نہیں کریں گے جب کہ شرافت کی نئی تعریف اور مصنوعی تجدیدان کے انسانی کردار سے ہوجاتی ہے۔

قاسمی صاحب

(صفحہ ۲۳۸ سے آگے)

ناول بھی نہ دوں گی۔ عین ممکن تھا کہ میں ناول سے بھی انکار کردیتی۔ لیکن قاسمی صاحب کے اردگرد روشنی جو پھیلی نظر آئی۔ تو لمحہ بھر میں فیصلہ کرلیا۔ اور بلا تامل ناول دینے کی حامی بھرلی۔ قاسمی صاحب کو تعجب تو ہوا ہوگا۔ کہ افسانے سے انکار اور ناول کے لیے اقرار! لیکن یہ تو راز دروں ہیں۔ قدرت کی باتیں قدرت ہی جانے۔

جب ناول کا اشتہار "فنون" میں آنا شروع ہوا۔ تو کچھ ادبی لوگوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ بعض حضرات اس فکر میں تھے کہ کسی طرح ناول شایع نہ ہو پائے۔ کچھ صاحبان خود کو یوں بہلاتے تھے، کہ محض اشتہار ہی تو آرہا ہے۔ ارے کب ناول مکمل ہوگا۔ اور کب قاسمی صاحب چھاپیں گے؟ ان حضرات کو یہ علم نہ تھا۔ کہ میں اپنا ہر کام قطعیت اور یقین کے ساتھ کرتی ہوں۔ اور قاسمی صاحب بھی بلا وجہ اعلانات اور نعرے بازی نہیں کرتے پھرتے ہیں۔ کچھ حضرات نے حسبِ توفیق قاسمی صاحب سے بدظن کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں جانتی تھی، کہ کتنے طوفان، آندھیاں کیوں نہ آئیں، حالات بد سے بدتر کیوں نہ ہوتے جائیں۔ میرا ناول کتاب نما سے ہی شایع ہوگا۔ مجھے آج بھی اُسی روشنی پہ بھروسہ ہے۔ جو قاسمی صاحب کے اردگرد دیکھی تھی۔ اور میں نے اپنا ناول ایک بڑے شاعر۔ بڑے افسانہ نگار۔ بڑے مدیر اور کالم نویس اور ناشر کو نہیں دیا تھا۔ بلکہ ایک بالکل مختلف شخصیت کو دیا تھا، وہ شخصیت — جسے ہم محض فقیر و درویش کا نام دیتے ہیں۔ اور یہ کیسا عجیب فقیر درویش ہے۔ کہ لوگوں کی بد کلامی سے بھی جدال میں نہیں آتا۔ خود بھی خاموش رہتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی چپ چاپ پتھر کھانے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس درویش کے سوزِ دروں میں صداقت نہیں ہے۔ لیکن اس فقیر کی نگاہوں میں انسانوں کی مخصوص بے بسی و مظلومیت کے بجائے تپش ہوتی، تو آج یہ افسانہ و شاعری سے بھی بلند مقام پہ بیٹھا جگمگاتا —۔

خلیق احمد خلیق

یادگار انٹرویو

نیا پیام کے مدیران کی مجلسِ مشاورت (جس کا ایک رکن میں بھی ہوں) نے ندیم صاحب سے انٹرویو کرنے کی ذمہ داری میرے سپرد کی تو مجھے محسوس ہوا جیسے یہ فیصلہ میری دلی خواہش کے مطابق ہوا ہے۔ یہ ذمہ داری مجھے سونپ بھی دی گئی اور میں نے بڑی خوشی کے ساتھ قبول بھی کر لی۔ لیکن اس کے بعد میں جس ذہنی کشمکش سے دوچار رہا ہوں اس کا اظہار یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے ــــ

میں ندیم صاحب کا بے حد احترام کرتا ہوں ــــ احترام تو میں فیض اور احسان کا بھی بے حد کرتا ہوں۔ لیکن احسان یا فیض سے انٹرویو کرنا ہوتا تو مجھے شدید ذہنی کشمکش سے واسطہ نہ پڑتا، جس سے ندیم صاحب کے بارے میں دوچار ہونا پڑا ہے بات یہ ہے کہ مجھے ندیم کی ذات سے محبت بھی ہے اور عقیدت بھی۔ اور مجھے اس امر کا بھی شدید احساس ہے کہ ندیم صاحب گذشتہ بارہ برس سے میرے ساتھ بڑے لطیف انداز میں ایک خاص اُنسیت اور اپنائیت کا سلوک کرتے آئے ہیں۔

اب ایک طرف میرے سامنے ندیم صاحب کے لیے اپنی محبت و عقیدت تھی، اور دوسری طرف میرے ذہن میں ندیم صاحب کے لیے بڑے ہی جارحانہ، بلکہ بہت حد تک سنگ دلانہ سوالات مچل رہے تھے۔ بس یہاں سے میری ذہنی کشمکش کا آغاز ہوا تھا۔

میرے ذہن میں جو سوالات اُبھر رہے تھے ان میں سے بیشتر تو میرے اپنے خیال کی پیداوار تھے، مگر ایک دو سوال ایسے تھے جو مختلف نجی صحبتوں میں کئی ہم عصر قلم کاروں کی طرف سے اٹھائے جا چکے تھے۔ ان سوالوں میں کچھ اس قسم کے شکوک کا اظہار کیا جاتا تھا ــــ

کہیں اپنے بنیادی نظریات پر سے ندیم صاحب کا اعتماد تو نہیں اُٹھ گیا؟ ــــ

وہ اپنے ذہن میں اپنی نظریاتی شکست قبول تو نہیں کر چکے؟ ــــ

کہیں ایسا تو نہیں کہ ان میں اپنی نظریاتی شکست کا برملا اعتراف کرنے کی اخلاقی جرأت بھی موجود نہیں؟

یہاں یہ واضح کر دیا جائے تو اچھا ہوگا کہ ان شکوک کا اظہار بعض اوقات ندیم صاحب کی ذات سے آگے بڑھ کر پورے فیض، ندیم گروپ کے بارے میں بھی کیا گیا ہے! ــــ

میرے ذہن نے اگرچہ ان شکوک کو، کم از کم ندیم صاحب کے بارے میں، کبھی قبول نہیں کیا، لیکن ان کی تردید بھی میں نے کبھی نہیں کی بلکہ ایک خاص اہمیت کے ساتھ ان پر ہمیشہ غور کرتا رہا ہوں، اور ان کے اسباب سمجھنے کی کوشش بھی جاری رکھی ہے۔ بات یہ ہے کہ میرے ہاں خلوص و عقیدت کبھی "شخصیت پرستی" کی صورت اختیار نہیں کر سکے میں اپنی پسندیدہ شخصیتوں پر کچھ زیادہ ہی تنقیدی نظر رکھنے کا عادی ہوں۔ میں نے ہمیشہ شخصی تعلقات سے بالا ہو کر ندیم صاحب کو ایک شاعر، ایک "ادیب رہنما" اور ایک صحافی کے طور پر جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان کے عوامی کردار کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ کم از کم مجھے ان کا کوئی ایسا شعوری فعل یا قول نظر نہیں آیا جسے ان کی فن کارانہ بددیانتی پر محمول کیا جا سکتا ہو۔ ہاں ان کے بعض اہم اقدامات کو میں نے "غلط اندازوں" اور "غیر شعوری لغزشوں" سے ضرور تعبیر کیا ہے۔!

ممکن ہے کہ بعض ذہنوں کو ندیم صاحب کے غلط اندازوں اور ان کی غیر شعوری لغزشوں سے ایسا دھچکا لگا ہو کہ ان کی ذات کے بارے میں اس طرح شکوک پیدا ہو گئے۔ جن ذہنوں میں ندیم صاحب کے بارے میں یہ شکوک پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے کچھ تو بلاشبہ پورے خلوص، سنجیدگی، اور فن کارانہ دل سوزی کے ساتھ ایسا سوچتے ہیں، اور ایسا سوچتے ہوئے بے پناہ اذیت بھی محسوس کرتے ہیں۔ گویا یہ تمام شکوک ان کی بہترین توقعات کے سراسر خلاف ہیں، اور وہ دل سے ان شکوک کو رفع کرنا چاہتے ہیں۔

ان حالات میں ایک انٹرویو کرنے والے کی حیثیت سے میری دیانت داری کا تقاضا تھا کہ میں پوری بے لحاظی۔ بلکہ "بے مروتی" سے کام لیتے ہوئے ندیم صاحب سے یہ "سنگ دلانہ" سوالات پوچھ "ڈالوں ـــ اگرچہ مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ ندیم صاحب یہ سوال سنتے ہی تڑپ اٹھیں گے، اور انھیں ایسا لگے گا جیسے ان کے سینے پر کسی نے تیروں کی بارش کر دی ہو ـــ! یہ تھی اس انٹرویو کے سلسلے میں میری شدید ذہنی و جذباتی کش مکش۔

بہر حال میں خوش ہوں کہ اس کشمکش کے باوجود اپنا فرض ادا کرنے میں ناکام نہیں رہا۔ البتہ ایک بات کا افسوس ہے ـــ وہ یہ کہ میری پوری کوشش اور ندیم صاحب کے پورے تعاون کے باوجود یہ انٹرویو روبرو نہ ہو سکا۔ ایک طرف تو ان دنوں ندیم صاحب کچھ زیادہ مصروف رہے، اور دوسری طرف پرچے کی کتابت و طباعت کے لیے وقت بہت کم تھا۔ اس لیے "روبرو انٹرویو" کے لیے وقت کا انتظار ممکن نہیں تھا۔ اور میں نے مجبوراً ایک سوال نامہ مرتب کر کے ندیم صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس لیے انٹرویو میں بات سے بات پیدا ہونے والا انداز آپ کو نہیں ملے گا۔ بلکہ ایک دو جگہ ضمنی سوالات بے محل بھی ہوئے ہیں، کیونکہ ان کا دارومدار تو اصل سوال کے جواب پر تھا۔ تاہم ندیم صاحب نے جوابات لکھنے میں کچھ ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ انٹرویو میں ایک برجستگی کی سی کیفیت ضرور پیدا ہو گئی ہے۔

س :- میں آپ سے کئی بہت "ٹیڑھے"، بلکہ کسی حد تک پریشان کن سوالات پوچھنے والا ہوں۔ آپ اپنے آپ کو پوری طرح تیار پاتے ہیں؟

ج :- آپ کے سوالات ٹیڑھے ہوں یا پریشان کن، وہ میرے لیے ٹیڑھے اور پریشان کن نہیں ہو سکتے کیونکہ ادب، فن اور زندگی کے ہر مسئلے کے سلسلے میں میرا ذہن صاف ہے۔ میں آپ کے ہر "ٹیڑھے" سوال کا سیدھا اور صاف جواب دینے کو تیار ہوں۔

س :۔ کیا آپ آدم جی انعام کے حصول کو اپنی زندگی کا کوئی اہم واقعہ تصور کرتے ہیں؟

ج :۔ آدم جی ادبی انعام کا حصول میری زندگی کا ایک واقعہ ضرور ہے کیونکہ یہ میرے ملک کا پہلا ادبی انعام ہے۔ لیکن میں اسے "اہم" واقعہ نہیں کہوں گا۔ اہم واقعہ "دشتِ وفا" کی اشاعت ہے اور بس۔ میری اس کتاب کو انعام نہ بھی ملتا تو جب بھی اس کی اشاعت کی اہمیت اپنی جگہ پر قایم رہتی۔ مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے کہ لاہور سے باہر گورنمنٹ کالج میں ایک مشاعرہ ہونے والا تھا جس میں مجھے بھی مدعو کیا جا رہا تھا۔ مگر کسی اعلیٰ افسر نے شعرا کی فہرست میں سے میرا نام کاٹ دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ واقعہ آدم جی ادبی انعام کے حصول سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

س :۔ کیا آدم جی انعامات کے مقابلے میں "دشتِ وفا" کے علاوہ اور بھی شعری مجموعے شامل تھے؟

الف۔ آپ کی رائے میں "دشتِ وفا" کے مقابلے میں ان دیگر مجموعوں میں سے کوئی اس سال کے آدم جی انعام کا زیادہ مستحق تھا؟

ج :۔ یقیناً ہوں گے مگر مجھے ان کا علم نہ تھا اور نہ ہے۔

الف۔ جب میں نے آپ کے پہلے سوال کا جواب نفی میں دیا ہے تو آپ کے اس ضمنی سوال کا محل ہی نہیں پیدا ہوتا۔ البتہ اس ضمن میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اگر مجھے مقابلے میں شامل ہونے والے دوسرے شعری مجموعوں کا علم بھی ہوتا تو آپ مجھ سے یہ توقع نہیں کر سکتے تھے کہ میں "دشتِ وفا" کو سب کے مقابلے میں افضل ثابت کروں۔ میں نے "استادی" کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ اپنی شاعری کے موضوع اور انداز کے سلسلے میں مجھے جو اعتماد حاصل ہے اس نے مجھے کسی دوسرے شاعر کی فنی قوتوں کی نفی پر کبھی مجبور نہیں کیا۔

س :۔ "اداس نسلیں" پر عبداللہ حسین کو جو آدم جی انعام ملا ہے، آپ کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟

الف۔ کیا کوئی دوسرا نثری مجموعہ انعام کا اس سے زیادہ مستحق تھا؟

ج :۔ افسوس ہے کہ میں "اداس نسلیں" اب تک نہیں پڑھ سکا۔ یہ کتاب میں نے گذشتہ اگست میں خریدی تھی مگر اس کے مطالعے کے لیے موقع نہیں ملا اس لیے کسی قسم کی رائے دینے کا اہل نہیں ہوں۔

الف۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں آپ کے اس ضمنی سوال کے جواب کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

س :۔ کیا اب تک کسی ایسی کتاب کو آدم جی انعام ملا ہے جو آپ کی رائے میں انعام کی مستحق نہ ہو؟

ج :۔ جی ہاں۔ مگر فی الحال مجھ سے تفصیل نہ پوچھیے گا۔ جب آدم جی انعام کی ایک حیثیت معین ہو جائے گی، تب اس موضوع پر لکھوں گا۔

س :۔ کیا آپ کو آدم جی انعامات کے طریقِ کار سے کلی طور پر اتفاق ہے؟

ج :۔ جی نہیں۔ مثلاً میں چاہتا ہوں کہ کتابیں مقابلے میں بھجوانے کا تکلف نہ کیا جائے، بلکہ آدم جی ادبی انعام کا ادارہ سال بھر کی تمام مطبوعات کو از خود جمع کرتا رہے۔ پھر جب منصفین کسی کتاب کو سال کی بہترین کتاب قرار دیں تو ساتھ یہ بھی بتائیں کہ اس کتاب کو انعام کا مستحق کیوں قرار دیا گیا اور دوسری کتابیں اس استحقاق سے کیوں محروم کی گئیں۔

س :۔ کسی کتاب کی انعامی مقابلے میں شمولیت کے لیے ضروری ہے کہ مصنف اس اقرار نامے پر دستخط کرے کہ اگر مجھے انعام کا مستحق قرار دیا گیا تو میں انعام قبول کر لوں گا — کیا اس کے معنی یہ نہیں کہ ادیب اپنی مرضی سے کتاب کو انعامی مقابلے میں شرکت کے لیے بھجوا رہا ہے؟ اور کیا بہت سے لوگوں کی رائے کے مطابق ایسا کرنا ادیب کے منصب کے منافی نہیں؟

ج :۔ آپ نے نہایت معقول سوال پوچھا ہے۔ میری خواہش ہے کہ مصنف پر اس قسم کی کوئی شرط نہ لگائی جائے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہونا چاہیے کہ جب تک انعام کے قواعد میں سے یہ شق خارج نہیں کی جاتی، اس انعام کو ایسے مصنفین کے سپرد کر دیا جائے جن کی تخلیقات کا فن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ جب اچھے لکھنے والے اپنے "منصب کے تحفظ" میں لگ جائیں گے تو ہمارے ملک کا یہ پہلا ادبی انعام غیر مستحق لوگوں میں بٹنے لگے گا۔ ایک مثال سے میرے اس نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جائے گی۔ پاکستان کے وہ لوگ جو بالغ حق رائے دہی کے حامی ہیں۔ مروجہ بالواسطہ انتخابات میں ضرور حصہ لیں گے کیونکہ اگر وہ حصہ نہیں لیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انھوں نے اسمبلیاں اپنے نقطۂ نظر کے مخالفین کے سپرد کر دیں اور ظاہر ہے کہ یہ مثبت طریق کار نہیں ہے۔

س :۔ کیا بحیثیت شاعر آج کل آپ کسی نازک یا پریشان کن مسئلے سے دوچار ہیں؟

ج :۔ جی ہاں۔ متعدد مسائل سے دوچار ہوں۔ مگر میں نے شکست اب تک قبول نہیں کی۔ حسب توفیق سب سے نمٹ لیتا ہوں۔ کم از کم میرا اپنا ضمیر مطمئن ہے کہ میں اپنے دل و دماغ کو فریب نہیں دیتا۔ یہ الگ بات ہے کہ جو بات کھل کر کہی جانی چاہیے اسے بعض حالات میں دب کر کہنا پڑتا ہے۔ یوں ذہن پر ایک بوجھ ضرور آ گرتا ہے۔ مگر کسی نہ کسی ڈھب سے اپنی بات کہہ دینے کا اطمینان زیادہ مدت تک اداس نہیں رہنے دیتا۔ ان مسائل کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ذاتی اور اجتماعی۔ مثلاً بحیثیت شاعر میرا ایک ذاتی مسئلہ یہ ہے کہ اپنی عمر کے اڑتالیسویں سال میں بھی حسن میرے احساسات و جذبات میں وہی قیامت برپا کر دیتا ہے جس کا تجربہ آج سے اٹھائیس تیس سال پہلے ہوا تھا۔ اس صورت میں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ذاتی حیثیت سے ابھی تک وہیں کھڑا ہوں، جہاں اس وقت کھڑا تھا جب میری مسیں بھیگ رہی تھیں۔ کہنے میں کہتی ہیں کہ شاعر اگر ذہنی طور سے ہمیشہ جوان رہے تو اس کا فن بھی ہمیشہ جوان رہتا ہے مگر عمر اور احساس کا تفاوت کہتا ہے کہ کہیں میرا نظریۂ حسن جامد ہو کر تو نہیں رہ گیا ہے! میں جانتا ہوں، مجھے اس گومگو کی کیفیت سے جلد چھٹکارا پا لینا چاہیے مگر مشکل یہ ہے کہ میں واعظ کبھی نہیں بن سکوں گا۔ واعظ بنوں گا تو شاعر نہیں رہوں گا، اور شاعر نہیں رہوں گا تو مر جاؤں گا — اجتماعی مسئلے کی ایک مثال یہ ہے کہ آزادیٔ تحریر کو میں انسانی آزادی کا عنوان قرار دیتا ہوں۔ میری شاعری میں آپ کو میرے اس نقطۂ نظر کی متعدد مثالیں ملیں گی۔

ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں
جو بات ذہن میں آئی زباں سے کہہ دیں گے
ندیم جن کے مقدر بندھے ہیں دار کے ساتھ
اک بھڑکتے ہوئے شعلے پہ ٹپک جائے اگر

بوند بھی بولتی ہے

مگر آج کا مروجہ قانون ایسا ذکی الحس ہو گیا ہے کہ شعر کہنے بیٹھیے تو خیال کو لبادے پہنانے پڑتے ہیں۔ میں الفاظ کو غلافوں میں لپیٹنے کا عادی نہیں ہوں۔ اس لیے ایک ایک شعر پر سو سو بار محسوس ہوتا ہے کہ میری روح تبض ہو رہی ہے۔

س :۔ کیا آپ نے اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کو کبھی ایک دوسرے کے لیے نقصان دہ یا ایک دوسرے کی راہ میں رکاوٹ محسوس کیا ہے؟

ج :۔ قطعی نہیں۔ بلکہ میری شاعری کو افسانہ نگاری نے اور میری افسانہ نگاری کو شاعری نے نکھارا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ میں صرف شاعر اور افسانہ نگار ہی کیوں ہوں۔ ساتھ ہی مصور اور مغنی اور مجسمہ ساز کیوں نہیں ہوں۔ میرے اندر تو تخلیقِ فن کا لاوا اُبل رہا ہے۔

س :۔ اگر آپ افسانہ نگار نہ ہوتے۔ میرا مطلب ہے کہ تخلیقی ادب میں صرف شعر کو ذریعہ اظہار بناتے تو کیا آپ کی شعری تخلیقات کا مرتبہ اور زیادہ بلند نہ ہوتا؟

ج :۔ جی نہیں۔ بلکہ اس صورت میں ممکن ہے کہ میں قطعی "رسمی" قسم کا شاعر ہوتا جو عمر بھر شعر کہتے ہیں۔ مشاعروں اور محفلوں میں بے شمار داد وصول کرتے ہیں اور جب مرتے ہیں تو اپنی شاعری کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ صورتِ حال ہر شاعر کے ساتھ ہو۔ میری اپنی منفرد افتادِ طبع ہے جو مجھے ایسا سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ میری غزل کا ایک شعر ہے جو اس موضوع سے براہِ راست تو متعلق نہیں۔ مگر میں نے اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کے جو رشتے آپ پر واضح کرنے کی کوشش کی ہے ان کی ایک جھلک اس شعر میں نظر آ جائے گی۔ شعر یہ ہے

ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمھاری یادیں
ہم کوئی تم تھے کہ وابستۂ غم ہو جاتے

س :۔ جب براہِ راست آپ کی ذات کو کسی "حریف قوت" کی طرف سے کوئی زک پہنچتی ہے تو کیا اس وقت یا ان دنوں آپ کی تخلیقی قوتیں سب سے زیادہ بیدار ہوتی ہیں؟

ج :۔ جی نہیں۔ میں ہر تجربے کو اپنے ذہن میں کھپائے اور اپنے خون میں دوڑائے بغیر اس تجربے کا شعری اظہار نہیں کر سکتا۔ میں فن کے معاملے میں جلد باز نہیں ہوں۔

س :۔ کیا آپ اپنے فنی نظریات پر فراخ دلی سے نظرِ ثانی کرتے رہتے ہیں؟

ج :۔ جی ہاں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نظریۂ فن جامد نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ اس نظریے کو اپنی بنیادوں پر ضرور قدم رہنا چاہیے مثلاً "جلال و جمال" سے "دشتِ وفا" تک چلے آیئے۔ آپ کو میرے نظریۂ فن کی ایک ہی بنیاد نظر آئے گی اور وہ انسان دوستی، انسان کا احترام اور انسان کا وقار اور اس کی عظمت ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس بنیاد کو اکھیڑنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ البتہ انسان کی عظمت کو عملی صورت میں کارفرما دیکھنے کے لیے میں ہر اس جھری میں سے جھانکا ہوں جس میں سے روشنی چھن رہی ہو۔ ورنہ کسی بھی چمکتی ہوئی جھری کے قریب سے محض اس لیے آنکھ بچا کر نہیں نکل جاؤں گا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ میری رائے میں نظریے کی استواری کا مفہوم ہی یہی ہے۔ صرف ایک

رجعری سے چمٹے کررہ جانا تلاش و جستجو نہیں ہے، محض ضداور بے معنی وضع داری ہے۔ اسی لیے تو میں کسی بھی جامد نظریے سے متفق نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اجتہاد کے بغیر ارتقا ناممکن ہے۔

س :۔ کیا کبھی آپ نے اپنے نظریات کو شکست وریخت کے کسی بڑے خطرے سے دوچار پایا ہے۔ پھر یہ خطرہ کیسے ٹلا؟

ج :۔ میں نے اپنے نظریات کو شکست وریخت کے کسی بڑے خطرے سے کبھی دوچار نہیں پایا۔ اس ضمن میں مجھے بڑی خود اعتمادی حاصل ہے۔ شکست وریخت کا خطرہ صرف ان فن کاروں کو پیش آسکتا ہے جنھیں اپنے نظریے یا اپنے فن کے بارے میں اعتماد حاصل نہ ہو۔

س :۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پندرہ بیس سال قبل آپ جو نظریات لے کر ادب کے میدان میں اُترے تھے، اب اُن نظریات کی افادیت پر سے آپ کا ایمان بھی اُٹھ چکا ہے، اور آپ اپنے دل میں اپنی نظریاتی شکست بھی تسلیم کر چکے ہیں ـــــ لیکن آپ میں ان تلخ حقائق کے واشگاف اعتراف کی اخلاقی یا فن کارانہ جرأت نہیں ـــــ؟

ج :۔ جن "بعض" لوگوں کا یہ خیال ہے، ان کے سامنے میں یہ عرض کرنے کو تیار ہوں کہ میں نے جن نظریاتِ فن کی خاطر حسبِ توفیق قربانیاں دی ہیں اور اب تک دے رہا ہوں۔ وہ میرا محض نظریہ نہیں ہیں، میرا ایمان بھی ہیں۔ میں یہ دعوے کرنے کو بھی تیار ہوں کہ میں پاکستان کا واحد شاعر ہوں، جس نے کسی بھی مصلحت سے کبھی شکست نہیں مانی۔ میں تو اس بات پر بھی حیران ہوں کہ آپ کو ایک ایسے شاعر سے یہ سوال پوچھنے کا خیال کیسے آیا، جس سے یہ سوال پاکستان کے تمام شاعروں سے جواب حاصل کرنے کے بعد بھی نہیں پوچھا جا سکتا۔ اسے لاف زنی یا بڑبولا پن قرار نہ دیجیے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے اپنے نظریے اور اپنے فن کو شکست اور ریاکاری سے کبھی آلودہ نہیں ہونے دیا۔ اور پھر آپ یا "بعض لوگ"، مجھ میں "اخلاقی یا فن کارانہ جرأت" کی کمی دیکھتے ہیں جب کہ مجھے اپنی اخلاقی اور فن کارانہ جرأت پر آج پہلے سے بھی زیادہ ناز ہے۔ آپ کے اس سوال کے مستحق بے شمار دوسرے شاعر ہوں گے، مگر میں تو ایک فی صد بھی مستحق نہیں ہوں۔

س :۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پروان چڑھنے والے شاعروں کی جدید تر نسل پچھلے کئی برس سے اُس شاعری کی طرف متوجہ رہی ہے جسے میں "کسی ہسٹریا کی مریضہ کے بطن سے پیدا ہونے والے بدشکل، آپاہج، غبی اور بے ستوانے بچے" سے تشبیہ دوں گا ـــــ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا "دشتِ وفا" کو انعام ملنے سے شاعروں کی یہ جدید تر نسل اس صحت مند شعری روایت میں ایک بار پھر دلچسپی لینا شروع کردے گی جو "خیال، جمال اور جلال" تینوں عناصر کا مرکب ہے ـــــ اور "دشتِ وفا" جس کی نمائندگی کرتی ہے ـــــ

ج :۔ میرے خیال میں محض "دشتِ وفا" کی انعام یافتگی سے اتنا بڑا انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔ "دشتِ وفا" کو ۱۹۶۳ء کا بہترین شعری مجموعہ قرار دینے کا واقعہ، اتنا بڑا واقعہ نہیں ہے کہ وہ ایک اُبھرتی ہوئی روایت کے سامنے بند باندھ دے۔ میں جدید تر شاعروں سے مایوس نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ چند ہی برس بعد وہ اردو شاعری کی روایت سے اپنا رشتہ جوڑلیں گے۔ یہ ان کی مشق کا زمانہ ہے اور سونا کوٹنے کے لیے پہلے دبا کوٹنا ہی پڑتا ہے۔

س :۔ اب میرا ذہن ادبی سیاسیات سے ہٹ کر کچھ اور سوچنے لگا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ خدا جانے آپ اُس خوفناک تجربے سے اب تک کتنی بار گزرے ہوں گے جسے "عشق" کہا جاتا ہے۔

ج :۔ میں "عشق" کو "خوفناک تجربہ" کہنے پر احتجاج کرتا ہوں۔ اس جذبے کی شدت کو واضح کرنے کے لیے ہماری زبان میں اور بھی بہت سے الفاظ موجود ہیں۔ رہا آپ کا یہ سوال کہ میں اس تجربے سے کتنی بار گزرا ہوں، تو عرض یہ ہے کہ متعدد بار گزرا ہوں۔ آپ جانتے ہیں ہر انسان کی زندگی میں ایسا وقت ضرور آتا ہے جب اسے ہر خوبصورت چیز پر ٹوٹ کر پیار آنے لگتا ہے (اور خوبصورتی کا اپنا اپنا معیار ہوتا ہے) اور یہ تجربے عشق کی "ریہرسل" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھ پر بھی یہ وقت آیا مگر پھر میں عشق کے ایک عظیم تجربے سے گزرا اور اس کے بعد میرے ذہن کی وہی کیفیت ہو گئی جو اب تک قایم ہے اور جس نے مجھ سے اس قسم کے شعر کہلوائے ہیں :

بچھ کو چاہا تو تجھی کو چاہا
اِک یہ قصہ نہ ہوا طولانی

جب بھی اُٹھی کوئی چلمن، مجھے محسوس ہوا
میری آنکھوں پہ ہیں بکھرے ہوئے تیرے گیسو

اک جست کا فاصلہ ہے شہ رگ تک
لیکن ترا پیار درمیاں ہے

س :۔ کیا اس تصور سے کہ جیسے ایک بار پھر آپ عشق کے تجربے سے گزرنے والے ہیں، آپ لرز نہیں جاتے؟

ج :۔ جی نہیں ـــــ جب میں سمجھتا ہوں کہ عشق انسان کو اچھا انسان بناتا ہے تو میں لرزوں کیوں؟

س :۔ کیا عشق کا تجربہ کسی شخص کو بھرپور شعری تجربے کے قابل بنانے میں بہت اہم رول ادا کرتا ہے؟

ج :۔ یقیناً ـــــ میں نے اس مسئلے پر خاص طور سے غور کیا ہے کہ جن شاعروں کی شاعری، خشک، بے رنگ اور بے اثر ہوتی ہے وہ دراصل عشق کے حیات بخش اور حسن افروز تجربے سے محروم ہوتے ہیں۔ مشرق و مغرب کے کسی بھی ایسے شاعر کو لے لیجیے جس نے محض فلسفیانہ نظریات کو موزوں قرار دیا ہے یا جنھوں نے عشق کو اپنا موضوعِ شعر بنایا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے بڑھئی تصویر بنا رہا ہے۔ ایسے شاعروں کے سوانح کو غور سے پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ عشق سے بدکتے رہے اور اگر کیا بھی تو یوں جیسے سودا کر رہے ہیں۔ پھر عشق کا عظیم تجربہ شاعر کو محض عشقیہ موضوع میں رواں نہیں کر دیتا، بلکہ عشق زندگی کی ہر حقیقت میں ـــــ ایک نرمی، ایک گداز، ایک حسن اور توازن پیدا کر دیتا ہے۔ اور یاد رکھیے کہ میں جب "عشق" کہتا ہوں تو اس سے میں کسی فلسفیانہ یا متصوفانہ اصطلاح کی طرف اشارا نہیں کرتا۔ اس عشق سے میرا مطلب مرد کا عورت کے ساتھ اور عورت کا مرد کے ساتھ عشق ہے۔

س :۔ کیا اپنے تجرباتِ عشق کے دوران افتا کے تصور سے آپ کو کبھی "ندامت" یعنی GUILT کے احساس نے ستایا؟ ـــــ

ج :۔ جی ہاں ـــ مگر یہ ندامت اپنی ذات سے نہیں تھی۔ اپنے معاشرے اور اس کی مقرر کی ہوئی اخلاقی بندروں سے

(باقی صفحہ ۲۷۴ پر)

انور محمود خالد

ندیم سے ایک ملاقات

۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء[1] بعد از دوپہر، پنجاب یونیورسٹی کے سینیٹ ہال میں مولانا عبدالمجید سالک کی برسی منائی جا رہی تھی۔ فیض، احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، صوفی تبسم، امتیاز علی تاج اور وقار عظیم نے سالک مرحوم کی یاد میں مقالے پڑھے مجھے چونکہ آگے جگہ مل گئی تھی اس لیے ندیم صاحب کو پہلی مرتبہ قریب سے دیکھا۔ اُنھوں نے اپنی مخصوص دھیمی آواز میں سالک صاحب کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

میٹنگ ختم ہونے پر ندیم صاحب اپنے چند دوستوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے ہال سے باہر نکلے۔ لاہور شام کے دھندلکے میں ملفوف ہو رہا تھا۔ فیض صاحب اور دوسرے ادیب تو کاروں میں بیٹھ کر چلے گئے اور حضرتِ ندیم نسبت روڈ جانے کے لیے "تانگہ" ڈھونڈنے لگے۔ تھوڑی دور جا کر جب وہ ایک تانگے والے سے بھاؤ تاؤ کرنے لگے تو میں نے موقع غنیمت جانا اور اُنھیں سلام کرنے کے بعد پوچھا، اگر ان سے ملنا ہو تو کب آؤں؟ فرمانے لگے "آج کل بیکار ہی ہوں اور سارا دن گھر پر رہتا ہوں۔ آپ کسی وقت بھی تشریف لا سکتے ہیں"۔ میں نے دیر کرنی مناسب نہ سمجھی اور اگلے دن کے لیے ملاقات کا وقت مقرر کر لیا۔

دوسرے دن کالج سے فارغ ہو کر کوئی چار بجے کے قریب میں اور میرا ایک دوست (عبدالمجید۔ ایم۔ ایس۔ سی)، نسبت روڈ پر ندیم صاحب کا مکان تلاش کرنے لگے۔ دیال سنگھ لائبریری کے عقب میں ان کا گھر تھا۔ جو آسانی سے ہمیں مل گیا۔ لیٹر بکس پر اُن کا نام دھندلے دھندلے حروف میں بس اُڑ جانے کو تیار تھا۔ ہم نے برقی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کھٹ سے بالکونی پر ایک ننھی منی بچی نمودار ہوئی۔ ہم نے اُس سے قاسمی صاحب کے بارے میں پوچھا — جواب ملا۔ "گھر پر ہیں۔ کہیے کیا کام ہے؟" میں نے کہا — "انھیں بتائیں کہ دو طالبِ علم آپ سے ملنے آئے ہیں"۔ وہ "اچھا" کہہ کر غائب ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سیڑھیوں پر نمودار ہوئی۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا، ہمیں اندر بلایا اور یہ کہہ کر کہ "آپ تشریف رکھیں، وہ ابھی

---

[1] انور محمود خالد جن دنوں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے طالب علم تھے۔ یہ انٹرویو اسی زمانے کی یادگار ہے — (مرتب)

آتے ہی ٹ پھر واپس چلی گئی۔

ہم صوفوں پر دھڑکتے ہوئے دل لیے بیٹھ گئے۔ ڈرائنگ روم بڑا خوبصورت تھا۔ فرش پر ایک بیش قیمت قالین بچھا تھا۔ صوفہ سیٹ بھی خاصا نفیس تھا۔ مینٹل پیس پر چند ایک تصویریں اور روغنی مٹی کے خوش نما کھلونے سجے ہوئے تھے۔ سامنے دیوار پر ندیم صاحب کی ایک قلمی تصویر ٹنگی تھی، جس میں ایک قدیم وضع کی عینک پہنے بیٹھے نظر آرہے تھے۔ البتہ میز پر اُن کی ایک اچھی تصویر موجود تھی۔ دیواروں پر ایک مصوّر کے ہاتھ کی بنی ہوئی کئی تصویریں آویزاں تھیں۔ پورے کمرے سے نفاست اور خوش سلیقگی کا اظہار ہوتا تھا۔

اتنے میں قاسمی صاحب اندر داخل ہوئے۔ ہم تعظیماً کھڑے ہوگئے، ہاتھ ملائے اور بیٹھ گئے۔ وہ ہمارے سامنے ایک صوفے پر آہستگی سے تشریف فرما ہوگئے۔ میں آغازِ گفتگو کے لیے الفاظ جمع کرنے لگا۔

سب سے پہلے وہی ٹیپ کا مصرع دہرایا گیا۔

"آپ سے ملنے کی ایک مدت سے آرزو تھی"

انھوں نے منکسرالمزاجی سے اس کا جواب دیا اور حسبِ عادت پوچھا "آپ آج کل کیا کررہے ہیں؟" میں نے بی۔ایڈ میں داخلہ لینے کا ذکر کیا۔ وہ کچھ دیر تک بی ایڈ اور بی۔ٹی کے لفظی فرق کے چکر میں پڑے رہے، اور ہوسٹل کی پابندیوں کا تکلیف دہ تذکرہ سُن کر مسکراتے رہے۔ اس کے بعد ہم سوال کرتے گئے اور وہ جواب دیتے گئے۔

میں نے پوچھا۔ "نسیم حجازی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

مسکرائے۔ بولے۔ "کچھ عرصہ پہلے اُن کا ایک ناول پڑھنا شروع کیا۔ لیکن وقت ضایع ہوتے دیکھ کر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد اُن کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔"

میں نے منٹو کے بارے میں سوال کیا اور اُس کے نمایندہ افسانوں۔ "ہتک"، "نیا قانون"، "بابو گوپی ناتھ" اور قابلِ اعتراض افسانوں۔ "بو"، "دھواں"، "کالی شلوار"، "کھول دو" اور "ٹھنڈا گوشت" کے بارے میں اُن کی رائے طلب کی۔

منٹو کے بارے میں گویا ہوئے۔ "ہم دونوں بڑے اچھے دوست تھے۔ لیکن منٹو میں ضد اور انانیت کا غلبہ تھا۔ ایک دفعہ وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے "ندیم! میرے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔ فوراً ایک کاغذ پر لکھ کر مجھے دے دو" میں نے کہا۔ "صاحب! اس وقت تو نہیں لکھ سکتا۔ ہاں پھر کبھی لے لیجیے گا"۔ بولے "نہیں۔ اسی وقت"۔ میں نے جان بچانے کے لیے کہا "اچھا۔ پھر شام تک سہی"۔ وہ مان گئے۔ میں طبعاً بڑا محتاط انسان ہوں۔ بالخصوص منٹو جیسے دوستوں کے بارے میں پھونک پھونک کر قدم اُٹھانا پڑتا ہے۔ کیونکہ اگر تنقید کی جائے تو بھڑک اُٹھتے ہیں، اور اگر تعریف کی جائے تو لوگ سند بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے مناسب الفاظ میں ان کے متعلق چند جملے لکھ کر انھیں دے دیئے۔ انھوں نے اسی طرح کی آرا اپنے دوسرے ادیب دوستوں سے بھی طلب کیں اور انھیں اکٹھا کر اپنے مجموعے "چشمِ روزن" میں شامل کیا۔ یہ بحث بڑی دلچسپ تھی اور پڑھنے کے قابل ہے۔

پھر بولے منٹو کے بعض افسانوں پر مجھے اعتراض تھا اور ہے۔ اُن کے افسانے "نیا قانون" کا جواب نہیں۔

میں نے ایک بار منٹو سے کہا۔ "اگر حکومت تمھارے اس افسانے پر (جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ پر طنزاً لکھا گیا تھا) مقدمہ چلاتی تو مجھے یقین ہے کہ تم اِس جیسے کئی اور بھی شان دار افسانے لکھتے۔ لیکن چونکہ گورنمنٹ نے تمھارے جنسی افسانوں پر مقدمے چلائے، لہٰذا چڑ کر تم نے باقی افسانے اسی نوع کے لکھے اور بعد میں تو اُنھوں نے اِسے اپنی مخصوص روش بنا لیا تھا۔ "ہتک"، "بابو گوپی ناتھ" اور "موذیل" وغیرہ اُس کے بڑے اچھے افسانے ہیں۔ اور پھر اُنھوں نے تو بے شمار افسانے لکھے ہیں۔ کہاں کہاں یاد رہیں۔ البتہ "بو" اور "دھواں" جیسے افسانوں کو میں بھی فحش سمجھتا ہوں۔ گو عدالت میں منٹو صاحب مجھ سے زبردستی اپنے حق میں بیان دلوا لیتے تھے اور اس طرح بچ نکلتے تھے۔ بہرحال وہ اُردو کے ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں۔"

کرشن چندر کے بارے میں بولے۔ "لکھتا تو وہ بھی اچھا ہے مگر اس میں ایک نقص یہ ہے کہ لکھتے لکھتے بجائے کرداروں کے خود اپنی طرف سے فقرے لکھنے شروع کر دیتا ہے جو کہانی سے زاید معلوم ہوتے ہیں۔ یہ طریق میرے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ البتہ اُس نے ہیئت کے بعض اچھے تجربے کیے ہیں مثلاً "ان داتا" وغیرہ میں۔"

میرے دوست نے پوچھا۔ "آپ صرف دیہات کے بارے میں ہی کیوں لکھتے ہیں؟" ندیم صاحب نے جواب دیا۔ "فن کار کو ادب میں صرف وہی چیز پیش کرنی چاہیے جس سے وہ بخوبی واقف ہو، وگرنہ اگر وہ ایسی چیزوں کے بارے میں لکھے گا جن کا اُسے علم ہی نہیں یا جو اُس کے مشاہدے میں نہیں آئیں تو بعد میں اُسے بری طرح پچھتانا پڑے گا۔ جیسے ایک بار اوپندر ناتھ اشک کے ساتھ ہوا۔ ایک دفعہ میں نے اُس کا ایک افسانہ پڑھا جس میں کسی ریگستان کا ذکر تھا۔ ایک جگہ اُس نے لکھا۔ "دور اُفق کے پاس ایک صنوبر کا درخت نظر آیا۔" جب میں اُس سے ملا تو پوچھا ——— "یار، تم نے کبھی صنوبر کا درخت خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا ہے؟" ہنس کر بولا۔ "نہیں۔ بس یوں ہی تصویروں میں دیکھا تھا۔ بچشمِ خود نہیں۔" اس پر میں نے اُسے بتایا کہ صنوبر ریگستانوں میں نہیں، پہاڑوں پر ہوتا ہے، البتہ تم کیکر یا ببول کا ذکر وہاں کر سکتے تھے۔"

اب چونکہ قاسمی صاحب کا ذکر شروع ہو گیا تھا، اس لیے ساری گفتگو کا رُخ اُسی طرف مڑ گیا۔ میرے چند سوالوں کے جواب میں اُنھوں نے بتایا کہ اپنے افسانوی مجموعوں میں وہ "سناٹا" کو اپنا بہترین مجموعہ سمجھتے ہیں۔ "جلال و جمال" کی نظموں میں ہم تبدیلی قطع و برید اور حک و اضافہ کے بعد وہ اسے دوبارہ شایع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اُن کے خیال میں "جلال و جمال" کی بیشتر نظمیں ابتدائی نوعیت کی تھیں۔ اس لیے وہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اپنا نیا مجموعہ کلام بھی وہ خود شائع کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ جو جلد ہی مارکیٹ میں آجائے گا۔ (اب یہ مجموعہ "دشتِ وفا" کے نام سے چھپ چکا ہے۔)

میں نے اُن کے افسانوں میں ارتقا اور یک بیک ایک نئی تبدیلی پر اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کیا۔ اور ثبوت کے طور پر "گھر سے گھر تک" اور "ہذا من فضلِ ربی" کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے میری رائے کی تائید کرتے ہوئے فرمایا۔ "کوئی بھی فن کار اپنے گرد و پیش سے نظر چرا کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے درمیانے اور اونچے طبقے کی کھوکھلی زندگی اور اس کی ظاہری چمک دمک کے تضاد کو بڑی طرح محسوس کیا اور انھیں اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ اب "نقوش" کے افسانہ نمبر میں میرا ایک نیا افسانہ "بھرم" آ رہا ہے جس میں قدرے کھل کر میں نے اونچے طبقے کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ اسی نمبر میں کرشن چندر کی ایک کہانی "تائی اسیری" بھی آ رہی ہے، جس کے متعلق کرشن چندر نے مجھے لکھا ہے کہ تمھیں پسند آئے گی۔ سو ظاہر ہے کہ اچھی ہی ہوگی۔"

اب گفتگو افسانوں سے شاعری کی طرف مڑ گئی۔ فرمانے لگے۔ اس عرصے میں میری شاعری میں بھی کافی تبدیلی آئی ہے۔ "رم جھم" اور "جلال و جمال" کی رومانی نظموں اور قطعات کے بعد اب میں حقیقت پسندی کے قریب ہوتا جا رہا ہوں، اور فکری پہلوؤں کو نظموں میں سمونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن اس طرح نہیں کہ وہ لوگوں کے لیے مبہم ہو کر رہ جائیں۔ میرے خیال میں پُرانے شعرا میں غالب کے زندہ رہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اُس کی شعری تخلیقات میں فکر کے جواہر ریزے اتنے ہیں کہ ہر زمانے میں آنکھوں کو خیرہ کرتے اور دل و دماغ کو لبھاتے رہے ہیں اور لبھاتے رہیں گے۔"

اختر شیرانی کے بارے میں انھوں نے مختصراً بتایا: "اُن کی عظمت اس بات میں پنہاں ہے کہ جب اقبال "شمع و شاعر" "طلوعِ اسلام" اور "خضرِ راہ" جیسی نظمیں تخلیق کر رہے تھے اور شعراء کا ایک لشکرِ جرار اُس زمانے میں اُن کی بھونڈی نقل کرنے میں مصروف تھا۔ تو اختر شیرانی نے اپنی شاعری کا چراغ الگ جلایا اور عربی دور کی شاعری کو زندہ کر دیا۔ ان کے مجموعوں میں عربی شاعری کا بڑا دل آویز عکس ملتا ہے۔ مگر میرے نقطۂ نظر سے وہ اتنے اہم شاعر نہیں ہیں۔ گو کئی ایک پہلوؤں سے اُنھیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اُردو شاعری کو بعض بڑی خوبصورت نظمیں دی ہیں۔ مگر بعض نظموں میں غیر ضروری طوالت سے کام لیا ہے۔ جس بات کے اظہار کے لیے اُنھوں نے صفحات کے صفحات ضائع کیے ہیں، اُنھیں تین چار بندوں میں بڑے حسین پیرائے میں بیان کیا جا سکتا تھا۔"

فیض احمد فیض کے بارے میں اُنھوں نے بتایا: "وہ بڑا پیارا شاعر ہے۔ اُس کی ہر تخلیق نازک خیالی، بلاغت، اور گہرائی و گیرائی کا دل آویز نمونہ ہے۔"

عزیز احمد کے بارے میں جواب دیا: "وہ اپنے قلم پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں چھوڑ دینا بہتر ہوتا ہے۔ لیکن عزیز احمد اپنی لیاقت سے مجبور ہو کر انھیں لکھ جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ بے ضرورت ہوتی ہیں۔ "ایسی بلندی ایسی پستی" میرے نزدیک اُردو کا بہترین ناول نہیں ہے۔ البتہ "شکست" (کرشن چندر) اور "گئودان" (پریم چند) کو میں اُردو کے بہت اچھے ناولوں میں شمار کرتا ہوں۔"

عصمت چغتائی کے بارے میں اُنھوں نے کہا کہ "وہ پورا افسانہ بڑے اچھے طریق سے لکھتی ہے آخیر میں غیر ضروری طور پر بات بڑھا دیتی ہے۔"

میرے اس سوال کے جواب میں کہ وہ خود افسانہ کیسے لکھتے ہیں؟ کہنے لگے "افسانہ ایک بے حد مکمل، پرکار، اور مشکل فن ہے۔ بسا اوقات ایک ایک افسانے پر مجھے مہینوں لگ جاتے ہیں۔ جب کبھی میرا ذہن نئے موضوعات سے دوچار ہوتا ہے تو وہ اُن میں سے بہتر اور زیادہ کار آمد موضوع کا انتخاب کر کے اُس پر سوچ بچار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ رات کے وقت بلب کی روشنی گل ہونے کے بعد میں اپنی چارپائی پر لیٹا اپنے کرداروں کے ساتھ ہو لیتا ہوں۔ میں ان کے ساتھ چلنے پھرنے اور اُٹھنے بیٹھنے لگتا ہوں، میں اُن کے ہنسنے رونے میں شریک ہو جاتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ اب فلاں کردار کے منہ سے یہ فقرہ نکلے گا اور اس کے جواب میں فلاں کردار یہ جملہ بولے گا۔ پھر خیال آتا ہے۔ نہیں۔ یہ کچھ جچا نہیں۔ اس طرح ہونا چاہیے —— ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اب اس موقع پر یہ کردار اُٹھ کر چل دے گا اور فلاں فلاں کردار آپس میں اس طرح گفتگو کریں گے۔ چنانچہ جب افسانہ ہر لحاظ سے میرے ذہن میں مکمل ہو چلتا ہے اور اُس کی گرفت اور واقعات کی ترتیب پوری طرح

مجھ پر قبضہ جما لیتی ہے۔ تو پھر کسی فرصت کے وقت میں لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ کبھی پورا لکھ کر اُٹھ جاتا ہوں (جسے خوش قسمت دن سمجھیے) اور کبھی نصف یا ایک چوتھائی حصّہ لکھ کر چھوڑ دیتا ہوں۔ ہفتے عشرے کے بعد جب دوبارہ لکھنے کا "دورہ" پڑتا ہے تو اسے نئے سرے سے پڑھ کر لکھنا شروع کرتا ہوں اور پھر آہستہ آہستہ افسانہ تکمیل کے مراحل طے کرنے لگتا ہے۔ مکمل کرنے کے بعد میں افسانے پر نظرِ ثانی کرتا ہوں بعض اوقات نظرِ ثانی سے افسانہ کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ یعنی اتنی تبدیلیاں کرتا ہوں کہ افسانے کا حلیہ ہی بدل جاتا ہے۔ پھر اپنے کسی عزیز سے اس کی متعدد نقلیں کرا لیتا ہوں اور رسالے کو بھیج دیتا ہوں"

میں نے پوچھا "آپ نے آج تک کوئی ناول کیوں نہیں لکھا؟"

"یہاں تو افسانہ ہی اتنا وقت لے لیتا ہے، پھر ناول، جس کے لیے بے پناہ وقت کی ضرورت ہوتی ہے، لکھنے کے لیے وقت کہاں سے لاؤں۔ یہی غنیمت سمجھتا ہوں کہ کم از کم افسانہ ہی لکھ لیتا ہوں"

میرے ساتھی نے سوال کیا "آج کل آپ کیا کچھ پڑھ رہے ہیں؟"

جواب دیا "الطاف فاطمہ کا ناول "نشانِ محفل" زیرِ مطالعہ ہے۔ وہ نئی ہونے کے باوجود اچھا لکھتی ہے۔ یہ ناول اردو کے چند اچھے ناولوں میں شمار کیا جائے گا"

گفتگو ابھی اس مرحلے پر تھی کہ کوئی صاحب قاسمی صاحب سے ملنے کے لیے آئے اور اُن کی گفتگو طوالت کا رنگ پکڑنے لگی۔ ہم نے ندیم صاحب سے اجازت چاہی اور باہر نکل آئے۔

تنگ سی گلی میں رات کے سائے رینگ رہے تھے اور لسبت روڈ پہ روشنیاں جل اُٹھی تھیں۔

یادگار انٹرویو

(صفحہ ۲۷ سے آگے)

تھی۔ عشق کے معاملے میں GUILT کے احساس نے مجھے کبھی نہیں ستایا کیونکہ میں عشق کو GUILT کی بجائے عبادت سمجھتا ہوں۔ البتہ یہ احساس ضرور تھا کہ میری اس عبادت، اس نیکی، اپنی شخصیت کو نکھارنے کے اس عمل کو معاشرہ GUILT قرار دے ڈالے گا۔ اس عالم میں کئی شعر ہوئے جن میں سے ایک اس وقت یاد آ رہا ہے ؎

میرے اشعار میں یوں دفن ہیں اسرار ترے
پردۂ ساز میں آواز ہو پنہاں جیسے

(بشکریہ پندرہ روزہ "نیا پیام" لاہور۔ یکم مارچ ۱۹۶۴ء)

ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمھاری یادیں
ہم کوئی تم تھے کہ وابستۂ غم ہو جاتے

جمیل یوسف - خواجہ اعجاز احمد بٹ
سرور ش - اکبر حمیدی - احمد یراچہ
شوکت راجہ - سید سعید مرتضیٰ زیدی

اخلاص نامے

جمیل یوسف

ندیم صاحب کی بڑائی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ کراچی کا ایک رسالہ احمد ندیم قاسمی نمبر نکال رہا ہے۔ اگر یہ رسالہ پنجاب کے کسی شہر سے نکلتا تو یار لوگ کہہ سکتے تھے کہ پنجابیوں کا ایک رسالہ پنجابی شاعر اور ادیب کی عظمت کے گُن گا رہا ہے۔ مگر اب تو عظمت کی یہ سند، اہلِ زبان کا ایک مؤقر جریدہ دے رہا ہے۔

میں اہلِ پنجاب اور اہلِ زبان کے حوالے سے جس بات کا آغاز کر رہا ہوں اس پر معذرت خواہ ہوں اور خاص کر جناب تنہا لکھنوی صاحب سے معذرت خواہ ہوں، جن کے قریب سے بھی یہ تعصب نہیں گزرا۔ مگر کیا کروں سوچ کا عام انداز یہی ہے اور ابھی تک جملہ قارئین اور اہلِ قلم حضرات کا عام طور پر اس حقیقت کا احساس نہیں ہو پایا کہ ادیب پہلے ادیب ہوتا ہے۔ پھر پنجابی یا اہلِ زبان ہوتا ہے۔ اس کا ادیب ہونا شاید کسی فخر و ناز کا باعث ہو تو ہو۔ محض پنجابی یا محض اہلِ زبان ہونا چنداں کوئی قابلِ فخر بات نہیں، بلکہ قابلِ ذکر بھی نہیں۔ یہ احساس ہمارے حلقۂ شعر و ادب میں خدا جانے کب پیدا ہوگا۔

خود جناب احمد ندیم قاسمی سے یہ واقعہ منسوب ہے کہ ایک اہلِ زبان بزرگ اُن سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ اور بڑے اشتیاق اور گرم جوشی سے ندیم صاحب سے ملے۔ دیر تک ندیم صاحب کی با محاورہ اور منجھی ہوئی زبان کی تعریف کرتے رہے۔ کبھی اُن کی شاعری پر واہ واہ کرتے کبھی اُن کے افسانوں پر آہ آہ۔ کہ صاحب واہ کیا بات ہے، جواب نہیں، اس طرح کی اردو بھلا یہاں لاہور میں کون لکھ سکتا ہے، آپ نے جو یہاں پنجاب میں اردو شعر و ادب کی شمع روشن کر رکھی ہے تو یہ اردو پر آپ کا احسان ہے، قومی خدمت ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ندیم صاحب اپنے عجز کا اظہار کرتے رہے کہ آپ کا حسنِ ظن ہے، ورنہ میں کس قابل ہوں۔ بس اپنے شوق کی تکمیل میں لگا رہتا ہوں۔

آخر باتوں باتوں میں وہ بزرگ پوچھنے لگے "ندیم صاحب! آپ پنجاب میں کیا ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں سے پہلے ہی آ گئے تھے؟"

اس پر ندیم صاحب نے انھیں بتایا کہ وہ تو ہیں ہی پنجابی۔ وہ صاحب بولے "خیر اچھا ہے۔ اب تو آپ کو ایسا ہی سمجھنا چاہیے"۔۔۔ ندیم صاحب نے کہا "نہیں جناب یہ بات نہیں ہے، میں تو حقیقت میں ہوں ہی پنجابی"۔

اس پر وہ صاحب کچھ جز بز ہوئے، کہنے لگے "خیر پھر بھی آپ کی ہمت ہے جو اُردو زبان و ادب کی اس طرح خدمت کر رہے ہیں"۔ اس کے بعد اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کر کے چل دیئے۔

تو میں کہہ رہا تھا یہ ندیم صاحب کی عظمت ہے کہ ان کی تحریریں پڑھنے والے آن کو اہلِ زبان سمجھتے ہیں اور اہلِ زبان اُن کو پنجابی جانتے ہوئے اُن کی شخصیت اور فن کی تعریف میں اپنے رسائل کی خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کرتے ہیں۔

جب پہلی دفعہ آج سے کوئی بیس سال اُدھر، احمد ندیم قاسمی کا نام سُنا تو یوں لگا یہ کسی غزل کا مصرع ہے۔ آج تک غزل کے اس مصرعے کی نغمگی اور اس کے غیر محسوس آہنگ کا اثر ذہن پر موجود ہے۔ یہ سے مسلسل اور نہ ختم ہونے والی ہے اس کے غیر محدود پھیلاؤ پر حیرت ہوتی ہے۔

اک سفینہ ہے تری یاد اگر
اک سمندر ہے مری تنہائی

جب صہبا لکھنوی صاحب کا خط آیا کہ احمد ندیم قاسمی صاحب کے بارے میں کچھ لکھو، افکار کا احمد ندیم قاسمی نمبر نکل رہا ہے تو خیال آیا کہ قلم اٹھانے سے پہلے صہبا بھائی سے پوچھ لوں، افکار کون سے احمد ندیم قاسمی پر اپنی خصوصی اشاعت کا اہتمام کر رہا ہے، احمد ندیم قاسمی جو شاعر ہے۔ یا وہ احمد ندیم قاسمی جو افسانہ نگار ہے۔ یا وہ احمد ندیم قاسمی جو نقاد ہے یا وہ احمد ندیم قاسمی جو صحافی ہے۔ یا وہ احمد ندیم قاسمی جو فنون کا مدیر ہے یا وہ احمد ندیم قاسمی جس کی شرافت اور انسان دوستی پر ٹوٹ کے پیار آتا ہے

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالمِ نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

ندیم صاحب نے شعر و ادب کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ شعر و ادب ہی ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ بلکہ اس محاورے کا صحیح مفہوم مجھے ان کے کمرے کو دیکھ کر ہی پتہ چلا۔ کمرے میں ان کی چارپائی کے اردگرد کتابیں ہی کتابیں تھیں، جو کمرے کے فرش سے لے کر دیواروں کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی چھت تک چلی گئی تھیں۔ اور کتابوں کے اس ہجوم میں ندیم صاحب اتنے سکون اور اطمینان سے بیٹھے تھے جیسے کوئی پرندہ اپنے گھونسلے میں بیٹھا ہو۔ وہ خود بھی ان کتابوں کا ہی ایک حصہ نظر آتے تھے۔ ایک ایسی کتاب جس کے الفاظ ایک ہمدرد اور آشنا آواز میں ڈھل جانے کی قدرت رکھتے ہوں۔ جس کا سرمایہ نہ ختم ہونے والا ہو، جو کبھی جلال و جمال کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے اور کبھی شعلۂ گل کی لپک بن کر ابھرتی ہے۔

مچل مچل کے اُبھرتی ہے جب چراغ کی لَو
میں سوچتا ہوں کہ ان لرزشوں میں تُو تو نہیں

یہ کبھی دشتِ دفا کی پہنائیوں میں کھو جاتی ہے۔ اور کبھی گوناگوں اور رنگ برنگے افسانوں کے بھیس میں دیہات کی سُریلی فضاؤں میں پھیل جاتی ہے۔

ندیم صاحب نے اس ان پڑھ اور ادب ناشناس معاشرے میں محض ادب کے سہارے زندہ رہ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ عشق صادق ہو تو اس کی راہ میں کوئی دیوار حائل نہیں ہو سکتی۔ کوئی مجبوری اُسے پابہ زنجیر نہیں کر سکتی۔ ورنہ جو عشق کے بارے میں کسی نے کہا ہے ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

تو یہ سچے عشق کے بارے میں نہیں۔

شعر و ادب ندیم صاحب کے لیے عشق کا درجہ ہی نہیں رکھتے۔ وہ تو ان کی زندگی ہے اور زندگی کرنے کا کوئی اور جواز اُن کی نگاہ میں نہیں ؎

میں زندہ تھا کہ ترا انتظار ختم نہ ہو
جو تو ملا ہے تو اب سوچتا ہوں مر جاؤں

ان کے لیے فن ایک مسلسل مجاہدہ ہے، ایک مستقل ریاض۔ اس کے روپ بدل سکتے ہیں، مگر اس کی حقیقت سے مفر نہیں ؎

جس بھی فن کار کے شہکار ہو تم
اُس نے صدیوں تمہیں سوچا ہو گا

سوچ کا یہ انداز کہ خوب سے بعد خوب تر کی تخلیق ہو، اپنے اندر جو کرب کا عالم لیے ہوئے ہے اُسے ایک فن کار ہی جان سکتا ہے۔ اس کرب نے ندیم صاحب کی شخصیت کو ایک مدھم مگر نہ بجھنے والی آنچ کا حسن بخشا ہے ؎

سقراط نے زہر پی لیا تھا
ہم نے جینے کے دکھ سہے ہیں

ندیم نے انسان کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ زندگی کی خوبصورتی اسی میں ہے کہ انسان کو اپنی فطری صلاحیتیں اجاگر کرنے کی مکمل آزادی ہو اور اس کے لیے اسے بھرپور مواقع میسر ہوں۔ ندیم نے ایک ایسی ہی دنیا کی تشکیل کا خواب دیکھا ہے ؎

ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں

سرور اکبر آبادی

ندیم بیک وقت صحافی، ادیب، شاعر، نقاد اور افسانہ نگار ہیں۔ لیکن یہ بڑی حیرت اور استعجاب کی بات ہے کہ اس

عدیم الفرصتی اور بحرانی دور میں جب کہ کسی لکھنے والے کے لیے صرف ایک صنفِ ادب کو ہی نبھانا دشوار و دقت طلب ہے ۔ اُن کی طبیعت کا یہ تنوع اور ہمہ گیری واقعی لائقِ صد تحسین و آفرین ہے اور یہ بھی ایک امرِ مسلم ہے کہ انھوں نے جس کسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے اُس کو بحسن و خوبی نبھایا بھی ہے ۔

خواجہ اعجاز احمد بٹ

قاسمی کو ترقی پسند کہا جاتا رہا ہے ۔ مگر قاسمی کو دوسرے ترقی پسندوں سے ممیز کرنے کے لیے قاسمی کا مسلمان ترقی پسند ہونا ایک شرط بن گیا ہے ۔ قاسمی مسلمان ترقی پسند ہے اور اسے خود اس سے انکار نہیں ۔ اس نے امروز میں فکر و فن کے تحت لکھا تھا ۔

”ہم نے مسلمان رہ کر ترقی پسند تحریک میں بھرپور اور مثبت حصہ لیا ہے“۔

قمر یورش

میں کافی عرصے سے جناب احمد ندیم قاسمی پر ایک مضمون لکھنا چاہتا تھا ۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ میں اس ہیروں کی طرح جگمگاتی ہوئی شخصیت پر کیا لکھوں اور کیسے لکھوں ۔ میری اس مشکل کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کو کبھی اپنے عزیز ترین دوست پر کچھ لکھنے کا اتفاق ہوا ہو ۔ سنا ہے مجھ سے پہلے اردو کے مشہور افسانہ نگار جناب سعادت حسن منٹو کو بھی ایسی ہی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا ۔ ہوا یوں کہ کسی شخص نے فاضل افسانہ نگار سے پوچھا :

> ”جناب، آپ اپنے بہت سے دوستوں کے متعلق لکھتے ہیں مگر آپ اپنے عزیز ترین دوست اور ملک کی مایۂ ناز ادبی شخصیت احمد ندیم قاسمی پر کیوں نہیں لکھتے اس کی وجہ کیا ہے ؟
> سعادت حسن منٹو نے بڑی فراخ دلی سے اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ سب سے مشکل کام اپنے دوست پر لکھنا ہوتا ہے ۔ چونکہ ذرا قلم بے قابو ہوا تو الزام لگ جاتا ہے کہ یہ شخص جنبہ داری کر رہا ہے — دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ایک دوست دوسرے دوست کی بے پناہ تعریف کر رہا ہے ۔ باقی رہا آپ کا سوال تو احمد ندیم قاسمی پر میں نے متعدد بار لکھنے کی کوشش کی ہے مگر میں کبھی کامیاب نہیں ہوا ۔ سعادت حسن منٹو کے عقیدت مند کے دل کو ٹھیس لگی اور اُس نے حیرت سے پوچھا ”یہ کیا بات ہے آپ جیسا باکمال فن کار احمد ندیم قاسمی پر اب تک کیوں نہیں لکھ سکا“۔ سعادت حسن منٹو نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ”احمد ندیم قاسمی نے نہ تو کبھی شراب ارغوانی کے چھلکتے ہوئے بلوری جام لنڈھائے ہیں ۔ نہ کسی مہ جبیں سے عشق کیا ہے اور نہ ہی کبھی بازارِ حسن کا طواف کرتے ہوئے کسی پری چہرہ کی رقص و سرود کی محفل میں شرکت کی ہے ۔ اب آپ ہی بتائیں خدا کے اس نیک بندے پر کیا لکھا جا سکتا ہے ۔ یہی نا کہ ہر تیسری سطر میں لکھنا پڑے گا ۔ احمد ندیم قاسمی بہت شریف آدمی ہے“۔

جناب احمد ندیم قاسمی میرے دوست بھی ہیں اور ادبی رہنما بھی ہیں۔ یہ مضمون لکھتے وقت میں بھی کچھ ایسی ہی مشکل میں گرفتار ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں نقاد حضرات یہ کہتے ہوئے مجھے تیر و نشتر کا نشانہ بنا دیں کہ ایک دوست دوسرے دوست کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہے۔ قارئین میں تو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کر رہا ہوں اور بس، ورنہ کہاں احمد ندیم قاسمی کی عظیم شخصیت اور کہاں یہ ناچیز مزدور قلم کار۔

——— آج سے چند سال قبل باغ بیرون موچی دروازہ میں مزدوروں کا ایک عظیم الشان جلسۂ عام منعقد ہو رہا تھا جس کی صدارت مشہور مزدور رہنما مرزا محمد ابراہیم کر رہے تھے۔ راقم اس جلسے میں شریک تھا۔ اتنے میں اسٹیج سے اعلان ہوا کہ اب آپ کے سامنے ملک کے عظیم فن کار جناب احمد ندیم قاسمی صاحب اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔ میں نے دیکھا کہ گندمی رنگ، درمیانہ قد، مضبوط جسم اور گھنگھریالے بالوں والا ایک نوجوان اسٹیج پر آیا اور اس نے مائیکروفون سنبھال کر کہا۔

میرے مزدور ساتھیو!

میں آپ کا قلم کار ساتھی ہوں۔ میں آپ کی صفوں میں اپنی جگہ لینے آیا ہوں۔ میرا قلم آپ کی امانت ہے۔ رفیقو! میں امراء کے درباروں میں افسانوں کا انبار لگا کر کہانی سنانے والا داستان گو نہیں ہوں۔ عزیز بھائیو! آپ مجھے ہمیشہ اپنے دکھ سکھ میں شریک پائیں گے۔ اور جاگیرداری کے خلاف جدوجہد میں میں آپ کے ساتھ مل کر شانہ بشانہ لڑوں گا۔

میرے ساتھیو! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مزدوروں کی خاطر مجھے تختۂ دار پر بھی جانا پڑے تو میں محنت کشوں کی بہتری کے لیے پھانسی کا رسہ چوم کر اپنے گلے میں ڈال لوں گا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ اپنے ملک میں شہنشاہیت کا دور نہیں تھا۔ ورنہ احمد ندیم قاسمی کی یہ دلی آرزو بھی پوری ہو جاتی۔ احمد ندیم قاسمی بہت سیدھے سادے سچے انسان ہیں۔ ان کی شخصیت تابناک ہے وہ بڑے عظیم اور مضبوط کردار کے مالک ہیں۔ یہ بات ہے انہوں نے کبھی زندگی کی تلخ حقیقتوں سے راہ فرار اختیار نہیں کی۔ اور نہ کبھی اپنے آپ کو عوامی تحریک سے علیحدہ رکھ کر اپنے خیالات کو گیسو و رخسار یا گل و بلبل تک محدود رکھا۔ بلکہ وطن کو غیر ملکی پنجۂ استبداد سے آزاد اور وطن کی سرزمین کو حسین و لالہ زار اور شاداب کرنے کے لیے تحریک پاکستان میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔

اکبر حمیدی

غالب اور ندیم کی زندگیوں میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثلاً دونوں کے والد ان کے بچپن میں فوت ہو گئے۔ دونوں نے چچا کے ہاں پرورش پائی اور بچپن کی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ دونوں کے چچا بھی ان کے آغاز شباب میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چنانچہ دونوں کو اپنے آبائی وطن سے نکلنا پڑا۔ غالب دلی پہنچے اور ندیم ملتان۔ ایک نے بہادر شاہ ظفر کے ہاں نوکری پائی اور دوسرے نے ملتان میں محکمۂ آبکاری میں۔ دونوں کو حصول معاش میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

دونوں کو جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ دونوں کے عہد میں آزادی کی جنگ لڑی گئی۔ دونوں نے انسانی خون کی ندیاں بہتی دیکھیں۔ ایک نے ۱۸۵۷ء میں اور دوسرے نے ۱۹۴۷ء میں اور پھر ۱۹۷۱ء میں۔ دونوں نے اپنی قوم کا انتہائی دور

انحطاط دیکھا۔ ایک نے اپنی قوم کو انگریز کے ہاتھوں گاجر مولی کی طرح کٹتے دیکھا اور دوسرے نے اپنی قوم کو ہندو جارحیت کا نشانہ بنتے۔ غرضیکہ دونوں کی داخلی اور خارجی زندگیوں میں بہت سے واقعات ایک جیسے ہیں۔

بحیثیت فن کار دونوں غزل کی ہیئت اور مواد پر پوری طرح اثر انداز ہوئے اور صاحبِ طرز کہلائے۔ دونوں کی شہرت کا دارو مدار زیادہ تر غزل پر ہے۔ دونوں نے اپنی نثر کا لوہا منوا لیا۔ ایک نے بحیثیت مکتوب نگار اور دوسرے نے بحیثیت افسانہ نگار۔ دونوں نے اپنی زندگیوں میں بہت شہرت پائی، مگر دونوں کو بعض حلقوں نے شاعر تسلیم نہیں کیا۔

دونوں کو زندگی سے انتہائی گہرا ربط ہے۔

ایک کہتا ہے ۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے　　(غالب)

دوسرا ۔

مجھے تو بجھ کے بھی ہے زندگی سے ربط اتنا
کہ جل رہا ہوں کسی ہاتھ کی حنا بن کر　　(ندیم)

۔
قیامت ہے کہ ہوئے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے　　(غالب)

۔
مت مانگ دعائیں جب محبت
تیرا میرا معاملہ ہے　　(ندیم)

احمد پراچہ

احمد ندیم قاسمی بنیادی طور پر ترقی پسند فن کار اور سچا انسان ہے۔ انھوں نے اس دور میں بھی اپنے ترقی پسند ہونے کا اعتراف دبے دبے لفظوں میں نہیں کیا تھا جب کہ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے فن کار معتوب تھے اور ان پر اشتراکی ہونے کا الزام دھرا جاتا تھا۔ متحدہ ہندوستان کے زمانہ میں نوکر شاہی افسر عوامی فن کاروں کو زنداں کی آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا کرتے تھے، لیکن ندیم کے پائے استقلال میں اس وقت بھی لغزش نہ آئی انھوں نے انگریز سے اس وقت بھی یہ کہا ۔

ہمیں کیا سکھاؤ گے تہذیب جاؤ
تم اپنے تمدن کا لاشہ اُٹھاؤ
یہاں سے وہاں تک ہماری حکومت
یہاں سے سدھارو وہاں سے سدھارو

یہ دورِ غلامی کی بات تھی مگر دورِ غلامی کے بعد جب کہ پاکستان معرضِ وجود میں آچکا تھا، تب بھی ترقی پسندوں کو

ٹِک کر بیٹھنے نہیں دیا جاتا تھا۔ ہمارے ملک کے خود غرض اور موقع پرست سیاست داں، ترقی پسند ادبی تحریک سے تعلق رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کو ہوا خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ترقی پسند ادیبوں کو انھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں ہمیشہ نفرت سے دیکھا۔ ریڈیو، سرکاری رسائل و اخبارات اور دیگر سرکاری ملازمتوں میں ترقی پسند فن کاروں کی کوئی گنجایش نہیں تھی۔ لیکن ندیم صاحب اس وقت بھی اپنے نظریے پر قایم تھے اور آج بھی اپنے ترقی پسند نظریے سے نہیں ہٹے ہیں۔

شوکت راجہ

ندیم نے اپنے احساساتی تجزیے کے ذریعے اس مادّی دنیا کی حقیقتوں کو پا لیا ہے اور زمین کی صداقتوں کو سمجھتے ہوئے اپنے لیے راہیں متعین کر لی ہیں۔ معاشرے کو ایک بار سمجھ کر اس سے نیکی اور اچھائی کی اُمیدیں رکھنا، ایک چوٹ کھا کر دوسری سے بے خبر ہونا اور پھر اسے قسمت سے تعبیر کرنا یہ سب کچھ ہی انسانی فطرت ہے۔ ندیم نے اپنی شاعری کی بنیاد صداقت اور حقیقت پر رکھی ہے اور اس جرم کی سزا کے ہر پہلو پر پوری طرح غور و خوض کرنے کے بعد بھی اسی راہ کو اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ اُنھوں نے سچائی کو جھوٹ کے دل فریب اور حسین پردوں سے ڈھانپنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ جو کچھ انھیں معاشرے نے سکھایا انھوں نے خود اپنے اردگرد دیکھا اُسے من وعن اپنے کلام میں سمو دیا، اور ان حقیقتوں کو شاعری کی زبان دے کر لوگوں سے متعارف کروایا۔ ایک ایسے معاشرے میں رہتے ہوئے، جہاں غربت، گناہ تصور کی جائے۔ خون میں لتھڑے ہوئے مدقوق چہروں سے آنکھیں پُر کر پُرکشش اور خیالی لفظوں کو سہارا لے کر "تخیلاتی چہروں" کو تراشا جائے اور اسے شاعری کی زبان دے کر سامنے لایا جائے تو ایسا کرنے والا چند لمحوں کے لیے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے اور ایسی شاعری کو پڑھنے والا چند ساعتوں کے لیے تو اس خیالی جنت میں ضرور کھو سکتا ہے۔ لیکن حقیقت کے تھپیڑے فوراً ہی اُسے اُس کے اصلی مقام پر پہنچا دیں گے تو ایسی صورت میں اس کے ذہن سے تمام تصوراتی الفاظ فرد ہو کر ٹھوس اور حقیقی تصورات ان کی جگہ لے لیں گے۔ اس کے مقابلہ میں ایسی شاعری کو کون پسند کرے گا جس کی اساس ہی حقیقت ہو۔

سید سعید مرتضیٰ زیدی

جدید اُردو ادب میں جو چند تاریخ ساز شخصیات نظر آتی ہیں ان میں آپ کا مقام ممتاز ہے ــــ ہمیں پُرمسرت احساس ہے کہ ہم نے آپ کو بحیثیت مہمان خصوصی مدعو کر کے اس جذبۂ احترام کا اظہار کیا ہے، جو ہم سب لوگوں کے دلوں میں آپ کے لیے موجود ہے، ہم آپ کی ہمہ جہت شخصیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ آپ نے نثر اور نظم دونوں میں اردو ادب کو نئی جہت سے روشناس کروایا ہے، انسان دوستی کی روایات کو تازہ و تابندہ کیا ہے۔ اُردو ادب کو ایک تحریک کی صورت دی ہے اور ایک زمانے میں ادب کے ذریعے آپ نے وہ تمام نیک مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جن کو بالعموم سیاسی راستوں سے حاصل کیا جاتا ہے، ہمیں اعتراف ہے کہ آپ نے اس زمانے میں بھی اس ملک میں علم و ادب، انصاف اور انسانیت کے مشن کو اونچا رکھا ہے جب اس ملک میں چاروں طرف ظلم و جبر اور بے انصافی کی تاریکیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ انسان دوستی اور اظہارِ خیال کی آزادی کی خاطر آپ نے مصیبتیں بھی سہی ہیں اور حکمرانوں کا نشانۂ عذاب بھی بنے ہیں۔ آنے والا

مورخ جب اُردو ادب کی تاریخ لکھے گا تو آپ کی شخصی عظمت، دیانت اور فنی خلوص کا ذکر سنہری حروف میں کرے گا۔

جناب والا

نئی نسل کو آپ کے ادبی کارناموں پر بجا طور پر فخر ہے۔ آپ کی حیثیت ہمارے لیے ایک ذہنی رہنما کی سی ہے۔ نئی نسل نے آپ جیسی شخصیات سے ہی علم و فن کے امور سیکھے ہیں اور آپ نے فکر و فن کے جو چراغ جلائے ہیں، نئی نسل کے دانشوروں کا قافلہ ان چراغوں ہی کی روشنی میں آج بھی رواں دواں ہے۔

(اقتباس سپاس نامہ انجمن اردو، یونیورسٹی اورینٹل کالج۔ لاہور)

تخلیقِ فن

میرا سرمایہ تخلیقِ فن ہی تو ہے

ڈاکٹر سید عبداللہ

وہ کہ شاعر بھی ہے انسان بھی ہے

یہ مختصر سی تحریر محض اظہار عقیدت کے لیے لکھ رہا ہوں، یہ نہ تو ندیم کے کلام اور فن کا پورا جائزہ ہے اور نہ ان کی شخصیت کی پوری تصویر۔

عقیدت کا ذکر آیا ہے تو یہ بتانا ضروری ہو گیا ہے کہ احمد ندیم قاسمی سے میرے نیازمندانہ اور دوستانہ روابط بھی ہیں۔ ان روابط کے سلسلے میں اقدام و استحکام زیادہ تر انہی کے خلوص کا رہینِ منت ہے۔ میں عادتاً تاخیر آمیز اور کم آمیز آدمی ہوں۔ عقیدت ہو تب بھی اس کا اظہار کم ہوتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ میں خنک ہوں، حالانکہ ایسا ہوتا نہیں۔

ندیم صاحب جس زمانے میں امروز کے مدیر تھے ان سے پہلی مرتبہ ایک دوست کے مکان پر ملاقات ہوئی۔ پھر زمانے گزر گئے تا آنکہ پرنسپلی کے زمانے میں اورینٹل کالج کی مشکلات نے پریشان کیا اور مجھے اس کالج کو بچانے کے لیے تگ و دو کرنی پڑی تو [illegible] جن احباب نے دستگیری کی ان میں ندیم اور بعض میرے خاص شکریے کے مستحق ہیں۔ ان کی مہربانی سے امروز اور پاکستان ٹائمز کی قلمی تائید حاصل ہوئی اور میں کہہ سکتا ہوں کہ علوم مشرق کے حق میں رائے عامہ کی تنظیم بڑی حد تک انہیں کی بدولت ممکن ہو گئی۔

اس زمانے میں میں نے مدیر امروز (احمد ندیم قاسمی) کو مسلسل خط لکھے جو امروز میں چھپتے رہے۔ تعجب یہ کہ مانسہرہ یا ایبٹ آباد سے لکھے ہوئے یہ خطوط من و عن چھپ جاتے تھے حالانکہ ان میں کوئی خاص بات نہ ہوتی۔ درست کہ ان میں ادارے درد مندی کا عنصر ضرور ہوتی تھی مگر وہ فراخ دلانہ پذیرائی جو میری تحریروں کو امروز کے کالموں کے ذریعے میسر آتی تھی خود میرے لیے باعث تعجب تھی۔ اس حوصلہ افزائی کی وجہ سے، میں نے آزاد تخلصی انشائیہ نگاری شروع کی جس میں کچھ حقیقت مگر باہم مل کر تماشا انگیز واقعاتی تبصرے آجاتے تھے۔۔۔۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ راستہ ندیم ہی نے دکھایا۔

ندیم سے میری ملاقات اب بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ مگر غائبانہ ربط اب بھی ویسا ہی ہے۔ ندیم دوستی کے مسلک میں بڑے پکے آدمی ہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں معمولی سا تغافل بھی انہیں برہم کر سکتا ہے۔ مجھے اس کا کچھ تجربہ ہوا ہے۔ اور

میں نے بے حد کوشش کی ہے کہ ان کے دل پر اپنا نقش بٹھائے رکھوں ۔۔ ۔۔۔۔۔ میں نے ایک خط میں ایسے ہی ایک لمحے کا ذکر کیا ہے ۔ (خط کا عنوان ہے "احمد ندیم قاسمی کے نام ناتمام خط" ۔ اور یہ اب میرے مضامین کے ایک مجموعے "درخت اور دریچے" میں چھپ بھی چکا ہے)

یہ تو رہا روابط کا قصہ ۔۔۔۔۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ یہ تحریر "ارمغان عقیدت" کے طور پر لکھی جا رہی ہے ۔۔۔ اب مختصراً ندیم کے کلام کے بارے میں اپنے تاثر کا اظہار کرتا ہوں ۔ تاثر میں نے اس لیے کہا ہے کہ تنقیدی مسئلہ ، بے شمار عقلی اور معروضی پہلوؤں کے باوجود ، بالآخر موضوعی اور ذاتی تاثر ہی کا سوال بن جاتا ہے ۔ کسی شاعر کے کلام کے بارے میں ہر قسم کے سوال اٹھائے جا سکتے ہیں ۔ سماجی ، عمرانی ، فلسفیانہ ، معاشرتی تہذیبی مگر ان کی قدر و قیمت کی بات کرتے وقت فیصلہ بالآخر ذاتی تاثر ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے ۔ یعنی بڑا سوال یہی ہوتا ہے : کہ "میں اس شاعر سے کہاں تک متاثر ہو ۔ یا مجھ پر اس شاعر کے کلام کا کیا اثر ہوا ؟"

یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ اگر میں متاثر ہوا تو کیوں ہوا ، کن کن وجوہ سے (یعنی مواد و اسلوب کے کس رخ سے) متاثر ہوا ۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ تنقید ، ابتدا میں بھی ایک تاثراتی ردعمل سے عبارت ہے اور آخر میں بھی ۔ ہاں درمیان میں کچھ عقلی سوال و جواب بھی ہوتے ہیں جن کی تشفی کے بعد انتہا پھر تاثر پر ہوتی ہے ۔ ہر سوال کے جواب میں عقلی ، عمرانی نفسیاتی اور فلسفیانہ رخ نکالے جا سکتے ہیں مگر ذاتی تاثر سے بچ نکلنا شاید (بلکہ یقیناً) ممکن نہیں ۔

سو اہم سوال یہ ہے کہ مجھ پر ندیم کی شاعری کا اثر کیا ہوا ۔ ۔ یا جب جب پڑھتا ہوں تو کیا کیا اثر ہوتا ہے ؟ سب سے پہلے تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ندیم کے کلام کو پڑھ کر عموماً میرے خیال میں شاعر کی ایک خاص تصویر ابھرتی ہے ۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک ایسے شخص کو دیکھ رہا ہوں جو فکرمند مگر متبسم ہے ۔۔۔۔۔ سیپیاں چننے والا ، جگنوؤں سے کھیلنے والا ، چاند تاروں سے ہم کلام ہو کر اندھیروں کو بھگانے والا ، سحر ، آفتاب اور دن کا جویندہ ، ندیوں کے کنارے پھرنے والا مگر شہروں کی زندگی اور اس کے مسئلوں سے پھر بھی وابستہ ، مشفق اور شفیق ، جس کے ماتھے پر سنجیدگی کی گہری لکیر بھی ہے ۔۔۔۔۔ اس کے اپنے شعر میں اس کی ایک تصویر موجود ہے ؎

صبح کو راہ دکھانے کے لیے
دست گل میں ہے دیا شبنم کا

شبنم کا چراغ ہاتھ میں لیے ہوئے یہ شخص شہر شہر قریہ قریہ گھوم جاتا ہے اور بام و در سے یہ آواز سنائی دیتی ہے ؎

دوستو آؤ قریب آ جاؤ — آ کے دیکھو تو سہی
ایک حلقے میں کبھی آنکھوں کو — لا کے دیکھو تو سہی
شاید آواز پہ آواز آئے — گا کے دیکھو تو سہی

غرض یہ سیپیاں چننے والا "گا کے دیکھو تو سہی" کی دعوت دیتے ہوئے خود بھی گاتا ہے اور اپنے زمانے کو بھی گانے کے اس عمل پر ابھارتا ہے ۔۔۔۔۔ اس کی آواز میں خوف کے آثار بھی ہیں مگر اس کی دعوت کی تاثیر یہ ہے کہ بھیانک وادیاں اور خوفناک ظلمتیں بھی حسین معلوم ہونے لگتی ہیں ؎

نظر افروز ہے پکتے ہوئے کھیتوں کا شباب
اور دل دوز ہے لٹتی ہوئی فصلوں کا سماں

آندھیاں ہانپتی ہیں جیسے گھنے جنگل میں　　گنگناتی ہے اسی طرح گلستاں میں نسیم

ندیم کی شاعری سے یہی دو تاثر بیک وقت ابھرتے ہیں۔ وہ متضاد حقیقتوں کو دکھا کر اپنے قاری کو اصلی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ یہ یاد دلاتا ہے کہ زندگی کے دو پہلو لازمی ہیں ؎

شب حقیقت ہے مگر اس کے بھی دو پہلو ہیں
چاند نکلا ہے سر کلبۂ احزان ندیم

دوسرے الفاظ میں، زندگی کے راستے تضادوں کے ٹکراؤ سے کھلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی علامتوں میں چاند اور تارے کے ساتھ ساتھ تیرگی اور ظلمت کا ذکر بار بار آتا ہے ...... رات اور دن کا مقابلہ بھی ہے اور زندگی کی کل حقیقت بھی یہی ہے کہ اس میں ترقی کی منزلیں دوامی جدل کی رہین منت ہیں ؎

آدمی کے ارتقا کا مدعا
وہ چھپاتے ہی رہے ہم پا گئے
اب کوئی طوفاں ہی لائیگا سحر
آفتاب ابھرا تو بادل چھا گئے

مجھے ندیم کے کلام میں دو آوازیں سنائی دیتی ہیں ...... یا یوں کہئے کہ دھڑکنیں "رم جھم" سے لے کر "جلال و جمال"، "شعلۂ گل" اور "دشت وفا" تک ..... ہر جگہ مجھے دو ندیم نظر آتے ہیں .... ایک ندیم وہ ہے جو ایک نظریئے کا داعی اور مبلغ ہے۔ اس میں وہ فکر اور سیاسی حقائق کی زبان استعمال کرتا ہے۔ اور اس طرح گفتگو کرتا ہے جس طرح ایک نظریے کے سلسلے میں ہونی چاہیے۔ دوسرا ندیم وہ ہے جو افسانے بُنتا ہے، ... آوازوں کی مدد سے کہانیاں سناتا ہے، وہ تصویریں بھی بناتا ہے اور بعض اوقات تصویروں پر نغمے کی چاندنی بھی بکھیر دیتا ہے، یہ افسانہ خواں اپنے خوابوں کو حقیقت بنانے والا ... اور حقیقتوں کو خوابوں کی شکل دینے والا ...... مصور ...... یا رامش گر یعنی نغمے ابھارنے والا ..... ندیم ہے۔

میں حقائق زندگی سے نفور نہیں ہوں، میں ان شاعروں کی بھی قدر کرتا ہوں جو نظریوں کے ترجمان ہیں۔ مگر نظریوں کی قدر، نظریوں کی قدر و قیمت کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی شاعر کسی نظریے کا ترجمان ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے (اگرچہ اس کی اچھائی برائی کا فیصلہ دوسری بنیادوں پر ہوگا) مجھے اس سے زیادہ یہ دیکھنا پڑے گا کہ شاعر نے تصویریں کیسی بنائیں اور رامش گری کہاں تک اور کس کس صورت میں کی۔ جو شاعر، تصویر نہیں بنا سکتا وہ نثر نگار ہے۔ جو شاعر موسیقی پیدا نہیں کر سکتا وہ شاعر نہیں کچھ اور شے ہے، میں شاعری میں ان دو باتوں کے علاوہ اگر کسی اور چیز سے دلچسپی رکھتا ہوں تو اس بات سے (اور یہ بہت بڑی بات ہے) کہ اس ساری نظم طرازی میں شاعر خود بھی کہیں ہے یا نہیں؟ اس کا اپنا دل بھی کہیں نظر آتا ہے یا نہیں۔ میری نظر میں، شاعری کی حد تک، نظریہ بعد کی شے ہے۔ اصل شے وہ نغمہ و تصویر ہے جس کے آئینے میں وہ اپنے

جذبات کو منعکس کرتا ہے۔ اس کی شاعری کی قیمت اسی سے متعین ہوگی۔

ممکن ہے ادب کی نئی شریعت میں میرے یہ خیالات کافرانہ و ملحدانہ سمجھے جائیں مگر نظریے کی قدر کرتے ہوئے بھی میں نظریے کو شاعری کے لیے ضروری نہیں مانتا، ہرچند کہ نظریے کا بھی ایک مقام ہے۔ اس کا احترام اپنی جگہ ضروری ہے اور میں نظریوں اور عقیدوں کے احترام میں کسی سے پیچھے نہیں۔

ندیم کی شاعری کا سماجی حصہ اپنی جگہ احترام کے لائق ہے مگر میں جب ندیم کو ایک بلند پایہ شاعر کہتا ہوں تو اس کے سماجی حصے کی وجہ سے نہیں (ہرچند کہ آخری نتیجے میں اس کا بھی کچھ حصہ ہوگا) بلکہ اس وجہ سے کہ ندیم کے کلام میں خود ندیم بھی موجود ہے، اس کا دل (اس کا اپنا دل) بھی اس میں بانداز خاص دھڑکتا دکھائی دیتا ہے . . . . اور اس وجہ سے کہ ندیم تصویریں بھی اچھی بناتا ہے . . . . اور پھر اس وجہ سے بھی کہ اس کی تصویریں ایسے نغموں سے ہم آہنگ اور ہم رنگ ہوتی ہیں جو قاری کے تخیل میں تحرک پیدا کر دیتی ہیں۔ اس لحاظ سے میں ندیم کو جلیل القدر شاعر مانتا ہوں۔

میں ندیم کے کلام میں اکثر یہ ڈھونڈتا رہتا ہوں کہ اس میں ندیم خود بھی کہیں بول رہا ہے یا نہیں (جس طرح اس کے افسانوں کے مطالعے میں بھی میں اس کے سماج کو کم اور خود اس کو زیادہ ڈھونڈتا ہوں) . . . . اس جستجو میں مجھے اصلی ندیم بارہا مل بھی جاتا ہے . . . .

یہ ندیم حسن کا دل دادہ اور محبت کا پرستار ہے۔ زندگی کا جدل اسے مرعوب بھی کرتا ہے اور مسحور بھی، مگر زندگی کا حسن اس کے قلب پہ کچھ اس طرح منقوش ہے کہ اس کی شخصیت کے تار و پود اس سے منور دکھائی دیتے ہیں ؎

گنجان صنوبروں کے پیچھے
اک چاند ہزار چاند بن کر
تاروں کی طرح بکھر گیا ہے
اس سیل جمال کے سہارے
وادی کے نشیب بھر گئے ہیں
ویرانۂ جاں سنور گیا ہے

چاند ندیم کا خاص استعارہ ہے۔ ستارہ یا ستارہ بھی اس کا خاص لفظ ہے مگر چاند اس سب سے کا مرجع ایک الگ ہے، چاند سے مراد مرکز حسن اور موضوع حسن ہے اور نجم سے مراد حسن کا جویندہ (خود ندیم)۔ جب ندیم نے چاند کے اسلوب سے حسن کی تصویر کھینچی ہے بلکہ اس کا تصور دیا ہے . . . . اس بند میں تخیل کو لفظوں سے اور بھی بہت کچھ مل جاتا ہے بہت سی یادیں زندہ ہو جاتی ہیں۔ بودلیئر پر لکھنے والوں نے ہمیں بتایا ہے کہ اصل شاعری کی پہچان یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر یوں لگے گویا کوئی کھوئی ہوئی شے مل گئی ہے وہ دبی ہوئی حسیات ابھارے۔ قاری کو یہ محسوس ہو کہ کوئی شے آس پاس تھی جس نے اس کو دیکھ لیا ہے۔ اندھیرے میں کوئی دیا ابھر آیا ہے اور اس سے تاریکی بھر گئی ہے، ماحول اسے بھر مل گیا ہے اور گویا انہی صنوبروں کے پیچھے اک چاند ہزار چاند بن کر تاروں کی طرح بکھر گیا ہے:

ندیم فکر کا شاعر اگر ہے تو مبارک بات ہے مگر مجھے تو اس کا یہ دوسرا روپ کچھ زیادہ ہی پیارا لگتا ہے۔ وہ افکار و حقائق

سیاسی بات بھی کہتا ہے، سماج کی محبت اور انسانیت کے احترام کی باتیں بھی کرتا ہے، روایتی اور انقلاب کا ذکر بھی چھیڑتا ہے، تاریخ و تہذیب کے نکتے بھی بیان کرتا ہے مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں کم از کم میرے لیے، اوپری اوپری ہیں، اور بعض جگہ وہ محض نثری حقیقتیں رہ گئی ہیں۔ مثلاً ۔۔

ذہن و وجدان ہیں یوں تشنہ و بے بس جیسے   خود کو دیکھو مرے معیار کے آئینے میں

تاریخ کہ رہی ہے نشاں ہیں   تہذیب کے سسکتے نشاں ہیں

تاریخ کی آگ جل رہی ہے   اک اور زباں نکل رہی ہے

بڑی بلی میں انسان کی چھپی ہے کھڑی کھڑی گرداں ہے ندیم

خوش قسمتی سے ان حقائق اور نظری زبان کا سامنا کم کرتے ہیں، ان میں تقاضے نے شعر کے لیے مجبوری پیدا کر دی ہے ... لفظ نے نقشے بنائے ہیں اکثر خوشبوؤں کی یاد نکھارنے میں تصویر پیش کرتے ہیں اور نغمہ نکھارنے میں کچھ حصہ نہیں لیا۔ مگر یاد رہے کہ اس زمانے میں شاعر دم بھی کہیں نزدیک ہی ہوتا ہے وہ نئی شاعری کو نثری خشکی سے بچانے کے لیے ساتھ آجاتا ہے۔ ایسی نظموں میں رہ کر قاری کو ایک اور اقلیم میں لے جاتا ہے۔ ندیم کی نظم "سوچتا ہوں" ملاحظہ ہو ۔۔

میری کھڑکی کے شیشے پہ پھولوں کی اک بیل انگڑائیاں بنتے بنتے رکی!
اک حسینہ سمندر کی دھوئی ہوئی ریت سے سیپیاں چنتے چنتے رکی
اوس کے چند موتی جو پھولوں کے ماتھے پہ جھومر کی مانند رخشندہ ہیں
بیل کی بے حسی سے ہیں بے بس مگر کتنے مجبور ہیں کیسے شرمندہ ہیں
سوچتا ہوں اگر کوئی جھونکا نہ آیا تو کیا پھول چپ چاپ مرجائیں گے؟
میرے ویران کمرے کے یہ قمقمے کیا یونہی تیرگی میں اتر جائیں گے؟

یہ نظم حسن کا مرقع ہے۔ اس میں جمال کے مینا خانے سجے ہیں۔ ہر شاخ شاخِ نبات، اور ہر گل، گلِ تر۔ یہ سیپیں یہ حسین ... کی حقیقت سفر ہے۔ اس میں فکر کی خشک اور بے آب و گیاہ دنیا نظر نہیں آتی، بلکہ وہ مرغزار ہیں۔ جن کی تخلیق صرف حقیقی شاعر ہی کر سکتا ہے۔ اور پھر اس سوال کی کمی، تو داد دیجیے۔ ع

سوچتا ہوں، اگر کوئی جھونکا نہ آیا تو کیا پھول چپ چاپ مرجائیں گے؟

اس کا جواب قدرت کے ذمے ہے!

میں انسانی دکھ درد کا پجاری ہوں . . . . . مگر غم انسان کی اجتماعی آواز والی شاعری ہے یا آخر فکری فیشن کی شاعری بن جاتی ہے۔ اہم سوال تو یہ ہے کہ سماجی انسان کا مسئلہ محض فکری چیز ہے یا انسانی دلی گہرے تجربے سے ابھرا ہے۔ سماج کا غم اگر محض نظریہ ہے تو ایک اخلاقی اور مابعد الطبیعاتی حقیقت کی حد تک ہی قابل قدر ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وجہ یہ کہ دنیا بھر کا دکھ سہنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ کوئی بوبکر شبلی، کوئی گوتم بدھ، کوئی تبریز، کوئی دوستو فسکی اس وادی میں آئے اور پھر نہ ابھرے . . . . ع

کون لا سکتا ہے تاب غمزۂ دیدار دوست

پس جب صورت یہ ہے تو یہ کیسے معلوم ہو کہ کس شاعر کے ہاں یہ غم ایک روحانی تجربہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ محض نظریاتی نہیں۔ الم کے گہرے احساس کے بغیر غم کی شاعری ممکن ہی نہیں اور غم کا گہرا احساس نظریے کی بجائے دل کی آشفتگی سے پیدا ہوتا ہے۔

تاہم مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ندیم کے یہاں یہ خواص اخلاص و صداقت کے ساتھ موجود ہے ... ہیں "ننگی دیواریں" اور "بکھے چہرے" ... استعارے اس کے کسی روحانی تجربے کا پتہ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ندیم ... کا عرفان موجود نظر آتا ہے۔ مثلاً کہا ہے ؎

میں بکھرا ہوا ... ہوں ...
لیکن اب بپھرے ہوئے طوفان کا ساحل بھی ہوں

بپھرے ہوئے طوفان کا یہ ساحل کہاں ہے؟ یہ اس مقام پر ہے جہاں شاعر شکست کے گہرے احساس میں ڈوب کر بھی ابھرنے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ شکستہ ہے گہرے احساس سے ... مگر یہ احساس اس کے دل میں موج زن ہے یہی وہ مقام ہے جہاں ایک دل کو دوسرا دل نظر آتا ہے۔ ذاتی الم کے ... موج زن ہوئے بغیر کائناتی الم کی حقیقت کون جان سکتا ہے۔ اس کا ساحل بپھرے ہوئے طوفان کہیں آس پاس ہے۔ ندیم نے کہا ہے ؎

مسافروں سے کہو رات سے شکست نہ کھائیں
میں لا رہا ہوں خود اپنے لہو سے بھر کے چراغ

"اپنے لہو سے بھرے ہوئے چراغوں" کے بغیر یہ ساحل نظر نہیں آ سکتا۔

تمام دردمندی اور غم انسان کے بے کراں سمندروں میں شناوری سے پہلے اپنے لہو سے اپنے چراغوں کی روشنی لازمی ہے . . . . . نظریاتی انسان دوستی محض خیال ہے "اپنے لہو کے چراغ جلانا" ایک روحانی تجربہ ہے۔ مگر محض افکار کی مدد سے الم کے چراغ مشکل ہیں۔ یہ بھی دیکھنا ہے کہ انسان کسی اور کے دکھ سہنے کی طاقت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ جوش ... نے ایک زمانے میں لکھا تھا ؎

اپنے ہی دکھڑے رونے کو ہر اک کوئی بن جاتا ہے
ورنہ یاں کون کسی کے دکھ سہتا غم کھاتا ہے

بہرحال ندیم شکست کی برکتوں سے آشنا ہے اور اس کے لیے غم انسان سے ہمدردی کرنے کا خونی امکان معلوم

ہوتا ہے کیونکہ الم سے براہِ راست آشنا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں قدرے نظریاتی بحث میں الجھ گیا ہوں۔ یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ مجھے بتانا یہ تھا کہ ندیم شاعر بھی ہے اور انسان بھی ہے۔ اور انسان سے مراد یہ ہے کہ اس کے دل میں دوسرے دل کے لیے جگہ ہے، اس کا دل دوسرے کے لیے تڑپ سکتا ہے۔ انسان دوستی کے لیے یہی کافی ہے، اور کافی کیا، کافی سے بھی زیادہ ہے..... اور کافی سے زیادہ اس لیے کہ دنیا جہان کے غموں کی بات صرف کہنے کی بات ہے ورنہ سارے عالم کے غم کو کون برداشت کر سکتا ہے مجھے تو میر کی بھی یہ بات کچھ اوپری ہی معلوم ہوتی ہے ؎

دین و دل کے غم کو آساں ناتواں میں لے گیا
یا محبت کہہ کے یہ بارِ گراں میں لے گیا

تو کہنا یہ ہے کہ ندیم شکستِ غم اور غمِ شکست سے ذاتی طور سے آشنا ہے اور اسی سے اس کی انسانیت یا انسان دوستی ابھری ہے۔ یہ اس کا مرتبہ ہے مگر اس مرتبے میں اس کی شکست غم کے علاوہ اس کی شاعری بھی حصہ دار ہے۔ اور شاعری سے یہاں مراد تصویر سازی اور رامش گری ہے۔

کسی ایک شاعر کا کسی دوسرے معاصر شاعر سے مقابلہ اچھی بات نہیں۔ مگر میں بڑے ادب و معذرت کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ مصوری کے عاظ سے ندیم، فیض سے بہتر شاعر ہے، اور ان میں فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ جہاں فیض کنائے اور استعارے کو بھی اشارہ بنا دیتا ہے۔ ندیم استعاروں سے تصویر کی تفصیلی مینا کاری کا کام لیتا ہے۔ اشاروں میں ایک بات ہے۔ مگر تصویر گری میں اشارے ناکافی وسیلہ ثابت ہوتے ہیں۔ فیض استعارات کو سمیٹ کر "دزدیدہ" جھلک دکھاتا ہے۔ ندیم (شاید افسانہ نگار ہونے کی وجہ سے) استعارے میں پھیلاؤ کا میلان رکھتا ہے۔ دونوں میں لطف ہے مگر جہاں شفق کو ڈھونڈنا پڑتا ہے (شب گزیدہ سحر میں آپ نے تجربہ کیا ہوگا) وہاں ندیم آسانی سے اپنی تصویر کی جزئیات تک دکھا دیتا ہے۔

ڈی سیلین کوٹ نے کیٹس پر لکھتے ہوئے ہمیں بتایا ہے کہ اچھا شاعر اپنی تصویروں میں نمایاں ہوتا ہے.....
اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اچھا شاعر مجرد کو محسوس و متحجر بنا کر پیش کرتا ہے، وہ مجہول و مبہم کو معلوم اور واضح بنا کر پیش کرتا ہے... یہ اگرچہ قاعدہ کلیہ نہیں کیونکہ بعض اوقات شاعر کو اپنے موضوع اور محل کی مجبوری سے الٹا سفر بھی کرنا پڑتا ہے مگر یہ سچ ہے کہ عام قاری تک رسائی کے لیے مجرد سے متحجر کا سفر سہل بھی ہے اور کامیاب بھی۔ ندیم بھی افکار و حقایق کو تصویروں میں مجسم کرتا ہے، اس کی یہ تصویریں بول رہی ہوتی ہیں۔ گنگنا رہی ہوتی ہیں مگر وہ ڈی سیلین کوٹ کے مشورے کا پابند نہیں۔ میرے نزدیک ندیم کی بہت سی عمدہ تصویریں وہ ہیں، جن میں وہ واضح سے مبہم کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس ابہام سے وہ ان خوابوں اور خیالوں کا تصور دلاتا ہے جن کی خوبی ہی یہ ہے کہ وہ تخیل کے لیے بے کراں اور بے پایاں ثابت ہوں۔ مگر یہ ابہام حقیقت اور وضاحت سے اس طرح لپٹا ہوا چلتا ہے کہ اسے سخن حقیقت بھی نہیں کہہ سکتے ؎

ایک زرد سی ہوئی فصلِ گل کی طرح	چاندنی شاہراہوں پہ سوئی ہوئی
ایک اڑتی ہوئی سلطنت کی طرح	ایک شے دوسری شے میں کھوئی ہوئی

"شکستِ دفا" کی یہ ساری نظم جس کا عنوان "شام کب آئی" اسی ابہام حقیقت کُشا کی آئینہ دار ہے، نظم "میں سوچتا ہوں" (ایضاً) اور نظم "فکر" بھی اسی انداز کی نمایندہ ہے۔

ندیم کے یہاں ترقی پسند اور ملامت پسند شاعروں کے استعارے بھی آتے ہیں۔ مگر وہ مقلد نہیں۔ رینگتی ہوئی دھوپ اور سسکتے ہوئے سائے اور چیخنے ہوئے جذبات۔ مگر اس کے یہاں یہ تجربہ ومت بدہ نہیں، محض روایت ہے ــــــ

ندیم نے زبان کو آزادی بھی دی ہے مگر مادر پدر آزادی نہیں دی۔ وہ فکری زبان استعمال کرجاتا ہے مگر اس کی توانائی کے لیے کانی شاعری بھی کرتا ہے۔ خاصی مصوری کرتا ہے۔ کانی موسیقی بھی دیتا ہے۔

ندیم نے غزل اور نظم کے مابین فاصلوں کو بھی کم کیا ہے۔ بعض اوقات غزل لکھ کر عمدہ نظم کے نمونے پیش کرتا ہے۔ اور بالعکس بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر مجموعی صورت وہ شاعری کی خدمت کرتا ہے۔ اصناف کی اصطلاحی قیدوں میں مقید نہیں ہونا چاہتا۔ غزل بھی اچھی کہتا ہے نظم بھی اچھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ جذبے کی تصویر کس طرح اچھی بنتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہمیں بھی اصطلاحوں کے پیچ میں پڑنے کی ضرورت ہے۔

اس کے قطعے اور رباعیاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مختصر بیانی کے شاہ‌کار سمجھے ہیں مگر خود ندیم کو اس کا فرار نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا بیان ہے کہ میں نے آہستہ آہستہ یہ اہتمام ترک کردیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ رم جھم کے پیش لفظ میں اس نے یہی بتایا ہے۔

۱۹۳۵ء کے بعد کی شاعری میں، نظم کو آگے بڑھانے اور غزل میں نئے زمانے کی روح سے آشنا کرنے کا کام کئی شاعروں نے کیا ہے۔ مگر ندیم کی آواز اور ندیم کا فن منفرد ہے!

وہ اچھا شاعر بھی ہے اور اچھا انسان بھی! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جو لوگ ان دونوں باتوں کی حقیقت جانتے ہیں وہ تصدیق کریں گے کہ ان اوصاف کے اجتماع ہی سے وہ تسخیر و تاثیر پیدا ہوتی ہے جو ندیم کی شخصیت میں بہ‌ہمہ‌وجوہ موجود ہے ــــــ

آپ کو میرے نظریۂ فن کی
ایک ہی بنیاد نظر آئے گی،
اور وہ انسان دوستی، انسان
کا احترام اور انسان کا وقار
اور اس کی عظمت ہے۔
دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس بنیاد
کو اکھیڑنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔

ــــــ ندیم

سیّد وقار عظیم

ندیم کے افسانے۔ سنّاٹا کے بعد

فلسفی، سائنس داں، صوفی اور مُلّا، کسی اور بات پر متفق ہوں یا نہ ہوں، یہ بات سب کے ایمان کا جزو ہے کہ تغیر کو ثبات و قیام ہے اور تغیر کے اسی اٹل قانون سے حکیم سے مُلّا تک سب کا بھرم قایم ہے۔ ندیم کے افسانوں کے کرداروں نے بھی اس سے قطع نظر کہ وہ کون ہیں، کیا نہیں، یہی بات کہی ہے۔ بہت کہتے ہیں، کہتے چلے جاتے ہیں اور تھکتے نہیں۔ کہنے کا انداز یقیناً بدلتا رہتا ہے، لیکن بات نہیں بدلتی۔

"زمانہ کتنا بدل گیا ہے دادا! ۔۔ بڑے بڑوں کی عزتیں ٹکے سیر بک رہی ہیں ۔۔ گالی نہ دیا کر"۔۔۔۔۔ (بازارِ حیات، ۱۷۲)

گاؤں کی سوندھی مٹی سے دو ہو کر ایک پوری دھواں دھار فضا میں رہ جانے اور بس جانے والا یوں کہتا ہے:

"گاؤں میں آ کر کیا کریں۔ مٹی کے برتنوں کا رواج اٹھ رہا ہے ۔۔ ہم خود چینی کے پیالوں میں چائے پیتے ہیں"۔۔۔۔۔ (برگِ حنا ۔۔ ۲۴)

"اصول کی بات" افسانے والا زمیندار ملک کے روپے کو یاد کر کے، حسرت بھری آواز میں کہتا ہے:

"۔۔ ہا! کیا روپیہ تھا۔ سچی چاندی تھی ۔۔ یوں کھنکتا تھا جیسے کٹوری بج رہی ہو۔ ہا! ۔ کیسے زمانے تھے جو ندگئے"۔۔۔۔۔ (گھر سے گھر تک ۔۔ ۶۱)

اور اسی افسانے کا عبداللہ جب بھیک سے حاصل کی ہوئی چار روٹیاں اور چار آنے لے کر بیوی بچی کے پاس آیا تو بیوی نے کہا:۔۔۔۔۔

"۔۔۔ کانپ کیوں رہے ہو؟ آج تم نے آنسو بیچ کر روٹی لی ہے، پہلے تم خون پسینہ بیچ کر روٹی لیتے تھے۔ جو کیا تو روٹی ہی کا نہ"۔۔۔۔۔ (گھر سے گھر تک ۔۔ ۷۵)

عبداللہ چوپال پر آیا تو وہاں بیٹھے ہوئے سائیں نے حقے کا کش لگا کر بڑے چین سے یہ بات کہہ دی:

"۔۔ بڑا برا زمانہ آ لگا ہے چاچا، پیٹ کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں"۔۔۔۔۔ (گھر سے گھر تک ۔۔ ۷۷)

زمانہ بدل گیا ہے اور اُس نے اپنے ساتھ آدمی کو بھی بدل ڈالا لیکن زمانے کو تو ابھی اور بدلنا ہے اور اسی لیے چنگا جیبو کے ماں باپ آنے والے زمانے کے تصور کے سہارے جیتے رہتے تھے :

"—— ہم بابر بادشاہ کے زمانے سے پانی بھرتے آ رہے ہیں اور اب تھک گئے ہیں —
اب ہمارا چنگا منشی بنے گا اور اگلی نسل تک ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ دوسرے لوگ
ہمارا پانی بھریں" —————　(ثواب اگھرسے گھرتک : ۳۱)

مستقبل کے متعلق "ہیرا" والے دریام (بازارِ حیات، ۲۴۲) کے سوچنے کا انداز مختلف ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ : ———

"—— بڑا سخت زمانہ آنے والا ہے، زینو! — یہ بچے بڑے ہوں گے تو ایسے ایسے
کام بیچے جائیں گے اِن سے کہ ہم تم سوچیں کبھی تو دماغ پھٹ جائیں" ———

لیکن زمانے کو دیکھنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ " ھٰذا مِن فَضلِ رَبّی " (گھر سے گھر تک : ۵۸) کے کرداروں میں سے ایک یہ بات کہے کہ : ———

"—— میں دیہات کو اپنے ملک کے آثارِ قدیمہ میں شامل کرتا ہوں کیونکہ مجھے یقین
ہے کہ جب بابر نے حملہ کیا تھا تو جب بھی یہ دیہات ایسے ہی تھے" ———

اور دوسری "اصول کی بات" کے کردار زمیندار کے منہ سے اُس وقت بے اختیار نکل جائے، جب بیل کے لیے بچھائی ہوئی چادر پر عبداللہ دوانی کی جگہ چونی ڈال دے : ———

"—— بھئی لوگو! — تم دیکھ رہے ہو اس بڈھے کو — تم سب نے ایک ایک دوانی دی ہے
اور اُس نے میرے سامنے چونی لا کر رکھ دی ہے۔ یہ فرق ہے پرانے اور نئے زمانے میں —
اسے کہتے ہیں وضع داری" ———

"زمانہ بدل رہا ہے، وہ اب بھی بدل رہا ہے، وہ آیندہ بھی یوں ہی بدلتا رہے گا" —— "زمانہ بڑا بدل گیا ہے، دادا!
— بڑا بُرا زمانہ آ لگا ہے دادا!" —— "کیا میرے مولا کی دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے!" —— "بڑا سخت زمانہ آنے والا ہے، زینو" اور پھر یہ کہ "یہ فرق ہے پرانے اور نئے زمانے میں۔ اسے کہتے ہیں وضع داری" ——

یہ سب آوازیں زندگی کو زندگی کی طرح دیکھنے اور اُسے دیکھ کر اپنا اضطراری ردِ عمل ظاہر کرنے والے ندیم کے افسانوں کے کرداروں کی آوازیں ہیں۔ اِن آوازوں میں دل کی دھڑکن اور کسک بھی ہے، تمناؤں اور آرزوؤں کی جھلک اور لگن بھی اور طمانیت اور مسرت کی رکاوٹ کا اظہار بھی۔ لیکن یہ ساری دھڑکن، کسک، جھلک، لگن، طمانیت اور مسرت کی آوازیں دراصل وہ آوازیں ہیں جو کرداروں کے دلوں سے اُٹھتی دکھائی دیتی ہیں حقیقت میں خود ندیم کے دل سے اُٹھتی ہوئی لہریں ہیں۔ جن کی شان یکتائی یہ ہے کہ ہمارے لیے کبھی کبھی یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ندیم کو بڑا فن کار کہیں یا بڑا انسان — اور میرے دل کی بات پوچھیے تو یہ ہے کہ اس طرح کسی نتیجے یا فیصلے پر پہنچنے کی کوشش فن کار ندیم کے ساتھ بھی ناانصافی ہے اور انسان ندیم کے ساتھ بھی — اس لیے کہ ناپ تول کی کوشش سے گزر چکنے کے بعد جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ندیم کی انسانیت اور ندیم کی فن کاری، دونوں اس طرح ایک دوسرے کے اندر جذب اور حل ہو گئی ہیں —

کہ دونوں کی قدر و قیمت میں بڑی متوازن اور خوش گوار ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔ انصاف کی ترازو کے جن دونوں پلڑوں میں انسانیت کی قدریں اور فن کاری کی قدریں رکھی گئی ہیں وہ پوری طرح ایک دوسرے کے برابر ہیں۔

یہ بات میں نے اب سے پندرہ برس پہلے سنتالیس سے پہلے کے افسانوں پر رائے ظاہر کرتے وقت کہی تھی اور پندرہ برس گزر جانے پر جب میں نے سنہ ۴۷ء کے بعد کے افسانوں کے تین مجموعوں کو شروع سے آخر تک پڑھا ہے میری بات جوں کی توں قایم ہے۔ "بازارِ حیات"، "برگِ حنا" اور "گھر سے گھر تک" کے افسانوں میں ندیم کو تلاش کیجیے تو اس کی یہ انفرادیت اور یکتائی پوری طرح ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ندیم انسان بھی عظیم ہے اور فن کار بھی عظیم اور دونوں عظمتوں کی سطح حیرت انگیز حد تک ایک سی ہے۔ ترازو کے دونوں پلڑوں کی سطح اب بھی پہلے کی طرح برابر ہے، اور ایسا اس لیے ہے کہ ندیم کا ظاہر اور باطن ایک سا ہے اور ہمارے لیے اس کی انسانی عظمت اور فن کارانہ عظمت کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں رہا۔ اس کی شخصیت کے انسانی رخ میں فن کی وہ لطافت، نزاکت، نرمی، لوچ اور لچک ہے کہ اس کی ذات محاسنِ فن کی مظہر بن گئی ہے اور شخصیت کے اس رخ میں جسے ہم فنی رخ کہتے ہیں، وہ خلوص، سچائی، دیانت اور وفاداری ہے کہ وہ انسانیت کی اعلیٰ ترین قدروں کا پیکرِ مجسم بن گئی ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے جذبے کی رو میں بہہ کر ندیم کی ذات اور ان کے فن کی بڑی شاعرانہ تصویر بنا دی، اور یہ کہ شاید اس تصویر کے رنگوں میں توازن باقی نہیں رہا۔ اس لیے کچھ باتیں ایسی بھی سن لیجیے جو کہنے سے پہلے معذرت ضروری ہے۔ بازارِ حیات، برگِ حنا اور گھر سے گھر تک کے افسانے پڑھتے وقت جہاں میں نے وہ کچھ محسوس کیا جس کا ذکر میں اب تک کر رہا تھا، بعض باتیں ایسی بھی دیکھی ہیں، جن کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان تینوں مجموعوں کے بعض افسانے، پورے کے پورے، اور بعض افسانوں کے جستہ جستہ حصے ایسے ہیں جو ایڈگر ایلن پو اور بیٹس (BATES) کے بتائے ہوئے اور چیخوف اور موپساں کے برتے ہوئے ضابطوں کا ساتھ نہیں دیتے! انھیں نظری اور عملی ضابطوں کو سامنے رکھتے ہوئے میرا جی یہ کہنے کو چاہتا ہے کہ "دار و رسن" (بازارِ حیات ۸۶)، "ہمبگ" اور "وحشی" (برگِ حنا ۱۰۱، ۱۳۵) نہ لکھے جاتے تو بہتر تھا۔ اس لیے کہ "دار و رسن" اتنی بھیانک اور اتنی ہولناک ہے کہ اسے سچ تسلیم کرنے کی ہمت نہیں پڑتی اور "ہمبگ" اور "وحشی" زندگی کے تجربے معلوم ہونے کے بجائے صاف صاف محض تخیل کی کارفرمائی کا نتیجہ دکھائی دیتے ہیں اور ان کی تخلیق اپنی ذات اور اپنے فن کی طلب کے بجائے مروت اور خارجی تقاضوں کی بنا پر ہوئی ہے یا شاید اس فنی انا کی تشفی کی خاطر جو فن کار کو بندھے ٹکے ضابطوں سے منحرف ہو کر اور ضابطوں کی شکست و ریخت کر کے ہی میسر و مطمئن ہوتی ہے۔ ندیم کے ساتھ بھی کبھی کبھی یہی ہوا ہے کہ ان کا فنی تجربہ سچ کی حدوں کو توڑ کر مشاہدے کی راستی سے بے نیاز ہو گیا ہے، اور اس نے "دار و رسن"، "ہمبگ" اور "وحشی" کی شکل اختیار کر لی ہے۔

سچ کی حدوں کو توڑ کر مشاہدے کی راستی سے نکل جانے والی یہ باتیں کہیں کہیں ان تینوں افسانوں میں دکھائی دی ہوں تو ندیم کے افسانوں کی بنیادی خصوصیت سچ ہے اور سچ پوچھیے تو ندیم کے افسانوں کا سب سے بڑا حسن تو یہی ہے کہ یہاں بات سچ کی حسین ترین صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے اور ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ندیم حسن کا شیدائی، اس کا پرستار اور اس کا دلدادہ ہے اور حسن جو روپ بھی دھارتا ہے ندیم کی نظروں نے اس کا پیچھا کیا ہے اور اس کی ادا ادا پہچانی ہے۔ اس کا روپ کنواری معصومیت اور بڑی عبادت گزاری کے اندر [illegible] اور دوسرا [illegible]

پرستش اور عبادت گزاری کا ذریعہ بھی سمجھا گیا ہے۔

انسان اللہ کی بہترین مخلوق ہے۔ اور اللہ کی اس سب سے اچھی مخلوق کا سارا حسن سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آ گیا ہے۔ سعادت کے بہترین کردار۔ افسانے تو حقیقت میں اور حسن پرست ذہن کے رومانی احساس کے ترجمان ہیں آنکھوں کے حسن اور ان کی کشش کے دل میں ڈوب جانے اور اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دینے والے افسانے ہیں ان کو پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ حسن کی دنیا کی سب سے برتر، سب سے دل کش، سب سے دل نواز، سب سے پاکیزہ اور سب سے مقدس حقیقت ہے۔ یہ حقیقت جب سامنے آ جاتی ہے تو آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اسے صرف آنکھ دکھائی دیتی ہے اور وہ طرح طرح کے حسن اور رنگ میں بھی اس حسن کا احاطہ نہیں کرتا۔

"۔۔۔ ہادی کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ تو ناز و بالکل ٹھیک تھی۔ آخر آج اس کی ان آنکھوں میں چوڑیاں کیوں چلنے لگیں؟ ـــــ اور وہ کتنی دیر تک بس اپنی بیٹی کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔" ـــــ (بیٹے بیٹیاں ـــ ۰)

"ـــ ان آنکھوں میں آگ کے شعلوں کا ننھا سا عکس جھانک رہا تھا۔ ان کی سیاہ آنکھوں میں آگ کی یہ چمک بالکل اس چراغ کی سی لگتی تھی جو گھپ اندھیری رات میں کہیں ٹمٹما رہا ہو۔ ـــــ یہ ہیں گل رخ کی آنکھیں۔

(بازارِ حیات ـــ ۴۲)

"ـــ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کتنے ہی چاندوں کے عکس تھے اور اس کے چہرے پر کتنے ہی چاند ہنسے جا رہے تھے۔" ـــــ یہ ہیں بدنام افسانے والی نوراں کی آنکھیں ـــــ

ـــــــ (بازارِ حیات ـــ ۱۳۴)

"ـــ کالی اور بڑی اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں جو ہم نے تصویروں میں دیکھی ہیں۔" یہ ہیں ہمارے فضل ربی والی مالن کی آنکھیں ـــــ

ـــــــ (گھر سے گھر تک ـــ ۴۲)

"ـــ بڑی بڑی بادامی آنکھیں پھیلیں اور مجھے نگل گئیں۔ ان آنکھوں میں دنیا کے سارے سمندر قربان ـــ کیا آپ نے ان سے جھلکتی ہوئی گہری راتوں میں آپ نے سمندری سفر کیا ہے؟ ـــ یہ ہیں ابراہیم فضل ربی والی ساجدہ کی آنکھیں جو مالن کی آنکھیں سے بہت ملتی جلتی تھیں، مگر وہ زیادہ کالی تھیں۔ ـــ

ـــــــ (گھر سے گھر تک ـــ ۷۰)

"ـــ میں نے اس کی آنکھوں کو اس کے سارے پیکر سے الگ کر کے دیکھا تو مجھے ان میں دو ایسی چیزیں نظر آ گئیں ـــ وہی ابہام جو خارشیں بھی ہے اور خمار بھی اور جب اس نے

پلکیں جھپکیں تو جیسے صدیاں گزر گئیں "۔۔۔۔۔ (یہ آنکھیں " بھاڑا " والی ملکھاں کی ہیں) جمہوریت کی شان ۔۔ گھر سے گھر تک ۲۱۳)

۔۔۔ اور " بھاڑا " میں ہر طرف خاموشی چھا گئی ۔ صرف ملکھاں کی آنکھیں بولتی رہیں ۔۔۔ دو کنپٹیوں کو چھوتی ہوئی لمبی ، کالی ، سوچتی ہوئی آنکھیں ، جو کسی ملکہ کے چہرے پہ ہوتیں تو سلطنت کی تقدیریں بن جاتیں "۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔ (گھر سے گھر تک ۔۔۔ ۲۱۰)

اور اسی ملکھاں کی شعلہ بار آنکھوں کا ایک رنگ یہ ہے کہ :۔۔۔

"۔۔۔ جب اُس کی بجھی ہوئی آنکھیں کھلیں تو جیسے وہ شعلے بن آئی تھیں "۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔ (گھر سے گھر تک ۔۔۔ ۲۲۱)

اور یہ ملکھاں کی یہی آنکھیں ہیں جنھیں دیکھ کر افسانہ نگار بے اختیار پکار اٹھتا ہے :

" اللہ اکبر ! یہ آنکھیں تو خدا کے وجود کا ثبوت تھیں "۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔ (گھر سے گھر تک ۔۔۔ ۲۱۸)

دل کو موہ لینے ، دل میں سما جانے اور صدا کے لیے اپنا پجاری بنا لینے والی آنکھوں کی جو تصویریں ہمارے سامنے ہیں ان سے محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایسے شخص کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں جس کی زندگی بس آنکھوں کا حسن دیکھنے اور اسی دیکھنے ہی کو مشغلۂ حیات سمجھنے میں بسر ہوئی ہے ، لیکن جنھوں نے ندیم کو چلتے پھرتے دیکھا ہے انھیں تو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ کوچہ و بازار میں سے آنکھیں جھکا کر گزر جانے والا یہ افسانہ نگار تو اس کا اہل ہی نہیں کہ وہ آنکھوں کو گھور کر یا جی بھر کر دیکھ لینے کے گناہ کا مرتکب ہو سکے ۔ ندیم کے انسانی مسلک میں مصلحتاً بھی جھوٹ بولنا ناقابلِ عفو تقصیر ہے ، اس لیے اس نے ملکھاں کی آنکھوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ اگر وہ ان آنکھوں کو جی بھر کر دیکھ لیتا تو وہ ان آنکھوں کی ہتک ہوتی ، البتہ اس پاک باز انسان نے آنکھوں کی عظمت اور تقدس کا اعتراف کرتے ہوئے بھی ایک ایسی بات کہہ دی ہے جو اس نیک دل انسان کے اندر چھپے ہوئے فن کار کے دل کی بات ہے ۔ یہ بات خود اُس کے لفظوں میں سنئے :۔۔۔

" میں نے ان چند لمحوں میں بڑی تفصیل سے اُس کی آنکھوں کا مطالعہ کیا "۔۔ چند لمحوں میں کسی چیز کا بڑی تفصیل سے مطالعہ کر سکنے کی استعداد پیدا کرنے ہی نے ندیم کو عظیم انسان سے عظیم فن کار بنایا ہے ۔ لیکن اس نقطۂ نظر سے اُس مطالعہ کی تفصیل کہنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ آنکھوں کے متعلق ندیم کا ایک واضح فلسفہ ہے اور اس فلسفے کی وضاحت ایک جگہ بڑی وضاحت سے کھل کر کی ہے ۔ ندیم کے الفاظ یہ ہیں :۔۔۔

۔۔۔ انسان کے جسم کا سب سے بلیغ حصہ اُس کی آنکھیں ہیں ۔۔ زبان سے جذبات کا اظہار ہوتا ہے ، یہ سچ بھی بولتی ہے اور جھوٹ بھی ۔ لیکن آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں کسی انسان سے ملتا ہوں تو سب سے پہلے میری آنکھیں اُس کی آنکھوں کو

ڈھونڈتی ہیں۔ ان آنکھوں میں کہیں مجھے سمندر نظر آتے ہیں اور کہیں صحرا۔
کہیں ان میں تارے چمکتے ہیں اور کہیں چراغ بجھتے ہیں۔ ایسی آنکھیں بھی ہوتی ہیں
کہ غور سے نہ دیکھو تو گناہ کا احساس ہونے لگے اور غور سے دیکھو تو ڈوب جاؤ۔"
—————— (گھر سے گھر تک۔۱۱۴)

آنکھوں میں ندیم نے سب کچھ دیکھا اور سب کچھ پایا ہے اور اسی دیکھنے اور پا لینے نے، انھیں اپنے گرد و پیش کی زندگی کا مبصر، مفسر، مصور، ترجمان اور وکیل بنایا ہے۔ ایسا وکیل مسرت و غم اور راحت و کلفت دونوں کی وکالت کو اپنا فرض جانتا ہے۔ زندگی میں جہاں کہیں بھی حسن ہے ندیم اُس کی وکالت کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ حسن کو اللہ کی دی ہوئی نعمت سمجھ کر اس سے پوری طرح لطف اٹھاؤ اور زندگی میں جہاں کہیں حسن نہیں یا جہاں کہیں کسی نے کسی کا حسن (جس کا ایک نام حق بھی ہے) چھینا ہے، اُسے اچھی زندگی بسر کرنے کے حق سے محروم کیا ہے، اسے مجبوری اور بے بسی کا صیدِ زبوں بنایا ہے، زندگی کو حسن سمجھنے والے ندیم کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ مظلوم، مجبور اور بے بسی کا وکیل بن کر سامنے کھڑا ہوا ہے اور اس وکالت میں ہمیشہ آنکھ کی گواہی کو سب سے سچی اور پکی گواہی سمجھتا ہے۔ ندیم کے نزدیک آنکھ دل کا آئینہ ہے۔ دل میں طوفان اٹھتے ہیں تو آنکھوں میں بھی طوفان اُمنڈ آتے ہیں۔ دل میں بہاریں آتی ہیں تو ان بہاروں سے آنکھیں شفق رنگ ہوجاتی ہیں۔ دل خوشیوں کی حرارت سے پگھلتا ہے تو آنسو موتی بن کر بکھر جاتے ہیں۔ دل سوزِ غم سے جلتا ہے تو آنکھوں میں شعلے رقصاں نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ندیم کے افسانوں میں آنکھ دل کی سفیر بھی ہے اور ضمیر کی زبان بھی۔ پرمیشر سنگھ کے "وہ آنسو جو مایوسی نے آنکھوں میں جمع کیے تھے خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے" (بازارِ حیات۔۔۔ ۲۷) شیرازہ "وائلن بجاتے بجاتے رونے لگی۔ پھر ایک دم اُس نے وائلن کو صوفے پر پھینک دیا اور دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔" (بازارِ حیات۔۔۔ ۴۷)

"اُس روز کو تم کیا سمجھو گے کہ مجھے ایمان کی حد تک یقین ہے کہ وہ صرف میرے لیے رو رہی تھی۔"۔۔۔ (زرشاہ کے اُن دیکھے آنسوؤں پر "خونِ جگر" والے مالک کا تبصرہ ۔ بازارِ حیات۔۔۔ ۸۷) "نبکاں نے کوئی جواب دینا ضروری نہ سمجھا وہ رو رہی تھی (بازارِ حیات۔۱۵۱) اُن کے (یعنی کفن دفن والے میاں سیف الحق) کے چہرے پر غیر قدرتی سی سرخی آگئی تھی اور داڑھی کے بالوں میں اٹکے ہوئے آنسو نئے آنسوؤں کے لیے جگہ خالی کرتے ہوئے اُن کے سینے پر ٹپک رہے تھے۔ (بازارِ حیات۔۔۔ ۱۹۳) ۔۔۔ اور جب روتی ہوئی زینو پڑوس میں جا کر بات کی ماں آئی تو زخمی پڑوسن بھی رو دی۔ (بازارِ حیات۔۔۔ ۲۵۷)۔ کیا ہوا؟ ۔۔کسی نے پوچھا اور پھر بھاگاں نے جیسے ایک فردہ سناتے ہوئے کہا۔۔۔ "بی بی رو رہی ہے۔" (برگِ حنا۔۔۔ ۳۹)

ندیم کے افسانوی کرداروں کی آنکھیں ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ وہ ہمیں اپنے پاس آنے اور ان کی تہ میں ڈوب جانے کی دعوت دیتی ہیں۔ اس دعوت (بلاوے یا کشش) میں ایک طرف تو حسن، جمال کے احساس کو دخل ہے، جس کا ذکر بڑی تفصیل سے اب تک ہوتا رہا ہے اور دوسری طرف اُن [illegible]

ہزاروں نے آرزو کی ہے مگر نوازی دیکھنے کو غم کا ترجمان ہے۔ یہی ندیم کی انسان دوستی اور دردمندی ہے، اس سے زیادہ کیا کہ معنی ہوں۔ ندیم افسانے میں معاملات اور مفاہیم کی ان کثرت نے جو رسے اُن کے افسانوں میں نرمی بھی پیدا کی ہے اور گرمی بھی، درمیزی اور گرمی کی یہی دونوں کیفیتیں ہیں جو کی بدولت رومانیت اور حقیقت پسندی کی حدیں جمال پرستی اور جذباتیت سے جا ملتی ہیں۔ یہ لکی یہی بات ندیم کے معاملے میں بھی ہوتی ہے۔

ندیم کی آنکھیں، جو کچھ دیکھنے کی آرزومند ہیں وہ مشاہدات کی زندگی میں انھیں نظر نہیں آتے، اس لیے اُن کی آرزو کی پیدا ہوئی حقیقت، ذرا سے نا حقیقت ہو جاتی ہے اور لوگ حقیقت کا یہ روپ دیکھ کر کبھی کبھی لوگ یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ افسانہ نگار جو کچھ ہمیں دکھا رہا ہے، ہماری دیکھی ہوئی دنیا میں اُس کا وجود نہیں۔ لیکن اعتراض کرنے والے اس راز سے بے خبر ہیں کہ افسانہ نگار نے جو کچھ آرزو کی آنکھ سے دیکھا ہے، اور جس کی تصویر اُس نے اپنے افسانے میں کھینچی ہے وہ اس کے لیے بھی ایک زندہ حقیقت ہے۔ وہ اُس تمام تجربے سے گزر چکا ہے جس میں اُس کا قاری اب تک بھٹک رہا ہے اور اس نے اُس سے ایسی باتیں بیان کی ہیں جو مشاہدے سے آگے بڑھ کر احساس اور ادراک کی باتیں ہیں ——— ایسی باتیں جو آرزومندی کے سبب استغراق کے غیر شعوری عمل کی بدولت عینی واردات سے حقیقی تجربات بن گئی ہیں۔ یہیں ندیم کے افسانوں میں کہیں کہیں حقیقت سے ماورا ایک اور حسین تر حقیقت کی چھوٹی چھوٹی تصویریں ملتی ہیں، جنھیں ندیم کے احساس فن اور احساس جمال نے تو بھرپور نگاہوں سے دیکھا ہے لیکن عام نظر ان کے حسن کو اپنی گرفت میں لینے سے قاصر ہے۔ ندیم کو اہلِ دنیا کی اس کوتاہی اور اس سے پیدا ہونے والی بے یقینی کو محسوس کیا ہے، اس لیے وہ لوگوں کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ جو آنکھوں نے دیکھا ہے وہ سچ ہے، لیکن اس سچ کو سچ کے روپ میں دیکھ سکنے کے لیے ایک خاص طرح کے مزاج کی تشکیل اور تعمیر ضروری ہے۔ ندیم نے حسن کی ماورائی حقیقتوں کو محسوس حقیقتیں بنانے کے لیے جو جتن کیے ہیں ان کا سراغ اُن کے افسانوں میں جا بجا ملتا ہے :———

"——— میرا ذہن اتنے مکمل حسن کو گرفت میں لانے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔"

——————— (بازارِ حیات ——— ۴۴)

"——— میرے دل میں آیا کہ اس انجنہ کو شان کو بتا دوں کہ اس کی بیٹی ناقابلِ یقین حد تک حسین ہے۔"

——————— (بازارِ حیات ——— ۴۵)

"——— مخاطب کو یقین دلانے کے لیے میں قسموں پر قسمیں کھا رہا ہوں کوئی چیز رہا ہے کہ شیراز دنیا کی سب سے حسین لڑکی ہے ———"

——————— (بازارِ حیات ——— ۶۰)

"——— ست محرابی کی تخلیق کرتے وقت قدرت نے اپنے اوپر کوئی الزام نہیں لینا چاہا تھا۔"

——————— (بازارِ حیات ——— ۱۳۱)

"——— جس نے ایسا حسن پچاس سال کی عمر میں اور کہیں دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹ جائیں۔"

——————— (بازارِ حیات ——— ۲۲۷)

"۔۔۔۔راحت علی نے چند مہینے پہلے جب ساجدہ کو پہلی بار دیکھا تھا تو اُسے پہلی بار یقین آیا تھا کہ اجنتا کے غاروں جیسی دیویاں آج بھی زندہ ہیں"۔۔۔۔

(گھر سے گھر تک ۔۔۔)

حسن کے حسین اور مقدس ہونے اور اُس کے قرب کی ساعتوں کو زندگی کی سب سے حسین اور سب سے پاکیزہ ساعتیں سمجھنے کا احساس اور ادراک ندیم کی رومانیت ہے ۔ آپ کا جی چاہے تو اسے کوئی عیب کی بات سمجھ لیجیے ، لیکن میرے نزدیک ایسا سمجھنا درست نہیں اور وہ یوں کہ حسن کے وجود کے اسی ادراک ہی نے اُسے عام انسانی زندگی کو ایسی حقیقت سمجھنے کا عادی بنایا ہے جس کا بسر کرنا انسان کے لیے بڑی اذیت اور بڑا عذاب ہے ، وہ اذیت اور وہ عذاب جس میں انسان نے خود ہی اپنے آپ کو مبتلا کیا ہے ۔ اُس کی توہم پسندی اور رواج پرستی ۔ طبقاتی اونچ نیچ ، رواج ورسم کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی دنیا میں ہر لمحے ہونے والا طبقاتی تصادم ۔ کشمکش اور پیکار اور اس سارے تصادم ، کشمکش اور پیکار کو جنم دینے اور مجبوروں اور بیچاروں پر غلبہ پا لینے والا استحصال کا خونیں نتیجہ ۔۔ یہ ہیں انسانی دنیا کے عذاب ، اور ندیم جسے قدرت نے صرف حسن کے روپ دیکھنے دکھانے کے لیے پیدا کیا تھا ، قسمیں کھا کھا کر آپ کو یہ یقین دلانے کے باوجود کہ انسان کے حسن میں "مسجدوں کی محرابوں اور گنبدوں کا سا تقدس ہے" ۔۔۔ (بازارِ حیات) اُس زندگی کا ترجمان بن گیا ہے جو انسان کے لیے عذابِ قیامت سے بھی بڑا عذاب ہے ۔ سناٹا کے افسانوں کا تجزیہ کرتے وقت بھی میں نے یہی بات کہی تھی اور یہی بات "سناٹا" کے بعد کے تینوں مجموعوں کے افسانوں سے بھی ظاہر ہے کہ قسامِ ازل نے جس ندیم کو حسن کے تقدس اور پاکیزگی کی گہرائیوں میں ڈوب جانے والی چشمِ بینا عطا کی ہے اُسی نے اُس کے سینے کو ایک دلِ دردمند کا مسکن بھی بنایا ہے اور یوں اُس کے افسانے اب بھی بیک وقت دل کش رومانیت اور تلخ حقیقت کے افسانے ہیں ۔ ندیم نہیں بدلا اس لیے اُس کی کہانیاں بھی نہیں بدلیں ۔

میرے نزدیک ندیم کی شخصیت کے دو پہلو ہیں اور دونوں میں اپنی اپنی اہمیت اور جاذبیت ہے ۔ ایک روپ آنکھوں کا روپ ہے اور دوسرا دل کا ۔ اور یہ دونوں روپ اُس کے افسانوں میں اب بھی اُسی طرح جلوہ نما ہیں جیسے ۱۹۵۲ء میں تھے ، اس فرق کے ساتھ کہ اب دونوں روپوں میں اب زیادہ نکھار نمایاں نظر آتا ہے اور اس نکھار کو ہم مختلف نام دے سکتے ہیں ، احساس کا نکھار جس کے معنی احساس کی شدت اور گہرائی کے ہیں ، اظہار کا نکھار ، جس کا دوسرا نام ہے بیان کی حسین اور دل کش شعریت اور طنز کی تیکھی تاثیر ۔ نکھار کی ان دل آویز صورتوں کا سرچشمہ افسانہ نگار کی آنکھوں کی سچائی اور دل کا خلوص ہے ۔ بازارِ حیات ، گھر سے گھر تک ۔۔۔ اور برگِ حنا کے افسانے سرتاسر اسی سچائی اور اسی خلوص کے مظہر ہیں ۔۔۔

میں اگر ندیم کے زیرِ بحث افسانوں کا خلاصہ دو جملوں میں بیان کروں تو کہوں گا کہ یہ کہانیاں زندگی کے زہر اور اُس کے تریاق کی کہانیاں ہیں اور یہ کہانیاں انسانیت اور فن کی بہت سی قدروں کی غیر واعظانہ تلقین کی کہانیاں ہیں ۔۔۔۔

اسلوب احمد انصاری

احمد ندیم قاسمی اور اردو افسانہ

پریم چند کے دور کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کی روایت کو آگے بڑھایا اور اسے سستے پروپیگنڈے کا آلۂ کار نہ بناتے ہوئے زندگی اور سماج کی سنجیدہ فنی تنقید کے لیے استعمال کیا، ان میں احمد ندیم قاسمی کا نام ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو افسانے نے بتدریج نہیں۔ بلکہ حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ترقی کی بہت سی منزلیں ایک ہی جست میں طے کی ہیں اور اس کے نشو و ارتقا میں غیر ملکی افسانوں کے ترجموں اور خود یہاں کی سرعت سے بدلتی ہوئی معاشی اور اجتماعی زندگی کے حالات نے خاصا حصہ لیا ہے۔ افسانے کا فن بڑا ریاض چاہتا ہے۔ اس میں ایک منفرد تجربہ، مشاہدے کی ایک قاش، تاثر کی ایک تھرتھراتی شعاع ہی بس کرتی ہے۔ لیکن یہ تجربہ، یہ مشاہدہ، یہ تاثر ایک جام جہاں نما ثابت ہوتا ہے۔ جس کی تجسیم کے وسیلے سے حقیقت کے بے شمار گوشے سمٹ کر روشنی میں ابھر آتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ نگار زندگی کے خلفشار میں سے چند جاذب نقطوں کو چن کر علیحدہ کر لیتا ہے اور پھر انھیں ایسی دل آویزی، شدتِ تاثر اور قطعیت کے ساتھ نمایاں کرتا ہے کہ پڑھنے والا ان پر بڑی خارجی اور اندرونی حقیقتوں کا ادراک کر سکے۔ غالب کے الفاظ میں قطرے میں دجلہ کا نظارہ کرنا اور دوسروں کو کرانا، افسانہ نگار کے لیے ایک بنیادی فنی تقاضا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ ندیم قاسمی کے یہاں شروع ہی سے ایک سنجیدہ مقصد کی جھلک ملتی ہے اور ان کا فن ایک مہذب اور تربیت یافتہ ذہن کی پیداوار ہے۔ ان کے ابتدائی اور بعد کے دور کے افسانوں میں یہ فرق ہے کہ پہلے مقصد کا اظہار بلا ہوتا تھا، اب فنی آداب کے پردوں میں چھپ چھپ کر سامنے آتا ہے۔ ان کے افسانوں کے تقریباً ایک درجن مجموعے اب تک منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب افسانے ایک سطح اور معیار کے نہیں ہیں۔ ایسا ہونا ممکن بھی نہیں۔ لیکن ان کا کوئی افسانہ ایسا نہیں، جسے محض حسنِ نگارش کی کرشمہ سازی کہا جا سکے، یا تفریحِ طبع، لذتیت اور برہنگی کے جذبے کی نمائش کا نتیجہ کہہ کر اس پر خردہ گیری کی جائے۔ کیونکہ ہر افسانے کی تعمیر کسی نہ کسی ایسے تجربے یا حادثے پر کی گئی ہے، جو انسانی روابط کے ڈھانچے کو سمت دیتا اور دور تک متاثر کرتا ہے۔ ان افسانوں میں سے بیشتر پنجاب کے دیہاتوں میں بسنے والوں کی زندگی کی مصوری کرتے ہیں۔ اس زندگی کے پیچھے برسوں کی روایات، نظامِ معیشت، عقائد اور توہمات کا سہارا ہے۔ اور افسانہ نگار اس فضا میں

سانس لینے والے کسانوں اور زمینداروں، ان کے بیوی بچوں، ان کے کھیت اور کھلیان، ان کی چوپال، ان کے کنوؤں، چشموں اور جانوروں تک سے ایسی ہمدردی اور دلچسپی رکھتا ہے۔ جو پریم چند کے بعد وہ کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتی۔ یہی ان افسانوں کی کامیابی اور تاثیر کا راز بھی ہے۔ اس لیے کہ جس زندگی سے افسانہ نگار کی واقفیت صحیح اور براہ راست ہو اسے اگر خام مواد کے طور پر کام میں لایا جائے۔ تخیلی قوت کو اس بنیاد پر عمل کا موقع دیا جائے۔ تو اس طرح حقیقت تخیل کی مطیع بھی رہے گی اور تابندگی بھی حاصل کرے گی۔ شاید افسانہ نگار نے یہ بھی محسوس کیا ہو کہ متوسط اور زیادہ تر نچلے طبقوں کی زندگی میں جو زمین سے زیادہ قریب رہتے ہیں۔ بنیادی انسانی محرکات کا مطالعہ جس بے ساختگی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، اتنا شاید ان لوگوں کے سلسلے میں ممکن نہ ہو، جن کی فطرتِ اصلی کو تہذیب کی چمک دمک ملوث کر دیتی ہے۔ شہری زندگی سے متعلق ندیم قاسمی کے افسانے کمزور ہیں۔ ان میں فنی ربط کی کمی ہے۔ کردار نگاری پر افسانہ نگار کی گرفت مضبوط نہیں اور نہ ان میں وہ رچاؤ ہے۔ جو مشاہدے اور نقطۂ نظر میں نکھار اور تیکھا پن پیدا کرتا ہے۔ "ھذا من فضل ربی" "بھرم" "بندگی بے چارگی" اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

ندیم قاسمی کے افسانوں میں ایک عملِ ارتقا ملتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شروع کے افسانوں میں وہ چیزوں کو جیسا دیکھتے ہیں، ان کی کم و بیش ویسی ہی عکاسی کر دیتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں کہ ان کے محرکات کا پتہ لگائیں اور انھیں بے نقاب کریں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ محض صورتِ حال میں افسانہ نگار کی دلچسپی کچھ عرصہ بعد کرداروں میں دلچسپی کا روپ دھار لیتی ہے۔ پھر یہ آخری دلچسپی بھی اعمال کے مطالعے سے تجاوز کر کے داخلی کیفیتوں کے تجزیے میں بدل جاتی ہے۔ اس طرح انسانوں، اداروں اور مروجہ اور جکڑے ہوئے نسلی اور طبقاتی میلانات کے خلاف، احتجاج، جھلاہٹ، اور رنجیدگی ایک ایسے خاموش اور موثر طنز میں بدل جاتی ہیں، جس کی نوک تیز اور جس کا وار بھرپور ہوتا ہے۔ ندیم قاسمی کے افسانوں میں متانت، میانہ روی، دل سوزی اور سمت و رفتار کا توازن ہمیشہ نمایاں خصوصیات رہی ہیں۔ ان سب کی تہ میں انسان دوستی کا وہ جذبہ ہے، جو انھیں گرد و پیش کی اٹل حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کرنے دیتا۔ انسان اپنے عقائد، تعصبات اور برتاؤ میں جیسا کچھ ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔ لیکن یہ خواہش بھی افسانہ نگار کا دامن نہیں چھوڑتی کہ وہ ان بندشوں سے اونچا اٹھ کر ان امکانات کو آزمائے اور پورا کرے، جو اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔

ندیم قاسمی کے افسانوں کے موضوعات وہ معاشی ناہمواریاں ہیں، جو ہماری زندگی میں قدم قدم پر موجود ہیں، ان کی وجہ سے نظم و نسق کی بے شمار شکلیں بھیس بدل بدل کر ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں، اور سیاست اور مذہب کے ٹھیکیدار ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر انھیں ہوا دیتے رہتے ہیں۔ جنگ کی تباہ کاریاں ہیں، جن کا نشانہ وہ ضرورت مند بنتے ہیں، جو اپنی مادی خصوصیات سے مجبور ہو کر بخوشی حکومت کے مقاصد کی برآری کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیتے ہیں۔ فسادات ہیں، ان کے [illegible]ب ہیں، جو آزادی کی نیلم پری اپنے جلو میں لے کر آئی تھی۔ انتقام اور رقابت کی وہ آگ ہے جو قبائلی انسان کے کردار میں اتنی نمایاں تھی اور اسے معمولی سے عذر پر انسانوں کو خاک و خون میں ملا دینے پر اکساتی رہتی تھی۔ یہ آگ آج بھی دیہاتوں میں رہ رہ کر بھڑک اٹھتی ہے اور فطرتِ انسانی کی وہ عجوبہ برائیاں ہیں، جو نہ انسان کو ایک مرکز پر ٹھہرنے دیتی ہیں، اور نہ کسی ایک وسیع شاہراہ پر، چاہے وہ اخلاق کی ہو یا مذہب کی یا انسانیت کے سوز و ساز کی، گام زن ہونے دیتی ہیں۔ عشق و محبت کا موضوع انسان کی زندگی میں اپنی مرکزیت کی وجہ سے ہمیشہ موجود رہا ہے، اور ہمیشہ

موجود رہے گا۔ لیکن ندیم قاسمی کا کوئی افسانہ محض عشقیہ افسانہ نہیں کہلایا جا سکتا کیونکہ عشق و محبت کے جذبات کی عکاسی ان کے یہاں ہمیشہ سماجی محرکات کے تانے بانے سے متاثر ہوتی ہے۔ ان کے یہاں نہ اس رومانیت کے لیے کوئی گنجائش ہے، جو خواہشات کو بے لگام چھوڑنے سے پیدا ہوتی ہے، اور نہ اس لذتیت کے لیے جو ذہنی اور اخلاقی عدم توازن تک لے جائے۔ ان کے یہاں صرف محبت کا رومان ہی نہیں، اس کی محرومیاں اور مجبوریاں بھی ہیں۔ اس لیے شاید یہ کہنا مناسب ہو کہ ندیم قاسمی کے افسانوں میں انسان کی جنسی اور حیاتی زندگی، محض حیاتیاتی سطح پر نہیں، بلکہ ایک وسیع چوکھٹے کے اندر اپنی جگہ رکھتی ہے۔ جہاں زندگی کے دوسرے مطالبات اور ذمہ داریاں بھی ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ ان کے یہاں جذبات اور احساسات کی دھوپ چھاؤں بہت سے اور متنوع عناصر کے پس منظر ہی میں دیکھی جا سکتی ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا، ندیم قاسمی کے یہاں افسانوں میں متضاد رنگ بھی ملتے ہیں، اور ان کی تخلیق یک عمل ارتقا سے بھی گذری ہے۔ وہ کسی مخصوص فارمولے کو اپنا کر یا کسی نظریے کا پرچار کرنے کی خاطر افسانہ نہیں لکھتے۔ لیکن زندگی میں چاروں طرف جو ظلم اور ناانصافی، جو پریشانیاں اور محرومیاں بکھری ہوئی ہیں، اور فطرتِ انسانی کے جو پیچ و خم ان کے تجربے کی زد میں آتے ہیں، وہ انھیں تخلیق پر اکساتے ہیں۔ ان کے ایک افسانے "میرا دیس" (طلوع و غروب) کو لیجیے۔ اس میں اس حقیقت کی کسی حد تک براہِ راست ترجمانی ہے کہ غربت اور طبقاتی ناہمواری کی وجہ سے کس طرح زبردست زیردست پر غالب رہتا ہے، اور اسے اپنی کام جوئی کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اسی موضوع پر ایک اور افسانہ ہے "جب بادل امڈے" (درو دیوار) اس افسانے کا ماحول بھی دیہات کا ماحول ہے۔ اور یہ ایک مہاجر کی داستان ہے۔ جو اپنا سب کچھ کھو کر اپنے وطن کو خیرباد کہتا ہے لیکن نئے وطن کا زمیندار بھی بہرصورت زمیندار ہی ہے۔ وہ اپنی سرشت کو بدل نہیں سکتا۔ اور مزارعے اس کی چیرہ دستیوں کے مقابلے میں حریفِ ناتواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اگر وہ اپنی پوری قوت مجتمع کر کے مدافعت کی کوشش بھی کریں تب بھی انھیں ناکامی اور ذلت کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ افسانہ "میرا دیس" سے بہتر ہے۔ لیکن "کنگھے" اور "پکا مکان" (طلوع و غروب) دونوں اختصار کے باوجود زیادہ کامیاب اور موثر ہیں۔ کیونکہ ان دونوں میں معاشی تنگ دستی کو جاہ و حشمت اور اثر و رسوخ کے مقابلے میں پسپا ہونا پڑتا ہے۔ "جب بادل امڈے" اور "پکا مکان" میں جو بات مشترک ہے، وہ یہ کہ نچلے اور پس ماندہ طبقے اوپر اٹھنے اور اپنی جائز خواہشات کی تسکین کے لیے کتنی بھی جدوجہد کریں، وہ بالادست قوتوں سے شکست کھا جاتے ہیں، جن کی جڑیں ہمارے نظام میں گہرے طور پر پیوست ہیں اور جنھیں حکومت اور مذہب دونوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ "کنگھے" میں ناداری، بے کسی اور جہالت مجسم ہو کر سامنے آ گئی ہیں۔ لیکن "موچی" (بازارِ حیات) ان سب افسانوں میں ممتاز ہے۔ اس میں منظم طور پر کوئی احتجاج نہیں ہے۔ لیکن نچلے طبقے کے ایک مزدور نادر کی آرزوؤں اور اس کی محنت اور جائز حق خدمت کی جس طرح پامالی ملک زیلدار راجہ شیر خان کے ہاتھوں ہوتی ہے، اسے دیکھ کر دل پر گھونسا سا لگتا ہے۔ اسی طرح "اصول کی بات" (گھر سے گھر تک) میں جب ایک زمیندار گرد و قریب کے سارے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ایک مصیبت زدہ کسان کی لڑکی کو اپنی حرص و آز کا نشانہ بنانے کا عزم کرتا ہے، تو اس پورے معاشرتی نظام سے، جس میں انسان محض مہروں کی طرح استعمال کیے جاتے ہیں، شدید نفرت ہو جاتی ہے۔ اس مختصر سے افسانے میں گاؤں کے پورے ماحول اور زمیندار کی اس ماحول میں اہمیت کو جزئیات نگاری کے آئینے میں بڑی خوبی کے ساتھ ابھارا گیا ہے۔ افسانے کے عنوان میں جو

تیکھا طنز چھپا ہوا ہے، اس کا راز آخر میں کھلتا ہے۔

یہاں ایک اور افسانے کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ اس کا عنوان ہے "کنجری" (زمستان)۔ غربت کے اثرات سے زیادہ اس افسانے میں اس عمل کو واضح کیا گیا ہے، جس کے ذریعے روح پر کثافت کی تہیں چڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی اصلی صورت پہچانی نہیں جاتی۔ مردار اور اس کی ماں عرصے سے جنس فروشی کا کاروبار چلاتے رہے ہیں، اور اس میں اتنے ڈوب چکے ہیں کہ ان کی معمولی سی قوتِ امتیاز بھی بالکل ختم ہو گئی ہے۔ وہ دونوں مردار کی نوجوان بیٹی کمالاں کو جس بے غیرتی کے ساتھ گناہ کی دلدل میں دھکیلنے کی کوشش کرتے ہیں، اس سے گھن آنے لگتی ہے۔ پھر کمالاں کی مدافعت جس طرح رفتہ رفتہ کمزور پڑتی جاتی ہے، وہ عبرت انگیز بھی ہے اور حقیقت پسندانہ بھی۔ آخر آخر میں کمالاں غربت اور ناداری سے مجبور ہو کر اس راستے کی طرف بڑھتی ہے، جسے وہ شروع میں نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس مجموعے میں "رئیس خانہ" ایک منفرد کا افسانہ ہے۔ غربت کے زیرِ اثر انسانی بے بسی کی ایک دل دوز تصویر ہے۔ جسے انتہائی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں "رئیس خانے" کے مادی اور طبعی وجود کو دلکش پس منظر اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات کی روشنی میں ابھارا گیا ہے۔ اس میں پہاڑی میاں بیوی، یعنی فضلو اور مریاں کی محبت کی سادگی، معصومیت اور ایثار کی تصویر بھی ہے، اور یوسف جیسے رئیسوں کے چونچلے اور فریب اور ریاکاری کا عکس بھی ہیں۔ افسانے میں تجسس کا عنصر بھی ہے، کیونکہ آخر وقت تک یہ قیاس کرنا مشکل ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ لیکن اس پُرسکون اور پُرفریب ماحول سے زیادہ اہم جو یوسف مریاں کو اپنے دامِ تزویر میں گرفتار کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے، جذبات اور حالات کی وہ کشمکش ہے، جس میں فضلو برابر ہچکولے کھاتا رہتا ہے۔ حق و صداقت اور گناہ کی ترغیب کے درمیان جو آویزش اس کے دل میں پیدا ہو کر مختلف مرحلوں سے گذرتی ہے، اور جس طرح فضلو اور مریاں کی ایک دوسرے سے محبت اور ایک دوسرے کے لیے ہمدردی اور رفاقت کا جذبہ (جو کہانی کے آخر میں شکست و ریخت کے باوجود عود کر آتا ہے) یوسف کی عیاری اور جنسی بھوک سے مات کھا جاتا ہے اسے عبرت انگیز فنکاری کے ساتھ ابھارا گیا ہے۔ افسانے کا بہترین اور آخری فیصلہ خود فضلو ہی کر دیتا ہے۔ "میری نوری مجھے دھوکہ دے گئی مریاں" فضلو نے رکتے رکتے کہا۔ یہ ہر اعتبار سے ایک کامیاب افسانہ ہے۔

اسی طرح "ثواب"، "دگیر سے گھر تک" اور "الحمد للہ" (سناٹا) بھی قابلِ ذکر ہیں۔ "ثواب" میں فضا قابلِ توجہ ہے۔ چھیدو کے کنوئیں میں ڈوب کر مرنے کی وجہ سے پورا گاؤں غمگینی کی چادر میں لپٹا ہوا ہے۔ اور فضا بوجھل اور اداس سی لگ رہی ہے۔ گاؤں کے سب رہنے والے کرماں کی مصیبت میں برابر کے شریک اور اس کے لیے ہر جتن کرنے کے لیے تیار ہیں۔ پھر اگر ایک طرف کرماں کے دل میں امید و بیم کی متضاد کیفیات کی مصوری کی گئی ہے، تو دوسری طرف ہماری نظریں اس بے حسی اور بے تعلقی کو بھی دیکھ لیتی ہیں، جو محض مذہب کے خول سے چمٹے رہنے والوں کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ان کی انسانیت کو جلا دینے کی بجائے انھیں محض مشین کا ایک پرزہ بنا دیتی ہے۔ ملّا رحیم داد اسی ذہنیت کا نمونہ ہیں۔ "الحمد للہ" میں مولوی ابوالبرکات اپنی بنیادی انسانی ضروریات پوری کرنے کے لیے چودھری فتح داد کے لطف و کرم پر تکیہ کرتے ہیں۔ اور ان "کھتی لے وظیفوں" پر جو ان کے معتقدین ان کی خدمت میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ایک بیٹی مہرن کی شادی انہی سہاروں کی بدولت بخیر و خوبی انجام پاتی ہے لیکن اب انھیں دوسری بیٹی [illegible] کی شادی

کی فکر کھانے لگتی ہے ۔ رہنے سہنے کے پرانے طور طریقوں اور سوچنے اور عمل کرنے کے انداز میں تبدیلی آ گئی ہے ۔ جس کا اثر مولوی ابل کی کسبِ معاش پر بھی پڑا ہے ۔ اس دوران میں مہرن کے یہاں سے ولادت کی خبر آتی ہے اور مولوی ابل اور ان کی بیوی جی مسوس کر رہ جاتے ہیں ۔ کیونکہ آخر بیٹی کے ہاں خالی ہاتھوں کیسے جائیں ۔ فتح داد خاں اپنی علالت کے زمانے میں بھی مولوی ابل کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے رہے ہیں ۔ جب آخری بار مولوی ابل چودھری صاحب کی مزاج پرسی کے لیے جانے کا ارادہ کرتے ہیں تو ان کے مرنے کی اطلاع انہیں ملتی ہے ۔ تو اس خیال سے اچھل پڑتے ہیں کہ ان کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں جو کچھ ہاتھ آئے گا اس سے چشمِ زدن میں بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے ۔

> "اور مولوی ابل ان بجھتے ہوئے لہجے میں چلایا 'مبارک ہو نارف کی ماں! تم نواسے کے جوڑے کو رو رہی تھیں ۔ اللہ جل شانہ نے چولے، چینی اور ٹوپی تک کا انتظام فرما دیا ۔ جنازے پر کچھ نہیں تو بیس روپے تو ضرور ملیں گے۔" (صفحہ ۱۴۸)

سچے مذہبی آدمی ہونے کے باوجود مولوی ابل آخر پیٹ کے تقاضوں کو کہاں لے جائیں ۔ مذہب کے ذریعے تزکیہ نفس ممکن بھی ہے اور ہوتا بھی رہتا ہے ۔ لیکن اس سے مادی ضروریات کی تکذیب کیسے کی جا سکتی ہے ۔ لیکن اس کے فوراً ہی بعد ایک دوسرا ڈرامائی موڑ آتا ہے ، جو عبرت ناک بھی ہے اور بصیرت افروز بھی :

> "اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی ابل کو گردن سے دبوچ لیا ۔ اس کی اوپر اٹھی ہوئی پتلیاں بہت اوپر اٹھ گئیں ۔ پھر ایک لمحے کے دردناک سناٹے کے بعد مولوی ابل جو مردے کے چلا چلا کر رونے کو ناجائز اور خلافِ شرع قرار دیتا تھا ، چلا چلا کر رونے لگا ۔ اور بچوں کی طرح پاؤں پٹختا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر باہر بھاگ گیا۔" (صفحہ ۱۴۹)

"[illegible]آب" کے مقابلے میں یہ افسانہ یقیناً زیادہ گٹھا ہوا اور زیادہ پختہ ہے ۔

جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کے سلسلے میں ندیم قاسمی نے کئی افسانے لکھے ہیں ۔ علاوہ اس کشت و خون اور مالی نقصان کے جو جنگ اپنے ساتھ لاتی ہے ، اس کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ بھی ہے کہ فوجی بھرتی پر جو چیز نوجوانوں کو آمادہ کرتی ہے وہ غربت اور افلاس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا جذبہ ہوتا ہے ۔ اور پھر اگر سپاہی میدانِ جنگ میں ہلاک ہو جائیں ، تو ان کے وارثوں کو پنشن بھی ملتی ہے ۔ اور یوں بے کسی کے مارے یہ نوجوان خوشی خوشی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے آپ کو تباہی اور موت کے منہ میں جھونک دیتے ہیں ۔ "سپاہی بیٹا" (در و دیوار) "بابا نور" اور "ہیرا" (بازارِ حیات) اس سلسلے میں تین قابلِ توجہ مطالعے ہیں ۔ پہلے دو نسبتاً سادہ ہیں اور تیسرا پیچیدہ ..... لیکن ان تینوں میں جو بات مشترک ہے ، وہ نفسیاتی گرہیں ہیں ، جو جنگ سے متاثر ہونے کی وجہ سے سپاہی کی بوڑھی ماں ، بابا نور اور دریام کے اندر پیدا ہو گئی ہیں ۔ دریام کا ذہن ، تیسرے افسانے میں ، جنگ کی خونریزی اور بربریت سے اس حد تک متاثر ہوا ہے کہ نہ صرف اس کی شخصیت میں سینکڑوں الجھاؤ پیدا ہو گئے ہیں ۔ بلکہ شخصیت بالکل چکنا چور ہو گئی ہے ۔ اس کی بیوی اور بچے بہرام کی زندگی بھی اس کے غیر فطری اور وحشت ناک طرزِ عمل اور رویے کی وجہ سے اجیرن ہو جاتی ہے ۔ "دار و رسن" (بازارِ حیات) میں موت ایک دوسرے دروازے سے داخل ہوتی ہے ۔ زندہ انسان کو پھانسی پر چڑھانے کا پیشہ تختو کو ورثتاً اپنے باپ سے

ملا تھا۔ متواتر تجربے نے موت کے سلسلے میں اس کے رویے کو خلافِ معمول بنا دیا ہے۔ پچاسی پر چڑھانے سے جو اذیت اور ایذا رسانی کا تجربہ کسی شخص کو ہو سکتا ہے، اسے اس نے اپنے لیے "دشمن کو گلاب کا پھول پیش کرنے اور ہاتھ جوڑ کر، آنکھیں جھکائے کہنے" کہ مجھے معاف کر دینا دوست" متوازن بنا لیا ہے۔ لیکن جب اسے یہ کام خود اپنے بیٹے خیرو کو سولی پر چڑھاتے وقت کرنا پڑتا ہے، تو اس وقت یہ سہارا بالکل کام نہیں آتا۔

ندیم قاسمی فطرتِ انسانی کے بہت اچھے نبض شناس ہیں۔ انسان اپنے آپ کو جس انداز سے دھوکہ دیتا اور اپنے لیے جھوٹے سہاروں میں تسکین کا پہلو تلاش کر لیتا ہے، اس کی بہت اچھی نشاندہی ان کے افسانوں میں ہمیں ملتی ہے۔ "گھر سے گھر تک" اس کی ایک بین مثال ہے۔ یہ افسانہ بظاہر مزاحیہ لیکن دراصل عبرت ناک ہے۔ اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اپنی اصلی حالت کو چھپانے اور دوسروں کی نظروں میں عزت اور اعتبار حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ اور دوسروں کو کس کس انداز سے فریب میں مبتلا کرتا ہے۔ "فالتو" (گھر سے گھر تک) میں وہ کشمکش نمایاں کی گئی ہے جو جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ہمیشہ رہی ہے۔ جوانی میں جذبات عقل پر غالب آجاتے ہیں۔ اور بڑھاپا اور تمنا، دستی اگر ایک جگہ جمع ہو جائیں تو انھیں شباب کی سرمستیوں کے سامنے پسپا ہونا پڑتا ہے۔ پیر بخش اور اس کی بیوی اور حبیب احمد اور خاتون کے نام کا تانا بانا اسی راز کو فاش کرتا ہے۔ اس افسانے میں بہت سے نازک موڑ آتے ہیں۔ حبیب احمد اور خاتون کے رویے پر دل شکستہ پیر بخش کا ایک تاثر یوں ادا کیا گیا ہے:

> "پیر بخش کو یوں لگا کہ اس نے گھر کے باغیچے کے سارے پھول نوچ کر پھینک دیئے ہیں اور ہر طرف پودوں کے ننگے خنجر اُگے ہوئے ہیں۔ سناٹے کو توڑنے کے لیے وہ یونہی چار پائی سے کو گھسیٹتا اس گوشے میں لے آیا، جہاں حبیب احمد کی شادی کے بعد نیک بخت ورس کے کھٹولے رہتے تھے۔ اور جہاں زاکھ خالوں کے لیے چٹائی بچھی تھی"۔ ——— (صفحہ ۱۸۷)

ازدواجی زندگی کی وہ ناہمواریاں جو عمر کے تفاوت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ "بیٹے بیٹیاں" (برگِ حنا) میں دکھائی گئی ہیں۔ یہاں جذبات کا مدوجزر خارجی حالات کے پیچ و خم سے منسلک ہے۔ اور جوان کے فطری احساسات کو دبا کر نا خوشگوار معاشرت اور پیش بندیوں کو توڑ کر جس طرح امنڈ پڑتے ہیں۔ انھیں بہت ضبط اور سلیقے کے ساتھ بے نقاب کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں عمل اور کردار دونوں ایک مبہم فضا کے اسیر ہیں۔ افسانہ بہت آہستگی اور نرم روی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اور بیشتر باتوں کے سلسلے میں محض سرگوشی کا لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ البتہ ہر دی کہانی کے بیٹے اور بیٹی کی بات نکلتی ہے تو عمل میں تیز رفتاری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ بھید بھی کھلتا ہے کہ ایک عارضی سمجھوتے کے باوجود جو ضرورت اور حقیقت نے عاید کیا ہے، جبلی تقاضے اپنی نکاس کے لیے راستہ نکال لیتے ہیں۔ یہی کیفیت "سرِ بازار" میں جذبات ملتی ہے۔ اور جوانی کی سرمستی اور خود سری کے سامنے ماں باپ کی محبت بالآخر سپر ڈال دیتی ہے۔

دو اور بہت اچھے نفسیاتی مطالعے "ماتم" (برگِ حنا) اور "کفن دفن" (بازارِ حیات) میں ملتے ہیں۔ پہلے افسانے میں ایک شادی شدہ جوڑے کی باہمی محبت اور اٹھکیلیوں کا نقشہ بہت پیار کے ساتھ اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پھر میاں جی کے مرنے کے بعد ان کی بیوی پر فرطِ غم کی وجہ سے سکتے کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔

کیفیت کا اظہار کسی طرح ممکن نہیں۔ ماضی کی کتنی بھولی بسری یادیں دماغ میں کلبلانے لگتی ہیں؛ مگر جب سودا تا آنکہ وہ پلیٹ کے کرچی کرچی ہو جانے سے جو میاں جی نے ایک دفعہ خریدی تھی، "جس کے وسط میں بھرے بھرے جسم کی ایک چینی لڑکی کی تصویر تھی، جو انگور کی بیلوں کے حاشیے میں کھڑی مسکرا رہی تھی"۔ وہ بند ٹوٹ جاتا ہے۔ جس پر بیوی کی جذباتی وگذشت اور تشدد انحصار ہے۔ یہ پلیٹ رومان اور جنسی لطافت کی بے شمار مرئی اور غیر مرئی کیفیتوں سے وابستہ ہو گئی تھی۔ ور اسے اس افسانے میں ایک علامتی حیثیت حاصل ہے۔ "کفن دفن" میں کہانی کا تانا بانا بڑی ہوشیاری سے بنا گیا ہے اس کے آغاز اور انجام دونوں میں ایک اچانک پن ہے۔ غفورے کی مردہ بیوی "کلی" کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں میاں سیف الحق کی تیق القلبی اور جذباتی شدت کا مظاہرہ جس پر بظاہر ان کے گہرے مذہبی احساس کی چھاپ لگی ہوئی ہے، دراصل ایک بھی غم اور نفسیاتی سانحہ کا خون ہے۔ جو ان کے جوان بیٹے حامد کے بے کسی کی حالت میں مارے جانے سے انہیں پہنچا ہے۔ غفورے پر جب یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے تو اس کے اندر سوئی ہوئی خودی جاگ اٹھتی ہے اور اس کی غیرت کو کچوکے دیتی ہے۔ وہ میاں جی کا شرمندۂ احسان ہونے اور اس کا اعتراف کرنے کے باوجود ان کی خیرات انھیں واپس لوٹا دیتا ہے۔ اور ایسا کرنے کے بعد اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے:

> "میاں جی، دیکھیے، خفا نہ ہوجیے۔ آپ نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے، میں ایسا کمینہ نہیں ہوں کہ اس احسان کو بھول جاؤں۔ پر بات یہ ہے میاں جی کہ آپ نے تو کلی کی جگہ حامد میاں کو دفن کیا تھا۔ اور میری کلی تو وہیں سڑک کے کنارے بے کفن پڑی رہ گئی۔ ان روپوں کو چاہے آپ نالی میں پھینک دیجیے۔ پر میں نے تو آج ہی اپنی کلی کو اپنے ہاتھوں سے دفنا دیا ہے میاں جی"
> (صفحہ ۳۱۰)

میاں سیف الحق کا کردار پیچیدہ ہے۔ کیونکہ اس میں مختلف محرکات ایک دوسرے میں اس طرح ضم ہو گئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے۔ محرکات کی اسی گنگا جمنی میں ان کی شخصیت کی دوئی کا راز مضمر ہے۔

شروع میں کہا گیا تھا کہ نچلے طبقوں کی زندگی میں ابھی تک اس بربریت کے آثار ملتے ہیں، جو قبائلی انسانوں کے ساتھ مخصوص تھی۔ "تیرا" اور "گنڈاسا" دونوں میں انسانی فطرت کے اسی مظہر کو خوردبینی مشاہدے کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ "تیرا" میں جذبات کی توانائی، ردِ عمل کی شدت، اور انتقام کی آگ ملتی ہے۔ یہی بات "گنڈاسا" میں بھی ہے۔ وہی خون آشامی، وہی تندی، وہی حرارت اور جوش۔ لیکن اس میں ایک بہت ہی نازک نفسیاتی حقیقت کی ترجمانی بھی کی گئی ہے۔ یہ وہ ردِ عمل ہے، جو مولا بخش کے دل پر گنڈے کی منگیتر راجو کے حسن کا ہوتا ہے۔ یہ ردِ عمل ایسا غیر شعوری، براہ راست اور صریح ہے کہ مولا اپنی ساری ترنگ بھول جاتا ہے:

> "اور مولا نے دیکھا کہ راجو کی کنپٹیوں پر سنہرے روئیں ہیں، اور اس کی پلکیں یوں کمانوں کی طرح مڑی ہوئی ہیں جیسے اٹھیں گی تو اس کی بھوؤں کو مس کر لیں گی۔ اور ان پلکوں پر گرد کے ذرے ہیں اور اس کی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے موتی کی نوک کے سے قطرے چمک

رہے ہیں۔ اور نتھنوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گھی کی بجائے گلاب سونگھ رہی ہو۔ اس
کے اوپر کے ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے۔ اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان
ایک تل ہے۔ جو کچھ یوں اچٹا ہوا سا لگ رہا ہے۔ جیسے پھونک مارنے سے اڑ جائے گا —
کانوں میں چاندی کے بُندے انگور کے خوشوں کی طرح لس لس کرتے ہوئے لرز رہے ہیں۔
اور ان بندوں میں اس کے بالوں کی ایک لٹ بری طرح الجھی ہوئی ہے۔ موئے گنڈاسے
والے کا جی چاہا کہ وہ بڑی نرمی سے اس لٹ کو چھڑا کر اس کے کان کے پیچھے جما دے یا چھڑا کر
یونہیں چھوڑ دے یا اسے اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ایک ایک بال کو گننے لگے یا ...

(ضمنی ت ۱۹۰، ۹۷)

وہ گنڈاسے سے میر اپنی تحقیر کھانے کے باوجود کوئی جوابی کارروائی نہیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا ہے۔ ان دونوں افسانوں میں کردار نگاری اور جذبات کے اتار چڑھاؤ کے علاوہ، وہ فضا آخر میں بھی بہت اہم ہے جس سے قبائلی دور کے سماج کو پہچانا جا سکتا ہے۔ اس میں نسلوں تک سے انتقام لینے، اپنی آن کے لیے خم ٹھونک کر اڑنے اور انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح قتل کر دینے سے نہ جھجکنے کو قابلِ فخر اعمال کا درجہ حاصل ہے۔ یہاں زندگی کی ریت اور رسم ہی ایسی ہے کہ ہر چیز صاف اور کھلی ہوئی ہے۔ محبت بھی اور عداوت بھی، شقاوت بھی اور ترحم بھی، وفا شعاری بھی اور کینہ پروری بھی ——

تقسیم سے متعلق فسادات پر اردو میں کئی اچھے افسانے لکھے گئے۔ مثلاً بیدی کا "لاجونتی"، احمد عباس کا "سردار جی" اور پریم ناتھ در کا "اخ تھو"۔ اس موضوع پر ندیم قاسمی کے دو افسانے قابلِ ذکر ہیں۔ یعنی "میں انسان ہوں" (دردِ دیوار) اور "پرمیشر سنگھ" (بازارِ حیات)۔ "اخ تھو" اور "میں انسان ہوں" میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ اول الذکر میں زہرناکی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ "میں انسان ہوں" زیادہ متوازن اور بعض لیکن تاثیر میں کم نہیں ہے۔ اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ "پانی کے ایک گھونٹ" کو رمز کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اس ازلی اور ابدی تڑپ کی نشان دہی کرتا ہے، جو انسان کے دل میں انسانیت کے بقا اور تحفظ کے لیے موجود ہے۔ لیکن فسادات میں، جن کی وجہ سے انسانی شخصیت بالکل مسخ ہو کر رہ گئی ہے، اور تمام آدرشوں کے پرخچے اڑ گئے ہیں، پانی کے اس گھونٹ کو وقتی طور پر انسان کے لیے ناممکن الحصول بنا دیا ہے۔

"پرمیشر سنگھ" کو درجۂ اول کی تخلیق ماننا مبالغہ نہ ہوگا۔ اول الذکر افسانے یعنی "میں انسان ہوں" کی عمومیت ایک خطابی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یا یہ کہیے کہ "میں انسان ہوں" میں صرف محشرِ جذبات ہے۔ "پرمیشر سنگھ" میں تاثرات واضح کرداروں اور صورتِ حال کی شکل میں ڈھل کر سامنے آئے ہیں۔ اسی طرح "سردار جی" میں تصویر سچی ہونے کے باوجود کسی قدر غیر متناسب ہو گئی ہے۔ ندیم قاسمی کے یہاں ہر چیز جچی تلی اور نوک پلک سے درست ہے۔ پرمیشر سنگھ ان سب سکھوں اور مسلمانوں سے الگ ہے، جن کے سروں پر بہیمیت کے بھوت ناچ رہے ہیں۔ ان کے مقابلے میں اس میں ایک سوز، درد مندی اور دلاسائی ہے۔ اس کا اپنا لڑکا کرتار سنگھ بھی اغوا کیا جا چکا ہے۔ اس لیے اس کا دل اتنا حساس ہو گیا ہے۔ اپنی بیوی اور بیٹی امر کور کے برعکس وہ چھوٹے سے بچے اختر سے جو، سے فسادات کے دوران مسلمانوں کے قافلے سے بچھڑ جانے کی وجہ سے

مل گیا ہے۔ انتہائی محبت اور لاڈ دار کا برتاؤ کرتا ہے۔ اور ہر طرح اس کی نازبرداری کے لیے تیار رہتا ہے۔ امر کور پرمیشر سنگھ کے اس برتاؤ پر تلخی کے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی اختر کو برا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس بھی نکال لیتی ہے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی کا دل ایک پکا پھوڑا ہے، جواب ٹوٹا اور تب ٹوٹا۔ لیکن ہر قسم کی دل جوئی کے باوجود پرمیشر سنگھ اختر کو پوری طرح جیتنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اور بالآخر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اسے سرحد کے قریب چھوڑ آئے۔ کہانی کا خاتمہ بھی ایک المیہ پر ہوتا ہے۔ اس نیک نیتی کے باوجود پرمیشر سنگھ آخر آخر میں سرحد پر چلائی ہوئی گولی سے زخمی ہو جاتا ہے اور اختر دور خلا میں نظروں سے ایک نامعلوم سمت میں بھاگتا چلا جاتا ہے۔ اس افسانے میں ایک عام سکھ گھرانے کی فضا، سکھوں کی عجیب عجیب حرکتیں، پرمیشر سنگھ کی بیوی اور بیٹی کی زخمی شخصیتیں، فسادات کے نتیجے کے طور پر ذہنوں پر خوف اور ناامیدی کے گہرے اور مہیب سائے، پرمیشر سنگھ کی معصوم اور دل کش شخصیت، اور اختر کے دل میں اپنی ماں کی چاہت کی ہوک، اور اس سے جدائی کی ٹیسیں، اور اپنے فطری، روایتی اور مانوس تہذیبی رنگ سے ہم آہنگ رہنے کی نہ مٹنے والی خواہش، حیرت انگیز بصیرت، ایجاز بیان اور گہری ہمدردی کے ساتھ واضح کی گئی ہیں۔

ندیم قاسمی کے افسانے فنی دروبست کے اعتبار سے بھی بہت گٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں میں بعض جملوں یا تراشوں کی تکرار پائی جاتی ہے۔ مثلاً " میں انسان ہوں " میں یہ جملے کئی بار آئے ہیں :

> " یہ پیاس ہی میری تلاش ہے، وہ زندگی ہے اور آخرت ہے۔ اور میں اس وقت بھی پیاسا ہوں۔"
> (صفحہ ۹)
>
> " اور کیچڑ سے خشک ہو کر میرے ہونٹوں کو کمان کی زہ کی طرح تان رکھا ہے۔ چمکتے ہوئے سبز رنگ کی ایک مکھی بار بار میرے حلق تک گھوم آتی ہے۔ اسے نمی کی تلاش ہے، اور میں ایک پیاسا انسان ہوں، اور مکی کے پودوں کی جڑیں گن رہا ہوں۔"———— (صفحہ ۱۱)
>
> " لیکن اس (پودے) کی جڑیں مضبوط ہیں۔ اس لیے یہ تنا کھڑا ہے اور میں زمین پر پڑا ہوں، اس لیے کہ میری بنیادیں کمزور تھیں۔ اس لیے کہ میں انسان ہوں۔ اور میں پیاسا ہوں۔"
> (صفحہ ۱۱)
>
> " تم پانی کی تلاش میں ہو؟ — مگر کس لیے؟ — انسانیت کے آخری وارث کے لیے؟ ——
> تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ خود اپنی پیاس بجھانے کے لیے تمہیں پانی کی تلاش ہے"————
> (صفحات ۲۲، ۲۳)
>
> " اور میں اس سوچ میں غرق یہاں مکئی کے ان بے بس پودوں میں گھرا ہوا پڑا ہوں مجھے گھونٹ بھر پانی کی تلاش ہے .... مجھے پانی کی تلاش ہے۔ مجھے ایک نئی زندگی کی تلاش ہے۔ مگر میری تلاش بے کار ہے۔ کیونکہ میں خدا کی محبوب ترین مخلوق ہوں ——
> میں انسان ہوں"———— (صفحات ۲۳، ۲۴)

"دار و رسن" میں یہ دو جملے دو مختلف موقعوں پر آئے ہیں :

" ایسا پھول سا ہلکا ہاتھ مرنے والے کا کہ سنتے ہیں ادھر جوان کے قدموں تلے سے تختہ کھسکا، ادھر وہ جسمے کے بنائے پھندے میں یوں لٹک گیا، جیسے بیل سے توری لٹکتی ہے ـــــ

(صفحہ ۹۸)

" خیرو کی لاش رسی سے یوں لٹک رہی تھی، جیسے بیل سے توری لٹکتی ہے" ـــــ (صفحہ ۱۰۵)

"کفن دفن" میں ایک جگہ یہ جملے ملتے ہیں :

" میاں سیف الحق کی زندگی بالکل ہموار تک بجری چمکتی ہوئی سڑک تھی۔ جو حدِ نظر تک خطِ مستقیم میں جاتی تھی۔ اور اس کے دونوں طرف قدآور درخت سایہ کیے کھڑے تھے۔ وہ اس سڑک پر کچھ ایسی بے تکلفی سے چل رہے تھے، جیسے انسان کھانا کھاتے وقت چاہے بات جلیانوالہ باغ کی کر رہا ہو مگر نوالہ سیدھا منہ کو جائے۔ البتہ کبھی کبھی اس سڑک پر ایک فصیل سی ابھر آتی تھی اور وہ ٹھٹک کر خلا میں گھورتے رہ جاتے۔ جہاں انھیں اپنے صمد کی کٹی پھٹی لاش صحن کے عین وسط میں پڑی ہوئی دکھائی دے جاتی" ـــــ (صفحہ ۱۸۹)

اور خاتمہ سے ذرا پہلے یہ جملے :

" اور اس بہت بڑے نشیب کے بعد میاں سیف الحق کی زندگی بالکل ہموار تک بجری چمکتی ہوئی سڑک بن گئی۔ جو حدِ نظر تک خطِ مستقیم میں جاتی تھی، اور جس کے دونوں طرف قدآور درخت سایہ کیے کھڑے رہتے تھے۔ وہ اس سڑک پر پھر سے کچھ ایسی بے تکلفی اور روانی سے چلنے لگے جیسے انسان کھانا کھاتے وقت چاہے بات جلیانوالہ باغ کی کر رہا ہو، مگر نوالہ سیدھا منہ کو جائے۔ اب اس سڑک پر وہ فصیل بھی نہیں ابھرتی تھی۔ جس کے پاس کبھی کبھی ٹھٹک کر وہ خلا میں گھورتے رہ جاتے تھے۔ اب حدِ نظر تک مطلع صاف تھا" ـــــ

(صفحہ ۲۱)

"شکنیں" (برگِ حنا) میں غفور کے چہرے کی شکنیں ایک علامتی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور یہ وہ محور ہے، جس کے ارد گرد کہانی برابر گھومتی رہتی ہے۔ اور "الحمد للہ" میں تو افسانہ نگار نے خود ہی ایک جگہ کہا ہے :

" مولوی ابل کے صرف دو ہی ایسے تھے جو کبھی نہ ٹوٹے" اللہ جل شانہٗ اور چودھری فتح داد خاں" ـــــ (صفحہ ۱۳۸)

اس تکرار سے، کثر دو مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں، یا یہ کہیے کہ وہ دو قسم کے اثرات کے حاصل کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ اول افسانے کی مخصوص فضا آفرینی، اور دوسرے خیالات اور تاثرات کی شیرازہ بندی۔ یہ جملے جو اکثر دہرائے جاتے ہیں۔ ایک طرح کے (OVERTONES) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی گونج کہانی کے عمل کے دوران اکثر سنائی دیتی ہے۔ جو تاثر مرکزی تجربہ یا مت بدد عمل کے لیے نقطۂ آغاز تھا، اور جسے افسانے کے ارتقا کے ذریعے وسعت دی گئی

ہے۔ وہ اکثر جزئیات نگاری کے گنجان اور دبیز پردے میں نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اسے پھر سے ذہن میں تازہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہی اس طریقۂ کار کو برتنے کا صحیح جواز ہے۔

ان افسانوں میں اکثر جگہ تشویش (SUSPENSE) کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ "الحمد للہ"، "بیٹے بیٹیاں"، "کفن دفن" اور "ماتم" اس کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ اس خصوصیت سے یہ مراد نہیں ہے کہ پایانِ کار افسانے کا انجام ایسا ہو، جس کی کوئی عقلی توجیہ ممکن نہ ہو۔ یا جہاں عمل کی بنیاد کسی اتفاقی حادثے پر ہو۔ کامیاب "تشویش" پیدا کرنے میں افسانہ نگار اس وقت کامیاب سمجھا جا سکتا ہے، جب ہم انجام کو پہلے سے تو متعین نہ کر سکیں، لیکن افسانہ اختتام کو پہنچے، تو ہم بلا جھجک، اور ذہنی پس و پیش کے بغیر اسے قبول کریں۔ اور عمل کی مختلف اکائیوں کے درمیان ہمیں ایک منطقی یا جذباتی ربط و تسلسل اور ایک سببی رشتہ نظر آ جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی محسوس کریں کہ جس تجربے یا تاثر کو مجسم کیا گیا ہے، وہ غیر متوقع ہونے کے باوجود بھی مانوس اور جانا پہچانا ہے اس لیے کہ زندگی میں ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔

ندیم قاسمی کے بیشتر افسانوں کا اختتام قابلِ غور ہے۔ اس میں ایک ڈرامائی عنصر کی کارفرمائی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کہانی کے آخر میں ہمیں عمل کے عواقب کی تمام تفصیلات سے آگاہ کیا جائے۔ اس سے افسانے میں لازمی طور پر ایک سپاٹ پن پیدا ہو جائے گا۔ افسانے کا فن، ناول کے فن کی نسبت زیادہ حسنِ تناسب اور قطع و برید چاہتا ہے۔ اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں تاثر اور تجربے کا بھرپور اور تشفی بخش اظہار تمام ہو جائے۔ یا اس کی گنجائشیں امکانی طور پر کام میں لائی جا چکیں، وہیں افسانہ ختم ہو جائے۔ افسانے کے دوران میں جو نقطہ ہائے انحراف (SHIFTS) پائے جاتے ہیں، وہ سب مل کر ہمیں ایک انجام تک لے جاتے ہیں۔ اس حد تک پہنچنے کے بعد اگر افسانے کو غیر فطری طور پر طول دیا جائے گا تو اس سے وحدت تاثر اور ردم کی موزونیت دونوں کو صدمہ پہنچے گا۔ بعض اوقات افسانہ نگار وقت کے بہت سے نقطوں کو پھلانگ کر انتہا تک پہنچنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں پڑھنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے تخیل سے کام لے کر اس انتہا کا رشتہ کہانی کے آغاز سے جوڑے اور اس حرکت اور تموج کو گرفت میں لانے کی کوشش کرے، جو افسانے کے ڈھانچے میں موجود ہے۔ "نیا فرہاد" (در و دیوار) "گونج" (طلوع و غروب)، "پرمیشر سنگھ" — "ہیرا" (بازارِ حیات)، "ماتم"، "نصیب" (برگِ حنا)، "سلطان" (گھر سے گھر تک)، "الحمد للہ"، "گنڈاسا" اور "چور" (سناٹا) کے ڈرامائی اختتام قابلِ غور ہیں۔

ندیم قاسمی ایک خوش گو شاعر بھی ہیں، اور یہ شاعرانہ افسانوں میں جگہ جگہ ہمیں ملتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ دلکش تشبیہات استعمال کرتا ہے۔ یا پورے ایک پیراگراف میں فطرت کی نقاشی کرتا ہے۔ لیکن یہ نقاشی فن برائے فن کی حیثیت سے افسانوں میں جگہ نہیں پاتی۔ ندیم قاسمی کی تحریر اس وقت چمک اٹھتی ہے۔ جب وہ جذبات کی کشمکش کو نمایاں کرنے یا معتدل بنانے کے لیے فطرت کی طرفگی اور شادابی کا سہارا لیتے ہیں۔ اور اس کے بے داغ حسن پر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں پنجاب کی مٹی، ہوائیں، سبزہ زار ٹیلے اور چشمے، چراگاہیں اور ریگستان، ان سب کی بو باس قدم قدم پر اپنی طرف کھینچتی ہے۔ فطرت انسان کے فن کا تکملہ بھی کرتی ہے اور انسانی جذبات کو فطرت کے آئینے میں ایک نکھار بھی ملتا ہے۔ ندیم قاسمی نے پنجاب کے دیہاتوں میں پلنے والے رومانوں کو جس طرح زندگی، حرکت اور تابناکی بخشی ہے۔ اس کی

غرض اشارہ پہلے کیا جا چکا ہے [illegible] اکثر فطرتی مطالعے کے ہیں جن میں کہانی کی جہت [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کے ہر پہلو میں حسن کا کوئی نقش ابھرتا نہیں جس سے ان کی حساس طبیعت کو متاثر [illegible] چند مثالیں دیکھیے :-

"جب پو پھٹنے میں کوئی ایک گھنٹہ باقی تھا تو میں باہر نکل آیا [illegible] اور مغربی افق تک قریب اوندھا پڑا تھا۔ اور موٹے موٹے ستارے سلیٹی آسمان پر ناچ [illegible] آ گئی تھی —"

"گیتوں کی آوازیں دھیمی پڑتی گئیں .... ٹیلوں کی [illegible] جوتوں میں بھر گئی تھی۔ جس کی وجہ سے میرے چلتے ہوئے ٹٹو کو بہت سکون پہنچ رہا تھا [illegible] ستارہ مشرقی افق پر کسی سانولی دلہن کے ماتھے کی ٹکلی [illegible] تھا۔ اور آسمان [illegible] دکیلی بولو [illegible] پیں پیں چلاتے جا رہے تھے —"

([illegible] صفحہ [illegible])

"غروب آفتاب سے پہلے میں حسب معمول سعید کے ہمراہ کھیتوں [illegible] شفق کے چھینٹے بن کر آسمان پر بکھری ہوئی تھیں اور [illegible] ٹھنڈے پانی کے گھونٹ بن کر جسم میں اترتی جا رہی تھی۔ [illegible] اڑتے جا رہے تھے —"

([illegible] صفحہ [illegible])

"اچانک آشیانوں کی طرف جاتی ہوئی چڑیوں کا ایک بہت شاندار [illegible] کی ہر شاخ پر گیندیں سی لٹک گئیں .... [illegible] ہوئے کیکر کے پھولوں نے زمین پر ہلدی سی بکھیر دی تھی [illegible] کی ایک گھنی بدلی [illegible] سے تیروں کی طرح نکلی پڑ رہی تھیں —"

([illegible] کی بات صفحہ [illegible])

"لیکن [illegible] بہار کا پہلا [illegible] جو کھی شاخوں پر [illegible] سبز [illegible] ہوئی جھیل کی سطح پر آگ لگا دیتا [illegible] جنگلوں کی عنابی [illegible] —"

([illegible] صفحہ [illegible])

[illegible] نہایت زور سے [illegible] اس [illegible]

تھالیوں کی طرح بجتی رہیں۔ یوسف بھاگ کر صحن میں آ گیا۔ پھر فوراً اندر لپکا۔ ایک دم بادل جیسے پھوٹ پڑا۔ صحن میں تھوڑی سی دھول اڑی اور بیٹھ گئی۔ پرنالوں کے دہانے سے پتے اور تنکے بوکھلا کر باہر آ گرے اور آن کی آن میں سبزے پر جوانی آ گئی —————

(رئیس خانہ صفحہ ۳۷)

"پھر جب میں جونکا تو ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد دھوپ دور تک پھیلے ہوئے سرسوں کے کھیتوں پر اونگھ رہی تھی۔ سرسوں کے پھولوں کی صاف ستھری صحت مند زردی میں چمک سی آ گئی تھی۔ وہ آسمان کے وسط میں اڑتی ہوئی ایک پتلی سی بدلی کو ڈوبتے ہوئے سورج نے بسنتی دوپٹے میں بدل دیا تھا" ————

(آتش گل صفحات ۸۳-۸۲)

"ہم منہ اندھیرے اس جزیرے پر پہنچے۔ نہایت ہوشیاری سے ساحل پر اترے اور پھر جھک جھک کر چلتے ہوئے جب آگے بڑھے تو اس وقت سامنے متحرک ہیں جیسے کسی نے انار چھوڑ دیے تھے۔ اتنی ابھی صبح ہی سے بجب ہم کبھی کبھی نہیں دیکھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہم نے صبح کو عریانی کے عالم میں اس کے خلوت کدے میں دیکھ لیا ہے۔ چڑیوں کے چہچہوں میں ہنسی کی سی کیفیت تھی۔ سمندری پرندے لمبی لمبی ٹانگیں لٹکائے ہمارے سروں پر تیر رہے تھے۔ رنگوں کے فوارے چھوٹ رہے تھے" ———— (ماستا صفحات ۱۰۹، ۱۰۸)

ندیم قاسمی اردو کے ان افسانہ نگاروں میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا اور بے جھجک اور انسانی فطرت کے پیچ و خم سے ان کی واقفیت بڑی دور رس اور بلیغ ہے۔ وہ زندگی کی سفاک حقیقتوں پر کوئی رنگین پردہ نہیں ڈالتے اور انسانوں کے فطری محرکات کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کرنے سے نہیں جھجکتے۔ جنس سے ان کی دلچسپی معمول کے مطابق ہے۔ اس میں مریضانہ لذت اندوزی نہیں۔ ان کے یہاں طنز کے چھینٹے بھی جا بجا ملتے ہیں۔ مگر وہ تند ایسے نہیں جو مردم آزاری کی سرحدوں کو چھو لے۔ ان کے نقطۂ نظر میں اعتدال اور سلامت روی اور ان کے لہجے میں نرمی، شائستگی اور صداقت ملتی ہے جو برسوں کے عمیق مشاہدے اور کامیاب ذہن کی آزمائش سے گزرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ وہ مادے کی طہارت کے بھی قائل ہیں اور روح کو اس عبادت کی ایک ترقی یافتہ شکل بھی سمجھتے ہیں۔ "ماتم"، "کفن دفن"، "موسیٰ"، "ہیرا"، "رئیس خانہ"، "الحمد للہ" اور "پرمیشر سنگھ" اردو کے ستھرے اور معیاری افسانے کہے جا سکتے ہیں۔ کسی بھی ادبی فن کار کے لیے وجہ امتیاز یہ نہیں ہے کہ اس کے یہاں سیاست، مذہب یا فلسفہ موجود ہے یا نہیں، بلکہ یہ کہ وہ ان کی موجودگی یا غیر موجودگی سے تخلیقی نظر انسانی ادراک کی کس حد تک توسیع کرتا ہے اور اس کے نقطۂ نظر میں کتنی انفرادیت، ہمہ گیری، توازن اور مرکزیت ہے۔ بیشتر یا اکثر وہ حقیقتوں کے ایسے گوشوں کو جنھیں دیکھتے اور محسوس سب کرتے ہیں گویا منکشف کرتا ہے۔ پس منظر اور جزئیات کا کام ہے۔ وہ آدمی کے لیے ہر چھوٹے بڑے تجربے کے اردگرد ایک خول سا چڑھا دیتا ہے۔ یہ خول ہماری ذہنی عادتوں، تعصبات اور آرزوؤں کا ہوتا ہے اور رسم و رواج، ذہنی کاہلی اور بے رخی کی وجہ سے ہم اس خول کو توڑنے پر رضامند نہیں ہوتے۔ افسانہ نگار اشیاء، تجربات اور کرداروں کو ہمارے سامنے بے نقاب کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ یہی اس کی حیثیت ہے۔ ندیم قاسمی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں ایک اعلیٰ فن کار کی جرأت اور صداقت کے ساتھ تہذیب اور دل سوزی، متانت اور میانہ روی اور ہمدردی اور رفاقت کا جذبہ ہر ہر قدم پر بہار دیتا ہے۔ وہ انسانوں کے سامنے ایک آئینہ بھی رکھ دیتے ہیں جس میں ان کی خوبیاں اور خامیاں بڑی دل کاشت چمکنے لگتی ہیں اور ایک معیار بھی جہاں تک انھیں پہنچنا ہے۔

ڈاکٹر حنیف فوق

احمد ندیم قاسمی کی علمی شخصیت

فن اور رابطۂ عصر

احمد ندیم قاسمی کے بارے میں منٹو جیسا بے باک و زباں دراز اگر صرف یہ کہہ کر رہ جائے کہ "وہ شریف ہیں" تو اس میں ان کی شخصیت کے اس ایک پہلو کی جھلک تو ملتی ہے جو دوسروں کو انھیں شریف سمجھنے اور کہنے پر مجبور کرتا ہے لیکن یہ ان کی شخصیت اور اُن کے فن کی صحیح تعریف یا تعارف نہیں۔ بہرحال اس سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ قاسمی صاحب نے دوسروں کے لیے اپنے آپ کو ایسا بنایا اور کبھی کبھی اپنی شخصیت کے بعض گوشوں کو ایسا دبایا ہے کہ لوگ اس ایک نقش کو عین تعبیرِ ذات سمجھنے لگے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ اس صف میں منٹو جیسا تجزیہ کار و زباں گیر کیسے شامل ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ شرافت کا تصور ہر دور میں ایک سماجی تصور رہا ہے جس کی تعبیریں بدلتی رہتی ہیں۔ راہ گیر کی شرافت کا تصور راہزن سے مختلف ہے۔ پھر ہم جن قدروں کو عزیز رکھتے ہیں ان کے لیے جانب داری اور مجادلہ دونوں ضروری ہوتے ہیں۔ کسی نظامِ اقدار کی روشنی ہی میں فرد کے کردار و شرافت کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ کہیں کہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود احمد ندیم قاسمی اس تصورِ شرافت کی مار کھا گئے ہیں جو تہذیبِ پاستاں سے وابستہ ہے۔ کہیں کہیں وہ بڑی کوشش سے اپنے آپ کو اس تصور کے مطابق ڈھالنے یا دکھانے کا جتن کرتے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر ان کی شخصیت اور ان کے فن میں وہ جوہر موجود ہیں جو زندگی کے اثباتی جہات کو آئینہ دکھاتے ہیں اور جن کو بروئے کار لانے کے لیے محاذ آرائی، ہنگامہ پروری اور خصومت سازی ضروری ہوتی ہے۔ محاذ آرائی ہو تو برا کہنے والے بدگوئی میں کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ غالب نے جب کہا تھا کہ ؂

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

تو زندگی کی ایک عظیم صداقت کی طرف اشارا کیا تھا۔ ہر ایک سے اچھا کہلوانے کی کوشش ذات کی کمزوری کی دلیل ہے کیونکہ جس کے چند برا کہنے والے نہ ہوں وہ تابعِ مہمل تو ہو سکتا ہے مردِ کار نہیں۔

احمد ندیم قاسمی اُس عظیم تحریک سے وابستہ رہے ہیں جس کا مقصد جہانِ نو کی تشکیل ہے اور اس تشکیل کے لیے زندگی کی ناکارگی کی نفی ضروری ہے۔ پھر احمد ندیم قاسمی اپنے فن کے ذریعہ جہانِ زندگی کے حسن و جمال کے سکون پرور

نفوسِ ش کو منکشف کرنے میں وہاں اس کی گرمیٔ ہنگامہ کی متحرک، جمالیاتی صورتوں کے ترجمان بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری، ان کی افسانہ نگاری، ان کی ادبی تنقید، ان کے مزاحیہ طنزیہ یا سنجیدہ مضامین پھر ان کی صحافت سب میں جہاں عالمگیر انسانی محبت کے تصورات کی ترجمانی ملتی ہے وہاں زمین اور ایک خطۂ زمین کی محبت بھی جھلکتی ہے۔ چنانچہ اس محبت اور اس تصور میں شریک دوسرے افراد بھی ان کی محبت کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے قاسمی ہرگز غیر جانب دار نہیں۔ وہ انسان اور زمین کی محبت کے غاصبوں کو معاف نہیں کرتے۔ کہیں کہیں مزعومہ شرافت ان کے وار کو ہلکا ضرور کر دیتی ہے۔ لیکن فن کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو نہیں روک سکتی۔

احمد ندیم قاسمی نے ترقی پسند تحریک کے تصورات کو شعوری طور پر قبول کیا۔ وہ فن کی افادیت، تاریخ کی نمو پذیری، عوام کی قدرت اور معاشی الفاظ کے نظریات سے نظری اور عملی طور پر وابستہ رہے۔ اس وقت جب عظیم تر قومیت کی چیرہ دستی کو بین الاقوامی استحصال کا سہارا ملا اور اس کا خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کم ترقی یافتہ خطے زیادہ ترقی یافتہ خطوں کے جارحانہ تسلط اور سازشِ استحصال کا شکار ہو جائیں گے تو احمد ندیم قاسمی نے بے خطر اپنی آواز بلند کی۔ جب ترقی پسند صفوں میں بعض حضرات انسان دوستی کے اس مجہول تصور کا ابھار رہے تھے جس سے نہ صرف عالم شیر خوارگی کے دودھ کی بو آتی تھی بلکہ جس کے ذریعہ طاقت کے بتوں کی پرستش اور کمزوروں کا زیاں مقصود تھا، احمد ندیم قاسمی نے بلا خوف ہو کر اس خطۂ زمین سے اپنی محبت کا اعلان کیا جس کو بین الملل سازش ازرفتہ نہ جانے ہوئے تھی۔ یہ اعلان محبت کسی تنگ نظری پر مبنی نہ تھا۔ انسان دوستی کے مجہول تصور کے مقابلے میں یہ انسان دوستی کے متحرک تصور کی تعبیر کرتا اور بین الاقومیت کی نفی کے بجائے اس کی جانب ایک مثبت قدم تھا۔ اس خطۂ زمین کے خلاف سازش کوئی ایک دن کی بات نہ تھی، بہت دنوں سے اس سازش کی ڈوری کئی ہاتھوں میں تھی بعض ہاتھ ایسے بھی تھے جو اس خطے کے فکری زیاں میں مصروف تھے کہ فکری زیاں خود بخود سیاسی زیاں کی راہ ہموار کر دیتا ہے۔ اس فکری زیاں کے کئی پہلو تھے جنہیں بظاہر بڑے پر خلوص اور بااحترام انداز میں پیش کیا جاتا اور کچھ ہمارے زیاں کار دانستہ یا نادانستہ فکرِ مجہول کا شکار ہو گئے۔ بعض اوقات حب الوطنی کو بھی ایسے دلیرانہ معنی دیے گئے جو ذہنی طور پر جارحانہ تسلط کے لیے زمین ہموار کر رہے تھے۔ اس فکری تخریب کا روپ وہ بھی ہے جب وہ ساطیری بہروپ بھرتی ہے۔ کبھی ازمنۂ قدیم کے نام سے کبھی تہذیبِ پاکستان کے عنوان سے نئے عہد کے مسائل سے روگردانی کی جاتی ہے اور ان مثبت بنیادوں کو فراموش کر دیا جاتا ہے جن سے تخلیقی تاریخ و تہذیب کو فروغ ہوتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے لیے رشتۂ محبت کا تصور مجرد اور مطلق تصور نہیں بلکہ اس کے معنی زمین کے باشندوں سے محبت اور ان کی بہتر معاشی، ذہنی اور تہذیبی زندگی کے لیے کوشش مسلسل ہیں۔ قاسمی نے بہتر زندگی کی جدوجہد میں منظر اور جنس و نسب سے ورا ہو کر اور کبھی دونوں سے تعبیر کی جانب بڑھتے ہیں اور انسان کی محبت نے انھیں زمین سے محبت کرنا سکھایا۔ ان کی شخصیت گویا کہ جیسے ہوتے ہوئے بسیط حقیقتوں کو جاں کنی سے دوچار پاتے ہیں، مشرق کے افق پر حسن دیکھ کر وہ کبھی وطن کے نغمے گاتے ہیں۔ وہ ذاتی اور کائناتی دونوں کے حسن کو پہچانتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ انسان کے کئی صفات میں سے ایک نفرت بھی ہے۔ اپنی مزعومہ شرافت کے پیشِ نظر وہ کبھی کبھی اس مقدس

نفرت کو بھلا کر محبتِ مطلق کا درس دینے لگتے ہیں۔ لیکن آدمیت کے تقاضوں سے صحیح وفاداری اور نمو کی قوتوں کا زندہ احساس انھیں دروغ آمیز تصورات اور باطل شخصیات کو راستے سے ہٹانے پر بھی مجبور کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد ندیم قاسمی اپنے مشربِ شرافت میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے اور صلحِ کل کا انداز اختیار کرنے کے باوجود "مقامِ شکر ہے کہ ان کی ذات، فکر اور فن کے شدید مخالف موجود ہیں۔"

زندگی کی برکتوں کو عام کرنے کے جس تصور نے اردو ادب کی ایک وسیع تحریک کو فروغ دیا تھا، اس کے مخالفوں کی صفوں میں بڑے بڑے جغادری موجود تھے اور جیسے جیسے یہ تحریک عام ہوتی گئی وہ مختلف پینتروں سے حملے کرتے رہے لیکن اس تحریک کو بالآخر نقصان خود اپنی ہی صفوں کے انتشار سے پہنچا اور مخالفتوں کے طوفان نے اسے ایسی زک نہیں پہنچائی جیسی زک بغلی گھونسوں، منافقانہ رویوں اور نادان دوستوں کے ہاتھوں اسے ملی ہے۔ کھلے دشمن کا مقابلہ آسان ہے۔ لیکن اپنی ہی صف کے دراندازوں کا مداوا مشکل ہے۔ دورِ حاضر کے فلسطائن (PHILISTINE) روشنی کی مخالفت روشنی ہی کے نام پر کرتے ہیں۔ زندگی کی برکتوں کو عام کرنے کے تصور پر منطقی حملہ کرنے والے اب شکست خوردہ قوت ہیں لیکن زندگی کی برکتوں کا نام لے کر مزاج، ہراس، خود ترحمی، نرگسیت، تعنتِ نازیبا، تعصبِ بے جا، اذیت پسندی، اقربا پروری، ہرزہ کاری، خود پروری، اعصابی ہیجان، نامناسب ادعائیت، مفاد پرستی اور تصورِ عدمیت کو فروغ دینے والے بھیس بدلے ہوئے موجود ہیں۔ ایک عظیم تحریک یا اس تحریک کے دامنوں سے چمٹے ہوئے یہ ذریات حیرت انگیز ہیں۔ اس امر پر غور کرتے ہوئے عبرت ہوتی ہے کہ کیا ہر بڑے نظریے کے قصرِ رفیع بالآخر آسیبوں کا مسکن بن جاتے ہیں؟ اس سلسلے میں قابلِ غور اور لائقِ عبرت وہ سلوک ہے جو ترکِ لذات کے حامل مسیحی تصور کے ساتھ مغربی تہذیب نے روا رکھا ہے۔ "ڈاکٹر جان رابنسن (DR JOHN ROBINSON) بشپ آف وولوچ اپنی کتاب "جنسی اجازت کے سماج میں عیسوی آزادی" (CHRISTIAN FREEDOM IN A PERMISSIVE SOCIETY) کا مخاطب موجودہ جنسی طور پر منحرف و آزاد نسل کو سمجھتے ہوئے نہ صرف یہ کہنے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھتے کہ پالا کیلی (PAULA KELLY) کے رقص کی عریاں تصویر جس میں ہر چیز یہاں تک کہ موئے زہار بھی نمایاں ہوں، حسین ترین منظر ہے، بلکہ آزادانہ جنسی اعمال کی کوئی نہ کوئی اعتقادی تاویل اس طرح کرنے لگتے ہیں کہ کسی جلے تن کو یہ پھبتی کسنا پڑتی ہے کہ شاید خدا تک رسائی کے بہت سے طریقوں میں مشت زنی بھی ایک طریقہ ہے۔" کچھ ایسا ہی سلوک ترقی پسند تصورات کے ساتھ بعض بزعمِ خود آزاد ترقی پسند کر رہے ہیں۔ اردو ادب میں احمد ندیم قاسمی زندگی کی حرمت، انسان کی محبت، عزتِ آدمیت، جمہور کی تکریم، آگہی کے فروغ، جہدِ حیات اور شعورِ عصر کی تعبیر کے بہت بڑے فن کار ہیں۔ لیکن انھیں یہ باور کرانے والے بھی موجود ہیں کہ خود ان کی ذات ترقی پسند تحریک [illegible]۔ انھیں یہ مشورہ دینے والے بھی کم نہیں کہ ان کی ذات تمام اصولوں سے بالاتر ہے اور ان کا فن مذکورہ بالا اقدار و اجزا کی نفی کے بعد بھی بہت بڑا فن ہے۔ حالانکہ ان اقدار و اجزا کی نفی نہ صرف احمد ندیم قاسمی کے فن بلکہ خود ان کی ذات کی نفی ہے۔ کیونکہ یہ اجزا صرف ان کے فن ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت میں بھی کچھ اس طرح پیوست و گندھے ہوئے ہیں کہ انھیں خارج کر دیجیے تو پھر شاید ندیم تو [illegible] نہ رہیں۔ یہ نام اور تخلص خود ان کے کردار کا مظہر ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ندیم ان کا تخلص ہی نہیں بلکہ "میرا کردار ہے، [illegible] کا نام"۔ آخر ندیم اور دوسروں مثلاً میراجی، راشد

ضیا جالندھری بلکہ وزیر آغا تک کے درمیان) جو حد امتیاز ہے، وہ ذہنی سطح پر بھی زندگی کے وسیع شعور کی مختلف سطحوں اور پھر ان سطحوں کی الگ الگ جمالیاتی تعبیروں پر مبنی ہے۔ لیکن بعض "ہوشیار" انھیں یہ سمجھانے سے باز نہیں آتے وہ کسی وابستگی کے حدود کے پابند نہیں۔ ایسے فقرہ بازوں کی کمی نہیں جو شرافت کو جھنڈے پر چڑھا کر منافقت کو راستہ دکھانا چاہتے ہیں اور خود ان سے انحراف مسلک کی پشت پناہی کی امید رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ شکستِ حدود و نئی سرحدوں کی نشان دہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر بڑا فن کار بیشتر حدود و قیود کو توڑتا ہی رہتا ہے اور اس کی بدولت ادب میں نئی روایت کا آغاز کرتی ہے۔ لیکن یہاں معاملہ مختلف ہے۔ شکستِ حدود کا نام لے کر وہ احمد ندیم قاسمی کے شعورِ زندگی، تصورِ تاریخ اور اقدارِ فن کو باطل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نظریۂ حیات کو وہ وسیع ترین معنوں میں شعور کی کیرن سے زیادہ نظریہ پر احسان سمجھتے ہیں۔ ان میں سے چند وہ نفوس ہو سکتے ہیں جن کے لیے قاسمی نے اپنی نظم "گالی" لکھی تھی۔ لیکن بیشتر وہ ہیں جن کی آواز کانوں سے دل میں اتر جانے والی ہے۔ دراصل قاسمی کی ذات میں محبت کے جوہر بہت نمایاں ہیں اور اکثر ان کی انسان سے محبت گرد و پیش صرف ہوتی ہے۔ مقام خطر یہ ہے کہ قاسمی کے موافقوں میں وہ بھی ہیں جو ان کے تصوراتِ فن اور اقدارِ حیات کے مخالف ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ زندگی میں مختلف نظریات کے حامل بھی ایک دوسرے سے وابستگی رکھ سکتے اور ذاتی طور پر بے حد قریب ہو سکتے ہیں۔ اس میں کوئی ضرر نہیں۔ لیکن خطرہ اس وقت پیش آتا ہے جب یہ محبت و موافقت کا وسیلہ انحراف میں صرف ہونے لگتی ہے۔ قاسمی کی ایک عظیم تصورِ حیات سے وابستگی ان کی ذات اور فن کے لیے تو اہم وصف رہی ہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس تصور سے وابستہ دوسرے افراد بلکہ ایک بڑے کاروانِ خیال کے لیے نشانِ راہ بھی رہے ہیں۔ اس نشانِ راہ کو خانۂ تاویل کا قبضۂ در بنا دینے کی کوشش کرنا قاسمی کے فن، ان کی شخصیت اور مسلکِ حیات سب کے ساتھ ناانصافی ہے۔

قاسمی کے فن اور ان کی شخصیت میں جو گہرا ربط ہے وہ محض ذہنی تجسس، فکری تلاش اور جذباتی خلوص کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کا زیادہ بڑا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے حقائق کی زندگی کے ارتقائی تصور کے ذریعے تخلیقی تعبیر کرتے ہیں اور پھر اس تعبیر کو اپنی شخصیت کا جزو بنا کر پیش قدم اجتماعی ہیئت کی جدلیاتی صورت سازی میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے فن میں جو استحکام اور شخصیت میں جو استواری آتی ہے وہ انھیں ایک جانب ان خوردہ فروشوں سے مختلف بنا دیتی ہے جو صرف لمحۂ گذراں کا احساس رکھتے ہیں اور دوسری جانب وہ ذات کے ان نیلام کنندوں سے بھی الگ ہو جاتے ہیں جن کے لیے فن صرف خود نمائی سے عبارت ہے۔ اس کے علاوہ احمد ندیم قاسمی کی وسیع نظر اور خلاقانہ تعبیرِ زندگی انھیں فن کو اس استادانہ گر کے سانچے میں ڈھالنے سے بھی محفوظ رکھتی ہے جس کے ذریعے لغزۂ سرفروشی میں حلاوتِ جمال کی آمیزش سے کاوشِ پیہم کے بغیر بھی گروہِ ناپختہ کاراں میں مقبولیت حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ سمن عذاروں کے نام پر واویلا کر کے اور قربانیوں کے شور سے دہلا کر قبولِ عام حاصل نہیں کرتے بلکہ اس کے لیے پیہم ریاضت ضروری سمجھتے ہیں۔ قاسمی کے فن سے پتہ چلتا ہے کہ شعر ہو یا افسانہ محض میکانکی عمل نہیں بلکہ ایک ایسی واردات ہے جو وارد ہوتے ہوئے اپنے ساتھ تصوراتی رنگ اور تصویری خطوط بھی لیتی آتی ہے۔ وہ زندگی کے احترام کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے فن کے وہ پیکر تراشتے ہیں جن سے انفرادی بصیرت اور اجتماعی شعور دونوں کی عکاسی ہوتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے فن کی تہہ میں جس تحریک کی کار فرمائی ملتی ہے، اس کا جائزہ لیتے ہوئے اس سیاسی شعور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو تاریخ کو جدلیاتی عمل، انسانی اعمال، طبقاتی آویزش اور ارتقائی منازل کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ انسان کا خیال، خواہش، عمل اور ماحول سب ایک ہی رشتے میں گندھے ہوئے ہیں اور ان تار و پود کے پیہم ترکیبی امکانات نے تمارت چاند تک کے سفر کو آسان بنا دیا ہے۔ انسانوں نے اپنی بنائی ہوئی صورتِ تعمیر کو توڑا بھی ہے اور نئے جہان بھی آباد کیے ہیں۔ کوفہ و بغداد کی قدیم بستیوں سے الگ ایک ایسا ہی تازہ جہان پاکستان بھی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کو ہر لمحہ احساس رہتا ہے کہ وہ ایک ایسے ملک کے لکھنے والے ہیں جس نے ابھی نو آبادیاتی نظام سے نجات پائی ہے اور جسے نئے معاشی اور تہذیبی مسائل درپیش ہیں۔ ایک سوچنے والے فرد کی حیثیت سے اس نئے ملک کے ذہنی خاکے مرتب کرنے کی ذمہ داری ان پر بھی عاید ہوتی ہے۔ اس ملک سے غربت کا خاتمہ، بیرونی سازشوں کا سدباب، تہذیبی منزل کی دریافت، تخلیقی ترقی کے ساتھ ساتھ منصفانہ انتظامِ معاش، علاقائی ترقی و بہبودی کے نام پر علاقائی عصبیتوں کا ازالہ اور ایک جمہوری سیاسی ڈھانچہ۔ یہ تو ایسے مسائل ہیں جن کا جمہوری حل ہر صاحبِ نظر کے لیے دعوتِ فکر بھی ہے اور چیلنج بھی۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں اور شعروں میں ہمیں براہ راست اس فکر کے اثرات ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے صحافیانہ مضامین کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جو اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اگرچہ ان مضامین کو ابھی ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، ظفر علی خان وغیرہ کے مضامین کی منزلت حاصل نہیں ہوئی ہے، کیونکہ ان کی صحافیانہ تحریر میں قلم برداشتگی تو ملتی ہے لیکن تحریر میں دست تحریر کے قلم کے ساتھ دل کی دھڑکن اور ذہن کی جولانی بہت ہی کم ملتی ہے۔ پھر بھی قاسمی کے سیاسی شعور کے مدارج کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ ان مضامین سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ علاقائی عصبیت سے بالاتر ہو کر قومی منزل کی تلاش میں مسلسل سرگرداں ہیں۔ کیونکہ انھیں علم ہے کہ باقی ماندہ پاکستان کے استحکام و بقا کا انحصار اسی پر ہے۔ اب اگر کچھ ٹوٹا تو جوڑنے کے لیے کچھ نہ رہے گا اور یہ تاریخ کی ایسی رجعت قہقہری ہو گی جو نہ صرف قیامِ پاکستان کی مدت کی ہی نہیں بلکہ ہزاروں سال کی تہذیب کی نفی کر دے گی۔

پاکستان کو ابتدا ہی سے جو مشکلات درپیش ہیں ان کے مدنظر ایک نسبتاً غیر ترقی یافتہ ملک کو ترقی کے دوران جو مسائل پیش آتے ہیں، بیرونی ریشہ دوانیوں کا جو سلسلہ جاری رہتا ہے اس کے مختلف علاقوں کی ترقی کی سطحوں میں فرق اور بہت سے تضادات رونما ہوتے ہیں، پھر بیک وقت یہاں رائج قبائلی، جاگیرداری اور سرمایہ داری نظاموں کے باعث تضادات جب سیاسی بازی گری کے شکار ہوتے ہیں یا اس کے بغیر بھی نمودار ہوتے ہیں تو بہت پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے سیاسی شعور کی بڑائی یہ ہے کہ وہ انتہائی تاریکی میں بھی مایوس نہیں ہوتے ہیں اور ان کے قلم نے برابر کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی روشنی کی لکیر کا پتہ دیا ہے۔ تضادات سے نئی زندگی کی روشنی پھوٹ سکتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ تضادات کے نئے ترکیبی امتزاج سے کوئی وحدت وجود میں آتی ہے اور بغیر تضادات کے زندگی کا سفر جاری نہیں رہتا لیکن یہاں خطرہ یہ ہے کہ کہیں تشکیل سے پہلے ہی تضادات غیر تشکیل کو درہم برہم نہ کر دے۔ رجعت کے آگے بڑھنے سے پہلے کی رجعت کم تشکیل نہ ہو جائے۔ اس لیے ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ تشکیل کو تقویت پہنچانے والی فکر برابر پنپتی اور پھلتی رہے اور مستقبل کا ادراک کرنے والی شمع امید کی روشنی کے دائرے بڑھاتی رہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنے فن کے ذریعہ

زندگی کی روشنی کے اظہار جمہوریت کے اثبات اور سیاسی و تہذیبی عناصر تشکیل کے استحکام کا کام کیا ہے۔ اگرچہ مایوسی کے اسباب کم نہ تھے۔ پھر بھی ان کی نظم امید کا پیغام دیتی رہی ہے۔

ہمارے لکھنے والوں میں خود پرستی اور تنگ نظری عام رہی ہے۔ ہمارے صحافی نظامِ تجارت و منفعت میں دیانت ضمیر سے کم واسطہ رکھ سکے ہیں۔ برسرِ اقتدار طبقہ اور عمالِ حکومت کی کم اندیشی نے وہ دن دکھایا کہ خود ہیئتِ قومی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ ہماری دانش گاہوں میں فکرِ تازہ کے چیلنج سے خائف کرسیوں پر متمکن کتابوں کے کیڑے ہر روزنِ در کو اس خوف سے بند کرتے رہے کہ کہیں تازہ ہوا کا جھونکا نہ آجائے اور ان کا بوسیدہ بت پاش پاش ہو جائے۔ ہمارے طالب علموں کو اس بوسیدہ مثالیت نے فکرِ جدید کے بجائے عناصرِ رجعت کی طرف مائل کر دیا۔ ہمارے عوام مایوس و پریشان ہر منزل کی طرف امید سے تکتے رہے لیکن آخر بد دلی نے انھیں پہلے سے زیادہ افتراق میں مبتلا کر دیا اور وہ خود اپنی ہی صفوں میں رخنے ڈالنے لگے۔ لیکن ان اسبابِ مایوسی کے ساتھ ساتھ قومی اور بین الاقوامی طور پر امید کے آثار بھی موجود ہیں۔ ہماری اس بددل، مایوس اور شکست خوردہ قوم نے بالآخر یہ بھی ثابت کر دیا کہ یہ بڑے سے بڑا صدمہ برداشت کر کے پھر تعمیرِ نو کا حوصلہ رکھتی ہے۔ بین الاقوامی طور پر ایشیا و افریقہ کے ممالک کی سیاسی بیداری بلکہ ایک تیسری دنیا کے وجود نے نئے عناصرِ امید کا اضافہ کیا ہے اور پرانے توازنِ طاقت و تفوق پر کاری ضرب لگائی ہے۔ یہ تیسری دنیا نئی امیدوں اور نئی خواہشوں کی امانت ہے۔ ایک جانب یہ نئی ابھرنے والی قوموں میں وطنیت [illegible] عناصر کو فروغ دیتی ہے اور دوسری جانب ہر جارحانہ قومی ملوکیت کے تصور سے ٹکراتی ہوئی بین الاقوامی انسانیت کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے یہاں مشرق اور تیسری دنیا کی یہ جدوجہد مختلف صورتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا اظہار اس طرح نہیں ہوتا کہ نئی ملوکیت کی حمایت کرتے ہوئے بھی ایک نعرہ ایشیا و افریقہ کے لیے لگا دیا جائے۔ اس کے اثر و نفوذ کے جاننے کے لیے قومی و بین الاقوامی سطحوں کے ادراک اور مختلف صورتوں کے فکری اظہار کا تجزیہ ضروری ہے۔ خود بھارتی جارحیت کا مقابلہ کرتا ہوا پاکستان بھی اس نئے احساسِ قومیت کا ایک مظہر ہے، جس کو احمد ندیم قاسمی کے فن نے موثر طور پر اپنے فن کا موضوع بنایا ہے۔ اس نئی قومیت کی اکائی کی جستجو جہاں ہمسایہ جارحیت کے خلاف ایک ذہنی محاذ اور نئی ملوکیت پسندی کے لیے ایک فکری دیوار ہے، وہاں ایشیا اور افریقہ کی اپنی اپنی دریافت میں منہمک اقوام میں مشترکہ عناصر کی تلاش، ایک نئے مینارۂ نور کی تعمیر بھی ہے۔ اپنی ترقی کے لیے بڑی طاقتوں کی امداد پر انحصار کے بجائے ایشیائی اور افریقی عوام کے مشترک ذرائع بھی بہت کچھ ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں۔ نوآبادیاتی نظام نے جہاں ایشیائی و افریقی قوم کو مشترک عناصر کی دریافت اور مشترک ذرائع کے استعمال سے باز رکھا تھا وہاں قومی سرفرازی اور انفرادی عزتِ نفس کے تصورات کو بھی بڑا صدمہ پہنچایا تھا۔ اس نظام سے نجات پانے کی جدوجہد نے جو قربانی کی عظمت کا تصور پیدا کیا تھا احمد ندیم قاسمی نے اسے بھی برقرار رکھا ہے اور نئے عناصرِ انسانیت کی جستجو بھی کی ہے۔ وہ اس احساسِ قومیت کو ایشیا بلکہ پورے مشرق کی بیداری کا ایک حصہ سمجھتے ہیں، اس سے الگ نہیں۔ اس لیے نوآبادیاتی نظام کی ہر منفی صورت کو خواہ وہ ذہنی اور تہذیبی ہی کیوں نہ ہو، رد کرتے ہوئے وہ مشرق کی نئی تہذیبی دریافت ضروری سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مشرقی اقوام کی آزادی اور ترقی کے ساتھ ساتھ نئے تضادات اور نئے تصادمات بھی ابھرے ہیں، نئی تہذیبی صورتوں میں بھی ان تضادات اور تصادمات کے نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن باشعور اور تخلیقی نظر رکھنے والے فن کار عصری مسائل سے واقفیت رکھتے ہوئے خیال کے ایسے ذرائع تراشتے ہیں جو خوش گوار

مستقبل انسانیت کے امین ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے فن میں نہ صرف انسانیت کے خوش گوار مستقبل کا یقین جھلکتا ہے بلکہ اس تخیل کا پتہ بھی چلتا ہے جو رابطۂ عصر کو مستقبل کے سانچوں میں ڈھال رہا ہے۔ یہ وہ سچائی ہے جو اس وقت انسان کا سب سے بڑا حلیف ہے۔

قاسمی کے فن کی خواہ نثر ہو یا نظم بنیادی خصوصیت حقیقت نگاری ہے۔ لیکن یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کا تجزیہ اس طرح بھی ضروری ہے کہ ان کے نزدیک حقیقت کا تصور کیا ہے؟ پھر یہ حقیقت کا جامد تصور ہے یا بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ اس کی تعبیریں بدلتی رہتی ہیں۔ یہی نہیں اس تصورِ حقیقت میں کیا ان کے تصورِ تاریخ اور مستقبل کے بارے میں ان کی آرزومندی کو بھی دخل ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان تصورات کا رخ متعین کرنے میں قاسمی کی ساری زندگی کے انفرادی تجربات، اجتماعی مطالعات، گرد و پیش کے مشاہدات، سماجی ہجوم کے اکتسابات اور عصری تقاضوں کے امکانات کی اثر آفرینی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قاسمی کے فن کا کمال یہ ہے کہ ان کی شاعری یا ان کی نثر نگاری محض ان اجزا میں منقسم نہیں ہو جاتی بلکہ ان سب اجزا کو سمیٹ کر ایک ایسے جمالیاتی اسلوب میں ڈھل جاتی ہے جسے علاوہ مزاج کی نرمی، رستگی اور شائستگی نے اپنے دور کا نہایت اہم تہذیبی سرمایہ بنا دیا ہے۔ ان کی شخصیت اور ان کے فن کو الگ کیجیے تو دونوں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتے ہیں اور ان کے فنی مقاصد کا ان کی سماجی آگہی سے تعلق منقطع کیجیے تو فن کی معنویت و حسن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ ان کی سماجی آگہی نہ صرف یہ کہ اپنے عصر کے شعور کی ذہنی سطح کو پیش کرتی ہے بلکہ وہ ان کی فنی جمالیات کا سنگِ بنیاد بھی ہے۔ اس بنیاد کو منہدم کرنے سے پوری عمارت ہی متزلزل ہو جاتی ہے جس پر تنقید کا [illegible] اہم وظیفہ یہی ہے کہ فن کے بنیادی تصورات کا تعین کرنے کے بعد مختلف مظاہرِ فن میں اس کے مخفی و واضح اثرات کے جمالیاتی نقوش کی جستجو کرے۔ قاسمی کی شاعری میں جدید فنی تجربے بھی ملتے ہیں۔ لیکن یقیناً یہ پاؤنڈ (POUND)، ایلیٹ (ELIOT) اور ییٹس (YEATS) — کی قائم کردہ روایتوں سے الگ ہے۔ اس طرح ان کی افسانہ نگاری [illegible] کاوشوں کے اکتسابات کے باوجود موپاساں — (MAUPASSANT)، ڈی ایچ لارنس (D. H. LAWRENCE) اور ہمنگوے (HEMINGWAY) کی تراشی ہوئی شاہراہوں سے الگ اپنی ڈگر نکالتی ہے۔ قاسمی کے یہاں [illegible] جو ملتی ہے اور اس خوشبو میں مشرق کی سحر آفریں فضاؤں کی جو موجِ رواں ملتی ہے، وہ انھیں تمام [illegible] لکھنے والوں سے [illegible] کرتی ہے۔ اس خوشبو کا [illegible] پریم چند اور بعض اقبال کے یہاں [illegible] لیکن [illegible] حقیقت پسندی [illegible] آفریں تصورات کو جس طرح ایک تخلیقی وحدت میں ڈھالا ہے اور پھر [illegible] عصر کے [illegible] نقش و نگار سنوارے ہیں وہ ان کا اپنا تخلیقی کارنامہ ہے۔ [illegible] نہیں کہ وہ ان دونوں سے بڑے فن کار ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ضرور ہے کہ قاسمی کے فن کی وحدت اور ترکیبی امتزاج ان دونوں کے یہاں نہیں۔ یہ بات کم اہم نہیں کہ قاسمی کے افسانوں میں شعریت اور شاعری میں افسانویت کے جو اجزا یک جان ہو گئے ہیں وہ [illegible] ہمیں اردو کے کسی اور لکھنے والے کے یہاں نہیں ملتے۔ اس لیے قاسمی کا فن اپنے دور کے [illegible] تخلیقی شعور کا [illegible] اپنے دور کے گرد و پیش کے کوائف کا مطالعہ سیکھا تھا سب سے اہم تہذیبی ترجمان ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی بنیادی ادبی شخصیت اجزا میں زندگی کی سالمیت کا حسن [illegible] اور [illegible]

کے نشاناتِ قدم دیکھتی ہے۔ اس لیے ان کی شاعری اور افسانہ نگاری تخلیقی ذہن کے دو الگ الگ حصوں کی نشان دہی کرنے کے بجائے اپنے عصر کے تقاضوں اور اپنے دور کی عزیمتوں کی تابندہ وحدت کی خلاقانہ تعبیریں ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور فن کو ان عصری نقوش سے الگ کر کے دیکھنا خود ان کے ادبی کارناموں کی معنویت کو پارہ پارہ کر دینا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قاسمی کے افسانوں اور شاعری دونوں میں ہمیں کئی مقامات پر جدتِ اظہار اور اسلوب کے انکشاف جدید کے نمونے ملتے ہیں لیکن اکثر یہ محض تراشِ ہئیت نہیں بلکہ اس کے پردے میں اس صورتِ حال کی ترجمانی مقصود ہے جس کے لیے یہ صورتِ بیان شاید زیادہ موزوں پیرایۂ فن ہے۔ اس لحاظ سے احمد ندیم قاسمی ان افسانہ نگاروں اور شاعروں سے بھی الگ ہیں جو صرف تکنیک کی ندرتوں کو فن کا کمال سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا کہ بعض موافقینِ قاسمی محض اسالیبی جدتوں کی بنا پر ان کی بڑائی منوانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ عظمت اللہ خاں سے لے کر جیلانی کامران تک اور سجاد بلدرم سے لے کر ملراج مینرا تک صرف وہ تخلیقی تجربے متاعِ ادب ٹھیرے ہیں جن میں زندگی کے کسی عصری عرفان کو پیش کیا گیا ہے۔ جن تجربوں کی پشت پر زندگی کے وسیع شعور کا ہاتھ ہوتا ہے۔ صرف وہی تجربے اپنے عصر کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ فن کی پائندگی کا حق ادا کر سکتے ہیں ورنہ ادب کی تاریخ میں فقط ایک ضمنی ذکر یا محض ایک حوالہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانے اپنے زمانے کے حالات، اپنی زمین کی سچائیوں اور اپنے گرد و پیش کی کیفیتوں سے پوری طرح منسلک ہونے کے باوجود محض صحافیانہ بیان نہیں اور نہ اُن کے اجزائے اظہار دیبانہ تاثر و تناسب سے زیادہ غیر ادیبانہ بے ہیئتی پر مبنی ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعے سے ہیئت کا واضح احساس اُبھرتا ہے جسے فن کے عصری شعور نے ایک معین صورت عطا کی ہے۔ قاسمی نے حقیقتوں کا تانا بانا بغیر کسی تصورِ حقیقت کے نہیں بُنا ہے۔ اس تصورِ حقیقت اور واقعیت نے مل کر ان کے افسانوں کو مخصوص مزاج دیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانے منٹو کی بے لاگ معروضیت سے اتنے مختلف ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے کی ضد کہا جا سکتا ہے۔ منٹو کی معروضیت خود زندگی پر بے رحمانہ تنقید ہے لیکن قاسمی نے زندگی کی شقاوتوں کو نمایاں کرنے کے لیے ان کے مقابل احساس و تخیل کا مرکب آئینہ رکھ دیا ہے۔ شاید اسی لیے بعضوں کے نزدیک ان کی افسانہ نگاری شاعری سے کم معتبر ہے لیکن بات صرف اتنی ہے کہ قاسمی کی شخصیت افسانہ ہو یا شاعری دونوں میں حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے رفعتِ تخیل کی رنگ آمیزی اور زیریں احساس کی موج آفرینی ضروری سمجھتی ہے۔ افسانوں میں وہ پریم چند کی حقیقت پسندی کے ایک بڑے جزو بینی مقامی زندگی کی تفصیلات سے آب و رنگ مستعار لیتے ہیں لیکن پریم چند سے کہیں زیادہ وہ افسانے کی مجموعی تراش میں خیال کی شاعرانہ لطافتوں سے کام نکالتے ہیں۔ پریم چند کے افسانے کا پلاٹ، اس کی عقبی زمین، اس کے کردار اور اس کی نفسیاتی فضا ہیں سب کی سب سماجی نظام کے کرب و سفاکی کی اس طرح آئینہ داری کرتی ہیں کہ خود قاری کا ذہن اس پیش کردہ زندگی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اس کے باوجود پریم چند کے بعض افسانوں میں حقیقت کی سنگینی کے ساتھ ساتھ جو مجموعی نقش اُبھرتا ہے وہ شاعرانہ تاثر کا حامل ہوتا ہے۔ خود "کفن" میں حقیقت کی سفاکانہ پیش کش کے ساتھ زندگی کی المناکی کا جو تاثر اُبھرتا ہے وہ شاعرانہ حسن و تاثیر سے خالی نہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ان کے یہاں یہ شعریت حقیقت کو نمایاں کرتی ہے اور قاسمی کے یہاں بعض اوقات شاعری واقعیت پر غالب آجاتی ہے۔ قاسمی کی شاعرانہ خواب سازی اور بہتر زندگی کے تصور کی حرکت آفرینی جہاں

ان کے افسانوں کو انسان دوستی کے محرکات عطا کرتی ہے وہاں بعض اوقات ان کے کردار، واردات اور مجموعی افسانوی احوال بھی شاعرانہ استعارے یا علامات و نقوش بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے قاسمی کے افسانے اپنے دور کے شعور کو پیش کرنے کا تخلیقی عمل ہیں اور ان میں زندگی کے تضادات و تصادمات کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ شاعرانہ حسن، مثال آرائی، تصوراتی شکل سازی اور ذہنی تجربات نے مل کر انھیں فنی صورت عطا کی ہے۔

قاسمی کے افسانوں کی ادبی قدر و قیمت اور معنویت کے سلسلے میں درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔ لیکن ان کے بہت کم افسانے ایسے ہوں گے جو اپنی تراش کے اعتبار سے ناقص اور ماجرائے اظہار کے لحاظ سے ڈھیلے رہ گئے ہوں۔ ان افسانوں میں تخیل اور حقیقت کی ایسی آمیزش ہے کہ انھیں اردو افسانے کی تاریخ میں ایک نمایاں اور الگ مقام دیا جا سکتا ہے۔ یہ معروضی حقیقت سے زیادہ حقائق کی شاعرانہ تعبیریں یا یوں کہیے کہ حقیقت کی افسانہ طرازیاں ہیں۔ قاسمی کے فن میں شاعرانہ تصور سازی اور افسانوی تخیل آرائی کے حدود مل جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان افسانوں کی بنیادی اہمیت اس لیے ہے کہ یہ زمین کی سطح سے ابھرتے ہیں اور واقعات کے انبار سے اپنی غذا تلاش کرتے ہیں۔ ان کی تخیل سازی افسانہ نگار کے احساسِ حقیقت اور تصورِ حقیقت پر مبنی ہے۔ اسی لیے یہ افسانے نمائشِ فن اور سرابِ خیال سے زیادہ زندگی کے سرچشمے کا پتہ دیتے ہیں قاسمی کے افسانے فطرت و ماحول کو انسانی اعمال کی روشنی میں پرکھنے کی کوششیں ہیں۔ وہ انسانی اعمال کو پیش کرتے ہوئے ایک تخلیقی عمل کا سراغ دیتے ہیں جس کی اساس ان کے شعورِ عصر اور تصورِ حیات پر ہے۔ یہ تخلیقی عمل خود ساختہ نہیں بلکہ عصری تحریکات کا پروردہ ہے اور اپنے دور کی سچائیوں سے نشوونما پاتا ہے۔ جب ہم تاریخ میں پیہم آویزش کا عمل کارفرما دیکھتے ہیں تو اپنے دورِ تاریخ میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کی بہتری، فکری آزادی، نظامِ پیداوار و تقسیم میں معاشی انصاف، سماجی مساوات، معاشرتی و تہذیبی ترقی، اپنی زمین سے محبت اور بین الاقوامی احساسِ یگانگت ہی زندگی کی برتر سچائیاں ٹھہرتی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے فن میں ان برتر سچائیوں کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ ان سچائیوں کو اپنے دور کے حقائق کی روشنی میں جانچا جا سکتا ہے اور یہی ان کا معیارِ قبول ہے۔ اس لیے فن کے بہترین کارناموں کو جانچنے کے لیے ہمیں صرف فن کار کی شخصیت کی طرف رجوع نہیں کرنا پڑتا بلکہ ان تمام اجتماعی عناصر کا جائزہ بھی لینا پڑتا ہے جو اس کے احساسِ حقیقت کو اپنے اپنے دور کی سچائی بناتے ہیں۔

قاسمی کے افسانوں میں برتر اقدار کے احساس اور عصری شعور نے ایک ایسی فنی منطق کو وجود بخشا ہے جو افسانے کی ساخت میں تخلیقی تحریک کا سبب بن جاتی ہے یہ افسانے ایک تہذیب کے نقوش کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے عصری شعور کو بھی پیش کرتے ہیں۔ جہاں قاسمی نے حقائق کو ایک حد تک تخیلی قالب میں ڈھالا ہے وہاں یہ تخیلی قالب خود اپنے طور پر ایک تہذیب کے عصری مزاج اور تمناؤں کو پیش کرتا ہے۔ اس تخیلی قالب پر افسانہ نگار کے احساس کی گرفت بھی مضبوط ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعہ وہ تصورات کو دھڑکتی ہوئی زندگی سے ہم آہنگ کر سکا ہے۔ قاسمی کے افسانوں میں احساس کی یہ مختلف سطحیں اپنے عصر کے نقوش کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے خوابوں کا تعین بھی کرتی ہیں اور اس طرح حقیقت و غیر حقیقت کے درمیان اس دورِ تاریخ کی جاری کشمکش میں، جو اکثر لکھنے والوں کو ابہام، انتشار، لایعنیت اور تصورِ عدم وجود کی وجودیت کی طرف لے جاتی ہے، وہ اپنے لیے راستہ نکال لیتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے بیشتر کامیاب افسانے وہ ہیں جن میں واقعات (خواہ ان کا دائرہ کتنا ہی مختصر سہی) رونما ہوتے ہیں اور ان میں بھی جہاں نفسیاتی اور سماجی سطحوں کا وہ اپنے عصر کے مستقبل کے شعور کے ساتھ تطابق پیدا کر سکتے ہیں؛ معنویت کا تاثر گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ کردار، صورتِ حال، نفسیاتی بیان، تکنیک کی ندرت، اور عمل ردعمل کے سارے عوامل بیکار ہیں اگر اپنے دور کی صداقتوں سے وابستہ بامعنی فنی تاثر پیدا نہ کر سکیں۔ کیونکہ فن کی مجموعی منطق اجزا کو اپنی گرفت میں لے کر انسانی دلچسپی کے ان عناصر کو ابھارتی ہے جو اپنے عصر کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ چنانچہ قاسمی کے افسانے "آسیب" اور "پائل" قدیم وجدید اقدار اور تہذیبی کشمکش کو شاعرانہ نقش میں ڈھالتے ہیں۔ اس کے برخلاف ان کا افسانہ "گڑیا" ایک ایسی شاعرانہ تخیل آرائی ہے جس سے شاید ایسے سماج کا پتہ تو چلتا ہے جس میں صنفی پابندیاں دو سہیلیوں کی محبت کو غیر حقیقی (غیر فطری یا LESBIAN نہ سہی) حد تک لے جاتی ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر یہ افسانہ مجموعی زندگی سے غیر منسلک خیال کی نقش گری ہے اور اس لیے ہیئت کی تراش سے اس کی خام کیفیتی کم نہیں ہوتی ہے۔ قاسمی نے جہاں کہیں مجموعی زندگی سے الگ ہو کر یا رابطۂ عصر سے کم وابستہ افسانے لکھے ہیں ان کی شاعرانہ تخیل آرائی بجائے افسانوی تاثیر کے برعکس اثر پیدا کرتی ہے کیونکہ یہاں حقیقت اور تخیل کی وہ وحدت جو قاسمی کے فن کا مرکزی نقطہ ہے۔ دولخت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح قاسمی کے بعض افسانوں میں زندگی کے مجموعی شعور سے الگ ہو کر نفسیاتی حقیقت بنی محض خیال آرائی بن جاتی ہے۔ لیکن وہ زندگی کے نرم ونازک گوشوں کو حقیقت کی سنگینی کے ساتھ ایک ہی تناظر میں پیش کرنے کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کے کامیاب افسانوں میں "کنجری" اور "نمونہ" اس سلیقے کے مظہر ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں قاسمی کی خیال آرائی اپنے عصر کی واقعیت سے رابطہ قایم کر سکی ہے وہاں شاعرانہ تصوریت بھی افسانویت کو مہمیز دیتی اور لطافت پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ "کپاس کا پھول" میں بھارتی فوجیوں کی ہوس کا شکار راحت اور مائی تاجو کے کفن میں لپٹی ہوئی مظلوم کے خلاف احتجاج اور امیدِ حیات کا ایک نہ بھولنے والا پیکر ہے۔ بڑی حد تک احمد ندیم قاسمی کے افسانے تفصیلی اجزا کے بیان پر اپنی ساری توجہ مرکوز کرنے کے بجائے ایک ایسی تاثراتی وحدت کے حامل ہیں جن میں اجزائے بیان اور دیگر عناصر افسانہ نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے حیات آفریں ربط رکھتے ہیں بلکہ اس ربط کا تعین کرنے والی فنی منطق کے زیرِ اثر جامد نفسی کیفیات کو عصری جہات عطا کرتے ہیں۔ اپنے شاعرانہ احساس اور عصری شعور کے ساتھ احمد ندیم قاسمی نے اردو افسانے کو آئینہ خانوں کی جلا اور تابش عطا کی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے فن اور شخصیت کا محور ان کی شاعری ہے۔ لیکن جہاں اس شاعری کو انسان دوستی کی روایت ورثے میں ملی ہے، وہاں اس نے اقبال کے عظمتِ آدم اور عملِ پیہم کے تصورات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی حد میں ایک انقلابی تحریک تک وسیع کر دی ہیں۔ قاسمی ان شاعروں میں نہیں جو گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر اپنے خیالوں کے محل سجاتے رہتے ہوں۔ اس کے برخلاف نہ صرف یہ کہ وہ اپنے عصر کی ادبی تحریکات سے پورے طور پر منسلک رہے ہیں بلکہ عظیم تر زندگی کے دھاروں سے بھی ان کی وابستگی گہری رہی ہے۔ قاسمی نے اقبال کی روایت کو آگے بڑھایا اور اسے نیا جمہوری شعور عطا کیا ہے۔ اقبال کی شاعری کے اس سامنتی مزاج کے برخلاف جو ان کو "اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں" کہنے پر مجبور کرتا ہے ندیم کی شاعری جمہوری مزاج اور انقلابی اقدار کی حامل رہتی ہے۔ قاسمی کی شاعری میں جمہوری رزمیہ بننے کے اوصاف موجود ہیں اور وہ اس خزینۂ دعنائیت کے کیائے جسے بعض شاعرانِ جمہور نے اپنی فکر تی

کمزوری کا پردہ بنا رکھا ہے، بیداری کے ترانے سنے ہیں۔ ان کی شاعری اپنی قربانی کے ترانے گانے کے بجائے نوعِ انسان کی قربانیوں کو زیادہ مدِنظر رکھتی ہے۔ اگر تجزیہ کیا جائے تو اقبال کی شاعری بعض بعد کے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ حرکت آفریں شاعری ہے اور احمد ندیم قاسمی نے اس حرکت آفرینی کو نئے رابطۂ عصر کے ساتھ نئی سمتوں میں پیش کیا ہے۔ وہ حافظ اور میر کے قبیلے سے نہیں، نظیری اور اقبال کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ آج کی دنیا کے اس نئے ابھرتے ہوئے شعور کے شاعر ہیں جس کا دائرہ گاؤں سے شہر تک وسیع ہو رہا ہے۔ قاسمی کے لیے فن ایک مسلسل ریاضت کا نام ہے اور بعض اتفاقی حادثات نے بیک جست انھیں شہرت عطا نہیں کردی ہے۔ شاید اسی لیے قاسمی کی شاعری کی تحسین شناسی کا کام صحیح معنوں میں اب شروع ہو رہا ہے۔ ان کی شاعری کا دائرہ اپنے بعض ہم عصروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع اور کہیں زیادہ متنوع ہے۔ اس لیے وہ ہمارے قومی مزاج اور عصری شعور کے زیادہ بہتر ترجمان ہیں۔ احمد ندیم قاسمی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے تہذیبی سرمائے، فکری ارتقا، ذہنی ورثے اور اجتماعی حرکت کا ایک حصہ ہیں۔ اسی لیے جدید تر نظریاتِ شاعری سے واقف ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے طرزِ اظہار میں اپنے قومی مزاج سے روگردانی نہیں کرتے۔ لیکن ان کا احساسِ قومیت وسیع تر ارضیت کا جزو ہے اور اس کے ذریعہ احمد ندیم قاسمی نے مجموعی انسانی آگہی کو پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اپنی شاعری کو معمائیت کا اشتہار بنا کر انتشار کی تبلیغ کے بجائے احمد ندیم قاسمی نے اکثر دل آویز، پُراثر اور قابلِ فہم انداز اختیار کیا ہے۔ وہ شاعری کی ہر صنف میں ابلاغ و معنویت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اپنے پیش رو شاعروں سے اکتسابِ فیض کرتے ہوئے اور اپنے قومی مزاج سے ہم آہنگ اسالیبِ اظہار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بھی احمد ندیم قاسمی کی شاعری کی آواز ان کی اپنی آواز ہے۔ انھیں اپنی جدیدیت یا انفرادیت کا ڈھول پیٹنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا بعض اوقات بیانیہ انداز بھی موضوع کی سطحوں کو اندرونی جوش اور ڈرامائی وصف کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ لیکن احمد ندیم قاسمی نے استعاراتی اور ایمائی انداز بھی اختیار کیا ہے کہ کوئی شاعری رمز و ایما سے خالی نہیں ہو سکتی۔ قاسمی کے یہاں علامت سازی شیشہ یا پتھر کوئی روپ اختیار کرے اور ایمائیت چھنکتی زنجیروں سے کام لے یا فصلِ گل میں محصور ہوتے تاروں کے قتل کا منظر دکھائے، بہرحال معنوی صراحت اس کی بنیادی خصوصیت ہے۔ یہ صراحت و وضاحت بھی ان کے جمہوری مزاج کا جزو ہے۔ کیونکہ وہ جمہور ہی کو اپنی شاعری کا مخاطب سمجھتے ہیں جن تک اپنی بات پہنچانا ضروری ہے۔ وہ ایک جگہ کھل کر اپنے ادبی منشور کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

یہی میرا ادب ہے اور یہی میری سیاست ہے
مرے جمہور ہی سے میری فن کاری عبارت ہے

یہ صحیح ہے کہ شاعری میں خواب نمائی کا جزو بھی شامل ہوتا ہے۔ لیکن اس خواب نمائی کی بنیاد زندگی کی حقیقتوں پر ہوتی ہے۔ قاسمی کی شاعری سراسر بیداری ہوتے ہوئے خواب نمائی کا یہ جزو بھی رکھتی ہے۔ اس کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شاعرانہ احساس کو ایسی حقیقی صورتوں کے ساتھ پیش کرتی ہے کہ خواب و بیداری کا فاصلہ مٹ جاتا ہے۔

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

قاسمی کی شاعری میں زندگی کے متنوع تجربات کی مختلف سطحیں ان کے عصری شعور کے مختلف زاویوں کو پیش کرتی ہیں۔ ان کی شاعری بعض جگہ خود کلامی سے بھی کام لیتی ہے لیکن اس سے زیادہ وہ اپنے عصر سے خطاب کرتے ہوئے انفرادی اور اجتماعی کیفیات کی متعدد شاعرانہ تصویروں کو پیش کرتے ہیں۔ ان میں متعدد تصویریں افسانے کی دلچسپی اور داستان کی رنگینی لیے ہوئے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ قاسمی نے شاعری کی افسانہ خیزی سے کام لیا ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے تمام ہم عصروں سے زیادہ شاعرانہ کیفیتوں کو مکتوم و مکشوف افسانوی موڑ دیے ہیں، اور بعض اوقات پورے افسانے کی تعمیر کردی ہے۔ ان کے بعض اشعار، بعض نظموں، اور بعض قطعات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم نہ صرف ایک افسانوی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں، بلکہ خود بھی اس منظر کا ایک حصہ بن کر اس کے گردوپیش کے ایک کردار کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی شاعری کی افسانہ طرازی کے بعض پہلو نمایاں دلچسپی کے حامل ہیں۔ مثلاً

چاند نکلا ہے سرِ بام لبِ بام آؤ　　　دل میں اندیشۂ انجام نہ آنے پائے

ترے گیت گاتی تھی جب بھی میں مجھے چھیڑتی تھیں سہیلیاں　　　مگر ان پہ کھل نہ سکیں کبھی مری زندگی کی پہیلیاں

تیرا غماز بنا خود ترا اندازِ خرام　　　دل نہ سنبھلا تھا تو قدموں کو سنبھالا ہوتا

گلیوں کی شمعیں سوئیں اور شہر سونا ہو گیا　　　بجلی کا کھمبا تھام کر بانکا سپاہی سو گیا

فقر و فاقے میں مر گیا شاعر　　　شعر اہلِ نظر کے کام آیا

غمِ جاناں غمِ دوراں کی طرف یوں آیا　　　جانبِ شہر چلے دخترِ دہقاں جیسے

تو گرجتا بھی ہے خاص اپنے ہی انداز کے ساتھ　　　پھول کھلتے ہیں ترے شعلۂ آواز کے ساتھ

دیکھ رہی تو پنگھٹ پر جا کے ان کا ذکر نہ چھیڑ اگر　　　میں کیا جانوں وہ کیسے ہیں کس کوچے میں رہتے ہیں
میں نے کب تعریفیں کی ہیں ان کے بانکے نینوں کی　　　وہ تو اک خوش پوش جواں ہیں میرے بھیا کہتے ہیں

چوپال پر رونق ہے شاید تھانے کے سپاہی آئے ہیں　　　معصوم غریب کسانوں کے وارنٹ بنا کر لائے ہیں

اتنی بے چین تھی اس رت مہک پھولوں کی　　　جیسے ماں، جس کو ہو کھوئے ہوئے بچے کی تلاش

قاسمی نے روزمرہ کے بعض اجزائے بیان کو نئی روشنی بخشی ہے اور بعض جگہ کسی شاعرانہ عمومیت کو انسانی خصوصیت کے ذریعہ نمایاں کیا ہے۔ اسے بھی ان کی حقیقت نگاری کا ایک پہلو کہا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی شاعری کی طرف توجہ مرکوز کرانے کے لیے نہ بعض جدید تر شاعروں کی طرح ذہنی صدمہ پہنچانے کی تکنیک سے کام لیتے ہیں اور نہ بعض ہم عصروں کی طرح انقلابی آہنگ کو رومانی تلطیف میں نعرۂ قربانی کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ انھیں اپنے آدرش یا نصب العین کے لیے اس رومانی چٹخارے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی جو کم پختہ یا نوبلوغ یافتہ ذہنوں کے لیے اس کی کشش میں اضافہ کر دیتا ہے۔ وہ اس نصب العین کو خود حقیقی کشش کا حامل پاتے ہیں اور اجزائے زندگی سے اس کی تفسیر کا کام لیتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کا فن اجزائے حقیقت کی شعوری گرفت کا نام ہے۔ وہ بعض شاعروں کی طرح متغزلانہ کیفیت اور جذباتی سرشاری ہی کو مشاہدے اور تجربے کا بدل نہیں سمجھ لیتے اور نہ محض اسے جنس فروشی کی تکرار کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان کا اپنے عہد سے رابطہ زیادہ منضبط، زیادہ واضح اور حقیقت کی زیادہ سطحوں پر حاوی ہے۔ وہ رنگوں کو محض پیراہن یا صرف گلوں میں نہیں انسانی زندگی کے ہجوم میں ابھرتے، سمٹتے اور مختلف سانچوں میں ڈھلتے دیکھتے ہیں اور یہی رابطۂ عصر ان کے فن کی بہت بڑی جیت ہے۔ زندگی کے مختلف رنگ ان کی غزلوں، نظموں اور قطعات میں شعری صورت سازی کے عمل سے نئی ذہنی شبیہیں بناتے اور پرانی صورتوں کو نئے انداز سے پیش کرتے ہیں۔ قاسمی کی شاعری کی جذباتی کیفیت اور شاعرانہ نقش گری میں ان کی شخصیت، عصری اجتماعیت اور ذہنی جمہوریت کے بہت سے رنگ نظروں کو سرمایۂ بہار فراہم کرتے ہیں۔

قاسمی کی شاعری نے اپنے دور کے عوام کے جذبات و توقعات کو خوبصورت شاعرانہ بیان عطا کیا ہے۔ عام زندگی سے تاثرات قبول کرنے کے بعد وہ ان کو شاعرانہ صورت دے کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کے مطالعہ سے ہمارے انسان کے علم اور انسانیت کی آگہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس آگہی کے لیے بھی ان کے رابطۂ عصر نے ضروری بنیاد فراہم کی ہے کہ اس کے بغیر نہ ان کا تصورِ فن مکمل ہوتا ہے اور نہ فن جلا پاتا ہے۔ یہی عرفانِ عصر انھیں چابک دستی عطا کرتا اور فنی انتخاب و تنظیم کے لیے معیار بن جاتا ہے۔ اسی کی روشنی میں وہ ماورائے واقعیت کے چکر میں پڑ کر لاشعوری گورکھ دھندوں کو سلجھانے کے بجائے زندگی کے فوری، سادہ، حقیقی اور اجتماعی عناصر کو تاریخی بصیرت کے ساتھ منتخب کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں استعارے نے تصور اور تصور نے استعارے کا پیکر جس طرح اختیار کیا ہے، وہ خود ایک دور کے اجتماعی تلازمات کا نتیجہ ہے۔ وہ دور جس میں ہمیں محبت کے ساتھ نفرت، مجبوری کے ساتھ اختیار اور شرافت کے ساتھ قہر کی پرچھائیاں ملتی ہیں، قاسمی شاعری میں زندگی کی سانسیں بھرتا ہے اور اس کے تضادات شاعرانہ نقوش میں ڈھلتے ہیں۔ قاسمی کی شاعری اس کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ ؎

میں محبت کا تو دیتا ہوں محبت سے جواب
لیکن اعدا کے لیے قہر و قیامت ہوں میں

اعتراف کے لہجوں میں اس کا اظہار بھی کرتی ہے کہ ؎

اس کے اندر کوئی فن کار چھپا بیٹھا ہے
جانتے بوجھتے جس شخص نے دھوکا کھایا

دراصل یہ بھی اپنے دور کے تضادات کا عکس ہے جس نے فن کار کے برتاؤ کے ایک پہلو کو نمایاں کیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے فن خصوصاً ان کی شاعری میں اپنے عصر کی جدوجہد سے جو قول و قرار کا عنصر ملتا ہے وہ ایک پورے نسل کی دین ہے جس نے زندگی کے روشن مستقبل پر یقین رکھنا اور اس کے لیے جدوجہد کرنا سیکھا تھا چنانچہ جب احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں کہ ؎

جو ترانہ کہ تلوار کے وار سے بیچ میں کٹ گیا اک سبق بن گیا
خون جو جذب ہوتا رہا خاک میں صبح نو کے اُفق کی شفق بن گیا
نوجواں فن طرازوں کی لاشوں سے پھوٹی وہ کونپل جواب ایک گلزار ہے
یہ تعطر جو اٹھکھیلیاں کر رہا ہے اسی گل کدے ہی کی مہکار ہے

(نیا ایشیا)

تو وہ اپنے دور کی ایک زندہ حقیقت کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن احمد ندیم قاسمی نہ صرف یہ کہ اس شعورِ عصر کو ایک مفروضے یا کُلّیے کی طرح بیان کرنے کے بجائے انفرادی احساسِ عصر کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ نفسیاتی لہروں اور سماجی شعور کی سطحوں میں جمالیاتی توازن قایم رکھنے کا فن بھی جانتے ہیں۔ اسی لیے ان کی آواز کسی پہاڑ کی بلندی سے نیچے آتی ہوئی نہیں معلوم ہوتی، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے زمین کی سطح سے بلند ہو رہی ہے۔ اسی لیے اس آواز میں پیار، اپنائیت اور انوسیت کی کیفیت اپنے تمام ہم عصروں سے زیادہ ہے۔ اس نسل نے جسے انسانیت کے مستقبل پر یقین تھا اور جس کے سرمایۂ یقیں سے قاسمی نے بہت کچھ اکتساب کیا ہے، ادبی تخلیق کے جو چراغ روشن کیے تھے ان سے آج بھی نظریں منور ہیں۔ اس کے برخلاف مغرب کی اس نسل نے جس کے لیے ایلیٹ (ELIOT) کی نظم ــــ 'THE WASTE LAND' زندگی کی ویرانی کی علامت بن گئی تھی، یقین کی شکست ہی کو اس طرح اپنا مطمحِ نظر بنا لیا کہ خود ایلیٹ کو لطنی ریت میں کہنا پڑا کہ "شاید میں نے ان کے ردِ التباس (DISILLUSION-MENT) ـــــ کے التباس ILLUSION ــــ کا اظہار کیا ہو، لیکن یہ میرے ارادے کا جزو نہ تھا"۔ اسی گروہ کی تقلید کو اردو کے جدید شعرا نے اپنے لیے لائقِ فخر سمجھا۔ قاسمی نے بھی اس جدید فضا میں سانسیں لیتے ہوئے شکستِ یقین کا منظر دیکھا، لیکن ان کی شاعری کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ذہنی شکستوں سے واسطہ رکھتے ہوئے بھی محض بے یقینی کے بجائے زیادہ وسیع تصورِ عصر کو پیش کرتی ہے۔ پھر قاسمی کا رویّہ بعض مغربی شاعروں (اور ان کے مقلد اردو شاعروں) کی طرح مخالفِ تہذیب (ANTY CULTURE) رویّہ نہیں۔ وہ اب تک کی تہذیبی میراث کو رد کر دینے کے بجائے اپنے دور کے تہذیبی عوامل کو پیش کرتے ہوئے گذشتہ روایات کے ان عناصر کو بھی قبول کرتے ہیں جو ہمارے معاشرے اور مزاج کا جزو بن گئے ہیں۔

مجموعی طور پر قاسمی کی شاعری نے اجتماعی طاقت کی مصوری اور رفتارِ ارتقاء کی شاعرانہ تجسیم کی ہے۔ ان کی شاعرانہ فطرت کی لوحِ سادہ نے زندگی کے پیچیدہ اعمال کا مرکب نقش بھی قبول کیا ہے۔ اس کا ثبوت ان کی شاعری کا حجم، تنوع اور وسعت ہے۔ اس شاعری کے نرم دھندلکے میں اجتماعی قوت کے پُرجلال چہرے کی صاف جھلک ملتی ہے۔

ان کی شاعری کی بارگاہوں میں عشقیہ رومانیت کی لطیف آواز بھی سنائی دیتی ہے لیکن اس عشقیہ رومانیت کو بھی اس عصر کی انسان دوستی کے تصورات نے نئی تجلیات بخشی ہیں۔

سب حجابات نظر دل کے نہ دکھنے تک تھے — درد چمکا تو اندھیرا بھی نہ رہنے پایا

جب بھی میں راہ سے بھٹکا ترا پیکر چمکا — جب بھی رات آئی تری سیم تنی یاد آئی

رچی ہوئی ہے رفاقت مری رگ و پے میں — کچھ اس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں

مٹی سے اگر بنا تھا آدم — انسان تو پیار سے بنا ہے

تیرا غم زندگی کا زخم سہی — تیرے غم سے وفا تو کی ہم نے

ہم عکس ہیں ایک دوسرے کا — چہرے یہ نہیں ہیں آئینے ہیں

قاسمی کی غزل اردو غزل کی روایت میں حقیقت و رومانیت کے لطیف امتزاج کے ساتھ احساس کے ایسے نئے گوشوں کو پیش کرتی ہے جو ان ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس غزل کا لہجہ و آہنگ واضح طور پر قاسمی کی ذات و شخصیت کی ترجمانی کرتا اور سرمایۂ غزل میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً ؎

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا — میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

خود اپنے ہی ریزے مری جھولی میں بھرے ہیں — اور لب پہ دعا ہے کہ کوئی شیشہ گر آئے

ترے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو — میں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے گھر جاؤں

مجھ سے کترا کے نکل جا مگر اے جانِ حیا — دل کی لَو دیکھ رہا ہوں ترے رخساروں میں

لے جو ٹوٹی تو صدا آئی شکستِ دل کی — رگِ جاں کا کوئی رشتہ ہے رگِ ساز کے ساتھ

فراق زخم سہی کم نہ تھی جراحتِ وصل — معانقہ مرے محبوب کا صلیب سا تھا

ڈوٹا تو کتنے آئینہ خانوں پہ زد پڑی　　　اٹکا ہوا گلے میں جو پتھر صدا کا تھا

قاسمی نے نظم گوئی میں حالی سے لے کر اقبال تک کا اثر بھی قبول کیا ہے اور صوت و آہنگ کے اعتبار سے نئے تجربے بھی کیے ہیں۔ لیکن ان تجربوں میں بھی شعور کارفرما ہے۔ پھر بعض قدیم اسالیبِ بیان کو بھی قاسمی نے جدید آہنگ بخشا ہے۔ مثلاً ؎

یوں بھی ہوتا ہے کہ آندھی کے مقابل چڑیا　　　اپنے پَر تولتی ہے
اک بھڑکتے ہوئے شعلے پہ ٹپک جائے اگر　　　بوند بھی بولتی ہے

قاسمی کے شاعرانہ تجربات کا دامن یوں تو بہت وسیع ہے۔ لیکن اس کا سب سے عظیم بالشان موضوع انسان ہے۔ انسان کی عظمت کا اظہار قاسمی نے بار بار مختلف پیرایوں میں کیا ہے اور انسان ہی کو ربطِ کائنات و حیات کا مرکزی نقطہ قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

اب اس سے بڑھ کے ہو کیا ربطِ کائنات و حیات　　　فضائیں گونجی ہیں انسان کی پکار کے ساتھ

اے جنتِ گم شدہ کے رازو　　　آدم اُبھرا ہے راستہ دو

وہ دھندلکا جسے سب حدِ نظر کہتے ہیں　　　اب تو انسان کی ہے راہگذر کہتے ہیں

آدم کی سلگتی ہوئی تاریخ رقم ہے　　　جبریل کے شہپر سے مرے دامنِ تر تک

ہم گونج ہیں سازِ ارتقا کی　　　گونجیں گے ابھی زماں زماں ہم

اس توقع پہ کہ شاید کبھی انسان سنبھلے　　　ہر نئے ظلم نے جینے پہ مجھے اُکسایا

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر　　　کسی بھی شہر میں جاؤں غریب شہر نہیں

آنکھ تک جھپکنے کا کس میں حوصلہ ہوگا　　　دیکھیں ٹکٹکی باندھے جب کئی کروڑ آنکھیں

بڑا سرور ہے انساں کی داستانوں میں　　　لبھا سکا فقط انسان کا مزاج ہمیں

ان اشعار کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عظمتِ آدم کے وہ نقوش جو ہمیں غالب و اقبال کے یہاں ملتے ہیں، قاسمی کی شاعری میں نئے عصری شعور کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ قاسمی کی فکر میں نہ صرف یہ کہ

ان کے اندازِ نظر کی ندرتوں کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سماجی علوم کی روشنی سماجی جدوجہد کی توانائی، جمہوری تحریکوں کے فروغ، بین الاقوامی رشتوں کے احساس اور کم ترقی یافتہ خطوں کی یک جہتی نے کئی منزلیں طے کرلی ہیں۔ قاسمی کی شاعری میں آدم کی عظمت کے مختلف پہلوؤں کا اظہار ایک آدرش بھی ہے اور تاریخ کے سفر کا ایک اہم نشان بھی۔ ان اشعار کا مطالعہ زمین سے خلاؤں کے جہاں تک آدم کے نقوشِ قدم کا مطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ خود فن کار کے اوجِ فکر کا مطالعہ بھی ہے۔ شاید نظامِ شمسی پہ یلغار خود زمین کے جمال کو نمایاں کر سکے۔

قاسمی کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے وسیلۂ اظہار یعنی زبان کا جائزہ لیا جانا بھی ضروری ہے کہ اس سے بیک وقت کئی فکری رابطوں اور عصری سلسلوں کا پتہ چلتا ہے نثر ہو یا نظم دونوں میں حقیقت کی تعمیر زبان ہی کے ذریعہ ہوتی ہے اور یہی زبان ہمیں پیش کردہ حقیقت کا ابلاغ بخشتی ہے۔ ہر بڑا فن کار زبان کے مختلف سانچوں اور لفظیاتی ساختوں کے ذریعہ نہ صرف اپنے عصر کا تازہ تصور بخشتا ہے بلکہ اس کے لفظوں کی کرشمہ سازی ہی سے کرشمہ ہائے عصر کی حقیقت کھلتی ہے۔ بعض لکھنے والوں کی طرح قاسمی کے لیے زبان ایک خود مختار سلطنت نہیں بلکہ اپنے عصر کی تابع اور زندگی کے شعور کی فرماں بردار ہے۔ اسی لیے قاسمی کے الفاظ دراصل ایک نکمے نظامِ زندگی کے خلاف اعلانِ جنگ ہیں اور ان کا جلال و جمال زندگی کی زیبائی و بدنمائی کو نمایاں کرنے کے مختلف پہلو ہیں۔ قاسمی کی زبان میں بڑی وسعتوں کی گنجائش ہے اور ان کے مضامین کے تنوع کا پتہ خود لفظوں کے وسیع سرمایہ سے بھی چلتا ہے۔ یہ لفظ خود اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ قاسمی نے زندگی کے وسیع دائرے کو موضوع نگر بنایا ہے۔ بعض لکھنے والوں کے یہاں ایک ہی قبیل کے الفاظ یا لفظوں کا ایک مختصر دائرہ ملتا ہے جو خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی نظر زندگی کی وسعتوں پر نہیں۔ قاسمی کی زبان، روایتی زبان نہیں، کیونکہ انھیں زندگی کے ان نئے دھاروں کو پیش کرنا ہے جن میں تاریخ کی رفتارِ ارتقاء کے ساتھ ساتھ مختلف دھارے شامل ہوتے گئے ہیں۔ اس لیے قاسمی نے اپنے لیے لفظیاتی ساختیں بھی تراشی ہیں، پرانی زبان کو بھی نئے سانچوں میں ڈھالا ہے اور قدیم و جدید اظہار کے پیرایوں کے امتزاج سے بھی کام لیا ہے اور یہ قاسمی کی زبان کے حسن و طاقت کا بڑا راز ہے۔

قاسمی نے جس زبان کو اظہارِ فن کے لیے اختیار کیا ہے وہ اسے بعض لکھنے والوں کی طرح کسی محدود علاقے یا محلے کی زبان نہیں سمجھتے بلکہ مختلف علاقائی تہذیبوں کو اپنے اندر سمیٹ لینے والی ایک ایسی بین العلاقائی زبان سمجھتے ہیں جس کا دنیا کی چند بڑی زبانوں میں شمار ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قاسمی اس بین العلاقائی رابطہ آفرینی اور بین الاقوامی تصورات کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ (جن کا اس زبان کے مزاج سے خصوصی لگاؤ ہے) مقامی زندگی کی رنگ آرائی کر سکے ہیں یا نہیں؟ قاسمی کے فن کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قومی اور بین الاقوامی مزاج یا یوں کہیے کہ عصری شعور کے ساتھ ساتھ مخصوص مقامی رنگ کو پیش کرنے میں نمایاں طور پر کامیاب رہے ہیں۔ ان کے بعض افسانوں میں یہ رنگ اس تازگی اور مہارت سے پیش ہوا ہے کہ اجتماعی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ ان میں قومی عوبردوں کو رنگ و لو عطا کرنے میں مقامی جزئیات کی مصوری کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ قاسمی کی لفظی ساختوں کا کمال ہے کہ وہ قومیت کو بین الاقوامیت کے ساتھ اس طرح ربط دیتے ہیں کہ خیال کی راہوں میں چراغ روشن ہوتے جاتے ہیں۔ اسی طرح

ان کی شاعری کے بعض حصوں میں مقامی زندگی کی جو نقاشی ملتی ہے اسے اردو ادب میں منفرد اور قد آدم کی نقاشی کہا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ بین الاقوامی ذہنی میراث کا ایک اہم حصہ بن جاتی ہے۔ اس نقاشی میں صرف مناظر ہی نہیں کردار، معاشرہ، تہذیب، رسم و رواج اور افراد کے درمیان رابطہ سب ہی کھنچ آتے ہیں۔ ان نقوش کی رنگا رنگی، بیان و اظہار کی زندگی اور لفظی ساختوں کی خوبی قاسمی کو اس دور کا بہت بڑا فن کار ٹھہراتی ہے، جس کی فن کاری صرف قومی سطح پر نہیں، بین الاقوامی سطح پر بھی امتیازی خصوصیات کی حامل ہے۔ مقامی، قومی اور بین الاقوامی یہ تین جہتیں ان کے فن کی ایسی نمایاں جہتیں ہیں جو انھیں اس عصر کے ایک ممتاز لکھنے والے کا درجہ دیتی ہیں۔

قاسمی کی شخصیت، ان کی افسانہ نگاری، ان کی شاعری، ان کے بعض تنقیدی مضامین اور کسی حد تک ان کی صحافیانہ تحریریں علیحدہ علیحدہ اجزائے شعور کو پیش کرنے کے بجائے ایک غیر منقسم اکائی کا اظہار ہیں۔ اس غیر منقسم اکائی کے انضباط کو بعض نے نظریۂ زندگی اور بعض نے کوئی اور نام دے رکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس انضباط کو اگر خلل پہنچ جائے تو نہ صرف یہ کہ شخصیت کا توازن بگڑ جائے بلکہ شاید قاسمی کے فن کے معیار و منزلت میں بھی فرق آجائے۔ یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اس انضباط کے عصری شعور ہی کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے قاسمی کی شخصیت اور فن کو اپنا ہدف بنا رکھا ہے۔ قاسمی کھل کر مشرق کے وفادار ہیں، وہ اپنی قومی سالمیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور بین الاقوامی طور پر ترقی پسندی کے نام سے کسی نئی ملوکیت کی ہم نوائی نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان تصورات کے مخالفوں نے برابر قاسمی کے فن کی بڑائی کو نظر انداز کرنے کا وطیرہ اختیار کر رکھا ہے۔ قاسمی نے بھارتی جارحیت کی کھل کر مذمت کی لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو سرحد کے دونوں طرف اس جارحیت پر خاموش رہ جانے والے یا تاویلیں گھڑنے والے ذہن پرستوں کے لیے عذر تراشی کرتے ہوئے انھیں پھولوں کے ہار پہنانے سے باز نہیں آتے۔ پھر خاموشی ایک حد تک مجبوری کے باعث بھی ہو سکتی ہے اور اس مجبوری کو آسانی سے شناخت کیا جا سکتا ہے لیکن جہاں یہ خاموشی اعانتِ مجرمانہ کی حد تک پہنچ جائے وہاں اس کی حمایت خود اپنی اقدار، اپنی سرزمین اور اپنی انسانی وفاداری سے متصادم ہوتی ہے۔ قاسمی اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کی مزعومہ شرافت بعض ندرتِ شخصی نظریاتی اور تعلقاتِ باہمی کے میدانوں کی طرح انھیں یہاں بھی متحارب انداز اختیار کرنے سے باز رکھتی ہے۔

قاسمی نے نثر و نظم کا خاصا بڑا ذخیرہ اردو ادب کو دیا ہے ظاہر ہے کہ ان کی سب تحریریں یکساں معیار کی حامل نہیں لیکن ان کی معیاری تحریریں ادب کے عالمی معیار پر پوری اُترتی ہیں۔ قاسمی اور فیض کی شاعری میں مقدار کے علاوہ فرق یہ ہے کہ فیض نے ابتدا ہی سے ایک منزہ طرز کو اپنایا تھا جس میں جمہوری رجحان کے باوصف علمی تربیت یافتگی کی تہذیبی صفات کا اظہار ہوتا تھا۔ ان کا یہ طرز کچھ زیادہ شگفتہ اور کچھ زیادہ صناعانہ ہوتا گیا لیکن معدودے چند نظموں کو چھوڑ کر اس کی جمالیاتی یکسانی میں فرق نہیں آیا۔ اس اعتبار سے فیض کی شاعری میں قاسمی کی شاعری کے مقابلے میں شستگی، تربیت یافتگی زیادہ اور ارتقاد تنوع کم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ صناعانہ زوال کے امکانات بھی کم ہیں۔ قاسمی نے مجموعی طور پر کیفیت و کمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اردو ادب کو فیض سے زیادہ سرمایہ دیا ہے پھر بھی قاسمی کے فن کا مطالعہ کرتے ہوئے اس خطرے کا احساس ہوتا ہے کہ کہیں ان کے فن، شخصیت اور رابطۂ عصر میں جو مناسبتیں قائم ہوئی ہیں ان میں انحراف آ گیا تو ان کی تحریریں اپنا حاصل کردہ معیار باقی نہ رکھ سکیں گی کیونکہ اس معیار کا بنیادی نقطہ ہی ان تینوں عناصر کی خلاقانہ وحدت ہے۔ قاسمی کے فن نے اپنا ذہنی قامت حاصل کر لیا ہے اور اس قامت میں مزید بلندی کے روشن امکانات بھی ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ ان کی تحریروں میں ان کی شخصیت کا نفوذ ہوتا رہے، بلکہ یہ نفوذ اپنی انسانی وفاداری کے اظہار کے لیے زیادہ تصادم رُخ اختیار کرے اور ان کے مجموعی انسانی شعور پر رابطۂ عصر کی گرفت مضبوط تر ہوتی جائے ——— احمد ندیم قاسمی آوازوں کے جنگل میں تنہا نہیں ہیں بلکہ ایک کاروانِ صدا ان کے ساتھ ہے اور جس کی "یا اخی" کی صدا عالمِ انسانیت کا احاطہ کر لیتی ہو اس کی بڑائی میں کیا شک ہے ——— (النقرہ سے)

ڈاکٹر وزیر آغا

احمد ندیم قاسمی کا فن

روایت ہے کہ ایک دفعہ کسی رشی نے کاگ بھشنڈ سے پوچھا ۔ "اے مقدس پرندے! تو ازل سے اب تک زندہ ہے۔ تیری اس درازئ عمر کا کیا راز ہے؟" ــــ کاگ بھشنڈ نے جواب دیا ــــ "اے رشی! میرے سامنے کئی جُگ تباہ ہوئے اور کئی جُگوں نے جنم لیا۔ جب کوئی جُگ اگنی سے تباہ ہوتا تھا تو میں خود کو اگنی کی آتما میں تبدیل کر لیتا تھا اور جب کوئی جُگ جل سے تباہ ہوتا تھا تو میں جل کے انگ انگ میں رچ بس جاتا تھا۔ پھر جب ایک نیا جُگ جل یا اگنی میں سے جنم لیتا تھا تو میں اسی کے رنگ دوبارہ نمودار ہو جاتا تھا" ــــ آج جب مجھے احمد ندیم قاسمی کے فن کے بارے میں کچھ لکھنے کو کہا گیا تو مجھے ــــ رشی اور کاگ بھشنڈ کی یہ کہانی اس لیے بے اختیار یاد آئی کہ اردو ادب کے جدید دور میں ندیم ہی وہ واحد ہستی ہے جس کا فن پانچ دہائیوں (اور فی زمانہ ایک دہائی ایک جُگ کے برابر ہے) کے ہر آبی طوفان سے نکل آنے کے باوجود تر و تازہ ہے اور خدا انھیں عمرِ خضر عطا کرے کہ ابھی ان کے فن میں ایسے کئی طوفانوں سے نکل آنے کی سکت باقی ہے ــــ

ندیم نے اس زمانے میں لکھنا شروع کیا جب ۱۹۲۹ء کا معاشی بحران ختم ہو چکا تھا اور دوسری جنگِ عظیم کے سیاہ بادل منڈلانے شروع ہو گئے تھے۔ اردو شاعری میں یہ بے پناہ جوش و خروش کا زمانہ تھا اور یہ جوش سیاسی درس گاہ جوش سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ علامہ اقبال نے تہذیبی و فکری مسائل، اختر شیرانی نے محبت اور رومان، ظفر علی خاں نے سیاسی اور قومی واقعات اور جوش نے انقلاب اور مذہب کے بارے میں جو کچھ کہا اس میں ایک غیر معمولی جذباتی ابال یا جوش کارفرما تھا جیسے بین الاقوامی سطح پر بھی اعصابی تناؤ روز بروز شدت اختیار کر رہا تھا۔ ایک طرف جرمنی اور اٹلی میں آمریت پروان چڑھ رہی تھی۔ دوسری طرف اس کے مخالفین ایک زیرِ سطح جوشیلے ردِعمل کی زد میں تھے۔ ندیم نے اس ساری پُرجوش فضا سے نمایاں اثرات قبول کیے اور اس کی ابتدائی نظموں میں اقبال، جوش، اختر شیرانی اور ظفر علی خاں کے گہرے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم نے اس اعصابی تناؤ کو ایک بڑی حد تک ختم کر دیا اور اس کے بعد ردِ عمل اعتدال سے مملو ہونے لگا۔ اس نئے دور میں پرانی آوازیں مدھم پڑ گئیں اور ان کے

اثرات بتدریج کم ہوتے چلے گئے ۔ لیکن ندیم کا فن اس "تجربے" سے نکھر سنور کر باہر آیا ۔ اب ایک طرف تو اس کے ہاں رومان کی مدھم سی لَو اُبھری دوسری طرف سماجی اور معاشی ناانصافی کا شعور توانا ہوا ۔ اس کے علاوہ اس کے ہاں "انسان" کا ایک ایسا تصور بھی بیدار ہوا جو ہر چند کہ اقبال کے مردِ مومن سے ماخوذ تھا ۔ تاہم جس میں نئے زمانے کے بہت سے تقاضے بھی شامل ہو گئے تھے ۔ اس دور میں ندیم کی سب سے بڑی عطا قطعات نگاری ہے — ان قطعات میں ندیم نے ایک مصور کی طرح موئے قلم کی ہلکی سی جنبش سے بڑے خوبصورت نقوش اُبھارے ہیں جو رومان، سیاست، فکر اور مذہب کے جملہ میلانات پر محیط ہیں ۔ مگر ان میں غیر ضروری جوش و خروش کے بجائے ایک سُلگتی ہوئی سی کیفیت اُبھری ہے ۔ جو ندیم کے ہاں ایک داخلی توازن کی نشان دہی کرتی ہے ۔ یہ چند قطعات قابلِ غور ہیں ۔ جو میں نے بغیر کسی کاوش کے اپنی یادداشت سے چُن لیے ہیں —

دُور وہ ننھے سے اسٹیشن پر اک گاڑی رُکی
سینہ تانے اک جواں اُترا ہے کس انداز سے
پاس ہی بوڑھی سی بیری کے تلے اک نازنیں
جھینپتی ڈرتی سمٹتی اٹھ رہی ہے ناز سے

دو بیگھہ زمیں کاشت کی خاطر مجھے دے کر
تم کرتے ہو چھُپ چھُپ کے مری لڑکی کو اشارہ
محنت تو بکا کرتی ہے غیرت نہیں بکتی
افلاس کا مارا ہوا دہقان پکارا

شیشم کی ایک شاخ سے جب فاختہ اُڑی
چڑوں نے سر پٹخ کے کہا جلد لوٹیو
میں جا رہا ہوں اور تمھیں کچھ خبر نہیں
دیہات کے اُداس پہاڑوں کی چوٹیو

اس دور میں ندیم کی نظم کا ایک انفرادی رنگ بھی نمایاں ہونے لگا ۔ اُن کا موضوع رومان ہو یا سیاست یا کچھ اور اس میں ایک ہلکی سی کسک در آئی جس نے جذباتی فشار کو توازن اور اعتدال سے مملو کر دیا ۔ بڑی بات یہ ہے کہ اب اقبال، اختر شیرانی، جوش اور ظفر علی خان کے اثرات پس منظر میں چلے گئے اور ندیم کی اپنی آواز نکھر کر سامنے آنے لگی ۔ اس زمانے میں ندیم نے جو نظمیں لکھیں ان کی نفاست، گہرائی اور کسک کا اندازہ ان چند نمونوں سے لگایا جا سکتا ہے —

نہ جانے آج کی شب اس قدر طویل ہے کیوں

نحیف چاند جہاں سے چلا تھا رُک سا گیا
کسی خیال میں یوں کھو گیا کہ جُھک سا گیا
ستارے جم سے گئے سرمئی خلاؤں میں
گھُلی ہیں نیند کی انگڑائیاں ہواؤں میں
افق پہ شام کو جو ابر گنگنا یا تھا
نقطِ امید کو بیدار کرنے آیا تھا
ندی کے موڑ پہ لہروں میں گونج بھی نہ رہی
بلند نیم کی شاخوں میں بے کلی نہ رہی
فضا پہ موت کی افسردگی ہے چھائی ہوئی
غنودگی سی نظاروں میں ہے سمائی ہوئی
جدھر نگاہ اٹھے انجماد طاری ہے
سکوت، ذوقِ سماعت پہ کتنا بھاری ہے

"جدائی کی پہلی رات"

دریچوں میں جالے، جھروکوں میں سائے، ستونوں پہ دھبے، چھتوں پہ دھندلکے
ہوا میں مچلتے ہوئے تند اندھیرے کہیں گہرے گہرے کہیں ہلکے ہلکے!
اُدھر مرمریں فرش کی اکھڑی اُبھری سلوں پر ہیں قرنوں کی چوٹیں نمایاں
ادھر آئینہ رنگ دیوار پر ہیں خراشوں کی صورت میں صدیوں کے عنواں
یہاں دھول پہ چند کیڑوں نے لکھی ہے تاریخ ماضی انوکھی زبان میں
وہاں اک مموسے کے پنجوں کی دھاری، اگر ہیں پتیاں جیسے آبِ رواں میں
دریچوں میں پردے، جھروکوں میں شمعیں، ستونوں پہ روغن، چھتوں پر اُجالے
کھلے تذکرے زلف و رخسار و لب کے کھلے قہقہے جیسے روئی کے گالے
یہ ملبوس کی سلوٹوں میں، ہوا میں فضا میں رواں ایک گھمبیر خوشبو
یہ بانہوں میں جکڑے ہوئے نرم پیکر، لچک جیسے کونپل، لپک جیسے آہو
ادھر مرمریں ساغروں میں مئے ناب رقصاں ہے جیسے گلابی سویرا
ادھر آئینہ رنگ دیوار پر ہے کسی اجنبی مملکت کا پھریرا

اگر وقت سورج کی زرکار بیلی کو صرف ایک پل کے لیے روک سکتا
اگر یہ جہاں دیدہ کاہن کبھی انقلابات کا راستہ ٹوک سکتا
لپکنا مگر اس کی تقدیر میں ہے، پلٹنا بھی دشوار، تھمنا بھی مشکل
یہ راہی قیامت میں سستا سکے گا، ازل اس کی نگری ابد اس کی منزل
اگر وقت کی شاہراہیں معین ہیں، یہ شام، یہ شب، یہ پَو، یہ دیا
تو دہکے ہوئے سُرخ پہیوں کے چکر میں جل جائے گا اجنبی کا پھریرا

"ناگزیر"

۱۹۴۷ء میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا اور اس کے ساتھ ہی اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ بہت سے لکھنے والے جو تقسیم سے پہلے پوری دل جمعی سے لکھ رہے تھے۔ دفعتاً غائب ہو گئے اور ایک کھیپ کی کھیپ نئے لکھنے والوں کے سامنے آ گئی۔ پرانے لکھنے والوں میں سے بعض ایسے بھی تھے۔ جنھوں نے عادتاً لکھنا ترک نہ کیا۔ لیکن اب ان کے فن میں آورد کے آثار ہویدا تھے۔ لیکن ندیم آب و خون کے ایک زبردست طوفان سے ایک تازہ لگن لے کر برآمد ہوا اور اس بار اس کے فن نے افسانے کے میدان کو اپنی تگ و تاز کے لیے منتخب کیا۔ کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ندیم کی افسانہ نگاری کا آغاز تقسیم کے بعد ہوا کیونکہ یہ حقیقت ہے۔ کہ وہ اس سے پہلے ہی افسانہ نگاری میں اپنے لیے نام پیدا کر چکے تھے۔ اور ان کے دیہاتی زندگی سے متعلق افسانوں کے متعدد مجموعے بھی خاصے مقبول ہو چکے تھے۔ لیکن تقسیم کے بعد ندیم نے جو افسانے لکھے ——— وہ اُن کے تمام سابقہ افسانوں سے بالکل مختلف ہیں —— قصہ یہ ہے کہ ندیم نے افسانہ نگاری کے پہلے دور میں دیہاتی زندگی کو ہی زیادہ تر اپنا موضوع بنایا تھا۔ اور ان کے افسانوں میں کوئی ایسا منفرد اور توانا رنگ پیدا نہ ہو سکا تھا۔ جو افسانے کی روایات کو پریم چند سے آگے لے جاتا۔ مگر تقسیم کے بعد ندیم نے شہری زندگی کے تصادم اور اس تصادم کے نتیجے میں اُبھرتے ہوئے کرداروں کے بارے میں افسانے لکھے۔ اس کے لیے فضا بھی سازگار تھی۔ تقسیم نے لاکھوں انسانوں کو نقلِ مکانی پر مجبور کیا ہزاروں کی پُرسکون زندگی المیے سے دوچار ہوئی اور ایک داخلی اور خارجی تصادم نے انھیں کرداروں میں تبدیل کر دیا۔ ندیم نے اپنے افسانوں کے لیے اسی ہنگامہ خیز دور سے کردار اخذ کیے۔ کنجری، مولوی ابّل، پرمیشر سنگھ، الحمد للہ اور لاتعداد دوسرے افسانے تقسیم کے بعد ہی کی پیداوار ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ انہی ایام میں مَیں نے ایک روز مولانا صلاح الدین احمد صاحب سے پوچھا کہ ندیم کی افسانہ نگاری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ — مولانا نے کہا "ندیم افسانے میں چمک نہیں سکا۔ میں آج تک اُس کے کسی افسانے سے متاثر نہیں ہوا" دوسرے روز میں نے ندیم کے تازہ افسانے ان کی خدمت میں پیش کیے اور ان سے رائے طلب کی۔ افسانوں کے مطالعہ کے بعد مولانا نے کہا "یقین نہیں آتا کہ یہ وہی ندیم ہے۔ فی الواقعہ ندیم کے فن نے ارتقا کے بہت سے مدارج طے کر لیے ہیں۔ میری ان سے ملاقات ہوئی تو انھیں مبارکباد پیش کروں گا" مجھے معلوم نہیں کہ مولانا نے ندیم کو مبارکباد پیش کی یا نہیں۔ لیکن زمانے نے انھیں ہدیۂ تبریک ضرور پیش کیا۔ گویا فن کے ایک ہی تازہ ابال نے ندیم کو اردو افسانے کی صفِ اوّل میں لا کھڑا کیا اور وہ آج تک اپنے اس مقامِ بلند پر ایستادہ ہیں۔

۱۹۶۰ء کے لگ بھگ اردو ادب ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ (۳) دور کو سرگوشیوں کا دور بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ اب بلند آوازیں سنائی نہ دیتی تھیں۔ ترقی پسند تحریک کا طمطراق اور جاہ و حشم ختم ہو چکا تھا۔ آئینۂ دل نازک تر اور جنبشِ لب لطیف تر ہو گئی تھی۔ اب جو بات بھی کہی جاتی۔ اشارے کنائے، بالواسطہ انداز اور نیم مبہم سرگوشی میں کہی جاتی۔ ایسی صورتِ حال کے لیے غزل سے بہتر شاید ہی کوئی حربہ ہو کیونکہ غزل بات ہی اشارے، کنائے، علامتی انداز اور نگاہِ نیم باز سے کرتی ہے مگر غزل کی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک نئے CODE، ایک نئی لغت کو تو بروئے کار لا کر بات کرتی ہے۔ مگر ساتھ ہی اس بات کو دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کرنے میں بھی بخل سے کام نہیں لیتی۔ یہ دور غزل

کے احیا کا دور تھا بہت سے پرانے لکھنے والے غزل کے نئے لہجے سے خود کو ہم آہنگ نہ کر سکے اور یا تو قاتل، دار، منزل اور رہبر کے پھیر میں گرفتار رہے یا قلم توڑ کر بیٹھ گئے۔ لیکن ندیم کے فن نے اس چیلنج کو فوراً قبول کر لیا۔ اور وہ ایک تازہ داخلی تموج کے تحت غزل کے بدلے ہوئے لہجے میں بات کرنے لگے۔ مگر ندیم کے پاس لفظوں، علامتوں اور تصورات کی ایک پوری روایت بھی موجود تھی۔ چنانچہ جب اس نے بات کہی تو بات نوکیلی بھی تھی اور پختہ بھی۔ اس میں نکھار اور تازگی بھی تھی اور اس کے ڈانڈے روایت سے ملے ہوئے بھی تھے۔ اس زمانے میں ندیم کی غزل کے نمونے یوں تھے:

جس بھی فن کار کے شہکار ہو تم — اس نے صدیوں تمہیں سوچا ہوگا
جب بھی دیکھا ہے تجھے عالم نو دیکھا ہے — مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا
ہم چھپاتے پھرے دلوں میں چمن — وقت پھولوں پہ پاؤں دھر کے [illegible]
کہیں افق نہ ملا میری دشت گردی کا — میں تیری دھن میں بھری کائنات [illegible]
خشک شاخوں پہ لہو کے یہ نگینے کب ہیں — زندگی ہے مگر اک تیز [illegible]
تو جو بدلا تو زمانہ بھی بدل جائے گا — گھر جو سلگا تو بھرا شہر بھی جل جائے گا

ندیم نے پچھلے پینتیس برس میں بہت کچھ لکھا ہے، نظم، غزل، قطعہ، رباعی، افسانہ، تنقید، فکاہی کالم وغیرہ آج بھی وہ فکاہی کالم لکھنے کے علاوہ متعدد اخبارات میں ادب اور ثقافت کے موضوعات پر سنجیدہ بیانات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ "فنون" کی ادارت اس کے علاوہ ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنا ڈھیر سا کام کرنے کے بعد بھی وہ افسانہ اور شعر کے لیے نہ صرف وقت نکال لیتے بلکہ وقتاً فوقتاً ان اصناف میں [illegible] تخلیقات بھی پیش کرتے رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ذہن کی زرخیزی تو خیر ہوئی کہ زمانے کا تقاضا یہی ہے۔ لیکن ندیم کی اس تخلیقی لگن کی نوعیت کیا ہے کہ ان کے بیشتر دوسرے معاصرین تو تھک ہار کر گرتے رہے لیکن ندیم کے بڑھتے ہوئے قدموں میں لغزش تک نہ آئی۔ آگے چل کر اگر ندیم صاحب نے کبھی اپنی "سوانح عمری" لکھنے کی ضرورت محسوس کی تو اہل نظر کو پتہ چل سکے گا کہ وہ "آگ" کس قسم کی تھی جس نے اس فن کار کو اظہار ذات پر سدا مائل رکھا۔ بصورت دیگر اگر ڈاکٹر وحید قریشی صاحب احمد ندیم قاسمی کی نگارشات کی کھدائی سے کسی نا تمام محبت کے نقوش تلاش کر لیں تو پھر شاید سوانح عمری کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

جس شخص نے آدمی کے خوں سے
اپنے چہرے کا روپ اُجالا
پتھر بن جائے، زہر ہو جائے
اُس شخص کے ہاتھ کا نوالا

ندیم

پروفیسر غلام رسول تنویر

اکیلا کولمبس

(ایک مختصر ارتقائی خاکہ)

(۱)

کرسٹوفر کولمبس کے لیے یہ رات بہت بھاری تھی۔ کیونکہ اس کے بحری بیڑے میں بغاوت کی لہروں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا اور اس کے قریبی ساتھی بھی مایوسی اور ناامیدی کے بھنور میں ڈوبنا شروع ہو گئے تھے ——— وہ ساتھی جس حسین دنیا کی تلاش میں اپنے گھر بار چھوڑ کر، اجنبی سمندروں میں اترے تھے، وہ مہینوں کے مسلسل سفر کے بعد بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ غالباً اس نئی دنیا کا کہیں کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ محض کولمبس کا ایک خیال تھی، جس نے برسوں کی بحری روایات سے جنم لیا تھا۔ یہ تھا وہ احساس جو کولمبس کے ساتھیوں پر مسلط ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چاروں طرف پھیلے ہوئے بے کنار سمندر کے مہیب سفر سے اکتا گئے تھے اور انھیں لامتناہی آبی سلسلوں سے ہول آنے لگا تھا۔ وہ ہر حالت میں زندہ سلامت اپنے گھروں کو لوٹنا چاہتے تھے۔ ایک عرصے کی دبی دبی مایوسی اب کھلی بغاوت میں تبدیل ہو چکی تھی ——— صرف کولمبس ہی وہ تنہا شخص تھا جس کا یقین نا متزلزل تھا اور جو پُرامید تھا کہ منزل اب زیادہ دور نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس بات پر مجبور کر دیا گیا تھا کہ اپنے مایوس ساتھیوں سے یہ کہے کہ وہ ایک رات اور انتظار کریں، شاید یہ آخری رات ہو اور آنے والی صبح کے جلو میں وہ نئی دنیا بھی ہو جس کی تلاش میں وہ سات سمندروں کا پانی کھنگالتے چلے آئے تھے ——— ۶؍ اکتوبر ۱۴۹۲ء کی وہ رات بہت بھاری تھی۔ کولمبس شکست خوردہ نہیں تھا، لیکن وہ تنہا ضرور ہو گیا تھا۔ جستجو کے اس وسیع سمندر میں اس کے ساتھی بتدریج اس سے دور ہٹتے جا رہے تھے ———

جستجو کے یہ وسیع سمندر ہر دور اور ہر خطے میں، اپنے اپنے وقت کے کولمبسوں کو یونہی دعوتِ عمل دیتے رہے ہیں۔ ان وسیع سمندروں میں سفر کے دوران، کوئی نہ کوئی کولمبس اپنے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے یونہی تنہا ہوتا رہا ہے ——— نہ تو ۱۴۹۲ء میں کولمبس کا وہ سفر نیا تھا اور نہ ہی ۱۹۷۲ء میں کسی کولمبس کا یہ سفر نیا ہے۔ اب بھی وقت کے اس رخ پر ایک ادبی سمندر میں ایک کولمبس برسوں کے طویل سفر کے بعد بھی شکست ماننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ بار بار تنہا ہوا ہے، وہ بار بار الجھن آرا ہوتا ہے ——— نصف صدی ادھر کی بات ہے ہم جو ادیبوں کا ایک بڑا گروہ اس

خطۂ زمین پر ایک نئی دنیا کی تلاش میں نکلا تھا۔ ان میں سے چند تو میناء نور قائم کر گئے، کچھ راستے کی آسودگی کی نذر ہو گئے، بہت سے سفر کا شکار ہو کر رہ گئے، کچھ تھک ہار کر گھروں کو لوٹ گئے، کچھ مایوس ہو کر راستوں ہی میں بھٹک گئے، اِکادُکا انفرادی طور پر اِدھر اُدھر رواں دواں رہے۔ ان کے ساتھ ساتھ، لیکن ان سے الگ بھی، جس کولمبس نے شکست سے منہ نہیں موڑا اور رات سے شکست نہیں کھائی اور جہانِ نو کی تلاش میں مسلسل فکر و فن کے بادبان کھلے رکھے ہیں وہ احمد ندیم قاسمی ہیں۔

یہ تنہا کولمبس گذشتہ چالیس سالوں سے ایک نئی دنیا کی تلاش میں سرگرمِ سفر ہے۔ یہ کارواں کے ساتھ ساتھ بھی ہے اور اس سے الگ بھی ——— جس ترقی پسند تحریک کے سہارے اس نے بیشتر فکری ارتقائی منازل طے کیں، اسی تحریک کے اندر بھی اس کا اندازِ سفر منفرد ہے۔ کیونکہ ادب میں اس کا ورود کوئی اتفاقی حادثہ نہیں۔ پیدائش ہی سے اس خطّے کی تمام تر روحانی، فکری، علمی، ادبی اور تاریخی روایات نے اسے "پالنے" میں لے لیا اور رسول اُس کے دل و دماغ کی پرورش کی ——— یہ اسی انتہائی تربیت کا نتیجہ تھا کہ ترقی پسند تحریک، جب اپنے عروج پر تھی اور بیشتر نودارد انِ ادب جدت کے جنون میں ماضی کی ہر شے کو مسترد کرنا ایک فکری فیشن بنا چکے تھے، ندیم اس کڑے وقت میں بھی جدت کو ماضی سے مربوط رکھے ہوئے تھا اور یوں اپنی اس طرزِ فکر سے بغاوت کے اندر ایک اور بغاوت کو جنم دینے کا موجب بنا تھا۔

(۲)

سیاسی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں۔ ترقی پسند تحریک ادبی جمود توڑ کر ایک فعال تخلیقی راستے پر گامزن ہو چکی تھی۔ اس تحریک نے نہ صرف جدت کے جذبے سے جنم لیا تھا بلکہ اس کا مزاج سراسر سیکولر تھا۔ اور ایک مخصوص معاشی نظام سے نسبت رکھنے کی وجہ سے اس تحریک میں قدامت کی مخالفت کی آواز بہت بلند تھی۔ ایسے ہیجانی دور میں، ترقی پسند تحریک کے راستے پر چلتے ہوئے بھی ندیم اپنے اس زمانے کی تخلیق "جلال و جمال" میں اپنے ساتھیوں سے الگ نظر آتا ہے۔ "جلال و جمال" کا دیباچہ ندیم کی انفرادیت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ندیم نہ تو ماضی کے مسلّمہ کلاسیکی شاہکاروں کی لازوال حیثیت سے انکار کرتا ہے، اور نہ ہی انسانی معاشرے میں مذہب کی ضرورت سے منکر ہے۔ وہ نہ غزل سے چڑتا ہے، نہ عشق و محبت سے بیزار ہے۔ وہ حسن و جمال کو "حقیقت پسندی" سے خارج تصور نہیں کرتا، اور جبلتِ انسانی کو جذبۂ حیرت سے عاری نہیں گردانتا۔ وہ ادب اور صحافت کو علیحدہ علیحدہ حیثیت میں دیکھنا پسند کرتا ہے ——— چنانچہ اس دور میں کئی مرحلوں پر ندیم اپنے ہم سفر اور ہم خیال ساتھیوں میں گھرے ہوئے پرتحسین نظروں کی بجائے خشمگیں نگاہوں سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن اسے ان خشمگیں نگاہوں سے محبت ہے، یہ خشمگیں نگاہیں اس کی ذاتی وسعتِ نگاہ کا ایک جزو بن جاتی ہیں۔

قیامِ پاکستان کے وقت جب اس نے پاکستان کو اپنا وطن بنایا اور تقسیمِ ہند کو مصنوعی لکیر تصور کرنے کی بجائے ایک اٹل حقیقت تسلیم کر لیا تو اس کے بیشتر ساتھیوں کی نگاہیں اور بھی قہر آلود ہو گئیں۔ پھر جب ندیم نے نئے حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر تعمیرِ پاکستان کے لیے فکری کام کا آغاز کیا تو وہ اور بھی تنہا ہو گیا ——— اس تبدیلی کا نقطۂ عروج ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ ہے۔ ۶ ستمبر کے بھارتی حملے پر ندیم ایک شعلۂ جوالا بن کر بھارتی سامراجیت پر برس پڑا۔ پاکستان میں اس کے کئی ساتھی ملکی بقا کی اس جدوجہد سے خود کو الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ مبادا ان کے اس جنگ میں ملوث ہو جانے سے ان کے بین الاقوامی تصور کو کوئی نقصان پہنچے اور ان کے بیرونی اثر و رسوخ میں کوئی کمی واقع ہو جائے، انھیں ندیم کا

یہ انداز کیسے پسند آ سکتا تھا؟ اس کے برخلاف بھارت کے تمام نئے اور پرانے ترقی پسند اور غیر ترقی پسند ادیبوں نے پاکستان کے خلاف ایک مشترکہ فکری اور ادبی محاذ کھول دیا اور جنگی جنون کی اس شدید رَو میں ندیم کے 'فنون' سے اپنے تمام فنی اور فکری رابطے یکسر منقطع کر دیے اور وہ آج تک منقطع ہیں، لیکن اپنے وقت کا یہ تنہا کولمبس اپنی راہ کو خوب پہچانتا ہے اور اپنی منزل کے فرد حال سے خوب آگاہ ہے۔ اسے کسی سنجیدہ کار کی تنبیہ، اُن کی ضرورت ہے اور نہ کسی اور کی پسندیدہ چال پر چلنا گوارا ہے۔ وہ کسی فرد یا کسی گروہ کی مرضی پر اپنا [illegible] قربان کرنا نہیں جانتا۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس کے متعلق درونِ خانہ کیا کہا جاتا ہے اور بیرون در کیا [illegible] عمل ہوتا ہے [illegible] جس چیز کو صحیح اور درست سمجھتا ہے اسی پر کاربند ہوتا ہے۔ وہ اس اٹل حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ ہم خیال اور ہم مقصد ساتھیوں کے ساتھ سفر میں بھی ہر مسافر کی چال اور مشاہدہ اپنا اپنا ہوتا ہے اور فکر و فن کے تخلیقی راستے پر سوچ کا سفر ہر فن کار اکیلا ہی طے کرتا ہے۔ اگر ایک ہزار اعلیٰ تمثیل نگار مل جائیں تو بھی وہ کسی مشترکہ کوشش سے ایک ہملٹ تخلیق نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہی ایک ہزار ہملٹوں کو اکٹھا کرنے سے ایک شیکسپیئر بنایا جا سکتا ہے۔

(۳)

بظاہر مختلف مقامات پر مختلف ندیم کھڑے نظر آتے ہیں۔ ایک ندیم ترقی پسند تحریک کا جوشیلا علمبردار ہے جو جدت پسند بھی ہے اور طرحِ نو کا دلدادہ بھی، اس کے پہلو بہ پہلو دوسرا ندیم کلاسیک میں یقین رکھتا ہے اور قدما کی بے بہا ادبی خدمات کا معترف ہے۔ ایک ندیم قدیم اقدار کی توڑ پھوڑ کر رہا ہے، دوسرا ندیم تعمیری انداز میں قدیم اور جدید اقدار کو مربوط کر رہا ہے۔ ایک ندیم روزنامہ امروز میں حکومتِ وقت کا سخت ترین ناقد ہے۔ دوسرا ندیم اسی 'امروز' کے 'حرف و حکایت' میں ایک نرم و ملائم مزاح نگار کا روپ دھارے ہوئے ہے۔

ایک ندیم "رم جھم" میں خالص عشقیہ اور علاقائی قطعہ گو شاعر ہے جسے کوچۂ سیلی سے باہر نکلنا گوارا نہیں۔ دوسرا ندیم "جلال و جمال" میں غمِ جاناں کو غمِ دوراں میں تحلیل کر رہا ہے اور پھر رومانیت کے سہارے نظامِ نو کے خواب دیکھتا ہے۔ ایک ندیم "شعلۂ گل" کا یک سمتی انقلاب پسند شاعر ہے اور دوسرا ندیم "دشتِ وفا" کا سہ سمتی ارتقاء پسند مفکر ہے۔ یہ تو شاعری کے مختلف مقامات پر کھڑے ہوئے ندیم ہیں۔ بحیثیت افسانہ نگار ایک ندیم "چوپال" اور "بگولے" کا انتہائی جذباتی الم پسند داستان گو ہے اور دوسرا ندیم "طلوع و غروب"، "آنچل" اور "آبلے" کا سنبھلا سنبھلا واقع نگار ہے۔ ایک ندیم "در و دیوار" میں انسانیت کے کھنڈروں پر بیٹھا ہوا محض ایک تاریخی مرثیہ گو نظر آتا ہے تو دوسرا ندیم "برگ حنا" اور "سناٹا" میں انسانیت کے اسی ملبے سے مختلف النوع کردار تعمیر کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اور کرداروں کی یہی گیلری "گھر سے گھر تک" پہنچتے پہنچتے مفلس اور متوسط طبقوں پر مشتمل پورے معاشرے کی نمائندہ گیلری کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔۔۔ ان سب ندیموں میں کئی مراحل و منازل پر تصادم بھی ہو رہا ہے لیکن اس متنوع سطح کا باریک چھلکا اتار کر نچلی تہہ پر نظر ڈالیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کثرت الوجود میں نامحسوس طور پر وحدت الوجود کا عمل جاری ہے۔ یہ سب ندیم ایک ہی قالب کے علیحدہ علیحدہ اعضا ہیں جو اپنے اپنے انداز میں بتدریج ایک اکائی میں ڈھل رہے ہیں ——— ایسی اکائی جو سلطانیٔ جمہور ——— کوئی ایک درجن ندیم گذشتہ نصف صدی سے سترہ مختلف کتابی راستوں کے ذریعے اس محور پر اتر رہے ہیں اور یہ کثرت الوجود ایک ایسی وحدت الوجود میں تبدیل ہو رہی ہے جہاں رنگ، نسل، قبیلہ، یا جغرافیائی حد بندیاں اپنی علیحدگی گم کر بیٹھتی ہیں۔ اور ایک عالمگیر جسد جنم لینا شروع کر دیتا ہے۔

اس جسد کا صرف ایک ہی نام ہے اور وہ نام ہے " انسان " ـــــ اور اس انسان کی صرف ایک ہی منزل ہے اور وہ ہے ـــــ " خودی " ـــــ

(۴)

اس وقت میرے سامنے صرف دو ندیم ہیں ـــ ایک ندیم نثری جامہ پہنے ہوئے ہے اور دوسرا شعری لباس ـــــ دونوں ندیموں کا کاغذی پیرہن، لفظی ساز و سامان، رنگ ڈھنگ، چال ڈھال ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ دونوں کا بغور مطالعہ کریں تو ایک ندیم مغربی افق پر شام کے ہم تاریک رنگوں میں ملبوس نظر آتا ہے اور دوسرا مشرق میں کاروانِ سحر کے آگے آگے علم اٹھائے چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نثر نگار ندیم، شعر کار ندیم سے عمر میں بڑا بھی ہے اور پختہ کار بھی زیادہ۔ کیونکہ سوچ کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے دکھ کی آگ پر یہی ندیم پہلے پہل چڑھا تھا یہ ندیم جس کا نام احمد شاہ ہے۔ ۲۰ر نومبر ۱۹۱۶ء کو موضع انگہ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم پائی۔ کیمبل پور اور شیخوپورہ میں تحصیل علم کے بعد صادق ایجرٹن کالج بہاولپور سے ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ چار سال مسلسل بیکاری میں گذارنے کے بعد ۱۹۳۹ء میں آبکاری کے انسپکٹر بنے۔ ۱۹۴۲ء میں آبکاری سے استعفیٰ دے کر شعر و ادب کی آبیاری کا کام سنبھالا۔ " پھول "، " تہذیبِ نسواں "، " ادبِ لطیف "، " شاہکار "، ریڈیو، سویرا، " نقوش "، امروز کے ادارتی مرحلوں سے گذرتے ہوئے اب " فنون " تک آپہنچا ہے۔ اس دوران دو بار چھ چھ مہینے کے لیے نظر بندی کے زمانے کاٹے ہیں۔ ندیم کی اولاد ایک بیٹا، دو بیٹیاں، تیرہ افسانوی اور چار شعری مجموعے ہیں۔ جہاں تک نگری اولاد کا تعلق ہے۔ یہ اس ضمن میں کسی قسم کی فیملی پلاننگ کے قائل نہیں۔ بلکہ جوں جوں وقت گذر رہا ہے ان کا تخلیقی عمل فزوں تر ہو رہا ہے۔ اور ہر نئی تخلیق سابقہ تخلیق سے قد و قامت میں سر نکالتی ہوئی نظر آتی ہے ـــــ ان کے ساتھ جن ساتھیوں نے سوچ کا سفر شروع کیا تھا ان میں سے بیشتر ایک عرصے سے تھک ہار کر جادہ نشیں ہو چکے ہیں لیکن ندیم ابھی تک جادۂ قدم سے سرگرم سفر ہے ـــــ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا انھوں نے ایک نئے " دشتِ وفا " میں قدم رکھا ہے، اس دشتِ وفا میں ان کا عشق کچھ اور ہی جنوں آشنا ہوا ہے، اور وہ اس دشت میں بہت دور تک نکل گئے ہیں، آگے جلوہ اور ان کی کونسی منزل ہے یہ جاننے کے لیے کوئی دور دراز اندیشیوں کی ضرورت نہیں، فسانوں کے ایک نئے مجموعے اور شاعری کے ایک نئے دیوان کے ظہور میں صرف ایک پل کا پردہ حائل ہے جس پردے ایک طویل ناول ایک سات منزلہ طویل نظم تخلیق کے راستے پر اتر چکے ہیں، ان کے عقب میں کیا کچھ ہو رہا ہے یہ پردوں کے اٹھنے پر معلوم ہوگا ـــــ لیکن تخلیق کے ان سارے راستوں کا رُخ انہی کے الفاظ میں صرف اسی ایک منزل کی طرف ہے۔ ؎

یہ زمیں، یہ خلا کی رقاصہ
آدمِ نو کے انتظار میں ہے

(۵)

بات نثر نگار ندیم کی ہو رہی تھی۔ سوچ کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اس نے جب پہلی آنکھ کھولی تو اور اپنے چاروں طرف آسیب کا احساس ہوا تھا۔ ... اپنے پیچھے کھنڈروں سے اٹی ہوئی زمین اور زخموں سے

پوری تحیں چھوڑ گئی تھی ۔ غربت، بے چارگی، مایوسی اور بے بسی اس دور کا مقدر بن گئی تھیں۔ ہندوستان، غلامی، بدحالی اور ذلت کے ایک بدترین دور سے گزر رہا تھا۔ ندیم کی جنم بھومی پنجاب کا شمال مغربی علاقہ بالخصوص جنگ سے جنازوں کا ایک بہت بڑا تحفہ وصول کر چکا تھا۔ مجبور و مقہور لوگوں کو انگریز کے استبدادی نظام نے مویشیوں کی سطح پر لا ڈالا تھا۔ ندیم نے جب ہوش سنبھالا تو اس کی روح پر سب سے پہلے اسی علاقائی آسیب نے دستک دی۔ اسی لیے ندیم نے ایک جگہ کہا ہے: "مجھے زندگی کی مسرتوں کی بجائے تلخیوں کا زیادہ تجربہ ہے، میں اس دنیا میں بہت رویا ہوں اور مسکرایا بہت کم ہوں" ـــــ چنانچہ اس کی سوچ نے جب تخلیق کا سفر شروع کیا، تو یہی آسیبی رنگ اس کا تخلیقی سرمایہ تھے۔ اس کے افسانوں کے پہلے دو مجموعے "چوپال" اور "بگولے" اسی علاقائی آسیب کے عکاس ہیں۔ ایک قسم کا سلیٹی رنگ اس کی سوچ، جذبات اور الفاظ پر بری طرح سے غالب ہے۔ الفاظ و تراکیب کے سانچے جو بھی روپ دھارتے ہیں وہ ندیم کی ابتدائی تخلیقات میں یوں ظاہر ہوتے ہیں۔

"سیاہ چٹانوں، گہری گھاٹیوں، سنسان کھیتوں، اونگھتی بستیوں، خالی پگڈنڈیوں، اونچے کنگروں، تنگ گھاٹیوں ...... ان میں گھرے ہوئے گھروندوں کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے سوراخوں سے چیختی ہوئی ہوائیں ...... اندھیرے کمروں میں اندھیرے سے بھی زیادہ اندھیری پرچھائیں ...... سہمی سہمی تانیں، دبی دبی آہیں، گھٹے گھٹے گیت ...... چٹانوں پر لرزتی ہوئی دھوپ، پہاڑوں کی چوٹیوں پر سوکھی ہرلی، پھلاہیاں، ٹنڈ منڈ درختوں پر کبڑے ٹہنوں کے سائے ...... کونی کاذ رانوں میں لمبے لمبے، رگ بھرنے والے خون کی کھوت، ہڈیوں کی چیخ، دانتوں کی کچکچاہٹ، آتشیں سانسوں کے بگولے ...... ڈھیریوں پر بیٹھے ہیں، بکریاں، اور بیل گردنیں جھکائے چرتے ہوئے ...... نیم کے جھنڈ سر جھکائے کھڑے ہوئے ...... ساری کائنات اونگھتی ہوئی ...... بوڑھے نیم کی ٹیڑھی شاخوں کے گھنے سائے، گلیوں میں لاٹھی ٹیکتی ہوئی بوڑھیاں ...... چوپالوں پر سوار سونگھتے ہوئے بوڑھے ...... اکا دکا کھجوروں کے آسیبی سائے ...... سائیں سائیں کرتی ہوئی خاموشی ...... بے پناہ بھرے خلا ...... تنہائی کے لق و دق صحرا ...... وغیرہ"

یہ ہے وہ فضا جس میں ابتدائی افسانوں نے جنم لیا۔ اس آسیبی فضا سے جو کردار بنے گئے ان میں نہ زندگی ہے نہ زندہ رہنے کی آرزو، وہ جانوروں کی طرح جیے جا رہے ہیں کیونکہ جینا ان کے لیے ایک جبر، ایک مجبوری ہے۔ ان میں نہ عزت کا احساس ہے نہ غیرت کا۔ یہ محض کٹھ پتلیاں ہیں جن کے عمل کی ڈور استبداد کے ہاتھوں میں ہے۔ جاگیردار، سرکاری اہلکار، پولیس کے کارندے، پٹواری، ضلع دار، تحصیلدار ـــــ یہ سب ان مویشیوں کے اصل مالک ہیں جو انھیں جب چاہیں، جدھر چاہیں ہانک لیں۔ یہ احتجاج کرتے ہیں نہ غصہ ہی میں آتے ہیں ـــــ مٹی کی ان مورتیوں کا تمام دکھ، تمام مظلومیت، تمام بے چارگی ندیم کی روح میں زہر بن کر اتر جاتی ہے اور اس روح سے جو بھی افسانہ ابھرتا ہے وہ اسی زہر میں بجھا ہوا ہے۔ ان افسانوں میں ہر محبت موت پر آ کر ختم ہوتی ہے اور ہر موت مفلسی کی کوکھ سے جنم لیتی ہے ـــــ چوپال کے قریباً سبھی افسانے مذکورہ بالا آسیبی رنگوں کے ساتھ ساتھ محبت اور موت سے اٹھ کر لکھتے ہیں۔ افسانوں کے دوسرے مجموعے "بگولے" میں مفلسی کا یہ زہر اور زیادہ نمایاں ہے:۔

منو محبت و زندگی بیاہ، جو سارقہ زندہ دو خاندان مسکا کا دن ... ایک بارات میں دلہا کی جھلک دیکھنے

کے لیے جا شامل ہوا اور وہیں چوری کے الزام میں دھر لیا گیا (دھڑ دھڑ جوتوں کی بارش کے نیچے بھی وہ اپنی اکلوتی چوتی نہیں کھوتا جو حوالدار کی جیب میں جا چکی ہے (چوری) رانی بیوہ ہو کر بھی بیوگی کے تنہا دن نہیں گذار سکتی، اور مرحوم شیردل کی اس امانت پر جاگیردار کا بیٹا ایک آسیب کا سایہ بن جاتا ہے۔ وراثت موت کی پناہ میں جانے پر مجبور کر دیتا ہے (کھیل) مایا کو پیار بھی ملا تو ماں کی چتا پر (کریا کرم) گلابو نے عمر بھر میں ریشم کی صرف ایک قمیص پہنی اور اس کی سزا میں ساری عمر کے لیے گھر کا سکون کھو بیٹھی (رماں) ایک چوتی کے اردگرد ننھے کی ساری سادگی اور خوشی نے دم توڑ دیا (ننھے نے سلیٹ خریدی) ولی کے عشق کی طرح غریب کی محبت آسیب زدہ ویرانے کا ایک بھوت ہے جو ولی کی جان بھی لے لیتا ہے اور اس کی محبوبہ چمارن کی بھی (محبت) بوڑھے بڑھیا کا واحد سہارا کریم بیماری کی حالت میں ملک صاحب کی گندم گدھے پر لاد کر شہر لے جاتا ہے تو اسی گدھے پر اس کی لاش واپس آتی ہے (توبہ میری) فیض کی خوش آلود انگلیوں نے ایک طلائی مہر اس کی حنائی انگلیوں میں کھا دی ـــــ قبرستان کے کنارے، قبروں کے درمیان مہر کی تلاش میں فیض کی محبت نے جنم لیا (طلائی مہر) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مفلسی کی ماری ہوئی محبتوں کا یہ آسیب گہرا ہی گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ندیم داستان گوئی کے اس دور کے بعد جب کردار نگاری کے مرحلوں میں سے گذرتے ہیں، تو یہ آسیب ان کے کرداروں کا ایک مستقل رنگ بن چکا ہے۔ فن کی مکمل پختگی کے ساتھ بھی جو کردار تخلیق پاتے ہیں وہ رنگ سے آزاد نہیں۔ افسانوں کے مجموعہ "برگِ حنا" میں ان کرداروں کا رنگ یوں جھلکتا ہے: بادی کمہار جس نے اپنی بیوی اشرفی کو حاصل کرنے کے لیے کسی زمانے میں لاکھ جتن کیے تھے اب اپنے آوارہ بیٹے مراد کی شادی کے لیے لاکھ جتن سے دلہن حاصل نہیں کر سکا۔ لڑکی کا باپ بوڑھا دلہے مراد کو لڑکی دینے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ خود اس کی شادی کے لیے بدلے میں لڑکی ملے۔ یوں کے ایک نازک مقام پر آ کر بادی بیمار اس مقصد کے لیے اپنی جان سے عزیز بیوی اشرفی کو طلاق دے دیتا ہے (بیٹے بیٹیاں) میاں جی کا جنازہ ابھی ابھی اٹھا ہے۔ بی بی پر سکتہ طاری ہے جو کسی جتن نہیں ٹوٹتا اور ٹوٹتا ہے تو اس وقت جب کسی نامراد نے بی بی کی پلیٹ کے ٹکڑے کر دیے" (ماتم) شیخ جی محلے میں اس وقت درود فرماتے ہیں جب کہ محلے میں بجلی کے کھمبے کا بلب بھر فیوز ہو گیا ہے اور محلہ تاریکی کی نذر ہو چکا ہے۔ شیخ جی کی بیٹھک میں ان کے علم و فضل، دانش اور فراست کی باتیں بلب کی کمی دور کر دیتی ہیں۔ لیکن محلے میں ایک بارات اترنے پر شیخ جی کی تاریک کوٹھڑی میں شیخ جی اپنے قالب سے باہر آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تنہا اور ویران زندگی میں دور دور تک کسی بلب کا سراغ نہیں ملتا (کھمبا) "میں نے اتنا مکمل اور بے داغ لباس بہت کم آدمیوں کا دیکھا ہے ـــــ غفور کے لباس میں کوئی شکن ڈھونڈے سے بھی نہ ملتی تھی ـــــ البتہ غفور کی شخصیت نے مجھے بک لخت سے ضرور چونکایا اس کا لباس کتنا بے شکن تھا، مگر اس کے چہرے پر کتنی شکنیں تھیں" (شکنیں) ماسٹر یونس پر بیوہ بانو کی محبت کا انکشاف اس وقت ہوا جب کہ وہ مفلسی سے ڈسے ہوئے ایک رہائشی احاطے میں ماحول کے آسیب میں مکمل طور پر آ چکا ہے۔ وہ بانو کی محبت کے انکشاف پر ایک لمحے کے لیے مرد بنتا ہے۔ لیکن پھر بھرے محفل میں اس ازلی آسیب کی نذر ہو جاتا ہے (جن دانش)

پختگی کے اسی دور میں دوسرے افسانوں کے مجموعہ "سناٹا" میں یہ رنگ اور پختہ ہو جاتا ہے ـــــ رئیس خانے کے چوکیدار فضلو کی حسین بیوی مریاں فضلو کی حماقت سے ایک رئیس کی GOD WISDOM پر اپنی عصمت کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے، مفلسی کے آسیب کا مارا ہوا فضلو روتے ہوئے مریاں سے کہتا ہے "مجھے میری غریبی دھوکا دے گئی مریاں" (رئیس خانہ)

مولوی اَبل جس کے بالوں کی سفیدی اولاد کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی ہے بیٹی کی شادی کے مسئلہ پر کوشش میں جاتا ہے تو اجنبی کا نام نہیں لیتا۔ اب صرف چوہدری فتح داد کی مدد پر زندہ ہے۔ "ایک مرحلے پر جب غربت سے دم لبوں پہ آچکا ہے، باہر سے لپکا چلا آتا ہے ۔" مبارک ہو عارف کی ماں .... جنازے پر کچھ نہیں تو بیس ۔ روپے تو ضرور ملیں گے ۔ ابھی کچھ دیر تک جنازہ اٹھے گا ۔ — چوہدری فتح داد مر گیا ہے "...... پھر ایک لمحے کے دردناک سناٹے کے بعد مولوی اَبل جو مردے کے چلا چلا کر رونے کو ناجائز اور خلافِ شرع قرار دیتا ہے، چلا چلا کر رونے لگا (الحمد للہ)

پختہ رنگوں میں ابھارے ہوئے یہ کردار ایک گیدی کی شکل میں متوسط اور مفلس طبقے کے ہر شعبے، ہر پہلو کی بھرپور نمایندگی کرتے ہیں ۔ ہر کردار اپنی جگہ کردار نگاری کا عملی نمونہ ہے، لیکن شاہکاروں سے سجی ہوئی یہ ساری گیلریاں چوپال اور بگولے کے اس آسیب سے آزاد نہیں ۔ اس کے قریباً سبھی کردار جرمِ ضعیفی کی سزا کسی نہ کسی رنگ میں بھگت رہے ہیں — اس تنا میں ربع صدی گذر گئی، ملک آزاد ہو گیا، جمہوری قدریں بدل گئیں، لیکن ندیم کے کردار اس رنگ سے باہر نہیں نکل سکے جو مفلسی کی کوکھ سے جنم لیتا ہے ۔ کیونکہ اس رنگ کے کئی روپ کئی شکلیں ہیں، دیہاتوں میں مفلسی کا یہ آسیب سیاہ ہے تو شہروں میں سفید ——— ندیم نے ان سیاہ سیٹی اور سفید رنگوں کے سہارے دیہی اور شہری معاشرتوں سے جو ہر قسم کے کردار تخلیق کیے ہیں وہ واقعاتی طور پر ان معاشرتوں کے سچے نمایندہ اور ادبی سطح پر ہمہ وقتی صفات کے حامل ہیں ۔ ان کرداروں کے سہارے ہم عوام کے سبھی چہروں، ساری شکلوں سے واقفیت حاصل کرتے ہیں ۔ ان کی کوئی نہ کوئی سیاہی پوشیدہ رہتی ہے نہ سفیدی، حسن نہ قبح ۔ دلوں میں اترتی ہوئی یوسی، جسموں میں اتری ہوئی سیاہی اور روحوں میں اترا ہوا نور سبھی ہمارے سامنے آجاتا ہے ۔

(۶)

نثر کار ندیم اگر مسافرِ شب ہے تو شعر کار ندیم مسافرِ سحر ہے ۔ کیونکہ دونوں ندیموں کا کاغذی پیرہن، لفظی ساز و سامان، رنگ و آہنگ یکسر مختلف ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ افسانوں کے بہی بے بس اور بے حس کردار ——— ہلوں میں جتے ہوئے یہ کسان، بنوں میں بھٹکتے ہوئے یہ چرواہے، گھروں میں سہمی ہوئی یہ بوڑھی مائیں، راستوں پہ بیٹھی ہوئی یہ پاگل لڑکیاں، یہ مدقوق مزدور، یہ مجبور متوسط طبقہ، یہ لٹے ہوئے کھیتوں کے مزارع، یہ اجڑی ہوئی بیٹیوں کے باپ، یہ بیگاروں میں جتے ہوئے بھائی، یہ فاقوں کی ماری ہوئی مائیں، یہ ڈیروں کی ڈسی ہوئی بہنیں ——— یہ سب منتشر سے کردار، جونہی ندیم کے افسانوں سے نکل کر اس کی شاعری میں داخل ہوتے ہیں، وہ یکایک اکائی میں تبدیل ہو کر ایک بگولہ، ایک آگ، ایک قوت بن جاتے ہیں ۔ ندیم شب کے اندھیروں میں چلنے کی بجائے سحر کے افق پر قدم رکھ دیتا ہے اس کے اردگرد سکوت اور سناٹا ریزہ ریزہ ہونے لگتا ہے ۔ چاروں طرف روشنی کی چاپ اور کرنوں کی آواز سنائی دیتی ہے ۔ اور سحر کی اس سپید سپاہ کے آگے شکست خوردہ اندھیرے بھاگ اٹھتے ہیں ۔

دونوں ندیموں کا لفظی ساز و سامان ایک دوسرے سے مختلف ہے ۔ یہ نثر کار ندیم اپنے مخصوص لب و لہجہ میں کہتا ہے:

"آسمان پر کفن کا سا بادل چھا رہا تھا اور ہوا میں کافور کی سی بو بسی ہوئی تھی "

لیکن شعر کار ندیم جب آسمان کا ذکر چھیڑتا ہے تو یہی لب و لہجہ یوں رنگ بدلتا ہے ———

سے

کیوں لرزنے لگے ہو ستارو
یہ تو پرواز کی ابتدا ہے
آسماں میری منزل نہیں ہے
آسماں تو خلا ہی خلا ہے

ان دونوں آوازوں میں یہ فرق کیوں ہے ——— اس کی وجوہ دو طرح کی ہیں جہاں سے یہ دونوں آوازیں ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ ندیم نے جب ادبی زندگی کا آغاز کیا تو اس وقت تک میرے افسانوں میں منشی پریم چند اور اردو شاعری میں ڈاکٹر اقبال ایک طرزِ نو کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ یعنی افسانہ نگاری منشی پریم چند کے باعث تخیلی، حکایتی اور داستانی کی تخیلاتی فضاؤں سے سیدھی زمین پر اتر آیا تھا۔ اور شاعری اقبال کے زیر اثر فرسودہ غزل کی روایت سے آزاد ہو کر تہذیب و فکر کے نئے راستوں پر چل نکلی تھی۔ افسانہ نگاری نے پہلی دفعہ خالص عوامی مسائل کو پذیرائی بخشی تھی اور عوام کی سیدھی سادھی زندگی، ان کی چھوٹی چھوٹی سوچیں، ان کے بڑے بڑے دکھوں سے براہِ راست ایک رشتہ قائم کیا گیا تھا۔ منشی پریم چند کے افسانوں کا پس منظر بڑے بڑے شہر نہیں بلکہ کچے پکے، دھندلے دھندلے گاؤں، دیہات اور ان کے معصوم اور رنگین لاجواب مکین تھے۔ افسانے نے پہلی دفعہ خالص عوامی زبان میں عوامی مسائل کو چھیڑا تھا۔ منشی پریم چند کی اس بے پناہ روایت پر در روایت کو منشی جی کی سی مہارت اور طہارت کے ساتھ جس خلوص اور خوبصورتی سے ندیم نے آگے بڑھایا ہے یہ صرف ان ہی کا خاصہ ہے۔ یہ تفصیل ایک علیحدہ مضمون کی طلب گار ہے۔ بات یہاں افسانے کی نہیں شاعری کی ہو رہی تھی۔ منشی پریم چند کے زیر اثر ندیم نے موضوع اور طرزِ بیان کا انتخاب تو کر لیا لیکن فکری طور پر ابھی انھیں کسی خاص سمت یا رخ کی ضرورت تھی۔ وہ سمت اور یہ رخ انھیں ڈاکٹر اقبال کی شاعری کی مدد سے مل گیا کیونکہ اس وقت تک حکیم الامت اپنے کلام میں شہنشاہیت، آدم اور سلطانیٔ جمہور کا شان دار نظری قصر مکمل کر چکے تھے۔

ندیم کے نثر کار ہاتھ نے جمہور کو اس کی ازلی حالت میں یوں تھام لیا تھا جیسے وہ گندھی ہوئی مٹی کا ایک تودہ ہو۔ ندیم کے شعر کار ہاتھ نے اس مٹی کو وہ شکل دینا شروع کر دی، جو صدیوں کے جبر و استحصال نے مسخ کر کے گم کر دی تھی۔ مٹی کا صدیوں پرانا تودہ اپنے اصل اور حقیقی رنگ روپ میں ظاہر ہونے لگا تو ندیم بول اٹھا ؎

کیوں لرزنے لگے ہو ستارو
یہ تو پرواز کی ابتدا ہے
آسماں میری منزل نہیں ہے
آسماں تو خلا ہی خلا ہے
اپنی گم گشتہ جنت کو پالوں
صرف اتنا مرا مدعا ہے
ہوشیار اے فرشتو کہ پھر سے
ایک سجدے کا وقت آ رہا ہے

یہ آواز ہمارے لیے اجنبی نہیں۔ یہ آواز اقبال کی آواز ہے۔ یہ تیور اقبال کی 'خودی' کے تیور ہیں۔ یہ وہی خودی ہے جس کا اظہار یوں کیا گیا ہے ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

کتنی مماثلت ہے ان دونوں آوازوں میں ۔ انسان کی عظمت احترام، تعظیم کے اظہار کے لیے ایک ایسی ہی آواز، ایک ایسے ہی آہنگ کی ضرورت تھی۔ اور ندیم کو یہ آواز یہ انداز اپنے ہی صداخانۂ شاعری سے مل گئے۔ اقبال کی شاعری جس فکری محور کا طواف کرتی ہے انھوں نے اسے 'خودی' یا 'عشق' کا نام دیا ہے۔ ندیم کی شاعری کا محور لفظ 'عظیم' قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کی شاعری میں لفظ 'عظیم' اتنی تکرار اور اتنے تیوروں سے گونجتا ہے کہ یہ لفظ ان کی تمام شاعری کی مخصوص آواز بن جاتا ہے ۔ انسان اور عظیم یہ دو بنیادی عناصر ہیں جن پر ندیم اپنی شاعری کا قد اٹھاتا ہے۔ خدا سے خطاب کرتے ہوئے انسان کے متعلق کہا ہے ؎

تو وقت ہے، روح ہے، بقا ہے
وہ حسن ہے رنگ ہے صدا ہے
تو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے
وہ ایک مسلسل ارتقا ہے

جس وقت ندیم شاعری کے ذریعے اظہارِ فکر کی راہیں تلاش کر رہا تھا، شاعری تھا، قبل سے کہ شعری دور میں داخل ہو چکی تھی۔ اور اقبال کے اثر سے باہر نکلنا انتہائی کٹھن کام تھا۔ اس کے باوجود اس دور کے متعدد شاعر اقبال کے فکر و بیان سے کترا کر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ بڑے پیڑ کے سائے میں چھوٹے چھوٹے درختوں کا پھلنا پھولنا دشوار ہوتا ہے۔ لیکن ندیم نے اقبال سے کترا کر نکلنے کی بجائے اپنی شاعری کے ابتدائی اور پختہ دونوں ادوار میں نہ صرف اقبال کا اثر قبول کیا بلکہ اس کے ایک خاص طرز کے فکری پہلوؤں سے بھی گریز نہیں کیا۔ قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ وہ نہ تو اقبال کے سائے میں گم ہوا اور نہ ہی اپنی منفرد آواز پیدا کرنے میں اس نے اقبال کو کہیں مزاحم پایا۔ بلکہ ایک اور زاویہ سے دیکھا جائے تو ہم پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اقبال کی وفات پر شاعری میں جو ایک ناقابلِ عبور خلا پیدا ہو گیا تھا اسے پُر کرنے میں اگر کوئی موثر قسم کی کوشش ہوئی ہے تو ندیم کی طرف سے۔ یہی نہیں ندیم نے اسی دور کے قریب جوار میں ایک اور قابلِ ذکر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اقبال کی وفات کے ساتھ ہی ایک اور بڑا حادثہ رونما ہوا، وہ تھی دوسری جنگِ عظیم۔ جس نے دنیا کے جسد پر جگہ جگہ گھاؤ لگانے شروع کر دیئے جنگ نے کچھ علاقوں کو تو بالکل کھنڈروں میں تبدیل کر دیا لیکن جو خطے براہِ راست جنگ کی لپیٹ میں نہ آئے وہ بھی جنگ کے آسیب سے محفوظ نہ رہے۔ جنگ کے ہولناک اثر کے تحت مشرق و مغرب میں جہاں آب و گِل ایک WASTE LAND محسوس ہونے لگا۔ ندیم نے ان کھنڈروں پر نوحہ کہنے کی بجائے یہاں بھی اقبال کی ناقابلِ شکست رجائیت سے کام لیا۔ اور خالص تعمیری انداز میں مشرق و مغرب کو یہ پیغام دیا ——

؎

آئے سلجھائے گی جمہور کی آواز اسے
تم نے تاریخ میں جس بات کو الجھایا ہے
اب مرا ذوق کسی قید کا پابند نہیں
تم نے صدیوں مرے وجدان کو ترسایا ہے
نوعِ انسان کے نئے عزم کی تکریم کرو
جب کہ ذرہ بھی قیامت کی خبر لایا ہے

یہ آواز جہاں ایک طرف اقبال کے بعد پیدا شدہ شعری خلا کو پُر کر رہی ہے وہاں شکست خوردگی کو شکست دینے کا تہیہ بھی کیے ہوئے ہے۔ یہ دراصل اقبال کے شاعرانہ دور کا وہی فکری موڑ ہے جب کہ دنیا میں جابر و مجبور کے درمیان صدیوں کی جنگ ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچ گئی تھی اسی کے زیر اثر اقبال نے اپنے منفرد انداز میں بالِ جبریل کی معروف نظم (فرشتوں سے فرمانِ خدا) میں جہاں یہ کہا تھا "اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو" وہاں یہ بھی کہا ہے

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

یوں ندیم کئی مرحلوں تک اقبال کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اقبال سے الگ بھی ہے اقبال کے نظریۂ خودی سے اس نے بے اندازہ اثر قبول کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ نظریہ خودی کو معنوی طور پر اس حد تک قبول کرتا ہے جہاں تک عظمتِ آدم کی نشان دہی کا تعلق ہے یا جہاں اقبال نے خودی کے ارتقا میں مزاحم ہونے والی استحصالی قوتوں کی نشان دہی کی ہے۔ ندیم اقبال سے کہاں کہاں اختلاف رکھتا ہے یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے ندیم (خودی) کے ضمن میں اس مقام پر آکر رُکا ہوا ہے جہاں خارجی استحصالی قوتیں فرد کے ارتقا کے راستے میں مزاحم ہوتی ہیں، جب تک دنیا میں ان استحصالی قوتوں پر خطِ تنسیخ نہیں پھر جاتا ندیم آگے بڑھتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اس مقام پر رُکا کھڑا ہے جہاں عظمتِ آدم اور استحصالی قوت میں تصادم جاری ہے۔ ندیم کی شاعری میں یہ تصادم تمثیلی طور پر ظلمت و نور کی آویزش سے نمایاں ہوتا ہے۔ یہ آویزش گو جلال و جمال میں بھی موجود ہے۔ لیکن اس نے وہاں کوئی فیصلہ کن شکل اختیار نہیں کی۔ اس آویزش کا نقطۂ عروج "شعلۂ گل" ہے جہاں یہ آویزش ایک فیصلہ کن دور میں داخل ہو چکی ہے۔ چنانچہ ندیم کی شاعری کا محوری مقام یہی ہے۔ شعلۂ گل میں اس نے الفاظ و تراکیب کے ہزاروں رنگ اور روپ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ چند نمایاں رنگ و روپ یہ ہیں:

جلتی سانسیں ...... لمحے کی حقیقت آتش ناک ...... لمحے کا ارادہ خوں آشام ...... لمحے کا بلادہ بیداری ...... ستارہ ٹوٹتا ہے تیرگی کا پیٹ بھرتا ہے ...... جب تنفیح شام کی وادی میں لہو لوٹی ہے ...... گلستانِ جہاں ـــ اک الاؤ کی طرح شعلہ فشاں بھڑکے گا ......

ثبت گریں گپھل جائے گا کانٹوں کا وجود ... گر چراغ کی لو سے لہو نکلے گا ..... سلگتے خون
میں اک کارواں روانہ ہوا ...... تو شش جہت سے لہو اس طرح ابلنے لگا۔ کچھ ایسی تند
تھی ہیئے لہو کی بولاں ..... جب رات شفق میں نہا کے آئی ہے .... ہونکتا قود د ۔ جوشش
تشنگی میں تسلسل ..... سوتے الندن کے لہو کے تمام قدریں ہیں اعتباری .....
جسم بھر کو جھلسائے گی وہ رنج کی کرن ..... ستارے بہے گئے آفتاب کھسکے گئے .... آفتاب
ضمیر بہوں میں پڑیں گے ..... شبنم ہے کہ گلچیں نے کلیوں پہ خون چھڑکا ہے ....
ریت میں ہی میں ہو نوڈہ رہا ہو تو مجھے ۔ پھولوں کا نام بدلنے پہ سزا دیتے ہو ..... کوئی
تو تیں اس زخم کو بجھنے نہیں دیتیں ۔ جہاں سے شارح لوٹی ہے وہیں سے شارخ پھوٹی ہے۔
سینۂ سنگ کی شدت سے صلیبیں گے گزر .... ایک سنگی کا نشتر رنگ کی مانند ہوگا ...
شاعر ندیم کا یہی وہ سرمایہ جیسے کہ وہ رات کو شکست دینے نکلا ہے ۔ شکست و ر کی جنگ آخری
مرحلے میں ہے۔ اور یہ مرد سحر قدم قدم پر یوں تجدید عہد کرتا ہے ؎

گزشتہ شب مشعل تھی نہ تھیں | جبیں مہ تنگ ریناں کے یہ شب یہیں گزاروں گا
شکست ... اشتاق اپنی سے ندیم | سحر سے نہ سطے رات سے نہ ہاروں گا

گزشتہ چالیس سالوں سے ندیم اس گروہ کے ساتھ ہے جو سحر کی تلاش میں نکلا تھا۔ اس کے دائیں
بائیں آگے پیچھے اب ایک بھی ساتھی ایسا نہیں جو اس اپنی عزم اور اس مضبوط یقین سے قدم بڑھا رہا ہو جس کا ہر
قدم پہلے سے زیادہ مضبوط اور زیادہ پر اعتماد ہو۔ فرق یہی ہے وہ کولمبس جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اعتماد و
یقین کو نئی نئی بلندی تک لے جا رہا ہے۔ گو سحر کا دور دور تک کوئی نشان نہیں ۔ لیکن اس تنہا کولمبس نے سفر
سے منہ نہیں موڑا اور رات سے شکست نہیں کھائی اور سحر کے رخ جہان نو کی تلاش میں مسلسل فکر و فن کے بادباں
کھولے آئے ہے، اور اس کے لبوں پر صرف یہی ایک نغمہ ہے ؎

اس زمیں پر میں اندھیروں کو نہ جینے دوں گا
میں تجلی کا پجاری ہوں، جلاؤ شمعیں
آج ہر طاق پہ، ہر گھر میں سجاؤ شمعیں
نقشے برق کے، مرمر کے دریچوں میں جلے
ان گھروندوں پہ، مرا خون چراغوں میں جلے

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

ندیم اور علامتی افسانہ

ادب کو زندگی کا ترجمان، عکاس، نقاد اور مفسر سبھی کچھ کہا گیا ہے اور کہا جاتا ہے۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ اس کی یہ حیثیتیں ایک علامت، ایک اشارہ، ایک استعارہ، ایک کنایہ، ایک تمثیل، ایک رمزیہ اور ایک ابہام آلود تصور سے آگے نہیں بڑھتیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ادب نے زندگی کی ترجمانی روزمرہ کے سیدھے سادے عام انداز سے بلکہ ایک خاص انداز سے کی ہے۔ یہ اندازِ خاص بھی عہد بہ عہد بدلتا رہا ہے لیکن علامات و اشارات سے کبھی بے نیاز نہیں رہا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ہر دور میں خوبصورت اور خیال افروز لفظی علامتیں ہی ادب کی ضامن رہی ہیں۔

ملا وجہی کی قطب مشتری اور سب رس دونوں اس بات کی شاہد ہیں کہ دنیا کے دوسرے ادبوں کی طرح، اردو نظم و نثر میں تمثیل و اشارات کی روایت ابتدا ہی سے ملتی ہے لیکن وہ علامتی و اشاراتی طرزِ اظہار جسے آج کل ہماری نئی شاعری اور افسانے کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے اور اب جس نے ایک مستقل رجحان کی صورت اختیار کر لی ہے، اوّل اوّل ن۔م۔ راشد اور میرا جی کے ہاتھوں ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ اردو میں آیا ہے۔ ہر چند کہ ترقی پسند اور علامتی شاعری کی تحریکیں ایک دوسرے کے مخالف اور متضاد تھیں اس لیے کہ ایک کا مقصد اپنے مطمحِ نظر کو ایچ پیچ کے بغیر واضح لفظوں میں اس طرح بیان کرنا تھا کہ اس کا مخاطب یا قاری اس سے زیادہ سے زیادہ اثر قبول کر سکے۔ اس کے برعکس دوسری تحریک اپنے مخاطب و قاری سے قدرے بے نیازانہ گزر جانے اور قاری کو تخلیق کی بلند سطح پر لانے کو ادب کا حاصل جانتی تھی۔ اس کے باوجود دونوں تحریکیں بہرحال ردِ عمل تھیں، کلاسیکی ادب کی ان جکڑبندیوں اور علم عروض و قافیہ کی ان سخت گیریوں کا جن کے ہاتھوں فکر و خیال کو زبان و بیان کی بھینٹ چڑھایا جا رہا تھا اور معنی کے بجائے طرزِ اظہار ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا تھا۔

سیاسی و سماجی حالات اس وقت کچھ اس نوع کے تھے کہ ترقی پسند تحریک مقبول ہوئی اور بہت تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ علامتی تحریک یا رجحان کے لیے فضا سازگار نہ تھی اس لیے مقبول کیا ہوتی زیادہ تر ہدفِ ملامت بنی رہی۔ لیکن حالات نے جلد ہی پلٹا کھایا، ترقی پسند تحریک اپنا کام کر کے سرد پڑ گئی اور علامتی تحریک بتدریج آگے قدم بڑھاتی گئی۔ آج وہ

ترقی کی اس منزل پر پہنچ گئی ہے کہ ہر ادبی محفل اور ہر تنقیدی نشست کا موضوعِ سخن بنی ہوئی ہے ۔ ابتدا میں اس کا حلقۂ اثر صرف شاعری تک محدود تھا، اب افسانہ، ناول اور ڈرامہ سب پر اس کے اثرات نظر آتے ہیں ۔ کوئی اس کی مخالفت کرے یا موافقت، اتنی بات تو ماننی ہی پڑے گی کہ اردو ادب میں اس کی جڑیں خاصی مضبوط ہو گئی ہیں اور اب اُسے اُکھیڑ پھینکنا آسان نہیں ہے ۔ نئی نسل تو تقریباً ساری کی ساری اس تحریک کے زیرِ اثر پروان چڑھ رہی ہے اور پرانی نسل میں بھی اب وہ غم و غصہ باقی نہیں رہا جو پہلے تھا ۔ شروع میں اس رمزیہ اسلوب کے خلاف ترقی پسند تحریک کے پلیٹ فارم سے جو آواز بلند کی گئی تھی وہ بھی ان لوگوں کی طرف سے تھی جو شاعر و ادیب کم، ترقی پسند زیادہ تھے ۔ ورنہ ترقی پسند تحریک کے خلاق ادیبوں اور شاعروں نے کبھی خود کو رمزیہ اسلوب سے بے نیاز نہیں رکھا ۔ احمد علی، فیض احمد فیض ۔ مخدوم محی الدین، کرشن چندر، منٹو، شوکت صدیقی، ساحر، جذبی، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین اور مجروح سبھی کے یہاں یہ اسلوب کم و بیش نظر آتا ہے ۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جس کے یہاں یہ رنگ جتنا گہرا ہے، اسی نسبت سے اس کی تخلیقات توانا و دلکش ہیں ، ہاں جو لوگ اپنے سیاسی نظریات و مقاصد کو سپاٹ طریقے سے بیان کر دینے ہی کو فنی تخلیق خیال کرتے رہے، وہ رفتہ رفتہ گم نام ہوتے گئے یہ وہ لوگ تھے جو ایک طرح کے سیاسی و سماجی کارکن تھے اور حصولِ مقصد اور جوشِ طبیعت ہی کو ادب کا حاصل جانتے تھے ۔ انھوں نے خود اپنی تحریک کے بعض اچھے شاعروں خصوصاً فیض احمد فیض اور جذبی کی شاعری پر سخت تنقید بھی اس لیے روا رکھیں کہ ان کا اسلوب، دوسروں کے مقابلے میں زیادہ رمزیہ اور علامتی تھا، کم و بیش یہی صورت احمد ندیم قاسمی کے ساتھ رہی ہے ۔ انھیں ترقی پسند تحریک کے لٹریچر میں کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ——————— - - - - - - - - - - - - - - بلکہ اس سلسلے کی بعض اہم کتابوں اور مقالوں میں ان کا ذکر تک نہیں کیا گیا اس کے برعکس ان سے کمتر درجے کے بعض ادیبوں اور شاعروں کو ضرورت سے زیادہ جگہ دی گئی ۔ اس کے اسباب اور بھی ہوں گے ۔ لیکن ایک یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی اپنی تخلیق کو رمزیت و ایمائیت سے پاک کرنے کو کبھی تیار نہیں ہوئے انھوں نے ترقی پسند تحریک کے آدرش کو پیش نظر رکھا ہے ۔ لیکن فیض اور جذبی کی مانند اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ ان کی تحریریں نئی ہوں یا پرانی بے جان اور بے رس نہیں ہونے پائیں ۔ کالم نویسی، غزل گوئی، افسانہ، جدید نظم اور قطعہ نگاری سب میں انھوں نے اپنا ایک ممتاز مقام بنا لیا ہے ۔ لیکن اس جگہ میں صرف ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں مختصراً اظہار خیال کروں گا وہ بھی جدید تر افسانے کے حوالے سے ۔

جدید تر افسانہ کیا ہے، کیا نہیں ہے ادب کے بعض دوسرے مباحث کی طرح ، اس کے بارے میں بھی قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے اور اس جگہ کہنے کی گنجائش بھی نہیں ہے ۔ اتنی بات تو سبھی جانتے ہیں کہ جدید تر افسانہ، ان افسانوں سے بہت مختلف ہے جس کی نمائندگی ہمارے یہاں پریم چند سے لے کر آج تک کے بیشتر افسانہ نگار کرتے ہیں ۔ افسانے کی فنی تعریف ابتداً کچھ اس طرح بتائی گئی تھی کہ اس میں ایک منظم پلاٹ اور کوئی بہت نمایاں کردار ہوتا ہے ۔ پلاٹ اور کردار کے کسی خاص واقعے یا تجربے کو اتحادِ زمان و مکان کے ساتھ بطور کہانی اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ قاری کا ذہن اس سے ایک خصوص اور بھرپور تاثر قبول کرتا ہے نیز یہ کہ اس کہانی کا آغاز وسط اور انجام بھی خاص شرائط کے ساتھ ظہور میں آتا ہے ۔

یہ اس وقت کے افسانے کا فنی خاکہ ہے۔ جب کہ ہماری تہذیبی زندگی کا ایک اچھا یا برا ڈھانچہ بہرحال موجود تھا، مروجہ قدار کا بھرم قایم تھا اور ہر چیز کو کسی نہ کسی اصول و آئین کا پابند بنا کر ہی دیکھا جاتا تھا۔ لیکن اب صورتِ حال پہلے سے بہت مختلف ہے۔ تہذیبی اقدار کے الٹ پلٹ نے ادبی اصناف کے فنی اصولوں کو بھی الٹ پلٹ کے رکھ دیا ہے چنانچہ افسانہ بھی فنی اعتبار سے اب وہ نہیں رہا جو پہلے تھا' آج کا افسانہ افسانے کی رواتی اور تکنیکی پابندیوں سے یک سر آزاد ہے۔ اب اس میں کسی واضح پلاٹ کردار یا تاثر کی تلاش بے سود ہے۔ جدید افسانہ آج کی مبہم اور پُر پیچ زندگی کا مبہم اور پُر پیچ استعارہ ہے۔ ایک افسانہ نگار اپنے مشاہدے یا تجربے کو اپنی داخلیت میں سمو کر دور رس استعاروں اور لفظی پیکروں کے ذریعے کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ زندگی کے ایک دو نہیں بیک وقت کئی رنگ اڑتے اور کھیلتے نظر آتے ہیں تہذیبی زندگی کے بہت سے رشتے ایک ساتھ الجھتے اور جال بنتے دکھائی دیتے ہیں مختصراً یہ کہ جدید تر افسانہ' ظاہری و معنوی دونوں حیثیتوں میں جدید اردو شاعری سے ملتا جلتا ایک فنی تجربہ ہے یہ تجربہ اپنے اظہار میں اتنا انفرادی ہے کہ اس کی تہ تک رسائی اتنی آسان نہیں جتنی کہ پرانے طرز کے افسانوں کی۔ پھر بھی نئے افسانے کی یہ روش روز بروز مقبول ہو رہی ہے اور اردو میں سردست اس کی نمایندگی' انور سجاد' دیوندر اسر' انتظار حسین۔ رشید امجد' بلراج کومل' کمار پاشی در احمد ہمیش وغیرہ کرتے ہیں۔

لیکن جدید افسانے کی یہ روایت اردو میں اتنی نئی نہیں جتنی کہ عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔ اس کی مقبولیت کا دور اگرچہ ۵۵-۱۹۵۴ء سے شروع ہوتا ہے لیکن اس کی داغ بیل اس سے بہت پہلے ترقی پسند تحریک کے ساتھ پڑ گئی تھی' یہ عذر ہے کہ ترقی پسند تحریک سے منسلک افسانہ نگاروں کی زیادہ توجہ مقصد اور اس کے ابلاغ ہی پر رہی' پھر بھی اس تحریک کے باشعور اور بالغ نظر ادیبوں نے دوسری قسم کے فنی تجربوں کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ چنانچہ جدید تر افسانے کی پہلی اینٹ بھی انھیں کے ہاتھوں رکھی گئی ہے۔ احمد علی' منٹو' عزیز احمد اور کرشن چندر سب کے یہاں بعض ایسے افسانے نظر آتے ہیں' جو افسانے کی عام ڈگر سے بہت الگ ہیں۔ ان میں مجرّد واقعہ نگاری' یا براہِ راست اظہار کے بجائے علامتوں اور استعاروں کی مدد سے بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعد کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں جن کے یہاں یہ رنگ زیادہ نمایاں ہو کر اور نکھر کر سامنے آیا ہے' اور توجہ کا مرکز بنا ہے ان میں احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین کے نام آتے ہیں لیکن میرا موضوعِ سخن اس وقت صرف احمد ندیم قاسمی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے متعدد مجموعے شایع ہو چکے ہیں اور ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں بہت کچھ لکھا بھی جا چکا ہے۔ لیکن ہمارے ناقدین کے پیشِ نظر' زیادہ تر وہی افسانے رہے ہیں' جو براہِ راست کہانی ہیں اور جن میں زندگی کے کسی خاص پہلو کو اردو افسانے کی پرانی تکنیک کے مطابق اجاگر کیا گیا ہے۔ ندیم کی افسانہ نگاری کے اس فنی اسلوب کی طرف توجہ نہیں کی گئی جو مروجہ افسانے کی ڈگر سے الگ جدید تر افسانے کی علامتی و تمثیلی روش سے تعلق رکھتا ہے۔

ندیم کے افسانوں کا ایک انتخاب بہ عنوان "ندیم کے بہترین افسانے" مظفر علی سید کے مقدمہ کے ساتھ میری لائبریری نے شایع کیا ہے اس میں ندیم کے سینکڑوں افسانوں میں سے صرف تیرہ افسانے منتخب کیے گئے ہیں۔ ان

بہترین افسانوں میں بعض افسانے، مثلاً "سلطان" اور "وحشی" ایسے ہیں جن میں جدید تر فنی اسلوب کے نشانات ملتے ہیں۔ دونوں افسانے اردو افسانے کی عام روش سے الگ، جدید طرز کے افسانے ہیں، ان کا فنی رویہ اور طرزِ اظہار خود ندیم کے دوسرے افسانوں سے بہت مختلف ہے، نہ ان میں کوئی اہم واقعہ ہے، نہ حقیقی کردار، نہ ان کا انجام طربیہ ہے نہ المیہ۔ اور شاید اسی لیے وہ اپنے قاری پر کوئی فوری تاثر بھی نہیں چھوڑتے ہیں ان کے مطالعے کے بعد ہمارے ذہن میں سوچ کے کئی نئے دریچے کھلتے ہیں۔ ان دریچوں سے کچھ دیر جھانکتے رہیے تو موجودہ تہذیبی زندگی کے کئی رجحانات متشکل ہو کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ ان افسانوں میں ندیم نے کوئی کہانی نہیں سنائی، بلکہ دورِ حاضر کے کئی تہذیبی مسئلوں کو مؤثر علامتی روپ دے کر ہمارے اعصاب اور فکر و شعور کو جھنجھوڑا ہے۔

ندیم کا افسانہ "سلطان" تہذیب کے اس بحران کا ترجمان ہے، جو دوسری جنگِ عظیم کے فوراً بعد رونما ہونے لگا تھا اور آج ہماری زندگی اور ادب کا سب سے اہم موضوع ہے۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ زندگی کو سنوارنے بنانے اور اس کے اقدار کے تعین میں کوئی اصول یا فارمولہ کام نہیں دے رہا۔ پرانی قدریں ایک ایک کرکے دم توڑ رہی ہیں، اور نئی قدریں ہیں کہ جنم لینے کا نام نہیں لیتیں۔ انسان اقدار کے خلا میں جی رہا ہے۔ لیکن اس طرح کب تک جی سکے گا، یہی فکر اور یہی خوف اُسے کھائے جا رہا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی بڑائی اس بات میں ہے کہ ان کے دراک ذہن نے اس بحران کو اب سے کوئی تیس سال پہلے اس وقت محسوس کر لیا جب کہ ان کے بیشتر ساتھی اقدار کو ایک بار پھر سیاسی اور نظریاتی فارمولوں میں جکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حالانکہ اقدار کی پامالی اور بے معنویت کا سبب ہی یہی تھا کہ جاگیردارانہ نظام نے تہذیبی قدروں کو اپنے فارمولوں کی تاریک کوٹھری میں بند کرکے انھیں تازہ ہواؤں سے محروم کر دیا تھا۔ احمد ندیم قاسمی اردو کے ان باشعور ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے اس عمل کو بروقت محسوس کر لیا۔ ہر چند کہ ادب اور زندگی دونوں کے بارے میں انھوں نے ہمیشہ ایک اندازِ نظر رکھا ہے لیکن وہ اپنے اندازِ نظر کا شکار ہو کر ہی نہیں رہ گئے۔ انھوں نے اپنے اندازِ نظر کی محبت میں، نہ تو کسی دوسرے اندازِ نظر کو حقارت و نفرت کی نظر سے دیکھا، اور نہ ہیئت و موضوع کے کسی فنی تجربے کو ادب کے حق میں بدعتِ قبیحہ یا جہنم قرار دیا۔ خوب سے خوب تر کی جستجو میں انھوں نے خود بھی نئے نئے فنی تجربے کیے ہیں اور دوسروں کے تجربوں کو بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ فکر و فن کے باب میں یہی وہ آزادہ روی اور وسعتِ نظر تھی جس نے ندیم کو افسانے کی جدید تکنیک کی طرف متوجہ کیا اور ان سے "وحشی" و "سلطان" نام کے دو ایسے بلند پایہ افسانے لکھوائے جو اردو میں علامتی افسانہ نگاری کے لیے نشانِ راہ بن گئے۔

"سلطان" علامت ہے قدیم و جدید کے ٹکراؤ اور آویزش کی۔ اس علامتی روپ میں ماضی، حال اور مستقبل اس طرح گتھم گتھا ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھنا دکھانا بہت مشکل ہے، پرانی قدریں روبہ زوال سہی لیکن ان سے ہمارا لاشعور اب تک چمٹا ہوا ہے نہ وہ ہمیں چھوڑنے پر رضامند ہیں اور نہ ہم اُن سے یکسر چھٹکارا حاصل کرنے کو تیار ہیں۔ نئی قدروں کا وجود ابھی تک زیادہ تر اشتہاری ہے۔ آزادیٔ رائے، اقتصادی مساوات، سماجی انصاف، عالمگیر برادری اور معاشی عدل کی باتیں صبح سے شام تک کی جاتی ہیں، لیکن عملاً دنیا میں ان کا وجود نظر نہیں آتا۔ نئی نسل، ان اصطلاحات کے معنی سمجھنا چاہتی ہے، لیکن سمجھانے والا نہیں ملتا۔ ملے بھی کیسے سمجھنے اور سمجھانے والے کے درمیان

براہِ راست کوئی رشتہ ہی نہیں رہا۔ ان کے درمیان تیسرا آدمی، جسے آپ ایجنٹ کہہ لیجیے یا دلال اس طرح حائل ہو گیا ہے کہ خرید و فروخت سے لے کر پاسپورٹ اور ڈرائیونگ لائسنس بنوانے تک ہم اس آدمی سے نجات نہیں پا سکتے۔ یہ تیسرا آدمی زندگی کے ہر شعبے میں دخیل ہے اور صاحبانِ معاملہ کو براہ راست ملنے ہی نہیں دیتا۔ دو آدمیوں کے درمیان کا یہ فاصلہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور اقدار کی آویزش کا سبب ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اسی آویزش اور اس سے پیدا شدہ کیفیت کو "سلطان" میں علامتی روپ دیا ہے۔

اس افسانے میں "سلطان" اور اس کا ضعیف و نابینا دادا بظاہر کردار کی حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ لیکن فی الواقع یہ کردار نہیں، عصری زندگی کے دو اہم اور باہم متصادم رجحانات کی علامتیں ہیں۔ دادا قدامت پرستی کی علامت ہے۔ وہ پرانے خیال کا ایک جہاں دیدہ آدمی ہے۔ تہذیبی زندگی کی جس ڈگر پہ پہلے دن چلا تھا اسی پر آخری دم تک چلے جا رہا ہے۔ ذمہ داری کو محسوس کرنے اور مروجہ اخلاقی قدروں کو سنبھالنے کی ناتمام کوشش ابھی اس کے یہاں ملتی ہے۔ بھیک مانگ کر وہ اپنا پیٹ بھی بھرتا ہے اور اپنے پوتے کو بھی کھلاتا ہے۔ بگو کوچوان کی ماں زہرہ نے اپنی چھپریا میں اسے سر چھپانے کی جگہ دے دی تھی، اس لیے دادا اسے اپنا محسن جانتا ہے۔ لیکن ذاتی مفاد اور اظہار تحکم کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اپنا کام نکالنے کے لیے خود کو ضرورت کے مطابق ڈھال لینا اسے خوب آتا ہے۔ بھیک مانگنے نکلتا ہے تو پوتے کے سر پہ اپنے دائیں ہاتھ کا پنجہ سختی سے جمائے رکھتا ہے کہ سلطان مداری کا تماشہ دیکھنے نہ نکل جائے۔ سلطان کو وہ اس کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں اور بیہودہ باتوں پر ڈانٹ بھی پلاتا ہے اور گاہے گاہے زندگی کی اونچ نیچ بھی سمجھاتا ہے۔ ایک دفعہ حسبِ عادت جب سلطان نے بھیک نہ دینے والے بابوؤں کے لیے بھونڈی سی گالی نکالی تو دادا نے کہا "ابے چپ رہ کوئی سن لے گا تو ادھر کا منہ اُدھر لگا دے گا"۔ ایک بار اس نے سلطان کو یہ بھی سمجھایا کہ کٹورے کو ترچھا لٹکائے رہنے کے بجائے ہاتھ میں سیدھا رکھا کر، ورنہ بابو لوگ سمجھیں گے کہ بھیک مانگنے نہیں سودا لینے جا رہا ہے۔ پرانی باتوں اور خاص طور پر انگریزی عہد کے رعب و داب کا اثر اس کے ذہن پر بہت گہرا ہے۔ وہ سرکاری راج سے منسلک ملازموں یا بابوؤں کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ بھیک مانگنے کے لیے عام طور سے انھیں بازاروں اور سڑکوں سے گذرتا ہے جن پر بابو لوگ ٹہلنے نکلتے ہیں۔ نوجوانی میں جب وہ بجلی کے کھمبے کو لکڑی سے بجا کر اس سے اپنا کان لگاتا تھا تو کھمبوں کے انگریزی بولنے کی آواز آتی تھی۔ پیسے کی افادیت بھی اس کے نظر میں رہتی ہے۔ سلطان نے جب دو پیسے کی گنڈیریاں چوس لیں تو جھنجھلا کر بولا — "ابے چنے کھا لیتا تو دوپہر تک کا سہارا ہو جاتا"۔ دادا کو نئی زندگی کا نہ کوئی شعور ہے نہ احساس وہ تو کسی طرح بس اپنا پیٹ بھرنے اور صبح سے شام کرنے کو زندگی جانتا ہے۔

دادا کے برعکس اس کا پوتا "سلطان" نو عمر، تند مزاج اور کھلنڈرا ہے۔ آزادہ منشی، لاپرواہی اور خود غرضی و خود داری بھی اس کے مزاج کے قوی عناصر میں سے ہیں۔ دادا اُسے لے کر روزانہ بھیک مانگنے نکلتا ہے اور جو کچھ ملتا ہے خود کھاتا ہے پوتے کو بھی کھلاتا ہے۔ پھر بھی سلطان، دادا کی سرپرستی سے خوش نہیں ہے۔ دن بھر دادا کے ساتھ گشت لگاتا ہے۔ لیکن بڑی بے دلی اور لاابالی پن کے ساتھ۔ وہ ہاتھ میں کٹورا لیے۔ دادا سے آگے آگے چلتا رہتا ہے لیکن اس کی نظر بھیک دینے والے بابوؤں کے بجائے زیادہ تر خوانچہ والوں اور مداری کے تماشے پر رہتی ہے۔ جیسے ہی دادا

کھانسی کا دورہ پڑا اور سلطان کے سر سے اس کا ہاتھ اٹھا سلطان، مداری کے تماشے کی طرف لپکا۔" جتنی دیر میں دادا کی سانس معمول پر آئی، اتنی دیر میں سلطان مداری کو ٹوکری کے نیچے رکھے ہوئے چیتھڑوں کو سفید براق رنگ کے دو موٹے موٹے کبوتروں میں بدلتے ہوئے دیکھ چکا تھا"۔ دادا نے دو پیسے دیے کہ وہ کوئی چیز کھا کر تازہ دم ہو جائے۔ سلطان چیز لینے گیا تو غائب ہی ہو گیا۔ دادا سلطان، سلطان کی آوازیں لگاتا رہا، سلطان سُسی کی ان سُنی کر کے اپنی مرضی سے بڑی دیر کو لوٹا۔ دادا نے اس سے پوچھا کیا کھایا، کہنے لگا "گنڈیری"۔ دادا بولا "ارے بدبخت چنے کھاتا تو دوپہر کا سہارا ہو جاتا"۔ شام کو گھر پہنچ کر جب دادا کا ہاتھ سلطان کے سر سے اُٹھتا، تو وہ یوں محسوس کرتا جیسے وہ یک دم ہلکا پھلکا ہو گیا ہے اور اس کے پاؤں میں لوہے کے گولوں کی جگہ ربر کے پہیے بندھ گئے ہیں۔ شام کو گھر پہنچتا، کھانا کھاتا اور زیبو خالہ کی آنکھ بچا کر باہر نکل جاتا۔ رات کو بہت دیر سے واپس ہوتا۔ صبح کھٹولے سے اُٹھتے ہی دادا کے ہاتھ کے خوف سے اُسے یوں لگتا جیسے اس نے سر پر کوئی پتھر کی ٹوپی پہن لی ہے۔ رات کو دادا پر کھانسی کا دورہ پڑتا تو بظاہر سلطان سہارا دیتا، لیکن تنہائی میں مسکراتا اور کہتا "دادا مر جائے تو اللہ کی قسم مزے آجائیں"۔ ایک دن جب زیبو خالہ نے خبر سنائی کہ دادا اللہ کو پیارا ہو گیا ہے تو سلطان کے اندر پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ سلطان کو زیبو خالہ بھی اچھی نہ لگتی تھی، اس لیے کہ وہ اسے ناوقت گھر سے نکلنے کو روکتی تھی۔ دادا کے مرنے کے بعد جب زیبو نے اس کے ہاتھ میں کٹورا تھما دیا اور بھیک مانگنے کو کہا، تو وہ بڑی مشکل سے رضامند ہوا اور بے دلی سے آواز لگائی "راہ مولا پیسہ دیدو"۔ ایک بابو جی بولے "نوکری کرے گا" تو سلطان کٹورے کو زمین پر پٹک کر بولا۔

"میں نوکری نہیں مانگتا، میں بھیک نہیں مانگتا، اللہ آپ کو بہت دے۔ میرے سر پر ذرا دیر ہاتھ رکھ کر چلیے میرا سر دُکھ رہا ہے"۔ بابو سلطان کی اس جسارت پر حیران رہ گیا۔ لیکن سلطان اپنی افتادِ طبع سے مجبور تھا، وہ آزادی بھی چاہتا تھا، اور کوئی ذمہ داری بھی قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ تندمزاجی کا یہ عالم تھا جو بابو اس کے کٹورے میں پیسے نہ ڈالتا اور "معاف کرو" کہہ کر آگے بڑھ جاتا تو سلطان اس کے لیے بھونڈی سی گالی نکالتا۔

یہ ایسی باتیں ہیں جو سلطان کے روپ میں آج کے تہذیبی دور کے خاص رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ رجحان اب ڈھکا چھپا نہیں رہا ہے۔ ہپیوں، چرسیوں اور ملنگوں کی شکل میں دنیا کے گوشے گوشے میں موجود ہے اس کے اثرات تمدنی زندگی پر قوی سے قوی تر ہوتے جا رہے ہیں احمد ندیم قاسمی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس رجحان کو مجسم کر کے اس وقت ہمارے سامنے لا کھڑا کیا جب کہ ہم میں سے اکثر نے اُسے محسوس تک نہ کیا تھا۔

"وحشی عورت" بھی "سلطان" کے رنگ کا افسانہ ہے۔ سلطان استعارہ تھا پرانی قدروں کی آویزش کا "وحشی عورت" استعارہ ہے اس قومی رجحان اور ملّی تشخص کا جو اپنی نارسائیوں اور مجبوریوں کے باوجود ٹیپو سلطان کے حوالے سے شیر اور گیدڑ کی زندگی کے فرق کو محسوس کر سکتا ہے۔ اُسے برابری کی سطح پر کسی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا، باہم دُکھ سکھ میں شریک ہونا اور وقت پڑنے پر بے غرضانہ ایک دوسرے کی مدد کرنا اچھا تو لگتا ہے۔ لیکن کسی کی طرف سے کوئی ایسی امداد جو عزتِ نفس اور غیرتِ ملّی کی قیمت پر از راہِ ترحم بطور خیرات دی جا رہی ہو اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اپنی ذات، اپنی صفات، اپنی زمین، اپنا آسمان، اپنی مٹی، اپنے کھیت، اپنے دریا، اپنے پہاڑ، اپنے زورِ بازو، اپنے گاؤں، اپنے شہر،

اپنے خیالات اپنے عقیدے، اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت خواہ کیسی ہی بے رنگ و بے جان کیوں نہ ہوں، بہرحال اپنی ہیں اور اسی لیے وحشی عورت کو جان و دل سے عزیز ہیں۔ مانگے تانگے کی کوئی چیز جو اس کی خودداری اور غیرت مندی پر ضرب لگاتی ہو اس کی نظر میں بے وقعت اور بے معنی ہے۔ وہ بوڑھی اور کمزور سہی، لیکن اس کا دل جوان اور توانا ہے۔ بس اسٹینڈ کی بھیڑ بھاڑ، کنڈکٹر کی چرب زبانی، بس کے خوش حال مسافروں کی بے نیازی اور گوری چٹی، خوش لباس لیڈیز کی بے رُخی کسی چیز کو بھی نہ وہ ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتی، اور نہ خود کو کسی سے کمتر سمجھتی ہے، اس کا ہر عمل اور ہر لفظ اس کی خود اعتمادی اور خود آگہی کو ظاہر کرتا ہے، وہ پرانے خیال کی بوڑھی عورت ہے۔ لیکن کسی نئی چیز یا نئی صورت حال سے بے سبب مرعوب و خوف زدہ نہیں ہے۔ بس اسٹینڈ پر آدمیوں کے بھیڑ کو چیرتی ہوئی وہ بڑی بے باکی سے بس میں داخل ہو کر سیٹ حاصل کر لیتی ہے۔ ایک گوری چٹی فیشن ایبل عورت اس کے برابر بیٹھی ہے اور بڑھیا کی طرف کوئی توجہ کیے بغیر کھڑکی سے باہر دیکھ رہی ہے۔ بڑھیا نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا اور بولی "باہر مت دیکھو چکر آجائے گا" عورت نے جواب دیا "مجھے چکر نہیں آتا" بڑھیا کہنے لگی "مجھے تو آگیا تھا" عورت نے کہا "تمھیں آگیا تھا تم باہر مت دیکھو، مجھے نہیں آتا اس لیے میں تو دیکھوں گی" اس پر بڑھیا نے سوال کیا "تو کیا، تم باہر نہ دیکھو گی تو تمھیں چکر آجائے گا" بڑھیا کے اس سوال سے عورت تلملا کر رہ گئی اور باہر دیکھنے لگی۔ اتنے میں بڑھیا کی نظر اگلی سیٹ کی ایک عورت پر پڑی، اس نے اپنی چوٹی میں زرد رنگ کا ایک پھول سجا رکھا تھا۔ بڑھیا نے جُھک کر ذرا غور سے پھول کو دیکھا اور ساتھ بیٹھی ہوئی عورت سے سرگوشی کے انداز میں پوچھا "اصلی ہے یا نقلی" عورت نے کہا "نقلی" بڑھیا نے کچھ اور بھی پوچھا۔ عورت نے بڑی بے رخی سے جوابات دیے اور بڑھیا کی طرف توجہ کیے بغیر باہر ہی دیکھتی رہی۔ چند لمحے بعد بڑھیا پھر مخاطب ہوئی اور پوچھا "لیڈی ہو" عورت بُرا مانتے ہوئے بولی۔ "کیا"؟ بڑھیا نے کہا۔ "اسپتال کی لیڈی ہو" عورت بولی "نہیں" بڑھیا نے کہا "پھر کیا کرتی ہو" جواب ملا "کچھ نہیں" بڑھیا نے کہا "کچھ تو ضرور کرتی ہو" اتنے میں کنڈکٹر نے آواز لگائی "ٹکٹ لے لو" بڑھیا بولی "ہاں بیٹے دے دو" کنڈکٹر نے پوچھا "کہاں جاؤ گی" بڑھیا نے کہا "گھر" اس جواب سے کنڈکٹر مسکرایا اور اپنی مسکراہٹ میں دوسرے مسافروں کو بھی شریک کر لیا۔ آخر کار بڑھیا نے بس اسٹاپ کا نام بتایا اور کنڈکٹر نے ساڑھے پانچ آنے طلب کیے۔ بڑھیا کے پاس صرف ایک چونی تھی وہ اس نے کنڈکٹر کی طرف بڑھا دی۔ کنڈکٹر نے چھ پیسے اور مانگے۔ بڑھیا نے معذرت چاہی۔ کنڈکٹر مصر رہا، دونوں میں جھک جھک ہونے لگی۔ سامنے کی سیٹ پر جو عورت بالوں میں پھول سجائے بیٹھی تھی بولی "ایسیوں کی تلاشی لینی چاہیے" یہ سن کر بڑھیا کے تن بدن میں آگ لگ گئی، بپھر کر بولی "کیا تو میرے بیٹے کی گھروالی ہے کہ تجھے میرے جیبوں کا حال بھی معلوم ہے۔ سر میں کوڑی کا پھول لگا لینے سے بھیجے میں عقل نہیں بھر جاتی رانی بی بی" پھول والی عورت دانت کچکچا کر رہ گئی۔ بڑھیا ابھی پوری طرح خاموش بھی نہ ہو پائی تھی کہ کسی کی آواز آئی "عجیب وحشی عورت ہے" بڑھیا پھر بھڑک اٹھی اور کہا۔ "یہ کون بولا پھر بولے تو میں اس کی زبان کھینچ لوں" کسی میں بولنے کی ہمت نہ ہوئی، اب کنڈکٹر نے بڑھیا کے پاس آکر سختی سے کہا "ساڑھے پانچ آنے دے گی یا نہیں"؟ وحشی عورت نے کہا "تو تھانے دار بنا جا رہا ہے۔ کہہ دیا لے یہ چونی، باقی چھ پیسے میں تجھے پہنچا دوں گی، کل بس اسٹاپ پر آکر جیتے جی دوں گی بیٹا" کنڈکٹر نے مسافروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "لو اور سنو

اتنے میں قصے کو رفع دفع کرنے کے لیے ایک صاحب نے بڑھیا کی طرف سے کنڈکٹر کو چپکے سے چھ پیسے دے دیے۔ کنڈکٹر نے بڑھیا کو ٹکٹ دیتے ہوئے کہا "چل حساب پورا ہو گیا اب میں تجھے تیری منزل تک پہنچا دوں گا۔" بڑھیا نے کہا۔ "کیسے؟" کنڈکٹر نے ایک سفید پوش بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے تجھ پہ ترس کھا کر چھ پیسے دیدیے" بڑھیا یہ سن کر غصے میں ان بزرگ کی طرف لپکی اور چیخ کر بولی۔ "تو کون ہے مجھ پہ ترس کھانے والا۔ کیا تیرے جیب میں یہ چھ پیسے کود رہے تھے کہ تو نے ترس کھا کر میری طرف یوں پھینک دیے جیسے کتے کی طرف ہڈی پھینکی جاتی ہے ارے سخی داتا کہیں کے، تو مجھ پہ ترس کھاتا ہے جس نے ساٹھ ستر سال دھرتی میں بیج ڈال کر پودوں کے اُگنے اور خوشوں کے پکنے کے انتظار میں کاٹ دیے ہیں تو ان ہاتھوں پر چھ پیسے رکھ رہا ہے کہ اگر اکٹھی ہو تو پہاڑ بن جائے کیا تیرے گھر میں تیری ماں بہن نہیں ہے۔ ترس کھانے کے لیے کوئی اندھا فقیر نہیں ملا تجھے رستے میں" سفید پوش بزرگ دم بخود ہو کر رہ گئے۔ اب بڑھیا کنڈکٹر کی طرف پلٹی اور بولی۔ "یہ چھ پیسے جو اس نے مجھ پر تھوکے ہیں اُسے واپس دیدے اور مجھے یہیں اُتار دے مجھے پیدل چلنا آتا ہے۔" یہ کہہ کر بڑھیا واقعی اپنی منزل سے پہلے ہی اُتر گئی اور پیدل چل دی۔

ان جزئیات سے ممکن ہے یہ محسوس ہو کہ "وحشی عورت" کا کردار کوئی انفرادی کردار ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے پورے افسانے پر نظر ڈالنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ "سفید پوش بزرگ کے چھ پیسے" استعارہ ہیں واشنگٹن ہاؤس کی اس معاونت کا جو ملکی ماہیت اور ملی سیاسی آزادی کی قیمتوں پر فارن ایڈ کے نام سے ہمیں گاہ بگاہ ملتی رہی ہے اور "وحشی عورت" علامت ہے اس ردعمل اور احتجاج کی جسے انفرادی سطح ہی پر نہیں، ملی سطح پر بھی محسوس کیا گیا ہے۔ گویا افسانہ کیا ہے قومی سطح پر ہمارے سیاسی و تاریخی شعور اور اس کے عمل و ردعمل سے پیدا شدہ رجحان کا منحنی خط ہے جسے احمد ندیم قاسمی نے "وحشی عورت" کی زبان دے دی ہے۔

کتابیں کہتی ہیں کہ شاعر اگر ذہنی طور پر ہمیشہ ہمیشہ جوان رہے تو اس کا فن بھی ہمیشہ جوان رہتا ہے مگر عمر اور احساس کا تفاوت کتنا ہے، کہ کہیں میرا نظریۂ حسن جامد ہو کر تو نہیں رہ گیا___

میں جانتا ہوں___ مجھے اس گومگو کی کیفیت سے جلد چھٹکارا پالینا چاہیے___ مگر مشکل یہ ہے کہ میں واعظ کبھی نہیں بن سکوں گا___ واعظ بنوں گا، تو شاعر نہیں رہوں گا، اور شاعر نہیں رہوں گا تو مر جاؤں گا___

___ ندیم

ڈاکٹر قمر رئیس

افسانہ نگار ندیم

بالعموم ایک فن کار کسی ایک فارم کو اپنا کر اس کے امکانات کی جستجو اور اس میں ایک منفرد مقام حاصل کرنے میں ہی عمر صرف کر دیتا ہے اور اگر کسی دوسرے فارم کو آزماتا بھی ہے تو اس میں اس کی کامیابی مشتبہ اور شہرت ثانوی ہوتی ہے۔ لیکن احمد ندیم قاسمی نے شاعری اور افسانہ دونوں میں اپنی محویت اور ریاضت سے ایسی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے کہ اکثر سنجیدہ قارئین سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ندیم شاعر بڑا ہے یا افسانہ نگار؟ کس فارم میں اسے کامیابی ہوئی اور کیوں؟۔ کس میں اس کی شخصیت کا اظہار زیادہ مکمل اور موثر ہے؟ ندیم کے لیے اس طرح کے سوالات شاید ایسے ہی ہوں جیسے کسی خوش نصیب ماں سے جس نے تقریباً مساوی تعداد میں خوب رو اور سعید بیٹوں اور بیٹیوں کو جنم دیا ہو، پوچھا جائے کہ اسے کون زیادہ عزیز ہیں؟ کن میں اس کی باطنی اور ظاہری مشابہت زیادہ ہے اور کیوں؟ ان سوالوں خصوصاً آخری کیوں؟ کا جواب ندیم کے لیے بھی اتنا ہی دشوار ہوگا جتنا اس ماں کے لیے کیونکہ تخلیق کا عمل جتنا شعوری ہے اتنا ہی اضطراری اور بے اختیاری بھی اکثر فن کار کے لیے یہ سراغ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ جس تجربہ نے اس کی باطنی اور تحسیسی دنیا میں ہل چل پیدا کی ہے اس کی تخلیقی تکمیل کس فارم کی صورت اختیار کرے گی۔ اس لیے کہ فارم کا انتخاب تخلیقی تجربہ کرتا ہے تخلیقی شعور نہیں۔ فن کار کا شعور تجربہ کی شدت، وسعت یا نوعیت کے اعتبار سے اظہار کی آسانیاں فراہم کرتا ہے اور ابلاغ اور جمالیاتی تکمیل کے تقاضوں کے پیش نظر اسے سنوارتا اور آراستہ کرتا ہے۔

ندیم کی شاعری اور اس کے افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے ہمیشہ فن اور اس کی تخلیق کے اعلیٰ اور حقیقی تقاضوں کا احترام کیا ہے۔ کسی ہنگامی مصلحت یا خارجی ترغیب سے اس نے کسی ایسے تجربہ یا واقعہ کو تخلیق کا رنگ دینے کی کوشش نہیں کی جو از خود اسے اپنے اظہار اور اپنے فارم کی تلاش میں سرگرم نظر نہ آیا ہو گویا ندیم نے اس کی مدد کی ہے جو فنی مدد کرنے پر آمادہ ہو، اس کی نہیں جو ہر قدم پر بیرونی امداد، روشنی یا رہبری کا محتاج ہو کر خود اپنی فطری توانائی اور تابندگی سے محروم ہو گیا ہو۔

ندیم ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم اور ممتاز رکن رہے ہیں لیکن مجھے اکثر محسوس ہوا ہے کہ وہ اتنا بڑا ترقی پسند نہیں جتنا بڑا فن کار ہے۔ اگرچہ مجھے شک ہے کہ ترقی پسندی سے وابستگی بھی پریم چند کی طرح ان کی اپنی دریافت ہے۔

وہ پریم چند کی طرح ایک حساس اور درد مند دل لیکن ان سے زیادہ ترقی یافتہ سائنسی ذہن رکھتا ہے۔ اور اس ذہن کی تشکیل میں مارکسزم کا حصہ سب سے نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے عہد کی حقیقتوں کے ادراک میں وہ پریم چند کی طرح پرفریب تصور پرستی کا شکار نہیں ہوا۔ اگرچہ پریم چند کی طرح اس کے احساس اور تخیل کا خمیر بھی گاؤں کی مٹی سے بنا ہے۔ اور وہ بھی پنجاب کے گاؤں کی مٹی سے جو بڑی زرخیز شاداب اور جمال آفریں رہی ہے اس لیے ان کا احساس و تخیل پریم چند سے زیادہ نازک لطیف اور حسین پیکر ہے۔ گاؤں کی مٹی اور اس کی زندگی سے اس کا والہانہ پیار ہی دراصل اس کے اجتماعی شعور کا سرچشمہ ہے۔ ان قوتوں کی جستجو سے شہر تک پہنچا۔ وہاں اسے جاگیرداروں اور ان کے جابر عاملوں کی صف میں وہ زبردست بورژوا اور سامراجی طاقتیں نظر آئیں جو محنت اور دولت پر جابرانہ تسلط کے نت نئے منصوبے بناتی تھیں یہیں متوسط طبقے کی زبوں حالی اسے کھلے کھلے نفسیاتی تضادات اور نفسیات کے مطالعہ کا موقع ملا تقسیم سے کچھ قبل ہی ملک کے طبقاتی کردار کے بارے میں اس کا شعور واضح اور پختہ ہونے لگا تھا۔ طبقاتی جبر و ظلم سے انسان کی آزادی کو وہ سیاسی آزادی سے کم اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ دراصل دوسری جنگ عظیم کے بعد جو پیچیدہ صورت حال پیدا ہوئی اور تقسیم کے بعد رونما ہونے والے حوادث سے اس پر جو غبار چھایا ہے شمار ترقی پسند دانشور اور انقلابی ادیب بھی اس میں بھٹک گئے کچھ قوم پرستانہ اور مذہبی سیاست کی نذر ہوئے کچھ تائب ہو گئے۔ ملک کی اور ساری دنیا کی نئی سیاسی اور سماجی صورت حال پر غور و فکر تو کجا۔ کتنے ہی ترقی پسند اور انقلابی دانشور ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۹ء میں جیلوں اور تہ خانوں سے باہر آئے یا تو صرف تن کے رہ گئے یا زندہ بھی نہیں رہے۔ ندیم ان چند ادیبوں میں سے ایک ہے جس کی طبقاتی فکر اس آزمائش سے گزر کر پہلے سے روشن ہو گئی۔ وہ ذہنی طور پر زیادہ چست اور چونچال ہو کر نئی سامراجی ریشہ دوانیوں اور گرد و پیش کی بدلتی ہوئی حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ محنت کش طبقوں کے مقدر سے اس کی وابستگی کچھ اور استوار ہو گئی۔ یہ صحیح ہے کہ اس مدت میں قومی اور ثقافتی زندگی کے بعض مسائل کے بارے میں ندیم کا جو رویہ رہا وہ مارکسی اور تاریخ کے مادی نقطہ نگاہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے باوصف میں سمجھتا ہوں کہ اس کی تخلیقات اپنے عہد کی طبقاتی آویزش کا بڑا تابناک اور کھرا نقش پیش کرتی ہیں۔ وہ اپنے تجربات اور ذہنی کوائف کو تاریخی پس منظر اور مادی حقیقتوں کی روشنی میں ہی پیش کرنے پر اصرار کرتا ہے اس کی انسان دوستی کی دھیمی دھیمی آنچ اس کے تخلیقی جوہر کو ہمیشہ نکھارتی اور سنوارتی رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ گنڈاسا، آنندی، موذیل، الحجوبی کے مرتبہ کی کوئی کہانی نہیں لکھ سکا (اس مرتبہ کی کہانیاں خود ان کے مصنف بھی کب لکھ سکے؟) لیکن ندیم کی بہترین کہانیاں اردو کے کسی بھی افسانہ نگار کی بہترین کہانیوں سے تعداد میں کم نہیں۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ ندیم نے گزشتہ بیس سال میں کوئی ایسی کہانی نہیں لکھی جو اس دور کی کہانیوں میں تیسرے درجہ کی تخلیق کہی جا سکے۔ جو مواد پر گرفت، دلچسپی، فضا، کیفیت اور معنویت کے احساس و شعور سے عاری ہو۔ اس مدت میں جب اس کے بعض دوسرے معاصرین کا فن جمود و انحطاط سے دوچار رہا ندیم کے افسانے تکمیل و ترقی کے مراحل طے کرتے رہے۔ افسانہ نگاری کی حیثیت سے ندیم کے فنی کمالات کو نظر انداز کرنے کا سبب شاید یہ ہے کہ اس کے فن میں انفرادیت کے عناصر کچھ دیر میں چمکے اور وہ بیک وقت شاعری اور افسانہ دونوں کو ساتھ لے کر چلا اور شاید یہ بھی ہو کہ وہ ادیبوں کی گروہ بندی، و رباہمی طرح مرا اپنے کے دبستان سے الگ رہا) بہرحال گزشتہ

ندیم، افسانہ نگار ندیم کو اپنا خونِ جگر نہ دیتا تو اس کا فن اس درجۂ کمال کو نہ پہنچتا۔ اس کی اکثر کہانیوں کے بعض حصے شاعری کی اعلیٰ سطح کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ لیکن کیا افسانہ نگار ندیم نے شاعر ندیم کو کچھ نہیں دیا؟ یہ ممکن ہی نہ تھا۔ ہم جسم کے قطعات میں افسانہ کا افسوں ہی بکھرا ہوا ہے۔ اسی طرح "جلال و جمال" اور "شعلۂ گل" کی متعدد نظموں مثلاً "زاویۂ نگاہ"، "لوگ تو کیا جاتے ہوتے"، "ایک چیخ"، "مغویہ" اور "پنشن" وغیرہ میں افسانہ نگار کی حقیقت، شعریت، اس کا ماضی تخیل اور افسانہ کی تکنیک رچی بسی ہے۔ ان میں زندگی کے آشوب اور دردوں کی آویزش کا ہونا احساس ہے۔ مشاہدہ کی جزرسی اور تجربہ یا واقعہ کہانی کا سا موڑ دے کر وحدتِ تاثر کی ترسیل کا جو سلیقہ ہے وہ افسانہ نگار ندیم ہی کا حصہ ہے۔

میں ندیم کی حکیمانہ یا مفکرانہ شاعری کو جو اس کی بعض نظموں یا تازہ قطعات میں اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ اس کی شخصیت کے فطری اور ذہنی دھارے سے الگ ایک لہر سمجھتا ہوں اور شاید یہ کبھی اس کی شاعری کے منفرد کردار کی تعمیر میں مزاحم رہی ہے۔ فلسفیانہ فکر کی اس لہر کو آگے بڑھانے میں اقبال کا اثر اور فیض اور سردار جعفری جیسے ترقی پسند شعراء سے اپنی آن کو ممتاز کرنے کا جذبہ بھی شامل ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے میرا اشارہ ان نظموں کی طرف نہیں جو کسی روشن سماجی بصیرت کی حامل ہیں بلکہ اس شاعری کی طرف ہے جس کے تجریدی آہنگ پر باطنیت کی پرچھائیاں پڑتی نظر آتی ہیں۔ ممکن ہے ندیم کا ناقد اس کے بچپن کے عارفانہ ماحول اور تعلیم و تربیت میں اس کا سراغ لگاتے ہوئے مجھ پر برہم ہو گا کہ یہ ندیم کا حقیقی لہجہ اور اس کی آواز نہیں بلکہ اپنے اردگرد کے مانوس ماحول اور اجتماعی [illegible] حالات میں وہ [illegible] تلاش کرتا ہے۔ فطری زندگی کا ہر مظہر اور ہر منظر اس کا دامنِ دل کھینچتا ہے اور وہ ہر لمحہ اپنی ذات اور کائنات کے درمیان نئے رشتوں کا ادراک کر کے اپنے ذہن اور تخیل کو سمت نیرنگی اور شادابی بخشتا ہے۔ کائنات کے دلفریب مناظر [illegible] مادی حقائق سے دلچسپی جن کا مرکزی محور انسان کا وجود ہے، ندیم کی ذہنیت اور تخلیقی محویت کا جوہر ہے۔ اور یہ جوہر اس کے ہر دور کے افسانوں میں مختلف رنگوں میں نمایاں ہوتا اور نکھرتا رہا ہے۔

"چوپال" اور "بگولے" سے لے کر "برگِ حنا" اور "گھر سے گھر تک" ندیم کی کہانیوں کا مطالعہ اسی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔ تاریخی ترتیب سے ندیم کی کہانیوں کا مطالعہ ایک ضخیم ناول کا مطالعہ ہے جس میں گزشتہ تیس سال کے شعور و احساس کے ارتقاء کی داستان رقم ہوئی ہے۔ یہ داستان خود ندیم کا ذہنی اور جذباتی سفر بھی ہے۔ اس نے اپنی ہر نئی کہانی میں انسان کی اس ازلی معصومیت، آسودگی، مسرت اور محبت کو تلاش کیا ہے جس کے لیے خود اس کی روح تڑپ رہی ہے۔ اس کی پچھلی کہانیوں کے کردار اگلی کہانیوں میں جنم لیتے اور اس ابدی تلاش کو جاری رکھتے ہیں۔ بدلتے ہوئے تہذیبی حالات اور حقائق میں ان کے جذبہ و احساس اور شعور کی کائنات بھی بدلتی اور زیادہ تہہ دار ہوتی جاتی ہے۔ "چوپال اور بگولے" میں ندیم نے جو کردار تخلیق کیے ہیں وہ معصوم، سادہ، جذباتی اور جنون پرور ہیں۔ وہ زندگی سے حسن و لذت کا احساس رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا ذہن زندگی کے اس مقدس شعور سے محروم ہے جو احساس کو عمل اور کشمکش کی راہ دکھائے! [illegible] وہ جاگیرداروں اور تھانیداروں کے روزافزوں مظالم اس طرح گوارا کرتے ہیں جیسے وہ ناگزیر ہوں۔ جیسے یہ سب کچھ فطرت کا قہر و غضب ہو۔ [illegible] ان کے سر کے محرک منزل اور [illegible] عشق ہے [illegible] اپنی محبت اور سوز کی [illegible] کیسی کیسی اذیتیں سہتا ہے۔ بھوت کا دل [illegible]

خاموش محبت میں خود کو فنا کر دیتا ہے۔ "ہیر رانجھا" کی الہامی پیار کی تند و تیز مدورا پی کر ہیر بن جاتی ہے "بچپنے کا" "میں" عشق کے بھنور میں ڈوب کر ابھرتا تو سسکتا ہوا اپنی ماں کے مامتا بھرے گرم آغوش میں پناہ لیتا ہے۔ "ماں کی گلابو" اپنے بچے کی محبت کے لیے دنیا کی ہر شے ہر خطرے، یہاں تک کہ بیمار شوہر کی فکر سے بھی بے نیازانہ گزر جاتی ہے۔ "بچہ" میں زندگی کی جو گہما گہمی ہے اس کا محور بھی محبت ہے۔ ماں کی مامتا اور باپ کی محبت۔ کھونڈے سے کالے، گندے روتے بسورتے، چپٹی ناک والے بچوں کی محبت۔ محبت جو زندگی کی علامت ہے۔ اس کا سرچشمہ اس کی محافظ ہے۔ ان افسانوں میں اسی محبت کی ساری نرمی، شدت، لطافت اور حلاوت سمٹ آئی ہے۔

یہ کہانیاں ۱۹۴۲ء سے پہلے کی ہیں جب ندیم کی عمر چھبیس پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس عمر میں محبت ہی خلاصۂ کائنات تھی لیکن یہ محبت ماورائی یا سماوی نہیں، ارضی اور حقیقی ہے۔ ایک طبقاتی سماج کی مغرور مجبور مجروح اور گھٹی گھٹی محبت۔ جو انسانیت اور بشریت کا جوہر ہے۔ اس کے بعد "طلوع و غروب" "گرداب" "آبلے" "در و دیوار" اور دوسرے مجموعوں کی کہانیاں سامنے آتی ہیں۔ اور سونی، ولی محمد، گلابو، رالمائی نئے ناموں سے جنم لیتے ہیں۔ ان کی روح اب بھی معصومیت اور محبت سے سرشار ہے لیکن اب ان کے وجود میں شعور و آگہی کی چنگاریاں اڑنے لگی ہیں جو اس محبت کے متوازی، نفرت کو جنم دیتی ہیں۔ نفرت محبت کے قاتلوں سے زمینداروں، ذیلداروں، نمبرداروں اور تھانیداروں کی خون آشامی سے۔ طبقاتی جبر سے۔ انسان کی تحقیر اور تذلیل سے۔ جنگ کے آسیبی سائے سے۔ گرد و پیش پھیلی ہوئی بہیمیت اور بربریت سے۔ "اب "سونی" "میرا دیس" میں اس کسان کی جوان بیٹی ہے جس کی زمین قرق ہو چکی ہے۔ وہ زرخرید لونڈی کی طرح زمیندار کی خدمت پر مامور اور مجبور ہے اور ہر شام اسے اپنا وجود ایک انگارے کی شکل اختیار کرتا محسوس ہوتا ہے۔" وہ سوچتی ہے۔ "یہ انگارہ کب بھڑکے گا۔ کب پھوٹے گا یہ انگارہ کہ میں چنگاریاں بن کر ان زمینداروں ان مولویوں اور ان پیروں کے ریشمیں ملبوس میں سوراخ ڈال دوں۔ ان کے دیدوں میں گھس جاؤں۔ ان کی کنپٹیوں سے چمٹ جاؤں" — اور پھر یہی "سونی" "ووٹ" میں کسان کی غیور اور سرکش بیٹی ہیان اور کہانی لکھی جا رہی ہے، "فاطمہ" بن جاتی ہے جس کا عقیدہ ہے کہ "اگر عزت سے جینا ہے تو جاگیرداروں سے اپنا حق مانگو نہیں بلکہ چھین لو جھپٹ لو۔" اور جس کی آواز میں اب ندیم کو ترا آب بجتی گھنٹیوں کی صدا نہیں، بلکہ "ٹوٹتی زنجیروں اور ٹکراتی تلواروں کی جھنکار سنائی دیتی ہے" اور پھر بھی سرکش اور باغی روح، وحشت بھرائی بغاوت ہے اور اپنی دنیا آپ پیدا کرتی ہے۔ اب اس کی معصومیت سادگی میں خود اعتمادی ہوشمندی تحرک اور بیداری کے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور پھر "جن والس" کی بیگماں اور بانو، "اکیلی" کی خالی "بدنام" کی نوراں، اور جس زمانہ کی ریان تک وہ کتنی ہمہ جہت، تہ دار اور متحرک ہو جاتی ہے۔ اب اس کے وجود کی تکمیل انفعالی جذباتیت کے بجائے ہوشمندانہ بغاوت اور عملی استقامت سے ہوتی ہے۔ اب صرف باہر کی نہیں اندر کی کشمکش قوت اور شدت سے کہانی پر چھا جاتی ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے شکست و ریخت کے اس ہولناک تشکیلی عمل میں محبت اس کے تشدد کا مرکز بنی رہتی ہے۔

ندیم کی کہانیاں پنجاب کی زندگی اور پھر تقسیم کے بعد پاکستانی معاشرے کے مسائل سے تعلق رکھتی ہیں پنجاب کا معاشرہ بنیادی طور سے زرعی اور جاگیردارانہ معاشرہ رہا ہے۔ وہاں کل آبادی کے کم بیش نوے فی صد حصے پر

جاگیردار اور بڑے کاشت کار قابض تھے اور چھیاسٹھ فی صد کسان صرف دس فی صد آراضی پر یا پھر جاگیرداروں کی مزدوری اور مرحمت کے سہارے گزر بسر کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد اصلاحات کے باوجود پنجاب میں زرعی نظام کا یہ تضاد کم نہیں ہوا۔ اس سے زیادہ اہم پاکستان میں غیر ملکی سرمایہ کی درآمد اور اس کی مدد سے مختلف علاقوں میں صنعتوں کا قیام اور قومی بورژوا طبقہ کا وجود میں آنا تھا۔ اس طبقہ کے مفاد اور اس کی ترقی اور بقا کا انحصار اس پر تھا کہ ملک کو جاگیرداری معیشت اور معاشرت سے نکال کر جدید ٹکنیکی اور سائنسی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ تاکہ زرعی پیداوار میں معتدبہ توسیع کے ذریعہ عوام کی قوت خرید بڑھے اور صنعت کاری اور صنعتی معاشرہ کی تشکیل کی رفتار تیز تر ہو۔ یہ عمل جاری ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ پاکستان کے مخصوص سیاسی حالات اور اسلامی مملکت کی تحریک کے زیر اثر جو فطری طور پر جاگیردارانہ معاشرہ کی قدامت پسندانہ قدروں کو عزیز رکھتی ہے۔ اس کی رفتار سست رہی۔ بہرحال ہمارے مقصد کے لیے اتنا کافی ہے کہ ان حالات میں شہر اور گاؤں کی معاشی اور تہذیبی زندگی کی ہر سطح پر فرد کی کشمکش تیز تر ہوتی گئی۔

ندیم کی کہانیوں میں اس کشمکش کا مطالعہ ایک حقیقت پسند انسان دوست شعور کا مطالعہ ہے۔ تقسیم سے اب تک ملک میں پیدا ہونے والی ہر صورت حال پر غور کرتے ہوئے ندیم نے انسان دوستی کے اس بلند نصب العین کو عزیز رکھا۔ خواہ وہ فرقہ وارانہ کشت و خون ہو۔ مہاجرین کی المناک زندگی کے مسائل ہوں۔ کسان اور جاگیردار کی جنگ ہو۔ سیاسی عدم استحکام کی لغزشیں ہوں یا مغربی سرمایہ کے ساتھ اس کے ذہن و احساس اور کلچر کی یلغار ہو۔ اس کے ثبوت میں 'گرداب'، 'سیلاب'، 'در و دیوار'، 'بازار حیات'، 'برگ حنا' کی بیشتر کہانیاں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کہانیوں میں ندیم نے جاگیردار اور ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقہ کے رخ سے نقاب اتار کر اس کی بہیمیت کو عریاں کر دیا ہے۔ یہاں اس کی انسان دوستی محنت کش طبقہ کی طرف داری اور حمایت کا واضح تصور پیش کرتی ہے۔ مثال کے طور پر 'موچی' میں (جو آزادی کے سات سال بعد کی تصنیف ہے) گاؤں کا موچی نادر اپنے ہنر میں کمال رکھتا ہے لیکن مفلس و محتاج ہے۔ اتنا بھی نہیں کہ اپنی شادی کے موقع پر اپنے لیے زری کا ایک جوتا بنا لے۔ رات رات بھر جاگ کر وہ راجہ شیر خان کے حکم پر ان کے لیے ایک کمر جوڑی تیار کرتا ہے اور جب شیر خان سے صرف ایک دن کے لیے وہ زر تار جوتا مستعار دینے کی درخواست کرتا ہے تو راجہ غیظ میں آ کر چیختا ہے۔ "میرا جوتا میرے پاؤں اور کمینوں کے سروں کے لیے ہوتا ہے ...... جی چاہتا ہے اسی جوتے سے چمڑی ادھیڑ ڈالوں اس کی۔ کتا کمینہ اور پھر ایسا حوصلہ کیا تو چمڑا کے ڈال دوں گا۔" لیکن میر ندیم نے چوہدری صاحب راؤ صاحب جیسے ایک بزرگ ہو۔ ناکی سیرت اور روپے کو جو امرا اور معززین شہر سے تعلق رکھتے ہیں اس مہارت سے پیش کیا ہے کہ ان کے طبقہ کی ساری غلاظت اور جابرانہ بہیمیت بے نقاب ہو گئی ہے۔ اسی طرح 'زلیخا' کا الوزنا، 'نرم دل' کا سفاک میرزا، 'نعیم بیگ' کا سرمایہ دار، 'رئیس خانہ' کا عیار امیر، 'سفید گھوڑا' کا الیاس اور 'پاگل' کے راجہ صاحب جیسے ان گنت کردار ندیم نے تخلیق کیے ہیں جو کہانیوں میں اپنے زندہ وجود کے ساتھ اپنے طبقہ کی ساری ذہنی اور نفسیاتی فضا کو سمیٹ لاتے ہیں۔

یہاں میرا مقصد ندیم کو ایک ترقی پسند فن کار ثابت کرنا نہیں بلکہ اس کی شخصیت اور شعور کے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ہے جو اس کے فن کی شعریت میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ بے شک ایک فن کار کی حیثیت سے ندیم کی بڑائی اور

کمال کے دوسرے پہلو بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کے بیشتر افسانوں کی بنیاد کوئی نفسیاتی گرہ ہوتی ہے جسے وہ انسانی سیرت کے نہاں خانوں میں بڑی ہنرمندی اور ژرف بینی سے دیکھتا، اس کا تجزیہ کرتا اور آخر میں کھولتا ہے۔ لیکن اس نفسیاتی حقیقت کے گرد جو عام ذہنی اور سماجی فضا ہوتی ہے اس نفسیاتی گرہ کے کھلنے سے اکثر اس کا طلسم بھی کھل جاتا ہے۔ یہی ندیم کے فن کا وہ منفرد انداز ہے جو اسے دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔

کسی تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرہ اور بدلتی ہوئی معیشت کی ایک بڑی خصوصیت فرد کی آرزومندی کا وجود جسارت عمل کا امکانی اظہار ہوتا ہے۔ وہ بدلتے ہوئے حالات میں اپنے لیے ایک بہتر اور بلند تر مقام حاصل کرنا چاہتا ہے جو اسے سماج میں زیادہ آسودگی، عافیت اور عزت بخشے۔ یہ آرزومندی اور مقصد آفرینی اس کے جوش عمل کو مہمیز کرتی ہے۔ اپنی محنت اور کس بل سے خوابوں کو حقیقت بنانے کا جذبہ ایک ایسی مثبت اور مبارک قدر ہے جسے ندیم نے اپنی کہانیوں میں نمایاں اہمیت دی ہے۔ ایک طرف اگر وہ جاگیردارانہ معاشرہ کی بوسیدہ اور بے جان قدروں کو بے حجاب کرتا ہے تو دوسری طرف نئی طلوع ہوتی ہوئی قدروں کو لبیک کہتا ہے۔ "موچی" کے نادر کی طرح "شیش محل" کا اللہ بخش بھی موچی ہے۔ نادر اگر اپنے ہزاروں تھک محنت سے گھر بسانے کی آرزو کرتا ہے۔ تو اللہ بخش گھر بنانے کی۔ اس سے پچھلے دور کی ایک کہانی "پکا مکان" میں بھی بارُو گھر بسانے اور گھر بنانے کا خواب دیکھتا ہے اور اس مقصد کے لیے اپنی زندگی تج دیتا ہے۔ اس طرح کی کہانیاں اور کردار ندیم کے یہاں کچلے ہوئے انسانوں کے نئے عزائم اور نئی تعمیری فضا کی علامت بن جاتے ہیں جو اس کے شعور حیات اور جمالیاتی طرز فکر کا ثبوت ہیں سماجی اور تہذیبی سطح پر اس معاشرہ میں مرتی اور ابھرتی ہوئی قوتوں اور قدروں کی کشمکش کے مرقعے ندیم نے "جب بادل امڈے"، "الحمدللہ"، "کفن دفن"، "بندگی"، "بیچارگی"، اور "پاگل" جیسی بے مثل کہانیوں میں پیش کیے ہیں۔

ندیم کی کہانیوں میں چند خاص طرح کی منفرد لیکن علامتی سیرتیں بار بار ابھرتی ہیں اور ان سے وہ بڑا کام لیتا ہے۔ مثلاً نیم دیوانی سڑی عورتیں اور مرد۔ کم سن معصوم بچے۔ لڑکیوں، ووٹوں اور محکمۂ بکاری کے دلال۔ جوان بیٹیوں کی فکر کرنے والے ماں باپ اور بوڑھے والدین کی سرپرستانہ قیود سے باغی نوجوان ...... یہ سب مل کر ندیم کی کہانیوں میں بدلتے ہوئے معاشرہ اور اس کی آویزش کی بڑی موثر واقعاتی تصویریں بناتے ہیں۔ اور ان کے پیچھے ندیم کی بے مثل دردمندی اور اس کے تجربات کی شدت جھلکتی نظر آتی ہے۔

مثال کے طور پر نیم دیوانی عورتیں، باسڑی اور سنکی بوڑھیوں کو لیجیے۔ یہ ندیم کی وہ مخلوق ہے جس کی روح اتھاہ دکھوں، محرومیوں اور جانکاہ صدموں سے نڈھال اور زخموں سے چور ہے۔ جو گردوپیش پھیلی ہوئی بہیمیت شیطنت درندگی اور سفاکی کی تاب نہ لاکر اپنے ہوش و حواس کا ایک حصہ گنوا بیٹھی۔ لیکن اس کے باوصف ان کی روح میں محبت انسانیت اور غیرت و حمیت کی شمع ٹمٹماتی رہی "جلسہ" کا بوڑھا کسان "میں انسان ہوں" کا واحد متکلم پرمیشر سنگھ، "پرمیشر سنگھ" اور "بابو نور" کا بابا نور، اسی نیم دیوانگی کے نمونے ہیں۔ بابا نور بھی "وحشی" کی غیور بڑھیا کی طرح ندیم کی غیر فانی تخلیق ہے وہ ہر روز صبح اپنے گاؤں سے پاس کے ڈاک خانہ جاتا ہے محض یہ پوچھنے کے لیے کہ اس کے بیٹے کی کوئی چٹھی آئی یا نہیں۔ اس کہانی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"ڈاک خانے چلے بابا نور" دکان کے دروازے پر کھڑے ہوئے ایک نوجوان نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا۔ جیتے رہو" بابا نور نے جواب دیا۔

پاس ہی ایک بچہ کھڑا تھا۔ تڑاک سے تالی بجا کر چلایا۔

"آ بابا بابا بابا نور ڈاک خانے چلا"

"بھاگ جا یہاں سے" نوجوان نے بچے کو گھُرکا۔ اور بابا نور جو کچھ دور گیا تھا پلٹ کر بولا۔ "ڈانٹتے کیوں ہو بچے کو۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ ڈاک خانے ہی تو جا رہا ہوں۔"

"دور دور سے دوڑ کر آتے ہوئے بچے یہاں سے وہاں تک بے اختیار ہنسنے لگے۔ اور بابا نور کے پیچھے ایک جلوس مرتب ہونے لگا۔ مگر آس پاس سے کچھ نوجوان لپک کر آئے اور بچوں کو گلیوں میں بکھیر دیا۔

بابا نور اب گاؤں سے نکل کر کھیتوں میں پہنچ گیا تھا۔ پگڈنڈی منڈ منڈ جاتی ہوئی اچانک ہرے بھرے کھیتوں میں اتر جاتی تھی تو بابا نور کی رفتار میں بہت کمی آ جاتی ہے۔ وہ گندم کے نازک پودوں سے پاؤں ہاتھ اور چوسے کے دامن بچاتا ہوا چلتا۔ اگر کسی مسافر کی بے احتیاطی سے کوئی پودا پگڈنڈی کے آرپار لیٹا ہوا ملتا تو بابا نور اسے اٹھا کر دوسرے پودوں کے سینے سے لپٹا دیتا اور جس جگہ سے پودے نے خم کھایا تھا اسے کچھ یوں چھوتا جیسے زخم سہلا رہا ہے۔ پھر وہ کھیت کی میڈ پر پہنچ کر بہت تیز چلنے لگتا ہے۔"

کہانی اسی نرم و لطیف دھیمی فضا میں آگے بڑھتی ہے (میں یہاں ندیم کے دیہاتی احساس، مشاہدے کی باریکی اور محاکاتی قوت کا ذکر نہیں کروں گا) بابا نور کسی کسان کی بیٹی کی پتنی کی ہوئی لسی پیتا۔ کسی کو دعائیں دیتا اور کسی کی خیریت پوچھتا ڈاک خانہ پہنچ جاتا ہے اور ڈاک منشی سے اپنی ڈاک کے بارے میں پوچھ کر خاموشی سے لوٹ جاتا ہے۔ اس افسانہ کی آخری سطریں ملاحظہ ہوں۔

پھر منشی بولا۔ "آج دس سال سے بابا نور اسی طرح آ رہا ہے۔ یہی سوال پوچھتا ہے اور یہی جواب لے کر چلا جاتا ہے۔ بیچارے کو یہ یاد ہی نہیں رہا کہ سرکار کی وہ چٹھی بھی تو میں نے ہی اسے پڑھ کر سنائی تھی جس میں خبر آئی تھی کہ اس کا بیٹا برما میں بم کے گولے کا شکار ہو گیا جب سے پاگل سا ہو گیا ہے۔ پر خدا کی قسم ہے دوستو۔ اگر آج کے بعد وہ پھر بھی میرے پاس پوچھنے آیا تو مجھے بھی پاگل کر جائے گا۔"

اس کہانی میں ندیم نے بابا نور کی دیوانگی سے جو رقت اور لطف پیدا کی ہے وہ میر کی یاد دلاتی ہے ؎

خوش ہیں دیوانگیٔ میرؔ سے سب

کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

ندیم ڈاک خانہ تک پہنچتے پہنچتے بابا نور کو قاری کے دل سے اتنا قریب لاتا اور مانوس کر دیتا ہے کہ بابا نور کا المیہ اسے اپنے ہی کسی عزیز کا المیہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ فنی چابک دستی کا کرشمہ ہے۔

مظفر علی سید نے شاید اسی لیے کہانی کو ندیم کے بہترین افسانوں میں شامل نہیں کیا کہ یہ جنگ کے خلاف پروپیگنڈہ کرتی ہے اور پروپیگنڈہ موضوع کے لباس میں [illegible] ہیں اس کی روح کو بھی جھنجھوڑ دیتا ہے۔

"سپاہی بیٹا" میں جموں کی ماں بابانور کا نسوانی روپ ہے جس کے اکلوتے بیٹے کی موت کی خبر رنگون سے آئی تھی۔ اور پھر "ہیرا" کا دریام جو ایام پیرسے واپس آکر بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ اسے جنون کے دورے پڑتے ہیں، وہ ناکارہ ہوجاتا ہے اس کی بیوی بچے فاقے کرتے ہیں۔ اور ایک دن اسی مجذوبی کیفیت میں وہ اپنے دوست اور سپاہی نواز کو یاد کرتا ہے جو مورچہ میں اس کے ساتھ لڑا تھا اور گولہ باری کے بعد جب وہ اس کی خبر لینے پیٹ کے بل رینگتا ہوا اس کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ سر کے سوا اس کے سارے جسم کو جیسے کسی نے بوٹیاں بوٹیاں کاٹ کر ڈھیر لگا دیا تھا۔ پھٹا ہوا چمڑا دھجی دھجی بنا بکھرا ہوا پڑا تھا۔ اور ایک طرف اس کا سر پڑا تھا۔

چاند کی طرح پیلا اور معصوم سا۔ جانے موت کے بعد نواز کا چہرہ بچے کے چہرے کی طرح چھوٹا سا اور بھولا بھالا سا کیوں ہوگیا تھا اور تب اسے ایسا لگا کہ نواز نہیں مرا بہرام، اس کا بیٹا مرگیا ہے۔

"دار و رسن" میں نھتوں کی ماں ہے جو اپنے تصور کی آنکھوں سے موت کا وحشیانہ منظر دیکھ کر پاگل ہوجاتی ہے۔ ان نیم دیوانے کرداروں کے ذریعے ندیم صرف یہ نہیں بتاتے کہ پچھلی جنگِ عظیم کے سب سے گہرے گھاؤ برصغیر میں پنجاب کے کسانوں کے سینے میں لگے تھے وہ بربریت اور بہیمیت کے خلاف (خواہ وہ کسی روپ میں ہو اور کہیں ہو) اپنے سینے کی ساری نفرت، آگ، اور اذیت قاری کے سینے میں منتقل کردیتے ہیں۔ ان کرداروں کی نیم دیوانگی سربرہنہ انسانیت کے لیے خود ندیم کی دیوانگی کا عکس ہے۔

ندیم حقیقت نگاری کی اس اعلیٰ روایت کا محافظ اور معمار ہے۔ جس کی تشکیل اور آبیاری پریم چند نے کی تھی پریم چند نے زندگی سے اپنی ہمہ گیر دلچسپی کی وجہ سے اردو میں افسانہ کے فروغ کی بے شمار راہیں دکھائیں۔ آج اردو افسانہ میں جہاں بھی حسن اور حقیقت کا جو بھرپور چمک اٹھا ہے وہ پریم چند کی ہی دین ہے۔ انھوں نے پہلی بار گاؤں کی زندگی اور کسانوں کی متحرک اور جاندار تصویریں پیش کیں۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ ایک مدت تک زرعی جاگیردارانہ نظام کی بعض قدروں کو رواداری، سادگی، شرافتِ نفس، محبت اور ایثار و اخوت کا نام دے کر اپنے سینے سے لگائے رہے۔ سماجی بے انصافی، طبقاتی جبر، ضعیف الاعتقادی اور معاشی استحصال کے خلاف جہاد کرنے کے باوصف وہ گاؤں کی زندگی اور کسان کے کردار میں یہ مثالی اوصاف ضرور تلاش کر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ "گئودان" کا ہوری بھی جاگیردارانہ معاشرہ کے ان اوصافِ حسنہ کا مجسمہ ہے۔ نہ صرف یہی نہیں اپنی کہانیوں اور ناولوں کے آخر میں وہ غیر فنکارانہ اور غیر نفسیاتی طور پر اپنے بعض کرداروں میں تبدیلی یا قلبِ ماہیت کرکے اپنے مثالی اوصاف پیدا کردیتے تھے اور اس طرح ان کے اجتماعی شعور اور انفرادیت پسندانہ اصلاحی نقطۂ نظر کا تضاد نمایاں ہوجاتا تھا۔

ندیم کے ابتدائی دور کے بعض افسانوں میں یہ انداز نظر ملتا ہے۔ لیکن اس کے شعور کی بیداری اور نفسیاتی درک نے جلد ہی اس پر قابو پا لیا اور اسے قدروں، طبقاتی، رواجی اور اضافی کردار کی بصیرت بخشی۔

طلوع و غروب، کے دیباچے میں ندیم لکھتے ہیں:

"پنجاب کی سرزمین میں ایک ایسی جماعت بھی آباد ہے جو باسی روٹی اور پیاز سے پیٹ بھر کر بھی طاقتور رہ سکتی ہے . . . . جس کی زندگی کا ہر لمحہ سرمایہ داروں اور زمینداروں کے

حکم کا تابع ہے ۔ لیکن جسے شرافت اور عصمت کی حفاظت کے لیے اپنا سر کٹا دینے میں کوئی تامل نہیں ۔"

یہ بات ندیم نے اپنے وطن کی سرزمین یعنی شمالی مغربی پنجاب کے لوگوں کے بارے میں کہی ہے اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ باوجود افلاس کے غیرت، آبرو اور آن پر مر مٹنے والی جماعت تھی ۔ اس کا کردار سرحدی قبائل کے حریت پسند جاں باز اور جری افراد کے کردار سے مشابہ تھا ۔ ندیم نے کبھی انسان کی حیثیت سے فرد کی سربلندی، احساسِ نفس اور آزادہ روی کا پہلا سبق وہیں سیکھا تھا جو بعد میں اس کی فکر کا اور سماجی فکر کا ایک روشن نقطہ بن گیا ۔ لیکن یہ تصور (اس کے افسانوں میں) زندگی کی حقیقتوں کے ادراک اور اظہار میں مانع نہیں ہوا ۔ اس لیے کبھی وہ متغیر پذیر معاشرہ میں فرد کے طبقاتی کردار پر ہی نہیں انفرادی اور نفسیاتی کردار پر بھی یکساں نظر رکھتا ہے ۔

مذکورہ مجموعہ کی پہلی کہانی "طلوع و غروب" کی نرگس جو پنجاب کی الھڑ کسان دوشیزہ ہے ۔ شہر کے ایک رئیس غضنفر کی ہوس کاری کا شکار ہو کر عصمت فروشی پر مجبور ہو جاتی ہے اور پھر "بدنام" کی نوراں، "نرم دل" کی تاجو، "نامرد" کی لاڈلی "رئیس خانہ" کی مرباں اور "سفید گھوڑا" کی بلقیس، ہیں جو حالات کے جبر سے عصمت و آبرو کا سودا کرنے پر آمادہ ہوتی ہیں اور کبھی سر نہیں کٹاتا ۔ اور ندیم کے دل میں ان کے لیے نفرت یا حقارت نہیں بلکہ ہمدردی اور محبت کے جذبات ہی امنڈتے دکھائی دیتے ہیں وہ انھیں "سنگ ساری" کا نہیں ہمدردی اور دلجوئی کا سزاوار سمجھتا ہے ۔ اس سے ان کی معصومیت اور شرافت پر کوئی حرف نہیں آتا ۔ اس لیے کہ یہ کردار اپنی اس آلودگی اور اس تعفن خیز تاریکی کے خلاف امکانی جدوجہد سے دریغ نہیں کرتے جس میں وہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں ۔ "بدنام" کی نوراں عصمت فروشی اس لیے کرتی ہے کہ اس کا شوہر بے روزگار ہو جاتا ہے اور جب اس کا بچپن کا رفیق اور ہمسایہ اس کی عسرت کا حال جان کر اسے ایک روپیہ روز دیتا ہے تو وہ پیشہ ترک کر دیتی ہے اور آخر میں اس کا دس روپے کا نوٹ یہ کہہ کر واپس کر دیتی ہے کہ اب اس کی ضرورت نہیں اب میرا گھر والا نوکر ہو گیا ہے ۔"

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ندیم زندگی کے کریہہ اور تاریک پہلوؤں کو اہمیت دیتا ہے ۔ طبقاتی سماج میں ہر طرف تاریکی، بہیمیت اور مجرمانہ سرگرمیوں کے سوا ہے بھی کیا ؟ دولت کی غلط تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والے حالات اور رشتے ہر قدم پر انسان، روح و ضمیر کی گراں باری اور پامالی کا منظر پیش کرتے ہیں ۔ ندیم کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اس پر آشوب زندگی کے تضادات کی مصوری کرتے ہوئے اس بلند تر زندگی اور اس معصوم انسان کا ایک تصور بھی دیتا ہے جو انصاف، آزادی اور روحانی پاکیزگی کا مظہر ہیں ۔ اس اعلیٰ یا برگزیدہ انسانی زندگی کے بارے میں ندیم کا تصور یا نقطۂ نگاہ فنی اعتبار سے اس کی کہانیوں کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتا ہے ۔

جیسا کہ شروع میں کہا گیا ندیم کی نظموں کی طرح اس کی کہانیاں بھی اس کے شخصی تاثر یا تجربہ کا فنکارانہ اظہار ہیں اس تاثر یا تجربہ کا محرک کوئی واقعہ بھی ہو سکتا ہے کردار بھی اور کوئی سماجی یا نفسیاتی صورت حال بھی جسے اس نے شدت سے محسوس کیا ہو ۔ احساس و تاثر کی اس شدت کی وجہ سے ندیم کے متعدد افسانے اپنی جذباتی فضا مصورانہ کیفیت اور شاعرانہ اسلوب کے اعتبار سے رومانی نظم معلوم ہوتے ہیں اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بعض افسانوں میں اس کی شاعرانہ

شخصیت کا غلبہ حقیقت کے احساس کو مجروح کرتا ہے۔ ایسی کہانیوں کی جذباتی اور تخیلی فضا کہانی ختم کرنے کے بعد ذہن سے محو ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ کمزوری ۱۹۵۲ء کے بعد کے افسانوں میں شاذ ہی دکھائی دیتی ہے۔

دراصل ندیم کی یہ معذوری اس کی کمزوری بھی ہے اور بڑائی بھی کہ وہ اپنی کہانی سے اپنے آپ کو جدا نہیں کرتا۔ اس لیے کہ وہ کہانی لکھتا ہی اس وقت ہے جب وہ کچھ کہنے کے لیے بے چین ہوتا ہے۔ جب وہ قاری کو کچھ دینا چاہتا ہے منٹو کسی کے لکھے ہوئے ایک فقرہ یا جملے کو آگے بڑھا کر آن کی آن میں افسانہ لکھ سکتا تھا۔ اس لیے کہ اس کو بات سے بات پیدا کرنے، کہانی گھڑنے اور اسے ایک ڈرامائی موڑ تک لے جانے کا گر آتا تھا۔ مشق نے اس قدرت میں اضافہ کیا تھا۔ اس طرح کے افسانوں میں ایک معروضی اور غیر جذباتی انداز نظر اختیار کرنا نسبتاً آسان اور امکانی تھا۔ ندیم کے احساس و تاثر کی شدت ضبط کی کوشش کے باوصف (اگرچہ مجھے شک ہے کہ منٹو کی بہترین کہانیاں طنز سے عاری ہیں اور طنز جذبہ کی شدت اور تلخی کا بے مایہ اظہار ہے) افسانہ کی تراش اور تعمیر میں تحلیل ہو جاتی ہے اور نتیجہ میں وہ اپنی اکثر کہانیوں میں کہیں نہ کہیں بیٹھا نظر آتا ہے۔ فن کار اگر اپنے فن میں موجود نہ ہو تو کہاں ہوگا؟ وہ فن کار جو اپنی تخلیقات میں معروضی یا "نیچرلزم" قسم کی واقعہ نگاری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اپنے ایک ایک لفظ میں موجود ہوتے ہیں۔ سوال فن کار کی موجودگی یا عدم موجودگی کا نہیں اس کا ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اسے افسانہ کے تاروپود (TEXTURE) میں کس سلیقہ سے سموتا ہے۔ اس سلیقہ کا نام فنی بصیرت اور اس کے عملی اظہار کا نام ٹکنیک ہے۔

ایک انگریز افسانہ نگار خاتون نے لکھا ہے کہ ناول اگر شادی شدہ بھری پری زندگی ہے۔ تو افسانہ عشق کا تیر ہے جو لگتے ہی دل کو چیر جاتا ہے۔ پریم چند نے فنی پہلو پر نظر رکھ کر اس بات کو یوں کہا ہے کہ "افسانہ دھرپد کی وہ تان ہے جس میں فن کار محفل شروع ہوتے ہی اپنی تمام صلاحیتیں دکھا دیتا ہے" دونوں نے افسانہ میں تاثر کی وحدت اور اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ افسانہ کا افسوں کسی ایک نقطہ کے گرد ہی جاگتا ہے۔ فضا کی تخلیق اشخاص، عمل اور مکالمے وغیرہ محض ایک ..... وسیلہ ہوتے ہیں قاری کی توجہ کو جذب کرنے اور اس نقطہ کی طرف کھینچنے کا۔ اس عمل میں باکمال فن کار ابتدائی سطروں سے ہی قاری کے اندر دلچسپی پیدا کرتا پھر اس کا اعتماد حاصل کرتا، اس کے تخیل کو اکساتا، جذبہ، تعمیر کو جگاتا، احساسات کو مرتعش کرتا اور ذہن کو روشنی بخشتا ہے۔ اور ان سارے عناصر کے تناسب اور موزونیت کا نام جمالیاتی تکمیل ہے۔

ندیم کے افسانے فن پر اسی قدرت کے شاہد ہیں۔ وہ بعض دوسرے ممتاز افسانہ نگاروں کی طرح اپنے تخیل کے رنگین اور سرکش دھارے میں بہتا نہیں۔ اس پر گرفت رکھتا ہے اور اس سے کام لینے کا ہنر جانتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے احساس و تاثر کی شدت کو افسانہ کے تارو پود میں ضبط و توازن سے سموتا ہے۔ جو حضرات (مثلاً انتظار حسین) ندیم کی کہانیوں میں جذباتیت کا شکوہ کرتے ہیں ان کو دراصل شکایت یہ ہوتی ہے کہ ندیم اپنے قارئین کے دلوں میں اس سماجی نظام کی بہیمیت اور ان طبقوں کے خلاف جو اس کے ذمہ دار ہیں بیزاری اور نفرت کیوں پیدا کرتا ہے۔ یہ فریضہ تو سماجی اور سیاسی مدبروں اور قائدوں کا ہے۔ اور شاید انھیں یہ شکایت بھی ہے کہ وہ اتنا بڑا فریضہ انجام دینے کے باوصف اتنا محبوب اور بڑا فن کار کیوں مانا جاتا ہے۔

یوں تو ندیم کی کہانیوں میں ماحول بھی کرداروں سے کم دلچسپ نہیں ہوتا اور بعض کہانیوں میں یہ احساس بھی ہوتا ہے

کہ ماحول ہی سب سے دلچسپ تہ دار اور موثر کردار تھا۔ مثال کے طور پر طلوع و غروب، پکا مکان، زلیخا اور تسکین، جیسی کہانیاں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کی بہترین کہانیاں وہی ہیں جن میں ماحول کرداروں میں اور کردار کہانی میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔ ایسی کہانیوں میں کردار ماحول سے زیادہ زندہ اور متحرک ہوتے ہیں۔ ان کی داخلی حشر خیزی قاری کو زیادہ شدت سے متاثر کرتی ہے اور ایسے کردار اپنی واقعیت اور قوت سے وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جو ندیم کہنا چاہتا ہے۔ مثلاً "تسکین" کا غفور جو متوسط طبقہ کی بڑھتی ہوئی معاشی الجھنوں کے ساتھ ساتھ اس کی کھوکھلی "اقدار، نمائشی، امارت، جھوٹی عزت اور وضع داری کی علامت بن گیا ہے۔ اس کو ندیم نے جس مہارت سے ایک جیتا جاگتا انفرادی پیکر دیا ہے اور جس خوبی سے اس کے ظاہر اور باطن، فریب اور حقیقت کے تضاد کو ابھارا ہے وہ اس کے فن کا کمال ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ جیسے جیسے اور جس سرعت سے پاکستانی معاشرہ میں فرد کی کشمکش بڑھی اس کی اہمیت میں اضافہ ہوا، اسی نسبت سے اس کا کردار بھی زیادہ پیچیدہ ہوتا گیا۔ ہر اچھے فن کار کی طرح ندیم کا حساس تخلیقی ذہن بھی اس بڑھتی ہوئی کشمکش کی نبض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدلتی ہوئی نفسی اور نفسیاتی حقیقتوں پر اس کی گرفت نے انسانوں کو زیادہ دلکش اور مؤثر بنا دیا ہے۔ "وحشی" کی بڑی لیکن غیرت مند بڑھیا۔ "جن والش" کے ماسٹر پولس اور ہیلن، "آئینہ" کی ماسی نشو۔ "کھمبا" کے شیخ جی اور "سلطان" کا سلطان یہ اور ایسی ان گنت کہانیاں ہیں جن کی بنیاد کسی ایک کردار کے تجزیہ نفس پر ہے۔ یہ کردار قاری کو متاثر ہی نہیں کرتے۔ اس پر ایک طبقاتی معاشرہ میں مسخ ہونے والی انسانی فطرت اور انسانی کردار کے اسرار بھی کھولتے ہیں۔

ندیم نے ایسی کامیاب کہانیاں بھی لکھی ہیں جن میں فضا کا احساس اور ایک واقعہ کا مؤثر اظہار ہی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ان کہانیوں میں بھی ندیم کی ژرف بینی نے ایسی سیرتیں تراشی ہیں جو ایک دوسرے سے الگ پہچانی جاتی ہیں۔ ندیم ان کی شبیہ کا، ان کے حسی اور جذباتی وجود کا کوئی ایک گوشہ ایسی ایمائی قوت سے دکھاتا ہے کہ قاری کے ذہن میں وہ نقش پھیل کر فضا سے باہر بھی اسے چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ لیکن یہ قدرت ندیم کو پریم چند کی طرح صرف گاؤں یا متوسط طبقہ کے اشخاص کی سیرت نگاری میں حاصل ہوئی ہے۔ اعلیٰ اور بورژوا طبقہ کی سیرتیں ندیم کے یہاں بھی اسی طرح بے کیف اور تخیلی ہو جاتی ہیں جس طرح پریم چند کے یہاں۔ اور یہ ایسی بدیہی حقیقت ہے جسے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔

پریم چند کی طرح ندیم کو بھی اس پر اصرار ہے۔ "دنیا کی ہر عورت کسی کی بیٹی، بیوی بہن یا ماں ہوتی ہے۔ اس پہ اسی کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ ان کے دوستوں کا بیان ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی میں بھی کچھ ایسے ہی "اخلاقی انسان" واقع ہوئے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنی کہانیوں میں بے حجاب ہونے والا ندیم نسوانی حسن کی پرستش کرتا ہے۔ وہ حسن کو خیالی نہیں مادی پیکر میں تلاش کرتا ہے۔ اس کے باطنی وجود میں ایک کشمکش ضرور ہے۔ شاید جسم اور روح کے تقاضوں کی بشریت کی ترغیب اور انسانیت کی تہذیب کے اساسی آدرشوں کی۔ لیکن کم از کم فن کی سطح پر اس کشمکش میں جسم اور بشری جذبہ ہی غالب نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں ممکن ہے ان کی بعض ناکامیاں اور محرومیاں (جن کا ذکر طفیل صاحب نے کیا ہے) ذہن و احساس کی الجھنیں بن کر دبے پاؤں ان کے فن پر اثر انداز ہوئی ہوں۔ مجھے وہ اپنے ان گنت کرداروں کی اوٹ میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اور ایسا لگتا ہے کہ ان کے پردے میں انھیں خود اپنا اور اپنے تجربات کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر "جوانی کا جنازہ" کا

غونث، طلوع و غروب کا سنبل، نامرد، کا سلیم میاں، "کھمبا" کے شیخ جی، سفید گھوڑا، رؤف اور ایسے ہی دوسرے کردار ان کہانیوں اور کرداروں میں ندیم اپنی شخصیت اور تجربات کی ان تہ نشین لہروں کو بے حجاب کرتے ہیں جو انھیں بے چین رکھتی ہیں اور جو شاید دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ صرف یہی نہیں ندیم کی کہانیوں میں لفظی تصویروں یا تمثالوں کا مطالعہ بھی ان کی شخصیت کی بعض تہوں کو کھولتا ہے۔ یوں تو ان کی جمال پرستی اور حسیت ———— (SENSUOUSNESS) تمام تمثالوں میں رنگ بھرتی ہے۔ لیکن جب کسی نوخیز الھڑ دوشیزہ کی کافر جوانی کا ذکر آتا ہے تو ندیم کے تخیل اور قلم میں ایک نشاط آفریں جولانی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بھی محض اتفاق نہیں ہے کہ ندیم کے نسوانی کردار مردانہ کرداروں کے مقابلہ میں زیادہ دل کش اور موثر اور زیادہ گہرے مشاہدہ اور مہارت سے تراشے ہوئے کردار ہیں۔ اس کی کئی کہانیوں میں ایسے مواقع آتے ہیں جب ماں باپ اچانک یہ دریافت کرتے ہیں کہ ان کی بیٹی جوان ہو گئی ہے ایسے میں بظاہر والدین کی نگاہوں سے لیکن دراصل خود اپنی نگاہوں سے ندیم جوانی اور جسم کی نوخیز اداؤں کو دیکھتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "بیٹے بیٹیاں" کا یہ حصہ۔

"ہادی کمھار رات بھر خنکی کے مارے گٹھری بنا پڑا رہا۔ صبح کو اٹھا تو اسے محسوس ہوا کہ کھری چارپائی پر کوئی سو تو ضرور رہا ہے لیکن وہ نازو نہیں ہے۔ وہ تو کوئی اور عورت ہے۔ نازو چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا کالا تہمد گھٹنوں تک چڑھ آیا تھا اور چھینٹ کا کرتا اس کے جسم پر کچھ یوں کس گیا تھا جیسے اس نے ایک بھی گہری سانس لی تو جگہ جگہ سے مسک جائے گا۔ نازو کی چوٹی اس کی گردن کے ارد گرد سانپ کی طرح لپٹ گئی تھی اور جو چادر اس نے اوپر اوڑھنے کے بجائے نیچے بچھالی تھی وہ زمین پر ڈھیر پڑی تھی۔

اچانک نازو نے ایک عجیب سی کروٹ لی۔ کروٹ لیتے ہوئے اس نے جسم کو چارپائی کے موٹے بان کے ساتھ اتنی سختی سے رگڑا کہ بان چھر چھر بول اٹھا۔ وہ دائیں طرف پلٹی۔ پھر الٹی ہو کر یوں کروٹ آ گئی۔ مگر رکی نہیں بلکہ پھر سے چت لیٹ گئی اور ہادی کمھار کو ایسا لگا جیسے نازو کے کرتے کا بٹن بتاشے کی طرح ٹوٹ کر اسے ننگا کر دے گا۔"

اسی مجموعے کی ایک دوسری کہانی "نصیب" کی یہ ابتدائی سطریں دیکھیے۔ ۔ ۔

"اس وقت رضیہ نے ہفتہ بھر کے چیکٹ کپڑے پہن رکھے تھے۔ لٹھے کی شلوار کے پائینچے بالکل سیاہ ہو رہے تھے۔ جمپر کا دامن صافی کی طرح میلا تھا اور بالوں نے اجڑ کر مانگ کو غائب کر دیا تھا۔ وہ ایک دیگچی کو بھگو بھگو کر دری کے حاشیے پر رگڑ رہی تھی۔ ہر رگڑ کے ساتھ اس کی آستین کہنی تک ہٹ جاتی تھی اور میلے ہاتھوں کے پیچھے اس کی کلائی کا صندل چمک چمک جاتا تھا۔ رئیسہ بیگم کو سب سے پہلے انہی سڈول بازوؤں نے رضیہ کی طرف متوجہ کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب پہلی بار رضیہ کے بازو کا کوندا لپکا وہ ذرا سی چونکی اور پھر رضیہ کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اسے نئے سرے سے پہچاننے کی کوشش

کررہی ہو —

اچھا تو رضیہ بیٹی یہ تم ہو! ———— یہ ہو تم ———— تمھاری جھکی ہوئی لانبی آنکھوں کے گوشوں میں سے یہ جگنو سے کیسے جھانک رہے ہیں۔ تمھارے بال ایک دم اتنے کیوں بڑھ آئے ہیں کہ فرش کو چھو رہے ہیں! یہ کیسے ننھے ننھے بھنور ہیں جو تمھارے گالوں میں بن بن کر ٹوٹ رہے ہیں۔ تمھارا جسم یوں بکھرا بکھرا سا کیوں لگتا ہے۔ جیسے تم نے جمپر پہننے کے بجائے سر پر رکھا ہوا اور بیٹی تمھاری جلد کیوں چمک رہی ہے! چمک نہیں رہی ہو تو تمھارے جمپر کے پیچھے یہ آگ سی کیوں جل رہی ہے:"

دوسری متعدد کہانیوں میں بھی اسی طرح کے لفظی پیکر مادی اور حسن کی بے نام اداؤں سے ندیم کی گہری وابستگی کا احساس دلاتے ہیں اور یہ وہ وصف ہے جو اس کی شاعری اور افسانہ میں نہ صرف مشترک ہے بلکہ نمایاں ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات کہیں کہ ندیم نے منٹو کی کہانیوں میں عورت کے جسم کے لذت انگیز بیان پر شدید اعتراض کیا ہے اور خود اس کی کہانیوں میں عورت باوجود لباس کے جس طرح عریاں نظر آتی ہے وہ لذت کے احساس سے عاری نہیں۔ اس حقیقت کی تردید ممکن نہیں۔ لیکن اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ ندیم کے یہاں اس طرح کی عریانی کبھی مقصود بالذات نہیں ہوتی وہ کہانی کا مرکزی نقطہ نہیں بنتی اور اکثر کہانی میں حسن کاری کا ایک وسیلہ یا جزو بن کر آرٹ کے موزوں و متناسب لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ جسم کی دل آویزی اور جنسی ہیجان پر نظر رکھتا ہے۔ لیکن جنسی مسائل کو وہ سماجی مسائل سے الگ کر کے نہیں دیکھتا۔ وہ منٹو کی طرح "عورت کو صرف شہوت کا مجسمہ" نہیں سمجھتا۔ اس کا وجود ندیم کے نزدیک ان گنت جذباتی ذہنی اور سماجی رشتوں سے عبارت ہے اور کہانی کے مجموعی تاثر میں یہ رشتے ہی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں

لفظی پیکروں یا تمثالوں کے نقطۂ نگاہ سے ندیم کی شاعری کی طرح افسانوں کا مطالعہ بھی اس کی شخصیت کے بارے میں دلچسپ حقائق کا انکشاف کرتا ہے۔ مثلاً کھیتوں کی ہریالی ابھرتا ہوا سورج پہاڑوں کی چوٹیاں اندھیری راتیں چھپتے ہوئے جگنو، چاند اور تارے اور اگر کچھ نہیں تو بھی (مکمل تیرہ و تاریک رات، ندیم کی کہانیوں میں شاذ و نادر ملتی ہے) موسیقی اور اس کے تلازمات اور بادل بار بار اس کے افسانوں میں ابھرتے ہیں۔ اور یہ سب ندیم کے دہقانی احساس و نظر اس کی بے مثل رجائیت، بلند نگاہی اور گرد و پیش کی زندگی اور فطرت سے اس کے گہرے رابطوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ندیم کی اکثر کہانیوں میں زندگی کا کوئی ایک واقعہ ہی اپنی گہرائی اور شدت کے اعتبار سے قاری کو متاثر کرتا ہے لیکن اس نے ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جن کا مجموعی تاثر اکثر ایسا نہیں ہوتا کہ اسے آسانی سے بیان کر دیا جائے۔ اس تاثر کو اپنے وجود میں جذب کرتے ہوئے ایک باشعور قاری کبھی کبھی خود اپنے ذہنی تعصبات اور بعض اقدار کی قطعیت کے احتساب پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ تاثر محض آگہی یا روشنی نہیں دیتا، بلکہ روشن اور مسلم حقیقتوں کو دھندلا بھی دیتا ہے۔ یہ کہیں جواب کی صورت اختیار کرتا ہے اور کہیں سوالوں کی۔ بعض کہانیوں کی محدود اور مخصوص فضا اپنے گہرے تاثر اور رمزی قوت سے ایک لامحدود اور آفاقی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح کی کہانیوں میں مثلاً "پرمیشر سنگھ" "پاؤں کا کانٹا" "خون جگر" "الحمد للہ" "کھمبا" "مرد" اور "جن و انس" کا نام لیا جا سکتا ہے۔ "جن و انس" کو لیجیے۔ بظاہر یہ ایک عشقیہ کہانی ہے جس میں التزام

میراثن بانو سے عشق کرتا ہے - بانو ماسٹر لوئس سے - ماسٹر لوئس بیاں سے اور بیماں راجہ سے - چاروں اس بلاخیز جذبے کی دھیمی دھیمی آنچ میں خاموشی سے سلگتے رہتے ہیں - اور اس کے افسوں سے اس بھری دنیا میں خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں یہ عشق کا ازلی مثلث نہیں مربع ہے - ندیم نے اس کی توسیع کر کے جہاں کہانی کو روایتی عشقیہ افسانہ کے ڈھچر سے ہٹا کر اس میں حقیقت کا رنگ بھرا ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ یہ محض اتفاق کا المیہ نہیں عام انسانی زندگی کا المیہ ہے - انسانی سماج کا المیہ ہے - انسان کی تنہائی اکثر اس کے جذبۂ عشق کی گھٹن، ناآسودگی محرومی اور کرب کا نتیجہ ہوتی ہے - منشی اللہ یار کہتے ہیں :-

"اکیلے تو ہم جیسے ہوتے ہیں کہ گھر میں بیوی ہے - بچے ہیں - مگر باہر گلی میں آؤ تو جیسے پنجرے میں سے نکلے ہوئے"

اس لیے کہ

"ہم سماجی مقامات کے کھونٹوں سے ساتھ کتوں کی طرح بندھے ہوئے ہیں اور ہم زنجیر توڑ کر بھاگیں گے تو آوارہ کہلائیں گے"

یوں تو اس کہانی کا تاثر قاری کے دل میں متعدد سوالات پیدا کرتا ہے لیکن یہ سوال کہ کیا عشق دو انسانوں کے درمیان کشش، ارتباط اور جذباتی سطح پر دونوں کے باہمی ردعمل کے تواتر کا نام ہے یا اس سے ماورا اس جذبہ کی اپنی حقیقت ہے اپنا وجود ہے؟ کیا وہ جنسی جبلت کا تابع یا اس سے علیحدہ اپنی کوئی مستقل حیثیت رکھتا ہے؟ بنیادی اہمیت اختیار کر لیتا ہے اس طرح کے ابدی اور کائناتی مسائل بھی ندیم کی کہانیوں میں قاری کو سوچنے پر اکساتے ہیں - مواد اور موضوع کے اعتبار سے ندیم کی کہانیوں میں جو تنوع ہے تکنیک میں اتنا اور ایسا تنوع نظر نہیں آتا - بیشتر کہانیوں کا اسلوب بیانیہ ہے - ایک ہمہ دان راوی کی طرح وہ سادگی اور روانی سے اشخاص اور واقعات کے بارے میں بتاتا رہتا ہے - اس کے بعد واحد متکلم کے انداز میں لکھی جانے والی کہانیاں ہیں - کہانی کہنے کے یہ دونوں انداز افسانہ کی قدیم اور کلاسیکی روایت کا بنیادی جزو رہے ہیں جو افسانہ نگار کو اظہار و ابلاغ کی بیش از بیش آسانیاں فراہم کرتے ہیں - مثال کے طور پر "بازار حیات" اور "برگ حنا" کی ۲۳ کہانیوں میں سولہ بیانیہ، پانچ واحد متکلم کے انداز میں اور ایک "خونِ جگر" طویل مکتوب کی شکل میں ہے جو حقیقت میں واحد متکلم ہی کی ایک صورت ہے - ان کہانیوں کی تکنیک میں کوئی ایسی طرفگی، آراستگی یا پیچیدگی نہیں جو کہانی پڑھتے ہوئے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرے - ورنہ یہ ندیم کی کامیابی اور فن پر اس کی گرفت کا ایک بڑا ثبوت ہے - اگر ان کہانیوں کی سیدھی سادھی تکنیک اور فنی تکمیل کا قریب سے مطالعہ کیا جائے تو ندیم کی فن کاری کی مہارت، وقت نظر اور نزاکت کا احساس ہوگا اور اندازہ ہوگا کہ ان کی تکنیک اتنی سیدھی سادھی نہیں جتنی نظر آتی ہے -

دراصل، فسانہ میں فنی ضرورتوں کے احساس و شعور کے اعتبار سے ندیم نے اپنے تجربہ، مواد، موضوع اور نقطۂ نگاہ کی رہبری کے سوا، کسی ترغیب کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا - نہ ہی کسی غیر ملکی افسانہ نگار کی پیروی کی - اس کے فن کا عام اسلوب چیخوف اور گورکی کے فن کی ایک امتزاجی صورت ہے - ہندوستانی ادیبوں میں ندیم کی کہانیوں میں پریم چند، ٹیگور اور منٹو کے فن کا عکس نظر آتا ہے - گاؤں کسان اور محنت کش عوام کی زندگی سے ان کی بے شل گہری ہمدردی اور طبقاتی بصیرت اکثر پریم چند کی یاد دلاتی ہے - فطرت کے مظاہر سے دلچسپی، نازک اور لطیف انسانی جذبات کی تحلیل اور انسان کی ازلی معصومیت پر ایمان ایسے اوصاف ہیں جو ٹیگور کی کہانیوں میں نمایاں رہے ہیں - آخر میں فنکاری کے میدان میں ندیم کی متعدد کہانیوں کا آغاز عروج اور انجام منٹو کی مہارت فن کا عکس معلوم ہوتا ہے - یہ اثر پذیری جس حد تک بھی غیر شعوری معلوم ہوتی ہے اس سے ندیم کے فن کی انفرادیت، در قدر و قیمت کم نہیں ہوتی -

پروفیسر شریف کنجاہی

ندیم کے ترقی پسندانہ افکار

ہم میں سے ہر شخص کے کچھ مخصوص خدوخال ہوتے ہیں جو اسے پہچاننے اور اس کی شخصیت کو نمایاں رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔یہی خدوخال احمد شاہ قاسمی کو محمد بخش قاسمی میں خلط ملط نہیں ہونے دیتے۔اگرچہ انھیں خدوخال میں بعض ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جن سے احمد شاہ کو دیکھ کر ان کے بڑے بھائی محمد بخش ذہن میں آجاتے ہیں۔کسی حد تک یہی بات فکری دنیا میں ملتی ہے۔یہاں ہر کوئی اپنی سوچوں میں دوسروں سے مختلف اور منفرد بھی ہے لیکن کسی ایک مکتبِ فکر کا فرد بھی۔بعض باتوں میں اسی مناسبت کی بنا پر قاسمی صاحب کو ترقی پسند مصنفین کے گروہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ گروہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ان مصنفوں کا ہے جو زندگی میں ترقی کے خواہاں ہیں۔ترقی تبدیلی پیدا کرنے ہی کا ایک نام ہے اور تبدیلی کسی مقصد یا جہت کے بغیر ممکن نہیں۔اس مقصد اور جہت کا تعین وتصور حالات وواقعات کے مخصوص حدود اربعہ کی رعایت سے ہوا کرتا ہے جس سے تبدیلی کی خواہش یوں آہستہ آہستہ پھوٹنے لگتی ہے جیسے شاخ سے نئی کونپلیں ——

عرفِ عام میں ترقی پسند مصنفین سے وہ اہلِ قلم مراد تھے جو کسی حد تک وہی کچھ چاہتے تھے جسے کل سوشلزم اور آج کی اصطلاح میں اسلامک سوشلزم کہا جا سکتا ہے۔قاسمی صاحب اس کے ہراول دستے میں ہیں۔ ان کی شاخِ سخن کے پھول وہی رنگ روپ لیے ہوئے ہیں جو اس نخل کی دوسری شاخوں پر لگتے چلے آرہے ہیں "شعلۂ گل" اور اس سے پہلے کے مجموعۂ کلام "جلال وجمال" میں انھیں باتوں اور ان ہی مسائل کا تذکرہ ہے جن سے اکثر ہمارے کان اس تحریک کے آغاز سے آشنا تھے یا ہو رہے تھے۔ بایں تفاوت کہ "جلال وجمال" میں غالباً ان کا وہ کلام ہے جو پاکستان بننے سے پہلے تخلیق ہوا اور "شعلۂ گل" میں تقسیم ملک سے لے کر ۱۹۵۲ء تک کا۔ وقت اور حالات کے اس فرق کے سبب دونوں کے موضوع اور لہجے میں بھی فرق ہے جس میں کچھ دخل اُن سال وماہ کو بھی شاید ہو جو بارہا مقاصد اور سمتوں کو نیا موڑ دے جاتے ہیں۔کیونکہ یہ بات وہ تقسیم ملک کے تجربہ کے بعد ہی کہہ سکتے تھے کہ ؎ "ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے کہ گجر کا بجنا تو دلیل سحر ہوتا ہے کسی نئی بھیانک تیرگی کا غلبہ نہیں۔ادھر یہ احساس روز بروز گہرا ہونے لگا تھا کہ——

"آفتاب ابھرا تو بادل چھا گئے" یہ نظم ۱۹۴۷ء میں لکھی گئی تھی تجلی کا فریب دے کر دھندلکوں میں پہنچاتے والوں اور ابھرتے آفتاب کے آگے بادل کی دیواریں کھڑی کرنے والوں کی سازشوں کو بھانپ کر قاسمی صاحب یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ؎

میں سوچتا ہوں سحر نے مجھے شعور دیا　　مگر یہی کہ سلاسل کے سلسلے ہیں طویل
مچل رہی ہیں شعاعیں اُبل رہا ہے لہو　　اُمڈ رہی ہے تجلی ابھر رہی ہے فصیل
چمک تو خوب تھی لیکن جھلس گئے ہیں بدن　　نہ جانے شعلۂ نمرود تھا کہ باغِ خلیل

کسی کیفیت کو بدلنے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو اس کیفیت کے ناپائیدار ہونے کا یقین اور دوسرے یہ اعتقاد کہ جد و جہد رائگاں نہیں جاتی۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلتی ہیں۔ اور قاسمی صاحب کے ہر دور کے کلام میں ملتی ہیں۔ اگر "دشتِ وفا" یعنی اپنے تا با مروز آخری مجموعے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ؎

رات بھاری سہی کٹے گی ضرور
دن کڑا تھا مگر گزر کے رہا

تو "شعلۂ گل" میں بھی ان کے لبوں سے جھڑتے پھولوں نے یہی مہک دی تھی کہ ؎

نجوم بجھتے رہیں تیرگی اُمنڈتی رہے
مگر یقینِ سحر ہے جنھیں، اُداس نہیں

لیکن سحر آپ سے آپ نہیں آجاتی اس کے لیے زمین کو بھی حرکت میں رہنا پڑتا ہے اسی لیے وہ کہتے ہیں ؎

شاخِ انگور پہ اُمڈے ہوئے لرزاں خوشے
آپ ہی آپ کبھی مے نہیں ہونے پاتے

اور شاخِ انگور پہ لرزاں خوشوں کو مے میں تبدیل کرنے کا یہ عمل ہی قاسمی صاحب کے نزدیک تخلیق و ارتقا بھی ہے اور مقصدِ تخلیق و ارتقا بھی۔ یہ عمل جس قدر ضروری ہے اسی قدر طویل ہے اور طویل عمل انھیں کے بس کا روگ ہوتا ہے جن میں استقلال ہو۔ استقلال ایک ایسا پھول ہے جو رات کو یعنی ناموافق حالات میں خوشبو دیتا ہے۔ اور یہ پھول وہی اگا سکتا ہے جو جد و جہد کے رائگاں نہ جانے پر ایمان رکھتا ہو ؎

اگر نشاطِ سفر تک نہیں نہیں نہ سہی　　میں ریگ ریگ کے یہ شب نہیں گزاروں گا
شکست سے مرا اخلاق اجنبی ہے ندیمؔ　　سحر ملے نہ ملے رات سے نہ ہاروں گا

اندھیروں کے خلاف یہ جنگ شرق و غرب میں یوں تو ہر جگہ چھڑی ہوئی ہے لیکن دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے مشرق میں جہاں سے ظلمت کے بادل چھٹنے کا نام نہیں لیتے شدید صورت اختیار کر چکی ہے۔ قاسمی صاحب ان تاریک راہوں میں لڑنے اور لڑتے لڑتے مارے جانے والوں کے ساتھ بھی ہیں اور ان کے نغمے بھی گاتے ہیں۔ الجزائر میں فرانسیسی استبداد کے خلاف لڑائی میں حصہ لینے والی جمیلہ اور خدیجہ جب فرانسیسیوں کے تیرِ ستم کا نشانہ بنیں تو

انھوں نے لکھا ہے ؎

گیا کبھی عظمتِ پیرس نے یہ سوچا بھی ہے
جون ڈی آرک جمیلہ بھی خدیجہ بھی ہے

اور جب ان اہلِ قلم کی یاد میں انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور کے زیرِ اہتمام دن منایا گیا جو چین میں چیانگ کائی شیک اور حکومت کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے تو قاسمی صاحب نے شہیدوں کے اس خون کے حوالے سے جو رنگ لا چکا تھا "نیا ایشیا" کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی جس کے چند شعر پیش کرتا ہوں ؎

جو زبانیں کہ اعلانِ حق میں کٹیں، احتجاجِ مسلسل بنیں ایک دن
جو کراہیں گلے ہی میں دبا دی گئیں، آسماں پوش بادل بنیں ایک دن
جو ترانہ کہ تلوار کے وار سے بیچ میں کٹ گیا، اک سبق بن گیا
خون جو جذب ہوتا رہا خاک میں صبحِ نو کے افق کی شفق بن گیا
نوجواں فن طرازوں کی لاشوں سے پھوٹی وہ کونپل جو اب ایک گلزار ہے
یہ معطر جو اٹکھیلیاں کر رہا ہے، اسی گل کدے ہی کی مہکار ہے

اندھیروں کی حکمرانی کے خلاف چین میں کامیاب عوامی جدوجہد نے اس احساس کو زیادہ تیز کر دیا کہ ؎

زندگی گونج کے سوا کیا ہے　　ایک انسان دوسرے کا نقیب
پھول کی گونج پھول کی مہکار　　اور یہی ہے اثاثۂ گلزار
ایک اک پھول گلستاں کا غرور　　ایک اک آدمی جہاں کا نور
کاش سب کو مری نظر ہو نصیب

لیکن یہ نظر درد کے رشتے سے نصیب ہوتی ہے ؎

سب حجاباتِ نظر دل کے نہ دکھنے تک تھے
درد چمکا تو اندھیرا بھی نہ رہنے پایا

کیونکہ دل کے دکھنے اور درد کے چمکنے ہی سے وہ غم پیدا ہوتا ہے جو قاسمی صاحب کے نزدیک فن بلکہ فن کار کی بھی جان ہوتا ہے کہ فن کار کے وجود کا جواز اس کا فن ہی تو ہے۔ چنانچہ وہ بجا طور پر کہتے ہیں ؎

جب بھی دیکھوں کوئی شہ پارۂ فن سوچتا ہوں
کتنے لوگوں نے مرا قصۂ غم دہرایا

اس قصۂ غم کے بلاشبہ کئی پہلو ہیں اور اپنی اپنی افتادِ طبع کے مطابق ؎

ایک کو رنگ جچا ایک کو راس آئی شمیم

یہ مصرع ان کی ایک طویل نظم میں سے لیا گیا ہے جس کا عنوان ہے "یہاں سے وہاں تک"۔ اس نظم میں انھوں نے شاعرانہ انداز میں اسی بات کو چھیڑا ہے کہ ؎

نغمۂ عشرتِ جمہور ہو یا وعدۂ وصل
ایک احساس کے دو رُخ ہیں جدید اور قدیم

وہ خود بصارت کی بہشتوں کے منکر نہیں ہیں بلکہ ان کو بڑی چیز مانتے ہیں اور ان کی شاعری اس آنچ سے خالی نہیں ہے۔ لیکن وہ فن کار سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ رنگ سے شمیم کی طرف پرواز کرے اور زندگی کا ایک ہی رخ نہ دیکھے ؎

یہ حقیقت بھی تو ہے حسن کی مانند عظیم　　　ہل کی ہتھی پہ اتر آئے ہیں ہاتھوں کے نشان
نظر افروز ہے پکتے ہوئے کھیتوں کا شباب　　　اور دل دوز ہے لٹتی ہوئی فصلوں کا سماں
یہ مسافت بھی تو فن کار کو طے کرنا ہے　　　کس کی محنت کا ثمر جا کے ٹپکتا ہے کہاں

اسی مسافت کو وہ حقیقت کا تدریجی ادراک کہتے ہیں۔ اسی کو شعر کا حسن اور اسی کو حسن کا عرفان کہ فصل قصر تک الجھے ہوئے رشتوں کا سراغ لگایا جائے کیونکہ اس سراغ کے بغیر ان کو سلجھایا نہیں جا سکتا۔ یہ سراغ لگانے کو وہی آمادہ ہو سکتا ہے جسے انسانوں سے اور ان کے مسائل سے گہری دلچسپی ہو اور یہ لگن اور تلاش قاسمی صاحب کے کلام میں جگہ جگہ ملتی ہے۔ اسی لیے جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان مسائل کے حل کی راہ میں وہی ناخن حائل ہو جاتے ہیں اور ہو رہے ہیں جن سے عقدہ کشائی کی توقع ہوتی ہے تو اس تضاد پر وہ دل مسوس کر رہ جاتے ہیں کہ ؎

آنکھیں تو دکھاتی ہیں فقط برف کے پیکر
جل جاتی ہیں پوریں جو کسی جسم کو چھو لوں

اور وہ یہ کہتے ہوئے تڑپ اٹھتے ہیں ؎

کن تضادوں میں تہِ دام ہے مری پروازِ خیال　　　دستِ تخلیق کی زنجیرِ طلائی کی قسم
الحذر انسان سے پوشیدہ ہے انساں کا جمال　　　ایک کہتا ہے غزل ایک بتاتا ہے بم

یہ اشعار مئی ۱۹۵۹ء میں کہے گئے جب کہ اس سے دس سال پہلے یہ شعر بھی انھیں کے لب سے نکلے تھے کہ :

کون جانے کہ تضاد ایک دیرینہ دستور ہے　　　کون جانے کہ ہر تیرگی میں نہاں نور ہے
یہ وہی جانتے ہیں جو احساس کی نرم پوروں سے چھوتے ہیں نبضِ جہاں
یہ وہی جانتے ہیں جو کھوئے نہیں آدمی زار میں آدمی کا نشاں

تو کیا ہم اس سے یہ قیاس کریں کہ حالات سے نہ ہارنے والا ندیم مات کھا گیا۔ جس نے کبھی کہا تھا ؎

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر
کسی بھی شہر میں جاؤں غریبِ شہر نہیں

آج یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ؎

بھری دنیا میں نظر آتا ہوں تنہا تنہا
مرغزاروں میں کوئی قریۂ ویراں جیسے

لیکن قاسمی صاحب کے کلام کا مطالعہ شہادت دیتا ہے کہ یہ احساس ان کی داستان کا عنوان نہیں ہے۔ اس کی حیثیت ان کے نظام شمسی میں در آنے والے اور وقتی طور پر اپنی طرف متوجہ کرنے والے شہاب ثاقب سے زیادہ نہیں ہے جس کی لکیر اس کے ساتھ ہی مٹ جاتی ہے۔ ویسے تنہائی کے اس احساس کا سبب بھی اسی غزل کے مقطع میں موجود ہے کہ ؎

زخم کھبرتا ہے زمانہ مگر اس طرح ندیم　　　سی رہا ہو کوئی پھولوں کا گریباں جیسے

یہ غزل جولائی ۱۹۵۹ء میں کہی گئی تھی جب دوسری بار قید کاٹ کر رہائی پائے ان کو چند ماہ ہوئے تھے اور مارشل لا کی سوزنِ تدبیر سے پھولوں کے گریبان سیے جا چکے تھے۔ پھر جس طرح کسی درخت کی مضبوطی کا معیار یہ نہیں ہے کہ ہوائیں چلیں تو اس کی شاخ تک نہ ہلے۔ بلکہ اگر وہ جڑ سے اکھڑ نہیں جاتا یا جھک کر زمیں بوس نہیں ہونے لگتا تو اس کی مقاومت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ایسے لمحے ہر شخص کی زندگی میں آتے ہیں جب اس کے عقیدے اور اعتماد کی شاخیں لرزنے لگتی ہیں۔ چند پتے شاخ سے گر بھی پڑتے ہیں۔ لیکن اسے درخت کی شکست نہیں کہا جا سکتا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ دسمبر تک وہ پھر اسی امید پرست انداز مزاج کی طرف یہ کہتے ہوئے لوٹ آتے ہیں: ؎

ہم بایں تیرہ نصیبی، بہ ہمہ تیرہ نظر
ہم نے ہر رات کی چتون میں ستارا دیکھا

بلکہ جب نیا سال آغاز ہوتا ہے تو عالمی حالات کے پس منظر میں اس کا سواگت کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

درد کے پیرہنِ چاک سے جھانکو تو ذرا،　　　مُردہ سورج پہ لٹکتے ہوئے میلے بادل
کسی طوفان کی آمد کا پتہ دیتے ہیں

طوفان کی آمد والی یہ بات انھوں نے محض انگریزی محاورہ کے ترجمہ کے طور پر نہیں کہی بلکہ یہ ان کے وجدان کی آواز تھی کہ بادل طوفان کے بغیر نہیں چھٹ سکتے۔ اپنی اس غزل میں بھی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے انھوں نے کہا تھا ؎

اب کوئی طوفان ہی لائے گا سحر
آفتاب ابھرا تو بادل چھا گئے

سازگار ماحول ملے تو ہر بیج بہ آسانی جڑ پکڑ جاتا ہے اور ہو سکتا ہے قاسمی صاحب کا ذہن و فکر بھی قنوطیت کی بادِ خزاں کا اثر قبول کر جاتا۔ اگر ان دنوں عالمی سطح پر ہی سہی بعض ہمت افزا واقعات رونما نہ ہوتے جن میں سے خلا میں مصنوعی سیاروں کی کامیاب پرواز اور پھر انسان کی اس خلا میں سیر کو سرِ فہرست رکھا جا سکتا ہے۔ ان واقعات کی اہمیت وہی ہے جو معرکہ میں فوجوں کے لیے کمک کی ہوتی ہے۔ چنانچہ قاسمی صاحب عالمِ سرشاری میں کہتے ہیں ؎

تقدیر کے رو کے بھی ابد تک نہ رُکے گا
انسان ہے اب اک تیر مشیت کی کمان کا

اور معاصر شعرا میں سے شاید ہی کسی نے اس تسخیر کون کی طرح بار بار موضوعِ سخن بنایا ہو۔ ان کی ایک نظم "تین سرزمینیں" بڑی عمدگی سے ان کی اس وجدانی کیفیت کی غماز ہے۔ یہ تین سرزمینیں ماضی، حال اور مستقبل ہیں۔ ماضی تو میری یادوں کے

آراستہ نشانوں کے سوا کچھ نہیں لیکن سرزمینِ حال پر جو روحِ مستقبل رواں ہے اس کے چاروں طرف کتنے ہی خوابوں کے نشاں ہیں جن میں سے بعض سے وہ ہمیں یوں روشناس کرواتے ہیں ؎

اک طرف افراد کے رشتوں میں آہنگِ نسیم — اک طرف قوموں کی باتوں میں گلوں کی نرمیاں
اِک طرف تارے عروجِ آدمی کے مستقر — اک طرف گھر کی منڈیروں پر حدودِ لامکاں
اک طرف حسن و محبت، اک طرف تقدیس و خیر — اک طرف صرف آدمیت، اک طرف ہفت آسماں

اس قسم کے خواب دیکھنے والے کبھی تا دیر مایوسی کے دھندلکوں میں نہیں رہ سکتے۔ بلکہ ہر نیا ظلم ان کو جینے کے لیے اکساتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ ظلم سہتے ہوئے جینا بذات خود کوئی قابلِ ستائش عمل ہے بلکہ اس لیے کہ اس طرح جیے جانے میں یہ توقع ہے کہ "شاید کبھی انسان سنبھلے" اور وہ جب بھی سنبھلا ظلم سہے جانے کے عمل کو بامقصد بنایا جائے گا۔

ان کی انہیں شعری اور شخصی خصوصیات کے باعث قاسمی صاحب کا جب بھی مجھے خیال آیا ہے ذہن میں ملٹن اور اس کی تصنیف SAMSON AGONISTES ضرور ابھر آئے ہیں۔ یہ منظوم ڈراما ایک لحاظ سے ملٹن کی اپنی داستانِ حیات ہے۔ "اگونسٹیس" یونانی اصطلاح ہے اور اس کا مفہوم ہے "دوڑ میں حصہ لینے والا"۔ ملٹن نے اسے استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے کہ عرصۂ حیات میں لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر دوڑ میں حصہ لیتے چلے آرہے ہیں۔ ایک راسخ العقیدہ مسیحی ہوتے ہوئے مادی سہولتیں حاصل کرنے کی دوڑ ملٹن کے دائرۂ تصور سے باہر تھی۔ اس کا سیمسن ایک ایسا ہیرو ہے جس کی دوڑ اس دنیا میں خدا کی بادشاہت قایم کرنا، ان مایوسیوں سے بددل نہ ہونا ہے جو اس جدوجہد میں اکثر راہزنی کرتی ہیں اور ان ترغیبات کی زلیخاؤں سے دامن بچا کر نہیں، چھڑا کر نکل جانا ہے جن سے خارجی ماحول میں واسطہ پڑتا ہے۔ کیوں کہ قاسمی صاحب کا کلام ہی اس کی تصدیق نہیں کرتا کہ وہ بھی "دوڑ میں حصہ لے رہے ہیں" بلکہ ملٹن کی طرح ان کی اسیری بھی اس کی گواہی دیتی ہے۔ دونوں مذہبی مزاج رکھتے ہیں۔ اگرچہ قاسمی صاحب ہیں وہ — PURITANISM — نہیں ہے، ملٹن جس کا مبلغ رہا۔ لیکن وہ کائنات میں کسی قوت کے حسنِ ربط کے قائل ضرور ہیں۔ عورت کے بارے میں بھی دونوں میں بہت بُعد ہے۔ ملٹن کے ذاتی حالات نے عورت کے معاملہ میں جو رائے قایم کرنا اس کے لیے کسی حد تک ناگزیر کر دیا تھا قاسمی صاحب کو ہم اس سے محفوظ پاتے ہیں۔ اس اختلاف کا سبب دونوں میں تین صدیوں کا فاصلہ بھی ہے اور شاید قاسمی صاحب کا مسلمان گھرانے میں پیدا ہونا بھی کہ اسلام عورت اور مرد کی فطرت میں کسی اختلاف کا قائل ہے نہ کسی شر کا۔ اسی لیے جہاں سیمسن کی بیوی سے نفرت اسے طبقۂ اناث سے بدظن کر جاتی ہے اور وہ اسے دیکھ کر کہتا ہے کہ LET HER NOT COME NEAR ME وہاں قاسمی صاحب حسیناؤں کے جمگھٹ کو جمارت کی ہستیں کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ؎

حسن تہذیب کی جاں، حسن تمدن کا نقیب — حسن سرمایۂ آسودگیِ قلب و نظر

چنانچہ عورت کا آدم کو بہکانا تو ایک طرف رہا ان کا آدم کہتا ہے کہ ؎

جب بھی تم نا ماہ نے بہکاتا پیکر چمکا — جب بھی رات آئی تری سیم تنی یاد آئی

اسی طرح جہاں ملٹن سمسن کے منہ میں اپنی بات ڈال کر کہتا ہے ۔

"........ GODS UNIVERSAL LAW

GAVE TO THE MAN DESPOTIC POWER

OVER HIS FEMALE IN DUE AWE

NOR FROM THAT RIGHT TO PART AN HOUR

SMILE SHE OR LOUR

وہاں قاسمی صاحب کے لہجے کی نرمی دیکھیے ۔ یہ نظم جیل میں لکھی گئی نظموں میں سے ہے ؎

کل نصف شب کی تیرگیوں میں ترا خیال　　ماضی کے پھول کنجِ قفس میں سجا گیا
جس پر ٹھٹک گیا تھا مرا دل ترا جمال　　حالات کا وہ موڑ مجھے یاد آ گیا
برسوں کے بعد آج بھی اے مبداءِ حیات　　تو میری دوست بھی ہے مری ہم سخن بھی ہے
تو میرا شعر، میرا فسانہ، مری زباں　　تو میرا فن بھی ہے مرا موضوعِ فن بھی ہے

بات عورت کی چل نکلی ہے تو قاسمی صاحب کے دو شعر پیش کرنے کو جی چاہتا ہے جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کس زاویے سے اسے دیکھتے ہیں اور ان کا تمتعِ جمال کا تصور کیسا ہے ؎

لبریزِ جمال ایک کا دل ایک کا پہلو　　اتنا سا فقط فاصلہ ہے خیر سے شر تک
اک جست کا فاصلہ ہے شر تک　　لیکن ترا پیار درمیاں ہے

اس میں شک نہیں کہ خیر سے شر تک کا یہ فاصلہ مٹنے یا مٹنے نہ دینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور اس کے لیے دل اور دماغ کی بڑی ہم آہنگی درکار ہے ۔ اگر ہم ان فاصلوں کا بھرم نہ رکھ سکیں تو کسی بہتر سماج کی توقع نہیں کی جا سکتی ——

میں یہاں ملٹن ہی کے ایک جملے پر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں جو قاسمی صاحب پر بھی اور ان کی شاعری پر بھی صادق آتا ہے ——

" HE THAT CAN APPREHEND CONSIDERVICE WITH

ALL HER BAITS AND SEEMING PLEASURES AND YET

ABSTAIN, AND YET DISTINGUISH, AND YET PREFER

THAT WHICH IS TRULY BETTER, HE IS THE TRUE

WAY_FARING CHRISTIAN."

آپ چاہیں تو یہاں کرسچین کی جگہ انسان کہہ لیں۔

جمیل ملک

شہر و دیہات کا سنگم

"گھر سے گھر تک"

"گھر سے گھر تک" احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا تا حال آخری مجموعہ[1] ہے۔ یہ کتاب اُس دور کی نمایندہ ہے۔ جس میں ندیم کی افسانہ نگاری کا فن نت نئی بلندیوں سے ہم کنار ہو رہا ہے۔ ندیم نے ان افسانوں میں رومان و حقیقت، احساس و شعور اور شہر و دیہات کا وہ سنگم پیش کیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ندیم کا فن جس قدر صاف، شفاف اور نکھرا ستھرا ہے، ندیم کے ناقدین اُس کے فن کے بارے میں اُسی قدر تضاد اور اُلجھے ہوئے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ ابتدا ہی سے ندیم کے قارئین کو اس غلط فہمی سے دوچار کیا گیا کہ ندیم تو محض دیہات کے فطری حسن، گاؤں کے لوگوں کی طبعی سادگی اور یہاں کے رومان پرور ماحول کا عکاس ہے۔ حالانکہ یہ تو ندیم کے فن کا صرف ایک رخ ہے۔

(۱) وہ حسن و رومان کا دل دادہ ضرور ہے مگر اُس نے کسی دور میں بھی حقائق کی سنگینی سے چشم پوشی نہیں کی۔ ندیم کی حسن پرست طبیعت کو جواز بنا کر کبھی اُس کو بنیادی طور پر شاعر کہا گیا اور کبھی فن افسانہ نویسی پر اُس کی فن کارانہ گرفت کی وجہ سے اُسے بہتر افسانہ نگار ٹھہرایا گیا۔ حالانکہ شاعری کی طرح افسانہ نگاری بھی ایک تخلیقی عمل ہے اور جب کوئی ادیب نثر بھی لکھتا ہے تو اُس میں ادبی چاشنی ضرور ہوتی ہے۔ تخلیق کا یہی مشترک پہلو شاعری میں رس پیدا کرتا ہے اور افسانے میں رنگ بھرتا ہے۔ کچھ عرصے تک ندیم کے فن کو ایک مخصوص تحریک اور اُس کے نظریات کی حدبندیوں میں مقید کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی بڑا فن کار زیادہ دیر تک کسی مخصوص دائرے میں محبوس ہو کر نہیں رہ سکتا۔ ہر عظیم فن کار تجربات کی بھٹی سے جب کندن بن کر نکلتا ہے تو اُس کے سامنے اپنا ایک آدرش اور اپنا ایک مسلکِ حیات ہوتا ہے جس کے حصول کے لیے وہ نئی نئی سرزمینیں اور نئے نئے اُفق تلاش کرتا رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اُس کے فن کا دم گھُٹ کر رہ جائے۔ اس میں کلام نہیں کہ ندیم ہمیشہ سے انسان دوستی کا فریفتہ اور زمزمہ خواں رہا ہے۔ لیکن فن کی باریکیوں اور اُس کے

---

[1] تازہ ترین مجموعہ "کپاس کا پھول" ہے، جو طبع ہو چکا ہے ۔۔۔۔ (ص)

لامحدود امکانات سے بھی اُس نے کبھی انحراف نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کا فن مسلسل ارتقا پذیر رہا ہے۔ اُس کے فکر میں تنوّع کی حیرت انگیزیاں بھی ہیں اور اُس کے فن میں ہیئت کی نیرنگیاں بھی ۔ وہ فن کار جس کا فن ہمیشہ ترقی پذیر ہو اور جو ہر منزل سر کرنے کے بعد ایک نئی منزل کے لیے رختِ سفر باندھ لیتا ہو اُس کی کسی کاوش کو اُس کا نقطۂ عروج تو نہیں کہا جا سکتا، تاہم ایسے فن کار کی ہر کوشش اُسے اپنے فن کی انتہائی بلندیوں سے قریب تر ضرور لے آتی ہے۔ ندیم کے اس مجموعے کو ناقدین کے منفی اعتراضات کا مثبت جواب کہا جا سکتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ندیم کے ان افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ بھی ہو جائے۔

"ثواب"۔ "اصول کی بات"۔ "شیش محل"۔ "فالتو"۔ اور "بھاڑا" دیہاتی زندگی کے اردگرد گھومتے ہیں۔ یہ پانچوں افسانے اپنی بعض مشترک خصوصیات کی بنا پر ندیم کے ایک نمایاں ذہنی رجحان کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان تمام افسانوں کے مرکزی کردار محنت کش اور خود دار ہیں جو معاشرے کے نچلے طبقوں سے متعلق ہیں۔ لیکن عزتِ نفس کا تحفظ اور مسلسل جدوجہد ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ کردار اپنی توتوں کو آزمانے اپنی سوئی ہوئی حمیت کو جگانے کے لیے کوشاں اور بالائی طبقے کے ظلم و ستم کے خلاف متواتر برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ یہ آویزش کبھی المیے کا تاثر اُبھار کر ظالموں کے خلاف ہمارے دل میں نفرت اور مظلوموں کے لیے ہمارے جذبات میں ہمدردی اور ہل چل پیدا کرتی ہے، اور کبھی طربیہ الفاظ اختیار کر کے کچلے ہوئے کرداروں کے لیے زندہ حال اور درخشاں مستقبل کی علامت بن جاتی ہے۔ ان افسانوں میں ندیم نے جگہ جگہ نام نہاد مذہبی اور اخلاقی قدروں کو بھی اپنے کٹیلے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ وہ اقدار ہیں جنھوں نے مکڑی کے جالے کی طرح معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور مظلوم و مقہور انسان اگر ان جالوں سے باہر آنا بھی چاہیں تو جالوں کے اُلجھے ہوئے تار اُن کے رگ و ریشے سے پیوست ہو جاتے ہیں۔

"ثواب" ایک واقعاتی افسانہ ہے۔ کرماں جھیورن اور اُس کا میاں دونوں محنتی کردار ہیں، جو "بابر کے زمانے سے" پانی بھرتے آرہے ہیں۔ مگر اب تھک گئے ہیں۔ ان کا بیٹا روشن مستقبل کی امید ہے جسے اُس کے ماں باپ منشی بنانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ مگر جنگا اچانک کنویں میں گر جاتا ہے اور کہانی المیے کی سمت مُڑ جاتی ہے۔ اس کہانی کو جو چیز مؤثر اور منفرد بناتی ہے، وہ ماں کی ممتا کا بے پناہ اظہار ہے۔ کرماں کے کردار میں نہ صرف داخلی کشمکش کی شدت ہے، بلکہ اس شدت اور تلخی کا اظہار اس وقت خارجی ماحول میں بھی ہل چل پیدا کر دیتا ہے جب ملک رحمٰن خان، یہ کہہ کر ایک طرف کھسک جاتے ہیں۔

"یہاں تو تمھیں تین چار ہو۔ سب چلے گئے تھک کر۔ صبح سے آئے تھے اب تو ظہر کی اذان ہونے والی ہے"

رد کرماں تن تنہا آگے بڑھ کر پکار اٹھتی ہے "لاؤ میں رسّہ کھینچوں گی" اس سارے عمل میں اگر کوئی اُس کا ساتھ دیتا ہے تو وہ جنگے کے ہم عمر معصوم بچے ہیں، یا اپنی ماں کے حلالی بیٹے، غوطہ خور ہیں جنھیں کرماں کسی ولی اللہ سے کم نہیں سمجھتی۔ کرماں کے یہ الفاظ:

"یوں ہنستا ہنستا باہر آجا بیٹے، جیسے تو مدرسے سے آتا ہے اگر تو مر گیا تو خدا کی خدائی میں زندہ کون رہے گا"

اُس کی داخلی کیفیات کی شدت اور ماں کی ممتا کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ اور پھر کرماں مُردہ چنگے کو بازوؤں میں لے کر یوں چل پڑتی ہے، جیسے اُسے مدرت چھوڑنے جا رہی ہو۔ اس افسانے میں جہاں ایک طرف کرماں کے مرکزی کردار کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ وہاں دوسری طرف معاشرتی پس منظر میں ملک رحمٰن خاں، کرماں، چنگا، غوطہ خور، میرو اور تماشائیوں کے کرداروں کو گاؤں کے محاکات کے ساتھ یوں اُبھارا گیا ہے، کہ واقعات متحرک تصویروں کی طرح آنکھوں کی راہ سے اُتر کر دل میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ماں کی مضطرب ممتا اور ڈوبے ہوئے چنگے کے داخلی ارتعاشات کا رشتہ ندیم نے کمال فن کاری سے خارجی محاکات اور مظاہر کے ساتھ استوار کیا ہے۔

"ادھر ہوا میں ایک ٹیٹری 'پیاسی ہوں' پیاسی ہوں، پکارتی ہوئی نکل گئی۔ کنوئیں کی جھکی ہوئی شیشم کی ایک شاخ سے ایک زرد پتا ٹوٹا اور بھیرکی کی طرح چکراتا ہوا کنوئیں میں اُتر گیا۔"

ملک رحمٰن خاں کی گفتگو جہاں ایک خاص طبقے کی ذہنی افتاد اور اجارہ داری کی چُغلی کھاتی ہے، وہاں یہ حقیقت بھی منکشف کر دیتی ہے کہ یہ طبقہ اخلاقی اقدار کی چادر کو بھی یوں اوڑھنے کا قائل ہے، جیسے اُس نے یہ دبیز چادر اپنے عیوب اور گناہوں کو چُھپانے کے لیے ہی بازار سے خریدی ہو۔ نقطۂ عروج پر پہنچ کر ملک رحمٰن کی زبان سے یہ فقرے سنیئے:——

"بات یہ ہے بھائی' لاش نکل آئی ہے تو کنوئیں کو پاک بھی کرنا ہوگا۔ دو سو ڈول کے نکالنے ہوں گے۔ تم جھیور لوگ ڈول کا خوب نکالتے ہو اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں اور پھر ثواب کا کام بھی ہے۔"

"اصول کی بات" کا موضوع جاگیردارانہ نظام میں زمیندار اور مزارع کا وہ رشتہ ہے جو کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتا ہے۔ یہاں عبداللہ کی بے دخلی کے پس منظر میں طبقاتی تضاد، مہنگائی اور روٹی کے مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ لیکن جو چیز بار بار اُبھرتی ہے وہ یہ المناک احساس ہے کہ جاگیردارانہ معاشرے میں کس بُری طرح ایک فرد کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس رُخ کو کامیابی کے ساتھ پیش منظر میں لانے کے لیے افسانہ نگار نے مکالموں سے بڑا کام لیا ہے۔ کہانی کا پلاٹ مکالموں سے بُنا گیا ہے اور کرداروں کی نوک پلک درست کرنے میں بھی لب و لہجے اور اندازِ گفتگو سے بڑی مدد لی گئی ہے۔ یوں یہ افسانہ تکنیک کے لحاظ سے بھی اہم ہو جاتا ہے۔ فرد کی نفی کا یہ تصور افسانہ نگار کی پیکر تراشی سے یوں مجسم ہو گیا ہے۔

"اُس کے ہاتھ زمیندار کے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے جڑ گئے تھے اور اب تک جڑے ہوئے تھے اور اُس کے انگوٹھے کے ناخن پر ایک مکھی ساکت و صامت بیٹھی تھی"——

چند چھوٹے چھوٹے فقروں میں زمیندار اور مزارع کے کرداروں کی جھلکیاں بھی دیکھیے:——

"اولاد ہے؟" زمیندار نے پوچھا — "جی ایک بیٹی ہے ایک بیٹا بھی تھا بیچارہ — خدا نے لے لیا" "کیسے مرا —؟" "جی دق سے" "تو پھر تمھیں بھی دق ہوگی۔ نام کیا ہے تمھارا؟" "عبداللہ" وہ بولا — "تو پھر دُلا کہو۔ پورا نام کس نے پوچھا تھا"——

اس کہانی کا ایک عمدہ پہلو یہ بھی ہے کہ فرد کی بے دخلی، محکومی اور نفی کے باوجود اور شکاریوں کے جال پھینکنے کے باوصف — عبداللہ، اُس کی بیوی اور بیٹی ماکھاں اپنی غیرت و آبرو رہزنوں کی دست بُرد سے بچانے اور

سلامت لے جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

"شیش محل" محنت کی عظمت کا بلیغ اشاریہ ہے۔ اللہ بخش ایک موچی ہے۔ لیکن اپنے کام کے سلسلے میں اتنا محنتی اور پُر خلوص ہے کہ وہ اپنی کاریگری کو فن کے درجے تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کے برعکس ملک صاحب کا کردار "مشیت" کی اُس تقسیم کا قائل ہے، جس نے ملک صاحب کو پُرانی اقدار کا محافظ اور اللہ بخش کو موچی بنا دیا ہے۔ اللہ بخش اور ملک صاحب کے تقابلی مطالعے سے یہ افسانہ ایک کرداری افسانے کی صورت میں اُبھرتا ہے۔ جس میں اللہ بخش کے کردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور جو اپنی مسلسل محنت اور ریاضت کی وجہ سے ملک صاحب کے کردار پر غالب آجاتا ہے۔ ملک صاحب کے نزدیک جب موچی کو دکان میں کام کرنا ہو تو اُسے کپڑے اُتار دینے چاہئیں۔ مگر اللہ بخش کی کاریگری تو ایک طرف اُس کے پہناوے تک سے بو آتی ہے۔ ان دونوں کی کشمکش فراغت اور محنت کی آویزش کا دوسرا نام ہے۔ اس آویزش میں محنت ایک مثبت قدر بن کر اُبھرتی ہے۔ جس کا عملی اظہار "شیش محل" کی تعمیر میں ہو جاتا ہے، ایک مکالمہ سنیئے:۔

ملک صاحب:۔ "شرم کرو بشکو شرم کرو۔ اپنے باپ دادا کی طرح کچے کوٹھے میں رہو گے تو کیا تمہارا دم گھٹ جائے گا"۔

اللہ بخش:۔ "اب شرم کا ہے کی کروں، اب تو شیش محل میرا اپنا شیش محل ہے"۔

"فالتو" کا خمیر گھریلو فضا میں اٹھایا گیا ہے۔ لیکن وہ طبقاتی تضاد اور معاشی تفاوت جو گھر کی چار دیواری کے باہر موجود ہے، اُس کی چھاپ، ماں باپ، بیٹے اور بہو کے گھریلو اور خونی رشتوں پر بھی ملتی ہے۔ اس افسانے میں ماں باپ اور بیٹے کی فطری محبت کا اظہار بھی بڑے مؤثر پیرائے میں ہوا ہے: حبیب کے دل میں ماں کی موت کے بعد معاشی سکون کے باوجود دنیاوی رشتوں کی ناپائیداری کا احساس گہرا ہو جاتا ہے۔ اور باپ کے دل میں بیٹے سے محبت کا یہ عالم ہے کہ تسبیح پر سبحان اللہ کا ورد کرتے کرتے وہ حبیب حبیب کی مالا جپنے لگتا ہے۔ اس کے باوجود، ساس، سسر، بہو کی ناچاقی اس افسانے کا مرکزی نکتہ ہے جو ہماری گھریلو زندگی کے جسم پر ناسور بن کر سالہا سال سے رس رہا ہے۔ اور جسے معاشی اور معاشرتی تفاوت کا زہر کبھی مندمل نہیں ہونے دیتا۔ یہاں تک کہ پیر بخش کی بہو "خاتون" اپنی طبقاتی برتری کے تیروں سے یوں اپنے سسر کو چھلنی کر دیتی ہے۔ جیسے گھر میں اُس کا وجود واقعی فالتو اور بیکار ہو۔

"میں جانتی ہوں تمہارے بیٹے کو۔ زبان نہ لڑاؤ۔ ورنہ ابا سارے گاؤں کے سامنے تم دونوں کے جوتے لگوائے گا"۔

اور پیر بخش جب بیٹے کی دکان پر فریاد لے کر جاتا ہے تو اُس کے استفسار پر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ پاتا:۔

"کچھ نہیں بیٹا۔ تمہیں دیکھنے آنکلا تھا۔ کہ تم دکان میں بیٹھے کیسے لگتے ہو"۔

اس افسانے میں ہماری گھریلو زندگی کے المیے کے علاوہ عورت اور مرد کے نفسیاتی مطالعے کی جھلکیاں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں۔ مثلاً یہ بلیغ اشارہ کہ:۔

"کھل کر رونے والا معاملہ ایسا ہے جس میں عورتیں مردوں سے زیادہ آزاد ہیں، ورنہ رونے کو تو

مردوں کا بھی جی چاہتا ہے "۔۔۔۔۔

"بھاڑا" کا مرکزی کردار ملکھاں ہے۔ اس کردار کی دو خوبیاں قاری کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ ایک تو اُس کی محنت کشی، دوسرے اُس کی آنکھیں۔ ملکھاں وہ ملکۂ حسن ہے، جس کو ایک جمہوریت یا ایک باوردی مشین کہہ لیجیے۔ لیکن اُس کی آنکھیں اُس کے حسن کی تفصیل بن گئی ہیں۔ اُس کی فن کاری کا یہ عالم ہے۔ کہ وہ جب بسم اللہ کہہ کر پیڑا اُٹھاتی ہے اور اسے روٹی میں بدلنے کے لیے حرکت میں لاتی ہے، تو گویا کائنات تخلیق ہونے لگتی ہے۔ ندیم نے ملکھاں کے حسین، حیادار، محنت کش اور متحرک کردار میں شاعرانہ اندازِ بیان اور تشبیہ و استعارہ سے بڑی جاذبیت پیدا کردی ہے۔

"یوں آنکھیں نہ جھکا لیا کرو۔ اس طرح آسمان بالکل سر پر جھک آتا ہے "۔۔۔۔۔

آنکھوں کو ملکھاں کے حسن کا محور بنا کر اور 'آنکھیں' پیشِ منظر، میں رکھ کر افسانہ نگار نے افسانے کو روحانی طربیہ کی جس انتہا پر پہنچا کر ایک جھٹکے (TWIST) کے ساتھ جس انداز سے ایک حادثاتی المیے سے دوچار کیا ہے۔ اُس سے یہ افسانہ صرف جبرِ فطرت پر ایک گہرے اور معنی خیز طنز کا حامل ہو گیا ہے۔ بلکہ اس سے طربیے اور المیے کے اجزا کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں۔ کہ یہ ٹریجڈی بڑی مؤثر ہو گئی ہے، اور اس کا کینوس بے رحم فطرت کی طرح وسیع ہو گیا ہے جو ہمیشہ انسان سے اپنا 'بھاڑا' وصول کرتی رہتی ہے۔

"تنور کی منڈیر ٹوٹ گئی۔ بس یہ ہوا کہ بے چاری کی آنکھیں بھُن گئیں۔ قدرت نے ملکھاں سے اپنا بھاڑا وصول کر لیا"۔۔۔۔۔

"گھر سے گھر تک"۔۔۔ "ھذا من فضل ربی"۔۔۔ "موج خون"۔۔۔ اور "بھرم"۔ میں ہماری ملاقات ایسے کرداروں سے ہوتی ہے۔ جو تضادات میں گھرے ہوئے ہیں۔ دولت، عورت اور محبت اُن کے لیے ایک ایسی تثلیث بن گئی ہے جو اُن کے پاؤں کی زنجیر بھی ہے، اور جو اُن کا رشتہ زندگی کے حقائق سے بھی منسلک کر دیتی ہے۔

"گھر سے گھر تک" ایک موضوعی افسانہ ہے جس میں بظاہر رشتوں ناتوں کا مسئلہ چھڑا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن دراصل یہ اُن دو رُخے کرداروں کی کہانی ہے جن کی جڑیں تو درمیانے یا نچلے طبقے میں پیوست ہوتی ہیں۔ لیکن جو اونچے طبقے کی چمک دمک اور آن بان دیکھ کر اس سے اتنے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ ہر وقت اسی طبقے میں شامل ہونے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ اپنی ذات پر امارت کا خول چڑھا کر، خریدے ہوئے مصنوعی تمدن کو اپنا کر، اتراتے پھرتے ہیں اور اسی کو زندگی کا مقصد اور معیار تصور کر لیتے ہیں۔ اس اندازِ زندگی کا المناک پہلو یہ بھی ہے کہ ایسے کرداروں کو معاشرے کی ان مروجہ اقدار کو بعض حالتوں میں مجبوراً بھی اپنانا پڑتا ہے، خاص طور پر شادی بیاہ کے معاملے میں تو خواہ پکوان پھیکا ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن بظاہر اونچی دکان کا ہونا ضروری سا ہو گیا ہے۔ افسانہ نگار نے اس افسانے میں اسی حقیقت کو نمایاں کیا ہے۔ اُس نے دولت و ثروت کے اس مصنوعی تصور کی نفی کی ہے اور بالائی طبقے کے کھوکھلے پن کی نقاب کشائی کرتے ہوئے چابک دستی کے ساتھ تصنع سے اصلیت کی طرف مراجعت کا رویہ اختیار کیا ہے۔ اس گھر میں بھی اور اُس گھر میں بھی مانگے کی رنگا رنگ چیزوں کا ہجوم ہے اور دونوں گھرانوں پر کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کی امارت کا رعب داب قایم ہے، مگر

جب عین وقت پر نوکر قالین، صوفہ اور پردے مانگنے کے لیے آدھمکتا ہے تو حاجی مقتدا احمد کے دیوان خانے کی حقیقت کھُل جاتی ہے۔ ٹوٹے ہوئے پیالے۔ کالی میلی دیواریں، پُرانے دوپٹوں کے پردے اور بے دھلے، بے نہائے بچے، زبانِ بے زبانی بن کر آن کی آن میں اپنی کہانی بیان کر دیتے ہیں۔ مگر عشرت خانم، ہما اور وقار بھی تو مانگے کی کار پر آئے ہیں۔ عشرت خانم جب اس حقیقت سے دوچار ہوتی ہے، تو اُس کی اصلی شخصیت مصنوعی خول سے نکل کر اور اپنے سچے روپ میں جلوہ گر ہو کر بول اٹھتی ہے:۔۔۔۔۔۔

"اے بہن نورالنسا! ذرا خدا کے لیے ہنسیے، کیا یہ ہنسی کی بات نہیں کہ انسان اپنے گھر سے نکل کر کسی دوسرے کے گھر جائے تو اپنے ہی گھر جا نکلے اور بہن، میری معصومہ بھی اپنے گھر سے چلے گی تو اپنے ہی گھر جائے گی۔ قسم قرآن مجید کی، پسینہ سرخی پوڈر بہالے جائے تو نیچے سے کیسے سچے اور کھرے چہرے نکل آتے ہیں :۔۔۔۔۔۔"

عشرت خانم اور نورالنسا کی اس ہنسی میں زہرخند کی ایسی کیفیت ہے جس میں المیہ اور طربیہ کے عناصر ہم آمیز ہو گئے ہیں۔ پھر یہ ہنسی اُس دردِ مشترک کی غمازی بھی کرتی ہے جس سے دلوں کے فاصلے دور ہو جاتے ہیں اور حال و مستقبل کی طنابیں کھنچ جاتی ہیں۔ ندیم نے اس افسانے کے کرداروں کی نفسیاتی تحلیل بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ کی ہے۔ ان کی بات چیت اور حرکات و سکنات سے آہستہ آہستہ یہ بات قاری کے دل میں سرایت کرتی چلی جاتی ہے کہ ضرور کوئی چور ہے، جس کو انھوں نے ریشمی پردوں اور دبیز غلافوں کے پیچھے چھپا رکھا ہے۔ یہ فقرے دیکھیے:۔۔۔

"جب لڑکیوں کو دیکھنے آتے ہیں تو آہستہ بولتے ہیں یوں سمجھو کہ ہر پردے کے پیچھے کوئی کھڑا تمھاری باتیں سُن رہا ہے"۔۔۔۔۔

"تینوں یوں سنبھل کر بیٹھ گئے، جیسے اُن کی تصویر اُترنے والی ہو"۔۔۔۔۔

"سلیقہ ہی تو سب کچھ ہے ورنہ مشین تو آدمی سے بھی زیادہ تیزی سے کام کر سکتی ہے"۔

مگر پھر یوں ہوتا ہے کہ ان مکالموں کے چہروں سے ملمع اُتر جاتا ہے اور اُن کی باتوں میں چھپا ہوا ہوا چور صاف پکڑا جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔

"ھذا من فضل ربی" پھیلتے ہوئے شہروں کے ایک پیچیدہ مسئلے کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ خان بہادروں کی اُس بستی کی کہانی ہے جو شہر سے ہٹ کر کسی مزار یا کسی مزارع کی زمین کے اوپر تعمیر کی جاتی ہے۔ اس بستی میں ایک ایسے طبقے کے لوگ رہتے ہیں جو نہ صرف خود ایک اُلجھا ہوا سوال ہیں بلکہ اُن کی طرح اُن کی اولاد بھی ایک 'پرابلم' ہے۔ اس 'پرابلم بستی' کے رہنے والے لڑکے اور لڑکیاں ملتے پھرتے ہیں جن کو نئی تعلیم کی تیرگی اور دولت کی چکاچوند نے مار رکھا ہے۔ خان بہادروں کے یہ لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے ہیں مگر محبت اُن کے نزدیک ایک مشغلہ ہے، 'ایک بھوت ہے اور ایک کھُلا راز ہے' جس کو سب جانتے ہیں مگر برملا اس کا اظہار نہیں کرتے، کیونکہ یہ بات اُن کے 'ایٹیکیٹ' کے خلاف ہے۔ یہ بھی ایک موضوعی افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے اونچے طبقے کی محبت (جو دراصل جنسی تلذذ اور کج روی کا پردہ ہے) کے کھوکھلے پن اور مصنوعی تصور کا تار و پود ہنسی ہنسی میں

بکھیر کر رکھ دیا ہے ۔ مگر جو چیز اس افسانے کو منفرد بناتی ہے وہ اس کی انوکھی تکنیک ہے ۔ افسانے کے ہیرو کو مختلف وقفوں میں تین نسائی کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے ۔ سب سے پہلے اُس کی نظریں مالی خوشیا کی بیوی سے ملتی ہیں اور اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مالن نے اُس کے ہونٹوں سے لگایا ہوا پانی کا گلاس چھین لیا ہو۔ اُدھر ہیرو کو دیکھتے ہی مالن کے چہرے پر گلاب ہی گلاب کھِل جاتے ہیں ۔ ان دونوں کیفیات سے ظاہر ہے، کہ مالن اولین ملاقات میں ہی ہیرو کے سینے میں ایک ایسی پیاس کو بیدار کر دیتی ہے، جس کا نام محبت ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی رہتی ہے، کیونکہ وہ ابتدا ہی میں مالن کے بے داغ قدرتی حسن اور بے ساختہ پن پر مرمٹا ہے ۔ لیکن چونکہ اُس کا ناتا نہ صرف امیر طبقے سے ہے، بلکہ اُس کی رگوں میں "پرابلم بستی" کا خون بھی ہے اس لیے جب تابندہ اور شگفتہ اُس کے راستے میں آتی ہیں تو وہ اُن کی آنکھوں کے سمندر میں ڈوب ڈوب جاتا ہے. اُن کے حسن کے لالہ زاروں میں گم ہو جاتا ہے، مگر تنہائی کے ان جانے لمحوں میں مالن روح کی گہرائیوں سے نکل کر اُس کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے اور اُسے پیاسا مارنے پر تُل جاتی ہے ۔ اس کہانی کے ہر موڑ پر گریز اختیار کر کے "تلازمۂ خیال" کا سہارا لے کر، خود کلامی کے انداز میں ندیم جس فن کاری سے بار بار مالن کا سراپا اور "امیج" اُبھارتا ہے، اُس نے اس افسانے کو بلاشبہ ایک نئی تکنیک بخش دی ہے اور اس کے پلاٹ کو گمبھیر بنا دیا ہے، گریز، "تلازمۂ خیال" اور خود کلامی کے دو ایک مواقع دیکھیے :۔۔۔۔

> "نہ جانے مالن کہاں چلی گئی بیچاری، سوچتا ہوں زندگی میں کبھی ایک بار مالن سے میری مڈبھیڑ ہو جائے تو مزا آجائے "۔۔۔۔۔
>
> "تابندہ اور مالن کی آنکھیں ۔۔! کیا تاروں سے چمکتی ہوئی راتوں میں آپ نے سمندری سفر کیا ہے ؟ "۔۔۔۔

" موجِ خون " میں بھی نفسیاتی انداز سے کرداروں کو پرکھا گیا ہے ۔ یوں کہنا چاہیے کہ بنیادی طور پر یہ افسانہ عورت کی نفسیات ہی کو پیش کرتا ہے ۔ عبدالحنان اس کہانی کی تکون کا ایک ایسا خط ہے جس کے دونوں کناروں پر ساجدہ اور زرینہ کے خطوط باری باری ملتے اور جُدا ہوتے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے عبدالحنان کو عورت کے شدید جذبوں اور بھڑکیلے پن سے عشق ہے ۔ شادی کے بعد ساجدہ کے جذبات کی فراوانی اور محبت کا جوار بھاٹا ایک ہموار سطح اختیار کر لیتا ہے تو وہ ایک منہ زور دوشیزہ کی بجائے ایک حیادار گرہستن کے روپ میں ڈھل جاتی ہے ۔ عبدالحنان ساجدہ کی اس منجمد پیش کاری سے اُکتا کر زرینہ کے کسے کسائے جسم کی رعنائی اور توانائی میں گم ہو جاتا ہے جو حرص کی کھلی علامت بن کر سامنے آتی ہے ۔ کچھ عرصے کے بعد یہ طوفان بھی اُتر جاتا ہے تو عبدالحنان کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے :۔۔۔۔۔

> "دنیا کی تمام عورتیں چاہے وہ ساجدائیں ہوں یا زرینائیں، جب بیوی بن کر مرد کے قریب آتی ہیں تو اپنی شخصیت کے خول سے نکل آتی ہیں، اور سیدھی سادھی عورتیں بن جاتی ہیں "۔۔۔۔

عبدالحنان کو یہ یکسانیت گوارا نہیں ۔ اُس کے پیچیدہ اور کمپلکس کردار کو تو ایذا پسندی اور ایذا دہی دونوں ہی

عزیز ہیں۔ وہ ایک بار ساجدہ کو دکھ دے کر اور زرینہ کو اپنا کر خوش ہوتا ہے اور دوسری بار ساجدہ کے تھپڑوں کی گرمی سے جب اُسے ساجدہ کی محبت کی آنچ محسوس ہوتی ہے وہاں زرینہ کو ٹھکرا کر اور اُسے ایذا پہنچا کر پھر وہ لاشعوری طور پر لذت محسوس کرتا ہے۔ اگرچہ فرائیڈ کی تحلیلِ نفسی ندیم کا مخصوص موضوع نہیں۔ تاہم اس فسانے میں اُس نے تحلیلِ نفسی کے واسطے سے عبدالحنان کے سینے میں ساجدہ کی محبت کو بیدار کرنے کی خوبصورت کوشش کی ہے۔ افسانے کے اختتام پر ساجدہ ایک باغیرت کردار کی صورت میں اُبھر کر فسانے کو ایک ڈرامائی نقطۂ عروج پر پہنچا دیتی ہے جس سے کہانی بڑی جاندار ہوگئی ہے۔

"مجرم" میں کھاتے پیتے خوش حال گھرانوں کے کردار اپنے تمام تر روحانی (انتشار FRUSTRATION) کے ساتھ پیتے پلاتے اور رنگ رلیاں مناتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں۔ سگرٹ، شراب اور عورت اُن کی وہ پناہ گاہیں ہیں جہاں وہ دنیا کے حقائق سے نظریں بچا کر اپنے خود ساختہ غموں کو ڈبو جاتے ہیں اور ان کے ساتھ خود بھی ایسے ڈوبتے ہیں کہ پھر نہیں اُبھرتے۔ "ہذا من فضلِ ربی" کے کرداروں کی طرح ان لوگوں کی محبت بھی ایک کھیل اور تفریح سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ زندگی کا رس نچوڑنا ان کا نظریۂ حیات ہے۔ یہی مقصد ہے جیتے اور اسی مقصد کے لیے مرتے ہیں۔ یہ افسانہ اپنی بھرپور کردار نگاری کی وجہ سے خاصے کی چیز ہے۔ اگرچہ اس کہانی کے متعدد کردار ہیں اور ہر کردار اپنی دو رُخی شخصیت کی وجہ سے ایک کشش رکھتا ہے لیکن اس کہانی کا حقیقی موضوع خالد، ثریا اور عطیہ کی مثلث کے گرد گھومتا ہے۔ باقی کردار اس مثلث میں رنگ آمیزی کرنے کے لیے اپنے اپنے رنگ بکھیرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ سارے ہی رنگ کچے ہیں۔ البتہ رب نواز ایک سنجیدہ اور متحرک کردار ہے۔ اُس کے چبھتے ہوئے تہہ دار فقروں سے مصنف نے اس طبقے کی بناوٹ اور گھناؤنے پن کا عمدگی سے انکشاف کیا ہے۔ وہ اُس سوسائٹی کے متذبذب کرداروں کا نمونہ بردار ہے جو اپنے داخلی انتشار اور جنسی کج روی کے باوجود سطح پر بڑے مطمئن نظر آتے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہیں، ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے ہیں اور انھیں بزعم خود سوسائٹی کی عزت کا بھی بڑا خیال ہے۔ عطیہ کا کردار اس کہانی کا سب سے پُرخلوص کیریکٹر ہے، جو سب کے سامنے خالد سے اپنی محبت کا برملا اظہار کرکے، 'خالد بھائی' کے راز کو اُس وقت طشت ازبام کر دیتی ہے جب 'خالد بھائی' اپنی بیوی ثریا کو ہی اپنی محبوبہ کا درجہ بھی دے چکے ہیں۔ عطیہ کے ذیلی مکالموں سے اس اونچی سوسائٹی کا بھرم کھل جاتا ہے اور خالد اور ثریا کی محبت کا محل دھڑام سے گر جاتا ہے جس کے نیچے دب کر عطیہ شہادت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے:—

"خالد بھائی! ثریا باجی سے شادی کرنے کے بعد آپ نے مجھ سے دوسری بے وفائی کی —
خالد بھائی نے بتایا کہ تمہارے قریب رہنے کا یہی تو ایک بہانہ ہے کہ میں ثریا سے شادی کر لوں"

"سلطان" بھی ایک کرداری کہانی ہے جو اگرچہ ہماری شہری زندگی ہی سے متعلق ہے۔ اگر ایک انتہائی نچلے طبقے کی نمائندگی کرتی ہے۔ "سلطان" دیکھنے کو ایک اندھے بھکاری کا بچہ ہے جس کا نام نبہ بیروں، خانساموں، چپراسیوں اور بہتروں سے بھی کمتر ہے لیکن درحقیقت وہ ہماری نئی پود کی علامت بھی ہے۔ سلطان کے کیریکٹر کا زوال دراصل ہماری موجودہ تہذیب اور آئندہ نسل کا انہدام بھی ہے۔ یہ ارباب بست و کشاد کے لیے لمحۂ فکریہ بھی مہیا کرتا ہے

اور متمدن معاشرے پر ایک مستقل طنز بھی بن جاتا ہے۔ اس کہانی کے دوسرے دو کردار بھی دو بڑی علامتوں کے طور پر ابھرتے ہیں۔ دادا ایک طرف مظلومیت کا نشان ہے اور دوسری طرف سلطان کی شخصیت کا ایسا کابوس ہے کہ دادا کی دعائیں بھی اُس کے راستے کی دیوار بن جاتی ہیں۔ دادا کا ہاتھ سلطان کے لیے تقدیر اور جبر کا ایک ایسا خوفناک سمبل بن جاتا ہے کہ دادا جب اُس کے سر پہ ہاتھ بھی رکھتا ہے تو اُس کی جان لبوں تک آجاتی ہے۔ زیبو کا کردار ماں کی ممتا کا اشاریہ ضرور ہے مگر سلطان کی روٹھی ہوئی تقدیر کی طرح سارے سہارے ایک ایک کر کے اُس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور وہ کسی انجانی منزل کی تلاش میں تن تنہا سڑکوں پر سر لگاتا نظر آتا ہے اور ایک سوالیہ نشان بن کر ہمیں چونکاتا پھرتا ہے۔

"بابوجی! خدا آپ کا بھلا کرے۔ خدا آپ کو بہت دے۔ کیا آپ ذرا دور تک میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر
چل سکیں گے ... " اور سنو ... بابو احمقوں کی طرح ہجوم کو دیکھنے لگتے ہیں ...

کیا مروجہ نظام اقدار اس ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے؟ یہی اس افسانے کا استفہامیہ ہے جس کو افسانہ نگار نے بڑی کامیابی کے ساتھ علامتوں کے ذریعے ہمارے شعور تک منتقل کیا ہے۔

"بندگی بیچارگی" اس مجموعے کا آخری افسانہ ہے۔ یہ افسانہ شہر و دیہات کی تہذیبوں کا ایک ایسا سنگم بن گیا ہے جہاں پہنچ کر شہر و دیہات کی زندگیاں ملتی تو ضرور ہیں مگر شیر و شکر نہیں ہو سکیں، کیونکہ ابھی راستے میں دو چار بڑے سخت مرحلے باقی ہیں۔ اس کہانی کا بنیادی کردار امین ایک سادہ اطوار دیہاتی لڑکی سے شادی رچاتا ہے مگر جب اُسے دیہات سے شہر میں لاتا ہے تو وہ انتہاؤں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف بیوی اُس کے نزدیک ایسی دولت ہے جس کی اصل جگہ گھر کا بنک ہے، اور دوسری طرف وہ زندگی میں آگے بڑھنے اور اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لیے بیوی اور باس کی بیگم میں بہناپے کا رشتہ بھی ضروری سمجھتا ہے۔ یہی دوسری انتہا امین کو شرابی اور مغربیت کا نقال بنا دیتی ہے۔ اسے یوں شراب کی لت پڑ جاتی ہے کہ اس کی کوٹھی مجلسی منڈی بن جاتی ہے۔ بانو امین کے ہاتھوں سے دہرے ظلم کا شکار ہوتی ہے۔ امین پہلے تو بانو کو دیہات کی فطری آزادہ روی سے محروم کر کے اُسے غیر فطری طور پر گھر کی چار دیواری میں مقید کر دیتا ہے اور پھر جب اُس کے گھر میں افسروں اور اُن کی بیگمات کا اکھاڑہ جمتا ہے تو وہ شراب کے نشے میں دھت غیر فطری طور پر اُس کی پردہ دری پر اُتر آتا ہے کہ اُس کے ہاں اب یہی آزادی کا سود مند تصور ہے:۔

"آج سے تمھارا پردہ ختم۔ میں نے شراب پی ہے۔ تم بھی پیو۔ میرے افسروں سے ہاتھ ملاؤ۔ میرے
افسروں کو لڈی دکھاؤ۔ میرے افسروں کو خوش کرو۔ بنیا ڈارلنگ"

یہ حکم دے کر امین بانو کے قدموں پر سر ٹیک کر دیں رونے لگتا ہے کہ یہ افسانہ ختم ہوتے ہوئے کرداروں کا المیہ بن جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کہانی کا تار و پود بیشتر طربیہ کے عناصر سے بنا گیا ہے مگر نقطہ عروج پر پہنچ کر یہ افسانہ ایک ایسے موڑ کی طرف مڑ جاتا ہے جہاں قہقہوں اور آنسوؤں کے درمیان امین کے اظہار مرض (KATHARSIS) سے ٹریجڈی کے باوجود فضا دھل کر نکھر جاتی ہے اور ہمیں امین کی بندگی بیچارگی کے ساتھ ساتھ بانو سے اس کی پرخلوص محبت کا بھی یقین آجاتا ہے۔ افسانے کے گٹھے ہوئے پلاٹ اور نوخیز کرداروں نے کہانی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ ہم نے احمد ندیم قاسمی کے فن اور اُس کے گیارہ افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ حسنِ اتفاق دیکھیے کہ پانچ افسانے دیہاتی زندگی کے مسائل پیش کرتے ہیں اور پانچ ہی افسانوں کا تانا بانا شہروں کے ارد گرد بنا گیا ہے۔ آخری افسانے میں شہر و دیہات کی زندگی کے ڈانڈے کچھ اس طرح ملتے نظر آتے ہیں کہ اس سے کتاب میں ہم آہنگی اور ایک دلکش توازن پیدا ہو گیا ہے جو ندیم کی اپنی شخصیت کا آئینہ ہے۔

سحر انصاری

دشتِ وفا کا سفر

"دھڑکنیں" "رم جھم" "جلال و جمال" اور "شعلۂ گل" کے بعد احمد ندیم قاسمی کا شعری مجموعہ "دشتِ وفا" منظرِ عام پر آیا۔ اس "دشتِ وفا" میں عہد و پیماں کی ریگِ رواں بھی ہے، ارمانِ مضطرب سے اٹھتے ہوئے نا آسودہ بگولے بھی۔ شفق رنگ فضائیں بھی ہیں اور گرم و سرد زمانہ کی ہوائیں بھی۔ تجربۂ وفا کے رشتے سے دیکھیے تو اس کا انداز کچھ یوں ہے کہ جب شبستانِ وجود کی کنیزیں بسترِ شب سے مرجھائی ہوئی کلیاں چننے لگتی ہیں تو نکہت و رنگ آندھی بن کر دشتِ وفا میں دھول اڑاتے ہیں۔ اس طرح جلال و جمال کے تجربے ایک انوکھے پیرایے میں "دشتِ وفا" کی پہنائی کا تعین کرتے ہیں۔

"دشتِ وفا" کے سفر میں زادِ راہ کے طور پر اس پس منظر کو ساتھ رکھنا ضروری ہے جس کو خود احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا پس منظر کہنا بھی درست ہوگا۔ یعنی ترقی پسند تحریک۔ یہاں میں اس تحریک کے آغاز اور سرگرمیوں پر روشنی ڈالنے کے بجائے اس امر پر زور دینا چاہوں گا کہ ترقی پسند تحریک کو بھی تاریخِ انسانی کی دوسری تحریکوں کی طرح صحیح تناظر میں دیکھنے کی کوشش ضروری ہے۔ اس تحریک کے مخالفوں کی تحریروں کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی تہہ میں ضرور کسی نہ کسی ذاتی رنجش یا ذاتی مفاد کا عنصر کارفرما نظر آئے گا۔ گویا جو ادیب اپنے مفادات کی پیمائش میں ترقی پسندوں سے تعاون حاصل نہ کر سکے وہ ان کے اور سارے ترقی پسند ادب کے دشمن اور مخالف بن گئے۔ میں نے ذاتی تجربے اور ترقی پسندوں کے مخالفین کی تحریروں کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ان دنوں جو لوگ ترقی پسند تحریک کے بارے میں مخالفانہ انداز سے لکھ رہے ہیں۔ ان کے پاس دلیلیں ختم ہو گئی ہیں اور کوتاہ نظری کی کیفیتیں زیادہ اجاگر ہو گئی ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے بارے میں مجھے اپنی بات کی وضاحت یوں ضروری محسوس ہوتی ہے کہ اس کے بغیر ندیم اور ان کے عہد کی شاعری کے ساتھ انصاف ذرا کم ہی ممکن ہے۔ آغاز کے طور پر میں جورج لوکیش (GEORG LUKACS) کے اس بصیرت افروز مطالعے کا حوالہ دینا چاہوں گا جس میں انھوں نے نپولین کی جنگوں اور انقلابِ فرانس، نیز شعورِ قومیت اور نظریاتی جد و جہد کے عوامل سے بحث کی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دنیا میں قومی بیداری کی تحریکیں نپولین کی جنگوں کا ردِ عمل تھیں اور انہی تحریکوں اور ردِ عمل کی صورتوں نے پہلی بار وسیع پیمانے پر عامۃ الناس کو تاریخ کے شعور اور تاریخ کے تجربے سے آگاہ کیا۔

دراصل تاریخِ انسانی میں عوامی تجربۂ تاریخ (MASS EXPERIENCE OF HISTORY) کا آغاز ہوا۔
اس پس منظر کی روشنی میں اگر تاریخ کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ہر دور کے مزاج کو ایک نہ ایک کلیدی اصطلاح کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے انگلستان کا کلیدی لفظ "ارتقا" تھا۔ اسی زمانے میں برصغیر میں "اصلاح" کو یہی حیثیت حاصل تھی۔ اس نے سارے عہد کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ راجہ رام موہن رائے، سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی ساری تحریکیں اسی لفظ کی عملی تعبیریں تھیں۔ ادب چونکہ سماجی زندگی اور اس کے تجربات کے مطالعے کے لیے ایک اہم دستاویز ہوتا ہے اس لیے "اصلاح" کے اثرات اس دور کے سارے ادب میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ پھر یہ اصلاح نہ صرف طرزِ معاشرت بلکہ خیالات، عقائد، اظہار، ردّ و قبول اور اقدار و افکار غرض ہر شعبۂ حیات میں کارفرما نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں سر اٹھانے والی دوسری ساری تحریکیں اپنی تاریخی اہمیت کے باوجود ماند پڑ گئیں۔ یہی حال بیسویں صدی کے نصف اول کا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم اور انقلابِ روس کے بعد برصغیر میں "آزادی" کو لفظِ کلیدی کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ آزادی کا تصور اور آزادی کی امنگ زندگی کے ہر شعبے میں اپنا اثر دکھانے لگی۔ غلامی سے نجات کی تحریک کے ساتھ ساتھ ذہنی آزادی، ہر قسم کی تعبد و جبر اور فرسودہ نظریات و عقائد سے آزادی کا شعور بیدار ہوا۔ ترقی پسند تحریک چونکہ اس قسم کی ہمہ گیر آزادی کے شعور پر مبنی تھی اور آزادی کا شعور رکھنے والوں کو ذہنی اور فکری تقویت دے سکتی تھی اس لیے برصغیر کی تمام زبانوں کے ادب پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ مستقبل قریب میں کوئی ادبی تحریک شاید ہی اس قدر ہمہ گیر اور دور رس ثابت ہو سکے۔ یہ تحریک ایک ہمہ گیر تصور کے ساتھ معنویت کا سرچشمہ تھی۔ یہ ترقی پسند تحریک محض درآمد شدہ نہیں تھی۔ ہمارے ادیب اور شاعر ذہنی طور پر مغرب میں رونما ہونے والی کسی نہ کسی ادبی تحریک یا میلان کو درآمد کرتے اور مقدور بھر اس کی وکالت و ترویج میں کوشاں رہتے ہیں لیکن ہر تحریک یا میلان مختصر سی مدت کے بعد ہی دم توڑ دیتا ہے یا یوں کہیے کہ ذہنوں پر اثر انداز ہونے سے قاصر رہتا ہے۔ ادب کی کوئی درآمد تحریک اسی وقت مؤثر، ہمہ گیر اور دیرپا ہو سکتی ہے جب وہ برصغیر کی سماجی، سیاسی اور تاریخی زندگی کے کسی ہمہ گیر رجحان کی نمائندہ ہو یا اس کو تقویت پہنچا سکتی ہو جس طرح ترقی پسند تصورِ آزادی اور جذبۂ آزادی کی دین تھی۔

ترقی پسند تحریک سے احمد ندیم قاسمی کی وابستگی کا سب سے بڑا محرک ان کی انسان دوستی ہے۔ ابتدا ہی سے ان کے یہاں عظمتِ انسان کا احساس اور تقدیرِ آدم کا ادراک نمایاں ہے۔ ترقی پسند تحریک کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ بھی انسان کو اس کی عظمتِ گم شدہ سے ہم کنار کرنا اور تقدیرِ آدم کے رموز کو فاش کرنا ہے۔ اس لیے احمد ندیم قاسمی کی اس سے وابستگی فطری تھی۔

احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا ارتقا جس نہج پر ہوا ہے اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ندیم تاریخی رجائیت کے شاعر ہیں۔ انھیں ماضی اور تاریخ کے وہ تمام محرکات اور شخصیتیں عزیز ہیں جن سے رجائیت کو تقویت ملتی ہے۔ حال اور فردا سے ان کی وابستگی ایک رجائی کی وابستگی ہے۔ لیکن ان کی رجائیت خوش خیالی یا حسنِ ظن پر مبنی نہیں۔ انھوں نے سرشتِ انسان کے کچھ ایسے نقش و نگار تلاش کیے ہیں کہ ان کی رجائیت کبھی مایوسی اور تشکیک میں مبتلا نہیں ہونے پاتی ہے

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر
کسی بھی شہر میں جاؤں غریبِ شہر نہیں

وہ لمحۂ موجود کو تاریخی تناظر میں دیکھتے ہیں اور حال کے المیہ یا طربیہ کو انسانی صداقت کے طور پر اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری اس کشمکش کی بھی مظہر ہے جو بیک وقت معاشرے اور انسان کی ذات میں کارفرما رہتی ہے۔

عظمتِ انسان کا سراغ لگاتے ہوئے وہ "دھڑکنیں" سے "دشتِ وفا" تک پہنچے ہیں اور ہنوز یہ سفر جاری ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اقدار کی شکست و ریخت کے اس عہد میں بھی ندیم مجموعی طور پر انسان سے مایوس نہیں ہیں۔ غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ گزشتہ ربع صدی میں ذہنی وفاداریوں کے بہت سے مرحلے ترک و قبول کے کتنے ہی پیغام لے کر آئے ہیں۔ اس عالم میں ایک طرف شیشۂ دل کو سلامت رکھنا اور دوسری طرف کارِ سخن پردازی کو آہنگِ وقت کے مطابق جاری رکھنا بڑا صبر آزما کام تھا۔ ایسے ہی مرحلوں پر متعدد لوگ زندگی کی مقصدیت ہی سے منکر ہو گئے۔ دل برداشتہ ہو کر خود اپنے لیے اجنبی بن گئے گویا ذہنی وضع داری یا نظریاتی وفاداری کوئی نقاب تھا جسے انھوں نے اپنا رول ادا کرنے کے بعد اتار دیا۔ یا پھر اسٹیج کے کسی ہدایت کار یا شریک اداکار سے اختلاف کی بنا پر کشمکش میں حصہ لینے ہی سے انکار کر دیا اور لمبا ریہرسل پر صرف ہونے والی ساری محنت اور وقت دونوں ہی رائیگاں ٹھہرے اور ان الفاظ کا بھی کوئی مفہوم نہ رہا جنھیں زیادہ سے زیادہ فطری انداز میں "ادا" کرنے کے لیے بار بار دہرانا پڑا اور اس مشق و مزاولت میں اپنا لہجہ بھی گنوا دینا پڑا۔ اسی سفر میں ایک ایسا گروہ خود بخود بن گیا جو الزام تراشیوں میں اپنی مصلحت پسندی اور عزلت نشینی کے جواز ڈھونڈتا رہا۔ ایک اور گروہ ایسا بھی ابھرا جس نے اپنی کلبیت (CYNICISM) کو فن کی قلندری اپنی بے باکی اور سربازار ننگی گالیاں دینے کے مسلک میں چھپایا اور ساری کلبیت کو ایک فلسفہ بنا کر گویا نئے عہد کے پیغمبر بن جانے کا اشتہار دیا جانے لگا۔ اس قسم کے متعدد ادیب و شاعر اب تخلیق کے پردے میں پیمبری کی کاپی رائٹنگ (COPY-WRITING) کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ پیغمبرِ وقت کے اس سیلابِ متواتر میں انسان اور اس کے مسائل کے بارے میں سوچنے اور لکھنے والے چند ہی شاعر بچ گئے ہیں جو گرم و سردِ زمانہ سے نمٹتے ہوئے برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی بھی انہی میں سے ہیں۔ وہ اپنے چند ہم عصروں کی طرح آج بھی ہمیشہ کی طرح روشنی کے متلاشی ہیں۔ اور شاید اسی لیے وہ شپرہ چشموں کی طرح روشنی کی تعبیروں اور تفسیروں میں الجھنا نہیں چاہتے۔ ان کے ذہن میں ہے

سحر کا ایک ہی مفہوم ہے، طلوعِ سحر
مجھے فریب نہ دیں روشنی کی تفسیریں

افراتفری کے اس دور میں جن شاعروں نے تعبیروں اور تفسیروں سے الجھنے کے بجائے اقدارِ حیات اور انسانی سچائیوں کا ساتھ دیا ہے وہ اب خاصی محدود اقلیت میں رہ گئے ہیں اور احمد ندیم قاسمی اسی محدود اقلیت کے ایک ممتاز رکن ہیں۔ یہاں میری مراد یہ نہیں کہ ان کی شاعری یا حسیات کی ترسیل محدود اقلیت کے لیے ہے۔ وہ ہمہ گیر انداز سے سوچتے ہیں اور ان کے مخاطب بھی وہی ہیں جو خوابوں کے سفر میں ان کے ساتھ ہیں۔ انھیں اس دور کے فن کاروں کے انحطاط کا بھی احساس ہے۔ وہ فن کار کو اس عہدِ گزشتہ کی یاد دلاتے ہیں جب ان کی کراماتِ فن عام تھیں ۔

اب تک ہیں مجھے تیرے خیالوں کے سفر یاد
جلتے تھے دیے جب ترے نقشِ کفِ پا پر
دریوزۂ جذبات کے باوصف، بظاہر
صرف اپنی لکیریں تھیں ترے دستِ دعا پر
یہ ذہن کے فردوس ترے فن کے نشاں تھے
یہ بھی کبھی سوچا کہ قدم تیرے کہاں تھے

"دشتِ وفا" کے سفر میں سب سے پہلا منظر جو دامنِ دل کو اپنی سمت کھینچتا ہے وہ ندیم کا تصورِ اقدار ہے۔ انھیں اس بات کا غم ہے کہ ؎

زخم در زخم محبت کے چمن زار میں بھی
فقط اک غنچۂ منطق کے گدا ہیں یہ لوگ

غنچۂ منطق کا گدا کہہ کر ان تمام مجنوں کا پردہ چاک کر دیا ہے جن سے نت نئے الجھنوں اور ابہام لزرا ئیل کا آنا ہوتا ہے۔ وہ ان کی تسکین کے لیے یوں گویا ہوئے ہیں۔ ع

یوں بجھ بیں کہ ببولوں میں بھی پھول آتے ہیں

تو دراصل "دشتِ وفا" کا سفر اسی احساس کا محرک ہے کہ ببولوں میں پھولوں کی نمود پر نگاہ رکھنے سے زندگی کے جلال و جمال کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا "تنوع" "دشتِ وفا" میں بھی پوری طرح نمایاں ہے۔ ہیئت کے تجربوں کے ساتھ ساتھ اسالیب اور مضامین میں بھی ان کے یہاں تازہ کاری پائی جاتی ہے۔ وہ آہنگِ عصر کا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن اس طرح نہیں کہ ان کا اپنا انفرادی آہنگ گم ہو جائے۔ ندیم کا بنیادی مزاج اپنے ہم عصروں کی طرح رومانوی ہے۔ لیکن یہ رومانویت اختر شیرانی کی رومانویت سے مختلف ہے کہ اختر رومانویت کے اس میلان کا پرتو لیے ہوئے تھے جس میں فطرت کی سادگی دعوتِ پرستش دیتی ہے۔ لیکن ندیم اور ان کے ہم عصروں کی رومانویت میں مناظرِ فطرت کی دلکشی کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت کو بھی شامل کر لیا گیا ہے اور ان کے یہاں فطرت پرستش کے لیے نہیں بلکہ تسخیر کے لیے ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے عظمتِ انسان کے آورش کی ایک جھلک "اسپوتنک" کی پرواز میں دیکھی۔ انھیں یوں لگا جیسے جنتِ آدم ایک مدت سے جو خواب دیکھ رہی تھی وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ اور تسخیرِ کائنات کا رومانوی تصور حقیقت سے ہم کنار ہونے لگا۔ یہاں وہ جمالِ انسان کو اوجِ کمال پر دیکھتے ہیں اور بڑی خوبی سے اسے ایک جمالیاتی کیفیت میں ڈھال کر کہتے ہیں ؎

قمر تو اس سے تنی ہوئی خلا میں
انسان کا فیصلہ سنا دو
یہ فرش ہے عرش قدسیوں کا
اس وہم کو واقعہ بنا دو

اے جنتِ گم شدہ کے رازو
آدم اُبھرا ہے، راستہ دو
اے حوصلو! میرا ساتھ دو تم
اے ولولو! تم مجھے دعا دو

یہاں ندیم کا وہ وژن کمس ہوتا دکھائی دیتا ہے جس سے کام لے کر انھوں نے کہا تھا ؎

یہ زمیں! یہ خلا کی وسعتیں
آدم نَو کے انتظار میں ہے

اس پس منظر میں یہ سمجھنا چنداں دشوار نہیں کہ ندیم کے ذہن میں آدم نو کا کیا تصور ہے! ان کا یہ تصور نہ نطشے کے فوق البشر سے ماخوذ ہے نہ جیلی کے انسانِ کامل سے اور نہ اقبال کے مردِ مومن سے ان کا آدم نو کسی دنیائی یا الہامی بلندی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ وہ اسی چ رولیداری عناصر کو بہشتِ بریں میں بدلنے کے خواب کی تعبیر ہے۔ اسی بنا پر وہ اس انداز سے سوچتے ہیں ؎

ممکن ہے فضاؤں سے خلاؤں کے جہاں تک
جو کچھ بھی ہے، آدم کا نشانِ کفِ پا ہو
ممکن ہے کہ جنت کی بلندی سے اُتر کر
انسان کی عظمت میں اضافہ ہی ہوا ہو

فطرت اور انسان کے مابین تصادم و تحارب کے نتیجے میں چونکہ وہ انسان کو بتدریج کامران پاتے ہیں اس لیے انسان ہی کو اس کائنات کا سب سے اہم وجود سمجھتے ہیں۔ اور خوش فہم انسان پرستوں کی طرح انسان کی محض قصیدہ خوانی کی کوشش کرنے کے بجائے وہ انسان کے طبقاتی وجود کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اسی لیے ایک طرف اگر وہ افلاس و نکبت کے مارے ہوئے انسان کو موضوع بناتے ہیں تو دوسری طرف اس حقیقت پر بھی ان کی نگاہ ہے کہ

جاگا ہوا انسان بھی تو موضوعِ سخن ہے

دراصل ندیم یہ چاہتے ہیں کہ دل کے پھپھولے سے لے کر داغِ خورشید تک فن کار کی چشمِ نگراں کا سفر جاری رہے۔ اور اس سفر میں اسے ایک ایک پل میں معنویت کے جہان کی تلاش رہے۔ وہ زندگی کے ان مشاہدوں کو مختلف اشاروں اور علامتوں میں پیش کرتے ہیں ؎

اک پل کی زندگی ابدیت سے کم نہیں
کس شان سے چلی ہے سواری حباب کی

مبہم سی ایک آس پہ انسان زندہ ہے
جلتی ہے لَو، چراغِ حقیقت میں خواب کی

وہ انسان اور زندگی کی عظمت کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ جب انسان کے دوسرے روپ پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہنوز انسان بھی انسان سے آگاہ نہیں ہے۔ یہاں ان کے اشارات واضح لیکن شاعرانہ خلوص لیے یوں ابھرتے ہیں ؎

ابھی انسان سے پوشیدہ ہے انساں کا جمال
ایک کہتا ہے غزل، ایک بناتا ہے بم
ایک کو دل بھی بہت، ایک کو آفاق بھی کم

انسانی معاشرے کے ان تضادات کا وہ اس حد تک شکار رہے کہ اپنے بعض ہم عصروں کی طرح ندیم کو بھی قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ پاکستان میں آمریت کے آغاز کے ساتھ ہی جن تخلیق کاروں کو پسِ دیوارِ زنداں سے روشناس کرایا گیا ان میں احمد ندیم قاسمی بھی تھے۔ "دشتِ وفا" کے سفر میں وہ زندانِ بلا بھی راہ میں پڑتا ہے جہاں سے ندیم کی آواز یوں سنائی دیتی ہے ؎

ہیں حلقۂ زنجیر کا ہم خندۂ جاوید
زنداں میں بسائے ہوئے اک شہرِ طرب ہیں

حسن فن کار کو پکارتا ہے
سنگ و آہن کے اس حصار میں بھی

ندیم نے نظموں میں اچھوتے محاکات و تلازمات کے استعمال سے "دشتِ وفا" کو بھی اپنے سابقہ مجموعوں کی طرح جاذبِ توجہ بنا دیا ہے۔ کلام کی معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ لفظی جمالیات کے نقطۂ نظر سے بھی ندیم کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے جس سے ان کے مصرعوں کی ساخت، الفاظ کی صوتیات اور تخییلی تلازمات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ندیم فن کے نکات و رموز کو بڑے سلیقے سے برتتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جدیدیت کا وہ انداز تو نہیں ہے جس میں صرف الفاظ سے چونکانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن وہ شاعری کے جدید معنوی تغیرات کا پورا شعور رکھتے ہیں۔

ندیم کے یہاں حسن، وفا، محبت اور معیارِ عشق کے نازک مضامین نظم میں بھی ادا ہوئے ہیں۔ لیکن غزل میں انھوں نے ان مضامین کو ایک اور ہی روپ دیا ہے۔ ندیم کی غزل اُن کی شاعری کے مجموعی مزاج کا ایک انوکھا رنگ ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارا کرتا ہے کہ وہ جذبے اور فکر کو اصنافِ سخن میں تقسیم کرنے کے قائل نہیں۔ بلکہ ایک سچے اور باشعور فن کار کی طرح وہ جس صنفِ سخن کو بھی اپناتے ہیں۔ اس میں اپنے شاعرانہ اظہار کی ساری خصوصیات یکجا کر دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے قطعات، نظموں اور غزلوں میں یکساں حسن، دل کشی اور تازگی ملتی ہے۔ میں نے مجموعی طور پر ندیم کی شاعری کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کی چند جھلکیاں غزل کے ان اشعار میں ملاحظہ کیجیے ؎

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیِ فن یاد آئی

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذنِ کلام
ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں

فصلِ بہار میں بھی وہ تھی ہیبتِ خزاں
دستِ دعا بنی رہی پتی گلاب کی

قفس کی تیرگی کچھ کم نہ تھی ہول آفرینی کو
کرن کے روپ میں تلوار رکھ دی کس نے روزن پر

صبح کو راہ دکھانے کے لیے　　　دستِ گل میں ہے دیا شبنم کا

طاق پر جس کے کبھی ایک دیا تک نہ جلا
ہم تو اُس گھر کو بھی اللہ کا گھر کہتے ہیں

تجھ سے مل کر تجھے پا لینے کی حسرت جاگی
کچھ نئے خواب ترے خواب کی تعبیر ہوئے

تیرے جاتے ہی یہ محسوس ہوا　　　عمر گزری تجھے پل بھر دیکھے

غمِ جاناں غمِ دوراں کی طرف یوں آیا
جانبِ شہر چلے دخترِ دہقاں جیسے

تخلیقِ زمیں کا عزم مت کر　　　ہم نے ترا آسماں بنایا

قدم قدم پہ اگر رک رہے ہیں دشت میں ہم
تو کیا کریں کہ تعارف ہے خار خار کے ساتھ

شاہد ہے شکستہ پائی اپنی　　　پہنچے نہیں ناگہاں یہاں ہم

(باقی صفحہ ۴۲۳ پر)

فتح محمد ملک

احمد ندیم قاسمی کا آدمی نو

شروع کرتا ہوں خدا کے نام سے جسے قدیم صوفی شعرا نے حُسنِ کُل کا نام دیا ہے۔ مگر احمد ندیم قاسمی کا انسان جس سے زیادہ حسین ہے تزئینِ حیات سے سامانِ ثبات کرنے والا آدم تو ندیم کو اتنا خوبصورت نظر آتا ہے کہ وہ خدا سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

تو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے — وہ ایک مسلسل ارتقا ہے
ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا

اب سے پندرہ سولہ سال ادھر اس نظم کی اشاعت خلافِ معمول ہنگامہ خیز ثابت ہوئی تھی۔ خلافِ معمول اس لیے کہ ندیم کے انداز کی طرح ندیم کا فن بھی ایک مسلسل ارتقا ہے۔ اس تدریجی ارتقا کے پیچھے ہمیشہ ایک توانا مثبت فکری نشوونما جاری رہی ہے جس کی بدولت ندیم اپنے فنی ارتقا کے کسی بھی مرحلے پر ہنگامہ خیزی کا شکار ہوئے نہ جدت کا — ندیم ہماری مخصوص شعر و ادب میں جس وقت داخل ہوئے تھے اس میں گوناگوں ہنگامے برپا تھے —— شاعرِ محفل اقبال تھے۔ مگر شرکائے محفل اقبال کو باہر نکال پھینکنے کے درپے تھے۔ وجہ یہ کہ اقبال جن فنی، تہذیبی اور سیاسی اقدار کے عاشق تھے۔ اُن سے ان مغرب زدگان کی بیزاری اور رومانٹک بغاوت گھن گرج میں بدلنے لگی تھی۔ اقبال کوہسار کی طرح اپنی جگہ قائم تھے۔ جب اپنی جگہ سے ہلتے نظر نہ آئے تو ان باغی اور شوریدہ سر نوجوانوں نے خود ہی محفل کو خیرباد کہا بلکہ خیرباد کہنے کا اعلان کر کے واک آؤٹ کیا اور اپنی الگ الگ محفلیں سجانے کے اہتمام میں لگ گئے۔ اس کے برعکس ندیم اس طرح کے کسی منفی رویہ کو اپنانے کی بجائے انتہائی مثبت انداز میں اس محفل کی فضا کو اپنی شخصیت میں جذب کرنے میں کوشاں ہو گئے۔ چنانچہ ندیم نے اقبال کی عظمت سے خوف کھانے یا اس پر برہم ہونے کی بجائے ایک خوش عقیدت کے ساتھ اقبال کی عظمت کی فکری اور جمالیاتی بنیادوں کو سمجھنے اور ان سے اکتسابِ فیض کرنے کا رویہ اپنایا۔ مگر اس اہتمام کے ساتھ کہ اقبال کے خلاف ردِ عمل کا مظاہرہ کرنے والے نوجوان جن محفلوں کے

آراستہ کرنے میں مگن ہیں اُن سے بھی زندہ روایت قائم رہی ہے۔ نئی نسل کے ادبی مراحل طے کرتے ہوئے بھی ندیم کی فنی انفرادیت کا راز اسی مثبت انداز نظر میں پوشیدہ ہے۔

یہ انداز نظر اس گہری اور عملی روحانیت کا کرشمہ ہے جس کے گہوارے میں ندیم نے آنکھ کھولی۔ ایک ایسے زمانے میں جب مغرب کے مادی نظریات کی یلغار سے ہماری تہذیب اور ہماری سماجی اقدار انتہائی خطرناک بحران میں مبتلا تھیں ندیم کا مادی اعتبار سے بے آب و گیاہ مگر دیہاتی اور روحانی طور پر سرسبز و شاداب ماحول میں پرورش پانا ندیم کی ... ساتھ ہی ساتھ ہماری شاعری اور تہذیب کی خوش بختی ہے۔ تپتے ہوئے ویرانوں میں اپنے چھوٹے سے بچے کی انگلی پکڑے ہوئے انجانے جھیل کی تلاش میں گھومتی بل کھاتی پتھریلی راہوں پر سرگرداں اور سکون جانے سے پہلے سب کچھ نہ پا سکنے پر اپنے آنسو ماں کی آنکھوں سے رواں دیکھنے والا احمد شاہ ترک دنیا کرنے والے باپ کے ... سوچتا ہوگا اس بچے کو وہ راہ کے عشق حقیقی کی ان منزلوں کا خیال آتا ہوگا جن کی دھن میں اس کے اباجی سرگرم سفر تھے۔ اس کے ... دنیا جہان کے ... سے کتنے مختلف تھے؟ ... اپنے ... ماں کی ... تھیں اور بلند لوند کے ساتھ اترنے والے فرشتوں کی ... سے ... سمجھتی تھیں کہ وہ ان بچوں کے پیدا ہونے کا حق ادا کر سکے۔ ... کس قدر عجیب تھے کہ ... سمجھتے تھے ... کے ساتھ ساتھ عاقبت سنوارنے میں یوں تو تھے کہ ندیم کو پانچویں جماعت میں ہی تفسیر ... پڑھنے لگے اور وہ بھی اس شخص سے جو میر حسن کا شاگرد اور اقبال کا ہم درس رہ چکا تھا۔ اور ... اور امیر مینائی کی شاعری سے ... ہونے کے باوجود تفسیر کے دوران حسان بن ثابت، سعدی، حافظ، غالب اور اقبال کے اشعار ... کرتے کا عادی تھا۔ یہ ہیں وہ کردار جو ندیم کی تعلیم و تربیت میں مرکزی اہمیت رکھتے ہیں جن کی شخصیتیں محبت، معصومیت اور تقدس سے عبارت ہیں اور جن کی بدولت ندیم کی ... زندگی کا سب سے پہلا ... دن وہ تھا جب وہ مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر مرثیہ لکھتے ہیں۔

ندیم کا یہ مرثیہ جدید اردو شاعری کا بے حد معنی خیز واقعہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہمارے ادبی افق پر ... یار ... نیاز فتح پوری اور اختر شیرانی کی رنگین مزاج اور ... زدہ روایت چھائی ہوئی ہے۔ ایسے میں ... کی موت سے متاثر ہونا۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ زمانہ طالب علمی میں بھی ندیم ... خواب اور رومان کی وادیوں میں پناہ لینے والے اور ... نوجوانوں کے ... تخلیقی دلچسپی رکھتے تھے ... روایت ابتدائی زندگی کی افراتفری خفقان شباب کی ... جوانی کی شکست ... ندیم کو اس زمانے میں بھی ... کے ... "تہذیب نے ... " ... بل جوتے رکھا ... زمانہ عالمگیر طور پر ... نقش اور جذباتی ... زمانہ ہے اقتصادی اور جذباتی بحران سے بھنور میں چکراتے ڈوبتے نوجوان کا کرب دیتی ہے۔ اس عظیم انسانی کرب کی ... گہری ... میں ... اور ... کی ابدی اور ... اقدار ... لوٹ لیا ہے ... انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا ... اور فرائیڈ کے ہاتھوں معصومیت ... انسان کے ... بیان ہے اور ...

ہونے والے نئے سے نئے نظریات اسے مسلسل ویران سے ویران تر کرتے جا رہے ہیں، مگر ندیم تخریب اور ویرانی کے ان مناظر میں ایک نئی دنیا کی تعمیر اور ایک نئے آدم کے ظہور کی جھلک دیکھتے ہیں ؎

زمیں پہ وہ قیامت کا دور آیا ہے کہ ہر بسیط حقیقت ہے جاں کنی سے دوچار
دباؤ ذہن پہ صرف ایک پھول کھلنے سے بٹی ہیں کتنی فصیلیں، گرے ہیں کتنے حصار
بجھی ہیں کتنے بڑے فلسفوں کی قندیلیں ملا ہے خاک میں کتنے علوم کا پندار
وہ آدمی جو نکالا گیا تھا جنت سے شعاع بن کے قمر افگن و ستارہ شکار
ہیں لمحہ لمحہ کی زد میں صدی صدی کے اصول
کہ ہو رہی ہے نئی صبحِ آگہی بیدار (صبحِ آگہی)

ندیم عالمگیر انتشار اور تخریب کی اس فضا میں نئی تعمیر کی جھلک اس مثبت طرزِ فکر ہی کی بدولت دیکھ پائے ہیں جو فطرت کے حسنِ تخلیق اور انسان کی نیرنگیٔ ارتقا سے ان کی گہری شناسائی کا نتیجہ ہے اور جس کے باعث ان کے نزدیک ہر دور بیک وقت تخریب اور تعمیر کا دور ہے ؎

جہاں سے شاخ ٹوٹی ہے، وہیں سے شاخ پھوٹی ہے نمو کی قوتیں اس زخم کو بھرنے نہیں دیتیں

گرتا ہے جہاں بھی کوئی ٹھنٹھ پھوٹ پڑتی ہے اک نئی کونپل

خشک شاخوں پہ نمو کے یہ نگینے کیا ہیں زندگی ہے اگر اک پیڑ کی ڈھلتی چھایا

بہ فیضِ لذتِ تخلیق خون ہو کے کلی خود اپنے زخم کے پردے میں مسکراتی ہے

قبروں پہ لہک رہا ہے سبزہ تخلیق کی ہر ادا نرالی

جب چٹانوں سے نبٹتا ہے سمندر کا شباب دور تک موج کے رونے کی صدا آتی ہے
یک بیک ابھرتی ہے ٹوٹی ہوئی بکھری ہوئی موج اک نئی موج میں ڈھلنے کو پلٹ آتی ہے

مرا یقین چور ہو رہا ہے یارو کچھ کام ضرور ہو رہا ہے یارو
آوازِ شکست سے ہوئے برخیز انسان کا ظہور ہو رہا ہے یارو

یہ اپنی تہذیب کی بنیادی اقدار پر اٹوٹ اعتماد اور انسان کی عظمت میں ناقابلِ شکست ایمان ہی کا کرشمہ ہے کہ ندیم عصرِ حاضر کی فنی اور فکری تحریکوں کے منفی رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر ان سے اکتسابِ فیض کر پائے ہیں،

اور مشقِ سخن کے دور سے ہی ان کا فنی افق اس قدر وسیع، لہجہ اس قدر توانا، دل اس قدر گداز اور اندازِ نظر اس قدر مابعدالطبیعاتی رہا ہے کہ عہدِ حاضر کا سارا سوز و ساز اور درد و کرب ان کی ربع صدی پر پھیلی ہوئی شاعری میں سمٹ آیا ہے۔ وہ حسن کے گھائل ہوتے ہوئے بھی فکر کے شاعر ہیں۔ مبادا آپ فکر کے نام پر کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں، میں آپ کو اس نام کی نظم سناتا ہوں ؎

راتوں کی بسیط خامشی میں　　جب چاند کو نیند آ رہی ہو
پھولوں سے لدی خمیدہ ڈالی　　لوری کی فضا بنا رہی ہو

•

جب جھیل کے آئینے میں گھُل کر　　تاروں کا خرام کھو گیا ہو
ہر پیڑ بنا ہوا ہو تصویر　　ہر پھول سوال ہو گیا ہو

•

جب خاک سے رفعتِ سما تک　　ابھری ہوئی وقت کی شکن ہو
جب میرے خیال سے خدا تک　　صدیوں کا سکوت خیمہ زن ہو

•

اُس وقت مرے سُلگتے دل پر　　شبنم سی اُتارتا ہے کوئی
یزداں کے حریمِ بے نشاں سے　　انساں کو پکارتا ہے کوئی

یہ نظم ندیم کی شاعری کے محرکات و مقاصد کے علاوہ فکرِ سخن اور تخلیقِ شعر کی کیفیت کی حسین ترین آئینہ دار ہے۔ ندیم کا زمین سے لے کر آسمان تک پھیلا ہوا فنی افق، تحت الشعوری کیفیات کو جنم دیتا ہوا سوچتا لہجہ، مظاہرِ فطرت کی اندرونی گہرائیوں میں ڈوب ڈوب کر ابھرنے والا کائنات گیر مشاہدہ، خاک سے رفعتِ سما تک ابھری ہوئی وقت کی شکن اور شاعر کے خیال سے خدا تک خیمہ زن صدیوں کے سکوت کو گرفت میں لانے والا آفاق نوردِ تخیل۔ وہ علاقہ جس میں ندیم پرواز کرتے ہیں، سب سے بڑھ کر ندیم کا سلگتا ہوا دل اور وہ انسان جسے انھوں نے کبھی تو حسنِ یزداں سے لے کر حسنِ بتاں تک دیکھا ہے، اور کبھی جس کے جمال کی سرحد سے کبریا کا مقام بہت قریب تو کیا تھا مگر قریب سا تھا۔ اس نظم میں سب عناصر گھُل مل کر ایک وحدت کو جنم دے رہے ہیں۔ اور یہ وحدت مجھے وہ ہنگامہ یاد دلا رہی ہے جو اب سے دو رے "انسان عظیم ہے خدایا" کی اشاعت پر ایک ادبی بحث کا موجب بنا تھا۔

اس نظم کی اشاعت پر ممتاز حسین خوشی سے چیخ اٹھے تھے۔ "یہاں احمد ندیم قاسمی کی فکر علامہ اقبال کی فکر سے بلند ہو جاتی ہے!۔ مجھے وہ دن دور نظر نہیں آتا جب کہ یہ آوازیں سنائی دیں گی۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب، کس کی دلیل۔ مردِ مومن کی دلیل یا انسان کی دلیل، جو کامل بھی ہے اور ناقص بھی اور جس کی بستی وہ ساری گیتی ہے جہاں حیات تخلیق کی جا رہی ہے اور جہاں آزادی کے لیے جد و جہد ہو رہی ہے۔" دوسری انتہا پر سلیم احمد تھے جنھیں یہ نظم دو وجہ سے شاعری کے رتبے سے گری ہوئی نظر آتی تھی۔ ایک اس وجہ سے کہ ندیم کا مشاعروں میں شعر پڑھنے کا انداز

سلیم احمد کو پسند نہ تھا اور دوسرے اس وجہ سے کہ اگر انسان عظیم ہے تو پھر خدا کو مخاطب کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ غرض مہینوں یہ ہنگامہ آرائی جاری رہی۔ ادب کے ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس ہنگامہ خیزی کا سبب ہمارے عہد کا وہ محدود انداز نظر ہے جس کے سہارے ہم ندیم جیسے شاعر کے فن کو بھی کسی ایک تحریک کا پابند اور ایک نظریہ میں محصور دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ ندیم نے اپنی نثری تحریروں میں بار بار یہ کہہ رکھا ہے کہ ان کی ترقی پسندی اسلام سے پھوٹی ہے اور اقتصادی مساوات کے نظریات انھوں نے شاہ ولی اللہ سے اخذ کیے ہیں۔ الحاد کی گرم بازاری اور انقلابی شاعروں کی خدا سے بے زاری پر وہ ایک سے زیادہ مقامات پر اپنی برگشتگی کا اظہار کر چکے تھے مگر سن پچاس کا زمانہ ترقی پسند تحریک کی پرزور مخالفت اور شدید حمایت کا زمانہ ہے اس لیے اگر ممتاز حسین نے نظریاتی جوش و خروش میں آکر ندیم کے انسان کو اقبال کے مرد مومن کا حریف کہہ دیا اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ غالب اقبال اور ندیم ہماری تہذیبی اور شعری روایات کا وہ تسلسل پیش کرتے ہیں جسے توڑنے میں گذشتہ ڈیڑھ سو برس کی مغرب زدہ ادبی تحریکیں کوشاں رہی ہیں، تو یہ محض ان کی خوش فکری ہے جو ترقی پسند نظریۂ ادب سے وفاداری بشرط استواری کی دلیل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ندیم نے اقبال کے جلال و قوت سے بھرپور رنگِ سخن میں جمالیاتی نرمی اور نکھار کا گراں قدر اضافہ کیا ہے اور اقبال کے عظیم انسان کے عشق میں گوشت پوست کی عورت سے ارضی محبت کی نئی بہنائی پیدا کی ہے۔ ندیم کا یہ اجتہاد ہماری اقبال تک کی ادبی روایات کی نفی نہیں ثبات ہے۔ یہ روایات کے تسلسل کو قایم رکھنا اور آگے بڑھانا ہے۔ اسی طرح سن پچاس کی مخصوص فضا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سلیم احمد کا ندیم کی شاعری سے محض اس بنا پر خفا ہونا کہ وہ ترقی پسند تحریک کے پُرجوش رہنما ہیں ناقابلِ فہم نہیں۔ یہاں مجھے تھوڑی سی "تبلیغ" کرنے دیجیے۔

مسلمانوں کے ادب میں ترقی پسند تحریک کا کردار ایک اعتبار سے رجعت پسند نہ رہا ہے۔ یہ تحریک دنیا بھر کی ادبیات کے لیے ترقی پسند ہے مگر ہمارے ہاں رجعت کا باعث۔ وجہ یہ کہ جب یہ تحریک مغرب کے فرسودہ سیاسی معاشی اور مذہبی اداروں کی تخریب سے انسان دوستی کا خدا آفریں فریضہ سر انجام دے رہی تھی۔ اس زمانے میں اقبال کی فکر اس تحریک سے آگے تھی۔ اقبال اس تحریک کی تعمیر میں مضمر خرابیوں کا شعور رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سن چھتیس کی یہ ترقی پسند تحریک سن چھیاسٹھ میں ازکار رفتہ ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اشتراکیت کے مادیت پرستانہ نظریات بالآخر اشتراکی ریاستوں کو بھی سامراجی طاقتیں بنا دیں گے۔ اشتراکی منشور دنیا بھر کے مزدوروں کو متحد ہونے اور سامراجی قوتوں سے ٹکرانے کا درس دیتے وقت یہ کہنا ضروری سمجھتا ہے کہ تمھارے پاس اپنی غلامی کی زنجیروں کے علاوہ اور ہے ہی کیا جو کھو جائے گا ؟ ــ آج جب اشتراکیوں کے پاس بہت کچھ ہے تو وہ اس بہت کچھ کے کھو جانے کے ڈر سے خود سامراجی ادارہ بن بیٹھے ہیں۔ اقبال اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے سے پہلے ہی مغربی سامراج کے علاوہ مستقبل کے ہندو سامراج اور اشتراکی سامراج سے تصادم کے لیے نئے انسان کو بیدار اور تیار کرنے میں مصروف تھے۔ اردو کے ترقی پسند ادیبوں نے اقبال کے خلاف ردِ عمل سے نئے انسان کی ترقی پسند فکر کے پَر نوچنے کی سعی لاحاصل کی۔ سن پچاس کے گرد و پیش ندیم ترقی پسند تحریک کے رہنما تھے اور داخلی اور خارجی حملوں سے نبرد آزما۔ اس تحریک کے دشمن ندیم کے حال سے دل برداشتہ تھے اور صرف "رم جھم" کے ندیم کو شاعر مانتے تھے اور ترقی پسند تحریک کے دوست ندیم کے مذہبی مزاج، وحدت الوجود کے صوفیانہ عقیدے سے محبت

اور مادی نظریات کو ایک گونہ روحانیت پسندی کے ساتھ پیش کرنے پر غضبناک ۔ اور ندیم تھے کہ ادبی سیاست کی ان ہنگامہ خیزیوں سے اپنے فنی مستقبل کو محفوظ رکھنے میں کوشاں۔ یہ ندیم وہی ندیم تھے جنھوں نے "جلال و جمال" میں اپنی حکیمانہ رنگ کی شاعری کو اقبال کے خیالات کی بازگشت قرار دیتے ہوئے اس تمنا کا اظہار کیا تھا کہ "آگے چل کر اس رنگ میں بھرپور انداز میں لکھنا میری نہایت عزیز تمناؤں میں شامل ہے اور کیا عجب کہ میں اسلام کو ایک آفاقی نظامِ حیات کی صورت میں آیندہ اپنی نظموں میں پیش کر سکوں۔"

یہ عہد نامہ سن چھیالیس کا ہے اب اگر سن پچاس کے گردوپیش وہ اس عہد کو ایفا کرنے سے کہیں زیادہ سیاست سے محبت کا چلن مانگنے میں مصروف نظر آتے ہیں تو آپ دکھ برا مانیں ندیم آپ کے مشوروں پہ کان نہیں دھریں گے کیونکہ اگر وہ ایسا کریں گے تو خود خدا شرمسار ہو جائے گا:

جب حریتِ فکر کا دستور ہوا طے
کہتے ہیں مشیت نے قسم کھائی ہماری

جب نقاد ندیم کی شاعری کو ہنگامہ آرائی کی نذر کرنے کے درپے تھے۔ میں ادب کا عام قاری ندیم کی اس نظم کو ممتاز حسین کی عینک سے نہ دیکھ سکنے کے باوجود ندیم کی شاعری کے مستقبل کے بارے میں پُرامید تھا۔ جب انسان منزل ارتقا ہے تو ندیم فنی ارتقا کے اس مرحلے پر کیسے منجمد ہو کر رہ جائیں گے؟ اور ندیم نے اردو شاعری کے قارئین کو مایوس نہیں کیا بلکہ گذشتہ پندرہ سولہ برس کے دوران ان کے فن نے برق رفتاری کے ساتھ ترقی کی ہے۔ اس سے آپ یہ نہ سوچیے گا کہ ندیم عظمتِ انسان کے بارے میں اپنی فکر سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ ندیم کا آج بھی یہ ایمان ہے کہ انسان خود اپنی تخلیق ہے۔ خدا نے تو صرف آدمی بنایا تھا۔ آدمی نے اپنے آپ کو انسان بنایا جو خدا کے بنائے ہوئے آدمی سے کہیں زیادہ حسین ہے:

مٹی سے اگر بنا تھا آدم
انسان تو پیار سے بنا ہے

ندیم کے خیال میں محبت انسان کا سب سے بڑا حسن اور سب سے بڑی عبادت ہے۔ یہ اندازِ نظر ندیم کی عشقیہ شاعری میں وہ ندرت، نکھار اور توانا نزاکت پیدا کرتا ہے جو اردو شاعری میں ناپید ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ صحیح معنوں میں ندیم کی عشقیہ شاعری کا آغاز ماضی قریب کا واقعہ ہے۔ انھوں نے فکری اور مقصدی شاعری سے فنی سفر کی ابتدا کی ہے۔ اور اگر "جلال و جمال" اور "رم جھم" میں عشقیہ شاعری کے چند نہایت حسین نمونے ملتے ہیں تو وہ محض تہذیب رسمِ عاشقی کے ذیل میں آتے ہیں۔ بجا کہ "جلال و جمال" میں رومانی اور افلاطونی عشق سے لے کر خالص کتابی عشق تک کی کیفیات مل جاتی ہیں مگر "جلال و جمال" اور "رم جھم" کا حسین ترین حصہ وہ ہے جہاں آپ بیتی کی بجائے جگ بیتی کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں اگر ایک طرف فضا اور کرداروں کے ذریعے انسان کے بنیادی اور آفاقی جذبات کی پیش کش کا حق ادا کیا گیا ہے تو دوسری طرف جذبۂ عشق کو سماجی پس منظر میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً "رم جھم" کے بے شمار قطعات کے علاوہ "آخری سجدہ" "سہاگن بیوہ" "سپاہی مورچے میں" "پروازِ جنوں"

وغیرہ میں جذبۂ عشق کی مصوری سے ندیم نے علاقائیت کو آفاقیت بنا دیا ہے۔ لیکن اردو کی عشقیہ شاعری میں جس نئی پہنائی کا میں ذکر کر رہا ہوں اسے سمجھنے کے لیے "دشتِ وفا" کی نظم "کسمدر" کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

غنچۂ دل جو کھلا بھی تو سرِ شام کھلا
کون ظلمت میں نکلتا ہے نظارۂ گل

ایک اور نظم "دعوت" سنیے:-

اے میری پرستشوں کے حق دار　　　　آ میں ترے حسن کو نکھاروں
چہرے سے اُڑا کے گردِ ایام　　　　آ میں تیری آرتی اُتاروں
تو میری زمیں بھی آسماں بھی
میں تجھ کو کہاں کہاں پکاروں

محبوب کو بیک وقت زمین اور آسمان صرف ندیم ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا محبوب چند جسمانی ترغیبات کا رنگین واہمہ نہیں، ایک ایسی زندہ ہستی ہے جو گوشت پوست کی جیتی جاگتی حسینہ ہے۔ جس کے پاس دل کے علاوہ دماغ بھی ہے۔ یہ ایک شخص ہے جو اپنی شخصیت کو برقرار رکھتے ہوئے عاشق کے ساتھ دل و دماغ کی پوری طاقت کے ساتھ عشق کرتی ہے:

دہر کو تشنگیٔ نازِ بتاں ہے اب تک　　　　تو مری یاد میں کیوں سوختہ جاں ہے اب تک
تجھ کو کیا مجھ سے، فقط مجھ سے محبت کیوں ہے　　　　یہ تو میں مانتا ہوں تو مری جاں ہے اب تک
کیوں مسرت سے ہے محروم تری شانِ جمال　　　　کیوں مرا غم ترے چہرے سے عیاں ہے اب تک
میرا معیارِ وفا ہے ترے دم سے قائم　　　　ہر گھڑی تو مری جانب نگراں ہے اب تک

میں محبت میں بھی توحید کا قائل ہوں مگر　　　　ظلم ہے حسن پہ پابندیٔ آدابِ وفا
حسن ہے صحنِ چمن عشق ہے صحرائے بسیط　　　　جس سے کترا کے نکل جاتی ہے امواجِ صبا
اس کے یاوصف بھرے شہر کی تنہائی میں　　　　آج بھی میں نے سُنی ہے تری آہوں کی صدا
رسم و رسم سے جکڑی ہوئی اس دنیا میں　　　　حُسن بھی عشق کرے گا مجھے معلوم نہ تھا

جی ہاں حسن نہ صرف عشق کرتا ہے بلکہ محرومیٔ وفا کا شکوہ سنج بھی ہے:

سچ کہوں اپنی محبت پہ ندامت سی ہوئی　　　　جب کبھی دیکھی تری اُتری ہوئی صورت میں نے

کر شوق سے شکایتِ محرومیٔ وفا　　　　لیکن مرے عزیز روف کو خبر نہ ہو

جب تک میں ترا جمال دیکھوں　　　　تو زخم مرے شمار کر لے

یہ احساس کہ ندیم اور اس کے محبوب دونوں ایک دوسرے کے عاشق ہیں۔ ندیم کے غرورِ وفا کی جان ہے ؎

برسوں کے بعد آج بھی اے مبدۂ حیات
تو میری دوست بھی ہے مری ہم سخن بھی ہے
تو میرا شعر، میرا افسانہ مری زباں
تو میرا فن بھی ہے، مرا موضوعِ فن بھی ہے

تجھ کو چاہا تو تجھی کو چاہا
اک یہ قصہ نہ ہوا طولانی

یوں تو اس جلوہ گہِ حسن میں کیا کیا دیکھا
جب تجھے دیکھ چکے کوئی نہ تجھ سا دیکھا

اب تجھ سا کوئی کہیں نہیں ہے
اب تیرا فراق بھی حسیں ہے

اس جلوہ گہِ حسن میں حسیناؤں کی کمی نہیں مگر ندیم ان کے جسمانی حسن سے متاثر ہونے کے باوجود ان پر عاشق نہیں ہو سکتا اس لیے کہ : ؏

جسم کا حسن وہی تھا لیکن پیار کے حسن سے خالی تھا (دیادکا چاند)

ندیم کے محبوب کی رعنائی، ہر لحظہ ایک نیا عالم ہے : ؎

تو بگڑتا بھی ہے خاص اپنے ہی انداز کے ساتھ
پھول کھلتے ہیں ترے شعلۂ آواز کے ساتھ
تو پکارے تو چمک اٹھتی ہیں میری آنکھیں
تیری صورت بھی ہے شامل تری آواز کے ساتھ

فقط اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
کہ ترا حسن، ترے حسنِ بیاں تک دیکھوں

چھوتی ہے تجھے لہر تو گھل جاتا ہے سونا
کل تک تو کوئی رنگ نہ تھا آبِ رواں کا

سمٹ گیا مری باہوں میں جب وہ پیکرِ رنگ
تو اس کا رنگ مجھے دور تک نظر آیا
یہ گل ہیں یا ترے روکے ہوئے تبسم ہیں
یہ کون دشت میں لایا ہے تیرے گھر کے چراغ

آغوش میں مہکوگے دکھائی نہیں دوگے
تم نکہتِ گلزار ہو ہم پردۂ شب ہیں

مجھ سے کترا کے نکل جا مگر اے جانِ حیا
دل کی لو دیکھ رہا ہوں ترے رخساروں میں

نتیجہ یہ کہ شناسائی کا مرحلہ طے ہونے میں ہی نہیں آتا ؎

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالمِ نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

یہی وجہ ہے کہ ندیم کا عشق بیک وقت کامیاب بھی ہے اور ناکام بھی۔ محبوب خون میں رواں ہوتے ہوئے بھی لالۂ دشتِ نارسائی ہے۔ اس لیے کہ وصل کی سرشاریوں اور قرب کی لذتوں کے باوجود یہ دو اشخاص ایک قالب میں نہیں ڈھل سکتے۔ یہ محبوب دور رہ کر رگِ جاں بن جاتا ہے اور بعض قریب ہوکر دور چلا جاتا ہے ؎

ہم تو سمجھے تھے قیامت ہے فراقِ محبوب　　　تجھ سے مل کر بھی مگر حشر ہی برپا دیکھا

فراق زخم سہی، کم نہ تھی جراحتِ وصل　　　معانقہ مرے محبوب کا صلیب سا تھا

گوشت پوست کے محبوب کے ساتھ وصل کی کیفیات کی مصوری کے دوران ندیم جس تہذیبی بلوغت اور عفتِ قلب و نظر کا ثبوت دیتے ہیں وہ اردو کی عشقیہ شاعری میں اپنی مثال آپ ہے ؎

میں جسے شرطِ ادب کہتا ہوں تو فرطِ حیا
حسن اور عشق میں حائل ہے وہ دیوار ابھی

اس دیوار کے ٹوٹنے پر عاشق جن جنسی تجربات سے دوچار ہوتا ہے ان کی پیش کش کا انداز ملاحظہ ہو ؎

تو کعبۂ دل میں تھا تو پتھر کا صنم تھا　　　لیکن مری آغوش میں قندیلِ حرم تھا

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط　　　اپنی کوتاہیٔ فن یاد آئی

ظلمتِ شب میں بھی شرماتے ہو　　　درد چمکے گا تو پھر کیا ہوگا

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ندیم محبوب کے حسن اور عاشق کے جذبات کی ترجمانی کے دوران اپنی داخلی زندگی کی گہرائیوں اور آفاق کی وسعتوں کے درمیان ایک مشترک رشتہ استوار کر لیتے ہیں۔ اور ان کے دل کی دھڑکن کائنات کے آہنگ سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ "قیاس"، "مسافر"، "اظہار"، "ربط"، "ایک منظر"، "شامِ فراق"، "یہ ستارے" کے علاوہ غزل کے یہ شعر دیکھیے ؎

شام کو صبحِ چمن یاد آئی　　　کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی
جب خیالوں میں کوئی موڑ آیا　　　تیرے گیسو کی شکن یاد آئی
چاند جب دور افق پر ڈوبا　　　تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

فلک پہ ٹوٹے ستارہ تو میرا اشک گرے　　　مرے ندیم یہی ہے کمالِ بخیہ گری
یہ کائنات کا آہنگ ہے کہ سحرِ حیات　　　چٹک کلی کی ستاروں کو گدگداتی ہے

صبح جب محبوب کے چشمے سے نہا کر نکلی　　　ہم نے آئینہ بدل تیرا سراپا دیکھا

مسکرانے کا یہی انداز تھا — جب کلی چٹکی تو وہ یاد آ گئے

اک سفینہ ہے تری یاد اگر — اک سمندر ہے مری تنہائی

اجلا سا غبار ہے اُفق پر — اس راہ سے کس کے گھر گیا چاند
اب آئے ہو آفتاب لے کر — ظلمات سے جب گزر گیا چاند

تاروں بھرا آسماں محبت — جذبات کا بحرِ بے کراں ہم

ایسے میں عاشق کی شخصیت میں کائنات کی وسعتیں سمٹ آتی ہیں اور عشق محبوب کی ذات میں فنا ہو جانے کی بجائے بقا کی نئی سطحیں تلاش کرنے لگتا ہے ؎

پھر یاد وہ مہ جمال آیا — ہے حدِ نظر تک اپنا سایا

کتنے خورشید بیک وقت نکل آئے ہیں — ہر طرف اپنے ہی پیکر کے گھنے سائے ہیں

اب ساری خدائی ہے تماشائی ہماری — دیکھو تو ذرا جنسِ گرانی ہماری

نکلیں گے لحد سے بھی بہار بن کر — مر کر بھی نہ ہوں گے رائیگاں ہم

اور حقیقت اور مجاز کی حدیں مٹتی نظر آتی ہیں ؎

نارسائی کی قسم اتنا سمجھ میں آیا — حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا

وہ ترے جسم کی قوسیں ہوں کہ محرابِ حرم — ہر حقیقت میں ملا خم تری انگڑائی ہے

تجھے ابرو، مجھے محراب پسند — سارا جھگڑا اسی نازک خم کا

دریا ہو، صبا ہو، یا خیالات — ہر چند تری طرف رواں ہے
اب تک نہ مگر ہوا یہ معلوم — تو ہے تو کہاں نہیں، کہاں ہے

مختصر یہ کہ ندیم کی عشقیہ شاعری کے ساتھ اردو شاعری نفسیاتِ عشق اور کیفیاتِ جمال کی ایک انوکھی دنیا میں داخل ہوتی ہے۔ ندیم ہمیں اس دنیا کی سیر کرانے میں اس لیے کامیاب ہوتے ہیں کہ ان کی حیاتِ معاشقہ ان کی

پوری زندگی سے نامیاتی علاقہ رکھتی ہے۔ اور ان کی دلچسپیاں شروع ہی سے سیاسیات سے لے کر مابعدالطبیعیات تک پھیلی ہوئی رہیں۔ ۱۹۴۲ء میں ہی میرا جی نے ندیم کو ازلی مسرتوں کی ازلی منزلوں کا کھوج لگاتے دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ "ندیم کی ذہانت زندگی اور موت کی مانند گہری ہے" اور ندیم کی زیرِ نظر عاشقانہ شاعری کے آغاز سے بہت پہلے اثر لکھنوی یہ فتویٰ صادر فرما چکے تھے کہ "اگر ادب برائے زندگی سے مراد زندگی اور زیرِ فن کی ایسی ہی جھلکیاں ہیں۔ تو ادب اور زندگی دونوں کا بول بالا" جو لوگ ندیم کی سیاست سے دلچسپی پر برافروختہ ہیں۔ ان کا خیال کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر ندیم کی دلچسپیوں کا دائرہ اس قدر وسیع نہ ہوتا تو ان کی عشقیہ شاعری اتنی پُرعظمت ہوتی، نہ ان کا عشق اتنا گرانمایہ ہوتا ہے

انسان نے تخلیق سے اب تک جو کیے تھے　　وہ مرحلے گذرے ہیں تری راہگذر تک
آدم کی سلگتی ہوئی تاریخ رقم ہے　　جبرئیل کے شہپر سے مرے دامنِ تر تک

اور نہ ان کی شکست اتنی باوقار ہے

اسی شکستِ تمنا کے دم سے آج مجھے　　دکھائی دیتے ہیں کتنے صنم چٹانوں میں
رہی عزیز کچھ ایسی جہاں کی لاج مجھے　　کہ میں بھٹک نہ سکا تیرہ آسمانوں میں
کوئی گداز نہیں خلد کے فسانوں میں　　مری بہشت ہے تنکوں کے آشیانوں میں
نبھا سکا ۔۔۔ فقط انسان کا مزاج مجھے　　بڑا سرور ہے انساں کی داستانوں میں

یہ شکست عاشق کے ہاں کلبیت کی بجائے رجائیت اور آدم بیزاری کی بجائے انسان دوستی کے تصورات کو جنم دیتی ہے

ستارے کون چنے گا بدستِ زخم آلود　　چلو غبارِ سرِ رہ گذر کا ذکر کریں

جس کے طاقوں پہ کبھی ایک دیا تک نہ جلا　　ہم تو اس گھر کو بھی اللہ کا گھر کہتے ہیں

ندیم کی انسان دوستی کے باب میں کچھ کہنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر انسان دوستی کی مغربی روایت سے گہرے اثرات قبول کرنے کے باوجود ندیم مشرق کی انسان دوستی کی اس صوفیانہ روایت کو اپناتے اور آگے بڑھاتے ہیں جو اقبال کے ہاں پہنچ کر ایک نیا قالب اختیار کر چکی تھی۔

انسان سے محبت ندیم کے ہاں جو گہرا صوفیانہ رنگ لیے ہے اُسے سمجھنے میں ۱۹۴۷ء کی ایک نظم "مجاز" ہماری مددگار ثابت ہو سکتی ہے

ایک مٹی کا دیا لَو کو سنبھالے کب تک　　تیل بھی ختم ہے، طوفاں بھی امڈ آیا ہے
اے بلندی کے خدا! تو نے بنا کر پستی　　کیا فقط جذبہ تخلیق کو بہلایا ہے

چھلکا پڑتا ہے ستاروں سے ترا ساغرِ شب　　میری قسمت میں فقط ایک چراغِ مُردہ
کیا تجھے عرش کی خلوت کا سکوں جچتا ہے　　فرش پر ہو ترا محبوب اگر آزردہ

شکوہ سنجی مرا مقصود نہیں ربِّ کریم   خود ترا حکم ہے اخفائے حقیقت نہ کروں
تو تجلّی کو جو آلودۂ پستی نہ کرے   ایک مٹّی کے دیے سے بھی محبت نہ کروں

ایک مٹّی کے دیے یعنی اس آدمی سے محبت جسے میسر نہیں انساں ہونا، ندیم کی شاعری کا محور ہے۔ ندیم کی شاعرانہ عظمت کا ثبوت اس حقیقت میں بھی پوشیدہ ہے کہ وہ انسان کے مثالی تصور کی حمد و ثنا پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس مثالی انسان کے ناتمام نقش، یعنی آدمی کے ان گنت روپ بھی پیش کرتا ہے۔ ندیم کی شاعری میں آدمیوں کا جتنا بڑا ہجوم ہے اور آدمی کی زندگی جن وسعتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس کی مثال اردو شاعری میں ڈھونڈنے نکلیں تو نگاہ گھوم پھر کر نظیر اکبرآبادی پر ٹھہرے گی۔ نظیر کے ہاں زندگی کی وسعت اور رنگارنگی تو ہے مگر ندیم کی سی فکری گہرائی اور ندیم کا سا انقلابی اندازِ نظر ناپید ہے۔ ندیم کے ہاں آپ کو آدمی کہیں تو مادی اور روحانی محکومی کی زنجیروں میں محبوس دکھائی دیتا ہے، کہیں ان زنجیروں کو توڑنے کی جدوجہد میں مصروف اور کہیں آدمی سے خدا بنتا نظر آتا ہے۔ آدمی کی زندگی کی حقیقی جھلک دکھانے کی کوشش میں ندیم نے رنگینیت زدہ رومان پرستی اور دیہات نگاری کے مریضانہ رجحان کو مٹانے، ہئیت و اسلوب کے نئے تجربے کرنے اور زبان و بیان کے مصنوعی اور ساختہ اصولوں کو توڑنے کے جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کی بحث کا یہ موقع نہیں۔ یہاں صرف یہ اشارہ مقصود ہے کہ ندیم نے آدمی کے بعض مصائب اور اس کے 'جلال و جمال' کے بعض پہلوؤں کو محض اس لیے نظر انداز کر دینے کی غلطی کبھی نہیں کی کہ شاعری کا مروجہ ساز و سامان ان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس انھوں نے "غیر شاعرانہ" الفاظ کو شاعرانہ حسن و خوبی سے استعمال کیا، 'زنہار' جیسے متروک لفظوں کو پھر سے رواج دیا اور نئے الفاظ و تراکیب تراشنے کا عمل جاری رکھا۔ اس ضمن میں ندیم کی کامیابی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ فراق گورکھپوری جیسے شاعروں نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ مگر خیر، یہاں ہمیں بحث اس سے ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے سے برسوں پہلے ندیم کے ہاں وطن کے فردوس میں اجڑے ہوئے گھر، اور ان گھروں کو آباد کرنے کی ناکام جدوجہد میں مصروف انسانوں کا وہ انبوہ دکھائی دیتا ہے، جس میں تہی دامن کسان بھی ہیں، دو دو بیگھہ زمین کاشت کی خاطر ان کی بیٹیوں کو چھپ کر اشارہ کرنے والے زمیندار بھی۔ اور زمینداروں کے گھر میں رقص کرنے والی طوائفیں بھی بیگی کی گھمر گھمر میں کھو دینے والی دوشیزائیں بھی ہیں اور انھیں زمیندار کی حکومت میں بھیجنے والے مقروض باپ بھی۔ وہ بیوائیں بھی ہیں، جو یہ تک نہ جان سکیں کہ ان کا بانکا سپاہی کس ملک میں کیوں کام آیا؟ بدمست پنگھٹ والیاں بھی ہیں اور ان کے شہر سے آئے ہوئے شکاری بھی" تلاش رزق میں گاؤں سے شہر جانے والے عاشق بھی ہیں اور مرحوم انور کو دس روپے کے عوض بیچ دینے والی پنشن خوار ماں بھی۔ کبڈی کے کھلاڑی بھی ہیں اور پھانسی کے تختے پر چڑھا دیے گئے رہزن بھی ہیں اور انھیں ہتھکڑیاں پہنانے والے غلیظ مہاجن بھی۔ نخوت کی بھاپ برساتے ہوئے رئیس بھی ہیں اور ان کی موٹروں کو روک کر ووٹ کے بدلے نوٹ مانگنے والے بے خوف دیہاتی بھی۔ گاؤں کی صبح و شام کے وہ دل کش مناظر بھی ہیں، جن کے پس منظر میں بیگار پر تھانے جانے والے دہقان صاف نظر آ رہے ہیں اور سب سے بڑھ کر وہ فضا ہے جو بقول تاثیر "خاص پنجاب کے دیہات کی فضا ہوتے ہوئے اپنے اندر ایک ایسی عالمگیر جاذبیت رکھتی ہے کہ بدیشی کو کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا اور جس میں ہندوستانیت ہی نہیں بلکہ انسانیت کا جوہر ہے۔" ستم زدگان کے اس ہجوم میں گھرا ہوا ندیم انسانی شرف و عظمت کے خوابوں کو خوابِ پریشاں بنتا دیکھ رہا ہے اور سوچ رہا ہے ؎

نہ جانے مجھ پہ افرنگی کی شاہی کیوں مسلط ہے
بھلا اک فرض کیا کم تھا مشیت کی غلامی کا
بغاوت بندگی سے اور آدم کش عناصر سے
یہی چارہ ہے باقی عمر بھر کی تشنہ کامی کا
(نا تمام)

یہ سن چھیالیس کی نظم ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب "افرنگ کی شاہی سے نجات کی گھڑی قریب ہے اور ندیم مسلم لیگ کے ایک رکن کی حیثیت سے آزادی کی جدوجہد میں عملاً شریک ہیں اور "خدا کے ذہن کے فن پارۂ عظیم" یعنی آدمی کو آدم نو کے روپ میں جلوہ گر دیکھنے کے لیے خیال و خواب کی نقش گری میں مصروف۔ جب ندیم نے آزادی کے بعد بھی آدمیت کو پامال ہوتے، زبردستوں کے مراجعت مقاصد کو پہنچتے اور زندگی کو عزم زندگی سے تہی دیکھا تو اس کی آواز باغیانہ گھن گرج میں بدل گئی ؂

میرا غم، صرف مرا غم تو نہیں، کم کیوں ہو
آدم اس دور میں بھی کشتۂ آدم کیوں ہو
جس کے دانتوں میں مری قوم کے ریشے ہیں ابھی
وہی سفاک مرے دیں کا ہمدم کیوں ہو
کٹ کے بھی جھک نہ سکا جو مرے اجداد کا تن
کسی سلطان کے دربار میں وہ خم کیوں ہو
سینۂ شب میں دھڑکتا ہے دل صبح جمال
لب ترے خشک ہوں کیوں آنکھ تری نم کیوں ہو
پیٹھ کا زخم نہیں ہے کہ ندامت ہو تجھے
زخم سینے کا ہے شرمندۂ مرہم کیوں ہو

ترقی پسند تحریک کی بے پناہ مقبولیت کے اس دور میں ندیم نے اگر ایک طرف علی سردار جعفری کی روایت میں آزاد نظمیں لکھنے میں وقت برباد کیا تو دوسری طرف اس تحریک سے منسلک ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ وہ ایک خیال یک سوئی اور بے مثال جرأت کے ساتھ آدمی کے مقصد کے بارے میں سوچ سکا جس کو خوشبوئے بدن سے لے کر پل کی ہتھی پر ابھرے ہوئے ہاتھوں کے نشان تک دیکھ سکا۔ فصل سے لے کر دفتر تک الجھے ہوئے رشتوں کا سراغ پا سکا اور گذشتہ پندرہ برس کی مسلسل شدید سے شدید تر ہوتی ہوئی پابندیٔ اظہار کے زمانے میں حق گوئی و بے باکی کا ایک نیا معیار قایم کر سکا۔ شاعر کی حیثیت سے انسان کا بے ساختہ پن مانگنے والے ندیم کا سب سے بڑا مسئلہ آزادیٔ اظہار ہے اور شخص کی حیثیت سے حسن انسان، ظہار، پابندی، درد وطن، فنون لطیفہ، کون سنے، صدائے بے صدا، بلاغت کا المیہ، جیسی نظمیں پہلے مسئلے نے جنم دی ہیں۔ اور "درانتی" "عنفوان شباب" "آخری فیصلہ"، حسن، ایشیا، جمیلہ، ایک جھونکا۔ خشک پتے۔ نیا سال، تین سرزمینیں، دیوانہ، مراجعت، جنگل کی آگ۔ ریستوران، مشرق و مغرب، جنگل، اور پھیپل، جیسی نظمیں، دوسرے مسئلے سے متعلق اور ان میں ندیم کا واشگاف بیانیہ انداز سے علامت پسندی اور رمزیت کی طرف

سفر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اس دور کی شاعری میں ندیم نے ایک نیا لب و لہجہ تخلیق کیا ہے۔ اس لہجے میں گہری طنزیہ کیفیات غیر مرئی مگر محسوس لہروں کی صورت میں رواں ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

یقیں سے کون کہے نغمے ہیں کہ فریادیں　　افق افق اگر اک شور سا سنائی دے

سر بچا لائے ہو لیکن یہ زیاں تو دیکھو　　کتنا ویران ہے تا حدِ نظر منظرِ دار
شایانِ شہادت نہ ہوا کیوں کوئی منصور　　یاروں رسن و دار کا ساماں تو بہم تھا
نئے انساں سے تعارف جو ہوا تو بولا　　میں ہوں سقراط مجھے زہر پلایا جائے
کاٹیں گے کیسے شب کو جوانانِ عصرِ نو　　ان کو تو دھوپ پر بھی گماں ہے غبار کا
گل ہیں کمیاب اگر خون تو ارزاں ہوگا　　کسی عنواں تو کوئی رنگ جمایا جائے
کون شاہوں کو گداؤں سے الگ پہچانے　　اب تو خلعت میں بھی پیوند لگایا جائے

گرد و پیش کے حالات سے متعلق "تلخ نوائی" کے دوران ندیم نے ظلم کے جنگل میں گرفتار آدمی کی جو تصویریں پیش کی ہیں ان میں سے چند ملاحظہ ہوں :۔

حسن مٹ جائے تو اس کارگہِ عالم پر　　ایک اک لمحہ صدی بن کے مسلط ہو جائے
کتنی صدیوں سے میں اس سوچ میں غلطاں ہوں کہ لوگ　　حسن کے خول سے کس طرح بہل جاتے ہیں
خود فریبی کی مسرت پہ یہ جینے والے　　کیوں نہیں ڈھونڈتے کھلتے ہوئے ہونٹوں پہ نمی
پی چکی ہے جسے اک عمر سے ماحول کی دھوپ　　کیوں نہیں دیکھتے آنکھوں میں حوادث کے چراغ
کیوں نہیں سوجھتی چہروں پہ بکھرتی ہوئی بھوک　　اور ابھرتے ہوئے خیرات کے قدموں کے نشاں

——— (حسن)

گوشۂ گلشنِ ویراں کا سکوت　　اتنا پر ہول ہے جیسے اک لاش
شب کی بانہوں میں لٹک کر رہ جائے　　چاندنی اُس کا کفن ہو گویا

——— (خشک پتے)

تنگ گلیوں میں امڈتے ہوئے لوگ　　گو بچا لائے ہیں جانیں اپنی
اپنے سر پر ہیں جنازے اپنے　　اپنے ہاتھوں میں زبانیں اپنی

——— (جنگل کی آگ)

رات کی اڑتی ہوئی راکھ سے بوجھل ہے نسیم
یوں عصا ٹیک کے چلتی ہے کہ رحم آتا ہے
سانس لیتی ہے درختوں کا سہارا لے کر

اور جب اس کے سہارے سے پلٹ کر کوئی
پتہ گرتا ہے تو پتھر سا لڑھک جاتا ہے

شاخیں ہاتھوں میں یہ کتنی ادھوری کلیاں
مانگتی ہیں فقط اک نرم سی جنبش کی دعا

ایسا چپ چاپ ہے سنولائی ہوئی صبح میں شہر
جیسے معبد کسی مرجھائے ہوئے مذہب کا
سر پہ اپنی ہی شکستوں کو اٹھائے ہوئے لوگ
اک دوسا ہے پہ گردہوں میں کھڑے ہیں تنہا

(نیا سال)

فصلِ بہار میں بھی تھی وہ ہیبتِ خزاں　　　دستِ دعا بنی رہی بنتی گلا سب کی
اس قدر پھیلا ہے زنداں کا حصارِ بےاماں　　　شہر بھی لبریز ہیں زنجیر کی جھنکار سے
چہرے ہیں کہ مر سے تراشی ہوئی لوحیں　　　بازار میں یا شہرِ خموشاں میں کھڑا ہوں
اتنی ارزاں تو نہ تھی درد کی دولت پہلے　　　جس طرف جائیے زخموں کے لگے ہیں بازار

اپنی اپنی الجھن سب کی اپنی اپنی رائے
سب نے آنسو روک رکھے ہیں کون کسے بہلائے
ہر شے پر شک ہو تو جینا ایک سزا بن جائے
محور ہی موجود نہ ہو تو گردش کس کام آئے

قہقہے جیسے خالی برتن لڑھک لڑھک کر ٹوٹیں
بحثیں، جیسے ہونٹوں میں سے خون کے چھینٹے چھوٹیں
حسن کا ذکر کریں یوں جیسے آندھی پھول کھلائے
فن کی بات کریں یوں، جیسے بنیا شعر سنائے

سکڑی سمٹی روحیں لیکن جسم ہیں دوہرے تہرے
ریستوراں میں بجے ہوئے ہیں کیسے کیسے چہرے

(ریستوراں)

ندیم آدمی کے انسان بننے کی جدوجہد کی راہ میں حائل زمینی خداؤں کے علاوہ آسمانی خدا سے بھی اسی طنزیہ لہجے میں مخاطب ہیں ؎

تیری قدرت کی سیاست نہ سمجھ میں آئی　　　حرم و دیر کو ہم دوش میں یک جا دیکھا

ہم ہیں تیرا نقشِ خود نمائی　　پندار ہمیں سے اے خدایا
تخلیقِ زمیں کا طنز مت کر　　ہم نے ترا آسماں بنایا

یارب اک عرض ہے گستاخانہ
(رہیں آباد تیرے دیر و حرم)
مسکراتا ہوا پایا ہے تجھے
جب چٹانوں میں دھڑکتے ہیں صنم

ندیم کا قاری خدا کے ساتھ ندیم کے مکالمات کی اہمیت یہ جانے بغیر نہیں سمجھ سکتا کہ ندیم کی جنگ خدا کے اُس تصور کے ساتھ ہے جو استحصالی قوتوں نے گھڑ رکھا ہے۔ ورنہ وہ تو صاف کہتا ہے ؎

کفر کے انکاری عظمت کا گو منکر نہیں　　میں کسی قوت کے حسنِ ربط کا قائل بھی ہوں
حسن و توازن کے رسیا ہیں کیوں اضداد سے صلح کریں
اسی لیے تو صحنِ حرم میں برہمنوں سے لڑائی ہوئی

سچ پوچھیے تو ندیم کے طنز کا نشانہ صحنِ حرم کے وہ برہمن ہیں جو خدا کے نام پر انسانی زندگی سے حسن و توازن چھین لینا چاہتے ہیں ؎

ہوئے اس دور میں فتوے جاری　　کہ غزالوں کو جنوں ہے رم کا
میں قیامت کا تو منکر نہیں لیکن واعظ　　مجھ سے انساں کو تماشا نہ بنایا جائے
آج اناالحق سے بڑی کوئی حقیقت ہی نہیں　　مومنو! دار پہ کس کس کو چڑھایا جائے
تو ہینِ گناہ کر رہا ہے　　زاہد ہے بلا کا لاابالی
دوزخ سے ڈرا رہا ہے اس کو　　جنت بھی ہے جس کی دیکھی بھالی
نفسی نفسی بھی وہی سچ کی دہائی بھی وہی　　تیرا محشر مرا مانوس نظارہ نکلا
میں محبت کا پجاری ہوں عقیدوں کا نہیں　　ان بتوں کو مرے رستے سے ہٹایا جائے
مجھ کو ابرو تجھے محراب پسند　　سارا جھگڑا اسی نازک خم کا

ندیم کی دکھی انسانیت سے ہمدردی پرستش کا گہرا رنگ لیے ہے۔ وہ انسانیت کی حمایت میں آواز بلند کر کے محض اپنے سیاسی اور انقلابی شعور کا ثبوت ہی پیش نہیں کرتے بلکہ خدا کی عبادت کا حق ادا کرتے ہیں کیونکہ اس سیاسی اور تہذیبی جدوجہد میں انہیں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے ؎

زخموں سے اٹے ہوئے بدن پر　　یزداں کا جمال ضوفگن ہے
ہیں برق فشاں سلے ہوئے لب　　کاٹا ہوا ہاتھ تیغ زن ہے

(کشمیر)

مجھ پہ اٹھا ہوا خنجر ترے دل میں اُترا　　　آ کے لوٹا ہے ستمگر ترا پندار کہاں

(جمیلہ)

یزداں کو زمیں پر بلائیں　　　انساں کو آئینہ دکھائیں

نتیجہ یہ کہ فاتحِ کائنات کو، جب کہ آنا ہے، ندیم کی انسان دوستی کی آخری منزل نہیں بلکہ وہ انہیں آدمیت کے اس قیام پر دیکھنے کے آرزو مند ہیں کہ —

آدمی ششِ جہات کا دولہا　　　وقت کی گردشیں مرا نا ہیں
پرواز کو محدود نہ کر نجم و سحر تک　　　انساں کی ہیں مملکتیں حدِ نظر تک
وہ دھندلکے جنہیں ہم ابدیّت کہتے ہیں　　　اب تو انسان کی یہ راہ گزر بنتے ہیں

ندیم اس اعتبار سے بھی عصرِ رواں کے منفرد فنکار ہیں کہ وہ علومِ انسانی کی ترقیوں اور سائنسی انکشافات کی بدولت سے خوف زدہ ہو کر فکری انتشار کا شکار نہیں ہوتے، بلکہ ڈرتے عقیدوں، ٹوٹتے یقینوں اور مرتے خداؤں کے اس عہد میں ہر تازہ انکشاف کا خیر مقدم یوں کرتے ہیں۔ جیسے ان کے آدمِ نو کا ظہور کا وقت اور قریب آگیا ہو۔ چنانچہ پہلے انسان کی پرواز پر ندیم نے کہا تھا —

ایک چیخ چیخ پڑے صحرا ابد کا　　　مجھ سے پوچھو افق پار کیا ہے
یہ نہ سمجھو کہ ماہ و ستارہ　　　یہ تو پرواز کی ابتدا ہے
آسماں میری منزل نہیں ہے　　　آسماں تو خلا ہی خلا ہے
اپنی گم گشتہ جنت کو پالوں　　　صرف اتنا مرا مدعا ہے

ہوشیار اے فرشتو کہ پھر سے
ایک سجدے کا وقت آگیا ہے

(مراجعت)

اب اوجِ سپہر پہ ہے جہانِ انساں　　　اب چرخ کو آئینۂ ہزار دو
جو پھول ترس گئے ہیں حسن کو　　　اب ان کو شفق کا رنگ لا دو
شبنم کی طرح جو رو رہے ہیں　　　تاروں کی طرح انہیں ہنسا دو
اڑتے ہوئے پل نہیں تھمیں گے　　　اگلی صدیوں کو گردشیں سکھا دو
ماضی کے مزار سے نکل کر　　　فردا سے حیات کا پتہ دو
اب حدِ نظر کی مشعلوں کو　　　تا حدِ جہانِ دل جگہ دو

ندیم کو یقین ہے کہ عالمگیر طور پر اس آدمِ نو کا ظہور قریب سے قریب تر ہو رہا ہے مگر یہ انسان کسی پڑوسی ملک کی یلغار کو دیکھ کر تو یہ کہنا اپنا فرض سمجھے گا —

میرا دشمن مجھے للکار کے جاتا ہے کہاں　　　خاک کا طیش ہوں، افلاک کی دہشت ہوں میں

مگر فی الحقیقت اس کا اندازِ نظر یہ ہوگا ؎

ساری دنیا میرا کعبہ، سب انساں میرے محبوب
دشمن بھی دو چار تھے لیکن دشمن بھی تو تھے انساں

جو دنیا کی سامراجی طاقتوں کو یوں للکارے گا۔

گو لبادہ ابھی پیرہن چاک ہے ۔ کے ہاتھوں میں میزانِ افلاک ہے
اب جو مانگو تو برگِ گلاب ایشیا اور چھینو تو موجِ سراب ایشیا

لیکن اپنی سرشت میں رنگ و نسل اور قومیت کے امتیازات سے ماورا ہوگا ؎

رنگ اور رُت نہیں مدارِ حیات
رنگ سورج کا ایک زاویہ ہے
رُت فقط ایک رُخ ہے دھرتی کا
میرے چہرے کا رنگ میری دھوپ
تیرے چہرے کا رنگ برف تری
تو مری دھوپ کو ترستا ہے
میں تری برف کے لیے بے چین (مشرق و مغرب)
دو مسافر ہیں ایک رستہ ہے

آدمِ نو جن خطرات سے دوچار ہے۔ ندیم رجائیت پسندی کی دھن میں ان سے قطعِ نظر نہیں کرتے۔ آدمِ نو کو سب سے بڑا خطرہ آدمی کی یک رُخی ترقی سے ہے۔ اس عہد کا آدمی جو بری دوڑ میں تو برابر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ مگر حسن، لطافت اور توازن کی اقدار اس ترقی کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں ؎

یہ حادثہ بھی رہے گا شامل — آدم کے عروج ہی کی حد میں
انسان ابھر کر آگیا ہے — اک شعلۂ بے اماں کی زد میں

جب یہ انسان باوصفِ غرور و تمکنت — پتھروں کے دیوتاؤں کی نگاہ مُردہ ہوا
عداوتوں سے نمٹ کر کیا بتاؤں کس سے نمٹے گا — ندیم اب آدمی کے ہاتھ ہیں خود اپنی گردن پر

دشتِ ہر فکر سے میں عمرِ رواں کا انساں — ہو کے خود اپنی ذہانت کا شکار آیا ہوں

یوں تو جوہر نے الاؤ سا لگا رکھا ہے — روح سے نور کا احساس مٹا جاتا ہے
صبح ہوتی ہے مگر رات نہیں کٹ جاتی — اب تو سورج بھی ستاروں میں گنا جاتا ہے

اس عہد کے آدمی کے گداز دل وذہن سے نا آشنا ہونے کا حسین ترین اظہار ۔ نظم "پتھر ہیں" ؎

جتنے معیار ہیں اس دور میں سب پتھر ہیں
جتنی اقدار ہیں اس دور کی ، سب پتھر ہیں
رقص و تصویر بھی اور شعر و غنا بھی پتھر
سبزہ و گل بھی ، ہوا اور فضا بھی پتھر
مرا الہام ، ترا ذہنِ رسا بھی پتھر
اس زمانے میں تو ہر فن کا نشاں بھی پتھر
ہاتھ پتھر ہیں ترے ، میری زباں بھی پتھر

ریت سے بُت نہ بنا اے مرے اچھے فن کار

آدم نو کو ان خطرات سے بچانے کے لیے ندیم بار بار عصرِ حاضر کے فن کار سے مخاطب ہوتے ہیں کہ یہی ان کی رجائیت کی آخری امید گاہ ہے ؎

اس شان سے بدلا ہے چلن عصرِ رواں کا　　　اب چاند بھی اک پھول ہے گلزار جہاں کا
اب فاصلے کچھ ہیں تو روایاتِ کہن ہیں　　　اب حدِ نظر پر بھی گماں ہے رگِ جاں کا
اس درجہ بصارت کے افق پھیل گئے ہیں　　　تاروں پہ بھی دھوکا ہے رخِ برق وشاں کا
وہ دن کا پھیکا لا ہو کہ داغ رخِ خورشید　　　محتاج ہے فن کار کی چشمِ نگراں کا

اے نغمہ گرانِ عصرِ حاضر　　　آغوشِ خیال کب سے وا ہے
جب دل ہو رہینِ طاقِ نسیاں　　　سَر اپنے مدار سے جدا ہے
مٹی سے اگر بنا تھا آدم　　　انسان تو پیار سے بنا ہے

اگر جوہری دوڑنے دنیا کو صحرا نہ بنا دیا تو ندیم کی یہ آوازِ صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی۔

میں نے جن نظریات فن کی خاطر حسبِ توفیق قربانیاں دی ہیں اور اب تک دے رہا ہوں وہ میرا محض نظریہ نہیں ہیں ، میرا ایمان بھی ہیں ۔۔۔ میں یہ دعوٰی کرنے کو بھی تیار رہوں کہ میں پاکستان کا واحد شاعر ہوں جس نے کسی بھی مصلحت سے کبھی شکست نہیں مانی ۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ ندیم

لالۂ صحرا

کلام ندیم کے جلال میں جمال کے پہلو

اردو شاعری کے موجودہ دور میں جو چند نام آبروئے سخن مانے جاتے ہیں ان میں ندیم کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے عمر عزیز کے کم و بیش چالیس سال اردو کی خدمت میں صرف کیے ہیں اور اب بھی ان کا قلم حسن سرعتِ رفتار سے نہ صرف شاعری بلکہ مختلف النوع ادب کی تخلیق میں مصروف ہے اس کی مثال ملنا دشوار ہے۔ غزل، نظم، قطعہ، رباعی، افسانہ، مقالہ، مزاح، غرض ہر طرح کی خدمات وہ انجام دے رہے ہیں۔ جن کا احاطہ مشکل ہے۔ وہ نہ صرف چوٹی کے شاعر اور صفِ اول کے افسانہ نگار ہیں بلکہ صحافت میں بھی ان کا مقام بہت بلند ہے۔ اگر شعر کی تاریخ میں ان کا نام زندۂ جاوید رہے گا تو افسانوی ادب بھی ان کا منت کشِ احسان ہے اور اگر صحافت ان کے دست و قلم پر ہمیشہ ناز کرے گی تو مزاح نگاری میں بھی ان کی حیثیت منفرد ہے۔

یہ اعتراف مجھے ابتدا ہی میں کر لینا چاہیے کہ میں نہ نقاد ہوں نہ سخن شناس۔ میں نہ خود میں اتنی اہلیت پاتی ہوں کہ ایک عظیم شاعر کے کلام کی گہرائیوں کو سمجھ سکوں اور اس پر مدلل بحث کر سکوں۔ نہ ہی تنقید میرا منصب ہے۔ میں تو ایک عام قاری کی حیثیت سے اپنے تاثرات بیان کروں گی جو اُن کے کلام کے اس پہلو کے مطالعے سے میری ناقص سمجھ میں آتے ہیں۔۔۔۔۔

جہاں تک مجھے علم ہے کلام ندیم کے جلال میں جمال کے اس پہلو کو اب تک کسی نے لائق توجہ نہیں سمجھا، کہ ندیم کی رسیلی شخصیت میں آہن و فولاد اور حریر و گلاب کی یہ دو متضاد صفتیں کس طرح جمع ہو گئیں۔ آخر کوئی سبب تو ہو گا۔ آج تک یہی بات مجھے کھٹکتی رہی ہے اور میں منتظر رہی ہوں کہ ان کی شاعری اور شخصیت کے اس نازک اور لطیف پہلو کی طرف بھی کوئی سوچے۔ آج میں کوشش کروں گی کہ اپنی کم علمی کے باوجود اس میں وہ سب کچھ بیان کر دوں جو میری ناپختہ عقل ان کے کلام کے گہرے مطالعے سے اخذ کر سکی ہے۔

عام طور پر لوگ انھیں ایک فکری شاعر کی حیثیت سے جانتے اور مانتے ہیں اور یہ بالکل صحیح ہے۔ نقاد حضرات بھی ان کی شاعری کے صرف اس حصے کو اہمیت دیتے ہیں۔ اور اسی کا ذکر کرتے ہیں جو زیادہ نمایاں ہے۔ اور سارا زور یہ ثابت

کرنے پر صرف کرتے ہیں کہ وہ فقط مدنی و فکری شاعری کے علمبردار ہیں۔ انقلاب اور انسان دوستی کے شاعر ہیں۔ اس سے کسی کو انکار نہیں۔ ان کی فکری شاعری کی عظمت سے کوئی بھی نظر نہیں کر سکتا۔ اس کے متعلق تو بہت کچھ کہا جا چکا ہے لیکن اس حقیقت پر بھی ایک نظر ڈال لینا نامناسب نہ ہوگا کہ بقول خود انہی کے :-

یہ حقیقت کہ جو شاعر ہے وہ انسان بھی ہے

آخر ان کی شاعری کے حسین و لطیف پہلو کی طرف کسی کی نظر کیوں نہیں جاتی۔ یا پھر شاید وہ لوگ اسے ایک کمزور چیز سمجھ کر ونقطۂ چشم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور یہ نہیں سوچتے کہ جب شاعر اسی دنیا کا رہنے والا ایک انسان بھی ہے تو انسان تو محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ پھر انسان دوستی اور انسان پرستی کی منزل بھی زندگی میں سر نہیں ہوتی۔ یہ تو بعد کی بات ہے ابتدا میں تو کسی ایک انسان کی محبت ہی قلب کو ایک نئی حرارت سے روشناس کراتی ہے۔ اور اگرچہ ندیم خود بھی دعویٰ تو یہی کرتے ہیں کہ :-

تم نے افراد سے پیمانِ محبت باندھا
آدمیت کے تقاضوں کا وفادار ہوں میں

مگر جب تک وہ آدمیت کے تقاضوں کی وفاداری سے پہلے کسی ایک فرد سے پیمانِ محبت باندھ چکے ہیں اور جب تک آدمی کسی ایک فرد سے محبت نہ کرے وہ پورے عالم انسانیت سے محبت کرنا کیسے سیکھ سکتا ہے۔ جب تک قلب انسانی میں کسی فردِ واحد کی محبت کا سوتا نہ پھوٹے وہ بحرِ بیکراں کیسے بن سکے گا۔ اسی محبت کے بعد "دل دریا سمندروں ڈونگے" بنتے ہیں۔

تاریخ کے صفحات میں ہمیں متعدد ایسے نام ملیں گے جن کو محبت نے ہی درجات عالیہ تک پہنچایا۔ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ شاہ عبد اللطیف بھٹائی "بڑے عارف کامل اور شاعر بے بدل ہیں۔ لیکن ان کے بھی یہ مقام بلند حاصل ہونے کی ابتدا ایک عورت کی محبت کی چنگاری ہی سے ہوئی تھی۔ اقبال نے "دردیدۂ معنی نگراں" پیغمبری کی ہے۔ لیکن انھوں نے بھی اپنے سفر شاعری کی ابتدا اسی محبت سے کی تھی۔ فیض بھی انسان دوستی اور فکری شاعری کے نقیب ہیں۔ گویا نھیں اس عظمت سے کسی حوا کی بیٹی نے ہی ہم کنار کیا ہے۔ عورت مرد کو مجنون و فرہاد بھی بنا سکتی ہے اور ولی کامل بھی —

ندیم بھی ابن آدم ہیں وہ اس کے بغیر اتنے بڑے فن کار کیسے بن سکتے تھے۔ مجازی محبت صوفیا کو عشق حقیقی تک پہنچاتی رہی ہے وہ ہمہ اوست کے عقیدے کے قائل ہیں اور اسی مجازی محبت سے انسان دوستی اور عشق نوع انسان تک پہنچے ہیں۔ (جو در اصل وہی محبوب حقیقی کا عشق ہے) ان کے اشعار خود اس کی گواہی دیتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ فکری شاعری سے قطع نظر کر کے صرف ان کے عشقیہ اشعار کا مطالعہ کیا جائے ؎

تجھے معلوم کیا مردِ خردمند　　کہ میرے شوق کی منزل کہاں ہے
خرد تھی تو اک محدود بستی　　محبت اک خلائے بے کراں ہے

وہ شاعری جو محبت سے بہرہ یاب ہوئی — کبھی نہ رہ سکے گی خرد کے جادوں پر
لفظوں میں ترانگہ ... شعروں میں ترنم — [illegible]

جب تک نہ جلے چراغِ دل کا
ہر شے کا جمال رائیگاں ہے

ندیم کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۱ء تک کا ہے جسے وہ خود بھی محض مشق کا درجہ دیتے ہیں۔ وہ اس زمانے کا زیادہ تر کلام تلف کر چکے ہیں۔ اس کے چند نمونے ہمیں "جلال و جمال" میں مل جاتے ہیں مگر ہم بھی اسے حذف کیے دیتے ہیں۔

دوسرا دور ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۳ء یا ۱۹۴۴ء تک کا ہے۔ ان کی زندگی کے خود نوشت حالات جو ہم "جلال و جمال" کے دیباچے میں پڑھ چکے ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ کتنے پر آشوب دور سے گزرے ہیں۔ بچپن سے لے کر جوانی تک انھیں جن جن حالات سے سابقہ پڑا ہے ان کا اثر ان کے ذہن پر بڑا شدید ہے۔ اس زمانے میں اگرچہ ان کے کلام میں [illegible] بلندی ظاہر ہونے لگے ہیں۔ لیکن یہ ثانوی دور بھی [illegible] ذہنی [illegible] کا شکار ہے۔ ان کی ذہنی کلفتوں کا کوئی [illegible] ہے۔ [illegible] ناموافق ہی ہیں۔ اور ہر انسان پر اس کا [illegible] حوال، حالاتِ زندگی، حیاتِ فانی کے غم، مسرتیں، محبتیں، نفرتیں، ناکامیاں، محرومیاں، حوادث و واقعات ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور [illegible] ان سے ہر حیرت [illegible] خیالات و جذبات اثر پذیر ہوتے ہیں۔ پھر شاعر کا احساس تو بے انتہا نرم و نازک ہوتا ہے اور ندیم [illegible] شاعروں سے بھی زیادہ حساس ہیں۔ اس کے بھی اسباب ہیں۔ یعنی وہی شدائدِ حیات اور تلخیاں جو انھیں زندگی سے ملی ہیں۔ مطلب یہ کہ ہر پھر کر بات پھر وہیں حالاتِ زندگی تک پہنچ جاتی ہے۔ بچپن اور عنفوانِ شباب کے تجربات پر وہ خود اس دیباچے میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ اتنے حوصلہ شکن حالات تھے کہ [illegible] دماغ کا [illegible] ہوش [illegible] پھر غلط راہ میں تسکینِ ذہنی کی تلاش کرتا لیکن انھوں نے عہدِ طفولیت سے جوانی، جوانی سے پختگی تک ان کا جس پامردی اور بلند حوصلگی سے مقابلہ کیا وہ ان کی باہمتی اور اولوالعزمی کی دلیل ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر انھیں اتنے شدید غم و آلام اور آزمائشوں سے واسطہ نہ پڑتا تو شاید اس [illegible] کی تکمیل کبھی نہ ہو سکتی جو ندیم کی شخصیت میں تشکیل پا رہی تھی اور یہ جوہرِ قابل کبھی جلا نہ پا سکتا۔ غم روح کی غذا ہے۔ کم حوصلہ لوگ غم سے گھبرا کر ہمت ہار بیٹھتے ہیں اس لیے کہ غم کی پذیرائی سے لے کر ضبطِ غم اور پھر لذتِ درد تک پہنچنے کے لیے جس حوصلہ و تاب و تواں کی ضرورت ہوتی ہے وہ قدرت ہر ایک کو عطا نہیں کرتی کیونکہ ؎

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

یہ دورِ ثانی اگرچہ دورِ اول سے بہت بہتر ہے مگر اس دور میں ان کی ذہنی الجھنیں اور ان کا جال صاف محسوس ہوتا ہے۔ ابھی ان کی منزل متعین نہیں ہوئی۔ لیکن اس دور میں بھی ہم ایسے خوبصورت اشعار پاتے ہیں جن سے ان کے روشن اور درخشندہ مستقبل کا اندازہ ہوتا ہے اور ہمیں ایک عظیم شاعر ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔

نقاب ڈال رکھے ہیں دلِ فسردہ پر — کوئی سمجھ نہ سکے میرے مسکرانے کو

یہی سُتی ہوئی نیندیں، یہی افسردہ دل
میں سوچتا ہوں کہ سب کچھ لٹا کے کیا پایا

حنا کا اب نہ بہانا تراش، میں خوش ہوں
کہ دل کا آخری قطرہ بھی تیرے کام آیا

سمجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری
مری موت سے نہ ہوگی مرے غم کی ترجمانی

اتنی ہلکی ہے شبستانِ محبت کی ہوا
میری سانسیں کبھی مجھے بار ہوئی جاتی ہیں

وہ میرے عشق کا مقصودِ خاص پوچھتے ہیں
ضرورت آن پڑی آئنہ دکھانے کی

اس دور کی شاعری میں ہمیں ایک پیاس، ایک تمنا، ایک موہوم سی آرزو دکھائی دیتی ہے۔ ان کی روح تشنہ ہے، اسے سکون نہیں ملتا۔ اور صاف ظاہر ہے کہ یہ محبت کی تشنگی ہے۔ اگرچہ اس دور کے قطعات اور اشعار میں محبت کا ذکر ملتا ضرور ہے۔ لیکن یہ "تہذیب رسمِ عاشقی کی ذیل میں آتے ہیں"۔ ان دنوں شاعر کو کسی ایسی ہستی کی تلاش ہے۔ جو محبت کی شبنم بن کر اس کے دل کے تپتے ہوئے صحرا میں چپکے سے اتر آئے۔ اس دشت لامحدود پر ابرِ نیساں بن کر برس پڑے۔ اس کے قلبِ تپاں کو تسکین بھی عطا کرے اور ایک دردِ لا دوا بھی بخش دے۔ اسے حقیقتوں سے ہم کنار کردے۔ اس زمانے کے اشعار میں یہ تمنا صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔ شاعر خود بھی نہیں جانتا کہ اسے کس کی تلاش ہے۔ بہر کیف اس کی روح بے سکون ہے، اس کا ذہن ژولیدہ ہے، اس کا دل بے چین ہے، مضطرب ہے، منتظر ہے۔ کسی زخم کا، کسی چوٹ کا، سازِ قلب کسی بھی مضراب کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہے کہ کوئی تو ہو جو اس کی روح کی پکار پر لبیک کہے اور اسے

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کردے
مری تمنا میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کردے

اور یہ اشعار اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں ؎

خود اپنے ہی ریزے مری جھولی میں بکھرے ہیں
اور اب یہ دعا ہے کہ کوئی شیشہ گر آئے

آپ کیوں سامنے نہیں آتے
آپ کیوں روح میں سمائے ہیں

ان دنوں ان کے سامنے کوئی روشن تصویر نہیں۔ لیکن ایک موہوم سا تصور ضرور ہے جس کے وہ منتظر ہیں۔ اس دور کے اشعار میں محبت کے متعلق سنجیدگی، گہرائی اور حقیقی تڑپ نہیں ملتی۔

اب تیسرا دور شروع ہوتا ہے جو ۱۹۴۳ء سے شاید ۱۹۵۶ء تک کا ہے۔ اب ان کا شعور پختہ ہو چکا ہے۔ ذہن کی ژولیدگی ختم ہو چکی ہے۔ شاید ان کی روح کو وہ زخم میسر آگیا ہے۔ اور اب ان کے اشعار میں ایک خاموش، سنجیدہ تڑپ، سوز و گداز پیدا ہو چکے ہیں۔ اس کا ثبوت شعلۂ گل کے اشعار ہیں۔ اس مجموعے کی نظموں میں بجائے خود بڑی توانائی، تازگی اور نکھار ہے۔ انسان دوستی ہے۔ ایک عزمِ صمیم ہے۔ لیکن میرے موضوع کا اس سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ اس لیے میں زیادہ تر ان کی غزلوں اور تھوڑا بہت نظم و قطعات کا ذکر کروں گی۔ اس مجموعے میں ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۲ء تک کی غزلیں شامل ہیں۔ اب ان کے اشعار میں وہ جلال و جمال والی بے یقینی، بے سکونی اور اضطرار کی کیفیت ختم ہو چکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ شاعر کا دل اس مطلوبہ زخم کی پذیرائی کر چکا ہے۔ اس کے سازِ قلب پر مضراب کی وہ چوٹ لگ چکی ہے جس کا وہ منتظر تھا۔ لیکن تا حال وہ ایک چنگاری سی ہے جو خاکستر میں دبی ہوئی ہے۔ شاعر کو احساس ہے کہ اس کا محبوبِ نظر اس کی کیفیتِ قلب سے بے خبر محض ہے۔ لیکن وہ کھل کر اظہارِ محبت نہیں کرتا۔ صاف طور پر اس کے حضور اعتراف نہیں

کر سکتا۔ اس کا عشق باشعور ہے۔ وہ خاموش اور پاکیزہ پیار کا قائل ہے۔ محبت کا تقدس اس کے لبوں پر مہرِ سکوت لگائے ہوئے ہے۔ وہ محبت جو انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہے ؎

میں جسے ضبطِ ادب کہتا ہوں تو فرطِ حیا　　　عشق اور حسن میں حائل ہے وہ دیوار ابھی
کشتِ ویراں، ابھی برسات کی ترسائی ہے　　　بدلیاں جھوم رہی ہیں سرِ کہسار ابھی

شعلۂ گل کی ہر غزل اسی کیفیتِ دروں کا اظہار کرتی ہے۔ اور یہ کیفیت ۱۹۵۵ء تک بعینہٖ قایم ہے۔

خدیجہ مستور نے "نقوش" کے شخصیت نمبر میں لکھا ہے "ندیم سے بارہا کرید کرید کر پوچھنے کی کوشش کی کہ آیا انھوں نے سچ مچ کسی سے محبت کی تھی یا یہ محض شاعرانہ تعلّی ہے۔ لیکن وہ کوئی جواب نہیں دیتے۔ اور زیادہ اصرار کرو تو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں "کی تھی۔ پھر؟ کوئی تمھارا جارہا ہے؟" لیکن پھر عورت کا یہ عبادت کی حد تک احترام کہاں سے آیا۔ ندیم انھیں یاد نہیں۔ بہ عنوانِ سراب کہ کوئی عورت ہی ہے جس نے انھیں یہ مستحکم ایمان بخشا ہے۔"

میں اس سے متفق ہوں۔ اس لیے کہ ان کے اشعار یہی داستان کہہ رہے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ؎

زندگی کا ذائقہ تھا ان ہونٹوں کے لمس میں　　　فکر کا شاعر ہوں لیکن حسن کا گھائل بھی ہوں

پیاس ختم ہو چکی لیکن روح زخمی ہے۔ اور وہ زخم ہر شعر میں ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ اس دور کی شاعری کی خاص کیفیت ہے۔ اب شاعر کو تلاش ہے۔ اسے اس صیاد کی تلاش جو "درونِ سینہ" وہ "زخم بے نشاں" لگا کر سات پردوں میں جا چھپا ہے ؎

میں کب سے گوش بر آواز ہوں پکارو بھی　　　زمیں پر یہ ستارے کبھی اتارو بھی
بھٹک رہا ہے دھندلکوں میں کاروانِ خیال　　　بس اب خدا کے لیے کاکلیں سنوارو بھی
جو ابتدائے سفر میں دیے بجھا بیٹھیں　　　وہ بد نصیب کسی کا سراغ کیا پائیں
کائنات ایک دشتِ بے انجام　　　اب کہاں ڈھونڈے کسی کی گلی

ندیم فلاطونی محبت کے قائل ہیں۔ بار بار محبت کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ ان کی استادِ طبع ہرجائی پن سے متنفر ہے۔ وہ محبت میں بھی توحید پسند ہیں۔ اسی لیے وہ ... لت کر بھی دشتِ جنوں کی راہ نہیں لیتے۔ بلکہ اسی "شمعِ کشتہ" سے نباہ کرنے کا عزم کیے ہوئے ہیں ؎

نئے چراغ جلا لوں مگر یہ عزمِ صمیم　　　کہ شمعِ کشتہ سے ہر حال میں نباہ کروں
یہ تیری چاپ ہے یا میرے دل کی دھڑکن ہے　　　بہت قریب سے آئی ہے دور کی آواز

پھر انھیں یعنی اسی شمع کے دکھ کا بھی شدید طور پر احساس ہے۔ ان کا دل ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار ہے ؎

گو پتنگوں کی شکایت بھی بجا ہے میرے دوست　　　شمع کے آنسو بھی کوئی پونچھنے والا نہیں
برا نہ مانے تو دامن سے چن لوں اشک ترے　　　کہ میں ہی تھا تری دوشیزگی کا آئینہ ساز
ترے غرور میں پنہاں مرا غرورِ شکست　　　میں تیرے راز نہ کھولوں گا میرے محرمِ راز
کیفِ وصال سے سوا قربِ جمال سے سوا　　　میرے خیال سے ترا میرے خیال ہی میں رم
میرا سرمایۂ حیات ہو تم　　　میرا فن میری کائنات ہو تم

باوجود التفاتِ پیہم کے　　　ان کہی - ان سنی سی بات ہو تم

ایک اور قطعہ ہے ؎

میں ستاروں کے اُجالے میں تجھے ڈھونڈوں گا　　　ڈوبتے چاند کے ہالے میں تجھے ڈھونڈوں گا
جستجو جب افقِ زیست پہ منڈلائے گی　　　شستِ تصور کے سنبھالے میں تجھے ڈھونڈوں گا

اور اس ہزاراں شبہائے طویل اور روزہائے دراز پر مشتمل شبِ فراق کی طوالت اور کیفیت کے اظہار کے لیے انھوں نے بڑا حسین پیرایۂ اظہار اور گوناگوں اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ کبھی انھیں پھولوں کی فراوانی سے باغ جلتا محسوس ہوتا ہے۔ چاروں طرف آتشِ گل نے ان کے دل کی عجیب حالت کر رکھی ہے۔ ایک طرف تو ؏

نازنیں پیکر سا اک رقصاں ہے دل کے متصل

اور دوسری سمت ایک ابدی تلاش ان کا مقدر بن چکی ہے۔ اس عالم میں پھولوں کا رنگ شعلہ اور نکہت شرار دکھائی نہ دے اور چمن دہکتا الاؤ نظر نہ آئے تو اور کیا ہو ؎

چٹک رہے ہیں شگوفے دہک رہے ہیں گلاب　　　وفورِ موسمِ گل ہے، کہ باغ جلتے ہیں
تجھ سے پہلے تو بہاروں کا یہ انداز نہ تھا　　　پھول یوں کھلتے ہیں جل جائیں گلستاں جیسے
بہار جب بھی چمن میں دیئے جلاتی ہے　　　ہجومِ گل سے مجھے تیری آنچ آتی ہے
آگ جلتی ہے کہ کھلتے ہیں چمن　　　رنگ نکہت ہے تو شعلہ ہے شرار

اور یہ حسین قطعہ جو آہِ نیم شبی کا ساتاثر دیتا ہے۔

گلوں میں رنگ تو تھا رنگ میں جلن تو نہ تھی　　　دہک میں کیف تو تھا کیف میں جنوں تو نہ تھا
بدل دیا ترے غم نے بہار کا کردار　　　کہ اب سے قبل چمن کا مزاج یوں تو نہ تھا

شاید اس مجموعۂ کلام کا نام شعلۂ گل تجویز کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ اس دور میں انھیں ہر سمت - یہی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ تلاش جاری ہے زبان بند ہے اور لب خاموش۔ لیکن اشعار میں اس کیفیت کا اظہار ہو ہی جاتا ہے جو کچھ ایسی ہے ؎

آنسو مرے دل میں گر رہے ہیں　　　نالے مرے خون میں رواں ہیں
ترے غرور کے انداز سے نمایاں ہے　　　نہ مل سکے گا مجھے زندگی کی راہ میں تو
یہ محبت کہیں محرومی کا جواز نہ ہو　　　کھو گئیں تم تو خدا کو بھی نہ اپناؤں گا

لیکن یہ ان کی لاعلمی کی وجہ سے ہے۔ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ بعد کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سینہ ان کے غم کا رازدار نہ سہی بہرکیف خود تمندر اسی آتشِ غم میں پھنک رہا ہے۔ یہ الگ بات کہ شاعر تا حال بے خبر ہے۔ اور یہ بے خبری اس کیفیت کو اور زیادہ شدید کر رہی ہے۔ اور وہ اس عالم میں خدا سے کہتے ہیں۔ قطعہ

میں رند سہی - رند سیہ کار نہیں تھا　　　جذبات کے چنگل میں گرفتار نہیں تھا
اے میری محبت کا گلا گھونٹنے والے　　　میں تیری خدائی کا خریدار نہیں تھا

ایک قطعہ ہے اس میں بڑے انوکھے طریقے سے اس ناکامی کو بیان کیا ہے ؎

نظر آئی نہ اب تک منزلِ دوست　　اگرچہ کام کچھ مشکل نہیں تھا
بایں ذوقِ طلب یہ نامرادی　　مرے سینے میں شاید دل نہیں تھا

اور ؎　　ابھی کچھ اور سلگتا ہے وقت کی لو پہ　　ابھی نہیں مرے معیارِ زندگی میں گداز

وہ بار بار اس چراغِ سرِ راہِ انتظار کا ذکر کرتے ہیں جو انھوں نے مدت العمر سے جلا رکھا ہے اور بعض اوقات تو فورِ اشتیاق اور شدتِ انتظار میں خود چراغ بن کر جلنے لگتے ہیں ؎

تم کو آنا ہے تو آؤ کہ دیا جلتا ہے　　پھر نہ جانے یہ سہارا ابھی ہے گا کہ نہیں
مجھے تسلسلِ لیل و نہار کی سوگند　　بجھا نہیں ہے سرِ راہِ انتظار چراغ
اک عمر سے ہر شب سرِ شہراہِ محبت　　میں شمع کے انداز میں جلتا ہوں سحر تک
بہار جب بھی چمن میں دیے جلاتی ہے　　بجومِ گل سے مجھے تیری آنچ آتی ہے
ترے نصیب میں راتیں مرے نصیب میں دن　　ترے چراغ، مرے دل کے داغ جلتے ہیں

ایک قطعہ ہے: ؎

گو وقت کردشیں ہی بدلتا رہا مدام　　میرا خلوص مثلِ کہستان ہے استوار
تم رخ بدل کے دوسرے رستے پہ ہو لیے　　روشن رہا چراغ سرِ راہِ انتظار

ایک قطعہ میں محبوب کے پرایا ہو جانے کی کیفیت یوں بیان کی ہے کہ پوری تصویر اس بے قراری کی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے جو اس وقت یہ خبر سن کر شاعر کو ہوئی ہوگی جو شمع امید جلائے منتظر تھا۔

بجھا دو شمعِ کا طوری بجھا دو　　گلوں کو روند دو سپنیں اٹھا دو
انھیں اک اور جنت مل گئی ہے　　مرے فردوس کو دوزخ بنا دو

"رم جھم" میں ان کی نظم "تصور" ان کی پوری داستانِ ماضی بیان کر رہی ہے۔ وہ کس حالتِ بیخودی میں بے قرار ہو کر کہہ اٹھتے ہیں ؎

قریب و دور سے کوئی بلا رہا ہے کیا کروں　　سکوت کے سُروں میں گنگنا رہا ہے کیا کروں
نہیں یہ ایک وہم ہے۔ نہیں یہ ایک خواب ہے　　میں لٹ چکا، میں مٹ چکا مرا یہی جواب ہے
الاؤ بجھ چکا ہے اپنی راکھ اب اڑاؤں کیا　　کھنڈر میں طاق ہی نہیں نئے دیے جلاؤں کیا

اس طرح وہ دل کے بجھے ہوئے الاؤ میں سلگتی ہوئی چنگاری کو بھڑکنے سے بچانے کے لیے خود کو دھوکا دیتے ہیں۔ لیکن اسی نظم کے آخری دو شعر بتا رہے ہیں کہ وہ خود سے لڑ نہیں سکے اور کہہ اٹھتے ہیں ؎

ہوا چلی کہ دامنِ جمال لہلہا گیا　　مہک اٹھی کہ حسن چار سو چمن کھلا گیا
چمن۔ پھر اک لٹے ہوئے چمن کی یاد آگئی　　مرے نصیب کو تو آتشِ چمن جلا گئی

ان اشعار میں انتہائی حسرت و یاس ہے، ساختہ ارمانوں کی راکھ ہے، شدتِ غم ہے، آہیں ہیں، کیا نہیں [illegible]

اور پھر ۱۹۵۲ء میں الاؤ بجھانے کا پہرہ بٹھانے والے، تقریباً دس برس بعد ۱۹۶۲ء میں یہ کہہ رہے ہیں ؎

یوں بظاہر تو دیا میں نے بجھا رکھا ہے   درد نے دل میں الاؤ سا لگا رکھا ہے

"رم جھم" ہی کی ایک اور نظم "الہام" کا پہلا قطعہ درد اور غمِ صمیم کے ملے جلے تاثرات پیش کر رہا ہے:

مرے ندیم بس اتنی ہی تھی حکایتِ شوق   تو مل سکی نہیں، وہ بنی حیات اپنی
مجھے بجھا نہ سکیں دوسروں کی قندیلیں   مرے چراغ کے شعلے ہی کائنات اپنی

مرا شباب، مری شاعری، مرے رومان   یہ راز ہیں، مرے رازوں کی کوئی بات نہ چھیڑ

اپنی شکست کا تذکرہ وہ بار بار کرتے ہیں۔ لیکن ندیم کی شکست یہ نہیں کہ انھیں طرفِ ثانی کی طرف سے نفرت یا بے رخی ملی ہو۔ اس معاملے میں ندیم ان گنت شاعروں کی نسبت بے حد خوش نصیب ہیں کہ انھیں سمتِ دیگر سے بے پناہ محبت ملی ہے۔ الغرض محبوب کی بے وفائی یا ستمگری کا کوئی تجربہ نہیں اور یہی سبب ہے کہ دوسرے شاعروں کے برخلاف ان کی پوری شاعری میں 'بے وفائی' کا لفظ تک نہیں ملتا۔ بلکہ اس کے برعکس ان کی تمام عشقیہ شاعری وفاؤں کے تذکرے سے بھری پڑی ہے۔ لیکن محبوب کو حاصل کرنے میں ناکامی، محرومی اور احساسِ شکست ہر ہر لمحہ انھیں بے قرار کیے ہوئے ہے ؎

مری شکست مرے راستے کی دھول بنی   مری شکست تو ادراک کا اصول بنی
کلی کا خون ہوا اور سنور گیا ہے چمن
گلوں میں لپٹی ہوئی یادِ یار کی سوگند   بھلا ہوا ہے ابھی تک مری شکست کا داغ

شعلۂ گل کی اس نظم کا نام ہی "میری شکست" ہے۔ لیکن یہ ایک بے حد باوقار شکست ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں۔

شکست سے مرا اخلاق اجنبی ہے ندیم   سحر ملے نہ ملے رات سے نہ ہاروں گا

محبوب کو نامہ لکھتے اور اس کا انتظار کرتے ہیں تو اس کا بیان بھی لطف سے خالی نہیں۔ ایک قطعہ دیکھیے ؎

ان کو خط لکھا تھا لیکن وہ اب تک خاموش رہے   مجھ کو حیراں دیکھ کے اکثر ہنس دیتا ہے ہرکارہ
چٹھی آ نکلی تو دل کی ڈالی کونپل چھوڑے گی   اس کو کیا معلوم ہے آخر وہ کیا جانے بیچارہ

اور جب یہ چٹھی آ نکلتی ہے تو پھر ان پر ایک نیا انکشاف ہوتا ہے خود انہی کی زبانی سنیے ؎

آج ترے عتاب نامے میں   بات بین السطور مل ہی گئی
میرے طوفانِ شوق میں گھر کر   اپنی برہمی پگھل ہی گئی

اور اب ان کے احساسات کچھ اس قسم کے ہیں کہ زندگی کی خزاں آ چلی ہے اور اب تو عمر بھر کی ناکامیوں کے بعد کوئی امید کی کرن چمکے۔ تلاش کا یہ دور تقریباً ۱۹۵۵ء، ۱۹۵۶ء تک بدستور قایم ہے۔ لیکن اب انھیں وداعِ جوانی کا احساس اس قسم کے اشعار کہنے پر مجبور کر رہا ہے۔

آج کچھ ذکر رفو کا بھی چلے   کب تلک چاک کروں پیراہن
تمام عمر کیے چاک دامنی کے گلے   بعزمِ بخیہ گری بخیہ گر کا ذکر کریں

مری شیوہ ہمنگو، شباب دانی ہے   ہنر درعشق کا دیرینہ کھیل بار و بھی

لیکن ان کا ایمان ہے کہ چپ کی داد ضرور ملتی ہے اور خدا آخرکار ان کی یہ تمنا کسی حد تک پوری کر ہی دیتا ہے ؎

چپ ہوں کہ چپ کی داد بہ ایمان ہے مرا   مانگوں دعا جو میرے خدا کو خبر نہ ہو

اور اب ان کی عمر بھر کی تشنہ کھیتی کسی حد تک سیراب ہونے لگتی ہے ۔ ۱۹۵۵ء، ۱۹۵۶ء سے ان کی شاعری اچانک ایک نئی کروٹ لیتی ہے ۔ اس کے بعد ان کی شاعری کا سب سے زیادہ حسین دور شروع ہوتا ہے ۔ جو صحیح معنوں میں ان کی عشقیہ شاعری کی ابتدا ہے ۔ اور ہم کیسے مان لیں کہ یہ "بے خودی" "بے سبب" ہے ۔ صاف ظاہر ہے کہ اب ان پر باران التفات ہونے لگا ہے اور وہ بے اختیار کہتے ہیں کہ اب ماضی کے کھنڈر میں قندیل جل رہی ہے ۔ اور ویرانۂ احساس میں پھول کھلنے لگے ہیں ؎

گردشِ وقت کو سوجھی ہے نرالی تمثیل   جل رہی ہے مرے ماضی کے کھنڈر میں قندیل
اب ترا التفات ہے حادثۂ جمال و فن   اندھے عقاب کی اڑان زخمی ہرن کا بانکپن
اب اس کے بعد مجھے فکر کیا کہ ہوگا کیا   وہ آنکھیں آج مرے غم پہ ڈبڈبائی تو ہیں
ہوئی ہے عمر کہ ویران ہے مرغزارِ شباب   اب التفات کے بادل برس رہے ہیں کیوں
چلمن اٹھی کہ خزاں ختم ہوئی   آج تو پھول سرِ بام کھلے
ہر زخم زبان بن رہا ہے   اب دردِ حیات میں کمی ہے
نومیدیٔ جاوید کا اللہ رے اعجاز   آتے مری آغوش میں اور بےطلب آئے
آفاق میں پھولوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا   جب میرے لبوں تک کسی کافر کے لب آئے

بلاشبہ انھوں نے اپنے فنی سفر کی ابتدا فکری اور مقصدی شاعری سے کی ہے لیکن ان کی عشقیہ شاعری بجائے خود بے حد حسین و عظیم ہے حقیقی جذبات کا بے تکلفانہ اظہار ہے ۔ ان کا تصورِ عشق بقول آمنہ تجمل بیک وقت حسرت کی طرح ختم، اقبال کی طرح رفیع اور فراق کی طرح ارضیت لیے ہوئے ہے ۔ وہ بہت بڑے حقیقت پسند ہیں ۔ وہ ڈوب کر شعر کہتے ہیں ۔ ان کا ایمان ہے کہ محبت انسان کی سب سے بڑی عبادت ہے ۔ جب عشق کی چنگاری حزم و احتیاط کے باوجود بھڑک کر شعلۂ بے اماں بن جاتی ہے تو وہ اس طرف بھی پوری پوری توجہ دیتے ہیں ۔ اور ایسے پھولوں کی طرح مہکتے اشعار تخلیق کرتے ہیں کہ روح تک مسحور ہو جاتی ہے ۔ وہ جب مصافِ زندگی سے خیال ہٹا کر شبستانِ محبت میں داخل ہوتے ہیں تو سچ مچ حریر و پرنیاں بن جاتے ہیں ۔ اور اس وقت ان کا انداز بالکل اس شعر کے مطابق ہوتا ہے ؎

درعشق غنچہ ایم کہ لرزد ز باد صبح   درکارِ زندگی صنعتِ سنگِ خارا ایم

۱۹۵۷ء ہی سے وہ ایک نئے جذبے کا اظہار کرنے لگے ہیں اس التفات و اعتراف نے درد کی سوزش اور کرب کو اور بڑھا دیا ہے ۔ اب دل اور بھی زیادہ بے چین اور بے قرار ہوتا جا رہا ہے ۔ اتنے بڑے حقیقت پسند ہونے کے باوجود وہ مزاجاً ذرا بھی کرخت نہیں ہیں کتنے لطیف انداز سے وہ اپنے محبوب نظر سے مخاطب ہوتے ہیں ؎

مرا غرور ترے حسن کی ثبات میں ہے   تو میرے دل میں نہیں ساری کائنات میں ہے

بیدا ہے تو مرے ہاتھ کی لکیروں میں ہیں　　جو تو رفیقِ سفر ہو تو رات رات نہیں

"دشتِ وفا" کا حرفِ اول غالب کا شعر بھی اس کیفیت کی ترجمانی کر رہا ہے جو ان کی شاعری کی نئی کروٹ کی اس کیفیت کی غمازی کر رہا ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں ؎

مژدۂ صبح درین تیرہ شبانم دادند　　شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

اسی مجموعے کی ایک نظم "شباب کے پھول" میں وہ فرماتے ہیں ؎

یہاں سے وہ قافلے نہ گذرے فضا میں گونجی تھی چاپ جن کی
میں عمر بھر منتظر رہا ہوں گواہ گردش ہے رات دن کی

اس عمر بھر کے انتظار کے بعد مادی دوریوں کے باوجود بھی ذہنی طور پر وہ اپنے محبوب سے اتنے قریب معلوم ہوتے ہیں کہ وہ خود کو کسی وقت بھی تنہا نہیں سمجھتے۔

رچی ہوئی ہے رفاقت مرے رگ و پے میں　　کچھ اس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں

سفرِ حیات میں اس کی مادی رفاقت ان کی عزیز ترین تمنا ہے لیکن روحانی اور ذہنی مطابقت و رفاقت بہر حال اب انھیں حاصل ہے۔ ایک طرف تو وہ درد ہجراں سے بے چین ہیں اور دوسری طرف یہ روحانی اتصال ان کے لیے سکون و طمانیت کا باعث ہے۔ اور اس کیفیت کا اظہار وہ کتنی بے ساختگی سے کر رہے ہیں ؎

قرارِ حال بھی تمہی، اضطرابِ جاں بھی تمہی　　مرا یقیں بھی تمہی ہو، مرا گماں بھی تمہی
تم نے لوٹا ہے مجھے تم نے بسایا ہے مجھے　　میری رہزن بھی ہو میرا سر و ساماں بھی ہو
تو اتنا قریب ہے کہ تجھ سے　　میں پوچھ رہا ہوں تو کہاں ہے

ایک قطعہ میں التجا کا انداز دیکھیے۔ گردشِ ایام کا خوف کتنا شدید ہے جو ساری زندگی کو پہلے ہی انتظار میں برباد کر چکی ہے۔

چاند نکلا ہے سرِ بام، لبِ بام آؤ　　دل میں اندیشۂ انجام نہ آنے پائے
کچھ اس انداز سے اترو مری تنہائی میں　　کھوج میں گردشِ ایام نہ آنے پائے

احساسِ محرومی محورِ حیات بن چکا ہے۔ اب یہ غم ان کی زندگی بن کر ان کی سانسوں میں رچ بس چکا ہے۔ اور ان کے رسیلے دھیمے لہجے میں ایک پوشیدہ شعلے کی آنچ سی آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ؎

جدائیوں کے گھنے جنگلوں میں عمر کٹی　　لویں سمیٹ کے سوتے رہے سفر کے چراغ
طے کر بھی سکوں گا کہ نہیں کون بتلائے　　پھیلا ہوا تجھ تک ہے مرا دشتِ جدائی
خود کو کھویا تو نہیں، تم کو نہ پایا نہ سہی　　تم کو پاتے تو اسی کیف میں گم ہو جاتے

یہ محض خود کو بہلانے کی کوشش ہے ورنہ وہ تو در حقیقت وابستۂ غم ہو چکے ہیں ؎

صرف ہم پر ہی نہ یہ حادثہ ہوتا موقوف　　تم بھی اک معبدِ ویراں کے صنم ہو جاتے

لیکن ان کے دل کا یہ معبد ویراں ہے کب۔ اس میں تو وہ صنم پہلے ہی موجود ہے جس سے وہ مخاطب ہیں۔ ورنہ وہ

یہ کیوں کہہ رہے ہیں ؎

جب بھی اٹھی کوئی چلمن، مجھے محسوس ہوا — میری آنکھوں پہ ہیں بکھرے ہوئے تیرے گیسو

وہ خود بھی طرفِ ثانی کی وفاؤں کے دل سے معترف ہیں۔ اب وہ صرف اسی کو دیکھ سکتے ہیں۔ اسی کو سنتے ہیں
یہ شخصیت ان کی روح میں رچ بس چکی ہے۔ اب اس کے چہرے میں انھیں آئینے کی طرح خود اپنی ہی تصویر دکھائی دیتی ہے ؎

آغوش میں مہکوگے دکھائی نہیں دوگے — تم نکہتِ گلزار ہو، ہم پردۂ شب ہیں
تیرا در چھوڑ کے میں اور کدھر جاؤں گا — گھر میں گھِر جاؤں گا، صحرا میں بکھر جاؤں گا

اور وہ حسین غزل جسے وہ اپنی بہترین غزل بتاتے ہیں ؎

تجھے پانے کی تمنا، تجھے کھونے کا یقیں — تیرے گیسو مرے ماحول میں غلطاں جیسے
وقت بدلا پہ نہ بدلا مرا معیارِ وفا — آندھیوں میں سرِ کہسار چراغاں جیسے
تجھ سے مل کر بھی تمنا ہے کہ تجھ سے ملتا — پیار کے بعد بھی لب رہتے ہیں لرزاں جیسے

لیکن احساسِ محرومی نے ان کے یہ ہجر و وصال کو یکساں بنا دیا ہے۔

یکساں ہیں فراق و وصل دونوں — یہ مرحلے ایک سے کڑے ہیں
پا کر بھی تو نیند اُڑ گئی تھی — کھو کر بھی تو رت جگے ملے ہیں
فراق زخم سہی کم نہ تھی جراحتِ وصل — معانقہ مرے محبوب کا صلیب سا تھا
جب میں نے پرستش کی حدوں تک تجھے چاہا — پھر جو بھی حسیں تھا مرے معیار سے کم تھا

ان کی عشقیہ شاعری اتنی پاکیزہ اور طاہر ہے اور روح جسم کو پیوند کر کے محبت کرنے کا انداز بتاتی ہے کہ اردو کا کوئی بھی شاعر اس سلسلے میں ان کی برابری نہیں کر سکتا۔ اس دور کے مجموعے کا نام "دشتِ وفا" بھی ان کی عمر بھر کی وفا شعاریوں کی چغلی کھا رہا ہے۔ خود ان کی زندگی بھی صاف ستھری اور پاکیزہ ہے۔ انھوں نے روح کی گہرائیوں سے صرف ایک فرد کو چاہا ہے۔ جسم یا اس کی مادی کثافتوں کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اب وہ ہر طرف جلوۂ محبوب دیکھتے ہیں۔ اور یہ اُن کی عمر بھر کی ریاضت کا نتیجہ ہے ؎

کس توقع پہ کسی کو دیکھیں — کوئی تم سے بھی حسیں کیا ہوگا
مجھے کھو کر بھی تجھے پاؤں جہاں تک دیکھوں — حسنِ یزداں سے تجھے حسنِ بتاں تک دیکھوں
دل راکھ ہو چکا تو چمک اور بڑھ گئی — یہ تیری یاد تھی کہ عمل کیمیا کا تھا
اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھلیں — تو سامنے تھا اور تصور خدا کا تھا
کون کہتا ہے محبت ہے فقط جی کا زیاں — ہم تو اک دل کے عوض حشر اٹھا لائے ہیں
تمام عمر امیدوں کے چاک سلتے رہے — تمام شب ترے قدموں کی چاپ آتی رہی
زخم بھرتا ہے زمانہ مگر اس طرح ندیم — سی رہا ہو کوئی پھولوں کے گریباں جیسے

انھیں یہ بھی احساس ہے کہ عمر بھر کی شب بیداریاں رائگاں نہیں گئیں۔ انھوں نے ان کی شخصیت کو نکھارا

کہا ہے ؎

مجھ نہ کچھ پایا بھی ہے احسان عدو کے ساتھ   جن کے دل جلتے گئے برقِ تپاں بنتے گئے

وہ ایک عجیب سے تضاد کا شکار ہیں۔ وہ سنجیدگی سے اس شکست اور اس کے متعلق ہر ہر حادثے کو بھلا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ آگ تو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ یہ شعلہ بھڑکتا ہے اور بھڑک کر رہتا ہے وہ پریشان ہیں۔ برسوں تک خود سے لڑتے لڑتے ہار چکے ہیں اور تھک کر حیرانی سے کہتے ہیں ؎ قطعہ

نظر حیران ہے ششدر ہے احساس   سمجھ میں راز یہ اب تک نہ آیا
جسے میں نے بھلایا زندگی میں   اسی نے حشر کو دل میں اٹھایا

ہم اصولوں کے حصاروں میں چھپے لاکھ مگر   اک نگاہِ غلط انداز سے تسخیر ہوئے

آبلوں پر جو حنا باندھے مجھے پہنچی بتائے   کیوں بایں درماندگی وارفتۂ منزل بھی ہوں

انھیں حسن کی بے پناہ قوتِ تسخیر کا بھی شدت سے احساس ہے ؎

نہ جانے کونسا جادو تھا پیار کی رت میں   بدلتے دیکھے ہیں موسم مزاجِ یار کے ساتھ

زنداں پہ گمانِ فرشِ گل ہے   جو بھی چاہے مزاجِ یار کرے

وہ رجائی ہیں۔ ان کے ساتھ امید ہمیشہ رہتی ہے۔ اور انھیں اپنے محبوب کے وعدۂ ملاقات پر مکمل اعتماد ہے۔ پوری زندگی "جدائیوں کے گھنے جنگلوں میں" کاٹنے کے باوجود ان کا عہدِ محبت روزِ اول کی طرح تر و تازہ ہے۔ اور وعدۂ ملاقات پر اسی طرح یقین ہے کیونکہ انھوں نے محبوب کے چہرے میں وعدۂ ملاقات کے وقت اپنا ہی عکس دیکھا تھا۔ اس لیے جس طرح انھیں خود پر اعتماد ہے اسی طرح وہ اپنے اس عکس یا اپنے وجود کے دوسرے حصے کے بارے میں بے اعتمادی کیسے کر سکتے ہیں۔ اس کے پیمانِ محبت اور وعدۂ ملاقات نے تو موت تک کو لوٹا دیا ہے۔ یہ اعتماد کی انتہا ہے ؎

ایک امید ملاقات نے مرنے نہ دیا   تیرے پیماں مری سانسوں کے عناں گیر ہوئے

'دشتِ وفا' میں ایک نظم ہے 'یاد' کے عنوان سے۔ اس کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

یوں تو ہر دور میں جذبات کی رُت آتی ہے   جب تری یاد سے بھر جاتا ہے پیمانۂ جاں
تیری آہٹ ابھرتی ہے مرے خوابوں میں   سر بسجدہ نظر آتا ہے مرا شعرِ جواں
سر بہ سجدہ نظر آتا ہے مرا شعرِ جواں   تیرے پیکر کی دمکتی ہوئی محرابوں میں
درد میں اب جو چمک ہے کبھی پہلے تو نہ تھی   آج تو تیرے خیالوں سے بھی آنچ آتی ہے

آج تو تیرا تصور بھی ہے گلدستۂ خار   آج تو یاد بھی اک ہوک سی بن جاتی ہے
آج کی شب کہیں وہ شب ہی نہ لوٹ آئی ہو   اٹھ سکی جس میں نہ خود وقت کے قدموں کی صدا
جس میں اک عمر سے گم ہے ترا پیمانِ وفا   پاس جس کے مری آنکھوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا

اب وہ زخمِ بے نشاں دل کا روگ بن چکا ہے۔ وہ خاکسترِ قلب میں دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی ہے

سبب سے ہم ناواقف ہیں۔ بہرکیف اتنا جانتے ہیں کہ شاعر اس حقیقت سے دوچار ہے کہ

اس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی　　　کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

شعور کے ساتھ ساتھ جذبۂ عشق بھی پختہ سے پختہ تر ہو چکا ہے۔ اور ۱۹۵۵ء سے لے کر آج تک ان کے سارے اشعار اسی کیف و سرور کے حامل ہیں۔ آغا سہیل نے فرمایا تھا۔ "ندیم کا جذباتی سرمایہ 'رم جھم' میں ختم ہو چکا ہے"۔ لیکن کیا 'دشتِ وفا' اور اس کے بعد کی غزلیں اردو ادب کے بہترین اور پاکیزہ سرمائے میں سے نہیں ہیں؟ کیا ان میں حقیقی جذبات نگاری نہیں۔ اگر ہم آغا صاحب کی یہ بات مان لیں تو یہ ندیم کے ساتھ بے انصافی ہوگی جسے کم از کم میں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ 'دشتِ وفا' کے انتساب والی غزل بھی ۱۹۵۵ء کی ہی تخلیق ہے۔ یہ غزل شاعر کی ذہنی کیفیت کی صحیح تصویر ہے اور اس کا ایک ایک لفظ اس کے بے کراں، 'لازوال' اور نیرنگیٔ محبت کی ترجمانی کررہا ہے۔ جو شاعر کے دل میں موج زن ہے۔ سنیے ؎

اک کشتۂ غم پہ مہرباں ہو　　　تم کتنے عجیب حکمراں ہو
تم میرے یقیں ہو یا گماں ہو　　　میرے ہو مگر مرے کہاں ہو
تم حسن کا نقشِ جاوداں ہو　　　تم میری وفا کا امتحاں ہو
بکھری ہوئی کائناتِ دل پر　　　چھائے ہوئے مثلِ آسماں ہو
سوگند مجھے خلوصِ فن کی　　　تم میری نفاستِ بیاں ہو

اسی مجموعے کا ایک قطعہ اور ایک نظم 'دعوت' پڑھیے ؎

تو میرا شعور، میرا وجدان　　　تو میرا یقین، میرا ایمان
بس تیری سپردگی کا معیار　　　تو میری پرستشوں کی پہچان
اے میری پرستشوں کے حق دار　　　آ میں ترے حسن کو نکھاروں
چہرے سے اڑا کے گردِ ایام　　　آ میں تری آرتی اتاروں
تو میری زمیں بھی آسماں بھی　　　میں تجھ کو کہاں کہاں پکاروں　　(دعوت)

شاعر اور ان کا محبوب ایک دوسرے کے محب بھی ہیں اور محبوب بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسے آسمان اور زمین دونوں کہتے ہیں ۔۔ ایک نظم ہے "تضاد" ؎

کتنے کوسوں پہ جا بسی ہے تو　　　میں تجھے سوچ بھی نہیں سکتا
اتنا بے بس ہوں، تیری سوچ کو میں　　　ذہن سے نوچ بھی نہیں سکتا
مجھ سے تو دور بھی ہے، پاس بھی ہے　　　اور مجھے یہ تضاد راس بھی ہے

ایک قطعہ ہے ؎

مری شکست پہ اک پرتوِ جمال تو ہے　　　میں کیوں نہ عظمتِ افتادگی پہ اتراؤں
تجھی سے ہے مرے آسودہ خاطری کا بھرم　　　ترے غموں کا خزانہ چھنے تو مٹ جاؤں

اب ان کے لہجے میں شوخی کی بھی ہلکی سی جھلک آنے لگی ہے۔ جو ذہنی سکون و مسرت کی غمازی کرتی ہے، اور اب وہ لمحہ بھر کے لیے احتیاط سے بھی قطع نظر کر لیتے ہیں۔ ذرا سی چھیڑ چھاڑ میں مضائقہ بھی کیا ہے آخر "حسرت ہی سہی" لیکن ان کی ساری عشقیہ شاعری میں صرف یہ چند اشعار ہی آپ کو ایسے شوخی آمیز ملیں گے جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ورنہ کہیں بھی انھوں نے احترام و احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے

زینتِ حلقۂ آغوش بنو　　دور بیٹھو گے تو چرچا ہوگا

اک دن تو اس طرح بھی مرے بازوؤں میں آ　　تیرے ادب کو میری حیا کو خبر نہ ہو

اور یہ قطعہ ے

حد سے جب بڑھنے لگا تلخیٔ حالات کا زہر　　ذائقے کو تری شیریں دہنی یاد آئی

جب بھی میں راہ سے بھٹکا، ترا پیکر چمکا　　جب بھی رات آئی، تری سیم تنی یاد آئی

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط　　اپنی کوتاہیٔ فن یاد آئی

ان کے "جسیات" ملاحظہ کیجیے کیسی حقیقت نگاری اور حسین جذبات کا قابلِ احترام طریقہ سے اظہار ہے ے

رات ٹوٹ پڑتی ہے جب سکوتِ زنداں پر　　تم مرے خیالوں میں چھپ کے گنگناتے ہو

کتنے یاد آتے ہو؟ پوچھتے ہو کیوں مجھ سے　　جتنے یاد کرتے ہو، اُتنے یاد آتے ہو

انہی "جسیات" میں ایک حسین نظم "ایک رات" شامل ہے جس میں وہ اپنی داستانِ ماضی بیان کر رہے ہیں ے

کل نصف شب کی تیرگیوں میں ترا خیال　　ماضی کے پھول کنجِ قفس میں سجا گیا

جس پر ٹھٹک گیا تھا مرا دل "زیرِ جمال"　　حالات کا وہ موڑ مجھے یاد آ گیا

کتنی لطیف تھی تری آنکھوں کی روشنی　　کتنی بسیط تھی مرے جذبات کی فضا

تو میرا شعر، میرا فسانہ، مری زباں　　تو میرا فن بھی ہے، مرا موضوعِ فن بھی ہے

پھر وہ چھونے کے قائل بھی نہیں۔ ان کی طہارتِ قلب و روح انھیں صرف ذہن سے چھونے کی اجازت دیتی ہے۔ لیکن یہ ذہنی لمس انھیں زندگی میں ایک نئی تازگی، بھرپور توانائی اور غمِ دوراں سے نبٹنے کی قوت عطا کر دیتا ہے اور وہ خود کو "آدم نو" سمجھنے لگتے ہیں ے

جب بھی میں اپنے ذہن سے چھوتا ہوں تیرا جسم　　تجھی میں دیکھتا ہوں فضا میں حیات کی

وہ آدابِ عشق سے بخوبی واقف ہیں اور اس پر عامل بھی ہیں :

عشق کرنے کے بھی آداب ہیں کیسے چپ چاپ　　رات بھر چاند نے ظلمت کا سفر کاٹا ہے

ان کی پاکیزگی اور محبت کی خاموش تقدس کا یہ عالم ہے کہ انھیں خدا کو بھی اپنے محبوب کا نام بتانے پر ندامت ہے اور وہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ پیار کا بھرم نہیں رکھ سکے ے

ہاں میں خاموش محبت کا بھرم رکھ نہ سکا　　ہاں خدا کو تو ترا نام بتا رکھا ہے

اب یک نئی تبدیلی یہ آئی ہے کہ وہ برملا عشق کی جنوں خیزی کا بھی اعتراف کرنے لگے ہیں۔

قطعہ

نہ چھیڑو مجھ سے باتیں خیر و شر کی — میں شاعر ہوں بس اتنا جانتا ہوں
محبت کا اگر خالق خدا ہے — تو میں ایسے خدا کو مانتا ہوں
اے لذتِ زندگی کے منکر — اک بار کسی سے پیار کر لے
جب تک میں ترا جمال دیکھوں — تو زخم مرے شمار کر لے

صنفِ مخالف کے پیار کی قوتِ تسخیر کی بے پناہی انھیں حیران کیے دے رہی ہے اور اس عالم کیف و سرور میں وہ کہہ اٹھتے ہیں ؎

مجھ سے کافر کو ترے عشق نے یوں شرمایا — دل تجھے دیکھ کے دھڑکا تو خدا یاد آیا

انھیں اپنے عشق کے تقدس کا احساس بھی شدت سے ہے ؎

لبریز جمال ایک کا دل، ایک کا پہلو — اتنا سا فقط فاصلہ ہے خیر سے شر تک

ان کی زندگی پر ان کا محبوب اس حد تک اثر انداز ہے کہ وہ ہر قیمت پر اس کے اعتماد کا احترام برقرار رکھتے ہیں۔

اک جست کا فاصلہ ہے شر تک — لیکن ترا پیار درمیاں ہے

ان کے اشعار میں صحراؤں، قافلوں، خیموں، آبلہ پائی، بادیہ پیمائی اور لالۂ صحرائی کا ذکر اتنی کثرت سے ملتا ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ خود مرد کہستان ہیں۔ لیکن ان کا دل کسی لالۂ صحرائی کی چشمِ غزالیں کا اسیر ہے ؎

داغِ دل نقش ہے، اک لالۂ صحرائی کا — یہ اثاثہ ہے مری بادیہ پیمائی کا
ابھی تو چند بگولے اٹھے تھے صحرا سے — غبارِ راہ میں کیوں کارواں بھٹکنے لگا
جب بھی سوچا کہ ترے شہر کے ابھرے ہیں نقوش — اک بگولہ سا رواں برسرِ صحرا دیکھا
ذہن میں یوں تو کئی پھول کھلے — ریگِ صحرا سے نہ مہکار آئی
ع صحراؤں کی رونق ہے مری آبلہ پائی
اب دامنِ صحرا پہ بھی دھوکا ہے چمن کا — گم گشتہ ہے اب بادیہ پیمائی ہماری
جب تری دھن میں کہیں لالۂ صحرا دیکھا — ہم یہ سمجھے کہ ترا نقشِ کفِ پا دیکھا

وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ محبوب خواہ کتنا ہی نظر چرائے اس کے دل میں بھی ان کی محبت کا شعلہ لو دے رہا ہے۔ چنانچہ

مجھ سے کترا کے نکل جا مگر اے جانِ حیا — دل کی لو دیکھ رہا ہوں ترے رخسار میں بھی
بھری دنیا میں فقط مجھ سے نگاہیں نہ چرا — عشق پر بس نہ چلے گا تری دانائی کا

ایک قطعہ ہے: ؎

مانا کہ طویل فاصلوں پر — برسوں کے غبار چھا گئے ہیں
محرومئ مشترک سے لیکن — ہم کتنے قریب آ گئے ہیں

یہ محرومی ان دونوں کے درمیان برابر کی محرومی ہے اور اس دردِ مشترک نے دوریوں اور فاصلوں کے باوجود انھیں یک جان کر رکھا ہے۔ غمِ عشق غمِ حشر سے کم نہیں ہے ؎

ہم تو سمجھے تھے قیامت ہے فراقِ محبوب　　تجھ سے مل کر بھی مگر حشر ہی برپا دیکھا
کون کہتا ہے محبت ہے فقط جی کا زیاں　　ہم تو اک دل کے عوض حشر اٹھا لائے ہیں

وعدے کا چراغ ؎

اور تو کوئی چمکتی ہوئی شے پاس نہ تھی　　تیرے وعدے کا دیا راہ میں لا رکھا ہے

ایک نظم 'فراق' ہے اس کا ایک شعر سنیے ؎

کلیم ہوں مری شامِ فراق میرا طور　　برس رہا ہے فضا سے کسی کی یاد کا نور

'دشتِ وفا' میں ایک نظم بعنوان 'توحید' ہے اس میں ان کی وارداتِ قلبی کا بیان بڑے لطیف طریقے سے کیا گیا ہے۔ انھیں اپنی وفاؤں پر فخر ہے اور حسن کی محکم وفا اور عشق میں استقامت پر بھی حیرت آمیز مسرت کے ساتھ ناز کرتے ہیں۔ یہ نظم پوری سنیے ایک مصرعہ بھی کم ہوا تو لطف جاتا رہے گا: —

دہر کو تشنگیٔ نازِ بتاں ہے اب تک　　تو مری یاد میں کیوں سوختہ جاں ہے اب تک
کیوں مسرت ہے ہے محروم تری شانِ جمال　　میرا غم کیوں ترے چہرے سے عیاں ہے اب تک
میرا معیارِ وفا ہے ترے دم سے قائم　　ہر گھڑی تو مری جانب نگراں ہے اب تک
میں محبت میں بھی توحید کا قائل ہوں مگر　　حسن پر ظلم ہے پابندیٔ آدابِ وفا
حسن ہے صحنِ چمن، عشق ہے صحرائے بسیط　　جس سے ٹکرا کے پلٹ جاتی ہیں امواجِ صبا
اس کے باوصف بھرے شہر کی تنہائی میں　　آج بھی میں نے سنی ہے تری آہوں کی صدا
رسمِ رسم سے جکڑی ہوئی اس دنیا میں　　حسن بھی عشق کرے گا، مجھے معلوم نہ تھا

ایک اور غزل کے چند اشعار سنیے انھیں اپنے محبوب کی صدمۂ فراق سے اتری ہوئی صورت دیکھ کر ندامت بھی ہوتی ہے۔ یہ اردو شاعری میں نیا خیال ہے ؎

سچ کہوں، اپنی محبت پہ ندامت سی ہوئی　　جب بھی دیکھی تری اتری ہوئی صورت میں نے
چمک اٹھتا ہے سرِ شام تری یاد کا چاند　　کبھی تاریک نہ دیکھی شبِ فرقت میں نے
آج بھی ہے مرے غم پر وہی ماضی کی بہار　　توڑ دی گردشِ ایام کی ہیبت میں نے

انھیں اپنے مرکزِ نگاہ پر بھی فخر و ناز ہے ؎

وہ حسن ہے انسان کی معراجِ تصوّر　　جس حسن کو پوجا ہے مرے شعر و ادب نے
لفظوں میں ترا رنگ ہے شعروں میں ترا سحر　　کہنے کو تو شہرہ ہے مرے حسنِ بیاں کا
غرورِ عشق کو ضد ہے کہ تیرا عہدِ وفا　　شکست کھا کے بھی تقدیس کھو نہیں سکتا

احساسِ شکست کی شدت بے پناہ ہے ؎

یے جو ٹوٹی تو صدا آئی شکستِ دل کی　　　رگِ جاں کا کوئی رشتہ ہے رگِ ساز کے ساتھ

لیکن اس کے باوجود یہ شکست محبت اور یادِ حبیب کو دل سے مٹا نہیں سکی ۔

چمن کی طرح مہکتا ہے اب بھی داغِ فراق　　　تمہاری یاد رہی یادگارِ موسمِ گل

بہرکیف یہ سکون اتنے طویل دورِ ہجراں کے بعد حاصل ہوا ہے کہ ۔

تمام عمر کی صحرا نوردیوں کے بعد　　　ترا مقام سرِ گردِ رہ گزر آیا

فرہاد کے کردار سے بھی وہ متاثر ہیں اس کا اور جوئے شیر کا ذکر بھی بار بار آتا ہے ۔

جوئے شیر آج بھی شیریں کے قدم دھوتی ہے　　　آج بھی تیشۂ فرہاد سے اڑتے ہیں شرار
حسن اگر جھکا رہا بر درِ خسروانِ دہر　　　گھستے رہیں گے کوہسار مرتے رہیں گے کوہ کن
حسنِ شیریں اب بھی ہے شاید اسیرِ قصرِ سنگ　　　ورنہ کیوں آتی ہے تیشے کی صدا کہسار سے

انھیں یہ احساس بھی ہر دم رہتا ہے کہ طویل فاصلوں پر ان کا محبوب ان کے لیے بےقرار ہے ۔ لیکن "رسنِ رسم سے جکڑی ہوئی دنیا" انھیں ملنے نہیں دیتی ۔ رسموں اور رواجوں کی قیود کے وہ خود بھی بہر حال پابند ہیں ۔ اور ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتے ۔ ادھر انتہائی احترام و تقدس ہے اور ادھر لاج کا پہرہ ۔ ان بیڑیوں کو کاٹنا ان جیسی آہن گداز شخصیت کے لیے بھی ناممکن ہی رہا ہے ۔ اتنا بڑا نقیب انقلاب ہونے کے باوجود مشرق کا فرزند اس سلسلے میں ایک عام مرد کی ہی طرح مجبور ہے ۔ اور ۔

بغاوت ہے اگر یہ تو بغاوت چاہیے مجھ کو

لکھنے والا باغی طبیعت شاعر جو انسانیت کے دکھوں کے لیے اس انتہا تک پہنچ سکتا ہے ، معاملاتِ عشق میں انتہائی مشرقیت کا ثبوت دیتا ہے ۔

وہ احترامِ روایات ہے کہ مجبوری　　　نبھا رہے ہیں ستم ہائے روزگار کے ساتھ

وہ حسرت ناک لہجے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں ۔

دور ہی دور سلگنے والے　　　کاش تو پاس بھی آ کر دیکھے
عمر بھر ایک ترا دھیان رہا　　　یوں تو ہر مہ و اختر دیکھے
خزاں کے ساتھ ہی تیرے اداس ذہن میں کیوں　　　جمالِ یار برنگِ بہار آتا ہے

اور ان کا یہ قطعہ کتنی دل گداز حقیقت کا حامل ہے باہمی اعتماد اور ذہنی رفاقت کا شاہکار ۔

چپکے چپکے مرے آلام پہ رونے والی　　　گردشِ وقت کے انداز سے مایوس نہ ہو
تو ہے مجبور تو یوں روک بیاں اتنی دور　　　تیرے شکووں کی روانی مجھے محسوس نہ ہو

وہ اس پردہ نشیں محبوب کی محبت کی گہرائی سے واقف ہیں اور برسوں کی جدائی کے بعد بھی جب اس کی آتشِ عشق کی تپش روزِ اول ہی کی طرح شدید پاتے ہیں تو انتہائی حیرت و مسرت کے عالم میں بے اختیار پکار اٹھتے ہیں ۔

رسنِ رسم سے جکڑی ہوئی اس دنیا میں　　　حسن بھی عشق کرے گا مجھے معلوم نہ تھا

اس لیے کہ حسن ان کے نزدیک "صحنِ چمن" ہے اور اسی وجہ سے "حسن پر پابندیِ آدابِ وفا" کو وہ ظلم بتاتے اور سمجھتے ہیں لیکن جب اس کے باوجود "بھرے شہر کی تنہائی" میں وہ اس کی آہوں کی صدا سنتے ہیں تو یہی صدائے دل سوز اور طرفِ ثانی کی جنوں آمیز ازلی و ابدی محبت ان کے حساس دل پر اس شدت سے اثر انداز ہوتی ہے کہ وہ اس کے دیوانے بن جاتے ہیں۔ انھیں اس جلوہ گہِ حسن میں اس واحد حسنِ نگاریں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ اسی کو اپنی "پرستشوں کی حقدار" کہتے ہیں اور اپنے قلب و روح کی مملکت پر اس کی مکمل حکمرانی کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ محبت جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ جوان، زیادہ توانا اور زیادہ گہری ہوتی جاتی ہے۔ ایک پاک باز، باشعور اور حساس مرد کی غیر فانی محبت ہے جسے وہ زندگی کے آخری لمحے تک بھی فراموش نہیں کر سکتا ؎

ہر زخم پہ دیکھی ہیں ترے پیار کی مہریں | یہ گل بھی کھلائے ہیں تری سرخیِ لب نے
تو نیند میں بھی میری طرف دیکھ رہا تھا | سونے نہ دیا مجھ کو سیہ چشمیِ شب نے
ایک اک یاد کے ہاتھوں میں چراغوں بھرے طشت | کعبۂ دل کی فضا ہے کہ صنم خانوں کی

لیکن یہ محبت ادھورا افسانہ ہے۔ اس میں نہ رومانی ملاقاتیں ہیں نہ لمبے چوڑے وعدے، نہ رنگین الفاظ کے طوطا مینا ہیں اور نہ تکمیلِ آرزو ؎

جنوں ہے شیوۂ رندانہ میرا | ازل سے ہے تہی پیمانہ میرا
امنگیں، بجلیاں، اڑتی ہوئی راکھ | بہت بے رنگ ہے افسانہ میرا

قربت اور جدائی بیک وقت دل شاعر پر اثر انداز ہیں۔ ایک ترئیلے کے چند مصرعے سنیے ؎

مرے پہلو میں ہے وہ پیکرِ ناز | مگر دل ہے کہ محوِ جستجو ہے
میری باہوں پہ پریشاں ہیں کسی کے گیسو | میرے افکار پہ طاری ہے حنا کی خوشبو
گو بہت دیر سے آباد ہے میرا پہلو | میرے احساس کے چہرے پہ کوئی رنگ نہیں
دھڑکنیں دل کی مگر اب بھی ہم آہنگ نہیں

غرض کہ اس خاموش، پاکیزہ، لازوال اور باشعور محبت نے ہی انھیں پورے عالمِ انسانیت سے پیار کرنا سکھایا ہے۔ اور اب وہ پوری نوعِ انسانی کے دکھ کو اپنا ذاتی دکھ سمجھتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے اپنی اس محبت کو پرستش کی حدوں تک پہنچا دیا ہے۔ اور ان کی محبت اتنی گیرائی اور گہرائی رکھتی ہے کہ وہ اس پیار کو عبادت کا درجہ دے رہے ہیں ؎

تمھارے بعد کہ حسنِ ازل ہے وہ بھی آوارہ | تمھارے چاہنے والے خدا سے اور کیا چاہیں
خدا کے بعد تو بے انتہا اندھیرا ہے | تری طلب میں کہاں تک نہ میرا دھیان گیا

بلکہ طرفِ ثانی سے بھی انھیں اتنی بھرپور محبت ملی ہے کہ انھوں نے ساری انسانیت کے غموں کو اپنے دل کی اس کشتِ سیراب میں سمو لیا ہے۔ اب انھیں کوئی تشنگی باقی نہیں رہی۔ اب سرزمینِ قلب پیاسی نہیں۔ چاہنے اور چاہے جانے کے اس مقدس، خاموش اور حسین و لطیف تجربے کے بعد ان کا دل بحرِ ذخار بن چکا ہے۔ انھیں سرشتِ انسانی پر

مکمل اعتماد ہو گیا ہے۔ یہی اعتماد اب ان کا یقین اور ان کا مذہب و مسلک بن چکا ہے۔ وہ انسانیت سے نا امید نہیں۔ انسان کا روشن مستقبل وہ دیکھ رہے ہیں۔ بڑے سے بڑا حادثہ ان کے اس اعتماد کو گزند نہیں پہنچا سکتا ؎

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انسان پر　　کسی بھی شہر میں جاؤں غریبِ شہر نہیں
یہ اعتماد کہ انسان کی جبلت میں　　بایں شکستہ دلی آشتی ہے قہر نہیں

نقاد حضرات کچھ بھی کہیں۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ صرف ایک ایسا شاعر ہی انسان دوستی کا اتنا بلند تصور پیش کر سکتا ہے اور انسان کی عظمت کے ایسے ترانے گا سکتا ہے جسے مکمل اور بھرپور محبت کا یہ انمول خزانہ حاصل ہو چکا ہو۔ محض تصوراتی اور تخیلی عشق شاعر اور اس کے کلام کو اتنا عظیم نہیں بنا سکتا۔ اگر بعض لوگ قائم کو محض فکری شاعر کہنے پر بضد ہیں۔ اور انھیں ان کے کلام میں محبت کا جذبہ اتنا تیز و تند نظر نہیں آتا تو اس کا سبب یہ ہے کہ وہ محبت جیسی متاعِ بے بہا کو تماشہ بنانے کے قائل نہیں۔ وہ اسے ایک قیمتی خزانہ سمجھتے ہیں اور دل کی گہرائیوں میں چھپا کے رکھتے ہیں ایک قطعہ ہے ؎

میرے ویرانۂ احساس میں اک پھول کھلا　　چارہ گر ڈھونڈنے نکلے ہیں مگر مرہمِ دل
میں تو یہ درد کی دولت انھیں چھونے بھی نہ دوں　　تیری شدت کی قسم اے غمِ دل اے غمِ دل

وہ باکردار انسان ہیں۔ انھیں اپنے جذبات و احساسات پر مکمل قابو حاصل ہے۔ نیز ان کا عشق بھی خامیانہ نہیں۔ انھوں نے جذبۂ عشق کی جنوں خیزی کی آگیں انسان پرستی اور انسان دوستی کی طرف موڑ دی ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک محبت ان کے محبوب کی ایک گراں بہا امانت ہے۔ اور یہ انھیں کسی طور منظور نہیں کہ اس بیش قیمت اثاثہ پر کسی غیر کی نظر پڑے۔ نہ ہی ایسا پاک باز انسان اپنے محبوب کی رسوائی گوارا کر سکتا ہے۔ پھر محبوب بھی وہ جس نے بقول خود ان کے انھیں "زندہ رہنے کے طور سکھائے" اور "شاعری کا سلیقہ دیا" ہے ؎

اس کے ستم میں عدل بھی شامل تھا اے ندیم　　دل لے کے شاعری کا سلیقہ دیا مجھے

جس کے نام نہاد "ظلم" میں بھی انھیں اس کے پیار کی شدت صاف طور پر محسوس ہوتی ہے ؎

انتہا عشق کی یہ ہے کہ ترے ظلم میں بھی　　کی ہے محسوس ترے پیار کی شدت میں نے

جو ان کے روح و قلب میں سما چکا ہے اور دوریوں کے باوجود ہر ہر لحظہ قریب تر ہے۔ لالۂ دشت "نا رسائی" ہونے کے باوجود ان کے "خون میں رواں" ہے ؎

دکھاتے ہو نرالے شعبدے تم　　کبھی پنہاں، کبھی پیشِ نظر ہو
کبھی نزدیک تر ہو دور ہو کر　　کبھی نزدیک ہو کر دور تر ہو

میرا معیارِ وفا ہی مری مجبوری ہے　　رخ بدل کر بھی تجھے اپنے مقابل پایا
تو نے یوں دیکھا ہے جیسے کبھی دیکھا ہی نہ تھا　　میں تو دل میں ترے زخموں کے نشاں تک دیکھوں

محبت کا تعلق زندگی کے کسی دور سے مخصوص نہیں۔ محبت لافانی اور غیر محدود جذبہ ہے اور شاعر ایک سچے محب کی طرح بدستور اس آگ میں جل رہا ہے جو مدت العمر سے اس کے سینے میں سلگ رہی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس درد کو

پوشیدہ رکھنے کی ناکام کوششیں بھی جاری ہیں اور الزام گردشِ ایام پر لگائے جا رہے ہیں ؎

عام ہو جائے نہ ہر بت سے ترے نام کا نام　　　گردشِ چشم کو دوں گردشِ ایام کا نام
گردشِ چشمِ یار کے الزام　　　آسماں پر لگائے جاتے ہیں
یادوں کے ظلمات میں اب بھی ترے ہیں تارے سے　　　بھوجھل بن کر سلگ رہی ہے آج بھی آگ بجھائی ہوئی

لیکن وہ بھی کب تک اور اب تو حال یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ محبوب کی آواز بھی اسے شعلہ بنائے دے رہی ہے - اور شاعر باوجود انتہائے ضبط کے پکار اٹھتا ہے ؎

[illegible] بھی ہے خاص اپنے ہی انداز کے ساتھ　　　پھول کھلتے ہیں ترے شعلۂ آواز کے ساتھ

اب کہ سکوت بھی صدا ہے اور کان اسی آواز پر لگے ہیں - سناٹے سے بھی اتنے مانوس ہو چکے ہیں کہ کوئی بولے تو برا لگتا ہے

میں اس مقام پہ ہوں ضبطِ عشق کے ہاتھوں　　　جہاں سکوت صدا کی ہے آئینہ داری
[illegible] ہیں تیری آنکھیں　　　تیری صورت بھی ہے شامل تری آواز کے ساتھ
اتنا مانوس ہوں سناٹے سے　　　کوئی بولے تو برا لگتا ہے

انھیں اتنی وسیع و عریض دنیا میں کسی سے نفرت نہیں - کوئی دشمن نظر نہیں آتا - عشقِ صادق کی لو پر جلتے جلتے ان کا دل اس قدر گداز ہو چکا ہے کہ وہ کسی سے نفرت کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے - وہ تو دشمن سے بھی محبت [illegible] کیونکہ خود سراپا پیار بن چکے ہیں - مجسم عشق و محبت ہیں ؎

جو [illegible] شکایت ہو تو یوں کر دو　　　وہ دیوانہ [illegible] پیار آ جاتا ہے دشمن پر
[illegible] پیار کا حق دار بنا　　　تجھ سے کی ہے کہ زمانے سے محبت میں نے
[illegible] نفرت [illegible] مصلوب کرو　　　میں تو شامل ہوں محبت کے گنہگاروں میں

کئی [illegible] صحرا سے [illegible] خود ان کا دل لالۂ صحرا بن چکا ہے جس میں داغِ فراق مہک رہا ہے - اس کی [illegible] جسم کھلاتے نہیں ہوتی - مشامِ جاں اب سالہا سال گزر جانے پر بھی اس کی مہک سے کیف و سرور حاصل [illegible] ہے ؎

شام کو صبحِ چمن یاد آئی　　　کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی
خوشبوئے بدن آئی ہے پھر موجِ صبا سے　　　پھر مجھ کو پکارا ہے ترے شہرِ طرب نے

[illegible] ان کے دل کی تپش اور بڑھا دیتا ہے اور دل کی اجڑی بستی سے دھواں اٹھنے لگتا ہے -

ہم نے مانا کہ بہار آئی ہے　　　اپنی نگری میں تو پت جھڑ آئی
[illegible] اگر اس حال میں آیا بھی تو کیا　　　[illegible] دل چہرۂ گلزار پہ مل جائے گا

نشاطِ عشق اور خاموش پرستش کا کرب کتنے خوبصورت انداز سے بیان کر رہے ہیں :

انسان نے تخلیق سے اب تک جو کیے طے　　　وہ مرحلے گذرے ہیں تری راہ گزر تک
انہی دو باتوں میں کٹ جاتی ہے سب عمر ندیم　　　اے غمِ دہر! نہ چھیڑ اے غمِ یار! آتا ہوں

ہم زندہ ہیں اے فراق کی رات		پیارتی! ترے بال کیوں کھلے ہیں

وہ ۔۔ یہ محبت کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

خدا کے سامنے کس منہ سے جائیں گے خدا جانے		محبت کا کوئی دھبہ نہیں ہے جن کے دامن پر

قطعہ

داورِ حشر مجھے تیری قسم		عمر بھر میں نے عبادت کی ہے
تو مرا نامۂ اعمال تو دیکھ		میں نے انسان سے محبت کی ہے

ان کا پیار توانا، طاہر اور غیر فانی ہے لیکن یہ حسرت انھیں ہر لمحہ چبھتی رہتی ہے کہ ؎

جب یہ طے ہے، میں کبھی تجھ کو نہیں پا سکتا		اب یہ حسرت ہے تجھے کوئی تو پا سکتا
تجھ سے مل کر تجھے پا لینے کی حسرت جاگی		کچھ نئے خواب ترے خواب کی تعبیر ہوئے
اشک آنکھوں میں چمکتے ہیں تبسم بن کر		آگیا ہاتھ ترا گوشۂ داماں جیسے
مر جاتا ہوں جب یہ سوچتا ہوں		میں تیرے بغیر جی رہا ہوں
تارے سے خرام جیسے چھن جائے		میں تجھ سے کچھ اس طرح جدا ہوں
تو پھول ہے یا صبا ہے، کیا ہے		میں رنگ ہوں یا مہک ہوں، کیا ہوں
ہم عکس ہیں ایک دوسرے کا،		چہرے یہ نہیں ہیں، آئینے ہیں

احساس محرومی اور نارسائی کا دکھ محورِ حیات بن چکا ہے مگر رواجوں اور رسموں کی جکڑ بندیاں اور معاشرتی مجبوریاں ان کی راہ میں حائل ہیں۔ پھر دونوں طرف آگ برابر لگی ہونے کا احساس اس کرب کو اور بھی جانستاں اور دل گداز بنا دیتا ہے چنانچہ یہ کرب انھیں کسی کل چین نہیں لینے دیتا۔ ہار کر دست دعا بھی اٹھاتے ہیں لیکن اذانِ صبح رات کا کیا علاج کرے گی ؎

کتنا کافر ہے کربِ محرومی		ہم بھی دستِ دعا اٹھانے لگے
اذانِ صبح سے شب کا علاج کیا ہوگا		مجھے تو تیرا ہی چہرہ سحر نما ہوگا

ساتھ ہی یہ فکر بھی ہے کہ ؎

میں کھل کے رو نہ سکا جب تو یہ غزل کہہ لی		بچھڑ کے مجھ سے مگر تو نے کیا کیا ہوگا

کچھ یوں لگتا ہے جیسے وہ خود بھی قربِ حبیب سے خوف کھاتے ہوں ؎

یہ سوچتا ہوں کہ میں بت پرست کیوں نہ ہوا		تجھے قریب جو پاؤں تو خود سے ڈر جاؤں
میں تیرے قرب سے صرف اس لیے گریزاں ہوں		کہ تجھ کو یاد رہوں حرفِ داستاں بن کر

وہ بنیادی طور پر رجائی ہیں۔ امید کا دامن کبھی ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ اس لیے یہ دعوٰی بھی انہی کو زیب دیتا ہے ؎

کسی افق پہ تو خم کھا کے مجھ کو چھو لے گا		تو لاکھ دور رہے مجھ سے آسماں بن کر

بلکہ انھیں تو یہ اصرار بھی ہے کہ وہ اپنے اس شکستہ پائی کا طعنہ دینے والے محبوب سے دور ہوئے ہی کب تھے کہ

اسے ان کے صدیوں طویل انتظار کے بعد اس طعنہ زنی کی ضرورت پیش آئی۔ کتنی خوبصورتی اور کیسے لطیف انداز سے وہ اسے مطمئن کر دیتے ہیں ؎

ندیم ہوں مجھے صحنِ شکستہ پائی نہ دے　　　ہیں تیرے ساتھ رہا گردِ کارواں بن کر
یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں ہے کہ "ندیم"　　　میرا کردار کا کردار ہے، ورنہ نام کا نام

انھیں اپنے جذبۂ صادق پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ بڑی بے تکلفی اور یقین کے ساتھ کہہ جاتے ہیں ؎

قطعہ
عرش سے ماورا ملیں گے آپ　　　اس قدر دور کیا ملیں گے آپ
عشق اپنا اگر بلند رہا　　　اسی پستی میں آ ملیں گے آپ

تجھ سے چھوٹ کر بھی تری سرخیٔ عارض کی قسم　　　چپکے چپکے ترے دل میں کئی بار آتا ہوں
تو بھلانا نہیں چاہے تو بھلا دے لیکن　　　تو ہمیں یاد نہ آئے گا تو جب جائیں گے

بہرحال ایسے حسین و جمیل اشعار ان کے کلام میں ان گنت ہیں۔ میرے سامنے اس وقت ان کی تازہ غزلیں نہیں ہیں ورنہ کچھ اور نمونے پیش کر دیے جاتے۔ لیکن جتنا انتخاب ہم پیش کر چکے ہیں یہ بھی ہمارے اس دعوے کے ثبوت کے لیے کافی سے زیادہ ہے کہ ندیم صرف فکری اور مقصدی شاعر ہی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے فن کے لیے ؏

مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

وہ جینئیس ہیں اور ہر فنی منصب کو مکمل طور پر نبھا سکتے ہیں اور نباہ رہے ہیں۔ وہ انسان دوست اور انسان نواز شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک وفا شعار اور قابلِ اعتماد محب بھی ہیں اور لائقِ پرستش محبوب بھی — ان کے اشعار ان کی ناکامی اور محرومی کی کہانی بھی سناتے ہیں اور طمانیت و کامیابی کی داستان بھی بیان کرتے ہیں ان کے کلام میں سوزِ غمِ ہجراں کی لذت بھی ہے اور جوابی محبت کے احساس کی شبنمی طمانیت بھی۔ کسی کھوئی ہوئی شے کو پانے کی لگن بھی اور باوجود انتہائی کوشش کے اسے حاصل نہ کر سکنے کا یقین بھی۔ ان اشعار میں چاہنے کا فخر بھی شامل ہے اور چاہے جانے کا غرور بھی ؎

یہ مجھ پہ نزع کا عالم نہیں ہے　　　کوئی کھوئی ہوئی شے پا رہا ہوں

اس حقیقت میں بھی بڑا درد ہے اور سکون بھی۔ اور یہ متضاد احساسات مل جل کر ان کی شخصیت کو ایسی توانائی، نزاکت، رسیلے پن، حدود اعتدال اور حسن کا سنگم بنا دیتے ہیں کہ وہ صحیح معنوں میں ایک عظیم شاعر اور عظیم انسان بن جاتے ہیں اور انھیں یہ کہنے کا حق بجا طور پر حاصل ہو جاتا ہے کہ ؏

تمام دہر کا دکھ اوڑھا ہوں میں ندیم ہوں میں

جس طرح لقول کسے "کیٹس کو اگر لوسی مل جاتی تو وہ کسی دفتر میں کلرکی کر کے بقیہ زندگی گذار دیتا۔ اور انگریزی شاعری ایک قیمتی سرمائے سے محروم رہ جاتی" اسی طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ندیم کی یہ شکست جسے وہ اپنی "زندگی کا زخم" بتاتے ہیں اردو ادب کے لیے ایک نعمت ثابت ہوئی ہے ؎

ترا غم زندگی کا زخم سہی　　　تیرے غم نے وفا تو کی ہم سے

اور اگر قلب شاعر کو یہ زخم نہ لگتا اور اس سے رہ رہ کر اٹھنے والی ٹیسیں انھیں ہر ہر لمحہ اس درد لا دوا کا احساس نہ دلاتی رہتیں۔ اگر انھیں سفرِ حیات میں اپنے محبوبِ نظر کی معیت اور رفاقت حسبِ تمنا نصیب ہو جاتی تو آج اردو شاعری بھی اس متاعِ بے بہا سے محروم رہتی جو ان کے سدا بہار اشعار کی صورت میں اوراقِ گل کی طرح چمنستانِ اردو میں بکھری پڑی ہے اور ہر حساس، دردمند اور مخلص دل میں محبت، سچائی، حسن اور انسان دوستی کا جادو جگا رہی ہے اور خود شاعر کی شخصیت کو شہرتِ عام اور بقائے دوام سے ہم کنار کر رہی ہے۔ درحقیقت اگر ان کی فکری اور مقصدی شاعری سے لمحہ بھر کے لیے قطع نظر کر کے صرف ان کی عشقیہ شاعری کو ایک نظر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی پوری زندگی ان دو اشعار کی تفسیر ہے:

عشق دانی چیست؟ لب پرخندہ کردن نزد خلق　　　بے خبر از آہ و افغاں آہ و افغاں داشتن
گاہ در عینِ وصال از داغِ ہجراں سوختن　　　گر نشاطِ وصل اندر عینِ ہجراں داشتن

دشتِ وفا کا سفر

(صفحہ ۴۰۱ سے آگے)

"دشتِ وفا" کا سفر دراصل عہدِ حاضر کا سفر ہے جس میں انسان کی کامرانیاں بھی ہیں اور چیرہ دستیوں کا غم بھی، محبت اور خلوص کے نغمے بھی اور زنداں کے حصارِ تنگ سے پھوٹنے والا اُجالا بھی۔ کہیں یہ غم بھی ہے کہ

جو بھائیوں کی حرصِ تجارت میں بک گئے
اے نظم نو وہ یوسفِ کنعاں ہمیں تو ہیں

اور کہیں وہ احساسِ زیاں ہے جو آدرشوں سے رشتہ رکھنے والوں کا مقدر ہے۔ لمحہ لمحہ یہ احساس اُبھرتا ہے کہ جسم کا گرم لہو زنداں کی نذر کیوں ہوا (بقول مخدوم) نذرِ آزادیِ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا۔ ایسے موقع پر ندیم کے یہاں یہ کیفیت یوں اُبھرتی ہے ع

میں زندگی کی خزاں سے اپنے شباب کے پھول مانگتا ہوں

"دشتِ وفا" میں ذات کا غم بھی ہے، کائنات کے سوال بھی۔ وطن کا چہرہ بھی ہے اور مشرق و مغرب کی آویزش بھی۔ ہل کی ہتھی پہ ہاتھوں کے نشانوں کا نمودار ہونا بھی ہے اور "ہم نے ترا آسماں بنایا" کا اظہار بھی۔ احمد ندیم قاسمی نے "دشتِ وفا" میں عظمتِ فن کو رعنائیِ فن سے اس طرح ہم رشتہ کر دیا ہے کہ ان کی شاعری ان کے اس شعر کی تفسیر ہو گئی ہے ؎

عظمتِ فن کا تقاضا ہے کہ رعنائیِ فن
یوں حقیقت کو سمیٹے کہ حقیقت ہو جائے

محمد علی صدیقی

قاسمی کی شاعری کا فکری پس منظر

احمد ندیم قاسمی اس صدی میں اردو شاعری کے اُن معدودے چند شعراء میں سے ہیں جن کی شاعری نے ادب اور معاشرہ کے رشتہ کو بہت وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ اُن کی وضاحت پسندی نے اکثر و بیشتر کلام کو شہادت نصیب ہونے کی بجائے بجا طور پر اپنے دور کی تفہیم کے لیے عصری تاریخ کا مددگار بنا دیا ہے۔

قاسمی کی شاعری کا دورِ شباب اُس زمانہ سے متصف ہے جس کی پیہم صراحت اور تصویر کشی سے اُن کے کم و بیش ہر معاصر کی زندگی اور سیاسی پس منظر پر یکساں مضمون کا تین چوتھائی حصہ آسانی کے ساتھ چھاپا جا سکتا ہے۔ قاسمی کی شاعری میں اس صدی کی تیسری دہائی کی عالمی کساد بازاری اور فاشزم کے فتنہ کے خلاف ردِ عمل نے ترقی پسندانہ خیالات کی آبیاری میں مدد دی ہے۔ اس لیے اس مختصر سے مضمون میں قاسمی کی ذات اور اُن کے ذہن کی ساخت ہی موضوعِ گفتگو ہے۔

قاسمی بہت ہی شریف النفس، پُر خلوص اور شرمیلے انسان ہیں۔ وہ دوستوں سے کیا اپنے دشمنوں سے بھی حسِ بے ریا شائستگی کے طالب ہوتے ہیں وہ اب ایک "انسانی" آرکیڈیا ARCADIA کے خیالی باسیوں کے مطالبات بن کر رہ گئے ہیں۔ انسانی نیچر NATURE کے واہمہ اور تخلیقی ارتقا کے مقلدین نے انسان کو چیستان بنا کر رکھ دیا ہے۔ ان دونوں نظریات کے طاقتور محرکات کا استیصال کیے بغیر قاسمی کا انسان واقعتاً ایک تصورِ اعلیٰ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ خود قاسمی صاحب کو وہ انسان جس کے لیے بقول نے "انسان عظیم ہے خدایا" کی تاریخی سطر لکھی تھی تجریدی شکل ہی میں میسر آیا ہے۔ یا تاریخ کی چند عظیم شخصیتوں کے روپ میں اُبھرا ہے۔ اُن کی خواہش ابھی تک وسیع تر اطلاق سے بہرہ ور نہیں ہوئی ہے۔ قاسمی اس صورتِ حال سے بہت نالاں ہیں اور اُن کی شاعری خود اپنے ہی مطالبہ کی شکست و ریخت کا نوحہ اور کبھی کبھی التبا س نظر کی وجہ سے ایک ایسا طربیہ بن کر بھر رہی ہے جو غالباً ۱۹۴۷-۴۸ء کے دور کی شاعری کے بعد سب سے زیادہ طاقتور دور کہا جا سکتا ہے۔

قاسمی صاحب جدید اردو شاعری کے ایک اہم ستون ہیں۔ اُن کی پیدائش جنگِ عظیم اوّل کے دوران (۱۹۱۶ء) میں ہوئی۔ اور ۱۹۲۵ء میں جب وہ اپنے والد کے انتقال کے دو سال بعد اپنے عمِ محترم کے پاس کیمبل پور چلے گئے تھے تو پنجاب پر حالی اور اقبال کی حکومت تھی۔ ۱۹۲۵ء تک علامہ اقبال کی کئی تصنیفات علم الاقتصاد (۱۹۰۱ء) فلسفۂ عجم (۱۹۰۸ء) اسرارِ خودی (۱۹۱۵ء) رموزِ بے خودی (۱۹۱۸ء) پیامِ مشرق (۱۹۲۳ء) اور بانگِ درا (۱۹۲۴ء) طبع ہو چکی تھیں۔ بانگِ درا کے نوجوان قاسمی کے ذہن کی تشکیل میں بھی اس کا نمایاں ہاتھ ہے۔ اُن کے کانوں میں اردو جن شعراء کے نام پڑے اُن میں

حسان بن ثابت، سعدی، حافظ اور غالب تھے۔ جیسے کہ خود قاسمی صاحب نے 'جلال و جمال' کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے کہ اُن کے عمِ محترم میر اور داغ کی شاعری سے بیزار تھے۔ قاسمی صاحب میر اور داغ سے کب تک فرار اختیار کیے رہے یہ تو الگ معاملہ ہے۔ لیکن فیض احمد فیض نے ایک جگہ اس حقیقت کا اقرار کیا ہے کہ انھوں نے میر کے علاوہ سودا اور مصحفی سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ میر اور داغ کی شاعری میں نرمی، گداز اور شیرینی کو قاسمی کی شاعری کے بالمقابل کھڑا کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ لیکن قاسمی صاحب کی شاعری میں قومی جذبہ، خیر و شر کے ڈرامہ میں خیر کی قوتوں کا ساتھ دینے کی تڑپ اور زبوں حال معاشرہ کی تیرہ و تار شب کے بعد مہرِ درخشندہ کی نمود نے اُنھیں نغمگی سے زیادہ فیصلہ کُن ادبیت سے مالا مال کیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں قاسمی الفاظ کو اتنی خوبصورتی سے برتتے ہیں کہ پھر زبان و بیان میں اُن کی قدرتِ کلامی کا ذکر چھیڑ جانا چاہیے۔ لیکن ہم اس بحث میں کبھی پڑنا نہیں چاہتے۔ اُردو تنقید میں اس قسم کی بحثیں "تاریک گلی" بن کر رہ گئی ہیں جس کا روشنی کی طرف سرا مضمون کے اختتام پر بھی نہیں نکلتا۔

پنجاب میں قاسمی کے اہم ہم عصروں میں فیض، تاثیر، مجید امجد، غلام عباس، ن ۔ م ۔ راشد اور میراجی کے نام گنے جا سکتے ہیں۔ پھر منٹو، کرشن چندر اور بیدی کی باری ہے۔ لیکن ان سب میں قاسمی اور پھر کسی حد تک مجید امجد نے زندگی کے جتنے نشیب و فراز دیکھے ہیں، وہ غالباً ایک ایسے دفینۂ تجربات سے تعبیر کیے جا سکتے ہیں جس سے قاسمی کسی الف لیلوی داستان کی منزلیں طے کرتے ہوئے ملتے ہیں "تاکہ کسی سبز طوطے کے شکم میں چھپا ہوا گوہرِ مراد مل سکے۔ اُن کے باقی ہم عصر یا تو زندگی کی نیرنگیوں کو اپنا حق سمجھ کر اپنی محرومیوں کا انتقام لیتے ہے، یا اپنے منہ میں پیدائش کے وقت ہی چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے، یا پھر منٹو کی طرح خود زندگی سے دست و گریبان رہ کر بالآخر مر دہ پڑ گئے۔ قاسمی کوئی تیرہ عشرہ "قلم مزدوری" کے علاوہ گراں قدر ادب بھی تخلیق کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ اپنے گرد عقیدت مندوں کا ایک ایسا ہالہ قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے ہیں، جو اُن کا فدائی بھی ہے۔ قاسمی کی شاعری چالیس سال پر بکھری ہوئی سہ پہلی دوپہر ہے جسے ہم عصر سیاست اور ہم عصروں کی شاعری کی مدد سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ قاسمی کی شاعری نہ فیض کی طرح مترنم اور ایمائی ہے اور نہ میراجی کی طرح فرانسیسی و آریائی، نہ راشد کی طرح فکر و خیال کے جیتاتوں کو جنم دیتی ہے (اب تو راشد کافی "شگفتہ" ہوتے جا رہے ہیں) اس لیے قاسمی کی شاعری سے صحیح طور سے حظ اٹھانے کے لیے قاری کو اپنے بہت سے "تعصبات" سے گلو خلاصی حاصل کرنا پڑے گی۔ ادب میں قاری کی اہمیت اس لیے نہیں ہے کہ وہ ایک مخصوص قسم کے ادب یا شاعری کو سمجھنے کا لائسنس رکھتا ہو، بلکہ وہ کسی شاعر کے کلام کو سمجھنے کے لیے خود شاعر کی تخلیق کردہ "دنیا" کا ایک ایسا سیاح بن سکے جو روم میں رومیوں کے اخلاق و آداب سے نہ صرف واقف ہو بلکہ رومیوں سے اپنے سماجی و ادبی میلانات کی روشنی میں گفتگو کرنے کی بجائے رومی کے وجدان کے سوتوں میں اُتر سکے جس طرح ادیب کے لیے "غیر ذاتی" ادب تخلیق کرنے کا مسئلہ کھڑا کیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح خود قاری کے لیے بھی "غیر ذاتی" ذوق ضروری ہے۔ جس کا مطلب اپنے سیاسی مسلک سے دست کشی نہ ہو، بلکہ زیادہ قیاضانہ نظریۂ ادب ہو۔ "غیر ذاتی" سے یہاں لغت کے معنی مراد نہیں بلکہ قاری کا "غیر ذاتی" ہونا ایک ایسی ذوقی حالت سے ہم رشتہ ہونے کا نام ہے۔ جس میں تخلیق کو اپنے "تعصبات" کے ساتھ ساتھ فنی لوازمات اور خود اس تخلیق کی ذاتی صلاحیت، الفاظ کی ترتیب اور خود میں ہم آہنگی کے ذریعہ پرکھا جائے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم بے

"تعصبات" ہیں ایک اور روایت کے اچھے شہ پارے سے منہ موڑ رہے ہوں ۔ ترقی پسند تحریک کی کمزوری کا ایک سبب ترقی پسندوں کی ملّائیت بھی رہی ہے ۔ جو ترقی پسند کسی غیر ترقی پسند کی اچھی تخلیق کو پسند کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرے ، اُسے خود مارکس کے ادبی ذوق کا مطالعہ کرنا چاہیے ۔ فلابیرؔ اشتراکیوں کا دشمن تھا ۔ لیکن اُس کی تصنیف "مادام بوؔواری" مارکس کی محبوب ترین کتاب تھی اور شیکسپیئر الزبتھین سامراج کا ڈرامہ نویس ہونے کے باوجود مارکس کے خاندان میں اتنا مقبول تھا کہ مارکس اپنی بچیوں سے شیکسپیئر کے کسی بھی ڈرامہ کی کوئی سطر پڑھ کر ڈرامہ بوجھنے کا کھیل کھیلتا تھا ۔ وکٹر ہیوگو اور زولا بھی مارکس کے مطالعہ میں رہے ہیں ۔ اور ان کی رومانیت اور فطرت پرستی پر اُس کے ریمارکس محفوظ بھی ہیں ۔ لیکن ہمارے یہاں مذہبی اور ترقی پسند حضرات مذہب اور ترقی پسندی کو اپنے ظرف کی سطح پر لے آئے ہیں ۔ قاسمی کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ کبھی سکّہ بند مذہبی یا اشتراکی یا "جدید" نہیں رہے ۔ وہ اپنی روایات میں پھلنا پھولنا پسند کرتے رہے اور انھیں اُس کی قیمت بھی دینا پڑی اور آج قاسمی کا سب سے اچھا قاری وہی ہو سکتا ہے جو قاسمی کو قاسمی کے ذہن کی عینک سے دیکھتا ہے ۔ اس طرح زیادہ مایوسی نہیں ہو پاتی ۔

قاسمی نے ایک مذہبی ماحول' بلکہ ایک خانوادۂ طریقت میں جنم لیا ۔ اُن پر اپنے خاندان سے عقیدت رکھنے والے مریدوں کو دیکھ کر وہی اثر ہوا جو مولانا ابو الکلام آزاد پر ہوا تھا ۔ "جلال و جمال" کے دیباچہ میں اس ماحول سے اپنی اولین برگشتگی کی بابت لکھتے ہیں ۔

> ———"میرے خاندان کے مرید ریاست کشمیر کے جنوبی علاقے نیز گجرات اور سیالکوٹ کے اضلاع میں اب تک بڑی تعداد میں موجود ہیں ۔ اُن کی عقیدت بے پناہ ہے ۔ ایک مرتبہ میں نے بھی اپنے جوتوں کو اُن عقیدت مندوں کے گروہ میں اس حالت میں گم ہوتے دیکھا ہے کہ ہر شخص کی آنکھیں غضب چمک رہی تھیں اور ہر "مرید" کے چہرے پر ایک بہت بڑے مذہبی بزرگ کے جوتوں کو مس کر کے ایک آسمانی آسودگی چھا گئی ۔ یہ میرے احساسات کی بیداری کا پہلا دن تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

اور پھر آگے چل کر قاسمی کو ہندوستان میں جگہ جگہ ننھے ننھے سجادوں کی اکثریت اور اسلامی نظام حرکت و عمل کے جسم پر ایک گلابی پھوڑے کے سوا اور کسی شکل میں نظر نہیں آئی ۔ میں خیر و برکت کا قائل ہوں' لوٹ کھسوٹ سے مجھے نفرت ہے ۔"

قاسمی کے یہاں تصوف کی اس منفیت سے بیزاری کا سبب علامہ اقبال کی خانقاہ کے متعلق "گوسفندانِ قدیم" والی اصطلاح اور "خطباتِ مدارس" میں جاری و ساری فکر بھی ہو سکتی ہے ۔ پنجاب میں نقشبندی سلسلہ کی کامیابی کی روشنی میں اگر ہند و مسلم تعلقات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی یوپی' دہلی' پنجاب اور سرحد کی شدت پسندی کے پیچھے ایک ہی نوع کا ذہن کارفرما رہا ہے ۔ قاسمی کے یہاں "فن کار" نے انھیں گہری شدت پسندی سے محفوظ رکھا ہے ۔ اور یہی شعیر کی وقت پیران کے غائبہ مشمول سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک میں عالمی اشتراکیت کے مقاصد کے تحت شامل نہیں ہوئے تھے ۔ قاسمی کبھی مادّی جدلیت کے قائل نہیں رہے ۔ اور ممتاز حسین نے قاسمی کے بارے میں آج سے بیس سال پہلے اپنے مضمون "ایک نیا منصور" میں انھیں "صوفی" قرار دیا تھا ۔ اس مضمون میں اگر صرف لفظ "صوفی" ہی کی تکرار

ہوتی تو فتح محمد ملک، ممتاز حسین کے مضمون میں کسی قسم کی بدنیتی تلاش کرتے ہوئے بھٹکنے لگتے ۔ غالب ادبی تنقید میں ابھی تک خورد بین کے ساتھ ساتھ دوربین بھی آلاتِ شعر فہمی میں شامل ہے۔

برصغیر میں ترقی پسندی کی "بوچھار" اس صدی کے چوتھے عشرہ سے منسوب ہے۔ اگر اشارہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف ہے تو یہ بہت مناسب خیال ہے۔ ورنہ ادب زندگی کی جدلیت کا گراف ہے اور اس میں ہر دو قسم کی قوتوں کی مبارزت ملتی ہے۔ ترقی پسند مصنفین میں سب ہی قسم کے لوگ شامل تھے۔ اگر کوئی گروہ اس میں شامل نہ ہو سکتا تھا تو وہ جمہوریت دشمن اور فاشی تھا۔

پریم چند، مولوی عبدالحق، جواہر لعل نہرو، تاثیر، عبدالمجید سالک، اچاریہ نریندر راؤ، نیاز فتح پوری اور بقول سجاد ظہیر علامہ اقبال بھی ترقی پسند مصنفین کے اغراض و مقاصد سے متفق تھے۔ اس انجمن کو بقول سید سبط حسن "اشتراکی دیوں کا پلیٹ فارم بنانے کی کبھی بھی سعی نہیں کی گئی" اور خود سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" اس دعوے کا واضح ثبوت ہے جس میں پوری صراحت کے ساتھ ترقی پسندوں کی انجمن میں شمولیت کی شرائط درج ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے "جلال و جمال" کے دیباچہ میں ۱۹۳۹ء تک ترقی پسند مصنفین کے قیام سے مرتب ہونے والے اثرات تک کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ گو اُن کی اُس دَور کی شاعری میں "ترقی پسندانہ خیالات" اور ایک رومان کی بازگشت ہے۔ اس رومان نے غالباً ۱۹۳۷ء میں قاسمی کو بہت مضطرب رکھا اور "جلال و جمال" اور "شعلۂ گل" میں اس دور کی غزلوں میں میرؔ اور داغؔ کی چھوٹ بھی پڑتی ہوئی ملتی ہے۔ شاید اس لیے کہ قاسمی کے عمِ محترم اقبال کے ہم درس تھے اور اس رشتہ سے داغؔ کسی نہ کسی طرح چور دروازہ سے آدھمکتے ہیں۔

قاسمی نے سرکاری ملازمت ۱۹۳۹ء میں شروع کی اور بالآخر خود اُن کے الفاظ میں ستمبر ۱۹۴۲ء کو "یہ کابوس میرے سینے سے اُترا" اور فوراً ہی انھوں نے دارالاشاعت پنجاب سے منسلک ہو کر "تہذیبِ نسواں" اور "پھول" کی ادارت سنبھال لی۔

ترقی پسند تحریک سے اُن کی باقاعدہ اور عملی وابستگی "ادبِ لطیف" کے دور سے شروع ہوئی اور "ادبِ لطیف" ہی میں ایک "قابلِ اعتراض" "مضمون لکھنے کی پاداش میں" ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اور اس طرح وہ گنتی کے اُن چند ادیبوں میں شامل ہو گئے جنھوں نے ترقی پسندانہ فکر کی سرخ روئی کے الزام میں قید و بند کی صعوبتیں اُٹھائیں۔ قاسمی کی ترقی پسندی دراصل انسان دوستی کے جذبہ کا سیکولر رُخ ہے۔ وہ مذہب بیزاری اور الحاد سے کوسوں دور ہیں۔ جدلیاتی مادیت اُن کے یہاں فلسفیانہ آورش نہیں ہے۔ "جلال و جمال" کے دیباچہ میں خود اُن کے الفاظ ہیں:

> "انقلابی شاعروں کی ایک خصوصیت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ انھیں خدا سے کیوں بیر ہے۔ اگر مذہب کی ابتدائی یعنی حقیقی ماہیت کو پرکھا جائے تو ایک ایسے کیمیائی عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو ہماری زندگی کو در زندگی سے جُٹا کر انسانیت کا احترام اور اپنی ذات کی طہارت سکھاتا ہے۔ مذہب اگر خود فکری کی نشوونما میں کسی نوع کی مزاحمت کر سکتا تو مذہب مذہب نہ رہتا، فاشی احکام کا پلندہ بن کر رہ جاتا۔ مذہب ہمیں بداخلاقی، ذہنی آوارگی اور انسانیت دشمنی کی یقیناً اجازت نہیں دیتا اور گر خود فکری و خود شناسی ہر نوع کی آزاد خیالی پر مبنی ہے

تو پھر الحاد بھی تو خود فکری کا کوئی قابلِ فخر نتیجہ نہیں۔ مادّہ کی قوت مسلّم، لیکن مادّہ کی تکوین و تعمیر کے پس پردہ جو ایک غیر محسوس حُسن کارفرما ہے، اُس سے ایک سچا شاعر قطعاً منکر نہیں ہو سکتا اور شاعری کا سب سے بڑا معجزہ عالمگیر حُسن کا احساس ہے ......"۔

"جنس ہو یا انقلاب، مذہب ہو یا الحاد ہم ہر حالت میں اپنے ذہن کی رہنمائی کے محتاج ہیں"۔

مندرجہ بالا دو اقتباسات نے پوری دیانت کے ساتھ قاسمی کے ذہن کو ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ وہ مادّہ پر ذہن کی فوقیت تسلیم کرتے ہیں۔ ماورائی طرزِ فکر کے اصولاً مخالف نہیں اور مذہب کو خیر و برکت سے متصادم نہیں سمجھتے۔ اس لیے اُن کی شاعری میں سماجی عدم مساوات اور ہر نوع کی اخلاق باختگی کے خلاف ایک مسلسل تکرار ملتی ہے جو اُنھیں ایک انسان دوست شاعر کے اعلیٰ منصب کی طرف لے جاتی ہے۔ قاسمی انسان کو تجرید و تجسیم دونوں صورتوں میں امکاناتِ خیر و برکت کا پتلا سمجھتے ہیں۔ انسان اُن کے یہاں ایک جمالیاتی پیکرِ صوت و صورت و آہنگ بن کر اُبھرتا ہے۔ یہ رُخ بہت نیا اور انوکھا ہے۔ قاسمی جب انسانی (FORM) پر جان دیتے ہوئے ملتے ہیں تو ہمیں نئی نسل کے ایک ممتاز شاعر جون ایلیا کی نظم "نئی آگ کے عہد نامہ" میں انسانی شکل (FORM) کا مذاق اُڑتا ہوا ملتا ہے۔ دو نسلوں کے اس فرق کو ملحوظ رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ دونوں شعراء کو انسان دوستی عزیز ہے — دونوں پُر امید ہیں۔ لیکن نئی نسل کا شاعر جب انسان کو آسمان پر سے دیکھتا ہے تو اُسے زمین کا انسان اُلٹا لٹکا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

لیکن قاسمی کی انسان دوستی کو یوروپی اصطلاح — HUMANISM کی روشنی میں نہ دیکھا جائے۔ ہم اپنی فکری تحریکوں کو یوروپی کھانچوں میں رکھنے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اگر کسی یوروپی سے کہا جائے کہ قاسمی HUMANIST ہے تو وہ اس سے قاسمی کے یہاں مذہب بیزاری، فنونِ لطیفہ، فلسفہ اور ادبی اقدار کے میدان میں بغاوت اور نچیہ کشتی کی طرف منعطف ہوگا جو غالباً قاسمی کی انسان دوستی اور یوروپی انسان دوستی کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ قاسمی کی انسان دوستی دراصل ترقی پسندی کا عادا عظم مشترک ہے۔ اس میں فرسودگی اور کہنگی میں بھی کام کی باتوں کو سنبھال کر رکھنے کی کاوش ملتی ہے اور "جدید" اور مادی جدلیت کے اُن پہلوؤں سے انکار ملتا ہے جسے قاسمی مذہب بیزاری، الحاد دوستی اور مادّہ پرستی خیال کرتے ہیں۔

قاسمی کے اب تک چار شعری مجموعے طبع ہوئے ہیں۔ "رم جھم" [1] "جلال و جمال"، "شعلۂ گل" اور "دشتِ وفا" مجھے ذاتی طور پر "شعلۂ گل" اور "دشتِ وفا" کی نظمیں اور تقسیم کے بعد کی غزلیں بہت پسند ہیں اور اگر کوئی مجھ سے "شعلۂ گل" اور "دشتِ وفا" میں بھی انتخاب کرنے کو کہے تو میں "شعلۂ گل" کا انتخاب کروں گا۔ لیکن "دشتِ وفا" کے بعد جو بھی مجموعہ ترتیب پائے گا۔ اُس کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ اردو کی چند بہت ہی خوبصورت نظموں اور غزلوں سے مالامال ہوگا۔ قاسمی کی شاعری بالخصوص ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء تک کی شاعری میں ایک مخصوص تیکھا پن ہے۔ ان میں الفاظ کا انتخاب اور ترتیب میں اس قدر حُسن کاری ہے کہ کوئی اور شاعر اس نوع کی شاعری میں اُن کا حریف نہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انکار، تذبذب اور تشکیک بذاتِ خود، منبع حسن و فن ہیں، اور کیا اثبات میں شاعر کے اندر کا — RHYTHM

[1] یہ مجموعہ پہلے "دھڑکنیں" کے عنوان سے چھپا تھا۔

(باقی صفحہ ۴۵۵ پر)

جابر علی سیّد

ندیم کی ایک تمثیلی نظم

(قانون قدرت)

تمثیلی نظم ALLEGORY کا نسبتاً مختصر پیمانے پر متشکل ہونا ہے۔ ایلیگری بنیادی طور پر اخلاقی، صوفیانہ، سیاسی، سماجی، تجریدی تصورات کا ادبی یا شعری اظہار ہے۔ انگریزی میں اسپنسر کی FERRY QUEEN ملٹن کی PARADISE LOST جان بنین کی PILGRIMS PROGRESS سوفٹ کی GULLIVER TRAVELS بالترتیب اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور سماجی تمثیل کے نمونے ہیں۔ فرید الدین عطار کی فارسی مثنوی منطق الطیر ایک صوفیانہ تمثیل ہے۔ جس میں عرفان کے تجریدی تصورات کو جانوروں کی صورت میں متشکل کر کے دکھایا گیا ہے۔ ایلیگری کا کینوس لازمی طور پر وسیع ہوتا ہے۔ اسے منظوم ناول بھی کہہ سکتے ہیں۔ مدتوں میں زندگی کا پورا VISION آئیڈیل بن کر قاری کے سامنے آجاتا ہے۔

تمثیلی نظم کو ایلیگری کی مختصر اور COMPACT صورت سمجھنا چاہیے۔ لیکن تمثیلی نظم اور ایلیگری میں ایک اور فرق بھی ہے۔ ایلیگری لازمی طور پر تصور کو ختم کر کے دکھاتی ہے۔ تمثیلی نظم میں اس کے برعکس فطرت اور ذہن (خارجی اور داخلی دنیا) دو متوازی خطوں کی طرح بیک وقت متحرک نظر آتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کا بدل تو ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان میں مرئی اور غیر مرئی کا تعلق نہیں ہوتا۔

ندیم کی نظم "قانون قدرت" اگرچہ کئی اعتبار سے دلکش ہے لیکن اس کا سب سے بڑا امتیازی حسن یہ ہے کہ یہ شاید اردو زبان کی واحد تمثیلی نظم ہے۔ اردو میں اس صنف شعر کا سراغ بعض مماثل صورتوں میں ضرور ملتا ہے۔ لیکن تمثیلی نظم بحیثیت ایک مکمل اور انفرادی صنف یہاں موجود نہیں۔ فارسی اور اردو کے اہل بلاغت نے علم بیان کے تحت جس پیرائے کو تشبیہ تمثیل کے نام سے موسوم کیا ہے اور اس کے تحت بعض اشعار کلاسیکی اساتذہ کے کلام سے بطور مثال پیش کیے ہیں وہ تمثیلی نظم کی ابتدائی اور نامکمل صورت ہے۔ تمثیلی تشبیہ محض دوہری تشبیہ ہے — DOUBLE SIMILE کی ایک مثال یہ شعر ہے۔ اس میں صبح کو تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے ؎

صبح را بنگر بہ ظلمت چساں آید پدید　　　　دہلیِ سیمیں تذ ازے بتدین غنتامے

فارسی شاعر نے ابھی تخیل کے طلسم کا ابتدائی مرحلہ طے کیا ہے۔ اس کی نگاہ کائنات کے دو مظاہر میں دو مماثل مظاہر کا سراغ دریافت کر رہی ہے۔ یہ سراغ ایک شعر میں متشکل ہو گیا اور تخیل کی نگاہ نے ایک خوبصورت رشتہ میں دو مختلف چیزوں کو پرو دیا ہے۔ اردو شاعری میں تشبیہ تمثیل کے نمونے بہت کم نظر آتے ہیں۔ میر حسن کے یہاں البتہ بعض خوبصورت مشاہداتِ فطرت تمثیلی پیکر اختیار کرتے نظر آتے ہیں ؂

پلیٹے ہوئے پوستوں پر تمام
رُو پہلے سنہرے ورق صبح و شام

میر حسن کا احساس روشنی و سایہ (LIGHTANDSHADE) خوبصورت پیکر تراشتا ہے جو اس کو اپیل کرتا ہے۔ میر انیس کے یہاں تشبیہ کبھی تمثیل نہیں بنتی اور باوجود اپنے حس کے صنعت کاری کی اگلی منزلوں سے شناسا نہیں ہوتی۔ لیکن یہ اردو شاعری کی روایت ہے کہ تسلسل صرف مثنوی ہی میں نظر آئے اور کسی صنف میں نہیں۔ غزل میں تخیل تشبیہ کی صورت میں اپنا جلوہ ضرور دکھاتا ہے لیکن صرف سادہ تشبیہ کے روپ میں۔ البتہ ذوق، صائب اور غنی کے ہاں جو تمثیل گوئی کا رجحان نظر آتا ہے اس کے عقب میں اخلاقیات کی کارفرمائی ہے۔ صنعت تمثیل کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ ــــــ

"شاعر پہلے ایک بات کہے اور پھر دوسرے مصرعے میں اس کا ثبوت پیش کرے"۔ ثبوت کے لفظ میں تشبیہ تمثیل کا عنصر موجود ہے۔ یہاں صائب، غنی اور ذوق کے اشعار پیش کرنے کا موقع نہیں محض ان کے تمثیلی رجحان کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ تمثیل گو شعرا کا تخیل رومانی نہیں اخلاقی ہے۔ وہ صرف ذہانت سے اخلاقی مزعومات کو خارج کی دنیا میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور بس۔ ان کا مقصد تعلیم اخلاق ہے۔ زیادہ سے زیادہ صناعانہ صورت میں جو اخلاق آموز بھی ہو اور فن کاری کا نمونہ بھی ــــ بحیثیت مجموعی اسے ہم اخلاقی تمثیل کہہ سکتے ہیں جو زیادہ منظم اور حسین شکل سپنسر کی فیری کوئین، جان بنین کی روبنسن کروسو، کیرول کی ایلس ان ونڈر لینڈ، شیلے کی پرومیتھیس ان بونڈ کیٹس کی ہائی پیرین میں نظر آتی ہے۔ عطار کی مثنوی منطق الطیر مکمل تمثیل ہے جس میں صوفیانہ تصورات و عقاید کو زیادہ سے زیادہ مجسم صورت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ چاسر کی ASSEMBLY OF FOULS بھی اخلاقی تمثیل ہے لیکن وہ اسپنسر کی FAIRY QUEEN کے حسن کو نہیں پہنچتی۔ اسپنسر کا کارنامہ دنیائے تمثیل میں بے مثال ہے اور اخلاقی تمثیل کا حسین ترین نمونہ ہے۔ فیری کوئین اخلاقیات کی کتاب نہیں ایک شعری کارنامہ ہے جس کا موضوع انسانی اخلاق و تصورات ہیں۔ اس میں فارسی اور اردو کے صوفیانہ شاعری کے عالم کی سی خوبصورتی اور کشش ہے جو بلند موسیقی سے ہم کنار ہے۔

اخلاقی تمثیل کی جو مضبوط روایت انگریزی شاعری میں ملتی ہے اردو شاعری اس سے محروم ہے۔ اٹھارھویں صدی کی عقلیت نے انگریزی ادب میں اخلاقی تمثیل نگاری کے لیے متعدد بلند مرتبہ تمثیلات کو جنم دیا۔ عقلیت کے فلسفۂ اخلاق میں فطرت کا عمل بنیادی اور فیصلہ کن ہے جو کائنات کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ اخلاقی تمثیلیت اسی نظریۂ فطرت سے وابستہ ہے اور پوپ، ڈرائیڈن، گولڈ اسمتھ اور جانسن کے کارناموں میں مختلف اسالیب میں جلوہ نما

ہوا ہے۔ اخلاقی تمثیل رومانوی تحریک شعر میں بھی دخیل ہے اور شیلے کی پرومیتھیس ان بونڈ اس کے بنیادی تصوراتِ حیات کی عکاس ہے۔ لیکن یہاں اخلاقیات کا تصور نئے ادب میں جلوہ گر ہوا ہے۔ اب اس کی نوعیت عقلیتی کی بجائے رومانوی ہو گئی ہے، اور اس کا گہرا رشتہ رومانوی نظریۂ حیات سے استوار ہو چکا ہے۔ یہ رومانوی نظریۂ حیات اُردو شاعری میں بیسویں صدی کے آغاز میں منعکس ہونا شروع ہوا اور اقبال اور جوش کی نظموں میں اس کے خدوخال صاف نظر آتے ہیں۔ لیکن اقبال اور جوش کے یہاں تمثیل کا عنصر نمایاں نہیں وہ تشبیہ کی سرحدت آگے نہیں بڑھتا۔ ندیم کا رومانوی تخیل تشبیہ سے گزر کر تخیل کی سرحد میں داخل ہوتا ہے۔ "قانونِ قدرت" اس رومانوی تمثیل نگاری کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ ندیم کے رومانی تخیل نے پنجاب کے دیہات کی فضا میں رومانیت کے پھول کھلائے ہیں۔ یہ اس کی انفرادیت کا مظہر ہے اور اس انفرادیت کا بہترین پہلو رومانی تمثیل بن کر ہمارے سامنے آیا ہے۔ میر حسن کی طرح ندیم کے تخیل نے روشنی و سایہ کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور ان کے بدلتے رنگوں سے نظم کا پیکر اُبھارا ہے۔ نظم میں تمثیل کی بنیاد کائنات کے سکون و حرکت پر رکھی گئی ہے۔ وجود کے سکون اور حرکت (حرکت و احساس) سے متماثل ہو۔ جیسے کائنات میں مظاہر کے باہمی عمل و تاثر سے سکون اور حرکت ظہور پاتے ہیں؛ یوں ہی انسان کا دل بھی سکون و حرکت سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس کے نور و ظلمت کے ظہور میں انسانی حسن کا ہاتھ کارفرما ہے۔

بدمست پنگھٹ والیاں جن کے گالوں کو تپتی تپتی جالیاں چومتی ہیں، جن کے سینے چھلکتے میکدے ہیں اور ہونٹ پیالوں کے لب۔ ٹخنوں پہ بجتی ہوئی جھانجھنیں ہیں، جن کے گاگروں کی چھاؤں اپگڈنڈیوں کے اس طرف رقص میں ہے جن کی زلفیں گھٹاؤں کی طرح اور آنکھیں ستاروں کی طرح ہیں، چلن ہواؤں کی طرح اور رنگت شراروں کی طرح ہے۔ یہ حسن سادہ کے پیکر دل کی تاریک کائنات میں اُجالا کرتے ہیں۔ یہ اُجالا دن کے آب ے کی طرح محدود زماں ہے۔ اُجالے کے بعد اندھیرا چھا جاتا ہے جب یہ چلتی پھرتی بجلیاں گلیوں میں چھپ جاتی ہیں اور یوں "قانونِ قدرت" اپنا اٹل اور یکساں عمل دہراتا اور ہمیں اندرونی وحدت کا احساس دلاتا ہے۔

قانونِ قدرت میں وحدت کثرت کے روپ میں جلوہ دکھاتی ہے۔ ندیم کے تخیل نے روشنی و سایہ کے پس منظر میں تمام کرداروں کو دیکھا ہے اور نظم کا منظر اُبھارا ہے۔ اس کا تخیل تین اہم اور بنیادی حواس سے کام لیتا ہے، باصرہ، سامعہ اور لامسہ۔ ان تینوں کے باہمی عمل سے ندیم کے رومانوی مشاہدہ اور احساس کے تال میل سے ایک ایسی دنیا تشکیل پاتی ہے جو فطرت کی تمثیل بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ نظم میں شروع سے لے کر آخر تک نگاہ، سامعہ اور لامسہ کے لیے پورا سامانِ لذت مہیا کیا گیا ہے۔ پہلے شعر میں نظر تاریکی سے دوچار ہوتی ہے ؎

گلیوں کی شمعیں بجھ گئیں اور شہر سونا ہو گیا
بجلی کا کھمبا تھام کر بانکا سپاہی سو گیا

تاریکی اور اس سے پیدا ہونے والی فضا اپنا مکمل تاثر پیش کر رہی ہے۔ باصرہ کے بعد دوسرے شعر میں سامعی تخیل کی کارفرمائی نظر آتی ہے: "اک دھیمی دھیمی تان میں گانے لگیں خاموشیاں"، خاموشیوں کی دھیمی آواز شاعر کے مشاہدے کی گہرائی کا ثبوت ہے۔

آگے چل کر تیسرے، اور چوتھے شعر میں مشرق کے پربت سے یک بیک گھٹائیں اُبھرتی اور بے خود ہوئیں انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہیں چھم چھم پھواروں کی جھڑی میں 'پھر سماں' تخیل کا اعجاز نظر آتا ہے۔ یہ منظر یکایک بدل جاتا ہے اور تاریکی کی بجائے تاروں پر جوبن آجاتا ہے اور بادل گم ہوجاتے ہیں۔ یہی "قانونِ قدرت" ہے جو پردوں میں چھپ بیٹھا ہے اور دل کی دنیا میں اپنا عمل جاری رکھتا ہے۔ یہ عمل احساس کا ہے جو چنگاریوں کی سی حدت کا حامل ہے۔ یہ روشنی اور حدت پنگھٹ والیوں کے نظر آنے سے پیدا ہوئی ہے جن کے حسن میں فطرت کا حسن سمو دیا گیا ہے۔ یہاں بھی گھٹائیں ہیں اور شرارے۔ یہاں بھی چال ہواؤں کی سی ہے اور رنگت شراروں کی سی۔ گاگر کی چھاؤں یہاں رقص کرتی ہے۔ ان کا ہنسنا ہنسانا بے سبب انسان کے دل میں بیداری کی انگڑائیاں پیدا کردیتا ہے اور اس کی دھڑکنوں پر طوفان کا گمان ہونے لگتا ہے لیکن یہ بھی کچھ دیر کے بعد گلیوں میں چھپ جاتی ہیں اور ...... پر تاریک راتوں کا سماں طاری ہوجاتا ہے۔

ندیم کی اس نظم میں موسیقی احساس کا لازمی جزو بن گئی ہے۔ بحر کے انتخاب ہی میں ایک بڑھتا ہوا آہنگ ہے جو فطرت کے مدوجزر کا ساتھ دیتا نظر آتا ہے۔ انتخاب الفاظ کے سلیقہ پر حسن تکرار مستزاد ہے جو احساس اور تخیل کو جذب و تاثر مہیا کرتا ہے۔ اس جذب و تاثر سے ایک چکا چوند پیدا ہوتی ہے جو فطرت کے مظاہر کے عمل کی یاد دلاتی ہے اور تمثیل کا حسن رکھتی ہے۔ انسانی تصور میں جزئیات کا حسن مکمل اور انوکھا ہے جو ندیم سے پہلے اور کسی شاعر کے حصہ میں نہیں آیا۔ یہ فطرت کے سادہ حسن کی تصویر ہے جس میں کئی رنگ ہیں۔ تناسب اور ترتیب سے ملتے ہوئے نظم میں یہ رنگ حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ متحرک فلم کی طرح۔ گھٹائیں۔ ہوائیں، شرارے، رقص میں لکھن سے پاؤں، رقص کرتی ہوئی گاگر کی چھاؤں یکے بعد دیگرے پردۂ فلم پر متحرک حسن دکھا کر گزر جاتے ہیں۔ لیکن ان کا تصور نگاہوں میں تادیر قایم رہتا ہے اور حافظے کا ابدی حصہ بن جاتا ہے۔ ندیم کا تخیل حرکی ہے۔ اس پر مووی کیمرے کی سی بے قراری بھی ہے اور وسعت تناظر بھی۔ لیکن حرکت کے ساتھ ساتھ سکون بھی اپنا تاثر دکھاتا ہے۔ سکون جو اندھیرے سے وابستہ ہے۔

"قانونِ قدرت" میں شاعر نے ایک ایسی بحر استعمال کی ہے جسے ہمارے شعراء نے شاذونادر ہی برتا ہے۔ بحر رجز (مستفعلن مستفعلن) مستفعلن مستفعلن حرکت اور سکون کے ALTERNATION کو اس طرح بروئے کار لاتی ہے کہ دونوں طبعی اصولوں کو مادے اور ذہن کی ہم سفری کا مظہر بنا دیتی ہے۔ اور یہی ہم سفری نظم کے تمثیلی پہلو کو استحکام بخشتی ہے۔

"قانونِ قدرت" کا شعری ڈکشن رومانوی آزادہ روی کی نشان دہی کرتا ہے۔ رومانوی آزادہ روی غزل کے لفظی TABOOS سے انحراف کرکے ایسے الفاظ کو موزوں سمجھتی ہے جو شعری فضا اور ماحول سے فطری مطابقت رکھتے ہوں وہ غزل پسندوں کی نظر میں کتنے ہی RUGGED غیر شاعرانہ اور بھونڈے ہوں ان کی واحد وجہ جواز نظم کی SETTNG اور کرداروں کا فطری ہونا ہے۔ اس نظم کے کردار چوپانی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں اشیا بھی (گلیوں کی شمعیں، رنگین دیواریں، مشرقی پربت کی گھٹائیں) کرداروں کی حیثیت رکھتی ہیں) بجلی کا کھمبا، بانکا سپاہی، بوڑھے، کھاٹ، بکتے بجے، لکھن، جھانجھنیں شعری ڈکشن کے ایسے اجزاء ہیں جو نظم کے ماحول سے براہِ راست رابطہ قایم رکھے ہوئے ہیں۔

نصراللہ خاں

قاسمی صاحب بحیثیت کالم نگار

درمیانہ قد۔گھنگھریالے بال۔گہری آنکھیں۔آنکھوں پر چشمہ۔کلین شیو۔کبھی سوٹ بوٹ میں اور کبھی شیروانی میں کسی زمانے میں گرمیوں کے موسم میں سولا ہیٹ لگایا کرتے تھے۔یہ جو کچھ بھی ہیں اور یہ جیسے بھی ہیں۔یہ اپنے احمد ندیم قاسمی صاحب ہیں۔ان کا باطن ویسا ہی پاک صاف ہے جیسا ان کا ظاہر ہے۔یہ شاعر بھی ہیں۔ادیب بھی ہیں صحافی بھی ہیں۔افسانہ نگار بھی ہیں۔اور مزاح نگار بھی ہیں۔شاید کسی نے قاسمی صاحب کے بارے ہی میں یہ کہا ہے ع

ہر فن میں ہیں یہ طاق انھیں کیا نہیں آتا

میں قاسمی صاحب کو اُس زمانے سے جانتا ہوں جب میں طالب علم تھا۔اور قاسمی صاحب کو طالب علمی سے فارغ ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا۔میں نے ان سے ان کا کلام گورنمنٹ کالج کے مشاعروں میں سُنا ہے۔اور اس زمانے میں بھی ان کی شاعری کی پنجاب میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔اور نوجوان ہونہار شاعروں میں فیض اور حفیظ ہوشیارپوری اور قاسمی صاحب ساتھ ساتھ آئے تھے۔یوں بہت سی محفلوں میں میرا قاسمی صاحب کا آمنا سامنا ہوتا رہا۔لیکن باقاعدہ ربط اور میل ملاپ پاکستان کے قیام کے بعد ہی ہوا۔ویسے قاسمی صاحب کی شخصیت اس زمانے کے ادیبوں اور شاعروں کی طرح کوئی ڈرامائی شخصیت نہیں تھی۔جیسے منٹو مرحوم اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی شخصیتیں تھیں۔اس زمانے میں جو بھی نئی شخصیت اُبھرتی تھی وہ ایک دھماکے سے اُبھرتی تھی اور اس کی تحریروں اور تقریروں میں بڑی چونکا دینے والی باتیں ہوتیں۔قاسمی صاحب میں سب کچھ تھا۔بس ایک بناوٹ ہی نہیں تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کی طرح بڑی تیزی سے نہیں اُبھرے۔اپنی فطرت کے مطابق ہیج سہج علمی و ادبی حلقوں میں چھائے ہیں۔

قاسمی صاحب کے زمانے میں مختصر افسانے کا دور شروع ہو چکا تھا۔وہ خود بھی افسانہ لکھتے تھے۔پھر جب منٹو نے مختصر افسانہ لکھنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ افسانہ چیزے دیگر است۔اس ظالم نے افسانے کی دنیا ہی بدل ڈالی۔قاسمی صاحب یہ ضرور سوچتے ہوں گے کہ منٹو کے عہد میں افسانہ نگاری لاحاصل ہے۔یا تو منٹو کی طرح افسانہ لکھا جائے اور یا پھر یہ سلسلہ ہی ختم کر دیا جائے۔منٹو اس زمانے میں بمبئی میں تھا۔اس کی نظر سے قاسمی صاحب کا ایک افسانہ گذرا۔اس نے قاسمی صاحب کو ایک

خط لکھا اور اس افسانے کی بے پناہ تعریف کی اور جب وہ لاہور آیا تو اُس نے قاسمی صاحب کے نہ صرف اس افسانے بلکہ ان کے اور بہت سے افسانوں کی تعریف کی۔ قاسمی صاحب منٹو کے مزاج سے واقف تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ منٹو بے جا تعریف نہیں کیا کرتا۔ جب منٹو سے قاسمی صاحب کی دوستی ہوگئی تو ان کے افسانوں میں نئی زندگی پیدا ہوئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قاسمی صاحب افسانہ نگاری میں منٹو اسکول کے ہو کر رہ گئے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ منٹو نے قاسمی صاحب کا حوصلہ بڑھایا اور وہ اپنے انداز میں بہتر سے بہتر افسانے لکھنے لگے اور ان کا شمار برصغیر کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہونے لگا۔

مجھے یہاں قاسمی صاحب کی صحافت کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔

قاسمی صاحب کی صحافت کا آغاز روزنامہ انقلاب سے ہوا ان کی سیاسی نظمیں اس زمانے میں (یہ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۶ء کا زمانہ ہے) نہ صرف روزنامہ انقلاب کے سرورق پر بلکہ روزنامہ زمیندار کے سرورق پر بھی شایع ہوا کرتی تھیں اور یہ بھی بہت بڑی بات تھی، کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو روزناموں کے مدیر نامی گرامی شعرا اور اساتذہ ہوا کرتے تھے۔ اس لیے ایک نوعمر شاعر کا کلام کسی روزنامے کے سرورق پر شایع ہونا واقعی بڑی بات تھی۔ روزنامہ انقلاب کے مدیر سالک و مہر تھے۔ اور ان کے بعد روزنامہ انقلاب میں قاسمی صاحب ہی سب کچھ تھے۔ وہ اداریے بھی خوب لکھتے تھے کبھی کبھی ان کے مزاحیہ کالم بھی شایع ہوتے۔ اگرچہ قاسمی صاحب نے باقاعدہ مزاح نگاری روزنامہ امروز سے شروع کی ہے لیکن اس سے پہلے ہی مختلف اردو رسایل اور اخبارات میں ان کے مزاحیہ اور ہلکے پھلکے طنزیہ مضامین شایع ہوتے رہتے تھے ــــــ منٹو مرحوم میرا ہم مدرسہ تھا۔ اور میرے والد کا عزیز ترین شاگرد تھا۔ اس کی ادبی اور علمی تربیت میں جہاں میرے والد کا ہاتھ ہے وہاں ہمارے استاد رانا مبارک مند خاں سالک صہبائی، مرحوم (جو اسلامیہ ہائی اسکول خزانہ گیٹ لاہور میں تقسیم کے بعد ملازم ہو گئے تھے) اور امرتسر کے مشہور شاعر آغا حشر کاشمیری مرحوم کا بھی تھا جو منٹو کے ساتھ ہی بمبئی چلے گئے تھے۔ منٹو قاسمی صاحب کا بڑا احترام کرتا تھا اور اکثر یہ کہتا تھا کہ اگر قاسمی شریف آدمی نہ ہوتا تو یہ غضب کا آدمی ہوتا۔ وہ اپنے پیرزادگی کے خول میں سے جھانک کر معاشرے کا جو حال دیکھ لیتا ہے اُسے وہ کمالِ جراُت سے لکھ دیتا ہے۔ لیکن جب کچھ ایسے حالات ہوتے ہیں کہ خول میں سے نکل کر حالات میں گھلنے ملنے کی ضرورت ہوتی ہے تو یہ خول میں واپس چلا جاتا ہے۔ اسے بزرگوں نے جو گھٹی پلائی ہے اس کا اثر کسی طرح بھی زائل نہیں ہوتا۔ جب منٹو نے بہت سی شخصیتوں کا اپنے قلم سے ایکس رے کیا تو کسی نے کہا ــــ

تم نے قاسمی صاحب کو کیوں چھوڑ دیا۔

منٹو نے کہا۔ تم ہی بتاؤ کہ کوئی قاسمی صاحب پر کیا لکھے؟ ــ بس ان پر یہی لکھا جا سکتا ہے کہ قاسمی بڑا شریف آدمی ہے۔ بڑا شریف آدمی ہے۔ بڑا شریف آدمی ہے ــ

قاسمی صاحب کی کالم نگاری

قاسمی صاحب کے کالموں میں ان کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔ غالب کو دیکھنا ہو تو غالب کے خط پڑھ لو ــ اور اگر قاسمی صاحب سے ملاقات کرنا چاہو تو قاسمی صاحب کے کالم پڑھو ــ یہ وہ قاسمی صاحب نہیں ہیں جو شاعری اور افسانوں میں ہیں ــ شاعری اور افسانوں میں تو انھیں بڑی محنت کرنا پڑتی ہے اور بہت دُکھ اُٹھانے

پڑتے ہیں ۔یہاں وہ خوب ہنستے ہنساتے اور قہقہے لگاتے ہیں اور یہ لگتا ہی نہیں ہے کہ یہ وہی شاعر قاسمی اور افسانہ نگار قاسمی ہے ۔ان کے مزاح میں کلیوں کی چٹک ہے ۔پھولوں کی خوشبو ہے ۔وہ کسی کا دل نہیں دکھاتے ۔۔ وہ آنسو پی کر مسکراتے ہیں ۔۔یہی وجہ ہے کہ اُن کی طنز میں تلخی نہیں ہوتی ۔ان کا مزاح بھی ایک بھلے آدمی کا مزاح ہے۔ وہ اپنے مزاح کا خود ہدف بنتے ہیں ۔مزاح اور پھکڑپن میں ایک باریک سا فرق ہے ۔

قاسمی صاحب بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں ۔ان کا مزاحیہ کالم شروع سے آخر تک پڑھتے جایئے، ہنسی کے ہلکے پھلکے فوارے چھوٹتے رہیں گے ۔۔وہ ہر موضوع پر لکھتے ہیں ۔اور ہر رنگ میں لکھتے ہیں ۔زبان اور ادب کی چاشنی سے اُن کی یہ تحریریں جہاں صحافت کا حصہ ہیں وہاں وہ ادب میں بھی شامل ہیں ۔قاسمی صاحب ایسے ادیب صحافی اب بہت کم رہ گئے ہیں ۔ان میں سے بعض خالص ادیب ہیں ، اور بعض خالص صحافی ۔۔

قاسمی صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے صحافت سے ادب کا رشتہ قایم رکھا ہے ۔اور انہی لوگوں سے اردو صحافت کی آبرو قایم ہے ۔قاسمی صاحب مزاح سے اپنی تفتیش کا کام لیتے ہیں ۔قاسمی کی ہنسی عام مزاح نگاروں کی طرح خود پسندی کی ہنسی نہیں ہے ۔وہ انسان کو کائنات میں رکھ کر دیکھتے ہیں اور پھر دلوں پہ ہنستے ہیں اور ہنساتے بھی ہیں ۔۔ وہ اگر معاشرے اور از کار رفتہ قدروں پر ہنستے بھی ہیں تو خود کو ان میں رکھ کر اپنی ہنسی اڑاتے ہیں ۔۔ اور اپنے اوپر ہنسنا اور اپنی ہنسی اڑانا طنز کی معراج ہے ۔ یہ کام قاسمی صاحب ایسا ہی دل گُردے کا آدمی کر سکتا ہے ۔

قاسمی کی شاعری کا فکری پس منظر

(صفحہ ۴۴۸ سے آگے)

خارج کے RHYTHM سے ہم آہنگ نہیں ہوپاتا ۔یوٹوپیا، میری زمین، انفرادیت، صحرائے لیبیا، نا تمام، تاریخ کی آواز، طلوع، معراج ادھیراج، آزادی کے بعد، جبر و اختیار، انسان عظیم ہے خدایا، انسانیت، ارتقا، نیا ایشیا غم وطن میں قاسمی نے جہاں اقبال کے جذبے کو پالیا ہے وہاں اپنے دور کے مخصوص عملِ تنفس کو بھی ۔

یہ مطالعہ بنیادی طور پر "شعلۂ گل" تک کے دور کا احاطہ کرتا ہے ۔"شعلۂ گل" سے آج تک قاسمی کی فکر میں کافی تبدیلی آئی ۔۔ لیکن وہ آج بھی اپنی شرائط پر ترقی پسند ہیں اور ہندوستان میں طبع شدہ ہنس راج رہبر کی کتاب ترقی پسند تحریک ۔ایک جائزہ (۱۹۶۹ء) میں فیض اور فراق کے ساتھ وہ روشنی کی ایک ایسی تثلیث کا ایک حصہ ہیں جس سے اردو کا موجودہ ادب جگمگا رہا ہے ۔

اور اس میں کیا شک و شبہ ہے کہ آج قاسمی جیسی ہمہ جہت شخصیتیں بہت کم ہیں واقعہ ہے اور جدید اردو ادب پر کوئی گفتگو قاسمی کو بیچ میں لائے بغیر ممکن ہی نہیں ۔۔

حسن عابدی

ندیم بحیثیت صحافی

"احمد ندیم قاسمی کی صحافت" میری اس تحریر کا موضوع ہے۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ موضوع کی نسبت سے عبارت بھی صحافیانہ ہو۔ میرا مطلب ہے سطحی اور سرسری، اگرچہ میں صحافیہ نہ تحریر کو پایۂ اعتبار سے گری ہوئی چیز نہیں سمجھتا۔ یہ اور بات کہ ادبی جرائد میں ایسی تحریروں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ بہر حال اس اعتراف عجز کے ساتھ میں کچھ باتیں اُس احمد ندیم قاسمی کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں، جسے میں نے گھر اور دفتر میں بطور ایڈیٹر کام کرتے دیکھا ہے۔

برصغیر میں جلیل القدر مدیرانِ جرائد کے نام کے ساتھ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، مولانا چراغ حسن حسرت، قاضی عبد الغفار اور مولانا غلام رسول مہر کے نام ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ میرا ارادہ نہ تو احمد ندیم قاسمی کو ان بزرگوں سے ٹکرانا ہے اور نہ ان سے بڑا یا ان میں سے کسی ایک کے پایے کا خبر نویس ثابت کرنا ہے۔ کیونکہ خود قاسمی صاحب نے کچھ تو اپنے طبعی انکسار کی بنا پر اور کچھ اس احساس سے کہ ان کا اصل مقام صحافت سے ماورا بھی ہے، کبھی اُن بزرگوں کے ساتھ اپنا قد ناپنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ قاسمی صاحب میں فکری اور اظہار و بیان کی بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ وہ بہت بڑے صحافی نہ سہی، لیکن اپنی ذات میں یکتا ہیں۔ ان کے یہاں مولانا جوہر کی شعلہ بیانی، مولانا مہر کا جوشِ استدلال یا مولانا ظفر علی خاں کی سی پُرگوئی نہ سہی، لیکن مجھے اس حسارت کے لیے معاف فرمائیں کہ ان کے معاصرین میں سے کون ہے جو بیک وقت افسانہ نگار، غزل گو، جدید نظموں کا خالق، ادب کا نباض و نقاد اور اخبارات میں خبر نویس، اداریہ نویس اور فکاہی کالم نویس اور اس سے بھی آگے، ریڈیائی ڈرامے، ٹیلیویژن اور فلم کے مسودوں کا خالق و مرتب ہو۔ اظہار و بیان کے جتنے قرینے اب تک وضع ہو سکے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاسمی صاحب ان سب پر قادر ہیں۔ آپ ان کے دلائل سے انکار اور ان کی صحت سے اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ فکر کی ژولیدگی، اظہار و بیان کی بے بضاعتی یا کم حوصلگی میں کبھی مبتلا نہیں ہوتے۔ اُن کے سیاسی، ادبی اور تہذیبی عقائد بڑے واضح، صاف ستھرے اور نپے تلے ہیں اور قاسمی صاحب ان کے اظہار میں کبھی عاجز نہیں ہوئے۔ وہ بے تکلف لکھتے ہیں۔ بے تکان لکھتے ہیں اور مہینوں کا کام دنوں میں نہیں بلکہ گھنٹوں میں نبٹانے کے عادی ہیں۔ ان کی بشاشت کی گہری شکنیں بعض اوقات اس تکان کا احساس دلاتی ہیں جو اُن پر گذر چکی، لیکن

کی حاضر دماغی، خوش کلامی اور بذلہ سنجی مخاطب کو قائل کر لیتی ہے کہ قاسمی صاحب تھکنے والے آدمی نہیں۔ اس طرح، پیشانی کی شکنیں کبھی اُن کی تحریر میں نمایاں نہیں ہوئیں۔

۱۹۵۵-۵۶ء کی بات ہے۔ اُن دنوں قاسمی صاحب امروز لاہور کے ایڈیٹر ہوتے تھے۔ میں امروز کے لیے محنت کشوں کی سرگرمیوں کا خبرنامہ مرتب کر کے قاسمی صاحب کے پاس لے جاتا، اور وہ اسے چھاپ دیتے۔ مزدوروں کا بھلا تو خیر کیا ہوتا ہوگا، مجھے اپنی مزدوری سات روپے کالم کے حساب سے مل جاتی۔ شاید اس لیے کہ قاسمی صاحب نوآموز لوگوں میں خود اعتمادی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان دنوں بھی میری ٹوٹی پھوٹی عبارت میں کوئی ترمیم نہیں کرتے تھے۔ انھیں دنوں ایک اخبار میں ملازمت کا امکان پیدا ہوا تو میں اپنے دوست حمید ہاشمی مرحوم کو ڈھال بنا کر قاسمی صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ اُن دنوں نسبت روڈ پر دیال سنگھ لائبریری کے عقبی مکان میں رہتے تھے۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا اور کہا، اُن کے یہاں ملازمت کی شرط یہ ہے کہ پہلے کہیں کام کیا ہو۔ لیکن میں نے تو اس سے پہلے کسی اخبار میں ملازمت نہیں کی۔ میں آپ سے کیسے کہوں، ایک جھوٹا سرٹیفکٹ دے دیں۔ (حالانکہ صاف مطالبہ یہی تھا کہ دیر نہ کریں، دے دیں) قاسمی صاحب نے اپنی روایتی حلیمی اور شفقت سے کہا، کوئی بات نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کام کر سکتے ہیں۔ اس لیے اتنا لکھ دینے میں کوئی حرج نہیں۔ مجھے یہ خوشی ہے کہ بعد میں، میں اُن کے اعتماد پر پورا اُترا۔

کچھ عرصے بعد مجھے قاسمی صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُن کی صحت کچھ اچھی نہیں رہتی، لیکن میں نے اُنھیں انتہائی صابر اور سخت کوش پایا۔ اخبار کے دفتر میں آنے والے دوستوں، عزیزوں، خبر نگاروں، مقالہ نویسوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور ہر طرح کے پرسانِ حال کا تانتا بندھا رہتا۔ قاسمی صاحب ان سب کو خوش آمدید کہتے لیکن جوں جوں وقت گذرتا اور کاتب کا تقاضہ شدت اختیار کرتا، ان کی مسکراہٹ پھیکی پڑتی جاتی۔ جیسے زوال کے وقت خاکستری دیوار پر دھوپ کا رنگ پھیکا پڑنے لگتا ہے۔ ایسی شہید مسکراہٹ میں نے بہت کم دیکھی ہے۔ بعض دفعہ وہ میز پر دھرا ہوا اپنا ہاتھ اُٹھا کر کرسی سے نیچے لٹکا دیتے تاکہ پاس بیٹھے ہوئے لوگوں پر اُن کے مزاج کا اضطراب اور ہاتھوں کی کپکپاہٹ ظاہر نہ ہو، لیکن اس کرب کے عالم میں بھی ان کے لہجے میں ناگواری اور تپاک میں کمی پیدا نہ ہوتی۔ اور جوں ہی تھوڑی سی یکسوئی ملتی وہ تیزی سے لکھنا شروع کر دیتے۔ میں نے قاسمی صاحب کی ماتحتی میں کام نہیں کیا اس لیے خود کو اس سعادت کا اہل نہیں پاتا کہ ان کے دفتری معمولات اور صحافتی خدمات کو پورے وثوق سے بیان کر سکوں، یہ منصب تو ان کے رفقا کو حاصل ہے، تاہم میں نے تو یہ دیکھا کہ وہ صبح اُٹھ کر تین چار اخبارات جلدی جلدی پڑھ لیتے اور تقریباً دس بجے جب دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلتے تو پنج دریا کا فکاہی کالم ان کے تھیلے میں ہوتا۔ سہ پہر تک وہ اپنے دفتری معمولات سے فارغ ہو جاتے، حالانکہ اس دوران میں بہت سے مضامین کی قطع و برید اور اکثر اوقات افسانے غزل اور ادبی ایڈیشن کے مواد کی تدوین بھی انھیں کے ذمے ہوتی تھی۔ انھوں نے کبھی کام کو اپنے اوپر سوار نہیں کیا، اتنا کچھ کرنے کے باوجود وہ بالکل ہلکے پھلکے ہو کر اُٹھتے اور خود کو تخلیقی کاوشوں کے لیے تازہ دم پاتے۔ ہمارے درمیان ایسے صحافیوں کی تعداد کچھ کم نہیں، جنھوں نے اپنے کیریئر کا آغاز ایک شاعر یا افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا تھا لیکن صحافت نے ان کے اندر کے شاعر یا افسانہ نگار کو جذب کر کے کالم نویس یا اداریہ نویس بنا دیا۔ کچھ ایسے ارباب فن بھی

جنھیں صحافت اپنے اندر جذب نہ کر سکی۔ یہ سخت جان صحافت کے کوچے سے ٹہلتے ہوئے باہر نکل آئے اور اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں گم ہو گئے۔ لیکن صحافت ــــ شاعر اور افسانہ نگار ندیم کا کچھ نہ بگاڑ سکی، یہ تو ممکن ہے کہ صحافتی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہونے کی صورت میں وہ ادبی تخلیقات میں کچھ اور گراں قدر اضافے کرتے، لیکن انھوں نے اپنی تخلیقی لگن، مسلسل کاوش اور نئے نئے تجربوں کی بدولت کبھی یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ صحافت کے زخم خوردہ ہیں یا صحافت کی گراں باریوں کے باعث اپنے جذبۂ تخلیق کے آگے شرمندہ ہیں۔ انھوں نے صحافت کو بھی اپنی تخلیقی سرگرمیوں کا ایک ضروری حصہ بنا لیا، اور اظہار کا ایک ایسا ہی موثر ذریعہ سمجھ کر برتا جیسے یہ شاعری یا افسانہ نگاری ہو۔

قاسمی صاحب نے بہت ریاض کیا ہے۔ یہ جوان کی تحریر میں بے ساختگی اور روانی پائی جاتی ہے، یہ سالہا سال کی شب بیداری اور مشق تحریر کا عطیہ ہے۔ ان کے استدلال کی تندی، ان کے طنز کی کاٹ، ان کے مزاح کی دلآویزی اور عبارت کا مجموعی حسن، یہ سب کچھ اس مسلسل فکر اور خامہ فرسائی کا حاصل ہے۔ جس کا تصور بھی ہمارے جیسے سہل پسندوں کو تھکا دینے کے لیے کافی ہے۔ اور ان سب کی تہہ میں انسانیت سے محبت اور احترام کا جذبہ کار فرما ہے۔ نوجوانوں سے محبت، ان پر شفقت، اُن کا "بزرگانہ" احترام اور اعتماد اور ان کی حوصلہ افزائی بھی، مستقبل پر اُن کے گہرے یقین کا پتہ دیتی ہے۔

سیاست کی طرح صحافت کے پچھلے تین چار سال بھی شدید نظریاتی معرکہ آرائیوں میں گذرے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی ہمدردیاں اس دوران میں ترقی پسند افکار کے ساتھ رہیں، لیکن انھوں نے اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور حریفوں کے خلاف اُن کے سے لب و لہجے میں گفتگو نہیں کی۔ ترقی پسند فکر کوئی جامد شے نہیں۔ خود ترقی پسند طاقتوں کے درمیان دنیا بھر میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں اور میں خود کو اس قابل نہیں پاتا کہ ان اختلافات کے درمیان کوئی فیصلہ صادر کر دوں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ جب متحدہ پاکستان میں قومیتوں کا سوال اٹھا اور صوبوں کے حقوق کے سوال نے مرکز سے "بغاوت" کا نام پایا اور مشرقی پاکستان کے خلاف "سنگین کارروائیوں" کا مطالبہ شدت اختیار کرنے لگا تو میری ہمدردیاں ان مطالبہ کرنے والوں کے ساتھ نہ رہیں اور ترقی پسندی کے نام پر صوبوں کی سرکوبی اور خوں ریزی کی بات میرے محدود علم اور شعور نے قبول نہ کی۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب احمد ندیم قاسمی کے اخباری کالموں سے میری دلچسپی کم ہوتی گئی اور میں نے محسوس کیا کہ اب ان کے دلائل میں سائنسی فکر کی بجائے جذبات کا غلبہ بڑھتا جا رہا ہے۔ مجھے علم ہے کہ قاسمی صاحب کے عقیدت مندوں کو یہ بات ناگوار گذرے گی۔ لیکن ان کا ایک ارادت مند میں بھی تو ہوں، اور جو بات مجھے بُری لگی ہے، اس کا تذکرہ کس سے کروں!

جہاں پناہ مجھے بازوؤں میں لے لیجے
مری تلاش میں ہیں گردشیں زمانے کی
جب بھی دیکھا ہے تجھے، عالمِ نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

ــــــــ ندیم

شہزاد منظر

ندیم اور ترقی پسند تحریک

احمد ندیم قاسمی اردو کے ان چند خوش نصیب ادیبوں میں سے ہیں جن کا ذکر کیے بغیر ترقی پسند ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔ وہ اگرچہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے نہیں ہیں اور نہ انھوں نے قیام پاکستان سے قبل ترقی پسند مصنفین کی تنظیم میں عملی طور پر حصہ لیا ہے اس کے باوجود وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے آغاز سے اس سے ذہنی طور پر وابستہ ہیں اور انھوں نے اپنی زندگی کی ابتدا میں ہی اس تحریک سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ احمد ندیم قاسمی کی ادبی زندگی اور ترقی پسند تحریک ساتھ ساتھ شروع ہوئی اور پروان چڑھی ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ندیم کی زندگی کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے کیونکہ ان کے فکری رجحانات کو ان کی زندگی کے پس منظر میں ہی صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں جب سجاد ظہیر، احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں اور محمود الظفر وغیرہ نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت احمد ندیم قاسمی کی عمر ۲۰ سال تھی۔

احمد ندیم قاسمی نے لڑکپن اور جوانی میں ہی انسانیت کو اپنی آنکھوں سے ذلیل و رسوا ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور انسان کی مظلومیت اور دکھ درد کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا تھا چنانچہ ان میں چھوٹی عمر سے طبقاتی شعور پیدا ہو گیا تھا اور انھیں معاشرے کے تضاد اور طبقاتی فرق نے ضرورت سے زیادہ اور وقت سے قبل حساس کر دیا تھا۔ وہ چونکہ پیروں کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے انھیں مذہب کے نام پر سادہ لوح عوام کے استحصال کا عملی تجربہ ہوا۔

ندیم قاسمی اس بارے میں لکھتے ہیں:۔

> "عمر کے ابتدائی نو برس گاؤں میں گزرے۔ پانچواں سال گاؤں کی مسجد میں قرآن مجید کا درس لیتے گزرا۔ ۱۹۲۵ء میں ابتدائی چار جماعتیں پاس کر کے اپنے چچا خان بہادر پیر حیدر شاہ مرحوم کے ہمراہ کیمبل پور چلا گیا۔ مرحوم کسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ وہاں ناز و نعم میں پالا اور آرام و آسائش سے زندگی بسر ہونے لگی، مگر اس نئے ماحول نے میری ذہنی دنیا پر بجلی گرا دی۔ دس مہینے نہایت ٹھاٹھ سے گزار کر جب میں ہر سال گاؤں میں آتا تو اچانک جیسے سدرہ کی بلندیوں سے تحت الثریٰ میں پٹخ دیا جاتا۔ حالات کا تضاد اب شدید صورت اختیار کر چلا تھا کیونکہ خام احساسات میں پختگی آ رہی تھی۔ اس عرصے میں چند عزیزوں کی ریاکاری اور ابوالعجبیوں کا سراغ ملا

ہوئے۔خیالوں میں کھوکھلی شرافت کے بھانڈے پھوٹنے لگے۔نمائشی امارت سے نفرت ہونے لگی۔"

یہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۵ء تک کے واقعات کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کی ذہنی کیفیات و احساسات کا اعتراف ہے۔اس دور سے بحث کرتے وقت ہندوستان کے مخصوص حالات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ وہ دور ہے جب سرمایہ دار دنیا عالمی کساد بازاری (گریٹ ڈیپریشن) کا شکار تھی۔سامراجی ملکوں نے اشتراکیت کی بڑھتی ہوئی یلغار کو روکنے کے لیے جرمنی اور اٹلی میں فسطائیت کو عمداً پروان چڑھنے کا موقع فراہم کیا تھا۔جرمنی میں ہٹلر نے اقتدار سنبھال لیا تھا اور دوسری عالمی جنگ کے بادل منڈلانے لگے تھے۔اسی دور میں ہندوستان میں "ہوم رول" کے لیے زبردست جدوجہد شروع ہوئی تھی جس کے نتیجہ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کا نفاذ عمل میں آیا۔اسی دور میں پنجاب، بنگال اور مہاراشٹر کے مختلف حصوں میں مارکسزم کے مطالعہ کے لیے اسٹڈی سرکلز قایم ہوئے۔اس کے ایک سال بعد کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔

احمد ندیم قاسمی کی زندگی میں نجی سطح پر دو اہم واقعات رونما ہوئے۔اوّل ۱۹۳۴ء میں ان کے محبوب چچا پیر حیدر شاہ کا انتقال ہو گیا جن کی موت سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔دوئم ۱۹۳۵ء میں بی۔اے کرنے کے بعد انھیں چار سال کا طویل عرصہ بے روزگاری میں گزارنا پڑا۔اس دور میں احمد ندیم قاسمی ترقی پسند خیالات سے کس طرح متاثر ہوئے۔زندگی کے تلخ حقایق کا کس طرح علم ہوا۔اس کا اندازہ ان کے ان تجربات اور مشاہدات سے ہوتا ہے۔جو انھوں نے اس دور میں حاصل کیے وہ اس دور کی اپنی ذہنی کیفیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "۱۹۳۵ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد پروانہ ہاتھ میں لے کر اور خاندانی سندوں کا ایک پلندہ کاندھوں پر رکھ کر اور مغربی طریقِ آداب رٹ کر میں نے ملازمت کی بھیک مانگنا شروع کی۔۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک تقریباً سارے پنجاب کے چکر لگائے۔ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری، تحصیل داری اور نائب تحصیل داری سے لے کر انجمن حمایتِ اسلام میں کلرکی تک کے لیے نت نئے ڈھنگ سے درخواستیں لکھیں۔ریفارمز کمشنر کے دفتر میں بیس روپیہ ماہانہ پر محرری کا کام کرتا رہا۔۔۔۔۔ محکمۂ پنچایت سے لے کر محکمۂ آرمی ریمائونٹ تک کے دفاتر میں میرا نام بطور امیدوار درج رہا۔ساتھ ساتھ مانگے تانگے کا لباس پہن کر ڈپٹی کمشنروں، کمشنروں اور فنانشل کمشنروں کے حضور باریاب ہوتا رہا۔ایک غلام ایک تازہ غلامی اختیار کرنے کی خاطر انتہا درجہ کی غلامانہ خدمات کا سہارا لے کر اپنے اصول کے برخلاف اور اپنی ذہنیت کے برعکس اپنے ہمدردوں کے مشورے کے مطابق جگہ جگہ دریوزہ گری کرتا پھرا۔۔۔۔۔۔ ہر جگہ ناکام ہوتا رہا اور ذہن کا زہر اُبلتا اور بکھرتا رہا۔آخر کار ۱۹۳۹ء میں ایک مشفق بھائی کیپٹن ملک امیر حیدر خاں نے بڑے جان جوکھوں کے بعد محکمۂ آب کاری میں میرا نام بطور سب انسپکٹر منظور کرا لیا۔"

مندرجہ بالا عبارت پڑھنے کے بعد احمد ندیم قاسمی کے ترقی پسند افکار و خیالات سے متاثر ہونے پر حیرت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء کا دور ہندوستان میں سیاسی بیداری کا دور تھا اور اس دور کی سیاسی اور ثقافتی

تحریکوں نے سارے ہندوستان کے دانشوروں کو متاثر کیا تھا۔ برطانیہ کی تمام تر پابندیوں کے باوجود ہندوستان میں انقلابِ روس کے اثرات مرتب ہونے شروع ہو گئے تھے جس کے نتیجہ میں ہندوستان میں مزدور تحریک نے شدت اختیار کر لی تھی اور ہندوستان کی ہر زبان کا شعر و ادب انقلابی اور ترقی پسند خیالات و افکار سے متاثر ہو رہا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اقبال، ٹیگور، نذرالاسلام اور پریم چند جیسے دانشور بھی انقلابِ روس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوئے تھے اور انھوں نے نئی سماجی تبدیلیوں کا خیر مقدم کیا تھا۔ ایسے عالم میں اگر احمد ندیم قاسمی اس دور کی سب سے بڑی ادبی تحریک سے متاثر ہوئے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ جس دور میں ندیم کی شاعری نے فکری توانائی اور فنی پختگی حاصل کی اس وقت برصغیر ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے علاوہ کوئی ایسی فکری تحریک نہ تھی جس سے وہ متاثر ہوتے۔ اس لیے ان کا ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونا فطری امر تھا۔

احمد ندیم قاسمی کے ترقی پسند ادبی تحریک سے متاثر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بنیادی طور پر ایک انسان دوست اور وطن پرست شاعر تھے اور ابتدا میں علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں اور اختر شیرانی کی شاعری اور افکار سے اثر قبول کر چکے تھے۔ اس لیے عصر کے دور میں اُن کا اقبال اور ظفر علی خاں کے اثرات سے نکل کر ترقی پسند ادبی تحریک سے متاثر ہونا فطری عمل تھا۔ ترقی پسند تحریک دراصل حالی اور اقبال کی اصلاحی تحریک کی ہی ایک نئی اور ترقی یافتہ شکل تھی۔ سر سید اور حالی کی ادبی تحریک نے نئے دور میں ترقی پسند تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی چنانچہ اس دور کے وہ تمام ادیب و شاعر جو ۱۹۳۶ء سے قبل اس تحریک سے متاثر تھے انھوں نے بعد کے دور میں ترقی پسند تحریک کو ذہنی طور پر اختیار کر لیا تھا۔ ان میں پریم چند، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، ڈاکٹر عبدالحق، مجنوں گورکھپوری، اختر حسین رائے پوری اور فراق گورکھپوری وغیرہ شامل ہیں۔ برصغیر میں اس تحریک کی مقبولیت اور ہمہ گیری کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ خود علامہ اقبال نے اس کے اغراض و مقاصد کو سراہا اور اس سے بڑی توقعات وابستہ کی تھیں۔ بعض لوگوں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ اگر علامہ اقبال چند سال اور زندہ رہتے تو وہ بھی ٹیگور اور پریم چند کی طرح اس تحریک کے سرپرستوں میں شامل ہو جاتے۔

ندیم نے اس عہد میں شاعری شروع کی جب برصغیر سیاسی اور فکری انقلابات سے دوچار تھا اور سیاست کی طرح ادب و ثقافت میں بھی انقلاب آفریں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور برصغیر میں دو تحریکیں بیک وقت پروان چڑھ رہی تھیں ـــــ ایک قوم پرستی اور دوسری سوشلزم کی تحریکیں۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ دونوں تحریکیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئی تھیں چنانچہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں جب برصغیر میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو ندیم نے اس تحریک کو فکری طور پر قبول کر لیا۔ کیونکہ اُن کا ذہن پہلے ہی اُس کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ انھوں نے ترقی پسند مصنفین کا منشور فی الفور قبول کر لیا اور اس تحریک میں شمولیت کے بعد ان کے اندر ایک نئے شاعر نے جنم لیا۔

یہ ۱۹۳۶ء کا وہ انقلاب آفریں دور تھا جب برصغیر میں آزادی کی جنگ شباب پر تھی۔ قوم پرستی اور اشتراکیت کا نظریہ بے حد مقبول تھا اور ادیبوں اور شاعروں سے بھی اُن کے سماجی فرائض ادا کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ ایسے موقع پر ہندوستان کے ترقی پسند دانشوروں نے پہلی بار ادب کی سماجی افادیت اور ادیبوں کی ذمہ داری پر زور دیا اور شعر و ادب میں عوام کی زندگی، ان کے مسائل اور اُن کے دُکھ سکھ کی سچی عکاسی کا مطالبہ کیا۔ اسی دور میں ترقی پسند دانشوروں کا یہ بہت

بڑا کارنامہ تھا کہ انھوں نے برصغیر کی تمام بڑی اور اہم زبانوں کے ادیبوں اور مصنفوں کو انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیرِ پرچم منظم کیا اور ہندوستانی دانشوروں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سیاسی قیادت اور عوام کی باگ ڈور برصغیر کی دو سب سے بڑی سیاسی جماعتوں کانگریس اور مسلم لیگ کے ہاتھ میں رہی۔

آزادی سے قبل انجمن ترقی پسند مصنفین ایک وسیع پلیٹ فارم تھی جس میں مختلف مکتبۂ فکر کے ادبا چند بنیادی اصولوں اور مقاصد کے تحت متحد تھے۔ ان میں اکثریت ایسے ادیبوں کی تھی جنھوں نے ترقی پسندی اور سوشلزم کو ایک نظامِ فکر کے طور پر قبول کیا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک ایک نظامِ فکر کے بجائے ایک سیاسی جماعت کے پروگرام کے مترادف ہو کر رہ گئی اور فکری تنگ نظری اور انتہا پسندی کے دور میں ترقی پسند ادبی تحریک پر ایک مخصوص سیاسی جماعت نے عملی طور پر تسلط جما لیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین میں ابتدا سے اشتراکی ادیب و دانشور شامل تھے۔ لیکن انجمن ترقی پسند مصنفین کبھی اشتراکی ادیبوں کی انجمن نہیں تھی اور نہ اس کے منشور اور اغراض و مقاصد میں اشتراکیت کا قیام شامل تھا۔ جو لوگ انجمن کے پہلے منشور کے متن سے واقف ہیں وہ یقیناً مجھ سے اتفاق کریں گے۔ اس وقت مختلف مکتبۂ فکر کے ادبا و شعرا اس میں شامل تھے اور ان کا صرف ایک مقصد تھا اور وہ تھا وطن کی آزادی اور ایک ایسے معاشرے کا قیام جس میں سماجی انصاف، معاشی مساوات اور عوامی جمہوریت کی ضمانتیں حاصل ہوں۔ چنانچہ اس میں ترقی پسند مسلم لیگی بھی تھے اور کانگریسی، سوشلسٹ اور کمیونسٹ بھی۔

آزادی کے بعد ترقی پسند ادیبوں نے اپنے وطن میں جو کچھ دیکھا وہ اس سے قطعی مختلف تھا جس کا انھوں نے آج تک خواب دیکھا تھا۔ ادیبوں کی اکثریت نے آزادی کا جو تصور قائم کیا تھا اس میں سماجی انصاف، معاشی مساوات اور آزادیٔ افکار کے عناصر شامل تھے۔ انھیں یقین تھا کہ پاکستان کے قیام کے بعد ایک ایسا معاشرہ قائم ہوگا جو جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی لوٹ کھسوٹ اور طبقاتی استحصال سے پاک ہوگا اور جہاں تمام مسلمان سماجی طور پر یکساں اور مساوی حیثیت کے مالک ہوں گے۔ لیکن قیامِ پاکستان کے چند برسوں بعد ملک کا اقتدار جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور اس کے گماشتہ سیاست دانوں اور نوکر شاہی کے ہاتھوں میں آگیا۔ اسلام کے نام پر حاصل کیے ہوئے ملک میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو گیا اور اسے نہایت بے شرمی کے ساتھ اینگلو امریکی سامراج کا تابع بنا دیا گیا۔

عین اس موقع پر ۱۹۴۸ء میں بین الاقوامی سطح پر روس کے مشہور نظریہ داں ژدانوف نے اور ہندوستان اور پاکستان کی سطح پر بی ٹی رن دیو اور سجاد ظہیر نے اشتراکی انقلاب کی آواز بلند کی۔ یہ وہ دور تھا جب دنیا دوسری عالمی جنگ کے بعد واضح طور پر دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ روس اور مشرقی یورپ کی اشتراکی مملکتیں ایک طاقتور بلاک کے طور پر نمودار ہوئی تھیں اور انقلابِ چین نے جنوب مشرقی ایشیا میں انقلاب کی لہریں دوڑا دی تھیں، جس سے اینگلو امریکی سامراج سخت پریشان تھا۔ ژدانوف نے اشتراکی انقلاب کی جو تھیسس پیش کی تھی اس میں یہ دلیل پیش کی گئی تھی کہ دنیا چونکہ دو حصوں میں بٹ چکی ہے اس لیے نو آبادیاتی اور نیم نو آبادیاتی ملکوں کے عوام کو چاہیے کہ وہ انقلاب کے لیے جدوجہد شروع کر دیں۔ اس تصور کے تحت ہندوستان اور پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں نے اپنی از سرِ نو صف بندی شروع کر دی اور شعر و ادب کے ذریعہ انقلاب کے لیے زمین ہموار کرنے کا فیصلہ کیا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ندیم ہمیشہ ترقی پسند تحریک کی صفِ اول میں رہے اور اپنی شاعری اور افسانوں کے ذریعہ

اس تحریک کو آگے بڑھاتے رہے لیکن قیام پاکستان کے بعد انھوں نے تنظیمی طور پر بھی اس تحریک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ ندیم بنیادی طور پر ایک انسان دوست ادیب ہیں۔ انھوں نے غربت اور افلاس کو قریب سے دیکھا تھا، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی سفاکی کو محسوس کیا تھا۔ اس لیے وہ ایک سچے انسان دوست اور حریت پسند دانشور کی طرح اس نظام کے خلاف سینہ سپر ہو گئے اور اپنے ذہن اور قلم کو اس نظام کے خلاف وقف کر دیا۔ اس دور میں ترقی پسند ادیبوں کو ہندوستان اور پاکستان میں انقلاب دستک دیتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ چند دنوں کے اندر برِصغیر میں انقلاب آ جائے گا۔

نومبر ۱۹۴۹ء میں لاہور میں منعقدہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل پاکستان کانفرنس میں احمد ندیم قاسمی کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ وہ واحد ادیب تھے جو اس تحریک کی ابتدا سے انجمن سے وابستہ تھے اور انھوں نے اس کی وجہ سے بڑی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کی تھیں چنانچہ انھیں جب کل پاکستان انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیمی ذمہ داری سونپی گئی تو انھوں نے بخوشی یہ ذمہ داری قبول کر لی اور بہایت خلوص اور لگن کے ساتھ تنظیمی خدمات انجام دیں۔ اس دور میں ترقی پسندوں سے چند غلطیاں بھی ہوئیں اور وہ فکری تنگ نظری اور تعصب کے شکار ہو گئے۔ لیکن انھوں نے یہ سب کچھ خلوص اور نیک نیتی سے کیا۔ وہ ایک راسخ العقیدہ ترقی پسند تھے اور خلوصِ دل سے سماجی انقلاب پر یقین رکھتے تھے چنانچہ انھیں جب احساس ہوا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے جس پاکستان کے لیے جد و جہد کی تھی یہ وہ پاکستان نہیں ہے تو انھوں نے تمام سیاسی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر بے جھجک انقلاب کا نعرہ بلند کیا اور اس کی وجہ سے انھیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی طرح انھوں نے بھی ادب برائے انقلاب کا نعرہ بلند کیا۔

اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۹۵۰ء میں ہی معلوم ہو گیا کہ پاکستان جیسے پس ماندہ ملک میں جمہوری انقلاب سے قبل اشتراکی انقلاب کا نعرہ بلند کرنا غلط اور قبل از وقت ہے۔ اس بات کا جلد ہی احساس ہو گیا کہ انقلاب کے سلسلے میں جو مفروضہ پیش کیا گیا تھا وہ مارکسزم کے صرف میکانکی پہلوؤں کے پیشِ نظر پیش کیا گیا تھا۔ اور انقلاب کے بارے میں تمام تصورات غلط مفروضے پر مبنی تھے۔ اس دور میں نظریاتی تعصب اور تنگ نظری کے باعث ترقی پسندوں نے خود اپنی صفوں میں جس طرح انتشار پھیلایا اور ان سے نظریاتی اتفاق نہ کرنے والے ادیبوں کو جس طرح اپنے سے دور کیا اس سے ترقی پسند تحریک کو بے حد نقصان پہنچا۔ ترقی پسندوں کو جب اپنی غلط پالیسی کا احساس ہوا اور انھوں نے اس کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا تو اس سے ترقی پسندوں میں سخت انتشار پیدا ہو گیا۔ عین اس وقت سوشلسٹ دنیا کے عظیم المرتبت رہنما اسٹالن کی موت اور اسٹالن کے بارے میں خروشچیف کے سنسنی خیز انکشاف نے ترقی پسندوں میں تہلکہ مچا دیا اور عالمی اشتراکی تحریک کے دو حصوں میں بٹنے کے بعد ترقی پسند ادیب نظریاتی تشکیک اور بے اطمینانی کا شکار ہو گئے یہی نہیں بلکہ خود اشتراکی عقیدے میں بہت سے مد و جزر آئے۔ جن ادیبوں نے اشتراکیت اور مارکسزم کو انسانیت کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھا تھا ان کے عقائد و نظریات متزلزل ہو گئے۔

۱۹۵۱ء میں ترقی پسند تحریک بے حد انتشار کا شکار ہوئی اور ترقی پسند ادیبوں کو شدت سے احساس ہو کہ ان کی تحریک میں دراڑیں پڑنے لگی ہیں چنانچہ ۱۹۵۲ء کے وسط میں ترقی پسند مصنفین کا دوسرا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں انجمن کے مخلص اور حقیقت شناس اراکین نے اپنی پچھلی انتہا پسندانہ پالیسی سے قطع تعلق کر کے ایک نیا منشور پیش کیا۔

اس میں واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اعلان کیا گیا کہ یہ انجمن ایک ادبی جماعت ہے۔ اس کا کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں ہے۔ اس اجلاس میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا " .... میں ترقی پسندوں کی اخلاقی جرأت کا قائل ہوں اور اس کی قدر کرتا ہوں کہ انھیں جب اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو وہ اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ غلطی کرنا تقاضائے بشریت سہی مگر غلطی کے بعد اس کا اعتراف ایک جرأت مندانہ اقدام ہے۔

۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۴ء تک کا دور ترقی پسند ادب میں انتہا پسندی کا دور تھا۔ اس دوران یعنی ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین نے جہاں ایک طرف ادب کو عوام کے قریب لانے کی مہم شروع کی، وہاں وہ ادب کو عوامی اور اشتراکی بنانے کی کوشش میں انتہا پسندی کا شکار ہو گئی۔ چنانچہ بعض ترقی پسند ادبا و شعرا عوام دوستی اور نظریاتی خلوص کی رو میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے شعر و ادب میں فنی قدروں اور نزاکتوں کا بھی لحاظ نہیں رکھا اور اس طرح ان کی تحریریں محض پروپیگنڈا ہو کر رہ گئیں۔ ندیم کی شاعری پر بھی نظریاتی تنگ نظری اور انتہا پسندی کے اثرات مرتب ہوئے لیکن بہت کم۔ وہ بہت مختصر مدت کے لیے انتہا پسندی کا شکار رہے۔ اس کے باوجود انھوں نے اس دور میں بھی فن کو نظریے کی قربان گاہ پر کمٹمنٹ نہیں چڑھایا۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنی تحریروں میں نہایت خلوص اور دیانت سے اپنی ان کوتاہیوں اور غلطیوں کا اعتراف کیا ہے۔

۱۹۵۴ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی عاید کر دی گئی جس کی وجہ سے ترقی پسند ادیب سخت آزمایش میں گھر گئے اور خفیہ پولیس بڑی باقاعدگی سے ترقی پسند ادیبوں کا تعاقب کرنے لگی۔ انجمن ترقی مصنفین کے ساتھ ساتھ بائیں بازو کی تنظیموں پر بھی حکومت کا عتاب نازل ہوا اور دوسرے محب وطن ادیبوں کی طرح ندیم کو بھی دو دفعہ گرفتار کر کے آہنی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔ انھیں پہلی بار ۱۹۵۱ء میں اور دوسری بار ایوب خاں کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد گرفتار کیا گیا۔

ترقی پسند تحریک کے زوال کے نتیجے میں "برہم ادیبوں" کے ایک بڑے گروہ نے ادب کی جدید اور ترقی پسند روایات ہی سے انکار کر دیا اور اشتراکیت پر ایک سماجی اور فکری نظام کی حیثیت سے غور کرنے اور اس کے صحیح تصور کو رائج کرنے کے بجائے اسے مکمل طور پر رد کر دیا۔ مستقبل سے مایوسی، نظریاتی تشکیک اور انتشار نے ترقی پسند ادبی تحریک کی بنیادیں متزلزل کر دیں اور اچھے خاصے رجائیت پسند شعرا ناآسودگی اور کلبیت کا شکار ہو گئے۔ سیاست اور معاشرے کے بے جہت دور میں ندیم نے مع ترقی شکست و ریخت کا تجزیہ کیا لیکن قومی اور بین الاقوامی سطح پر رجائیت اور جمہوری تحریکوں سے رابطہ ختم نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ندیم نظریاتی طور پر بے حد راسخ العقیدہ تھے اور وہ ترقی پسندی سے کسی حال میں تائب ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ چند سال قبل جو ترقی پسند ادیب ادب برائے انقلاب کا نعرہ لگا کر حکمرانِ وقت اور جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے سے ٹکر لینے کے عزم کا اظہار کیا کرتے تھے۔ انھوں نے مصلحت پسندی کے تحت حکمرانِ وقت سے سمجھوتہ کر لیا اور حکومت سے انعام و اکرام وصول کر کے بڑی بڑی ملازمتیں قبول کر لیں۔ شکست و ریخت کے اس عالم میں بھی ندیم نے ترقی پسند تحریک کا ساتھ نہ چھوڑا اور نہ دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی طرح فوجی آمر سے سمجھوتہ کیا۔ ان کے لیے عرصہ تک ریڈیو، ٹی۔ وی اور اخبارات کے دروازے بند رہے۔ اس کے باوجود انھوں نے ترقی پسند عقائد ترک نہیں کیے اور

نہ نظریاتی تشکیک اور بے اعتباری کا اظہار کیا۔ البتہ تشکیک اور شکست و ریخت نے ان کی شاعری میں افسردگی ضرور پیدا کر دی۔ انھوں نے اس سلسلہ میں نہایت سائنٹفک طریقہ اختیار کیا۔ فلسفۂ اشتراکیت پر ایک سماجی اور فکری نظام کی حیثیت سے غور کیا اور اس کی خوبیوں اور خامیوں پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ابھی تک دنیا میں کوئی ایسا نظام فکر وجود میں نہیں آیا جو ہر قسم کی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے پاک ہو اور جسے اشتراکی نظام کا نعم البدل قرار دیا جائے یہی وجہ ہے کہ ندیم آج بھی اسی طرح کٹر ترقی پسند ہیں جیسے وہ ماضی میں تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ انتہا پسند ہونے کے بجائے اعتدال پسند اور عقیدے کے معاملے میں انتہائی لبرل واقع ہوئے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی انتہا پسندی اور فکری تنگ نظری کے دور سے نکلنے کے بعد ایک مفکر شاعر کی حیثیت سے ابھرے اور ان کی شاعری میں انسان دوستی کے ساتھ ساتھ فنی نکھار، فکری گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی اور آج احمد ندیم قاسمی بلا شبہ جوش اور فیض کے بعد پاکستان کے سب سے بڑے ترقی پسند ادیب اور مفکر ہیں۔ وہ آج بھی ترقی پسند تحریک کو اسی قدر عزیز رکھتے ہیں، جتنا پہلے رکھتے تھے اور انھوں نے آج بھی ترقی پسند تحریک کے پرچم کو بلند رکھا ہے۔ ان کا دو ماہی جریدہ "فنون" آج بھی ترقی پسندوں کا غیر سرکاری ترجمان تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس اثنا میں ترقی پسند ادیبوں میں کافی نظریاتی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ اشتراکیت کے چینی مسلک کا قائل ہے اور دوسرا گروہ روسی مسلک کا۔ احمد ندیم قاسمی دونوں سے تعلق اور رابطہ قایم رکھنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے انھیں دونوں گروہوں کی تنقیدوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے

احمد ندیم قاسمی ادب اور زندگی کے نظریے کے بارے میں کیر کے فقیر نہیں ہیں بلکہ وہ تغیر اور تبدل کے قائل ہیں بشرطیکہ یہ تغیر حالات کے تقاضوں کے عین مطابق ہو چنانچہ وہ اپنے فنی نظریات کے بارے میں فرماتے ہیں:

"——— میں اپنے فنی نظریات کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ حالات کے تغیر کے ساتھ ان میں بھی کہیں کہیں بدل سکتے ہیں۔ یہ نظریات پہلے بھی ہیں۔ ابتدا میں مجھے غزلیہ اور نشاطیہ رنگ سے شغف رہا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بالکل متوازی دو دو لہریں اس رفتار سے رواں دواں رہیں۔ سماجی حالات سے بیزار ہو کر میں نے کئی تلخ نظمیں بھی کہیں اور پکا مسلمان ہونے کی حیثیت سے مذہبی اور حکیمانہ رنگ میں بھی شاعری کی۔ سماجی مسائل کے بیان میں تلخی کم ہونے لگی، کیونکہ صرف تلخی توانا ادب پیدا نہیں کر سکتی۔ میں نے سماجی اور سیاسی مسائل کو طیش میں آ کر دیکھنے کے بجائے اعصاب زدگی سے بچ کر اور سنبھل کر ان میں ڈوب جانا اور سنجیدگی سے ان پر غور کرنا بہتر سمجھا۔ مذہبی رنگ کی شاعری مولانا ظفر علی خاں اور پھر ڈاکٹر اقبال کے خیالات کی بازگشت تھی۔

.... فیشن کے مطابق انقلابی نظمیں کہیں جن میں شاعری سے زیادہ دعوے اور فنی دیانت سے زیادہ شیون اور سینہ کوبی کا دخل تھا۔ .... دراصل یہ گرج اور دھاڑ سستی وطن پرستی کے شعبدے تھے۔

.... پھر جوش ہوا سے اتر کر زمین پر آ گیا۔ خلا کی شاعری سے نفرت ہونے لگی۔ غریبوں کے متعلق غریب کی حیثیت سے لکھنا شروع کیا۔ کسانوں کے بارے میں کسان بن کر لکھا

.... انقلابی و حکیمانہ شاعری کرنا آسان نہیں۔ جتنا عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے۔ انقلابی شاعر کا

ذہن جب تک ایک خاص مسئلہ کو توجہ کی مرکزیت اور یکسوئی سے نہ پرکھ سکے۔ وہ پیغامی شاعری کا خالق نہیں بن سکتا ...... ہمارے ہاں انقلابی شاعری نے شروع ہی سے جو صحافتی رنگ اختیار کر لیا ہے اس حقیقت کے عمیق اور فنی مطالعہ سے اس کو جمالیاتی احساس میں بدل سکتا ہے۔ جس پر ہر لطیف فن کی بنیاد ہے ۔"

یہ ندیم کے آج کے خیالات نہیں ہیں۔ آج سے اٹھائیس سال قبل اس نے زندگی اور فن کے بارے میں اپنے ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ تین دہائی گزر جانے کے باوجود آج بھی ان کے بنیادی فنی نظریہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ وہ آج بھی انھیں خیالات و نظریات کے قائل ہیں۔ انھوں نے ۱۹۴۶ء میں اپنے پہلے شعری مجموعہ " جلال و جمال" میں اپنے ادبی نظریہ کا ذکر کرتے ہوئے خواہش ظاہر کی تھی :۔

" مصائب اور حوادث نے مجھے ابدی مایوسی کے جہنم زار میں نہیں جھونکا، مجھ سے میرا جذبۂ آزادی اور غرورِ نفس نہیں چھینا۔ میرے خلوص اور انسانی محبت پر ڈاکہ نہیں ڈالا۔ شاید یہ فطری ردِ عمل ہے کہ میں اب تک حسن کو زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے دنیا کے کسی انسان سے نفرت نہیں اور میرا نظریۂ حیات اتنا وسیع اور جذبۂ ارتقا اتنا بلند ہے کہ مجھے عظیم رفعتیں بھی ہیچ نظر آنے لگی ہیں۔ صرف ایک تمنا ہے کہ میں اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کے ذریعہ انسانیت کی عصمت اور طہارت قائم رکھتے ہوئے ایک ایسے نظام کی تعمیر میں ممد ثابت ہو سکوں جس میں ہر انسان دوسرے انسان کو انسان ہی سمجھے۔ کالا یا گورا۔ مشرقی یا مغربی غلام یا آقا نہ سمجھے۔ لیکن میرے اس کارنامے میں بھی ایک حسن اور فنکارانہ بانکپن اور غیر فانی جوانی ہو ۔"

سلیم اختر

کپاس کا پھول[1]

"میں نے دیہاتی موضوع پر صرف اس لیے قلم اٹھایا تھا کہ پنجاب کے دیہات کو صحیح رنگوں میں پیش کرنے والا مجھے کوئی نظر نہ آیا۔"

(دیباچہ "طلوع و غروب" ۱۹۴۲ء)

زندگی کی تصویر کشی کے لیے دیہات اور اس کے احول کی عکاسی کو احمد ندیم قاسمی نے اپنا فنی مقصود قرار دیا۔ اس انداز میں وہ کمال پیدا کیا کہ آج اس کا نام دیہات کے افسانہ نگار کی حیثیت سے دنیائے ادب میں اپنا سکہ منوا چکا ہے۔ چنانچہ فنی چابک دستی، مشاہدہ کی گہرائی، انسانی فطرت کے گہرے شعور اور تکنیک پر قدرت کی بنا پر اس نے اردو ادب کو "کنجری"، "چڑیل"، "الحمد للہ"، "گنڈاسہ"، "خربوزے" ایسے شاہکار افسانے عطا کیے ہیں۔

ندیم ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستہ ہے۔ اس تحریک نے ادب کو تو چند قد آور شخصیتیں دیں۔ ان میں بلاشبہ ندیم کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے پاکستان میں جو ذہنی انقلابات آئے۔ اس دوران میں بہت سے ادیب "تائب" ہوئے تو کئی کے تخلیقی سوتے ہی خشک ہو گئے۔ لیکن ندیم ان فن کاروں میں سے ہے جن کی تحریریں آج بھی شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ بحیثیت ایک افسانہ نگار اس کی مقبولیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس نے ابھی تک فن کی دنیا میں خوب سے خوب تر کی جستجو ترک نہیں کی۔ بعض اوقات اچھے اچھے لکھنے والے بھی خود کو دہرانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن ندیم کے یہاں یہ بات نہیں چنانچہ تیس پینتیس سالہ کامیاب افسانہ نگاری کے باوجود وہ آج بھی "بھیڑ"، "کپاس کا پھول"، "پہاڑوں کی برف"، "پاگل" اور "ماسی گل بانو" ایسے افسانے لکھ سکتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ وہ خلوص ہے جو ندیم نے اپنے فن اور اس کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے ساتھ روا رکھا ہے۔ وہ حساس فنکار ہے اور جب تک اس کے پاس احساس اور خلوص کا یہ خزانہ برقرار ہے اس وقت تک اس کا فن بھی زندہ رہے گا۔ ۱۹۳۹ء میں

---

[1] افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ

اس نے "آنچل" کے دیباچہ میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ آج بھی ندیم کے فن کی جہات اور اساس سمجھنے کے لیے ایک اہم اشارہ ہیں ـــ

> "اپنے افکار کا وزن معلوم کرنے کے لیے میرا احساس ہی بہترین ترازو ہے اگر میری کوئی تکنیک ہے تو وہ محض خلوص ہے اگر میرا کوئی موضوع ہے تو وہ انسانی زندگی ہے۔ اگر میرا کوئی اسلوب ہے تو وہ محض میری شاعرانہ طبع کا پرتو ہے" ـــــــ

یہ اسی احساس اور خلوص کا ثمر ہی تو ہے کہ ابھی تک اس کے افسانے مقبول ہیں۔ چنانچہ آخری مجموعہ "گھر سے گھر تک" کے بعد طبع ہونے والے افسانوں کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ندیم وہ کان ہے جس کا سونا ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ ندیم نے ابتدا میں اپنے لیے جو فنی نصب العین مقرر کیا تھا ابھی تک اس سے روگردانی نہیں کی اس نے اپنے فن کے لیے جو راستہ منتخب کیا تھا ـــ وہ آج بھی اسی پر گامزن ہے۔ اس نے ۱۹۴۳ء میں "سیلاب" کے دیباچہ میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا آج ۱۹۷۳ء میں بھی وہ ان پر عمل پیرا ہے۔

> "میری سب تحریروں کا خالق میرا احساس ہے۔ وہ مچلتا ہوا مضطرب اور سیماب سرشت احساس جس نے اگرچہ مجھے زندگی کی کئی منزلوں تک پہنچنے سے روکے رکھا، لیکن میرے شعر اور افسانوں میں تڑپ بھردی ..... وہ تڑپ جس کی برقی لہریں میرے نزدیک تجلی بخش ہیں اور آتش افروز بھی: .... میرا احساس میرا راہبر ہے وہی مجھے ابتدا و انتہا، زوال و عروج پرواز و گریز کے نکات سمجھاتا ہے۔ خلوص احساس کا دوسرا نام ہے اور میں مطمئن ہوں کہ خلوص ہی میرا آرٹ اور میری تکنیک ہے جو دیکھتا ہوں وہی کہتا ہوں جو محسوس کرتا ہوں، وہی لکھتا ہوں .... میں شاعر پہلے ہوں اور افسانہ نگار بعد میں.... اس لیے میرے اکثر افسانوں میں میری شاعرانہ افتادِ طبع کا عکس نمایاں ہوگا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ میری آنکھیں مجھے یہی دکھاتی ہیں۔ یہ میری سمجھ کا قصور نہیں میرے اندازِ نظر کا کرشمہ ہے" ـــــ

بہ الفاظِ دیگر احساس۔ خلوص اور شاعرانہ افتادِ طبع ـــ یہ وہ تین عناصر ہیں جن سے ندیم کے افسانوں کی تخلیق ہوتی ہے ـــــ

ندیم ترقی پسند اور مقصد پسند ہے، لیکن اس نے کبھی بھی فن کو مقصد پر قربان نہ کیا اس کا فنی شعور اسے ہر اس موقع سے بچا لیتا ہے جہاں وہ محض جذباتیت کی سطح پر اتر سکتا تھا۔ شاید اسی لیے اس کے افسانوں میں کبھی بھی وہ بلند آہنگ خطیبانہ انداز نہ پیدا ہو سکا جو بعض سوڈو انقلابیوں کی تحریروں کا وصف رہا ہے اور جس کی وجہ سے ترقی پسند افسانہ خاصا بدنام بھی ہوا۔ بلکہ میں نے تو گزشتہ دہائی میں لکھے گئے افسانوں میں ایک تبدیلی بھی محسوس کی ہے ـــ یہ تبدیلی اچانک قسم کی نہیں بلکہ نہایت ہی آہستہ روی اور دبے قدموں سے آ رہی ہے۔ وہ یہ کہ اب ندیم کے افسانوں میں ترقی پسندوں کے مخصوص موضوعات اور محبوب مسائل کی کارفرمائی میں نہ صرف کمی آ چکی ہے بلکہ اب ان پر اس واضح اور واشگاف انداز میں زور بھی نہیں دیا جاتا جو کبھی لازم تھا۔ چنانچہ "گھر سے گھر تک" کے بعد بھی ہونے والے تمام قابلِ ذکر افسانوں میں

سے صرف "لارنس آف تھیبلیا" اور "دشمن" کو خالص ترقی پسند افسانے قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دیہات کے افسانوں کی مقدار میں بتدریج کمی ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ "فیشن"، "مائیں"، "پاگل"، "سفارش"، "پہاڑوں کی برف"، "گلدستۂ خار"، "آسیب"، "قرض" اور "سکوت و صدا" یہ سبھی افسانے شہر سے متعلق ہیں۔ دیہات پر لکھے گئے افسانے یہ ہیں۔ "تبر"، "گڑیا"، "ماسی گل بانو"، "کپاس کا پھول"، اور "لارنس آف تھیبلیا"۔ ان میں سے صرف موخرالذکر افسانہ ندیم کے مخصوص رنگ کا آئینہ دار ہے اور باقی سب میں امارت و غربت کی کشمکش والی کوئی بات نہیں، نہ ظالم زمیندار ہیں اور نہ ہی مظلوم مزارع اس کی معصوم بہن (یا بیوی) ہے۔ بلکہ باقی تمام افسانوں میں اگر دیہات کے کچے مکانوں کی جگہ شہر کے مکانات کر دیے جائیں تو اس بدلی فضا کے ان افسانوں کے تاثر میں کوئی کمی نہ ہوگی اس میں سے صرف "کپاس کا پھول" مستثنائی حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے اس امر پر بطور خاص یوں زور دیا کہ دیہی زندگی میں زمیندار اور مزارع والی تھیم ختم کر دینے کے نتیجہ میں ندیم کے افسانوں میں متنوع موضوعات نے بوقلمونی پیدا کر دی ہے۔

ندیم پہلے بھی انسانوں اور ان کے جذباتی مسائل کی عکاسی کرتا تھا۔ لیکن اقتصادی پس منظر کی بنا پر بعض اوقات تنگیٔ داماں کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن اب مندرجہ بالا افسانوں کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب وہ انسانوں کے باطن میں باندازِ نو جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ندیم کے افسانوں میں کشمکش پہلے بھی تھی۔ لیکن اس کا رخ خارج کی طرف تھا اور زمیندار اس کشمکش کا ہدف۔ کشمکش اب بھی ہے۔ لیکن اب وہ داخلی کشمکش کی صورت میں ہے۔ کشمکش ندیم کے افسانوں میں صد رنگ شعاع کی مانند جلوہ گر نظر آتی ہے۔ جب اس کا مظہر خارج تھا تو زمیندار، مزارع، حق و باطل، حسن، ظلم اور اعلیٰ اقدار اور خود غرض کے روپ میں وسعت کی حامل تھی۔ لیکن اب جب اس نے اس کا رخ باطن کی دنیا کی طرف کیا تو اس نے اس نفسی کشمکش کا روپ دھارا جو انسان کا مقدر ہے تو فرد کا المیہ! چنانچہ "تبر" اور "پاگل"، "ماسی گل بانو" اور "پہاڑوں کی برف" اسی انداز کی خوبصورت مثالیں ہیں۔

ابتدا سے ہی ندیم کے افسانوں کی ایک خصوصیت اتنی نمایاں رہی ہے کہ اسے رجحان بھی قرار دیا جا سکتا ہے یہ ہے تحیر کی ایک خاص فضا کی تخلیق۔ وہ مناسب الفاظ کی مدد سے ایک ایسی HAUNTED فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو ذہن میں مافوق الفطرت کا سا تصور ابھار کر سسپنس پیدا کرتی ہے اس کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرح کا پُراسرار رومانی ماحول! نتیجہ میں پڑھنے والا سحرزدہ سا رہ جاتا ہے۔ "چڑیل" غالباً اس انداز کی اولین اور کامیاب کوشش تھی۔ گو "چڑیل" سے لے کر "ماسی گل بانو" اور "گڑیا" تک کا خاصا زمانی فاصلہ ہے۔ لیکن ندیم اس انداز میں افسانے لکھنے کے تجربات کیے جا رہا ہے چنانچہ تحیر کی فضا اور پُراسرار ماحول کی تخلیق کے لحاظ سے یہ دونوں افسانے بہت خوب ہیں۔

"ماسی گل بانو" میں ندیم نے سارا زور ایک مخصوص قسم کی HAUNTED فضا کی تشکیل میں صرف کیا ہے جبکہ "گڑیا" میں فضا کے مقابلہ میں ایک خاص طرح کی صورتِ حال سے تاثر ابھارا گیا ہے۔ "گل بانو جب جوان تھی تو بہت خوبصورت تھی اور جب اسے دلہن بنایا گیا تو اسے اتنی مہندی لگائی گئی کہ اس کی ہتھیلیاں سرخ، پھر گہری سرخ اور پھر سیاہ پڑ گئیں اور تین دن تک آس پاس کی گلیاں گل بانو کے گھر سے امڈتی ہوئی مہندی کی خوشبو سے مہکتی رہیں"۔۔۔ لیکن برات گھر پہنچنے سے قبل اس کا محبوب قتل ہو جاتا ہے اور شدتِ غم سے عارضی جنون اور بخار کے بعد اس کا یہ حلیہ بن گیا

"اس کے سر کے سب بال جھڑ گئے اس کی آنکھیں جو عام آنکھوں سے بڑی تھیں اور بڑی ہوگئیں اور ان میں وحشت سی بھر گئی۔ پھٹی پھٹی میلی میلی آنکھیں، ہلدی کا سا پیلا چہرہ، اندر دھنسے ہوئے گال، خشک کالے ہونٹ اور اس پر گنجا سر۔ جن نے بھی اسے دیکھا آیت الکرسی پڑھتا ہوا پلٹ گیا۔" اس کے بعد سے "پورے گاؤں میں یہ خبر گشت کر گئی کہ اپنے منگیتر کے مرنے کے بعد گل بانو پر جن آ گیا ہے اور اب جن نہیں نکلا، گل بانو نکل گئی ہے اور جن بیٹھا رہ گیا ہے۔ یہیں سے گل بانو اور جنوں کے رشتے کی بات چلی۔ اور پھر آہستہ آہستہ گل بانو، عامل گل بانو بن گئی اور اس کے گرد اسراروں کے پردے دبیز ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ وہ ایک زندہ پیجنڈ بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ ماسی گل بانو بن کر، زندہ لاش کے طور پر زندگی تو بسر کر رہی ہے۔ لیکن اس کے اندر کی گل بانو نہ صرف زندہ رہتی ہے، بلکہ ہر دم اپنے منگیتر کی منتظر بھی ہے۔ اسی لیے تو وہ ماسی جسے لوگ آسیب سمجھتے تھے، اس سے خوف زدہ تھے اور رات کو اس کے گھر کی طرف سے گزرنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ موت کے وقت گل بانو بن کر جان دیتی ہے۔

"پورا کوٹھا مہندی کی خوشبو سے بھرا ہوا تھا چارپائی پر صاف ستھرا کھیس بچھا تھا۔ چاروں طرف رنگ رنگ کے کپڑے اور برتن پیڑھیوں اور کھٹولوں پر دلہن کے جہیز کی طرح سجے ہوئے تھے۔ ایک طرف آئینے کے پاس کنگھی رکھی تھی جس میں سفید بالوں کا ایک گولہ سا اٹکا ہوا تھا۔ ماسی کو صاف ستھرے کھیس پر لٹا دیا گیا، اور اسے اس کے ریشمی دوپٹے سے ڈھانک دیا گیا۔ جب چنبیلی کی کٹوریاں سی بجنے لگیں زار زار روتی ہوئی تاجو دلہن کی رخصت کا گیت گانے لگی اور ہجوم جنوں کی طرح چیخ چیخ کر رونے لگا۔"

گاؤں نے جسے آسیب سمجھا وہ ایک حرماں نصیب عورت تھی جس کے خواب تعبیر سے پہلے ہی مایوسی میں تبدیل ہو گئے۔ موت آئی تو کفن کے روپ میں اسے سرخ دوپٹہ ملا۔

'گڑیا' کا موضوع دو سہیلیوں کی محبت ہے۔ "گڑیا" مہراں کی شکل کی ہے۔ سفید رنگ پر کالی آنکھیں، "کالی بھلی آنکھیں"۔ بانو کو اس گڑیا سے پیار ہے اس لیے کہ یہ اس کی عزیز سہیلی "مہراں" ایسی ہے جب کہ مہراں اس سے متنفر ہے

"اس حرامزادی کو تو نے اب تک سنبھال رکھا ہے بانو" اس نے عجیب سی آواز میں کہا تھا "یہ تو ہو بہو میرے جیسی ہے مجھے ایسا لگتا ہے یہ میری موت ہے۔ یاد ہے ایک بار تمھاری اماں ہی نے تو بتایا تھا کہ موت کا فرشتہ مرنے والے کا ہم شکل ہوتا ہے۔"

ہمارے ملک کے جادو ٹونے سے لے کر یورپ کے BLACK MAGIC اور جنوبی امریکہ کے VODO CULT تک سب میں انسان کے ہم شکل پتلے کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ہم شکل گڑیا (یا گڈا) مافوق الفطرت داستانوں میں بھی ملتے ہیں۔ ندیم کا یہ کمال ہے کہ ایک عام روایت کو۔ کرشن ایک خوبصورت افسانے کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ ہم شکل گڑیا مہراں کی موت ثابت ہوتی ہے جس طرح داستانوں میں جن کی جان کسی پرندے میں ہوتی ہے۔ اسی طرح مہراں کی جان بھی گڑیا میں تھی کیونکہ ایک شریر لڑکا اس گڑیا کو توڑتا مروڑتا ہے تو مہراں کی جان نکل جاتی ہے لیکن کہانی ختم نہیں ہوتی، کیونکہ اختتام سے ایک نئی کہانی جنم لیتی ہے۔ بانو کے جب بچی ہوئی تو وہ بالکل مہراں جیسی تھی۔

"بانو کی ماں نے اپنے سینے پر دو ہتڑ دے مارا۔" ہائے یہ تو ہو بہو مہراں ہے، ہائے وہی سنہرے بال اور وہی گورا رنگ۔

اور وہی ۔ ہائے بالکل وہی اتنی بڑی بڑی ، حسّ کالی آنکھیں !"

اور نیم غنودگی کے عالم میں بانو کو محسوس ہوا جیسے عمراں کھڑکی میں کھڑی اسے جھانک رہی ہے اور مسکرا رہی ہے اور کہہ رہی ہے ۔ "میں نے کہا تھا نا بانو ! میں نے کہا تھا نا کہ میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ۔"

چاہت ایک تسلسل کا نام ہے ، موت محبت کو ختم نہ کر سکی اس نے دوسرا جنم لے لیا ۔ گڑیا اب بھی موجود ہے ۔ لیکن بیٹی کے روپ میں ۔۔۔

"گڑیا" ندیم کے افسانوں میں اس بنا پر ایک منفرد مقام کا حامل سمجھا جا سکتا ہے کہ موضوع کے لحاظ سے یہ سب سے جداگانہ حیثیت کا حامل ہے ۔ دونوں سہیلیاں آسیب زدہ ہیں تو ماسی گل بانو خود آسیب ! لیکن وعظ کیے بغیر ندیم نکتہ سمجھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا آسیب انسان خود ہے ، رہ گیا پھر اس کی اپنی بدقسمتی !

آسیب سے ہم ذہن اس دلچسپ افسانہ کی طرف منتقل ہوتا ہے جس کا عنوان ہی "آسیب" ہے ۔ لیکن اس افسانہ میں کسی طرح کی پراسراریت اور طلسمی فضا نہیں ۔ فقط "آسیب" دراصل اس بوڑھے کی کہانی ہے جس کے بیٹے کوٹھی میں اگا بڑا سا سال خوردہ درخت اس کے خاندان کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کا مظہر اور درخشندہ ماضی کی علامت ہے اس کے بقول ۔

"اس درخت نے ہمارے خاندان کی چار پشتیں دیکھی ہیں اس کی عمر پنجاب پر انگریزوں کے اقتدار سے بھی زیادہ ہے میرے دادا نے جب سنہ [illegible]ء میں یہ بنگلہ بنوایا تو اس وقت کے بڑے بوڑھوں کے مطابق اس بڑ کی عمر آدھی صدی سے بھی کچھ زیادہ رہی تھی ۔ اس وقت یہ ہماری طرح جوان تھا اور اتنا خوبصورت تھا کہ دادا کہتے تھے اگر یہ بڑ نہ ہوتا تو یہ بنگلہ بھی نہ بنتا یا کم سے کم یہاں نہ بنتا ۔"

لیکن جب شادی کے بعد اس کے بیٹے کی بہو اسے کٹوا دیتی ہے تو وہ گویا اپنے وجود سے منقطع ہو جاتا ہے ۔

"کیا میں موجود ہوں ؟" سید امجد حسین نے آئینے کے سامنے جا کر سوچا ۔

درخت ہمیشہ سے شادابی ، نمو ، افزائش اور تخلیقی قوتوں کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے ۔ لیکن ندیم نے اسے ایک خاندان کی علامت بنا کر جذباتی رشتہ استوار کیا ہے ۔ نفسیاتی لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ امجد حسین نے بڑ کے اس درخت سے اپنی (IDENTIFICATION) کر لی ہے کہ اس کی مانند وہ بھی سال خوردگی کے باوجود دھرتی کے سینے میں قدم جمائے کھڑا ہے اور بڑ ہی کی مانند وہ بھی اپنے بیٹے کے لیے ٹھنڈی چھاؤں کا روپ ہے ۔ لیکن جب بیٹا خود ہی اس ٹھنڈی چھاؤں سے محرومی کو ترجیح دے تو اس میں باپ یا بڑ کا کیا قصور ؟ بڑ کے بوڑھے درخت اور درآمد شدہ یورپین کھلونوں میں زندگی کی اقدار کے تضادات اور کلچر میں نئے اور پرانے کی آویزش کو واضح کیا گیا ہے ۔ بڑ کی طرح امجد حسین بھی ماضی کا ورثہ ہے اور اسی کے وجود میں بھی روایات پنپ سکتی ہیں ۔ لیکن جدید ذہن کا حامل بیٹا بڑ اس لیے کٹوانا چاہتا ہے کہ اس کے دوست مذاق اڑاتے ہیں ۔ اسے بڑ کی خنک چھاؤں سے اس لیے وحشت ہوتی ہے کہ گھر میں مصنوعی خنکی کے سامان مہیا کیے جا سکتے ہیں ۔ لیکن اس کے باپ کے لیے بڑ کی چھاؤں ماضی کی چھاؤں ہے اور وہ صرف اس کے سائے ہی میں خوش رہ سکتا ہے ۔ اس لیے تو افسانے کے غیر متوقع انجام میں وہ اپنے بیٹے اور بہو کے لگائے ہوئے پھولوں کی تمام کیاریاں اجاڑ دیتا ہے ۔ اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ اب اس کوٹھی کا "آسیب" ہمیشہ یوں ہی کیاریاں اجاڑتا رہے گا ۔

"پاگل" کا موضوع بھی نئی اور پرانی نسل کی آویزش ہے۔ "آسیب" میں انداز ڈھکا چھپا تھا اور بڑے کے حوالے سے جب بات کی تو اس میں کچھ اقدار بھی شامل ہو گئیں۔ لیکن "پاگل" میں انداز واضح ہے۔ یہ کشمکش اعلیٰ مقاصد کے لیے نہیں ہے اور نہ ہی کردار مثالی ہیں۔ ایک نودولتیہ خاندان اور پرانی نسل کے والد بزرگوار کا بھی یہی مسئلہ ہے کہ وہ پرانی اقدار کو خاندانی شرافت کے نام پر سینے سے لگائے ہیں۔ لیکن وہ چوہدری صاحب جنھوں نے مغربی انداز اپنانے کی بنا پر ایک وقت اپنے بیٹے کو کمرے میں بند کر دیا تھا۔ ان ہی چوہدری صاحب کا ایک پارٹی میں اپنے بیٹے اور بیٹی کو ٹوسٹ میں ایشین چیمپئن شپ جیتنے پر یہ ردِ عمل ہوتا ہے "ان کے ہونٹ ذرا سے کانپے مگر اس کپکپی کو انھوں نے بے انتہا مشقت کے ساتھ جمع کی ہوئی مسکراہٹ میں چھپا لیا اور سب کی توقع سے کہیں زیادہ بلند آواز میں بولے "سبحان اللہ"۔ "پاگل" میں سمجھوتہ کا یہ انداز پرانی نسل کی منافقانہ ذہنیت کی فنکارانہ عکاسی کرتا ہے اور آخر میں پڑھنے والا سوچتا رہ جاتا ہے کہ پاگل کون ہے؟

انفرادی جائزہ لینے پر "کپاس کا پھول" "تبرّ" اور "پہاڑوں کی برف" نمایاں نظر آتے ہیں۔

"کپاس کا پھول" جنگ کے موضوع پر ایک نہایت اہم افسانہ ہے کہ اس میں جنگ کے بارے میں عام جذباتی رویہ سے ہٹ کر مائی تاجو کو تمام قوم کے عزم و ہمت کے لیے ایک بلیغ استعارہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ محنت کش عورت ہے اور اس نے تمام عمر اپنے ہاتھ کی محنت سے پیٹ بھرا۔ اسی لیے تو اسے محتاج کہلوانا اور بھیک کا کھانا ناگوار ہے۔ "آج تمھاری ماں نے مجھے بتایا کہ میں محتاج ہوں اور چکی پیس پیس کر میرے ہاتھوں پر جو گٹے پڑ گئے ہیں وہ مجھے کچھ اور بتاتے ہیں۔ سو بیٹی! یہ روٹی میں نہیں لوں گی، اسے کبھی نہیں لوں گی۔ تمھاری لائی ہوئی کل شام کی روٹی میری آخری روٹی تھی، یہ روٹی اپنے کتے کے آگے ڈال دو۔"

یہ روٹی واقعی آخری ثابت ہوئی کہ اس رات سرحد عبور کر کے بھارتی فوج نے گاؤں میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ گاؤں میں مائی تاجو کی سب سے ہمدرد نوجوان راحتاں تھی جو بھارتی فوجیوں کی ہوس کا نشانہ بنتی ہے۔ مائی تاجو ان کے سامنے سینہ سپر ہوتی ہے۔ لیکن کب تک؟

کپاس کا پھول ایک خوبصورت استعارہ کے طور پر اس افسانہ کی روح میں جلوہ گر ہے۔ کپاس کے پھول سے سوتا بنتا ہے اور اس سوتے سے کفن، اور یہی کفن مائی تاجو نے اپنے لیے سنبھال کر رکھا تھا چنانچہ گاؤں سے نکلتے وقت اس کے پاس صرف اپنا کفن ہی ہے اور یہ کفن اس کے اپنے کام نہیں آتا۔ بلکہ راحتاں کی عریانی ڈھانپنے کے کام آتا ہے۔ کفن میں لپٹا انسان زندگی کا آخری سفر ختم کرنے کے بعد قبر میں آسودۂ خواب ہوتا ہے۔ یعنی یہاں ایک نوجوان لڑکی جس کی عصمت دشمن سپاہیوں نے لوٹی، وہ اپنی عزت گنوانے کے بعد مائی تاجو کا کفن لپیٹ کر نئے عزم سے نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔ "کفن پر جگہ جگہ خون کے دھبے نمایاں ہونے لگے تھے۔ نوچی کھسوٹی ہوئی راحتاں کا جسم اپنا کرب کفن کو منتقل کر رہا تھا اور خاکِ پاک بھی اس خون کے لیے جگہ خالی کر رہی تھی۔ اور لاش کے پاس مائی نے کہا "راحتاں بیٹی! تو کتنی بھلی ہے تو نے میرا شان دار جنازہ نکالنے کا وعدہ کیا تھا تو نے یہ وعدہ سچ مچ پورا کیا۔ تو میرے کفن میں کتنی پیاری لگ رہی ہے۔ میری اچھی، میری نیک، میری خوبصورت راحتاں بیٹی!"

"تبرّ" ایک کامیاب نفسیاتی مطالعہ ہے۔ چھوٹا قد جس احساس کمتری کو جنم دیتا ہے اور پھر اس سے انسانی شخصیت

کس کس طرح سے متاثر ہوتی ہے یہ اسی نفسیاتی الجھن کا بڑا کامیاب تجزیاتی مطالعہ ہے۔

سب سے بڑا ستم یہ تھا کہ شہباز کا قد بہت چھوٹا تھا، لوگ اس کے قریب سے گزرتے تو اسے یوں دیکھتے جیسے وہ سب کا برخوردار ہے اور جیسے وہ کترا کر نہ نکلا تو اس کے سر پہ ہاتھ پھیر دیں گے۔ "چھوٹے قد سے عاجز شہباز " قد آور " بننے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا "۔ اس نے بڑی بڑی مونچھیں بھی رکھ لی تھیں جنھیں وہ ہر صبح گھی سے چپڑتا تھا، اس نے قلمیں بھی کانوں کی لووں تک پھیلا لی تھیں وہ اپنے پٹوں میں ہاتھی دانت کا ننھا سا قوسی کنگھا کچھ اس ادا سے لگاتا تھا کہ وہ اس کے دو طُرّوں والی پگڑی سے بھی نہیں چھپتا تھا۔ ہر روز داڑھی منڈاتا تھا۔ دھاری دار بوسکی کے کرتے میں سیپ کے بٹنوں کی بجائے چاندی کی زنجیر لٹکا رکھی تھی جس کے آخری سرے پر گھونگھریاں لگی تھیں اور وہ ہر قدم پر یوں بجتی تھیں جیسے چڑیوں کے گھونسلوں میں ان کے بے پر بچے بولتے ہیں "

وہ اس ہیئت کذائی کے ساتھ ساتھ جنت سے عشق بھی کرتا ہے جو اس کا سارا مال کھا جاتی ہے، وہ تبر بھی رکھتا ہے اور استعمال کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں ہے اور پھر گاؤں کے بدمعاش دلیر سے بھی ٹکر لیتا ہے۔ لیکن اسی کے دام میں پھنس کر جنت کے خاوند کو اس توقع پر قتل کرتا ہے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن قتل کے مقدمہ سے بری ہو کر اس پہ اس تلخ حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ یہ دلیر اور جنت کی سازش تھی، وہ دونوں کو اکٹھے دیکھ کر اپنے آپ میں نہیں رہتا اور تبر سے دلیر کو قتل کر دیتا ہے جس جنت کے اس نے خواب دیکھے تھے اب اس کے عریاں جسم سے بھی اسے کوئی تحریک نہیں ہوتی، اس پر نفرت غالب آ چکی ہے۔

" تبر کو فرش پر بچھی ہوئی گھاس سے پونچھتے ہوئے وہ بولا "میں تیرا خون نہیں کروں گا۔ تیرا خون میرے تبر کے لائق نہیں ہے۔ پھر اس نے جنت کا کرتا اٹھا کر اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا "لے اسے پہن لے، ننگی عورت لاش کے پاس کھڑی ہوئی بھلی نہیں لگتی "

اب شہباز واقعی قد آور بن چکا ہے، وہ قتل کر کے نہیں، بلکہ جنت کے منہ پر تھوک کر! —— "پہاڑوں کی برف" کا موضوع بے حسن پرست اور حسن کار افسانہ نگار کی وہ کشمکش جو تصور اور حقیقت کے ٹکراؤ سے جنم لیتی ہے۔ وہ افسانہ نگار ذہن کے چہرہ کی رنگت کے لیے تشبیہ تلاش کر رہا ہے کہ گندی بھکارن کے روپ میں تمام تشبیہیں مجسم ہو کر سامنے آ جاتی ہیں، وہ جس شدید جذباتی تموج سے آشنا ہوتا ہے اسے بڑے کامیاب طریقہ سے اجاگر کیا گیا ہے، وہ بھکارن کے کردار کو افسانہ نگار کی جذباتی کیفیات کے زیر و بم سے تاثر انگیز بنایا گیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ بھکارن بطور ایک کردار برائے نام وجود رکھتی ہے اور سوائے بھیک مانگنے کے چند جملوں کے وہ اور کچھ نہیں کہتی۔ لیکن افسانہ نگار کے جذبات کی شدت اس کے لیے کرداری سانچہ مہیا کرتی ہے —— یہ PYGMYLON کے برعکس ہے اس نے تو بت تراش کر اپنی محبت سے اسے زندہ کر لیا تھا لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے کہ تصور جمالی روپ میں تو ہے مگر اسے افسانہ نگار کی جذباتی سطح تک آنا گوارا نہیں ہے اس لیے تو ایک ہفتہ کی غیر حاضری کا جواز وہ یوں بیان کرتی ہے —— "میں اٹھنی بوڑھے لے گئی تھی۔ ایک آنہ اس دن کا، باقی سات آنے سات دنوں کے، آج آٹھواں دن تھا تو آ گئی!" —— پہاڑوں کی برف سے بھکارن کا تقابل بھی معنی خیز ہے۔ سفید دودھیا برف کا نظارہ دلفریب ہے لیکن اس پر غلبہ پانا مشکل ہے اور اس لیے وہ آلودگی سے منزہ رہتی ہے۔ اس کی سطح تک بلند ہو گے تو یخ ہو جاؤ گے۔ سے اپنی سطح پر لاؤ گے تو پگھل کر وہ برف نہ رہے گی اس لیے برف کا پجاری سدا اپنی آگ میں جلے گا اور اس لحاظ سے دیکھیں تو احمد ندیم قاسمی کے بیشتر افسانوں میں جلتی آگ اور پہاڑوں کی برف کسی نہ کسی روپ میں جلوہ گر ملے گی! ——

امجد اسلام امجد

احمد ندیم قاسمی کی نظمیں

اردو میں جدید نظم نگاری کا آغاز ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ حالی، شبلی اور آزاد کی تحریک سے ہوا۔ یوں دیکھا جائے تو یہ صنف ابتدا ہی سے اردو کی اکثر اصنافِ سخن کی نسبت کم رہی ہے۔ کسی بھی صنفِ ادب کے عروج و زوال کا تعلق اُس کے لکھنے والوں کے خارجی ماحول سے متعلق ہوتا ہے۔ قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، شہر آشوب وغیرہ جو ایک زمانے میں غالب اصنافِ شاعری تھیں آج نہ ہونے کے برابر ہیں۔ نظیر اکبر آبادی نے نظم لکھی۔ مگر اس کا رواج عام نہ ہوا۔ یہ سب باتیں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ شاعری کی کوئی ہیئت مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ ہر عہد مختلف ہیئتوں کو اپنے تقاضوں کے مطابق استعمال کرتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی نظموں کی قدر و قیمت کا جائزہ لینے کے لیے جہاں ہمیں شاعر کے داخلی محرکات کو دیکھنا ہے، وہاں اُس کے خارجی حالات، معاشرتی صورتِ حال اور شاعر کی شخصیت میں ماحول کی پیدا کردہ تبدیلیوں اور ترقیوں کا بھی مطالعہ کرنا ہے کہ شاعری کو اس کے پیش منظر اور پس منظر میں رکھے بغیر صحیح طور سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ ندیم کی عمر اس وقت لگ بھگ ۶۵ برس ہے اور انھیں شعر کہتے ہوئے تقریباً ۳۵ برس ہو چکے ہیں۔ اس عرصہ میں اُن کے چھ شعری مجموعے سامنے آ چکے ہیں۔ "جلال و جمال"، "رم جھم" (قطعات)، "شعلۂ گل" اور "دشتِ وفا"۔

پہلا مجموعہ ۱۹۴۶ء میں اور آخری مجموعہ ۱۹۶۳ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ احمد ندیم اپنی شاعری کے آغاز سے اب تک برصغیر کے صفِ اول کے مقتدر شعرا کی صف میں نمایاں رہے ہیں۔ اور یہ مقبولیت اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی شعری روایت ان کے خارجی ماحول سے ہم آہنگ رہی ہے ورنہ اُن کی بزرگ نسل، ہم عصر شعرا اور یہاں تک کہ بعد میں آنے والوں کا ایک کثیر گروہ بھی اپنی اپنی جگہ کھو چکا ہے۔ مثال کے طور پر میں جوش، حفیظ، علی سردار جعفری، ظہیر کاشمیری، شہرت بخاری، اختر رضا، اور فیض کا نام لوں گا جو کہ ایک زمانہ ادب کے نمایاں ہوئے، لیکن اب ان کی حیثیت زندہ مُردوں کی سی ہے۔

میں اس مضمون کا دائرہ قاسمی کی نظموں تک محدود رکھنا چاہتا ہوں، چنانچہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اُن کے عہد کی

نظم کے ارتقائی تناظر میں اِن کا تجزیہ کروں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں شاعر کی شخصیت کی داخلی قوتوں، فطری جذبات، میلانات اور نظریات کی تفہیم بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ان دونوں کے مرکب امتزاج کے بغیر کسی فن پارے کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ آیئے پہلے شاعر کی زندگی اور ذاتی حالات پر ایک نظر ڈالیں۔ احمد ندیم ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو ضلع سرگودھا کے ایک گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان علاقے کے پیروں کا خاندان تھا۔ پنجاب کے دیہات میں پیر پرستی کی جو شدید وبا ہے وہ چھپی ہوئی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایسے خانوادوں کے بچوں کو شروع سے ایسی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ آگے چل کر پیر پرستی کی اس تاریک دنیا میں اپنا اور اپنے بزرگوں کا نام روشن کریں۔ اتفاق سے ندیم کے کچھ قریبی عزیز تعلیم پاکر مدرسے سے باہر نکل چکے تھے جس کی وجہ سے اُن تک روشنی کی ایک کمزور کرن پہنچ رہی تھی۔ سچ پوچھیے تو یہی کرن آگے چل کر ندیم کے کلام میں مذہب پر شدید تنقید کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اگرچہ اُن کے خاندان کے مذہبی تقلید سے شروع ہی سے منحرف ہونے کی وجوہ اور ہیں۔ لیکن ایک پس ماندہ اور غریب دیہاتی علاقے میں رہنے کے باعث اُن کے معاشی حالات زیادہ قابلِ اطمینان نہیں تھے۔ خاندانی عظمت کے کاغذی پہاڑ اور غربت و افلاس کے تلخ سالوں سے لو ہوا تو ندیم کے وجود میں ایک بغاوت نے جنم لیا بغاوت کی جس کے شعلوں کی حدت آج بھی اُس کی شاعری میں محسوس ہوتی ہے۔ یہ ندیم کی وسعتِ قلب اور حوصلہ مندی کا کمال ہے کہ وہ اس آگ میں سُلگ کر جل اُٹھنے کے بجائے اس سے روشنی حاصل کرتے رہے۔ بچپن میں والد کی وفات کے بعد اپنے چچا خان بہادر حیدر شاہ کے ساتھ کیمبل پور میں رہے جو ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ ان کی آسودہ زندگی دیہات کے مسکنت زدہ ماحول سے اس حد تک مختلف تھی کہ نو عمر ندیم اس شدید تضاد کا کوئی جواز تلاش نہ کر سکا۔ اوائل عمر میں غربت اور امیری کے اس عجیب و غریب تجربے نے اُن کے احساس کو "انسان پرستی" کا وہ شعور دیا جو اُن کی شاعری کا اہم حصہ ہے۔ چچا کے پاس قیام کے دوران علمی و ادبی ماحول میسر ہوا جس سے انھیں احساس اور اظہار کے درمیانی مقامات سے آگاہی ہوئی اور عربی، فارسی اور اردو کی عمدہ شاعری سے تعارف حاصل ہوا۔ ان کی طبیعت میں شروع سے کچھ کرنے کی لگن تھی چنانچہ بچپن ہی میں شعر و ادب کی راہ اختیار کی۔ میٹرک کے بعد چچا کے ایما پر بہاولپور کالج میں داخل ہوئے لیکن ۱۹۳۲ء میں اُن کی ناگہانی وفات پر یک دم دنیا کے تلخ حقائق سے دوچار ہونا پڑا۔ کچھ عمر کا تقاضا اور کچھ طبیعت کی حساسیت، شاعری کی زبان میں طوفان کی تیزی سما گئی۔ جذبات و احساسات اگرچہ خام تھے لیکن تخیل کا وفور اپنے جوبن میں مست تھا۔ بیکاری، غربت، جذباتی واردات اور ناکامی ان سب نے مل کر کم و بیش آٹھ برس تک ندیم کو اپنے شکنجے میں جکڑے رکھا۔ اُن کی اس دور کی شاعری اسی نظر نہ آنے والے محبس کے شب و روز کی داستان ہے۔ "جلال و جمال" کے دیباچہ "میرا فنی نظریہ" میں انھوں نے خود اس کیفیت کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

"۔۔۔ ۱۹۳۱ء میں چچا جان مرحوم مشیرِ مال مقرر ہو کر بہاولپور تشریف لے گئے، تو ہم بھی ساتھ لائے گئے۔ وہیں حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے وفات پاگئے۔ سر پرست کا سایہ نہ رہا، منازع تو بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ تو دنیا اور اس کی رعنائیوں سے نفرت سی ہوگئی۔ کبھی دو برس کی شاید یہی بنیاد تھی جس نے ۱۹۲۹ء سے زندگی کو اور ۱۹۳۲ء تک میری شاعری کو ایک پتھنتے جلاتے ہوئے دھندلکے میں اندھا دھند بھٹکائے رکھا۔ مذہب، اخلاق، قانون، سماج، غرض، شعبہ

حیات میرے نزدیک ایک شکنجے کی صورت اختیار کرگیا اور اس دباؤ میں احساسِ بشریت سسکیاں لیتا رہا۔
لیکن مرا نہیں، ایک خوش گوار سنبھالا میرے مقدر میں تھا"۔۔۔۔۔

پہلی باقاعدہ نوکری جو بے حد مشکلوں اور سفارشوں کے بعد دستیاب ہوئی محکمہ آبکاری میں سب انسپکٹری کی آسامی تھی، ہمارے شاعر کے فرائض منشیات کی تیاری اور فروخت کے اڈوں پر چھاپہ اندازی، ملزمین کی گرفتاری اور عدالتوں میں بطور سرکاری گواہ کے حاضر تھے۔ اس طرح انھیں زندگی اور اس کے مسائل۔ گناہ اور اس کے محرکات اور عوام کی غلامی اور غربت کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا جس کا اثر اس دور کی نظموں اور افسانوں میں بہت واضح نظر آتا ہے۔ یہ زمانہ ترقی پسند تحریک کی ابتدا کا زمانہ تھا، لیکن ندیم ۱۹۴۲ء تک بیکاری اور پھر ناپسندیدہ ملازمت کے آشوب میں گھرے رہے اس دور میں انھوں نے بہت سی نظمیں لکھیں لیکن زندگی کے بارے میں واضح نظریہ نہ ہونے کے باعث یہ افکار کسی ٹھوس بنیاد سے محروم ہیں۔ شاعر کی اس دور کی قلبی و فکری صورتِ حال جاننے کے لیے ۲۸ فروری ۱۹۴۱ء کو لکھا ہوا اُن کی ڈائری کا ایک اقتباس دیکھیے۔

"عجیب زندگی ہے، سوچتا ہوں کہ میں اپنے آس پاس ہی اندھوں کی طرح "ٹٹول کر کوئی چقماق اثر مادہ" ڈھونڈ لوں ۔۔۔۔ میرے خیال میں ان مضحکہ خیز تصورات کے پیچھے کوئی آرزو کلبلا رہی ہے۔ کام کرنے کی آرزو، زندہ رہنے کی آرزو، لیکن میرے پاس کوئی کام نہیں ۔۔۔۔۔۔۔ یہ کہرا چھٹنے سے رہا، سانس لو، آنکھیں جھپکاؤ اور مر جاؤ، عجیب ماحول ہے۔ نہ گھنگھروؤں کی جھنکاریں، نہ دوشیزاؤں کی الاپیں، نہ میدانِ جنگ کا طبل، نہ تونی اجتماعوں کا جوش! بس دفتر کی بھاری اور سنگین دیواریں، غلیظ قلم اور خاکستری کاغذ۔ بوڑھے چپراسی اور بدمذاق افسر، چرس اور افیون کے سودے اور بے چین نیندیں"۔۔۔۔۔

یہ گھٹن، افسردگی اور بے چینی کی منزل بھی گذر گئی اور شاعر ایک نئے ولولے اور جوش کے ساتھ زندگی سے نبرد آزما ہوا مختلف رسالوں کی ادارت کی۔ ترقی پسند تحریک کے نظریات سے ذہنی ہم آہنگی کے باعث اس کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا۔ "ادبِ لطیف" کی ادارت کے دوران ایک مضمون کی اشاعت پر گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا۔ بری ہوئے۔ بیمار پڑے، گاؤں میں سکونت اختیار کی۔ لیکن لاہور کی ہوا شاعر کے سر میں سما چکی تھی بیتاب ہو کر پھر ادھر کا رخ کیا۔ مختلف اخبارات اور رسائل میں ملازمت کی۔ ہاجرہ مسرور کی معاونت میں "نقوش" کی ادارت سنبھالی، پھر "امروز" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکرٹری رہے۔ ۱۹۵۲ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب حکومت کے برسرِاقتدار آنے پر پھر شاہی مہمان خانہ نصیب ہوا۔ رہا ہونے کے بعد مختلف اخباروں سے بطور کالم نویس منسلک رہے، آج کل بھی "امروز" میں "عنقا" کے نام سے اپنا مشہور کالم "حرف و حکایت" لکھتے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں رسالہ "فنون" جاری کیا جو پاکستان کے معدودے چند ادبی رسالوں میں سرِفہرست ہے۔ اس دوران میں ۱۹۵۶ء میں حکومت کی طرف سے بطور اخبار نویس چین کا سفر کیا۔ ۱۹۶۳ء میں "دشتِ وفا" پر سال کی بہترین کتاب کا انعام حاصل کیا۔ ۱۹۶۸ء میں حکومت کی طرف سے ان کی ادبی خدمات کے صلے میں پرائڈ آف پرفارمنس دیا گیا۔

اس سے پیشتر کہ ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے اُن کی شاعری اور شخصیت کو اُن کے ماحول کے تناظر میں دیکھنا ضروری

ہے اُن کی ذاتی زندگی کا جو خاکہ اوپر درج کیا گیا ہے اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ندیم نے حوصلے، محنت، ذہانت اور فطری صلاحیتوں کی بدولت زندگی کے تمام نشیب و فراز میں کردار کی استقامت سے کام لیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ذہن کو ہمیشہ جائزہ اور مثبت تبدیلیوں کے لیے کشادہ رکھا ہے۔ ترقی پسند تحریک برصغیر ہند و پاکستان کی ادبی زندگی میں ایک انقلابی تبدیلی کی علم بردار ہے، تحریک کے آغاز سے قبل اُردو شاعری میں اقبال کا طوطی بول رہا تھا۔ اقبال ایک "جن" کی طرح شعری اظہار کے رستوں میں کھڑے تھے اُن کا وسیع مطالعہ، عظیم قوتِ تخلیق اور بے مثال قدرتِ بیان ایک آسیب کی طرح فن کی وادیوں پر محیط تھی بعد میں آنے والے لوگ خود کو اس عظیم شاعر کے سامنے بے بس محسوس کرتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے لیے نئے میدانوں کی جستجو کی۔ میراجی۔ راشد اور خالد ہیئت کے میدان میں جادہ پیما ہوئے۔ جب کہ اختر شیرانی، فیض اور حفیظ وغیرہ نے رومان کی وادیوں میں پناہ تلاش کی، ترقی پسند تحریک بھی ایک طرح سے، اقبال کی حد سے بڑھی ہوئی نظریہ پرستی اور مذہب پسندی کا ردِ عمل تھی۔ دنیا بھر میں مارکس کے نظریات نے گرتے ہوئے مذہبی اور معاشی نظاموں کی بیخ کنی شروع کر رکھی تھی، نئے، پُر جوش، آزادی پسند اور تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ان افکار کا چرچا شروع ہوا جس کی عملی شکل ترقی پسند تحریک کے پہلے اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۹۳۶ء میں ظاہر ہوئی۔ شاعروں اور ادیبوں کی نئی نسل جُوق در جُوق اس تحریک میں شامل ہوئی اور دلوں میں اس کے نظریات جنگل کی آگ کی طرح برصغیر میں پھیل گئے۔ مزدور اور کسان ہیرو قرار دیے گئے اور سرمایہ داری و جاگیرداری کو سب سے زیادہ قابلِ نفرت ٹھہرایا گیا، پرانے نظاموں کی شکست و ریخت کا عمل اور انسانی آزادی کے بارے میں جدید ترین تصورات کا پرچار شروع ہوا۔ انسان کی کمزوریوں کو معاشرے کی دین قرار دیا گیا۔ چنانچہ اس دور کے ادب میں طوائف اور ڈاکو کے بارے میں ہیرو پرستی کا رجحان عام نظر آتا ہے۔ مذہب کو استحصال کے آلۂ کار کے طور پر دیکھا اور دکھایا گیا۔ اتفاق سے یہی زمانہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا زمانہ تھا۔ چنانچہ تمام تبدیلیوں کی بنیاد جذبۂ آزادی پر رکھی گئی۔ ملک بھر میں غلامی کے خلاف جدّ و جہد جاری تھی ترقی پسندوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور شاید ادب میں آزادی کے سلسلے میں سب سے فعال رول اسی تحریک نے انجام دیا۔

تقسیم اپنے ساتھ بہت سے پیچیدہ اور غیر متوقع مسائل لے کر آئی، سیاسی نعروں کا جوش ذرا مدھم پڑا تو پتہ چلا کہ نئے ملک کے لیے جس پلاننگ کی ضرورت ہوتی ہے وہ سرے سے ناپید ہے استحصال پسندوں اور موقع پرستوں کے لیے یہ ایک سنہری لمحہ تھا چنانچہ ملک میں ایک شرمناک ڈرامہ شروع ہوا جس کا ایک عبرت ناک باب گزشتہ برس سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ مزدور، کسان اور آزادی پسندی کے نام لیو بھی اس صورتِ حال سے چکرائے ہوئے تھے۔ عدم اطمینان، معاشی بدحالی اور گوناگوں مسائل سے گھبرا کر بعض لوگ ایسے انقلابی حل کی طرف مائل ہوئے جو انقلاب کی سرشت میں موجود نہیں یعنی فوج کی مدد سے عوامی انقلاب کی کوشش۔ کچھ لوگ گوشہ نشین ہو گئے، گنتی کے چند لوگ تھے جنھوں نے اس تضاد کو حبِ وطن کی روشنی میں عقل کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کی، احمد ندیم قاسمی اسی آخری گروہ کے ایک نمایاں رکن ہیں۔ مسائل کی سنگینی کا احساس انھیں بھی تھا لیکن وہ انھیں اپنے ملک کی مخالف صورتِ حال میں دیکھتے تھے وقت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے ترقی پسندانہ نظریات کو اپنے ملک کی سالمیت اور محبت سے ہم آہنگ کر لیا اور تب سے اب تک وہ اس مسلک پر قایم ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس ملک میں نام نہاد ترقی پسندوں نے کبھی عہدوں اور بڑے بڑے مشاہرہ والی

پرائیویٹ نوکریوں پر فائز ہیں اور چین کی نیند سو رہے ہیں۔ لیکن اُن کے حصّے کی ساری لعن طعن ندیم کو سہنی پڑ رہی ہے جو دن رات اپنے بچوں کے لیے مزدوری، پیر پیدا کیے، قلم کی مشقت کر رہے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے زندگی بھر انسان دوستی، حبّ وطن اور معاشرتی انصاف کا پرچار کیا ہے اور اخباری کالم لکھ لکھ کر گذارہ کرتے ہیں جب کہ انقلاب کے نام لیوا ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھے آرٹ اور لٹریچر کے غم میں مرغِ سکولائزر کھا رہے ہیں۔ ملک میں جو حکومتیں قایم ہوئیں اُن کی استحصال پسندی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ندیم نے ہر دور میں حق و انصاف کے لیے آواز بلند کی، اُن پر حرص و طمع کے بوقلموں جال پھینکے گئے، لیکن وہ ہر آزمائش سے سرخ رو ہو کر نکلے کردار کی یہ استقامت اور نظریات پر ایمان کی یہ عملی مثال بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ملک سے محبت، اپنے عوام کی خوش حالی، استحصال سے نفرت، انسانی آزادی، اور مذہب کی غلط تعبیرات کے خلاف احتجاج قیامِ پاکستان کے بعد اُن کی شاعری کا خاصہ ہیں جن کی تفصیل اُن کی نظموں کے تجزیے سے سامنے آئے گی۔

"جلال و جمال" کی نظمیں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء تک کے دس سالوں کے کلام پر مشتمل ہیں یہ دور شاعر کی تشکیک، مایوسی، جھنجھلاہٹ، رومانوی واردات اور ترقی پسندی کے رویوں کو پیش کرتا ہے۔ تشکیک، مایوسی اور جھنجھلاہٹ کے رویے دراصل ایک ہی صورتِ حال کے مختلف روپ ہیں۔ پیری مریدی کے عمل میں مضمر مذہب اور خدا کی بگڑی ہوئی شکل نے ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا کیے۔ خارجی ماحول کی جبریت اور ذاتی محرومی نے ان میں مایوسی اور جھنجھلاہٹ کے رنگ بھرے، اس کے علاوہ اُس عہد میں اقبال کی ایسی نظمیں جن میں خدا سے "ڈائیلاگ" کیے گئے تھے، بہت مقبول تھیں۔ چنانچہ ان سب عوامل نے مل کر اُس دور میں ندیم سے ایسی نظمیں لکھوائیں جن میں خدا اور انسان کے رشتے کے قدیم تصورات کو شک اور غصّے کی نظر سے دیکھا گیا تھا۔ نظم "تذبذب" میں لکھتے ہیں ؎

اگر نجوم میں تو ہے تو چاند میں ہے کون
ترے جمال کی تقسیم ہو نہیں سکتی
ازل ابد کا تصور فقط تصوّر ہے
ترے وجود کی تقویم ہو نہیں سکتی
حرم میں تو ہے تو آخر کنشت میں ہے کون؟
کہ ایک ذات تو دو نیم ہو نہیں سکتی
جو تو تیں ہیں تری منتشر تو سچ کہہ دوں
کہ اس جہاں کی تنظیم ہو نہیں سکتی
(تذبذب)

اس نظم میں شاعر نے خدا کی ذات اور کائنات کے تعلق کے بنیادی سوال کو اٹھایا ہے اور اس شک کا اظہار کیا ہے کہ اگر اہلِ مذہب کے بنائے ہوئے تصور خدا کو مان لیا جائے تو کائنات کے بہت سے معاملات پر اُس کی حقانیت صادر نہیں ہوتی ۔۔۔۔۔

یہاں شاعر نے مذہبی قوانین اور رسوم [illegible] داج کو "دل آویز شکنجوں" سے تشبیہ دے کر ان سے اپنی بے زاری کا اظہار کیا ہے اور [illegible] کو تسلیم کرنے کے بعد کسی [illegible] کے تصور کو پیش کر کے اپنی ذہنی کشمکش کا برملا ذکر کیا ہے۔ یہ صورتِ

حال ایسی نظموں میں اور بھی شدید ہو جاتی ہے جہاں وہ تقدیر کے جبر کو پیش کرتے ہیں اس جبر کے اقرار کی تہہ میں بغاوت کی وہ چنگاری سلگ رہی ہے جو بھڑک کر شعلہ بننے کو بے قرار ہے ؎

آنکھ کھلتے ہی امڈ آتی ہے گھنگھور گھٹا
عشق، احساس، جوانی، غمِ دنیا، غمِ دیں
یوں بچھڑ جاتے ہیں ماحول و مقدر کے نقیب
جیسے فطرت کا کھلونا ہوں میں، انسان نہیں　　(تضحیک)

شاعر تقدیر کے جبر سے دل برداشتہ نظر آتا ہے۔ مظاہر فطرت کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے وقعت دیکھتا ہے اور سمے کے طوفانی ریلوں میں خود کو بے دست و پا محسوس کرتا ہے لیکن وہ اس صورت حال سے صلح نہیں کرتا بلکہ اپنی تمام تر بے بضاعتی کے باوجود مقابلے پر ڈٹ جاتا ہے ندیم کے یہاں مقابلے کا یہی رجحان آگے چل کر عظمتِ آدم کے تصور میں متشکل ہوا۔ وہ تقدیر کو للکارتے ہیں یہ للکار ایک باغی کا اعلان ہے، ایک چیونٹی کا ہاتھی کے خلاف اعلانِ جنگ ہے، ایک سرمد کا کلمۂ حق ہے۔

زندگی موت کا عنواں ہے تو ڈرنا کیسا
ایک نقطے پہ تجلی کا ٹھہرنا کیسا
میں تو یہ پوچھتا ہوں، کیا یہی خلاقی ہے
یعنی انسان تو فانی ہے، خدا باقی ہے
جزو فانی ہے تو پھر کُل کی بقا کیا معنی
یہ بھی فانی ہے تو پھر خوفِ خدا کیا معنی　　(اداس محبوبہ سے)

جبرِ مشیت کے قانون کو اس طرح للکارنا تشکیک، مایوسی اور جھنجھلاہٹ کے عمل کی انتہائی حد ہے جسے ندیم نے ایک باقاعدہ سفر کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ "جلال و جمال" کی نظموں کے ایک مخصوص حصے یعنی "داستانِ شوق" کا بیان بہت ضروری ہے۔ کیونکہ عورت کی محبت اور نسائی حسن کا جو تصور اور احساس ندیم کی ان نظموں میں نظر آتا ہے وہ محتاج نہیں ہے، اگرچہ یہ واردات اُن کی طویل عمر کے صرف ایک سال سے متعلق ہے۔ لیکن اس کی مہک زندگی بھر اُن کے ساتھ ساتھ رہی ہے، دیہاتی دوشیزہ اور دکھوں کے مارے ہوئے تعلیم یافتہ، حساس، پُرجوش اور نوجوان شاعر کی یہ داستانِ محبت مرد عورت کے ازلی رشتوں کے چند نہایت معصوم اور خوبصورت پہلوؤں سے متعلق ہے ؎

وہ جوانی، وہ جنوں کی رُت، وہ ارمانوں کا زور
مشتعل جذبات کے مجبوب طوفانوں کا زور
میری تمثیلوں کا موسم، تیرے فرمانوں کا زور

وہ تری آنکھوں میں نیندوں کا گلابی سلسلہ
وہ ترے بالوں میں اک اُودا سا پھول اُلجھا ہوا
وہ ترے ہونٹوں کے گوشوں میں تقاضا لمس کا

دل رُبا خوابوں کی دنیا میں چلے جاتے تھے ہم
خامشی میں بھی ترنّم کا مزا پاتے تھے ہم
پَو پھٹے چپکے سے گاؤں کو پلٹ آتے تھے ہم (یادِ رفتہ)

رومان اور محبت کی ان وادیوں میں ندیم نے جو ترانے گائے ہیں اُن کی نمایاں خصوصیت جذبات کی شدت اور بیان کی صفائی ہے وہ پڑھنے والوں کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیتے کہ اُن کی محبوب دنیا کی حسین ترین عورت ہے یا اُن دونوں کا عشق اس قدر غیر معمولی ہے کہ اگر "پاسِ عزت داراں" نہ ہوتا تو دنیا بھر کے عشاق محجوب ہوئے پھرتے عشق و محبت کے معاملات میں واقعیت کا یہ عنصر ان نظموں کو اُردو کی رومانوی شاعری میں ایک خاص اہمیت کا حامل کرتا ہے، انھوں نے محبت کی ناکامی کو مروجہ رواج کے مطابق سماج کی سازش بھی قرار نہیں دیا اور اس طرح جذباتی واردات کے بیان میں حقیقت پسندی سے کام لے کر ایک خوبصورت امتزاج پیدا کیا ہے ؎

غیر کی ہو کے بھی تم میری محبت چاہو
اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں یہ تارے کیسے
قافلے آئے، گئے، گرد اٹھی، بیٹھ گئی
اب مسافر کو اُفق پر سے اشارے کیسے (ترکِ محبت کے بعد)

ندیم کی رومانی نظمیں اُن کی داستانِ محبت کی طرح مختصر ہیں وہ غمِ جاناں کو غمِ دوراں میں ڈھالنے کا کمال جانتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ذاتی محرومی کے اندمال کے بجائے اجتماعی مسائل کی طرف توجہ کی ۱۹۴۲ء کے بعد اُن کی نظموں میں واضح طور پر انقلاب پسندی کا رجحان نظر آتا ہے یہ رجحان کبھی تو وطن کی آزادی کی شکل میں سامنے آتا ہے اور کبھی غریب اور استحصال زدہ طبقوں کے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے حقوق چھین لینے کے عزم کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ ندیم کے سامنے دو دشمن ہیں ایک تو فرنگی حکمران جو ملک پر قابض تھے اور دوسرے ملکی استحصال پسند طبقے جو اہلِ وطن کی محنت کا استحصال کر کے قبہ شکم کی پرورش کر رہے تھے، شاعر کی تنقید دونوں پر ہوتی ہے اور تندی و تیزی میں تلوار کی سی کاٹ رکھتی ہے۔ حالات کو بدلنے کا یہ عزم اتنا قوی ہے کہ وہ خوش رنگ مناظر، نرم و لطیف باتوں اور دلکش صحبتوں میں بھی نہیں بہلتا بلکہ سکون اور مسرت کو عام کر کے سب تک پہنچانا چاہتا ہے، اجتماعیت کا یہ احساس اُس معاشرتی شعور کا نمائندہ ہے جسے ندیم نے ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا ہے۔

ہم چٹانوں کے کلیجوں میں علم گاڑیں گے
چشمِ احرار میں جچتے نہیں خوش رنگ زجاج
میری محبوب یہ چپ چاپ سلونی شامیں
آج کے بھیس میں دکھلاتی ہیں کل کی معراج (سلونی شامیں)

"شعلۂ گل" ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۲ء تک کے چھ سالوں کا کلام ہے اس مجموعے میں کُل ۵۸ نظمیں شامل ہیں ان میں ندیم کا فکری ارتقا چند نئے امکانات کی تسخیر کرتا نظر آتا ہے، کہاں تشکیک، مایوسی، جھنجھلاہٹ اور رومان

کے بجائے مجدد نئے احساسات شاعر سے روشناس ہوئے ہیں اس کتاب کا غالب موضوع اُن کا تصورِ انسان ہے۔ ندیم نے اقبال اور نطشے کی طرح اس تصور کے لیے کوئی فلسفہ وضع نہیں کیا۔ بلکہ اُن کا انسان "دس مادی و معاشرتی صورتِ حال میں موجود تنفد ذات سے جنم لیتا ہے اور اپنے وسیع تر امکانات کی بازیافت کے عمل میں تمام موجودات کو تسخیر کر دیتا ہے" ندیم کے "انسان" کی یہ قوت کوئی اندھا یا وحشی جذبہ نہیں ہے بلکہ کائنات کا فطری اصول ہے کہ وہ مسلسل ارتقا پذیر رہتی ہے اس کے علاوہ اُن کا تصورِ انقلاب بھی زیادہ واضح ہوتا ہوا نظر آتا ہے کہاں وہ بین الاقوامی بھائی چارے اور روشنی کی بات کرتے ہیں اب اُن کے نزدیک استحصال محض فرد سے فرد یا افراد سے جماعت تک محدود نہیں بلکہ وہ اسے عالمی صورتِ حال میں تجارتی منڈیوں، مقبوضہ علاقوں اور استعماری فوجی اڈوں کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ تمام ایشیا سفید سامراج کے استحصال کا شکار ہے چنانچہ اب اُن کا پیغام اپنے ملک کے ساتھ ساتھ تمام دنیا کے استحصال زدوں کے لیے ہے وہ محنت کشوں کی محنت میں فردا کے نقش دیکھتے ہیں اور اس سلسلے میں کسی جغرافیائی حد بندی کے پابند نہیں ہیں بہتر ہوگا کہ اس دور کے مختلف رویوں کو اُن کی نظموں کے حوالے سے دیکھا اور سمجھا جائے۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ترقی پسند تحریک کے ارکان جس تذبذب کا شکار رہے اس کا ذکر اوپر کہیں کیا جا چکا ہے اس دور کا غالب رویہ عدم اطمینان اور شکستِ خواب کا ہے۔ فیض نے اس کیفیت کو "یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر" سے تعبیر کیا۔ ندیم اسے یوں بیان کرتے ہیں ؎

وہی موہوم اُجالا، وہی لالی، وہی کیف
وہی اک گونج میں لپٹا ہوا سناٹا ہے
صبح کے جشن کا انجام کہیں رات نہ ہو
تم جو چاہو تو ابھی سمت معین کر لو　　(سمت)

لیکن وطن کے حالات سے یہ مایوسی شاعر میں کسی منفی جذبے کو جنم نہیں دیتی، وہ اربابِ وطن کی بے حسی، اہلِ شوکت کی جاہ طلبی، اور موقع پرستوں کی وطن دشمنی سے نالاں اور بددل ضرور رہتا ہے۔ لیکن ہر حال میں عوام کو اپنے ساتھ پاتا ہے اور اپنی زمین کو استحصال سے پاک کرنے کا عزم جواں رکھتا ہے۔ ؎

نجوم بجھتے رہیں، تیرگی امنڈتی رہے
مگر یقینِ سحر ہے جنہیں، اداس نہیں

(رات بیکراں تو نہیں)

وطن کی محبت سے بھرپور ندیم کا یہ لہجہ طاقت اور توانائی کا مظہر ہے وہ اپنے دشمن کو پہچانتے ہیں اور اُس سے کسی حال میں مدد لینے یا دھوکہ کھانے کو تیار نہیں ہیں۔ اُمید اور عمل کی شمع ہاتھ میں لیے وہ اہلِ وطن کے لیے مستقبل کے جادے روشن کرنے میں ہمہ وقت مصروف ہیں وطن کی یہ محبت آگے چل کر ایشیا کے مظلوم لوگوں کی محبت اور جدوجہدِ آزادی میں ظہور پذیر ہوتی ہے سامراج کے خلاف وسیع تر محاذ پر لڑنے اور اسے شکست دینے کا عزم اس دور کی نظموں میں بہت نمایاں ہے لیکن اس عزم کی بنیاد محض جذباتی نعروں یا خواہش پر نہیں بلکہ وہ عالمی صورتِ حال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں، نئے محرکات، سامراج کے عزائم اور محکوم یا نئے آزاد ممالک کے مسائل سے آگاہ ہو کر اس موضوع پر

قلم اٹھاتے ہیں ۔ محنت کشوں اور مظلوم قومیتوں کا یہ عالمی انقلاب اُن کی مثالی دنیا کا نقطۂ آغاز ہے :۔

اس دور کی اکثر نظمیں ندیم کے اس انقلابی رویے اور محنت کش عوام سے رشتہ جوڑنے کے عمل کی آئینہ دار ہیں۔ لیکن، شعلۂ گل" کا سب سے نمایاں پہلو جبرِ مشیت کے مقابلے میں انسان کی عظمت کا تصور ہے ۔ یہ تصور "دشتِ وفا" تک پہنچتے پہنچتے ایک ایسی شکل اختیار کر جاتا ہے کہ ہم بلاکھٹکے شعر کے توسط سے شاعر کی نشان دہی کر سکتے ہیں یہ سعادت بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے کہ اُن کے شعری افکار اُن کی پہچان بن جائیں عظمتِ آدم کے سلسلے میں ۔

اُن کی نظم "انسان عظیم ہے" زبان زدِ خاص و عام ہے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ فنی اور فکری توازن کا ایک خوبصورت نمونہ ہے ؎

اُس نے تجھے عرش سے بُلایا
انسان عظیم ہے خدایا
تو سنگ ہے اور وہ شرر ہے
تو آگ ہے اور وہ اُجالا
انسان عظیم ہے خدایا
تو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے
وہ ایک مسلسل ارتقا ہے
ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا

(انسان عظیم ہے)

انسان کی عظمت کے اس احساس کا لازمی نتیجہ تقدیر اور مابعد الطبعیات کے بارے میں شاعر کے اندازِ فکر میں تبدیلی کا رونما ہونا تھا چنانچہ ندیم کی اس دور کی نظموں میں تشکیک اور مایوسی کے بجائے مذہب کے سلسلے میں سخت تنقید اور کہیں کہیں اس سے بھی دو قدم بڑھ کر نفی کی صورتِ حال نظر آتی ہے ۔ کارل مارکس نے جب مذہب کو افیون قرار دیا تھا تو غالباً اُس کے پیشِ نظر بھی اہلِ مذہب کا وہ کردار تھا جو استحصال کرنے والے گروہوں کی اعانت کے لیے تاریخ کے ہر دور میں انھوں نے بحسن و خوبی انجام دیا ۔ نام نہاد اہلِ مذہب کی ریاکاری انسانیت دشمنی اور ہوس پروری ہر دور میں شاعروں اور دانشوروں کے لیے مذہب سے بیزاری کا سبب بنتی رہی ہے اور پھر ندیم نے اپنے بچپن میں اس کے انتہائی گھناؤنے پہلوؤں کو بچشمِ خود قریب سے دیکھا تھا ۔ جب انھوں نے محسوس کیا کہ مذہب کے ٹھیکیدار اسے عوام دشمنی کے لیے استعمال کر رہے ہیں تو انھوں نے اس پر بڑی جارحانہ تنقید کی ۔ ان کے لہجے کی یہ تندی اور تیزی اس سے پہلے کی نظموں میں نظر نہیں آتی ۔

میرے نزدیک اس کتاب کی سب سے زیادہ قابلِ ذکر اور بہترین نظم اس کی آخری نظم "نیا ایشیا" ہے جو اس مجموعے کی طویل ترین نظم ہونے کے ساتھ ساتھ ندیم کے فن میں ایک نئی جہت کا نشان بھی ہے ۔ اسے شاعر نے "ظلم کے خلاف لڑنے والے فن کاروں کے نام" معنون کیا ہے یہ فن کار چین کے نوجوان ترقی پسند ادیب تھے جنہیں اپنے

نظریات کی بنا پر چیانگ کائی شیک کی سامراج نواز حکومت نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ندیم نے ان شہیدوں کے روشن لہو میں ایک نئی سحر کو طلوع ہوتے دیکھا ہے اور ان ایشیا بھر میں ہونے والی انقلابی جدوجہد کا سمبل بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ نظم ایک طرح سے دنیا بھر کے ترقی پسندوں کی انقلابی کوششوں اور فلسفے کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کی فنی حیثیت پر بحث فی الحال ملتوی رکھتے ہوئے اس کا فکری پہلو ایک نظر دیکھیے۔ یہاں اس کی کچھ متفرق لائنیں درج کی جاتی ہیں ؎

ایشیا ایک ایسا کھلونا رہا جس میں یورپ سدا کوک بھرتا رہا
کون جانے سیاست برائے دعویٰ ارتقا کتنے پانی میں ہے
کون جانے کہ وقت آج ساکن ہے یا حسبِ عادت روانی میں ہے
کون جانے کہ جب شاخ پر برف جمتی ہے کونپل کی تخلیق رکتی نہیں
کون جانے کہ بہتے ہوئے پانیوں میں کرن ٹوٹ سکتی ہے جھکتی نہیں

اپنے انجام کو پہنچتے پہنچتے یہ نظم شہید فن کاروں کا پیغام دنیا بھر کے محنت کشوں اور انقلابیوں کو دیتی ہے۔ یہ پیغام دراصل دنیا بھر کے محکوم ملکوں کے لیے ایک درسِ عمل ہے ؎

اے مرے ہم نصیبو، مرے ساتھیو
اے مرے دوستو، اے مرے ہم صفیرو۔ اٹھو
اے روایاتِ محکومیت کے رسیلے مگر
ٹوٹے پھوٹے قفس کے اسیرو۔ اٹھو
جب ادب زندگی کا اک آئینہ ہے تو یہ آئینہ
ہر آدمی کو دکھاتے چلو

(نیا ایشیا)

"دشتِ وفا" احمد ندیم قاسمی کا تا حال آخری مجموعہ کلام ہے اس میں ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۱ء تک کا کلام جمع کیا گیا ہے یہ کتاب اپنی جامعیت کے اعتبار سے اُن کی بہترین کتاب ہے۔ اس میں شاعر کے رجحانات و میلانات پختہ ہو چکے ہیں اور اس کے نظریات، تجربات و مشاہدات اور مطالعے کی بھٹی میں تپ کر کندن بن چکے ہیں۔ حیات و کائنات کے مسائل کے بارے میں نقطہ نظر واضح ہو گیا ہے۔ انقلاب کا تصور جدید انقلابی تصورات کی روشنی میں زیادہ نکھر کر سامنے آیا ہے۔ موضوعات کے لحاظ سے تنوع کے باوجود شاعر نے کسی نئے موضوع پر خصوصی توجہ نہیں دی بلکہ عام طور پر اپنے مخصوص رجحانات پر ہی قلم اٹھایا ہے۔ آزادی اور حریت کے جذبات اور عظمتِ انسان کا تصور ہی اس کتاب کے اہم مسائل ہیں لیکن اظہار میں شاعر پہلے سے بہت زیادہ منجھا ہوا نظر آتا ہے۔ ندیم اب براہِ راست اندازِ بیان کے بجائے تشبیہ اور علامت سے زیادہ کام لیتے ہیں اُن کی فکر زیادہ گہری اور کٹیلی ہو گئی ہے۔

نظم "تاریخ"، ایک مختصر نظم ہے لیکن ندیم نے آٹھ لائنوں میں اس کے ارتقا کو بہت خوبصورت علامتوں کے ذریعے واضح کیا ہے انھوں نے اس نظم میں انسان کو تاریخ کی تبدیلیوں کا محرک قرار دیا ہے اور اپنی نسل کو ایک نئے دور کی بشارت کے طور پر پیش کیا ہے، صدیوں سے تمازت سہہ کر جلی ہوئی چٹانیں آدم نو کو بہ نظر غور دیکھ رہی ہیں اور یہ آدم نو کوئی اور نہیں محکوم

قوموں کا انقلابی نوجوان ہے۔

پاکستان کی سیاست میں جو شعبدہ بازیاں رائج رہی ہیں اور جن کے طفیل قوم تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے وہ سب وطن فن کاروں کے لیے ہمیشہ باعث تشویش ہوتی ہیں۔ کنبہ پروری، رشوت ستانی اور خود غرضی کی بنیاد پر جو معاشرہ قائم کیا جا رہا تھا اسے ندیم جیسے حساس و محب وطن فن کار نے اس کی ابتدائی صورت میں شناخت کر لیا تھا ان کی نظم "درد وطن" نمونے کی حیثیت رکھتی ہے اس کی واضح مثال ہے ؎

هم سیاست سے محبت کا چلن مانگتے ہیں
شب صحرا سے مگر صبح چمن مانگتے ہیں
کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذن کلام
ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں

(درد وطن)

نظم ہمسفر اور ہمسفر عالمگیر اخوت کا پیغام ہے لیکن اس کا آہنگ نعرے کا نہیں ہے امید کا۔ شاعر نے اپنے عہد کی عالمی صورت حال میں محکوم قوموں اور انقلابی جماعتوں کی مجبوریوں اور سفید سامراج کے ہتھکنڈوں سے پیدا ہونے والی صورت کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یہ نظم جنوری ۱۹۵۰ء میں لکھی گئی ہے جب کہ پاکستان خود انتشار کے دہانے پر کھڑے ہونے کی طرف گامزن تھا جنوب مشرقی ایشیا، مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے بیشتر ممالک سامراج کی لگائی ہوئی آگ میں جل رہے تھے ایسے میں مظلوم ملکوں کا اتحاد ایک موہوم امید سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن شاعر کے ذہن میں یہ احساس موجود ہے کہ کمزور انقلابی جتھوں کی ہم آہنگی ایک مضبوط انقلاب کو جنم دے سکتی ہے چنانچہ وہ حوصلہ ہارنے کے بجائے حالات کی نامساعد سنگینی سے مقابلے کا عزم ظاہر کرتا ہے اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں کو جاننے کے باوجود تنہا نہ ہونے کا یہ خوش گوار جذبہ اس نظم کا مرکزی خیال ہے ؎

جنگل جنگل آگ لگی ہے بستی بستی ویراں ہے
کھیتی کھیتی راکھ اڑتی ہے دنیا ہے کہ بیاباں ہے
قدم قدم پر جھلسے جھلسے خواب پڑے ہیں راہوں میں
صبح کو جیسے کالے کالے دیپ عبادت گاہوں میں
ایک اک سنگ میل پہ کتنی آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی
ایک اک نقش قدم میں کتنی رفتاریں کترائی ہوئی
ہم سفرو! اے ہم سفرو! کچھ اور بھی نزدیک آ کے چلو
جب یہ تباہی مقدر ٹھہرا ہاتھ میں ہاتھ ملا کے چلو

(ہمسفر او ہمسفر)

مغرب کے سامراج میں مدہوش مشرق کی بیداری بیسویں صدی کی سب سے اہم تبدیلی ہے عالمی جنگوں نے یورپ

کو جس بری طرح تہہ و بالا کیا ہے اُس کی وجہ سے مشرق کو آزاد اور طاقت ور ہونے میں کافی سہولت مل گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے تیس برسوں میں بے شمار ممالک آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ چین اب جا کر کہیں اس قابل ہوا ہے کہ کمزور ایشیائی ممالک کے لیے مددگار ثابت ہو سکے۔ سنہ ۱۹۶۰ء تک روس واحد ایشیائی ملک تھا جو عالمی سیاست میں کوئی مقام رکھتا تھا۔ چنانچہ تمام محکوم اور نو آزاد ایشیائی ممالک کی طرح پاکستانی دانشور بھی اُسے مغرب کے خلاف اپنا نمائندہ تصور کرتے تھے۔ اس خیال کو زیادہ تقویت روس کے کمیونسٹ انقلاب اور نظام سے بھی ملی جو اس وقت تمام پس ماندہ ممالک کے لیے ذریعہ نجات بنا ہوا تھا۔ چنانچہ جب روس نے خلائی جہاز چاند کی طرف بھیجے تو سارے ایشیائی ممالک نے اسے مغرب کے خلاف اپنی کامیابی تصور کیا۔ ندیم کی نظم "گجر بجا دو" بھی اسی جذبے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ لیکن انھوں نے اس محدود موضوع کو اپنی تخلیقی قوت کے ذریعے نئی جہتوں سے ہم آہنگ کیا ہے وہ "سپوتنک" کی پرواز کو صرف مغرب کے لیے ہی نہیں، بلکہ فطرت کے لیے بھی ایک چیلنج بنا کر پیش کرتے ہیں ؎

مشرق کا افق چمک اٹھا ہے
مغرب کے غبار کو ہٹا دو
سورج کا اب انتظار کیا
پو پھٹنے لگی، گجر بجا دو

قرنوں سے تنی ہوئی فضا کو
انسان کا فیصلہ سُنا دو!
اے جنتِ گم شدہ کے راز و
آدم اُبھرا ہے، راستا دو

(گجر بجا دو)

ندیم نے اپنی شاعری میں دنیا بھر کی انقلابی تحریکوں کو بہ نظرِ استحسان دیکھا ہے اور انقلابی جدوجہد میں شریک لوگوں کی توصیف کی ہے چاہے وہ چین کے جفاکش کارکن ہوں یا ویت نام کے بہادر عوام۔ الجزائر نے فرانسیسی استعمار کے خلاف جنگ آزادی لڑی تو ندیم نے اُن کی اس تحریک کی پرجوش حمایت کی۔ اُن کی نظم "جمیلہ" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جمیلہ بوحیرد ایک حریت پسند الجزائری خاتون تھی جس نے آزادی اور حریت کے نام پر جان کی بازی لگا دی اور شدید ترین ظلم و ستم کے باوجود اپنے مقصد سے منہ نہ موڑا۔ اس کردار کی حمایت کر کے دراصل شاعر نے تمام ایسے لوگوں کی حمایت کی ہے جو اپنے اپنے ملکوں سے استحصال اور غلامی کو ختم کرنے میں مصروف ہیں ؎

پابہ زنجیر ہوئی وقت کی رفتار کہاں
جو کبھی کٹ نہ سکے ایسی شبِ تار کہاں
اے مرے جسم کو کانٹوں میں پرونے والے
بے غلامی سے بھی بڑھ کر کوئی آزار کہاں!

باندھے جاتے ہیں زبانوں پہ جہاں انگارے
وا ہوا بھی تو ہمارا لبِ اظہار کہاں!
اے طلب گارِ صباحت! مرے گھر کی سرحد
ساحلِ قلزمِ خوں ہے، خطِ گلزار کہاں
مجھ پہ اٹھا ہوا خنجر ترے دل میں اترا
جا کے ٹوٹا ہے ستم گر! ترا پندار کہاں　　　(جمیلہ)

نظم "ایشیا" بھی اس ظلم کی داستان ہے جو اس براعظم پر روا رکھا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے تہذیب کا مرکز اور ایک اٹھتا ہوا طوفان کہا گیا ہے جو غفلت کی نیند سے بیدار ہو کر ظالموں کے ساتھ اپنے حساب چکانے کو پرتول رہا ہے۔ نظم "صبحِ آگہی" ان تبدیلیوں کو بیان کرتی ہے جو بیسویں صدی میں اس تواتر، کثرت اور تیزی سے رونما ہوئی ہیں کہ ماضی کے تمام علوم اور فلسفے بیکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ نظم جہاں انسان کی عظیم قوت کی مظہر ہے وہاں ایک غیر محسوس حد تک دھیمے انداز میں مشرق کی بیداری کا مژدہ بھی ہے ۔

زمیں پر وہ قیامت کا دَور آیا ہے
کہ ہر لبیط حقیقت ہے جاں کنی سے دوچار
بساطِ ذہن پہ صرف ایک پھول کھلنے سے
ہٹی ہیں کتنی فصیلیں، کٹے ہیں کتنے حصار
ہیں لمحہ لمحہ کی زد میں صدی صدی کے اصول
کہ ہو رہی ہے نئی صبحِ آگہی بیدار　　　(صبحِ آگہی)

یوں تو "دشتِ وفا" کی بہت سی نظمیں اپنے موضوعات و تکنیک کے اعتبار سے قابلِ ذکر ہیں لیکن جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں یہ احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں کلیدی حیثیت نہیں رکھتیں لہذا میں ان سے قطع نظر کرتے ہوئے ان نظموں کا ذکر کروں گا جو پچھلے دس برسوں میں مختلف ادبی جریدوں کے توسط سے ہم تک پہنچی ہیں۔ یہ نظمیں کئی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہیں ۔

نظم "جنگل" بنیادی جمہوریت کے نظام کے نفاذ پر لکھی گئی ہے۔ اس میں ندیم نے جنگل کے معاشرے کو بطور پس منظر استعمال کیا ہے اور اس جدید نظام کی وحشیانہ روح کو اس کیلے طنز سے واضح کیا ہے یہ بظاہر ایک بے ضرر سی نظم محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اشعار میں چھپے ہوئے معنی پر غور کیا جائے تو اصناسات و واقعات کا دفتر کھل جاتا ہے ؂

اب کے مخدوش نہیں ہے جنگل

شیر غاروں میں پڑے اونگھتے ہیں	اور ہر غار کے منہ پر ہے چٹان
ان چٹانوں سے ذرا سا ہٹ کر	سنگ و فولاد کے ابھرے ہیں مچان
ان مچانوں پہ چڑھے بیٹھے ہیں	گھنے جنگل کے کئی پشتیبان

کوئی ساونت ہے کوئی بلوان

آ بیٹھیں چار طرف سو نگھتے ہیں　　　　بیٹھ کھڑ کے تو سنبھل جاتے ہیں

جھونکا شاخوں سے اگر بات کرے　　　　رنگ چہروں کے بدل جاتے ہیں

کوئی چڑیا بھی اگر بول پڑے　　　　ان کے ہتھیار بھی چل جاتے ہیں

تب یہ چٹکی سے نکل جاتے ہیں

(جب گل)

"جلال و جمال" کے رومانی دور کے بعد ندیم کی شاعری میں بہت کم ایسی نظمیں ہیں جنھیں خالص رومانی کہا جا سکتا ہے۔ اکثر و بیشتر رومانی نظمیں زندگی کے سنجیدہ اور سنگین مسائل کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔ لیکن اُن کی نظم "اظہار" اس سلسلے میں ایک خوشگوار گریز کی مثال ہے۔ ایک ایک شعر نو عمری کے معصوم تحیر و تند و تیز جذبوں سے لبریز ہے شاعر نے محبوب کے اظہارِ محبت اور اس سلسلے میں پیش آنے والے مسائل اور کیفیت کو نہایت خوبصورتی سے نظم کیا ہے ؎

تجھے اظہارِ محبت سے اگر نفرت ہے
تو نے ہونٹوں کو لرزنے سے تو روکا ہوتا
بے نیازی سے مگر کانپتی آواز کے ساتھ
تو نے گھبرا کے مرا نام نہ پوچھا ہوتا
یوں تو مجھ سے ہوئیں صرف آب و ہوا کی باتیں
اپنے ٹوٹے ہوئے فقروں کو تو پرکھا ہوتا
تیرا غماز بنا خود ترا اندازِ خرام
دل نہ سنبھلا تھا تو قدموں کو سنبھالا ہوتا
اپنے بدلے مری تصویر نظر آ جاتی
تو نے اس وقت اگر آئینہ دیکھا ہوتا
حوصلہ تجھ کو نہ تھا مجھ سے جدا ہونے کا
ورنہ کاجل تری آنکھوں میں نہ پھیلا ہوتا

(اظہار)

ایوب خاں کے صدارتی انتخاب کے موقع پر کراچی میں حکومتی پارٹی نے جو ظلم و ستم روا رکھا اُس کی داستان نظم "محصورِ گل" میں کچھ یوں بیان ہوئی ہے ؎

محصور ہو گئے ہیں عجب فصلِ گل میں ہم
کلیوں کے دل فگار ہیں پھولوں کے سر قلم
تاروں کا قتل پردۂ شب میں ہوا مگر
دستِ سحر سے خون تو ٹپکے گا صبح دم

چُپ چاپ پی گئے ہیں لہو کی پکار کو
دانش وری کے یوں تو بڑے مدعی ہیں ہم　　　(حصار گُل)

نظم "نیلام" قاسمی کی مختصر نظموں میں انتہائی خوبصورت، بامعنی اور بھرپور نظم ہے پہلی لائن سے آخری لائن تک فکر اور اظہار کی اکائی ایک لمحے کے لیے کمزور نہیں پڑتی۔ یوسف کی تلمیح اُردو شاعری میں اس اس طرح استعمال کی گئی ہے کہ بظاہر اس میں کسی چونکا دینے والے امکان کی دریافت ممکن نظر نہیں آتی۔ لیکن دیکھیے ندیم نے اسے کس طرح نئی جہتوں سے روشناس کیا ہے ؂

تم میں وہ کون ہے جو یوسفِ کنعاں کے لیے
آخری بولی دے گا؟
سب غلام ایک سے ہوتے تو یہ نیلام بھلا
کس لیے برپا ہوتا
اور یہ یوسفِ کنعاں تو ہے صورت گرِ کونین کا معیارِ جمال
دامن و جیب کو تم سیم و زر و لعل و جواہر
سے تو بھر لائے ہو
وہ مگر اور ہی دولت ہے جو درکار ہے
یوسف کے خریداروں کو
تم اسے کچھ بھی کہو، سُوت کی انٹی، کہ تہی دستِ محبت کا ملال　　　(نیلام)

روس ایک مدت تک تمام دنیا کے انقلابیوں کے لیے درس گاہ کا کام کرتا رہا ہے خود ندیم بھی ترقی پسند تحریک اور اس کے بعد کے زمانے میں روس کے مداح تھے روس کو انھوں نے مغرب کے خلاف مشرق کی بیداری کا مظہر کہا اور اس کی ترقیوں اور سائنسی کامیابیوں پر دل کھول کر مبارک باد دی۔ لیکن عرب اسرائیل جنگ میں روس کے ترماک عوام دشمن رویے سے وہ سخت دل تنگ ہوئے اور انھوں نے روس پر نہ صرف سخت تنقید کی بلکہ آیندہ کے لیے اُس کی حمایت سے بھی دست کش ہو گئے کم وبیش ۲۵ برس کی ذہنی اور نظریاتی رفاقت کو اصولوں کی خاطر توڑنے کا یہ حوصلہ کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے ندیم کی نظم "روشنی کی تلاش" اس عمل کی شاہد ہے کہ وہ اپنے اصولوں کے مقابلے میں کسی چیز کی پروا نہیں کرتے ؂

اب کہاں جاؤ گے اے دیدہ ورو
اب تو اُس سمت بھی ظلمت ہے جہاں
شب کے الاؤ میں نہا کر، سرے سورج کو اُبھرنا تھا
گجر بجتے تھے!
اب تو مشرق پہ بھی مغرب کا گماں ہوتا ہے　　　(روشنی کی تلاش)

نظم "محنت کش" کا عنوان ہی اس کے موضوع کا تعین کرتا ہے۔ لیکن ندیم نے اس کے مصرعوں کی ترتیب میں ایسا التزام رکھا ہے کہ نظم کلائمکس پر پہنچ کر ایک ایسا جھٹکا دیتی ہے جو اعصاب کو چند لمحوں کے لیے ہلا کر رکھ دیتا ہے انھوں نے اس کے اختتام میں PARADOX کا استعمال جس مہارت سے کیا ہے اُردو شاعری میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں اس نظم کا دوسرا بند دیکھیے ؎

ہمیں سے قایم ہے جب سے اب تک بھرم نمو کا
ہمیں سے بالیدگی جوان ہے
یہ ساما اعجاز ہے ہمارے تپاں لہو کا
جو چار جانب رواں دواں ہے
جہاں جہاں روحِ زندگی رقص کر رہی ہے
ہماری محنت گہر فشاں ہے
۱۰ اسی لیے تو ہمارے ہاتھوں میں روشنی ہے
ہمارا چہرہ دھواں دھواں ہے　　　　(محنت کش)

ندیم کے اس آخری یعنی موجودہ دور کی بہت سی نظمیں میرے پیشِ نظر ہیں لیکن میں اُن میں صرف ایک نظم انتخاب کر رہا ہوں۔ یہ نظم انھوں نے سقوطِ مشرقی پاکستان سے متاثر ہو کر لکھی ہے میں اس کے موضوع، تکنیک، ہئیت وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کیونکہ یہ اُن معدودے چند نظموں میں سے ایک ہے جو تنقید اور تجزیے سے بجائے واضح ہونے کے اپنی حیرت انگیز کشش کھونے لگتی ہیں۔ آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان لکھی ہوئی یہ نظم ایک محبِ وطن شاعر کے سچے اور پرخلوص جذبات کی مظہر ہے یہ جذبہ ہم سب کسی نہ کسی سطح پر محسوس کرتے ہیں لہٰذا میں یہ نظم بلا تبصرہ درج کر رہا ہوں ؎

میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن ۔۔ میں روتا ہوں
امیدوں کی تانبے کی طرح تپتی ہوئی زرد فصیلوں کے آئینوں میں
جب خود کو مقابل پاتا ہوں ۔۔ میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن ۔ میں روتا ہوں
جب اک اک لمحۂ تنہائی مفلوج سا ہو کر رینگتا ہے
جب شب کاٹے کٹتی ہی نہیں
میں اپنے لہو کے قطروں کو اپنی رگِ جاں میں پروتا ہوں
میں روتا ہوں ۔ اے ارضِ وطن ۔۔ میں روتا ہوں
میں نکہتِ گل کا رسیا تھا اب مجھ پر یہ افتاد پڑی

پھولوں سے بچ کر چلتا ہوں، کانٹوں کو دل میں چبھوتا ہوں
میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن ـ میں روتا ہوں
آ میری چِلا اُتار کے اپنے سارے زخم رفو کر لے
جب تک اے ماں
اے میرے جیسے کتنے کروڑوں کی باعظمت، باعزت، باعصمت ماں
تیرے دامانِ دریدہ کو میں آبِ سرشکِ غیرت وغم میں دھوتا ہوں
میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن ـ میں روتا ہوں (میں روتا ہوں)

جہاں تک ندیم کی نظموں کے فنی ارتقا کا تعلق ہے اس کے عمل کی تفہیم کے لیے پہلے کرنا ضروری ہے کہ اُن کی فن کاری کا اندازہ دائرۂ کار اور نوعیت کیا ہے؟ اُن کی نظم نگاری کا آغاز ذاتی رومانی واردات کے تذکرے سے ہوا اس دور میں اُن کی نظمیں تکنیکی اعتبار سے اپنے دور کے رومانویوں سے متاثر ہیں چنانچہ بہت سی نظمیں غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ عام طور پر بندوں کی تقسیم میں کسی مخصوص فارمولے پر عمل نہیں کیا گیا دو مصرعوں سے لے کر دس دس مصرعوں تک سے قافیہ بند ٹکڑے ملتے ہیں لیکن زیادہ زور تین اور چار مصرعوں کے بندوں پر دیا گیا ہے "جلال وجمال" کی نظمیں موسیقیت کے اعتبار سے ندیم کی تمام شاعری میں منفرد ہیں جذبات واحساسات کی ناپختگی کی تلافی شاعر نے لفظوں کو متحرک تصویروں کی شکل میں لکھ کر کی ہے اس میں شک نہیں کہ ان نظموں میں کہیں کہیں ایسے الفاظ بھی ہمارے سامنے آتے ہیں جو بظاہر ادق اور نامانوس دکھائی پڑتے ہیں لیکن ان کی موجودگی محض اتفاقی نہیں ہے اس دور میں ندیم نے طوفانی رفتار سے نظمیں کہی ہیں، جب کہ کتابِ فن میں وہ ابھی محض مبتدی کی حیثیت رکھتے تھے چنانچہ موزونیٔ طبع اور احساسِ نغمگی کے باوجود وہ ایسے نامانوس، کمزور اور کم صوت الفاظ کی گرفت سے نہ بچ سکے، مثلاً ؎

۱۔ اُف یہ بے باک نگاہی یہ بھبھوکا چہرہ
۲۔ کتنی تاریک نگاہی ہے کہ یورپ والے
"آدمی" ہیں مگر انسان نہیں بے چارے
۳۔ تم کہاں تھے مرے بچھڑے ہوئے بھولے بھیا
اے بہن میں نے تجھے جان لیا مان لیا
۴۔ چیخ سی شدتِ غم سے ہوئی انجن سے بلند
۵۔ اُف یہ لپٹا ہوا اُلجھے ہوئے بالوں میں وجود
۶۔ وہ میرے دل تک میرے گھروندے میں آ گیا
۷۔ خیالوں کی خوابیدگی کیا ہوئی
سیاہی کی سنجیدگی کیا ہوئی

۸۔　گلیوں کی شمعیں بجھ گئیں اور شہر سونا ہو گیا
بجلی کا کھمبا تھام کر بانکا سپاہی سو گیا

وغیرہ ۔ وغیرہ ۔ لیکن ندیم کے ابتدائی کلام کی یہ کمزوری اُن کے لیے پیرِ تسمہ پا نہیں بنی (جیسا کہ اکثر شاعروں کے ساتھ ہوا ہے) بلکہ وہ بہت جلد لفظوں کی اہمیت اور اُن کے حسنِ استعمال کے رموز سے آگاہ ہو گئے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ لفظوں کے سلسلے میں اُن کی فن کاری نئے نئے اور اُن خوش آہنگ حوالوں سے سامنے آتی رہی ہے مثال کے طور پر اُن کی نظم "چھ ستمبر" سے ایک شعر دیکھیے ۔ تشبیہ کے حسن سے قطع نظر لفظوں کی دروبست اور اصوات کی ترتیب شاعر کے حسنِ کمال کی آئینہ دار ہے ؎

اتنی بے چین تھی اُس رات مہک پھولوں کی
جیسے ماں، جس کو ہو کھوئے ہوئے بچے کی تلاش

ندیم کے فنی ارتقا کے ضمن میں میرے نزدیک پانچ باتیں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں ۔

۱۔ بحروں کا استعمال　۲۔ امیجری　۳۔ ترنم اور بے ساختگی　۴۔ مختصر نظم کی تکنیک ۔۔۔
۵۔ آزاد نظم ۔ جہاں تک بحروں کے استعمال کا تعلق ہے "جلال و جمال" کی چند نظموں سے قطع نظر اُن کی اکثر نظمیں موضوع اور پیرایۂ اظہار کے خوبصورت امتزاج کو پیش کرتی ہیں ۔ ندیم اپنے پڑھنے کے مخصوص انداز کی وجہ سے سینکڑوں میں پہچانے جاتے ہیں ۔ ایسی صورت میں اس بات کا شدید اندیشہ رہتا ہے کہ شاعر چند محبوب بحروں تک محدود ہو کر رہ جائے جو اُس کے پڑھنے کے انداز سے قریب تر ہوں ۔ لیکن ندیم نے اس کے برعکس متنوع بحروں کے استعمال میں اپنی فن کاری کے جوہر دکھائے ہیں اور جہاں تک میرا علم کام دیتا ہے یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ اقبال کے بعد آنے والے نظم گوؤں میں کسی نے ندیم سے زیادہ بحروں میں طبع آزمائی نہیں کی ۔ زیادہ بحروں میں شاعری کرنا قطعاً قابلِ ذکر بات نہیں ہے ۔ لیکن اگر یہ شاعری اپنے مواد کے اعتبار سے وقیع ہو تو بحروں کا استعمال ایک اضافی صفت ضرور بن جاتا ہے ۔ انھوں نے اپنی پابند نظموں میں بھی ارکان کی کمی بیشی سے معروف بحروں کو زیادہ خوبصورت طریقے سے برتا ہے ۔ جو بحریں ہندی سے متاثر ہیں اُن میں الفاظ زیادہ تر ہندی کے استعمال کیے ہیں لیکن شاعر نے اس بات کا خصوصی التزام رکھا ہے کہ ایسے الفاظ اپنی اصوات کے ذریعے خیال کی [illegible] اور رد[illegible] بن [illegible] ۔ مثلاً ؎

میں کیا جانوں [illegible] سپنا تھا یا ہونی کا سایا تھا
برسوں سُلگ سُلگ کر میں نے من کا دیا جلایا تھا

[illegible] طویل بحروں کے سلسلے میں بھی ندیم نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ شعری مواد اپنی ہیئت کے ساتھ ہم آہنگ رہے ۔ اس ضمن میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ "جلال و جمال" کی ابتدائی نظموں سے [illegible] اُن کی تازہ ترین نظموں تک طویل بحروں یا لمبے لمبے مصرعوں سے اُن کی رغبت کبھی کم نہیں ہوئی ۔ اُن کی تازہ نظموں [illegible] ملاحظہ کیجیے اور کچھ پرانی ۔

بہت پرانی نظمیں بھی دیکھیے ؎

زندہ ہے پاکستان تو ہم سب زندہ ہیں۔ پائندہ ہیں
سورج ہے رخشندہ جب تک، تارے بھی تابندہ ہیں ـــ ۱۹۷۲ء

نیچے اب تک رنگ بھرے ہیں، اب تک ہونٹ امنگ بھرے
ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہیں پتھرائی سی آنکھیں نگراں ـــ ۱۹۷۱ء

میں نے احساس کے ان گنت تار چھیڑے، مگر کوئی نغمہ نہ پیدا ہوا
یعنی انساں کا وجدان بھی اس الوہی تصور کی ہیبت سے مسحور ہے ـــ ۱۹۴۹ء

ایک بہت پتلی پگڈنڈی ساحلِ دریا سے مندر تک کانپ رہی ہے
ناؤ چلانے والی لڑکی، چپو کو ماتھے سے لگائے ہانپ رہی ہے ـــ ۱۹۴۰ء

وہ فرشتوں کی قطاریں سی شعاعوں کے سہارے سے زمیں پر اتر آئیں
وہ تھرکتے ہیں ستاروں سے پرے نور بھرے بحر میں روحوں کے سفینے ـــ ۱۹۳۷ء

IMAGERY تمثال کاری فن شعر میں حسن کاری کے پراثر ترین حربوں میں سے ایک ہے بلکہ اگر اس کو بہترین طریقہ کہا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا۔ اس فن کو ہمارے کلاسیکی شعرا نے جو جہتیں عطا کی ہیں اُن سے کون واقف نہیں پھر ہماری اپنی صدی میں اقبال جیسا عظیم شاعر پیدا ہوا جس کے زبردست ذہن نے زمین و آسمان کی وسعتوں پر کمندیں ڈالیں اور اکثر مواقع پر کامران ہوا۔ اقبال کے ساتھ سب سے بڑا ظلم اس کے مداحوں نے یہ کیا ہے کہ اسے مفکرِ پاکستان اور فلسفی اسلام وغیرہ ثابت کرنے میں اپنا سارا زور صرف کر دیا اور یہ بھول گئے کہ وہ بطور شاعر اتنا عظیم ہے کہ اسے ان بیساکھیوں کی کوئی حاجت نہیں۔ اقبال کا ذکر یہاں اس لیے نکل آیا کہ IMAGE کے استعمال کا جو سلیقہ اس نے دکھایا ہے اس کا کسی سے مقابلہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کی اس روایت کا بہت خوش گوار اثر بعد کی شاعری پر پڑا۔ چنانچہ ندیم کے یہاں IMAGE کے ضمن میں جو فن کاری اور وسعت نظر آتی ہے اُسے بالواسطہ طور پر اقبال کا ہی فیضان کہنا چاہیے۔ اس سے میری یہ مراد نہیں کہ ندیم نے IMAGE کے سلسلے میں اقبال کی تقلید کی ہے بلکہ اس حقیقت کی نشان دہی کرنا ہے کہ وہ IMAGERY جو نئی شاعری کو کلاسیکی شاعری سے ممیز کرتی ہے دراصل اقبال کی آغاز کردہ ہے یہ اور بات ہے کہ ہر نیا آنے والا شاعر اس میں مسلسل اضافہ کر رہا ہے۔ ندیم کی کچھ نظموں میں انسانی احساسات و جذبات کے لیے جو تصویری پیکر تشکیل ہوئے ہیں وہ صرف اُنہی کا حصہ ہیں خصوصاً روحانی واردات کے اظہار میں انھوں نے منظر کشی، سراپا نگاری اور جذبات نگاری کو نہایت تمثالوں کے ذریعے واضح کیا ہے ؎

زندگی پر سُرور طاری ہے
خواب انگڑائیاں سی لیتے ہیں
نرم پاؤں دولتے خنک جھونکے
نیند کی کشتیوں کو کھیتے ہیں

(رات اور دن)

اندھیارے کا درپن ٹوٹا پورب نے پُور بسائی
انگارے کا جھومر پہنے، اوشا نے لی انگڑائی
جنگل مہکے، پنچھی چہکے، بہکی بہکی پروائی
بھور آئی

(بھور آئی)

پچھم میں پگھل رہا ہے سونا
سونے میں لہو کی دھار دوڑی
وہ ایک حسینۂ سیہ پوش
آشفتہ و بے قرار دوڑی

(دائرہ)

بیٹھی ہوگی کسی دیوار کے سائے میں خموش
اپنی نوخیز جوانی کے نشے میں مدہوش
کیف آنکھوں میں، تمناؤں کا سینے میں خروش
عیشِ امروز کی دنیا میں نہ فردا ہے نہ دوش
اوڑھنی سر پہ سیہ رنگ کی ڈالے ہوگی
اپنے اڑتے ہوئے بالوں کو سنبھالے ہوگی

(پرواز جنوں)

دیکھ یہ گھاس پہ موہوم سے کیڑے کا خرام
اس کے ادراک سے بالا ہے دو عالم کا نظام
اک ذرا چھو تو اسے، کانپ کے بل کھائے گا
اور اس گھاس کی پتی سے اُتر جائے گا

(اُداس محبوبہ سے)

روٹیاں بوٹیوں میں تُلتی ہیں
عصمتوں کی بھی دُکانوں پر
پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے
خون کا ذائقہ زبانوں پر

(آزادی کے بعد)

دُور موڑ نے سُلگتی ہوئی آنکھیں کھولیں
چاک در چاک شبِ تار کا پیراہن ہے

(مسافر)

تھرتھری ہاتھ کی رُک جائے تو لب ہلتے ہیں
لب اگر بند ہوں گالوں پہ بکھرتے ہیں گلال

گال چھپ جائیں تو آنکھوں میں کھنے ہیں چراغ
آنکھیں مُند جائیں تو ماتھے پہ کنول کھلتے ہیں

(اظہار)

سر بر آوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
چاند بلور کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کی طرح اٹکا ہے
آسماں سرمئی فرغل میں ستارے ٹانکے
سمٹا جاتا ہے، جھکا آتا ہے
وقت بےزار نظر آتا ہے (وقت)

قہقہے، جیسے خالی برتن لڑھک کے ٹوٹیں
بحثیں، جیسے ہونٹوں میں سے خون کے چھینٹے چھوٹیں (ریستوران)

مجھے احساس ہے کہ IMAGERY کے ضمن میں اقتباسات بہت زیادہ ہو گئے ہیں لیکن ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا ہے اول اس لیے کہ میں امیجری کو محض تصویر کاری نہیں سمجھتا اور دوم یہ کہ میں ندیم کے فن کے اس پہلو کو خصوصی طور پر اجاگر کرنا چاہتا تھا مندرجہ بالا مثالوں میں تشبیہ، پورٹریٹ، تصویر کاری، جذبات و احساسات کی تجسیم اور منظر نگاری سب کچھ ایک دوسرے میں مِل جل گیا ہے اور میرے نزدیک ندیم کی بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ اساتذہ کی طرح مختلف شعری صنعتوں کو بالالتزام پیش نہیں کرتے بلکہ اسے اپنے موضوع کا تابع اور شریک بنا کر سامنے لاتے ہیں۔

ندیم کی شاعری میں ترنم، بے ساختگی، سلاستِ بیان اور روانی وغیرہ کی وضاحت کے لیے میں الگ سے مثالیں دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اس مضمون میں اُن کی شاعری سے کئی اقتباسات درج کیے گئے ہیں جو ندیم کی ان خصوصیات سمجھنے کے لیے بہت کافی ہیں۔

مختصر نظموں میں ندیم نے جو مہارت حاصل کی ہے اُس کے پیچھے قطعہ نگاری میں اُن کی گہری دلچسپی، تجربہ، فن کاری اور مشق شامل ہے یہ نظمیں عام طور پر بڑے (SUBTLE) انداز میں ختم ہوتی ہیں، NARRATION جو عام طور پر شاعری کی تکنیک رہی ہے ان نظموں میں بے حد کم ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ندیم کو مختصر نظم کی ہئیت، شعری اسلوب اور فن کے تقاضوں کا مکمل شعور حاصل ہے۔ مختصر نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس کا موضوع بہت تیکھا اور گہرا ہو اور اس طرح پیش کیا جائے کہ قاری چند لمحوں کے لیے اس کے احساس کی شدت سے مبہوت رہ جائے اس لحاظ سے ایسی نظم کی آخری دو لائنیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں ان میں ذرا سا جھول ساری نظم کے تاثر کو غارت کر دیتا ہے ندیم اس ادق گھاٹی سے کیسے گزرے ہیں آپ بھی دیکھیے ۔

اے میری پرستشوں کی حق دار
آ میں ترے حسن کو نکھاروں
چہرے سے اٹھا کے گردِ ایام
آ میں تری آرتی اتاروں

تو مری زمیں بھی آسماں بھی
میں تجھ کو کہاں کہاں پکاروں

(وحدت)

کتنے کوسوں پہ جا بسی ہے تو
میں تجھے سوچ بھی نہیں سکتا
اتنا بے بس ہوں تیری سوچ کو میں
ذہن سے نوچ بھی نہیں سکتا
مجھ سے تو دور بھی ہے پاس بھی ہے
اور مجھے یہ تضاد راس بھی ہے

(تضاد)

اتنی خوشبو ہے کہ دم گھٹتا ہے
اب کے یوں ٹوٹ کے آئی ہے بہار
آگ سی جلتی ہے کہ کھلتے ہیں چمن
رنگ شعلہ ہے تو نکہت ہے شرار
روشوں پر ہے قیامت کا نکھار

جیسے تپتا ہو جوانی کا بدن
آبلہ بن کے چٹکتی ہے کلی
کونپلیں پھوٹ کے لَو دیتی ہیں
اب کے گلشن میں تو بالیدگی بھی جلی

(بہار)

اظہارِ مدعا کی اجازت کا شکریہ
لیکن مری زبان تو واپس دلائیے
الفاظ سے صدا کی صفت کس نے چھین لی
اس رہزنی کا کھوج تو پہلے لگائیے

جب مل گیا مجھے مری آواز کا سراغ
جنباں رہیں گے کنجِ لحد میں بھی میرے لب
یوں بولنے کو بول تو دوں آج بھی مگر
تاروں کے ٹوٹنے سے نہ ٹوٹا سکوتِ شب

(صدائے بے صدا)

نظموں پر تشریحی نوٹ لکھنا تو ادب کے عما اور جغادری ناقدوں کا کام ہے مجھ ناتواں میں اس بار کے اٹھانے کی سکت نہیں لہذا میں آپ کو مندرجہ بالا مختصر نظموں کے فاضلانہ تجزیے سے متاثر نہیں کروں گا یوں بھی میرے نزدیک اچھی نظم

کی تفہیم علم اور فہم سے زیادہ ذوقِ سلیم کی طالب ہوتی ہے البتہ آپ کی توجہ آخری نظم کے آخری مصرعے "تاروں کے ٹوٹنے سے نہ ٹوٹا سکوتِ شب" کی طرف ضرور مبذول کرانا چاہوں گا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ حوالہ بھی پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ یہ نظم پاکستان کے ایک سابق صدر ایوب خان کے صدارتی انتخاب کے بعد لکھی گئی تھی جو اُس نے محترمہ فاطمہ جناح کے خلاف جیتا تھا۔ ندیم کے یہاں حرّیتِ فکر اور آزادیِ اظہار کے سلسلے میں جو ترقی پسندانہ اور انقلابی رویہ پایا جاتا ہے اس سے سب اہلِ نظر واقف ہیں اب اس تناظر میں اس نظم کو دیکھیے اور غور فرمائیے کہ شاعر نے ان آٹھ مصرعوں میں احساس کی کیسی کیسی نازک رگوں کو چھیڑا ہے۔

ندیم نے آزاد نظم لکھنا بہت دیر میں شروع کیا یعنی جب وہ کم و بیش پندرہ برس شاعری کر چکے تھے۔ یہ زمانہ وہ ہے جب اُن کے گرد و پیش راشد، میرا جی، فیض اور اُن کے بعد آنے والی ایک بڑی نسل اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کر رہی تھی۔ لیکن میرے خیال میں شروع کے چند سال شاعر اپنے آپ کو اس نئے پیرایۂ اظہار سے صحیح طور پر ADJUST نہیں کر سکا۔ البتہ پچھلے چند برسوں میں ندیم نے جو آزاد نظمیں لکھی ہیں اُن کا ایک اپنا انداز ہے اور بالآخر شاعر نے مواد اور ہیئت کے اس نئے رشتے کی دریافت میں ایک مشکل مرحلہ طے کر لیا ہے۔ آزاد نظم کی طرف ندیم کی یہ رغبت اور جھکاؤ محض اتفاقی یا رواجی نہیں ہے اس لیے اس میں شاعر کا خلوص اور تجربے کی سچائی نظر آتی ہے۔ انھوں نے آزاد نظم کو اپنی شہرت کے لیے زینہ نہیں بنایا بلکہ اُس وقت اختیار کیا جب وہ پابند نظم کے ذریعے شعرا کی صفِ اول میں جگہ حاصل کر چکے تھے نیز انھوں نے آزاد نظم کو صرف اُن خیالات کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے جو شاید نظم کے پرانے ڈھانچے میں زیادہ موثر طریق پر پیش نہ ہو پاتے۔ انھوں نے آزاد نظم کو اس بے معنی علامیت، بدآہنگی اور لایعنیت سے آلودہ نہیں کیا جس کی وجہ سے اکثر قارئین اس صنفِ سخن سے اب تک مانوس نہیں ہو پاتے۔ میں اس مضمون کو اُن کی ایک آزاد نظم پر ختم کر رہا ہوں جو میرے نزدیک اُن کی نظموں کے فنی ارتقا کی وہ آخری کڑی ہے جو اب تک ہمارے سامنے آئی ہے — "جلال و جمال" سے اس نظم "کھنڈر" تک احمد ندیم قاسمی کا فنی سفر ایک بڑے شاعر کی عظمت، فنی استعداد اور روحِ عصر سے ہم آہنگی کی کہانی ہے جو اُن کے بعد آنے والے شاعروں کے لیے ایک اچھی مثال ثابت ہو سکتی ہے ؎

یہ میری تاریخ کا کھنڈر ہے
یہ میرے راہوارِ برق پیکر کی ہڈیاں ہیں
یہ میری تلوار ہے جو تنکا بنی پڑی ہے
یہ ڈھال ہے جس پہ پاؤں رکھ دو تو خشک پتے کے ٹوٹنے کی پکار سُن لو
یہ میرے پرچم کی دھجیاں ہیں
یہ میری قدروں کی کرچیاں ہیں
یہ میرے معیار ہیں جو پتھر بنے پڑے ہیں
یہ میرے افکار ہیں جنھیں عنکبوت نے اپنے تانے بانے کی کھونٹیاں سی بنا لیا ہے،
یہ ٹوٹی چھت کو سالہا سال سے سنبھالے ہوئے جو اک ناتواں ستون ایستادہ ہے
یہ مری انا ہے۔

(کھنڈر)

آصف ثاقب

ندیم کا دبستانِ شاعری

اُردو ادب میں طرزِ فکر، جہتِ احساس، قرینۂ اظہار اور تمدن میں تفاوتوں اور مناقشوں کے پیشِ نظر مختلف دبستانوں کے چرچے رہے ہیں اور رہیں گے۔ سرسید نے نثر میں "عقلیت" کو موضوع بنایا۔ متاثرین اس ادا کو لے اُڑے۔ یعنی ایک دبستانِ نثر عالمِ وجود میں آیا۔ آزاد کا اسلوب سرسید اور ان کے متاثرین سے جدا ہے۔ شاعری کے دو دبستانوں میں لکھنؤ کا دبستانِ شاعری اور دہلی کا دبستانِ شاعری دو مختلف نہج کی شاعریوں کا مسلک بن گئے۔ جدید شاعری پر اقبال کے اثرات بہت عمیق ہیں۔ اقبال نے شاعری کو نئی طرزِ گویائی دی، علامتوں اور اشاروں کو نئے معنی پہنائے۔ نئی بات کی تلاش اور اس کی ادائیگی کے ڈھنگ میں جدت سب نے اقبال سے سیکھی۔ اقبال انسانیت کی رفعتوں کا علمبردار تھا۔ بعد میں آنے والے شعرا اس کے نغمات سے بے حد متاثر ہوئے۔ شعرا کی عظمت کا معیار یہ ہوا کہ انھوں نے "اقبالیت" کو اپنی افتادِ طبع کے رنگ و بو سے اپنی انفرادیت میں متشکل کیا۔ جو شعرا اس زمرے میں آتے ہیں۔ ان میں احمد ندیم قاسمی بلند مقام رکھتا ہے۔ ندیم نے اقبالیت کو اپنی شخصی و طبعی خصوصیات کی آنچ دے کر اپنی ذات سے خاص کر لیا۔ یہ "انسان دوستی" کے "مال" سے اپنی شاعری کی دکان بھر ڈالی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ندیم نے اس ضمن میں کوئی مشکل علائم وضع نہ کیے۔ بلکہ سیدھی سیدھی باتیں کی ہیں۔ اس طرح اس کے اندازِ تفکر اور مسلکِ شعریت نے اس کی شاعری میں فن کے نئے رُخ متعین کیے۔ اس کا نصب العین بھی انسانیت کی سربلندی ہے۔ مگر طبعی رنگوں نے اس کے اظہار کو سنجیدہ و متین اب و لہجہ دیا۔ ندیم کے حساس دل نے زندگی کی ناہمواریوں، انسانیت کی تذلیل اور معاشرتی خرابیوں کو دل سے محسوس کیا اور آنسو بہاتے۔ یہ "آنسو بہانا" اس کا اپنا ہے، کسی اور سے نہیں سیکھا۔ ندیم نے حقائق کو کسی حد تک اقبال سے سمجھا مگر ان کے ساتھ اس کا طرزِ عمل، برتاؤ اپنا ہے۔ یعنی اس کی تمام کی تمام شعری حسیات ذاتی ہیں۔ انسانیت کے دکھ درد کو اس کا دل اپنی انفرادی حیثیت سے محسوس کرتا ہے۔ ندیم نے اقبال کی طرح عصری تقاضوں سے خوش گوار التفات برتا۔ اس التفات پر ندیم کی اپنی شخصیت کی چھاپ ہے۔ ندیم نے اپنے فنی احساس کو بروئے کار لا کر جذبات و خیالات کی سب کیفیتوں کو اظہار کے ذاتی وسیلے عطا کیے۔ ان وسیلوں پر اگرچہ اقبال کا اثر موجود تھا مگر ندیم نے ان کو اپنے شعور سے جلا دے کر صرف اپنے فن کے لیے چمکا لیا۔ ان میں "انسان سے عشق" اور

"رجائیت" کے محاکاتی پہلو اور اشاراتی تصویریں زیادہ اہم ہیں۔ چونکہ یہ سب وسیلے زبان و بیان اور نصب العین کے اعتبار سے اپنے اندر گہری کشش رکھتے ہیں، ان کے مظاہر "یونیورسل اپیل" کے حامل ہیں اس پر طرہ یہ کہ یہ اپنے وقت کے تقاضوں کے پہلو بہ پہلو چل رہے ہیں، اس لیے آج کی شاعری پر ان کے زبردست اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ہم عصر شعرا پر ندیم کا گہرا اثر ملتا ہے۔ اس طرح اردو شاعری کا نیا دبستان یعنی ندیم کا دبستانِ شاعری ظہور پذیر ہوا ہے۔ نصب العین و اظہار کے سب متذکرہ بالا وسیلے ندیم کے دبستان شاعری کے عوامل کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے ہیں۔ ندیم کے دبستانِ شاعری کا مسلک ندیم کے اس شعر سے ظاہر ہے ؎

یہ جی میں آتی ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں
کہ خون بن کے رگِ سنگ میں اتر جاؤں

یعنی حالات کی سنگینیوں کو خون کی "تر و تازگی" بخش کر عالم انسانیت کے لیے پُر بہار بنا لیا جائے۔ اس شعر کا ایک ایک لفظ رجائیت کا پیکر ہے۔ ندیم کی طرح اس دبستان کے بھی شاعر مذہبِ انسانیت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ انسانیت کی زبوں حالی انھیں بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ یہ سب کے سب "انسان کی سربلندی" کی جد و جہد میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ندیم کی طرح اپنی محبت اور چاہت کا مرکز انسانیت کو سمجھتے ہوئے انھوں نے بھی انسانیت کی "خوبصورتیوں" کو موضوعِ شعر بنایا ہے۔ غرض یہاں ہر فن پارے میں در پردہ یا کھلم کھلا "انسان عظیم ہے" کا مضمون ملتا ہے۔ اس دبستان میں بھی علامتوں اور اشاروں کے سہاروں کی تدش دیکھنے میں تو آتی ہے مگر ان میں پیچیدگی نہیں بلکہ لگی لپٹی رکھے بغیر بات کہہ گزرنے کا انوکھا اسلوب ہے۔ چنانچہ دبستان کا منشور وہی ٹھہرتا ہے جو ندیم کے موقف و منشا کے عین مطابق ہے۔ یہی "انسانیت کی" والا جاہی" کا اعتراف۔ ندیم کے نزدیک خدا سے انسان کا رشتہ ایسا نہیں کہ انسان "مخلوقِ حقیر و پر تقصیر" کے سوا کچھ معلوم نہ ہو نظم "انسان عظیم ہے" کہ اس بند میں اس نے خدا سے دو ٹوک بات کر کے انسان کی عظمت کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ "عظمت" جو ندیم کے دبستان شاعری کا طرۂ امتیاز ٹھہری ہے۔ "انسان عظیم ہے" کا ایک بند ؎

تو سنگ اور وہ شرر ہے　　　تو آگ ہے اور وہ اُجالا
تو نم ہے، نمو کا پاسباں ہے　　　تو دشت ہے وہ چراغِ لالہ
انسان نے تجھے حسیں بنایا
انسان عظیم ہے خدایا

چونکہ کسی دبستان کی حدیں جغرافیائی نہیں ہو سکتیں بلکہ طرزِ احساس، قرینۂ اظہار، اور تشکیلِ لزومات کی یکسانی پر اس کے تعین کا انحصار ہوتا ہے اس لیے اپنی ہمہ گیر اپیل کے بل بوتے پر ندیم کا دبستان شاعری وسیع و عریض ہے۔ لکھنؤ اور دلی کے دبستانوں کی طرح ندیم کے دبستان کی خصوصیات بھی واضح ہیں۔ لکھنویت اور دہلویت کی اصطلاحوں کی مناسبت سے ندیم کے دبستان کی خصوصیات کو "ندیمیت" کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔ ندیمیت عین رجائیت ہے اور رجائیت عین ندیمیت۔ ندیمیت کے سبھی عناصر احمد ندیم قاسمی کی شخصیت، افتادِ طبع، اور قوتِ تخیلہ کے مرہونِ منت ہیں۔ ان عناصر کے پیچھے رجائی "شعورِ ذات" کارفرما ہے۔ وہ عناصر یوں ہیں۔ (۱) انسان دوستی نصب العین

کی عظمت کا احساس) (۲) گفتگو کا اثر آفریں اور شفیق انداز (رفیع الشان نصب العین کی بدولت) (۳) سنجیدہ و متین لب و لہجہ، جدتِ اظہار و مضمون (۴) زندگی کی ناہمواریوں کا شعور (۵) اپنی شان اور روایات کی پاسداری (۶) شدتِ احساس کی مخصوص بحر (۷) غزلوں میں نظمیت کا عنصر (۸) امیجری اور علامتوں میں اقبالیت۔

یہ سبھی اجزاء ندیم کے دبستان کے کم و بیش تمام شعراء کے ہاں منقش دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ندیم کی شخصیت کی ملائمت، پیار، خلوص، اندازِ نظر، رواداری، غرض انسانیت کے تمام لوازم تاثیر رکھتے ہیں۔ اسی لیے اس کا حلقۂ اثر بہت بڑا ہے۔ ندیم کی شخصیت کا مکمل تجزیہ کرنا دشوار سہی، اس کے فن کے "جلال و جمال" کا اقرار مشکل نہیں۔ ندیم کے دبستان کے شعراء کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ان کے تمام نام گنوانے بظاہر آسان نہیں تاہم ان چند شعراء کے نام سردست مثالاً دیے جا سکتے ہیں جو اپنی انفرادی اقدار رکھتے ہوئے بھی اس دبستان کے نمائندے کہلائے جا سکتے ہیں۔ ان کے نام ہیں قتیل شفائی، ظہیر کاشمیری، شکیب جلالی، مصطفےٰ زیدی، ناصر کاظمی، احمد فراز، شہزاد احمد، منیر نیازی، احمد مشتاق، ظہور نظر، محسن احسان، سیف زلفی، منظور عارف، خلیل رام پوری، جمیل ملک، احمد ظفر، عدیم ہاشمی، خالد احمد، اختر امام رضوی اور کئی دوسرے۔ قتیل شفائی کی شاعری میں ندیمیت کے عناصر ہوتے ہوئے بھی ایک بالکل مختلف خصوصیت ہے، غنائیت، جو قتیل کو منفرد مقام بخشتی ہے۔ احمد فراز کی شاعری پر ندیمیت کے علاوہ کچھ باہر کے عوامل بھی اثر انداز ہیں۔ مثلاً اس کی شاعری میں فیض کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ تاہم اسے ندیمیت سے زیادہ "شوخ" اور خوبصورت نسبت ہے۔ مصطفےٰ زیدی فکر و خیال میں ندیم کے بہت قریب ہیں مگر ان کی امیجری اور لب و لہجے میں پرتوِ جوش ہے۔ شکیب جلالی گو ندیمیت کے ساز و سامان کا سوداگر ضرور تھا مگر وہ رفتہ رفتہ اپنی ہمہ گیری اور طبعِ رسا کی بدولت نئے دبستانِ شاعری کے "خاکے اور خط" ترتیب دیتا دکھائی دے رہا تھا۔

ندیم کے دبستانِ شاعری کے اجزاء کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ندیم کے اشعار پھر متاثرین کے اسی مضمون کے شعر درج ذیل کیے جاتے ہیں۔ رسم یہ رہی ہے کہ دبستانوں کی جزویات کی آئینہ داری کے لیے غزلوں کے اشعار بطور حوالہ لکھے جائیں۔ اس رسم کی یہاں پابندی کی گئی ہے۔ غزلوں کے اشعار میں ایمائیت اور رمزیت کے جوہر پائے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے ایک طویل مضمون بھی بہ اختصار بیان کر دیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ "جزویات بیانی" کے سلسلے میں غزلوں کے اشعار زیادہ کارگر ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ندیم کی منظومات سے بھی حسبِ ضرورت خوشہ چینی کی جا سکتی ہے۔ بہرنوع سب سے پہلے ندیمیت کا ممتاز ترین عنصر لیا جاتا ہے۔

انسان دوستی (نصب العین کی عظمت کا احساس): انسانیت سے بھرپور پیار، انسان سے محبت اور شفقت کا برتاؤ ندیم کا خاصۂ شاعری ہے۔ اس کی شاعری کی خصوصیات کے سبھی سوتے اسی ایک "جزوِ آغاز" سے پھوٹتے ہیں۔ اس نے خانوں میں بٹی ہوئی پریشان حال انسانیت کو یکساں اور مطمئن دیکھنے کے خواب آنکھوں میں سجا رکھے ہیں۔ ان کی تعبیر کے سلسلوں کے نشانات اس کے شعروں میں ملتے ہیں۔ ان شعروں کا لطف و سرور صرف انسان کے تذکرہ پر موقوف ہے۔ ندیم نظم "مری شکست" میں ایک جگہ کہتا ہے۔

ے

اسی شکستِ تمنا کے دم سے آج مجھے
دکھائی دیتے ہیں کتنے صنم چٹانوں میں
رہی عزیز کچھ ایسی جہاں کی لاج مجھے
کہ میں بھٹک نہ سکا تیرہ آسمانوں میں
کوئی گداز نہیں خلد کے فسانوں میں
مری بہشت ہے تنکوں کے آشیانوں میں
بڑا سرور ہے انساں کی داستانوں میں
لبھا سکا فقط انسان کا مزاج مجھے

ندیم نے موضوع کی اہمیت کی روشنی میں "بیان" کے کتنے حسین پیکر تراشے ہیں۔ اس کی غزلوں میں بھی یہی "روپ" ہے۔ اور جہاں بجا انسان دوستی کے جذبات و خیالات موج زن ہیں۔ اس کا یہی مسلک اس کے متاثرین نے بھی سینے سے لگا رکھا ہے۔ پہلے حسبِ موقع ندیم کی غزلوں کے کچھ اشعار دیے جائیں گے، پھر دبستان کے نمائندہ شعراء کی غزلوں میں سے نمونے پیش کیے جائیں گے۔

حیران ہوں کہ دار سے کیسے بچا ندیم　　　وہ شخص تو غریب و غیور انتہا کا تھا

چہرے ہیں کہ مرمر سے تراشی ہوئی لوحیں　　　بازار میں یا شہرِ خموشاں میں کھڑا ہوں

موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو　　　پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے

میں قیامت کا تو منکر نہیں لیکن واعظ　　　مجھ سے انساں کو تماشا نہ بنایا جائے

اس سے پہلے کہ حشر آنے لگے　　　کاش انسان مسکرانے لگے

دشمن بھی جو چاہے تو مری چھاؤں میں بیٹھے　　　میں ایک گھنا پیڑ سرِ راہ گذر ہوں

احمد ندیم قاسمی

متاثرین:- کل کائنات فکر سے آزاد ہو گئی　　　انساں مثالِ دستِ تہِ سنگ رہ گیا

ظہیر کاشمیری

بتا سکے ہیں پڑوسی کسی کا درد کبھی　　　یہی بہت ہے کہ چہرے سے آشنا ہے کوئی

شکیب جلالی

اک موجِ خونِ خلق تھی کس کی جبیں پہ تھی؟　　اک طوقِ فردِ جرم تھا کس کے گلے میں تھا!

مصطفیٰ زیدی

گئے دنوں کی لاش پہ پڑے رہو گے کب تلک　　الم کشو، اٹھو کہ آفتاب سر پر آگیا　　ناصر کاظمی

خوب واقف تھا وہ انسان کے اندھے پن سے　　جس نے بھی دن کے اجالے میں جلایا سورج　　قتیل شفائی

بھولے تھے خدا کو مگر انساں کو نہ بھولے　　ہم پر کسی کافر نے یہ احساں بھی کیا ہے　　جمیل ملک

تجھ میں کس بل ہے تو دنیا کو بہا کرلے جا　　چائے کی پیالی میں طوفان اٹھاتا کیوں ہے　　شہزاد احمد

جرم آدم نے کیا اور نسلِ آدم کو سزا　　کاٹتا ہوں زندگی بھر میں نے جو بویا نہیں　　منیر نیازی

تم نے تو چھین لی مجھ سے مری گویائی بھی　　میں تو اک کاغذِ آتش زدہ تھا، کیا کرتا　　محسن احسان

رہ گیا مشتاق دل میں رنگِ یادِ رفتگاں　　پھول مہنگے ہو گئے قبریں پرانی ہو گئیں　　احمد مشتاق

مجھے خبر تھی مرا انتظار گھر میں رہا　　یہ حادثہ تھا کہ میں عمر بھر سفر میں رہا　　ساقی فاروقی

نیند آرہی ہے کرب کی آغوش میں مجھے　　سینے پہ دستِ غم ہے ترے ہات کی طرح　　سیف زلفی

کیا بتلاؤں کیسے دن کاٹ رہا ہوں　　موتی ہوں اور رستے میں بیکار پڑا ہوں　　خلیل رامپوری

میرے کوٹ کا میلا کالر اور نمایاں ہوتا ہے　　بانکی سج دھج رکھنے والے تیرے سامنے بیٹھے کون　　احمد ظفر

میرے رستے میں بھی اشجار اگا یا کیجے　　میں بھی انساں ہوں مرے سر پہ بھی سایا کیجے　　عدیم ہاشمی

اک برگِ سبز شاخ سے کر کے جدا بھی دیکھ　　میں پھر بھی جی رہا ہوں، مرا حوصلہ بھی دیکھ　　مرتضیٰ برلاس

میں خاک ہی سے بنا تھا تو کاش یوں بنتا　　کہ اس کے ہاتھ سے گرتے ہی ٹوٹ جاتا میں　　[illegible] شعور

نہ منزل ہوں نہ منزل آشنا ہوں　　مثالِ برگ اڑتا پھر رہا ہوں　　اطہر نفیس

اک عمر ہو گئی ہے کہ میں جاں کنی میں ہوں　　ایسی ٹھہر گئی ہے یہ ساعت عذاب کی　　سلیم شاہد

گفتگو کا اثر آفریں اور شفیق انداز (رفیع الشان نصب العین کی بدولت) ندیمیت کا نصب العین انسانیت کی سلامتی اور آشتی ہے۔ سلامتی اور آشتی کے لیے جگر کاوی کے ساتھ ساتھ صبر و تحمل چاہیے۔ چنانچہ ندیم متحمل ہے۔ وہ بڑے پیارے انداز سے بہتری اور فلاح کی بشارت دیتا ہے۔ کمزور پہلوؤں کا ذکر بھی بڑی شفقت سے کرتا ہے، وہ بھی ایسے کہ برا نہ لگے۔ اپنے اس رفیع الشان نصب العین کی بدولت ندیم بڑے دل گردے کا مالک ہے۔ ندیم کی گفتگو دل میں گھر کر جانے والی صفت رکھتی ہے۔ یہ مشفقانہ انداز نظم "دوستو آؤ!" کے اس "پارے" میں ملاحظہ ہو ؎

دوستو آؤ!
اپنی بنا کا ملبہ کھودیں
آؤ جنتی دھرتی میں
جو اشکوں سے سیراب ہوئی ہے
امیدوں کے موتی بو دیں

دوستو آؤ!
خون آلود زمین سے پھول اگانا سیکھیں
آؤ!
محنت اور لگن سے جینا سیکھیں
عزت سے مرجانا سیکھیں

گفتگو میں شفقت کی اس "رنگت" سے غزلوں کے اشعار اثر آفریں بھی ہیں اور دل خوش کن بھی ہے

انصاف کی سزا تو اک اعزاز ہے مگر　　پہلے بتا تو دیجیے میری خطا مجھے
اتروں گا چمن پہ اوس بن کر　　میں لوٹتی رات کی دعا ہوں
کچھ ایسے لگا جو تونے دیکھا　　جیسے آئینہ دیکھتا ہوں
ہم کو اپنا سراغ پانے تک　　کتنی صدیاں لگیں زمانے لگے
تو مرا کفر بھی ہے تو مرا ایمان بھی ہے　　تو نے لوٹا ہے مجھے تو نے بسایا ہے مجھے

احمد ندیم قاسمی

متاثرین :-

رسوائیوں کا آپ کو آیا ہے اب خیال	ہم نے تو اپنے دوست بھی دشمن بنا لیے	قتیل شفائی
آ کر گرا تھا ایک پرندہ لہو میں تر	تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر	شکیب جلالی
یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر	سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں	ناصر کاظمی
میں تری بزم سے نکلا تھا نظر کی صورت	اب نہ یوں دیکھ مجھے دیدۂ حیراں کی طرح	ظہیر کاشمیری
پتھر نہ پھینک دیکھ ذرا احتیاط کر	ہے سطحِ آب پر کوئی چہرہ بنا ہوا	شہزاد احمد
زندگی! ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ	اور تو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے	احمد فراز
ہاتھ میرا اے مری پرچھائیں تو ہی تھام لے	ایک مدت سے مجھے تو سوجھتا کچھ بھی نہیں	ظہور نظر
دیتا تمھارا نطق دہائی تو نطق تھا	لوح و قلم کے نام سے فن کار بولتے	سیف زلفی
تجھ کو رہا نہ اپنے زرِ غم کا اعتماد	ورنہ یہ دل تو دردِ جہاں کا امین تھا	منظور عارف
اپنا درد بھلا دیں اے دل اس کے درد کی خاطر	اپنے گھاؤ یاد نہ آئیں چاند کے گھاؤ دیکھیں	احمد ظفر
جسم کی پتلی کو روشن کر کے دنیا سے گزر	آنکھ خواہش کی نظر رکھتی ہے، دھوکا کھائے گی	خلیل رامپوری
میں خاک بن کے فضا میں بکھر بکھر جاؤں	کسی کے پاؤں تلے زینۂ صبا بھی تو ہو	خالد احمد
میں تو کہتا ہوں کہ تم ابرِ کرم ہو لیکن	کاش صحرا مرے الفاظ کی تائید کرے	مرتضیٰ برلاس
جان دے دوں گا تجھے لیکن سلیقے سے تو مانگ	تو ضرورت مند ہے احکام تو جاری نہ کر	عدیم ہاشمی

سنجیدہ و متین لب و لہجہ، جدتِ اظہار و مضمون ـــــ ندیم کے لب و لہجے کی متانت و سنجیدگی اپنی ساری دل آویز رنگینیوں کے ساتھ حسنِ احساس سے بھرپور ہے۔ یہ لب و لہجہ کمال خود اعتمادی سے اظہار و مضمون میں جدیدیت کا داعی ہے۔ ندیم کی خوددار طبیعت دیگر امور کی طرح اظہار و مضمون کی وادی میں بھی اپنے لیے نئے راستے تلاش کرتی ہے۔ جدت اور نئے پن سے لگاؤ کی وجہ سے ندیم میں تکرار کا عیب بھی نہیں۔ اس کی شاعری گوناگوں رنگوں اور روشنیوں سے عبارت ہے۔ سنجیدہ و متین لب و لہجہ، جدتِ اظہار و مضمون نظم "سفر جاری ہے" میں دیکھیے ـــ

کنارِ آبِ رواں شبنمی شگوفوں میں
جہانِ رنگ شعاعوں کے انتظار میں ہے

ندی کی نرم روی میں نجوم او نگھتے ہیں
اداس چاند نہاں نور کے غبار میں ہے
سحر کا ہے یہ تقاضا کہ آفتاب ابھرے
یہ جگنوؤں کا اک انبوہ کس شمار میں ہے

اب غزلوں کے اشعار میں سے

ٹوٹا تو کتنے آئینہ خانوں پہ زد پڑی　　اٹکا ہوا گلے میں جو پتھر صدا کا تھا
سورج نے گھنے صنوبروں میں　　جالے شعاعوں کے بُنے ہیں
اب تو پتھر کے زمانے سے نکل آؤ ندیم　　اب تو سوچوں کے تصادم سے شرارا نکلا

احمد ندیم قاسمی

دبستان کے شعراء:۔

بنی نہیں جو کہیں پر، کلی کی تربت تھی	سنا نہیں جو کسی نے ہوا کا نوحہ تھا	شکیب جلالی
سوچ کو جراَتِ پرواز تو مل لینے دو	یہ زمیں اور ہمیں تنگ دکھائی دے گی	قتیل شفائی
یہ صبح کی سفیدیاں، یہ دوپہر کی زردیاں	میں آئینے میں ڈھونڈتا ہوں میں کہاں چلا گیا	ناصر کاظمی
چھوٹے تھے جو قامت میں جنھیں جھک کے ملا تھا	اُن ہاتھوں کے پتھر مرے سر تک نہیں پہنچے	منظور عارف
منتظر کب سے تحیر ہے تری تقریر کا	بات کر، تجھ پر گماں ہونے لگا تصویر کا	احمد فراز
ذہن کے تاریک گوشوں سے اٹھی تھی اک صدا	میں نے پوچھا کون ہے اس نے کہا کوئی نہیں	شہزاد احمد
راتوں کو کلی بن کر چٹکتا تھا ترا جسم	دھوکے میں چلی آئی نسیمِ سحری بھی	مصطفےٰ زیدی
زمین پر ہی کہیں نور کا سراغ لگاؤ	ستارے ڈوب گئے چرخ پر قمر بھی نہیں	حنیف فوق
عمر بھر عمرِ گریزاں سے نہ میری بن سکی	جو کرے کرتی رہے، میں پوچھتا کچھ بھی نہیں	ظہور نظر
دن بھر جلے جو دھوپ کے بستر پہ دوستو	سورج چھپا تو چادرِ شب میں سمٹ گئے	سیف زلفی
خواب کو دن کی شکستوں کا مداوا نہ سمجھ	نیند پر تکیہ نہ کر شب کو مسیحا نہ سمجھ	ساقی فاروقی
پھرتے ہیں مثلِ موجِ ہوا شہر شہر میں	آوارگی کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو	منیر نیازی
کچھ تو سراغ مل سکے موسمِ دردِ ہجر کا	سنگِ جمالِ یار پر، نقش کوئی بنائیے	احمد مشتاق
شبنمی آنکھوں کے جگنو کانپتے ہونٹوں کے پھول	ایک لمحہ تھا جو امجد آج تک گزرا نہیں	امجد اسلام امجد
زمیں نے پاؤں نہ چھوڑے دگرنہ تیرے لیے	ادھر بھی آتے جہاں دشت تھا نہ دریا تھا	اطہر نفیس

زندگی کی ناہمواریوں کا شعور:۔ دبستان کے اس عنصر کی ڈانڈے بھی "انسان دوستی" سے جا ملتے ہیں۔ نسلِ انسانی میں فرقہ بندیوں کے ہاتھوں معاشرتی سختیوں، سماجی مشکلات اور اقتصادی دشواریوں پر ندیم کے ہاں شدید ردِّعمل ہوا ہے۔ اس کی شاعری پر ان مسائل کا زبردست اثر ہے۔ اسی اثر کی وجہ سے ندیم اپنے شعروں میں جگہ جگہ "عالمِ انسانیت" کے

سامنے "ندامت" کا اظہار کرتا ہے۔ ندامت کا یہ پہلو انتہائی تعمیری اور اطمینان بخش جذباتی بیک گراؤنڈ رکھتا ہے۔ اس کے اندر شفقت اور پیار کی گل سامانیاں ہیں۔ یہاں اس کی شاعری میں انسان کے لیے محبت اور گہری محبت کا تشخص ہوتا ہے۔ جذبے کی اسی سچائی کی بدولت ندیم کی شاعری "ٹھہراؤ" کا شکار نہیں ہو پاتی، تمام تخلیقات عصری تقاضوں سے جان دار اور خوش گوار نسبتوں کی حامل ہوتی ہیں، ان میں درد اور فکر کی جزویات ہمیشہ کی طرح خوبصورتی سے موج بہ موج موجود ہیں۔ تفکر اور شعریت کا خوبصورت امتزاج اقبال کے بعد ندیم میں ملتا ہے۔ اقبال بھی نصب العین کی شاعری میں بلند و بالا ہے اور ندیم بھی۔ ندیم کی اس "ادائے دل ربا" نے اکثر ہم عصر شعراء کو اپنا شیدائی بنا رکھا ہے! اس سلسلے کے ندیم کے اشعار درج ذیل ہیں ؎

سقراط نے زہر پی لیا تھا　　　ہم نے جینے کے دکھ سہے ہیں

اے خدا اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے　　　تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

کسی چمن سے بس اس خوف سے گزر نہ ہوا　　　کسی کلی پہ نہ بھولے سے پاؤں دھر جاؤں

اے صبح مری گواہ رہنا　　　میں رات سے عمر بھر لڑا ہوں

فقر و فاقہ میں مر گیا شاعر　　　شعر، اہلِ نظر کے کام آیا

احمد ندیم قاسمی

دبستان کے شعراء:-

فراز تو نے اسے مشکلوں میں ڈال دیا　　　زمانہ صاحبِ زر اور صرف شاعر تو　　　احمد فراز

عمر بھر کی تلخیاں دے کر وہ رخصت ہو گیا　　　آج کے دن کے سوا روزِ جزا کوئی نہیں　　　شہزاد احمد

دکھلائے جا سکیں جو نہ کانٹے زبان کے　　　تم داستانِ کرب و بلا کہہ لیا کرو　　　قتیل شفائی

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے　　　جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے　　　شکیب جلالی

کتنے ہی انقلاب شکن در شکن ملے　　　آج اپنی شکل دیکھ کے میں دنگ رہ گیا　　　ظہیر کاشمیری

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ　　　مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے　　　مصطفیٰ زیدی

وہ ہجر کی رات کا ستارا، وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا　　　سدا رہے اس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ　　　ناصر کاظمی

جب بھی آئی کوئی خوشی کی گھڑی　　　دن غموں کے بھی یاد آ کے رہے　　　ظہور نظر

شاید کوئی لہر سینے آئے　　　ساحل کے قریب گھر بناؤں　　　منظور عارف

مجھے منزلت نے سلطانیِ عطا کی ہے دو عالم کی　　　مگر میں پیار کا پیاسا ہوں مجھ کو پیار دے کوئی　　　انور شعور

کچھ تم کہو، تم نے کہاں کیسے گزارے روز و شب　　　اپنے نہ ملنے کا سبب تو گردشِ حالات تھی　　　احمد مشتاق

ہم اپنے پاؤں کا کانٹا ہیں اپنے غم کا اسیر　　　مثالِ سنگِ گراں راستے میں بیٹھا ہوں　　　محسن احسان

ڈھونڈتے پھرتے ہیں زخموں کا مداوا نکلے　　　اس بھرے شہر میں کوئی تو مسیحا نکلے　　　جمیل ملک

چپ کا زہر پی لینا غم کے ہونٹ سی لینا　　　مصلحت نہیں یارو، بات بے حسی کی ہے　　　خالد احمد

ہوا کے زخم کھلے تھے اداس چہرے پر — خزاں کے شہر سے کوئی تو پُر بہار گیا — اختر امام رضوی
گھر کے دھندے نمٹتے ہی نہیں ہیں ناہید — میں نکلنا بھی اگر شام کو گھر سے چاہوں — کشور ناہید
جو ابر ہے سو وہ اب سنگ و خشت لاتا ہے — فضا یہ ہو تو دلوں کی نزاکتیں کیسی — عبید اللہ علیم
میں سمجھتا تھا تعاقب میں فقط ہیں واہمے — لوٹ کر دیکھا مگر جس نے بھی، پتھر ہو گیا — سلیم شاہد
اس وقت وہاں کون دھواں دیکھنے جائے — اخبار میں پڑھ لیں گے کہاں آگ لگی تھی — انور مسعود
پہلے تو زخم زخم میں انگور ڈھونڈنا — پھر آپ اپنے واسطے پتھر تراشنا — خالد شریف

اپنی شان دار روایات کی پاس داری — آج کے دَور کے جیّادری شعرا میں ندیم ہی ایسا ہے جس کو حیثیت قوم اپنی شان دار روایات سے "مثبت انداز" میں پیار ہے۔ وہ ان کے اثبات کے لیے "عصریت" کے اندر رہ کر ہر ممکن سعی کرتا ہے، مستقبل کی طرف بھی نگاہ رکھتا ہے اور ماضی سے بھی "روشنی" حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ندیم ایسے نظریات کو دل میں نہیں بساتا جو اپنی نفی کر کے خود کو دوسروں کے حوالے کر دینے کا راستہ دکھائیں۔ اس کا موقف یہ ہے کہ پہلے اپنی حیثیت سے خود کو پہچانا جائے پھر دوسروں کی اچھی اقدار اپنائی جائیں۔ اپنی انفرادیت کو مسخ کر کے جھولی پھیلانا عزتِ نفس کی توہین ہے۔ ندیم کو وطن، قوم اور اپنی تہذیب سے بے حد لگاؤ ہے، اسی لگن میں اس نے شعروں میں ایمائیت اور اشاریت کے جادو جگائے ہیں ؎

آج انا الحق سے بڑی کوئی حقیقت ہی نہیں — مومنو! دار پہ کس کس کو چڑھایا جائے
اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھلیں — تو سامنے تھا اور تصور خدا کا تھا
اچھے وقتوں کو بھول جانے میں — تم کو دو پل، ہمیں زمانے لگے
وہ جو شعلہ پیکر تھے، بجلیوں کے ہم سر تھے — اپنی آگ سے ڈر کر اپنی راکھ سے کھیلیں

— احمد ندیم قاسمی

دبستان کے شعراء:—

نہ پوچھ احسان کس کس کے ہیں مجھ پر — مرے دل میں حسابِ دوستاں ہے — قتیل شفائی
خاک ہیں اب تری گلیوں کی وہ عزت والے — جو ترے شہر کا پانی نہ پیا کرتے تھے — شہزاد احمد
ایسی سونی تو کبھی شامِ غریباں بھی نہ تھی — دل بجھے جاتے ہیں اے تیرگیٔ صبحِ وطن — مصطفیٰ زیدی
یہ دورِ تیز گام بھی ہے ان سے بے خبر — وہ منزلیں جو دے گئیں اپنا پتہ ہمیں — ظہیر کاشمیری
دھنستے جاتے ہیں تہِ ہستی میں جبر و ضبط سے — ہم انا داروں کا اپنا آپ دلدل ہو گیا — ریاض مجید
میرا وجود مجھ سے الگ ہو کے رہ گیا — کیوں رو رہا ہوں، کون مرا، مجھ سے پوچھیے — وحی کنجاہی
چرخ بھر جائے گا کرلاتی ابابیلوں سے — پنکھ پھیلائیں گے جب روز سویرے میرے — خالد احمد
وہ طائروں کے جھرمٹ جو ہواؤں میں جھولتے تھے — وہ فضا کو دیکھتے ہیں تو آہ بھر رہے ہیں — عبید اللہ علیم
مجھ سے جدا ہوا ہے مری ذات کا شعور — یارو مجھے تلاش کرو میں بکھر چکا — حسن اختر جلیل

شدتِ احساس کی مخصوص بحر ۔ اپنے مزاج اور احساساتی ماحول کے اعتبار سے ہر بحر محاکاتی اور داخلی طور پر ذاتی تاثر رکھتی ہے ۔ اگرچہ ندیم کا مزاج، لب ولہجے کی ملائمت، طبیعت کا گداز کئی بحروں پر محیط ہے ۔ مگر ایک مخصوص بحر اس کی افتادِ طبع سے بہت زیادہ قربت رکھتی ہے ۔ وہ ہے 'فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن (ع ساکن)' یہ بحر شدتِ احساس، درد کے منفرد اظہار، مزاج کی حسی گداز اور لب ولہجے کے خاص پیرائے کے لیے بہترین میڈیم ہے ۔ بہرحال وجہ ندیم اس بحر میں اردو کے بہت بڑے شاعر کی حیثیت سے سامنے آتا ہے ۔ اس بحر کی ہم شکل بحریں بھی ہیں ان سب کو یک تخلیق میں اکٹھا برتا جا سکتا ہے ۔ بحر کے شروع (صدر و ابتدا) میں فعلاتن اور آخر میں (عروض و ضرب) میں فعلن (ع متحرک)، فعلان (ع ساکن) فعلات (ع متحرک) لاکر دیگر ہم صورت بحریں ہاتھ آتی ہیں ۔ چونکہ متاثرین بھی طبعی اور مزاجی طور پر ندیم کے زیادہ قریب ہیں اس لیے انھوں نے بھی شدتِ احساس کی مخصوص بحر کو اس طرح برتا کہ یہ بحر دبستان کا نشانِ امتیاز بن کر رہ گئی ہے ۔ اس میڈیم میں شدتِ احساس کے مناظر ملاحظہ ہوں ۔

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن　　　یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ
اب تو کچھ اور ہی اعجاز دکھایا جائے　　　شام کے بعد بھی سورج نہ بجھایا جائے
تو کہ تھا بزم میں تصویر کم آمیزی کی　　　میری تنہائی میں کیوں انجمن آرا نکلا
اے خدا اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے　　　تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

احمد ندیم قاسمی

دبستان :—

توں نے وہ مانگا جو تاریخ کو منظور نہ تھا　　　ہے تری راہ کی دیوار دعا ہی تیری　　　شہزاد احمد
کتنا دل کش ہے تری یاد کا پالا ہوا اشک　　　سینۂ خاک پہ مہتاب گرا ہو جیسے　　　ظہیر کاشمیری
اک ترا لمحۂ اقرار نہیں مر سکتا　　　اور ہر لمحہ زمانے کی طرح فانی ہے　　　مصطفےٰ زیدی
کیا کہوں دیدۂ تر یہ تو مرا چہرہ ہے　　　سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی جہاں دھار گرے　　　شکیب جلالی
آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر　　　کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں　　　احمد فراز
میں تری آنکھ سے ڈھلکا ہوا اک آنسو ہوں　　　تو اگر چاہے بکھرنے سے بچالے مجھ کو　　　محسن احسان
یوں مرے پاس سے ہو کر نہ گزر جانا تھا　　　بول اے شخص مجھے کون نگر جانا تھا　　　ساقی فاروقی
چاند سورج سے کبھی تاریکیٔ دوراں نہ گئی　　　دیکھیے پردۂ تخلیق سے اب کیا نکلے　　　جمیل ملک
قیدِ تنہائی میں کیا آئے گی کوئی آواز　　　بیٹھ کر اپنی ہی زنجیر ہلایا کیجیے　　　عدیم ہاشمی
میں ہر اک حال میں تھا گردشِ دوراں کا امیں　　　جس نے دنیا نہیں دیکھی مرا چہرہ دیکھے　　　اختر امام رضوی
لاکھ بدلا سہی منصور کا آئینِ حیات　　　آج بھی سلسلۂ دار و رسن ہے کہ جو تھا　　　حنیف فوق
آپ کے قصر کی جانب کوئی دیکھے تو یہ　　　جرم ثابت ہو تو چن دیجیے دیواروں میں　　　الوز مسعود
تجھ جدا کبھی تجھے پا نہ سکیں گے تو ہمیں　　　صورتِ درد ترے دل میں اترنا ہوگا　　　روحی کنجاہی

غزلوں میں نظمیت کا عنصر۔ ندیم کے ہاں غزلوں میں رنگِ تغزل تو بلا شک و شبہ بھرپور و افر مقدار میں ہے، سچ تو یہ ہے کہ اس نے غزلیت کے لوازم سے کسی مقام پر نا انصافی نہیں کی۔ بلکہ اسے چ ہے، اسے پوجا ہے: دیکھیے ؎

اُس کا ستم بھی عدل سے خالی نہیں ندیم — دل سے کے شاعری کا سلیقہ دیا مجھے
آنکھوں میں کٹ گئی ہے عمر لیکن — جیسے ابھی نیند سے اٹھا ہوں

لیکن یہ بھی درست ہے کہ موضوعات میں زیادہ وسعت ہونے کی بنا پر اس کی غزلوں میں نظمیت کا عنصر بھی کہیں کہیں غالب آ گیا ہے۔ اس "غزلیاتی نظمیت" کا احساس الفاظ و امیجری کے معنوی پس منظر سے ہوتا ہے۔ بہر حال نظمیت کسی موقع پر بھی دور از کار یا بے مقصد معلوم نہیں ہوتی، یہ بھی اپنے اندر راحت انگیز "حیرانیاں" رکھتی ہے۔ اقبال کے ہاں بھی غزلوں میں نظمیت کا عنصر اسی خوبصورتی سے پایا جاتا ہے۔ اس کے اس انداز کو صرف ندیم نے ہی عظیم روایت کا قرینہ دیا ہے۔ غزل میں ... یہ آج کے کسی بڑے شاعر کے ہاں ایسی حسن سے ماتی نہیں رکھتا جو ندیمیت کا خاصہ ہے۔ یہ رویہ دیکھیے ؎

اٹھا عجب تضاد سے انسان کا خمیر — عادی فنا کا تھا تو پجاری بقا کا تھا
ہر ایک روح یہاں جسم کے لباس میں ہے — کہ پتھروں کو جو توڑا شرر شرر نکلے
چاند پر جب لوگ جانے لگے — صرف پتھر زمیں پہ لانے لگے
ارتقاء ابتدا کو لوٹ چلا — مقبرے راستے دکھانے لگے — احمد ندیم قاسمی

دبستان :-

کم نہیں ہے یہ لذت کہ ابھی زندہ ہوں — اب مرے سر پہ کوئی اور بلا کیوں آئے — شہزاد احمد
ملبوس خوشنما ہیں مگر جسم کھوکھلے — چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پر — شکیب جلالی
سوچتا ہے اک شاعر بھی، اک تاجر بھی — لیکن سب کی سوچ کا ہے معیار جدا — قتیل شفائی
ہمارے دور کے انسان خود اپنی ہی ضد نکلے — طلب ماضی کی ہوتی ہے قدم فردا میں رکھتے ہیں — ظہیر کاشمیری
چمک زر کی اُسے آخر مکانِ خاک میں لائی — بنایا ناگ نے جسموں میں گھر آہستہ آہستہ — منیر نیازی
احباب کس خلوص سے رکھتے ہیں مری غزل — رکھتے ہیں دل کے طاق میں سوغات کی طرح — سیف زلفی
یہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں سوتے ہیں — مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے — احمد مشتاق
فن کار کہوں اُسے تو کیسے — تخلیق کو جو مٹا رہا ہے — احمد ظفر
میں لے رہا ہوں قلم سے تخنوروں کا کام — ہوائیں کاٹ رہا ہوں ہنر کے خنجر سے — خلیل رامپوری
گو چشموں کے لیے آئینہ خانہ معلوم — ورنہ ہر ذرہ ترا عکس نما ہے کب سے — امجد اسلام امجد
سوچ کے پھیلاؤ سے جھنجھلا کے چیخ اٹھتے ہیں ہم — کس کا دعویٰ ہے جو کہنا تھا مکمل ہو گیا — ریاض مجید

تعبیری ور متوازیت قبائیت ... ندیمیت میں اقبال کی امیجری علامتیں اور شارے ملتی ہیں

روانی ڈھنگ بھی موجود ملتے ہیں، گو رنگ وہ نہیں ہوتا جو صرف اقبالیت سے خاص ہے۔ اسی سبب سے اس کو تقلید کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ ان علامتوں، امیجری اور اشاروں کے پیچھے ندیم کا اپنا مزاجِ شعری کارفرما ہے۔ اقبال کی بڑائی کی دلیل یہ ضرور ہے کہ اس کے انداز سے ایک اور جینیس متاثر ہوا، جس نے اپنی شخصی تقاضوں کے مطابق اسے اپنایا اس طرح ندیم کی انفرادیت اس کی اپنی حیثیت اپنی جگہ پر قایم رہتی ہے۔ اس کا دھیما پن، اور کھلم کھلا بات کرنے کا شیوہ عین ندیمیت ہے۔ یہ رہے اقبالیت کے نشانات سے

اک حقیقت سہی فردوس میں حوروں کا وجود	حسنِ انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک پہنچوں	
کون شاہوں کو گداؤں سے الگ پہچانے	اب تو خلعت میں بھی پیوند لگایا جائے	
دل راکھ ہو چکا تھا چمک اور بڑھ گئی	یہ تیری یاد تھی کہ عمل کیمیا کا تھا	
یارب مجھے اس کیفِ مسلسل سے رہا کر	مسجودِ ملائک ہوں تو کیوں خاک بسر ہوں	
اگر جنوں ہے تو آداب اس کے شب سے سیکھ	ادھر ہو چاک گریباں اُدھر سحر نکلے	احمد ندیم قاسمی

دبستان ۔

ظہیر سوزِ دروں بھی عجب کرشمہ ہے	میں دور رہ کے بھی اس سے کبھی جدا نہ ہوا	ظہیر کاشمیری
یہ کائنات ہے میری ہی خاک کا ذرہ	میں اپنے دشت سے گزرا تو بھید پایا بہت	شکیب جلالی
ترا چہرہ مجھی سے کیوں نہاں ہے	سکندر تیرا آئینہ کہاں ہے	قتیل شفائی
سفرِ شوق ہے زنجیر کے پھیلاؤ تک	کوئی منزل نہیں بھٹکے ہوئے راہی تیری	شہزاد احمد
مری روح کی حقیقت مرے آنسوؤں سے پوچھو	میرا مجلسی تبسم، مرا ترجماں نہیں ہے	مصطفےٰ زیدی
رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناصر	تم نے یہ دولتِ بیدار کہاں سے پائی	ناصر کاظمی
تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا	دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں	احمد فراز
میرے ہمراہ وہی تہمتِ آزادی ہے	میرا ہر عہد وہی عہدِ اسیری نکلا	ساقی فاروقی
دیدہ وروں کے گھر پہ مسلط ہے تیرگی	اندھوں کی انجمن میں چراغاں ہے ان دنوں	ظہور نظر
رکھیے بعزمِ خاص رہِ زیست میں قدم	منزل بڑی کٹھن ہے مگر ڈر نکالیے	سیف زلفی
ہم کو تو احتیاطِ غمِ دل عزیز تھی	کچھ اس لیے بھی کم نگہی کا گلا نہ تھا	کشور ناہید

آخر میں ایک خدشے کا اظہار مقصود ہے۔ ہو سکتا ہے دبستانوں کی ان "نفسیاتی" کاوشوں کو محلِ نظر گردانا جائے۔ ان کو فرضی دقیانوسی بتایا جائے۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ جب ہم عصروں کے درمیان جذباتی، خیالاتی، محاکاتی اور تصوراتی مماثلتیں اجاگر ہونے لگیں تو دبستان کا ظہور عمل میں آتا ہے۔ یہی بات لکھنؤ اور دہلی کے دبستانوں کی تشکیل پر صادق آتی ہے ـــــ احمد ندیم قاسمی چونکہ اپنی شخصیت کی ہمہ گیری کے کارن ہم عصروں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس کی شاعری کی اقدار یونیورسل اپیل رکھتی ہیں، اس کا لب و لہجہ پُرکشش اور دلربا ہے اس لیے ان تمام جزویات کے ساتھ وہ آج کی شاعری پر گہرے نقوش مرتب کر رہا ہے۔ انہی نقوش نے ایک نیا دبستانِ شاعری قایم کیا ہے جسے نام دیا جاسکتا ہے۔ "ندیم کا دبستانِ شاعری" ـــــ

مبارک اکمل گیلانی

غم کی تیسری جہت

—— اردو غزل ولی دکنی سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر بلکہ بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں تک مضامین کے ضمن میں صرف دو طرح کے غم سے آشنا رہی ہے 'غمِ عشق'، جس کے منہاج سے غزل کا سارا پیکر منبع نور بنا رہا ہے۔ سرسید کی تحریکِ اصلاح کے نتیجے کے طور پر وجود پانے والی مقصدیت کے دور تک اردو غزل نے عشق کے غم کو حرزِ جاں بنائے رکھا انیسویں صدی کے اواخر میں جب شعرا فکرِ یار سے فکرِ روزگار کی منزل کو روانہ ہوئے، تو غزل کے پیرایوں میں غم کی جو واحد صورت رہی وہ غمِ عشق ہی تھا۔ حالانکہ بعض استثنائی صورتوں میں شعرا نے زندگی کے نئے روپ اور تہذیبی شکست و ریخت سے پیدا شدہ کرب اور ذہنی صدمے کو غزل کے پیکر میں تشبیہات و استعارات کے خوب صورت ملبوس میں پیش کرنے کی کوشش بھی کی مگر تجربات کا یہ اظہار بھی اردو غزل کی روایت کی بھرپور "تسمہ پائی" کے زیرِ اثر غمِ عشق کے حوالے سے ہی پہچانا جاتا رہا۔ غزل پر کیے جانے والے اعتراضات میں سے نہایت قوی اعتراض ہے کہ غزل کے پیکر نے اپنے روایتی ڈھنگ میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور اگرچہ فرداً فرداً اور جستہ جستہ غزل کے افق پر غمِ روزگار کے کوندے لپکتے دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم غزل نے غمِ روزگار کو واضح طور پر بیسویں صدی کے اوائل تک اپنا موضوع نہیں بنایا۔ بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں تک غزل غمِ عشق اور کہیں کہیں غمِ روزگار کی واردات سے مرتب ہے۔ اقبال کی غزل ایک استثنائی صورت ہے:

مگر بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں کرۂ ارض کے مشرقی نصف حصے میں ایک ایسا سیاسی و سماجی انقلاب اپنی تمام تر حشر انگیزیوں کے ساتھ رو پذیر ہوا جس نے بیسویں صدی کے آدمی کے ذہنی اور فکری سانچوں کو شدت سے متاثر کیا اور عالمِ انسانی کی سوچ کو زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت سے روشناس کیا اور پہلی بار شعر و ادب کو شبستانوں اور محلات کے جاہ و حشم یا صرف و محض جمالیاتی تام جھام اور خیرگی سے نکال کر عام آدمی کی زندگی کے عملی دکھوں اور غموں کی خلش سے آگاہ کیا، یہ انقلاب روس کا اشتراکی انقلاب تھا جس نے بالواسطہ پورے عالمِ انسانی کے ادب کو ایک نیا لہجہ اور نہج بخشی۔ اردو غزل بھی، برصغیر میں بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ترقی پسند تحریک کے وجود سے اپنے روایتی غمِ عشق کے کینوس پر غمِ روزگار کے بھڑکتے، پھیلتے اور چھا جانے والے رنگوں سے روشناس ہوئی۔

غمِ عشق نے غمِ روزگار کے ساتھ مل کر بعض بہت خوبصورت، منفرد اور جاندار ادبی روایات قائم کیں شاعری ہیں، فیض، جذبی، ساحر، اختر الایمان، مجاز اور احمد ندیم قاسمی کی شاعری غم کی اس حسین آمیزش کے نادر نمونے ہیں۔
بیسویں صدی کے آغاز کی غزل کی اس ساری روایت میں جب وہ غمِ عشق اور غمِ روزگار کی کشمکش میں گھری نظر آتی ہے اور دونوں میں ایک منفرد آواز نے غزل کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔ ایک ایسی جہت جس نے غزل پر وارد ہونے والے تمام اعتراض کے رد کرنے کی منزل کی طرف ایک بہت بڑا قدم اٹھایا ہے۔ یہ منفرد آواز احمد ندیم قاسمی کی ہے اور اس غم کی وہ تیسری جہت جو غمِ عشق اور غمِ روزگار کی روایت سے وجود پذیر ہوئی ہے۔ غمِ انسان ہے۔ عشق! انسان کا عشق اور روزگار، انسان کا روزگار!!

قاسمی کا شعور قاسمی کو غمِ انسان کی منزل تک لے گیا ہے۔ اور یہ انفرادیت دیتا ہے کہ تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی اعلیٰ نمائندگی اس صدی میں وہ واحد غزل گو شاعر ہے جس نے غمِ انسان کی منزل کو منتخب کیا ہے اور جس کے سینے میں دھڑکنے والا دل، دنیا کے لیے نہیں، انسان کے لیے دھڑکتا ہے

بیسوی صدی کیسا انقلاب لائی ہے
کوہ بے پیرہن ہیں، دشت میں صنوبر ہیں

اپنے زمانے کی غلط بخشی اور گمراہ نظری کا یہی احساس ہے جس نے قاسمی کو ادراک کی اس منزل تک پہنچایا ہے جہاں اس کی شاعری کا ہیرو اور اس کا محبوب انسان ہے اور اس کی رگوں میں دوڑنے والا درد غمِ انسان کا غم ہے

نکہتِ صباحتِ انساں ہے جس کا فن
اے روحِ عصر تو وہ غزل خواں ہمیں تو ہیں

وہ تو جیتا ہی اس لیے ہے کہ شاید کبھی انسان اپنے صحیح مقام کو پانے میں کامیاب ہو جائے

اس توقع پہ کہ شاید کبھی انساں سنبھلے
ہر نئے ظلم نے جینے پہ مجھے اکسایا

وہ دشمن سے بھی اس لیے محبت کرتا ہے کہ وہ انسان ہے۔ انسان سے نفرت، خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، قاسمی کے مسلکِ حیات اور نظریۂ فن کے خلاف ہے

دوستوں کی نفرتیں بھی کیوں مجھے پیاری نہ ہوں
میں تو اپنے دشمنوں تک کا محبت خوردہ ہوں

ساری دنیا مرا کعبہ، سب انسان مرے محبوب
دشمن بھی دو اِک تھے لیکن دشمن بھی تو تھے انساں!

اس کے نزدیک تمام دہشت یہی ہے کہ انسان کو خوبصورت فریب دیا جائے۔ انسان تو [illegible] ہے۔

مجھے تو بے مری شانِ آدمیت کی
فریب دے کے سکوں کا فریب کھانا نہیں

——— قاسمی کی شاعری میں غمِ انسان کے مطالعہ کے لیے یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ یہ غم قاسمی کی غزل میں تین تہوں میں ملتا ہے۔ انسان کی محبت اس لیے کہ وہ عظیم ہے مگر غم اس کا کہ اس کا مستقبل تابناک امکانات رکھنے کے باوجود آشوبِ جہاں کی زد پر ہے۔ مطالعہ کی آسانی کے لیے انسان سے اس کی محبت ان تین صورتوں میں منضبط کی جا سکتی ہے۔

۱۔　انسانی عظمت اور برتری کا احساس

۲۔　انسان کے مستقبل کی تابناکی اور اس کے لامحدود مضمرات و امکانات میں یقین۔

۳۔　اور آج کی تیز رفتار زندگی کے نت نئے بدلتے ہوئے مزاج کے لائے ہوئے آشوب میں انسان کے مستقبل کے متعلق پیدا ہونے والی تشویش کا کرب!

——— قاسمی کے ہاں عظمتِ آدم اور انسان کی برتری کا احساس کس درجہ شدت رکھتا ہے وہ ان کی ایک نظم کے اس مصرعے سے بخوبی عیاں ہے کہ "انسان عظیم ہے خدایا" تاہم لازم یہ ہے کہ اُن کی شاعری کے اس پہلو کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے ———!

——— حیات و کائنات کے بارے میں انسانی فکر و نظر نے غور و فکر کی جو منازل طے کی ہیں اُن سب میں رسائی کے گوشے اور سوچ کے زاویے مختلف ہوں گے مگر انسانی نظریات ہوں یا آسمانی ہدایات، ہر دو ذرایع سے یہ بات تمام تر واضح نظر آتی ہے کہ کائنات کی تخلیق، اس کے حسن و جمال، اس کی نیرنگی و بوقلمونی اور اس کی نظر فریب جادوگری کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ انسان کے کام آسکے! گویا انسان تخلیقِ حیات و کائنات کا مقصود ہے۔ انسان اپنی تمام تر جسمانی کمزوریوں اور فطری کوتاہیوں کے باوجود اپنی تمام تر جبلی پستیوں کے ہوتے ہوئے بھی اس لیے اہم ہے کہ یہ وہ نقطہ ہے جس کے گرد پرکارِ کائنات گردش کرتی ہے اور یہی احساس قاسمی کے اس احساس کا محرک ہے ؎

اس قدر پیار ہے انساں کی خطاؤں سے مجھے　　　　کہ فرشتہ مرا معیار نہیں ہو سکتا

اب اس سے بڑھ کے ہو کیا ربطِ کائناتِ حیات　　　　فضائیں گونجی ہیں انسان کی پکار کے ساتھ

وہ آدمی جو نکالا گیا تھا جنت سے　　　　اٹھا ہے بن کے قمر افگن و ستارہ شکار!

——— زندگی میں تخلیقِ پیہم کا وجود انسان کے دم سے قایم ہے انسان نہ ہوتا تو علم اسما کی تکمیل کون کرتا اور تخلیقِ مسلسل کے عمل میں فطرت کا شعبہ معطل کون بنتا یہی تو عظمتِ آدم کا راز ہے کہ وہ تخلیق و ارتقاء کے رازکا امین ہے ؎

ابھی تو خیر سے تسخیرِ عرش باقی ہے　　　　ابھی تو اہلِ زمیں آسماں تک آئے ہیں

تخلیقِ زمیں کا طرزِ مت کر　　　　ہم نے ترا آسماں بنایا

ہم گونج ہیں سازِ ارتقا کی　　　　گونجیں گے ابھی زماں زماں ہم

——— انسان اپنی ماہیت میں کس قدر سخت جان، سخت کوش ہے اس کے خط و خال قاسمی کی شاعری سے ابھرنے میں اور وہ اس لحاظ سے آج کی غزل میں ایک منفرد آواز ہیں!

ظاہر میں ہم انسان ہیں مٹی کے کھلونے　　　　باطن میں مگر تُند عناصر کا غضب ہیں

فنا کے دام میں الجھے ہوئے غریب انساں
نظامِ شمس پہ یلغار کرتے دیکھے ہیں

—— انسان کے ممکناتِ استقبال کے بارے میں اقبال کے بعد نہایت دو ٹوک اور واضح آواز قاسمی کی ہے اور یہی آواز آدم کی عظمت کا احساس دلا کر اُسے ایک خوش گوار صبح کے طلوع ہونے کی نوید دیتی ہے۔ انسان کی عظمت و برتری میں اعتماد کی یہی بحالی ندیم کا کارنامہ ہے۔ جب تک ذات پر اعتماد بحال نہ ہو۔ ذات سے باہر کی دنیا کے آشوب سے ستیزہ کار ہونا ممکن نہیں، اس کے لیے یہ یقین بہت ضروری ہے کہ ؎

ممکن ہے فضاؤں سے خلاؤں کے جہاں تک　　جو کچھ بھی ہے آدم کا نشانِ کفِ پا ہو
ممکن ہے کہ جنت کی بلندی سے اُتر کر　　انساں کی عظمت میں اضافہ ہی ہوا ہو

قاسمی کے نزدیک دوسرا امکان امکان سے زیادہ ایقان کا درجہ رکھتا ہے اس لیے کہ اس کے نزدیک انسان جنت سے نکالا نہیں گیا خود نکلا۔ نادیدہ کی جستجو کا اضطراب ہی تو انسان کی فطرت ہے ؎

عرش کی خلوتوں سے گھبرا کر
آدمی فرش پہ اُتر کے رہا

انسان کے ممکنات اور اس کی عظمت کا احساس قاسمی کے ان اشعار میں بھی دیکھیے ؎

پرواز کو محدود نہ کر شام و سحر تک　　انسان کی ہیں مملکتیں حدِ نظر تک
آدمی پھول بھی ہے کانٹا بھی　　اور کانٹے کا لچکنا دشوار
تقدیر کے روکے بھی ابد تک نہ رُکے گا　　انسان ہے اک تیر مشیت کی کماں کا

بیسویں صدی کا دورِ آشوب۔ جس طرح ندیم کے شاعرانہ احساس کی تجربہ گاہ میں تحلیل کے عمل سے گزرتا ہے اور جس طرح انسان کی موجودہ حالت سے مایوس ہونے کے احساس سے شاعر انسان کے کھوئے ہوئے اعتماد کی بحالی کی منزل تک جاتا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ اپنے اردگرد کے ماحول میں وہ قدم قدم پر انسان کو حالات کی شدت اور وقت کے آشوب کا شکار دیکھتا ہے تو اس کے سینے میں خلش جاگتی ہے ؎

اب بھی انسان ہے اسباب و نتائج کا اسیر
قعر کے سائے میں اب تک ہے وہی جمِ غفیر
وہی جینا ہے مصیبت، وہی مرنا ہے حرام
اے مشیت تری قوت کو سلام

مگر انسان کی عظمت میں خود شاعر کا یقین اسے اس منزل پر رُک کر مایوسی کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ وہ انسان کو جبر کے سامنے سینہ سپر ہوتے دیکھنا چاہتا ہے ؎

بہتر ہے کہ اب حدِ امکاں سے نکل جائیں　　انساں کو مقدر پہ جلال آنے لگا ہے
کیا خلد کی میراث پہ کچھ حق نہیں میرا　　آدم کے لبوں پر یہ سوال آنے لگا ہے

انسانی عظمت کے اسی احساس سے ندیم کے ہاں انسانی مستقبل کی تابناکی اور کامیابی کا یقین پیدا ہوتا ہے

وہ ہرگز نہیں مان سکتا کہ وہ انسان جو کائنات کا نقطۂ ارتکاز ہے وہ وقت کے جبر اور زمانے کی گردش سے بے بس و مجبور ہو کر رہ جائے گا۔ صبح کے آثار کتنے ہی معدوم کیوں نہ ہوں، مگر آنے والا کل انسانی عظمت کی کرن کو وقت کی گرد سے نکال کر رہے گا ؎

یوں بھی ہوتا ہے کہ آندھی کے مقابل چڑیا — اپنے پر تولتی ہے
اک بھڑکتے ہوئے شعلے پہ ٹپک جائے اگر — بوند بھی بولتی ہے

اُسے ایک سوال پریشان کرتا ہے کہ انسان کائنات کی حدوں سے پرے اور عناصر کی گرفت سے باہر کا سفر کب کرے گا۔ وہ سفر جو اُسے کائنات کے سارے رازوں سے آگاہ کر دے ؎

اب تو ذہنوں کو ستاتا ہے فقط ایک سوال
عرش سے پار تک انساں کا سفر کب ہوگا

آدم کی رسائی اور عظمت کے احساس سے کائنات کے خوف زدہ ہونے کا احساس اقبال کے ہاں اس صورت میں ملتا ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

انسانی امکانات کا یہی احساس ندیم کی غزل میں بھی جگہ جگہ ملتا ہے ؎

آدم کی رسائیوں سے ڈر کر
اسرارِ حیات تھرتھرائیں

بیسویں صدی نے انسانی عظمت کا جو ثبوت خلائی سفر کی صورت میں دیا ہے، ندیم کی شاعری کا رنگ پاکر وہ احساس کیا رنگ اختیار کرتا ہے۔ اسپوتنک ۲ کی پرواز پر ندیم نے انسانی عظمت کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے ؎

اب اوج پہ ہے جمالِ انساں	اب چرخ کو آئینہ بنا دو
قمر لزوں سے تنی ہوئی خلا کو	انسان کا فیصلہ سُنا دو
یہ فرش ہے عرش قدسیوں کا	اس وہم کو واقعہ بنا دو

انسان کی وسعتِ پرواز کی داستان اتنی دل نشین اور اس کے ارتقاء کی کہانی میں اس قدر THRILL ہے کہ ندیم کے ہاں یہ بیان و اظہار کے مختلف پیرائے اختیار کرتی ہے ؎

وہ دھند لکا جسے سب حدِ نظر کہتے ہیں	اب تو انسان کی بس راہ گذر کہتے ہیں
آدم کی سُلگتی ہوئی تاریخ رقم ہے	جبریل کے شہپر سے مرے دامنِ تر تک
عناصر سمٹ کر کیا بتاؤں کس سے نمٹے گا	ندیم اب آدمی کے ہاتھ میں خود اپنی گردن ہے
شیشے میں لاکھ آئیں عناصر	ابنِ آدم کہاں مانتا ہے
ہوشیار اسے فرشتو کہ پھر سے	اک سجدے کا وقت آ رہا ہے

آخری دو اشعار جس نظم سے لیے گئے ہیں اس کا عنوان ہے 'مراجعت' اور یہ انسان کی خلا میں پرواز سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ نظم پوری کی پوری عظمتِ آدم کے ایقان اور اس کے تابناک مستقبل میں بھرپور یقین کی آئینہ دار ہے۔ ندیم کی شاعری کا یہی منفرد رنگ ہے جس نے اسے اپنے معاصرین سے ہمیشہ ممتاز رکھا ہے۔

—— لیکن وہ حقائق سے روگردانی کا مرتکب ہوتا اور اپنے ماحول سے بے خبری کا مظاہرہ کرتا اگر اُسے آج کے دور کے اٹھائے ہوئے فتنوں اور انسان کو جس قیامت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُس کا احساس نہ رکھتا۔ انسان کی عظمت بجا! مگر انسان کس حال میں ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ندیم کی شاعری انسان کے متعلق ایک تشویش سے دوچار ہوتی ہے اور جہاں آگہی کا غم، غمِ جاناں اور غمِ دوراں سے نکل کر غمِ انسان کی سرحد میں داخل ہوتا ہے۔ انسانی مستقبل کے متعلق تشویش کا احساس اور حالات کی سنگینی کا شعور اس کی شاعری میں قدم قدم پر ملتا ہے۔ یہ تشویش اول تو اس احساس سے پیدا ہوتی ہے کہ انسان، انسان سے غافل ہے، اس کے اسباب متنوع ہو سکتے ہیں مگر یہ حقیقت ایسی ہے جو ندیم کے سینے کو درد سے آشنا کرتی ہے ؎

آگ جب تک نہ بجھے جنگل کی　　　بستیوں تک کوئی جاتا ہی نہیں

حسنِ اشجار کے متوالوں کو　　　حسنِ انسان نظر آتا ہی نہیں

صرف یہی نہیں کہ انسان، انسان کے حالات سے بے خبر اور کور باطن ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کو جس طرح جدید معیشت نے انسان کے استحصال کا موقع دیا ہے وہ آج کے انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے ؎

نئی زباں میں مہذب اسی کو کہتے ہیں

بلند جس کا ہو معیارِ مردم آزاری

آج کا انسان چاند پر تو قدم رکھ سکتا ہے مگر عناصر کی حقیقت سے آزاد نہیں ہو سکتا ؎

ندیم چاند پر انسان کے پہنچنے تک　　　اُبھر نہ جائے عناصر کی چار دیواری

انسان اُبھر کے آ گیا ہے　　　اک شعلۂ بے اماں کی زد میں

انسانی دنیا کے ان تضادات نے کہ وہ ایک طرف تو دنیا کے کسی گوشے میں سیلاب یا قحط آجانے پر بلبلا اٹھتا ہے اور انسانیت کا درد اُسے ہر ممکن تعاون پر مجبور کر دیتا ہے۔ مگر دوسری طرف وہ اپنے اقتدار اور قوت کے نشے میں سالہا سال تک ہزاروں لاکھوں انسانی جانوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونک سکتا ہے۔ ندیم کو درد کی دولت دی ہے۔ یہی اس کا غم انسانی ہے ؎

اک طرف انسان خود اپنی نظر میں اجنبی　　　اک طرف ذرّوں کی مریخ و زحل سے شوخیاں

اک طرف بالائے عروجِ آدمی کے مستقر　　　اک طرف گھر کی منڈیروں پر حدودِ لامکاں

کن تضادوں میں نہاں ہے مری پروازِ خیال

دستِ تخلیق کی زنجیرِ طلائی کی قسم

ابھی انسان سے پوشیدہ ہے انساں کا جمال
ایک کہتا ہے غزل۔ ایک بناتا ہے بم
ایک کو دل بھی بہت۔ ایک کو آفاق بھی کم

یہ تضاد آج کے انسان کا مقدر ہے کہ وہ کائنات کے اسرار کے انکشاف کے درپے ہے مگر خود اپنی حقیقت کا انکشاف اس پر آج تک نہیں ہوا۔ وہ زمانوں کو تسخیر کرنے کی سوچتا ہے مگر صرف ایک کل کے بارے میں نہیں جانتا کہ کیا ہوگا ؂

اب بھی انسان کی گنتی ہے اُن انجانوں میں
جن کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کل کیا ہوگا

رشتۂ فکر سے میں عصرِ رواں کا انساں
ہو کے خود اپنی ذہانت کا شکار آتا ہوں

میں جدید انسان باوصفِ غرور و تمکنت
پتھروں کے دیوتاؤں کی نگاہِ مردہ ہوں

جدید انسان کی نگاہِ مردہ کو زندگی کی دھڑکن دینا اور سے حقیقت پسندی کی منزل تک لانے کے لیے ندیم کے ہاں صرف ایک ہی نسخہ ملتا ہے اور وہ ہے سچ بولنے کی ہمت۔ ماحول کی سنگینی اور حالات کے آشوب کا ایک ہی علاج ہے کہ حقائقِ انسانی کا صداقت سے بیان کرکے ان کا احتساب کیا جائے مگر یہ منزل دار و رسن کی منزل ہے ؂

دار پر کھینچ کے بھی بدلی نہیں نیت میری
آج انا الانس کا مفہوم انا الحق ہے ندیمؔ

ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں
کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذنِ کلام

وہ نہ صرف یہ کہ انسان کے سچ بولنے کا حق مانگتا ہے بلکہ دورِ جدید میں سچ کے صحرا میں وہ خود کو اس قدر تنہا پاتا ہے کہ "نہیں منکم رجل رشید" کی صدا کی طرح "کیا کوئی انسان بھی کہیں ہے" کی صدا بلند کرتا ہے ؂

سچ کے کھنڈر پہ چڑھ کے صدا دے رہا ہوں میں
دنیا میں کوئی بھی مجھے پہچانتا نہیں

وہ سچ کا چراغ اپنے ہاتھ پر رکھ کر سچ کے معیار سے انسان کو تلاش کرنے نکلا ہے اور اُسے یہ غم کھا رہا ہے کہ اس معیار کی کسوٹی پر پورا اُترنے والا انسان ابھی میسر نہیں! ؂

اک شانِ بے رخی سے بساطِ حیات پر
سچ کو لبا کے دل کے سفر پر چلا تھا میں

کتنا غرور تھا مجھے عرفانِ ذات پر
کوسوں تک ایک بھی مجھے انساں نہ مل سکا

قاسمی نے اردو شاعری کو غم کی جو تیسری جہت غمِ انسان کے نام سے دی ہے اس کا بھرپور اظہار ان کے ہاں انسان کی محبت، اس کی خطاؤں سے محبت، اس کی کمزوریوں سے محبت یعنی ہر صورت میں انسان سے محبت کے احساس سے ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کا واحد مقصد انسان سے محبت ہے۔ دشمنِ جاں ہو تو بھی اور رہزنِ ہوش ہو تو بھی! — اور یہ کہنا لا حاصل ہے کہ ابراہیم ادہمؒ کے حوالے سے انسان سے محبت خالقِ انسان سے محبت کی منزل ہے ؂

عمر بھر میں نے عبادت کی ہے
داورِ حشر مجھے تیری قسم

تو مرا نامۂ اعمال تو دیکھ — میں نے انسان سے محبت کی ہے

چلو دشتِ طلب میں ایک انسان تو نظر آیا
جو وہ مانے تو اپنی جان رکھ دوں دستِ رہزن پر

حسن ہے انسان کی معراجِ تصور — جس حُسن کو پوجا ہے مرے شعر و ادب نے

ندیم کے نزدیک غمِ حیات کی حقیقت برحق سہی۔ مفلسی اور غربت کے عفریت کی یلغار ایک واقعہ سہی مگر وہ زمین کے غم کا نشہ نہیں توڑ سکتے اس لیے کہ یہ زمین انسان کی جولاں گاہ ہے ؎

مجھ سے مر کر بھی نہ توڑا جائے
ہائے یہ نشہ زمیں کے غم کا

اور نہ وہ انسان سے پیار کرنے کے مسلک سے ہٹ سکتا ہے۔ اس کے نزدیک غمِ انسان۔ ہر غم سے برتر اور حسین ہے، اتنا حسین کہ اسے سرمایۂ جاں بنایا جائے ؎

مانتا ہوں غمِ افلاس پرانا غم ہے
غمِ انسان سے ہیں کم تر سب روگ

اس لیے کہ انسان سے محبت تو خود اپنے آپ سے محبت ہے ؎

مثلِ خورشید ہوئی ہے افقِ فن پہ طلوع
یہ حقیقت کہ جو شاعر ہے وہ انسان بھی ہے

اردو شاعری کی تاریخ میں شاعری کو غمِ انسان کی جہت سے اس بھرپور انداز میں روشناس کرانے کا سہرا احمد ندیم قاسمی کے سر ہے۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک حیات و کائنات کے اسرار سے آشنائی اور عرفان کی منزل کا آغاز عرفانِ انسان سے ہی ہو سکتا ہے ؎

جب تک نہ سمجھ میں آئے انسان
ہم اپنی سمجھ میں خاک آئیں

ہر انسان کی زندگی میں ایسا وقت ضرور آتا ہے جب اُسے ہر خوبصورت چیز پر ٹوٹ کر پیار آنے لگتا ہے (اور خوبصورتی اپنا اپنا معیار ہوتا ہے) اور یہ تجربے عشق کی "ریہرسل" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھ پر بھی یہ وقت آیا مگر پھر میں عشق کے ایک عظیم تجربے سے گزرا اور اس کے بعد میرے ذہن کی وہی کیفیت ہو گئی جو اب تک قائم ہے۔

——— ندیم

خالد عرفان

احمد ندیم قاسمی۔ ایک تاثر

کسی فن کار کے فن کو پرکھنے سے پہلے اس کی شخصیت کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ لیکن ایک قاری کا فن کار سے براہِ راست تعلق صرف فن کے ذریعہ ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے اس کے فن کا گہرا جائزہ فن کار کی شخصیت سے روشناسی کا وسیلہ بن سکتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے معاملہ میں ایک طرح سے یہ جائزہ آسان بن جاتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے "جلال و جمال" کی ابتدا میں اپنی زندگی اور نظریۂ فن کے متعلق تفصیل سے باتیں کی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ان کے نظریۂ فن میں بنیادی تبدیلی نہ سہی پختگی آگئی ہو کیونکہ انھیں خود اس زمانہ میں اس بات کا اعتراف تھا کہ انھوں نے ابھی اپنا سفر شروع کیا ہے۔ نہ جانے کن راستوں پر چل کر انھیں منزل پر پہنچنا پڑے۔ ظاہر بات ہے جب وقت کے ساتھ ساتھ فن میں گہرائی اور گیرائی آتی جاتی ہے تو بنیادی تصورات بھی بدل سکتے ہیں۔ لیکن ایک حساس ادیب جس کا دل آسمانوں کی طرح بلند اور فضاؤں کی طرح وسیع ہو ایک بنیادی تصور کو سینے سے لگائے اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور شاید ہی کوئی ادیب اپنی منزل معین کر سکتا ہے اس لیے کہ وہ جب بھی کسی منزل کو معین کرتا ہے تو اس معینہ مقام پر چل کر اس کو پتہ چلتا ہے کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اور وہ اُن کی تلاش میں آگے بڑھ جاتا ہے۔

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ ہر سچے فن کار کا ایک بنیادی تصور ہوتا ہے جو کبھی نہیں بدلتا۔ لیکن اس حد تک پہنچنے کے لیے وہ طرح طرح کے روپ اور رنگ اختیار کرتا ہے۔ یہاں میرا مطلب انسانیت کی بقا اور ترویج سے ہے۔ فن کار ضروری نہیں ہے کسی مخصوص مذہب کا پیرو ہونے سے پہلے اس عالمگیر نظریہ کا معتقد ضرور ہوتا ہے۔ ورنہ اس کا فن گھٹ کر رہ جاتا ہے اس نظریے اور اعتقاد کا اظہار وہ اپنے فن کے ذریعہ اپنی استطاعت اور تربیت کے مطابق کرتا ہے۔ میں نے استطاعت اور تربیت ان کے محدود مطالب میں نہیں استعمال کیے ہیں۔ ان دو لفظوں میں فن کار کے تجربات و مشاہدات سے لے کر اس کے اعتقادات اور نظریہ حیات تک سب کچھ آجاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے اسی ابتدائیہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ انھوں نے اپنے سفر کی ابتدا ہی میں منزل کی نشان دہی کر لی تھی۔ ان کا کہنا ہے۔ صرف ایک تمنا ہے کہ میں اپنی شاعری اور

افسانہ نگاری کے ذریعہ انسانیت کی عصمت وطہارت قایم رکھتے ہوئے ایک ایسے نظام کی تعمیر میں ممد ثابت ہوسکوں۔ جس میں ہر انسان دوسرے انسان کو انسان سمجھے۔ اگر فن کار اپنے اس مقصد میں اس قدر بھی کامیاب ہو جائے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کے دل میں ایک ہلکی سی خلش اور کسک ہی پیدا کر دے تو یقیناً وہ خود ندیم کے الفاظ میں ایک کارنامہ ہوگا۔ اور اس کارنامہ کی انجام دہی میں ایک ادیب ہونے کے ناتے جن ضروریات کا موجود ہونا لازمی ہے وہ اُن کے الفاظ میں حسن "فن کارانہ بانکپن" اور "غیر فانی جوانی" ہیں۔ ان تین کسوٹیوں پر میں اس بات کی کوشش کروں گا کہ ندیم کے فن کا اجمالاً جائزہ لوں۔ ہوسکتا ہے میں۔ یہ جائزہ تنقید و تبصرہ کی کسوٹی پر پورا نہ اترے اس لیے کہ تنقید و تبصرہ کے بنیادی اصولوں سے پوری واقفیت کے بعد ہی قطعی رائے پیش کی جاسکتی ہے اور یہ میرا دائرہ نہیں ہے اس لیے میں اس مقالے کو جائزے کے بجائے ندیم کے فن کے متعلق میرا اپنا تاثر کہوں گا۔ اس طرح یہ مقالہ بالکل ذاتی چیز بن جائے گی۔ اور ذاتی رائے کا حق بنیادی نہ سہی دستوری تو ہے ہی۔

فن کار حوادث اور حالات کی بھٹی میں تپ کر ہی فن کار بنتا ہے۔ جس طرح سونا تپ کر کندن بن جاتا ہے۔ ندیم کو فن کار بننے کے لیے ان تمام منازل سے گذرنا پڑا جہاں ان کے احساسات پر تازیانے لگے۔ اُن کے ذہن کو جھٹکے لگے، جنھوں نے ان کے دماغ کی چولیں ہلا دیں اور اُن کے اندر بسنے والا وہ انسان جاگا جس نے زمانے اور حالات کے خلاف بغاوت کردی ہے

انساں باغی ہو جاتے ہیں جب ٹیکیں من کے گھاؤ

لیکن ان کی بغاوت میں ایک طرح کی فرزانگی اور ہوشیاری ہے وہ عام انقلابیوں کی طرح ہر چیز کو تہہ و بالا نہیں کرتے چلے جاتے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ ہر چیز جس پر قدامت کی چھاپ ہے ہمیشہ بری نہیں ہوتی۔ اسی قدامت میں تہذیب و تمدن اور انسانیت کے ایسے اقدار بھی چھپے ہوئے ہیں جن کی حفاظت اور پرورش اور ترویج ضروری ہے ان کے کئی افسانوں میں ان اقدار کا اظہار ہے ان کی اکثر نظموں میں اس خیال کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک ایسے زمانہ میں جب غزل اور نظم کے اظہار میں ہیئت اور اسلوب کی تبدیلی کو ناگزیر قرار دے کر قدیم روش کو بری طرح لتاڑا جارہا تھا۔ ندیم نے پابند نظم اور غزل کو اپنے فن کے اظہار کے لیے لازمی قرار دیا۔ یہ نہیں کہ اُنھوں نے ایک اور مکتب خیال کے لوگوں کی طرح جو ہر جدت اور نئی چیز کو معتوب قرار دیتے ہیں، آزاد نظم کو بالکل ہی نہیں اپنایا۔ ان کی ایک کامیاب آزاد نظم "ارتقا" ہے اس نظم کی شروعات ہی ان سوالات سے ہوتی ہے جو ہر بالغ نظر اور تجسس رکھنے والے فرد کے دل میں رہ رہ کر اٹھتے ہیں۔ اور جو ہر فلسفی کے افکار کو الجھائے رکھتے ہیں۔

"ہم کہاں سے چلے تھے؟"

لیکن اس کے فوراً بعد ایک ایسا سوال دہرایا جاتا ہے۔ جو ایک حساس ذہن ہی کر سکتا ہے اور جس کے دل میں رہ رہ کر ایک ان جانا خوف اٹھا کرتا ہے کہ

"ہم کہاں جائیں گے؟"

ہم عناصر کے طوفان میں تنکوں کی مانند جانے کہاں سے چلے تھے۔ کہاں جائیں گے؟

پھر ندیم نے جس طرح ارتقاء کا ذکر کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا ذہن صرف شاعری اور افسانہ نگاری کے میدان میں گھٹ کر نہیں رہ گیا ہے ان کو اپنے اردگرد کی ہر دم بدلتی، ہر آن ترقی کرتی، اپنے آگے سائینس اور دیگر علوم کے ذریعہ کئی پرتیں کھولتی زندگی کے ہر روپ، ہر رنگ سے دلچسپی اور جانکاری ہے۔ وہ اپنے تصوراتی عقائد کو آنکھیں بند کر کے نہیں مانتے بلکہ ایک باریک بیں، دور بیں تماشائی کی طرح گہرے مشاہدے کے سہارے اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انسان کو عریاں کرنے کے لیے سیاست کا طوفان ہی تعاقب نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ اس پُر اسرار عالم کی دیگر قوتیں بھی روز ازل سے کوشاں ہیں، لیکن انسان ان قوتوں سے ٹکرلے کر رہے گا۔ ان کا پیام ہے کہ ؎

اُبھر د بھی ندیم اپنی شکستوں کے کھنڈر سے
ٹوٹے تو بلندی کو لپکتا ہے شرر تک

ندیم کی شاعری میں فکر کا رنگ، لگتا ہے۔ اقبال کی شاعری سے ملا ہو۔ اس لئے کہ اُن کی نظموں مثلاً "مرد خود شناس" وغیرہ میں یہی رنگ چھلکتا ہے۔ ندیم کے غور و فکر میں فلسفیانہ رنگ کی ایک مثال "بھونچال" ہے جس میں انھوں نے "کرۂ ارض کی مانند ہے انساں کا وجود" کہتے ہوئے انسان کا کس قدر حسین تجزیہ کیا ہے کہ سطح پر پھول، سبزہ، خنک چھاؤں، برف، چاندنی، سب کچھ ہے لیکن باطن میں ایسا لاوا گرج رہا ہے جس سے کہسار چیخ جاتے ہیں۔ یعنی ؎

لبِ دریا جو یہ معصوم سا اک گاؤں ہے
اس کے نیچے وہ جہنم ہے کہ جب جاگے گا
آدمی اپنے ہی پیکر سے نکل بھاگے گا

اور پھر ان کا ذہن ایک اور حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے تڑپنے لگتا ہے۔ رعنائی تن کے اُس پار دیکھتے ہوئے عارض سے پرے نکہتِ گیسو و شیرینئ لب کے پس پشت، حسن تہذیب و تمدن سے ہٹ کر ذہن کے آتش سیال میں جو بھنور پڑ رہے ہیں۔ اس سے جو قدریں تھرا رہی ہیں۔ معیار الٹ رہے ہیں، اُن کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:۔

۔۔۔۔ اور اس زلزلۂ فکر و نظر سے ہر بار
کتنے دیوانے روایت سے دغا کرتے ہیں
کتنے بُت ٹوٹتے ہیں کتنے خدا مرتے ہیں

کیا واقعی خدا مر جاتے ہیں؟

ان کی شاعری اُن کے فن کی ایک اور خصوصیت کی نشان دہی کرتی ہے۔ ندیم حوادث و مشکلات کے درمیان پھنس کر گھبرا نہیں جاتے۔ ہمت نہیں ہارتے۔ امید کا دامن نہیں چھوڑتے۔ وہ فطرتاً "رجائی" ہیں۔ اس رجائیت میں کہیں بھی "قنوطیت" کی چھاپ نہیں ہے۔ میرا اندازہ ہے اُن کی اس رجائیت میں اُن کے گھریلو ماحول اور "مقامی رنگ" کا بڑا حصہ ہے۔

مقامی رنگ سے میری مراد دیہاتی زندگی ہے جس کے وہ ایک کامیاب عکاس ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں اس مقامی رنگ کو بڑے ہی فن کارانہ بانکپن سے استعمال کیا ہے۔ اور اُس کے "حسن" کو ایک "غیر فانی جوانی" بخشی

ہے جب بھی شہر کی زندگی نے ندیم کو بُری طرح کچھ کے لگائے ہیں دیہات ہی نے اُن کو سکون بخشا ہے اُن کے ذہن کے رِستے زخموں پر مرہم لگایا ہے دیہات نے قاسمی کو جو گراں قدر احساسات عطا کیے ان کو افسانوں اور شاعری کے ذریعہ دوسروں تک پہنچا کر انھوں نے دیہات سے وفاداری کا حق ادا کر دیا ہے۔

عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ شہر کی ملوث زندگی سے دیہات پاک ہوتے ہیں۔ وہاں فطرت اور انسان دُھلے دُھلائے صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ خیال اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ ندیم کو فن کار نہ ماننا۔ چاہے انسان فطرت کی آغوش میں نگینہ کی طرح چمکنے والے دیہات میں رہتا ہو یا کارخانوں کی چمنیوں سے اٹھتے ہوئے کثیف دھوئیں میں سانس لیتا ہو۔ انسانی فطرت سب جگہ ایک ہے جو بنیادی مسائل شہری کو حل کرنے پڑتے ہیں۔ انہی مسائل سے، ایک چھوٹے پیمانے پر سہی، دیہاتی کو بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح کے کئی ایک مسائل کو ندیم نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے ویسے دیہات کو اپنے محلِ وقوع اور طرزِ زندگی کی وجہ سے بعض مخصوص مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے، ندیم نے اُن مسائل کو نہیں بھلایا ہے۔

دیہات کے بھولے بھالے کسانوں اور اُن کی معصوم ناریوں کے درمیان بھی ندیم نے کئی ایسے روپ دیکھے ہیں۔ جو دوسرے، فسانہ نگاروں کو شہر میں ملتے ہیں۔ اکثر سمجھا جاتا ہے کہ شہر کی گوناگوں اور مصروف زندگی میں فسانوں کے لیے جتنے پلاٹ اور کردار ملتے ہیں۔ اتنے دیہات میں نہیں مل سکتے۔ اس نظریہ کی غلطی سب سے پہلے تو ہمارے ادب میں پریم چند کی کہانیوں اور ناول کو پڑھ کر آشکارا ہو جاتی ہے۔ پریم چند کے بعد کئی اور ادیبوں نے بھی دیہاتی زندگی کو اپنے افسانوں میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لیکن اس میدان میں ندیم نے اپنا ایک خاص رنگ اختیار کیا ہے۔ اُن کے افسانے پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ دیہات جیسے محدود مقام اور ماحول سے بھی ایسے موضوع مل سکتے ہیں۔ جن کی بنیاد پر ایک اچھا افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ ضرورت تو یہاں بھی اس چیز کی ہے جس کے بل بوتے پر ہمیشہ ایک اچھا افسانہ تخلیق کیا جاتا ہے۔ گہرا مشاہدہ فکر اور اُپج۔

ندیم نے جن دیہاتی کرداروں کو پیش کیا ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے گہرے مشاہدے کا پتہ چلتا ہے، بلکہ اس امر کا بھی، اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اس کردار پر قلم اٹھانے سے پہلے اتنی گہری فکر کے ذریعہ اس کا نفسیاتی اور واقعاتی مطالعہ کیا ہے۔ اور پھر اُس کو بالکل نیا اوریجنل اور منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ گہرے مشاہدے سے میرا مطلب صرف اس کردار کی حرکات و سکنات، واقعات عمل، اور ردِ عمل سے نہیں ہے۔ جب تک اس منظر کا گہرا مطالعہ نہیں کیا جاتا۔ کردار میں وہ رنگ نہیں بھرا جا سکتا۔ جس سے کہ کردار کو زندگی ملتی ہے۔

ندیم نے دیہات کی معاشرت، سیاست اور نزاکت کے ساتھ ساتھ دیہاتیوں کے سپنوں، امیدوں، آرزووں، مایوسیوں، الجھنوں اور مسائل کا بھرپور مطالعہ کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کے اولین دور کے افسانوں میں وہ گہرائی اور پختگی نہیں ہے جو ان کے آج کے فن پاروں میں پائی جاتی ہے۔

"گرداب" کے افسانے اس بات کے غماز ہیں۔ کہ ندیم کے پاس ایک حساس دل ہے۔ جس کے بل بوتے پر وہ دوسروں کے درد کو محسوس کرتے ہیں۔ اور اس احساس کو وہ دوسروں تک منتقل کر سکتے ہیں۔ لیکن ان میں جذبے کی

وہ گہرائی نہیں پائی جاتی جو ان کے بعد کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ اس حیثیت سے قاسمی خوش نصیب ہیں۔ اس لیے کہ "حساس" دل تو ایک ادیب کے لیے فطرت کا عطیہ ہوتا ہے جس کے بل بوتے پر وہ اپنے فن کے نقوش بناتا ہے۔ لیکن کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مالی اور دیگر مصلحتوں کے زیرِ اثر فن کار اپنی تخلیق میں فن سے زیادہ اہمیت صرف زود نویسی کو دیتا ہے۔ اور اس طرح، بہت سے کامیاب اور بلند پایہ افسانہ نگاروں کی کئی ایک تخلیقات بھی صرف "بھرتی" کی بن کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن ندیم کے سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ ندیم کا قلم ہمیشہ ترقی کی جانب گامزن رہا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کے قلم میں زور پیدا ہوتا چلا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ افسانے میں قاری کو وہ سب کچھ نہ ملے جو اُن کی تحریر کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ لیکن ایسی تحریروں میں بھی کوئی نہ کوئی پہلو اچھا مل ہی جاتا ہے۔ مثلاً "شکن" واقعاتی اعتبار سے ایک مخصوص افسانہ نہ سہی، اور اس کا کردار کمزور سہی لیکن یہاں بھی ندیم کے خلوص اور درد کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

ندیم خلوص اور خودداری کے پتلے ہیں۔ اُن کے عزتِ نفس نے انھیں کئی مرتبہ اپنی خودداری کو ٹھیس پہنچنے نہیں دیا ہے۔ انھوں نے یہی خلوص اور خودداری اپنے افسانوں کے کئی ایک دیہاتی کرداروں میں دیکھی ہے۔ اُن کے کردار جب پیار کرتے ہیں۔ تب بھی اُن میں عزتِ نفس اور خودداری کا وقار ہوتا ہے۔ مثلاً "سپنوں کے محل" میں جب ذیلدار نے پہلے تو محبت کے سنہرے تانے بانے گاؤں کی چھوری کے گرد بنے اور پھر روپے کے بل بوتے پر اس کو اڑانا چاہا تو وہ روپے پھینک دیتی ہے اور کہتی ہے "ارے بدھو کیا تو نے مجھے ربڑ کی گڑیا سمجھ لیا ہے کہ دو کوڑی دے کر مول لے گا" بدمعاش کہیں کا۔ لچا۔ شہدا"۔۔۔ دھرتی میں بیج ڈال کر پودوں کے اُگنے اور خوشوں کے کٹنے تک انتظار کرتے کرتے ایک عمر بتا دینے والی کسان عورت کی اسی خودداری نے ان چھ پیسوں کو لینے سے انکار کر دیا تھا جو ایک سفید پوش بزرگ نے ترس کھا کر اس "وحشی" بڑھیا کے لیے بس کنڈکٹر کو دے دیئے تھے جس کے پاس کرایہ کے لیے ساڑھے پانچ آنے کی بجائے صرف چار آنے ہوتے ہیں۔ اس کی غیرت نے بوتلن تک کی طویل راہ پر چلنا منظور کیا۔ لیکن بھیک کے چھ پیسوں کو لینا گوارا نہیں کیا۔ اور "شیر محمد" کا اللہ بخش موچی ہے۔ جس کو ملک الٰہی غیرت دلاتے ہیں کہ فن کارانہ ہاتھ ہیں۔ سال بھر میں دوسرے موچیوں سے دس گنا کمائی ہوتی ہے لیکن رہنے کے لیے گھر نہیں بن پایا ہے۔ اور جب طعنے سنتے سنتے اللہ بخش جس کا مذاق بلند ہے، جو ایک دم بڑھیا کپڑے پہنتا ہے، جس کے بھی دل ہے، اور دل میں ارمان آرزوئیں ہیں، جلتا ہے اور گاؤں میں "پکا مکان" تعمیر کرنے لگتا ہے تو سارا گاؤں حیرت میں پڑ جاتا ہے، ملک الٰہی حسد کی آگ میں جل اٹھتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ادنیٰ موچی ایک ایسے مکان کا مالک بنے جس کا خواب بھی وہ خود نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن اللہ بخش مکان بناتا ہے "کیوں اور کیسے" اس کا پتہ ملک جی کو اس وقت چلتا ہے جب وہ نئے گھر میں رہائش کے لیے داخل ہونے کے دن ان کے پاس سو روپیوں کے لیے جاتا ہے۔ اُن کی انتقامانہ آگ بھڑک اٹھتی ہے اُن کے غلط جذبات اُبھر آتے ہیں۔ وہ پکار پکار کر کہتے ہیں "لوگو بشکو نے قرض لے کر مکان بنایا ہے" بشکو کی عزتِ نفس، خودداری "اور "رسول پاک کی قسم" کو دھکا پہنچتا ہے۔ وہ دل ہو رچلا آتا ہے۔ محنت کرتا ہے، فاقے کرتا ہے، پھر روپے ادا کرتا ہے۔ اور اپنے مکان کو لوٹنا چاہتا ہے جو اس کا اپنا ہوگا!!۔۔۔ نچلے طبقے کی آرزوؤں، ارمانوں اور سپنوں کے تانے بانے کیسے بنتے ہیں اور وہ کیسے اونچا اُٹھنا چاہتے ہیں۔ اس کا بھرپور ذکر آپ کو اس افسانے میں ملے گا۔ اسی طرح کا ایک جیتا جاگتا کردار محمد دین تھی ہے جو تھانیدار کی اکنی کی چارپائیاں بنائے پایا ہے:

لیکن اپنی بہن کی زندگی کے بعد بھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا"۔

ایک اور کہانی "الحمد للہ" ہے جس میں ندیم کا فن پورے عروج پر ہے اور جس میں دیہاتی زندگی کی ساری مجبوری ساری بے کسی اور بے بسی بھی فنکارانہ طریقہ پر پیش کی گئی ہے۔ مولوی ابل کے لیے شادی ذمہ داری کا احساس لاتی ہے اُن کی زندگی کی رنگینی غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن "توکل" اور "اللہ کی رحمت" جس پر دیہاتی اندھا عقیدہ رکھتے ہیں، ہر مرتبہ نیک دل اور متقی فتح داد کی صورت میں مولوی ابل کے کام آتے ہیں۔ اور ان کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ زیب النساء، مہرالنساء اور شمیم احمد زندگی سے لیے گئے کردار ہیں۔ اس لیے ان کی آرزوئیں تمنائیں اور ضرورتیں حقیقی ہیں۔ پھر ایک دن "ناک" کا مسئلہ آ جاتا ہے۔ مولوی ابل جن کی جیب میں ایک پائی نہیں، جنھیں ابھی کئی بیٹیوں کی شادی کرنی ہے، اپنے نواسے کی پیدائش پر اپنی ناک کٹوانے سے محفوظ رکھنے کے لیے فتح داد کے پاس روپے کے لیے جاتے ہیں۔ لیکن اللہ میاں ان کی لاج رکھ لیتے ہیں۔ فتح داد مر جاتا ہے۔ اور اس کے جنازے پر سینکڑوں روپے ملنے والے ہیں۔ مولوی ابل خوش ہے۔ خوشی خوشی گھر لوٹتا ہے۔ جہاں زیب النساء کا نوحہ سن کر احساس ہوتا ہے کہ فتح داد کی موت پر تو وہ یتیم ہو گیا ہے۔ تب وہ شریعت کو بھول جاتا ہے اور دھاڑیں مارتا جانے کدھر ہو لیا ہے۔ ہمارے معاشرے کے کتنے حقیقی مرقع ہیں ندیم کے افسانے!

اسی طرح کا مرقع ایک معمولی سی کہانی "سفارش" ہے۔ بات صرف اتنی ہے۔ فیکے کوچوان کے بوڑھے باپ کی آنکھوں کا علاج کروانا ہے۔ ایک بابو جی جو کہ تعلیم یافتہ ہیں۔ بڑے رکھ رکھاؤ سے رہتے ہیں۔ فیکے ان سے ملتا ہے اور بابو جی سفارش کا وعدہ کر لیتے ہیں جو پورا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود فیکے کا کام بن جاتا ہے۔ باپ کی بینائی واپس مل جانے سے تو وہ شکریہ ادا کرنے آتا ہے۔ تب بھی بابو جی کے اندر کا انسان جاگتا ہے۔ پر اس کے اندر کا انسان کچھ بھولا ہے، جھوٹ سے پہلا سفر ہی ہے۔ بابو جی کو اپنے جھوٹے بھرم کو قائم رکھ لینے کا موقع دے جاتا ہے۔ .... "آپ نے بینائی لوٹا دی ہے اور آپ نے وہ بھی آپ نے مجھے سر ... ہے اور بابو جی قسم خدا کی میں عمر بھر آپ کا نوکر رہوں گا۔"

اور ہم میں آپ میں ایسے کتنے ہیں جو اس عظیم لمحہ کو پا کر بابو جی کی طرح بہت ہی بہت گہری سانس لے کر فیکے جیسے عظیم انسان پر احسان کرتے ہیں کہ "کوئی بات نہیں فیکے، کوئی بات نہیں" اور پھر شاید کندھے جھٹک کر اپنے روزمرہ کے کاموں میں اس طرح لگ جاتے ہیں کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور پھر اسی طرح فیکے کو، فیکے کے باپ کو اور سب سے بڑھ کر اپنے آپ کو دھوکا دینے لگتے ہیں۔ جھوٹ کہنے لگتے ہیں۔ ندیم نے ہمارے معاشرے کے "مہذب" انسان پر بڑا گہرا طنز کیا ہے اس معمولی سی کہانی میں۔

میں نے اب تک ندیم کے افسانوں اور شاعری کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔ وہ ہے ان کی رومانی کیفیت۔ ندیم عورت کے ذکر سے نہیں بلکہ حسن کے تذکرہ سے رومان پیدا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں حسن صرف دیہاتی دوشیزاؤں میں نہیں بلکہ فطرت اور دیہات کے وسیع آنگن میں ہر طرف بکھرا ہوا ہے۔ اس "حسن" اور "رومان" کو وہ اتنے ہی حسین "نازک" "کومل" اور "مترنم" الفاظ کے دلکش روپ میں پیش کرتے ہیں۔ اور جب بھی حسن اور محبت کا ذکر کرتے ہیں اس کے لیے جن استعاروں کو استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تشبیہیں بڑی جاندار ہوتی ہیں

سے

تیری زلفیں ہیں کہ ساون کی گھٹا چھائی ہے
تیرے عارض ہیں کہ پھولوں کو ہنسی آئی ہے
یہ ترا جسم ہے یا صبح کی شہزادی کی
ظلمتِ شب سے الجھتی ہوئی انگڑائی ہے

ان کے کلام سے ایسی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں جن میں دیہاتی دوشیزاؤں کے دل کی دھڑکنیں ہیں، جوانوں کی مچلتی آرزوئیں ہیں، بوڑھوں کی حسرتیں ہیں اور ان سب میں ایسی رنگینی اور مستی چھائی ہوئی ہے جو دیہات کی آزاد زندگی میں رچی ہوئی ہے۔

میں نے اس سے پہلے ندیم کے ہاں فکر اور مقصدیت کی موجودگی کا بھی اشارہ کیا ہے۔ جو ان کی کئی نظموں اور غزلوں میں پائی جاتی ہے۔ انھوں نے زندگی کے حسن، زندگی کے کرب اور زندگی کے مسائل ہی کا فنکارانہ تجزیہ نہیں کیا ہے بلکہ زندگی کا فلسفیانہ تجزیہ بھی کیا ہے۔ ان کے قلم سے ایسے شعر بھی نکلتے ہیں جن میں اس تجزیہ کے ساتھ گہری فکر اور احساس کا اظہار پایا جاتا ہے۔ بعض جگہ انھیں "انسانیت" یاد آجاتی ہے۔ وہ خدا تک کو اسی انسانیت کے رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں ؎

"یہ پھول بھی تو اسی دھول سے اُگے ہیں ندیم
رُخِ خدا مری دنیا کا رہنے والا ہے"

وہ کبھی خدا سے خطاب کرتے ہیں

گو اپنے گناہوں سے انکار نہیں مجھ کو   رسوائی آدم ہے لیکن تیری رسوائی

تو کبھی نیک بندے سے کہتے ہیں۔

سجدے بھی ہیں اشنا بھی ہے حمد بھی ہے دعا بھی ہے
اشک مگر کہیں نہیں دامنِ پاکباز میں

میں اس تجزیہ میں ان کی زندگی کی تلخیاں کچھ اس طرح رچی بسی ہوتی ہیں کہ ان کا فکر طنز بن جاتا ہے اور وہ اسی جھنجھلاتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہتے ہیں ؎

داورِ حشر! مجھے تیری قسم   عمر بھر میں نے عبادت کی ہے
تو مرا نامۂ اعمال تو دیکھ   میں نے انسان سے محبت کی ہے

وہ یہاں تک کہہ اٹھتے ہیں کہ ؎

یارب اک عرض ہے گستاخانہ   ہیں آزردہ ترے در کے صنم
مسکراتا ہوا پایا ہے تجھے   جب چٹانوں میں دھڑکتے ہیں صنم

بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ وہ جس طرح انسان سے مایوس نہیں ہوتے خدا کی ذات سے بھی آس لگائے بیٹھے ہیں ؎

اس انتظار میں تکمیلِ کفر ہو نہ سکی   کبھی تو میرا خدا بھی مرا خدا ہوگا

"جذبہ تخلیق" میں طنز و فکر کی یہی گہرائی ملتی ہے ؎

ایک مٹی کا دیا تو کو سنبھالے کب تک
تیل بھی ختم ہے طوفان بھی اُمڈ آیا ہے
اے فرازوں کے خدا میرے نشیبوں کو نہ بھول
تو نے کیا جذبۂ تخلیق کو بہلایا ہے

"ارتقا" میں جس ندیم کو آپ نے دیکھا تھا اسی ندیم کو آپ "غنچہ پھر لگا کھلنے" میں پائیں گے اس کا آخری بند سنیے۔

سحر کی ایک ہی تفسیر ہے۔ طلوعِ سحر　　مجھے فریب نہ دے روشنی کی تفسیر میں
نہ مسکرائے گا غنچہ بہار آنے تک　　وہ لاکھ نوکِ سناں سے کلی کا دل چیریں
کچھ اور نام ہے اس کا، یہ فصلِ گل تو نہیں
کہ بوئے گل کے لیے ڈھل رہی ہیں زنجیریں

یہی فکر و جذبہ کی گہرائی و گیرائی آپ کو "نذرِ فن کاران وطن" میں دکھائی دے گی۔ انسان کو مقدر بہ جلال آ رہا ہے اور آدم کے لبوں پر سوال آ رہا ہے کہ کیا "خلد کی میراث پر کچھ میرا حق نہیں ہے" اس میں فن کار کا فرض کیا ہے؟ سنیے ؎

سوئی ہوئی کس دُھن میں تری غیرتِ فن ہے؟
جاگا ہوا انساں بھی تو موضوعِ سخن ہے!

اور اس شعر میں بھی یہی گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے ؎

بہار کتنی ہی بے رنگ ہو، بہار تو ہے
جو گُل نہیں تو کوئی زخم ہی کِھلا ہوگا

فن کار کے نازک دل میں بچوں کے لیے مخصوص مقام ہوتا ہے۔ لیکن ہر فن کار بچوں سے اپنے اس والہانہ تعلق کو اپنی نگارشات میں نہیں بیان کر سکتا اس کے لیے بچے کی نفسیات اور ضروریات کو سمجھنا پڑتا ہے۔ ندیم اس میدان میں بھی اپنا رنگ جمائے ہوئے ہیں۔ بچوں کے نازک احساسات کو اس قدر خوبی اور رنگینی سے بیان کرنا کہ بچے تو کیا بڑے بھی پڑھ کر جھوم جھوم جائیں۔ ندیم کا حصہ ہے آپ "تندرست بچے کی فریاد حکیم جی" سے پڑھیے۔ آپ کو مدرسہ کے دن یاد نہ آئیں اور آپ اسی وقت سر درد کا بہانہ نہ کرنے لگ جائیں تو میرا ذمہ۔ "شرارت" میں ننھے میاں کی ہم جولیوں، دوستوں اور بھائیوں سے شرارتیں کرتے دیکھ کر آپ کی رگ شرارت بھی پھڑک اٹھے گی۔ ان ہلکی پھلکی نظموں کے بعد جب ندیم کو کوئی خاص پیغام دینا ہوتا ہے۔ تو دیکھیے وہ کیسے کہتے ہیں ؎

گلی گلی کی خاک اڑائی　　پھر یہ عادت کام نہ آئی
اب تم پر پھبتی کستے ہیں　　ابا، امی، آپا، بھائی
اگلے سال کی خاطر لیکن محنت کرو خدارا

نغمے

اب نہ پھر دآوارہ

اب آیئے پھر سے کہانیوں کی طرف لوٹ چلیں۔ ندیم کے قلم نے صرف دیہاتی رنگوں کی دھنک آپ کے آگے نہیں پھیلائی ہے۔ اس کا موضوع دوسرے کردار بھی رہے ہیں۔ "رئیس خانہ" کا فضلو بھی ایک دیہاتی ہے۔ وہ رئیس خانہ کا مالک ہے وہاں ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ لیکن فضلو کے پاس نیکی کا ایک تصور ہے۔ اس کی "مریاں" ہے جو اس تصور کو بنائے رکھنے میں فضلو کا ساتھ دے رہی ہے۔ دونوں میں بے پناہ محبت ہے اس محبت کے درمیان ایک "صاحب" آتا ہے جو فضلو کو گناہ کے راستے میں لا کھڑا کرتا ہے جس کی وجہ سے فضلو کو نت نئے تجربے اٹھانے پڑتے ہیں۔ اس کا ذہن جاگتا ہے۔ لیکن ایک ایسی ٹھوکر کھانے کے بعد جس کی وجہ سے فضلو اور مریاں کی "محبت" کو پل صراط پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ فضلو اس بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز پل پر سے نیچے گرجاتا ہے لیکن یہی انجانی اور ملکوتی "محبت" ہوتی ہے جس کی وجہ سے اتھاہ گہرائیوں میں گر کر بھی فضلو التجا کرتا ہے ——— "مریاں" اور "مریاں" سسکیوں میں پوچھتی ہے۔ "تم مروگے تو نہیں" اور زندگی سے پیار (خواہ یہ زندگی ذلتوں کے سمندر میں غوطے لگا آئی ہو) فضلو کو یقین کے ساتھ کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ "نہیں" اور پھر:

"حرامزادے ——— وہ بلک بلک کر روتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

"سور کی بچی" — وہ اس کے بالوں کو خون آلود ہونٹوں سے چومنے لگا۔ ندیم کا یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔

آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟ کبھی اس البیلے انجانے اور پیارے جذبے کی ماہیت نفسی کی ہے نہیں نا۔ گھبرایئے نہیں۔ آپ چپکے سے "گلدستہ خار" پڑھ لیجیے، آپ کے سپاٹ دل میں اس جذبہ کا لالۂ صحرانہ کھل اٹھے تو میرا ذمہ! اس پاک جذبہ کی تخلیق اور پرورش کی کس قدر حسین ترجمانی کی گئی ہے۔ کون جانے آپ ہی وہ نگہت ہوں اور آپ ہی وہ سرفراز جو اس دو دھاری خنجر کے کشتہ ہوں۔ اور وہ لمحہ کتنا نورانی کتنا ملکوتی حسن، مسرت اور سکون لیے ہوتا ہے جب نگہت کو سرفراز مل جاتا ہے۔

لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ محبت ایک ایسا کرب عطا کردیتی ہے جو گمبھیر ہوتے ہوئے بھی جان لیوا ہوتا ہے۔ پھر ملاقات کے لمحے صدیوں میں بدل جاتے ہیں۔ اور اس طرح مجسم محبوب سے خدق محبوب تک پہنچتے پہنچتے محبت کی تاریخ لکھی جانے لگتی ہے۔ "گلدستہ خار" کہانی میں جس جذبے سے سرشار ہو کر کسی نگہت یا سرفراز کی کھوج میں آپ کی آنکھیں بھٹکنے لگی تھیں وہی آنکھیں ان لمحوں کو کھوجنے لگتی ہیں۔ جو حقیقتاً صدیاں ہوتی ہیں۔ اور یہی صدیاں چند لمحوں میں گزر جاتی ہیں۔ اسی ضمن میں "چند لمحے سفید صدیاں" سے ایک بند سنیے سے

تو نے پہلے تو اک اجنبی کی سی جرأت سے
پھر ایک دل دوز اپنائیت سے
مری سمت دیکھا
تو لمحوں کے پر جھڑ گئے۔

تیری زلفوں کی زنجیر سارے بدن پر سجائے ہوئے
رخت گرنا گیا
چند لمحے جو صدیوں کی مانند پھیلے
تو میں نے سنی
باغِ جنت سے حوا و آدم کے رختِ سفر باندھنے کی صدا!
اور پھر وہ پُراسرار آواز
جس سے خلاؤں کو لبریز ہونا ہے ۔
جب یہ زمیں ــــــ چاند سے
چاند ــــ سورج سے
سورج ــــ کسی اور سورج سے جا کر ملے گا ۔
یہاں سے وہاں تک
زمیں سے زماں تک
مجھے تیری آنکھیں نظر آ رہی تھیں
سمندر تموج میں تھے ۔
اور لہریں مرے دل کے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں
(وہ اس وقت بھی دل کے ساحل سے ٹکرا رہی ہیں)

از ل سے جانے پہچانے اس محبوب کو ابد تک یاد رکھنا چاہیے ۔ عبادت ہو ۔ لیکن محبت کا ــــ ہنس ذہنی وابستگی کا ــــ ایک اور رنگ دیکھیے "پہاڑوں کی برف" کی رنگت والی محبت کا ۔ اس کہانی کا ہیرو ایک فن کار ہے کہانی لکھنے بیٹھا ہے ۔ ابھی ایک فقرہ سوجھا ہے کہ ایک آواز آتی ہے "خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے، تیرا بچہ جیوے" اور پھر اس بھکارن کے یک رخی جھلک میں یونانی صنمیات کی دنیا منعکس ہو جاتی ہے اور .... " عورت فطرت کی نہایت خوبصورت تخلیق ہے ۔ مگر حسنِ تخلیق کی داد کا بھی ایک قرینہ ہوتا ہے ۔ نو شگفتہ پھول کو دیکھ کر ہمارے احساسات کو ایک انگڑائی سی آ جاتی ہے ۔ اور ہم آگے بڑھ جاتے ہیں ۔ شفق میں رنگے ہوئے بادلوں کو ہم پیار سے دیکھتے ہیں اور اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں ۔ رات کو چھت پر گرتی ہوئی بوندوں کی موسیقی چند لمحوں کے لیے ہمیں آسمانوں سے اترا ہوا ساز معلوم ہوتی ہے ۔ اور پھر ہم سو جاتے ہیں ۔ میں خوبصورت عورتوں کو بھی اس قرینے سے دیکھتا ہوں ۔ حسن کی طرف ذرا سی زیادہ توجہ دیجیے ۔ تو پھر ...... " پھر کیا ہوگا اس کا افسانہ نگار کی زبان سے سنیے ۔ "یہ کتنی عجیب بات ہے کہ انسانی جذبات کے طوفان ان کے اندر ہی چلتے رہتے ہیں ہر انسان کے اندر سے اس کا طوفان باہر آ جائے تو کیسی قیامت برپا ہو جائے" ــ طوفان باہر آئے یا نہ قیامت برپا ہو یا نہ ، یہاں آ کر جو حالت ہوتی ہے اس کا اندازہ بھکارن کے الفاظ سے لگائیے ...... کوئی کسی کے زخم نہیں دیکھتا تھا ۔ اس لیے کہ زخم دیکھنے دکھانے

کی چیز نہیں ہیں۔ یا شاید اس لیے کہ سب کے اپنے اپنے زخم ہوتے ہیں" اور ان زخموں پر کہانی میں ناخن اس وقت لگے جب روزانہ ایک آنہ کے حساب سے انگھتی کے آسنے ختم ہونے پر۔ ہفتہ بھر بعد کارن آئی اور اس حقیقت کو اس قدر سادہ لوحی سے بیان کر دیا کہ" . . . . ایک آن میں پہاڑوں کی ہونٹ تڑاخ تڑاخ کر کے چٹخی اور اس کے بڑے بڑے چٹانوں کے تودے چیختے چنگھاڑتے ہوئے آئے اور میرے سر پر ٹوٹنے لگے . . . ." ذرا سنبھلے رہیے۔ یہی تودے آپ کے سر پر بھی ٹوٹ سکتے ہیں۔ اور یہ لمحے ــــ کتنے پیارے لیکن کتنے جان لیوا ہوتے ہیں۔

ایک اور زیادہ کامیاب اور ان کے فن کا بھرپور عکاس اور مرقع افسانہ "بندگی بے چارگی" ہے جس میں دیہات سے شہر تک اور پھر شہر میں کلرک سے افسر کی کرسی تک پہنچتے پہنچتے جن جن منزلوں سے ایک درمیانی طبقہ کے مرد اور عورت کو گذرنا پڑتا ہے' پورے جذبے' پوری شدت اور بھرپور حسن کے ساتھ بیان ہونے کے علاوہ ہمارے معاشرے کے ان سے اندر سے ہمیں پوری دیانت داری کے ساتھ روشناس کراتا ہے جو آج ابھر رہے ہیں جن کی چھاپ ہماری زندگی پر پڑ رہی ہے اور جس کے زیر اثر امین کی طرح آپ کو اپنی سمٹی ہوئی بانو کے قدموں پر سر رکھ کر بچوں کی طرح بیک وقت رونا اور ہنسنا پڑتا ہے۔

مجھے ندیم کی ایک حالیہ کہانی بہت پسند آئی ہے۔ میں اس کو ان کا شاہکار کہنا چاہتا ہوں وہ کہانی ہے "پاگل" ـــ آپ اس کہانی کو پڑھیں گے تو چاہے آپ "سبحان اللہ" کہنے والے چودھری صاحب کے خیرت رکھتے ہوں۔ یا اس کو اردو کا ونڈرفل سمجھنے والے رانا صاحب یا اردو میں ڈیڈی کے بجائے "ابو جی" سن کر چونکنے والی لڑکی۔ پاگل نہ بھی ہوں تو پاگل ہوتے ہوتے بچیں گے۔ اس کہانی میں ندیم نے نئی اور پرانی نسل کو نیم تاریک کوریڈور میں بیٹھے نئی نسل کی "بدتمیزیاں" دیکھنی پڑتی ہیں اور جب کوریڈور روشن ہو جاتا ہے تو چونکنے والی نسل نئی ہوتی ہے۔ اس کہانی میں وہ سارا عمل اپنے پورے کرب' پورے درد' پورے لطف اور پورے ولولہ جوش کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس سے بوڑھے سانپ کو نئی پرانی کینچلی اتارنے تک گزرنا پڑتا ہے۔ "ڈیڈی یو رمسٹ کرن میرا مطلب ہے ابو جی سے) وہ عارف کی امّی" جیسی میموں سے لے کر تنگ ہوتی پتلونوں والے لڑکوں اور منڈے ہوئے چہروں والی صفیاؤں تک کے دریا جیسے گمبھیر مسائل کو اس چھوٹی سی کہانی کے کوزے میں الٰہ دین کے دیو کی مانند ندیم نے بند کر دیا ہے جب آپ بوتل سے ایک ایک کر کے ہر کردار کو انفرادی طور پر نکال کر چپ سامنے رکھتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے میں' باتیں کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ تو آپ کو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے جاندار کرداروں سے تعارف حاصل کیا ہے ایسے الوکھے تجربے کو محسوس کیا ہے جس سے آپ' آپ کے ابا' امی' چچا' آپا' ماموں جان اور سب ہی یا تو گزر چکے ہیں یا گزر رہے ہیں یا گزرنے والے ہیں۔ آپ اس افسانے کو مسحور ہو کر پڑھیں گے۔ اور اسے ختم کر کے پتہ چلے گا کہ کبھی جادوگر نے اپنے "ڈنڈے" کو الٹی طرف نہیں گھمایا ہے۔ آپ کو نئی اور پرانی نسل کی قدروں کا شعوری احساس ہوگا اور خواہ آپ کسی بھی نتیجہ پر پہنچیں آپ بے اختیار کہہ اٹھیں گے وونڈرفل سبحان اللہ (اور یہ اردو کا ونڈرفل ہوگا)

موخر الذکر دونوں افسانوں سے میرے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ احمد ندیم قاسمی کا فن وقت کے تیز دھاروں کے ساتھ ساتھ اپنا مقام بناتا چل رہا ہے۔ ندیم کو ہمارے معاشرے کی ترقی و تشکیل کا بھرپور احساس ہے۔ اس ترقی و تشکیل کے پس منظر میں جس تہذیب کے اقدار دوب رہے ہیں۔ اور جو نئے اقدار ابھر رہے ہیں ان کا بھرپور احساس ہے۔ ان ہی نئی اقدار حیات کے تانوں بانوں سے احمد ندیم قاسمی کا فن تشکیل پا رہا ہے۔ ادبی محاکمہ اور جائزہ میں ندیم کے فن کا تاریخی جائزہ ہمارے ادب کی تاریخ لکھنے میں بڑی مدد دے گا۔

غلام محمد قاصر

چوتھا عنصر

(ندیم کی غزل کا ایک جائزہ)

مرزا غالب نے اپنے ایک قصیدے میں انسانی جسم کے عناصرِ اربعہ کا ذکر اس ترتیب سے کیا ہے ؎

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام

اردو غزل کے عناصرِ اربعہ میں آتش کا نام میر تقی میر ہے۔ جن کے کلام کا بنیادی وصف سوز کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ غزل قصیدے کی تشبیب سے ایک علیحدہ شکل میں ابھری تھی۔ لیکن میر نے اپنے سوزِ کلام اور لالہ کاری سے اسے مرثیے کی سرحدوں تک پہنچا دیا ہے۔

آب کی جگہ مرزا غالب نظر آتے ہیں۔ کیونکہ آب کے دوسرے خصائص کے علاوہ ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ موتیوں کو اپنے اندر چھپائے رکھتا ہے۔ کلامِ غالب میں بھی ایسے کتنے ہی گہرہائے معانی پوشیدہ ہیں جنھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ادبی غواصوں کو زمانے گزر گئے ہیں۔

باد کے خواص کا موازنہ اقبال کی غزل سے کیا جا سکتا ہے۔ لکھنؤ میں غزل ایک میکانکی چیز بن کر رہ گئی تھی اقبال کی جدتِ تخلیق کی صرصر نے اس مشتِ خاک کو وسعتِ افلاک تک رسائی کا حوصلہ بخشا ہے۔ پھر اُن کے شاہین کی بلند پروازی کا بھی ہوا سے ایک گہرا ربط ہے۔ انھوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ ع

کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں

یا

خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

غزل میں اقبال کے ملکوتی ترانوں کے بعد بھی اس کا سفر جاری رہا اور اس رہ نوردِ شوق نے آج تک منزل قبول نہیں کی۔ یہی بات غزل کی بقا کی ضمانت بھی ہے۔ غزل کی ہیئت اٹل ہے جس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ لیکن مختلف اساتذہ نے اس کے مواد میں فکری سرمائے کے گراں بہا اضافے کیے ہیں۔ فانی نے شدتِ احساس کے خم سے

سبوئے غزل میں صہبائے آبگینہ گداز بھر دی۔ اصغر نے غزل کے سہارے ناپائیدار کو پائیدار عشق کرنے کا حوصلہ بخشا ہے۔ جگر نے چمن زارِ غزل میں والہانہ سرمستیوں کے پھول اُگائے ہیں۔ یگانہ نے غزل کو مردانہ لب و لہجہ عطا کیا ہے۔ فراق نے مضرابِ غزل کو چھیڑ کر ارضیت کے نغمے الاپے ہیں۔ فیض نے سیاست کے مختلف رنگوں سے تزئینِ در و بامِ غزل کی ہے۔ حفیظ جالندھری نے غزل کے جسم میں گیت کا رسیلا خون داخل کر کے اس کے رگ و پے میں ایک برق سی دوڑا دی ہے۔ لیکن غزل میں ذاک (زمین) اور خاک کے پتلے (انسان) کا ذکر جس تفصیل سے احمد ندیم قاسمی کے یہاں ملتا ہے اس کے پیشِ نظر وہی خاک کے عنصر کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اور ان کے لہجے کی متانت، سنجیدگی، ٹھہراؤ اور وقار سے آرام کی مناسبت پوری ہو جاتی ہے۔

ان چار شاعروں (میر۔ غالب۔ اقبال اور ندیم) میں بعض ایسے اتفاقات بھی نظر آتے ہیں جن سے میرے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ اور انھیں محض اتفاق کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ مثلاً

۱۔ چاروں شاعروں کی غزل زمان و مکان کی قیود سے ماورا ہے اور آفاقی اپیل رکھتی ہے۔ تاہم دو کے یہاں ایک مخصوص پیغام بھی ہے۔ اگرچہ بقول نصیر احمد ناصر پیغام بذاتِ خود ایک اضافی چیز ہے اور اس کے بغیر بھی عظیم شاعری کی جا سکتی ہے اور کی گئی ہے۔

۲۔ غزل عام طور پر شاعروں سے جو چاہے کہلوا لیتی ہے۔ لیکن ان شعرا نے غزل سے اپنی مرضی کے مطابق کہلوایا ہے۔

۳۔ دو شعرا کے مولد و مسکن ہونے کا دعوےٰ منقسم ہندوستان کر سکتا ہے تو باقی دو پاکستان کے حصے میں آتے ہیں۔

۴۔ دو شعرا ہندوستان کے شہر دلی میں رہے اور دو پاکستان کے دل میں رہے۔

۵۔ دو شاعر سید ہونے کی وجہ سے عرب سے ایک خاص تعلق رکھتے ہیں تو باقی دو نے اپنے فارسی کلام پر ناز کر کے اپنے عجمی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

۶۔ دو شعرا اہلِ زبان ہیں تو باقی دو انگریزی زبان و ادب پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔

۷۔ دو شعرا نے اپنی زیادہ تر توجہ غزل پر ہی صرف کی اور غزل ہی ان کی شہرت کا سبب بنی۔ جب کہ باقی دو بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ غزل ان کے یہاں منزل مقصود نہیں بلکہ منزل تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے۔

۸۔ چاروں شاعروں نے غزل کے چار بنیادی عناصر کو آخری شکل دی ہے۔ میر کے یہاں غزل کی دروں بینی اپنے شباب پر ہے۔ غالب نے اس کی رمزیت کو انتہائی شکل دی ہے۔ اقبال کی رفعتِ تخیل سے غزل نے اپنی انتہائی بلندیوں کو اس طرح چھو لیا ہے کہ آل احمد سرور کے الفاظ میں اس سے آگے کی فضا میں پرواز کرنے سے غزل کے پَر جلتے ہیں۔ اور ندیم نے غزل کو وہ گہرائی بخشی ہے۔ جس سے آگے دیکھنا ناممکنات کی حد تک مشکل ہے۔

۹۔ میر کی وفات کے وقت غالب اور اقبال کی وفات کے وقت ندیم اپنی عمر کے ابتدائی مرحلوں میں تھے، اور غالب کی وفات اور اقبال کی پیدایش کے درمیان کوئی پانچ چھ سال کا عرصہ حائل ہے۔ اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ سلطنتِ غزل دست بدست آئی ہے۔

ان چار شاعروں کے تقابل و اشتراک کا سلسلہ ان کی وضع قطع سے لے کر مذہبی عقیدوں تک پھیلا ہوا ہے۔ بات بہت دور نکل گئی، کہنا صرف یہی تھا کہ میر غالب اقبال اور ندیم کے بہم ہونے سے غزل کا مزاج متعین ہو جاتا ہے۔

یوں تو ہر شاعر نے انسان سے محبت کی ہے اور اسے اپنا موضوع بنایا ہے۔ لیکن انسان سے ندیم کی محبت جداگانہ نوعیت کی حامل ہے۔ ایک جگہ وہ اپنا نظریۂ فن بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"میں انسان کو اور اس کی زندگی کو فن کا بنیادی موضوع قرار دیتا ہوں۔ اگر انسان موجود ہے اور اس کرۂ پر زندگی موجود ہے تو پھر سب کچھ موجود ہے۔ انسان اور خدا۔ ذات اور کائنات۔ حقیقت اور مابعد الطبیعات کے رشتوں پر بھی انسان اور زندگی کی موجودگی ہی میں غور کیا جا سکتا ہے۔ سو میری نظر میں انسان اہم ہے۔ زندگی اہم ہے اور فن اسی صورت میں اہم ہے جب وہ انسان کو حسن و توازن حاصل کرنے میں مدد دے۔"

غزل میں انسان کی اہمیت کا اعتراف یوں کرتے ہیں ؎

آدمی شش جہات کا دولھا
وقت کی گردشیں براتی ہیں

انسان اس لیے بھی اہم ہے کہ جب کبھی خیر و شر میں آویزش ہونے لگتی ہے تو یہ اپنے آپ کو پیش کر دیتا ہے اور اس طرح نظام کائنات درہم برہم ہونے سے بچ جاتا ہے ؎

یزداں پہ جھپٹ پڑے گا ابلیس
انسان ہٹا جو درمیاں سے

انسان کی اسی اہمیت کے پیش نظر ندیم نے اپنی غزل کے دامن تر پر آدم کی سلگتی ہوئی تاریخ لکھی ہے ؎

آدم کی سلگتی ہوئی تاریخ رقم ہے
جبریل کے شہپر سے مرے دامن تر تک

اور اس طرح انھوں نے "ہبوطِ آدم سے موجودہ دور تک انسانی سفرنامہ" مرتب کیا ہے۔ انھیں حدِ نظر تک انسان کی مملکتیں نظر آتی ہیں۔ اور انھوں نے اپنے ہر شعر میں تصویر جراحت کھینچی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انسان کو سمجھے بغیر ہم اپنی سمجھ میں بھی نہیں آ سکتے ؎

جب تک نہ سمجھ میں آئے انساں
ہم اپنی سمجھ میں خاک آئیں

اس لیے جب ہم ان کی غزل کو دیکھتے ہیں تو خاک کے پتلے کے عروج و زوال کے کئی فلسفے سوجھتے ہیں ؎

جس راز سے انساں کو کئی فلسفے سوجھے
دیکھا تو وہی پھول کی پتی پہ رقم تھا

یہ پھول کی پتی (ندیم کی غزل) ہمیں بتاتی ہے کہ آدم کی افتاد کا سلسلہ ہنوز جاری ہے ؎

شاید آج بھی جاری ہے آدم کا سلسلۂ افتاد
تھی نہ وہاں جنت بھی گوارا اور قبول ہے دھول یہاں

اور اس کی وجہ انسان کے خمیر کا تضاد ہے ؂

اُٹھا عجب تضاد سے انسان کا خمیر
عادی فنا کا تھا تو پجاری بقا کا تھا

یہ تضاد یہاں اور بھی واضح ہو جاتا ہے ؂

یہ آدمی بھی عجیب شے ہے اُدھر ستاروں کو چھو رہا ہے　　ادھر ابھی تک فصیلِ شاہی کے سائے میں جھونپڑے بنائے

سیم و زر آدمی کے چاکر تھے
آدمی سیم و زر کے کام آیا

آج کے دور میں انصاف کے معنی یہ ہیں
روح مر جائے مگر جسم بچایا جائے

میں جدید انسان باوصفِ غرور و تمکنت
پتھروں کے دیوتاؤں کی نگاہِ مردہ ہوں

رات جل اُٹھتی ہے جب شدتِ ظلمت سے ندیم
لوگ اس وقفۂ ماتم کو سحر کہتے ہیں

مقبرے بنتے ہیں زندوں کے مکانوں سے بلند
کس قدر اوج پہ تکریم ہے انسانوں کی

صنعتیں پھیلتی جاتی ہیں مگر اس کے ساتھ
سرحدیں ٹوٹتی جاتی ہیں گلستانوں کی

نئی زباں میں مہذب اسی کو کہتے ہیں
بلند جس کا ہو معیارِ مردم آزاری

ندیم کے خیال میں حسن تخلیق کی جڑیں دھرتی میں اس لیے نہیں پھیلتیں کہ ؏

تم نے انسان کو گملے میں سجا رکھا ہے

اس لیے وہ دنیا بھر کے دانش مندوں کو دعوتِ فکر و عمل دیتے ہیں کہ ؂

بزمِ انساں میں بھی اک رات بسر کر دیکھو
ایک بار اپنی زمیں پر بھی اُتر کر دیکھو

اگر جنوں ہے تو آداب اس کے شب سے سیکھ
اِدھر ہو چاک گریباں اُدھر سحر نکلے

لیکن انھیں یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ ؂

حل کرتا ہے افلاس کے عقدے وہ سخنور
جو ہاتھ میں تھامے ہوئے سونے کا قلم ہے

اپنے بارے میں انھوں نے کہا ہے:-

"فن کار کا محبوب انسان ہے اور جب تک انسان مضطرب اور بے قرار ہے فن کار کی آسودہ خاطری بدیانتی ہے۔ فن کار ارتقا کا پرستار ہے اور ارتقا کا عمل مسلسل جاری ہے۔ یہ خوب سے خوب تر اور خوب تر سے خوب ترین، بلکہ اس سے بھی آگے نکل جانے کا عمل ہے۔ اس لیے سچے فن کار کے دل میں تخلیق کی لگن بجھ نہیں سکتی۔ فن تخلیق کرنا تو اپنے اندر قیامت تک کے لیے ایک الاؤ لگا لینے کا نام ہے اور جب تک دنیا میں ظلم ہے بے انصافی ہے۔ بھونڈا پن ہے۔ انسان کے بے ساختہ پن کی پامالی ہے۔ اس وقت تک سچے فن کار کا تخلیقی اضطراب ختم نہیں ہو سکتا۔ سو میں ذاتی طور پر

اپنے قاری سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں اور میرے قویٰ سلامت ہیں۔ میں اس سے بحیثیت فن کار رخصت ہونے کی اجازت طلب نہیں کروں گا۔"

غزل میں انہی خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

تخلیقِ فن کروں گا بعنوانِ ارتقا
جس ہاتھ میں قلم ہے اسی ہاتھ کی قسم

اور جب ہم انھیں انسانیت کے درد پر مضطرب پاتے ہیں اور ان کے دعوؤں کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

کبھی جو سینۂ انسانیت سے ہوک اٹھی
مری نگاہ بھی رہ سکی نہ بر سرِ بام

یہی انسان دوستی کی لے بڑھ کر ان کے لیے زندگی کا جواز بن جاتی ہے ؎

اس توقع پہ کہ شاید کبھی انساں سنبھلے　　ہر نئے ظلم نے جینے پہ مجھے اکسایا
وہ مر تو جائے کہ مرنا ہے روح کی معراج　　مگر ندیم سے کچھ آس ہے زمانے کو

انسان دوستی ندیم کا مسلک ہے اور اس میں اپنے پرائے کی کوئی قید نہیں ہے ؎

قدم قدم پہ اگر رک رہے ہیں دشت میں ہم
تو کیا کریں کہ تعارف ہے خار خار کے ساتھ

اپنے اس مسلک میں وہ انتہا پسند واقع ہوئے ہیں ؎

چلو دشتِ طلب میں ایک انساں تو نظر آیا
جو وہ مانے تو اپنی جان رکھ دو دستِ رہزن پر

کتنی معصومیت سے پوچھتے ہیں کہ ؎

خدا کے سامنے کس منہ سے جائیں گے خدا جانے؟
محبت کا کوئی دھبا نہیں ہے جن کے دامن پر

ندیم حسنِ انسان میں اتنے محو ہیں کہ انھیں فردوس کی طرف دیکھنے کی فرصت بھی نہیں ؎

اک حقیقت سہی فردوس میں حوروں کا خیال
حسنِ انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں

انھوں نے اپنے مسلکِ انسان دوستی میں محبت کو عقیدوں پر ترجیح دی ہے ؎

میں محبت کا پجاری ہوں عقیدوں کا نہیں
ان بتوں کو مرے رستے سے ہٹایا جائے

ندیم نے جلال و جمال میں اپنا فنی نظریہ بیان کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"اسلامی لٹریچر بہت وسیع ہے اور مجھے اس کے گہرے مطالعے کے وافر مواقع نہیں ملے۔

اس لیے میں اس صنف میں کسی نوع کی انفرادیت پیدا نہیں کرسکا۔مگر آیندہ چل کر اس رنگ میں بھرپور انداز میں لکھنا میری نہایت عزیز تمناؤں میں ہے اور کیا عجب ہے کہ میں اسلام کو ایک آفاقی نظامِ حیات کی صورت میں آیندہ اپنی نظموں میں پیش کرسکوں"۔

یہاں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ ایمان میں امن اور اسلام میں سلامتی کا مفہوم شامل ہے اور ندیم کی غزل امن اور سلامتی کا پیغام دے کر اپنے خالق کی نہایت عزیز تمنا کو پورا کر چکی ہے۔اسلام کا پیغام انسان کے لیے ہے جس میں جغرافیائی حدبندیوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ندیم کی غزل میں بھی اسی حقیقت کا عکس نظر آتا ہے ؎

انساں کا مجسمہ بھرا دل تھا مرا مسکن
جو میرا وطن تھا وہ عرب تھا نہ عجم تھا

انسان کے لیے زمین پر تخلیقِ خلد ندیم کا نصب العین ہے اور کیوں نہ ہو ؎

جسے فرشتوں نے خلد سے ربِ خلد کے حکم سے نکالا
وہ خلدزادہ زمیں پہ تخلیقِ خلد سے کیسے باز آئے

چونکہ زمین کا رشتہ انسان سے اٹوٹ ہے اس لیے ندیم زمین کو بھی بے حد اہمیت دیتے ہیں ؎

ابھی انسان کو مانوسِ زمیں ہونا ہے　　مہرو مہتاب کے ایواں نہیں درکار ابھی
جو پیار نہ کرسکے زمیں سے　　پائیں گے نہ بھیک آسماں سے
فضا کا ذکر کریں بحر و بر کا ذکر کریں　　بہت بلند ہے فردوس گھر کا ذکر کریں
مجھے بہشت سے انکار کی مجال نہیں　　مگر زمیں پہ محسوس یہ کمی تو کروں
وہ بہشتوں کے محل ہوں کہ فرشتوں کی اڑان　　سایہ ہر چیز کا بر روئے زمیں ہوتا ہے

یہاں تک کہ وہ دعا مانگنے سے بھی محض اس لیے اجتناب کرتے ہیں کہ زمین کی بات آسمان سے کیسے کہی جائے ؎

آخر دعا کریں بھی تو کس مدعا کے ساتھ
کیسے زمیں کی بات کہیں آسماں سے ہم

ندیم تخلیقِ خلد کے مختلف مراحل سے جب گزرتے ہیں تو فطرت کا وہ سربستہ راز ان پر منکشف ہونے لگتا ہے جسے عرفِ عام میں غم کہتے ہیں۔غم کا نام آتے ہی فانی بدایونی کی تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے جو میر کے بعد مملکتِ غم کے تنہا تاج دار ہیں۔لیکن فانی نے غم کو ایک مجبوری سمجھ کر قبول کیا ہے ؎

غم بھی گزشتنی ہے خوشی بھی گزشتنی
کر غم کو اختیار کہ جائے تو غم نہ ہو

اس لیے ان کے یہاں ہر نفس عمرِ گذشتہ کی میت ہے۔اور غم ایک بھیانک عفریت بن کر نہایت گھناؤنی شکل میں سامنے آتا ہے جس سے صرف موت ہی نجات دلاسکتی ہے اس لیے فانی کے یہاں خواہشِ مرگ کا تکرار پایا جاتا ہے موت فانی کو بہت حسین نظر آتی ہے ؎

ادا سے آڑ میں خنجر کی منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے

لیکن ندیم کا نظریۂ غم مختلف ہے۔ ان کے نزدیک "غم انسان کی ایک تخلیقی قدر ہے۔ کیونکہ اسی غم ہی سے تو ان حالات کو ختم کرنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے جنھوں نے یہ غم بخشا ہے" اس لیے وہ کسی مقام پر بھی غم کی قاہری کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے۔ ان کا خیال ہے ؎

صرف دیکھو تو تجلّی بھی ہے ظلمت کا نقاب
اور پرکھو تو اندھیرا بھی حسیں ہوتا ہے

ندیم نے غم کو پرکھ کر ایک ایسے روپ میں پیش کیا ہے جس کی نظیر اردو شاعری کی تاریخ میں نہیں ملتی، ان کے یہاں غم اور درد میں وہ چمک دمک ہے کہ تخلیقِ مسرت مشتبہ نظر آنے لگتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ؎

غم ادھورا تھا کہ پیغامِ اجل آیا ندیم　　　دھندلا ابھی بھڑکی نہ تھی پتھر ابھی بولا نہ تھا
یوں بظاہر تو دیا میں نے بجھا رکھا ہے　　　درد نے دل میں الاؤ سا لگا رکھا ہے
سب حجاباتِ نظر دل کے نہ دکھنے تک تھے　　　درد چمکا تو اندھیرا بھی نہ رہنے پایا
ظلمت گرِ حالات کے ویران اُفق پر　　　جو درد چمکتا ہی رہا وہ مرا غم تھا
چمکا ہے جو مرے دل میں شب بھر　　　اس درد کی چاندنی میں آنا
جو پاسِ ضبط سے مڑ مڑ کے ٹپکا　　　وہ آنسو چاند سے بڑھ کر حسیں ہے
تیرے ہی غموں نے مجھ کو بخشی　　　کوندے کی لپک غزال کا رم
ظلمتِ شب میں بھی شرماتے ہو　　　درد چمکے گا تو پھر کیا ہوگا
دکھ راکھ ہو چکا تو چمک اور بڑھ گئی　　　یہ تیری یاد تھی کہ عمل کیمیا کا تھ
ہر طرف چھا رہی ہے تاریکی　　　آؤ مل جل کے ذکرِ یار کریں

لیکن غم کی اتنی کشش کے باوجود وہ وابستۂ غم نہیں ہونا چاہتے، بلکہ اس سے صرف یادیں نکھارنے کا کام لیتے ہیں ؎

ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمھاری یادیں
ہم کوئی تم تھے کہ وابستۂ غم ہو جاتے

ظاہر ہے جب غم اتنا حسین نظر آئے تو انسان زندہ رہنا چاہتا ہے ؎

ٹھہرا ہوں اس خطا پہ سزاوار دار کا　　　سب نعمتوں سے میں نے حیات انتخاب کی
سقراط نے زہر پی لیا تھا　　　ہم نے جینے کے دکھ سہے ہیں
ہم زندہ ہیں اے فراق کی رات　　　پیاری ترے بال کیوں کھلے ہیں

اس طرح ان کا تصورِ موت بھی سمجھ میں آجاتا ہے ؎

وہ ایک بار مرے جن کو تھا حیات سے پیار　　　جو زندگی سے گریزاں تھے روز مرتے تھے

موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو　　پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے

اجل کے خوف سے آزاد ہے حیات مری　　مگر یہ شوق تماشائے جاں کُنی تو کروں

ندیم کی غزل میں ایک مربوط نظامِ فکر ملتا ہے۔ انھوں نے پتھر سے پھول اُگانے والے خدا سے انسان کے لیے صرف ایک تبسم کا اذن مانگا ہے۔ اور کہکشاں سے کعبۂ مقصود کے عوض کسی انسان کے نقشِ قدم طلب کیے ہیں۔ کیونکہ ان کی جوانی کوکب و قمر سے نہیں بہل سکتی۔ وہ کہتے ہیں جب تک زمانے میں کبوتر کا لہو ارزاں ہے کسی شہباز کے ساتھ ربط رکھنا ظلم ہے۔ وہ سحر کا گجر بجا لینے کے بعد اپنے لیے ہر سزا قبول کر سکتے ہیں ؎

گجر سحر کا بجا لوں تو ہر سزا منظور

مرا گناہ سہی نصف شب کی بیداری

نامساعد حالات سے شکست مان لینا ان کے مسلک میں کفر ہے ؎

مسافروں سے کہو رات سے شکست نہ کھائیں

میں لا رہا ہوں خود اپنے ہو سے بھر کے چراغ

غرض انھوں نے ہمیشہ یہی سوچا ہے کہ کسی طرح ؏

فاصلے دشت و چمن زار کے کم ہو جاتے

اور اس کے اظہار کے لیے انھوں نے کسی مابعدالطبیعاتی طرزِ بیان کا سہارا نہیں لیا بلکہ ؎

بات دل سے نکل کے دل میں بسے

زندگی بھی یہی ہے فن بھی یہی

وہ ایک ایسے فرہادِ فن ہیں جو اپنے تیشۂ فکر کی ہر ضرب سے ایک جوئے شیر لانے میں کامیاب ہوئے ہیں اور کہیں بھی ان کا اندازِ بیان غیرشعرانہ نہیں ہونے پایا۔ اور نہ ہی موہومات کی فضا میں لفظی پتنگ بازی کی ہے۔

آخر میں چند ایسے اشعار سنیے جو تغزل کے تمام تقاضوں پر پورے اترتے ہیں۔ نفسیاتِ محبت کے ان حسین مرقعوں پر اردو غزل ہمیشہ ناز کرتی رہے گی ؎

طے کر بھی سکوں گا کہ نہیں کون بتائے　　پھیلا ہوا تجھ تک ہے مرا دشتِ جدائی

شکستہ پائی کے مرحلے دشتِ ہجر میں اس لیے نہ آئے　　کہ یہ سفر میں نے طے کیا ہے دراز پلکوں کے سائے سائے

جہاں پناہ! مجھے بازوؤں میں لے لیجے　　مری تلاش میں ہیں گردشیں زمانے کی

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالم نو دیکھا ہے　　مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

دور سے دیکھا تو پلکوں تک کے سائے گن لیے　　جیسے جیسے تم قریب آئے دھواں بنتے گئے

اس کا ستم بھی عدل سے خالی نہیں ندیمؔ　　دل لے کے شاعری کا سلیقہ دیا مجھے

میرا ذوقِ دید تیرا روئے زیبا جل گیا　　کیوں بتاؤں دشتِ تنہائی میں کیا کیا جل گیا

آج تنہائی کی یوں آخری تکمیل ہوئی　　مر گئے سائے بھی آ کر تری دیوار کے پاس

مر جاتا ہوں جب یہ سوچتا ہوں — میں تیرے بغیر جی رہا ہوں
دل کھول کے ہنسنے سے بھی آنسو نکل آئے — کس درجہ مکمل ترا آئینِ ستم تھا
جب میں نے پرستش کی حدوں تک تجھے چاہا — پھر جو بھی حسیں تھا مرے معیار سے کم تھا
کس قدر قحطِ شفا ہے مری دنیا میں ندیم — جو ذرا ہنس کے ملے اُس کو مسیحا سمجھوں
تمھارے بعد چمن پر جو اک نظر ڈالی — کلی کلی میں خزاں کے چراغ جلتے تھے
جس بھی فن کار کی تخلیق ہو تم — اُس نے صدیوں تمھیں سوچا ہوگا
زینتِ حلقۂ آغوش بنو — دور بیٹھو گے تو چرچا ہوگا
صرف اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں — میں ترا حسن ترے حسنِ بیاں تک دیکھوں
انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا — دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا
اس حسنِ اتفاق پہ لٹ کر بھی شاد ہوں — تیری رضا جو تھی وہ تقاضا وفا کا تھا
اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھلیں — تو سامنے تھا اور تصور خدا کا تھا
ذکر اک روز پلٹنے کا کیا تھا تو نے — اک دیا دل کے اندھیرے میں جلا رکھا ہے
پلٹنا چاہو تو جاؤ ابھی اُجالا ہے — مرا حریمِ طلب تو بلند و بالا ہے
ذرے ذرے میں ترا عکس نظر آتا ہے — راستہ دیکھتے رہنا بھی اب آساں نہ رہا
رچی ہوئی ہے رفاقت مری رگ و پے میں — کچھ اس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں
نارسائی کی قسم اتنا سمجھ میں آیا — حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا
زندگی میں عمر بھر یوں تو بھنور پڑتے رہے — ڈوب کر دیکھا تو پانی اس قدر گہرا نہ تھا

ندیم بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور بعض ناقدوں نے انھیں شاعر سے بڑا افسانہ نگار تسلیم کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ندیم نے اپنی تمام تر توجہ غزل پر صرف نہیں کی۔ مگر اس پر بھی ان کی غزل عظیم ادب کے تمام کوائف پورے کرتی ہے۔ یہاں روایت اور درایت کے رنگوں کا حسین اور متوازن امتزاج ملتا ہے۔ اور فکر جذبے سے گزر کر فن کارانہ اظہار تک پہنچتا ہے۔

ندیم کی غزل سازِ ارتقا کی وہ گونج ہے جو زماں زماں سنائی دے گی۔ اس لیے پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر احمد ندیم قاسمی اور کچھ بھی نہ کہتے تو صرف ان کی غزل ہی ان کا دوام جریدۂ عالم پر ثبت کرنے کے لیے کافی تھی۔

لطف تو جب تھا طوفاں میں بجلی سی کی کوندتی رہتی
جس نے تیری راہ نہ دیکھی اب وہ دیا جلانا کیسا

—— ندیم

غلام قادر آزاد

ندیم — ایک آفاقی شاعر

ادب و فن میں آفاقیت کے رشتے اُس گہری معنویت سے بندھے ہیں جو زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ کے کرشمہ و اعجاز سے پوری انسانیت کا رنگ دکھاتی اور زندگی کی دائمی اقدار کا حسن اجالتی ہے۔ اسی لیے بڑا ادب انسانی زندگی کو ہمیشہ ایک اکائی اور ایک کل کے روپ میں دیکھتا ہے۔ رنگ، نسل، قوم، ملک اور مذہب کے حوالے ادب میں بھی بار بار آتے ہیں مگر یوں کہ ہر تخصیص کے پردے میں تسلیم کا وہ انداز صاف دکھائی دیتا ہے جس سے یہ سب امتیازات تحلیل ہو کر ایک ہی سر آغاز کی انشراحت و صراحت کا افسانہ کہتے ہیں۔ خون کے رنگ کی طرح پوری انسانیت کی اصل تو ایک ہی ہے۔ مگر فکری، نظری اور رسمی تفریق، تقسیم، تعصب اور پندار کے باعث انسانی زندگی ایک المیہ ہے۔ ادب کے دردمند اور حساس مزاج نے اس المیہ کی شدت کا اظہار جب تخیلی ادراک و احساس کے ساتھ کیا ہے تو اس میں عظمت اور جمال نے جلوہ نمائی کی ہے۔ ادب و فن کا خمیر شعور و دانش سے اٹھتا ہے۔ اس لیے وہ محض تصویر جہات نہیں۔ ادب نے جو کچھ ہے اُس کی بازآفرینی ہی نہیں کی، بلکہ جو نہیں اُس کا خواب بھی دیکھا اور جو ہونا چاہیے اُس کی تمنا اور تڑپ کا اظہار بھی کیا۔

”جس طرح ایک آدمی اپنے سینے میں دو دلوں کی دھڑکن پر زیادہ عرصہ جی نہیں سکتا، اسی طرح انسانیت کی بقا کسی یک میزان اقدار کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی۔“[1] یہ بات آج کی اس دنیا میں ہے جب ہم عالمی شہریت کا خواب دیکھ رہے ہیں [2] اور یہ خواب ندیم کے نزدیک، کسی دیوانے کا خواب نہیں جسے کچھ اور بھی، کچھ اور بھی ضروری نظر آتی ہے۔ یوں بھی ادب کی دنیا میں کائنات کی وسعتوں کا تصور روایتی نہیں رہا۔

ندیم ہمارا ایک معتبر ادیب، صحافی، افسانہ نگار اور شاعر ہے۔ اُن کی ان حیثیتوں میں امتیاز و تفوق کا یہ موقع نہیں مگر آئندہ ادبی مباحث میں یہ نکتہ دلچسپی کا موجب ہو گا کہ وہ بڑا ادیب ہے یا صحافی، عظیم افسانہ نگار ہے یا شاعر۔ میری

---

[1] نوبل لیکچر۔ از ——— ALEXANDER SOLZHENITSYN

[2] تعارف روحِ عصر۔ سید علی عباس جلالپوری۔

رائے میں اُن کی ایک حیثیت نے دوسری میں ضم ہو کر اُس کے شعر کو وہ معنویت عطا کی ہے کہ وہ ایک آفاقی شاعر کی حیثیت سے ایک بلند اور ممتاز مقام پر فائز ہیں۔ افسانہ نگار کی بے رحم حقیقت پسندی، ادیب کی ترقی پسندی، صحافی کی باخبری اور عہد شناسی اور شاعر کی دردمندی اور شدتِ احساس آپس میں یوں گندھے ہوئے ہیں کہ اُن کی شاعری حدیثِ ذات سے بڑھ کر روداد کائنات بن گئی ہے

اگر انسان دوستی، دردمندی اور ہمہ گیر محبت آفاقیت کا اشاریہ ہیں تو اُردو شاعری کی پوری تاریخ اس آفاقیت کی روایت کا مسلسل پتہ دیتی ہے۔ خصوصاً غزل نے اپنی فطری دروں بینی، اشاریت پسندی، تعمیم، تصوف اور حسن و عشق کی ابدی اقدار کی بدولت اس روایت کا پرچم ہر دور پر آشوب میں بلند رکھا ہے۔ جدید اُردو شاعری میں اس روایت کا اظہار غزل اور نظم دونوں میں ہوا ہے۔ مگر اقبال کے بعد اقبال سے بڑھ کر ندیم نے جس منفرد انداز میں اسے اپنایا اور [illegible] آگے بڑھایا ہے وہ اُن کی شاعری کا سب سے روشن پہلو ہے۔ اُن کی انسان دوستی اُن کی شاعری کا محرک [illegible] بن کر ایسے ایسے نقشِ جمیل تراشتا ہے کہ یہ یقین ہوتا ہے کہ اگر اُن کا فکری مزاج اُسے شعر و ادب کی بجائے فلسفے میں اظہارِ ذات پر اُکساتا تو وہ جدید اُردو کا سب سے بڑا [illegible] ہوتا، اور اگر تصوف اُس کا مسلک بنتا تو وہ اسے ماورائیت کی فضا سے نکال کر انسان کی [illegible] سے باندھ دیتا۔ اُس کی نگاہ میں ایک ہی صداقت کا حسن چمکتا ہے اور یہ صداقت ہے "انسان" یہ صداقت عالمگیر ہے۔ انسانوں کے درمیان اجنبیت کا ہر نشان اُس کے نزدیک کفر ہے۔ وہ ہر اس قلعہ کو مسمار کر دینا چاہتا ہے جس میں انسانی روح اور ضمیر مقید ہیں اور انسان کو رنگ، نسل، مذہب اور ملک کے حوالوں سے دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اُن کی شعری فضا میں انسانیت کی روح و حرمت کا احساس بہت واضح ہے۔ اس بارے میں اُن کے ایمان و یقین کے یہ انداز ملاحظہ ہوں ؎

یہی یقین کہ انسان کی جبلت میں — [illegible] شکستہ دلی آشتی سے تہی نہیں
وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر — کسی بھی شہر میں جاؤں غریبِ شہر نہیں

شعر کی دل آرائی، سخن کی لطافتوں کی پُراسراریت کے باوجود اپنے خالق کی شخصیت کا افسانہ طراز بھی ہے اور شخصیت اپنے آباؤ اجداد سے میراثِ معنوی کے طور پر خواہ نسلوں کی قوتِ تخیل اور دروں بینی اپنے خون میں لے کر پیدا ہوئی ہو زمانے کے تصادم سے بچ نہیں سکتی۔ [illegible] ہر ادیب فن اسی تصادم کی منفی یا مثبت [illegible] مگر متنوع [illegible] ہیں۔ ندیم کی شخصیت کو دو زبردست محاذوں پر برسرِ پیکار رہنا پڑا ہے۔ گرد و پیش [illegible] ندیم نے کبھی بھی گوارا نہیں کی۔ اس لیے اپنی [illegible] اور [illegible] نہیں دیا۔ چنانچہ [illegible] جمالیاتی طور پر مسلسل ہیرے کی طرح کٹتا [illegible] دوسری طرف وہ [illegible] زندگی کی [illegible] محض نظریے سے [illegible] اخلاقی تجربے کی بدولت [illegible] [illegible] [illegible]

دشوار گذار منزلوں کا سفر ہے۔

ہمارا عہد — جو ہمارے شاعر کا عہد بھی ہے — اپنی حشر سامانیوں کی بدولت پوری انسانی تاریخ کا منفرد عہد ہے۔ یہ متضاد عناصر کی باہمی آویزش و پیکار کا وہ دورِ اضطراب ہے جسے [illegible] سکون و قرار کے متلاشی انسان کو اس صدی میں جنم نہیں لینا چاہیے تھا۔ مادی اور سائنسی [illegible] کی بدولت وقت، [illegible] کے دائمی تصورات ختم ہوئے۔ کائنات چھک کر ذرا سی نظر آنے لگی۔ تہذیب و تمدن کا نظام بدلا۔ انسان [illegible] سرد جنگ اور گرم جنگ کے شعلوں نے انسان کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ سامراجیت کا سورج جو اس صدی کے نصف النہار پر تھا اس دور میں ڈوبا — لیکن حریت، آزادی اور خود ارادیت کے تازہ باب بھی رقم ہوئے۔ [illegible] انقلابات کی شکل دیکھے بغیر رونما ہونے والے سیاسی انقلابات نے نہ جانے کن کن فتنوں کو آگ دکھائی۔ [illegible] ترقیوں کے باوجود انسان اندرونی طور پر جس عالمِ جانکنی سے گذرا وہ بھی دیدنی ہے۔ انسان نے فطرت کے متوازی [illegible] جب غور کیا تو وہ حیران و ششدر ہو کر رہ گیا اس عالم میں اُس پر یہ کھلا کہ وہ اپنا تشخص یا (IDENTITY) کھو بیٹھا ہے۔ اب جو اُس نے اپنی بازیافت کا عزم کیا تو اُس کی روح وجودیت یا فردیت، لاشعور نفسیات [illegible] حیات کی آگ میں چیخ کر رہ گئی۔[1] عالمی سطح پر چلنے والی ان آندھیوں نے نہ جانے کیسے کیسے [illegible] کو [illegible] ناامیدی اور یاس کی پُر الم وادیوں میں بھٹک جانے پر مجبور کر دیا۔ ان فکری اور نظری طوفانوں کی زد پہ ہمارا شاعر بھی تھا جو عالمی سطح پر اُسے درپیش تھیں مگر ملکی اور قومی سطح پر بھی وہ ایک طوفان سے دوچار تھا۔ یہ طوفان تھا اُس کی بے وقعتی اور ناقدری کا، ایک ایسے سماجی مزاج کا جو ہر لحظہ سنگ زنی پر آمادہ ہے۔ بقول پروفیسر حمید احمد خاں صاحب "آزادی کے بعد ہم نے ادیب کو نہ کسی مقامِ شرف پر فائز کیا اور نہ کچھ معاشرتی ذمہ داریاں اُسے سونپیں۔ لیکن اس کی عزتِ نفس نے اُسے بار بار داخلی، تجریدی اور منفی (بلکہ کبھی کبھی تخریبی) طریقِ اظہار پر مجبور کیا ہے"[2] عالمی سطح پر انسانی [illegible] کے شدید دورِ ابتلا سے گذرنے اور خود ایسے سماجی احوال سے دوچار ہونے کے باوجود جو حساس ذہنوں کو [illegible] کے لیے بہت تھے اور جن میں بے شمار فن کار دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتے دکھائی دیتے ہیں — ندیم نے اپنی شخصیت کی "سالمیت" کو برقرار رکھا۔ اُس نے اپنے فکر اور فن کو ایسے عدم توازن کا شکار نہیں ہونے دیا جس سے وہ ہم سے دور ہو جائے اور ہمارے اور اُس کے درمیان اجنبیت کی کوئی دیوار کھڑی محسوس ہو۔ ندیم اپنی شخصیت کو اس شکست و ریخت سے اگر بچا سکا ہے تو اُس گہرے فکری مزاج کی بدولت جو ظاہری تضادات و تناقضات سے اٹھ کر زندگی کی صداقتوں کا سراغ لگاتا ہے۔ اُس کے فن کے سوتے گہرے شعور و ادراک سے پھوٹتے ہیں۔ اور بالآخر اُس کی نظریں اس نکتے پر جا کر رکتی ہیں جس کے گرد تاریخ، تہذیب، تمدن اور ثقافت کے لامتناہی دائرے بنتے چلے گئے ہیں ؎

بڑھا تو راہیں تراشیں رکا تو قصر بنائے
اڑا تو گیت بکھیرے جھکا تو پھول کھلائے

---

[1] صدی رواں اور زوالِ مغرب — روحِ عصر — سید علی عباس جلالپوری۔

[2] اردو ادب ۱۹۴۷ء — ۱۹۷۰ء، افکار جوبلی نمبر

ندیم انسانی محسوسات و واردات کی عمومیت اور اشتراک کے حوالے سے آفاقیت کا وصف اپنے شعر میں نمایاں کرنے کی بجائے ذات کے ہمہ گیر مظاہر اور لامحدود امکانات کے اظہار سے نمایاں کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک انسان کائنات کا سب سے بڑا رزمیہ ہے جس نے زمان و مکاں کے نہ جانے کن کن دکھوں کو سہا اور سہہ رہا ہے ؎

توہینِ حیات ہے مگر وہ
تزئینِ حیات کر رہا ہے
اُس پر ہے غلط فنا کا الزام
سامانِ ثبات کر رہا ہے!

ندیم جب اس "فانی دیوتا" کی حمد کے گیت الاپتا ہے تو اُس کی نظروں کا پھیلاؤ دیدنی ہے۔ وہ خالص زماں، خالص تہذیب اور خالص تمدن کی پہنائیوں میں کھو کر، ڈوب کر، رچے ہوئے اظہار و ابلاغ کے ساتھ اُبھرتا ہے وہ آج کا شاعر ہے۔ اس لیے جدید دور میں ہونے والے بے شمار واقعات اُس کے تخیل و ادراک کو تحریک دیتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ عصریت کی روح سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر کے اپنے شعر میں انسانی عظمت کا راگ چھیڑتا ہے۔ وہ انسان پہ ایسا پختہ یقین رکھتا ہے کہ ناامیدی و یاس کے کسی سائے کو قریب آنے نہیں دیتا۔ اُس کے نزدیک

ٹوٹی ہوئی شاخ ہو کہ دل ہو
ہر زخم بہار کا نشاں ہے

ندیم کی انسان دوستی اظہارِ محبت اور عشق تک محدود نہیں۔ وہ اس سے آگے بڑھ کر ایک ایسے انقلاب کی طرح ڈالنا چاہتا ہے جو نئے نظامِ اقدار، ایک نئی اخلاقیات کی بنیاد بن سکے۔ اور اس اچھوتے انقلاب کا تصور ملاحظہ ہو ؎

ہم آفتابِ ضمیرِ جہاں میں بوئیں گے	تو ایک روز عظیم انقلاب کاٹیں گے
ہم انقلاب ضمیرِ جہاں میں لوئیں گے	زمیں پہ خیر بدی کا جواب کاٹیں گے

ندیم جانتا ہے کہ انسانی ضمیر کو بدل کر ہی دنیا آفاقیت ایسے عظیم آدرش سے ہم کنار ہو سکتی ہے جہاں تمام تعصب، تفریق اور تقسیم مٹ جائیں۔ جہاں ایسی تمام قدریں، ایسے سماجی اور سیاسی ادارے، ایسے مذاہب اور مسالک بے معنی، بے کار اور ناکارہ ہو جائیں، جو انسان کے احترام، انصاف، آسودگی اور امن پر یقین نہیں رکھتے۔ اُس کے ان الفاظ کی بلاغت پر غور کریں ؎

نہ پوچھو مجھ سے ماہیتِ خیر و شر کی	میں شاعر ہوں بس اتنا جانتا ہوں
محبت کا اگر خالق خدا ہے	تو میں ایسے خدا کو مانتا ہوں

ندیم کے موضوعات میں جو وسعت ہے اُس سے اُس کی زبان و بیان کا متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔ اس کے شعر کا دریچہ جتنا سے تو اندر وسعت اور کشادگی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش سے بلند ہو کر خود کو پرواز کرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ندیم کے شعر ہیں ؎

زمیں مری ہے فضا بھی مری خلا بھی مری	خلا مری ہے تو اقلیم ماورا بھی مری
خدا کے ذہن کا فن پارۂ عظیم ہوں میں	تمام دہر کا دولھا ہوں میں ندیم ہوں میں

علی حیدر ملک

احمد ندیم قاسمی اور ”آبلے“

ہمارے ہاں صفِ اوّل کے شاعر کتنے ہیں؟
بلند پایہ افسانہ نگار کون کون سے ہیں؟
باضمیر اور بااُصول صحافیوں میں کن کن لوگوں کا شمار ہوتا ہے؟

ان سوالوں میں سے ہر سوال کے جواب میں جو چند نام لیے جائیں گے، ان میں احمد ندیم قاسمی کا نام مشترک ہوگا۔ قاسمی کے سلسلے میں سب سے بنیادی اور اہم بات یہی ہے کہ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو بہت ہی مستحکم ہے۔ ان کی دیگر نگارشات کو چھوڑ کر صرف شاعری اور افسانہ نگاری کو ہی پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوگا کہ وہ شاعر بڑے ہیں یا افسانہ نگار۔ اور اس لحاظ سے ان کا نام نہ صرف یہ کہ اس عہد میں بلکہ اردو ادب کی پوری تاریخ میں منفرد اور ممتاز ہے۔ شاعری اور افسانہ نگاری دو بالکل الگ الگ صنفیں ہیں اور اردو میں قاسمی کے علاوہ کوئی دوسرا نام ایسا نظر نہیں آتا جس نے بیک وقت ان دونوں فنون میں اس درجہ کمال حاصل کیا ہو۔

ندیم کے شعری مجموعوں سے قطعِ نظر اُن کے ایک درجن سے زاید افسانوی مجموعے اب تک شایع ہو چکے ہیں۔ ان ہی مجموعوں میں سے ایک مجموعہ ”آبلے“ ہے جو چار طویل کہانیوں پر مشتمل ہے —(۱) کفارہ (۲) ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد (۳) عبدالمتین ایم۔اے (۴) محدب شیشے میں سے۔ یہ چاروں کی چاروں کہانیاں ملک میں آزادی کا سورج طلوع ہونے سے پہلے لکھی گئی تھیں اس لیے اُس سیاہ دَور کے حالات و واقعات پر مبنی ہیں۔

سب سے پہلی کہانی ’کفارہ‘ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے ——

”پیرو کا باپ حکومت کے خیراتی ہسپتال میں تھا۔ لیکن اس ہسپتال کے خداوندوں نے اس سے گھر کے چھاج اور چنگیریں تک ہتھیا لی تھیں۔ ٹین کے ٹوٹے ہوئے ڈبوں اور مٹی کے پُرانے برتنوں کے ساتھ توے کا ٹکڑا بھی کمپونڈر کی نذر ہو گیا تھا۔“ اس کے باوجود پیرو کے باپ کو صحت نصیب نہیں ہوتی اور ایک دن وہ ہسپتال ہی میں داعیِ اجل کو لبیک کہتا ہے۔ باپ کی موت کے بعد پیرو اپنا مکان بیچ ڈالتا ہے اور مکان کے عوض حاصل کیے گئے روپوں سے سفید بیلوں کا ایک خوبصورت جوڑا اور

ایک رنگین ہل خرید کر اپنی برسوں کی آبائی زمین کو دوبارہ کاشت کرنے کی غرض سے اس پر ہل چلانے کا کام شروع کر دیتا ہے۔ خود اپنی اور بیلوں کی رہائش کا مسئلہ وہ ایک دھوبی کے گھر میں حل کرتا ہے۔ یہاں اُسے دھوبی کی لڑکی کموں سے عشق ہو جاتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ذات پات کی دیواروں کو ڈھا کر کموں سے شادی کرے مگر چند در چند وجوہ کی بنا پر وہ ایسا نہیں کر پاتا۔ جب کموں کی شادی ہونے لگتی ہے تو وہ اس کی ماں سے وعدہ کرتا ہے کہ اپنے بیلوں کو بیچ کر وہ کموں کی شادی دھوم دھام سے اور ڈھیر سارے جہیز دے کر کرے گا۔ لیکن اسی اثنا میں ذیلدار کی طرف سے ڈھنڈورا پٹوایا جاتا ہے کہ تمام گاؤں والے ہل چلانا بند کر دیں۔ کیونکہ پولیس کے خیال میں ڈاکو اس گاؤں میں رات بسر کرنے آتے تھے۔ حکومت نے واضح طور پر اعلان کر دیا تھا کہ جب تک گاؤں کے لوگ ڈاکوؤں کو پولیس کے حوالے نہیں کر دیتے ہل چلانے پر مکمل پابندی عاید رہے گی۔ حکم عدولی کرنے والے کو نہ صرف مقدمہ کے حوالات میں ڈال دینے کی دھمکی بھی دی گئی تھی۔ کھیت میں ہل چلانا سال بھر کے لیے فاقے کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لیے تیرو سرکار کا حکم نہیں مانتا اور راتوں رات ہل چلانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ تھانیدار اُسے اس جرم میں پکڑ کر لہولہان کر دیتا ہے اور ساتھ ہی اس کے دونوں بیلوں کو بھی ہانک کر لے جاتا ہے۔ تیرو بہت منت سماجت کرتا ہے کہ یہ صرف ڈھور نہیں ہیں یہ ایک گھر کی آبرو ہیں۔ مگر تھانیدار ایک نہیں سنتا اور اپنی من مانی کارروائی مکمل کر کے ہی دم لیتا ہے۔

"ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد" میں شمشیر خاں حالات سے مجبور ہو کر اپنے بیٹے دلیر کو فوج میں بھرتی کرا دیتا ہے۔ فوج میں بھرتی ہونے کے بعد دلیر محاذِ جنگ پر چلا جاتا ہے۔ شمشیر کو گاؤں میں اس کی طرف سے پیسے موصول ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے وہ ایک طرح سے مطمئن ہے۔ لیکن جب جنگ سے متعلق وحشت ناک خبریں پہنچتی ہیں تو شمشیر کا جذبہ پدری بیدار ہو جاتا ہے اور وہ اپنے بیٹے کی بخیر و خوبی واپسی کی دعائیں کرنے لگتا ہے۔ بالآخر جنگ ختم ہو جاتی ہے اور دلیر تار کے ذریعہ خبر دیتا ہے کہ وہ آ رہا ہے۔ مگر شمشیر اس خبر پر خوش نہیں ہو پاتا کیونکہ اُسے اس کے ساتھ ہی یہ بھی ملتی ہے کہ اُس کی بہو یعنی دلیر کی بیوی پڑوس کے دھوبی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

"عبدالمتین ایم۔اے" رومانی ذہن کے مالک ایک نوجوان کی کہانی ہے۔ عبدالمتین کے ایم۔اے پاس کر لینے کے بعد اُس کے والدین چاہتے ہیں کہ وہ کوئی بڑا افسر بن جائے۔ لیکن عبدالمتین اس کی بجائے خود کو دیہات اور دیہاتیوں کی اصلاح کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہے۔ اسی مقصد کے تحت وہ ایک گاؤں میں پہنچتا ہے اور وہاں ایک کسان کے گھر قیام کرتا ہے۔ اپنے میزبان کسان اور اس کے لڑکے کے تعاون سے وہ گرام سدھار کا آغاز کرتا ہے۔ لیکن یہاں اسے اسی مرحلے پر ایک لڑکی سے عشق ہو جاتا ہے۔ یہ لڑکی اُس کے میزبان کے بیٹے کی منگیتر ہے۔ لہٰذا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور متین گرام سدھار تحریک کو چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔

مجموعے کی چوتھی اور آخری کہانی "محدب شیشے میں سے" بھی رومانی ذہن رکھنے والے ایک نوجوان کی کہانی ہے۔ یہ نوجوان رنگ و بو اور قوسِ قزح میں کھویا رہنا چاہتا تھا۔ لیکن دنیا نے اسے محکمۂ امداد باہمی میں سب انسپکٹر بنا دیا۔ نوجوان سب انسپکٹر جب اپنے دفتری کام کے سلسلے میں ایک گاؤں میں پہنچتا ہے تو وہاں اُسے ایک لڑکی سے جو کہ ایک دہقان کی بیٹی ہے محبت ہو جاتی ہے۔ صابی بھی اسے چاہتی ہے اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے نہیں ہو پاتے۔ صابی کی شادی

دوسری جگہ ہو جاتی ہے مگر بدقسمتی سے وہ بہت جلد بیوہ ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اپنے محبوب کے تعاون سے کھجوروں کی تجارت شروع کر دیتی ہے "اور تین مہینے کے بعد تین تین سو بیسوں کی پانچ ڈھیریاں بھی کٹ کٹ کر تیرے درخت کے کھجوریاں بیوہ زمیندارن کے پاس بھجوا دیتا ہوں جو آج کل میری منہ بولی بہن ہے۔ اور جس کا بھائی اپنے بہنوئی کو قتل کرنے کے جرم میں پورے تیس جیل کا پانی پی رہا ہے"۔ "آبلے" کی یہ چاروں کہانیاں ایک واضح تمہید سے شروع ہو کر آگے بڑھتی ہیں اور ایک خاص نکتے پر پہنچ کر جہاں سب کچھ روشن ہو جاتا ہے ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ کہانیاں بالکل مربوط پلاٹ کی کہانیاں ہیں اور اس کے تمام تقاضے پورا کرتی ہیں۔

مجموعے کی ہر کہانی میں چھوٹے بڑے کئی کردار ہیں جو اپنی طبقاتی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادی خصوصیت بھی رکھتے ہیں۔ کرداروں کے سلسلے میں یہ بات اہم ہے کہ بنیادی اور اہم کرداروں کے علاوہ وہ کردار بھی بڑے دلچسپ ہیں اور قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں جو ضمنی طور پر ان کہانیوں میں آئے ہیں۔ ان کرداروں میں خلوص اور زندہ دلی موجود ہے جس سے ندیم کے اس نظریہ کی زندگی کو ایک سنجیدہ اور بامقصد عمل سمجھنے والے مصائب میں گھرا ہوا دیکھنے کے باوجود ہنسی خوشی زندگی گزارنے کا قائل ہے اور اسے خواہ مخواہ بوجھل نہیں بنانا چاہتا۔

چاروں کہانیوں میں سے دوسری کہانی "ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد" سب سے زیادہ مشہور اور مقبول کہانی ہے جو جنگ کے ہولناک اور دور رس اثرات پر مبنی ہے لیکن فنی طور پر آخری کہانی "محدب شیشے میں سے" سب سے زیادہ خوبصورت اور بھرپور کہانی ہے۔ اس میں جو تہہ داری موجود ہے وہ اختتام تک پہنچتے پہنچتے تزکیہ نفس (KATHARSIS) کی کیفیت پیدا کر کے اس کے نقش کو اور گہرا بنا دیتی ہے۔ زبان و بیان کے معاملے میں قاسمی EXACTNESS اور ACCURACY کے قائل ہیں۔ اسی لیے عام طور پر وہ کم بیانی اور زود بیانی دونوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کی نثر نگاری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ شاعر ہوتے ہوئے بھی نثر میں خواہ مخواہ شاعری کی کوشش نہیں کرتے ورنہ اکثر شاعروں کی نثر میں یہ عیب بہت نمایاں ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ وہ بالکل سیدھی اور سپاٹ نثر لکھتے ہیں بلکہ اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ ان کی نثر نگاری میں اچھی نثر کی خوبیاں پائی جاتی ہیں لیکن شاعری کی نہیں جس سے اچھی نثر اکثر مجروح ہوتی ہے۔ زبان کے سلسلے میں ایک اور بات یہ کہ افسانہ نگار نے متعدد مقامات پر پنجابی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن ان کا استعمال اس لیے غیر مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ یہ اردو کے مزاج سے بہت قریب ہیں۔ مثلاً لشکارے، بوٹا وغیرہ۔

"آبلے" کے دوسرے ایڈیشن میں "بہ فسانے" کے عنوان کے تحت افسانہ نگار نے سوال کیا ہے "کیا آبلے کی کہانیاں آج بھی سچی ہیں؟ اور کیا یہ آج بھی نئی اور تر و تازہ ہیں؟" اور پھر بڑے کرب کے ساتھ خود ہی جواب دیا ہے "ان کی تر و تازگی سے مجھے کتنی نفرت ہے اور مجھے اس روز کا کتنا انتظار ہے جب یہ کہانیاں سچ مچ ماضی کے ایک مردہ نظام کی یادگاریں بن جائیں گی"۔

دراصل قاسمی ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے اظہار کا وسیلہ تو فن ہے لیکن وہ صرف فن کے نمائندے نہیں ہیں بلکہ اپنی تہذیب اور اپنے عہد کی تاریخ کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ "آبلے" کی کہانیاں اس بات پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے اب تک کوئی ناول نہیں لکھا لیکن یہ بات بڑی حد تک یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر انھوں نے کبھی کوئی ناول لکھا تو وہ پنجاب کی تہذیب اور برصغیر کے تاریخی پس منظر میں ہی لکھا جائے گا۔

عذرا اصغر

ندیم صاحب

دیکھ ری تو بیگمات پہ جا کے اُن کا ذکر نہ چھیڑ کر
میں کیا جانوں وہ کیسے ہیں، کس کوچے میں رہتے ہیں
میں نے کب تعریفیں کی ہیں اُن کے بانکے نینوں کی
وہ تو اک خوش پوش جواں ہیں میرے بھیا کہتے ہیں

ندیم صاحب کا یہ قطعہ کب سے میری نوٹ بک کے ایک صفحہ پر درج ہے اور نا معلوم عمر کے کس موڑ پر اور کس شخص سے میں نے یہ قطعہ سنا تھا۔ یہ مجھے یاد نہیں ہے۔ لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ جب یہ خوبصورت قطعہ پہلی بار میں نے سنا تھا تو میں جھوم اٹھی تھی۔ زبان کی سلاست، سوچ کی بلندی، خیال کی اُپج اور بیان کی بے ساختگی نے مجھے چونکا دیا۔ "میرے بھیا کہتے ہیں" کا انوکھا اور حقیقت سے قریب انداز بیان رہن سہن کے ہر گوشے میں چاشنی سی گھول گیا۔

گھٹے گھٹے سے مشرقی ماحول کی عکاسی اس سے پہلے شاید ہی کسی نے کی ہوگی؟ میں سوچتی رہی مگر یہ معلوم نہ کر سکی کہ یہ شعر کس شاعر کی تخلیق ہے۔ [illegible] ورنہ بڑے اونچے اور عجیب قسم کے شاعر تو ایسی شاعری کرتے ہیں کہ معنی و مطلب لغت میں ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ اسی لیے مجھے شعر و شاعری سے بس اتنا ہی شغف رہا جتنا کہ میری سمجھ میں آسکے۔

جب میرے شعور نے آنکھیں کھولیں تب احمد ندیم قاسمی کا نام بڑے اونچے اور عظیم شاعر کی حیثیت سے ہر محفل اور ہر گھر میں گونج رہا تھا۔

کسی چیز یا کسی فرد کا تذکرہ حد سے سوا ہونے لگے تو مجھے چڑ سی ہو جاتی ہے۔ کئی سال پہلے مجھے کراچی شہر سے چڑ سی [illegible] تھی۔ ہر شخص کراچی کا تذکرہ کچھ یوں کرتا تھا جیسے گفتگو اس ذکر کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ پاکستان بننے کے بعد [illegible] زیادہ تر رشتہ دار کراچی میں آباد تھے۔ گو ان دنوں کراچی اگر یہ نہ تھی سوئٹزرلینڈ تھی۔ پھر یہ ہوا کہ مجھے کراچی جانا پڑ گیا۔ نفرت سے قدم [illegible] پڑ رہے مگر جانا مجبوری بن گیا تھا۔ بس گئی اور جب کراچی کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ یہی [illegible] ندیم صاحب کے [illegible] بھی تھا۔ حالانکہ [illegible] کا "حرف و حکایت" ذوق سے [illegible] کر پڑھتی

آ رہی ہوں اور کسی دوسرے کا نکاہی کا لم نگاہوں میں جچتا ہی نہیں ۔لیکن وہ احمد ندیم قاسمی والی چڑ اپنی جگہ قایم تھی ۔ چند برس پیشتر مشکور بھائی (مشکور حسین یاد) نے بہت لہک کر بتایا کہ قاسمی صاحب ہمارے پڑوسی ہوگئے ہیں اور یہ کہ " چلیے آپ کو ملواتے ہیں "۔

میں نے کہا ۔۔۔" چھوڑیے بھائی صاحب ! کیوں ان کے غرور میں اضافہ کرانے کی کوشش کرتے ہیں "۔۔۔ نہ جانے میں نے یہ کیوں فرض کر لیا تھا کہ موصوف مغرور ہیں ۔ اور اس کے بعد مشکور بھائی نے بے شمار تعریفیں قاسمی کی کر ڈالیں ، مگر میں نے ایک پر بھی کان نہ دھرا ۔ پھر میرے غرور کا سر اس طرح نیچا ہوا کہ میری کتاب " دل کے رشتے " کی تقریب کی صدارت موصوف کو سونپی گئی ۔ اور کراچی جانے کی مجبوری کی طرح یہ بھی میری مجبوری بن گئی ۔ کتاب میری ضرور تھی ۔ لیکن دخل میرا نہ تھا ، ان مہربانوں کا یہی فیصلہ تھا جنھوں نے اس تقریب کا اہتمام کیا تھا ۔ لہٰذا میں نے سرِ تسلیم خم کیا ۔ بہرحال دل میں ایک خوش کُن خیال ضرور اُبھرا اور وہ تھا اس شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا احساس ، جس کے فن اور شخصی مرتبے کو لوگ عقیدت واحترام کی نظروں سے دیکھتے تھے اور جب میں نے انھیں دیکھا تو میرے سب نظریات باطل ہوگئے ۔ میرا دل اُن کی سادگی ان کے اخلاص اور اُن کی نرم نرم ، لوچ دار سی شخصیت کے اثر سے کِھل اٹھا ۔ گھر آکر میں نے سب سے پہلے ان کی کتاب " جلال وجمال " نکالی اور شروع سے آخر تک پڑھ ڈالی ۔ موصوف کے حالاتِ زندگی پڑھتے ہوئے کئی بار میری آنکھیں بھر آئیں اور کتنی ہی مرتبہ خوشی ، و تحسین سے جگمگا اٹھیں ۔ تب میں نے محسوس کیا کہ بلا شبہ احمد ندیم قاسمی بلند پائے کے شاعر ہی نہیں ، ایک عظیم انسان بھی ہیں ۔ ایک ایسا انسان جس کے دل میں کچھ کرگزرنے کا جذبہ موجزن ہے ، اور جس کے رگ وپے میں انسانیت کا بے پناہ درد سمایا ہوا ہے ۔ ایک معزز اور صاحبِ حیثیت خاندان کے چشم وچراغ ہونے کے باوجود موصوف کو سرمایہ دارانہ نظام سے شدید نفرت ہے اور وہ اس فرسودہ نظام کو تہس نہس کر دینا چاہتے ہیں جس میں غریب اور متوسط طبقے کے احساسات کو کچلا جاتا ہے اور اس کی ذہانتوں کو پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے ۔ اس دکھ کا اظہار جا بجا انھوں نے اپنے کلام میں کیا ہے ۔ انھیں اس خطے سے بے اندازہ محبت ہے جس میں ان کے بچپن نے کلیلیں بھریں اگرچہ اس سرزمین نے انھیں بہت سے دُکھ بھی دیے ۔ مگر وہ دُکھ انھوں نے زندگی کا انمول تجربہ سمجھ کر دامن میں سمیٹ لیے ۔ ان ایذا رسانیوں نے ان کی محبت کو فنا نہیں کیا ۔ جس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں ؎

رہوں گا اپنے وطن کے بہشت زاروں میں
جوان وادیوں ، بلوان کوہساروں میں
یہ کچے مٹی کے گھر ، یہ غریب رشتہ دار
یہ آڑی ترچھی سی بوسیدہ جھپڑوں کی قطار
صبیح بچوں کے جھمگٹ یہ تنگ گلیوں میں
یہ پھول بننے کے انداز تازہ کلیوں میں

ایک جگہ اپنے گاؤں کی صبح کی وہ اس طرح تعریف کرتے ہیں ؎

گلیوں سے صدائیں آتی ہیں ننھے بچوں کے رونے کی   اور گونج رہی ہیں ہر جانب آوازیں دودھ بلونے کی

پنہاریاں پنگھٹ کی جانب تیزی سے تھرکتی جاتی ہیں　　　اور ہولے ہولے اوڑھنیاں سینوں سے سرکتی جاتی ہیں
چوپال پہ رونق ہے، شاید تھانے کے سپاہی آئے ہیں　　　معصوم غریب کسانوں کے وارنٹ بنا کر لائے ہیں

ان کے جذبے سچے اور گہرے ہیں۔ وہ دوسروں سے محبت کرتے ہیں اور خود سے محبت کرانے کے خواہاں ہیں۔ جیسا کہ ان کے اکثر اشعار سے پتہ چلتا ہے۔ یہاں ایک شعر سنیے ؎

مجھ کو نفرت سے نہیں پیار سے مصلوب کرو
میں تو شامل ہوں محبت کے گنہگاروں میں

دو شعر اور ملاحظہ فرمائیے ؎

یوں بظاہر تو دیا میں نے بجھا رکھا ہے
درد نے دل میں الاؤ سا لگا رکھا ہے
منصفو! کچھ تو کہو، کیوں سرِ بازارِ حیات
مجھ کو احساس نے سولی پہ چڑھا رکھا ہے

امید و نا امیدی، حسرت و یاس، حالات کی ناسازگاری، زندگی کی مجبوریاں اور بے چارگیاں اور خوش گوار وقت کا انتظار ان کے کلام کے اجزا ہیں اور ان کی ہمہ گیر، رنگا رنگ شخصیت کا عکس۔ ان کا کلام پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے ؏

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ان کے کلام کا رنگ منفرد اور سب سے جُدا ہے۔ مگر پھر بھی بعض چیزیں پڑھتے ہوئے ذہن میں کوندا سا لپکتا ہے اور کبھی اقبال کا خیال آتا ہے تو کبھی نظیر اکبر آبادی اور اختر شیرانی کا ——— ان سب رنگوں کے احساس کے باوجود ان کا ایک اپنا الگ تھلگ اندازِ بیان ہے ——— سوچ کی فراوانی، اور اظہار کی ندرت، ان کے کلام کی جان ہے، جس میں ڈوب کر اب میں سوچ رہی ہوں کہ روزمرہ کے انداز میں حقیقت سے قریب ترین شعر احمد ندیم قاسمی کے سوا اور کون کہہ سکتا ہے جس میں معصومیت کا حسن، الھڑ پن، کم عمری کے کچے پنے کی ناتجربہ کاری، سادگی کے ساتھ فطری جذبوں کا ڈھکا چھپا سا اعتراف جس سے ہمارے نرے مشرقی اور دیہاتی بھولپن کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔

"میرے بھیا کہتے ہیں" کا دل کش اور موہ لینے والا انداز اور بھلا کہاں مل سکتا ہے۔؟

یہی لُٹی ہوئی نیندیں، یہی فسردہ دلی
میں سوچتا ہوں کہ سب کچھ لُٹا کے کیا پایا

سجدے بھی ہیں، ثنا بھی ہے، حمد بھی ہے، دعا بھی ہے
اشک مگر کہیں نہیں دامنِ پاک باز میں

——— ندیم

اُفقِ فن

مثلِ خورشید ہوئی ہے اُفقِ فن پہ طلوع

یہ حقیقت کہ جو شاعر ہے وہ انسان بھی ہے

منتخب

دھڑکنیں۔ رم جھم

(پہلا مجموعۂ کلام)

قارئین سے

میرا موضوعِ سخن ہے زندگی
بےکراں، رقصاں، جواں، نکہت فشاں
مضمحل، افسردہ، بےبس، نا امید
مضطرب، بےچین، بےکل، سرگراں

زندگی اک حشرِ موضوعات ہے
اور ہر موضوع کے عنوان ہزار
کس کو اپناؤں نہ اپناؤں کسے
زندگی پر ہے مرے فن کا مدار

فقیہہ سے

فقیہہ شہر! غوّاصِ معانی
تجھے اسرارِ عالم کی خبر کیا!
تجھے بھی نصف شب کی ظلمتوں میں
نظر آتے ہیں انوارِ سحر کیا؟

شاعرِ شباب

نہ بیش و کم کا جہنم نہ زشت و خوب کا زہر
نہ اتباع مرے منفرد خیالوں میں
وہ شاعری جو محبت سے بہرہ یاب ہی
کبھی الجھ نہ سکی منطقی سوالوں میں

ماضی و حال

جسے ہر شعر پہ دیتے تھے تم داد
وہی رنگیں نوا خونیں نوا ہے
اب ان رنگوں کے نیچے ڈھیرے ڈھیرے
لہو کا ایک دریا بہہ رہا ہے

شاعر

مرے جذبات میرے پاسباں ہیں
مرے افکار میرے راز داں ہیں
مرے بس میں ہے تقدیرِ دو عالم
مری زد میں زمین و آسماں ہیں

طلسمِ تبسم

چاندنی رات کا جادو بھی کوئی جادو ہے
میں نے دیکھا ہے ترے نرم تبسم کا طلسم
یہ تبسم ہے کہ پھولوں سے کرن پھوٹی ہے
یہ تبسم ہے کہ پایا ہے مرے خواب نے جسم

آمد آمد

حسیں لبوں پہ جڑی بوٹیوں کا رس مَل کر
صبوحی کھیت سے چڑیاں اُڑاتے آئی ہے
بچھا کے سُرخ دوپٹے کو سنگ ریزوں پر
نہ جانے کس کے تصور میں مسکرائی ہے

بغاوت

اے خزاں رنگ سیاست کے علم بردارو
موسمِ گُل پہ بھی الزامِ بغاوت دھر دو
ان کی مہکار سے مفلس ہوں بھلا کیوں نوش
ایک اک پھول کو پابندِ سلاسل کر دو

پنگھٹ کی رانی

وہ پانی بھرنے چلی اِک جوان پنہاری
وہ گورے ٹخنوں پہ پازیب جھنجھناتی ہے
غضب غضب کہ مرے دل کی سرد راکھ سے پھر
کسی کی تپتی جوانی کی آنچ آتی ہے

برکھا کے دو رنگ

وہ چھا رہے ہیں فضاؤں میں سرمئی بادل
وہ تند و تیز ہواؤں کا ساز بجنے لگا
وہ دل کی بجھتی ہوئی آگ سے دھواں اُٹھ کر
تصورات کے آکاش پر گرجنے لگا

بے درد

بات کہنے کا جو ڈھب ہو تو ہزاروں باتیں
ایک ہی بات میں کہہ جاتے ہیں کہنے والے
ہیں ان کے لیے ہر لفظ کا مفہوم ہے ایک
کتنے بے درد ہیں اسی شہر کے رہنے والے

دردِ بے سبب

گلی کے موڑ پہ بچوں کے ایک جمگھٹ میں
کسی نے درد بھری لے سے ہیّا ماہیا گایا
مجھے کسی سے محبت نہیں مگر اے دل
یہ کیا ہوا کہ تو بے اختیار بھر آیا

جادو بھری رات

وہ دُور جھیل کے پانی میں تیرتا ہے چاند
پہاڑیوں کے اندھیروں پہ نور چھانے لگا
وہ ایک کھوہ میں اک بدنصیب چرواہا
بھگو کے آنسوؤں میں ایک گیت گانے لگا

نور پاشی

اُداس چاند نے بدلی کی آڑ میں ہو کر
کنارے مٹیالے بادل کے کر دیے روشن
شبِ فراق میں جیسے تصورِ رخِ دوست
دلِ حزیں کے اندھیرے میں روشنی کی کرن

ساون کا سحر

برس کے چھٹ گئے بادل ہوائیں گاتی ہیں
گرجتے نالوں میں چرواہیاں نہاتی ہیں
وہ نیلی، دھوئی ہوئی گھاٹیوں سے دو کونجیں
کسی کو دُکھ بھری آواز میں بُلاتی ہیں

نوجواں راہی

وہ سبز کھیت کے اُس پار اک چٹان کے پاس
کڑکتی دھوپ میں بیٹھی ہے ایک چرواہی
پرے چٹان سے، پگڈنڈیوں کے جالوں میں
بھٹکتا پھرتا ہے وہ ایک نوجوان راہی

پانی میں آگ

ابھی تو جھیل کی لہروں پہ ہے سکوں طاری
ابھی تو دور ہے طوفان بادوباراں کا
سفینہ راں نہ پلٹ، دیکھ کر بھنور کا نشاں
یہ ایک رقص ہے موجوں کے قلبِ سوزاں کا

تحائف

یہ اوڑھنی ہے، وہ جھمکے ہیں اور یہ مالا ہے
وہ یاسمن ہے، یہ گیندا ہے اور وہ لالہ ہے
اور ان کے ساتھ شفق رنگ اشک ہیں دو چار
جنھیں فراق نے پالا ہے، غم نے ڈھالا ہے

بعد از وقت

کئی برس سے ہے ویران مرغزارِ شباب
اب التفات کے بادل برس رہے ہیں کیوں
یہ بوندیاں، یہ پھواریں، یہ رس بھرے جھونکے
توقعات کی نعشوں کو ڈس رہے ہیں کیوں

سانس کی پھانس

اندھیری شب کی پراسرار سنسناہٹ میں
کھُلی ہوئی ہے کسی محوِ انتظار کی سانس
بایں فروغ ارادوں میں ابنِ آدم کے
کھٹک رہی ہے ابھی جبر و اختیار کی پھانس

پردوں کی لرزش

کبھی نہ پلٹے گی بیتی ہوئی گھڑی لیکن
تصورات سے دل خوش ہیں نوعِ انساں کے
وہ کس کے ہاتھ کے ہیں منتظر خدا جانے
لرزتے رہتے ہیں پردے حریمِ جاناں کے

گریز

خموش جھیل پہ کیوں ڈولنے لگا بجرہ
ہوائیں تند نہیں ہیں کنارہ دور نہیں
بھنور کا ذکر نہ کر، زندگی کا لطف نہ چھین
مجھے ابھی کسی انجام کا شعور نہیں

خرامِ ناز

یہ بھی کیا چال ہے ہر گام پہ محشر کا گماں
پائلیں بجتی ہیں، لہنگے کی کماں تنتی ہے
یوں چلو جیسے اترتی ہے کہستاں سے ہوا
جیسے رنگوں کے تموّج سے کرن بنتی ہے

عکسِ لرزاں

یوں مرے ذہن میں لرزاں ہے ترا عکسِ جمیل
دلِ مایوس میں یوں گاہ ابھرتی ہے آس
ٹمٹماتا ہے وہ لو خیز ستارا جیسے
دور مسجد کے اُس ابھرے ہوئے مینار کے پاس

سراپا

تیری زلفیں ہیں کہ ساون کی گھٹا چھائی ہے
تیرے عارض ہیں کہ پھولوں کو ہنسی آئی ہے
یہ ترا جسم ہے یا صبح کی شہزادی ہے
ظلمتِ شب سے اُلجھتی ہوئی انگڑائی ہے

حیا

آج پنگھٹ پہ یہ گاتا ہوا کون آ نکلا
لڑکیاں گاگریں بھرتی ہوئی گھبرا سی گئیں
اوڑھنی سر پہ جما کر وہ صبوحی اٹھی
انکھڑیاں چار ہوئیں، جھک گئیں، شرما سی گئیں

تشنگی

پو پھٹے رینگتے جھرنے پہ یہ کون آیا ہے
بال بکھرے ہوئے، پٹے ہوئے خواب آنکھوں سے
لوٹ لیں تشنگیٔ زیست نے نیندیں ورنہ
یوں پیاپے نہ برستی مئے ناب آنکھوں سے

کھنڈروں میں

میں نے اس دشت کی وسعت میں شبستاں پائے
اُس کے ٹیلوں پہ مجھے قصر نظر آئے ہیں
ان بگولوں میں کسی ساز کے پردے لرزے
اُن کھجوروں پہ مرے راز ابھر آئے ہیں

رخصت

بوڑھے ماں باپ بلکتے ہوئے گھر کو پلٹے
چونک اُٹھے ہیں وہ شبنمی بجنے والے
اُف بچھڑتی ہوئی دوشیزہ کے نالوں کا اثر
ڈولتے جاتے ہیں ڈولی کے اُٹھانے والے

ایک تصویر

صحرا کی سپاٹ وسعتوں میں
یوں اک کھجور ہے خمیدہ
جیسے مرے ذہن کے اُفق پر
اُبھری ہو صبوحی آب دیدہ

عشق یا ہوس؟

بجھتے ہی گجر اُڑے پتنگے
لالچ تھا یہ بندگی نہیں تھی
مٹی کے دِیے کا ذکر کیسا؟
دراصل دیے کی لَو حسیں تھی

فریبِ نظر

رخ ہیں یا عکس ہے برگِ گلِ تر کا
چاندی کا یہ جھومر ہے کہ تارا ہے سحر کا
یہ آپ ہیں یا شعبدۂ خوابِ جوانی
یہ رات حقیقت ہے کہ دھوکا ہے نظر کا

صبح کا تارا

وہ صبح کا تارا ہے دھندلکے میں خراماں
یا چاند کا بدلی سے ٹپکتا ہے اُجالا
یا میری صبوحی ہے کہ پنگھٹ کے کنارے
لہراتی ہے اوڑھے ہوئے نیندوں کا دوشالا

طوفانی موسم

ساون کی یہ رُت اور یہ جھولوں کی قطاریں
اُڑتی ہوئی زُلفوں پہ مچلتی ہیں پھواریں
ہیں صبح سے ندی کے کنارے پہ کھڑا ہوں
ملّاح کہاں ہیں جو مجھے پار اُتاریں

ابابیل

وہ تار کے اک کھمبے پہ بیٹھی ہے ابابیل
اڑنے کے لیے دیر سے پر تول رہی ہے
جس طرح مرے عشق کی ٹوٹی ہوئی کشتی
امید کے ساحل پہ کھڑی ڈول رہی ہے

برسات کے راز

گرتی ہوئی بوندیں ہیں کہ پارے کی لکیریں
بادل ہے کہ بستی پہ گجر دم کا دھواں ہے
مغموم پپیہا ہے کہ بھٹکا ہوا شاعر
جو پوچھتا پھرتا ہے کہاں ہے تو کہاں ہے

ایک تصوّر

یہ فضا، یہ گھٹائیں، یہ بدلیاں، یہ بوندیاں
کاش اُس بھیگے ہوئے پربت سے لہراتی ہوئی
دھیرے دھیرے ناچتی آئے صبوحی اور پھر
گھُل کے کھو جائے کہیں میری غزل گاتی ہوئی

لچک

باجرے کے فصل سے چڑیاں اُڑانے کے لیے
ایک دوشیزہ کھڑی ہے کنکروں کے ڈھیر پر
وہ جھُکی، وہ ایک پتھر سنسنایا، وہ گرا
کٹ گئے ہیں اُس کے جھٹکے سے مرے قلب و جگر

منتظر جھولا

عید کا دن ہے فضا میں گونجتے ہیں قہقہے
جھولتی ہیں لڑکیاں جھولوں پہ گاتی ہیں ملہار
میرا جھولا جس سے ہیں لپٹے ہوئے سرسوں کے پھول
دیکھتا ہے ایک نکڑ کو لپک کر بار بار

گھات میں

گورے ہاتھوں میں یہ دھانی چوڑیوں کی آن بان
کالی زلفوں پر گلابی اوڑھنی کی آب و تاب
ہر قدم پر نقرئی خلخال کے نغموں کی لہر
تیرے پیکر میں مجسم ہو گئی روحِ شباب

شباب مجسّم

گائیں ڈکراتی ہوئی پگڈنڈیوں پر آ گئیں
مُرلیاں ہاتھوں میں لے کر مست چرواہے بڑھے
بیریوں کے دھُندلے سایوں میں کھڑا ہوں منتظر
ایک لڑکی کو گزرنا ہے یہیں سے دن چڑھے

تبسّمِ غمّاز

کھڑکھڑاتی ڈول وہ دھم سے کنوئیں میں گر گئی
دم بخود پنہاریاں کنگن گھماتی رہ گئیں
وہ کنوئیں میں ایک چرواہا اُترنے کو بڑھا
وہ صبوحی کی نگاہیں مسکراتی رہ گئیں

جانے کہاں

لڑکیاں چنتی ہیں گیہوں کی سنہری بالیاں
کاٹتے ہیں گھاس مینڈھوں پر سے بانکے نوجواں
کھوئی کھوئی ایک لڑکی بیریوں کی چھاؤں میں
دیکھتی ہے گھاس پر لیٹی ہوئی جانے کہاں

لمحۂ فرصت

کٹ چکی جب فصل اور دہقان سستانے لگے
اِک کھنڈر کے پاس وہ یوں آئی کتراتی ہوئی
جیسے اک ہلکی سی بدلی ابر چھٹ جانے کے بعد
اودے پربت کی طرف جاتی ہے اٹھلاتی ہوئی

الف لیلیٰ کی ایک رات

بج رہی ہیں ہولے ہولے کارواں کی گھنٹیاں
رینگتی جاتی ہے صحراؤں میں اونٹوں کی قطار
ایک دوشیزہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں
دیکھتی ہے جانے کیوں سوئے اُفق دیوانہ وار

نغمۂ شادی نوحۂ غم

گونج ہے شہنائیوں کی دُھوم ہے بارات کی
پھر رہی ہیں کھیلتی ہنستی، مچلتی کنواریاں
گاؤں سے کچھ دور اک سنسان گورستان میں
ہو رہی ہیں ایک سادہ قبر کی تیاریاں

ایک بچے کی موت پر

چاند اب تک تیری خاطر ناچتا ہے جھیل پر
ڈھونڈتی ہیں تتلیاں اب تک تجھے اشجار میں
دف بجاتی بدلیاں آتی ہیں اب تک صف بصف
اور دھنک جادو جگاتی ہے ابھی کہسار میں

داغ دار آنچل

رَن میں جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں جواں
گردنیں اکڑی ہوئی رُخ پر جوانی کی بہار
ایک جانب دم بخود استادہ ہیں کچھ لڑکیاں
اپنی آنکھوں میں چھپائے آنسوؤں کے آبشار

مژدۂ بہار

تند ہوائیں مست گھٹائیں آئیں جائیں دھوم مچائیں
شاخوں پر البیلی چڑیاں چونچ سے چونچ ملا کر گائیں
اے دوشیزہ آنکھیں مل کر رقص کرا ور کونین پہ چھا جا
جانے کب دل رُک جائے اور جانے کب نبضیں تھم جائیں

معصومیت

دیکھ ری تو پنگھٹ پر جا کر میرا ذکر نہ چھیڑا کر
میں کیا جانوں کیسے ہیں وہ کس کوچے میں رہتے ہیں
میں نے کب تعریفیں کی ہیں اُن کے بانکے نینوں کی
"وہ اچھے خوش پوش جواں ہیں" میرے بھیا کہتے ہیں

پیک سوئی

دور ابابیلوں کی ڈاریں پربت پر منڈلاتی ہیں
مست ہوائیں مست گھٹاؤں کے پرچم لہراتی ہیں
چار طرف ان کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے
ذہن میں کانٹے چبھ جاتے ہیں جب بھیڑیں ممیاتی ہیں

کرنوں کا جالا

سسکتے چاند نے بادل میں چھُپ کر
بنا ہے نقرئی کرنوں کا جالا
حسین بیمار کے چہرے پہ جیسے
کسی بے نام تابانی کا ہالا

محبوبۂ صحرائی

یہ بانکی سانڈنی، چٹیل بیاباں، اونگھتی راہیں
یہ مدھم چاند کی کرنیں، یہ حسرت ناک خاموشی
ترا خیمہ کہاں ہے او مری صحرائی محبوبہ
جہاں نیندیں سجاتی ہے تری آنکھوں کی مدہوشی

جوگ

شکستہ مقبروں میں ٹوٹتی راتوں کو اک لڑکی
لیے ہاتھوں میں بربط جوگ میں کچھ گنگناتی ہے
کہا کرتے ہیں چرواہے کہ جب رکتے ہیں گیت اُس کے
تو اک تازہ لحد سے چیخ کی آواز آتی ہے

دو حالتیں

حسن محوِ خواب کے سیلاب میں
نیند پلکوں سے ٹپک کر بہہ گئی
تم نے جب آنکھیں ملیں انگڑائی لی
زندگی اِک خواب بن کر رہ گئی

ہندی نوجوان سے

نہ تجھ کو غلبۂ افرنگ ناگوار رہا
نہ تیری روح پہ محکومیت کا بار رہا
میں تیرے مذہب و ماحول کا ثنا خواں ہوں
کہ جن کے دم سے تجھے بھوک کا خمار رہا

بھوکا دیہاتی

بلک رہی ہے دمادم مشین آٹے کی
گرج رہا ہے وہ پٹری پہ شعلہ بار انجن
وہ تنگ باڑوں سے بکریاں پکارتی ہیں مجھے
کہ آج پیٹ کے کہنے پہ تج رہا ہوں وطن

بنگالی قحط زدہ کی زبانی

کاش یہ سنگ دل سیاست باز
تھپکیوں سے نہ ہم کو بہلاتے
غم گساروں کے درد ناک الفاظ
کاش چاول کے دانے بن جاتے

پھول اور مقتول

کیکروں کے سفید کانٹوں پر
یوں اٹکتے ہیں پیلے پیلے پھول
جیسے نیزوں پہ ہوں پروئے ہوئے
حریت دوست نوجواں مقتول

نظامِ نو

چار جانب ہے شورِ رستاخیز
سوچ میں غرق ہے دلِ پرویز
اور افلاس کے ستائے ہوئے
کرتے پھرتے ہیں تیغ و خنجر تیز

عورت

سر بسر ایک ساز تیری ذات
پھر بھی صدیوں کا راز تیری ذات
راز آواز کی تلاش میں ہے
اور وہ ساز کی تلاش میں ہے

اُڑے ہوئے تنکے

دوپہر، لُو، غبار، خاموشی
تنکے یوں اُڑ رہے ہیں گلیوں میں
جیسے مرحوم باپ کی دولت
نوجوانوں کی رنگ رلیوں میں

بے کرانی

ان ستاروں سے پرے اور ستارے بھی تو ہیں
جن کے پرتو سے منور ہیں کئی اور جہاں
ان جہانوں سے پرے اور جہاں بھی ہوں گے
میرے سیارۂ رنگیں کی طرح رقص کناں

انکشاف

تو ستاروں سے بہت دور ہے بس جانتا ہوں
اپنی مخلوق سے مستور ہے میں مانتا ہوں
لیکن اک راز سے آگاہ کیے دیتا ہوں
میں شناسا ہوں ترا میں تجھے پہچانتا ہوں

ڈوبتا چاند

صاف کھلیان پہ غلّے کا سنہری انبار
چار سو بیٹھے ہیں دہقان تھکے ہارے سے
ڈوبتے چاند کے ہالے میں ہوں جیسے تارے
روئے روئے سے پریشان سے بے چارے سے

حکمران

کتنے سلجھے ہوئے صیاد ہو، سبحان اللہ
قفسِ سنگ میں کمخواب بچھا دیتے ہو
جب مجھے بھوک ستاتی ہے تو کتنے ڈھب سے
تھپکیاں دیتے ہو، گاتے ہو، سُلا دیتے ہو

میں اور تو

تیرگی، رات کا اعجاز، اُجالا دن کا
رات اور دن ترے اعجاز، تو میرا اعجاز
تُو مرے ذہن کا مہ، میں ترے افکار کا مہر
میری تخلیق میں پنہاں تری تخلیق کا راز

خود شناسی

رنگ جب اپنی حقیقت سے شناسا ہو جائے
لالہ زاروں میں بھڑکتا ہے الاؤ بن کر
رقص جب دائرۂ فن سے اُبل پڑتا ہے
دندناتا ہے سمندر کا بہاؤ بن کر

رقیب

محکوم بھی ہوں غریب بھی ہوں
آوارہ و بدنصیب بھی ہوں
با وصف تمام خامیوں کے
فطرت، میں ترا رقیب بھی ہوں

تفاوت

مشرق کو اگر شدتِ احساس نے مارا
مغرب کو غمِ دگوہر و الماس نے مارا
لیکن مرے مہتاب جبیں ہم وطنوں کو
محکومی و بے کاری و افلاس نے مارا

تن اور من

"دو بیگھے زمیں کاشت کی خاطر مجھے دے کر
تم کرتے ہو چھپ کر مری لڑکی کو اشارا
محنت تو بکا کرتی ہے، غیرت نہیں بکتی"
افلاس کا مارا ہوا دہقان پکارا

امید حیات

سرودِ دیر کیا، سوزِ حرم کیا
بلند و پست کیا، بود و عدم کیا
اگر ہر دل میں ہے اس کا ٹھکانا
تو یہ افسانہائے کیف و کم کیا

پہلوتہی

نہیں بے مدعا تخلیق انساں
سمجھ میں مدعا لیکن نہ آیا
خدا خالق سہی، مخلوق کے پاس
رسول آئے خدا اب تک نہ آیا

خدا سے

یہ دل ہے اور یہ سوزِ دروں ہے
یہ اپنا عشق ہے، اپنا جنوں ہے
الٰہی! کیا یہی ہے تیرا انصاف
کہ منعم بہرِ مے، مفلس کا خوں ہے

میرا وطن

جہاں پھولوں کی خوشبو بک رہی ہے
مجھے ایسے چمن سے دور لے جاؤ
جہاں انسان کو سجدہ روا ہے
مجھے ایسے وطن سے دور لے جاؤ

داغ دار سجدے

انساں کو سیدھی راہ پہ لانے کے نام پر
انسانیت کا خون پیے جا رہا ہے تو
یوں سجدے کر رہا ہے رعونت سے دم بدم
جیسے کسی کو بھیک دیے جا رہا ہے تو

گھنگھور گھٹا

اُفق سے اک گھٹا اُٹھی گرجتی، گونجتی، گاتی
گزر کر میرے ویراں کھیت پر سے دور جا برسی
کچھ ایسے میں نے دیکھا اُس کی جانب جس طرح مفلس
امیروں کی نگاہِ تند میں ڈھونڈے خدا ترسی

سونا اور رونا

بادشاہوں کی معطر خواب گاہوں میں کہاں
وہ مزا جو بھیگی بھیگی گھاس پر سونے میں ہے
مطمئن لوگوں کی اُجلی مُسکراہٹ میں کہاں
لُطف جو اک دوسرے کو دیکھ کر رونے میں ہے

ووٹ

وہ کسی بے خوف دیہاتی نے موٹر روک لی
اک رئیس اُترا ہے برساتا ہوا نخوت کی بھاپ
کیا شکایت ہے؟ وہ غرّایا، وہ دیہاتی بڑھا
"ووٹ لے لیتے ہیں، روٹی نہیں دیتے ہیں آپ"

لاہور اور انگہ

ہیں ترے لاہور میں لارنس باغ اور شالامار
میری بستی میں فقط پتھریلی گلیاں ہیں ندیم
پھر ترے لاہور کے ہر پھول میں ہیں خار زار
اور مری بستی کے ہر کنکر میں کلیاں ہیں ندیم

معیارِ افکار

ترے معیار پر پوری نہ اُتری
مرے افکار کی گردوں پسندی
کہ تو ان پستیوں پہ خندہ زن ہے
نظر آئی مجھے جن میں بلندی

نغمے کی موت

یہ ننھی منی سی ڈھولک یہ نرم نرم سے ہاتھ
یہ انگلیوں کی تڑپ، چوڑیوں کی یہ جھنکار
منڈیر پر وہ اچانک کسی نے آہ بھری
وہ بجھ گئے ہیں نرالوں کے بے قرار شرار

دُھندلے آئینے

ترے رحم و کرم کے آئینے
ہیں ازل سے غبار آلودہ
بندہ بیمار و مفلس و مجبور
اور قدرت ہے کتنی آسودہ

تقابل

اِدھر قسمت کا خون آلود چہرا
اُدھر فطرت کی اُجلی مُسکراہٹ
اِدھر جھنکار زنجیرِ نفس کی
اُدھر جھجکے ہوئے قدموں کی آہٹ

خزاں در بہار

یہ خزاں ہے کہ میری آنکھیں ہی
ہیں فروغِ بہار کی دشمن
بات کیا ہے کہ صحنِ گلشن میں
ان دنوں اُگ رہے ہیں دار و رسن

مرگ و زیست

درانتیوں کے لبوں پر فنا کے نغمے ہیں
سنہری فصل بچھی جا رہی ہے کٹ کٹ کر
یہ کس نے چھیڑ دیے بربطِ حیات کے تار
کھنڈر کی اوٹ میں کھلیان سے ذرا ہٹ کر

مزاجِ چمن

گُلوں میں رنگ تو تھا رنگ میں جلن تو نہ تھی
مہک میں کیف تو تھا کیف میں جنوں تو نہ تھا
بدل دیا ترے غم نے بہار کا کردار
کہ اب سے قبل چمن کا مزاج یوں تو نہ تھا

خود نگری

خدا کی یاد میں صدیاں گزار دیں لیکن
خدا سے صرف تحیّر کی دُھند لایا ہے
عجب نہیں کہ خدا عرش سے اُتر آئے
اب آدمی کو خود اپنا خیال آیا ہے

طلوع و غروب

غروب ہو کے بھی سورج کبھی طلوع ہوا
اگر غروب یہی ہے زہے طلسم غروب
اگر غروبِ مسلسل ہے روز و شب پہ محیط
تو کیوں طلوع سے کر دی گئی سحر منسوب

ایک بہت بڑے مشاعرے کی دعوت ملنے پر

بڑے وقار سے اِک احترامِ خاص کے ساتھ
بجا کہ مجھ کو ملا ہے مشاعرے کا پیام
میں اپنے چہرے سے زنداں کی خاک تو دھو لوں
مری جلیل حکومت، مرے عظیم نظام

بدلے ہوئے تیور

اپنی آواز کی لرزش پہ تو قابو پا لو
پیار کے بول تو ہونٹوں سے نکل جاتے ہیں
اپنے تیور تو سنبھالو کہ کوئی یہ نہ کہے
دل بدلتے ہیں تو چہرے بھی بدل جاتے ہیں

آدابِ محبت

ہجر کی رات میں رہ رہ کے تڑپنے والو
رات کے پاس فقط رات کا سناٹا ہے
عشق کرنے کے بھی آداب ہیں کیسے چُپ چاپ
رات بھر چاند نے ظلمت کا سفر کاٹا ہے

تاریخ

بادشاہوں کے مقبروں سے اگر
تم مرتب کرو گے تاریخیں
تب بھی اِک روزن سے امڈیں گی
گرتے پڑتے عوام کی چیخیں

پہچان

ارزاں نہ کرو کفر کے فتووں کو کہ میں نے
عرفانِ حقیقت کو خدا مان لیا ہے
اب کیا ہے فرشتوں کے تعارف کی ضرورت
انسان نے انسان کو پہچان لیا ہے

سوال

مدت سے یہ دُھن ہے کہ رئیسوں سے یہ کہہ دوں
نکلے کبھی دیہات میں جب اُن کی سواری
گندم کی یہ بالی نہیں مرگھٹ کے دیے ہیں
بستی کے یہ چھپّر نہیں قبریں ہیں تمھاری

تہذیب

انساں تو خیر ہو، مگر آخر عوام ہو
دھرتی میں خون بو کے اُگاتے رہو خراج
تہذیب اس عظیم تفاوت کا نام ہے
کھلیان پر اناج، گھروندے میں احتیاج

شاعر اور شعر

شاعر تو خیر دست بہ زنجیر ہو چکا
وہ شعر کو تو پا بہ سلاسل نہ کر سکے
داغا گیا ہے جسم، مگر جسم ہی تو تھا
وہ ذہن پر تو گرم سلاخیں نہ دھر سکے

حُسن کی لوٹ

کتنی بھرپور ہیں گندم کی سنہری بالیں
دانے دانے پہ مگر مُہر لگائی کس نے؟
حُسن تو خیر کسانوں نے کیا ہے تخلیق
عصمتِ حسن کی یہ خاک اُڑائی کس نے؟

عوامی ادب

عمودی چٹانیں
درختوں سے خالی
چٹانوں پہ لیکن
جھلکتی ہے لالی

رباعیات

تاریخ کی جنتیں نہ دکھلا مجھ کو
ان کاغذی پھولوں سے نہ بہلا مجھ کو
ماضی، مرے ماضی، مرے اندھے ماضی
لاشوں کے تعفن میں نہ لے جا مجھ کو

○

دعویٰ ہے اُسے، عرش بریں میرا ہے
وہ سوچتا ہے عرش نشیں میرا ہے
دھرتی پہ اُترنا نہ خدا کے بندو
انسان کو کہنا نہ کہیں میرا ہے

○

انسان سرافیل کا ثانی نکلا
اِک ذرّہ قیامتوں کا بانی نکلا
جب ہونٹ ہلے، گُلوں کی بارش سی ہوئی
جب جسم کٹا تو خون پانی نکلا

○

آ ڈوبتی نبضوں کو اُبھاریں ساتھی
آ گیسوئے گیتی کو سنواریں ساتھی
خاشاک کے انبار جلانے کے لیے
آ مشعلِ جہد پہ ہاتھ ماریں ساتھی

○

صحراؤں سے تم پھول نہیں چُن سکتے
تم حسنِ خزاں پہ سر نہیں دُھن سکتے
کلیوں کے چٹک سے چونکتے ہو لیکن
انسان کی فریاد نہیں سُن سکتے

○

کب تک میں روایات کی باتیں کرتا
فاقوں میں کرامات کی باتیں کرتا
تم زخم کو بھی پھول سمجھ لیتے ہو
کب تک میں کنایات کی باتیں کرتا

○

ہر ذرّے کا دل ہے دردِ الفت سے دونیم
ہر گُل ہے غمِ عشق سے آوارۂ شمیم
ہر ملک کا احترام لازم آیا
جب اپنے وطن سے عشق کرتا ہے ندیم

○

تاریخ کے پنجر کو کفن سے نہ نکال
اس بگڑی ہوئی لاش کے ٹکڑے نہ اُچھال
ماضی کے تعفّن سے فضا بوجھل ہے
اے مصلحِ قوم! اپنا تابوت سنبھال

○

تھپکی سے نہ آپ زخمیوں کو بہلائیں
ٹلتی نہیں چمکارنے سے قبروں کی وبائیں
میں آپ سے ایک التجا کرتا ہوں
آپ اپنے عوام سے ذرا آنکھ ملائیں

○

اے نغمۂ اقتدار گانے والو
اے گنبدِ زر پہ چہچہانے والو
اسلام نے انسان کو بیچا تو نہ تھا
اسلام کے نام پر کمانے والو

○

آثارِ سحر چمن کو چونکائے رہے
سائے سے مگر چار طرف چھائے رہے
دو چار نے بڑھ کے اپنی جھولی بھر لی
لاکھوں کے ہجوم ہاتھ پھیلائے رہے

○

شبنم کو گُلوں پہ تولتے ہیں ہم لوگ
اشکوں کی زباں میں بولتے ہیں ہم لوگ
میدانِ حیات میں بھٹک کر اکثر
اسرارِ حیات کھولتے ہیں ہم لوگ

○

ذرّے کو مثلِ ماہ پایا میں نے
سورج کو چراغِ راہ پایا میں نے
اس درجہ بڑھا تھوں میں جلنے کا جنوں
ہر جبر میں اک گناہ پایا میں نے

○

آفاق کو ایوان بنایا اپنا
تقدیر میں کردار رچایا اپنا
مجرے کو فرشتے بھی زمیں پر اُترے
انسان نے جب سُراغ پایا اپنا

○

پیوست ہے میرے دل میں میرا ہی قلم
دھرتی پہ ٹپک کے خوں یہ کرتا ہے رقم
اس خون میں پھول کھلکھلاتے ہیں ندیم
جس طرح چٹانوں میں دھڑکتے ہیں صنم

○

زنداں کی سحر پہ ہیں سلاخوں کے داغ
کٹتی ہیں شعاعیں تو سمٹتا ہے دماغ
یہ صبح ہے یا نزع میں بچے کی ہنسی
یہ مہر ہے یا تربتِ شاعر کا چراغ

○

یا دل تو بہت ہیں مینہ کے چھاجے کم ہیں
کانٹوں کے مقابلے میں لاسے کم ہیں
مزدور کا ذکر تو ہزاروں نے سُنا
مزدور کی فکر کرنے والے کم ہیں

ترائیلے

آخری دعوت

(۱)

تم کو آنا ہے تو آؤ کہ دیا جلتا ہے
پھر نہ جانے یہ سہارا بھی رہے گا کہ نہیں
بے ادب وقت کا تیزی سے قدم چلتا ہے
تم کو آنا ہے تو آؤ کہ دیا جلتا ہے
رات کا سایہ وہ پچھم کی طرف ڈھلتا ہے
جانے پھر کوئی ستارا بھی رہے گا کہ نہیں
تم کو آنا ہے تو آؤ کہ دیا جلتا ہے
پھر نہ جانے یہ سہارا بھی رہے گا کہ نہیں

بدگمانی

(۲)

مری باہوں پہ پریشاں ہیں کسی کے گیسو
دھڑکنیں دل کی مگر اب بھی ہم آہنگ نہیں
میرے افکار پہ طاری ہے حنا کی خوشبو
میری باہوں پہ پریشاں ہیں کسی کے گیسو
گو بہت دیر سے آباد ہے میرا پہلو

میرے احساس کے چہرے پہ کوئی رنگ نہیں
میری باہوں پہ پریشاں ہیں کسی کے گیسو
دھڑکنیں دل کی مگر اب بھی ہم آہنگ نہیں

مختصر نظمیں

یادش بخیر

محبت کے شبستاں آج بھی جس سے درخشاں ہیں
وہ اِک بے اختیار و بے محابا مُسکراہٹ تھی
وہ ہر آواز میں اِک گدگدی سی اِک تقاضا سا
یہ دل کی دھڑکنیں تھیں یا ترے قدموں کی آہٹ تھی
ابھی تک چونک اُٹھتا ہوں راتوں کی خموشی میں
ترے ملبوس میں گاتی ہلا کی سرسراہٹ تھی
تری پہلی نظر میں، بجلیوں کا سا قرینہ تھا
کماں کی سی لچک تھی تیر کی سی سنسناہٹ تھی
ستاروں میں رچی، دل میں سمائی، برق میں کوندی
مری آغوش میں جو تیری پہلی تلملاہٹ تھی
امیدوں کے چمن میں دیر تک جاری رہے نغمے
کلی چٹکی تھی یا دوشیزگی کی کسمساہٹ تھی
ترے گیتوں میں احساسِ جوانی جھنجھناتا ہے
رواں پانی میں بہتی چاندنی کی لپلپاہٹ تھی
وہ تیرے بے سبب رونے سے عارض کا دہک اُٹھنا
میں سمجھا برگِ گُل پر شبنموں سے کپکپاہٹ تھی
مگر یہ ذکر ہے اُس دور کا جب تیری سانسوں میں
سحر کی اوّلیں انگڑائیوں کی تھرتھراہٹ تھی

وقت کی واپسی

کل صبح کو سبز کھیتیوں پر
اک گیت تھرکتا جا رہا تھا
دریا کے کنارے ایک بانکا
گھوڑے پہ سوار جا رہا تھا
میں جھینپ گئی، مرا سپاہی
پردیس سے گاؤں آ رہا تھا
اور اپنا پرانا گیت گا کر
کھیتوں سے مجھے بُلا رہا تھا
گذرا ہوا وقت ہولے ہولے
افلاک سے واپس آ رہا تھا

پرچھائیاں

ہوائیں سرسراتی جا رہی ہیں سبز وادی میں
نئے سورج کی کرنیں پڑ رہی ہیں کوہساروں پر
پروں کو دھو رہی ہیں ننھی چڑیاں سرد چشموں میں
تھرکتے جا رہے ہیں ہلکے ڈونگے جوئباروں پر
دھوئیں کی پیچ کھاتی دھاریاں بستی پہ چھائی ہیں
حسیں چرواہیاں بکھری ہوئی ہیں مرغزاروں پر
یہ کس نے دل میں چٹکی لی یہ آنسو کیوں اُبل آئے
اُداسی کے دھندلکے چھا گئے سادہ نظاروں پر
ادھر سورج میں چہرے جھلملاتے ہیں حسینوں کے
اُدھر پرچھائیاں منڈلا رہی ہیں کوہساروں پر

بھولی بسری باتیں

ہوا کی مغموم راگنی میں نہاں ہیں وہ بھولی بسری باتیں
کہ جن کی یادوں سے گونجتی ہیں جدائیوں کی اندھیری راتیں
گُلوں کے محزون تبسموں میں وہ ساعتیں خون رو رہی ہیں
کہ جن کے پرتو سے میری تیرہ نصیبیاں مست ہو رہی ہیں
فضا کی موہوم گنگناہٹ میں تیرتی ہیں وہ داستانیں
جنھیں بیاں کرتے وقت آنکھوں میں آ گئی تھیں کئی زبانیں
پہاڑ کے نیلگوں دھندلکوں میں وہ نقشے تھرتھرا رہے ہیں
جو آج بھی دل کی دھڑکنوں میں خمار بن کر سما رہے ہیں
یہ جنگلوں کا سکوت، یہ چاندنی، یہ جھرنوں کا صاف پانی
سنائی دیتی ہے مجھ کو ہر چیز میں وہی دلرُبا کہانی
وہ ڈوبتا چاند جو اُفق پر گھٹا سے دامن بچا رہا ہے
وہی کہانی، وہی کہانی وہی کہانی سُنا رہا ہے
جسے کبھی کہکشاں کے سائے میں سنتے سنتے گذاری راتیں
وہ راتیں جن میں رچی ہوئی ہیں لطیف گھاتیں عمیق باتیں

گاؤں کی شام

دھندلکے پربتوں پر چھا رہے ہیں
اُجالے کے کنول کملا رہے ہیں
گپھاؤں میں کئی بانکے گڈریئے
جوانی کے ترانے گا رہے ہیں
اندھیری کھوہ میں بھیڑوں کے ریوڑ
ٹھٹھر کر ٹھنڈ سے ممیا رہے ہیں

ہواؤں سے پروں کو تھپتھپاتے
پرندے گھونسلوں کو جا رہے ہیں
دھواں سا گاؤں پر پھیلا ہوا ہے
نظر سے کھیت چھپتے جا رہے ہیں
اُفق کے پار تارے اِکا دُکا
اندھیرے سے اُبلتے آ رہے ہیں
معطّر وادیوں کے نرم جھونکے
فرازِ کوہ کو مہکا رہے ہیں
کہیں کوئل دما دم کُوکتی ہے
کہیں ٹڈے بہم چلّا رہے ہیں
وہ لہراتی ہوئی پگڈنڈیوں پر
مسافر سر جھکائے جا رہے ہیں
مسافر! اے نگاہِ بادہ آشام
یہ تجھ پر نشّے سے کیا چھا رہے ہیں
انھیں بے گار میں پکڑا گیا ہے
یہ سب تھانے کی جانب جا رہے ہیں

اِرتقا

لالہ و گُل کی باڑیں اُلانگو　　اور بھی دور جائیں گے ساتھی
اپنے وجدان کو کُند کر لو　　یعنی کانٹے کبھی آئیں گے ساتھی
جگنوؤں کے تعاقب میں کب تک　　تم ستاروں سے رُوٹھے رہو گے
اوس کے موتیوں کو سجا کر　　آبشاروں سے روٹھے رہو گے
کوہساروں کے سینے میں اُترو　　ریگِ ساحل میں سونا نہیں ہے
آدمیّت کو بہلا سکو گے
آدمیّت کھلونا نہیں ہے

نئے معیار

انگاروں پر بوندیں ٹپکیں انگارے پھنکار اٹھے
جیسے تلخ دوا پیتے ہی جھلّاتا بیمار اٹھے
کالے کالے داغوں سے بگڑے پیکر انگاروں کے
جیسے برف پگھلنے پر چہرے جھلکیں کہساروں کے
آخر بوندیں کب تک گرتیں ہوتے ہوتے تھمنے لگیں
انگاروں کی راکھ پہ پتلی نرم تہیں سی جمنے لگیں
جلے بجھے انگاروں کا قصہ پاک ہوا انگاروں کا
آؤ مل کر ذکر کریں جینے کے نئے معیاروں کا

دیئے جلاؤ

دیئے جلاؤ اندھیرے ٹٹولنے والو
دیئے جلاؤ کہ ہر تیرگی پہاڑ نہیں
ستارۂ سحری جھلملا رہا ہے ابھی
ضمیرِ دہر کھنڈر کی طرح اُجاڑ نہیں

اُمید و بیم کی لہروں میں ڈولنے والو
دبی دبی سی کراہوں میں بولنے والو
دیئے جلاؤ اندھیرے ٹٹولنے والو

دیے گم [illegible] کے گرد سحتِ خزاں ہیں جبیں
تو خاک تک میں چمک بس چلے بہاروں کی
تمہارے ذہن میں یوں جگمگا رہے ہیں خیال
برات جیسے ندی میں چلے ستاروں کی

یہی خیال اگر پیکرِ عمل میں ڈھلیں
تو ظلمتوں کے خدا ظلمتوں میں ہاتھ ملیں
دیئے گلاب کی پہنائیِ خزاں میں جلیں

بھور آئی

اندھیارے کا درپن ٹوٹا پورب نے پو برسائی
انگارے کا جھومر پہنے اوشا نے لی انگڑائی
جنگل جھکے، پنچھی چہکے، بہکی بہکی پُروائی

بھور آئی

رُکی رُکی سی، جُھکی جُھکی سی، دُکھی دُکھی سی آشائیں
مچل مچل کے اُچھل اُچھل کے گگن جھروکے چھو آئیں
من میں سپنوں کی پھلواری من ہی من میں اترائی

بھور آئی

دھواں دھار پچھم کی لبستی، دھڑ دھڑ پورب بیس جلے
سورج دیوتا گھات لگائے رات کی دیوی ہاتھ ملے
کرنوں کی گوپی کہرے میں کانپ کانپ کے چلائی
بھور آئی

انفرادیت

وحدتِ ذات میں نہاں وحدتِ کائنات ہے
ورنہ تمام کائنات ایک طویل رات ہے
ذات ہے ولولہ طراز، ذات ہے زندگی نواز

جانِ حیات کون ہے، جانِ حیات ذات ہے
بوند کی تھرتھری سے ہے بحرِ تموّج آشنا
عام سی بات ہے مگر نئی عجیب بات ہے
تیرگیاں، تجلّیاں، محض فریبِ امتیاز
ایک ہی آفتاب جب مبدءِ معجزات ہے
شام کا سرمئی غبار فرصتِ فکر کا نقیب
صبح کا نقرئی نکھار دعوتِ ممکنات ہے

روایت

شفق بجھی تو ستاروں نے روشنی پائی
کسی کی موت کسی کی حیات بنتی ہے
جو میری حسرتِ تعمیر پر ٹپکتے ہیں
ان آنسوؤں سے مری کائنات بنتی ہے
چٹک چٹک کے ہنسی پھول کے کفن میں کلی
بگڑ بگڑ کے اسی طرح بات بنتی ہے
مری پکار چٹانوں میں گونج بن کے بجھی
صنوبروں میں مگر گنگنا اٹھی ہے نسیم
لہو لہو ہے اگر زندگی تو کیا غم ہے
مری شکست بنی سجدہ گاہِ ذوقِ سلیم
اگرچہ گیت محبت کے ناتمام رہے
صدائیں آتی ہیں آفاق سے ندیم ندیم

ندیم

جلال و جمال

(دوسرا مجموعۂ کلام)

نذرِ سالکؔ[1]

تخئیل کے مرمریں دریچے — افکار کے زر فشاں شبستاں
اک ولولۂ حیاتِ تازہ — اک عزمِ قوی کی تیغِ عریاں
اک گھاؤ سا مرہموں سے عاری — اک درد سا، بے نیازِ درماں
بے منتِ بادہ، سرخوشی سی — بے خوفِ جمود، قلبِ سوزاں
اسرار کا قلزمِ کف آلود — احساس کی مشعلِ درخشاں
سنجیدہ و پُر فشاں تفکر — طرار و جمیل و زمزمہ خواں
ملبوسِ فسانہ میں حقائق — الفاظ کے پیرہن میں طوفاں

شعروں میں لطیف سی پھریری
تالاب میں جیسے موج لرزاں

دراصل ندیم کے ترانے — پرتو سے ترے ہیں جلوہ افشاں
یہ ساز یہ سوز یہ تاثر — سب تیرے کرم کے ہیں ثنا خواں
بھٹکی ہوئی عقل کے سہارے! — بہکی ہوئی روح کے نگہباں!
سہمی ہوئی فکر کے مسیحا! — سہمی ہوئی زندگی کے ساماں!

---

[1] مولانا عبدالمجید سالکؔ

اے سالکِ دشت ہائے انجم! — اے رہروِ چرخِ سخن کے قرباں!
فن کارِ ازل کے شہ پارے! — افسانۂ دوستی کے عنواں.
یہ شعر - یہ زندگی کے خاکے — تاریخِ آدم و بیانِ خوباں.

گو زیست سے بھی ہیں یہ گراں تر
پر نذر ہیں تیرے آستاں پر

شعر کا دیوتا

تصوّر کی چُپ چاپ خلوت میں اکثر کوئی شوخ یوں گنگناتا ہے شب بھر
کہ جیسے تھرکتا ہے شفاف جھرنا حسیں سنگ ریزوں کو ہمراہ لے کر
یہ اَن دیکھا محبوب، جانے! مجھے کیسی پگڈنڈیوں پر لیے جا رہا ہے
مجھے ہر قدم پر، چھوتے خیالات کا اک دفینہ دیے جا رہا ہے
ستارے مرے پاؤں میں لوٹتے ہیں، تو پھولوں کی بارش سی ہوتی ہے سر پر
کبھی عرش کی وسعتوں پر قدم ہے، کبھی پھیل جاتے ہیں پردے نظر پر
کبھی دل کی دھڑکن میں موہوم سایوں کی جھنکن چھناکے سے کرتی ہے پیدا
کبھی ان چھنکوں کی افسوں طرازی رگوں میں دھماکے سے کرتی ہے پیدا
کبھی زلف و رُخ کی حکایت میں غلطاں، کبھی اتنوں کے مقدر پہ نالاں
سرور و طرب میں بھی رہتا ہوں گریاں، وفورِ الم میں بھی ہوتا ہوں خنداں
کبھی نرم کرنوں میں شبنم کے موتی پروتے ہوئے مسکراتی ہیں آنکھیں
اُفق پر کبھی دیکھ کر زرد تاروں کو بجھتے ہوئے ڈبڈباتی ہیں آنکھیں
کبھی زندگی کو حقیقت سمجھ کر اُلجھتا ہوں تو لون کی رفعتوں سے
کبھی دیکھتا ہوں حقیقت کا دامن لپٹتا ہوا وقت کی گردشوں سے
کبھی ایک ذرّے میں لاکھوں زمینیں، کبھی ایک پل میں کروڑوں زمانے
میں کیا ہوں، کہاں کا ارادہ ہے میرا، مجھے کون سمجھے، مجھے کون جانے
الٰہی! خیالوں کے خلوت کدے میں کوئی شعبدہ باز سا آگیا ہے
وہ پردے ہٹے۔ وہ کوئی مسکرایا — مجھے ہو بہو تو نظر آ رہا ہے

(۱۹۴۱-۶-۱۹)

اُمید کی کرن

ہو گئی عیش گاہ جب سنسان　　نظر آنے لگا جہاں حیران
سیج پر گُل پڑے تھے مَسلے ہوئے　　جیسے گالوں پہ خون کے قطرے
فرش پر ڈھیر تھا پتنگوں کا　　دھبّا اِک ملگجے سے رنگوں کا
زرد لَو پڑ رہی تھی شمع کی لَو　　حُسن پر جیسے موت کا پَرتو
اونچے محراب، سرد اور خموش　　جیسے اک زاہدِ کفن بردوش

شمع جب ہولے ہولے بجھنے لگی
میرے احساس نے پھریری لی

کل اسی عیش گاہ کے اندر　　نظر آئے گا پھر وہی منظر
رقص ہوں گے سرود کی دُھن پر　　عشق سونگھے گا پھول چُن چُن کر
لوگ بے فکر گیت گائیں گے　　موت پر پھبتیاں اُڑائیں گے
باہیں باہوں میں پھنس کے جھومیں گی　　نظریں نظروں کے تیر چومیں گی
بکھرے گی بازوؤں پہ زلفِ دراز　　جھوٹے پندار کے کھلیں گے راز

ریشمی پردے سرسرائیں گے
لوگ تھک تھک کے اٹھتے جائیں گے

اختلافات ہیں جہاں کی اساس　　اس کو یک رنگیاں نہیں ہیں راس
رات جس دم جماہی لیتی ہے　　دن کی آہٹ سنائی دیتی ہے
ٹوٹتا ہے جوں ہی کوئی ڈنٹھل　　پھوٹ پڑتی ہے اک نئی کونپل
میں نے تن من کسی پہ وار دیا　　دل سے بارِ خودی اُتار دیا
کھو کے سب کچھ اُسے بھی کھو بیٹھا　　یعنی وہ دوسروں کا ہو بیٹھا

لیکن احساس مجھ سے کہتا ہے
وقت رستہ بدلتا رہتا ہے

(۳۰ ۱۹ء)

ازلی مسرتوں کی ازلی منزل

مٹیالے مٹیالے بادل گھوم رہے ہیں میدانوں کے پھیلاؤ پر
دریا کی دیوانی لہریں ہمک ہمک کر ہنس دیتی ہیں اک ناؤ پر
سامنے اودے اودے پربت کی موہوم بلندی پر ہے ایک شوالا
جس کے کلس کی تابانی سے پھیل رہا ہے ہر سو ایک عجیب اُجالا
ٹم ٹم کرتی اک مشعل سے محرابوں کے گہرے سائے رقصیدہ ہیں
ہر سو پریاں ناچ رہی ہیں، جن کے عارض رخشاں نظریں دزدیدہ ہیں
عنبر اور لوبان کی لہریں دوشیزہ کی زلفوں کے سے بل کھاتی ہیں
چاندی کے ناقوس کی تانیں، دھندلے دھندلے نظاروں میں گھل جاتی ہیں
ہاتھ بڑھائے سر نیہوڑائے، سایوں کا اک جھرمٹ پیہم جھوم رہا ہے
پوجا میں بے خود سا ہو کر مندر کے گوشے گوشے کو چوم رہا ہے
ایک بہت پتلی پگڈنڈی ساحلِ دریا سے مندر تک کانپ رہی ہے
ناؤ چلانے والی لڑکی چپو کو ماتھے سے لگائے، ہانپ رہی ہے
دیوانی کو کون بتائے، اس مندر کی دھن میں سب تھک ہار گئے ہیں
سائے بن کر گھوم رہے ہیں، جو بے باک چلانے والے پار گئے ہیں
وہ جب ناؤ سے اُترے گی مٹیالے مٹیالے بادل گھر آئیں گے
میدانوں پر، کہساروں پر، دریاؤں پر، ناؤ پر، سب پر چھا جائیں گے
اوّل تو پگڈنڈی کھو کر گر جائے گی کالے غاروں میں بے چاری
بچ نکلی تو ہو جائے گی اس کے نازک دل پر اک ہیبت سی طاری
ہوش میں آئی تو رگ رگ پر ایک نشہ سلبِ ہوشی کا چھایا ہو گا
جسم کے بدلے اس مندر میں ایک لجیلا اک لچکیلا سایا ہو گا

(۱۹۳۰ء)

عزم

اُڑ گئی روح کے آئینے سے گردِ تقلید
ناخدا اب مری کشتی کا کوئی غیر نہیں
ذرّے ذرّے میں نظر آتا ہے معبد مجھ کو
میرے ایماں کو جنونِ حرم و دیر نہیں

رخشِ احساس کی ہے باگ مرے ہاتھوں میں
اب کوئی میرے خیالوں کو نہیں بھٹکاتا
نام دیتی ہے غلامی کا جسے یہ دنیا
میرے جذبات پہ وہ بھوت نہیں منڈلاتا

کائنات ایک کھلونا ہے مری نظروں میں
جی میں جس طرح بھی آئے گی گھماؤں گا اسے
اس میں گوندھے ہوئے جوہر کو پرکھنے کے لیے
گاہ توڑوں گا اُسے، گاہ بناؤں گا اُسے

میری قیمت کو بچائے گا ارادہ میرا
میرے پنجے میں سمٹ آئیں گی سب تقدیریں
گل کے بن جائیں گی حریتِ عالم کا حصار
بازوئے دہر سے لپٹی ہوئی یہ زنجیریں

منجمد قلب سے لپکیں گے بھڑکتے شعلے
اور جل جائے گا اقدار کا فرسودہ نظام
خاک بوسوں کو اُچھالوں گا فلک کی جانب
محو کر دے گا ستاروں کو بھی انساں کا مقام

(۱۹۳۱ء)

عرفاں

مسافر

مہیب رات ہے تاریکیاں ہیں چھائی ہوئی
تجلّیات کو ہے آج نیند آئی ہوئی

فضائے تیرہ میں جب بجلیاں کڑکتی ہیں
قریب و دور سے پرچھائیاں لپکتی ہیں

دل و دماغ کو پیہم مسل رہا ہے کوئی
مرے خیال کے صحرا میں چل رہا ہے کوئی

میں اک غریب مسافر ہوں کوئی رہ دکھائے
مجھے قریب کی آبادیوں میں پہنچا آئے

آواز

یہ امتحاں ہے ترا ہر قدم سنبھل کے اُٹھا
شروعِ عشق کی ان الجھنوں میں ڈوب نہ جا

ترے خیال کی منزل ابھی قریب نہیں
تو تہمات میں پنہاں ترا حبیب نہیں

دل و دماغ کی واماندگی ہے خوف و ہراس
نہیں جنوں کے نہنگوں کو احتیاجِ لباس

اگر یہ مرحلۂ سخت تیرے بس کا نہیں
تو تیرا ولولۂ شوق ایک خس کا نہیں

مسافر

الم نصیب مسافر سے اجتناب نہ کر
مجھے خدا کے لیے وقفِ احتساب نہ کر

لگا نہ ٹھیس تمنّائے بازیابی کو
پلا نہ زہر کے جرعات اس شرابی کو

اگر پہنچ نہ سکا میں حریمِ جاناں میں
بگولہ بن کے بھٹک جاؤں گا بیاباں میں

مگر یہ تیرگیاں راستے میں حائل ہیں
یہاں شعور کے کتنے الگ مسائل ہیں

آواز

نہیں ہے پختہ ابھی خواہشِ وصال تری
جھجک رہی ہے نگارِ بلند بال تری

ترے اُفق پہ ستارہ نہ کوئی چمکے گا
کوئی چراغ نہ ان ظلمتوں میں دمکے گا

اسی تلاش میں کٹ جائے گی حیات تری
انھیں خطوط پہ گھومے گی کائنات تری

تجھے جہان میں جب کچھ نظر نہ آئے گا　　　ترا حبیب ترے دل میں مسکرائے گا

(۱۹۴۱ء)

بے قراریاں

دل میں جب بے کلی نہیں رہتی　　　زندگی، زندگی نہیں رہتی
زندگی شاہراہِ پُر خم ہے　　　زندگی اضطراب پیہم ہے

رعشۂ برق ہے حیات کا نام
بے مقامی ہے کائنات کا نام

کتنی خاموش ہے فضائے جہاں　　　نیند میں کھو گئے ہیں کون و مکاں
نیم کی پتلی ڈالیاں خاموش　　　گاؤں کی گانے والیاں خاموش

سُونی گلیاں اُجاڑ سی چوپال
زندگی کی جبیں پہ گردِ ملال

رقص کر اے دلِ خیال آلود　　　یہ تری قیل و قال ہے بے سود
یوں دھڑک، دو جہاں مچل جائیں　　　آسماں محوروں سے ٹل جائیں

کہکشاں ایک جھولا بن جائے
کائنات اک بگولا بن جائے

(۱۹۴۲ء)

تذبذب

کسی کو مل نہ سکی بارگاہِ ناز تری　　　مگر ازل سے اُسی کی تلاش جاری ہے
مرے خیال میں یہ تو ہے تیرے جلووں کا　　　وہ اک خمار سا جو آگہی پہ طاری ہے
فقیہہ شہر کا اصرار ہے کہ یہ مستی　　　فقط فسردہ خیالی کی سحر کاری ہے

مری نگاہ میں لیکن وہ "کانِ عرفاں" بھی
گہر بدست سہی، روشنی سے عاری ہے

اگر نجوم میں تو ہے، تو چاند میں ہے کون؟ — ترے جمال کی تقسیم ہو نہیں سکتی
ازل ابد کا تصور، فقط تصور ہے — ترے وجود کی تقویم ہو نہیں سکتی
حرم میں تو ہے تو آخر کنشت میں ہے کون — کہ ایک ذات تو دو نیم ہو نہیں سکتی

جو قوتیں ہیں تری منتشر، تو سچ کہہ دوں
کہ اس جہان کی تنظیم ہو نہیں سکتی

اندھیرے غاروں میں اوہام لے گئے مجھ کو — نکل گئے مرے کافر تصورات کہاں
خدا : کیا ہے، سمجھ لے جسے حقیر دراک — کہاں خرد کی اُڑانیں حریمِ ذات کہاں
تو ذرے ذرے میں ہے اور کہیں نہیں ملتا — ترے وجود پہ قیدِ تعینات کہاں

کہاں وہ زندہ و پایندہ حُسنِ لا محدود
مرے خیال کے دُھندلے تاثرات کہاں

تجھے سمجھنے کی سب کوششیں ہیں بے معنی — کہ میں ندیم کو بھی آج تک نہ جان سکا
فضول سا ہے یہاں تذکرہ حکیموں کا — کہ اپنی روح کا کہنا بھی میں نہ مان سکا
جنوں ہے عرصۂ کون و مکاں کی سیاحی — کہ میں تو قلب کا ویرانہ تک نہ چھان سکا

مری حیات کی بنیاد ہے تذبذب پر
ہزار چاہا مگر جی میں کچھ نہ ٹھان سکا

(۱۹۴۲ء)

پچورنگی

(۱)

جس نے بھی دیکھا ہے ناچار پکار اُٹھا ہے — "کاش اک بار۔ پھر اک بار ادھر سے آئے"
ہو گئے چار طرف شوخ نگاہوں کے ہجوم — میں تو حیراں ہوں۔ وہ آئے تو کدھر سے آئے

لاج کی ماری لگی جاتی ہے دیوار کے ساتھ — کیا کرے حسن کا تقاضا ہے کہ شرما کے چلو
انگلیاں تک نظر آئیں نہ کسی راہی کو — کالے کھدر کے دوپٹے کو نہ لہرا کے چلو

(۲)

جس نے بھی دیکھا ہے ناچار پکار اٹھا ہے
"اُف یہ بے باک نگاہی یہ بھبھوکا چہرہ

کس کی آنکھوں پہ یہ زلفوں کی گھٹا چھائے گی
کس کی قسمت میں ہے یہ لامتناہی پہرا"

یوں چلی جاتی ہے جیسے کوئی آوارہ غزال
جس کو صحراؤں کی پہنائیاں ہلا نہ سکیں

یوں اٹھاتی ہے قدم، جیسے کوئی شہزادی
جس کو ایوانوں کی رعنائیاں بہلا نہ سکیں

(۳)

جس نے بھی دیکھا ہے ناچار پکار اٹھا ہے
"مضمحل کیوں نظر آتی ہے یہ سیلابِ شرست!

پاؤں اٹھتے ہیں کہ چکراتی ہے دُنیائے جہاں
بال اڑتے ہیں کہ جلتا ہے جوانی کا بہشت!"

آج ان آنکھوں میں وہ شعلۂ جوالا نہیں
جس نے بے مایہ چراغوں کو اُبھرنے نہ دیا

ناخدائی کا وہ انداز نہیں، جس نے ہمیں
عین طوفان میں بھی ساحل پہ اُترنے نہ دیا

(۴)

اب کے جو دیکھے وہ انگشت بدنداں ہو جائے
میں مگر کب سے سمجھتا ہوں معمائے حیات

حسن اگر رنگ نہ بدلے تو جوانی مٹ جائے
دن کو دن کون کہے دن کو جو حاصل ہو ثبات

بھوسلے بالوں کو چادر میں چھپاتی خاتون
کاش تجھ کو بھی اِن اسرار کا عرفان ہوتا

تو اگر جانتی فطرت کے کھلونے ہیں ہم
اپنے ماضی پہ ترا قلب نہ گریاں ہوتا

نوعِ انساں کوششوں سے اُبھارا نہ گیا
بس یہی نقشِ مشیت سے سنوارا نہ گیا

(۶-۱۹۴۳)

دھڑکن

جیسے طوفاں کا پُر جوش [illegible] ہو
ذرّوں سے اُگ رہا ہو

پھر ابر اُفق پہ کڑکے
پھر تند یہ مشیت دھڑکے

پھر روحوں کے ایوانوں میں جھانجن کی جھن جھن گونجی
چھاگل کی چھن چھن گونجی
پائل کا کلیجہ پھڑکا　　پھر قلبِ مشیت دھڑکا

اُمیدوں کے چپ چاپ اُفق پر ہنستا گاتا آیا
تیروں کو سجاتا آیا
یونان کا اندھا لڑکا　　پھر قلبِ مشیت دھڑکا

سنگیں پیکر آئینہ گردوں کے محلوں سے ٹکرائے
آئینہ گر چلائے
اور سنگ سے شعلہ بھڑکا　　پھر قلبِ مشیت دھڑکا

اُن دیکھے اَن جانے ہاتھوں نے رات کا پردہ نوچا
ظلمت کا گلا دبوچا
پورب کا دریچہ کھڑکا　　پھر قلبِ مشیت دھڑکا

(۱۹۴۳ء)

یوٹوپیا[1]

میں نے جس دَور کی تصویر دکھائی ہے تجھے
وہ ابھی وقت کے پردوں میں ہے پابندِ جمود
ابھی یخ بستہ فضاؤں میں ہے وہ پارۂ عود
ابھی خاکسترِ ماضی میں نہاں ہے وہ گہر
ابھی دوزخ ہے تصوّر کا، وہ فردوسِ نظر
ابھی انگڑائی سے عاری ہے وہ حسنِ مدہوش
ابھی اس بحر کو معلوم نہیں لطفِ خروش

[1] UTOPIA - ایک مکمل مثالی سیاسی اور تمدنی نظام

ابھی اس لَو سے فروزاں ہے فقط میرا دماغ
ابھی اس نور سے ملتا نہیں ساحل کا سُراغ
میں نے جس دَور کی تصویر دکھائی ہے تجھے
وہ تری شعلہ مزاجی سے جلا پائے گا
تیرے انفاس کے جھونکوں سے نکھر جائے گا
بحرِ ذخّار سے اُلجھے گا ترا عزمِ صمیم
کہ ابھی دور ہے آزاد روی کی اقلیم
یہ سفر حرّیتِ قلب و نظر چاہے گا
شیر کا حوصلہ، شاہیں کا جگر چاہے گا
میرے اشعار کی محتاج نہیں اس کی نمود
تیری یلغار ہے اس عقدۂ مشکل کی کشود
میں نے ہلکی سی جھلک جس کی دکھائی ہے تجھے

(۱۹۴۳ء)

پرتوِ آرزو

اعترافِ شکست ممکن ہے
لیکن اسرار فاش ہوتے ہیں
مل ہی جائے گی منزلِ مقصود
ہم تو محوِ تلاش ہوتے ہیں

راہ ناپید۔ راہبر حیران
کارواں تشنہ لب۔ شکستہ دماغ
زیست آلام سے عبارت ہے
آندھیوں میں بھڑک اٹھیں گے چراغ

دور تک کپکپا رہے ہیں سراب
بھاپ سی اُٹھ رہی ہے ٹیلوں سے
عشق کی پیاس بجھ نہیں سکتی
باغِ جنّت کی سلسبیلوں سے

ان دہکتی ہوئی فضاؤں میں
ایک پرچھائیں سی ہے رقص کناں
جس کی پازیب کے چھناکے پر
ہے ازل سے نظامِ دہر رواں

سُست انگڑائیوں کا ایک ہجوم　　باہوں کے لوچ میں کنول کا بل
پُتلیوں میں دیے سے جلتے ہیں　　لانبی پلکوں کی اوٹ میں کاجل

گاہ تیزی سے یوں لپکتی ہوئی　　جیسے ارجن کا سرسراتا تیر
گاہ یوں رُک کے پیچ کھاتی ہوئی　　جیسے دم توڑتا ہوا نخچیر

یہ مری آرزو کا پَرتو ہے　　میرے اوہام کا غبار نہیں
یہ وہی لَو ہے شمعِ ہستی کی　　جس کی تقدیر میں قرار نہیں

میں تھکن سے نڈھال ہوں لیکن
کیوں ادھورا رہے سفر میرا
تب کروں گا میں اعترافِ شکست
موت جب تھام لے گی سر میرا

(۱۹۴۳ء)

کروٹیں

کتنے ادوار سے گذرا ہے شباب　　عشق، امید، تذبذب، انجام
ذرے ذرے میں خیالی فردوس　　یعنی ہر گام پہ اوہام کے دام
ایک مرکز پہ دھڑکتی تھی حیات　　"دست بر سینہ، نظر بر لبِ بام"
مجھ کو محسوس ہوا کرتا تھا　　اپنے اشکوں میں ستاروں کا خرام
مضمحل سوچ میں لپٹی ہوئی صبح
دل رُبا فکر میں ڈوبی ہوئی شام

گنگناتے ہوئے جھرنے کے قریب　　کسمساتا ہوا اک پیکرِ نور
وہ شفق رنگ لبوں کی لرزش　　جیسے موسیٰ کے خیالوں میں طور
رُخ پہ گیسوئے طلائی کی وہ لٹ　　جیسے آکاش کے رمنوں میں حور

سمٹی باہوں میں لپٹنے کی اُمنگ　　　جیسے کلیوں میں چٹکنے کا شعور
مسکراہٹ میں محبت کی کسک
تلملاہٹ میں جوانی کا غرور

میں نے اس عالمِ مدہوشی میں　　　منجمد وقت کا دھارا دیکھا
جب کبھی غور کیا دنیا پر　　　ایک آوارہ ستارا دیکھا
میں نے آفاق کی پہنائی میں　　　حُسن کو انجمن آرا دیکھا
اس قدر تند تھا سیلابِ شباب　　　نہ سفینہ نہ کنارا دیکھا
ایک دن حُسن سے نظریں جو ملیں
قلبِ ہستی کو دو پارہ دیکھا

اک طرف رقص کی بجلی چمکی　　　اک طرف آہ کا شعلہ بھڑکا
اک طرف تھاپ پڑی طبلے پر　　　اک طرف بھوک کا بادل کڑکا
زلفیں لہرائیں ۔ ہوائیں مہکیں　　　ہونٹ تھرائے ۔ کلیجہ بھڑکا
بھاؤ کچھ اور چڑھے ۔ مے چھلکی　　　فصلیں تیار ہوئیں ۔ دل دھڑکا
سانس لیتا رہا پھر بھی انساں
اندھی فطرت کا مجاہد لڑکا

شاعری حسنِ بیاں تک محدود　　　فلسفہ ہرزہ سرائی کا شکار
سرفروشوں پہ سلاسل کی گرفت　　　سورماؤں پہ سیاست کا غبار
نوجوانوں کے ارادے بے رنگ　　　جیسے صحراؤں شہیدوں کے مزار
غم کی ماری ہوئی دوشیزائیں　　　شب کے سناٹے میں جیسے گلزار
زندگی، غیر مسلسل مستی
موت کا خوف مسلسل آزار

نہ تدبر سے مقدر کو غرض　　　نہ مشیت سے مرا یارانہ
مجھ پہ ابلیس نے ڈورے ڈالے　　　مجھ سے یزداں بھی رہا بیگانہ
کب تک احساس کو محصور رکھے　　　خشک اسرار کا تانا بانا

کہکشاں اب ہے مری منزلِ شوق   کہ بہت چھان لیا ویرانہ
مصلحت یہ ہے کہ تخلیق کروں
نئے مے نوش، نیا مے خانہ

مژدہ اے عالمِ نو کے خوابو!   مائلِ خیر ہے انساں کا شرف
کچھ خطا اس میں کمانوں کی نہیں   میرے تیروں سے گریزاں تھا ہدف
دل کی دھڑکن وہ نشیبوں سے اٹھی   محوِ پرواز ہے تاروں کی طرف
حدتِ حبس سے زنداں ٹوٹا   اپنے موتی کو اچھالے گا صدف
گردشِ چرخ خبردار رہے
اب مرا عزم ہے تقدیر بہ کف

(۳۱۹۴۳ء)

واپسی

اپنے افکار کی گستاخ اڑانوں کے طفیل   بارہا دیکھے ہیں تاروں کے نشیمن میں نے
جن کو حوروں نے مہ و مہر کی کرنوں سے بُنا   اپنے اشکوں سے بھگوئے ہیں وہ دامن میں نے
اپنی نظروں کو مئے عشق سے صیقل کر کے   کر دیے گنبدِ گردوں میں بھی روزن میں نے
ٹمٹمانے لگے ایوانِ مشیت کے چراغ   جب کیا روح کے فانوس کو روشن میں نے
لیکن افسوس۔ ان اسرار کے سلجھانے سے
اور الجھائی ہے تقدیر کی الجھن میں نے

فرش کے راز بھلا عرش پہ کیسے کھلتے   درحقیقت مری پرواز تن آسانی تھی
خاک سے جانبِ افلاک اچھالا جس نے   وہ پراگندہ خیالوں کی پریشانی تھی
پھڑ پھڑاہٹ مرے شہپر کی جسے تو سمجھا   میری افسردہ امیدوں کی پرافشانی تھی
میں جسے دیکھ کے پھر سوئے زمیں لوٹ آیا   آئینہ خانۂ فردوس کی حیرانی تھی
پس گئیں جس میں تخیل کی کئی دنیائیں
چرخ پر بھی اسی چکر کی ستم رانی تھی

ان پُر اسرار خلاؤں میں ہے اُڑنا بے کار — جن کے پیچھے ہے وہی کہنہ و فرسودہ نظام
وہی ہنگامۂ تغئیر، وہی قیدِ شکست — صبح کے دوش پہ اکھڑے ہوئے تاروں کا خیام
وہی یزداں، وہی مجبور ہیولوں کے سجود — وہی ایمان کے لالچ میں درود اور سلام
وہی پابندیٔ پیہم، وہی زندانِ بہشت — وہی بجلی، وہی خرمن، وہی دانہ، وہی دام

میں تو کہتا ہوں کہ لازم نہیں دنیا سے گریز
جب کسی چیز کو حاصل نہیں عالم میں دوام

چشمِ بینا میں یہ سیارۂ رقصاں میرا — عرش کے معبدِ خاموش کو شرماتا ہے
جھرنے بن جاتے ہیں باریک گلابی ڈورے — مہر جب چھپی غاروں میں پھسل جاتا ہے
بحر میں، بن میں، پہاڑوں میں برستے ہیں گلاب — جب نئی صبح کا سیلاب اُمڈ آتا ہے
کارخانوں سے اُبلتا ہوا پُر پیچ دھواں — فتنۂ شہر کو انگڑائی پہ اُکساتا ہے

سبز کھیتوں کی لہکتی ہوئی ہریاول سے
قلبِ دوشیزۂ صحرا کئی بل کھاتا ہے

کتنے ہنگاموں کا مرکز ہے مری بزمِ حسیں — کتنی مستی سے ہے لبریز مرا ساغرِ زر
کتنے دل لذتِ نظارہ سے کانپ اُٹھتے ہیں — کپکپاتی ہوئی چلمن کا اشارہ پا کر
کتنی پلکوں پہ چمکتے ہیں وہ لرزاں تارے — جو ٹپکتے ہیں تمناؤں کی خاکستر پر
کتنے راہی ہیں پُراسرار سی راہوں پہ رواں — جو نہیں جانتے خود بھی کہ روانہ ہیں کدھر

کتنی شمعیں ہیں جو اُجڑے ہوئے محلوں میں جلیں
کتنے گھر چشمکِ انجم کے رہے دست نگر

سرِ کہسار سسکتا ہوا کمزور سا چاند — میری دنیا سے بچھڑتے ہوئے گھبراتا ہے
جانتا ہے کہ وہ مبہوت فرشتوں کا حرم — ان نشیبوں کی بلندی پہ چلا جاتا ہے
اب بھی کرنوں کے سہارے سے کوئی پیکرِ نور — عرش سے وادیٔ سینا میں اُتر آتا ہے
اب بھی جبریل، ستاروں کے اُٹھا کر پردے — بحر و بر پر شبِ خاموش میں منڈلاتا ہے

اب بھی افلاک پہ دہکا ہوا گلزارِ جناں
خاک سے آنکھ ملاتے ہوئے شرماتا ہے

جس نے قطرے میں بھی سیلاب کی جھنکار سنی　　میں نے ذرّے کے دہن میں بھی زباں دیکھی ہے
جس حقیقت سے مہ و مہر بھی بیگانہ رہے　　دھندلے دھندلے سے دریچوں میں عیاں دیکھی ہے
وہ تڑپ جس کا ستاروں نے کیا تھا دعویٰ　　ننھے سے پھول کے ریشوں میں رواں دیکھی ہے
جس تجلی سے عبارت ہیں اڑانیں میری　　اپنے احساس کے غنچے میں نہاں دیکھی ہے

منحصر ہے مری دنیا پہ نظامِ کونین
میں نے یزداں کی بھی چشمِ نگراں دیکھی ہے

(۱۹۴۳ء)

ثبوت

دم بخود رات، منتظر تارے　　کائنات ایک خواب ایک خیال
پتلے جھرنے کا سرمئی پانی　　اک حقیقت، مگر فریب مآل

نیم افسردہ نسیم کی ٹہنی　　قوس بن کر تنے کو چومتی ہے
ایک بھٹکی ہوئی پریشاں چیل　　پیچ کھا کر فضا میں گھومتی ہے

گھاس میں اوس کی گھلاوٹ ہے　　نرمیاں، خنکیوں کے بس میں ہیں
پتی ڈرتی ہے، قطرہ ناچتا ہے　　یہ چمن کی قدیم رسمیں ہیں

ناگہاں کہکشاں کماں بن کر　　تن گئی — دیر تک تنی ہی رہی
ایک انگڑائی سی بنی، لیکن　　ایک انگڑائی سی بنی ہی رہی

کتنی شدت ہے اس تناؤ میں　　اُف وہ انگڑائی جو نہ ٹوٹ سکے
انتظار! انتظار! سناٹا!　　ہائے وہ تیر جو نہ چھوٹ سکے

آسمانوں میں اور زمینوں پہ　　زندگی تھم گئی، کہ تیر چلا
اور پھر کو پھٹے ستاروں کا　　آخری مضمحل سفیر چلا

وقت کو تیر ہی نہیں ملتا　　یا ہدف کا کہیں وجود نہیں
ورنہ یہ ہمہمہ ـــ یہ خاموشی!　　ایک ہنگامہ ہے سرود نہیں

اور کچھ غور کر ستارہ نشیں!　　اس گہر کو ابھی کچھ اور تراش
اس کے اک رخ میں سرسراتی ہوئی　　نظر آتی ہے بے بسی کی خراش

بے بسی؟ ـ بے بسی؟ ـــ پتہ بخدا
آسماں بج اُٹھے ـــ "توانگ توانگ"
پوربی دائرے سے تیر چلا
تیرگی نے بھری سنہری مانگ

(۱۹۴۴ء)

وحدت

دائرہ ایک ہے، انجام بھی، آغاز بھی ایک
دشتِ ناپید کنار
ایک ہی راہ گذار
ذوقِ پرواز بھی، پرواز کا انداز بھی ایک

یہ ہوائیں، یہ فضائیں، یہ خلائیں، یہ فلک
یہ مہ و مہر کے داغ
یہ عناصر کے چراغ
ان کی نبضوں سے ہم آہنگ ہے کلیوں کی چٹک

ایک زنجیر میں مربوط ہیں کتنی کڑیاں
چاند آیا لبِ بام
دیکھ موجوں کا خرام
کرنیں لہراتی ہیں سیپوں کی منوّر لڑیاں

رنگ اور نسل کی اُلجھن میں بھٹک جاتے ہیں
یہ فقیہوں کے امام
یہ رواجوں کے غلام
مردہ تہذیب کے حجروں میں سکوں پاتے ہیں

اس طرف دعویٔ آزادیٔ نوعِ انساں
اس طرف سوچ بچار
اپنے دعووں سے فرار
ایک پھنکارِ سخاوت کا ابھی وقت کہاں

امتیازات نے وحدت کا دبوچا ہے گلا
تارے ٹکرانے لگے
زلزلے آنے لگے
وہ مشیت کی کماں تن کے بجی ـــــ تیر چلا

(۱۹۴۴ء)

شرمیلا فن کار

سیپیاں چنتے ہیں ساحل سے کھلنڈرے بچے
ریت کے نرم گھروندوں میں سجاتے ہیں انھیں
شام جب آتی ہے سمٹی ہوئی، سنولائی ہوئی
گھر کو بھاگ اٹھتے ہیں، چننے نہیں پاتے ہیں انھیں

ہاں اگر چاند کے انوار سے رخشاں ہو زمیں
کھیل بچوں کے ذرا طول پکڑ جاتے ہیں
لیکن اک لمحہ بھلا وقت سے کیسے اُلجھے!
چاند چھپ جاتا ہے ظلمات اُمڈ آتے ہیں

دن ڈھلے پھر سرِ ساحل نظر آتے ہیں ہجوم
سیپیاں چنتے ہوئے ریت پہ منڈلاتے ہوئے
پھر وہی شام، وہی چاند، وہی تاریکی
پھر وہی سائے سے آفاق پہ لہراتے ہوئے

یہ اگر تیری مشیّت ہے تو خالقِ بد بین
یا تو روشن ہی رہے تیرا فلک میری زمیں

اب تو اس رسم میں پہلو کوئی جدّت کا نکال
یا تری رحمتیں بنتی رہیں ظلمات کے جال

ساحلِ زیست پہ بکھری ہوئی اُمید کی ریت
اور پھر موت ــ یہ سنولائی ہوئی شام ــ یہ رات

اور دمکتی ہوئی یہ سیپیاں ارمانوں کی
اور یہ قبریں ترے محبوبوں کی ــ انسانوں کی

ایک لمحے کے لیے چاند چمکتا ہے اگر
یہ اس انساں کے یقینوں کی قلابازی ہے

تو یہ اک لمحہ تری دین نہیں ہو سکتا
اپنی مرضی سے جو ظلمت میں نہیں کھو سکتا

تیرا مذہب، ترا قانون، ترے رسم و رواج
تو اگر حسن ہے، رحمت ہے، کرم ہے یا رب

یہ دل آویز شکنجے ترے مظہر تو نہیں؟
تو ترے ہاتھ میں سونے کا یہ خنجر تو نہیں؟

تیری وحدت تو مسلّم ہے مگر یہ ظلمات
دوسرا کون ہے خلّاق پسِ پردۂ چرخ

کس نے تخلیق کیے ہیں تری دنیا کے لیے؟
تو اگر "حال" میں ہے، کون ہے "فردا" کے لیے؟

اصطلاحات کے پردوں سے نکل آ، ورنہ
ابنِ آدم کے لپکتے ہوئے پنجوں سے نہ ڈر
سامنے آ کے نئے نقش بنا ــ رنگ جما
اپنے فن سے کبھی فن کار بھی کرتا ہے حذر!

(۱۹۴۴ء)

ستارے

چمک چمک کے تھکے، ٹمٹمائے گھبرائے
سحر کے نرم اُجالوں میں ڈوب ڈوب چلے
چھپے، جھلک سی دکھائی، بجھے، تمام ہوئے
نہ جانے کون سی دنیا میں محوِ خواب رہے
اُفق کے پاس کہ اس بے کراں خلا سے پرے

غروبِ مہر کی پرچھائیاں بکھرنے پر
یہ پھر فضاؤں میں اڑنے لگے شرر بن کر
وہی تڑپ، وہی شوخی، وہی درازیِ سفر
وہی چمکتے پروں سے طوافِ قرصِ قمر
وہی افق کے دریچوں سے انتظارِ سحر

حیات و موت کے ان دائروں کی زنجیریں
نہ جانے کون سے اسرار کی ہیں تفسیریں
ادھر دماغ میں ہیں چرخ گیر تدبیریں
ادھر ہیں گھات میں تدبیر سوز تقدیریں
ہیں اک سراب سراپا عمل کی تاثیریں

یہ کھیل ہے، تو کھلاڑی! تری دہائی ہے
اگر یہی ہے خدائی، تو کیا خدائی ہے
یہ کبریائی نہیں ہے، یہ کج ادائی ہے
اگر حیات ترے ہاتھ کی صفائی ہے
تو پھر یہ شب کی دلہن، موت کیوں بنائی ہے

ستارو۔ ٹوٹ پڑو، بج اٹھو، بکھر جاؤ
بھٹک بھٹک کے جہنم خلا میں بھڑکاؤ
کبھی زحل، کبھی مریخ کی خبر لاؤ
یہاں سے سن سے اڑو، ٹھن سے کسی سے ٹکراؤ
فنا کے گیت تباہی کے ساز پر گاؤ

ازل سے لے کے ابد تک یہی نظام رہا
تو جان لو کہ تڑپنا تمھارا خام رہا
اگر حیات کا افسانہ ناتمام رہا
اگر ہمیشہ انھیں گردشوں سے کام رہا
تو کس کا نام رہا اور کسے دوام رہا

(۱۹۴۳ء)

احساس و ادراک

یہ گھنا جنگل، یہ خاموشی کی پُراسرار لے		اس اندھیرے میں یہ پوشیدہ مغنّی کون ہے
جو سکوت افزا ترنم سے کیا کرتا ہے طے
ہر دیارِ کائنات

اس کے آہنگِ مسلسل میں فرشتوں کی اُڑان		اس کے سرگم میں نہاں دشتِ مشیّت کی اٹھان
روح میں یوں پیچ و خم کھاتی ہے اس کا فر کی تان
جیسے اسرارِ حیات

سانس ہے اس کی، کہ بہتی ہے شراب لالہ فام		اس کی کروٹ ہے کہ لرزاں ہے دو عالم کا نظام
لمس ہے اس کا، کہ خود یزداں ہے مصروفِ کلام
در بیانِ ممکنات

آگہی کہتی ہے۔ اس راہِ سرور آگیں پہ چل		شوق کہتا ہے۔ خیالوں کے زنداں سے نکل
حکمِ شاہی ہے کہ اک نقطے پہ جم جا سر کے بل
کھو کے امکانِ حیات

لیکن اک آواز۔ خاموشی سے جو موسوم ہے		(جس کا منبع یا تو خود قدرت ہے یا معدوم ہے)
"تو اگر انساں ہے، ہر ذرّہ ترا محکوم ہے
اے قتیلِ حادثات"

یک بیک ہیجان سا آتا ہے ہفت افلاک میں		کلبلاتے ہیں کئی مریخ بطنِ خاک میں
دہر گھر جاتا ہے اس ناقوس کے پیچاک میں
آگہی کھاتی ہے مات

(۱۹۴۵ء)

پرواز کے بعد

دھواں دھواں ہے آسماں، الاماں!		ٹھٹک گیا ہے زندگی کا کارواں

بھٹک گئے ہیں قصرِ شب کے پاسباں — نگاہ گھومتی رہی، کہاں کہاں
نہ ماہتاب کا نشاں، نہ کہکشاں!

بس اب ہیں ذوق پر بلندیاں گراں — بس اب اُتر چلیں گے زیرِ آسماں
مگر مرے خیال! میرے راہ داں! — مجھے نہ راس آسکیں گی پستیاں
وہ بستیاں جو اب نظر سے ہیں نہاں

یہ کون لے چلا مجھے کشاں کشاں — وہ ایک گیند سی ہے کیا شرر فشاں!
سنہری گرد چھا گئی جہاں تہاں — چھلک رہی ہیں چاندنی کی پیالیاں
یہ خلد ہی نہ ہو خلا کے درمیاں

نہیں نہیں، نہ رک سکیں گے ہم یہاں — تجلیوں کی چشمکیں ہیں بے اماں
یہ کون ہو گئے ہمارے ہم عناں — ستارے، چاند، آفتاب، بجلیاں!
مچلتے ناچتے ہوئے، یہاں وہاں!

زمین۔ اے زمین! اے مرے جہاں! — میں بہہ گیا، بہک گیا، فغاں فغاں!
میں خود کہاں، مراد جو رہے کہاں — یہ کس کے نور کا ہے سیلِ بے کراں.
رواں دواں۔ رواں دواں۔ رواں دواں

مجھے قبول ہیں زمیں کی پستیاں — مگر زمین و آسماں کے درمیاں
یہ ایک ذرّہ حقیر و ناتواں — رہے گا کب تک آخر اس طرح تپاں
رواں دواں۔ رواں دواں۔ رواں دواں

تضحیک

کائنات ایک پہیلی کا دھندلکا بن کر
میرے آئینۂ ادراک پہ چھا جاتی ہے
پھیل جاتے ہیں کچھ اس طرح تصور کے خطوط
زندگی آنکھ اٹھاتے ہوئے گھبراتی ہے

عشق، احساسِ جوانی، غمِ دنیا، غمِ دیں
ایک دل اور یہ افکار کی گھنگھور گھٹا

سسٹپٹاتا ہوں، لپکتا ہوں، ٹھٹک جاتا ہوں
چار جانب سے یہ آتی ہے صدا۔ کیا ہوگا!

جو بھی ہوگا مجھے منظور ہے ۔ جی لینے دو
دسوسو، آرزوؤ، کشمکشو، یار مالو!
تم عبارت ہو مری زیست سے تسلیم، مگر
جو مرے ذہن پہ بیتی ہے وہ تم کیا جانو

چاند کے ساتھ ستارا تو ہے، لیکن کیوں ہے؟
تتلیاں پھول پہ کیوں آتی ہیں، کیا پاتی ہیں
پھول کے رنگ میں خوشبو کا رچاؤ کیا ہے؟
روحیں قالب سے نکلتے ہی کہاں جاتی ہیں؟

آسماں حدِ نظر ہے، تو زمیں کیا شے ہے؟
یہ بھی اعجازِ نظر ہے تو خدا کیا ہوگا!
وہ بھی تخئیل کی جنت ہے تو خاکم بدہن
عاقبت کیا ہے؟ وہاں جلوہ نما کیا ہوگا!

گہری کہروں سے ہے معمور خیالوں کی خلا
دھندلی راہیں ہیں، سمٹتی ہوئی، چکراتی ہوئی
ایسے موڑ آتے ہیں جب روح لرز اٹھتی ہے
لڑکھڑاتے ہی اُچٹ جاتی ہے نیند آتی ہوئی

آنکھ کھلتے ہی اُمڈ آتی ہے گھنگھور گھٹا
عشق، احساس، جوانی، غمِ دنیا غمِ دیں
یوں بپھر جاتے ہیں ماحول و مقدر کے نقیب
جیسے فطرت کا کھلونا ہوں میں انسان نہیں

(۱۹۴۶ء)

دائرہ

شبنم کے زمرّدیں ستارے
سبزے کی ردا پہ جم گئے ہیں
برّاق، سماق رنگ بادل
مبہوت خلا میں تھم گئے ہیں

پربت کی سفید رفعتوں پر
پورب نے شفق بخور ڈالی
زرکار سبک افق کہاں ہے
تیروں نے کمان توڑ ڈالی

پھولوں میں بھی رقص رچ گیا ہے
پتوں میں بھی رم سما گیا ہے
کروٹ ہے، تڑپ ہے، بے کلی ہے
سیلابِ حیات آ گیا ہے

مرکز سے پلٹ کے سائے رینگے
پورب سے شفق کی بھیک لینے
اس درجہ بڑھا جمالِ خورشید
ہر پھول جھکا خراج دینے

پچھم میں پگھل رہا ہے سونا
سونے میں لہو کی دھار دوڑی
وہ ایک حسینۂ سیاہ پوش
آشفتہ و بے قرار دوڑی

دھرتی پہ گرے گی نیند بن کر
رینگے گی امید کے سہارے
سنبھلے گی تو مسکرا اٹھیں گے
شبنم کے زمردیں ستارے

(۱۹۷۷ء)

سحر نغمہ

مغربی اُفق کے پار، پیلے پیلے تاروں میں، چاند مسکراتا ہے
جھیل کے کنارے پر، اک چراغ کٹیا کے پاس ٹمٹماتا ہے
سوئی سوئی لہروں پر چاندنی کی بارش سے، تھرتھری سی طاری ہے
یا کسی حسینہ کا ــ قمقموں کی کرنوں میں ــ ہار جگمگاتا ہے
ٹوٹی پھوٹی کٹیا میں، اک اُداس سا دوہا ــ گا رہا ہے جانے کون
عشق آسمانوں پر، پردۂ ازل تھامے، حُسن کو بلاتا ہے
ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے ہیں، بھینی بھینی خوشبو ہے، نرم نرم لہریں ہیں
جانے کیسی یاد آئی، کچھ تو یاد پڑتا ہے، کچھ تو یاد آتا ہے
وہ کسی کی آنکھوں کا اذنِ دید دیتے ہی، یک بیک جھپک جانا
جیسے چاند بدلی کی آڑ سے نکلتا ہے اور ڈوب جاتا ہے
ہانپتے نظاروں میں میرا جانا پہچانا ایک ہاتھ لہرایا
کانپتے ستاروں میں ایک مرمریں پیکر اوڑھنی اُڑاتا ہے
اونگھتی چراگاہیں دردناک تانوں سے کروٹیں بدلتی ہیں
اجلی صبح کا دامن مشرقی پہاڑوں کے پاس پھڑپھڑاتا ہے
عنقریب مغرب کے کالے کالے غاروں میں چاند ڈوب جائے گا
تیرا گیت، اے جوگی ـ مجھ کو یاد آتا ہے ـ مجھ کو یاد آئے گا

(۱۹۳۷ء)

رخصت

اُف یہ بھیگی ہوئی پلکیں، یہ لرزتے ہوئے ہونٹ

آئینہ رنگ جبیں پر یہ پسینے کے شرار　　سانس میں لپٹی ہوئی روح کی دل دوز پکار
مست آنکھوں سے چھلکتے ہوئے غمناک خمار　　زرد باہوں میں یہ کل رات کے مسلے ہوئے ہار
چیخ سی شدّتِ غم سے ہوئی انجن سے بلند　　چھا گیا آنکھ جھپکتے ہی فضاؤں پہ غبار

گونج پہیوں کی تھی اب دور کہیں ڈوب گئی

قلب میں اس کے تصور سے ہے لہو بن کے رواں — ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں ہیں خلاؤں میں لرزاں
تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں میں ہے وحشت سی نہاں — پھڑپھڑاتے ہوئے آنچل میں ہیں پنہاں طوفاں
اُف یہ لپٹا ہوا اُلجھے ہوئے بالوں میں وجود — سینۂ آکاش پہ ہے عکس یہ کس کا رقصاں
اُف یہ بھیگی ہوئی پلکیں، یہ لرزتے ہوئے ہونٹ

(۱۹۳۹ء)

برسات کی ایک رات

اُمڈے ہیں وہ پربتوں سے طوفاں — ہیں چرخ پہ بدلیاں خراماں
موہوم اُفق پگھل چکا ہے — اوجھل ہے نظر سے ماہِ تاباں
گھنگھور گھٹا گرج رہی ہے — ٹکراتے ہوں جیسے دو کہستاں

رعشے میں ہے کائنات ساری
ہیں دو جہاں نزار و حیراں

میلا سا چراغ جل رہا ہے — کُٹیا میں کھڑا ہوں میں ہراساں
انگڑائیاں لے رہی ہیں یادیں — احساس ہے دل میں شعلہ افشاں
یاد آتے ہیں بار بار وہ دن — جب عشق تھا زندگی کا ساماں
غم اک حقیر واہمہ تھا — سرمایۂ زیست تھا ہر ارماں
سرما کی اُداس چاندنی میں — ہوتی تھی صبوحی میری مہماں
آنکھوں میں مسرتوں کے آنسو — عارض میں جوانیاں فروزاں
مسکا ہوا کہنیوں سے چولا — بکھری ہوئی زلفِ ظلمت افشاں
وہ بھیگی ہوئی حنائی پوریں — سمٹی ہوئی روحِ برق و باراں

ہر بات میں گیت کا ترنم
ہر سانس میں موجِ آبِ حیواں

وہ فرطِ طرب سے میرا کہنا — "اے میری نجوی، اے مری جاں
تجھ سے مری زندگی عبارت — تجھ سے مری رات صبحِ خنداں
بس تیرے وجودِ دل نشیں سے — لبریزِ حیات ہے شبستاں

بس تیری نگاہِ پُر اثر سے		میں خفتہ نصیب، گل بداماں

اے کاش شباب جاوداں ہو

بے جان ہو نبضِ چرخِ گرداں

معصوم صبوحی کا لجا کر		لہرانا وہ چاک چاک داماں

چپ چاپ سمٹ کے ایک جانب		خاموش حکایتیں سنانا

کچھ میری فسردگی سے بے کل		کچھ اپنے سکوت پر پشیماں

عارض پہ وہ کپکپی حیا کی		جس طرح گلوں پہ اوس لرزاں

گرتی ہوئی اوڑھنی کے پیچھے		اُٹھتی ہوئی آرزو کی میزاں

کچھ کہنا اگر تو اتنا کہنا

"اس شب پہ دلوں کے ڈھیر قرباں"

طوفاں سے دل میں اُٹھ رہے ہیں		اک عمر سے گن رہا ہوں گھڑیاں

احساس پہ ہے جمود طاری		امید ہے رہنِ طاقِ نسیاں

کچھ سوچ رہے ہیں مدتوں سے		موہوم شباب کے شبستاں

دل پر خرد کا رنگ غالب		سینے میں نزاعِ کفر و ایماں

اب سود و زیاں کی اُلجھنوں میں		لُٹ جاتا ہے دورِ برق و باراں

شاعر تو کبھی کا مر چکا ہے

اب تو ہے ندیم صرف انساں

(۱۹۴۰ء)

ذرا سی بات

وہ کونپلوں کے بوجھ سے شاخیں لچک گئیں		پھولوں کی نکہتوں سے فضائیں بہک گئیں

وہ جھاڑیوں میں بجنے لگے بوندیوں کے ساز		وہ خاک پر برسنے لگے بادلوں کے راز

باریک ندیوں کے وہ میداں میں حاشیے		ٹھنڈی زمیں پہ جیسے مچلتے ہوں اژدہے

یوں محوِ وجد و رقص ہیں نیموں کی ڈالیاں

انگڑائی جیسے نیند میں لیں گاؤں والیاں

یہ سامنے اندھیری چٹانوں کے آس پاس — کس آسرے پہ بھیڑیں کھڑی ہیں اُداس اُداس
کس کے لباس سے یہ ہوائیں ہیں گرمِ ناز — چہرے پہ کس کے کھیلتے ہیں گیسوئے دراز
یہ کس کی چشمِ مست جھپکتی ہے بار بار — چادر یہ کس کے سر سے ڈھلکتی ہے بار بار

بھیگے ہوئے لباس سے چھنتا ہوا جمال
ڈوبا ہوا شباب کی مستی میں بال بال

"لڑکی تو کس غریب کی آنکھوں کا نور ہے؟ — بتلا، یہاں سے گاؤں ترا کتنی دور ہے؟
بھٹکی ہوئی ہے تو، تو مرے ساتھ ساتھ چل — چکنی ہے راہ۔ دیکھ، ذرا رک۔ ذرا سنبھل
بھیڑوں کے رام کرنے کے آتے ہیں مجھ کو ڈھب — یہ میرے پیچھے پیچھے چلی آرہی ہیں سب
کیچڑ ہے اُس طرف تو۔ اِدھر سے پلٹ کے آ — لے میرا ہاتھ تھام کے جھرنا پھلانگ جا"

اتنی سی بات اور یہ ہنگامۂ خیال
اے دل سنبھل، سنبھل، مرا جینا نہ کر وبال

(۱۹۴۰ء)

قانونِ قدرت

گلیوں کی شمعیں بجھ گئیں اور شہر سونا ہو گیا — بجلی کا کھمبا تھام کر بانکا سپاہی سو گیا
تاریکیوں کی دیویاں کرنے لگیں سرگوشیاں — اک دھیمی دھیمی تان میں گانے لگیں خاموشیاں
مشرق کے پربت سے پرے اُبھریں گھٹائیں یک بیک — انگڑائیاں لینے لگیں بے خود ہوائیں یک بیک
تارے نگلتی بدلیاں چاروں طرف چھانے لگیں — چھم چھم پھواروں کی جھڑی دھرتی پہ برسانے لگیں
کتے اچانک چونک کر بھونکے، دبک کر سو گئے — بے رس چچوڑی ہڈیوں کی لذتوں میں کھو گئے
مائیں لپکتی ہیں کہیں؟ بچے بلکتے ہیں کہیں، — اور کھاٹ لینے کے لیے بوڑھے اُچکتے ہیں کہیں
اک سرسراہٹ سی اُٹھی، لہرائی، تھم کر رہ گئی — ہر چیز نے آنکھیں ملیں، ہر چیز جسم کر رہ گئی

پھر گنگناتی ظلمتوں کا سحر ہر سو چھا گیا
بادل کہیں گم ہو گئے، تاروں پہ جوبن آ گیا

قدرت کے سب چھوٹے بڑے قانون ہیں یکساں مگر — پردے پڑے ہیں جا بجا چھنتی نہیں جن سے نظر

انساں کا معصوم دل تاریک سونا شہر ہے
جس کے تلے احساس کی چنگاریوں کی لہر ہے
جب دیکھتا ہے وہ کسی بدمست پنگھٹ والیاں
کانوں کو جن کے چومتی ہیں پتلی پتلی بالیاں
زلفیں گھٹاؤں کی طرح۔ آنکھیں ستاروں کی طرح
چلنا ہواؤں کی طرح۔ رنگت شراروں کی طرح
ہنسنے کی ابرو پہ کسے تناؤ کھنچن سے پاؤں رقص میں
پگڈنڈیوں کے اُس طرف گاگر کی چھاؤں رقص میں
سینے چھلکتے میکدے اور ہونٹ پیمانوں کے لب
ٹخنوں پہ بجتی جھانجھنیں، ہنسنا ہنسانا بے سبب
یہ زیرِ لب انگڑائیاں لیتا ہے دل انسان کا
ناگاہ ہر دھڑکن پہ ہوتا ہے گماں طوفان کا

گلیوں میں چھپ جاتی ہیں جب یہ تپتی پھرتی بجلیاں
ہوتا ہے طاری روح پر سنسان راتوں کا سماں

(۱۹۳۸ء)

شکاری

جبیں پہ ایک موجِ رنگ دلنواز سی لیے ہوئے
شراب سی پیے ہوئے
درِ بہشت مست انکھڑیوں میں وا کیے ہوئے
مرے خدا یہ کون ہے
قدم قدم پہ ایک نغمہ سا جگا رہی ہے وہ
کچھ ایسے آ رہی ہے وہ
بلند و پست پر نشہ سا بن کے چھا رہی ہے وہ
مرے خدا یہ کون ہے؟
لبوں پہ ایک کپکپی سی وقفِ پیچ و تاب ہے
نگاہ محوِ خواب ہے
یہ عکسِ ماہتاب ہے کہ روحِ آفتاب ہے
مرے خدا یہ کون ہے؟
وہ مجھ کو دیکھتے ہی اپنے راستے سے ہٹ گئی
سمٹ کے یوں پلٹ گئی
کہ جیسے اک پتنگ کی فضا میں ڈور کٹ گئی
مرے خدا یہ کون ہے؟
مجھے قریب دیکھ کر کچھ اس طرح لجا گئی
کچھ ایسے پیچ کھا گئی
کہ ساری کائنات پر ردائے خواب چھا گئی
مرے خدا یہ کون ہے؟
وہ تیز تیز جا رہی ہے بادلوں کی چھاؤں میں
وہ سامنے کے گاؤں میں
مگر یہ بیڑیاں سی کیوں پڑی ہیں میرے پاؤں میں
مرے خدا یہ کون ہے؟
وہ اُس کی میلی اوڑھنی، یہ میرا اُجلا پیرہن
یہ پیرہن کا بانکپن

مگر مرے لباس پر ہیں اس کے ناز خندہ زن — مرے خدا یہ کون ہے؟
بس اب اسی جگہ پر اپنا جھونپڑا بناؤں گا — اسی کے گیت گاؤں گا
کبھی تو اس کو اپنے جذبِ دل سے کھینچ لاؤں گا — مگر بتا وہ کون ہے؟

(۱۹۴۱ء)

اُداس محبوبہ سے

کتنا خاموش ہے سوئے ہوئے نیموں کا ہجوم — زندگی تک نظر آتی ہے خیالِ موہوم
موڑ پر سست سی ندی کے وہ' ملّاح کا گھر — اک کھلونا سا مجھے دور سے آتا ہے نظر
اُجلی اُجلی سی گھٹاؤں میں وہ بہتا ہوا چاند — دُھندلے دھندلے سے کسی خواب کی مانند ہے ماند
ایسے ماحول میں کیوں کشتۂ افکار ہے تو — کیوں مرے ولولۂ شوق سے بیزار ہے تو
تجھ کو شکوہ ہے اُمیدوں کی زبوں حالی کا — خوف، شاہینِ تمنا کی گراں بالی کا
تو سمجھتی ہے کہ جب بزمِ جہاں فانی ہے — لذّتِ زیست کا احساس بھی نادانی ہے
شاعری ہے تری دانست میں افسانۂ غم — زندگی جس کے اثر سے ہے مسلسل ماتم
سولھویں سال نے کیا تجھ پہ قیامت ڈھائی — خشک منطق میں اُلجھتی ہے تری انگڑائی
نہ فسانوں کا تقاضا، نہ ترانوں کی ترنگ — نہ لپکتی ہوئی بانہوں میں سمٹنے کی اُمنگ

زندگی خواب سہی، خواب کو ویراں تو نہ کر
میرے فردا کے ہیولوں کو پریشاں تو نہ کر

دم بخود شب کی پُراسرار سی بے پایانی — شاید اب تک تری نظروں نے نہیں پہچانی
منتشر ابر کے ٹکڑوں میں ہے مہتاب رواں — سطحِ دریا پہ ہے یا ایک پری رقص کناں
اونگھتی لہروں میں تاروں کی مچلتی گیندیں — سیمِ سیال میں مرمر کی اُبلتی گیندیں
یہ فضاؤں میں تعطّر کی خمار انگیزی — گھاس پر اوس کے قطروں کی جواہر ریزی
یہ لچکتی ہوئی شاخوں کی کمانوں کا تناؤ — لوریاں دیتا ہوا نرم ہواؤں کا بہاؤ
ایسی جنّت میں جہنّم کا تصور ہے محال — کل پر رکھے ہیں تو ادراک کا دشنہ نہ نکال
جب شگوفے کے تبسّم میں ہیں اسرارِ حیات — کیوں قہقہوں کے خرافات ہوں سامانِ نجات

جب مہ و مہر کی کرنیں ہیں صحیفوں کی سطور
اصطلاحات سے کیوں ذہن کو کریں مجبور

دیکھ یہ گھاس پہ موہوم سے کیڑے کا خرام
اس کے ادراک سے بالا ہے دو عالم کا نظام

اک ذرا چھو تو اسے، کانپ کے بل کھائے گا
اور اس گھاس کی پتی سے اُتر جائے گا

زندہ رہنا ہے تو جینے کی ہوس پیدا کر
زہر ہے زیست تو اس زہر میں رس پیدا کر

اپنے اس شاعرِ آوارہ و بدنام کو دیکھ
اس کے افکار میں ڈھالے ہوئے اصنام کو دیکھ

یہی اصنام ہیں ان تازہ خداؤں کے حریف
جن کی جبروت سے بیزار ہے احساسِ لطیف

جن کے قانون ہیں قرنوں کی غلامی کے نشاں
کاٹ لی جن کی خلیفوں نے صداقت کی زباں

خونِ دہقاں سے نکھرتا ہے پھریرا جن کا
حق کے تابوت پہ ہوتا ہے بسیرا جن کا

میرے اصنام سے ڈرتی ہے خدائی ان کی
ان چٹانوں سے چٹختی ہے کلائی ان کی

کون کہتا ہے یہ بے وقعت و بے مایہ ہیں
یہی اصنام مری زیست کا سرمایہ ہیں

وقت پر ان کی قباؤں سے جھڑیں گے وہ غرر
شب کے چنگل سے نکالیں گے جو ایوانِ سحر

قبل اس کے گرائے شمعِ شبستانِ خیال
کیوں کریں قوم کے اُجڑے ہوئے ماضی کا ملال

ہو کے مایوس مرے عشق کو بدنام نہ کر
ایک مجبور کو یوں موردِ الزام نہ کر

موت کیا چیز ہے؟ افسردہ خیالات کا بھوت
موت کیا چیز ہے؟ تاریک نگاہی کا ثبوت

موت دراصل تصور کی پریشانی ہے
موت انسان کے ادراک کی حیرانی ہے

زندگی موت کا عنواں ہے تو ڈرنا کیسا؟
ایک نقطے پہ تجلی کا ٹھہرنا کیسا؟

میں تو یہ پوچھتا ہوں، کیا یہی خلاقی ہے
یعنی انسان تو فانی ہے، خدا باقی ہے

جزو فانی ہے تو پھر کُل کی بقا کیا معنی
یہ بھی فانی ہے تو پھر خوفِ خدا کیا معنی

جب وہ باقی ہے تو ہم موت سے کیوں گھبرائیں
کیوں نہ پہنائیِ عالم میں چہکتے جائیں

کیوں نگاہوں میں ہو الفت کی زبوں انجامی
جب کہ ظلمت ہے حقیقت میں نظر کی خامی

نرم سبزے پہ تھرک، نیم کی شاخوں میں جھول
اپنے بالوں میں پرو، اوس میں بھیگے ہوئے پھول

سطحِ دریا پہ لپک، نور کی قوسوں میں نہا
مجھ کو سینے سے لگا، دہر کو قدموں پہ جھکا

قہقہہ مار، حقیقت میں یہی جینا ہے
فرصتِ عیش تو عرفان کا اِک زینہ ہے

(۱۹۴۲ء)

رات کی بات

میرے خوابوں کے دریچے سے یہ کس نے جھانکا — نیند کی جھیل میں یہ کس نے کنول پھیلائے
لال پوروں میں یہ آنچل کا کنارا تھامے — کس نے پائل کے مدھر تال پہ دوہے گائے

سوئی سوئی سی یہ آنکھیں ہیں ادھورے سپنے — خلوتِ دل میں چھپا رکھتے ہیں جن کو فن کار
مرمریں گالوں پہ مدھم سے شفق رنگ دیے — جو چمکتے ہیں خیالوں کی ندی کے اُس پار

وہی سنجیدہ سا اک لوچ ہے ہنگامِ خرام — جیسے بھٹکی ہوئی ساون کی اکیلی بدلی
رُخِ رنگیں پہ وہ ہلکا سا تفکر، جیسے — سیپی لہروں میں نظر آتی تھی گدلی گدلی

ان گنت نظروں سے بچتی ہوئی تو آئی ہے — اپنے ٹھکرائے ہوئے دوست کا جی بہلانے
وہی عنواں ہیں کمانوں سی بھووں میں مستور — مجھ سے جن پر ابھی لکھے نہ گئے افسانے

اُنگلیوں میں وہ ستاروں کی تپاں بے چینی — مسکراہٹ میں گجر دم کی خنک رعنائی
کالے بالوں میں وہ موہوم سنہری لہریں — جیسے جلتے ہوئے جنگل میں چلے پُروائی

ہائے وہ لمس، وہ اک گونج، وہ اک واویلا — وہ دھندلکوں میں پگھلتے ہوئے پتلے سائے
وادیٔ خواب میں وہ صرصرِ دنیائے شعور — جیسے بھرپور بہاروں میں خزاں آ جائے

دھجیاں بن کے اڑا رات کا پیراہنِ تار — تارے ٹکرائے خلاؤں میں، فضا چکرائی

میٹھی نیندوں کو کترتی ہوئی کرنیں لپکیں
خون کا طشت لیے صبح کی دیوی آئی

(۱۹۴۱ء)

لمحاتِ گریزاں

میں ابھی وقت کو پابندِ سلاسل کرلوں
چاند رک جائے، ستاروں کے سفینے تھم جائیں
یہ خلاؤں میں لپکتی ہوئی کافر گھڑیاں
دم بخود ہو کے ہواؤں کی ندی میں جم جائیں

یہ صنوبر کا سُبک اور چھریرا سایہ
آتشیں رنگ چٹانوں سے پلٹ کر سو جائے
اور یہ لمحہ، یہ جوانی کا گریزاں لمحہ
اتنا پھیلے کہ مجسّم ابدیّت ہو جائے

یہی جھرنے کا حسیں موڑ نگاہوں میں رہے
یہی پھولوں سے لدی بیل، یہی چھتنارا
یہی معصوم ترنّم، یہی پربت کا سکوت
یہی ہالہ مری باہوں کا، یہی مہ پارا

یہی بھیگے ہوئے ہونٹوں کی گلابی قوسیں
یہی عارض، یہی چہرے کا مدوّر مرمر
یہی آنکھوں میں دمکتا ہوا بھرپور شباب
اور یہی جسم، یہی کعبۂ احساس و نظر

آخر انساں ہوں، مشیّت سے اُلجھنے والا
اوجِ افلاک کے اسرار کا غمّاز ہوں میں
جس کی پرواز میں خود خلوتِ یزداں ہے محیط
وہ دُھندلکوں سے اُلجھتا ہوا شہباز ہوں میں

لیکن اک بات، محبّت کے تقاضوں سے الگ
اپنا انجام نہ بن جائے یہی ٹھہراؤ
اور وہ جبرِ مسلسل ۔۔۔ وہ جمودِ ابدی
ابنِ آدم کے کلیجے کا پُرانا گھاؤ

شام کو کتنا دلآویز تھا سورج کا غروب
لیکن اب صبح کا محتاج ہے یہ نظّارا
کیا عجب، وقت ہمیں پھر بھی مہیّا کردے
یہی پھولوں سے لدی بیل، یہی چھتنارا

(۲۹/۲/۱۹۶۰ء)

میرا گاؤں

رہوں گا اپنے وطن کے بہشت زاروں میں
جوان وادیوں، بلوان کوہساروں میں

یہ کچے مٹی کے گھر، یہ غریب رشتہ دار
یہ آڑی ترچھی سی بوسیدہ چھپروں کی قطار

صبیح بچوں کے جھمگٹ یہ تنگ گلیوں میں
یہ پھول بننے کے انداز تازہ کلیوں میں

یہ منہ اندھیرے ہی بیلوں کی گھنٹیوں کی صدا
یہ صبح صبح گھروں سے دھواں سا اٹھتا ہوا

یہ چھت پہ بیٹھی ہوئی بھولی بھالی دوشیزہ
گلی سے بانکا سا اک نوجواں گزرتا ہوا

یہ اونچے اونچے درختوں کی چھدری چھدری چھاؤں
اُفق پہ بکھرے ہوئے بے شمار ننھے گاؤں

یہ سرد راتوں میں چوپال پر سلونے گیت
یہ حادثات کا اظہار، صبر و شکر کی ریت

یہ پتھروں پہ تھرکتا ہوا حسیں نالا
کنارے بیٹھا ہوا کھیتوں کا رکھوالا

مقابلے یہ کبڈی کے نوجوانوں میں
شکست و فتح کا اظہار چند گانوں میں

یہ سیدھے سادھے عقیدے، یہ بھولے بھالے خیال
یہ بے مثال جوانی، یہ بے نظیر جمال

ندیم شہر سے اُکتا چکی تھی طبعِ حزیں
یہیں کہیں ہے مرے شوق کی بہشت بریں

(۱۹۳۸ء)

گاؤں کی صبح

مشرق کے چھلکتے ساغر میں سورج کی شعاعیں تیرتی ہیں
مغرب میں اُفق کے سینے پہ بدمست گھٹائیں تیرتی ہیں
چڑیوں کے لشکر کھیتوں کی وسعت میں چہکتے جاتے ہیں
مسجد کے مقدس مینارے کرنوں سے دمکتے جاتے ہیں
گلیوں سے صدائیں آتی ہیں ننھے بچوں کے رونے کی
اور گونج رہی ہیں ہر جانب آوازیں دودھ بلونے کی
لاٹھی کو جما کر کاندھے پر گھر سے نکلا ہے چرواہا
گلّے کے گذرتے ہی جانے کیا سوچ رہا ہے چرواہا
پنہاریاں پنگھٹ کی جانب تیزی سے تھرکتی جاتی ہیں
اور ہولے ہولے اوڑھنیاں سینوں سے سرکتی جاتی ہیں

اک تنگ گلی میں کھلتے ہیں دروازے چند دکانوں کے
قسمت کے نوشتے رکھے ہیں ان میں مفلس دہقانوں کے
چوپال پہ رونق ہے، شاید تھانے کے سپاہی آئے ہیں
معصوم غریب کسانوں کے وارنٹ بنا کر لائے ہیں
وہ اک بوسیدہ کٹیا سے فریادوں کا طوفان اٹھا
تھانے کی طرف جانے کے لیے اک خستہ دل دہقان اٹھا
نالوں کی اک گھنگھور گھٹا ہر سمت فضا پر چھائی ہے
آنکھوں سے شرارے برساتی، وہ صبح کی دیوی آئی ہے

(۱۹۳۸ء)

ساون

وہ پربت پر ہے اک بدلی کا سایا　　　اندھیرا جنگلوں میں سنسنایا
پپیہا پیہو پیہو گنگنایا　　　ہوا نے جھاڑیوں میں گیت گایا
وہ بگلوں نے بھی اپنے پر سنوارے
وہ کھمبن کے کھلونے پیارے پیارے
وہ وادی میں ابابیلوں کی ڈاریں　　　وہ بل کھاتی ہوئی پانی کی دھاریں
وہ بھولے بھولے بچوں کی قطاریں　　　وہ جھرنوں پر ملاروں کی پکاریں
وہ اک ننھی پھسل کر رو رہی ہے
چُنریا بے دلی سے دھو رہی ہے
دھنک نے یک بیک چلّہ چڑھایا　　　پلٹ دی آن میں عالم کی کایا
پھٹی بدلی میں سورج مسکرایا　　　چھوا چاندی کو اور سونا بنایا
بلندی پر وہ جنگل لہلہائے
پہاڑوں کے پڑے جھیلوں میں سائے
وہ اک چرواہے نے مُرلی بجائی　　　وہ نظاروں کو انگڑائی سی آئی

یہ خنکی اور یہ آتش نوائی! 	نیا چولا بدلتی ہے خدائی
فضا ٹھٹھری ہوئی تھی کھل رہی ہے
گلے جھاڑی سے جھاڑی مل رہی ہے
یہ سبزہ اور یہ نالوں کی روانی	بکھر کر جھاگ بن جاتا ہے پانی
یہ بھیگے بھیگے پودوں کی جوانی	مجھے ڈستی ہیں یہ گھڑیاں سہانی
میں اپنے گھر کی کھڑکی میں کھڑا ہوں
گہر ہوں اور خرابے میں پڑا ہوں

(۱۹۳۹ء)

شہپارہ

ہنوز چہرۂ ہستی میں رنگ باقی ہے
فرازِ کوہ کی سنجیدگی کی مجھ کو قسم
پہاڑی نالوں کی پیچیدگی کی مجھ کو قسم
ہنوز آدم و فطرت میں جنگ باقی ہے

سمندروں کی ہیں جولانیاں گواہ مری
میں دیکھتا ہوں کہ صحرائے بیکراں ہے وہی
غنودہ وسعتوں پر خواب کا گماں ہے وہی
رخِ خرد کی ہیں حیرانیاں گواہ مری

ہنوز اوس کے موتی ہیں برگِ گل پہ نثار
بچھی ہوئی ہے بساطِ زمرّدیں اب تک
نگاہِ شوق ٹھہرتی نہیں کہیں اب تک
ہنوز روحِ مشیت ہے بے نیازِ قرار

وہ نقش، کلکِ ازل نے جسے اُبھارا ہے
ہنوز میری نگاہوں میں شاہ پارا ہے

(۱۹۴۳ء)

چرواہے

وہ بانکے ترچھے چرواہے　　　یوں پھرتے ہیں میدانوں میں
جیسے رنگیلی تیتریاں　　　منڈلاتی ہیں بستانوں میں
کہساروں میں لہراتے ہیں　　　دراتے ہیں ویرانوں میں
موسم کے ارادے تولتے ہیں　　　پروائی کی میزانوں میں
انگور کی لذت پاتے ہیں　　　مکی کے سجیلے دانوں میں
دن بھر کی تھکی ہاری چڑیاں　　　جب آتی ہیں کاشانوں میں
یہ اپنا جی بہلاتے ہیں　　　پریوں کے حسین افسانوں میں
صدیوں سے اُجڈ کہلاتے ہیں　　　فیشن کے غلام انسانوں میں
لیکن یہ ان سے بڑھ کر ہیں　　　مضبوط اپنے ایمانوں میں
رکھتے نہیں اپنی مورتیاں　　　تہذیبوں کے بُت خانوں میں
تاریخ مرتب کرتے ہیں　　　کھیتوں میں اور کھلیانوں میں

جب تک یہ گڈریے جیتے ہیں
گیتی کے گریباں سیتے ہیں

(۱۹۴۰ء)

استعجاب

(شاعر)

دیکھ کر مجھ کو لرز جاتے ہیں سُکّانِ جہاں
جانے کس جرم سے آلودہ ہے میرا داماں

میں وہ قطرہ ہوں جو دریاؤں کا آئینہ ہے
میں وہ ذرہ ہوں جو ہے ہمسرِ مہرِ رخشاں

آسماں میری تجلی کی ہے دھندلی سی نقاب
یا مرے دل میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کا دھواں

مہر و مہ میرے تخیل کے ہیں اشک ریلطیف
اور بکھرے ہوئے تارے مرے قدموں کے نشاں
آبشاروں میں مرا ذوق طلب نغمہ طراز
میں سمندر کی مچلتی ہوئی موجوں میں رواں
ڈوبتے چاند میں غلطاں ہے مری مدہوشی
میں اُبھرتے ہوئے سورج کی کرن میں رقصاں
بوند بن کر کبھی بادل سے ٹپک پڑتا ہوں
برق بن کر میں کبھی ابر میں ہوں شعلہ فشاں
ذرّے میں میری تڑپ مہر میں پرتو میرا
میں قمر میں متبسم، میں شرر میں لرزاں
طے کیا کرتا ہوں اک پل میں کروڑوں فرسنگ
میری رفتار سے مبہوت ہے چرخِ گرداں
میرے افکار سے شاداب ہے کشتِ احساس
میری پرواز سے لبریز ہے گلزارِ جہاں
میں زمانے پہ کئی رنگ میں عکس افگن ہوں
میں ہوں عالم کے ہر افسانے کا رنگیں عنواں
چومتے ہیں مرے قدموں کو سلاطینِ زمن
اور حاجب ہیں مرے قصر کے شاہانِ جہاں

پھر بھی خلوت میں جب اٹھتے ہیں من و تو کے حجاب
چلنے لگتی ہیں مرے قلب و نظر پر چھریاں

(آواز)

مردِ آزاد کے اوصاف ہیں یہ، اے شاعر
اور آلودہ غلامی سے ہے تیرا داماں
تو خیالات میں گم، غیر فتوحات میں گم
تو خرافات میں گم، غیر کرامات میں گم

نوکری پر جاتے ہوئے

اندھیری راہوں پہ بھاری چھکڑے کے پہیے یوں چرچرا رہے ہیں
کہ جیسے آسیب گونجتی گھاٹیوں میں کچھ گاتے جا رہے ہیں
اُداس تارے خموش جوہڑ میں ڈوب کر غوطے کھا رہے ہیں
شریر جھینگر کرخت پیں پیں کے تیر و نشتر چلا رہے ہیں

مرا وہ ننھا سا پیارا گاؤں نگاہ سے چھپتا جا رہا ہے
مرے گھروندے میں جانے اب تک چراغ کیوں ٹمٹما رہا ہے

منڈیر کی آڑ لے کے شاید ضعیف ماں میری روتی ہوگی
مرے تصور میں آنسوؤں کی اٹوٹ لڑیاں پروتی ہوگی
پچھاڑیں کھا کھا کے میری آپا غریب بے ہوش ہوتی ہوگی
مری صبوحی فراخ آنگن کے عین مرکز میں سوتی ہوگی

مرے گھروندے کا ذرہ ذرہ مجھے نہ پا کر اُداس ہوگا
مگر سنا ہے کہ اب کے لاہور کا سفر مجھ کو راس ہوگا

تلاش ہے نوکری کی لیکن دماغ میں آگ جل رہی ہے
جگر میں دوزخ بھڑک رہا ہے، رگوں میں بجلی مچل رہی ہے
گلا نجابت کا کٹ رہا ہے، خودی کی تلوار گل رہی ہے
ندیم کی آہنی جوانی عجیب سانچے میں ڈھل رہی ہے

کبڈی کے دل فریب میلوں میں جس نے کڑیل جواں گرائے
وہ ایک چھکڑے میں رینگتا جا رہا ہے بے چارہ سر جھکائے

میں جانتا ہوں کہ روندی جائے گی نوکری میں مری جوانی
فسانہ گوئی نہ ہو سکے گی، پنپ سکے گی نہ شعر خوانی
تباہ کر دے گی میری صبحیں اُداس شاموں کی خوں چکانی
رہیں گے دو چار شعر میری حیاتِ بے مایہ کی نشانی

مگر مجھے بھی کبھی کبھی بھوک تنگ کرتی ہے، کیوں نہ جانے
یہ طائر سدرہ بھی چُنے گا زمین کی وسعتوں میں دانے

مجھے نہ بھولیں گی اپنے گاؤں کی ٹیڑھی میڑھی سی تنگ گلیاں
وہ شام پڑتے ہی تنگ گلیوں میں نوجوانوں کی رنگ رلیاں
وہ آنکھوں میں لوٹتے ستارے، وہ گالوں میں کھل کھلاتی کلیاں
وہ پاؤں میں جھنجھناتے گھنگھرو، گلے میں وہ ٹن ٹناتی ٹلیاں[1]

وہ ناچ — اور ناچ کے بہانے سے اپنے محبوب کو اشارے
دبی دبی مسکراہٹوں میں وہ لوٹ جانا خوشی کے مارے

مجھے نہ بھولے گا وہ کبڈی کے کھیل میں تن کے باہر آنا
وہ اپنے ہم راز دوستوں کو نئی نئی کسرتیں دکھانا
وہ ایک انداز سے مقابل کے نوجوانوں پہ مسکرانا
وہ برق بن کے تڑپتے جانا، بگولا بن کر لپکتے آنا

وہ شانوں کے گول گول پٹھے، وہ اُبھرے اور لال لال سینے
نہ روح میلی، نہ کھوٹ من میں، نہ بات بے رس، نہ دل میں کینے

مجھے نہ بھولے گی پیاری امی، مجھے نہ بھولے گی بھولی آپا
مجھے نہ بھولے گا وہ گھروندا جہاں کا میں حکمراں رہا تھا
وہ کچی دیواریں، بوڑھی بیری، وہ آنگن اور کبک کا وہ پنجرا
وہ میرے ہنستے ہوئے پڑوسی، وہ ایک دہقان دوست میرا

مری صبوحی، وہ میری پیاسی نگاہ کا اوّلیں سہارا
مرے خیالات کے اندھیرے افق کا وہ زرفشاں ستارا

میں جب کبھی اپنا کام کر کے سکون کی ایک آہ لوں گا
تو اپنی تخئیل کے خزانے سے تیز سی اک نگاہ لوں گا
پلک جھپکنے میں اُڑ کے میں اس غریب گھر میں پناہ لوں گا
اگرچہ یہ راہ پُرخطر ہے، یقین ہے، میں نباہ لوں گا

اُٹھوں گا دفتر سے جب کھلی میز پر کئی فائلیں جما کر
تو اپنے گاؤں پہ آ کے منڈلاؤں گا تصور کے پر لگا کر

[1] گھنٹیاں

دیا بجھ دے، دیا بجھا دے، نہ رو، نہ رو، میری پیاری امّی
ستارے اشکوں کے اتنی افراط سے نہ کھو، میری پیاری امّی
میں لوٹ آؤں گا کچھ کما کر، حزیں نہ ہو، میری پیاری امّی
بس اب تو چھت سے اُتر، کھٹولے پہ جا کے سو، میری پیاری امّی
ترا ندیم ایک روز لوٹے گا نوکری کا خزینہ لے کر
خزینہ لیکن یہ پائے گا اپنی شاعری کا دفینہ دے کر

(۱۹۴۱ء)

نیا ساز نئی تان

شدتِ درد میں بے کار ہے مرنا تیرا
زندگی سے تجھے نفرت ہی سہی
موت پیغامِ مسرت ہی سہی
ڈوب مرنے سے تو بہتر ہے اُبھرنا تیرا
قافلے رات کی ظلمت میں بھٹک جاتے ہیں
لیکن ایسی بھی اک آتی ہے گھڑی
صبح کا مست گجر بجتے ہی
پردہ ہائے شبِ تاریک سرک جاتے ہیں
جسم چکا ہے ترے احساس پہ صدیوں کا غبار
چہرہ روشن ہے مگر رنگ نہیں
دھڑکنیں دل کی ہم آہنگ نہیں
ہے جوانی تری، ناکام امنگوں کا مزار
ترے ماحول پہ طاری ہے تعیش کا جمود
حسن کو حسن فروشی کا جنوں
عشق پر جلوۂ عریاں کا فسوں
شعلہ ناپید ہے، باقی ہے مگر پردۂ دود

شبِ تاریک میں تو پھرتا ہے آوارہ سا
جب بہت دور درختوں کے تلے
کوئی بھٹکا ہوا جگنو چمکے
قلب میں تیرے دہک اٹھتا ہے انگارہ سا

جب کبھی رقص کے گونجے ہوئے ایوانوں میں
سرسراتے ہیں حریری ملبوس
جگمگاتے ہیں سنہری فانوس
بھوت سرگوشیاں کرتے ہیں ترے کانوں میں

موٹریں جب ترے پہلو سے نکل جاتی ہیں
چھوڑ کر تند بگولوں کی قطار
پھینک کر رُخ پہ ترے گرد و غبار
بجلیاں سی ترے سینے میں مچل جاتی ہیں

جب کسی محل سے سمٹی ہوئی باہر آئے
کوئی افلاس زدہ دوشیزہ
اپنی عصمت کا چکا کر سودا
پھیل جاتے ہیں ترے ذہن پہ غمگیں سائے

مسجدیں چند دکھاوے کی نمازوں کے مقام
دیر میں مورتیاں ہیں حیراں
بنسی والے کے پجاری ہیں کہاں
قحبہ خانوں میں کھنکتے ہیں مگر جام سے جام

ایسے جینے سے تجھے موت کا چنگل ہے پسند
زندگی اب تری گمراہ سی ہے
تیری ہر سانس میں اک آہ سی ہے
ٹوٹ جانے کو ہے اب تیری امیدوں کی کمند

لیکن اب روح زمانے کی ہے طوفاں بہ کنار
کٹ کے گر جائیں گے بحر و بر پر
اندھے بوسیدہ عقیدوں کے سر
کون کہتا ہے کہ بھرپور نہیں وقت کا وار

اپنی مایوس جوانی کی کہانی نہ سنا
یہ حزیں عہد ہے جانے والا
اک حسیں دور ہے آنے والا
اب نئے ساز کی آمد ہے، نئی تان اُڑا

(۱۹۴۱ء)

تاریخ پلٹا کھائے گی

صدیوں کے سائے کے تلے　　رقصاں ہیں ماضی کے دیئے
یادوں کے پروانے یہاں　　بنتے ہیں دھندلے دائرے
اُڑتی ہوئی گھڑیوں کے پر　　ہر سمت ہیں پھیلے ہوئے
کتنے شکستہ حوصلے　　کتنے دریدہ ولولے
کتنے ہراساں قہقہے
کتنے پشیماں غلغلے
چٹخے ہوئے پنجر کہیں　　کچلے ہوئے جوہر کہیں
اُجڑے ہوئے بادہ کدے　　ساقی کہیں ساغر کہیں
ایوانِ شاہی کے کھنڈر　　گنبد کہیں اور در کہیں
بکھری ہوئی لاشیں کہیں　　ٹوٹے ہوئے خنجر کہیں
دلدل میں چکراتے ہوئے
تارے کہیں، خاور کہیں
اک غار کے پاتال سے　　ناگاہ اک سایہ اُٹھا
اُبھرا، رُکا، لرزا، بڑھا　　ٹھٹکا تو سر کے بل گرا

بھاگا تو ٹخنے بج اٹھے — رینگا تو اُلجھے دست و پا
بدلیں کچھ ایسی کروٹیں — بادل سا امڈا دھول کا

آخر وہیں پاتال میں
کچھ بڑبڑا کر کھو گیا

اک سمت سے آئی صدا — برسوں کی پہچانی ہوئی
روحِ غلامانِ جہاں — یہ تجھ سے نادانی ہوئی
قوت ہے استبداد کی — جانی ہوئی، مانی ہوئی
دربار یزداں سے اسے — وہ آگ ارزانی ہوئی

جس میں چٹان احساس کی
جب گھر گئی پانی ہوئی

ناگاہ صدیوں کی تہیں — تھرائیں، کانپیں کٹ گئیں
ماضی کی سب پرچھائیاں — دھندلے اُفق تک ہٹ گئیں
بیتے دنوں کی بدلیاں — گالے سے بن کر کٹ گئیں
زہرہ کو چھوتی رفعتیں — بھورے دھوئیں سے اٹ گئیں

یادوں کی گہری ظلمتیں
کٹ کر فضا میں پھٹ گئیں

لاوے کو شرماتا ہوا — نعرہ اُٹھا پاتال سے
"فولاد دب سکتا نہیں — ریشم کی نازک ڈھال سے
تلوار کی جھنکار کو — نسبت نہیں خلخال سے
مرتے نہیں شیروں کے دل — برسوں کے اضمحلال سے

تاریخ پلٹا کھائے گی
ماضی بنے گا حال سے"

(۱۹۴۳ء)

سوانگ

انہی قریوں کی عفونت سے بھری گلیوں میں
جذب ہوتا ہے اسی خاک میں دہقاں کا لہو
پرورش پاتا ہے قوموں کی معیشت کا نظام
یعنی بنتا ہے تمدن کے خداؤں کا مقام

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
کھردرے کپڑوں سے بناتی ہیں بقا کے زینے
جن کے عارض میں سسکتا ہے زبوں حال شباب
ڈال کر کھاد جوانی کی اُگاتی ہیں گلاب

انہی کھلیانوں میں لگتے ہیں طلائی انبار
برسوں اک لال سی پوتھی میں پڑی رہتی ہے
جن کی اُجرت ہے فقط ایک پُرانی تحریر
جتنی فرسودہ ہو، بڑھ جاتی ہے اُس کی تاثیر

انہی میدانوں میں پلتے ہیں جوانانِ جری
دستیاں جُتتے ہیں اُجڑی ہوئی چوپالوں میں
جن کی یلغار سے کٹ جاتے ہیں چٹانوں کے جگر
زندگی موت کی اُمیدمیں کرتے ہیں بسر

وہ بہت دور اُفق پر جو دھواں اُٹھتا ہے
گدھ کی مانند جھپٹتا ہے لہو پینے کو
یہ وہی شہر ہے، جو تاک میں رہتا ہے سدا
چھوڑ جاتا ہے اک انبار سڑے ڈھانچوں کا

کتنا بے درد ہے سرمایہ پرستی کا نظام
جانے تقدیر کی ہے مصلحت اندیشی کیا
اپنے رازق کا لہو پی کے تنا پھرتا ہے
کہ بھکاری بھی شہنشاہ بنا پھرتا ہے

(۱۹۴۳ء)

قدیم نقادانِ فن کا پیغام

(جدید فن کاروں کے نام)

اندھیارے میں رہنے والو! اندھیارے کے راز نہ کھولو
ناپنے کے سپنے ٹوٹ نہ جائیں، آہستہ آہستہ بولو
زہر نہ بن جائے یہ جینا، اس مینا میں نیندیں گھولو
اور خوابوں کے موتی رولو

رقص کی چکراتی لہروں میں بہنے دو ذہنوں کا سفینہ
جام کی خون آلود غلا میں گھلنے دو عرفاں کا نگینہ
بٹنے دو عصمت کا خزینہ، پھٹنے دو احساس کا سینہ
ایک کرو کیوں خونِ پسینہ

ننگوں کے ننگے پن کی تم ننگی تصویریں نہ بناؤ
کالی کلموہی چیزوں پر غازہ چھڑکو، رنگ چڑھاؤ
چھپ کر ہم جو کچھ کرتے ہیں، تم کیوں اس کو سامنے لاؤ
برخوردارو! ہوش میں آؤ

جانے کیا مقصد ہے تمھارا، صاف کہو، ابہام کو چھوڑو
کام نہیں رکتے دنیا کے، جام بھرو، انجام کو چھوڑو
جس میں ناسوروں کی بو ہو اس بھونڈے الہام کو چھوڑو
دام ملیں تو کام کو چھوڑو

فرش سے لے کر عرشِ بریں تک بیٹھا ہے قانون کا پہرا
تم کیوں مفت میں جھلاتے ہو، پرجا گونگی، راجہ بہرا
کیسے پار کرو گے سمندر، اتنا چوڑا اتنا گہرا
وہ ڈوبا جو پل بھر ٹھہرا

داناؤں نے فرمایا ہے مشکل ہے تقدیر سے لڑنا
ناممکن ہے تلواروں کا پربت کی چھاتی میں گڑنا
پکے بیروں کی قسمت میں لکھا ہے شاخوں سے جھڑنا
اور مٹی میں گلنا سڑنا

دیکھو وہ طوفان اٹھا ہے، بھاگو، غاروں میں چھپ جاؤ
ایواں کانپے، چھپر ہانپے، پلٹو پلٹو، آؤ آؤ
منزل کی رٹ بے معنی ہے، رستہ چھوڑو، جان بچاؤ
لاؤ اپنا ہاتھ بڑھاؤ

ٹھا لو بھی کچھ اپنے جی میں، مانو بھی یہ بات ہماری
لال آنکھیں کیوں جھپکاتے ہو، جسم پہ کیوں ہے رعشہ طاری
ہاتھوں میں فولاد کی سختی، سانسوں میں کوندے کی دھاری
وہ جاتی ہے راہ تمھاری

(۱۹۴۴ء)

ردِّ عمل

ملتا ہی نہ تھا نقطۂ آغازِ سفر کا　　ابہام بدلتا ہی نہ تھا حدِّ نظر کا
تاروں کی نگاہوں میں تقاضا تھا سحر کا

چلتا تھا، مگر سمت معیّن نہ ہوئی تھی　　اس دشت میں اک راہ بھی روشن نہ ہوئی تھی
اور روح رضامندِ نشیمن نہ ہوئی تھی

میں بارگہِ حسن میں اک بار گیا تھا　　لیکن یہ سفر بھی مرا بے کار گیا تھا
گو جسم بچا لایا تھا، جاں ہار گیا تھا

باہوں کو بھی سہلایا تھا، بالوں سے بھی کھیلا　　ہونٹوں سے بھی بہلا رہا، گالوں سے بھی کھیلا
تاروں پہ جھپٹنے کے خیالوں سے بھی کھیلا

کہسار کے گاتے ہوئے چشموں میں نہایا　　جھونکوں نے مجھے اپنے ہنڈولوں میں جھلایا
اک سانس نے کہرے کی نقابوں کو اڑایا

گاتے ہوئے جھرنے پہ صنوبر کی گھنی چھاؤں　　چھپتے ہوئے میدان کی چھاتی سے کئی گاؤں
بڑھتا تھا مرا شوق، لپکتے تھے مرے پاؤں

ہونٹوں کے بھبھکتے ہوئے جھرنے بھی پیے تھے　　آنکھوں کو تپاں ریت کے چھینٹے بھی دیے تھے
پوشاک بھی پہنی تھی گریباں بھی سیے تھے

ناگاہ ستاروں نے نئے پیچ لڑائے　　اٹھتے ہوئے انسان کے پرزے نظر آئے
تقدیر کی ڈوریں تھیں اشارے تھے پرائے

فرسودہ سہی کھیل، مگر ڈھنگ نیا تھا　　تھے چنگ پرانے مگر آہنگ نیا تھا
گو رنگ وہی تھے مگر اثرِ رنگ نیا تھا

اندازکی جدّت سے توجہ کو سمیٹا — کچھ دیر صنوبر کی گھنی چھاؤں میں بیٹھا

پھر عشق کا پشتارۂ بے ربط لپیٹا

خوابوں کی بلندی سے زمیں پر اُتر آیا — ہر ذرّے میں دبکا ہوا اک دل نظر آیا

ہر نقش میں صانع کا کلیجہ اُبھر آیا

چہروں پہ تجلّی تھی، نگاہوں میں پکاریں — ہونٹوں پہ تھیں افسردہ و پژمردہ بہاریں

گالوں پہ ڈھلکتے ہوئے اشکوں کی قطاریں

سہمی ہوئی، سمٹی ہوئی بکھری تھی جوانی — سڑتی ہوئی صدیوں کے تعفن کی نشانی

تاریخ کی روداد، مزاروں کی زبانی

پازیب میں زنجیر کے اٹھتے تھے چھناکے — گیتوں میں اُمنگوں کے چٹخنے کے دھماکے

آنکھیں تھیں کہ فن کار کے بگڑے ہوئے خاکے

کھیتوں کی نگہبان تھیں بگڑی ہوئی لاشیں — ناسور تھے سینوں پہ تو باہوں پہ خراشیں

چٹخے ہوئے مہتاب کی بجھتی ہوئی قاشیں

ہر پھول کو حاکم نے بنایا تھا شرارہ — اور وہم یہ ہوتا تھا کہ اُبھرا ہے ستارہ

تقدیر بڑے غور سے کرتی تھی نظارا

اک خطہ اگر کال سے پامال ہوا تھا — اک خطہ اسی کال سے خوش حال ہوا تھا

مسرور بہت "رندِ کہن سال" ہوا تھا

بارود کے بھبکے میں شرابوں کی مہک تھی — گولوں کی کڑک میں کئی کلیوں کی چٹک تھی

کچلے ہوئے اجسام میں ریشم کی لچک تھی

دیکھی نہ گئی مجھ سے جب آدم کی تباہی — بیدار ہوئی روح کی آفاق پناہی

چیخنے لگی فطرت کو مری تیز نگاہی

حائل تھیں مری راہ میں مذہب کی فصیلیں — آنکھوں پہ چبھنے لگیں قانون کی کیلیں

ڈسنے لگیں اخلاق کی بے رحم دلیلیں

بکھرتا رہا لیکن میں فضاؤں میں طرارے　　　لپٹے مرے ملبوس سے جلتے ہوئے تارے

تقدیر کھڑی ہنستی تھی سورج کے کنارے

پُر شور ہوئے مجھے بے طرح اچھالا　　　سو بار شبستانِ مشیّت سے نکالا

لیکن مجھے احساس کی شدت نے سنبھالا

مستقبلِ آدم کی سیاہی کو اُڑایا　　　ناسور کو نابود کیا پھول بنایا

گردوں کو مساوات کے محور پہ گھمایا

ہر لوح کی تحریر لہو گھول کے دے دی　　　آنکھوں کی تجلّی نئے لفظوں میں سمو دی

یہ دیکھ کے تقدیر بھی منہ ڈھانپ کے رو دی

اب میرا جہاں حسن و جوانی کا جہاں ہے　　　مقصد مرا اب خواجگیٔ کون و مکاں ہے

اے جبرِ مشیّت ترا قانون کہاں ہے

(۱۹۴۴ء)

رفتارِ زمانہ

خیالات کے دُھندلے دھندلے اُفق پر کوئی چاند جلوہ نما ہو رہا ہے

اُمیدوں کی اُجڑی ہوئی وادیوں میں کوئی شوخ نغمہ سرا ہو رہا ہے

شہنشاہوں کی مرمریں بارگاہوں میں فانوس روشن ہوئے جس کے نور سے

مشیّت کے اُلجھے ہوئے راستوں سے وہ مقہور بھی آشنا ہو رہا ہے

تمدّن کی قربان گاہوں پہ بے رنگ لاشیں نشاناتِ سفر بن رہی ہیں

حکومت کے پنجے میں محبوس و مجبور نالہ، صدائے درا ہو رہا ہے

سرور و درستی کی جنت میں کب تک میں انگڑائیوں کے ہیولے بناؤں

کہ اجداد کی خاک کا ذرّہ ذرّہ مرے پیار سو لب کشا ہو رہا ہے

رنگِ سنہ [illegible] میں زندگی کچھ پھڑپھڑائی، چٹانیں اُبھریں اور مگر اُس کے لوٹیں

وہ آئینہ خانوں میں اک شور اٹھا، یہ کیوں ہو رہا ہے یہ کیا ہو رہا ہے

جسے چند محتاط تاریخ دانوں نے مذہب کا اندھا تعصب کہا تھا

زمانے کے دربار سے مف[illegible] کو، وہ جذبِ مردان پھر عطا ہو رہا ہے

وہ کافر نگاہی! — یہ رنگیں نوائی! — کسی مصلحت کی ہے معجز نمائی
جسے طفلِ مکتب کہا جا رہا تھا وہی قابلِ اعتنا ہو رہا ہے
وہ بیلیں جو ایوانِ شاہی کے ٹوٹے ہوئے گنبدوں کو چھپاتی رہی ہیں
اب اُن کے پٹنے، لپٹ کر تڑپنے کا انداز اژدر نما ہو رہا ہے
غزال اپنے صحرا کے زنداں سے نکلے، پہاڑوں میں گھومے، سمندر میں جھلکے
اسی ولولے کے ہیں چرچے جہاں میں، یہی تذکرہ جا بجا ہو رہا ہے

(۱۹۴۴ء)

راستے کا موڑ

خیال و خواب کی دنیا سے بھاگ آیا ہوں　　جوانیوں کے چمن زار تیاگ آیا ہوں
میں بن کے راگ گیا، ہو کے آگ آیا ہوں

شفق میں ڈوبے ہوئے پربتوں پہ گھوم چکا　　ہوا میں کھوئی ہوئی راگنی پہ جھوم چکا
گلوں کے بھیگے ہوئے عارضوں کو چوم چکا

کبھی شباب کی تنہائیوں پہ رویا ہوں　　کبھی سلگتے ہوئے بازوؤں پہ سویا ہوں
اب اپنے ذہن کی پرچھائیوں کا جویا ہوں

یہ زندگی ہے، کہ حبسِ دوام ہے ہمدم　　قدم قدم پہ پرستش کا دام ہے ہمدم
یہ داستان ابھی نا تمام ہے ہمدم

جوان ہوں مگر احساس، خود شناس نہیں　　اُداس ہوں، مگر اس کی کوئی اساس نہیں
بایں ہمہ یہ سکونِ دوام راس نہیں

رواج و رسم میں بٹتا رہا خیال مرا　　دل و دماغ میں گھُلتا رہا خیال مرا
حصارِ جبر میں لٹتا رہا جمال مرا

جو کہنا چاہوں تو میری زباں پہ پہرے ہیں　　جو کہہ بھی دوں تو مرے سامعین بہرے ہیں
جو کہہ چکوں تو سلاسل ہیں اور کٹہرے ہیں

مقابلے ہیں ادھر زور آزمائی کے　　اِدھر گلے ہیں مشیت کی کج ادائی کے
سمجھ میں آ نہ سکے راز کبریائی کے

یہاں پڑے ہیں گزرگاہوں پر غریب کے لال — وہاں فضاؤں میں شعلوں کے تن بے ہیں جال
وہ زندگی کے مجاہد، یہ زندگی کے وبال

ادھر پکار کہ چاول کا ایک دانہ ملے — اُدھر اُمنگ کہ پہنائیٔ زمانہ ملے
کسی کو قبر کسی کو شراب خانہ ملے

میں رقص گاہوں میں لاکھوں کو سیر دیکھ چکا — میں شاہراہوں پہ لاشوں کے ڈھیر دیکھ چکا
میں اس تضاد کے سب ہیر پھیر دیکھ چکا

عدم میں بھٹکے ہوئے کارواں سے شکوہ ہے — مجھے نشیب و فرازِ جہاں سے شکوہ ہے
الٰہی تجھ سے ترے لامکاں سے شکوہ ہے

ترا سکوتِ پُراسرار بیکراں کیوں ہے؟ — یہ مصلحت مرے ادراک سے نہاں کیوں ہے؟
نگارہ برق میں میرا ہی آشیاں کیوں ہے؟

کہ عام ہو نہ سکی تیری رحمتوں کی شمیم — بس اب اُلٹ کے رہوں گا یہ پردہ ہائے قدیم
کوئی پکار رہا ہے مجھے — ندیم! ندیم!

میں اپنی خاک سے نکہت بنا کے دم لوں گا — میں آرزو کو حقیقت بنا کے دم لوں گا
ترے جہان کو جنت بنا کے دم لوں گا

مرے چراغ تو گن اپنے مہر و ماہ نہ دیکھ — مجھے تو دیکھ! مرے لشکر و سپاہ نہ دیکھ
مجھے بلا تو سہی! اوجِ بارگاہ نہ دیکھ

شرر ہوں اور جہنم نگلنے نکلا ہوں — میں خود ہی اپنا مقدر بدلنے نکلا ہوں
مقامرو! میں نئی چال چلنے نکلا ہوں

میں خاص خاص فرشتوں کے راز جانتا ہوں — میں آدمی ہوں بہشتوں کے راز جانتا ہوں
میں ان حجاب سرشتوں کے راز جانتا ہوں

نئی زمین نیا آسماں نگاہ میں ہے — اک آفتاب نہفتہ شبِ سیاہ میں ہے
یہ شعبدہ مرے احساس کی پناہ میں ہے

اُفق پہ نجمِ سحر جب نقاب اُٹھائے گا — عمل کے دشت میں جب عزم دندنائے گا
تو میری شعلہ مزاجی کو چین آئے گا

جب اپنے قصر میں اپنا دیا جلاؤں گا　　　　جب اپنے کھیت کا پھل آپ ہی اٹھاؤں گا
خیال و خواب کی دنیا کو لوٹ جاؤں گا

(۱۹۴۴ء)

ماہتاب فردا

شام افسردہ و پژمردہ سہی
میں تو محراب اُفق دیکھ رہا ہوں ہمدم
ایک دھندلی سی تجلّی کا وہ موہوم سا خم
بے کراں چرخ میں آزردہ سہی
اک دمکتی ہوئی انگڑائی کی تمہید تو ہے
عزم تجدید تو ہے
عزم یہ تیرے لیے مردہ سہی

آگیا وہ مرا معبودِ کہن
سرمئی جھیل پہ تاروں کے سفینے کھیتا
شام کے عارضِ شب رنگ کے بوسے لیتا
ڈالتا چہرۂ ظلمت پہ شکن
ہیں اسے گردشِ ایام کا گرداب کہوں
یا وہ مہتاب کہوں
میرے فردا پہ ہے جو عکس فگن

اب تو ہر شے ہے برافگندہ نقاب
یہ کسی شوخ کے گلنار لبوں کے محراب
یہ تبسم کی چکاچوند، یہ گالوں کے گلاب

نیم وا آنکھوں میں نظروں کی شراب
یہ سمٹتی ہوئی، باہوں میں لپٹنے کی اُمنگ
آتے جاتے ہوئے رنگ

یہ تقاضوں کا حیاؤں سے خطاب

مہہ تاباں مرے نغموں میں تپاں
اپنی کرنوں کو ذرا اور بکھر جانے دے
تیرہ و تار گپھاؤں میں اُتر جانے دے
تیرا پرتو ہو اگر شاملِ حال
اپنا جینا کسی جبار کا مرہون نہ ہو
زیست کا خون نہ ہو

ہے مری مشعلِ مریخ جلال
(۱۹۴۵ء)

کل اور آج

کل تو ہر گام پہ منزل کا گماں ہوتا تھا
آج ہر منزلِ دشوار ہے پیغامِ رحیل

کل ہر انکار تھا گستاخی و دو ہر آشوبی
آج ہر لغزشِ پا، عظمتِ آدم کی دلیل

کل ستم گیس کا اجارہ تھا سیاست بازی
آج قانون کی تشکیل کا دہقاں ہے کفیل

کل جہاں قتل کے فرمان لکھے جاتے تھے
آج وہ اوج ہے جمہور کی نظروں میں ذلیل

کل جو جبر کا نغمہ تھی نمرودِ ملوکیت نے
آج وہ نارِ جہنم ہے گلستانِ خلیل

کل تو قابیل کی ہیبت تھی دلوں پر طاری
آج آنکھوں میں اُتر آیا ہے خونِ ہابیل

کل نہ رنگی کا رخِ سرخ تھا معیارِ جمال
آج رنگی بھی ہے اللہ کی تخلیقِ جمیل

کل تھے بے مایہ سے نالے وطنیت کے نشاں
آج ذہنوں میں نہ دجلہ ہے نہ گنگا ہے نہ نیل

کل تھی جس بحر کے ساحل کی کولمبس کو تلاش
آج وہ بحر ہے سمٹی ہوئی، سکڑی ہوئی جھیل

کل فقط کاکل و رخسار سے تھی ذکرِ حسیں
آج مزدور کی تاریخ بھی ہے ذکرِ جمیل

کل جو آدم پہ کئی آفتیں بن کر ٹوٹے　　آج اُن احکام کی کرتی ہے مشیت تعمیل
آج اس اوج پہ انساں ہے جہاں تک نہ اٹھا
بالِ جبریل کا کیا ذکر ـ خیالِ جبریل

(۱۹۴۵ء)

سمندر پار کے "فرشتہ ہائے رحمت" سے
(وزارتی مشن ۱۹۴۶ء کی واپسی پر)

عذابِ جاں تھا اگر مملکت کا استقلال　　تو کیا ضرور تھے ہنگامہ ہائے گفت و شنید
معلّمینِ سیاست! تکلفات ہیں یہ　　کہ خود شناس ہے انسانیت کا دورِ جدید

نہ جانے کب سے یہ طفلانہ کھیل جاری ہے　　تمھاری "عقدہ کشائی" ـــ ہماری محرومی
مذاق پر اُتر آئی ہے جب شہنشاہی　　تو اپنے آپ کو پہچانتی ہے محکومی

تمھارے ذہن کی یہ موشگافیاں ہی تو ہیں　　کہ حریت کی خرید و فروخت ہے دُشوار
خزاں کے بعد یقیناً بہار آتی ہے　　نہیں ہے عادتِ فطرت کو مصلحت درکار

مورخوں سے کہو خون میں ڈبوئیں قلم　　بدل چکا ہے ارادے میں اضطراب اپنا
خزاں رہے کہ بہار آئے، ہرچہ باداباد
اب اک زقند کا ہے منتظر شباب اپنا

(۱۹۴۶ء)

عقیدے

اپنے ماضی کے گھنے جنگل سے ـــ
کون نکلے گا! کہاں نکلے گا!
بلے گراں رات، ستارے نابود
چاند اُبھرا ہے؟ کہاں اُبھرا ہے

اک فسانہ ہے تجلّی کی نمود
کتنے گنجان ہیں اشجار بلند
کتنا موہوم ہے آدم کا وجود

مضمحل چال ــــ قدم بوجھل سے
اپنے ماضی کے گھنے جنگل سے

مجھ کو سوجھی ہے نئی راہِ فرار
آہن و سنگ ــــ شرر برسائیں
آؤ اشجار کی بنیادوں پر
تیشۂ و تیغ و تبر برسائیں
اک تسلسل سے ہم اپنی چوٹیں
بے خطر بارِ دگر برسائیں

ذہن پر چھائے ہوں کیوں بادل سے
اپنے ماضی کے گھنے جنگل سے

نوعِ انساں کو نکلنا ہوگا
ان اندھیروں کو نگلنا ہوگا

(۱۹۴۶ء)

خون

شفق، شراب، شرارہ، گلاب، گال گلال
انھیں سے میں نے حقائق کی تلخیاں دھوئیں
یہ سب کبھی مری فن کاریوں کا غازہ تھے
انھیں سے رنگ مری شاعری کے تازہ تھے

شباب میرے ترانوں کی شوخ سُرخی تھی
مگر ندیم یہ کتنی کڑی حقیقت ہے
مری نظر میں صداقت بھی تھی شراب آلود
کہ میرے ذہن کی انگڑائیاں تھیں خواب آلود

مری نگاہ شبستانِ یار پر تو پڑی
نہ پا سکی وہ اٹل، وہ عظیم سچائی
مگر وہیں سے پلٹ آئی لڑکھڑاتی ہوئی
رواں ہے جو دلِ انساں میں سرسراتی ہوئی

شفق، شراب، شرارہ، گلاب، گال، گلال
یہ رنگ پھیکے ہیں، مجھ کو نہ تھا مگر معلوم
اک اور رنگ ہے جو رنگ بھی ہے نور بھی ہے
بغیر اُس کے شباب و نگار سب معدوم

سنور چکی ہے اسی رنگ سے عروسِ حیات
یہی سنگار اب اک اور رنگ لائے گا

پھٹے گا قلبِ زمیں، بلبلا اٹھے گا لہو
زمانہ چاہے گا لیکن اماں نہ پائے گا

(۱۹۴۶ء)

ناگزیر

دریچوں میں جالے، جھروکوں میں سائے، ستونوں پہ دھبے، چھتوں پر دھندلکے
ہوا میں مچلتے ہوئے سے اندھیرے، کہیں گہرے گہرے، کہیں ہلکے ہلکے

اِدھر مرمریں فرش کی اُکھڑی اُکھڑی سلوں پر ہیں قرنوں کی چوٹیں نمایاں
اُدھر آئینہ رنگ دیوار پر ہیں خراشوں کی صورت میں صدیوں کے عنواں

یہاں ڈھول پر چند کیڑوں نے لکھی ہے تاریخِ ماضی انوکھی زباں میں
وہاں اک مموے کے پنجوں کی دھاری۔ گریں پتیاں جیسے آبِ رواں میں

دریچوں میں پردے، جھروکوں میں شمعیں، ستونوں پہ روغن، چھتوں پر اُجالے
کھُلے تذکرے زلف و رخسار و لب کے، دُھلے قہقہے جیسے روئی کے گالے

یہ ملبوس کی سلوٹوں میں، ہوا میں فضا میں رواں ایک گمبھیر خوشبو
یہ باہوں میں جکڑے ہوئے نرم پیکر، لچک جیسے کونپل، لپک جیسے آہو

اِدھر مرمریں ساغروں میں مئے ناب رقصاں ہے جیسے گلابی سویرا
اُدھر آئینہ رنگ دیوار پر ہے کسی اجنبی مملکت کا پھریرا

نہیں۔ وقت، سورج کی زرکار بہلی کو، پل بھر کو بھی روک سکتا نہیں ہے
نہیں۔ یہ جہاں دیدہ کاہن کبھی الفنا بات کو ٹوک سکتا نہیں ہے

لپکنا ہے اس کے مقدر میں شامل، پلٹنا بھی دشوار، تھمنا بھی مشکل
یہ راہی قیامت میں ستا سکے گا، ازل اس کی نگری، ابد اس کی منزل

اگر وقت کی شاہراہیں معین ہیں — یہ شام، یہ شب، یہ پَو، یہ سویرا
تو دہکے ہوئے سُرخ پہیوں کے چکر میں جل جائے گا اجنبی کا پھریرا

(۱۹۴۶ء)



اعجاز ہے یہ تیری پریشاں نظری کا　　　الزام نہ دھر عشق پہ شوریدہ سری کا
اس وقت مرے کلبۂ غم میں ترا آنا　　　بھٹکا ہوا جھونکا ہے نسیمِ سحری کا
تجھ سے ترے کوچے کا پتہ پوچھ رہا ہوں　　　اس وقت یہ عالم ہے مری بے خبری کا
یہ فرش، ترے رقص سے، جو گونج رہا ہے　　　ہے عرشِ معلّٰی مری عالی نظری کا
کہرے میں تڑپتے ہوئے اے صبح کے تارے
احسان ہے شاعر پہ تری چارہ گری کا

(۱۹۴۱ء)



جانے کہاں تھے، اور چلے تھے کہاں سے ہم　　　بیدار ہو گئے کسی خوابِ گراں سے ہم
اے نوبہارِ ناز، تری نکہتوں کی خیر　　　دامن جھٹک کے نکلے ترے گلستاں سے ہم
پندارِ عاشقی کی امانت ہے آہِ سرد　　　یہ تیر آج چھوڑ رہے ہیں کماں سے ہم
آؤ غبارِ راہ میں ڈھونڈیں شمیمِ ناز　　　آؤ خبر بہار کی پوچھیں خزاں سے ہم
آخر دعا کریں بھی، تو کس مدعا کے ساتھ
کیسے زمیں کی بات کہیں آسماں سے ہم

(۱۹۴۲ء)



انگڑائی کی اوٹ میں جانے، پوشیدہ ہیں کتنے بہانے — مفت میں اٹھے ہو دنیا کو اوجِ ثریا سے ٹکرانے
حسن کی بزمِ نازیں کیسے سنجیدہ بن کر بیٹھے تھے — عشق نے ایسا نالہ کھینچا بھاگ اُٹھے اپنے بیگانے
عدل کا دعویٰ کرنے والا مجھ پر کیا الزام دھرے گا — اُس نے میرا سچ بھی لوٹا، میں نے اُس کے جھوٹ بھی مانے
دُور بھی کر پُر ہول اندھیرے، روک بھی لے سیلابِ تباہی — ورنہ تھک کر چل نکلوں گا طوفانوں میں دیئے جلانے
تیرا پتہ تو خیر، نہ پایا، اب گھر کا رستہ تو دکھا دے — ٹامک ٹوئیے مار کے آخر بھول گیا ہوں ٹھور ٹھکانے
سورج کے زرتار کلس پر اونگھ گیا قسمت کا پنچھی — آؤ چلیں سب خفتہ مقدر، چرخ کا نیلا گنبد ڈھانے
کانٹوں سے بچنے کی خاطر ہم نے اتنا وقت گنوایا — وہ ندی کس شان سے لپکی، کہساروں میں راہ بنانے
عشق کا یہ انداز نہ بھایا، بجھے دیے پر کوئی نہ آیا — لَو کانپی تو چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے لاکھوں پروانے
آج سراپا گوش ہے عالم، کہہ دے جو کچھ کہنا چاہے — پھر طوفانِ سنگ کی زد میں آ نہ سکیں گے آئینہ خانے
آخر اس گھمسان کے رن میں روح کہاں تک جم کر لڑتی — حسن آیا آنکھوں کو رجھانے، عشق چلا دل کو بہکانے
عمر کے ساتھی سے یہ دھڑکا، چلمن سرکی، شعلہ بھڑکا — آنکھوں نے تو بہت کچھ دیکھا، دل کیا جانے، دل کیوں مانے
گلیوں کے موڑوں پہ ٹھٹکنا، رُکنے کی کوشش میں لپکنا — پہروں تکنا اور نہ تھکنا، ہائے وہ نادانی کے زمانے
راتوں کے سونے محلوں میں تانیں کون اُڑا جاتا ہے — شاید اس تاریک خلا میں لرزاں ہیں ماضی کے ترانے

پھر احساس کے دوراہے پر وہ حیران ندیم کھڑا ہے
لو رب تیرا، پچھم تیرا، یہ بدبخت کہاں کی ٹھانے

(۶۰۱۹۴۲)



چاندنی پر گماں سیاہی کا — شعبدہ تیری کم نگاہی کا
زشت اور خوب کے شعور میں ہے — رازِ انسان کی تباہی کا
بندے کی خواہش خداوندی — زیرِ دریا، خیمہ اُمّ ماہی کا
صبح کے سیل رنگ و نور سے پوچھ — مدعا رات کی سیاہی کا
مردنی چھا گئی اوامر پر — ذکر جب چھڑ گیا تو ذاتی کا
پاسبانوں کو جبر کی تاکید — اور دعویٰ جہاں پناہی کا
اے مرے عشق ۔ میری تنہا بھول — وقت آیا تری گواہی کا

ڈوبتا چاند ہے جواب ندیم
میری فریادِ صبح گاہی کا
(۱۹۴۴ء)

○

فروغِ ماہ میں تو اور شبِ سیاہ میں تو
بہر لباس نمایاں مری نگاہ میں تو

ترے غرور کے انداز سے ہویدا ہے
نہ مل سکے گا مجھے زندگی کی راہ میں تو

اب اس سے بڑھ کے ثبوتِ بقا نہیں ممکن
تری پناہ میں دنیا، مری پناہ میں تو

ترے لبوں کے کناروں پہ کپکپی کیسی
کھڑا ہے جیسے محبت کی بارگاہ میں تو

درود کی ابدیت ہے قرب کی معراج
نہ کھل سکے گا ملاقات گاہ گاہ میں تو

چراغ تھکنے لگے، بھیگنے لگیں آنکھیں
کب آ سکے گا مرے خانۂ تباہ میں تو

اس اجتناب کے صدقے تو کہوں گا حشر کے دن
کہ منعکس تھا مری خواہشِ گناہ میں تو
(۱۹۴۶ء)

○

یہ میری بے جہتی ہے کہ تیری بے خبری
مرا جنوں عملی ہے - تری خرد نظری

اب آفتاب کی باری ہے رات بھاری ہے
میں دیکھتا رہوں کب تک ستارۂ سحری

یہ ایک قطرۂ شبنم ہے آفتاب بدست
بہت قریب سے دیکھی ہے فطرتِ بشری

جہاں سے پھول کھلا تھا وہیں کلی چٹکی
اگر ہے فتنہ یہی، تو نثار فتنہ گری

زمیں اداس، ستارے اداس، چاند اداس
یہ پچھلی رات ہے یا تیری شانِ کم نظری

یہ تجھ کو دیکھ کے کیوں لوگ مجھ کو دیکھتے ہیں
یہ تیری جلوہ گری ہے کہ میری پردہ دری

فلک پہ ٹوٹے ستارا، زمیں پہ اشک گرے
مرے ندیم یہی ہے کمالِ بخیہ گری
(۱۹۴۶ء)

○

یہ کیں شب تار [illegible] شب تار
جینا بھی دشوار، مرنا بھی دشوار

ہونٹوں کی لرزش کچھ کہہ رہی ہے
اک مدعا ہے محتاجِ اظہار

بنیاد جن کی خود آگہی ہو
وہ مستیاں ہیں مستوں کو درکار

سانسوں میں رم ہے، آنکھوں میں دم ہے　　کس نے بلایا دریا کے اُس پار
اے ذوقِ پرواز اب ضبط کیسا!　　اٹھتی رہے گی زنداں کی دیوار
شہکارِ فطرت! اے وائے فطرت　　ہر چیز معصوم، انسان عیار!
حکمِ مساوات اور امتیازات　　تارے دل افروز، کلیاں دل افگار
انسان اب کچھ نکھرے، تو نکھرے　　سونے پڑے ہیں شاہوں کے دربار

ہم تو ندیم اب اُکتا چلے ہیں
انوار، ظلمات ــــ تکرار تکرار

(۱۹۴۶ء)



زلفِ سیاہ خم بہ خم، نورِ جمال یم بہ یم
رازِ حیات کی قسم، جلوۂ ذات کی قسم
تیرا رواج رہنما، میرا مزاج رہنما
میرا عدم بھی عینِ زیست، تیرا وجود بھی عدم
چھٹنے لگے سحاب کیوں، اٹھنے لگے حجاب کیوں
لُٹنے لگا ہے میرا غم، گھٹنے لگا ہے میرا دم
کیفِ وصال سے سوا، قربِ جمال سے سوا
میرے خیال سے ترا میرے خیال ہی میں رم
لہریں مرے جنوں کی ہیں، سرخیاں میرے خون کی
چہرۂ شہریار پر میرا فسانہ ہے رقم
بوئے چمن کی بحث تھی، وہ جو نہیں تو کچھ نہیں
برگِ گلاب پر ابھی رنگ تو ہوں گے مرتسم

(۱۹۴۶ء)



سنا ہے تو مری پرواز کا مخالف ہے　　تری خوشی کے لیے اپنے پر کترتا ہوں

مجھے بھی رخصتِ تعمیرِ آشیاں دیجے　　چلے ہیں آپ اگر بجلیاں گرانے کو

یہ التفات نہیں، انقلاب ہے دل کا　　یہ میرا ذوقِ نظر ہے، جمالِ یار نہیں

یہی لٹی ہوئی نیندیں، یہی فسردہ دلی　　میں سوچتا ہوں کہ سب کچھ لٹا کے کیا پایا

مجھے اور زندگی دے، کہ ہے داستاں ادھوری　　مری موت سے نہ ہوگی، مرے غم کی ترجمانی

یہ تری طفلانہ تعمیریں شکست انجام ہیں　　اوس کے قطروں کو کرنوں میں پرونا چھوڑ دے

جہاں پناہ مجھے بازوؤں میں لے لیجے　　مری تلاش میں ہیں گردشیں زمانے کی

ہر مسرت سے سرگرانی ہے　　کیا یہی عالم جوانی ہے

یہ انجم ہوئیں، ایوانوں کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں　　خدا انسان کو سمجھا رہا ہے استعاروں میں؟

فصلِ گل آئی، نشیمن جل گئے　　ہائے دیوانوں کی دور اندیشیاں

سجدے بھی ہیں، ثنا بھی ہے، حمد بھی ہے، دعا بھی ہے　　اشک مگر کہیں نہیں، دامنِ پاک باز میں

اک بڑا حادثہ تھا، ایک بڑا واقعہ تھا　　اوّل اوّل تری نظروں سے شناسا ہونا

گو روح زندگی کے فسوں سے اداس تھی　　مرنے کے وقت بھی مجھے جینے کی آس تھی

لطف تو جب تھا طوفاں میں بھی اس کی لو تھراتی رہتی　　جس نے تیری راہ نہ دیکھی اب وہ دیا جلا نا کیسا

ندیم

شعلۂ گل

(تیسرا مجموعۂ کلام)

لمحہ بہ لمحہ

ریستوران کے فرش پہ لرزاں سائے رقاصاؤں کے
ذہن میں جیسے گڈمڈ ہو کر ناچیں رازخداؤں کے
چھنن چھنن چھن! اے رقاصہ! فن پر یہ آوازے کیوں؟
جس کی لو سے پھول لجائیں اس چہرے پہ غازے کیوں؟
یوں تک جیسے چاند کی کرنیں، یوں سُن جیسے رب قدیر
وقت کے اس لمحے کا تاثر عالمگیر ہے عالمگیر

(۲)

راوی کی لہروں پہ رواں ہیں قاشیں چاند ستاروں کی
کس منزل کو لپکی یہ نورانی فوج سواروں کی
چپ شپ! جھکتے تنتے مانجھی! تجھ کو سبک ڈانڈوں کی قسم
دھیرے دھیرے، ہولے ہولے، کاٹ یہ ابرو کا سا خم
یوں مڑ جیسے پھول کی پتی۔ یوں چل جیسے سرگوشی
وقت کے اس لمحہ کا تقاضا مدہوشی ہے مدہوشی

(۳)

کھیتوں کی ہریالی پر یہ دھبّے ہیں دہقانوں کے
یا گیتی نے اُگلے بوسیدہ تابوت انسانوں کے
سر سر! دھپ دھپ ہائے محنت کش! چھوڑ درانتی توڑ کدال
چاک ہوئی، دھرتی کی چھاتی مجھ کو اس محشر سے نکال
چار طرف سے گھیر چکے ہیں جلتی سانسوں کے پیچاک
وقت کے اس لمحے کی حقیقت آتش ناک ہے آتش ناک
یہ کس راجہ کا ایواں ہے جلسے کے انباروں میں
جیسے بلوائی کی بیٹھک لٹے ہوئے بازاروں میں
اُلٹی سانسیں! اٹکی آہیں! اے راہی یہ راز ہیں کیا؟
پچکے پیٹ، دریدہ رانیں، زیست کے یہ انداز ہیں کیا؟
راجہ اٹھا، ڈال کے اپنی بگھی میں فردا کا نظام
وقت کے اس لمحے کا ارادہ خون آشام ہے خون آشام

(۴)

معصوم انساں کے لاشے پر فتح کے پرچم لہرائے
استبداد کی بیخ کنی میں کتنے انساں کام آئے
ہاریں استبدادی قومیں، لیکن کس کی جیت ہوئی
یورپ کی بے رحم سیاست پورب کی کب میت ہوئی
تمغوں کی تقسیم ہوئی ہے پورب کے بلوانوں میں کیا
"مال غنیمت" سجتا ہے یورپ کے تمدن خانوں میں

(۵)

نومیدی کی دھند میں غلطاں جگنو احساسات کے ہیں
اوس کے پرّاں قطرے ہیں یا تارے پچھلی رات کے ہیں
جگنو اُڑتے شعلے بن کر دھرتی سے ٹکراتے ہیں

جھلمل جھلمل، ڈگمگ ڈگمگ، ہچکولے سے آتے ہیں
موت سے بھڑ جانے کے ارادے، اور جینے کی تیاری
وقت کے اِس لمحے کا بلاوا بیداری ہے بیداری

(۱۹۴۶ء)

نا تمام

کنول کی پیالیوں کو دھول سے لبریز کرنے کو
ہوائیں جھاڑیوں کی آڑ میں گھاتیں لگاتی ہیں
اُفق پر مرتسم شہتوت کے موہوم سائے کو
اُبھرتے چاند کی کرنیں نمایاں کرتی جاتی ہیں
یہ جگنو اُڑ رہے ہیں، یا بقا کی طعنہ زن پریاں
پلوں کو لوٹ کر میری فنا پر مسکراتی ہیں
ستارہ ٹوٹتا ہے، تیرگی کا پیٹ بھرتا ہے
ارادے پھولتے ہیں، قسمتیں طوفاں اُٹھاتی ہیں
مجھے معلوم ہے۔ یہ پھول کانٹوں کے نشیمن ہیں
مگر گل چینیوں سے کب اُمنگیں باز آتی ہیں

نہیں اے ہم نفس! میں جنتِ عرفاں سے باز آیا
مجھے حسنِ مجسم کا یقیں آئے تو کیوں آئے!
زمیں پر اِس لیے بھیجا گیا ہے ابنِ آدم کو
کہ رحمت کے لیے دامن بڑھائے، بجلیاں پائے
مشیت کے مظاہر کا بظاہر مدعا یہ ہے
کہ انساں چند سالوں کے لیے نابود ہو جائے
[illegible] ہیں مہریں وراثت کی
تو انساں [illegible] جائے

میں شاعر ہوں مجھے تاویل کے حیلے نہیں آتے
فقیہوں کا یقیں کوئی کہاں سے ڈھونڈ کر لائے

یقیں — یعنی جہنم پر گلستاں کا گماں کرنا
چٹانوں تک کو انبارِ حریر و پرنیاں کہنا
کسی موہوم منزل کے تصور میں رواں رہنا
شکستہ تربتوں کو اس مسافت کے نشاں کہنا

نہ آنکھیں کھولنا پل بھر، نہ سننا دل کا واویلا
مصیبت کو مسرت، ابتلا کو امتحاں کہنا
شکستِ آگہی کو عرش کی عظمت عطا کرنا
تصور کو خلا، عجزِ نظر کو آسماں کہنا
پروں کو کیا کروں، پرواز پر بیٹھے ہیں جب پہرے
مجھے آتا نہیں کنجِ قفس کو آشیاں کہنا

فرشتوں نے اگر سجدہ کیا تھا ابنِ آدم کو
تو اب مسجود کے بارے میں، جانے کیا ارادے ہیں
یہاں اک دانۂ گندم نے لوٹی آبرو اپنی
وہاں مغرب میں صدیوں کے لیٹرے شاہزادے ہیں
یہاں عورت کی ننگی چھاتیوں سے خون رستا ہے
وہاں کی ویشیاؤں کے بھی اطلس کے لبادے ہیں
اگر اک واقعہ ہوتا تو کہتے اتفاق اس کو
مگر لاکھوں سزائیں، اور سزاؤں کے اعادے ہیں
لپکتی بجلیاں سرگوشیاں کرتی ہیں آپس میں
کہ فرزندانِ آدم، کتنے بھولے، کتنے سادے ہیں

مری سادہ دلی میرا مقدر بن ہی نہیں
مجھے احساس ہے انسان کی گردوں مقامی کا
نہ جانے مجھ پہ افرنگی کی شاہی کیوں مسلّط ہے
بھلا اک فرض کیا کم تھا مشیّت کی غلامی کا
بغاوت بندگی سے اور آدم کش عناصر سے
یہی چارہ ہے باقی عمر بھر کی تشنہ کامی کا
زمیں کی دھجّیاں تاروں کی جانب اُڑنے والی ہیں
یہی اب کام دیں گی نوعِ انساں کے پیامی کا
ترے ابہام کے اسرار کو اب فاش کر ورنہ
قیامت ہی نہ ہو انجام میری ناتمامی کا

(۱۹۴۶ء)

آزادی کے بعد

کتنے خاکے مری اُمنگوں کے
پیچ کھاتے ہیں یوں ہواؤں میں
جس طرح چرخ کے تمام نجوم
یک بیک اڑ چلیں خلاؤں میں

کونپلوں سے اُگے ہیں انگارے
جن کی حدت سے تپ رہے ہیں چمن
بُن رہے ہیں گلے سڑے پتّے
کتنی جامد حقیقتوں کے کفن

روٹیاں، بوٹیوں سے تلتی ہیں
عصمتوں کی بجی دکانوں پر
پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے
خون کا ذائقہ زبانوں پر

آدمیت پلٹ کے تکتی ہے
اپنے بچپن کے رہ گذاروں کو
جیسے معزول شہریار گنے
اپنی عظمت کی یادگاروں کو

زندگی، عزم زندگی سے تہی
کارواں کے غبار میں گم ہے
زاہد کہنہ سال کی مانند
مقبروں کے شمار میں گم ہے

ایک آفاق گیر سناٹا!
زندگی! زندگی! پکارتا ہے
سٹپٹاتا ہے اپنے ہونٹوں سے
خون کی پپڑیاں اُتارتا ہے

زندگی کو سنبھالنے کی مہم
کب مقدر کے اختیار میں ہے
یہ زمیں، یہ خلا کی رقاصہ
آدم نو کے انتظار میں ہے

(۱۹۴۸ء)

رات بے کراں تو نہیں

نجوم بجھتے رہیں، تیرگی اُمڈتی رہے
مگر یقینِ سحر ہے جنھیں — اُداس نہیں

اُفق دھڑک تو رہا ہے، دکھائی دے کہ نہ دے
شفق اُبل تو رہی ہے، دکھائی دے کہ نہ دے
گلوں پہ اوس شعاعوں کے انتظار میں ہے
کہ اس کے حسن کی عظمت کرن کے پیار میں ہے

وہ ایک اور ستارہ لرز کے ٹوٹ گیا!
بجا کہ رات بھیانک ہے، بے کراں تو نہیں
عظیم وقت کی رفتار رائیگاں تو نہیں
سُنا ہے دو قدم آگے مہک رہے ہیں چمن
اسی لیے تو ہواؤں میں ہے لطیف چبھن
اسی لیے تو اندھیرے میں پڑ رہی ہے شکن
اسی لیے تو قدم تیز تیز اُٹھتے ہیں
طلسم شب کا یہی توڑ ہے، قدم نہ رُکیں
اندھیرا ٹوٹ کے برسے، مگر یہ سر نہ جُھکیں
نجوم بجھتے رہیں، تیرگی امڈتی رہے
سحر کا توڑ کسی ذی نفس کے پاس نہیں
(۱۹۴۹ء)

جبر و اختیار

ایک موہوم ثقافت کے علم بردار ہو تم
ایک بے رحم صداقت کا گنہگار ہوں میں
ایک خوابیدہ مشیت کے پرستار ہو تم
ایک تابندہ حقیقت کا خریدار ہوں میں
ایک ٹوٹی ہوئی زنجیر کی جھنکار ہو تم
ایک سوتی ہوئی شمشیر جگر دار ہوں میں
تم نے افراد سے پیمانِ محبت باندھا
آدمیت کے تقاضوں کا وفادار ہوں میں
چمن افروزیٔ شبنم سے مجھے کیا لینا
حدتِ مہر سے جلتا ہوا گلزار ہوں میں

میں اگر بھوک کی شدت کا گلہ کرتا ہوں
تم عقیدوں کے غبارے مجھے لا دیتے ہو
میرے ملبوس کے پُر ہول شگافوں کے عوض
کتنی تقدیس سے فرمانِ حیا دیتے ہو
شررِ سنگ ہے کب سے مری بستی کا چراغ
تم تجلّی کو بلندی پہ لٹا دیتے ہو
ریشۂ گل میں لہو دوڑ رہا ہو، تو مجھے
پھول کا نام بدلنے پہ سزا دیتے ہو
چونک اُٹھتی ہے مری چاپ سے جب ظلمتِ شب
تم ستاروں کو ستاروں سے بھڑا دیتے ہو
تم کو اس وقت بھی معلوم نہیں ہے شاید
کہ زمانہ تو بہت دُور نکل آیا ہے
آج سلجھائے گی جمہور کی آواز اُسے
تم نے تاریخ میں جس بات کو اُلجھایا ہے
اب مرا ذوق کسی قید کا پابند نہیں
تم نے صدیوں مرے وجدان کو ترسایا ہے
نوعِ انساں کے نئے عزم کی تکریم کرو!
جب کہ ذرّہ بھی قیامت کی خبر لایا ہے
تم ہی کہہ دو کہ سمندر ہے کف آلودسا کیوں
کیا چٹانوں سے سفینہ کوئی ٹکرایا ہے؟

(۱۹۴۹ء)

درانتی

چمک رہے ہیں درانتی کے تیز دندانے
خمیدہ ہل کی یہ الھڑ، جوانِ نوزِ نظر

سنہری فصل میں جس وقت غوطہ زن ہوگی
تو ایک گیت چھڑے گا مسلسل اور دراز
ندیم ازل سے ہے تخلیق کا یہی انداز
ستارے بوئے گئے آفتاب کاٹے گئے
ہم آفتاب ضمیرِ جہاں میں بوئیں گے
تو ایک روز عظیم انقلاب کاٹیں گے
ہم انقلاب ضمیرِ جہاں میں بوئیں گے
زمیں پہ خلدِ بریں کا جواب کاٹیں گے
کوئی بتائے زمیں کے اجارہ داروں کو
بلا رہے ہیں جو گزری ہوئی بہاروں کو
کہ آج بھی تو اسی شانِ بے نیازی سے
چمک رہے ہیں درانتی کے تیز دندانے
سنہری فصل تک اس کی چمک نہیں موقوف
کہ اب نظامِ کہن بھی اسی کی زد میں ہے
خمیدہ بل کی یہ الھڑ جوان نورِ نفیر
جب اس نظام میں لہرا کے غوطہ زن ہوگی
تو ایک گیت چھڑے گا — مسلسل اور دراز
ندیم! ازل سے ہے تخلیق کا یہی انداز
ستارے بوئے گئے آفتاب کاٹے گئے

(۱۹۵۰ء)

سفر جاری ہے

کنارِ آبِ رواں شبنمی شگوفوں میں
جہانِ رنگ شعاعوں کے انتظار میں ہے
ندی کی نرم روی میں نجوم اُگتے ہیں
اُداس چاند نہاں نور کے غبار میں ہے

سحر کا ہے یہ تقاضا کہ آفتاب اُبھرے
یہ جگنوؤں کا اک انبوہ کس شمار میں ہے

یہیں رُکیں کہ چلیں، کچھ بڑھیں کہ سستا لیں
تھپک رہی ہیں ہوائیں، اُفق بلاتا ہے

سحر تو آئے گی، آتی رہے گی، دم لے لیں
دلوں کی کوئی، مگر چٹکیاں بجاتا ہے

فضائے شب تو بہت خوابناک ہے لیکن
اُفق خود اُٹھ کے بھلا کس کے پاس آتا ہے

وہ ایک پل جو تجلی سے ہم کنار ہوا
ہماری تیز روی کا ہے ایک اجرِ عظیم

یہاں خرام ہوائیں رواں ہیں سنّاٹے
وہاں اُفق پہ مگر گیت گا رہی ہے نسیم

وہ صبح طنز ہے اپنی شکستہ پائی پر
گرے جو پیرہنِ وقت سے ڈھلک کے ندیم

(۱۹۵۰ء)

موضوع

فن بڑی چیز ہے، تخلیق بڑی نعمت ہے
حسن کاری کوئی الزام نہیں ہے اے دوست

ہے مرے مدِّ نظر آج بھی تخلیقِ جمال
گیسوئے شب میں اُلجھتے ہوئے تاروں کے خیال

وہ جوانی کے گلابوں سے مہکتے ہوئے جسم
پھسلتی باہوں میں مدہوش، لپکتے ہوئے جسم

کنجِ گلشن کی خموشی میں اُمنگوں کے ہجوم
صندلی رُخ پہ بدلتے ہوئے رنگوں کے ہجوم

پیار کی پیاس میں کھلتے ہوئے ہونٹوں کی پُکار
آنکھوں آنکھوں میں لگن کا مترنّم اظہار

فن کی تعمیر ہوئی ہے انہی ایوانوں میں
یہی مقبول تھے، ماضی کے غزل خوانوں میں

انہی کلیوں سے کھلائے گئے گلزار اب تک
انہی شمعوں سے اجالے گئے دربار اب تک

انہی جھونکوں سے روایات میں باقی ہے حیات
منعکس ہے انہی آئینوں میں انساں کا ثبات

میں اگر ان سے الگ بات کروں تو دراصل
یہ فقط گردشِ ایام نہیں ہے اے دوست

حُسن بیٹھا ہے سرِ راہ بھکاری بن کر
میرا اندازِ نظر خام نہیں ہے اے دوست

چند اُڑتے ہوئے لمحوں کی حسیں عکاسی
میرے فن کا تو یہ انجام نہیں ہے اے دوست

پہلے میں ماہیتِ حُسن تو پالوں — ورنہ
حُسن کاری کوئی الزام نہیں ہے اے دوست

جن کی تخلیق سے ہے حُسن کی قدروں میں دوام
ان کے ہاتھوں کی خراشیں تو مٹالوں پہلے

جن کی محنت سے عبارت ہے جمالِ عالم
اُن کو آئینہ دکھانا بھی تو فن کاری ہے

ان کی آنکھوں میں جو شعلہ سا لرز اٹھتا ہے
ان کا احساس دلانا بھی تو فن کاری ہے

اہلِ ثروت نے عقابوں کا بھرا ہے بہروپ
بھولی چڑیوں کو جگانا بھی تو فن کاری ہے

کھیت آباد ہیں، دیہات ہیں اُجڑے اجڑے
اس تفاوت کو مٹانا بھی تو فن کاری ہے

لب و رخسار کو موضوعِ سخن ٹھہرالوں
لیکن اس رنگ کا ماحول تو پالوں پہلے

گن تو سکتا ہوں میں پیچ و خمِ کاکل، لیکن
ذہن سے بارِ سلاسل تو ہٹالوں پہلے

جن کی تخلیق سے فن کار سبق لیتا ہے
ان کے ہاتھوں کی خراشیں تو مٹالوں پہلے

(۱۹۵۰ء)

انسان عظیم ہے خدایا

اس نے تجھے عرش سے بلایا
انسان عظیم ہے خدایا!

تو بسترِ کہکشاں پہ لیٹا
تاروں کو بتا رہا تھا راہیں
اس خاک کے تودۂ رواں پر
پڑتی ہی نہ تھیں تری نگاہیں
وہ تجھ کو زمیں پہ کھینچ لایا
انسان عظیم ہے خدایا!

تو نور ہی نور بن رہا تھا
وہ خاک ہی خاک چھانتا تھا
آنکھیں تھیں تری جھلک سے محروم
لیکن تجھے دل سے مانتا تھا
اب چھونے لگا ہے تیرا سایہ
انسان عظیم ہے خدایا!

تو سنگ ہے اور وہ شرر ہے
تو آگ ہے اور وہ اُجالا
تو نم ہے نمو کا پاسباں وہ
تو دشت ہے وہ چراغِ لالہ
انساں نے تجھے حسیں بنایا
انسان عظیم ہے خدایا!
تو عینِ حیات ہے، مگر وہ
تزئینِ حیات کر رہا ہے
اس پر ہے غلط فنا کا الزام
سامانِ ثبات کر رہا ہے
اب جینے کا ڈھب سمجھ میں آیا
انسان عظیم ہے خدایا!
تو وقت ہے، روح ہے، بقا ہے
وہ حسن ہے، رنگ ہے، صدا ہے
تو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے
وہ ایک مسلسل ارتقا ہے
ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا!

(۱۹۵۰ء)

فنونِ لطیفہ

یہ رقص و نغمہ، یہ شعر و ادب، یہ حکمت و فن
حیات کش ہیں، نہیں ہیں اگر حیات آموز
فقط فسونِ تصور، فقط طلسمِ خیال
یہ آسماں کے ستارے نہیں زمیں افروز

نکل کے دھند سے جو کہر میں اُتر جائے

اُس آفتاب کے طالب نہیں مرے شب و روز

وہی کرن ہے کرنِ ارتقاء کی نظروں میں

جو گھُل کے ریشۂ گُل میں نفوذ کر جائے

جو رنگ بن کے سما جائے بند کلیوں میں

جو آگ بن کے رگِ سنگ میں اُتر جائے

جو آب جو پہ گرے عکس بن کے تاروں کا

جو اوس بن کے لبِ آب جو بکھر جائے

سنٹرل جیل۔ لاہور (۱۹۵۱ء)

حُسنِ تخلیق

تالاب کی سطح پر گرا اک پتّا

اک پل کو رُکا رہا کہ شاید شاخیں

ٹوٹے ہوئے زیور کے اٹھانے کو جھکیں

یا پیڑ کے عکس ہی کو رحم آ جائے

گہنا ٹوٹے مگر نہ کھونے پائے

میدان کی سمت سے چلا اک جھونکا

تالاب کو گدگدا کے اُس پار گیا

پتّے کے قدم اکھڑ گئے، ہار گیا

آبی حلقوں میں جب اُلجھ کر پہنچا

آنسو کی طرح اک اور پتّہ ٹپکا

پت جھڑ کا طلسم بھی بالآخر ٹوٹا

ٹوٹے پتّے نگینے بن کر پھوٹے

پتّوں کی عبا پہن کے ننگے بوٹے

تالاب کے آئینے میں یوں ابھرے
جیسے وادی میں بادلوں کے سائے
پتا پتا پلٹ پلٹ کر آیا
تجدید کی چھلنی سے بیاپے چھن کر
تخلیق کے حسن کا تسلسل بن کر
لوگ اس کو جو انقلاب کہتے ہیں
نیرنگیٔ ارتقا سے غافل نہ رہیں

(۱۹۵۲ء)

سمت

شام ہاتھوں میں شعاعوں کے لیے انگارے
دور پربت کے جھروکے میں نظر آتی ہے
ابنِ آدم کو اگر سمت کا احساس نہ ہو
ایک پل کو تو یہ سمجھے کہ سحر آتی ہے
وہی موہوم اُجالا، وہی لالی، وہی کیف
وہی اک گونج میں لپٹا ہوا سناٹا ہے
کون جانے کوئی ڈوبا ہے کہ اب اُبھرے گا
کس نے آغاز کیا؛ کس نے سفر کاٹا ہے

شام کے بعد شعاعوں کے بجھے انگارے
رخِ گیتی پہ اُترنے لگے کاجل بن کر
صبح ہوتی تو تجلّی کا امڈتا سیلاب
سنگ و آہن کی فصیلوں سے بھی آتا چھن کر

جھٹپٹا ہے یہ گجر دم کا دھندلکا تو نہیں
کور چشمی کا یہ الزام نہ اپنے سر لو
صبح کے جشن کا انجام کہیں رات نہ ہو
تم جو چاہو تو ابھی سمت معین کر لو

(۱۹۵۲ء)

آخری کھٹکتا گیت

شاہراہِ ہستی کے　　　موڑ کتنے بے ڈھب ہیں
ان گنت عقیدے ہیں　　　بے شمار مذہب ہیں
اپنی اپنی چالیں ہیں　　　اپنے اپنے مشرب ہیں

ثبت دیکھتا ہوں میں　　　پھول پھول پر مُہریں
اس گلاب پر مہریں　　　اس ببول پر مہریں
جمتی برف پر مہریں　　　اُڑتی دھول پر مُہریں

میں، کہ ایک شاعر ہوں　　　پیار میرا مسلک ہے
میرے شعر کی پرواز　　　جانے کس اُفق تک ہے
میرا عشق بینا ہے　　　میرا ذوق زیرک ہے

ظلمتوں کی وادی سے　　　پھول چن کے دم لوں گا
اے بسیط سناٹے　　　تجھ کو دُھن کے دم لوں گا
گیت بُن کے دم لوں گا　　　گیت سُن کے دم لوں گا

گیت حسنِ انساں کے　　　چشمِ سرمہ سا کے گیت
مرمریں ہتھیلی پر　　　سرخیٔ حنا کے گیت
بکھرے بکھرے بالوں میں　　　کھیلتی ہوا کے گیت

مسکراہٹوں کے گیت　　　　آنسوؤں میں جو جھلکیں
گیت ان ستاروں کے　　　　عارضوں پہ جو ڈھلکیں
وہ ہلال سے ابرو!　　　　وہ کمان سی پلکیں

آخر یہ کھنکتا گیت　　　　حُسنِ آدمیت کا
آدمی کے سینے میں　　　　آدمی کی چاہت کا
شاخِ دل پہ گل بن کر　　　　ناچتی محبت کا

اور۔۔اک وہ دن آئے　　　　زخم پھول بن جائیں
ملکیت کی مہروں کو　　　　آندھیاں اُڑا لائیں
شاہراہِ ہستی کے　　　　موڑ گیت بن جائیں

(۱۹۵۲ء)

انسانیت

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر
کسی بھی شہر میں جاؤں، غریب شہر نہیں
یہی یقین ہے شیرازہ بند نسل ونسب
یہی یقین ہے میرا خلوص، میرا وقار

یہی یقین ہے میرا ادب، مرا مذہب
یہی طلسم صبا ہے، یہی ورودِ بہار
یہی یقین مرا شعر، میرا حسنِ نظر
یہی یقین محبت، یہی یقینِ جمال

اسی یقین سے تارے ہیں میری گردِ سفر
یہی یقین شعور وخرد کا اوجِ کمال
یہی یقین ہے امن وسکون ونغمہ ورنگ
یہی یقین صدائے اذاں، نوائے چنگ

یہی یقین کہ انسان کی جبلّت میں
بایں شکستہ دلی آشتی ہے، قہر نہیں
وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر
کسی بھی شہر میں جاؤں، غریب شہر نہیں

(۱۹۵۲ء)

اُفق

وہ کوہسار کی چوٹی ہو یا خطۂ صحرا
وہ شاخسار کی چٹکی میں ہو چٹکتی کلی
کہ گلستاں میں بھڑکتی ہوئی چنار کی آگ
سمندروں کے دھندلکے ہوں یا ابھرتی موج

ہرا ہرا سا جزیرہ ہو یا منارۂ نور
کسی کے کاکلِ عنبر فشاں کی لہریں ہوں
کہ زیرِ دامنِ رنگیں شباب کی محراب
وہ فلسفے کی گھٹا ہو کہ فن کے لالہ و گل

وہ آدمی کی بقا ہو کہ ارتقائے حیات
فقط خیال ہو یا دائمی حقیقت ہو
اُفق وہی ہے جہاں آسماں زمیں سے ملے

(۱۹۵۲ء)

رفتارِ زمانہ

یہ انقلاب بھی دیکھا کہ نو شگفتہ کلی
رمیدہ بو تو رہی، اب رمیدہ رنگ بھی ہے
ہوا نے شمع کی لو نوچ کر نگل ڈالی
ہوا کے ساتھ مگر منتقم پتنگ بھی ہے

چمن سے آئیں صدائیں، لوائیں کانوں سے
کہ زیست قطرۂ شبنم بھی اور سنگ بھی ہے
سنبھل سنبھل کے چلے آ رہے ہیں تیر انداز
شکارگاہ میں آہو بھی ہے، پلنگ بھی ہے
فرنگ ہی نے بہایا لہو ضعیفوں کا
اب اس بہاؤ کے ریلے میں خود فرنگ بھی ہے
عجیب شان سے نکھرا ہے ایشیا کا شباب
اُدھر ہے چنگ تو اِس ہاتھ میں خدنگ بھی ہے
فریب خوردۂ پیماں ہوں، آدمی تو ہوں
وہ امن جو ہوں جسے انتظارِ جنگ بھی ہے

(۶۔۱۹۴۷)

بہار آئے گی

صرف تاراجیٔ گلزار کا شکوہ تو نہیں
آسماں پر بھی ستاروں کی کمی پاتا ہوں
شفقِ شام ہو یا صبح کی انگڑائی ہو
سب نظاروں میں بہاروں کی کمی پاتا ہوں

جسم کہتا ہے کہ میں حدِّ نظر کو چھو لوں
ذہن کہتا ہے سہاروں کی کمی پاتا ہوں

اجنبی راہ سے پہنچا ہوں یہاں تک لیکن
مجھ کو اس بزم سے مانوس نہ ہونا آیا
میں مہک بن کے قفس میں بھی پرافشاں ہی رہا
رنگ بن کر مجھے محبوس نہ ہونا آیا

تیرگی کلبۂ دہقاں کی رہی مدِ نظر
حجلۂ شاہ کا فانوس نہ ہونا آیا

میری منزل کو اُفق پار بتانے والے
میں نے دیکھا ہے اُفق تا بہ اُفق کوئی نہیں
ایک مرکز ہو تو جچتا ہے تجسس، لیکن
اَن گنت دائروں میں گھومتی رہتی ہے زمیں

ہر اُفق پر اُفقِ نَو کی صدا آتی ہے
تیری منزل ہے بہت دور کہیں اور کہیں
اب مسافر کو نئے عزم سفر سے کیا کام
اب اسی بزم پہ پرچم مرا لہرائے گا
اس بیاباں میں چمن زار سجانے کے لیے
میرا احساس مرا آئنہ بن جائے گا
اتنے طوفان اٹھاؤں گا، کہ تاریخوں میں
اپنے تابوت سے دہقان نکل آئے گا

منجمد کُہر کو چٹخائے گی سورج کی کرن
ان دھندلکوں کے کلیجے میں اُتر جائے گی
سائے سمٹیں گے کہ ظلمت پہ کوئی آنچ نہ آئے
تیرگی چاہے گی، لیکن نہ اماں پائے گی
سینۂ سنگ کی حدت سے کھلیں گے گلزار
اتنی شدت سے زمانے میں بہار آئے گی

(۱۹۴۸ء)

ترقی پسند مصنفین

غبارِ راہ سہی ہم نشانِ راہ بھی ہیں
جہاں گزیدہ بھی ہیں اور جہاں پناہ بھی ہیں

یہ سب درست کہ معتوب بھی، تباہ بھی ہیں
شبِ سیاہ جہاں میں نوید ماہ بھی ہیں

عوام دوست ہیں، یعنی گناہ گار ہیں ہم
مؤرخوں سے مگر اس کے دادخواہ بھی ہیں

لبوں پہ گیت تو ہاتھوں میں ہے عنانِ حیات
کہ ہم تمدن و تہذیب کی سپاہ بھی ہیں

نجومیوں نے چمک سے فریب کھایا ہے
خلا میں چند ستارے ابھی سیاہ بھی ہیں

یہ انقلاب کی ہے اولیں جھلک کہ ندیمؔ
ہماری کھوج میں شاہانِ کج کلاہ بھی ہیں

(۱۹۵۰ء)

زنداں

پسِ دیوار ہے اک اور بھی دیوار بلند
ایک دیوار کے پیچھے کئی دیواریں ہیں

یہ احاطوں میں احاطے، یہ فصیلیں، یہ حصار
وقت کی بات ہے۔ سب وقت کی رفتاریں ہیں

حبس تاریخ کی اک طرفہ روایت تو نہیں
یہ تو ہے عظمتِ آدم کا طرازِ عنواں

ایک تخئیر کی تمہید ہے زنداں گردی
انہی ظلمات سے ہوتا ہے طلوعِ انساں

ارتقاء کا یہ چلن ہے کہ ہر انجام سے قبل
نئے آغاز کے رستے میں اُبھرتی ہے فصیل
انقلابات کی یلغار میں دب جاتی ہے
سطوتِ کوہِ ہمالہ ہو کہ طغیانیٔ نیل

آج زنداں میں سہی، دست بہ زنجیر سہی
کل یہ میدان میں شمشیر بدست اُبھریں گے
جس طرح تیر کمانوں سے نکل جاتے ہیں
یوں بیک جست فصیلوں سے یہ مست اُبھریں گے

دوستو ایک چھلاوے کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ جو اُٹھتی ہوئی ہنستی ہوئی دیواریں ہیں
حرّیت کی یہ اسیری، یہ تشدّد کا فروغ
وقت کی بات ہے، سب وقت کی رفتاریں ہیں

سنٹرل جیل ــــ لاہور (۱۹۵۱ء)

غمِ وطن

میرا غم، صرف مرا غم تو نہیں، کم کیوں ہو
آدم اس دور میں بھی کشتۂ آدم کیوں ہو
آدمیت ہی جب اس دور میں پامال ہوئی
اپنی اک ذات کے لٹنے کا مجھے غم کیوں ہو

جس کے دانتوں میں مری قوم کے ریشے ہیں ابھی
وہی سفاک مرے دیس کا ہمدم کیوں ہو
جب لنڈھالے پہ بھی بچتا ہی رہا بادۂ ناب
پھر مرے جامِ سفالیں میں بھرا سم کیوں ہو

اس کے سائے میں جب انسان کو دم لینا ہے
خونِ انساں ہی میں ڈوبا ہوا پرچم کیوں ہو

جس کے کانوں نے صدائیں جرسِ گل کی سنیں
اس کے ہونٹوں پہ فقط نوحہ و ماتم کیوں ہو

جس کی بانہوں میں پلے وارث و خوش حال و لطیف
اس کے بشرے پہ بھلا یاس کا عالم کیوں ہو

کٹ کے بھی جھک نہ سکا جو سرِ پندارِ وطن
کسی سلطان کے دربار میں اب خم کیوں ہو

جب گلوں تک کو خبر ہے کہ بہار آتی ہے
گلشنِ غیر سے دریوزۂ شبنم کیوں ہو

سینۂ شب میں دھڑکتا ہے دلِ صبحِ جمال
لب ترے خشک ہوں کیوں، آنکھ تری نم کیوں ہو

مجھ کو ڈر ہے تری آواز ہے بھرائی ہوئی
حریت کا یہ ترانہ ہے تو مدھم کیوں ہو

جس کو تہذیب و تمدن کا اُفق چھونا ہے
چند فرسنگ کی پرواز سے بے دم کیوں ہو

پیٹھ کا زخم نہیں ہے کہ ندامت ہو تجھے
زخم سینے کا ہے۔ شرمندۂ مرہم کیوں ہو

(۱۹۵۲ء)

عنفوانِ شباب

شبنم آئینہ بدست آئی سرِ برگِ گلاب
ایک معصوم کلی
شاخساروں سے ہمک کر نکلی
آئینہ دیکھ کے شرمائی، لجائی، کانپی
جھرجھری لے کے سنبھلنا چاہا

لیکن احساسِ جمال
ایک کوندا ہے جو لپکے تو لپکتا ہی چلا جاتا ہے
اور معصوم کلی
کپکپاہٹ کے تسلسل سے چٹکنے پہ جو مجبور ہوئی
چُور ہوئی
غنچہ تخلیق ہوا
آئینہ چونک اُٹھا

(۱۹۴۷ء)

مغویہ

رات خاموش ہے
سر برآوردہ اشجار دن بھر کے رقصِ مسلسل سے تھک ہار کر
بازوؤں کو سمیٹے
اندھیرے کے بستر پہ خوابیدہ ہیں
سرد جھونکے خراماں ہیں لیکن کوئی چاپ اُٹھتی نہیں
جیسے شاہی کنیزیں، جو ملبوس کے نقرئی حاشیوں کو سنبھالے ہوئے
کانچ کے فرش پر چل رہی ہیں
ستاروں کی آنکھوں میں نیندیں ہیں
رفتار میں ایک ایسا بہاؤ ہے
جیسے فضا سے اُترتے ہوئے برف کے نرم گالے
پُراسرار
آواز سے بے نیاز
اولیں عشق کی دھیمی سرگوشیوں کی طرح
رات خاموش ہے

جیسے اپنے ہی بالوں میں لپٹی ہوئی سانولی سی دُلہن
جس کے ماتھے کی افشاں پہ
گالوں کے غازے پہ
ہاتھوں کی مہندی پہ
سینے کے امڈے ہوئے عزمِ تخلیق پر
اس کے اپنے ہی پیکر کی خوشبو نے
وہ دائرے بُن دیئے ہیں
جو چھونے سے کُھل جائیں گے

رات خاموش ہے
رات کی خامشی کتنی گہری ہے، کس درجہ گمبھیر ہے
کِس میں ہمّت ہے، جو زور کی سانس تک لے سکے،
رات کے اس وقار اور پندار کو ٹھیس پہنچا سکے
کس قدر طنطنے، کتنی پیاری رعونت سے لبریز ہے رات کی خامشی!
رات کی خامشی کتنی گہری ہے، کس درجہ گمبھیر ہے
رات خاموش ہے
ایک چیخ آسماں سے زمیں تک خراشیں اُگاتی ہوئی
چار جانب لپکتی چلی جا رہی ہے
ہوا کا بہاؤ اُلجھنے لگا ہے
ستارے لرزنے لگے ہیں
خود اپنے ہی بالوں میں لپٹی ہوئی سانولی سی دُلہن
ٹوٹتی نیند کی ڈوریاں اپنی پلکوں سے چُنتی ہوئی
چونک اُٹھتی ہے
خموشی کی گمبھیرتا کا بھرم کُھل گیا ہے
وقار اور پندار کے آئینوں کی کئی کرچیاں ہر طرف منتشر ہیں

یہ گستاخ آواز کس کی تھی ؟
یہ کون تھا ـــــ ؟

رات کی خامشی پھڑپھڑانے لگی ہے
شبوں کے ورق چیختے اور بجتے ہوئے ہر طرف اُڑ رہے ہیں
یہ راتیں، یہ دن
اور یہ شامیں، یہ صبحیں،
گھٹائیں امڈتی ہوئی اور چھٹتی ہوئی
بجلیاں جل رہی ـ بجھ رہی ہیں ،
کڑک ہے،
چمک ہے ،
ورق اُڑ رہے ہیں
ورق تھم گئے ہیں
سکوت ـ ایک گمبھیر گہرا سکوت ـــ
اِک پراسرار سناٹا
اِک بار پھر رات خاموش ہے ـــ
رات کی خامشی میں

بہت دور سے
نیند میں چُور اک آواز آنے لگی ہے،
اِس آواز میں رات کی خامشی کا شکستہ وقار
ایک ٹوٹا ہوا طنطنہ
زخم آلود خود اعتمادی
پکار
احتجاج

اور جانے کہاں کا تاثر ہے
آواز آنے لگی
تم نہیں جانتے
تم جو ناموس و عصمت کی چھاتی میں آزادیوں کے علم گاڑتے ہو
مجھے تم نہیں جان سکتے
سیاست کے بازار کی جنس کو کون پہچان پائے!
کسے دھیان آئے!
کہ میں کون ہوں ——
قوم کے رہنما
میری تقدیس کو بیچ کر
اک نئی جنگ
اک تازہ سوداگری کے لیے
پھر سے تیاریاں کر رہے ہیں
میں اس شور میں آج کس کو پکاروں
بتاؤں کسے
کس کو آواز دوں
کس سے یہ راز کہہ دوں
کہ میں مذہب و نسل کے چند رنگیں غباروں کے بدلے میں
بکتی ہوئی ایک عورت ہوں،
بیٹی ہوں،
بیوی ہوں،
ماں ہوں،
بہن ہوں،
میں اک مغویہ ہوں!"

(۶۱۹۴۸)

وقت

سر برآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
چاند بلور کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کی طرح اٹکا ہے
دامنِ کوہ کی اک بستی میں
ٹمٹماتے ہیں مزاروں پہ چراغ
آسماں سرمئی فرغل میں ستارے ٹانکے
سمٹا جاتا ہے، جھکا آتا ہے
وقت بے زار نظر آتا ہے!

سر برآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
صبح کی نقرئی تنویر رچی جاتی ہے
دامنِ کوہ میں بکھرے ہوئے کھیت
لہلہاتے ہیں تو دھرتی کے تنفس کی صدا آتی ہے
آسماں کتنی بلندی پہ ہے اور کتنا عظیم
نئے سورج کی شعاعوں کا مصفا آنگن
وقت بیدار نظر آتا ہے!

سر برآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
آفتاب ایک الاؤ کی طرح روشن ہے
دامنِ کوہ میں چلتے ہوئے ہل
سینۂ دہر پہ انسان کے جبروت کی تاریخ رقم کرتے ہیں
آسماں تیز شعاعوں سے ہے اس درجہ گداز
جیسے چھونے سے پگھل جائے گا
وقت تیار نظر آتا ہے!

سر برآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
زندگی کتنے حقائق کو جنم دیتی ہے
دامنِ کوہ میں، پھیلے ہوئے میدانوں پر
ذوقِ تخلیق نے اعجاز دکھائے ہیں۔ لہو گلا ہے
آسماں گردشِ ایام کے ریلے سے ہراساں تو نہیں
خیر مقدم کے بھی انداز ہوا کرتے ہیں
وقت کی راہ میں موڑ آتے ہیں، منزل تو نہیں آ سکتی؟

(۱۹۴۹ء)

نیا ایشیا

ظلم کے خلاف لڑنے والے فنکاروں کے نام

(۷ فروری ۱۹۳۱ء کو چین میں چیانگ کائی شیک کی حکومت نے چھ نوجوان ترقی پسند ادیبوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔
۷ فروری ۱۹۴۹ء کو انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور نے ان چھ فنکاروں کی یاد میں ایک خاص اجلاس منعقد کیا۔ یہ نظم اسی موقع پر لکھی اور پڑھی گئی)

زندگی کے ہیولے بناتا رہا ایشیا
زندگی سے بہت دور جاتا رہا ایشیا
ایشیا ایک ایسا کھلونا رہا جس میں یورپ سدا کوک بھرتا رہا
ایشیا کے ذخیروں میں غلّے کے بدلے فرنگی سدا بھوک بھرتا رہا
ایشیا ایشیائی کے ہاتھوں سے پیہم نکلتا رہا
ایشیا ایک ایسے خطرناک سانچے میں ڈھلتا رہا
جس میں مفلس کی پرچھائیں دھجی سی بن کر لٹکنے لگے
جس میں مجبور کی آہ کانٹا سا بن کر اٹکنے لگے
جس میں دہقان جائے تو اپنے لہو سے گلستانِ شاہی سجاتا پھرے

جو بھی انسان جائے وہ انسانیت کی ہزیمت کا
پرچم اُڑاتا پھرے

جس میں بچے کی چیخیں کھنکنے لگیں
جس میں عورت کی آہیں چھنکنے لگیں
جس میں بیوہ کے آنسو نگینے بنیں
جس میں عصمت کے ملبے دفینے بنیں
جس میں نمرود جھانکے تو عود اور عنبر کی خوشبو کا سیلاب
گانے لگے

جس کو مزدور چھوئے تو کنژدم اڑیں اور اژدر کی پھنکار
آنے لگے

ایشیا اک نہایت خطرناک سانچے میں ڈھلتا رہا
ایشیا ایشیائی کے ہاتھوں سے پیہم نکلتا رہا

کون جانے سیاست بہ ایں دعوئ ارتقا کتنے پانی میں ہے
کون جانے کہ وقت آج ساکن ہے یا حسبِ عادت
روانی میں ہے
کون جانے کہ انسان اپنی طہارت کو محکوم رہ کر بھی
کھوتا نہیں
کون جانے کہ آدم مظالم کے پاٹوں میں پس کر بھی
نابود ہوتا نہیں
کون جانے کہ جب شاخ پر برف جمتی ہے، کونپل کی تخلیق
رُکتی نہیں
کون جانے کہ بہتے ہوئے پانیوں میں کرن ٹوٹ سکتی ہے
جُھکتی نہیں

کون جانے کہ اُجڑی ہوئی وادیاں کن بہاروں کو تکتی ہیں
شام وسحر
کون جانے سپاٹ آسمانوں پہ رہتی ہے کیوں تشنہ لب
گلشنوں کی نظر
کون جانے تضاد ایک دیرینہ دستور ہے
کون جانے کہ ہر تیرگی میں نہاں نور ہے
کون جانے شرف آدمیت کا فانی نہیں
کون جانے کہ یہ بیش قیمت صداقت کہانی نہیں
کون جانے کہ راتوں کے دامن میں جو ظلمتیں ہیں
ستاروں سے لبریز ہیں
کون جانے کہ سیلاب کی راہ میں سر برآوردہ کہسار
ہمیز ہیں
کون جانے کہ طوفان کی آغوش میں جتنے کانٹے ہیں اتنی ہی
کلیاں بھی ہیں
کون جانے مورخ کی نظروں میں اس وقت محلوں کے ہمراہ
گلیاں بھی ہیں
کون جانے کہ بھوبھل کی چنگاریاں اک نئی رس الاؤ کی
غماز ہیں
کون جانے کہ جمہور کی میتیں ماضی وحال میں محوِ پرواز ہیں

یہ وہی جانتے ہیں جو احساس کی نرم پوروں سے چھوتے ہیں
نبضِ جہاں
یہ وہی جانتے ہیں جو بھولے نہیں آدمی زار میں آدمی کا نشاں
یہ وہی لوگ ہیں جن کو سکوں کی جھنکار ڈستی نہیں

یہ وہ انسان ہیں جن کی انسانیت اتنی سستی نہیں
یہ وہی لاأ بالی ہیں جن کی خموشی میں پوشیدہ چیخوں کا طوفان ہے

یہ وہی "سرپھرے" ہیں جنھیں اب بھی انسان کی سرفرازی
پہ ایمان ہے

یہ وہی ہیں جنھیں تیز آنچوں میں پالا گیا
یہ وہی ہیں جنھیں بھٹیوں میں اُچھالا گیا
یہ وہی ہیں جو شاہوں کو نوکِ قلم سے پچھاڑا کیے
یہ وہی ہیں جو فغفور و خاقان تک کو لتاڑا کیے
یہ وہی ہیں کہ جن کا لہو مشعلیں بن کے ہر دیس میں جگمگاتا رہا
یہ وہی ہیں کہ جن کا جنازہ نشانِ سفر بن کے رستہ دکھاتا رہا
یہ وہ سردار ہیں جن کے ہاتھوں میں باگیں ہیں ایام کی
یہ وہ سرکش ہیں جن کو ستاتی نہیں فکرِ انجام کی
یہ وہی ہیں جنھیں سربلندوں کا معتوب ہونا پڑا
یہ وہی ہیں جنھیں ہر زمانے میں مصلوب ہونا پڑا
یہ وہی لوگ ہیں جن کی ہیبت سے روحِ زمانہ لچکتی بھی ہے
اور دھڑکتی بھی ہے
یہ وہی لوگ ہیں جن کی تحریر میں زندگی لہلہاتی بھی ہے اور
بھڑکتی بھی ہے
چند ایسے ہی فن کار تھے جن کے ہونٹوں پہ تاریخ کی گرد
جمنے نہ پائی کبھی
ان کے سینوں سے جو دھار پھوٹی لہو کی وہ یَنگ سی کی مانند
تھمنے نہ پائی کبھی
یہ وہ اہلِ قلم تھے کہ جن کا تھا معیارِ فن زندگی کی نمایندگی

ظلمتوں کے جگر سے جنھوں نے نچوڑی تھی اک غیر فانی
درخشندگی
یہ وہی تھے جنھوں نے گراں مایہ جمہوریت کو نہ بیچا
کسی اجنبی ہات میں
یہ وہی تھے جو مینارِ انوار بن کر چمکتے رہے ایک لمبی
سیہ رات میں
یہ وہی تھے جو یورپ کے سوداگروں کو ڈپٹتے رہے
"ہم نہ بیچیں گے بھولے سے بھی آبروئے وطن
گنگناتی ہوئی ندیاں ہیں ہماری ہیں یہ لہلہاتی ہوئی کھیتیاں
مسکراتے چمن
زرد مٹی کا ایک ایک دانہ ہمارا ہے ۔ ہم چینیوں کا
خزینہ ہے یہ
چاولوں کے اس انبار کو چھوڑ دو، ہم کسانوں کا جلتا
پسینہ ہے یہ
ہم کروڑوں کی محنت کو کیوں چند لوگوں کی جھولی میں
ڈالیں بھلا
ہم غلامی کے اک نقرئی روپ کا راستہ کیوں نکالیں بھلا
قلبِ جمہور کو بھون کر ایک آمرِ ضیافت اڑاتا پھرے
اور فن کار خوابوں کے الجھے ہوئے تانے بانے بناتا پھرے
آدمیت امانت ہے فن کار کی اور دیانت کا ہے دوسرا نام فن
اور ہمارے دلوں کو ہے اس فن کی تابندگی و درخشندگی
کی لگن
ہم نے اک عزم سے اپنے بلبے سے خود اپنی تعمیر کی
جانے کس زعم میں تم سناتے ہو جھنکار زنجیر کی"

یہ وہ آواز تھی جس کو پیہم دبایا گیا
یہ وہی آگ تھی جس کو صدیوں بجھایا گیا
یہ وہی سیل تھا جس کے رستے میں کہسار حائل ہوئے
یہ وہی پھول تھا جس کی پوجا پہ گلزار مائل ہوئے
زندگی چارسو پھڑپھڑانے لگی
آدمیت معًا مسکرانے لگی
خود شناسی کا سیلاب اس زور سے چین کی سرزمیں پر مچلنے لگا
جیسے اک منجمد اور ساکن سمندر اچانک چیخ کر اُبلنے لگا
ہل کی ہتھی پہ جو ہاتھ جمتے رہے، یوں بڑھے جیسے تارے
اُڑا لائیں گے
گرد آلود پاؤں اُٹھے اس طرح جیسے دھرتی کو ہموار
کر جائیں گے
اس تغیّر کو تاریخ داں کی زباں میں بغاوت کہیں
یا ستم خوردہ انسانیت کی زباں میں طہارت کہیں
یہ اس آواز کا ایک اعجاز تھا جس کو پیہم دبایا گیا
یہ اُسی آگ کا ایک انداز تھا جس کو صدیوں بجھایا گیا
آمریت طہارت کی بدخواہ ہے، آمریت کو طیش آ گیا
یہ وہ نعرہ تھا جو گونج کر اجنبی زر پرستوں کو چکرا گیا
چھ ادیبوں کو شنگھائی میں ٹھوکروں سے اُچھالا گیا
تن کی بھڑکی ہوئی آگ پر خونِ فن کار ڈالا گیا

جو زبانیں کہ اعلانِ حق میں کٹیں، احتجاجِ مسلسل بنیں
ایک دن
جو کراہیں گلے میں دبا دی گئیں، آسماں پوش بادل بنیں
ایک دن

جو ترانہ کہ تلوار کے وار سے بیچ میں کٹ گیا
اک سبق بن گیا
خون جو جذب ہوتا رہا خاک میں، صبح نو کے اُفق کی
شفق بن گیا
نوجواں فن طرازوں کی لاشوں سے پھوٹی وہ کونپل جواب
ایک گلزار ہے
یہ تعطر جو اٹکھیلیاں کر رہا ہے، اسی گل کدے ہی
کی مہکار ہے
بڑا اعظم کے فرماں روا اب سمٹ کر جزیروں کو آباد
کرنے لگے
جو کروڑوں کی فریاد سے بے خبر تھے۔۔ زمانے سے فریاد
کرنے لگے

یہ انہی چھ ادیبوں کا فیضان ہے
چین کے ذرے ذرے میں ہیجان ہے
یہ وہ ہیجان ہے جو گجردم ستاروں میں دیکھا گیا
جو بہاروں سے پہلے اُجڑتے نظاروں میں دیکھا گیا
خونِ ناحق سدا رنگ لاتا رہا
گو مؤرخ اسے بھول جاتا رہا
خون اور وہ بھی مخلص قلم کار کا، حریت کے صحیفے کا
عنوان ہے
خون فن کار کا اصل میں اُمتوں کے شگفتہ مقدر کی پہچان ہے
جس شہادت کا انجام ہے زندگی
اُس کا اک دوسرا نام ہے ۔۔ زندگی

اے مرے ہم نصیبو، مرے ساتھیو، اے مرے دوستو، اے
مرے ہم صفیرو، اٹھو
اے روایاتِ محکومیت کے رو پہلی مگر ٹوٹے پھوٹے قفس کے
اسیرو، اُٹھو
دیکھو دیکھو، ہری ڈالیوں پر چمکتے ہیں پھولوں کے
تارے، اُٹھو
دیکھو دیکھو، ہرن ہر طرف دشت میں پھر رہے ہیں
طرارے، اُٹھو
دیکھو دیکھو، وہ خورشید اُفق پر ٹھٹھک کر خدا جانے کیوں
مسکرانے لگا
دیکھو دیکھو، سنہری دھندلکا بہت دور ہٹ کر ہمیں کیوں
بلانے لگا
ہم مساوات کے جب علم دار ہیں، کیوں وہی ہیں نشیب و
فرازِ جہاں
جب ہمیں آشیاں کی بِنا ڈالتے ہیں ہمیں سے گریزاں ہے
کیوں آشیاں
جب ادب زندگی کا اک آئینہ ہے تو یہ آئینہ ہر آدمی کو
دکھاتے چلو
جب کوئی نقشِ باطل نظر آئے تم کو، تو اس کو خود اپنے لہو سے
مٹاتے چلو
خونِ فن کار پھولوں سے بڑھ کر حسیں اور بہاروں سے
بڑھ کر تعطر فشاں
خونِ فن کار میں ہیں تمام آدمیت کی سب لودمیدہ امنگیں رواں
اے رفیقو، تمھی سے فن کارِ عالم میں رنگِ دوام آئے گا

اب تمھارے لہو کا جو قطرہ گرے گا وہ نسلوں کے کام آئے گا
پھر اُفق کی کماں میں تناؤ سا ہے
قلب انساں میں پھر ایک گھاؤ سا ہے
ایشیا منتظر ہے کہ انسانیت اس کے رمنوں میں گانے لگے
چہچہانے لگے
آؤ آؤ، قدم یوں اٹھاؤ کہ لاکھوں، کروڑوں شہیدوں کی محنت
ٹھکانے لگے

(۱۹۴۹ء)

غزل

بگاڑ ہو کہ بناؤ، عجیب تیرے سبھاؤ
نگاہوں میں ہیں بلاوے تو ابروؤں میں تناؤ

گجر بجا ہے سہانا، مگر کرو نہ بہانا
سحر تو آئے گی، لیکن ابھی دیے نہ بجھاؤ

اگر گھنا ہو اندھیرا، اگر ہو دور سویرا
تو یہ اصول ہے میرا، کہ دل کے دیپ جلاؤ

اُجڑ رہے ہیں گھرانے، بدل رہے ہیں زمانے
لپک رہے ہیں دوانے، اُتار ہو کہ چڑھاؤ

خدا کے لب پہ ہنسی ہے، خدائی جھوم رہی ہے
تمھاری بات چلی ہے — مری حسین خطاؤ

ادھر شباب کا مس ہے، اُدھر شراب کا رس ہے
قدم قدم پہ قفس ہے، ندیم دیکھتے جاؤ

(۱۹۴۷ء)

غزل

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں
آنکھ کیا کھولی، چمن مرجھا گئے

ن

کون تھے آخر جو منزل کے قریب
آئنے کی چادریں پھیلا گئے

کِس تجلی کا دیا ہم کو فریب
کِس دھندلکے میں ہمیں پہنچا گئے

اُن کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا
اور جب پلٹے، قیامت ڈھا گئے

اِک پہیلی کا ہمیں دے کر جواب
اِک پہیلی بن کے ہر سُو چھا گئے

پھر وہی اختر شماری کا نظام
ہم تو اس تکرار سے اُکتا گئے

رہنماؤ! رات ابھی باقی سہی!
آج سیارے اگر ٹکرا گئے؟

جن کو ہم سمجھا کیے ابرِ بہار
وہ بگولے کتنے گلشن کھا گئے

کیا رسا نکلی دعائے اجتہاد
کیجیے! اگلے زمانے آ گئے
آدمی کے ارتقا کا مدعا
وہ چھپاتے ہی رہے، ہم پا گئے
اب کوئی طوفاں ہی لائے گا سحر
آفتاب اُبھرا تو بادل چھا گئے

(۱۹۴۸ء)

غزل

دستِ گل چیں میں کھل رہی ہے کلی
میرے جینے سے اس کی موت بھلی
ابتلا، ابتدائے ذوقِ عمل
یعنی طوفاں اُٹھا تو ناؤ چلی
شاخِ اُمید کی بہار نہ پوچھ
برسوں پھولی مگر کبھی نہ پھلی
چشمِ سرشار میں حیا چمکی
ساغرِ مے میں چاندنی کی ڈلی
گردشِ چشم ہے کہ گردشِ دہر
پلکیں جھکنے لگیں کہ دھوپ ڈھلی
کائنات ایک دشتِ بے انجام
اب کہاں ڈھونڈیئے کسی کی گلی

(۱۹۴۸ء)

غزل

گو مرے دل کے زخم ذاتی ہیں
ان کی ٹیسیں تو کائناتی ہیں

آدمی شش جہات کا دولہا
وقت کی گردشیں براتی ہیں

فیصلے کر رہے ہیں عرش نشیں
آفتیں آدمی پہ آتی ہیں

کلیاں کس دور کے تصور میں
خون ہوتے ہی مسکراتی ہیں

تیرے وعدے ہوں جن کے شاملِ حال
وہ اُمنگیں کہاں سماتی ہیں

(۱۹۴۹ء)

غزل

بن ہو، ابر ہو، تیز ہوا ہو
تیرے حسن کا دیا جلا ہو

پَو کبھی پھٹی، طوفان کبھی اُٹھا
اب کوئی کیا جانے، کیا ہو

آج کی کلیاں کب چٹکیں گی
شاید مستقبل کو پتا ہو

چاند کبھی ساکن وقت کبھی ساکن
شاید تو کچھ سوچ رہا ہو

بت جھڑ میں کیوں پھول نہ ڈھونڈے
جس نے تجھے کھو کر پایا ہو

بیلیں سی بل کھاتی ہیں، جب
کوئی سہارا ٹوٹ چلا ہو

تو نے یوں شرما کر دیکھا
جیسے تھک کر دیا بجھا ہو

میری تنہائی کی دعا ہے
تیرے ساتھ بھری دُنیا ہو

انساں کا معیار یہی ہے
خوب دکھی ہو، خوب اچھا ہو

دیے بجھے ہیں، پھول کھلے ہیں
شاید یہ شہراہ صبا ہو

تو کہتا ہے تارا ٹوٹا
اور اگر آنسو ٹپکا ہو!

(۱۹۴۹ء)

غزل

چراغِ مُردہ کو اِک بار اور آزماؤں
دیا بجھے تو سحر کا فریب کیوں کھاؤں

خدا کے کام جو آئے، خدا بنائے گئے
میں سوچتا ہوں کہ انسان ہی کے کام آؤں

میں رنگ و نغمہ و رقصِ حیات ہوں یعنی
ضمیرِ دہر ہوں، شاہوں کے ہاتھ کیا آؤں

رچی ہوئی ہے رفاقت مرے رگ و پے میں
کچھ اس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں

ستارے ٹوٹ کے کلیوں کے روپ میں چٹکیں
زرا زمین کے پندار کو جو اُکساؤں

کسی کی زلف بھی منت پذیرِ شانہ سہی
مگر میں گیسوئے گیتی تو پہلے سلجھاؤں

کئی برس سے مجھے مل رہا ہے درسِ خودی
یہی کہ تیرگیوں میں ہوا سے ٹکراؤں

میں اب سے دور فرشتوں کے گیت لکھتا رہا
یہ آرزو ہے کہ اب آدمی کو اپناؤں

(۱۹۵۰ء)

غزل

یوں بے کار نہ بیٹھو دن بھر، یوں پیہم آنسو نہ بہاؤ
اتنا یاد کرو کہ بالآخر آسانی سے بھول بھی جاؤ

سارے راز سمجھ لو لیکن خود کیوں اِن کو لب پر لاؤ
دھوکا دینے والا رو دے، ایسی شان سے دھوکا کھاؤ

ظلمت سے مانوس ہیں آنکھیں، چاند اُبھرا تو مند جائیں گی
بالوں کو اُلجھا رہنے دو۔ اک الجھاؤ سو سُلجھاؤ

کل مجھ پر الزام تھا سارا آج تو فرق ہے رنگ تمھارا
کل تم مجھ سے شرمائے تھے، آج آئینے سے شرماؤ

پہلو تو لُٹ جائے گا، لیکن آنکھیں تو ویراں نہ رہیں گی
بے شک میرے پاس نہ بیٹھو لیکن اتنی دور نہ جاؤ

اس کا زمانہ بیت چکا ہے، اب مَس میں معراجِ محبت
میں اس دور کا دیوانہ ہوں، دل میں نہیں نظروں میں سماؤ

کل کو کل پر رکھو جب کل آئے گا دیکھا جائے گا
آج کی رات بہت بھاری ہے، آج کی رات یہیں رہ جاؤ

کب تک یوں پردے پردے میں حسنِ محبت کو جھٹلاؤ گے
موت کا دن بھی حشر کا دن ہے، چھپنے والو! سامنے آؤ
دورِ خزاں میں سُنتا ہوں تخلیق کا یہ آہنگِ مسلسل
کلی کلی کی نرم چٹک میں پھولو! میری آہٹ پاؤ
مرنے سے کچھ کام چلا تو اے دمسازو، مر بھی لیں گے
مرنا تو برحق ہے لیکن تم جینے سے باز نہ آؤ

(۱۹۵۱ء)

غزل

ہوتا نہیں ذوقِ زندگی کم
بنیادِ حیات ہے ترا غم
احساسِ جمال اُبھر رہا ہے
جب سے ترا التفات ہے کم
تیرے ہی غموں نے مجھ کو بخشی
کوندے کی لپک، غزال کا رم
سامانِ ثبات ہیں سفر میں
اُمید کے پیچ، راہ کے خم
شمعوں کی لویں ہیں یا زبانیں
آنسو ہیں کہ احتجاجِ پیہم
انجم سے کھلائے گی شگوفے
شبنم سے لدی ہوئی شبِ غم
طوفان کا منتظر کھڑا ہے
یہ عینِ سحر کو شب کا عالم

(ڈسٹرکٹ جیل کیمبل پور ۱۹۵۱ء)

غزل

ہمہ سرمایۂ دامانِ چمن
ریشۂ گل ہو کہ سورج کی کرن

ہمہ اضداد ہے کردارِ جمال
صبح کا نور ہے تاروں کا کفن

ٹوٹتا ہے جو ستارہ کوئی
پھیلتی ہے مرے ماتھے کی شکن

وقت کی آنکھ بنا جاتا ہے
تیرہ و تار قفس کا روزن

آج کچھ ذکر رفو کا بھی چلے
کب تلک چاک کروں پیراہن

مجھ کو آنکھوں کی چکاچوند سے کام
ذہن روشن ہے تو دنیا روشن

ہم نہ بدلیں گے اگر اپنا کام
کون بدلے گا زمانے کے چلن

رات کو آگ نہ لگ جائے کہیں
آنچ دیتے ہیں ستاروں کے بدن

فن کے صحراؤں پہ ساون کی گھٹا
میرا بدلا ہوا اندازِ سخن

(۱۹۵۲ء)

غزل

بہار جب بھی چمن میں دیے جلاتی ہے
ہجومِ گل سے مجھے تیری آنچ آتی ہے

بہ فیضِ لذتِ تخلیقِ خون ہو کے کلی
خود اپنے زخم کے پردے میں مسکراتی ہے
وفورِ رنگ میں گھلنے لگی ہے کیوں شبنم
عروسِ گل کو اگر آئینہ دکھاتی ہے
یہ شب ہے یا شفق افشانیوں سے گھبرا کر
نگارِ شام حیا سے لٹیں گراتی ہے
یہ کائنات کا آہنگ ہے کہ سحرِ حیات
چٹک کلی کی، ستاروں کو گدگداتی ہے
یہ رودِ آب، یہ تارے، یہ شہرِ لالہ و گل
ابھی وہ آ نہ چکے اور رات جاتی ہے

(۱۹۵۲ء)

غزل

رہے اسیرِ قفس در قفس بہار میں ہم
مگر حقیر نہ تھے چشمِ روزگار میں ہم
کسی نے جس میں اُمیدِ سحر دلائی تھی
بھٹک رہے ہیں اُسی رات کے غبار میں ہم
وہ ایک درد بنا زندگی کا سرمایہ
جسے پرو نہ سکے آنسوؤں کے تار میں ہم
وہ آئے بھی تو بگولے کی طرح آئے، گئے
چراغ بن کے جلے جن کے انتظار میں ہم
یہ اور بات، کہ انجان بن گئے ورنہ
ترے خرام کو پہچان لیں ہزار میں ہم
ترا جمال ہے یا خوابِ سایۂ گل میں
پگھل رہے ہیں اُترتے ہوئے خمار میں ہم

کبھی بہار بنے اور کبھی شکستِ بہار
ندیم! جم نہ سکے حسن کے حصار میں ہم

(۵۲ ۱۹ء)

غزل

قرارِ جاں بھی تمہی، اضطرابِ جاں بھی تمہی
مرا یقیں بھی تمہی ہو، مرا گماں بھی تمہی

تمہاری جان ہے نکہت، تمہارا جسم بہار
مری غزل بھی تمہی، میری داستاں بھی تمہی

یہ کیا طلسم ہے، دریا میں بن کے عکسِ قمر
رُکے ہوئے بھی تمہی ہو، رواں دواں بھی تمہی

خدا کا شکر، مرا راستہ معیّن ہے
کہ کارواں بھی تمہی، میرِ کارواں بھی تمہی

تمہی ہو جس سے ملی مجھ کو شانِ استغنا
کہ میرا غم بھی تمہی، غم کے رازداں بھی تمہی

نہاں ہو ذہن میں وجدان کا دھواں بن کر
اُفق پہ منزلِ ادراک کا نشاں بھی تمہی

تمام حسنِ عمل ہوں، تمام حسنِ بیاں
کہ میرا دل بھی تمہی ہو، مری زباں بھی تمہی

(۵۲ ۱۹ء)

غزل

لپک گئے پلٹ کے پھر وہاں سے
بھٹکے تھے یہ کارواں جہاں سے

اک ٹیس فضا کے دل میں اٹھی
یا تیر نکل گیا کماں سے
بیداریٔ شب کے بدلے ہم نے
دن پائے مگر دھواں دھواں سے
ہر گُل ہے پناہ گاہِ زنبور
گُل چیں کو گلہ ہے باغباں سے
پھولوں کی بھی خاک اُڑا رہے ہیں
لپٹے ہیں جو دامنِ خزاں سے
جو پیار نہ کر سکے زمیں سے
پائیں گے نہ بھیک آسماں سے
کچھ اور نہیں تو حشر ٹوٹے
اب خواب تو ہو چلے گراں سے
ہم آبلہ پا ہی، اے زمانے
اُلجھیں گے ترے رمِ رواں سے
اُڑتا ہے مذاق، بجلیوں کا
اب پھول گریں گے آسماں سے
یزداں پہ جھپٹ پڑے گا ابلیس
انسان ہٹا جو درمیاں سے
گنجینۂ وقت بن گئی ہے
جو بات نکل گئی زباں سے

(۱۹۵۲ء)



متفرقات

میں جسے شرطِ ادب کہتا ہوں، تو فرطِ حیا
عشق اور حسن میں حائل ہے وہ دیوار ابھی

مرے خطوط پہ جمنے لگی ہے گردِ حیات
اُداس نقش گرو، اب مجھے نکھارو بھی

نہ کر خدا کے لیے بار بار ذکرِ بہشت
ہم آسمان کے مکرّر فریب کیوں کھائیں

کچھ ایسا نرم ہوا میرا ذوقِ خودنگری
مرے لیے مرا دشمن بھی ہے مرادم ساز

اگر نہایت بے چارگی ہے چارہ گری
تو اِس اُمید پہ زخمِ جگر کا ذکر کریں

الٰہی! حشر میں انسان سے یہ مواخذہ کیوں؟
تو نارسیدہ رہا وہ فریب دیدہ رہا

ایک صحرائے بے کراں ہے جہاں
وقت اک بے قرار آہو ہے

سکوں میں رقص کناں، رقص میں سکون پذیر
خرام حسن کا آئینہ ہے خرام حیات

ندیم

دشتِ وفا

(چوتھا مجموعۂ کلام)

انتساب

اک کشتۂ غم پہ مہرباں ہو
تم کتنے عجیب حکمراں ہو
تم حسن کا نقشِ جاوداں ہو
تم میری وفا کا امتحاں ہو
تم میرے یقیں ہو یا گماں ہو
میرے ہو مگر مرے کہاں ہو
ہو لالۂ دشتِ نارسائی!
لیکن مرے خون میں رواں ہو
برسوں کی جدائی کی قسم ہے
تم وقت کی طرح بے کراں ہو
بکھری ہوئی کائناتِ دل پر
چھائے ہوئے مثلِ آسماں ہو
سوگند ہے مجھے خلوصِ فن کی
تم میری نفاستِ بیاں ہو

ایوانِ سحر میں

یہ شب ہے یا مرے دل کا سکوتِ بے پایاں
یہ دل ہے یا مرے مرقد پہ جل رہا ہے چراغ
کچھ ایسے لوٹ رہی ہیں رگیں تخیل کی
کہ جیسے تندیٔ مے سے چٹخ رہا ہو ایاغ
ہوا چلی کہ مشیت کو دل لگی سوجھی
سمندروں سے نہ پوچھو کبھی صدف کا سراغ

ہر ایک چیز میں گہرائی ہے، تجسّر ہے
ہوا کے بھیس میں اُمڈے سکوت کے دھارے
یہاں تو گُل بھی مرے ہم نصیب ہی نکلے
کہ تیرگی میں گھلے جارہے ہیں بے چارے
اندھیری شام سے محسوس ہو رہا ہے مجھے
کہ جیسے جھیل کی تہہ تک اُتر گئے تارے
نشیبِ شام سے نجمِ سحر کی چوٹی تک
تمام رینگتے کہرے، تمام سناٹے
تھکے تھکے ہیں کچھ اس طرح وقت کے تیور
کہ جیسے شیر، ہرن کو چبا کے لب چاٹے
سُنا ہے ایسی ہی شب ہائے تار تھیں، جن میں
بڑے وقار سے اجداد نے سفر کاٹے

مری نگاہ سے اوجھل ہے کاروانِ سحر
مگر جرس کی صدا تھی کہ رات بھر نہ تھمی

سجے تھے اوس کے موتی قبائے گلشن پر
مجھے یہ وہم، کہ آغوشِ گل میں برف جمی
جو آنسوؤں نے سرِ بام دل جلائے تھے
بجھا گئی وہ دیے دامنِ صبا کی نمی

اُفق لرزنے لگا، رات کے قدم اُکھڑے
سحر کے بند دریچے پہ کیوں نہ دستک دوں
ستارۂ سحری نے مجھے نہ پہچانا
تو کیا وطن میں پہنچ کر بھی اجنبی ہی رہوں
یہ اور بات، مجھے تابِ ضبط ہو کہ نہ ہو
سحر کی انجمنِ لرزیں قدم تو دھروں

قدم بڑھا تو چھنکنے لگی ہیں زنجیریں
نظر اٹھی تو دکھائی دیے کئی احباب
کسی کے دوش پہ ہل تھا، کسی کے ہاتھ میں پھول
کسی کے پاس درانتی کسی کے پاس کتاب
دمک رہا تھا وہ پندار اُن کے چہروں پر
دیا ہے اہلِ حکم نے جسے جنوں کا خطاب

گجر بجا کہ عروسِ سحر ہوئی بیدار
تنی ہوئی ہے فضا پر بسیط انگڑائی
ابھی اُفق سے وہ محبوبۂ شگفتہ مزاج
جو شب کو پردہ نشیں تھی تو دن کو ہرجائی
زمیں سے تا بہ فلک رنگ لہلہانے لگے
مگر یہ دھند سی کیا ذہن پر اُتر آئی

میں سوچتا ہوں، سحر نے مجھے شعور دیا
مگر یہی کہ تسلسل کے سلسلے ہیں طویل
مچل رہی ہیں شعاعیں — اُبل رہا ہے لہو
اُمڈ رہی ہے تجلّی، ابھر رہی ہے فصیل
چمک تو خوب تھی لیکن جھلس گئے ہیں بدن
نہ جانے شعلۂ نمرود تھا کہ باغِ خلیل
سحر کا ایک ہی مفہوم ہے — طلوعِ سحر
مجھے فریب نہ دیں روشنی کی تفسیریں
شگفتِ گُل کو تو ہے انتظارِ موسمِ گُل
وہ لاکھ نوکِ سناں سے کلی کا دل چیریں
کچھ اور نام ہے اس کا یہ فصلِ گُل تو نہیں
کہ بوئے گُل کے لیے ڈھل رہی ہیں زنجیریں

(نومبر ۱۹۵۲ء)

غزل

گو دھند میں تا کمر گیا چاند
نظروں میں مگر ٹھہر گیا چاند
شبنم کو شرار کر گیا چاند
آنکھوں میں غبار بھر گیا چاند
راہوں کو ٹٹولتے رہے تم
بادل میں اُدھر اُتر گیا چاند
جب ہجر کی رات چاند ڈوبا
دل چیخ اُٹھا کہ مر گیا چاند
اے دردِ فراق کے اندھیرو
کیا ہو گئے گُل؟ کدھر گیا چاند

اُجلا سا غبار ہے اُفق پر
اِس راہ سے کس کے گھر گیا چاند
اے لوٹتے آسرے، لٹے ہم
اے سوچتے رہ گذر، گیا چاند
تم، کاش، کرن کی چاپ سنتے
میرے لیے در بدر گیا چاند
اب آئے ہو آفتاب لے کر
ظلمات سے جب گزر گیا چاند
آنسو بھی نہیں کہ دل کو رولیں
تارے بھی گئے، جدھر گیا چاند

(دسمبر ۱۹۵۲ء)

غزل

حیراں حیراں کونپل کونپل، کیسے کھلتے پھول یہاں
تنے ہوئے کانٹوں کے ڈر سے پوجی گئی ببول یہاں
کلیاں نوکِ سناں سے چٹکیں، غنچے کٹ کے شگفتہ ہوئے
کاش یہ فصلِ خونِ بہاراں اور نہ کھینچے طول یہاں
شاید آج بھی جاری ہے آدم کا سلسلۂ اُفتاد
تھی نہ وہاں جنت بھی گوارا اور قبول ہے دھول یہاں
یارو یہ سناٹا توڑو، گیت نہیں تو چیخ سہی
رلوانا قانون یہاں کا، رو لینا معمول یہاں
پل پل میں تاریخ چھپی ہے، گھڑی گھڑی گرداں ہے ندیم
ایک صدی کی ہار بنے گی ایک نظر کی بھول یہاں

(دسمبر ۱۹۵۲ء)

شباب کے پھول

میں زندگی کی خزاں سے اپنے شباب کے پھول مانگتا ہوں
وہ پھول جن سے بہار کی رہ گذر پہ میں نے دیے جلائے
بہار کی دیویوں کے قدموں کی چاپ کانوں میں گونجتی تھی
مرے ترستے ہوئے خیالوں کے آسمانوں میں گونجتی تھی
اُفق تک اپنے قلم سے میں نے شباب کے پھول یوں بچھائے
کہ جب بہاریں یہاں سے گذریں تو میری مہکار ساتھ جائے
میں زندگی کی خزاں سے اپنے شباب کے پھول مانگتا ہوں
وہ پھول جن پر بہار کے روپ میں چلے گرد بادِ صحرا
وہ پھول، وہ میرے شاہپارے، مری امیدیں، مرے ارادے
شفق میں ڈوبے ہوئے پھریرے، لہو میں بھیگے ہوئے لبادے
یہاں سے وہ قافلے نہ گذرے فضائیں گونجی تھی چاپ جن کی
میں عمر بھر منتظر رہا ہوں، گواہ گردش ہے رات دن کی
میں زندگی کی خزاں سے اپنے شباب کے پھول مانگتا ہوں

جنوری ۱۹۵۲ء

غزل

شام کو صبحِ چمن یاد آئی
کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی

جب خیالوں میں کوئی موڑ آیا
تیرے گیسو کی شکن یاد آئی

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیٔ فن یاد آئی

چاند جب دور اُفق پر ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

دن شعاعوں سے الجھتے گزرا
رات آئی تو کرن یاد آئی

(فروری ۱۹۵۵ء)

منظر اور پس منظر

احساس کے داغ جل رہے ہیں
ذہنوں میں چراغ جل رہے ہیں
پربت کی طرح ہے رات بھاری
خاموش ہے کائنات ساری
پلکوں سے جب اشک پھوٹتا ہے
دھرتی کا جمود ٹوٹتا ہے

جھرنوں کی صدائیں آ رہی ہیں
پیڑوں میں ہوائیں گا رہی ہیں
جھیلوں میں نہا رہے ہیں تارے
پانی کو جلا رہے ہیں تارے
وادی میں بکھر گئے ہیں جگنو
سبزے میں اُتر گئے ہیں جگنو

آنکھوں میں لیے اُجاڑ بن سے
ہم لوگ تو چور ہیں تھکن سے
راتوں سے اٹی ہوئی نگاہیں
صدیوں سے ٹٹولتی ہیں راہیں

منظر کو یہ ضد ہے مُسکرائیں
ہونٹوں کی نمی کہاں سے لائیں

(اگست ۱۹۵۳ء)

دردِ وطن

ہم سیاست سے محبت کا چلن مانگتے ہیں
شبِ صحرا سے مگر صبحِ چمن مانگتے ہیں

وہ جو اُبھرا بھی تو بادل میں لپٹ کر اُبھرا
اسی بچھڑے ہوئے سورج سے کرن مانگتے ہیں

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذنِ کلام
ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں

ایسے غنچے بھی تو گل چیں کی قبا میں ہیں اسیر
بات کرنے کو جو اپنا ہی دہن مانگتے ہیں

فقط اِس جرم میں کہلائے گنہگار، کہ ہم
بہرِ ناموسِ وطن، جامۂ تن مانگتے ہیں

ہم کو مطلوب ہے تکریم قد و گیسو کی
آپ کہتے ہیں کہ ہم دار و رسن مانگتے ہیں

لمحہ بھر کو تو لبھاتے ہیں نعرے لیکن
ہم تو اے اہلِ وطن، دردِ وطن مانگتے ہیں

(اگست ۱۹۵۳ء)

سونا

تم کہتے ہو آفتاب اُبھرا
میں کہتا ہوں جل رہا ہے سونا

پیڑوں سے گزر رہی ہیں کرنیں
ہاتھوں سے نکل رہا ہے سونا
مشرق کی تمازتِ اَنا سے
مغرب میں پگھل رہا ہے سونا

(ستمبر ۱۹۵۳ء)

روایت

قدموں کے نقوش ہوں کہ چہرے
قبروں کے گلاب ہوں کہ سہرے
تاریخ کے بولتے نشاں ہیں
تہذیب کے سلسلے رواں ہیں
یہ رسم جہاں قدیم سے ہے
آدم کا بھرم ندیم سے ہے

(ستمبر ۱۹۵۳ء)

فکر

راتوں کی بسیط خامشی میں
جب چاند کو نیند آرہی ہو
پھولوں سے لدی خمیدہ ڈالی
لوری کی فضا بنا رہی ہو

جب جھیل کے آئینے میں گھُل کر
تاروں کا خرام کھو گیا ہو
ہر پیڑ بنا ہوا ہو تصویر
ہر پھول سوال ہو گیا ہو

جب خاک سے رفعتِ سما تک
اُبھری ہوئی وقت کی شکن ہو
جب میرے خیال سے خدا تک
صدیوں کا سکوت خیمہ زن ہو

اُس وقت مرے سلگتے دل پر
شبنم سی اُتارتا ہے کوئی
یزداں کے حریم بے نشاں سے
انساں کو پکارتا ہے کوئی

(دسمبر ۱۹۵۳ء)

پابندی

میرے آقا کو گلہ ہے کہ مری حق گوئی
راز کیوں کھولتی ہے
اور میں پوچھتا ہوں تیری سیاست، فن میں
زہر کیوں گھولتی ہے
میں وہ موتی نہ بنوں گا جسے ساحل کی ہوا
رات دن رولتی ہے
یوں بھی ہوتا ہے کہ آندھی کے مقابل چڑیا
اپنے پر تولتی ہے
اک بھڑکتے ہوئے شعلے پہ ٹپک جائے اگر
بوند بھی بولتی ہے

(اپریل ۱۹۵۴ء)

قطعہ

تمتماتے ہیں سُلگتے ہوئے رُخسار ترے
آنکھ بھر کر کوئی دیکھے گا تو جل جائے گا
اتنا سیال ہے یہ پیکر کہ گماں ہوتا ہے
میں ترے جسم کو چھو لوں تو پگھل جائے گا

غزل

تو جو بدلا تو زمانہ ہی بدل جائے گا
گھر جو سُلگا تو بھرا شہر بھی جل جائے گا
سامنے آکہ مرا عشق ہے منطق میں اسیر
آگ بھڑکی تو یہ پتھر بھی پگھل جائے گا
دل کو میں منتظرِ ابرِ کرم کیوں رکھوں
پھول ہے قطرۂ شبنم سے بہل جائے گا
موسمِ گُل اگر اس حال میں آیا بھی تو کیا
خونِ گُل چہرۂ گلزار پہ مَل جائے گا
وقت کے پاؤں کی زنجیر ہے رفتار ندیم
ہم جو ٹھہرے تو اُفق دور نکل جائے گا

(اکتوبر ۵۲ء ۱۹ء)

سفر اور ہم سفر

جنگل جنگل آگ لگی ہے، بستی بستی ویراں ہے
کھیتی کھیتی راکھ اُڑتی ہے، دنیا ہے کہ بیاباں ہے
سناٹے کی ہیبت نے سانسوں میں پکاریں بھر دی ہیں
ذہنوں میں مبہوت خیالوں نے تلواریں بھر دی ہیں

قدم قدم پر جھُلسے جھُلسے خواب پڑے ہیں راہوں میں
صبح کو جیسے کالے کالے دیئے عبادت گاہوں میں
ایک اک سنگِ میل میں کتنی آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی
ایک اک نقشِ قدم میں کتنی رفتاریں کفنائی ہوئی
ہم سفرو، اے ہم سفرو، کچھ اور بھی نزدیک آ کے چلو
جب چلنا ہی مقدر ٹھہرا، ہاتھ میں ہاتھ ملا کے چلو

(جنوری ۱۹۵۷ء)

غزل

کتنے خورشید بہ یک وقت نکل آئے ہیں
ہر طرف اپنے ہی پیکر کے گھنے سائے ہیں
ذہن پر تنگ ہوا جب بھی اندھیرے کا حصار
چند یادوں کے دریچے ہیں، جو کام آئے ہیں
کون کہتا ہے، محبت ہے فقط جی کا زیاں
ہم تو اک دل کے عوض حشر اُٹھا لائے ہیں
کتنے پل کے لیے وہ زینتِ آغوش رہے
کتنے برسوں کے مگر زخم نکھر آئے ہیں
گونج گونج اٹھتی ہے آوازِ شکستِ دل کی
جب بھی تارہ کوئی ٹوٹا ہے، وہ یاد آئے ہیں
داستانِ غمِ دنیا ہو کہ افسانۂ دل
وہی قصے ہیں جو ہر دور نے دہرائے ہیں
سینۂ ارض میں بیدار ہے احساسِ جمال
جب سے فن کار ستاروں سے اُتر آئے ہیں
اے سحر، آج ہمیں راکھ سمجھ کر نہ اُڑا
ہم نے جل جل کے ترے راستے چمکائے ہیں

(اگست ۱۹۵۷ء)

غزل

نہ محبت نہ صباحت نہ فانی
یہ سمندر ہیں سدا طوفانی

تجھ کو چاہا تو تجھی کو چاہا
اک یہ قصّہ نہ ہوا طولانی

ہم ترے عکس پہ کیسے بھولیں
آئنہ کس کا بنا ہے ثانی

ہم تری دُھن میں تجھے چھوڑ گئے
ہم نے صورت نہ تری پہچانی

ہم سے پوچھے کوئی رونے کا سبب!
اس قدر کون کرے قربانی

جیتے جیتے کسی قابل نہ رہے
قدر جینے کی نہ ہم نے جانی

کچھ سمجھتے تو کچھ آگے بڑھتے
اپنے پلّے تو پڑی حیرانی

سینہ کے چھالوں نے تو بربت چاٹے
چلمنوں سے نہ رُکے گا پانی

اُن کو لوٹا تو اُجڑ جاؤ گے
جن کا سامان ہے بے سامانی

(ستمبر ۱۹۵۷ء)

گجر بجا دو

(اسپوتنک نمبر ۲ کی پرواز کے روز)

انگڑائیاں لے رہے ہیں تارے
اب رات کی چلمنیں اُٹھا دو
اب تیرگی ہاتھ مل رہی ہے
اب اس کو رہِ سحر دکھا دو
اونچے پیڑوں کی خامشی کو
جھونکوں کے سرود میں بہا دو
مشرق کا اُفق چمک اُٹھا ہے
مغرب کے غبار کو بتا دو
سورج کا اب انتظار کیسا
پَو پھٹنے لگی، گجر بجا دو
اب اوج پہ ہے جمالِ انساں
اب چرخ کو آئینہ بنا دو
جو ہاتھ ترس گئے حِنا کو
اب اُن کو شفق کا رنگ لا دو
شبنم کی طرح جو رو رہے ہیں
تاروں کی طرح اُنھیں ہنسا دو

اڑتے ہوئے پل نہیں تھمیں گے
اکڑی ہوئی گردنیں جھکا دو
ماضی کے مزار سے نکل کر
فردائے حیات کو صدا دو
اب حدِ نظر کی مشعلوں کو
تا حدِ خیال جگمگا دو
قرنوں سے تنی ہوئی خلا کو
انسان کا فیصلہ سُنا دو

یہ فرش ہے عرش قدسیوں کا
اس وہم کو واقعہ بنا دو
اے جنّتِ گم شدہ کے رازو
آدم اُبھرا ہے راستہ دو
اے حوصلو، میرا ساتھ دو تم
اے ولولو، تم مجھے دعا دو

(۱۳ر نومبر ۱۹۵۰ء)

غزل

وہ دھندلکا جسے سب حدِ نظر کہتے ہیں
اب تو انسان کی ہے راہ گذر کہتے ہیں
اپنا نعرہ بھی انا الحق ہے مگر فرق یہ ہے
ہم وہی بات بہ اندازِ دگر کہتے ہیں
شیخ نے جس کو دیا نامۂ اعمال کا نام
ہم گنہگار اسے دامنِ تر کہتے ہیں
طاق پر جس کے کبھی ایک دیا تک نہ جلا
ہم تو اس گھر کو بھی اللہ کا گھر کہتے ہیں
کاش انساں کو شرر ہی کی چمک دے سکتے
زندگی کو جو فقط رقصِ شرر کہتے ہیں
رات جل اٹھتی ہے جب شدّتِ ظلمت سے ندیم
لوگ اس وقفۂ ماتم کو سحر کہتے ہیں

(ر دسمبر ۱۹۵۰ء)

جمیلہ

پا بہ زنجیر ہوئی، وقت کی رفتار کہاں!
جو کبھی کٹ نہ سکے، ایسی شبِ تار کہاں!
اے مرے جسم کو کانٹوں میں پرونے والے
ہے غلامی سے بھی بڑھ کر کوئی آزار کہاں!
میں نے جس راز کو سینے میں چھپا رکھا ہے
سرِ دربار نہ کھولا تو سرِ دار کہاں!
وہ جسے سایۂ سر بھی نہیں بہلا سکتا
اس جنوں کو ہوسِ سایۂ دیوار کہاں!
سینچتے ہیں جنھیں خود اپنے لہو سے ہم لوگ
جا کے بکتے ہیں وہ گلشن سرِ بازار کہاں!
باندھے جاتے ہیں زبانوں پہ جہاں انگارے
وا ہوا بھی تو ہمارا لبِ اظہار کہاں!
اے طلبگارِ صباحت! مرے گھر کی سرحد
ساحلِ قلزمِ خوں ہے، خطِ گلزار کہاں!
مجھ پہ اُٹھا ہوا خنجر ترے دل میں اُترا
جا کے ٹوٹا ہے ستم گر، ترا پندار کہاں!

(جون ۱۹۵۸ء)

ایشیا

ہر گئے دور کا احتساب ایشیا، ہر نئے دور کا اضطراب ایشیا
ظلمتِ شب کا دار الحساب ایشیا، صبحِ تہذیب کا آفتاب ایشیا
مدتوں تک بر و بحر کے حکمراں، ایشیا کے ٹکڑوں پہ پلتے رہے
یوں تو مغرب کی نظروں میں ہے آج بھی صرف اک خیمۂ بے طناب ایشیا

ابروؤں کے یہ خم، چتونوں کے یہ بل، صاحبو، "کے یہ انداز ہیں بے محل
جو سوال اس کی غیرت سے پوچھے گئے۔ دے رہا ہے انہی کا جواب ایشیا
اے جنونِ مکافات کے شاکیو، یاد گذرے ہوئے وہ زمانے کرو
جب لہو اس کے دل سے نچڑتا رہا، اور کھاتا رہا پیچ و تاب ایشیا
خلوتِ خاص میں ہے یہ کہرام کیوں، قصرِ عالی ہے لرزہ براندام کیوں
دیکھتا ہے خود اپنے کھنڈر میں اگر عظمتِ آدمیت کا خواب ایشیا
گو بہ ظاہر ابھی پیرہن چاک ہے۔ اس کے ہاتھوں میں میزانِ افلاک ہے
اب جو مانگو تو برگِ گلاب ایشیا، اور چھینو تو موجِ سراب ایشیا
جنسِ ناموسِ آدم کے سوداگرو، یہ صدی ہے مرے ایشیا کی صدی
چترِ شاہنشہی تھامنے کے عوض، اب نہیں بیچتا خونِ ناب ایشیا
کل بھی تہذیب و اخلاق کی مشعلیں پرتوِ ایشیا سے فروزاں رہیں
برق و جوہر کے اس دورِ تاباں میں بھی نوعِ انساں کا عہدِ شباب ایشیا

(اگست ۱۹۵۸ء)

ہم

پاداشِ حق میں زینتِ زنداں، ہمیں تو ہیں
اس تیرگی میں شمعِ فروزاں، ہمیں تو ہیں
جس کا اُفق غروب کی لو سے ہے تابناک
اے صبحِ نو، وہ شامِ غریباں ہمیں تو ہیں
صدیوں سے زندگی کے لباسِ حریر کا
جو چاک ہو رہا ہے، وہ داماں ہمیں تو ہیں
جو بھائیوں کی حرصِ تجارت میں بک گئے
اے نظمِ نو وہ یوسفِ کنعاں ہمیں تو ہیں

کہتے پھرے ہیں غبارِ سفر ہم کو اہلِ دیر
لیکن جبینِ دہر کی افشاں ، ہمیں تو ہیں
ہم جل رہے ہیں اپنی اُمنگوں کی آگ میں
اس جشنِ حرّیت کا چراغاں ہمیں تو ہیں
جس میں لہو کی بو ندگراں تر ہے تخت سے
تھامے ہوئے وہ عدل کی میزاں ہمیں تو ہیں
آئینۂ صباحتِ انساں ہے جن کا فن
اے روحِ عصرِ نو وہ غزل خواں ہمیں تو ہیں

(اگست ۵۸ ۱۹ء)

ایک منظر

گنجان صنوبروں کے پیچھے
اک چاند ہزار چاند بن کر
تاروں کی طرح بکھر گیا ہے
اس سیلِ جمال کے سہارے
ماضی کے نشیب بھر گئے ہیں
ویرانۂ جاں سنور گیا ہے
خوشبوئے حنا کا ایک پیکر
جلتی ہوئی انگلیوں کی لو سے
چھوتا ہے لبوں کے جب کنارے
کھُل جاتے ہیں مصلحت کے اصنام
ہٹ جاتے ہیں قصرِ دل سے پہرے
آتے ہیں خیال پیارے پیارے

اک عمر کے بعد جب کھُلی آنکھ
گنجانِ صنوبروں کے پیچھے
چاند آخرِ کار اُتر چکا ہے
گردش تو فضا میں گونجتی ہے
لمحوں کی تو چاپ سُن رہا ہوں
میرے لیے وقت مر چکا ہے

(ستمبر ۱۹۵۸ء)

غزل

لبِ خاموش سے افشا ہوگا
راز ہر رنگ میں رسوا ہوگا
دل کے صحرا میں چلی سرد ہوا
ابر گلزار پہ برسا ہوگا
کس توقع پہ کسی کو دیکھیں
کوئی تم سے بھی حسیں کیا ہوگا
جس بھی فن کار کے شہکار ہو تم
اُس نے صدیوں تمھیں سوچا ہوگا
زینتِ حلقۂ آغوش بنو
دور بیٹھو گے تو چرچا ہوگا
ظلمتِ شب میں بھی شرماتے ہو
درد چمکے گا تو پھر کیا ہوگا
آج کی رات بھی تنہا ہی کٹی
آج کا دن بھی اندھیرا ہوگا

کس قدر کرب سے چٹکی ہے کلی
شاخ سے گلُ کوئی ٹوٹا ہوگا
عمر بھر روئے فقط اس دُھن میں
رات بھیگی تو اُجالا ہوگا
ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے
کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہوگا

(ستمبر ۱۹۵۸ء)

قطعہ

داورِ حشر مجھے تیری قسم
عمر بھر میں نے عبادت کی ہے
تو مرا نامۂ اعمال تو دیکھ
میں نے انساں سے محبت کی ہے

(جنوری ۱۹۵۹ء)

قطعہ

کنجِ زنداں میں پڑا سوچتا ہوں
کتنا دلچسپ نظارا ہوگا
یہ سلاخوں میں چمکتا ہوا چاند
تیرے آنگن میں بھی نکلا ہوگا

(دسمبر ۱۹۵۸ء)

غزل

فاصلے کے معنی کا کیوں فریب کھاتے ہو
جتنے دور جاتے ہو اتنے پاس آتے ہو

رات ٹوٹ پڑتی ہے جب سکوتِ زنداں پر
تم مرے خیالوں میں چھُپ کے گنگناتے ہو
میری خلوتِ غم کے آہنی دریچوں پر
اپنی مسکراہٹ کی مشعلیں جلاتے ہو
جب تنی سلاخوں سے جھانکتی ہے تنہائی
دل کی طرح پہلو سے لگ کے بیٹھ جاتے ہو
تم مرے ارادوں کے ڈوبتے ستاروں کو
یاس کی خلاؤں میں راستہ دکھاتے ہو
کتنے یاد آتے ہو، پوچھتے ہو کیوں مجھ سے
جتنے یاد کرتے ہو۔ اتنے یاد آتے ہو

(دسمبر ۵۸ ۱۹ء)

قطعہ

قوتِ بازوئے انساں کے بغیر
خاک کا ڈھیر جمالِ زر و سیم
اتنی عظمت کا تصور بھی محال
جتنی انسان کی عظمت ہے عظیم

(جنوری ۱۹۵۹ء)

اشعار

ہم دن کے پیامی ہیں مگر کشتۂ شب ہیں
اس حال میں بھی رونقِ عالم کا سبب ہیں
ظاہر میں ہم انسان ہیں مٹی کے کھلونے
باطن میں مگر تند عناصر کا غضب ہیں

ہیں حلقۂ زنجیر کا ہم خندۂ جاوید
زنداں میں بسائے ہوئے اک شہرِ طرب ہیں
چٹکی ہوئی یہ حُسنِ گریزاں کی کلی ہے
یا شدتِ جذبات سے کھِنچتے ہوئے لب ہیں
آغوش میں جھکوگے دکھائی نہیں دوگے
تم نکہتِ گلزار ہو، ہم پردۂ شب ہیں

(جنوری ۱۹۵۹ء)

قطعہ

یارب اک عرض ہے گستاخانہ
(رہیں آباد ترے دیر و حرم)
مُسکراتا ہوا دیکھا ہے تجھے
جب چٹانوں میں دھڑکتے ہیں صنم

(جنوری ۱۹۵۹ء)

غزل

پرواز کو محدود نہ کر شام و سحر تک
انساں کی ہیں مملکتیں حدِ نظر تک
اک عمر سے ہر شب سرِ شہراہِ محبت
میں شمع کے انداز میں جلتا ہوں سحر تک
اک شب تو سحر تک مری آغوش میں جھکو
اک رات کی زلفیں تو پہنچنے دو کمر تک
لبریزِ جمال ایک کا دل ایک کا پہلو
اتنا سا فقط فاصلہ ہے خیر سے شر تک

انساں نے تخلیق سے اب تک جو کیے طے
وہ مرحلے گزرے ہیں تری راہ گزر تک
اک بار بگڑ کر جو تری بزم سے اُٹھوں
پھر آکے ترے پاس نہ لوں اپنی خبر تک
پندارِ محبت کے وہی لوگ امیں ہیں
پہنچے غمِ جاناں سے جو غم ہائے دگر تک
آدم کی سُلگتی ہوئی تاریخ رقم ہے
جبریل کے شہپر سے مرے دامنِ تر تک
ابھرو بھی ندیم اپنی شکستوں کے کھنڈر سے
لوٹے، تو بلندی کو لپکتا ہے شرر تک

(جنوری ۱۹۵۹ء)

صبحِ آگہی

اِک ایسے دور میں پیدا ہوئی ہے پود اپنی
کہ ایک پل میں زمانے گزرتے دیکھے ہیں
فنا کے دام میں اُلجھے ہوئے غریب انسان
نظامِ شمس، پہ یلغار کرتے دیکھے ہیں
بصیرتوں پہ رہی برق بار جن کی چمک
وہ آفتاب خلاؤں میں مرتے دیکھے ہیں
جنھیں فقط دلِ آدم کی تھی فضا محبوب
وہ زخم سینۂ مہ پر بکھرتے دیکھے ہیں
جو نصف شب کو سُنی ہے صدائے پائے سحر
تو دوپہر کو ستارے اُبھرتے دیکھے ہیں
زمین پر وہ قیامت کا دور آیا ہے
کہ ہر بسیطِ حقیقت ہے جاں کنی سے دوچار

بساطِ ذہن پہ صرف ایک پھول کھلنے سے
ہٹی ہیں کتنی فصیلیں، کٹے ہیں کتنے حصار
بجھی ہیں کتنے بڑے فلسفوں کی قندیلیں
ملا ہے خاک میں کتنے علوم کا پندار
وہ آدمی جو نکالا گیا تھا جنت سے
اُٹھا ہے بن کے قمر افگن و ستارہ شکار
ہیں لمحہ لمحہ کی زد میں صدی صدی کے اصول
کہ ہو رہی ہے نئی صبحِ آگہی بیدار

(جنوری ۱۹۵۹ء)

ایک شعر

ہر زخم، زبان بن رہا ہے
اب دردِ حیات میں کمی ہے

(۲ر فروری ۱۹۵۹ء)

پسِ پردہ

کیسا بپھرا ہوا سناٹا ہے
ہانپتے، ہونکتے جھونکوں کی قسم
تیرہ و تار افق پر اشجار
رقص کرتے ہوئے جنات کے خم
گڑ گئی سینۂ آفاق میں رات
کٹ گئے وقت کے بے چین قدم
چمک اے چودھویں شب کے مہتاب
عالم افروز ہیں تیرے دم خم

چاند کہتا ہے پسِ پردۂ ابر
"کون ظلمات کی دلدل میں پھنسے
میں کوئی لالۂ صحرا تو نہیں
کون سنسان فضا میں چمکے
کون آسیب سے رشتہ باندھے
کون لوٹی ہوئی قبروں پہ ہنسے
کیوں مرا خونِ جگر مفت بہے
چاندنی کیوں مری بے کار لٹے"
ذہن کہتا ہے پسِ پردۂ کرب
"ایک پل پر نہیں صدیوں کا مدار
زندگی جھیل بھی ہے چشمہ بھی
اور چشمے نہیں تھمتے زنہار
آدمی پھول بھی ہے، کانٹا بھی
اور کانٹے کا لچکنا دشوار
ڈھال فولاد بنے یا تہذیب
خالی جاتا نہیں تاریخ کا وار"
سوچتا ہوں میں پسِ پردۂ شب
گنگناتے ہوئے جھونکوں کی قسم
خواب آلود اُفق پر اشجار
رقص کرتی ہوئی لیلاؤں کے خم
سینۂ ارض کو بوسوں کے گلاب
دے گئے وقت کے بے چین قدم
ابر پر چاند کی میّت اُبھری
صبح نے لوٹ لیے سب دم خم

قطعہ

مانا کہ طویل فاصلوں پر
برسوں کے غبار چھا گئے ہیں
محرومی مشترک ہے لیکن
ہم کتنے قریب آ گئے ہیں

(اکتوبر ۵۸ ۱۹ء)

خشک پتے

جب ذرا تیز ہوا آتی ہے
خشک پتوں کی صدا آتی ہے
خشک پتے - مری عمروں کے رفیق
خشک پتے - مری تنہائی کے پھول
خشک پتے - مری غیرت کے اصول
گوشۂ گلشنِ ویراں کا سکوت
اتنا پرہول ہے۔ جیسے اک لاش
شب کی باہوں میں لٹک کر رہ جائے
چاندنی اس کا کفن ہو گویا
چار جانب سے اُبلتی ہوئی موت
سانس کو روک کے چلتی ہوئی موت
یک بہ یک ذہن پہ دستک دے کر
خشک پتوں نے پکارا مجھ کو
"باغ اُجڑا ہو کہ آباد رہے
ذہن اُس فکر سے آباد رہے

کہ یہاں اب نہ چلیں گے جھونکے
اور جو چیز جہاں رکھی ہے
حشر کے دن بھی وہیں دیکھو گے"

فصلِ گُل ہو کہ خزاں کی رُت ہو
جب ذرا تیز ہوا آتی ہے
وقت کی آہٹیں گونج اٹھتی ہیں
خشک پتّوں کی صدا آتی ہے

"ہم ترے پاس بھی ہیں، ساتھ بھی ہیں
ہم وہی ہیں۔ ترے عمروں کے رفیق
ہم وہی ہیں۔ تری تنہائی کے پھول
ہم وہی ہیں۔ تری غیرت کے اصول

(اکتوبر ۵۹ء)

قطعہ

ممکن ہے، فضاؤں سے خلاؤں کے جہاں تک
جو کچھ بھی ہے آدم کا نشانِ کفِ پا ہو
ممکن ہے، کہ جنّت کی بلندی سے اُتر کر
انسان کی عظمت میں اضافہ ہی ہوا ہو

(جنوری ۷۰ء)

اے مشیّت تری قوّت کو سلام

تیری مٹھی میں ہے مہر و مہ و انجم کا نظام
ارض و مریخ ترے دم سے ہیں گردش میں مدام
مجھ سے کافر کو بھی کب ہے، تری عظمت میں کلام
اے مشیّت! تری قوّت کو سلام

نہ ازل ہے کوئی نقطہ، نہ ابد کوئی لکیر
وقت بھی ہے ترے پیکانِ بقا کا نخچیر
ان حصاروں سے ہے اونچا ترا معیارِ دوام
اے مشیت! تری قوت کو سلام

کتنی قرنوں سے خلاء میں ہے زمیں آوارہ
وقت کی دھول سے آزاد ہے یہ سیّارہ
وہی خوابیدہ لبالی، وہی بیدار ایام
اے مشیت! تری قوت کو سلام

وہی جذبات کے بندھن، وہی رشتے، وہی جال
وہی معمولِ محبت وہی کردار جمال
وہی اُمڈی ہوئی آنکھیں، وہی حسنِ بربام
اے مشیت! تری قوت کو سلام

پھول کھِلتے ہیں اسی طرح گلستانوں میں
اسی نرمی سے ہوا چلتی ہے میدانوں میں
سرِ ساحل ہے وہی موج کا اندازِ خرام
اے مشیت! تری قوت کو سلام

اب بھی انسان ہے اسباب و نتائج کا اسیر
قصر کے سائے میں اب تک ہے وہی جمِ غفیر
وہی جینا ہے مصیبت، وہی مرنا ہے حرام
اے مشیت! تری قوت کو سلام

(جولائی ۱۹۶۰ء)

غزل

کون جگ میں ترا ہمسر دیکھے
کوئی اس دُھند میں کیوں کر دیکھے

عمر بھر اک ترا دھیان رہا
یوں تو ہر مہ و اختر دیکھے

آنکھ صرف آنکھ ہے آئینہ نہیں
جو تجھے سامنے پا کر دیکھے

تیرے جاتے ہی یہ محسوس ہوا
عمر گذری تجھے پل بھر دیکھے

دور ہی دور سلگنے والے
کاش تو پاس بھی آ کر دیکھے

ہم تو تجھے حسن کے تاریخ نگار
ہم نے قیصر نہ سکندر دیکھے

لوگ ماضی کے دھوئیں میں ڈوبے
ہم نے گیسوئے معنبر دیکھے

نظر آئے اُنھیں سبزے میں بھی سانپ
ہم نے صحرا بھی ثمر ور دیکھے

اُنھیں جسموں نے بتوں نے جھانکا
ہم نے پتھر میں بھی پیکر دیکھے

اُنھیں دریاؤں نے پیاسا مارا
ہم نے آنکھوں میں سمندر دیکھے

کون غالب سا سخن ور ہے ندیم
سینکڑوں یوں تو ہنر ور دیکھے

(جولائی ۱۹۶۰ء)

نذر فن کارانِ وطن

کیوں تیرگیٔ ذہن کا الزام خدا پر
تو خود ہی دھواں بن کے مسلّط ہے فضا پر

خوابوں کی یہ باتیں ہیں کہ جب ظلمتِ شب میں
مشعل کا گماں تھا مری ایک ایک صدا پر
جب نشۂ تخلیق میں تو نے کبھی دیکھا
پھولوں کے سفینے تھے رواں موجِ صبا پر
اب تک ہیں مجھے تیرے خیالوں کے سفر یاد
جلتے تھے دیے جب ترے نقشِ کفِ پا پر
دریوزۂ جذبات کے باوصف، بہ ظاہر
صرف اپنی لکیریں تھیں ترے دستِ دعا پر
یہ ذہن کے فردوس ترے فن کے نشاں تھے
یہ بھی کبھی سوچا کہ قدم تیرے کہاں تھے"؟

اس شان سے بدلا ہے چلن عصرِ رواں کا
اب چاند بھی اِک پھول ہے گلزارِ جہاں کا
تقدیر کے روکے بھی ابد تک نہ رُکے گا
انساں ہے اب اک تیر مشیت کے کماں کا
اب فاصلے کچھ ہیں تو روایاتِ کہن ہیں
اب حدِ نظر پر بھی گماں ہے رگِ جاں کا
اس درجہ بصارت کے اُفق پھیل گئے ہیں
تاروں پہ بھی دھوکا ہے رُخِ برق وشاں کا
وہ دل کا پھپھولا ہو کہ داغِ رُخِ خورشید
محتاج ہے فن کار کی چشمِ نگراں کا
گو وقت، شب و روز کے چکر میں رواں ہے
جب بھی نظر اُٹھتی ہے گجر دم کا سماں ہے
رہ رہ کے مجھے اب یہ خیال آنے لگا ہے
صدیوں کے اصولوں کو زوال آنے لگا ہے

مرمر کے دریچوں پہ ہیں ظلمات کے پہرے
مٹی کے گھروندوں پہ جمال آنے لگا ہے

ہے دھول سے لبریز اُدھر ساغرِ جمشید
گردش میں اِدھر جامِ سفال آنے لگا ہے

بہتر ہے کہ انجم حدِ امکاں سے نکل جائیں
انساں کو مقدر پہ جلال آنے لگا ہے

کیا خلد کی میراث پہ کچھ حق نہیں میرا
آدم کے لبوں پر یہ سوال آنے لگا ہے

سوئی ہوئی کس دھن میں تری غیرتِ فن ہے
جاگا ہوا انساں بھی تو موضوعِ سخن ہے

(اگست ۱۹۴۰ء)

شامِ فراق

برس رہا ہے فضا سے کسی کی یاد کا نور
دمک رہا ہے ستارے کی طرح زخمِ جگر
چمک رہے ہیں جھروکے مرے خیالوں کے
مری شکست کے چُپ چاپ رہگزاروں پر
لپک رہے ہیں تصور پری جمالوں کے
ہر ایک گذرا ہوا پَل کروڑوں روپ لیے
غبارِ وقت سے یوں جھانکنے لگا، جیسے
اُمنڈ رہے ہیں اُفق سے، پرے غزالوں کے
وہ روشنی ہے کہ ہر چیز ہے برہنہ بدن
وہ ایک فرد کا غم ہو کہ روحِ عصر کا درد
جو راز دفن رہے، مدتوں، قرن بہ قرن
کچھ ایسے فاش ہوئے جا رہے ہیں پے در پے

کسی شہید کی نظروں میں جس طرح ٹوٹے
غرورِ جبر و تشدد، طلسمِ دار و رسن
کلیم ہوں، مری شامِ فراق میرا طور
برس رہا ہے فضا سے کسی کی یاد کا نور

(ستمبر ۱۹۷۰ء)

سچ

سقراط سے گلیلیو تک، سچ کے زہر سے
کتنی عقیدتوں کے جگر چاک ہو گئے
کتنے عظیم قوت و حشمت کے دیوتا
سیلِ شعور کے خس و خاشاک ہو گئے

سچ کو بسا کے دل میں، سفر پر چلا تھا میں
اِک شانِ بے رُخی سے، بساطِ حیات پر
کوسوں تک ایک بھی مجھے انساں نہ مل سکا
کتنا غرور تھا مجھے عرفانِ ذات پر
اُٹھتا رہا خیال میں طوفانِ زلفِ یار
سقراط یاد آتا رہا بات بات پر
روندے کچھ ایسے اپنی جبلت کے بتکدے
محمود جیسے ٹوٹ پڑے سومنات پر
اب سوچتا ہوں اپنی تھکن کے غبار میں
سچ زہر ہی سہی، مگر اس میں نشہ بھی ہے
سچ کے کھنڈر پہ چڑھ کے صدا دے رہا ہوں میں
"دنیا میں کیا کوئی مجھے پہچانتا بھی ہے؟"

(اکتوبر ۱۹۷۰ء)

غزل

دعویٰ تو کیا حُسنِ جہاں سوز کا سب نے
دنیا کا مگر روپ بڑھایا تری چھب نے
تو نیند میں بھی میری طرف دیکھ رہا تھا
سونے نہ دیا مجھ کو سیہ چشمئ شب نے
ہر زخم پہ دیکھی ہیں ترے پیار کی مُہریں
یہ گُل بھی کھلائے ہیں تری سُرخیٔ لب نے
خوشبوئے بدن آئی ہے پھر موجِ صبا سے
پھر مجھ کو پکارا ہے ترے شہرِ طرب نے
درکار ہے، مجھ کو تو فقط اذنِ تبسّم
پتھر سے اگر پھول اُگائے مرے رب نے
وہ حُسن ہے انسان کی معراجِ تصوّر
جس حُسن کو پوجا ہے مرے شعر و ادب نے

(نومبر ۱۹۷۰ء)

خدیجہ زہرہ

(جس کا جسم الجزائر کے شہر عروہ میں اُس وقت فرانسیسی گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ جب وہ فرانسیسی استبداد کے خلاف ایک مظاہرے میں حصہ لے رہی تھی)

جون ڈی آرک[1] کے پیکر سے نکلتی لَو نے
کتنے خاکے رسن و دار کے دکھلائے ہیں
کتنی پوشیدہ صلیبوں کے لگائے ہیں سُراغ

---

[1] فرانس کی بہادر بیٹی جو اپنے وطن پر انگریزی تسلط کے خلاف لڑی۔

جب کہیں قافلۂ عشق رواں ہوتا ہے
جون کا شعلۂ بے باک جواں ہوتا ہے
بھڑک اُٹھتے ہیں سُلگتی ہوئی آنکھوں کے چراغ

خون کی تیرگی درد چمک اُٹھتی ہے
جون کی چاپ سے تاریخ کھنک اُٹھتی ہے
الجزائر میں دمک اُٹھتے ہیں روآں[1] کے داغ

کیا کبھی عظمتِ پیرس نے یہ سوچا بھی ہے؟
جون ڈی آرک، جمیلہ[2] بھی، خدیجہ بھی ہے

(جنوری ۱۹۶۱ء)

---

[1] فرانس کا وہ مقام جہاں جون ڈی آرک کو نذرِ آتش کیا گیا تھا۔
[2] الجزائر کی مشہور مجاہد خاتون جو عالمی احتجاج کے باعث موت کی سزا سے تو بچ گئی مگر تادمِ تحریر محبوس ہے۔

تین سرزمینیں

سرزمینِ دل پہ ماضی کے رواں ہیں کارواں
چار سو آراستہ ہیں کتنی یادوں کے نشاں
اِک طرف چہرے، کتابوں کی طرح رازوں سے پُر
اِک طرف تیور، تقاضے! اِک طرف آنکھیں، زباں
اِک طرف جلتے ہوئے ہونٹوں کی شمعیں شعلہ بار
اِک طرف اُڑتا ہوا گیسوئے مشکیں کا دھواں
اِک طرف صرف ایک چٹکی میں گزرتے رات دن
اک طرف وہ پل کہ غش کھا جائے عمرِ جاوداں
اک طرف ہے وسعتِ گیتی، مگر محصور ہے
اک طرف ہے حلقۂ آغوش، لیکن بے کراں

سرزمینِ ذہن پر ہیں حال کے لشکر رواں
چار سو آراستہ ہیں کتنے زخموں کے نشاں

اک طرف اُمید کے پیڑوں پہ بور آیا ہوا
اِک طرف گھرتی، اُمڈتی، دندناتی آندھیاں
اک طرف ڈرتے عقیدے، اک طرف مرتے یقیں
اک طرف صف بستہ ملبوسِ حقیقت میں گماں
اِک طرف دشمن کو بھی دشمن پہ پیار آیا ہوا
اک طرف نفرت کے نرغے میں خلوصِ دوستاں
اک طرف انساں خود اپنی نظر میں اجنبی
اک طرف ذرّوں کی مریخ و زحل سے شوخیاں

سرزمینِ حال پر ہے روحِ مستقبل رواں
چار سو آراستہ ہیں کتنے خوابوں کے نشاں

اک طرف ویران رستوں پر چہکتے ہم سفر
اِک طرف ملبے کے ڈھیروں پر لچکتی کہکشاں
اک طرف افراد کے رشتوں میں آہنگِ نسیم
اک طرف قوموں کی باتوں میں گلوں کی نرمیاں
اک طرف تارے، عروجِ آدمی کے مستقر
اک طرف گھر کی منڈیروں پر حدودِ لامکاں
اک طرف حُسن و محبت اِک طرف تقدیس و خیر
اِک طرف صرف آدمیّت، اک طرف ہفت آسماں

(جنوری ۱۹۷۱ء)

ڈھلان

ریت پر ثبت ہیں یہ کس کے قدم؟
حُسن کی نرم خرامی کی قسم

میرے حل مری تخئیل جواں گزری ہے
یا کوئی انجمن گل بداماں گزری ہے

موج نے نقشِ قدم چاٹ لیے
میری تخئیل کے پرکاٹ لیے

لوگ دریاؤں کے انجام سے ڈر جاتے ہیں
اب تو رستے بھی سمندر میں اُتر جاتے ہیں

(مارچ ۱۹۷۱ء)

غزل

ــــ نذرِ غالب ــــ

ہنسی آتی ہے مجھ کو امتیازِ دشت و گلشن پر
گھٹا کعبے سے اٹھتی ہے، برستی ہے برہمن پر

خمارِ خانہ ویرانی میں یوں محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے بجلیوں نے رنگ چھڑکے ہیں نشیمن پر

چلو، دشتِ طلب میں ایک انساں تو نظر آیا
جو وہ مانے تو اپنی جان رکھ دوں دستِ رہزن پر

جفائے دوست کی مجھ سے شکایت ہو تو کیوں کر ہو
وہ دیوانہ ہوں جس کو پیار آجاتا ہے دشمن پر

شمیمِ گُل تو رنگِ گُل کے بس میں بھی نہیں رہتی
خزاں کیوں ہاتھ پھیلاتی رہی دیوارِ گلشن پر

قفس کی تیرگی کچھ کم نہ تھی ہول آفرینی کو
کرن کے روپ میں تلوار رکھ دی کس نے روزن پر

خدا کے سامنے کس منہ سے جائیں گے، خدا جانے
محبت کا کوئی دھبا نہیں ہے جن کے دامن پر

عناصر سے نمٹ کر، کیا بتاؤں، کس سے نمٹے گا
ندیم اب آدمی کے ہاتھ ہیں خود اپنی گردن پر

(مارچ ۱۹۶۱ء)

دیوانہ

ایک دیوانہ کا کل ' سرِ گلزارِ حیات
ایک انبوہ میں چپ چاپ چلا جاتا ہے
ایک گلُ ہے کہ بگولے میں اُڑا جاتا ہے

زندگی شور مچاتی ہے کہ "اے دیوانے
زندہ لمحوں کو تو بچے بھی نہیں کھو سکتے
اتنے بے حس تو فرشتے بھی نہیں ہو سکتے"

بڑھتا جاتا ہے وہ دیوانۂ آسودہ خرام
اور کہتا ہے کہ "اے ہم نفسانِ معصوم
مجھ کو معلوم ہیں جو راز، تمھیں کیا معلوم"

رُک تو جاؤں چمنستانِ جہاں میں، لیکن
میری آنکھوں سے تم آنکھیں تو ملا لو پہلے
مٹھیاں کھول کے پتھر تو گرا لو پہلے

(مارچ ۱۹۶۱ء)

بہار

اتنی خوشبو ہے کہ دم گھٹتا ہے
اب کے یوں ٹوٹ کے آئی ہے بہار

آگ جلتی ہے کہ کھلتے ہیں چمن
رنگ شعلہ ہے تو نکہت ہے شرار
روشوں پر ہے قیامت کا نکھار
جیسے تپتا ہو جوانی کا بدن
آبلہ بن کے ٹپکتی ہے کلی
کونپلیں پھوٹ کے لَو دیتی ہیں
اب کے گلشن میں صبا یوں بھی چلی

(جون ۱۹۶۱ء)

مراجعت

(خلا میں پہلے انسان کی پرواز پر)

میری لب بستگی پر نہ جاؤ
میرے دل میں قیامت بپا ہے
جانے کیا کیا ہیں میرے ارادے
ذہن چھلکا چلا جا رہا ہے
کیا بتاؤں کہ لمحہ گذر کر
میرے کانوں میں کیا کہہ گیا ہے
یوں دما دم قدم اُٹھ رہے ہیں
وقت حیراں کھڑا سوچتا ہے
طیش میں لاکھ آئیں عناصر
ابنِ آدم کہاں مانتا ہے
جتنے چبھتے ہیں تلووں میں کانٹے
حوصلہ اور بھی بڑھ رہا ہے
ایک چپ چاپ صحرا ابد کا
مجھ سے پوچھو اُفق پار کیا ہے

کیوں لرزنے لگے ہو ستارو!
یہ تو پرواز کی ابتدا ہے
آسماں میری منزل نہیں ہے
آسماں تو خلا ہی خلا ہے
اپنی گم گشتہ جنت کو پالو
صرف اتنا مرا مدعا ہے
ہوشیار اے فرشتو، کہ پھر سے
ایک سجدے کا وقت آ رہا ہے

(یکم اگست ۱۹۷۱ء)

قطعہ

ماحول کے خول سے نکل کر
یہ نکتہ سمجھتے، کاش، ہم لوگ
ہر فرد کے اَن گنت خدا ہیں
اب تک ہیں صنم تراش ہم لوگ

(۱ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

فنونِ لطیفہ

کلی چٹکتی ہے، جیسے کماں کڑکتی ہے
لہو میں ڈوب کے کھلتے ہوئے چمن کی قسم
گلوں کے روپ میں بکھرے ہوئے ہیں تن پارے
فصیل رنگ ہے لاوے کی موج آتش بار
ہری ہری روشیں ہیں کہ زہر کے دھارے
گھرے ہیں کیسی قیامت کی فصلِ گل میں ہم

کچھ اس طرح سے ہیں گم صُم ہرے بھرے اشجار
کھڑے ہوں اُجڑے ہوئے مندروں میں جیسے صنم
سکوت، خلوتِ کنجِ چمن میں گریاں ہے
ٹھہر گئی ہے زمیں، وقت پا بجولاں ہے
لرز رہے ہیں۔ مگر زندگی کے لب کم کم
کوئی نہیں کہ جو فن کی گرفت میں لائے
اک ایک پل کو جو ہے خیمہ زن قرن بہ قرن
کوئی نہیں کہ جو چھولے کٹار کی سی کرن
کوئی نہیں کہ جو اپنے لہو میں کرلے ضم
اس ایک پل کو، جو اک پل بھی ہے صدی بھی ہے
جو اہلِ رقص ہیں، شل ہو چکے ہیں ان کے قدم
جو اہلِ نَے ہیں، وہ ہیں نَے سے برسرِ پیکار
مصوروں نے کئی رنگ گھول کر دیکھے
نہ کر سکے مگر اک چشمِ شاہکار کو نم
کُچل گیا ہے چٹانوں میں دب کے سنگ تراش
اُتر گیا ہے قلم کار کے جگر میں قلم

(اکتوبر ۱۹۶۱ء)

غزل

تو بگڑتا بھی ہے، خاص اپنے ہی انداز کے ساتھ
پھول کھِلتے ہیں ترے شعلۂ آواز کے ساتھ
ایک بار اور بھی کیوں عرضِ تمنا نہ کروں
کہ تو انکار بھی کرتا ہے عجب ناز کے ساتھ
لے جو ٹوٹی تو صدا آئی شکستِ دل کی
رگِ جاں کا کوئی رشتہ ہے رگِ ساز کے ساتھ

تو پکارے تو چمک اٹھتی ہیں میری آنکھیں
تیری صورت بھی ہے شامل تری آواز کے ساتھ

جب تک ارزاں ہے زمانے میں کبوتر کا لہو
ظلم ہے ربط رکھوں گر کسی شہباز کے ساتھ

پست تو اتنی نہ تھی میری شکست اے یارو
پر سمیٹے ہیں مگر حسرتِ پرواز کے ساتھ

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

(جنوری۔ ۱۹۶۲ء)

غزل

پھولوں سے لہو کیسے ٹپکتا ہوا دیکھوں
آنکھوں کو بجھا لوں کہ حقیقت کو بدل دوں

حق بات کہوں گا مگر اے جرأتِ اظہار
جو بات نہ کہنی ہو، وہی بات نہ کہہ دوں

ہر سوچ پہ خنجر سا گذر جاتا ہے دل سے
حیران ہوں کہ سوچوں تو کس انداز میں سوچوں

سناٹے اڑا دیتے ہیں آواز کے پُرزے
یاروں کو اگر دشتِ مصیبت میں پکاروں

آنکھیں تو دکھاتی ہیں فقط برف سے پیکر
جل جاتی ہیں پوریں جو کسی جسم کو چھولوں

چہرے ہیں کہ مرمر سے تراشی ہوئی لوحیں
بازار ہیں یا شہرِ خموشاں میں کھڑا ہوں

جینے پہ جو مجبور ہو جی کر وہ کرے کیا
صحرا میں کبھی خضر جو مل جائے تو پوچھوں

مستی نہیں جب موت بھی مانگے سے تو یارب
ہو اذن تو میں اپنی صلیب آپ اٹھا لوں
یاد آنے لگا ہے مجھے انجامِ بہاراں
اے ابرِ کرم، تیری اجازت ہو تو رو لوں
سوکھا ہوا پتہ ہوں مگر اے شبِ تاریک
میں ایک ستارہ ہوں اگر شاخ سے ٹوٹوں

(مارچ ۱۹۶۲ء)

قطعہ

برحق سہی میری موت، لیکن
جینے کے شعور کو کروں کیا
اے میرا دیا بجھانے والے
میں جلوۂ طور کو کروں کیا

(مارچ ۱۹۶۲ء)

طوائف

صدیوں پہلے کا ذکر ہے، جب لوگ
خوف کو دیوتا سمجھتے تھے
سُرخ کوندوں، سیہ گھٹاؤں کو
چیختی پیٹتی ہواؤں کو
اپنے اپنے خدا سمجھتے تھے
قصرِ شاہی سے ایک شہزادی
بت کدے کی طرف روانہ ہوئی
پتلیوں میں جواں لہو کی چمک

اور اچھوتے لبوں میں رس کی چمک
رُت بدلنے کا اک بہانہ ہوئی
دیوتاؤں کے پاؤں پر اُس نے
خون چھڑکا بھری جوانی کا
جذبے معصوم، تجربے کم سن
روح تتلا کے رہ گئی، لیکن
جسم آغاز تھا کہانی کا
اک پجاری نے اس کا دشتِ بدن
چھو کے دیکھا تو غنچے کھِلنے لگے
کونپلوں میں نمو کا رس مچلا
جسم کا جذبۂ ہوس مچلا
ابر امڈے، پہاڑ ہلنے لگے
کل کی اک سر بلند شہزادی
آج سب کی نظر میں ہیٹی ہے
یوں تو بن ٹھن کے آئی ہے سرِ بام
اور "بنت الہوا" ہے اس کا نام
کنچنی دیوتا کی بیٹی ہے

(مئی ۱۹۶۲ء)

غزل

(نذرِ میر)

کٹی پتنگ ہے ساری دنیا کی نظروں میں سمائی ہوئی
جتنے ہم تجھ سے کترائے، اُتنی تری رسوائی ہوئی
ترکِ تعلق سے تو ہم نے غیرتِ عشق کو تھپکا تھا

تیرے تصور سے تو ورنہ برسوں بعد جدائی ہوئی
یادوں کے ظلمات میں اب بھی ٹوٹ رہے ہیں تارے سے
بھوبھل بن کر سلگ رہی ہے آج بھی آگ بجھائی ہوئی
پلٹ گئی رُت، جب تک رنگِ چمن سے ہم مانوس ہوئے
یوں صیاد کے کہنے کو تو موسمِ گُل میں رہائی ہوئی
دُھول اُڑائیں دشتِ وفا میں آندھی بن کر نکہت و رنگ
بسترِ شب سے چُنیں کنیزیں جب کلیاں مرجھائی ہوئی
حُسن و توازن کے رسیا ہیں، کیوں اضداد سے صلح کریں
اِسی لیے تو صحنِ حرم میں برہمنوں سے لڑائی ہوئی
فانی ہے انسان تو کیسے لاکھوں برس سے زندہ ہے
سب دھندا ہے عجزِ نظر کا ساری بات بنائی ہوئی
اب بھی ندیمؔ ضمیر پہ تیرے مصلحتوں کے پہرے ہیں
ورنہ کیسے رُک جاتی ہے بات زباں پر آئی ہوئی

(مئی ۔۶۲۔۱۹۶۰ء)

ریستوراں

ریستوراں میں سجے ہوئے ہیں کیسے کیسے چہرے
قبروں کے کتبوں پر جیسے مسلے مسلے سہرے

اک صاحب جو سوچ رہے ہیں پچھلے ایک پہر سے
یوں لگتے ہیں جیسے بچہ روٹھ آیا ہو گھر سے
کافی کی پیالی کو لبوں تک لائیں تو کیسے لائیں
بیرے تک سے آنکھ ملا کر بات نہ جو کر پائیں

کتنی سنجیدہ بیٹھی ہے یہ احباب کی ٹولی
کتنے اوجِ بلاغت پر ہے خاموشی کی بولی
ساری قوت چوس چکی دن بھر کی شہر نوردی
ماتھوں میں سے جھانک رہی ہے، مرتی دھوپ کی زردی

لمبی لمبی پلکیں جھپکے اِک شرمیلی بی بی
بالوں کی ترتیب سے جھلکے ذہن کی بے ترتیبی
شوہر کو دیکھے تو لجائے۔ لاج کو اوٹ بنائے
ہر آنے والے پر اک بھرپور نظر دوڑائے

اک لڑکی اور تین جوان آئے ہیں کیسے کسائے
سانولے روپ کو گورے ملکوں کا بہروپ بنائے
باتوں میں نخوت باغوں کی، وحشت صحراؤں کی
آنکھوں کے پیالوں میں بھری ہے راکھ تمناؤں کی

اپنی اپنی اُلجھن سب کی، اپنی اپنی رائے
سب نے آنسو روک رکھے ہیں، کون کسے بہلائے
ہر شے پر شک ہو تو جینا ایک سزا بن جائے
محور ہی موجود نہ ہو تو گردش کس کام آئے

قہقہے، جیسے خالی برتن لڑھک لڑھک کر ٹوٹیں
بحثیں جیسے ہونٹوں میں سے خون کے چھینٹے چھوٹیں
حُسن کا ذکر کریں یوں جیسے آندھی پھول کھلائے
فن کی بات کریں یوں، جیسے بنیا شعر سنائے

سکڑی، سمٹی روحیں، لیکن جسم ہیں دوہرے تہرے
ریستوران میں سجے ہوئے ہیں کیسے کیسے پہرے

غزل

پھول ہیں گلشن میں کچھ خوابیدہ کچھ بیدار سے
بستی جاتی ہیں مری یادیں شمیمِ یار سے

لوگ کہتے ہیں انھیں تاریخ انسانی کے موڑ
راستے جب جھوم اٹھتے ہیں مری رفتار سے

کون گل چینوں کو سمجھائے کہ معصومانِ گل
کٹ تو سکتے ہیں، چٹک سکتے نہیں تلوار سے

اتنے بے مایہ نہیں ہوتے خزاں کے پھول بھی
رُت کا اندازہ نہ ہوگا نکہتِ گلزار سے

دل کا اِک اک زخم، اِک اِک شمع بن کر جل اٹھا
درد یوں چمکا کسی کے شعلۂ گفتار سے

ایک پل گذرا کہ اِک آئی قیامت ٹل گئی
وقت نے سیکھا ہے اٹھلانا خرامِ یار سے

اس قدر پھیلا ہے زنداں کا حصارِ بے اماں
شہر بھی لبریز ہیں زنجیر کی جھنکار سے

زندگی مشکل ہے لیکن موت بھی آساں نہیں
دشت میں سر پھوڑنے نکلے ہو کس دیوار سے

ذرّۂ صحرا کبھی، سنگِ رہِ دریا کبھی
زندگی! تو نے مجھے برتا ہے کتنے پیار سے

حسنِ شیریں اب بھی ہے شاید اسیرِ قصرِ سنگ
ورنہ کیوں آتی ہے تیشے کی صدا کہسار سے
شعر کہنے کا مزہ جب ہے کہ صدیوں تک ندیم
آئینے بنتے چلے جائیں مرے اشعار سے

(مئی [illegible])

ہجر و وصال

شب، ترے جسم کو چھو کر مجھے محسوس ہوا
دل کے جنگل میں نہ پہنچے گی ترے لمس کی آگ
نہ وہ لرزش تھی بدن میں، نہ لہو میں دم تھا
تیری نبضیں تھیں کہ اک سلسلۂ ماتم تھا
وقت نے لوٹ لیا تھا ترے پیکر کا سہاگ

اب کہ تو شب کی طرح میری رسائی میں نہیں
میری رگ رگ میں ترے لمس کے شعلے ہیں رواں
میرے ہاتھوں کی یہ پوریں ہیں کہ شمعوں کی لویں
میرے ہونٹوں میں نہاں ہیں تری سانسوں کی رویں
میری آنکھوں میں لبالب ہے تری زلفوں کا دھواں

جانے یہ کون سی منزل ہے تری چاہت کی
تیرے ملتے ہی بدل جاتا ہے معیارِ جمال
تیرے چھنتے ہی مرا عشق جواں ہوتا ہے
رات بھر بھی تری آنکھوں کا گماں ہوتا ہے
یہ فراقِ تن و جاں ہے کہ غبارِ مہِ وصال

(جولائی ۱۹۷۲ء)

مشرق و مغرب

گرم ملکوں کا رہنے والا ہوں
برف زاروں سے کتنے ساگر دور
ایک چھالے کی طرح صحرا میں
میرا خاکستری گھروندا ہے
جس کے چٹخے ہوئے کواڑوں میں
جس کی دہلیز کے نشیب کے پاس
فنِ تعمیر کا پُرانا پن:
ایک ویرانہ بن کے بیٹھا ہے
چاندنی رات سرد ملکوں کی
نیلی برفوں میں منعکس ہوکر
اپنی کرنوں کی جھالروں میں چھپی
ایک رومان بن کے آتی ہے
چاندنی رات گرم ملکوں کی
محنتوں کی تھکن کے سناٹے
اپنی ننگی کمر پہ لادے ہوئے
ایک طوفان بن کے آتی ہے

سرد ملکوں کی دوپہر کا لباس
ایک ایسی مہین چادر ہے
جس کی پرتوں میں جسم کا سونا
تمغے بن کے مسکراتا ہے
اور اپنا لباسِ عُریانی

جس پہ سورج، شعاعوں کے کوڑے
اس قدر طیش سے لگاتا ہے
راکھ کا ڈھیر چھوڑ جاتا ہے
گرم ملکوں میں حُسن کی قدریں
کتنی اندھی، قدیم صدیوں سے
آگ بھڑکا کے اپنے پیکر کی
اپنے ہی گیسوؤں کا بن کے دھواں
زندگی کے اُداس آنگن میں
اک الاؤ لگائے بیٹھی ہیں
اور اس گرد بادِ آتش میں
جل رہی ہیں گلاب کی کلیاں

گرم ملکوں کے عشق پیشہ جواں
دھوپ کی چلچلاتی نگری میں
ہل چلاتے ہیں، بیج بوتے ہیں
اور پھر عاقبت کو روتے ہیں
ان کی محنت پہ وجد کرتے ہوئے
موتیوں سے لدے ہوئے خوشے
جتنے بھرپور ہوتے جاتے ہیں
اُتنے ہی دور ہوتے جاتے ہیں
سرد ملکوں میں حسن وعشق کی رو
زندگی سے قدم ملائے ہوئے
آسماں کی طرح، فضا کی طرح
روز و شب پر محیط رہتی ہے

گھر میں، معبد میں، یا سرِ راہے
ہر طرف، ہر مقام پر، ہر وقت
جب بھی حسن اور عشق ملتے ہیں
گرم بوسوں کے پھول کھلتے ہیں

سرد ملکوں میں کتنی گرمی ہے
جسم کی روح کی، خیالوں کی
گرم ملکوں پہ سرد و مُردہ سکوت
ایک آسیب بن کے طاری ہے
سرد ملکوں میں زندگی کا شعور
ایک ذرّے کو بھی سنوارتا ہے
گرم ملکوں میں موت کا احساس
ٹھوکریں زندگی کو مارتا ہے
سرد ملکوں کے رہنے والے دوست
میں کھنڈر کے ستون کی مانند
سوچتا ہوں ۔ کہ اس خرابے میں
میں اگر بس وہی ہوں جو کچھ ہوں
میں اگر ولولوں کا ملبہ ہوں
میں اگر حوصلوں کا مرقد ہوں
میرے جینے کا پھر جواز ہے کیا
آخر اس بے لبی کا راز ہے کیا

سوچتا ہوں ۔ (میں سوچ لیتا ہوں)
چاند جو میرے گھر میں نکلا ہے
تیرے ایوان میں بھی جھانکے گا

جس زمیں پر میں ایستادہ ہوں
نیلے نیلے سمندروں کے تلے
دبتی، اٹھتی، لچکتی جاتی ہے
اور بن کر ترے وطن کی زمیں
تیرے قدموں کو تھپتھپاتی ہے
سوچتا ہوں کہ میری حالتِ زار
کیا فقط رنگ کی شرارت ہے
کیا فقط اس لئے حقیر ہوں میں
کہ یہاں دھوپ چلچلاتی ہے
کیا فقط اس لیے عظیم ہے تو
کہ تری کھڑکیوں کے شیشوں سے
جب کرن آفتاب کی جھانکے
برف اس کی ہنسی اڑاتی ہے؟

رنگ اور رُت نہیں مدارِ حیات
رنگ سورج کا ایک زاویہ ہے
رُت فقط ایک رُخ ہے دھرتی کا
میرے چہرے کا رنگ، میری دھوپ
تیرے چہرے کا رنگ، برف تری
تو مری دھوپ کو ترستا ہے
میں تری برف کے لیے بے چین
دو مسافر ہیں — ایک رستہ ہے

○

ڈاکٹر تاثیر • مولانا عبدالمجید سالک • پروفیسر ممتاز حسین

فراق گورکھپوری • پروفیسر احتشام حسین • شورش کاشمیری

تذکرے، تبصرے

رم جھم — شعلۂ گل — دشتِ وفا

ڈاکٹر تاثیر

(رم جھم)

حضرت احمد ندیم قاسمی کا نام اور کلام محتاجِ تعارف نہیں ۔آپ کے اشعار اور مختصر افسانے اردو ادب کے اس دورِ جدید میں ایک معزز و ممتاز مقام حاصل کر چکے ہیں ۔

اس لیے میں اس "پیش نامہ" میں احمد ندیم قاسمی کے ادبی کارناموں کی ستائش کرنا نہیں چاہتا۔

جو اردو دان ان کے نام سے واقف نہیں اس کی معلومات ناقص ہیں ۔

جو ادیب ان کی ادبی عظمت کا منکر ہے اس کا ادبی ذوق محلِ نظر ہے ۔

احمد ندیم قاسمی نے اردو ادب میں ایک مستقل مرتبہ حاصل کر لیا ہے اور لطف یہ ہے کہ اُن کا کلام قدیم و جدید ہر رنگ کے صاحبِ نظر کو پسند آتا ہے ۔

ان قطعات میں ندیم نے ایک نیا تجربۂ ادبی کیا ہے۔ انھوں نے شاعری اور افسانہ کو یک جا کر دیا ہے۔ ہر قطعہ ایک نظم بھی ہے اور ایک مستقل افسانہ بھی ۔گویا پُرانی غزل اور نئی نظم کا امتزاج ہے۔ جس طرح غزل کا ہر شعر ایک مکمل اور مستقل حیثیت رکھتا ہے ۔اسی طرح ہر قطعہ اپنی جگہ قدیم وثابت ہے ۔مگر تمام قطعات مل کر ایک نظم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں — ایک معین و مخصوص فضا پیدا کرتے ہیں۔

اور یہ فضا خاص پنجاب کے دیہات کی فضا ہوتے ہوئے اپنے اندر ایک ایسی عالم گیر جاذبیت رکھتی ہے کہ بدیشی کو کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔

یہ قطعات حضرتِ ندیم کی شاعرانہ شخصیت کے آئینہ دار ہیں — ان میں پنجاب، اور اس کے بھی ایک خاص علاقہ کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے ۔اس طرح کہ باہر کا کوئی شخص اس کی ترجمانی نہ کر سکتا تھا ۔

اور پھر ان میں ہندوستانیت ہی نہیں بلکہ انسانیت کا جوہر ہے اور یہی دنیا شاعری اور ادب کی جان ہے۔ ندیم

قدیم چینی اور جاپانی شاعری کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔

ایک چینی شاعر کا ایک خورد سال بچہ فوت ہو گیا۔ اس نے اس کا مرثیہ اس ایک فقرہ میں لکھا:۔

"آج وہ بھونروں کی تلاش میں بہت دور نکل گیا ہے"۔

یہ مرثیہ تمام معصوم بچوں کا مرثیہ ہے، خواہ وہ چینی ہوں یا فرنگی۔ ندیم کے ان قطعات میں بھی جذباتی کنایہ اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے ـــــ خصوصیت اور عمومیت دونوں! ـــــ

مجھے امید ہے کہ یہ ادبی تجربہ بہت کامیاب ثابت ہو گا۔

(پیش نامہ "رم جھم" ۱۹۴۲ء)

مولانا عبدالمجید سالک

(شعلۂ گل)

"شعلۂ گل" میں ندیم کا اسلوبِ اظہار "جلال و جمال" کے مقابلے میں بہت واضح، دلیرانہ اور قطعی ہے۔ فکر بھی چھل چھلا کر اور ترش ترشا کر ایک نظر فریب پیکرِ کامل کی شکل میں جلوہ گر ہے۔ اب اس مجموعے کو پڑھ کر کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ندیم انسان کی عظمت کا بہت بڑا معترف ہے۔ وہ ساری کائنات کو انسانی مغلوبات و مسخرات کا مجموعہ سمجھتا ہے، وہ شہنشاہی، جاگیرداری، سرمایہ داری، جبر و ظلم اور استحصال کا سخت دشمن ہے۔ وہ معاشرے میں بہت بڑا انقلاب دیکھنا چاہتا ہے، تاکہ انسان اس سطحِ ارضی پر اپنی تقدیر کا مالک آپ بن جائے۔ وہ پرانی اقدار تمدن پر بے پناہ حملے کرتا ہے اور ان اداروں کو پاش پاش کر دینا چاہتا ہے جو انسان کی غلامی، مظلومی اور ذلت کے باعث ہوئے ہیں۔ غرض اس کا فکر ایک فکرِ تازہ اور اس کا احساس ایک احساسِ جدید ہے۔ وہ محبت کو بھی ناقدانہ نظر سے دیکھتا ہے۔ جذباتیت کو علو و ادراک کے ماتحت رکھنا چاہتا ہے۔ بلاشبہ اس کے نزدیک فطرت بے حد حسین ہے۔ اور عورت تمام مظاہرِ فطرت سے زیادہ حسین ہے۔ لیکن اس معاملے میں اس کا احساس مریضانہ نہیں۔ وہ خود گدازی کا قایل نہیں، آہن گدازی کا نقیب ہے۔ اس کی غزل کا نقشہ بھی کھرا کھرا ہے۔ پرانے غزل گوؤں کے کلام کی طرح چپٹا نہیں۔ اس کی غزل میں سوز تو ہے۔ لیکن گداز نہیں۔ درد تو ہے لیکن نالہ نہیں ہے۔ بلاشبہ پرانے نقادوں اور شاعروں کو ندیم کے کلام کے مطالعہ میں اکثر ٹھوکریں لگیں گی۔ انھیں جا بجا چونکا دینے والے خیالات ملیں گے جو انھوں نے پہلے کبھی نہیں سُنے۔ وہ بدیع و جدید اسالیب نظر آئیں گے، جن کو وہ قدیم فنِ بلاغت کے مطابق نہ پائیں گے۔ ندیم کی تشبیہات۔ ندیم کے استعارے۔ ندیم کے کنائے۔ "حدائق البلاغت" کے دائرے سے اکثر تجاوز کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ لیکن جن کو ادب و شعر کی تاریخ اور اس کے عہد بہ عہد ارتقا کا معمولی علم بھی ہے، وہ ندیم کی جدت و بداعت کا خیر مقدم کریں گے۔ ندیم نے ہماری شاعری میں نہایت گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ اس نے اظہار کے کئی راستے دکھائے ہیں۔ وہ وزن و بحر اور قافیہ ردیف کے معاملے میں بھی صرف اسی قدر تجاوز یا انحراف کا روادار ہے، جو ہماری شاعری کے مزاج کے مطابق ہو۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں بے حد محتاط ہے۔ وہ ان کی موسیقی کو بھی سمجھتا ہے اور بعض اوقات ان کے محلِ استعمال میں ایسا اجتہاد کرتا ہے کہ پرانے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ انھیں انکار و اعتراض کی جرأت نہیں ہوتی۔

میں سمجھتا ہوں کہ "شعلۂ گل" ندیم کی شاعری کے تیسرے دور کا "سنگِ میل" ہے۔ اور اس کی شاعری اب

اپنے نقطۂ کمال کے قریب پہنچ گئی ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، اسے ابھی اس وادی کے بڑے بڑے میدان طے کرنے ہیں۔ میں نے "جلال و جمال" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:۔

"ایشیا کے اُفق پر ایک عظیم شاعر نمودار ہوا ہے"۔

"شعلۂ گل" نے میرے اس فقرے کی صداقت واضح کر دی ہے۔ اور ندیم کے آیندہ مجموعے متعصب منکر کو بھی اس حقیقت کا قائل بنا دیں گے کہ وہ حقیقت میں ایک عظیم شاعر ہے۔

(اقتباس۔ "تعارف" "شعلۂ گل" ۱۹۵۲ء)

پروفیسر ممتاز حسین

(شعلۂ گل)

قاسمی جلال و جمال، دونوں ہی کا شاعر ہے۔ اور وہ زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو نظم اور غزل میں یکساں طور پر پیش کرتا ہے۔ پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ جمالیاتی قدروں کا جتنا نکھار ان کی غزلوں میں ہے وہ نظم میں نہیں ہے۔ غزل کے بارے میں مختلف لوگوں کا مختلف خیال ہے۔ کچھ لوگ اس کے کینوس کے اختصار اور اس کی اشاریتی زبان کے باعث اس کے مستقبل سے مایوس ہیں، کچھ لوگ ان دنوں کی مخصوص سیاسی فضا اور ہماری ادبی روایات کی تنگ دامنی کے مدنظر اس کے مستقبل سے بڑی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ یہاں میں ان دونوں پر کسی تنقید کے بغیر صرف اس حقیقت کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ادھر سال دو سال میں ہماری غزلوں میں ایک ایسی توانائی اور نکھار پیدا ہو گیا ہے جس کی توقع بہت کم لوگوں کو تھی۔ غزل میں سیاسی فضا کو ضم کرنے کی کوشش بہت دنوں سے کی جا رہی ہے۔ لیکن اس میں جو گھلاوٹ اور حلاوت ان دنوں پیدا ہو چلی ہے وہ اگلے وقت کی سیاسی رنگ کی غزلوں میں نہیں ملتی۔ اس رنگ کو چمکانے میں اگر ایک طرف فراق گورکھپوری اور فیض احمد فیض کا ہاتھ ہے تو دوسری طرف احمد ندیم قاسمی کا بھی ہاتھ ہے۔ قاسمی کا خیال ہے کہ "شاعری حقیقت کا سنگھار ہے۔ اور ترنم شاعری کا زیور ہے۔ میں قاسمی کے اس خیال سے بالکل متفق ہوں اور بھلا اتفاق کیوں نہ کروں، جب کہ انھوں نے اپنے دعوے کو عملی اعتبار سے پیش کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کی سیاسی فضا کو جس حسن و نغمہ کے ساتھ انھوں نے غزل کا لباس پہنایا ہے، انھیں کا کام ہے۔ ان کا پیرایۂ بیان کس قدر لطیف اور ابہام سے پاک و صاف ہے:۔

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے	ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے
ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں	آنکھ کیا کھولی چمن مرجھا گئے
کس تجلی کا دیا ہم کو فریب	کس دھندلکے میں ہمیں پہنچا گئے
پھر وہی اختر شماری کا نظام	ہم تو اس تکرار سے اُکتا گئے
آدمی کے ارتقا کا مدعا	وہ چھپاتے ہی رہے ہم پا گئے

اب کوئی طوفان ہی لائے گا سحر
آفتاب اُبھرا تو بادل چھا گئے

قاسمی کی غزلوں میں یہ لطافت اور حلاوت بنیادی طور پر اس بات سے پیدا ہوئی ہے کہ وہ اپنے شعور کو

اس راہ سے گذرتا ہے، جس پر لاکھوں ہی دل تڑپے اور دھڑکے ہیں، اور جہاں احساسات کے کشتے صرف ایک زبان کے متمنی ہوتے ہیں۔ قاسمی کی شاعری انہی لکھو کھا انسانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ لیکن اس انداز سے نہیں کہ جذبات خیالات کی صداقت میں بندھ نہ سکیں اور احساسات مبہم تاثرات کے دھندلکے میں لپٹ کر رہ جائیں۔ قاسمی نے یہیں پر غزل میں اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے:۔

ستارے کون چُنے گا بدست زخم آلود
چلو غبار سر رہ گزر کا ذکر کریں

یہاں اس کا شعور اور "وجدان" (جس کا وہ قائل ہے) ایک اکائی میں سمٹ کر پوری زندگی کا ترجمان ہے۔ یہ شعر فکری اعتبار سے کتنا بلند اور ساتھ ہی ساتھ احساسات کی کتنی لطافتوں کا حامل ہے۔

قاسمی کی شاعری میں جہاں انسانوں کی دُکھی زندگی کا عکس ہے جو زندگی کے خالق اور معمار ہیں، وہاں زہرہ جبینوں کا وہ لطف خرام اور آرائش کا کل بھی ہے جو بہیمیت کو تہذیب، سختی کو نرمی، اور ہوس کو خلوص میں بدل دیتی ہے۔ قاسمی کی عشقیہ شاعری بڑی پاکیزہ اور طاہر ہے اور اس طہارت نفس کا نتیجہ ہے جو روح اور جسم کو پیوند کر کے محبت کا چلن بتاتی ہے۔ (اقتباس "ایک نیا منصور"۔ شعلۂ گل ۱۹۵۲ء)

فراق گورکھپوری

(دشتِ وفا)

ندیم کے اشعار میں زندگی اور مسائل زندگی کی بھرپور چوٹیں ہیں۔ اُن کی آواز میں زندگی کے خواب، زندگی کے درد، زندگی کی فتوحات اور ان فتوحات سے بھی بڑھ کر اہم چیز، زندگی کی شکستیں، گہرے اور پُرخلوص سوچ کے عناصر سب مل کر حل ہو گئے ہیں، اور ان کے نغمے فضائے زندگی میں وہ گونج پیدا کر رہے ہیں، وہ جھنکاریں اٹھا رہے ہیں، اس کھنک کو جنم دے رہے ہیں جو شاعر اور شاعری کو لازوال بنا دیتی ہے اور جو ہمیں زندگی کی گہرائیوں اور بلندیوں کی سیر کراتی ہیں اور بہت دور تک سیر کراتی ہیں اور ہماری زندگی کو ناقابلِ فراموش تجربات سے اور انمول احساسات سے مالا مال کر دیتی ہیں۔

پنجاب کی سرزمین سے ہی ایسا شاعر اُٹھ سکتا تھا جس کی شخصیت میں نرمی اور کس بل کا حسین ترین سنگم نظر آئے اور توانائی اور نزاکت جس کی شاعری کی جان ہو۔ ندیم کے اشعار کے پیچھے لمبے اور گہرے سوچ کا بہت بڑا پس منظر ہوتا ہے۔ یہی سوچ ان کے کلام میں وہ چوٹیلا پن اور وہ کاٹ پیدا کر دیتا ہے جو صحت مند شاعری کی خصوصیت ہے۔

(فلیپ — "دشتِ وفا")

پروفیسر سید احتشام حسین

(دشتِ وفا)

اگر شاعری محض نئی تجربوں کا اظہار اور نئی ہیئتیں پیدا کرنے کا کرتب بن کر نہ رہ جائے تو انسانی قلب کی دھڑکن اس سے زیادہ واضح شکل میں کہیں اور نہیں سنی جا سکتی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دھڑکن فن کی کسی نئی صورت ہی میں ظاہر ہو۔ اس وقت

صورت معنی کا ناگزیر جز ہو جائے گی۔ اُلجھن صرف اس وقت ہوتی ہے جب شاعری کا مقصد صورت گری قرار پا جاتا ہے۔
احمد ندیم قاسمی کی شاعری دل کی دھڑکنوں اور زندگی کے تجربوں کا بامعنی اظہار ہے۔ رم جھم اور جلال و جمال کے بعد یہ مجموعہ ایک فن کار کے ارتقائے شعور کی ایک بہت اچھی مثال ہے۔ جہاں ہیئت گری کے تجربوں میں اُلجھنے کے بجائے زندگی کے تجربوں کو اظہار کا بہتر اور موزوں تر لباس پہنانے کی کوشش کی گئی ہے، جہاں شاعر کے خلوصِ فکر نے داخلی کیفیات اور خارجی محسوسات کو عام انسانی تجربوں کے ڈھانچے میں جگہ دے کر دوسروں کے دلوں کی دھڑکن بھی تیز کی ہے۔ اس حیثیت سے دشتِ وفا، فنی تجربوں کا البم نہیں، انسانی کیفیات و محسوسات کا رنگا رنگ آئینہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج انسان ہر عہد سے زیادہ سوچنے پر مجبور ہے۔ کبھی اختیار کے احساس کے ساتھ کبھی جبر کے اس نے اُس کی حستوں کو تیز تر کر دیا ہے۔ کچھ چیزوں کے لیے ان کی باڑھ کند ہو گئی ہے، کچھ باتوں کے لیے اتنی تیز کہ " دلِ وجود " کو بھی چیر جاتی ہے۔ کوئی اپنے کو دھوکے میں رکھے تو وہ دوسری بات ہے۔ لیکن اگر آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، اُن میں بصارت ہے اور آنکھوں کے سامنے جو کچھ گزر رہا ہے اُس کی معنویت سے آگاہی حاصل کرنے کی خواہش بھی ہے تو کوئی فن کار انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پیدا ہوتی ہوئی نئی پیچیدگیوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ احمد ندیم قاسمی نے اس سلسلہ میں بصارت اور بصیرت دونوں سے کام لیا ہے اور بڑے خلوص سے اپنے دل کے زخم اور پھول بھی دکھائے ہیں اور سماج کے دل کی چوٹیں اور جھکتی ہوئی مسرتیں بھی۔ انھیں اُس گلشن کا احساس بھی ہے جو عاشق کے دل کے اندر رکھا ہوا ہے اور اُس چمن کا بھی جس کے نرم اور نازک پودے سیاسی سموم دسر صر سے جھلس رہے ہیں۔ دونوں صورتوں میں اُن کے جذبہ اور فکر نے وہ صحت مندر دعمل پیش کیا ہے جو ایک انسان دوست کا دل پیش کر سکتا ہے۔ اس میں جو تصویر سب سے زیادہ نکھر کر ابھرتی ہے وہ اُس صبح کی ہے، جو رات کا کفن پھاڑ کر ضرور برآمد ہوگی، اس عاشق کی ہے جسے اپنے خلوصِ عشق پر بھروسہ ہے اور اُس انسان کی ہے جو بالآخر مسائلِ حیات کو حل کر کے، فطرت پر قابو پالے گا۔

'دشتِ وفا' میں محبت اور انسانیت کے پھول کھلے ہیں۔ اگرچہ دشت ہونے کے اعتبار سے اُس میں خشک پتے اور کھنڈر بھی ہیں، قید و بند کے مصائب اور خیالوں کو زنجیریں پہنانے کی تصویریں بھی ہیں۔ فنی اعتبار سے احمد ندیم قاسمی اس جدید رومانی اندازِ نظر کے ترجمان ہیں جو الفاظ کو معنوی علامتوں کی حیثیت سے استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ جذباتی علامت کی حیثیت سے بھی استعمال کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جدید استعاروں اور علامتوں سے کام لیتے وقت بھی یہ نہیں بھولتے کہ اُن کا مقصد ترسیلِ خیال یا اظہارِ جذبہ ہے اور اگر اُسے مبہم بنا دیا گیا تو اظہار کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔ جو شاعر اس کا خیال کرتا ہے وہ صرف اُن لوگوں کو مایوس کر سکتا ہے، جنھیں خیالات اور محسوسات کی صداقت سے کام نہیں صرف فنی کرتب سے کام ہے۔ احمد ندیم قاسمی لفظوں کے انتخاب میں کہیں کہیں ناکام رہ جائیں تو وہ اور بات ہے۔ لیکن وہ انسان اور شاعر دونوں بیک وقت بنے رہنا چاہتے ہیں۔ اور یہی اُن کی کامیابی ہے سے

مثلِ خورشید ہوئی ہے اُفقِ فن پہ طلوع
یہ حقیقت کہ جو شاعر ہے، وہ انسان بھی ہے

اُفقِ شاعری پر دشتِ وفا کا خورشید بھی اسی حقیقت کے روپ میں طلوع ہوا ہے۔

شورش کاشمیری

(دشتِ وفا)

ترقی پسند تحریک نے پنجاب میں اور اب یہ کہیے کہ پاکستان میں اُردو کے جن دو بڑے شاعروں کو اپنے زمرہ میں شریک کیا یا جو ترقی پسند تحریک کے راہنما ہو گئے ان میں فیض اور ندیم ہی۔ دو شاعر ہیں، جن میں ایک سچّے شاعر کی روح موجود ہے اور جو اپنی تخلیقات کے باعث مقام و مرتبہ پیدا کر چکے ہیں۔ سوال تقابل کا نہیں، ہر شخص اپنے زاویہ نگاہ کا عادی ہوتا ہے۔ اور اس کا ملکہ وہبی ہو اس کی انفرادیت ہو جاتا ہے، لیکن احمد ندیم قاسمی میں فیض کی بہ نسبت دو چیزیں زیادہ صاف اور ستھری ہیں۔

اولاً:۔ ان کے افکار کا لباس اور مطالب کا پیراہن مقابلتہً زیادہ چوکس، خوبصورت اور دل فریب ہوتا ہے۔

ثانیاً:۔ ان کی شاعرانہ روح کسی موڑ پر بھی زخمی نہیں ہوتی، وہ ادب برائے فن کی نزاکتوں سے بھی آگاہ ہیں۔ اور یہ سب نزاکتیں اُن کے دسترس میں ہیں۔

ایک شخص جو محض شاعری ہی کو ملحوظ رکھتا ہو۔ اور اس کوشش میں ہو کہ شاعری کے مزاج میں کوئی خارجی تاثر سرے سے داخل ہی نہ ہو۔ حتیٰ کہ اس کے نزدیک شاعری نام ہی غزل یا غزل کی روح کا ہو۔ اس کے لیے احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں بہت سے گھاؤ ہیں۔ ندیم کا یہی کمالِ فن ہے؛ اور یہی فن اُنھیں دوسرے ترقی پسند شعرا سے ممتاز کرتا ہے، کہ وہ شاعری کے حسن کو سنگلاخ مقاصد میں بھی مجروح نہیں ہونے دیتے۔ اس لحاظ سے وہ پاکستان کے سب سے بڑے ترقی پسند شاعر ہیں۔

(اقتباس تبصرہ "دشتِ وفا)

چہرۂ گیتی

چہرۂ گیتی ہمارے خون سے گل رنگ ہے

ندیم

هیروشیما سے پہلے — هیروشیما کے بعد

لوگ کہتے تھے شمشیر خان وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا ہے۔ اُس کی طبیعت کا تقاضہ یہی تھا، کہ اُس کا چہرہ روشن اور اُس کی داڑھی سیاہ رہے۔ لیکن کچھ دنوں سے بڑھاپا اس پر اچانک برف کی طرح گرنا شروع ہوا، اور اُس کے سر کے بالوں اور داڑھی مونچھوں کو کھچڑی بنا گیا۔ بڑھاپے کی یہ آسیبی سفیدی اس کے لباس پر بھی اثرانداز ہوئی۔ بنارسی پگڑیوں، ریشمی لُنگیوں اور بوسکی کے کھلے اور ڈھیلے ڈھالے چولوں کی جگہ ململ کے پھینٹوں، ٹخنوں سے بالشت بھر اونچے تہمدوں اور کھدر کی کسی کسائی، بنگالی قمیصوں نے لے لی۔ چہرے کی لالی بکھر گئی اور آنکھوں کے کناروں پر مکڑیوں نے ٹانگیں پسار دیں۔ اس انقلاب کے باوجود بچّوں سے لیکر بوڑھوں تک اور کنواریوں سے لے کر بیواؤں تک اُس کی چھیڑ چھاڑ بدستور جاری رہی بلکہ کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر گئی۔ جب وہ گلی کے نکڑ پر تیزی سے گذرتے ہوئے کسی نوجوان پر پھبتی کستا۔ "ارے بھئی، وہ تو اپنگمنٹ پر جا چکی"۔ یا چوپال کی پرلی طرف قبرستان کے ایک ویران گوشے میں کسی گبرو کو دبکتا دیکھ کر پکار اُٹھتا۔ "آج گاڑی لیٹ معلوم ہوتی ہے" تو لوگ بے اختیار ہنسے، اور خود شمشیر کے قہقہے ان سب سے بلند ہوتے۔ مگر ہر روز کوئی، اسی کی دُکھتی رگ کو چھیڑ دیتا۔ شمشیر چچا نہ جانے کیا بات ہے کہ پہلے تم ہنستے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے گھوڑے بج رہے ہوں، اور اب تم ہنستے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے چٹانیں لڑھک رہی ہوں پربت پر سے، اور پھر نہ تمھاری آنکھیں چمکتی ہیں، نہ چہرہ دمکتا ہے تم ہنستے ہو تو تمھارے پیڑائے ہونٹوں سے خون رسنے لگتا ہے، تمھارے ماتھے کی لکیریں گہری ہو ہو جاتی ہیں، آخر کیا بیتا پڑی ہمارے چچا پر کہ دنوں میں بجھ کر رہ گیا"۔

پربت کی چوٹی پر سے لڑھکتی ہوئی چٹانوں کا تانتا بندھ جاتا اور وہ کہتا۔ "یعنی مطلب یہ ہے تمھارا کہ ہم بوڑھے سرے سے ہنسنا ہی چھوڑ دیں، اور یہ نعمت بھی تم نوجوانوں کو سونپ دیں۔ کیوں بھئی؟ ہم نے کیا بگاڑا ہے تمھارا؟ ہم نے تمھیں سپرد کر رکھی ہیں محبتیں، اور راتوں کی ملاقاتیں اور تنہائیوں کے گیت اور لال چہرے اور نوَدیتی پتلیاں۔ اب یہ ہنسی بھی چھین لو ہم سے کہ ہم سچ مچ کے بے حیا بن کر رہ جائیں۔ واہ! — اور بھئی، یہ ایک کان سے عطر کی پھریری نکال کر ہمیں بھی تو سنگھاؤ، کہتے ہیں جس نے حنا کا عطر نہیں سونگھا۔ اُسے ماں نے ابھی جنا ہی نہیں" — اور چٹانوں کا ایک اور ریلا گڑگڑاتا ہوا امڈ پڑتا!

لیکن لوگوں کا اندازہ غلط نہ تھا، اگرچہ وہ اس کی وجہ نہیں جانتے تھے اُنھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اپنے بیٹے دلیر خاں کی شادی پر اس نے محض دکھاوے کی خاطر جو دھوم مچائی تھی اور سونے چاندی کے زیوروں کے جو انبار لگا دیے تھے، وہ درحقیقت تھا جن کی بھرپور محبت کا نتیجہ تھے اور شہنائیوں اور گیتوں اور تہنیتوں کے ہنگامے کے بعد جب اُس نے حالات کا جائزہ لیا تھا، تو ایک رات گھبرا کر پکار اٹھا تھا: "دلیر خاں دیا بجھا دو بھئی۔ تیل خواہ مخواہ جل رہا ہے۔"

ملحقہ کمرے کے دروازے کی روشن جھریاں اچانک مٹ گئیں اور اُس نے لحاف لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنا چاہی مگر کروٹوں کے بہت سے دائرے بنانے کے بعد وہ اُٹھ بیٹھا۔ اُسے اندھیرے سے ہول آنے لگا، طاق پر سے دیا سلائی کی ڈبیا اٹھا کر اُس نے چراغ جلایا تو ملحقہ کمرے سے آواز آئی۔ "کیا بات ہے آبا؟" ـــــ اور وہ جھنجھلا کر بولا۔ "ارے ابھی تک جاگ رہے ہو تم لوگ؟" ـــــ اور اس نے دیا بجھا کر پھر لحاف کی پناہ ڈھونڈی۔

بار بار اس کے دماغ کو اس احساس کی ان گنت سوئیاں کریدنے لگتیں، کہ وہ اپنی اچھی خاصی پونجی کو برباد کرنے کے علاوہ تین ہزار کا مقروض ہے، اور اب اس کا بیٹا نوجوان ہے، اُس کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ اب اُس کے بچے ہونے لگیں گے، اخراجات بڑھتے جائیں گے اور زمینیں اُجڑتی جائیں گی۔ پہلے سندھ کے پانیوں سے اس کی زمینوں پر ہر سال زندگی کی تازہ تہیں پھیل جاتی تھیں، ان لوگوں پر اُسے بہت ترس آتا تھا۔ جن کی زمینیں دریا سے دُور تھیں، جو ہمیشہ بارشوں کے محتاج رہتے تھے بارشوں کے لیے مسجدوں میں دعائیں مانگتے تھے، غریبوں میں گڑ اور گھنگھنیاں بانٹتے تھے نفل پڑھتے تھے اور پھر مایوس ہو کر گالیاں دینے لگتے تھے۔ لیکن اب سندھ سے ایک بہت بڑی نہر نکالی جا رہی تھی اور دریا سمٹ اور ہٹ کر بہت دُور بھورے پہاڑوں کے قدموں میں رینگ رہا تھا، بپھری ہوئی شور زمینوں پر جب وہ مٹر کا اِکّا دُکّا بوٹا دیکھتا، اور ڈھور ڈنگر ان دُور دُور تک بکھرے ہوئے پودوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے، تو وہ بہت دُکھی ہو جاتا۔ زمینیں روز بروز بگڑتی اور اُجڑتی جا رہی تھیں، اور سندھ کا پانی ان وسیع تھلوں کے صدیوں کے سُوکھے سڑے معدوں میں غرق ہو رہا تھا، جن پر نوابوں اور جاگیرداروں کا قبضہ تھا، اور جو ان تھلوں سے بیگانہ رہ کر بھی پہلے سے نہایت شاداب ریاستوں کے مالک تھے۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" اُس نے ایک روز ذیلدار سے کہا تھا۔ "کچھ پتے نہیں پڑتا کہ ایک ہزار غریب کسانوں کی زمین کو اجاڑ کر صرف ایک زمیندار کی آسودگی کا سامان کیوں ہو رہا ہے، بھئی یہ بات عجیب اُلٹی سی ہے، خدا کی ان نعمتوں میں تو ہر انسان برابر کا حصہ دار ہے، دریا کے پانیوں پر بھی کبھی کسی کا قبضہ ہوا ہے بھئی ذیلدار۔"

ذیلدار ورثے میں پائی ہوئی نیازمندی کا مظاہرہ کرتا۔ "شمشیر خاں سرکار جو چاہے کرے، چاہے تو تھلوں میں دریا بہا دے، چاہے تو ہرے بھرے کھیتوں میں آگ لگا دے۔ ایسی باتیں یوں کھُل کر نہ کیا کرو، سرکار کو پتہ چلا تو دھر لیے جاؤ گے اور بھئی خدا اور سرکار پر کون انگلی اُٹھائے۔"

"مگر دریا کے پانی پر کسی کا اجارہ تھوڑا ہے۔" وہ حیران ہو کر کہتا:

"سرکار چاہے تو ہوا پر بھی لگان لگا دے۔" ذیلدار حسب عادت سرکار کی وکالت کرتا۔

اور پھر شمشیر خاں کے دماغ میں خوش مزاجی کی رَو چلنے لگتی۔ "ہوا پر بھی لگان؟ بھئی سچ مچ اگر سرکار ہوا پر بھی لگان

لگا دے، تو عجیب تڑک پھڑک شروع ہو جائے، ہر پل واویلا مچا رہے، ارے بھئی کیا ہوا؟ کیسا شور ہے؟ — کچھ نہیں بھئی ادھر اس گھر میں ہوا ختم ہو گئی ہے۔ سارے گھر والے تڑپ رہے ہیں۔ پانسو کے نوٹ دے کر میراثی کو شہر بھجوایا ہے کہ سرکار سے ہوا کے کنستر خرید لائے — ہائے ہائے ہائے! اور پھر ذیلدار۔ ایک بات کہوں یہ سامنے دادا شہباز بیٹھا ہے نا، ہوا پر لگان لگے تو سب سے پہلے یہی دم توڑے گا بچارا۔"

"کیوں؟" کوئی سوال کرتا۔

"ایک تو غریب ہے۔ صبح کی بگھاری ہوئی دال دوسرے دن شام تک چلتی ہے، اور پھر دمہ کا مریض ہے، ادھر ہوا بند ہوئی، اُدھر دادا شہباز انا للہ ہوئے، کیوں دادا؟"

دادا شہباز پنشنر جو بڑھاپے کے آخری نقطے کو چھونے کے باوجود ہر بات اور مذاق سے باز نہ آتا تھا۔ پوپلے منہ کو کھُچّا کر کہتا — "ہم تو بھئی مٹکا بھر لیں گے ہوا سے، اور چھُپا دیں گے اُسے کوڑے کے ڈھیر میں۔ جب بھی ہوا نہ ملی، تو کوٹرا ہٹایا، مٹکے پر سے ڈھکنا کھسکایا، پھیپھڑے بھر لیے، اور پھر مٹکا بند، تجھے ایک بوند بھی دیں تو نام بدل ڈالنا۔ کنگوار کہہ دینا ہاں —"

قہقہے پڑتے، تمباکو کے دھوئیں اُڑتے، کھانسیوں کے پٹاخے چھوٹتے، شمشیر ہر کسی پر پھبتی کستا۔ "ابے آرام سے کھانس، ایسی کھانسی بھی کیا جیسے اونٹ کا گھٹنا ٹوٹے — ابے سنبھل کر بیٹھ، تو نے تو دکان کھول رکھی ہے!"

مگر جب وہ گھر آتا، تو تلملاتے ہوئے پیٹ والا مہاجن دوہری ٹھوڑی میں ہتھرے بل ڈال کر اُس کے کمرے میں کسی چھری کے رستے آ نکلتا۔ اور اندھیرے میں سوکھے سڑے پنجے اُس کی طرف لپکتے، اور ملحقہ کمرے کی روشن جھریاں بل کھا کر سانپوں کی طرح رینگنے لگتیں۔ "دیا بجھا دو دلیر" وہ پکار اُٹھتا۔ "تیل ضائع ہو رہا ہے" اپنی ہی آواز سُن کر وہ چونک اُٹھتا، آدھی رات کو اٹھ کر صندوق کھولتا، کہ شاید کسی کونے میں کپڑے کی کسی سلوٹ میں کوئی نوٹ اٹک کر رہ گیا ہو، اور پھر لحاف کی پناہ گاہ میں گھس جاتا — صبح کو اٹھتا تو اس کی کنپٹیوں پر بالوں کا ایک اور گچھا بھوسلا رنگ اختیار کر چکا ہوتا

"یعنی ہم بوڑھے ہو رہے ہیں!" اُس نے ایک روز سوچا، اور بناری پگڑی اُتار کر پلنگ پر پٹخ دی، اس کے بعد ہر روز سفیدی بوقلمونی کی جگہ لیتی گئی اور لوگ حیران ہونے لگے، کہ شمشیر پر بڑھاپا اچانک پہاڑ کی طرح کیوں ٹوٹ پڑا۔

ایک روز پٹواری نے چوپال پر آ کر خبر دی، کہ انگریز نے جرمن کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا ہے، کمزور قوتوں کی حفاظت کے لیے — شمشیر کی آنکھیں چمک اٹھیں، خلافِ معمول اتنے بڑے واقعے پر خیال آرائی نہ کی۔ بلکہ چُپ چاپ بیٹھا رہا، چہرے پر کئی رنگ آئے گئے۔ اور پھر آ گئے۔ آخر اٹھا، لپک کر گھر آیا، اور دلیر کو الگ لے جا کر کہا، "لام چھڑ گئی، تو نے اُس روز کہا تھا کہ انگریزوں کا چھتری والا وزیر خواہ مخواہ جرمن کو راضی کرنے کی دوڑ دھوپ کر رہا ہے، تو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ شکر ہے تو نے مڈل تو پاس کر لیا، ورنہ ہم ان پڑھ لوگ تو ساری عمر اندھیر نگری میں بسر کر دیتے ہیں۔ تو بات یہ ہے دلیر بیٹا!"

اُس نے ہزار چاہا، کہ اعصاب کو قابو میں رکھے، اُس کا رنگ نہ بدلے، اُس کے ہونٹ نہ کانپیں، اُس کی بھویں

ڈر رہی، مگر اس وقت اُس کی ذاتی غرض نے شفقتِ پدری کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا تھا۔ ایک دم رُک کر وہ سیدھا ہو بیٹھا اور پھر یوں بولا جیسے اُس نے یہ ساری عبارت برسوں سے رٹ رکھی تھی —" بات یہ ہے دلیر بیٹا کہ پچھلی لام میں جو پڑھا لکھا نوجوان فوج میں بھرتی ہوا، وہ واپس آکر تحصیل دار اور صاحب ضلع اور کپتان پولس بنا۔ ایسے بھی کئی منصف میں نے دیکھے ہیں، جو بات کرتے تھے، تو یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے فوج کو حملہ کا حکم دے رہے ہوں۔

تو اب میرے خیال میں اللہ کا نام لے اور بھرتی ہو جا۔ موت سے ڈرنا جوانمردوں کا کام نہیں۔ یہ گھڑی تو مقرر ہے بیٹے ٹل نہیں سکتی۔ جنگ کے طوفان سے لاکھوں بچ کر نکل آتے ہیں، اور یہاں کروڑوں کچا خربوزہ کھا کر یا چربی کا حلوہ پھونک کر یا ویسے ہی بیٹھے بٹھائے ہنستے کھیلتے دم توڑ دیتے ہیں۔ چل چلاؤ تو لگا ہی رہتا ہے، تو پھر میرے بیٹے، میں چاہتا ہوں کہ جب تو لام سے واپس آئے تو بہت بڑا افسر بن کر آئے۔ لوگ تیرا نام لیں تو میں فخر سے اکڑ جاؤں، یقین جان، اس طرح میرے سفید ہوتے ہوئے بال پھر سے کالے ہونے لگیں گے، دل کا اطمینان سب سے بڑا خضاب ہے۔"

دلیر خاں فوجی سپاہیوں کے کھڑکھڑاتے ہوئے تہمد، دو گھوڑا بوسکی کی قمیص، بناری پگڑیاں اور پھر عطر کی پھریریاں اور انگلیوں میں ناچتا ہوا سبک سا بید، کلائی پر گھڑی، اور ان سب پر مستزاد فوں فاں اور ٹھسّے —— غرض ہر بات سے متاثر تھا اور یہ تاثرات اُس وقت بہت گہرے ہو جاتے تھے جب گاؤں کی ہر اٹھتی جوانی عطر کی خوشبو اور انگریزی قسم کی لنسواری مٹھائیوں کے چکر میں آ کر محض فوجیوں ہی کا اجارہ بن چکی تھی۔ ساتھ ہی اُسے باپ کے قبل از وقت بڑھاپے کا بھی علم تھا، اور وہ یہ بھی جانتا تھا، کہ رات کو گھر میں دیر تک چراغ جلانے کی ممانعت کیوں ہے:

مگر ابھی شاداں کے ناخنوں پہ حنا کی ہلکی ہلکی لالی مٹنے نہیں پائی تھی۔ اگرچہ اس نے شادی کے دس روز بعد ہی سارے گھر کا کام سنبھال لیا، اور نئی نویلی سہاگنوں کے پرانے رواجوں کے برعکس گھر کی جھاڑو پونچھ کے علاوہ تالاب تک سب گھر والوں کے کپڑے تک دھولاتی تھی، لیکن آخر وہ ابھی دلہن تھی۔ اُس کی چوڑیوں کے کھناکے میں ترنم تھا، اس کی آواز کی نرمی میں تازہ خون کی طراری مترنم دھڑکنیں سی پیدا کرتی تھی، وہ قدم اٹھاتی تھی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دوسرا قدم زمین پر نہیں آئے گا۔ ہوا میں پڑے گا، اور وہ اُبھر جائے گی اور اُبھرتی چلی جائے گی۔ اس کی نئی آنکھوں کو سرمے کی لکیر ابھی تک نیم خوابی کا خمار بخشے جا رہی تھی۔ شرماتے وقت ابھی تک اس کا دایاں ابرو اوپر اٹھ کر کمان کا سا خم لیا جاتا تھا۔ اور گوری ٹھوڑی کی گولائی حباب کی طرح کپکپا اٹھتی تھی۔ دلیر خاں کے نزدیک اتنے بڑے سرمائے کو کھلا چھوڑ دینا بزدلی تھی۔ لیکن جب اعلان جنگ کے ساتھ ہی گاؤں نوجوانوں سے خالی ہونا شروع ہوا، اور چند لوگوں نے اس کی ہچکچاہٹ پر پھبتیاں بھی کسیں، تو وہ ایک صبح کو اپنے باپ سے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دعائیں لیتا اور شاداں کے سلگتے ہوئے لبوں کے گہرے گوشوں کا آبِ حیات پیتا گاؤں سے رخصت ہو گیا۔

دلیر خاں کے جاتے ہی گھر خالی خالی نظر آنے لگا۔ شاداں بھی اُداس رہنے لگی۔ ہر وقت پڑی کھاٹ توڑ رہی ہے، برتنوں میں چڑیاں ناچ رہی ہیں، آنگن میں کوّوں نے اودھم مچا رکھا ہے، سلیقے اور سگھڑاپے کا سارا سحر ٹوٹ گیا۔ زیور اُترنے لگے۔ ریشمی لہنگے کا کنارا زمین پر گھسٹتے گھسٹتے بے رنگ ہو گیا۔ آنکھوں میں بھولے سے سرمہ پڑتا بھی، تو دن ڈھلے تک بہہ جاتا۔ شمشیر اُسے دلاسہ دینے کی کوشش کرتا، مگر جانتا تھا، کہ جوانی میں محبت عبادت کی حیثیت رکھتی ہے، اور پھر

شاداں تو ویسے ہی مجبور ہے۔ اُسے بہت زیادہ کام نہیں کرنا چاہیے —— لیکن یہ اُداسی، یہ آنسو، یہ جمائیاں ——
"شاداں بیٹی، یہ بُرا شگون ہے۔ جواں مردوں کا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ وہ عمر بھر نکھٹو بن کر گھر میں پڑے نہیں رہ سکتے۔ خدا کے لیے ہنس، کھیل، مُسکرا —— سنتی ہے شاداں بیٹی؟"

شاداں شمشیر کی طرف یوں دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو "ٹھیک ہے، ہنسنا کھیلنا بڑی اچھی باتیں ہیں، مگر کس سے ہنسوں؟ کس کے ساتھ کھیلوں؟ بوڑھے چچا تم کیا جانو —— تم کیا جانو؟"

شمشیر سب کچھ جانتا تھا، وہ ہر ہفتے دلیر کے خط کا جھوٹ تراشتا "آج پھر خط آیا ہے" وہ کہتا "لکھتا ہے، شاداں سے کہیے کہ میرے لیے دعا کیا کرے۔ اداس نہ رہے، گرج کڑک اور دھواں دھار طوفانوں کے بعد مطلع صاف بھی ہو جاتا ہے، سورج بھی چمکتا ہے۔ ہری بھری گھاس بھی اُگتی ہے" —— شاداں کو کبھی کبھی شک گذرتا کہ چچا جھوٹ بول رہا ہے، آخر اس نے چھ مہینے تو دلیر کے ساتھ گذارے تھے، اور وہ جانتی تھی کہ دلیر مڈل پاس سہی، پر اُسے ایسی باتیں قطعی نہیں آتیں، اُسے تو ماہیے، ڈھولے، ٹپّے اور دوہے کے سوا اور کچھ معلوم نہیں، یہ تو بڑی دانائی کی باتیں ہیں۔

ادھر شمشیر کے ذہن میں شمشیر اور دلیر کے وزن پر کئی نام گھومنے لگے تھے، مگران سب میں شیر خاں اسے ایسا بھایا، کہ وقت سے پہلے ہی گاؤں بھر میں اعلان کر دیا۔

"اور اگر لڑکی ہوئی؟" کسی نے پوچھا:

"تو شیرنی" شمشیر نے جواب دیا۔

"میں کہتا ہوں اگر نہ لڑکا ہوا نہ لڑکی؟ تو ——؟" دادا شہباز پنشنر کے پوپلے منہ پر گول مول مسکراہٹ ناچنے لگی۔

"عورتیں لڑکا لڑکی کے سوا اور بھی کچھ جنتی ہیں کیا؟"

"ہاں ہاں" ——

"کیا؟" ——

"یہی لنگور، گیدڑ، بندر" ——

لوگ سنجیدہ ہوگئے، کیونکہ موضوع عام نہیں تھا بلکہ خاص شاداں سے متعلق تھا، اور شہباز حسبِ عادت زیادتی پر اُتر آیا تھا، مگر شمشیر نے کہا "بھئی چچا، مذاق کا کوئی رنگ روپ بھی تو ہونا چاہیے۔ یہ کیا، کہ ڈھیلا کھینچ مارا اور کہا، ہم مذاق کر رہے تھے"۔

"منشی جی سے پوچھ لو" دادا شہباز کب ہار ماننا تھا "امرت سر میں ایک عورت نے بندر جنا ہے، زندہ ہے، ہسپتال میں ہے، ماں کا دودھ پیتا ہے البتہ دُم ذرا چھوٹی ہے"۔

دادا شہباز کا مذاق برداشت کی حد سے باہر ہو چلا تھا، مگر شمشیر کو وہ دن نہیں بھولے تھے، جب اُس نے دادا شہباز کی ایک موٹی تازی شرمیلی بہو کے پیٹ کو تھپتھپا کر کہا تھا "خضر کی عمر اور سکندر کا بخت پاؤ۔ اب آ بھی جاؤ نا"۔

اور جب بچہ پیدا ہوا، تو وہ سچ مچ شیر ہی نکلا۔ بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، موٹا سر، گول چہرہ، گورا رنگ ——

"ہے دادا شہباز" مارے خوشی کے اُس کے گلے سے اکٹھی آٹھ دس آوازیں نکل گئیں "سنتے ہو؟ شیر پیدا ہوا ہے شیر!
"سچ سچ سچ" دادا شہباز نے ہمدردی کی۔ "ہائے ہائے! انسان کے گھر میں حیوان، تیرے کھیل نیارے ہیں ہے
مولا، لڑکی ہی ہوتی۔ پر یہ شیر، یہ دُم والا شیر! شمشیر، میں تمہارے کسی کام آسکتا ہوں؟"
بوڑھے کو بازو سے پکڑ کر گھر لے آیا، تھا دکھایا، اور پھر اُس کے منہ میں مصری کی ڈلی ٹھونس کر بولا "سیدھی طرح
مبارک دے۔ ورنہ دوسری ڈلی سے باچھیں چیر ڈالوں گا"۔۔۔۔۔

شہباز چوکنے والا کب تھا۔ مصری کو ایک طرف کے جبڑے میں سنبھال کر بولا "ہم سولہ سترہ روپے کے بدلے
فرانس کے میدانوں میں جانیں دینے جا نکلے تھے، مصری کی ڈلی کے بدلے باچھیں چری گئیں، تو وارے نیارے ہیں۔
ہمارے، جانیں دیتے مبارک ہو"۔۔۔۔۔ اور پھر سنجیدہ ہو کر اس نے شمشیر پر مبارک بادوں کی بوچھاڑ کر دی۔

دلیر ابھی جھانسی ہی میں تھا، کہ اُسے باپ بن جانے کی اطلاع ملی، فوراً ریشمی کپڑوں کی ایک گٹھڑی پارسل
بھجوا دی۔ ادھر شاداں کو ہنسنے کھیلنے کا بہانہ ہاتھ آگیا۔ اُدھر شمشیر کے چہرے کی جھریاں مسرت کی لہروں میں بدلنے
لگیں، اور اس کی حسِ مزاح تیز ہونے لگی۔ اب اُسے ہر مہینے بیٹے کی طرف سے بیس روپے مل جاتے تھے اور وہ ہر روز
مہاجن کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے کہتا تھا "بس ایک سال دے جا، ایک ایک کوڑی چکا دوں گا، پر دیکھو!
وہ جو تم پچاس کے پانسو اور ہزار کے دس ہزار بنا لیتے ہو نا؟ وہ جادو کا کھیل مجھے نہ دکھانا، میں مداریوں سے نفرت کرتا ہوں"۔

مہاجن ہنستا، یہ ہنسی پہلے تو اس کی چندھی آنکھوں میں چمکتی، پھر گالوں کے ابھار میں ہونٹوں کا شگاف پیدا
ہوتا اور پیٹ نیم بسمل مرغے کی طرح تڑپنے لگتا۔ پیٹ کے کافی دیر تک تڑپنے کے بعد اس کے حلق میں گڑگڑاہٹ
پیدا ہوتی، سانسوں میں کشتیاں ہوتیں، اور قہقہہ، کھانسی، چھینک اور چیخ کا ایک مرکب بن کر اس کے نتھنوں اور
ہونٹوں سے ایک دھماکے کی طرح اُبل پڑتا، اور پھر ایک زہرہ گداز ڈکار کے بعد مہاجن کہتا "بڑے پاپی ہو تم"۔

شمشیر خاں اکثر کہا کرتا تھا کہ مہاجن کا قہقہہ سب سے پہلے اس کے معدے میں بیدار ہوتا ہے، چربی کی ایک
تہ سے سر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، اُبھرتا ہے، مگر جب ٹھوڑی تک پہنچتا ہے، تو بھٹک جاتا ہے، ایک حصہ نتھنوں
اور دوسرا منہ کے راستے باہر نکلتا ہے، تیسرا حصہ ٹھوڑی کی گدگدی آرامگاہ میں لیٹ رہتا ہے، اور جب مہاجن نہیں
چکتا ہے، تو یہ بقیہ حصہ ڈکار بن جاتا ہے۔

بہت کم لوگ جانتے تھے، کہ مہاجن کے قہقہے کی طرح اُس کی زندگی کا ہر پہلو اور اُس کی ہر حرکت ایک طویل
عمل کی عادی بن چکی تھی، لال لال پوتھیوں کے ٹاکروں میں سیاہ روشنی کی ننھی ننھی بندیاں کئی گھروندوں کی تباہی کی ضامن
تھیں، اور ہر رات کڑوے تیل کی روشنی میں ان بندیوں میں اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا۔ اور پھر وہ نہایت سُبک سے چاقو
کی کھڑچنی اور وہ گھسا ہوا موم اور "ہرے رام ہرے رام"۔

ایک روز شمشیر کو دلیر کا خط ملا، کہ اگرچہ وہ ننھے شیر خاں کو دیکھنے کے لیے حد سے زیادہ بے تاب ہے مگر سرکاری
حکم کے مطابق وہ کسی نامعلوم مقام کو جانے کے لیے آج کل کراچی میں ہے وہاں سے باقاعدہ خطوط لکھتا رہے گا۔ چند
روز کے بعد شمشیر کو معلوم ہوا، کہ دلیر سمندر پار جا چکا ہے اور اپنی تین چوتھائی تنخواہ اس کے نام لکھوا گیا ہے شمشیر کا مقصد

پورا ہو رہا تھا، لیکن وہ پٹواری سے ہٹلر کی فاتحانہ یلغاروں کے قصے ہر روز سنتا تھا اور ان لوگوں پر اُسے بہت رحم آتا تھا، جو اس گرجتی کو بجتی اور بجلی کی سی تیزی سے بڑھتی ہوئی فوج کے مقابلہ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ "کچھ سُنا شمشیر خاں" ایک روز پٹواری نے اُسے ایک خبر سُنائی "۔ دس دن ہوئے میں نے تجھے بتایا تھا، کہ جرمن دنیا کے سب سے خوبصورت شہر پیرس میں داخل ہو گئے۔ اب آج کی خبر ہے کہ فرانس نے جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔"

"دس دن میں سارے ملک فرانس پر قبضہ"! شمشیر بولا "۔ حلوے کی طرح نگل گیا کمبخت"۔

"فرانس ہے بھی حلوہ" داداشہباز چہکا "۔ میٹھا میٹھا، تروتازہ، رنگ برنگا"۔

اچانک شمشیر سیدھا بیٹھ گیا "۔ یہ فرانس کہیں دور ہے نا منشی جی، کراچی سے کوئی جہاز اگر ۲۱ر جون کو چلے تو ۲۲ر جون تک فرانس پہنچ سکتا ہے کیا؟"

اُسے تسلی دی گئی کہ دلیر ابھی فرانس نہیں پہنچ سکا ہوگا۔ مگر اب ہر روز پٹواری اُسے ایک وحشت ناک خبر سُناتا، اور اس کے چہرے پر جھُریاں پھر سے اُبھرنے لگیں "۔ انگلستان پر ہر روز تڑا تڑ حملے ہو رہے ہیں، مکان جل رہے ہیں عمارتیں گر رہی ہیں، ملبے کے نیچے سے عورتوں اور بوڑھوں، بچوں کی لاشیں، اور خون کے چھینٹے، انگریزوں کے خون کے چھینٹے ہمارے حاکم کے خون کے چھینٹے"۔

"بھئی، سمجھ میں نہیں آتی یہ بات" ایک سادہ دہقان نے حقے کے لیے تمباکو مسلتے ہوئے کہا "۔ انگریز بھی مرتے ہیں کیا؟"

شمشیر کو جی بہلانے کے لیے ایک موضوع ہاتھ آگیا "۔ نہیں نہیں میرے عزیز، انگریز کہاں مرتا ہے، انگریز تو قطب صاحب کی لاٹھ ہے، ساگوان کا شہتیر ہے، فولاد کا ڈھانچہ ہے۔ میرے بھائی، انگریز بھی تو ہم جیسا انسان ہے۔ فرق صرف اتنا ہے نا کہ وہ گورا ہے، اور ہم ذرا سانولے ہیں، اُس کے پاس جہاز ہیں، ہمارے پاس اونٹ۔ اُس کے پاس بندوقیں ہیں، ہمارے پاس لاٹھیاں۔ اس کے پاس کپڑے کی مشینیں ہیں اور ہمارے پاس بوستان جولاہے کی کھڈی، جس میں اس کا ننھا بچہ گر کر اللہ میاں کے ہاں سدھار گیا تھا، بیچارہ۔ اور پھر انگریز کے پاس چرچل ہے اور ہمارے پاس داداشہباز؛ جو آسے کا ڈھلائی موڑ کاٹتا ہے تو ایک قدم پر پندرہ بار کھانستا ہے اور جس کی بیگھہ بھر زمین میں سے سرکاری سڑک گذرنے والی ہے"۔

اور پھر پٹواری نے روز ایک تازہ پھڑکتی ہوئی خبر سُنانا شروع کی "آج گاندھی جی نے ہر انگریز سے اپیل کی ہے، کہ وہ جرمنوں پر اپنا دروازہ کھُلا چھوڑ دے، اور ان سے کسی قسم کا لین دین نہ کرے، جرمن خود ہی تنگ آ کر واپس جرمنی چلے جائیں گے"۔

"واہ رے میرے ملنگ سائیں، تیری دُور بلائیں" شمشیر حاشیہ آرائی کرتا "۔ دشمن کے ایک چٹکی تک نہ لو، تو پھر دشمنی کا ہے کی اور دروازہ کیوں کھُلا چھوڑ دو، لٹھ کیوں نہ جما دو تا کہ بھرکس نکل جائے۔ ہائے، کتنا جی چاہتا ہے کہ گاندھی جی چرخے کی تکلی پر سوت کاتنے کی جگہ اس سے کسی دشمن کی آنکھ نکال لیتے"۔

"دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی" داداشہباز نے کہا "۔ اور ادھر سے حکم ملتا ہے، کھڈیاں بناؤ"۔

بات معقول تھی، مگر وہ شمشیر ہی کیا جو دادا شہباز کی بات نہ لوٹ کے ۔ "تم نے یہ بال کڑکتی دھوپ میں سفید کیے ہیں دادا۔ ہو سکتا ہے کھڈیوں کے بیچ نے مورچے بنوائے جا رہے ہوں ۔"

"اور یہ دروازے کھلے چھوڑ دو؟"

"یعنی اندر آتے ہی دبوچ لو۔"

"اور یہ چرخہ چلاؤ؟"

"یعنی چرخہ چلاتے ہوئے کسی سے چل جائے تو تکلی چبھو دو۔ ہتھی دے مارو کے پر۔"

"لٹھ کیوں نہ دے مارو کھوپڑی پر؟"

"اس طرح دشمن خفا ہو جاتا ہے نا بھولے دادا ۔۔۔۔ ہاں تو منشی جی کوئی اور خبر۔؟"

"انگلستان نے فرانس کے بیڑے پر قبضہ کر لیا ہے، زبردستی۔"

"یعنی گاندھی جی کی نصیحت نہیں مانی۔"

چوپال پر گپّوں اور قہقہوں کے ہجوم میں وہ بہت حد تک پرانے شمشیر کے روپ میں اُجاگر ہو جاتا، مگر گھر لوٹتے ہی اُس کا ضمیر اُس کے چٹکیاں لیتا۔ دلیر کو جنگ پر بھیجنے کا مقصد اُس کے سامنے آتا تو وہ اپنے آپ کو نہایت کمینہ، ذلیل اور خود غرض محسوس کرتا۔ پریشان ہو کر اندھیرے میں آوارہ پھرتا رہتا، اور جب کہیں چین میسر نہ آتا، تو صندوق کھول کر دلیر کا بھیجا ہوا روپیہ گننے لگتا ۔!

انھیں دنوں دلیر کا خط آیا، کہ وہ اب مصر میں ہے، اور خوب مزے میں ہے، اور مصری اذان بڑی سُریلی ہوتی ہے اور مصری لوگ بڑے اچھے ہوتے ہیں، اور ہم روز تماشے دیکھتے ہیں۔ سیریں کرتے ہیں۔ اور ۔۔۔۔ یعنی جنگ کا ذکر تک نہ تھا۔ شاداں نے یہ سُنا تو شیر کو اُچھالتی ہوئی صحن میں بھاگ گئی، اور شمشیر خط کو دوبارہ اور سہ بارہ پڑھوانے کے لیے پٹوار خانے کے چکر کاٹنے لگا۔

۔۔۔۔ "اٹلی نے سمالی لینڈ پر حملہ کر دیا۔" ایک دن پٹواری نے خبر سنائی۔ "سمالی لینڈ مصر کے قریب ہی ہے۔"

"اے ۔۔۔۔"

۔۔۔۔ "ایک ہزار جرمن ہوائی جہازوں نے انگلستان پر حملہ کیا۔"

"خدا کی پناہ ۔ یعنی ٹڈی دل ہوائی جہازوں کا"!

"اٹلی نے مصر پر حملہ کر دیا۔"

۔۔۔۔ گاؤں والوں کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ انھوں نے شمشیر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ۔۔۔ وہ چُپ چاپ چوپال پر سے اٹھ کر گھر کو چل دیا۔ اپنے کمرے میں آکر اُس نے صندوق کھولا اور دلیر کی کمائی کو فرش پر بکھیر کر بچّوں کی طرح رونے لگا۔ وہاں سے اٹھ کر دھم سے پلنگ میں گر پڑا ۔ شاداں بھاگی آئی، تو شمشیر بولا "نہ جانے اب تک کیا کچھ ہو چکا ہوگا۔ دُعا کر بیٹی، دعاؤں کا تانتا باندھ دے، اتنی دعائیں مانگ کہ اللہ میاں کے دربار میں شور مچ جائے۔ رو رو کر، بلک بلک کر، سسک سسک کر دعائیں مانگ، دلیر کی زندگی کے لیے دعائیں مانگ، اور مجھ پر لعنتیں بھیج، کہ میں نے قرض اُتارنے کے لالچ میں اپنے

اکلوتے لعل کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔ یہ نہ سوچا کہ میں اجڑ جاؤں گا، یہ نہ سوچا کہ شاداں میری اچھی بیٹی کا سہاگ ابھی نیا نویلا ہے، یہ نہ سوچا کہ ـــــ اس کا گلا رندھ گیا۔ اور سر کو تکیے پر رکھ کر رونے لگا۔

شاداں مچل گئی۔ شیر کو فرش پر بٹھا کر شمشیر کی بیٹھ پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی ـــ میرے چچا، کچھ بتاؤ تو سہی آخر، کیا ہوا؟ کچھ تو کہو۔"

شمشیر نے بازو سے اپنی آنکھوں کو چھپا کر کہا۔ "دلیر مصر میں ہے اور مصر پر اٹلی نے حملہ کر دیا ہے اب وہاں جہاز بم برسا رہے ہوں گے، توپیں چل رہی ہوں گی، بندوقوں کی ترا تڑ اور گرد و غبار اور دھواں دھائیں ـــ میرا نازوں سے پالا دلیر، میری حرص کا شکار دلیر، میرے دلیر میرے ـــــ" وہ پھر رونے لگا۔

چھ مہینے تک شمشیر اور شاداں کے آنسو خشک نہ ہوئے اور دعائیں بند نہ ہوئیں مزاروں پر دیے جلے، بھکاریوں میں گڑ بانٹا گیا۔ بکرے قربان ہوئے۔ دونوں ایسے حواس باختہ ہو گئے، کہ رات کو گھر میں دیا تک نہ جلتا اور اگر جلتا تو جلتا ہی رہتا۔ کپڑے میل سے اٹ جاتے تو یونہی رسماً تھوپ تھاپ کر الگنی پر ڈال دیے جاتے۔ شیر بیمار پڑتا تو کسی آتی جاتی بڑھیا سے دوا پوچھ لی جاتی۔ چوپال پر پٹواری سے لوگ نئی خبروں کا تقاضا کرتے تو وہ کہتا "بھئی نئی خبریں تو بہت ہیں، پر اگر چچا شمشیر نہ ہو تو بات کا سارا مزا کر کرا ہو جاتا ہے، اسے آنے دو" ـــــ مگر شمشیر کو اب چوپال پر بیٹھ کر گپیں ہانکنے کی فرصت ہی کہاں تھی، وہ نوجوان تک اداس ہو گئے تھے، جن پر نہایت کڑی مگر شگفتہ تنقید کر کے وہ قہقہوں کا طوفان مچا دیتا تھا۔

چھ مہینے کے بعد کہیں سے دلیر کا خط ملا، کہ لڑائی میں اس کے کندھے پر معمولی سے زخم آئے تھے، اور اب وہ تندرست ہو کر عنقریب "انڈیا" آنے والا ہے۔"

"انڈیا؟" اس نے پٹواری سے پوچھا۔

"ہاں۔ یعنی ہندوستان۔"

"یہ انگریزی ہے؟"

"ہاں"ـــ

"یعنی دلیر اب انگریزی بھی جانتا ہے"؟

"یہی معلوم ہوتا ہے۔"

"اری شاداں بیٹی" وہ گھر آ کر پکارا۔ "کچھ سنا؟ دلیر انگریزی بھی بولنے لگا، اور اب واپس آ رہا ہے۔ اور دیکھ۔ وہ مرغی پھر رہی ہے نا۔ وہ گوری سی، بانجھ کمبخت، جو بڑے نخروں کے ساتھ تین مہینے بعد ایک ذرا سا انڈا برآمد کرتی ہے، اسے ذبح کرا لے، اور ساتھ ہی گورمکھ کی دکان سے جڑشی چاول لے آ، اور دیکھ، بڑے مٹکے میں جو گڑ پڑا ہے نا، وہ بچوں میں بانٹ دے۔ ـــــ ہاں ـــــ" باہر گلی میں آ کر وہ خواہ مخواہ ایک نوجوان کے پیچھے پڑ گیا۔ "ارے طرّے باز! ارے بائیں مڑتے ہوئے دائیں دیکھنے والے! بات سن، پگڑی کراتنی کلف نہیں لگانی چاہیے کہ اچھی خاصی ملائم ململ ٹین کا پترہ بن کر رہ جائے۔"

شمشیر پھر چوپال کی رونق بن گیا۔ "جنگ کی کوئی نئی خبر؟" اس نے پٹواری کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "کوئی تر و تازہ خبر ہو بھئی، ننھے ننھے گاؤں اور چھوٹی موٹی کھاڑیاں اور تل بھر کے جزیرے ـــ نہ نہ، بہت ہو چکیں یہ باتیں، کوئی

ایسی خبر سناؤ منشی جی، کہ اوسانوں کو ٹھکانہ نہ ملے۔"

دادا شہباز ایک بڈھے سے کسی بلغم توڑ نسخے کے اجزا پوچھ رہا تھا یکایک چونکا، اور کھسک کر شمشیر کے سامنے آ گیا۔ "کیا کہا میاں شمشیر؟ ہائے ہائے ہائے، انسان بھی کتنا طوطا چشم ہے۔ قرآن کی قسم ——— ارے، تمہارا دیر مصر میں تھا وہاں کے ہر ٹیلے کی خبر سنتے تھے، اور اب تمہارا دلیر مصر سے واپس آ رہا ہے۔ تو تم ننھے منے گوڈوں اور چھوٹی موٹی کھاڑیوں کا ذکر ہی نہیں سنو گے؟ کوئی بہت بڑی خبر سنو گے تم؟ تو بھی جنگ کی بات۔ بڑی خبر تو یہی ہوتی ہے نا جس میں ان گنت انسان کھیت رہیں۔ اور میاں شمشیر! جو جوان تمہیں بہت بڑی خبر سنانے کے لیے جانیں دیں گے، اُن کے بھی تو باپ ہوں گے، اُن کی بھی تو نئی نویلی بیویاں ہوں گی، اور معصوم بچے اور پیارے دوست اور ہمدرد رشتہ دار، اُن کی اُمیدیں اور ان کے حوصلے، چاہے وہ جرمن ہوں چاہے انگریز چاہے ہندوستانی، میں انسانوں کی بات کر رہا ہوں۔"

شمشیر کا چہرہ ایک خوفناک ندامت آمیز سنجیدگی کے ہالے میں گھر گیا۔ مٹی ہوئی جھریاں پھر سے ابھر آئیں، پہلو بدلا، اور سر پر ہاتھ پھیر کر شہباز کی طرف دیکھا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو چچا" ——— اُس کی آواز کھوکھلی تھی اور بج رہی تھی، اور اس میں گھبراہٹ کے آثار چڑھاؤ تھے۔ "میں نے تو ویسے ہی بات کی تھی کہ ——— بات یہ ہے دادا، کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"میں نے غلط بات کب کہی ہے؟" شہباز الجھ رہا تھا۔

"صرف اب" شمشیر موضوع کو بدلنا چاہتا تھا۔

لوگ ہنس پڑے ———

"میرا مطلب ہے، میں نے کبھی نہیں کہی" ———

"سچ بات" ——— شمشیر نے دادا شہباز کا فقرہ پورا کر دیا اور چوپال قہقہوں سے گونج اٹھی۔

مگر شہباز اپنے احساسات کی تلخی سے ابھی پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا، بولا۔ "تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو شمشیر اور تم نے مجھ سے کم دنیا دیکھی ہے، پچھلی لام کو ان آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، سینکڑوں جرمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اور سچ کہتا ہوں، دشمن کی ہر لاش سے میرے دل کا ایک ٹکڑا چپک کر رہ گیا۔ اندھیری اُگھتی دھواں سی راتوں میں سرد جسموں سے ٹھوکریں کھائیں، اور ٹھوکر کھا کر گرا بھی تو لاشوں پر۔ کسی کی انتڑیاں باہر پڑی تھیں، کسی کا بھیجا چٹان پر بکھر گیا ہے۔ کسی کی ٹانگیں غائب ہیں، کوئی مرنا چاہتا ہے اور مر نہیں سکتا۔ کوئی جینا چاہتا ہے مگر جی نہیں سکتا۔ میں نے ایک روز ایک لاش دیکھی، جرمن سپاہی تھا، اتنا خوبصورت کہ مورت چھاپ لینے کو جی چاہے۔ میں نے اس کی جیبیں ٹٹولیں، تو اندر سے سنہری بالوں کا ایک گچھا نکلا۔ اور کسی پھول کی چند سوکھی پتیاں، اور ایک مڑی تڑی تصویر ——— ایک لڑکی کی ——— جس کی آنکھیں اتنی گمبھیر تھیں قرآن کی قسم، کہ جہان ڈوب جائے، اور اُس کی آنکھیں جیسے پوچھ رہی تھیں "سچ سچ کیا تم واپس نہیں آؤ گے؟" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، توپوں کی دھائیں دھائیں اور دھوئیں اور دھول کی اس دنیا میں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے یہ تینوں چیزیں اُس کی جیب میں ڈال دیں، اُس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور میاں شمشیر میری بات سننا۔ میں سچ کہتا ہوں ——— میں چیخ کر پیچھے ہٹ گیا، اس کے منہ سے اچانک چند مکھیاں نکلیں، اور اس کے نیلے ہونٹوں اور ننھی ننھی سنہری مونچھوں پر بیٹھ کر پر سنوارنے لگیں ——— یہ نوجوان بھی تو دنیا کو بہت بری خبر سنانے کے لیے مرا ——— اور میں نے ان تمام خونوں کے

بدلے سات روپے پنشن پائی ـــــ یہ سات ٹھیکریاں ـــــ یہ سات لعنتیں ـــــ" دادا شہباز کی آواز بھرا گئی اور وہ لاٹھی سنبھالتا چوپال پر سے اُتر گیا۔

"دادا" شمشیر نے اُسے پکارا۔

وہ بغیر مڑے بولا "میں پاگل ہو جاؤں گا، مجھے جانے دو"

"دادا" شمشیر ننھے بچے کی طرح پکارا۔ اور پھر سر جھکا کر بیٹھ رہا۔ ایک مجرم کی طرح، شرمندہ اور نڈھال ـــــ جیسے دنیا کی ساری جنگوں کا ذمہ دار صرف وہی ہو۔

صبح کو اٹھا، تو شاداں کے چہرے پر غیر معمولی تازگی دیکھ کر اس کا احساس مسرت پھر سے جاگ اٹھا، اور جرمن سپاہیوں کی لاشیں ایک طرف سرک گئیں، "دلیر آ رہا ہے" ـــــ "دلیر مصر سے بخیریت واپس آ رہا ہے" ـــــ اُس کی ذاتی تسلی کے لیے یہی خیال کافی تھا اور دادا شہباز کی بھرائی ہوئی آواز اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں ـــــ "اور میں پاگل ہو جاؤں گا" ـــــ بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے اُس نے سوچا۔

بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے ـــــ اُس نے ایک مرتبہ پھر سوچا، یعنی دلیر آ رہا ہے، تو آکر واپس بھی تو جائے گا۔ اور واپس لاہور یا دلّی نہیں جائے گا۔ جنگ پر ہی جائے گا۔ اور جنگ سے انسان ایک مرتبہ بچ نکلے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمیشہ بچتا چلا جائے۔

دادا شہباز۔ قتلے کر ڈالوں تیری زہریلی زبان کے ـــــ بات کیا تھی اور تو نے کہاں پہنچا دی!

اُس نے بہت کوشش کی کہ مسکرائے، قہقہے لگائے، پھبتیاں کسے، مگر اُس کے ذہن پر اچانک ایک خوبصورت چہرہ اُبھرتا، اور پھر نیلے ہونٹوں اور سنہری مونچھوں پر مکھیاں بھنبھناتیں، اور کلیجے میں کرچ سے سنگین پیوست ہو جاتی تو انتڑیاں باہر اُبل پڑتیں ـــــ وہ شاداں سے کہتا۔

"بھئی کوئی بات سناؤ" ـــــ مگر وہ مُسکرا کر پیاز کاٹنے لگتی۔

"ارے بھئی کوئی بات سُناؤ" وہ گلی کے نکڑ پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہتا۔

"دلیر کب آئے گا؟" سوال کا جواب سوال ہی میں ملتا۔

"دادا کوئی بات سُناؤ" اُس نے چرکے لگانے والے شہباز سے مرہم کی التجا کی۔

"بات؟" بڈھے نے پوچھا۔ "یعنی کوئی بہت بڑی خبر؟"

اور شمشیر کے جی میں آئی کہ ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو توڑ مروڑ کر ببول میں پھینک آئے۔

چند روز بعد اُسے دلیر کا خط ملا، کہ وہ گھر نہیں آئے گا۔ کراچی میں اُترتے ہی اُس کی رجمنٹ رنگون چلی گئی ہے اور رنگون سے سنگاپور جانے کا قصد ہے۔

"دلیر نہیں آ رہا" ایک دھماکے کی طرح یہ الفاظ اس کے لبوں سے نکلے، اور شاداں جو مسالہ رگڑ رہی تھی، دم بخود ہو کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"دلیر نہیں آ رہا۔ وہ رنگون جا رہا ہے" اُس نے دادا شہباز کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے چوپال پر اعلان کیا۔

"بہت بڑی خبر ہے بھئی" دادا شہباز کی لے ابھی نہیں ٹوٹی تھی۔

شمشیر بگڑ گیا "دیکھو دادا۔ بہت لحاظ کیا تمھارا، تم چند دنوں سے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ یہ اچھی بات نہیں۔ میں تمھارے سفید بالوں کی عزت کرتا ہوں ورنہ" ___ اور وہ غصے سے کانپتا ہوا چوپال پر سے اُٹھ آیا ___

پٹواری نے آواز دی ۔ "یہ جنگ ہیں یونہی ہوتا ہے چچا"

اور شمشیر نے پلٹ کر پٹواری کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے بس چلے تو اُس کی کھوپڑی ادھیڑ کر رکھ دے۔

لیکن اُسی روز ایک شہباز کیا پٹواری کیا، وہ سارے گاؤں سے بگڑ گیا۔ شاداں تک کو جھڑک دیا۔ "لوہے کی زبان ہوتی تو شاید مرچیں اثر نہ کرتیں، مگر اب تو گلے سے ناف تک جلتا ہوا فتیلہ رکھ دیا ہے تمھارے سالن نے بڈھوں کو جان سے مارنے کے اور بھی تو طریقے ہیں، کفگیر جما دو کنپٹی پر۔ کڑاہی دے مارو ماتھے پر ___ لے جاؤ میں نہیں کھاؤں گا"

مگر آہستہ آہستہ وہ سنبھلتا گیا، اُس کا بیٹا رنگون میں تھا اور اُس کے خیال میں یہ ناممکن تھا کہ جنگ مغرب سے ہٹ کر ہزاروں میل کی اُلٹی زقند بھرے اور مشرق کے مرغزاروں میں ناچنے لگے "مشرق میں کیا پڑا ہے" پٹواری نے کہا تھا۔ "مشرق کے لیے دوسرے بم اور توپیں تھوڑی ہیں، کہ اب یہ تکلف بھی کیا جائے"

"ایک جاپان ہے" دادا شہباز نے جہاں دیدہ سیاست دان کے انداز میں کہا تھا "ننگی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا ___ برسوں سے چین میں سر پٹخ رہا ہے پر یہ افیمی ابھی تک اس کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے ہیں اور کبھی جاپانی مال لو تم جانتے ہی ہو۔ جاپانی کھلونے، ادھر بچے کے ہاتھ میں آئے ادھر دانت نکال بیٹھے اور جاپانی ریشم کے کپڑے۔ ایک تاگا کھنچ آئے تو سمجھو سارا تانا بانا اشارے کا منتظر ہے۔ ان کے جہاز بھی تو ٹین کے بنے ہوتے ہیں، اور ان کے سپاہی ٹھنگنے، ناٹے، تم یوں جا کر ان کی کھوپڑی پر تھپڑ مارو تو زمین میں دھنس جائیں"

"نہیں نہیں" پٹواری نے دادا شہباز کو ٹوکا تھا "یہ بات تو نہیں دادا۔ مگر جنگ ابھی ادھر نہیں آئے گی۔ جنگ زندہ لوگ لڑتے ہیں۔ لاشوں نے بھی کبھی لڑائیاں کی ہیں بھوے بادشاہو"

ادھر دلیر کے خط پر خط آ رہے تھے، رنگون کے پگوڈے، برما کے جنگل، ناریل اور کیلے، اور ___ "ہم بڑے مزے میں ہیں۔ رنگون، برما کی جنت ہے۔ جنگ نہ ہوتی تو میں شاداں، شیرا اور آپ کو یہاں بلا لیتا"

شمشیر پٹواری کے پاس دوڑا آیا "کیا رنگون میں بھی جنگ ہو رہی ہے منشی جی؟"

پٹواری نے کان پر قلم دھر کر کہا "یہ جنگ کہاں نہیں ہو رہی چچا، جنگ صرف توپ، بندوق کی تو محتاج نہیں بھوک بھی تو جنگ ہوتی ہے، غلامی کی بھی جنگ ہوتی ہے۔ انتظار کی بھی جنگ ہوتی ہے۔ جنگ ہر جگہ ہو رہی ہے۔ رنگون میں بھی ہو رہی ہے، ہمارے گاؤں میں بھی ہو رہی ہے، یہ ازلی و ابدی جنگ، یہ جنگ جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ یہ جنگ جو دریا سے نہریں نکالتی ہے جو سرسبز کھیتوں میں سے سڑکیں گزارتی ہے، جو پانی پر لگان لگاتی ہے، جو پولیس کے سپاہی کو نمرود کے اختیارات بخشتی ہے، جو غریبوں کے کھدر میں جوئیں ڈالتی ہے، جو امیروں کے ریشم تیتے گھیا کی صورت میں پروان

چڑھتی ہے۔ تم ہر روز جنگ جنگ پکارتے ہو۔ جنگ ہر جگہ جاری ہے، ہماری زندگی خود ایک جنگ ہے۔"

"مگر جنگیں ختم بھی تو ہوتی ہیں"۔۔۔۔

"نہیں، کئی ایسی جنگیں بھی ہیں جو قیامت تک جاری رہیں گی، اب یہ جنگ ختم ہوگی تو ایک نئی جنگ آدھمکے گی۔ وہ امن کی جنگ ہوگی۔ امن قایم کرنے کے لیے تجارت کی جنگ ہوگی۔ تجارت بڑھانے کے لیے سمندری راستوں کی جنگ ہوگی۔ ان کے عقب میں انسان کے پیدائشی حقوق کی جنگ ہوگی، اور جب یہ جنگ ہوگی۔۔۔۔ جب یہ جنگ ہوگی۔۔۔"

اور پٹواری نے کان پر سے قلم اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا "کھتونی کہاں گئی؟"۔۔۔۔

چند روز کے بعد اُس نے پٹواری سے خبر سُنی "جاپان نے امریکہ پر حملہ کر دیا" اور پھر اتنے ہی روز بعد اُسے معلوم ہوا، کہ جاپان نے سنگاپور لے لیا۔۔۔

مگر دلیر تو رنگون میں تھا اور رنگون سنگاپور سے بہت دُور ہے۔ گھر آکر اُس نے شیر کو اٹھایا، اور صحن میں ٹہلنے لگا۔ "تیرا ابا رنگون میں ہے اور جنگ ہو رہی ہے سنگاپور میں، اور سنگاپور بہت دور ہے رنگون سے۔" بچے نے ناک پر ہاتھ رگڑ کر دادا کے بال پکڑ لیے، اور جب بڑی مشکل سے اُس نے بچے کی گرفت ڈھیلی کی تو بچہ رونے لگا، شاداں بھاگی آئی وہ رو رہی تھی، اس کی آنکھوں کے ڈوروں میں خون تھا۔ اُس کے گالوں میں خون تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر خون تھا۔ اُس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ شمشیر نے محسوس کیا کہ ساری کائنات پر انسانی خون کے چھینٹے بکھر گئے ہیں۔ لاشیں پیڑوں تلے چیخ رہی ہیں، کھوپڑیاں فضا میں اڑتی پھر رہی ہیں، کسی آسیبی ہاتھ نے افق پر سے لپک کر کھیتوں کی ہریاول کو نچوڑ لیا ہے اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے جس میں تازہ خون کی بو ہے۔ سڑتی ہوئی نعشوں کی بو ہے، جھلسے ہوئے چمڑے کی بو ہے۔

"دیا جلاؤ" وہ پکارا۔

کچھ دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ ہڑبڑا کر اُٹھا اور صحن میں جا کر چنگھاڑا۔ "شاداں میں بک رہا ہوں۔ دیا جلاؤ۔ وہ اس وحشت ناک خاموشی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دانت بھینچ کر چلایا۔ "دیا جلاؤ شاداں مجھے اندھیرا نگل جائے گا"۔

دروازے پر کسی کی دستک ہوئی۔ "کون ہے؟" وہ اسی شدت سے پکارا اور دروازے تک گیا۔ مہاجن کی ٹھوڑی چھچھیڑے میں تھیلی کی طرح لٹک رہی تھی۔ "اب کے تم نے قسط نہیں دی"۔

"نہیں دوں گا قسطیں" شمشیر نے کواڑ پر گھونسا جما کر کہا۔ "کب تک دیتا رہوں گا قسطیں۔ میں نے تمہاری قسطوں کے لیے اپنا بچہ موت کے منہ میں ڈال دیا۔ اپنے آنگن کی رونق لٹوا دی، اپنی روح کو نچوڑ کر تیری پیاس بجھانی چاہی پر تیری پیاس نہیں بجھے گی۔ تو نے میرے دلیر کو رگڑ کا۔ اب تو میرے شیر کو بھی چبائے گا۔۔۔ جا نہیں دیتا قسطیں، بتا دے جا کر اپنے ہوتوں سوتوں کو۔۔۔ نالش کر دے۔۔۔" پیچھے سے شاداں نے آکر اُسے کھینچ لیا۔ "آپ کس سے بول رہے ہیں! سیٹھ تو چلا گیا"۔

"دیا کیوں نہیں جلایا تم نے؟"۔۔۔

"جلایا ہے"۔

"کہاں چلا گیا ہے؟ کدھر چلا گیا ہے؟ چلا گیا ہوتا تو ـــــ" مگر دیا جل رہا تھا اور دیے کی روشنی میں شاداں کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ خود شمشیر کا سارا وجود جل رہا تھا، وہ دھم سے بستر پر جا گرا، بہت دیر کے بعد کروٹ بدلی، اُٹھ بیٹھا، منہ کو دبایا اور ہوئے سے بولا "شاداں بیٹی۔ ذرا ادھر آ کر دیا بجھا دے۔ تیل ضائع ہو رہا ہے خواہ مخواہ۔"

دلیر کی خاموشی اور خطرناک ثابت ہوئی، قسم قسم کے وسوسے شمشیر کو پریشان کرنے لگے۔ شاداں گھُلتے گھُلتے کانٹا بن گئی، اُس کا دودھ خشک ہو چلا تھا، پڑوس کے دھوبیوں سے وہ بکری کا دودھ خرید لاتی تھی۔ مگر شیر ہمک ہُمک کر ماں کے سینے سے چمٹ جاتا، ادھر پٹواری نت نئی اور خطرناک خبریں سنانے لگا۔ دادا شہباز شمشیر کو بہلانے کے کئی جتن کرتا، مگر شمشیر مری ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ٹال جاتا۔ ہر روز مدرسے جاتا۔ جب ماسٹر جی ڈاک کھولتے تو وہ بت بنا ایک طرف کھڑا رہتا ـــــ

"تمھارا خط نہیں آیا چاچا" ماسٹر جی کہتے، اور وہ سر جھکائے گھر کو پلٹ آتا۔

ہر صبح کو مدرسے میں سارا گاؤں جمع ہوتا تھا۔ سب اپنے بیٹوں، بھتیجوں، نواسوں اور پوتوں کے خط لینے آتے، اور دکھوں کی گٹھریاں اٹھا کر واپس جاتے، اور پھر ایک دن اچانک ڈاک کے بھرے بھرے تھیلے میں سے سرکاری خطوط کا ایک ڈھیر سا برآمد ہوا۔ ایک خط شمشیر کے نام بھی تھا۔ اُسے سرکار نے اطلاع دی تھی، کہ دلیر جاپانیوں کا قیدی ہو چکا ہے۔

خط کھلتے جاتے تھے، اور آنکھیں بھیگتی جاتی تھیں۔ اچانک ایک بوڑھے نے چٹاخ سے اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ مار کر کہا ـــ "میں اُجڑ گیا ـــــ اور پھر ہر طرف سسکیاں اور فریادیں اور شیون ـــــ ڈاک خانہ ماتم کدہ بن گیا ـــ کوئی جنگ میں مارا گیا تھا، کسی کا کچھ پتہ ہی نہیں تھا، کوئی جاپان کا قیدی تھا ـــــ آن کی آن میں گاؤں کے بہت سے گھروں میں داویلا مچ گیا، چھاتیاں کوٹی جانے لگیں، بال نوچے جانے لگے۔ گلیوں میں بھگدڑ مچ گئی، جنگ ہر جگہ ہو رہی ہے" ــــ

شمشیر کے کانوں میں پٹواری کے الفاظ گونج رہے تھے ــ "جنگ ہر جگہ ہو رہی ہے۔"

"شاداں، شاداں" اور صحن کے کونے میں بیٹھی ہوئی شاداں نے سر اُٹھایا، اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں اور کھلے بال زمین کو چھو رہے تھے۔ "میں سن چکی ہوں" اُس نے بلکتے ہوئے کہا۔

"شیر کہاں ہے؟" شمشیر نے پوچھا۔

"پڑا ہوگا کہیں" شاداں گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔

شیر اندر کمرے میں ایک کھٹولے کے نیچے لڑھکتا پھر رہا تھا۔ اُس کے منہ میں مٹی تھی اور بالوں میں تنکے اٹک گئے تھے۔ شمشیر نے اُسے اُٹھایا، چوما، چوم چوم کر اُسے نڈھال کر دیا، اور پھر اُسے شاداں کے پاس بٹھا کر بولا۔ "یہ سب میرا کیا دھرا ہے، مجھ بوڑھے کا، مجھ خناس کا، بیٹے کو یوں جنگ میں بھیجا جیسے جہاد کا حکم مل چکا ہے ـــــ میں ـــــ میں ـــــ"

مگر اُس نے اچانک محسوس کیا کہ یہ مقام اور یہ موقعہ ایسی باتوں کا نہیں۔ پلٹ کر اپنے پلنگ پر آیا۔ وہاں سے اُٹھ کر مرحوم نوجوانوں کے والدین کے پاس جا نکلا۔ ایک گھر میں اُسے پٹواری مل گیا۔ بولا "بڑا افسوس ہوا چچا"۔

شمشیر نے بازو اٹھا کر انگلیوں کو ایسا چکر سا دیا۔ جیسے کہہ رہا ہے۔ "قسمت"۔

"تم جب اپنے کلیجوں کے ٹکڑوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونک رہے تھے، تو تمھیں یہ کسی نے نہ بتایا کہ" ـــــ

اُس وقت ذیلدار فاتحہ خوانی کے لیے آنکلا اور پٹواری دبک کر دیوار سے لگ گیا۔

جاپان کی فاتحانہ یلغار برق رفتاری سے بڑھ رہی تھی، ادھر جرمنی نے اتحادیوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ مگر اب گاؤں والے بالکل بے حس تھے، جیسے جنگ کے ساتھ اُن کی ساری دلچسپی اور وابستگی اُن کے بیٹوں اور پوتوں کی وجہ سے تھی، اور جب وہ کٹ مرے، یا قیدی ہو گئے تو جنگ ختم ہو گئی۔ باہر چراگاہوں میں ریوڑ چرنے جاتے تو ان کے پیچھے بوڑھے بوڑھے گڈریے ہوتے۔ کھانستے اور ہانپتے ہوئے۔ کھیتوں کی رکھوالی کرنے والیاں اپنے بھائیوں اور خاوندوں کی یاد میں دھیمے سُروں میں گاتیں اور روتیں، چوپالوں پر الاؤ کے اردگرد دہقان چُپ چاپ بیٹھے رہتے۔ گلیوں میں خاک اُڑتی، ٹھنڈی کنواری صبحوں کو بوڑھیوں کی سسکیاں اور کھانسیاں داغ دار کر دیتیں، پھولتی ہوئی شفق کے کلیجے میں خرخراتے ہوئے گلے والے عمر رسیدہ مؤذن کی آواز برچھے کی طرح گھُس جاتی۔ زندگی جیسے پاؤں گھسیٹتی پھر رہی تھی، ماری ماری، خانماں برباد اور پریشان حال، گھومتی اور چکراتی ہوئی، اونچی لگروں پر رُکتی اور گہری کھاڑیوں میں بھٹکتی ہوئی —— لال گالوں اور چمکتی آنکھوں اور سریلے گیتوں کی تلاش میں —— مگر لال گالوں کو گدھ نوچ کر لے گئے تھے، چمکتی آنکھیں مصر کے ریگستانوں اور برما کے جنگلوں میں بجھ چکی تھیں اور سُریلے گلوں کا رس صحرائی مکھیوں نے چوس لیا تھا —— اور جنگ جاری تھی —— عوام کی جنگ —— جمہوریت کی جنگ —— نوعِ انسان کی آزادی کی جنگ —— اور دریائے سندھ سے ایک بہت بڑی نہر نکالی جا رہی تھی اور دادا شہباز کی ایک بیگھہ زمین پر سے پکّی سڑک گذرنے والی تھی، اشیائے خوردنی نابود ہو رہی تھی —— ایک ہندوستانی نے ایک یورپین نازنین کے بوسے کے عوض ہزار ہا روپیہ کا چندہ جنگ میں دیا تھا، اور مہاجن شمشیر کے پیچھے سائے کی طرح لگ گیا تھا، "تھوڑی سی رقم ہی تو باقی ہے، چکا دو، مجھے نیا دھندا شروع کرنا ہے" —— نیا دھندا"۔ پٹواری نے کہا تھا: "یعنی اناج کے ذخیرے اور ریزگاری کی تھیلیاں اور" —— "نہیں نہیں" مہاجن نے ٹھوڑی کے بلوں میں سے میل کی مڑوڑیاں نکال کر کہا تھا "میں کانگریسی ہوں میں ایسا نہیں کروں گا"۔

ہے شمشیر چچا —— جیسے ہر گاؤں والا پکار رہا تھا —— ارے کچھ بولو، کوئی پھبتی، کوئی مذاق، کوئی لطیفہ —— کچھ سناؤ بھئی ورنہ ہماری روحیں بجھ جائیں گی، ہمیں نوجوان بھائی اور بھتیجے اور پوتے راتوں کی خاموشیوں میں آ آ کر ستاتے ہیں۔ لال لال آنکھیں نکال کر ہمیں اپنے پھٹے ہوئے پیٹ کٹے ہوئے بازو اور کٹی ہوئی رانیں دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں —— "مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو" —— ہے شمشیر چچا کوئی بات سناؤ، ہمارے کانوں میں ہمارے عزیزوں کی کراہیں برسے کی طرح گھُسی جا رہی ہیں، ہماری بیوہ بہنیں، ہماری لُٹی ہوئی بیٹیاں، ہمارے کچلے ہوئے بچے! —— شمشیر چچا —— ہے شمشیر چچا! ——

مگر شمشیر چچا پر تو کوئی اور دُھن سوار تھی۔ وہ اب چپ چاپ رہنے لگا تھا۔ ہر روز ڈاک خانے میں جانا اُس کا معمول ہو گیا تھا، وہاں سے ناکام لوٹ کر وہ پٹواری کے پاس چند لمحے گذارتا۔ اور پٹواری کے زرد سوکھے ہوئے چہرے میں ٹھنسی ہوئی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں جھلملا اٹھتیں: "یہ جنگ کبھی ختم نہیں ہو گی، یہ جنگ کرۂ ارض کی آخری جنگ ہے، اس جنگ میں آدم کی اولاد جل بجھ کر بھسم ہو جائے گی، اور پھر اس راکھ سے ایک نئے آدم کی تعمیر ہو گی۔ جس کی اولاد صحیح انسان ثابت ہو گی۔ وہ ایک گھر کی آبادی کے لیے بیس گھر نہیں اجاڑے گی، وہ ایک انسان کو موٹر مہیا کرنے کے لیے سینکڑوں انسانوں کی ٹانگیں نہیں کاٹے گی، ساری دنیا کی پیداوار ساری دنیا کے باشندوں کی ملکیت ہو گی، اُس وقت

چچا شمشیر ـــــ صرف ـــــ صرف اُس وقت ـــــ صرف تبھی "ـــــ اور وہ کان پر سے قلم اُٹھا کر کہتا ـــ "کھتونی کہاں گئی"؟ ـــــ

مہاجن کی دکان کے سامنے سے گذرتا تو مہاجن لجاجت سے کہتا "بھئی چکا دو نا باقی حساب، اب نیا دھندا شروع کرنا ہے، اور پھر اب تو تمھارا بیٹا قیدی ہے، اس کی ساری تنخواہ تمھارے نام آتی ہوگی"۔

اب تو تمھارا بیٹا قیدی ہے!۔۔۔ اب تو تمھاری قسمت جاگ اُٹھی!ـــــ اب تو تمھاری برسوں کی تمنا پوری ہوئی!ـــــ اب تو تمھاری پانچوں گھی میں!ـــــ لعنت ہو۔شمشیر کو ہر کوئی چڑ کے لگاتا تھا، دادا شہباز بھی جو کہتا تھا۔ "آجائے گا، قیدیوں کو تو بادشاہیاں بڑے آرام سے رکھتی ہیں، دلیر ضرور آئے گا"ـــــ دادا شہباز اُس سے مذاق کرتا تھا!ـــــ

آہستہ آہستہ گاؤں پر سکون چھاتا چلا گیا۔ مگر اس سکون میں زندگی کم تھی اور موت زیادہ، ہواؤں میں بواؤں کی آہیں اور یتیموں کی کراہیں تھیں۔ کھیتوں کا رنگ زہر کی طرح کثیلا تھا، مویشی تک اداس نظر آتے تھے، ہر جمعرات کو چوپال سے پرے گاؤں کے قبرستان میں بزرگوں کی قبروں پر چراغوں کی قطاریں جلنے لگیں۔ ہر ماں، ہر بیوی اور ہر بہن جمعرات کو مٹی کے دیوں میں تیل بھر کر بزرگوں کے پاس جاتی، اُن کے سرہانے دیے رکھ کر دعائیں مانگتی "ـــــ میرا بیٹا واپس آئے، میرا مالک واپس آئے۔ میرا بھیا واپس آئے"ـــــ "کوئی واپس نہیں آئے گا" پٹواری نے کہا تھا "میں کہتا ہوں تم جن بھائیوں اور بیٹوں کو واپس بلا رہی ہو وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے، وہ مر چکے ہیں یا مر رہے ہیں، اُن کے ذہن مر چکے ہیں، اُن کے عقیدے مر چکے ہیں، اُن کے جسم شاید واپس آجائیں، لیکن وہ اپنی روحوں کو وہیں دفن کر آئیں گے، اور اس لیے جب وہ واپس آئیں گے تو تمھارے بھائی اور بیٹے نہیں ہوں گے۔ وہ دھرتی کے بیٹے ہوں گے اور جب میکسیکو میں کسی حبشی پر کوئی امریکن گولی چلائے گا تو درد کے مارے وہ چلا اٹھیں گے، جب شنگھائی میں کوئی جاپانی کسی چینی کے تھپڑ مارے گا تو وہ چلا اٹھیں گے، جب دلی میں کوئی گورا کسی ہندوستانی کے پیچھے پر لات جمائے گا تو وہ تڑپ اٹھیں گے اور پکار اٹھیں گے، اور ان کی پکار ہندوستان سے نکل کر لندن کے قلعوں سے ٹکرائے گی، واشنگٹن کے محلوں میں گونجے گی۔ ماسکو کے ...

"میرے خیال میں یہ پٹواری یا تو بم بنانے لگے گا۔ یا قید ہو جائے گا" ذیلدار نے ایک روز تنگ آکر کہا تھا۔

پٹواری کی باتیں پُرسکون تالاب کی سطح پر گرتے ہوئے ننھے ننھے سنگریزوں کی مانند تھیں۔ لہروں کے دائرے اپنے محیط وسیع کرتے ہوئے پھیلنے لگتے اور مٹ جاتے۔ اور پھر تالاب سو جاتا ـــــ ایک سال گذر گیا۔ دو سال گذر گئے، کبھی کبھی یورپ کے محاذ سے کسی نوجوان کی موت کی خبر آتی تو اس تالاب میں چٹان سی گر پڑتی، تالاب کھلبلا کر رہ جاتا، لہریں دیر تک اس کی سطح پر ناچتی رہتیں، اور پھر سکون چھا جاتا ـــــ سکون، جو برے انجام کا آغاز ہے۔

ٹھیک ہی تو ہے، وہ بیوائیں جن کے پریشان بال، خشک ہونٹ اور چھلکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر کائنات بھی سسکیاں لینے لگتی تھی۔ وہ بہنیں جن کی چیخ پکار کا خلوص غیر فانی اور ابدی معلوم ہوتا تھا ـــــ اب ترنجنوں میں چرخے گھماتیں چہلیں کرتیں، قہقہے لگاتیں، ٹہوکے مارتیں اور کہتیں ـــ "تیری اوڑھنی کا رنگ تو بالکل نئے نئے خون کا سا ہے بہن نوری"ـــــ اور "تیری لونگ۔۔ اتنی اچھی ناک پر اتنی بھونڈی لونگ، جیسے مصری کی ڈلی پہ مکوڑا چپک کر رہ جائے"ـــــ نا کوری آنکھوں

بالوں اور اوڑھنیوں کے گورکھ دھندے میں گھری ہوئی یہ بیویاں اور یہ بہنیں مصر کی رتیوں اور برما کی پتاوروں میں گلی ہوئی ہڈیوں کو فراموش کر چکی تھیں۔ صرف ماؤں کی محبت زندہ تھی، یہ ابدیت سے بھی گہری اور لامحدود محبت، جو انقلاب کا نام نہیں جانتی، جو خدا کی طرح اٹل ہے ـــــ اندھیری شاموں میں جب یہ بوڑھی مائیں پلو تلے دیے چھپا کر بزرگوں کی قبروں پر جاتیں، اور جب مقبروں پر بجھے دیے، جو اب تعداد میں بہت کم رہ گئے تھے، ہوا کے جھونکوں میں اپنی آتشیں زبانیں تھرتھراتے اور قریب بیٹھی ہوئی ماؤں کے نوچ چہروں میں دھنسی ہوئی آنکھیں شہابِ ثاقب کی طرح چمک اٹھتیں، تو شمشیر جس کی خاموشی اس عرصہ میں آوارگی کی صورت اختیار کر چکی تھی، لپک کر گھر آتا اور ننھے شیر کو پاس بٹھا کر شاداں سے کہتا۔ "بیٹا آج جمعرات ہے، دیا تو جلا دیا ہوتا مزار پر، کون جانے اسی تیل کے صدقے خدا ہمارے گھروندے کو پھر سے روشن کرے ــــ" تو شاداں انگڑائیوں کا تانتا باندھ کر اٹھتی اور کہتی ـــ "بہت دیے جلائے چچا، اور پھر دیے بجھ جاتے ہیں تو یہ مجاور الٹ کر لے جاتے ہیں۔ دیے جلانے سے کیا ہوگا۔"

شمشیر کے لیے دلیر کی دوری اب اتنی تشویش ناک نہیں رہی تھی، جتنا شاداں کا تغیر۔ دلیر کی قید کے پہلے ہی سال کے آخری مہینوں میں اس کے دبلے پتلے جسم میں تازہ خون دوڑنے لگا تھا۔ صبح سویرے بناؤ سنگار میں کتنی دیر لگا دیتی۔ بہترین لباس پہنتی، شیر کو گھر کتی، اور پڑوس میں دھوبیوں کے گھر چلی جاتی، ہر مہینے دلیر کی تنخواہ سے دس روپے شمشیر سے جبراً لے لیتی۔ "مجھے بھی زندہ رہنا ہے" وہ کہتی ـــ "مہاجن کا حساب شیطان کی آنت بنتا چلا جائے تو میرا کیا بس، میرا بھی تو حق ہے"

شمشیر چپ چاپ دس روپے ہر مہینے اس کے حوالے کر دیتا، وہ جانتا تھا، کہ جنگ میں صرف جانیں ہی نہیں، آبروئیں اور عزتیں بھی ملیامیٹ ہو جاتی ہیں۔

"سنبھلو، سنبھلو" دادا شہباز کہا کرتا تھا ــ "سنبھلو شمشیر، جو کچھ ہو کر رہو ــ آخر دو مردوں کے بیٹے بھی تو زندہ ہیں" ــــ

مگر شمشیر کو سنبھلنے کی توفیق ہی کہاں تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے ڈگمگا چکا تھا، اس لٹو کی طرح جو فرش پر گرتا ہے تو ایک جگہ قرار نہیں پا سکتا۔ اس کی لڑک کو جیسے زمین کے اندر سے کوئی چیز اچھال کر پرے پھینک دیتی ہے، اسے کوئی مرکز نہیں ملتا۔ کوئی منزل میسر نہیں آتی ــ سنبھلنے کے لیے فرصت چاہیے، اور شمشیر کے پاس بہت کم فرصت تھی۔ جب کبھی میں محاذِ جنگ سے ایک دو موتوں کی خبر آ جاتی، تو وہ فاتحہ خوانی کے لیے چلا جاتا۔ لوگ امن کے لیے قرآن مجید کے ختم کراتے، تو ان میں شامل ہو جاتا، اور جب پلٹتا تو پٹواری کہتا ــ "امن؟ امن تو صرف ایک لفظ ہے، امن جنگ کا دوسرا نام ہے، اور امن کی جنگ اصلی جنگ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ بنگال کا قحط کیا تھا؟ ـــ یہ امن کی جنگ تھی۔ ہر چیز کی گرانی، یہ امن کی جنگ ہے ــ یہ اغوا اور زنا کے نت نئے شوشے، یہ امن کی جنگ ہے ــــ امن؟ تم امن کے لیے دعائیں مانگتے ہو؟ حالانکہ تم دو صدیوں سے امن کے مزے اڑا رہے ہو، دو صدیوں سے تم اس چپ چاپ جنگ میں مبتلا ہو، ایسی جنگ جو تمہارا خون نہیں بہاتی۔ صرف تمہارے دماغ اور دل کو نچوڑ کر گلے ہوئے چیتھڑے کی طرح پرے پھینک دیتی ہے ـــ ارے یہ کھتونی کہاں گئی؟" ــــ

مگر اب جنگ کی تازہ خبریں حوصلہ افزا ثابت ہو رہی تھیں اور شمشیر بخاری سے بحث کرنے لگا تھا۔ "ارے بھئی امریکی فوج جنرل فلپائن پر اُتر آئی ہے نا ——— جنگ کو ختم سمجھو۔"

"یہ نئی جنگ کی ابتدا ہے۔" وہ کھتونی کو گھٹنے تلے رکھ کر کہتا۔

"روسی برلن میں گھس گئے۔"

"یہ نئی جنگ کی ابتدا ہے۔"

"مسولینی کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔"

"یہ نئی جنگ کی ابتدا ہے۔"

"یورپ میں جنگ ختم ہو گئی۔"

"اب نئی جنگ شروع ہو گی۔"

"جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایک نیا بم گرایا گیا ——— ایٹم بم ——— ذیلدار کہہ رہا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

اُس روز شمشیر کی آنکھیں چمک اُٹھیں، اور ہونٹوں کی پپڑیاں اُچٹ کر رہ گئیں۔ مدت کے بعد اُس نے پھبتی اور مذاق کی طرف توجہ دی۔ "بڑی دیر کے بعد نظر آئے ہو بھئی" اُس نے ایک نوجوان سے کہا۔ "سُناؤ آج کل کونسی گپھا آباد کر رکھی ہے۔"

اور پھر — "ابے کھُل کر قدم اٹھا۔ یوں چل رہا ہے جیسے تہمد کھُل گیا ہو تیرا۔"

ایٹم بم کی خوشی میں اُس روز اُس نے ایک بڑھیا پر بھی حملہ کر دیا۔ "لہنگا سنبھال خالہ، بلاوا دے رہا ہے۔"

بڑھیا پلٹ کر کھڑی ہو گئی اور پھر رو دی۔ "تم سچے ہو شمشیر، تمھارا دلیر واپس آ جائے گا نا ——— اور میرا احمد ——— وہ ادھر تین سال ہوئے مصر میں ——— اور وہ روتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی۔ "تم مجھ سے مذاق کرتے ہو؟ کیوں نہ کرو۔ تمھارا بیٹا جو واپس آ رہا ہے، اور میرا بیٹا ——— میرا بیٹا ——— سر پہ ہاتھ رکھ کر وہ اٹھی، اور اپنے بیٹے کے ماتم کو تازہ کرتی ساری گلی کو چونکاتی چل دی ———

"ارے!" شمشیر نے گلی میں جمع ہوتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا — اُن کے چہروں پر غم اور غصّہ کے آثار تھے، اور وہ سب نفرت سے شمشیر کو گھور رہے تھے ——— "شمشیر نے دوبارہ کہا، اور سر کو دونوں ہاتھوں میں دبا کر وہیں بیٹھ گیا اور بہت دیر تک بیٹھا رہا ———

رات کو چوپال پر لوگ اکٹھے ہوئے، تو ذیلدار نے ایٹم بم کا ذکر چھیڑ دیا۔ "اُس کی طاقت پانچ لاکھ ساٹھ ہزار من بارود کے برابر ہوتی ہے۔ جب ہیروشیما پر بم گرا، تو جو لوگ باہر تھے، وہ وہیں دم توڑ بیٹھے اور جو اندر تھے ——— وہ مارے حبس کے تڑپ پھڑک کر رہ گئے۔ لاشوں کے چہرے تک نہیں پہچانے جا سکتے۔ بم گرا تو سات آٹھ میل اونچا دھوئیں کا مینار اُبھر آیا، ہیروشیما بالکل مٹ چکا ہے۔ پچاس ہزار سے زیادہ جاپانی مر چکے ہیں، ہزاروں ہسپتالوں میں ہیں، ہزاروں کا کچھ پتہ نہیں۔ بس اب جنگ کو ختم سمجھو۔"

"بہت تیری نکٹے ناٹے کی" ایک دہقان بولا۔ "کیسے گرجتا دہاڑتا بڑھا تھا۔ اور کیسے دبوچا انگریز نے"

"نہیں نہیں۔ امریکہ نے" اعتراض ہوا۔

"ابے نہیں۔ انگریز نے"

"امریکہ نے"

"انگریز نے"

"سارے عالمِ انسانیت کی بدبختی اور بدطینتی نے" پٹواری بولا۔ اور سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے "وہ جنگ میں زہریلی گیس استعمال کرنا منع ہے، مگر زہریلی گیس سے لاکھ درجہ خطرناک ایٹم بم استعمال کرنا جائز ہے۔ بھئی بڑے لچکیلے ہیں جنگی اُصول۔ اُس وقت جب ہٹلر نے گیس چھوڑنے کی دھمکی دی تھی تو کانفرنسیں بلائی جانے لگیں۔ کمیٹیاں ہونے لگیں۔ اور اب یہ ایٹم بم"——

ذیلدار کڑک کر بولا "منشی بکواس بند کرو!"

"میں کہتا ہوں" پٹواری تو جیسے دیوانہ ہو گیا تھا۔ "یہ ایٹم بم کوئی نئی چیز تو نہیں، ہم ہندوستانیوں کے لیے تو ایٹم بم کوئی عجوبہ نہیں، بنگال میں کس ایٹم بم نے قحط ڈالا۔ آسام میں کس ایٹم بم نے لڑکیوں کی جوانیاں لوٹیں۔ راجپوتانہ اور پنجاب میں کس ایٹم بم نے بیواؤں اور یتیموں کی فوج کی فوج پیدا کر دی، ہندوستان پر تو پچھلی دو صدیوں سے ایٹم بموں کی بارش ہو رہی ہے اور تم منہ کھولے ہیروشیما کے ایٹم بم کی باتیں یوں سُن رہے ہو، جیسے تمھارے لیے جنت کا دروازہ کھل گیا—— ایٹم بم کی خبریں تم اخباروں میں کیوں پڑھتے ہو۔ قطب دین سے پوچھو، لال بیگ سے پوچھو، نورخاں سے پوچھو، چچا شمشیر سے پوچھو—— اور——"

"بکواس بند کرو میں کہتا ہوں" ذیلدار گرجا اور پٹواری تھر تھر کانپتا چوپال پر سے اٹھ کر چلا گیا۔

"منشی پاگل ہو جائے گا" ایک شخص نے رائے ظاہر کی۔

مگر ذیلدار کی غضب ناک خاموشی کا تقاضا تھا کہ حاضرین بھی خاموش رہیں، کڑی نگاہوں کی گھُرکی نے اس اصول توڑنے والے کو کپکپا کر رکھ دیا تھا۔

اب تو بنت نئی چٹپٹی خبروں کا تانتا بندھ گیا۔

"برطانیہ میں چھ سال کے بعد سب لوگوں نے صحیح معنوں میں چھٹی منائی، جنگ ختم ہو رہی ہے"

"روس نے جاپان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا"

"موئے کو مارے شاہ مدار—— جنگ ختم ہو جائے گی"

"جاپان نے ہتھیار ڈال دیے"

"اللہ بس باقی ہوس—— جنگ ختم ہو گئی—— پتلیاں چمک اٹھیں۔ گالوں پر گلال بھر گئے۔ قیدی اور عدم پتہ جیتوں کی مائیں لاٹھیاں ٹیکتی گلیوں میں آ گئیں۔——

"سچ مچ؟—— سچ سچ؟"——

"ہاں ہاں۔ جنگ ختم ہوگئی، جنگ بالکل ختم ہوگئی۔ اب جنگ نہیں ہوگی۔۔۔ اب جنگ بالکل نہیں ہوگی"
سچ مچ؟۔۔۔ سچ مچ؟"۔۔۔
اتنی بڑی سچائی پر ایمان لانے کے لیے بھی تو شیر کا کلیجہ چاہیے۔
"جنگ ختم ہوگئی شاداں بیٹی" شمشیر گھر جاکر چلایا، اور شیر کو اٹھا کر اس پر بوسوں کی بوچھاڑ کردی۔
"سچ مچ؟"۔۔۔
مگر شاداں کے اس استعجاب میں مسرت کے بجائے صرف حیرت تھی۔
"ارے کوئی یقین نہیں کرتا۔ شیر بیٹا، تیرا ابا اب واپس آجائے گا"
"شچ"؟۔۔۔ ننھے نے بڑی بڑی گول مول آنکھیں پھاڑ کر دادا کو گھورا۔ "تیا لائے دا؟"
"تمھاری سواری کا گھوڑا۔ عید کے لیے کپڑے اور ٹوپیاں اور بوٹ اور چھڑی اور۔۔۔"
"پتاخے"۔۔۔
"ہاں ہاں پٹاخے اور پھلجھڑیاں اور۔۔۔"
"خاک لائے گا"۔۔۔ شاداں نے بگڑ کر کہا۔۔۔
"کیوں؟"۔۔۔ جیسے شاداں نے بوڑھے کا منہ نوچ لیا تھا۔۔۔
"تنخواہ تو ساری مہاجن ہضم کر گیا، وہ تو اپنی جان بچا کر بھی لائے تو شکر کرو خدا کا"۔۔۔ اور اس نے نقرئی چوڑیوں کی گھنگھریاں چھنکائیں اور شیر کو گھسیٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کانٹوں کا وہ گچھا جو دلیر کی قید اور شاداں کی سرد مہری نے اس کے حلق میں ٹھونس رکھا تھا، اچھل کر جیسے اس کے دماغ میں کودنے لگا۔۔۔ مگر اب جنگ ختم ہوچکی تھی، اور اندر ہی اندر گھلنے سے یہی بہتر تھا کہ دلیر کی راہ دیکھی جائے۔۔۔

دو تین ہفتے بعد اسے معلوم ہوا، کہ انگریزوں نے سنگاپور پر دوبارہ قبضہ کرلیا ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ خبریں آنے لگیں، کہ قیدیوں کے جہاز ہندوستان آرہے ہیں۔۔۔ دامن کوہ کے ایک گاؤں کا نوجوان جو سنگاپور میں جاپان کا قیدی رہا، گھر واپس آچکا ہے۔ اس نے ایک روز ہرکارے کی زبانی سنا، اور اسی روز ایک ننھی سی بقچی کاندھے پر لٹکا کر اسی گاؤں کی راہ لی۔ گاؤں والوں نے بھی اپنے اپنے عزیزوں کے نام اور نمبر لکھ کر دیے، اور وہ ایک ذمہ دارانہ حیثیت سے، بالکل پرانے بادشاہوں کے ایلچیوں کی طرح پہاڑ کے دامن کی طرف چلا۔

وہاں جاکر اسے نووارد سپاہی کی زبانی معلوم ہوا، کہ قیدی بے شمار تھے اور انھیں ملایا اور جاوا اور دوسرے جزیروں میں بکھیر دیا گیا تھا۔ اس لیے وہ کوئی یقینی خبر نہیں دے سکتا تھا، مایوس ہوکر گھر کو پلٹا۔
تھکا ماندہ کھانستا کھنکارتا جب وہ اپنے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر پہنچا، تو اس نے کچھ دور پٹواری کو اپنی طرف آتا دیکھا، دیہاتیوں کا ایک جمگھٹ بہت پرے چپ چاپ کھڑا پٹواری کی طرف دیکھ رہا تھا۔
سورج غروب ہونا چاہتا تھا، مگر جیسے شمشیر کے گاؤں میں پہنچ جانے کا منتظر کھڑا تھا۔ دھوپ پیلی پڑ گئی تھی،

درختوں کے پتے اداس اور نڈھال ہو کر بل کھا گئے تھے، کھیتوں پر مرگ کا عالم تھا۔ ٹھکانوں کو جاتے ہوئے پرندوں کی آوازوں میں شیون تھا۔ پگڈنڈی کے لہراتے ہوئے زینے پر ایک گدھا دھول میں نہار رہا تھا۔

"واپس آ گئے چچا؟" پٹواری نے پوچھا۔

"ہاں۔ واپس آ گیا ہوں۔ نامراد"

شمشیر نے کہا "مگر تم کہاں چلے"؟

"میں یہاں سے دور جا رہا ہوں، ہمیشہ کے لیے"

"کیوں؟ خیریت تو ہے نا؟"——

"خیریت"؟— پٹواری کے ہونٹوں پر ایک عجیب زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر وہیں جمٹ کر رہ گئی۔ ——"خیریت امن کی طرح بے معنی لفظ ہے، امن کے لفظ سے معنی نچوڑنے کے لیے ماسکو میں مولوٹاف، برنز اور بیون کی کانفرنس ہونے والی ہے اور تمھیں خیریت کا مطلب سمجھانے کے لیے وہ مجمع تمھارا منتظر کھڑا ہے۔ جاؤ بابا۔ تم جو ہر کسی کا مذاق اڑاتے تھے، تم جو بڑی بڑی خبریں سننے کے شوقین تھے—تم جو ہنسنے ہنسانے کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہ تھے، جاؤ۔ وہاں اُس مجمع میں دادا شہباز سے پوچھو کہ خیریت کیا چیز ہے، اور پھر اپنے گھر جانا، وہاں کہیں طاق پر تمھارے بیٹے کا تار پڑا ہوگا۔ وہ آ رہا ہے"

"دلیر آ رہا ہے؟" شمشیر لپک کر پٹواری سے لپٹ گیا، مگر وہ لوہے کی لاٹھ کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا اور اُسی خوفناک سنجیدگی سے بولا۔ "ہاں واپس آ رہا ہے تمھارا دلیر، سو تم تار اٹھا کر شیر کو پکارنا جسے کل صبح اُس کی ماں نے دلیر کا تار ملنے کے بعد لاہور کے کسی یتیم خانے کے سفیر کے حوالے کر دیا ہے"——

"تار ملنے کے بعد؟"——

"اور پھر پکارنا۔ شاداں۔ شاداں بیٹی۔ تمھاری وہ شاداں بیٹی، جو شاید ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے جانے کی منتظر تھی، جو رات کو تمھارے پڑوسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے بتوں کی طرف"

"کیا کہہ رہے ہو؟"——

"اور پھر تجوری کھول کر وہ روپیہ گننا جو تم نے جنگ کی برکت سے کمایا۔ تمھیں امن اور خیریت کے تمام معانی ازبر ہو جائیں گے"——

وہ شمشیر کے مُردہ ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبا کر بیٹھا، اور پگڈنڈی پر ہو لیا۔ سورج دریا کے پرلے کنارے پر پھیلی ہوئی پہاڑیوں میں ڈوب چکا تھا۔ شفق نے پٹواری کے سفید لباس میں آگ سی لگا دی۔ وہ ایک شعلہ سا بن گیا—— دھرتی کے کلیجے سے نکلتا ہوا شعلہ—— رواں دواں—— رواں دواں—— اور پھر یہ شعلہ بجھنے لگا۔ دھوئیں کا ایک لونبا سا بن گیا، مشرقی افق کی دھند میں گھلتا ہوا یہ سایہ بڑھتا گیا۔ پھیلتا گیا۔ ناپید ہوتا گیا—— اور پھر اُسی افق سے چاند بن کر ابھرا۔ جگمگاتا ہوا، ہنستا ہوا—— جیسے مغرب میں دبکے ہوئے سورج کے تعاقب میں ہے——

ندیم

پرمیشر سنگھ

اختر اپنی ماں سے اچانک یوں بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے۔ ابھی تھا اور ابھی غائب۔ ڈھنڈیا پڑی۔ مگر بس اسی حد تک کہ لٹے پٹے قافلے کے آخری سرے پر ایک ہنگامہ صابن کے جھاگ کی طرح اٹھا اور بیٹھ گیا۔ "کہیں آ ہی رہا ہوگا" کسی نے کہہ دیا "یہ ہزاروں کا قافلہ ہے" اور اختر کی ماں اس تسلی کو تھامے پاکستان کی طرف چلی آئی تھی۔ "آ ہی رہا ہوگا" وہ سوچتی "کوئی تتلی پکڑنے نکل گیا ہوگا اور پھر ماں کو نہ پاکر رویا ہوگا اور پھر . . . اب کہیں آ رہا ہوگا۔ سمجھدار ہے۔ پانچ سال سے کچھ اوپر ہو چلا ہے۔ آجائے گا۔ وہاں پاکستان میں ذرا ٹھکانے سے بیٹھوں گی تو ڈھونڈ لوں گی۔"

لیکن اختر تو سرحد سے کوئی پندرہ میل ادھر یونہی بس کسی وجہ کے بغیر اتنے بڑے قافلے سے کٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے مطابق اس نے تتلی کا تعاقب کیا یا کسی کھیت میں سے گنا توڑنے گیا اور توڑتا رہ گیا۔ بہرحال جب وہ روتا چلاتا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا تو چند سکھوں نے اسے گھیر لیا تھا اور . . . وہ اتنا سہم گیا کہ . . .

. . . . . اور پھر وہ سہم گیا تھا۔

سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے۔ سوائے ایک سکھ کے جس کا نام پرمیشر سنگھ تھا۔ ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے اس کے الجھے ہوئے کیس جھانک رہے تھے اور جوڑا بالکل ننگا ہو رہا تھا۔ بولا "ہنستے کیوں ہو بزدلو! اس بچے کو بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے تمہیں اور تمہارے بچوں کو پیدا کیا ہے۔"

ایک نوجوان سکھ جس نے اب تک کرپان نکال لی تھی، بولا "ذرا ٹھہر پرمیشرے! کرپان اپنا دھرم پورا کرلے، پھر ہم اپنے دھرم کی بات کریں گے۔"

"مارو نہیں یارو!" پرمیشر سنگھ کی آواز میں پکار تھی۔ "اسے مارو نہیں۔ اتنا سا تو ہے، اور پھر بھی واہگورو نے پیدا کیا ہے، جس نے . . ."

"بولو بچے!" ایک اور سکھ بولا۔ پھر اس نے جھک کر اختر کے پاس جا کر کہا "بول! تمہیں کس نے پیدا کیا؟"

خدا نے کہ واہگورو جی نے؟"

اختر نے اس ساری خشکی کو نگلنے کی کوشش کی جو اس کی زبان کی نوک سے لے کر اس کی ناف تک پھیل چکی تھی۔ آنکھیں جھپک کر اس نے آنسوؤں کو گرا دینا چاہا جو ریت کی طرح اس کے پپوٹوں میں کھٹک رہے تھے۔ اس نے پرمیشر سنگھ کو یوں دیکھا جیسے ماں کو دیکھ رہا ہو۔ منہ میں گئے ہوئے ایک آنسو کو تھوک ڈالا اور بولا۔ "پتہ نہیں!"

"لو اور سنو!" کسی نے کہا اور اختر کو گالی دے کر ہنسنے لگا۔

اختر نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ "اماں تو کہتی ہے میں بھوسے کی کوٹھری میں پڑا ملا تھا۔"

سب سکھ ہنسنے لگے۔ مگر پرمیشر سنگھ بچوں کی طرح بلبلا کر کچھ یوں رویا کہ دوسرے سکھ بھونچکا سے رہ گئے اور پرمیشر سنگھ روتی آواز میں جیسے بین کرنے لگا۔ "سب بچے ایک سے ہوتے ہیں یارو۔ میرا کرتارا بھی تو یہی کہتا تھا۔ وہ بھی تو اس کی ماں کو بھوسے کی کوٹھری میں پڑا ملا تھا۔"

کرپان میان میں چلی گئی۔ سکھوں نے پرمیشر سنگھ سے الگ تھوڑی دیر کھسر پھسر کی۔ پھر ایک سکھ آگے بڑھا، بلکتے ہوئے اختر کو پکڑے، وہ چپ چاپ روتے ہوئے پرمیشر سنگھ کے پاس آیا اور بولا۔ "لے پرمیشرے، سنبھال اسے۔ کیس بڑھوا کر اسے اپنا کرتارا بنالے۔ لے پکڑ۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کو یوں جھپٹ کر اٹھا لیا کہ اس کی پگڑی کھل گئی اور کیسوں کی لٹیں لٹکنے لگیں۔ اس نے اختر کو پاگلوں کی طرح چوما۔ اسے اپنے سینے سے بھینچا۔ اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور مسکرا مسکرا کر کچھ ایسی باتیں سوچنے لگا جس نے اس کے چہرے کو چمکا دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دوسرے سکھوں کی طرف دیکھا۔ اچانک وہ اختر کو نیچے اتار کر سکھوں کی طرف لپکا۔ مگر ان کے پاس سے گزر کر دور تک بھاگا چلا گیا۔ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں بندروں کی طرح کودتا اور جھپٹتا رہا اور اس کے کیس اس کی لپک جھپٹ کا ساتھ دیتے رہے۔ دوسرے سکھ حیران کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ پھر وہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھے بھاگا ہوا واپس آیا۔ اس کی بھیگی ہوئی داڑھی میں پھنسے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سرخ آنکھوں میں چمک تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

اختر کے پاس آکر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

"اختر!" — اب کے اختر کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔

"اختر بیٹے!" پرمیشر سنگھ نے بڑے پیار سے کہا۔ "ذرا میری انگلیوں میں سے جھانکو تو۔"

اختر ذرا سا جھک گیا۔ پرمیشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں میں ذرا سی جھری پیدا کی اور فوراً بند کر لی۔ "آہا!" — اختر نے تالی بجا کر اپنے ہاتھوں کو پرمیشر سنگھ کے ہاتھوں کی طرح بند کر لیا اور آنسوؤں میں مسکرا کر بولا۔ "تتلی!"

"لو گے؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا

"ہاں!" اختر نے اپنے ہاتھوں کو ملا۔ "لو" پرمیشر سنگھ نے اپنے ہاتھوں کو کھولا۔ اختر نے تتلی کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ راستہ پاتے ہی اڑ گئی اور اختر کی انگلیوں پر اپنے پروں کے رنگوں کے ذرے چھوڑ گئی۔ اختر اداس ہو گیا اور پرمیشر سنگھ دوسرے سکھوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ "سب بچے ایک سے کیوں ہوتے ہیں یارو؟ کرتارے کی

تتلی بھی اڑ جاتی تھی تو یونہی منہ لٹکا لیتا تھا۔"

"پرمیشر سنگھ تو آدھا پاگل ہو گیا ہے۔" نوجوان سکھ نے ناگواری سے کہا اور پھر سارا گروہ واپس جانے لگا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور جب اسی طرف چلنے لگا جدھر دوسرے سکھ گئے تھے تو اختر پھڑک پھڑک کر رونے لگا۔ "ہم اماں پاس جائیں گے۔ اماں پاس جائیں گے۔" پرمیشر سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھپکنے کی کوشش کی، مگر اختر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ نے کہا کہ "ہاں بیٹے، تمہیں تمہاری اماں پاس ہی لیے چلتا ہوں۔" تو اختر چپ ہو گیا۔ صرف کبھی کبھی سسک لیتا تھا اور پرمیشر سنگھ کی تھپکیوں کو بڑی ناگواری سے برداشت کرتا جا رہا تھا۔

پرمیشر سنگھ اسے اپنے گھر میں لے آیا۔ پہلے یہ کسی مسلمان کا گھر تھا۔ لٹا پٹا پرمیشر سنگھ جب ضلع لاہور سے ضلع امرتسر آیا تھا تو گاؤں والوں نے اسے یہ مکان الاٹ کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی سمیت جب اس چار دیواری میں داخل ہوا تھا تو ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں اور وہ بڑی پراسرار سرگوشی میں بولا تھا۔ "یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

گرنتھی جی اور گاؤں کے دوسرے لوگ ہنس پڑے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی نے انھیں پیچھے سے بتا دیا تھا کہ کرتار سنگھ کے بچھڑنے ہی سے کچھ ہو گیا ہے۔ "جانے کیا ہو گیا ہے اسے!" اس نے کہا تھا۔ "واہگورو جی جھوٹ نہ بلوائیں تو دن میں کوئی دسیوں بار تو یہ کرتار سنگھ کو گڑھوں کی طرح پیٹ ڈالتا تھا اور جب کرتار سنگھ بچھڑا تھا تو بس۔ تو خیر وہ ہونی تھی پر اس کے رونے سے بھی جی ہلکا نہیں ہوا۔ وہاں مجال ہے جو بیٹی امر کور کو میں بھی ذرا غصے سے دیکھ لیتی، بھڑ جاتا تھا۔ کہتا تھا، بیٹی کو برا مت کہو۔ بیٹی بڑی مسکین ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسافر ہے بے چاری، ہمارے گھر دو دن سستانے بیٹھ گئی ہے، وقت آئے گا تو چلی جائے گی۔" .... اور اب امر کور سے ذرا سا بھی قصور ہو جائے تو آپے ہی میں نہیں رہتا۔ یہاں تک بک دیتا ہے کہ "بیٹیاں بیویاں اغوا ہوتی سنی تھیں یارو، یہ نہیں سنا تھا کہ پانچ چھ برس کے بیٹے بھی اٹھ جاتے ہیں۔"

وہ ایک مہینے سے اس گھر میں مقیم تھا مگر ہر رات اس کا معمول تھا کہ پہلے سوتے میں بے تحاشا کروٹیں بدلتا۔ پھر بڑبڑانے لگتا اور پھر اٹھ بیٹھتا۔ بڑی ڈری ہوئی سرگوشی میں بیوی سے کہتا۔ "سنتی ہو، یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے"! بیوی اسے محض "اونہہ" سے ٹال کر سو جاتی تھی۔ مگر امر کور کو اس سرگوشی کے بعد رات بھر نیند نہ آتی تھی۔ اسے اندھیرے میں بہت سی پرچھائیاں ہر طرف قرآن پڑھتی نظر آتی تھیں اور جب ذرا سی پو پھوٹتی تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتی تھی۔ وہاں ضلع لاہور میں ان کا گھر مسجد کے پڑوس ہی میں تھا اور جب صبح اذان ہوتی تھی تو کیسا مزا آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورب سے پھوٹتا اجالا گانے لگا ہے۔

پرمیشر سنگھ آنگن میں داخل ہوا تو آج خلاف معمول اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے کھلے کیس کنگھے سمیت اس کی پیٹھ اور ایک کندھے پر بکھرے ہوئے تھے، اور اس کا ایک ہاتھ اختر کی کمر کو تھپکے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی

ایک طرف بیٹھی چھاج میں گندم پھٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے اور وہ ٹکر ٹکر پرمیشر کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ چھاج پرے کو دھکیلتی ہوئی آئی اور بولی۔ "یہ کون ہے؟"

پرمیشر سنگھ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ "ڈرو نہیں، بے وقوف، اس کی عادتیں بالکل کرتارے کی سی ہیں۔ یہ بھی اپنی ماں کو بھوسے کی کوٹھری میں ملا تھا۔ یہ بھی تتلیوں کا عاشق ہے۔ اس کا نام اختر ہے۔"

"اختر!" بیوی کے تیور بدل گئے۔

"تم اسے اختر سنگھ کہہ لینا۔" پرمیشر سنگھ نے وضاحت کی۔ "اور پھر کیسوں کا کیا ہے، دنوں میں بڑھ آتے ہیں۔ کڑا اور کچھیرا پہنا دو، کنگھا کیسوں کے بڑھتے ہی لگ جائے گا۔"

"پر یہ ہے کس کا؟" بیوی نے مزید وضاحت چاہی۔

"کس کا ہے!" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر سے اتار کر زمین پر کھڑا کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "واہگورو جی کا ہے، ہمارا اپنا ہے۔ اور پھر یارو، یہ عورت اتنا بھی نہیں دیکھ سکتی کہ اختر کے ماتھے پر جو یہ ذرا سا تل ہے، کرتارے کے بھی ایک تل تھا اور یہیں تھا۔ ذرا بڑا تھا۔ پر ہم اسے یہیں تل پر ہی تو چومتے تھے اور یہ اختر کے کانوں کی لویں گلاب کے پھولوں کی طرح گلابی تو ہیں یارو۔ یہ عورت یہ تک نہیں سوچتی کہ کرتارے کے کانوں کی لویں بھی تو ایسی ہی تھیں۔ یہ ذرا پتلی ہیں اور ...."

اختر اب تک مارے حیرت کے بیٹھا تھا۔ "ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم اماں پاس جائیں گے۔ اماں پاس۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیوی کی طرف بڑھایا۔ "اری لو۔ یہ اماں پاس جاتا ہے۔"

"تو جائے۔" بیوی کے چہرے اور آنکھوں میں آسیب آ گیا تھا جسے پرمیشر سنگھ اپنی آنکھوں اور چہرے میں سے نوچ کر باہر کھیتوں میں جھٹک آیا تھا۔ "ڈاکہ ڈالنے گیا تھا سورما اور اٹھا لایا یہ ہاتھ بھر کا لونڈا۔ ارے کوئی لڑکی ہی اٹھا لاتا تو ہزار دو ہزار میں نہ سہی، ایک دو سو میں تو بک جاتی۔ اس اجڑے گھر کا کھاٹ کھٹولہ بن جاتا اور پھر ... پگلے ... تجھے تو کچھ ہو گیا ہے۔ دیکھتے نہیں یہ لڑکا مسلا ہے۔ جہاں سے اٹھا لائے ہو وہیں ڈال آؤ اور خبردار جو اس نے میرے چوکے میں پاؤں رکھا۔"

پرمیشر سنگھ نے التجا کی۔ "کرتارے اور اختر کو ایک ہی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے، سمجھیں؟"

"نہیں" اب کے بیوی چیخ اٹھی۔ "میں نہیں سمجھی اور نہ سمجھنا چاہتی ہوں۔ میں رات ہی رات جھٹکا کر ڈالوں گی اس کا۔ کاٹ کے پھینک دوں گی۔ اٹھا لایا وہاں سے۔ لے جا اسے، پھینک دے باہر۔"

"تمہیں نہ پھینک دوں باہر؟" اب کے پرمیشر سنگھ بگڑ گیا۔ "تمہارا نہ کر ڈالوں گا جھٹکا؟" وہ بیوی کی طرف بڑھا اور بیوی اپنے سینے کو دو ہتڑوں سے پیٹتی، چیختی چلاتی بھاگی۔ پڑوس سے ملکور دوڑی آئی۔ اس کے پیچھے گلی کی دوسری عورتیں بھی آ گئیں۔ مرد بھی جمع ہو گئے اور پرمیشر سنگھ کی بیوی پٹنے سے بچ گئی۔ پھر سب نے سمجھایا کہ نیک کام ہے۔ ایک مسلمان کو سکھ بنانا معمولی کام نہیں۔ پرانا زمانہ ہوتا تو پرمیشر سنگھ اب تک گورو مشہور ہو چکا ہوتا۔ بیوی کی ڈھارس بندھی مگر امر کور ایک کونے میں بیٹھی گھٹنوں میں سر دیئے روتی رہی۔ اچانک پرمیشر سنگھ کی گرج نے سارے

ہجوم کو ہلا دیا۔ "اختر کدھر گیا؟" وہ چنگھاڑا۔

"ارے وہ کہاں گیا ہمارا اختر۔ ارے وہ تم میں سے کسی قصائی کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا یارو۔ اختر! اختر!"

وہ چیختا ہوا مکان کے کونوں کھدروں میں جھانکتا ہوا باہر نکل گیا۔ بچے مارے دلچسپی کے اس کے تعاقب میں تھے۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ گئی تھیں اور پرمیشر سنگھ گلیوں میں سے باہر کھیتوں میں نکل گیا۔ "ارے میں تو اسے ماں پاس لے چلتا یارو۔ ارے وہ گیا کہاں۔ اختر! ارے اختر!"

"میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔" پگڈنڈی کے ایک موڑ پر گیان سنگھ کے گنے کے کھیت کی آڑ سے روتے ہوئے اختر نے پرمیشر سنگھ کو ڈانٹ دیا۔ "تم تو سکھ ہو۔"

"ہاں بیٹے۔ سکھ تو ہوں۔" پرمیشر سنگھ نے جیسے مجبور ہو کر اعتراف کر لیا۔

"تو پھر ہم نہیں آئیں گے۔" اختر نے بڑے آنسوؤں کو پونچھ کر آنسوؤں کے ریلے آہستہ صاف کیا۔

"نہیں آؤ گے؟" پرمیشر کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

"نہیں!"

"نہیں آؤ گے؟"

"نہیں! نہیں!"

"کیسے نہیں آؤ گے۔" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کان سے پکڑا اور پھر نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اس کے منہ پر چٹاخ سے ایک تھپڑ مار دیا۔ "چلو!" وہ گرجا۔

اختر یوں سہم گیا جیسے ایک دم اس کا سارا خون نچڑ کر رہ گیا۔ پھر وہ ایکا ایکی زمین پر گر کر ہاتھ پاؤں پٹخنے لگا اور بلک بلک کر رونے لگا۔

"نہیں چلتا، میں نہیں چلتا۔ تم سکھ ہو۔ میں سکھوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں اپنے ابا کے پاس جاؤں گا۔ میں تمہیں ماروں گا۔"

اور جیسے اب پرمیشر سنگھ کے سہنے کی باری تھی۔ اس کا بھی سارا خون نچڑ کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں جکڑ لیا۔ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور پھر ایک دم زور سے رو کر کھیت کی پہلی مینڈھ پر آتے ہوئے چند پڑوسی اور ان کے بچے بھی سہم کر رہ گئے اور ٹھٹک گئے۔ پرمیشر گھٹنوں کے بل اختر کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچوں کی طرح یوں سسک سسک کر رونے لگا کہ اس کا نچلا ہونٹ بھی بچوں کی طرح لٹک گیا، اور پھر بچوں کی سی آواز میں بولا۔ "مجھے معاف کر دے اختر۔ مجھے تمہارے خدا کی قسم، میں تمہارا دوست ہوں۔ تم یہاں سے اکیلے جاؤ گے تو کوئی تمہیں مار دے گا۔ پھر تمہاری ماں پاکستان سے آکر مجھے مارے گی۔ میں خود جا کر تمہیں پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ سنا؟ سن رہے ہو نا؟ پھر وہاں سے تمہیں ایک لڑکا مل جائے نا، کرتارا نام کا، تو تم اسے وہاں سے ادھر اس گاؤں میں چھوڑ جانا۔ اچھا؟"

"اچھا!" اختر نے الٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پرمیشر سنگھ سے سودا کر لیا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر اٹھا لیا اور چلا، مگر ایک ہی قدم اٹھا کر رک گیا۔ سامنے بہت سے بچے

اور چند پڑوسی کھڑے اس کی تمام حرکات دیکھ رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کا ایک پڑوسی بولا۔ "رونے کیوں ہو پرمیشر سے۔ کل ایک مہینے کی تو بات ہے۔ ایک مہینے میں اس کے کیس بڑھ آئیں گے تو بالکل کرتارا لگے گا۔"

یہ کہے بغیر وہ تیز قدم اٹھانے لگا۔ پھر ایک جگہ رک کر اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آنے والے پڑوسیوں کی طرف دیکھا۔ "تم سب ظالم ہو یارو۔ اختر کو کرتارا بناتے ہو۔ اور ادھر کوئی کرتارے کو اختر بنائے تو؟ اسے ظالم ہی کہو گے نا!"

پھر اس کی آواز میں گرج آ گئی۔ "یہ لڑکا مسلمان ہی رہے گا۔ دربار صاحب کی سوں! میں کل ہی امرتسر جا کر اس کے انگریزی بال بنوا لاؤں گا۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ خالصہ ہوں۔ سینے میں شیر کا دل رکھتا ہوں، مرغی کا نہیں!"

پرمیشر سنگھ اپنے گھر میں داخل ہو کر ابھی اپنی بیوی اور بیٹی کو اختر کی مدارات کے سلسلے میں احکام ہی دے رہا تھا کہ گاؤں کا گرنتھی سردار سنتوکھ سنگھ اندر آیا اور بولا۔ "پرمیشر سنگھ!"

"جی!" پرمیشر سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔ گرنتھی جی کے پیچھے اس کے سب پڑوسی بھی تھے۔

"دیکھو!" گرنتھی جی نے بڑے دبدبے سے کہا۔ "کل سے یہ لڑکا خالصے کی سی پگڑی باندھے گا، کڑا پہنے گا، دھرم شالہ آئے گا اور اسے پرشاد کھلایا جائے گا۔ اس کے کیسوں کو قینچی نہیں چھوئے گی۔ نہیں مانو گے تو کل ہی سے یہ گھر خالی کر دو۔ سمجھے؟"

"جی!" پرمیشر سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں!" گرنتھی جی نے آخری ضرب لگائی۔

"ایسا ہی ہوگا۔ گرنتھی جی۔" پرمیشر سنگھ کی بیوی بولی۔ "پہلے ہی رات راتوں کو گھر کے کونے کونے سے کوئی چیز قرآن پڑھتی سنائی دیتی ہے۔ لگتا ہے پہلے جنم میں ہمارا رہ چکا ہے۔ امر کور بیٹی نے تو جب سے یہ سنا ہے کہ ہمارے گھر میں مسلا چھوکرا آیا ہے تو بیٹھی رو رہی ہے۔ کہتی ہے کہ گھر پر کوئی اور آفت آئے گی۔ پرمیشر سے نے آپ کا کہا نہ مانا تو میں بھی دھرم شالہ میں چلی آؤں گی اور امر کور بھی۔ پھر یہ پڑا اس چھوکرے کو پالتے رہیں اکیلا۔ واہگورو جی کا بھی لحاظ نہیں!"

"واہگورو جی کا لحاظ کون نہیں کرتا گرنتھی جی۔" پرمیشر سنگھ نے گرنتھی جی کی بات کا غصہ بیوی پر نکالا۔ پھر وہ دیر تک زیر لب گالیاں دیتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر گرنتھی جی کے سامنے آ گیا۔

"اچھا جی۔ اچھا!" اس نے کہا، اور کچھ یوں کہا کہ گرنتھی جی پڑوسیوں کے ساتھ فوراً رخصت ہو گئے۔

چند ہی دنوں میں اختر کو دوسرے سکھ لڑکوں سے پہچاننا مشکل ہو گیا۔ وہی ذرا ذرا کانوں تک کس کر بندھی ہوئی پگڑی، وہی ہاتھ کا کڑا، ورد ہی کچھیرا۔ صرف جب وہ گھر میں آ کر پگڑی اتارتا تھا تو اس کے غیر سکھ ہونے کا راز کھلتا تھا۔ لیکن اس کے بال دھڑا دھڑ بڑھ رہے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی ان بالوں کو چھو کر بہت خوش ہوتی تھی۔ "ذرا ادھر آ امر کور، اے یہ دیکھ، کیس بن رہے ہیں۔ پھر ایک دن جوڑا بنے گا۔ کنگھا لگے گا اور اس کا نام رکھا جائے گا کرتار سنگھ!"

"نہیں ماں۔" امر کور وہیں سے جواب دیتی۔ "جیسے واہگورو جی ایک ہیں اور گرنتھ صاحب ایک ہیں اور چاند ایک ہے اسی طرح کرتار بھی ایک ہی ہے۔ میرا ننھا منا بھائی کرتار۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اور مچل مچل کر کہتی ہیں

اس کھلونے سے نہیں بہلوں گی - ماں میں جانتی ہوں - یہ مُسلا ہے اور جو کرتارا ہوتا ہے وہ مُسلا نہیں ہوتا۔"

"میں کب کہتی ہوں کہ یہ سچ مچ کا کرتارا ہے - میرا چاند سا لاڈلا بچہ۔"!

پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی رو دیتی - دونوں اختر کو اکیلا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتیں - خوب خوب روتیں ایک دوسرے کو تسلیاں دیتیں اور پھر زار زار رونے لگتیں - وہ اپنے کرتارے کے لیے روتیں - اختر چند روز اپنی ماں کے لیے روتا رہا اب کسی اور بات پر روتا - جب پرمیشر سنگھ شرنارتھیوں کی امدادی پنچایت سے کچھ غلہ یا کپڑا لے کر آتا تو اختر بھاگ کر جاتا اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور رو رو کر کہتا - "میرے سر پہ پگڑی باندھو پرمیشرا! میرے کیس بڑھا دو - مجھے کنگھا خرید دو۔"

پرمیشر سنگھ اسے سینے سے لگا لیتا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا - "یہ سب ہو جائے گا بیٹے سب کچھ ہو جائے گا - بس ایک بات نہیں ہوگی - وہ بات کبھی نہیں ہوگی - وہ نہیں ہوگا مجھ سے سمجھے؟ یہ کیس ویس سب بڑھ جائیں گے۔"

اختر اپنی ماں کو اب بہت کم یاد کرتا تھا - جب تک پرمیشر سنگھ گھر میں رہتا وہ اس سے چمٹا رہتا - اور جب وہ کہیں باہر جاتا تو اختر اس کی بیوی اور امر کور کی طرف یوں دیکھتا رہتا جیسے ان سے صرف ایک پیار کی بھیک مانگ رہا ہو - پرمیشر سنگھ کی بیوی اسے نہلاتی - اس کے کپڑے دھوتی اور پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے رونے لگتی اور روتی رہ جاتی - البتہ امر کور نے اختر کی طرف جب بھی دیکھا ناک اچھال دی - شروع شروع میں تو اس نے اختر کو ایک دھموکا بھی جڑ دیا تھا - مگر جب اختر نے پرمیشر سنگھ سے اس کی شکایت کی تو پرمیشر سنگھ بپھر گیا اور امر کور کو بڑی گندی گندی گالیاں دیں - امر کور کی طرف یوں بڑھا کہ اگر اس کی بیوی راستے میں اس کے پاؤں نہ پڑ جاتی تو وہ بیٹی کو اٹھا کر دیوار پر سے گلی میں پٹخ دیتا - "الو کی پٹھی" اس روز اس نے کڑک کر کہا تھا۔

"سنتا تو تھا کہ لڑکیاں ٹھہری ہیں ہم پر یہ مسٹنڈی ہمارے ساتھ لگی چلی آئی اور اٹھ گیا تو پانچ سال کا لڑکا جسے ابھی اچھی طرح ناک تک پونچھنا نہیں آتا - عجب اندھیر ہے یارو!" - اس واقعے کے بعد امر کور نے اختر پر ہاتھ تو کبھی نہ اٹھایا مگر اس کی نفرت دو چند ہو گئی تھی۔

ایک روز اختر کو تیز بخار آ گیا - پرمیشر سنگھ وید کے پاس چلا گیا اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد اس کی بیوی پڑوسن سے پسی ہوئی سونف مانگنے چلی گئی - اختر کو پیاس لگی - "پانی" اس نے کہا - پھر کچھ دیر بعد اس نے لال لال سوجی سوجی آنکھیں کھولیں - ادھر ادھر دیکھا اور "پانی" کا لفظ ایک کراہ بن کر اس کے حلق سے نکلا - کچھ دیر بعد وہ لحاف کو ایک طرف جھٹک کر اٹھ بیٹھا - امر کور سامنے دہلیز پر بیٹھی کھجور کے پتوں سے چنگیر بنا رہی تھی - "پانی دے!" اختر نے اسے ڈانٹا - امر کور نے بھنویں سکیڑ کر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کام میں جٹ گئی - اب کے اختر چلا دیا - "پانی دیتی ہے کہ نہیں - پانی دے ورنہ ماروں گا۔" امر کور نے اب کے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں - بولی "مار تو سہی - تو کرتارا تو نہیں کہ میں تیری مار سہ لوں گی - میں تو تیری بوٹی بوٹی کر ڈالوں گی۔" اختر بلک بلک کر رو دیا اور آج مدت کے بعد اس نے اپنی ماں کو یاد کیا - پھر جب پرمیشر سنگھ دوا لے آیا اور اس کی بیوی بھی پسی ہوئی سونف لے کر آ گئی تو دیکھا روتے روتے بُری حالت بنا لی تھی اور وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا - "ہم تو اب اماں پاس چلیں گے - یہ امر کور سورنی بچی تو پانی بھی نہیں پلاتی - ہم تو اماں پاس

جائیں گے۔" پرمیشر سنگھ نے امر کور کی طرف غصے سے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی اور اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔ "کیوں پانی پلاؤں؟ کرتارا بھی تو اسی طرح پانی مانگ رہا ہوگا کسی سے۔ کسی کو اس پر ترس نہ آئے تو ہمیں کیوں ترس آئے اس پر؟ ہاں؟"——

پرمیشر سنگھ اختر کی طرف بڑھا اور اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی تو تمھاری ماں ہے بیٹے!"

"نہیں!" اختر بڑے غصے میں بولا۔ "یہ تو سکھ ہے۔ میری ماں تو پانچ وقت نماز پڑھتی ہے اور بسم اللہ کہہ کر پانی پلاتی ہے۔"

پرمیشر سنگھ کی بیوی جلدی سے ایک پیالہ بھر کر لائی، تو اختر نے دیوار سے دے مارا اور چلایا۔ "تمھارے ہاتھ سے نہیں پئیں گے، تم تو امر کور سور کی بچی کی اماں ہو۔ ہم تو پرموں کے ہاتھ سے پئیں گے۔"

"یہ بھی تو مجھ سور کی بچی کا باپ ہے۔" امر کور نے جل کر کہا۔

"تو ہوا کرے!" اختر بولا۔ "تمھیں اس سے کیا؟"

پرمیشر سنگھ کے چہرے پر عجیب کیفیتیں دھوپ چھاؤں سی پیدا کر گئیں۔ وہ اختر کے مطالبے پر مسکرایا بھی اور رو بھی دیا۔ پھر اس نے اختر کو پانی پلایا۔ اس کے ماتھے کو چوما۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بستر پر لٹا کر اس کے سر کو ہولے ہولے کھجاتا رہا اور کہیں شام کو جا کر اس نے پہلو بدلا۔ اس وقت اختر کا بخار اتر چکا تھا اور وہ بڑے مزے سے سو رہا تھا۔

آج بہت عرصے کے بعد پرمیشر سنگھ بھڑک اٹھا اور نہایت آہستہ سے بولا۔ "ارے سنتی ہو؟ سن رہی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

بیوی نے تو پرمیشر سنگھ کی پرانی عادت کہہ کر ٹال دیا تھا، پھر ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی اور امر کور کی کھاٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے ہولے ہولے آہستہ سے ہلا کر بولی۔ "بیٹی!"

"کیا ہے ماں؟" امر کور چونک اٹھی۔

اور اس نے سرگوشی کی۔ "سنو تو، سچ مچ کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

یہ ایک ثانیے کا سناٹا بڑا خوفناک تھا۔ امر کور کی چیخ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔ اور پھر اختر کی چیخ خوفناک تھی——

"کیا ہوا بیٹا؟" پرمیشر تڑپ کر اٹھا اور اختر کی کھاٹ پر جا کر اسے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا۔ "ڈر گئے بیٹا؟"

"ہاں!" اختر لحاف میں سے منہ نکال کر بولا۔ "کوئی چیز چیخی تھی۔"

"امر کور چیخی تھی۔" پرمیشر سنگھ نے کہا۔ "ہم سب یوں سمجھے جیسے کوئی چیز یہاں قرآن پڑھ رہی ہے۔"

"میں پڑھ رہا تھا!" اختر بولا۔

اب کے بیٹی امر کور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

بیوی نے جلدی سے چراغ جلا دیا اور امر کور کی کھاٹ پر بیٹھ کر وہ دونوں اختر کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ابھی

دھواں بن کر روزن کی جھریوں میں سے باہر اڑ جائے گا اور باہر سے ایک ڈراؤنی آواز آئے گی ــ "میں جن ہوں، میں کل رات پھر قرآن پڑھوں گا۔"

"کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

"پڑھوں؟" اختر نے پوچھا۔

"ہاں ہاں!" پرمیشر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا:

اور اختر قل ھو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفواً احد پہ پہنچ کر اس نے اپنے گریبان میں پھونکی اور پھر پرمیشر سنگھ کی طرف مسکرا کر دیکھتا ہوا بولا ــ "تمہارے سینے پر بھی پھونک کر دوں؟"

"ہاں ہاں!" پرمیشر سنگھ نے گریبان کا بٹن کھول دیا اور اختر نے پھونک کر دی۔

اب کے امر کور نے بڑی مشکل سے چیخ پر قابو پایا۔

پرمیشر سنگھ بولا ــ "کیا نیند نہیں آتی تھی؟"

"ہاں!" اختر بولا ــ "اماں یاد آ گئی ــ اماں کہتی ہے نیند نہ آئے تو تین بار قل ھو اللہ پڑھو، نیند آ جائے گی، اب آ رہی تھی پر امر کور نے ڈرا دیا۔"

"پھر سے پڑھ کر سو جاؤ۔" پرمیشر سنگھ نے کہا۔ روز پڑھا کرو۔ اونچے اونچے پڑھا کرو۔ اسے بھولنا نہیں ورنہ تمہاری اماں تمہیں مارے گی۔ لو اب سو جاؤ۔" اس نے اختر کو لٹا کر اسے لحاف اڑھا دیا۔ پھر چراغ بجھانے کے لیے بڑھا تو امر کور پکارتی ــ "نہیں ــ نہیں ــ بابا ــ بجھاؤ نہیں، ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے" ــ پرمیشر سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا ــ "کس سے ڈر لگتا ہے؟"

"جلتا رہے کیا ہے؟" ــ بیوی بولی

اور پرمیشر سنگھ دیا بجھا کر ہنس دیا ــ "پگلیاں" وہ بولا ــ "گدھیاں"۔

رات کے اندھیرے میں اختر آہستہ آہستہ قل ھو اللہ پڑھتا رہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ ذرا ذرا سے خراٹے لینے لگا پرمیشر سنگھ بھی سو گیا اور اس کی بیوی بھی ــ مگر امر کور رات بھر کچی نیند میں "پڑوس" کی مسجد کی اذان سنتی رہی اور ڈرتی رہی۔

اب اختر کے اچھے خاصے کیس بڑھ آئے تھے۔ ننھے سے جوڑے میں کنگھا بھی اٹک جاتا تھا۔ گاؤں والوں کی طرح پرمیشر سنگھ کی بیوی اسے کرپا رکھنے لگی تھی اور اس سے خاصی شفقت سے پیش آتی تھی ــ مگر امر کور اختر کو یوں دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی بہروپیا ہے اور ابھی پگڑی اور کیس اتار کر پھینک دے گا اور قل ھو اللہ پڑھتا ہوا غائب ہو جائے گا۔

ایک دن پرمیشر سنگھ بڑی تیزی سے گھر آیا اور ہانپتے ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا ــ "وہ کہاں ہے؟"

"کون؟ امر کور؟"

"نہیں ــــ

"کرتارا؟"

"نہیں" پھر کچھ سوچ کر بولا "ہاں ہاں وہی کرتارا؟"

"باہر کھیلنے گیا ہے۔ گلی میں ہوگا"

پرمیشر سنگھ واپس لپکا۔ گلی میں جاکر بھاگنے لگا۔ باہر کھیتوں میں جاکر اس کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ پھر اُسے دور سے گیان سنگھ کے گنّے کی فصل کے پاس چند بچے کبڈّی کھیلتے نظر آئے۔ کھیت کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ اختر نے ایک لڑکے کو گھٹنے تلے دے رکھا ہے۔ لڑکے کے ہونٹوں سے خون پھوٹ رہا ہے۔ مگر کبڈّی کبڈّی کی رٹ جاری ہے۔ پھر اس لڑکے نے جیسے ہار مان لی اور جب اختر کی گرفت سے چھوٹا تو بولا "کیوں بے کرتارا! تم نے میرے منہ پر گھٹنا کیوں مارا؟"

"اچھا کیا جو مارا" اختر اکڑ کر بولا اور بکھرے ہوئے جوڑے کی لٹیں سنبھال کر ان میں کنگھا پھنسانے لگا۔

"تمھارے رسول نے تمھیں یہی سمجھایا ہے؟" لڑکے نے طنز سے پوچھا۔

اختر ایک لمحے کے لیے چکرا گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا "اور کیا تمھارے گرو نے تمھیں یہی سمجھایا ہے؟"

"مُسلّا" لڑکے نے اسے گالی دی۔

"سکھڑا" اختر نے اسے گالی دی۔

سب لڑکے اس پر ٹوٹ پڑے۔ مگر پرمیشر سنگھ کی ایک ہی کڑک سے میدان صاف تھا۔ اس نے اختر کی پگڑی باندھی اور اسے ایک طرف لے جاکر بولا "سنو بیٹے میرے پاس رہوگے کہ اماں کے پاس جاؤ گے؟"

اختر کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ کچھ دیر پرمیشر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ پھر مسکرانے لگا اور بولا "اماں پاس جاؤں گا"

"اور میرے پاس نہیں رہوگے؟" پرمیشر سنگھ کا رنگ یوں سرخ ہوگیا جیسے وہ رو دے گا۔

"تمھارے پاس بھی رہوں گا" اختر نے معمے کا حل پیش کر دیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور وہ آنسو جو مایوسی نے آنکھوں میں جمع کیے تھے، خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے۔ وہ بولا "دیکھو بیٹے اختر بیٹے۔ آج یہاں فوج آرہی ہے۔ یہ فوجی تمھیں مجھ سے چھیننے آرہے ہیں۔ سمجھے؟ کہیں چھپ جاؤ، پھر جب وہ چلے جائیں نا تو میں تمھیں لے آؤں گا"

پرمیشر سنگھ کو دور غبار کا ایک بگولا پھیلتا ہوا دکھائی دیا۔ مینڈھ پر چڑھ کر اس نے لمبے ہوتے ہوئے بگولے کو غور سے دیکھا اور اچانک تڑپ کر بولا "فوجیوں کی لاری آگئی" وہ مینڈھ پر سے کود پڑا اور گنے کے کھیت کا پورا چکر کاٹ گیا "گیانے! او گیان سنگھ!" وہ چلّایا۔ گیان سنگھ فصل کے اندر سے نکل کر آیا۔ اس کے ہاتھ میں درانتی اور دوسرے ہاتھ میں تھوڑی سی گھاس تھی۔ پرمیشر سنگھ اسے الگ لے گیا۔ اسے کوئی بات سمجھائی۔ پھر دونوں اختر کی طرف آئے۔ گیان سنگھ نے فصل سے ایک گنا توڑ کر درانتی سے اس کے پتے کاٹے اور اسے اختر کے حوالے کرکے بولا "آؤ بھئی کرتارے۔ تم میرے پاس بیٹھ کر گنا چوسو۔ جب تک فوجی چلے جائیں گے۔ اچھا

خاصا بنا بنایا خالصہ تھیا رہے آتے ہیں۔ اونہہ!" پرمیشر سنگھ نے اختر سے چلنے کی اجازت مانگی "میں جاؤں؟"

اور اختر نے دانتوں میں گنے کا لمبا سا چھلکا جکڑتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ اجازت پا کر پرمیشر سنگھ گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔ بگولہ گاؤں کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔

گھر جا کر اس نے بیوی اور بیٹی کو سمجھایا۔ پھر بھاگم بھاگ گرنتھی جی کے پاس گیا۔ ان سے بات کر کے ادھر ادھر دوسرے لوگوں کو سمجھاتا پھرا اور جب فوجیوں کی لاری دھرم شالہ سے ادھر کھیت میں رک گئی تو سب فوجی، ور پیس والے گرنتھی جی کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ علاقے کا نمبردار بھی تھا۔ مسلمان لڑکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی رہی . . . . گرنتھی جی نے گرنتھ صاحب کی قسم کھا کر کہہ دیا کہ اس گاؤں میں کوئی مسلمان لڑکی نہیں ہے" "اور لڑکے کی بات دوسری ہے" کسی نے پرمیشر سنگھ کے کان میں سرگوشی کی اور آس پاس کے سکھ پرمیشر سنگھ سمیت زیر لب مسکرانے لگے۔ پھر ایک فوجی افسر نے گاؤں والوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ اس نے اس ہنگامے کا ذکر کیا جو ان ماؤں کے دلوں میں ان دنوں ٹیسیں بن کر رہ گیا تھا، جن کی بیٹیاں چھین گئی تھیں اور ان بھائیوں اور شوہروں کے پیار کی بڑی دردناک تصویر کھینچی جن کی بہنیں اور بیویاں ان سے چھین لی گئی تھیں۔ "اور مذہب کیا ہے دوستو!" اس نے کہا تھا۔ "دنیا کا ہر مذہب انسان کو انسان بننا سکھاتا ہے اور تم مذہب کا نام لے کر انسانوں کو انسانوں سے چرا لیتے ہو، ان کی آبرو بگاڑتے ہو۔ ہم سکھ ہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہم واہگورو جی کے چیلے ہیں، ہم رسولؐ کے غلام ہیں۔"

تقریر کے بعد مجمع چھٹنے لگا۔ فوجیوں کے افسر نے گرنتھی جی کا شکریہ ادا کیا اور ان سے ہاتھ ملایا اور لاری چلی گئی۔

سب سے پہلے گرنتھی جی نے پرمیشر سنگھ کو مبارکباد دی پھر دوسرے لوگوں نے پرمیشر سنگھ کو گھیر لیا اور اسے مبارکبادیں دینے لگے۔ لیکن پرمیشر سنگھ لاری کے آنے سے پہلے جو اس باختہ ہو رہا تھا تو اب لاری کے جانے کے بعد لٹا لٹا سا لگ رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں میں سے نکل کر گیان سنگھ کے کھیت میں آیا۔ اختر کو کندھے پر بٹھا کر گھر لے آیا۔ کھانا کھلانے کے بعد اسے کھاٹ پر لٹا کر کچھ یوں تھپکا کہ اسے نیند آ گئی۔ پرمیشر سنگھ دیر تک اختر کی کھاٹ پر بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی داڑھی کھجاتا اور ادھر ادھر دیکھ کر پھر سے سوچ میں ڈوب جاتا۔ پڑوس کی چھت پر کھیلتا ہوا ایک بچہ اچانک ایڑی پکڑ کر بیٹھ گیا اور زار زار رونے لگا۔ "ہائے اتنا بڑا کانٹا اتر گیا پورے کا پورا" وہ چلایا اور پھر اس کی ماں ننگے سر اوپر بھاگی۔ اسے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ پھر نیچے بیٹی کو پکار کر سوئی منگوائی۔ کانٹا نکالنے کے بعد اسے بے تحاشا چوما اور پھر نیچے جھک کر پکاری "ارے میرا دوپٹہ تو اوپر پھینک دینا، کیسی بے حیائی سے اوپر بھاگی چلی آئی۔"

پرمیشر سنگھ نے کچھ دیر بعد چونک کر اپنی بیوی سے پوچھا "کیا تمہیں کرتارا اب بھی یاد آتا ہے؟"

"لو اور سنو" بیوی بولی اور پھر ایک دم چھاجوں رو دی۔

"کرتارا تو میرے کلیجے کا ناسور بن گیا ہے پرمیشرے۔۔۔؟"

کرتارے کا نام سن کر ادھر سے امر کور اٹھ کر آئی اور اپنی ماں کے گھٹنے کے پاس بیٹھ کر رونے لگی

پرمیشر یوں بدک کر جلدی سے اٹھا جیسے اس نے شیشے کے برتنوں سے بھرا ہوا طشت اچانک زمین پر دے مارا ہے۔
شام کے کھانے کے بعد وہ اختر کو انگلی سے پکڑے دالان میں آیا اور بولا ۔" آج دن بھر خوب سوئے ہو بیٹا۔ چلو آج ذرا گھومنے چلتے ہیں۔ چاندنی رات ہے "
اختر فوراً مان گیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے ایک کمبل میں لپیٹا اور کندھے پر بٹھا لیا۔ کھیتوں میں آکر وہ بولا ۔
" یہ چاند جو پورب سے نکل رہا ہے نا بیٹے، یہ جب ہمارے سر پر پہنچے گا تو صبح ہو جائے گی "
اختر چاند کی طرف دیکھنے لگا۔
" یہ چاند یہاں چمک رہا ہے نا، یہ وہاں بھی چمک رہا ہوگا۔ تمھاری اماں کے دیس میں "
اب کے اختر نے جھک کر پرمیشر سنگھ کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔
" یہ چاند جب ہمارے سر پر آئے گا تو وہاں تمھاری اماں کے سر پر بھی ہوگا "
اب کے اختر بولا ۔" ہم چاند دیکھ رہے ہیں تو کیا اماں بھی چاند دیکھ رہی ہوں گی ؟ "
" ہاں ! " پرمیشر سنگھ کی آواز میں گونج تھی ۔" جاؤ گے اماں کے پاس ؟ "
" ہاں ! " اختر بولا ۔ " پر تم تو جاتے نہیں ۔ تم بہت برے ہو ۔ تم سکھ ہو "
پرمیشر سنگھ بولا ۔" نہیں بیٹے ! آج تو تمھیں ضرور ہی لے جاؤں گا ۔ تمھاری اماں کی چٹھی آئی ہے ۔ وہ کہتی ہے میں اختر بیٹے کے لیے اداس ہوں "
" میں بھی تو اداس ہوں " اختر کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ۔
" میں تمھیں تمھاری اماں کے پاس لے جا رہا ہوں "
" سچ ؟ " اختر پرمیشر سنگھ کے کندھے پر کودنے لگا اور زور زور سے بولنے لگا ۔" ہم اماں پاس جا رہے ہیں ۔ پرموں ہمیں اماں پاس لے جائے گا ہم وہاں سے پرموں کو چٹھی لکھیں گے "
پرمیشر سنگھ چپ چاپ روئے جا رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر اور گلا صاف کر کے اس نے اختر سے پوچھا ۔" گانا سنو گے ؟ "

" ہاں ! "

" پہلے تم قرآن سناؤ "
" اچھا ۔" اختر قل ھو اللہ پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے سینے پر چھو کی اور بولا ۔" لاؤ تمھارے سینے پر بھی چھو کر دوں "
رک کر پرمیشر سنگھ نے گریبان کا ایک بٹن کھولا اور اوپر دیکھا۔ اختر نے لٹک کر اس کے سینے پر چھو کر دی اور بولا ۔" اب تم سناؤ "
پرمیشر سنگھ نے اختر کو دوسرے کندھے پر بٹھا لیا۔ اسے بچوں کا کوئی گیت یاد نہ تھا۔ اس لیے اس نے قسم قسم کے گیت گانا شروع کر دیے اور گاتے ہوئے تیز چلنے لگا۔ اختر چپ چاپ سنتا رہا۔

بنتو دا سر بن ور گا ہے
بنتو دا مُنہ چن ور گا ہے
بنتو دا اک چترا گا ہے
لوکو
بنتو دا اک چترا

" بنتو کون ہے ؟ " اختر نے پرمیشر سنگھ کو ٹوکا۔

پرمیشر سنگھ ہنسا۔ پھر ذرا سا وقفے کے بعد بولا ۔" میری بیوی ہے امر کور کی ماں ۔ اس کا نام بھی تو بنتو ہے ۔تمھاری اماں کا نام بھی بنتو ہی ہو گا۔"

" کیوں ؟ " اختر خفا ہو گیا ۔" وہ کوئی سکھ ہے ؟ "

پرمیشر سنگھ خاموش ہو گیا ۔

چاند بہت بلند ہو گیا تھا۔ رات خاموش تھی۔ کبھی کبھی گنّے کے کھیتوں کے آس پاس گیدڑ روتے اور پھر سناٹا چھا جاتا ۔ اختر تو پہلے گیدڑوں کی آواز پر ڈرا ، مگر پرمیشر سنگھ کے سمجھانے سے بہل گیا اور ایک بار خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اس نے پرمیشر سنگھ سے پوچھا ۔" اب کیوں نہیں روتے گیدڑ ؟ " پرمیشر سنگھ ہنس دیا۔ پھر اسے ایک کہانی یاد آ گئی ۔ یہ گورو گوبند کی کہانی تھی لیکن اس نے بڑے سلیقے سے سکھوں کے ناموں کو مسلمانوں میں بدل دیا اور اختر " پھر ؟ — پھر ؟ " کی رٹ لگاتا رہا اور کہانی ابھی جاری تھی جب اختر ایک دم بولا ۔" ارے ہم تو سرپر آ گیا ۔"

پرمیشر سنگھ نے بھی رُک کر اوپر دیکھا ۔ پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ کر دور دیکھنے لگا اور بولا ۔" تمھاری اماں کا دیس جانے کدھر چلا گیا ؟ "۔

وہ کچھ دیر ٹیلے پر کھڑا رہا جب اچانک کہیں بہت دور سے اذان کی آواز آنے لگی اور اختر مارے خوشی کے یوں کودا کہ پرمیشر سنگھ بڑی مشکل سے اسے سنبھال سکا ۔ اسے کندھے پر سے اتار کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھڑے ہوئے اختر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا ۔" جاؤ بیٹے ۔ تمھیں تمھاری اماں نے پکارا ہے ۔ بس تم اس کی آواز کی سیدھ میں ...."

" شش ! " اختر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی ، اور سرگوشی میں بولا ۔" اذان کے وقت نہیں بولتے ! "

" پر میں تو سکھ ہوں بیٹے ! " پرمیشر بولا ۔

" شش ! " اب کے اختر نے بگڑ کر اسے گھورا ۔

اور پرمیشر سنگھ نے اسے گود میں بٹھا لیا ۔ اس کے ماتھے پر ایک بہت طویل پیار دیا ۔ اور اذان ختم ہونے کے بعد آستینوں سے آنکھوں کو رگڑ رگڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا ۔" میں یہاں سے آگے نہیں جاؤں گا ۔ بس تم ...."

" کیوں نہیں جاؤ گے ؟ " اختر نے پوچھا ۔

"تمھاری اماں نے چٹھی میں یہی لکھا ہے کہ اختر اکیلا آئے" پرمیشر سنگھ نے اختر کو پھسلایا۔
"بس تم سیدھے چلے جاؤ۔ سامنے ایک گاؤں آئے گا وہاں جا کر اپنا نام بتانا کرتار نہیں، اختر۔ پھر اپنی اماں کا نام بتانا، اپنے گاؤں کا نام بتانا اور دیکھو مجھے ایک چٹھی ضرور لکھنا۔"
"لکھوں گا۔" اختر نے وعدہ کیا۔
"اور ہاں تمھیں کرتارا نام کا کوئی لڑکا ملے نا! اسے ادھر بھیج دینا؟"
"اچھا!"۔۔۔۔۔۔
پرمیشر سنگھ نے ایک بار پھر اختر کا ماتھا چوما اور جیسے کچھ نگل کر بولا۔۔۔۔۔۔ "جاؤ۔"۔
اختر چند قدم آگے چلا مگر پلٹ آیا۔ "تم بھی آجاؤ نا۔"
"نہیں بھئی۔" پرمیشر سنگھ نے اسے سمجھایا۔ "تمھاری اماں نے چٹھی میں یہ نہیں لکھا۔"
"مجھے ڈر لگتا ہے۔" اختر بولا۔
"قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟" پرمیشر سنگھ نے مشورہ دیا۔
"اچھا!"۔ بات اختر کی سمجھ میں آگئی اور وہ قل ھو اللہ کا ورد کرتا ہوا جانے لگا۔
نرم نرم ہوا افق کے دائرے پر اندھیرے سے لڑ رہی تھی اور ننھا سا اختر دور دھندلی پگڈنڈی پر ایک لمبے تڑنگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جا رہا تھا۔ پرمیشر سنگھ اس پر نظریں گاڑے ٹیلے پر بیٹھا رہا اور جب اختر نقطہ فضا کا ایک حصہ بن گیا تو وہ وہاں سے اتر آیا۔
اختر ابھی گاؤں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دو سپاہی لپک کر آئے اور اسے روک کر بولے "کون ہو تم؟"
"اختر!" وہ یوں بولا جیسے ساری دنیا اس کو جانتی ہے۔
"اختر!"۔ دونوں سپاہی کبھی اختر کے چہرے کو دیکھتے تھے اور کبھی اس کی سکھوں کی سی پگڑی کو۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر اس کی پگڑی اتار لی تو اختر کے کیس کھل کر ادھر ادھر بکھر گئے۔
اختر نے جھپٹ کر پگڑی چھین لی اور پھر سر کو ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے وہ زمین پر لیٹ گیا اور زور زور سے روتے ہوئے بولا۔ "میرا کنگھا لاؤ۔ تم نے میرا کنگھا لے لیا ہے۔ دے دو ورنہ میں تمھیں مار دوں گا۔"
ایک دم دونوں سپاہی زمین پر گرے اور رائفلوں کو کندھے سے لگا کر جیسے نشانہ باندھنے لگے۔ "ہالٹ"۔ ایک پکارا اور جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر بڑھتے ہوئے اجالے میں انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔۔۔۔۔۔ اور ایک نے فائر کر دیا۔ اور اختر فائر کی آواز سے دہل کر رہ گیا اور سپاہیوں کو ایک طرف بھاگتا دیکھ کر وہ بھی روتا چلاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔۔۔۔۔۔ سپاہی جب ایک جگہ جا کر رکے تو پرمیشر سنگھ اپنی ران پر کس کر پگڑی باندھ چکا تھا، مگر خون اس کی پگڑی کی سیکڑوں پرتوں میں سے پھوٹ آیا تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے کیوں مارا تم نے، میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یارو۔"
دور اختر بھاگا آ رہا تھا اور اس کے کیس ہوا میں اڑ رہے تھے۔

ندیم

گنڈاسا

اکھاڑہ جم چکا تھا۔ طرفین نے اپنی اپنی "چوکیاں" چن لی تھیں۔ "پڑ کوڈی" کے کھلاڑی جسموں پر تیل مل کر بجتے ہوئے ڈھولوں کے گرد گھوم رہے تھے۔ انھوں نے رنگین لنگوٹیں کس کر باندھ رکھی تھیں۔ ذرا ذرا سے سفید پھینٹے ان کے چڑھے ہوئے رنگے رنگے پٹکوں کے نیچے سے گزر کر سر کے دونوں طرف [illegible] بنا رہے تھے۔ وسیع میدان کے چاروں طرف گیہوں اور حقوں کے دور چل رہے تھے اور کھلاڑیوں کے [illegible] جانچا پرکھا جا رہا تھا۔ مشہور جوڑیاں ابھی میدان میں نہیں اتری تھیں۔ یہ نامور کھلاڑی اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کے گھیرے میں کھڑے اس شدت سے تیل چپڑ رہے تھے کہ ان کے جسموں کو ڈھلتی دھوپ کی چمک نے بالکل تانبے کا سا رنگ دے دیا تھا۔ پھر یہ کھلاڑی بھی میدان میں آئے۔ انھوں نے بجتے ہوئے ڈھولوں کے گرد چکر کاٹے اور اپنی اپنی چوکیوں کے سامنے ناچتے کودتے ہوئے بھاگنے لگے اور پھر آناً فاناً سارے میدان میں ایک سرگوشی بھنور کی طرح گھوم گئی۔ "مولا کہاں ہے؟"

مولا ہی کا کھیل دیکھنے کو تو یہ لوگ دور دراز کے دیہات سے کھنچے چلے آئے تھے۔ "مولا کا جوڑی وال تاجا بھی تو نہیں!" دوسرا بھنور پیدا ہوا اور لوگ پوربی چوکی کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے بڑھنے لگے۔ جما ہوا پڑ ٹوٹ گیا۔ منتظمین نے لمبے لمبے بیدوں اور لاٹھیوں کو زمین پر مار مار کر بڑھتے ہوئے ہجوم کے سامنے گرد کا طوفان اڑانے کی کوشش کی کہ پڑ کا ٹوٹنا اچھا شگون نہ تھا، مگر جب یہ سرگوشی ان کے کانوں میں بھی پہنچی تو وہ بھی ہجوم کے ساتھ ہو لیے۔۔۔ اور پھر اتنے میں جیسے میدان میں سیروں بارود سے بھرا ہوا گولا ایک چکرا دینے والے دھماکے سے پھٹ پڑا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ پڑ کی چوکور حدوں کی طرف واپس جانے لگے۔ مولا اپنے جوڑی وال تاجے کے ساتھ میدان میں آ گیا۔ اس نے پھندنوں اور ڈوریوں سے بجے اور لرزتے ہوئے ڈھول کے گرد بڑے وقار سے تین چکر کاٹے اور پھر ڈھول کو پوروں سے چھو کر "یا علی" کا نعرہ لگانے کے لیے ہاتھ ہوا میں بلند کیا ہی تھا کہ ایک آواز ڈھولوں کی دھما دھم کو چیرتی پھاڑتی اس کے سینے پر گنڈاسا بن کر پڑی۔ "مولے اے مولے بیٹے۔ تیرا باپ قتل ہو گیا!"

مولا کا اُٹھا ہوا ہاتھ سانپ کے پھن کی طرح لہرا گیا اور پھر ایک دم جیسے اس کے قدموں میں پہیے نکل آئے۔۔۔ رنگے

نے تیرے باپ کو ادھیڑ ڈالا ہے گنڈاسے سے!" اس کی ماں کی آواز نے اس کا تعاقب کیا!
پڑ ٹوٹ گیا۔ ڈھول رک گئے۔ کھلاڑی جلدی جلدی سے کپڑے پہننے لگے۔ ہجوم میں افراتفری پیدا ہوئی اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔ مولا کے جسم کا تنا ہوا گاؤں کی گلیوں میں کوندے بکھیرتا اڑا جا رہا تھا۔ بہت پیچھے اس کا جوڑی وال تاجا اپنے اور مولا کے کپڑوں کی گٹھڑی سینہ سے لگائے آ رہا تھا اور پھر اس کے بہت پیچھے ایک خوف زدہ ہجوم تھا جس گاؤں میں کسی شخص کو ننگے سر پھرنے کا حوصلہ نہ ہو سکتا تھا۔ وہاں مولا صرف ایک گلابی لنگوٹ باندھے پنہاریوں کی قطاروں، بھیڑوں بکریوں کے ریوڑوں کو چیرتا ہوا لپکا جا رہا تھا۔ اور جب وہ رنگے کی چوپال کے بالکل سامنے پہنچا تو سامنے کے ایک اور ہجوم میں سے پیر نور شاہ نکلے اور مولا کو للکار کر بولے "رک جا مولے!"
مولا لپکا چلا گیا مگر پھر ایک دم جیسے اس کے قدم جکڑ لیے گئے، اور وہ بت کی طرح جم کر رہ گیا۔ پیر نور شاہ اس کے قریب آئے اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولے "تو آگے نہیں جائے گا مولے!"
ہانپتا ہوا مولا کچھ دیر پیر نور شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا، پھر بولا "آگے نہیں جاؤں گا پیر جی تو زندہ کیوں رہوں گا؟"
"میں کہہ رہا ہوں" پیر جی "میں" پر زور دیتے ہوئے دبدبے سے بولے۔
مولا ہانپنے کے باوجود ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔ "تو پھر میرے منہ پر کالک بھی مل ڈالیے اور ناک بھی کاٹ ڈالیے میری۔ مجھے تو اپنے باپ کے خون کا بدلہ چکانا ہے پیر جی، بھیڑ بکری کی بات ہوتی تو میں آپ کے کہنے پر یہیں سے پلٹ جاتا۔"
مولا نے گردن کو بڑے زور سے جھٹکا دے کر رنگے کی چوپال کی طرف دیکھا۔ رنگا اور اس کے بیٹے لٹھوں پر گنڈاسے چڑھائے چوپال پر تنے کھڑے تھے، رنگے کا بڑا لڑکا بولا۔
"آ بیٹے آ۔ گنڈاسے کے ایک ہی وار سے پھٹے ہوئے پیٹ میں سے انتڑیوں کا ڈھیر نہ اگل ڈالو تو قادرا نام نہیں میرا گنڈاسا بڑا جلد باز ہے اور کبڈی کھیلنے والے لاڈلے بیٹے باپ کے قتل کا بدلہ نہیں لیتے، روتے ہیں اور کفن کا لٹھا ڈھونڈنے چلے جاتے ہیں۔"
مولا جیسے بات ختم ہونے کے انتظار میں تھا، ایک ہی زقند میں چوپال کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ مگر اب کبڈی کے میدان کا ہجوم بھی پہنچ گیا تھا اور گاؤں کا گاؤں اس کے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔ جسم پر تیل چپڑ رکھا تھا اس لیے وہ روکنے والوں کے ہاتھوں میں سے نکل نکل جاتا مگر پھر جکڑ لیا جاتا۔ ہجوم کا ایک حصہ رنگے اور اس کے تینوں بیٹوں کو بھی روک رہا تھا۔ چار گنڈاسے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں جنوں کی طرح بار بار دانت چمکا رہے تھے کہ اچانک جیسے سارے ہجوم کو سانپ سونگھ گیا۔ پیر نور شاہ قرآن مجید کو دونوں ہاتھوں میں بلند کیے چوپال کی سیڑھیوں پر آئے اور چلائے "اس کلام اللہ کا واسطہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ ورنہ بدبختو، گاؤں کا گاؤں کٹ مرے گا۔ جاؤ، تمہیں خدا اور رسول کا واسطہ، قرآن پاک کا واسطہ، جاؤ، چلے جاؤ۔"
لوگ سر جھکا کر ادھر ادھر بکھرنے لگے۔ مولا نے جلدی سے تاجے سے پٹکا لے کر ادب سے اپنے گھٹنے چھپا لیے اور

سیڑھیوں پر سے اُتر گیا۔ پیر صاحب قرآن مجید کو بغل میں لیے اس کے پاس آئے اور بولے "اللہ تعالیٰ تمھیں صبر دے اور آپ کے اس نیک کام کا اجر دے۔"

مولا آگے بڑھ گیا۔ تاجا اس کے ساتھ تھا اور جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچے تو مولا نے پلٹ کر رنگے کی چوپال پر ایک نظر ڈالی۔

"تم تو رو رہے ہو مولے؟" تاجے نے بڑے دکھ سے کہا۔

اور مولا نے اپنے ننگے بازو کو آنکھوں پر رگڑ کر کہا "تو کیا اب روؤں بھی نہیں"؟

"لوگ کیا کہیں گے؟" تاجے نے مشورہ دیا۔

"ہاں تاجے!" مولا نے دوسری بار بازو کو آنکھوں پر رگڑا "میں بھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ میرے باپ کے خون پر مکھیاں اُڑ رہی ہیں اور میں یہاں گلی میں ڈرے ہوئے کتے کی طرح دم دبائے بھاگا جا رہا ہوں ماں کے گھٹنے سے لگ کر رونے کے لیے!"

لیکن مولا ماں کے گھٹنے سے لگ کر رویا نہیں۔ وہ گھر کے دالان میں داخل ہوا تو رشتہ دار اس کے باپ کی لاش کو تھانے اٹھا لے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ منہ پیٹتی اور بال نوچتی ماں اُس کے پاس آئی اور "شرم تو نہیں آتی" کہہ کر منہ پھیر کر لاش کے پاس چلی گئی۔ مولا کے تیور اسی طرح تنے رہے۔ اُس نے بڑھ کر باپ کی لاش کو کندھا دیا اور برادری کے ساتھ تھانے روانہ ہو گیا۔

اور ابھی لاش تھانے نہیں پہنچی ہو گی کہ رنگے کی چوپال پر قیامت مچ گئی۔ رنگا چوپال کی سیڑھیوں پر سے اُتر کر سامنے اپنے گھر میں داخل ہونے ہی لگا تھا کہ کہیں سے ایک گنڈاسا لپکا اور انتڑیوں کا ایک ڈھیر اُس کے پھٹے ہوئے پیٹ سے باہر اُبل کر اس کے گھر کی دہلیز پر بھاپ چھوڑنے لگا۔ کافی دیر کی افراتفری کے بعد رنگے کے بیٹے گھوڑوں پر سوار ہو کر رپٹ کے لیے گاؤں سے نکلے، مگر جب وہ تھانے میں پہنچے تو یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئے کہ جس شخص کے خلاف وہ رپٹ لکھوانے آئے ہیں وہ وہیں اپنے باپ کی لاش کے پاس بیٹھا تسبیح پر قل ھواللہ کا ورد کر رہا تھا۔ تھانیدار سے انھوں نے بہت ہیر پھیر کی کوشش کی اور اپنے باپ کا قاتل مولا ہی کو ٹھہرایا۔ مگر تھانیدار نے انھیں سمجھایا کہ "خواہ مخواہ اپنے باپ کے قاتل کو ضائع کر بیٹھو گے، کوئی عقل کی بات کرو۔ اِدھر یہ میرے پاس بیٹھا اپنے باپ کے قتل کی رپٹ لکھوا رہا ہے اُدھر تمھارے باپ کے پیٹ میں گنڈاسا بھی بھونک آیا ہے؟"

آخر دونوں طرف سے چالان ہوئے، لیکن دونوں قتلوں کا وا قعِ چشم دید ثبوت نہ ملنے کی بنا پر فریقین بری ہو گئے اور جس روز مولا رہا ہو کر گاؤں میں آیا تو اپنی ماں سے ماتھے پر ایک طویل بوسہ ثبت کرانے کے بعد سب سے پہلے تاجے کے ہاں گیا۔ اسے بھینچ بھینچ کر گلے سے لگایا اور کہا "اس روز تم اور تمھارا گھوڑا میرے کام نہ آتے تو آج میں پھانسی کی رسّی میں توری کی طرح لٹک رہا ہوتا۔ تمھاری جان کی قسم جب میں نے رنگے کے پیٹ کو کھول کر رکاب میں پاؤں رکھا ہے تو آندھی بن گیا خدا کی قسم۔ اسی لیے تو لاش ابھی تھانے نہیں پہنچی تھی کہ میں ہاتھ جھٹک کر واپس بھی آ گیا۔"

سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ رنگے کا قاتل مولا ہی ہے، مگر مولے کے چند عزیزوں اور تاجے کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ پھر ایک دن گاؤں میں یہ خبر گشت لگانے لگی کہ مولا کا باپ تو رنگے کے بڑے بیٹے قادرے کے گنڈاسے

تے مرا تھا۔ رنگا تو صرف ہشکار رہا تھا بیلوں کو، سدا تو بیلوں کو، اور گھروں میں یہ موضوع چھت رہا، اور صبح کو پتہ چلا کہ قادرا اپنے کوٹھے کی چھت پر مردہ پایا گیا ہے، اور وہ بھی یوں کہ جب اس کے بھائیوں پہلے اور گلے نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اس کا سر لڑھک کر نیچے گرا اور پرنالے تک لڑھکتا چلا گیا۔ رپٹ لکھوائی گئی، پولیس آئی، مولا پھر گرفتار ہو گیا۔ مرچوں کا دھواں پیا، تپتی دوپہروں میں لوہے کی چادر پر کھڑا رہا۔ کتنی راتیں اسے اونگھنے تک نہ دیا گیا، مگر وہ اقبالی نہ ہوا اور آخر مہینوں کے بعد رہا ہو کر گاؤں میں آ نکلا اور جب اپنے آنگن میں قدم رکھا تو اس کی ماں جاگی ہوئی آئی۔ اس کے ماتھے پر ایک طویل بوسہ دیا اور بولی "ابھی دو اور باقی ہیں میرے لال۔ رنگے کا کوئی نام لیوا نہ رہے تو جبھی تجھے دھاریں بخشوں گی۔ میرے دودھ میں تیرے باپ کا خون تھا مولے، اور تیرے خون میں میرا دودھ ہے، اور تیرے گنڈاسے پر میں نے زنگ نہیں چڑھنے دیا۔"

مولا اب علاقے بھر کی ہیبت بن گیا تھا۔ اس کی مونچھوں میں دو دو بل آ گئے تھے۔ کانوں میں سونے کی بڑی بڑی مرکیاں جھومنے لگی تھیں۔ آنکھوں میں سرمے کی دھار جو کبھی کسی نے مٹی ہوا نہ دیکھی۔ خوشبودار تیل اس کے لہریے بالوں میں آگ کی قلمیں سی جلائے رکھتا۔ ہاتھی دانت کا بلدار کنگھا اکثر اس کی کنپٹی پر چمکنے لگا تھا۔ وہ گلیوں میں چلتا تو لٹھے کے تہبند کا کم سے کم آدھا گز تو اس کے عقب میں لوٹتا ہوا جاتا۔ باریک ململ کا پٹکا اس کے کندھے پر پڑا رہتا، اور اکثر اس کا ایک سرا گر کر زمین پر گھسٹنے لگتا اور گھسٹتا چلا جاتا۔ مولے کے ہاتھ میں ہمیشہ اس کے قد سے بھی کہیں لمبی تیل پی لٹھ ہوتی اور جب وہ گلی کے کسی موڑ یا کسی چوراہے پر بیٹھتا تو یہ لٹھ جس انداز سے اس کے گھٹنے سے ٹکی اسی انداز سے لگی رہتی اور گلی میں سے گزرنے والوں کو اتنی جرأت نہ ہوتی کہ وہ مولا کو لٹھ ایک طرف سرکانے کے لیے کہہ سکیں۔ اگر کبھی لٹھ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک تن گئی تو لوگ آتے، مولا کی طرف دیکھتے اور پلٹ کر کسی دوسری گلی میں چلے جاتے۔ عورتوں اور بچوں نے تو وہ گلیاں ہی چھوڑ دی تھیں جہاں مولا بیٹھنے کا عادی تھا۔ مشکل یہ تھی کہ مولا کی لٹھ پر سے لانگنے کا بھی کسی میں حوصلہ نہ تھا۔ ایک بار کسی اجنبی نوجوان کا اس گلی میں سے گزر ہوا۔ مولا اس وقت ایک دیوار سے لگا لٹھ سے دوسری دیوار کریدے جا رہا تھا۔ اجنبی آیا اور لٹھ پر سے لانگ گیا۔ ایکا ایکی مولا نے بھر کر ڈب میں سے گنڈاسا نکالا اور لٹھ پر چڑھا کر بولا "ٹھہر جا او چھوکرے، جانتے ہو تم نے کس کی لٹھ لانگی ہے؟ یہ مولا کی لٹھ ہے۔ مولے گنڈاسے والے کی۔"

نوجوان مولا کا نام سنتے ہی یک لخت زرد پڑ گیا اور ہولے سے بولا "مجھے پتہ نہیں تھا مولے۔"

مولے نے گنڈاسا اتار کر ڈب میں اڑس لیا اور لٹھ کے ایک سرے کو نوجوان کے پیٹ پر ہلکے سے دبا کر بولا "تو پھر جا اپنا کام کر۔" اور پھر وہ لٹھ کو یہاں سے وہاں تک پھیلا کر بیٹھ گیا۔

مولا کا لباس، اس کی چال، اس کی مونچھیں اور مرکیاں، اور سب سے زیادہ اس کا لاابالیانہ انداز، یہ سب پہلے گاؤں کے فیشن میں داخل ہوئے اور پھر علاقے بھر کے فیشن پر اثر انداز ہوئے۔ لیکن مولا کی جو چیز فیشن میں داخل نہ ہو سکی وہ اس کی [illegible] تھی۔ نیل پڑ، پتیل کے کوکوں سے اٹی ہوئی [illegible] لپٹی ہوئی، گلیوں کے کنکروں سے ٹکراتی اور یہاں سے وہاں تک چھیلنے والوں کو پلٹا دینے والی لٹھ۔ اور پھر وہ گنڈاسا جس کی میان مولا کی ڈب تھی اور جس پر اس کی ماں زنگ کا ایک دھبہ تک نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ مولا گلیوں کے موڑوں پر لٹھ بچھائے اور گنڈاسا چھپائے گلے اور پیچے کی راہ تکتا رہتا ہے۔ قادرے کے قتل اور مولا کی رہائی کے بعد پیچے تو ڈر کر بھرتی ہو کر چھپ گیا تھا، اور گلے نے علاقے کے مشہور سہ گیر چودھری مظفر الہی کے ہاں پناہ لی تھی، جہاں وہ چودھری کے دوسرے ملازموں کے ساتھ چناب اور راوی پر سے بیل اور گائیں بھینسیں

چوری کرکے لاتا۔ چودھری مظفر اس مال کو منڈیوں میں بیچ کر امیروں، وزیروں اور لیڈروں کی بڑی بڑی دعوتیں کرتا اور اخباروں میں نام چھپواتا اور جب چناب اور راوی کے کھوجی مویشیوں کے کھروں کے سراغ کے ساتھ ساتھ چلتے چودھری مظفر کے قصبے کے قریب تک پہنچتے تو جی میں کہتے "ہمارا ماتھا پہلے ہی ٹھنکا تھا!" انھیں معلوم تھا کہ اگر وہ کھروں کے سراغ کے ساتھ ساتھ چلتے چودھری کے گھر تک جا پہنچے تو پھر کچھ دیر بعد لوگ مویشیوں کی بجائے خود کھوجیوں کا کھوج لگاتے پھریں گے اور لگا نہ پائیں گے۔ وہ چودھری کے خوف کے مارے قصبے کے ایک طرف سے نکل کر اور تھلوں کے ریتے میں پہنچ کر یہ کہتے ہوئے واپس آجاتے "کھروں کے نشان یہاں سے غائب ہو رہے ہیں!"

مولا نے چودھری مظفر اور اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے بارے میں سُن رکھا تھا، اسے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے علاقہ بھر میں صرف یہ چودھری ہی ہے جو اس کی لٹھ اُلانگ سکتا ہے، لیکن فی الحال اسے رنگے کے دونوں بیٹوں کا انتظار تھا۔

تاجے نے اسے بہت سمجھایا کہ تجھے باپ کے خون کا بدلہ لینا تھا سو لے لیا۔ اب یہ چھٹے ہوئے بدمعاشوں کے سے چلن تجھے زیب نہیں دیتے۔ "کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا!" تاجے نے بڑے بھائیوں کی طرح مولا کو ڈانٹا۔ "اور کچھ نہیں تو اپنی زمینوں کی نگرانی کر لیا کر، یہ کیا بات ہوئی کہ صبح سے شام تک گلیوں میں لٹھ پھیلائے بیٹھے ہیں اور میراثیوں، نائیوں سے خدمتیں لی جا رہی ہیں۔ تو شاید نہیں جانتا پر جان لے تو اس میں تیرا ہی بھلا ہے کہ مائیں بچوں کو تیرا نام لے کر ڈرانے لگی ہیں، لڑکیاں تو تیرا نام سنتے ہی تھوک دیتی ہیں، کسی کو بددعا دینی ہو تو کہتی ہیں اللہ کرے تجھے مولا بیاہ کر لے جائے۔ سنتے ہو مولے؟"

لیکن مولا تو جس بھٹی میں کودا تھا اُس میں پک کر پختہ ہو چکا تھا۔ بولا "ابے جا تاجے، اپنا کام کر، گاؤں بھر کی گالیاں سمیٹ کر میرے سامنے ان کا ڈھیر لگانے آیا ہے؟ دوستی رکھنا بڑی جی داری کی بات ہے پٹھے، تیرا جی چھوٹ گیا ہے تو میری آنکھوں میں دھول کیوں جھونکتا ہے، جا اپنا کام کر، میرے گنڈاسے کی پیاس ابھی تک نہیں بجھی ۔۔۔ جائے۔ اس نے لاٹھی کو کنکروں پر بجایا اور گلی کے سامنے والے مکان میں میراثی کو ہانک لگائی "ابے اب تک چلم تازہ نہیں کر چکا۔ اُلو کے پٹھے: جا کر گھر والی کی گود میں سو گیا! چلم لا۔"

تاجا پلٹ گیا، اگر گلی کے موڑ پر جا کر رک گیا اور مڑ کر مولے کو کنکھیوں دیکھا، جیسے اس کی ہوا مڑی پر چپیٹ پھوٹ کر رو دے گا۔

مولا کنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اٹھا اور لٹھ کو اپنے پیچھے گھسیٹتا تاجے کے پاس آ کر بولا۔ "دیکھ تاجے مجھے ایسا لگتا ہے تو مجھ پر ترس کھا رہا ہے، اس لیے کہ کسی زمانے میں تیری میری یاری تھی، پر اب یہ یاری ٹوٹ گئی ہے تاجے، تو میرا ساتھ نہیں دے سکتا تو پھر کیسی یاری کو لے کر چاٹنا ہے؟ میرے باپ کا خون اتنا سستا نہیں تھا کہ رنگے اور اس کے ایک ہی بیٹے کے خون سے حساب بیک جائے، میرا گنڈاسا تو ابھی اس کے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں تک پہنچے گا، اس لیے جا اپنا کام کر۔ تیری میری یاری ختم، اس لیے مجھ پر ترس نہ کھایا کر، کوئی مجھ پر ترس کھائے تو آنچ میرے گنڈاسے پر جا پہنچتی ہے۔ جا"

واپس آ کر مولا نے میراثی سے چلم لے کر کش لگایا تو سلفہ اُبھر کر بکھر گیا۔ ایک چنگاری مولا کے ہاتھ پر گری اور ایک لمحہ تک وہیں چمکتی رہی۔ میراثی نے چنگاری کو جھاڑنا چاہا، تو مولا نے اس کے ہاتھ پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ میراثی بل کھا کر رہ گیا

اور ہاتھ کو ران اور پنڈلی میں دبا کر ایک طرف ہٹ گیا اور مولا گرجا "بس کھاتا ہے حرامزادہ"

اس نے چلم اٹھا کر سامنے دیوار پر پٹخ دی اور لٹھ اٹھا کر ایک طرف چل دیا۔

لوگوں نے مولا کو ایک نئی گلی کے چوراہے پر بیٹھے دیکھا تو چونکے اور سرگوشیاں کرتے ہوئے ادھر ادھر بکھر گئے۔ عورتیں سر پر گھڑے رکھے آئیں اور "ہائیں" کرتی واپس چلی گئیں۔ مولا کی لٹھ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی اور لوگوں کے خیال میں اس پر خون سوار تھا۔ مولا اس وقت دور مسجد کے مینار پر بیٹھی ہوئی چیل کو تکے جا رہا تھا۔

اچانک اسے کنکروں پر لٹھ کے بجنے کی آواز آئی۔ چونک کر اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی نے اس کی لٹھ اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑی ہے اور ان ننھی ننھی سرخ سرخ مرچوں کو چن رہی ہے جو جھکتے ہوئے اس کے سر پر رکھی ہوئی گٹھڑی میں سے گر گئی تھیں۔ مولا سناٹے میں آ گیا۔ لٹھ کو الانگنا تو ایک طرف رہا، اس نے یعنی ایک عورت ذات نے لٹھ کو گندے چیتھڑے کی طرح اٹھا کر پرے ڈال دیا ہے اور اب بڑے اطمینان سے مولا کے سامنے بیٹھی مرچیں چن رہی ہے، اور جب مولا نے کڑک کر کہا "جانتی ہو تم نے کس کی لاٹھی پر ہاتھ رکھا ہے؟ جانتی ہو میں کون ہوں؟" تو اس نے ہاتھ بلند کر کے چنی ہوئی مرچوں کو گٹھڑی میں ٹھونستے ہوئے کہا "کوئی سڑی لگتے ہو!"

مولا مارے غصے کے اٹھ کھڑا ہوا، لڑکی بھی اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نرمی سے بولی "اسی لیے تو میں نے تمھاری لٹھ تمھارے سر پر نہیں دے ماری۔ ایسے لٹے لٹے سے لگتے تھے تم، مجھے تو تم پر ترس آ گیا تھا"

"ترس آ گیا تھا تمھیں مجھ پر؟ مولا پر؟ مولا دہاڑا۔

"مولا؟" لڑکی نے گٹھڑی کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور ذرا سی چونک گئی۔۔۔

"ہاں، مولا، گنڈاسے والا" مولا نے بڑے گھمنڈ سے کہا۔

اور لڑکی ذرا سا مسکرا کے گلی میں جانے لگی۔

مولا کچھ دیر وہاں چپ چاپ کھڑا رہا پھر ایک سانس لے کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ لٹھ کو سامنے کی دیوار تک پھیلا لیا تو پرلی طرف سے ادھیڑ عمر کی ایک عورت آتی دکھائی دی۔ وہ مولا کو دیکھ کر ٹھٹکی، مولا نے لٹھ اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور بولا "آ جاؤ ماسی، آ جاؤ، میں تمھیں کھا تھوڑی جاؤں گا"

جو اس باختہ عورت آئی اور مولا کے پاس سے گزرتے ہوئے بولی "کیسا جھوٹ بکتے ہیں لوگ، کہتے ہیں جہاں مولا بخش بیٹھا ہو وہاں سے باؤلا کتا بھی دبک کر گزرتا ہے، پر تو نے میرے لیے اپنی لٹھ"

"کون کہتا ہے؟" مولا اٹھ کھڑا ہوا۔

"سب کہتے ہیں، سارا گاؤں کہتا ہے، ابھی ابھی کنوئیں پر یہی باتیں ہو رہی تھیں، پر میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مولا بخش۔۔۔"

لیکن مولا اب تک اس گلی میں لپک گیا تھا جس میں ابھی ابھی نوجوان لڑکی گئی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا گیا اور آخر دور لمبی گلی کے سرے پر وہی لڑکی جاتی نظر آئی، وہ بھاگنے لگا۔ آنگنوں میں بیٹھی ہوئی عورتیں دروازوں تک آ گئیں اور بچے چھتوں پر چڑھ گئے۔ مولا کا گلی میں سے بھاگ کر نکلنا کسی حادثے ہی کا پیش خیمہ سمجھا گیا۔ لڑکی نے بھی مولا کے قدموں کی چاپ سن لی،

بیٹی اور پھر وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس نے بس اتنا ہی کیا کہ گٹھڑی کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، چند مرچیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح اس کے پاؤں میں بکھر گئیں۔

"میں تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔" مولا پکارا۔ "کچھ نہیں کہوں گا تمھیں۔"

لڑکی بولی۔ "میں ڈر کے نہیں رکی۔ ڈریں میرے دشمن۔"

مولا رک گیا، پھر ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور بولا۔ "بس اتنا بتا دو تم ہو کون —— کون ہو تم؟"

لڑکی ذرا سا مسکرا دی۔

عقب سے کسی بڑھیا کی آواز آئی۔ "یہ رنگے کے چھوٹے بیٹے کی منگیتر ہے، جو ہے، مولا بخش۔"

مولا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راجو کو دیکھنے لگا۔ اسے راجو کے پاس رنگا اور رنگے کا سارا خاندان کھڑا نظر آیا۔ اس کا ہاتھ ٹیک تک گیا اور پھر رسے کی طرح لٹک گیا۔ راجو پلٹ کر بڑی متوازن رفتار سے چلنے لگی۔

مولا نے لاٹھی ایک طرف پھینک دی اور بولا۔ "ٹھہرو راجو، یہ اپنی مرچیں لیتی جاؤ۔"

راجو رک گئی۔ مولا نے جھک کر ایک ایک مرچ چن لی اور پھر اپنے ہاتھ سے انھیں راجو کی گٹھڑی میں ٹھونستے ہوئے بولا۔ "تمھیں مجھ پر ترس آیا تھا نا راجو؟"

لیکن راجو ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور اپنے راستے پر ہو لی۔ مولا بھی واپس جانے لگا۔ کچھ دور ہی گیا تھا کہ بڑھیا نے اسے پکارا۔ "یہ تمھاری لٹھ تو یہیں رکھی رہ گئی مولا بخش!"

مولا پلٹا اور لٹھ لیتے ہوئے بڑھیا سے پوچھا۔ "ماسی، یہ لڑکی راجو کیا یہیں کی رہنے والی ہے؟ میں نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"یہیں کی ہے بھی بیٹا اور نہیں بھی۔" بڑھیا بولی۔ "اس کے باپ نے لام میں دونوں بیٹوں کے مرنے کے بعد جب دیکھا کہ وہ روز ہل اٹھا کر اتنی دور کھیتوں میں نہیں جا سکتا تو گاؤں والے گھر کی چھت اکھیڑی، اور یہاں سے یوں سمجھو کہ کوئی دو ڈھائی کوس دور ایک ڈھوک بنالی۔ وہیں راجو اپنے باپ کے ساتھ رہتی ہے۔ تیسرے چوتھے گاؤں میں سودا سلف خریدنے آ جاتی ہے اور بس۔"

مولا جواب میں صرف "ہوں" کہہ کر واپس چلا گیا، لیکن گاؤں بھر میں یہ خبر آندھی کی طرح پھیل گئی کہ آج مولا اپنی لٹھ ایک جگہ رکھ کر بھول گیا۔ باتوں باتوں میں راجو کا ایک دو بار نام آیا مگر پھر دب گیا۔ رنگے کے گھرانے اور مولا کے درمیان صرف گنڈاسے کا رشتہ تھا نا، اور راجو رنگے ہی کے بیٹے کی منگیتر تھی۔ اور اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی۔!

اس واقعہ کے بعد مولا گلیوں سے غائب ہو گیا۔ سارا دن گھر میں بیٹھا لاٹھی سے دالان کی مٹی کریدتا رہتا اور اگر کبھی باہر جاتا بھی تو کھیتوں، چراگاہوں میں پھر پھرا کے واپس آ جاتا۔ ماں اس کے رویے پر چونکی، مگر صرف چونکنے پر اکتفا کی۔ وہ جانتی تھی کہ مولا کے سر پر بہت سے خون سوار ہیں، وہ بھی جو بہا دیے گئے اور وہ بھی جو بہائے نہ جا سکے۔

یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ نقارے پٹ پٹا کر خاموش ہو گئے تھے۔ گھروں میں سحری کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دہی بلونے اور توے پر روٹیوں کے پڑنے کی آوازیں مندروں کی گھنٹیوں کی طرح پُراسرار معلوم ہو رہی تھیں۔ مولا کی ماں بھی چولھا

جلائے بیٹھی تھی اور مولا مکان کی چھت پر ایک چارپائی پر لیٹا آسمان کو گھورے جا رہا تھا۔ یکایک کسی گلی میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ مولا نے نوڈا الٹھ پر گنڈاسا چڑھایا اور چھت پر سے اتر کر گلی میں بھاگا۔ ہر طرف گھروں سے لالٹینیں نکلی آ رہی تھیں اور شور بڑھ رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر مولا کو معلوم ہوا کہ تین مسافر جو نیزوں، برچھیوں سے لیس تھے، بہت سے بیلوں اور گائے بھینسوں کو گلی میں سے ہنکائے لیے جا رہے تھے، کہ چوکیدار نے انھیں لوٹا اور جواب میں انھوں نے چوکیدار کو گالی دے کر کہا کہ یہ مال چودھری مظفر الٰہی کا ہے، یہ گلی تو خیر ایک ذلیل سے گاؤں کی گلی ہے، چودھری کا مال تو لاہور کی ٹھنڈی سڑک پر سے بھی گزرے تو کوئی اُف تک نہ کرے!

مولا کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے چودھری مظفر خود بنفس نفیس گاؤں کی اس گلی میں کھڑا اس سے گنڈاسا چھیننا چاہتا ہے۔ کڑک کر بولا "چوری کا مال میرے گاؤں میں سے نہیں گزرے گا، چاہے یہ چودھری مظفر کا ہو، چاہے لاٹ صاحب کا۔ یہ مال چھوڑ کر چپکے سے اپنی راہ لو اور اپنی جان کے دشمن نہ بنو!" اس نے لٹھ کو جھٹکا کر گنڈاسے کو لالٹینوں کی روشنی میں چمکایا "جاؤ ـــــ

مولا گھرے ہوئے مویشیوں کو لٹھ سے ایک طرف ہنکانے لگا "جا کر کہہ دو اپنے چودھری سے کہ مولے گنڈاسے والے نے تمھیں سلام بھیجا ہے، اور اب جاؤ اپنا کام کرو۔"

مسافروں نے مولا کے ساتھ سارے ہجوم کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو چپ چاپ کھسک گئے۔ مولا سارے مال کو اپنے گھر لے آیا اور سحری کھاتے ہوئے ماں سے کہا کہ "یہ سب بے زبان ہمارے مہمان ہیں، ان کے مالک پرسوں تک آ نکلیں گے کہیں سے، اور گاؤں کی عزت میری عزت ہے ماں! "ـــــ

مالک دوسرے ہی دن دوپہر کو پہنچ گئے۔ یہ غریب کسان اور مزارعے کوسوں کی مسافتیں طے کر کے کھوجیوں کی نازبرداریاں کرتے یہاں تک پہنچے تھے اور یہ سوچتے آ رہے تھے کہ اگر ان کا مال چودھری کے حلقۂ اثر میں پہنچ گیا تو پھر کیا ہوگا۔ اور جب مولا ان کا مال ان کے حوالے کر رہا تھا تو سارا گاؤں باہر گلی میں جمع ہو گیا تھا اور اس ہجوم میں راجو بھی تھی۔ اس نے اپنے سر پر اینڈوا جما کر مٹی کا ایک برتن رکھا ہوا تھا اور پھر منتشر ہوتے ہوئے ہجوم میں جب راجو مولا کے پاس سے گزری تو مولا نے کہا "آج بہت دنوں کے بعد گاؤں میں آئی ہو راجو؟"

"کیوں؟" تو اس نے کچھ یوں کہا جیسے "میں کسی سے ڈاتی تھوڑی ہوں" کا تاثر پیدا کرنا چاہتی ہے۔ "میں تو کل آئی تھی اور پرسوں بھی، اور نرسوں بھی۔ نرسوں تھوم پیاز خریدنے آئی، پرسوں بابا کو حکیم کے پاس لائی، کل ویسے ہی آ گئی اور آج یہ گھی بیچنے آئی ہوں "ـــــ

"کل ویسے ہی کیوں آ گئیں؟" مولا نے بڑے شوق سے پوچھا۔

"ویسے ہی، بس جی چاہا آ گئے، سہیلیوں سے ملے اور چلے گئے، کیوں؟"

"ویسے ہی ـــــ" مولا نے بجھ کر کہا، پھر ایک دم اسے ایک خیال آیا۔ "یہ گھی بیچو گی؟"

"ہاں بیچنا تو ہے، پر تیرے ہاتھ نہیں بیچوں گی"

"کیوں؟ "ـــــ

"تیرے ہاتھوں پر میرے رشتہ داروں کا خون ہے۔"

مولا کو ایک دم خیال آیا کہ وہ اپنی لٹھ کو دالان میں اور گنڈاسے کو بستر تلے رکھ کر بھول آیا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں چل سی ہونے لگی۔ اس نے گلی میں سے ایک کنکر اٹھایا اور اسے انگلیوں میں ملنے مسلنے لگا۔

راجو جانے کے لیے مڑی تو مولا ایک دم بولا "دیکھو راجو میرے ہاتھوں پر تو خون ہے ہی، اور ان پر ابھی جانے کتنا اور خون چڑھے گا، پر تمہیں گھی بیچنا ہے اور ہمیں خریدنا ہے، میرے ہاتھ نہ بیچو میری ماں کے ہاتھ بیچ دو۔"

راجو کچھ سوچ کر بولی "چلو — آؤ۔"

مولا آگے آگے چلنے لگا۔ جاتے جاتے جانے اسے وہم سا گزرا کہ راجو اس کی پیٹھ اور پٹوں کو گھورے جا رہی ہے۔ ایک دم اس نے پلٹ کر دیکھا۔ راجو گلی میں چگتے ہوئے مرغی کے چوزوں کو بڑے غور سے دیکھتی ہوئی آرہی تھی۔ وہ فوراً بولا "یہ چوزے میرے ہیں۔"

"ہوں گے۔" راجو بولی۔

مولا اب آنگن میں داخل ہو چکا تھا، بولا "ماں یہ سب گھی خرید لو، میرے مہمان آنے والے ہیں تھوڑے دنوں میں۔"——

راجو نے برتن اتار کر اس کے دہانے پر سے کپڑا کھولا تاکہ بڑھیا گھی سونگھ لے، مگر وہ اندر تپلی گئی تھی ترازو لینے، اور مولا نے دیکھا کہ راجو کی کنپٹیوں پر سنہرے روئیں ہیں، اور اس کی پلکیں یوں کمانوں کی طرح مڑی ہوئی ہیں جیسے اٹھیں گی تو اس کی بھوؤں کو مس کریں گی۔ اور ان پلکوں پر گرد کے ذرے ہیں، اور اس کی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے سوئی کی نوک کے سے قطرے چمک رہے ہیں، اور نتھنوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گھی کے بجائے گلاب کے پھول سونگھ رہی ہو۔ اس کے اوپر کے ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے، اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان ایک تل ہے، جو کچھ یوں اچٹا ہوا سا لگ رہا ہے جیسے پھونک مارنے سے اڑ جائے گا۔ کانوں میں چاندی کے بندے انگور کے خوشوں کی طرح مس مس کرتے ہوئے لرز رہے ہیں، اور ان بندوں میں اس کے بالوں کی ایک لٹ بے طرح الجھی ہوئی ہے۔ مولے گنڈاسے والے کا جی چاہا کہ وہ بڑی نرمی سے اس لٹ کو چھڑا کر راجو کے کان کے پیچھے جما دے، یا چھڑا کر یونہی چھوڑ دے، یا اسے اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ایک ایک بال کو گننے لگے یا——

ماں ترازو لے کر آئی تو راجو بولی "پہلے دیکھ لے ماسی اور گڑ کر سونگھ لے۔ آج صبح ہی کو تازہ تازہ مکھن گرم کیا تھا۔ پر سونگھ لے پہلے!"——

"نہ بیٹی میں کو نہ سونگھوں گی۔" ماں نے کہا "میرا تو روزہ مکروہ ہوتا ہے۔" پھر وہ راجو کو گھور گھور کر دیکھنے لگی اور کچھ دیر کے بعد بولی۔

"تو غلام علی کی بیٹی تو نہیں؟"

"ہاں"——

"تو پھر جا ——" ماں نے ترازو اٹھا کر ایک طرف پٹخ دی۔ "تجھے حوصلہ کیسے ہوا میرے یہاں قدم دھرنے کا۔

رشتہ تلوں کا اور سودے گھی کے ، جا!"

پھر وہ مولا کی طرف مڑی ۔ "جن پر گنڈا سے چلاتے ہیں اُن سے گھی کا لین دین نہیں ہوتا میری جان ۔ یہ گلے کی منگیتر ہے ، گجے کی ۔ رنگے کے بیٹے کی !"

راجو جس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا تھا جلدی سے برتن پر کپڑا باندھ کر اُٹھی ، اور بولی "تمھارے سینوں میں دل ہیں یا خشخاش کے دانے ۔"

مولا کے منہ پر جیسے ایک طرف اس کی ماں نے اور دوسری طرف راجو نے تھپڑ مار دیا تھا ۔ وہ بھنا کر رہ گیا اور جب راجو چلی گئی تو جلتی دوپہر میں اوپر چھت پر چڑھ گیا اور چارپائی پر لیٹ گیا ۔ وہ دیر تک یونہی دھوپ میں لیٹا رہا اور جب اس کی ماں اُسے اٹھانے آئی تو وہ رو رہا تھا ۔

"تم تو رو رہے ہو مولے ؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا ۔

اور مولا بولا "تو کیا اب روؤں بھی نہیں ؟"

ماں چکرا کر اس کے پاس بیٹھ گئی ۔ وہ بیٹے کے سوال میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ رہی تھی ۔

اب مولا گھر میں بھی نہیں بیٹھتا تھا ۔ سارا سارا دن لاری کے اڈے پر لورے نائی کے ہاں پڑا رہتا ۔ لورے نے وہاں چائے کی دکان کھول رکھی تھی ۔ شام سے پہلے جب لاری آتی تو گاؤں بھر کے نوجوانوں اور بچوں کا وہاں ہجوم لگ جاتا —— سب لورے کی چائے پیتے اور ڈرائیور سے شہروں کی خبریں پوچھتے ، اور مولا ان سب سے الگ ایک کھٹولے پر لیٹا آسمان کو گھورتا رہتا ۔ لوگ اب مولا کے عادی ہو چکے تھے ۔ وہ اس کے پاس سے حقہ تک اٹھا لاتے تھے ، مگر کسی کو اس کی لٹھ کو چھونے یا الانگنے کی جرأت نہ ہوئی جو وہاں کھٹولے کے ساتھ لگی لاری کے انجن تک تنی رہتی تھی ۔

پھر ایک روز جب شام سے پہلے لاری آ کر رکی اور اس میں سے مسافر اُترنے لگے تو ایکا ایکی جیسے سارے اڈے پر الّو بول گیا ۔ لاری میں سے رنگے کا بیٹا گلا اترا ، اس کے پیچھے چار بڑے قدآور گبرو اُترے اور پھر یا خیرا ، ایک طرف جا کر کچھ باتیں کرنے لگے ۔

مولا اس سناٹے سے چونکا اور چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔ اُس نے دیکھا کہ ہجوم سمٹ کر لورے کی دیوار کے ساتھ لگ گیا ہے اور سامنے گلا کھڑا اس کی طرف اشارا کر رہا ہے ۔ اس نے تیزی سے چارپائی پر سے پاؤں لٹکائے اور ٹیبک میں سے گنڈاسا نکال کر لٹھ پر چڑھا لیا ۔ "حقہ لانا لورے ۔" وہ پکارا ، اور زرد زرد لورا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے پاس حقہ رکھ کر غڑاپ سے دوکان کے اندر چلا گیا ۔

اب یا بچوں لوورد لاری سے کچھ فاصلے پر قطار میں کھڑے گھور گھور کر مولا کو دیکھنے لگے جس نے بے پروائی سے ایک لمبا کش لگا کر دھواں آسمان کی طرف اُڑا دیا ۔

"مولے ۔" گلے نے اسے للکارا ۔

"کہو ۔" مولا نے ایک اور کش لگا کر اب کے دھواں گلے کی طرف اڑا دیا ۔

"ہم تم سے کچھ کہنے آئے ہیں ——

"کہو کہو"۔

"گنڈاسا ایک طرف رکھ دو، ہم بھی خالی ہاتھ ہیں"۔

"لو"۔ مولا نے لٹھ کو ایک طرف گرا دیا۔

پانچوں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگے۔

ہجوم جیسے دیوار سے چمٹ کر رہ گیا۔ بچے بہت پیچھے ہٹ کر کمہاروں کے آوے پر چڑھ گئے تھے۔

"کیا بات ہے؟" مولا نے گلے سے پوچھا۔

گلا جواب اس کے پاس پہنچ گیا تھا بولا "تم نے چودھری مظفر کا مال روکا تھا!"

"ہاں"۔ مولا نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "پھر؟"

گلے نے کنکھیوں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور گلا صاف کرکے بولا "چودھری نے تمھیں اس کا انعام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ ہم یہ انعام ان سارے گاؤں والوں کے سامنے تمھارے حوالے کر دیں"۔

"انعام!" مولا چونکا۔ "آخر بات کیا ہے؟"——

گلے نے تڑاخ سے ایک چانٹا مولا کے منہ پر مارا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "یہ بات ہے!"

تڑپ کر مولا نے لٹھ اٹھائی، ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں گنڈاسا شعلے کی طرح چمکا۔ پانچوں نو وارد غیر انسانی تیزی سے واپس بھاگے، مگر گلا لاری کی پرلی طرف کنکروں پر پھسل کر گر گیا۔ لپکتا ہوا مولا رک گیا، اٹھا ہوا گنڈاسا جھکا اور جس نزادیے پر جھکا تھا وہیں جھکا رہ گیا—— دم بخود ہجوم دیوار سے اچٹ اچٹ کر آگے آ رہا تھا۔ بچے آوے کی راکھ اڑاتے بھاگتے ہوئے اتر آئے۔ نو وارد کان میں سے باہر آ گیا۔

گلے نے اپنی انگلیوں اور پنجوں کو زمین میں یوں گاڑ رکھا تھا جیسے دھرتی کے سینہ میں اتر جانا چاہتا ہے—— اور پھر مولا، جو معلوم ہوتا تھا کچھ دیر کے لیے سکتے میں آ گیا ہے، ایک قدم آگے بڑھا۔ نو وارد دکان کے سامنے اپنے کھوتے کی طرف پھینک دیا اور گلے کو بازو سے پکڑ کر بڑی نرمی سے اٹھاتے ہوئے بولا، "چودھری کو میرا سلام دینا اور کہنا کہ انعام مل گیا ہے، رسید میں خود پہنچانے آؤں گا"——

اس نے ہوتے ہوئے گلے کے کپڑے جھاڑے، اس کے ٹوٹے ہوئے طرے کو سیدھا کیا اور بولا "رسید تم ہی کو دے دیتا پر تمھیں تو دولھا بننا ہے ابھی—— اس لیے جاؤ، اپنا کام کرو——

گلا سر جھکائے ہوئے ہوئے جھکا گلی میں مڑ گیا—— مولا آہستہ آہستہ کھاٹ کی طرف بڑھا، جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا ویسے ویسے لوگوں کے قدم پیچھے ہٹ رہے تھے اور جب اس نے کھاٹ پر بیٹھنا چاہا تو اچانک کمہاروں کے آوے کی طرف سے اس کی ماں چیختی چلاتی بھاگتی ہوئی آئی اور مولا کے پاس آ کر نہایت وحشت سے بولنے لگی "تجھے گلے نے تھپڑ مارا اور تو پی گیا چپکے سے! ارے تو تو میر حلالی بیٹا تھا، پھر گنڈاسا کیوں نہ اٹھا، تو نے——!" وہ اپنا سر پیٹتے ہوئے اچانک رک گئی اور بہت نرم آواز میں جیسے بہت دور سے بولی۔ "تو تو رو رہا ہے مولے؟"—— مولے گنڈاسے والے نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اپنا ایک بازو آنکھوں پر رکھا اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بالکل معصوم بچوں کی طرح ہولے سے بولا۔ "تو کیا اب روؤں بھی نہیں!"

ندیم

کنجری

سرور گھر میں داخل ہوا تو ایک بہت بھاری خبر کے بوجھ سے اس کی کمر ٹوٹی جا رہی تھی، گلے کی رگیں پھول رہی تھیں، جیسے باتیں اس کے حلق میں آ کر اٹک گئی ہوں۔ اس کی بہت اندر تک دھنسی ہوئی آنکھیں جھکنے لگی تھیں۔ ہونٹ کھلے تھے کیونکہ بات شروع کرنے سے پہلے بند ہونٹوں کو کھولنے کا وقفہ خبر کے بھاری بھرکم پن سے خارج ہو سکتا تھا۔ "اماں" وہ چھپر تلے بیٹھی ہوئی بڑھیا کو دیکھ کر پکارا اور اس کے قریب پہنچنے تک بولتا ہی چلا گیا۔ "وہ برساتی نالے سے پرلے محلے میں جولاہوں کی رہتی تھی نا؟ بیگماں؟ — جسے پہلی بار دیکھ کر تم نے بے ساختہ کہا تھا کہ چاہے تو بڑے ٹھکانے کی کنجری بن سکتی ہے؟" — "ہاں، ہاں ہاں" بڑھیا پیڑھی سمیت اچھل کر ایک قدم آگے آ گئی اور سرور نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اپنے بیان کو جاری رکھا۔ "وہ جو تمہارے خیال میں بیٹی کمال خاتون سے ہو بہو ملتی ہے" — اس نے انکھیوں سے کمالاں کی طرف دیکھا جو چولہے کے پاس اُپلوں کے دھوئیں میں لپٹی بالکل ایک پرچھائیں سی معلوم ہو رہی تھی، اور بڑھیا نے خاموشی کے اس خلا کو پر کیا۔ "ہو بہو کہاں کہا تھا میں نے؟ — ہماری کمال خاتون جیسی آنکھیں اس کے نصیبوں میں کہاں؟ — یہ آنکھیں تو سمندر ہیں۔ شمشاد اور نو بہار کی آنکھیں سارے ملتان میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، پر ہماری بیٹی کی آنکھوں کے سامنے وہ آنکھیں بھی پانی بھریں۔ اور پھر ہماری کمالاں کے اوپر کے ہونٹ کی محراب اور نیچے کے ہونٹ کی کمان! میرا تو کئی بار جی چاہا کہ ہندو عورتوں کی طرح اپنی کمالاں کی ہر صبح کو آرتی اتارنے لگوں۔ بیگماں اچھی ہے۔ بات چیت، چال ڈھال میں قدرت نے بڑا نفیس، اور بہت اونچے درجے کا رنڈی پنا بھر دیا ہے، پر ہماری کمالاں جیسا سجاؤ کہاں اس میں ہے" — بڑھیا کی باتوں کے دوران سرور اسی طرح کنکھیوں سے کمالاں کو دیکھتا رہا اور کمالاں جلے ہوئے اُپلوں کو دست پناہ سے ٹھونس ٹھونس کر ہر طرف پھوہڑپن سے آگ بکھیرتی رہی۔ اور جب بڑھیا ڈلی چبانے کے لیے رکی تو ٹوٹے تار کو سرور نے بڑی پھرتی سے جوڑا۔ "تو اماں، وہی بیگماں رات کو اس مشہور رنڈی باز زمیندار کے ساتھ بھاگ گئی؟" "جس کے" — بڑھیا پیڑھی سمیت اُچک کر سرور کے گھٹنے سے آ ٹکرائی۔ "بھاگ گئی؟ اے سبحان اللہ، میں نہیں کہتی تھی؟ شاباش ہے اس کے دادے پردادے کو، اور لعنت اس کے باپ پر جو اسکول کے سوکھے سڑے، ٹوٹے جڑے منشی کی ہڈیوں سے باندھنے چلا تھا۔ واہ! کس کے ساتھ بھاگی؟" بڑھیا نے کمالاں کی طرف دیکھا جو بجھے بجھے چولہے میں مسلسل پھونکیں مارے جا رہی تھی، اور کڑوا کسیلا دھواں بہت گاڑھا ہو رہا تھا۔ سرور بولا "اس زمیندار کے ساتھ جس کے بارے میں اماں تم نے ہی تو کہا تھا کہ تصویر اتارنے والی مشین کے سامنے بیٹھ کر آنکھ بھر کر

دیکھیے تو مشین کا شیشہ تڑسے ہو جائے!" اب کے بڑھیا پیڑھی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹہلتی ہوئی بولی "معلوم ہوتا ہے شیرنی کا دودھ پیا ہے بیگماں نے۔ بھئی سرور بیٹے' ایسی ہی لڑکیوں کے دم سے دنیا کی بہار قایم ہے' ورنہ ان شریف زادیوں کا بس چلے تو دلوں ہیں گاتی گنگناتی دنیا کو قبرستان بنا کر رکھ دیں ——— ہاہاہا۔ لگتا ہے میں دس برس ابھی اور جیوں گی ——— رگوں میں خون ناچنے لگا ہے۔ جیو میرے سرو' کیسی گھی میں ترتراتی خبر لائے ہو تم ——— کیوں کمالاں بیٹی ؟ تمہارا کیا خیال ہے ؟"

اور کمالاں نے ہنڈیا کو چولہے پر سے کچھ ایسا جھٹکا دے کر اٹھایا کہ چلو بھر پتلی دال اچھل کر اُ پلوں پر گری اور سانپ کی طرح پھنکار کر رہ گئی۔ بڑھیا نے مسکرا کر سرور کو دیکھا اور سرور نے مسکرا کر کہا "پکی ہے ابھی تو ——— کمالاں کو دروازے پر ٹھٹھکتے دیکھ کر بڑھیا فوراً بولی۔ "دال نا ؟" ——— اور جب کمالاں ہنڈیا لیے اندر چلی گئی تو دونوں ماں بیٹا منہ پر ہاتھ رکھے کھٹکنے لگے اور پھر سرور نے افیم کی ایک بڑی گولی کی دو گولیاں بنا کر ایک کو بڑھیا کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ "ہاں" وہ بولی "آج ہی تو سالونی دال کو چکھنے کا مزہ آئے گا"۔

یہ ترتراتی ہوئی خبر کمالاں کے لیے نئی نہیں تھی' اس کا باپ اور دادی تقریباً روزانہ اسی قسم کی خبریں ڈھونڈ ڈھانڈ لاتے تھے اور انھیں کمالاں کے سامنے کچھ یوں مزے لے لے کر بیان کیا جاتا کہ بعض وقت تو کمالاں تک چونک کر پوچھ بیٹھتی تھی۔ "پھر کیا ہوا بابا ؟" اور سرور جواب میں کہتا۔ "پھر کمال خاتون بیٹا! پھر کیا ہونا تھا! لڑکی نے گاؤں بھر کے سامنے اکڑ کر کہہ دیا کہ وہ اپنی یاری نہیں توڑے گی' بھائیوں کا حلقہ توڑ کے بھاگی اور اپنے یار سے چمٹ کر رہ گئی۔ ہیر کو تو وارث شاہ نے خواہ مخواہ اُچھال دیا ہے' میں اس نگری کا بادشاہ ہوتا تو اس لڑکی کا وظیفہ لگا دیتا' اماں کی قسم" ——— کمالاں یہ باتیں سُن کر جھینپ جاتی' پھر سونے سے پہلے بستر پر کروٹوں کے درمیان سوچتی اور سوچتے سوچتے کبھی اس پر چھاج بھر ستارے برس پڑتے' کبھی چولہا بھر انگارے۔

کمالاں کا دادا سہراب خان گاؤں کا خاصا کھاتا پیتا دکان دار تھا' کہتے ہیں پنجاب کا لاٹ سر میلکم ہیلی جب اس گاؤں میں ٹڈیوں کے انڈے دیکھنے آیا تھا تو سہراب خان نے لاٹ صاحب کے سامنے گاؤں کے کنویں میں کھانڈ کی اکٹھی بیس بوریاں انڈیل دیں اور اگلے سال خان صاحب کا خطاب پایا۔ مگر جانے اس پر کیا افتاد پڑی کہ یہ خان صاحب اسے بڑے بڑے شہروں میں لے گئی اور ایک روز گاؤں والے کیا دیکھتے ہیں کہ خان صاحب سہراب خان پچاس برس کی عمر میں ایک نئی بیوی لیے گاؤں میں داخل ہو رہا ہے۔ کھسر پھسر ہوئی' مگر سارے گاؤں کی ایک ٹھاٹ دار دعوت شکوک و شبہات کو بہا لے گئی۔ البتہ ایک برس کے بعد جب نئی بیوی کے بطن سے سرور پیدا ہوا تو دایہ نے ایک عجیب ہوائی اُڑا دی' یہ دایہ بھی کسی زمانے میں ملتان ہی سے بیاہ کر آئی تھی' اُس نے شوشہ چھوڑا' کہ سہراب خان کی نئی بیوی تو ملتان کی مشہور طوائف زر تاج ہے جو وہاں تاجی کے نام سے مشہور تھی اور بلوچستان کے کئی وڈیروں اور سندھ کے کئی جاگیرداروں کے پہلو گرما چکی تھی۔ "میں نے تاجی کو نواب رن مست خان کی حویلی میں ناچتے دیکھا ہے لوگو!" ——— دایہ جگہ جگہ یوں چلاتی پھری جیسے اس راز کو فاش نہ کیا تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔ "اپنی اولاد کی قسم کھاتی ہوں کہ یہ خان صاحبنی وہی تاجی ہے کنجری"۔

اور یہ لفظ سارے گاؤں میں گونج گیا "کنجری۔ کنجری!" سہراب خان کی دکان اجڑ گئی' وہ دکان کا سامان اٹھوا کر گھر میں روپوش ہو گیا۔ پائی تک کا محتاج ہو گیا تو رات کی رات گاؤں سے بھاگا اور کہتے ہیں کہ لائل پور میں کسی وکیل کا

منتشی ہو گئیں۔ سرور ابھی دس برس ہی کا تھا کہ خان صاحب سہراب خان اپنے گاؤں والوں کو گالیاں دیتا چل بسا۔ تاجی سرور کی انگلی پکڑے پھر سے گاؤں میں آئی اور سیدھی بھری چوپال میں داخل ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ اس نے رو رو کر گاؤں کے سامنے ایک تقریر کی اور قسمیں کھا کھا کر کہا کہ وہ کنجری ضرور تھی مگر اب برسوں سے توبہ کر چکی ہے، اب وہ ایک دکھی بیوہ ہے اور خدا کے بعد یہ دس برس کا لڑکا اس کا سہارا ہے، کیا یہ گاؤں جس پر اس لڑکے کے ابا کے بے شمار احسان ہیں، انھیں اپنے گھر میں سر چھپانے کی اجازت نہیں دے گا؟ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں فیصلہ کیا کہ کوئی خاص ہرج نہیں ہے، تاجی نے گاؤں میں کوئی دس برس بڑے امن سے کاٹے اور وہ بڑے پرامن طریقے سے نوجوانوں اور نو عمر لڑکوں کے درمیان یاریوں دوستیوں کے تانے بانے بنتی رہی اور اپنا پیٹ پالتی اور نشہ پورا کرتی رہی۔ پھر جب سرور جوان ہو گیا تو اس کے لیے کسی اور گاؤں میں ایک غریب سی لڑکی بھی چن لی، بیاہ ہوا اور سال بھر کے بعد کمال خاتون پیدا ہوئی، مگر زچگی کی حالت میں سرور کی بیوی مر گئی۔ وہ لٹا لٹا سا رہنے لگا اور پھر نہ جانے اس کے من میں کیا سمائی کہ چند روز بعد ہی گاؤں چھوڑ کر ملتان بھاگ گیا۔ تاجی کمال خاتون کو مختلف ماؤں کے ہاں لیے پھری کہ وہ اسے چند مہینے دودھ پلا دیں اور اس کی دعائیں لیں۔ لیکن اس دوڑ دھوپ میں اسے معلوم ہوا کہ وہ تو اب تک کنجری ہے، ایک رات کمال خاتون کو ایک کپڑے میں لپیٹا، گاؤں کے مولوی صاحب کے دروازے پر رکھا اور گاؤں سے بھاگ گئی۔ پانچ چھ برس تک ماں بیٹا ملتان میں کوکین کی تجارت کرتے رہے — چند وختے بھی کھول لیے۔ اور ڈیرہ اسمٰعیل خان سے چرس لا لا کر بھی بیچتے رہے، مگر سرور ایک بار چرس لاتے ہوئے پکڑا گیا اور ایک برس کے لیے جیل چلا گیا۔ تاجی سے کاروبار سنبھل نہ سکا اور جب سرور جیل سے رہا ہوا تو وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ بہترین تجارت لڑکیوں کی ہے، ایک لڑکی بھی چکلے میں بٹھانے کو مل جائے تو اس کی آمدنی سے چاہو تو موٹر تک خرید لو۔ ایک سال تک تو سارے پنجاب میں کسی آوارہ لڑکی کی تلاش میں بھٹکتے پھرے، مگر کوئی بھی ان کے ہتھے نہ چڑھی۔ آخر ایک دن بہاولپور شہر کے ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے تاجی کا نوالہ اس کے منہ تک جاتے جاتے رک گیا اور وہ بولی "سرو بیٹے — وہ ہماری کمال خاتون اگر زندہ ہوئی تو اب کے برس کی ہوئی؟" سرور ہڈی سے گودا نکالنے کی کوشش میں تھا، چونک کر بولا "ارے! آخر تم نے پہلے کیوں یاد نہیں دلایا اماں؟ وہ تو اب یوں سمجھو کہ کوئی سات آٹھ برس کی ہو گی۔ پانچ چھ سال کے اندر اللہ نے چاہا تو ——" اور اس نے زور سے چٹکی بجائی، تاجی نے نوالہ وہیں چھوڑ دیا۔ اٹھلاتی ہوئی اور کمالاں کی یاد میں روتی ہوئی ماں بیٹا افیم کی کافی مقدار شہر بہ شہر تولہ تولہ کر کے خریدتے ہوئے اپنے گاؤں میں آئے، تو مولوی صاحب نے خدا کا شکر ادا کر کے آٹھ برس کی کمالاں ان کے سپرد کر دی اور جب روتی چلاتی کمالاں گھر میں آتے ہی مصلا بچھا کر نماز پڑھنے لگی، تو بڑھیا اور سرور مکان کے ایک گوشے میں جا کر منہ پر ہاتھ رکھے دیر تک کھلکھلاتے رہے اور کہتے رہے "پیڑ کا رخ غلط ہے، تنے میں رسہ ڈال کر اسے سیدھا کرنا پڑے گا!"

تنے میں بار بار رسہ ڈالا گیا مگر کچھ دیر بعد پیڑ جھک جاتا اور رسہ تڑخ سے ٹوٹ جاتا۔ پیڑ کا رخ معین ہو چکا تھا۔ کئی بار تو ماں بیٹا مایوس ہو کر کمالاں کو پھر سے مولوی صاحب کے حوالے کر کے ہمیشہ ملتان جا بسنے کا فیصلہ کر لیتے۔ مگر پھر کمالاں سر پہ گھڑا رکھے آنگن میں داخل ہوتی اور بڑھیا کہتی "دیکھ دیکھ سرو بیٹے! ذرا دیکھ تو اس بڑھتی ہوئی قیامت کو۔ قد کیسا بوٹا سا ہو رہا ہے اور چال میں کتنی مستی ہے، ہونٹ دیکھو، لگتا ہے اللہ نے اپنے ہی ہاتھ مبارک سے تراشے ہیں اور آنکھیں! یہ تو سمندر ہیں۔

ملتان کا ملتان ڈوب مرے گا ان میں۔ اس روز چکی پیس رہی تھی اور ساتھ ساتھ گا بھی رہی تھی۔ سارا محلہ رہے سر کی قسم میں سمجھی کلکتے والی گوہر جان پھر زندہ ہو گئی ہے۔ آواز میں وہ قدرتی مرکیاں اور تھرتھریاں ہیں کہ ہز ماسٹرز وائس چالیس چالیس پچاس پچاس ہزار میں ایک ریکارڈ بھروائے گا اس سے، اور وہ بھی ناک سے لکیریں کھنچوا کر۔ میں تو نہیں جاؤں گی ملتان۔ میں تو اس کو لے کے جاؤں گی وہاں۔"

کمالاں وہ بلوغ بالکل عید کا چاند ہو کر رہ گیا تھا، گرچہ مسئلے کھیٹ جانے کے بعد دوسرا مسئلہ پیدا نہ ہو سکا، مگر کمالاں دن میں ایک دو بار اپنی لمبی ڈھلی ہوئی چادر یا چوٹے پر نماز پڑھ ہی لیتی تھی۔ پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ شروع شروع میں وہ دادی اور باقی باتیں سن سن کر یوں چونک اٹھتی تھی جیسے نیند میں ڈر گئی ہے۔ کئی بار اس نے مولوی صاحب سے شکایت کر دینے کی بھی دھمکی دی، مگر دادی نے سمجھایا کہ تم نہیں جانتیں بیٹا۔ اب تم خود بھی بڑی ہو گئی ہو نانی تو ایسی ہی باتیں کرتی ہے۔ خود مولوی صاحب بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہوں گے بچپن میں۔ تم بڑی بھولی ہو۔ پر اب تو نہیں کھیلتیں نا؟ آج سے دو سال پہلے تم کنوئیں سے ایک دو سی گگریا بھر کر لا سکتی تھیں۔ آج دو ملکے سر پر رکھے ہرنی کی طرح کچیں بھرتی ہوئی آتی ہو؟ تو یہ دنوں کا پھیر ہے میری جان۔ پھر اب بس چند مہینوں ہی میں تم دیکھو گی کہ تمہیں راتوں کو نیند نہیں آتی، جاگنے میں تمہیں مزا آئے گا اور اندھیرے میں تم کچھ ٹٹولنے کی کوشش کرو گی اور کچھ نہ پا کر اداس ہو جاؤ گی۔ سمجھ گئیں میری رانی؟ بس اب چند ہی مہینوں کی بات ہے۔"

"بس اب چند ہی مہینوں کی بات ہے!" بڑھیا سرور کو اطلاع دیتی

اور سرور ناک بھوں چڑھا کر کہتا "یہاں ایک ایک دن مہینہ ہو رہا ہے اور تم کہتی ہو کہ بس اب چند ہی مہینوں کی بات ہے۔ تم بھی کمال کرتی ہو اماں۔ ذرا سا افیم کا کاروبار چلا رہا تھا، پر یہ پولیس اور آبکاری والے بہت دور دور تک سونگھنے لگے ہیں۔ جس کے ہاتھ بھی افیم بیچتا ہوں، وہ پولیس کا مخبر نکلتا ہے۔ مہینے میں کل پندرہ بیس کی بکری ہوتی ہے۔ اب بتاؤ ان پندرہ بیس میں ہم دونوں اپنا نشہ پورا کریں یا کھائیں پئیں۔ اور ادھر تم ہو کہ نہیں۔ ویسے کبھی دل کچھ ہوتا ہے تو سوچتا ہوں۔ کمالو چپکے لائق نہیں، اس کی آنکھوں میں جو سادگی کی چمک ہے نا اماں وہ نہ ہو تو ... تو بہار میں۔"

بڑھیا بیٹے کی باتیں سن کر ہنس دیتی۔ "اے پگلے، یہ تو کبھی مولوی تو نہیں بنا دار، یہ سادگی کی چمک کسی آنکھوں میں نہیں ہوتی، ہوتی تو ہے پر غائب ہو جاتی ہے۔ مجھے جو ذرا غور کر دیکھو کر یہ بھی تو ... تو یہ بھی کبھی ... چمکا ہوگا۔ پگلے، لا آج کی افیم لا۔"

دونوں کمالاں کی جوانی کی یوں راہ تکا کرتے تھے جیسے چائے کی کیتلی کو چولہے پر رکھ کر پانی کے ابلنے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اور پھر ایک روز آلا جب کنوئیں پر جاتی ہوئی کمالاں کا ایک کسان تاورے نے چھیڑ دیا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا اور جب کمالاں کا پاؤں کسی گڑھے میں یا کسی کنکر پر پڑتا تو وہ کہتا "سنبھل کے ذرا سنبھل کے۔" کمالاں بہت دیر کے بعد اس دعائیہ کلمے کی تکرار سے چونکی۔ پلٹ کر بولی "اپنی راہ لو جا کر۔" نوجوان نے کہا "تو کیا میرے تیر سب کھائی ہی بھاگے ہیں مہربان۔" کمالاں نے کہا "آپ اپنی راہ لے۔" شوق ہوا "نوجوان نے مسکرا کر" ...

مرچکی ہے پیارو" کمالاں آپے سے باہر ہوگئی۔ قادرے کو وہ بے بھاؤ کی سُنا ئیں کہ آن کی آن میں کنویں کی جگت خالی ہوگئی۔ لڑکیاں کمک کو بھاگی آئیں۔ قادرا لپک کر دور نکل گیا اور وہاں سے پکارا۔ "آخر کنجری ہونا کنجری!"۔ وہ لڑکیاں جو ملے ہمدردی کے کمالاں کے پاس جمع ہوگئی تھیں، ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں، گنگنائیں اور پھر زور سے قہقہے مارنے لگیں۔ کمالاں نے گھڑے زمین پر دے مارے اور روتی چلاتی واپس گھر آگئی۔ پہلے تو دیر تک بلک بلک کر روتی رہی۔ پھر دادی اور ابا کی تسلیوں کے سہارے آنسو پونچھ کر بڑی رقت اور سوز سے سارے حادثے کی کیفیت بیان کی اور جب آخر میں غصے میں گھڑے توڑ دینے کا ذکر کیا تو دلاسہ پانے کی خاطر دادی کو دیکھا اور دادی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ حیران ہو کر ابا کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں ذرا غصہ تھا جو آنکھیں ملتے ہی کافور ہوگیا اور جب بڑھیا نے اس سے مخاطب ہو کر کہا "چراغ بہت بری طرح بھڑک اٹھا ہے سرو بیٹے!" تو دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔

اس روز سے کمالاں ایک دم سے بدل گئی۔ کنویں پر جاکر گھر میں سُنی ہوئی باتیں ایسے جوش سے سُناتی جیسے کسی سے انتقام لے رہی ہو۔ نوعمر لڑکیاں سنتیں، لیکن جھینپ جھینپ جاتیں اور بڑی بوڑھیاں ایک دوسرے کے کانوں پر منہ رکھ کر کہتیں۔ "آخر کنجری ہے نا کنجری" یہ سب کچھ سن کر بھی کمالاں کے تیور نہ بدلتے، اور وہ اغوا اور آشنائیوں کی کہانیاں بڑے ٹھسے سے سناتی چلی جاتی۔ گھر آتی تو دادی اور ابا سے نئی خبر سنانے کا تقاضا کرتی اور منہ کھول کر بڑی بے حیا ہنسی ہنسنے کی کوشش کرتی، بڑھیا تاجی اور سرور یہ آثار دیکھ کر خوش ہوتے اور جب کمالاں سو جاتی تو بہت رات گئے تک مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے رہتے "ہولے ہولے ایسی سدھائی ہے کہ ملتان پہنچے گی تو دوسری شان دار کنجریوں کے کلیجے دھک سے رہ جائیں گے، دیکھ لینا بیٹا" بڑھیا ہوائی قلعے تعمیر کرتی رہتی، ان قلعوں کے دریچوں میں بیٹھی ہوئی بنی ٹھنی کمالاں اسے ہنستی، مسکراتی، اشارے کرتی اور آنکھیں مارتی نظر آتی، اور پھر وہ بے قرار ہو کر اُٹھتی "اے ہے کیسا جی چاہ رہا ہے اپنی رانی بٹیا کو ایک نظر دیکھنے کے لیے" وہ سوئی ہوئی کمالاں کے پاس آکر اسے مسکرا مسکرا کر بڑے غور سے دیکھتی۔ پھر اس کی ایک لٹ کو اس کے چہرے پر ڈال کر بیٹے کو پکارتی۔ "ذرا ادھر تو آنا سرو بیٹے، دیکھنا تو لبنا بیٹی کو، تیری قسم اگر میں مرد ہوتی تو تیرے سامنے دس ہزار روپے رکھ کر اس کی مینڈھی کھلواتی" پھر وہ اس کی بلائیں لیتی اور رات بھر موٹروں، گدگدے بستروں اور کوکین کے نشوں کے خواب دیکھتی رہتی۔

لیکن کمالاں ایک روز پھر سے بدل گئی، کسی نے اسے بتایا کہ جس قادرے نے اسے چھیڑا تھا وہ ایک اور نوجوان کے ہاتھوں پٹ گیا ہے، کمالاں پر اس بے خبری نے کوئی خاص اثر نہ چھوڑا، مگر جب کہنے والی نے کہا کہ "تیرے نام پہ لڑائی ہوگئی۔ قادرا تیرے بارے میں ننگی ننگی باتیں کررہا تھا کہ ایک دم ابراہیم اس پر ٹوٹ پڑا اور دھنک کر ڈال دیا۔ ابراہیم کو تم جانتی ہو؟ اری یہی ابراہیم فوجی"۔ تو کمالاں کو گھبری سی آگئی اور اس کے بعد وہ احساس جمال اور احساس محبت کی سنجیدگی میں لپٹی رہنے لگی۔ ماں بیٹا کمالاں کے کردار کی اس دھوپ چھاؤں سے گھبرا سے گئے۔ لیکن اپنی ریاضت میں کمی نہ آنے دی، افیم کی گولی ذرا سی موٹی ہوگئی اور جماہیوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا، مگر کمالاں کی جوانی پر تکیہ لگائے رکھا۔ کمالاں بھی اگر اب منہ پھاڑ کر نہیں ہنستی تھی، اور ادھر لڑکی کی حرکتوں اور لڑکے کی صورت شکل کے بارے میں کرید کرید کر نہیں پوچھتی تھی تو کبھی میٹھی باتیں سن سن کر روتی اور جھلاتی بھی نہیں تھی۔ ایک روز ابراہیم فوجی کو گلی میں جاتے دیکھ لیا تو بغیر سوچے سمجھے مسکرانے لگی۔

جواب میں ابراہیم بھی مسکرا دیا تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر گھر آگئی۔ رات کو حالات کا جائزہ لینے کے بعد بڑھیا اور سرور سونے لگے تو انھوں نے مدتوں کے بعد کمالاں کو "رگی" میں گاتے سنا۔ دونوں ایک ساتھ بستروں پر اٹھ بیٹھے اور دم سادھے اس کا گیت سنتے رہے۔ اور جب گیت ختم ہوا تو بڑھیا نے چپکے سے کہا "چوٹ لگی ہے صاف چوٹ لگی ہے، تمھاری ہی قسم بیٹا، چوٹ نہ لگے تو آواز میں پینگوں کا سایہ اُتار چڑھاؤ مشکل ہی سے آپاتا ہے۔ اہا ہاہا، لطف آگیا!" امید کے پھول جنھوں نے اب تک سر نیہوڑا لیا تھا، ترو تازہ ہو کر سربلند ہو گئے۔ اور کمالاں کی آواز کے ہلکوروں میں جھومنے لگے۔

ہوتے ہوتے جب تقریباً روزانہ کمالاں اور ابراہیم آپس میں مسکراہٹوں کا تبادلہ کرنے لگے تو اسی رفتار سے گھر کے معاملات میں کمالاں محتاط ہوتی گئی۔ یہ وہ دن تھے جب گھر میں پتلی دال پکنے لگی تھی، دادی سارا دن پیڑھی پہ بیٹھی افیم کی پینک میں گم رہتی تھی، یا کبھی کبھار قصبے سے سرور کی لائی ہوئی چھالیا کترتی اور پھانکتی اور چباتی رہتی، اور سرور موچیوں اور جلاہوں کی دکانوں پر بیٹھ، افیم بیچتا اور نت نئی خبریں سن کر اور اکثر گھڑ کر گھر لاتا۔ ماں بیٹا صرف اُس وقت باہر کی خبروں پر تبصرہ کرتے، جب کمالاں بھی کہیں آس پاس موجود ہوتی۔ پھر بڑے جہاں دیدہ بن کر کمالاں کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ دیکھتے اور رات گئے تک اس کی پلکوں کے بار بار جھپکنے کے معانی اور سینے پر بار بار دوپٹے کو پھیلانے کے اسرار و غوامض پر مغز زنی کرتے سو جاتے، لیکن اب تک ان میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی تھی کہ کمالاں سے براہِ راست اور دو ٹوک انداز میں عصمت فروشی کے لیے کہتے۔ بس جال بچھاتے رہے، دانہ ڈالتے رہے اور انتظار کرتے رہے، مگر چڑیا کو دانے کی ہوس ہوتی تو جال میں پھنستی۔ بعض وقت سرور تنگ آکر کہتا "اماں اس حرامزادی کو اٹھا کر ملتان میں لے جائیں۔ ایک بار شمشاد اور نوبہار اور امیرو وغیرہ کے حلقے میں بیٹھی تو سارے نخرے ہرن ہو جائیں گے۔" مگر بڑھیا تاجی دوراندیشی سے کہتی "نہیں بیٹا! وہاں جا کر خود ہرن ہو گئی تو کیا کرو گے؟ ابھی کچی ہے نا، پک جانے دو، آپی ٹپکنے دو، اور پھر تم پولیس کو نہیں جانتے تھانیدار آنکھوں آنکھوں میں ڈاکٹری کر لیتے ہیں۔ انھیں اگر پتہ چل گیا کہ کمالاں پورے چودہ کی بھی نہیں تو میری تمھاری باقی عمریں جیل میں کٹ جائیں گی۔ جہاں آٹھ دس برس انتظار میں گزارے ہیں وہاں چند مہینے اور سہی، آخر اپنی بیٹی ہے کوئی غیر تو ہے نہیں کہ کان سے پکڑ کر لے جائیں۔ بیٹھے بٹھائے، نہ بیٹھے نہ بٹھائے، یہاں تو عمر بھر کا ساتھ ہے۔ نسلوں کا نصیبہ کھل جائے گا میرے لال۔ ذرا سا اور دیکھ لو۔"

ایک روز سرور گھر میں آیا تو تھکا ماندہ سا بڑھیا کی پیڑھی کے پاس بیٹھ گیا اور بولا "کچھ نہیں اماں، لطف نہیں آیا۔"

بڑھیا بولی۔ "میں پہلے سے سمجھ گئی تھی کہ سرور بیٹا خالی خالی سا آرہا ہے۔"

سرور نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کنپٹیاں دبائیں اور بولا "گلابی اور نواز میں بڑی مدت سے یارانہ چل رہا تھا، میں تو رفتار سے پہچان لیتا ہوں کہ کلیجے میں کتنا گہرا گھاؤ ہے۔ لوگ یقین نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے نواز نمازی ہے اور آنکھیں جھکا کے چلتا ہے۔ میں کہتا تھا بھئی جو لوگ نظریں اٹھا کے چلتے ہیں اُن پر تم شبہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ آنکھیں جھکا کے چلو، پر جو آنکھیں جھکا کے چلتا ہے اس پر ہم شبہ کیوں نہ کریں اور اس سے کیوں نہ کہیں کہ بھئی یہ نیچی نظر تو بڑی خطرناک ہے، نظریں اٹھا کر چلا کرو۔ سو آج میں کلے جولاہے کے ہاں افیم بیچ کر آرہا تھا کہ سلطانے کے کھنڈر کے پاس مجھے گلابی نظر آئی۔ چھپنے کی

کوشش میں تھی پر میں نے دیکھ لیا اور جو میں کھنڈر کی دیوار پر سے جھانکتا ہوں تو اندر یہ نمازی نواز دبکا بیٹھا ہے۔ اور پھر پلٹ کے دیکھتا ہوں تو گلابی گاؤں میں داخل ہو رہی ہے۔ میں نے نواز سے صرف اتنا کہا "کیوں پیارے نماز پڑھ رہے ہو؟" مجھے من بھر کی گالی دے کر چاقو نکال لیا اور بولا "یہ کوئی تیرے باپ سہراب کا کھنڈر ہے؟" پر اماں! چھپنے چھپانے سے چھپتی تو نہ ہیر بدنام ہوتی نہ سوہنی۔ خیر، میں نے واپس آ کر موچی کی دکان پر ذکر کیا تو سب نے مجھے جھوٹا قرار دیا ہے۔ میں نے پیر دستگیر کی قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میں نے بس ابھی، ابھی دونوں کو اکٹھے دیکھا ہے کہ ایک دم جیسے دکان پر آ تو بول گئی۔ سامنے یہی گلابی ہاتھ میں جوتا لیے کھڑی ہے۔ "اسے کل تک مرمت کر دو بھائی" اس نے موچی سے کہا اور جوتا پھینک کر چل دی۔ ایسی بھد ہوتی ہے اماں کہ جی چاہتا ہے زمین پھٹے اور اس میں سما جاؤں۔ بڑے آئے سچی یاری لگانے والے، چھپ چھپ کے ملتے ہیں اور ــــ حرامزادے!"

اور کمالاں نے سوچا کہ آخر ابا کو ان کے چھپ چھپ کر ملنے سے کیا تکلیف ہوئی، وہ ملتے ہیں تو ابا کا کیا جاتا ہے؟ یہ تو نہیں کرتے نا کہ کمر سے چادر کھول کر سر پر رکھ لی، اور عشق کا نام بدنام کیا۔ پھر اچانک وہ خیال ہی خیال میں گلابی کے روپ میں سلطانے کے کھنڈر میں جا پہنچی، جہاں ابراہیم نواز کے روپ میں بیٹھا اُس کی راہ تک رہا تھا۔ اور پھر ــــ

بڑھیا کی آواز نے اسے چونکا دیا "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟ عشق کماتے پھر رہے ہیں ماں کے لاڈلے، دھن ہو بیگماں جس نے بھائیوں کا حلقہ توڑ کر اپنے یار کے سینے پر سر رکھ دیا۔ دنیا بھر کے سامنے، مزا آیا نا عشق کرنے کا"

"دادی" کمالاں بولی اور وہ بہت مدت کے بعد اس نوعیت کی گفتگو میں حصہ لینے لگی تھی اس لیے دادی اور ابا دونوں "جی۔ جی" کہتے ہوئے اس کی طرف گھوم گئے اور وہ بولی "آخر آپ ان کے چھپ چھپ کر ملنے پر اتنے دکھی کیوں ہیں؟ ــــ"

بڑھیا اسے راہ راست پر لانے کے لیے واعظانہ لہجے میں بولی "دیکھ بیٹی رانی ــــ سُن، بات یہ ــــ"

مگر سرور نے بات کاٹ دی، "ٹھہرو اماں! بیٹی کمال خاتون سے میں بات کروں گا۔ یہ بتاؤ کمال خاتون بٹیا کیا تم چھپ چھپ کر ملنے کو برا نہیں سمجھتیں؟"

"کس سے"؟ کمالاں نے پوچھا۔

"کسی سے۔ جس سے میں کہوں یا جس سے تم چاہو۔ ملو گی؟" سرور نے تن کر کہا۔

"خدا تمھارا بھلا کرے!" بڑھیا نے سرور کو داد دی "کیا بات سے بات پیدا کی ہے اور وہ بھی سو بات کی ایک بات۔ ہاں تو بتاؤ بیٹی، جواب دو۔ ملو گی؟"

کمالاں تو جیسے طوفان میں گھر گئی تھی، چکرا سی گئی، اور پھر ایک ہی جست میں جیسے اسے کنارہ مل گیا۔ بولی "ہاں! پر جس سے میرا اپنا جی چاہے گا"

"ہاں ہاں جس سے تیرا اپنا جی چاہے گا" بڑھیا کی باچھیں کھل گئیں۔

"بالکل ــــ اچھا تو کون ہے وہ؟" سرور نے پوچھا۔

جواب کے انتظار میں بڑھیا اور سرور نے سانسیں روک لیں اور پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ کمالاں کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آئی جو دیکھی نہیں جا سکتی تھی، صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ بولی "ایسا تو کوئی نہیں!"

بڑھیا کی باچھیں سمٹ گئیں۔

سرور ٹہلتا ہوا آنگن کے پرلے گوشے تک چلا گیا اور جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی "حرامزادی"۔

اس رات بڑھیا دیر تک روتی رہی۔ پھر ایکا ایکی اس کی سسکیاں رک گئیں اور ٹوٹتی رات تک ماں بیٹے میں کھسر پھسر ہوتی رہی۔ اس رات کمالاں کو بھی بڑی پریشان نیند آئی۔ آنکھیں کھلتیں تو اندھیری چھت کو گھورتی رہ جاتی اور پھر یک دم آنکھیں بند کر کے سر کو تکیہ کی طرف [illegible] ہوئے [illegible] میٹھے چیتھڑوں میں یوں جا دیتی جیسے کسی بہت میٹھے خواب کے چابک کو رفو کرنے چلی ہے۔

دوسرے روز بڑھیا اور سرور کا طرز عمل بہت بدلا بدلا سا تھا۔ بڑھیا بے چین ہو ہو کر پیڑھی پر سے اٹھ بیٹھی اور کھانستی کھنکارتی ادھر ادھر گھومنے لگتی۔ ٹوٹے ہوئے [illegible] کی مرمت کرتے ہوئے کمالاں نے ایک بار پوچھا "کیا بات ہے دادی؟"

"[illegible] بیٹا! کوئی خاص بات نہیں" بڑھیا بولی "جوانی کمبخت یاد آ رہی ہے۔ [illegible] ٹوٹ کر آئی تھی کہ جی چاہتا تھا پہاڑوں کو سینے سے بھینچ کر نچوڑ کر سرمہ بنا کے آنکھوں میں ڈال لوں۔ سر سے پیروں تک سے کوئی چیز پھوٹ کر نکلنے کو دھڑکتی رہتی تھی۔ تمھیں دیکھ کر وہ گھڑیاں یاد آ گئیں" [illegible]

سرور بھی اس روز دن میں کئی بار گھر کے چکر لگا گیا۔ ایک مرتبہ کمالاں نے اس سے بھی پوچھ لیا "کیا بات ہے بھائی؟"

"آبکاری کا افسر دورے پر آیا ہے بہن" وہ بولا "ذرا سی افیم تھی، ادھر ادھر کر دی ہے کہیں چھاپہ نہ پڑ جائے۔ افیم ہاتھوں سے نکل گئی تو تینوں کے تینوں فاقوں مر جائیں گے۔ بار بار آتا ہوں کہ دیکھوں کہیں سچ مچ چھاپہ پڑ تو نہیں گیا۔ لوگ ہمیں کنجر کہتے ہیں نا بہنی، پنچ سمجھتے ہیں ہمیں، اس لیے کچھ دور نہیں کہ کوئی افسر [illegible] شکایت جڑ دے خواہ مخواہ"۔

کمالاں کو رونا آ گیا۔ کتنا دکھی ہے بے چارا بابا۔ ابھی چالیس برس کا بھی نہیں ہوا لیکن نچڑا ہوا سا ہے۔ دھنسے ہوئے گال، کہیں دور اٹھی ہوئی آنکھیں جیسے کنوئیں میں گر پڑی ہوں۔ ذرا سی آمدنی میں تین جانوں کو سہارے ہے۔ ننگی گندی باتیں کرتا ہے تو کیا ہوا۔ نماز بھی پڑھے گا تو پیچھے کہ تو افیم کی کوئی [illegible] ہی عادت سے نسیبے بدتے تو کیا گاؤں کے مولوی صاحب جیسے پرہیزگار اور نیک انسان آج اس نگری کا بادشاہ نہ ہوتے۔ جب سرور بابا۔۔۔ وہ چپکے چپکے روتی اور آنسو پونچھتی رہی اور ماں بیٹے تو آنگن کے گوشوں میں سرگوشیاں کرتے پھرتے رہے۔

اور شام کو کھانا کھاتے کھاتے اچانک بڑھیا کا [illegible] منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں رہ گیا۔ اور وہ پیڑھی پر سے یوں چکرا کر گری کہ ایک بار تو سرور اور کمالاں دونوں سناٹے میں آ گئے۔ پھر سرور نے لپک کر بڑھیا کو اٹھایا اور بیٹھا دیا۔

"اماں۔ اماں"

"دادی۔ دادی" کمالاں چلائی۔

"بیٹی۔ بیٹی" بڑھیا کراہی۔ "درد ہے پیٹ میں آج رات۔ لگتا ہے [illegible] گئی۔ اے بیٹا ہو کی تمیز ہوتے۔

اے کسی سیانے کو بلواؤ بیٹا کسی سیانے کو بلواؤ۔"

سرور نے بڑھیا کو اٹھا کر کھاٹ پر ڈال دیا۔ "قلنج ہے تو جیون بوٹی سے یوں چٹکی میں آرام آجائے گا۔ کہیں دیکھی تو ہے میں نے ـــــ جانے کہاں دیکھی ہے۔ پر جانے کہاں دیکھی ہے۔"

"قبرستان میں؟" بڑھیا نے مارے درد کے سمٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں اماں۔"

"مسجد میں؟" کمالاں نے پوچھا۔

"نہیں بیٹی۔ وہاں تو کنوار ہے، میں جیون بوٹی کی بات کر رہا ہوں۔"

"تو پھر کہاں دیکھی ہے؟" بڑھیا نے آنکھیں بند کر کے یہ الفاظ یوں ادا کیے جیسے اپنے سینے میں سے اپنے ہاتھوں سے خنجر نکال رہی ہے۔ "جلدی سے یاد کرو ورنہ میں چلی۔ میں چلی میری بیٹی رانی۔"

سرور گھبراہٹ میں اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔

اچانک بڑھیا بولی۔ "سلطانے کے کھنڈر میں؟"

اور سرور نے تالی بجادی۔ "جیو اماں، کیا وقت پر یاد دلایا ہے۔ وہیں ہے جیون بوٹی۔ میں ابھی لایا" اور باہر جانے کے لیے اس نے پگڑی سر پر لپیٹنا شروع کی۔

بڑھیا کراہی "تم میرے پاس رکو بیٹا۔ جانے تمھارے پیچھے کیا ہو جائے۔ کمال خاتون چلی جائے گی۔"

"میں چلی جاؤں گی بابا۔" گھبرائی ہوئی کمالاں نے جوتا پہن لیا۔

اور سرور بولا۔ "دیکھ بیٹا! ایک بڑے کوٹھے کا کھنڈر ہے ایک چھوٹی سی کوٹھری کا۔ چھوٹی کوٹھری کے کھنڈر کی دکھنی دیوار کی جڑ میں اک اُگ رہے ہیں۔ ان کے نیچے مولی ایسے بڑے بڑے پتوں والی ایک بوٹی اُگ رہی ہے۔ ایک پتہ بھی مل جائے تو اماں کے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔"ـــــ

"اچھا بابا۔ میں بس پل جھپکنے میں آئی۔" کمالاں نے باہر لپکتے ہوئے کہا۔

سلطانے کے کھنڈر کے پاس اندھیرے میں ایک کتا رو رہا تھا۔ تیزی سے آتی ہوئی کمالاں کو دیکھ کر اُس نے پیٹ سے لگی ہوئی دم کو اٹھا کر بھونکنے کی کوشش کی، مگر صرف "ٹیاؤں" کی آواز نکال پایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اب تک کمالاں بہت جوش سے چلی آرہی تھی، کتے کے رونے اور بھاگنے کی آواز سے وہ ہولا گئی اور ٹھٹک کر رہ گئی۔ پھر چھوٹی کوٹھری کے کھنڈر میں قدم رکھا تو ٹوٹی پھوٹی دہلیز کے کسی سوراخ پر بیٹھے ہوئے جھینگر نے اچانک دم سادھ لیا اور اس سناٹے میں دور کے جھینگروں کی آواز بڑی ڈراؤنی معلوم ہونے لگی۔ خود کمالاں نے بھی جیسے اس لمحے کی ہیبت سے دم سادھ لیا اور گھستے ہوئے تہبند کو دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں سے اٹھائے آگے بڑھی۔ آک کے سوکھے پتوں کو چھوا تو وہ اپنی بھونڈی آواز میں بج اُٹھے، خاموشی میں ان کی آواز معمول سے کہیں اونچی اور پھٹی پھٹی معلوم ہوئی۔ پھر وہ آک کے پاس بیٹھ کر اس کی جڑوں میں جیون بوٹی ڈھونڈنے ہی لگی تھی کہ یکایک آک کے بہت سے پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی اور آک کے پیچھے سے ایک سایہ جیسے کھنڈر کی دیوار سے ہی سر نکالتا ہوا اُٹھا اور آواز آئی "آگئیں میری جان۔"ـــــ چیخ جیسے کمالاں کے حلق میں ہڈی کی طرح اٹک کر

رہ گئی۔ ان گلابی جاڑوں میں بھی اس کا جسم تپ گیا اور جگہ جگہ سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ "میں جانتا تھا تم کبھی نہ کبھی ضرور آؤ گی۔ اور آخر آج ـــــ" کمالاں اپنی قوت سے جست سی لگا کر کوٹھڑی کے باہر آ رہی کہ بولنے والا اس قطعی غیر انسانی قوت سے بوکھلا سا گیا اور پھر کمالاں بھاگ اٹھی۔ اس وقت اس کے تمام حواس بہت تیز ہو رہے تھے، وہ جانتی تھی کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے اور قدموں کی چاپ لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب آ رہی ہے۔ لیکن جب وہ گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوئی تو کچھ سوچ کر رک گئی اور دیوار سے لگ لگ کر چلنے لگی۔ تعاقب کرنے والا بھی آبادی کے قریب آجانے کے باعث کہیں رک گیا تھا۔ ہانپتی ہوئی کمالاں دیوار کو ٹٹول کر چلتی اپنے گھر تک پہنچ گئی اور وہاں اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی دادی مر چکی ہے۔ گھر خاموش تھا۔ دادی کراہ نہیں رہی تھی، اور وہ کیسے کراہے؟ ـ کمالاں نے سوچا۔ بابا اس کی پائنتی سے لگا رو رہا ہوگا اور جیون بوٹی کا انتظار کر رہا ہوگا اور ــــ کمالاں مارے دکھ اور شرمندگی کے آنگن میں دیر تک رکی رہی۔ پھر پنجوں کے بل دروازے تک آئی اور کان لگا کر سننے لگی۔ دادی زندہ تھی۔

دادی کہہ رہی تھی "نصیبہ کھل بھی سکتا ہے اور چوپٹ بھی ہو سکتا ہے، قادرے کے بس میں آگئی تو جانو اللہ نے روزی کا سامان کر دیا اور جو وہاں سے بھی چھڑ چھڑا کر بھاگ گئی ہے تو بیٹا! مجھے زہر کی چٹکی دے دینا۔ انتظار کرتے کرتے آنکھیں سفید ہو چلی ہیں، اب بھی چاند نہ ابھرا تو بھورا ختم ہونے کی نہیں۔"

کمالاں کو جھرجھری آگئی، جیسے ایک دم بہت سی سرسریاں اس کی رگوں میں دوڑنے لگی ہوں۔

پھر سرور بولا "قادرے سے وعدہ تو دس کا ہے پر کہتا تھا کہ اگر کالو نے خوش کیا تو پندرہ دے دوں گا۔ روز کے دس پندرہ کمانے لگی تو حرامزادی خود بھی مزے میں رہے گی، پر مجھے اس پر اعتبار نہیں اماں! بچپن میں مولوی کے پاس رہ کر جانے کم بخت نے رگوں میں برف بھر لی ہے کہ گرمی تو اسے چھو بھی نہیں گئی۔"

"پر بیٹا" دادی نے کہا "تم نے اسے کھنڈر میں بھیجنے کی ترکیب اچھی سوچی ہے۔"

کواڑوں کو جیسے کسی نے پٹخ دیا۔ بڑھیا اور سرور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے اور ذرا سی دیر کے بعد انھوں نے دیے کی مدھم روشنی میں کمالاں کو پہچان لیا۔ بڑھیا فوراً کراہنے اور بل کھانے لگی، لیکن سرور تو بت بن چکا تھا۔ بڑھیا نے بڑی مشکلوں سے ہمت باندھ کر کچھ عجیب سی غیر قدرتی آواز میں پوچھا "بوٹی لائیں بیٹا؟" ـــ کمالاں یوں اندر آئی جیسے بڑھیا کو دبوچنے کے لیے بڑھی ہے۔ سرور تک لرز گیا۔ مگر وہ دادی اور بابا کو غصے سے دیکھتی اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی اور بستر پر گر کر بلبلا بلبلا کر رونے لگی۔ بڑھیا اور سرور بیٹھے ایک دوسرے کو بے وقوفوں کی طرح دیکھتے رہے اور جب ادھر سے کمالاں کے رونے کی آواز رکی تو ادھر بڑھیا نے رونا شروع کر دیا۔ اور جب بڑھیا خاموش ہوئی تو سرور وہاں سے اٹھ کر اپنی کھاٹ پر آیا اور سر سے پاؤں تک چادر پھیلا کر لیٹ گیا۔

اس رات بڑھیا دیر تک جاگتی رہی۔ کوٹھے میں ٹہلتے ٹہلتے اکتا جاتی تو باہر آنگن میں نکل جاتی، وہاں پالا کاٹتا تو اندر بھاگ آتی۔ سونے کی کوشش کرتی، بھڑک کر اٹھ بیٹھتی اور پھر ٹہلنے لگتی۔ اور جب صبح سرور اٹھا تو اس نے دیکھا کہ بڑھیا کراہ رہی ہے۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس آیا اور جھک کر بولا "اماں سچ سچ کہ جھوٹ موٹ؟"

بڑھیا نے بڑے کرب سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بولی "تم یوں نہ پوچھو گے تو اور

کون پوچھے گا بیٹا؟"

سرور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "نہیں ماں۔ معاف کر دو۔ تو کیا پرسوں سے بیمار ہو؟"

بڑھیا نے کہا "پسلی میں درد اٹھا ہے بیٹا! چھریاں چل رہی ہیں۔"

سرور حواس باختہ سا وہاں سے اٹھا اور بولا "میں ڈاکٹر سے کوئی دوا لے کر ابھی آیا۔"

سرور کے جانے کے بعد بڑھیا دیر تک کراہتی اور روتی رہی، کافی دیر کے بعد وہ پکاری "بیٹا کمال خاتون۔"

کمالاں دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ بری طرح زرد ہو رہا تھا۔ بال ابڑے اجڑے سے تھے اور ہونٹوں پہ سفیدی سی جھلک رہی تھی۔

"بیٹا" بڑھیا نے فریاد کی۔

کمالاں وہیں کھڑی اسے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

"ایک پیالی چائے مل جائے گی؟" اس نے گداگروں کی سی لجاجت سے کہا۔

کمالاں پلٹ کر باہر چلی گئی۔

سرور کوئی دوا لے کر آیا تو بڑھیا چائے پی رہی تھی اور کمالاں چپ چاپ اس کے پاس کھڑی تھی۔ سرور کی دھنسی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "اپنی دادی کو چائے پلا رہی ہو بیٹی؟" وہ بولا اور کمالاں کو خاموش پا کر بڑھیا کے پاس بیٹھ گیا۔ "یہ سفوف دیا ہے ڈاکٹر نے۔ کہتا تھا کہ یہ سفوف بھی اچھا ہے۔ پر ایک انگریزی ٹیکا نکلا ہے بڑے زور کا۔ پسلی کا درد ان کی آن میں غائب ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے دوا تم منگا لو ٹیکا میں لگا دوں گا۔ تیس چالیس لگتے ہیں۔"

لیکن ابھی تیس چالیس کی الجھن میں ٹیکا لانے کی بجائے بڑھیا کو ہوش میں لانے کی نوبت پہنچی۔ باقی افیم اور کمالاں کے چاندی کے دو بندے بیچ کر روپے ڈاکٹر کی نذر کیے، مگر شام کو جب یہ ڈاکٹر جو کمپاؤنڈری سے استعفیٰ دے کر ڈاکٹر بن کر آیا تھا، مریضہ کو دیکھنے آیا تو بڑھیا کی نظریں چھت کے کسی نقطے پر جم چکی تھیں اور وہ پنڈلیوں میں اینٹھن کے باعث پاؤں کو پیچ پیچ دیتی تھی۔ ڈاکٹر خفا ہونے لگا کہ "تم لوگ اسی وقت سیانے کو بلواتے ہو جب زندگی کی آخری رتی تک بکنے والی ہو۔ اب دوا تو کچھ نہیں ہو گی۔ خدا کا نام لینا ہو تو دعا کرو ورنہ اس وقت بات میرے بس سے نکل چکی ہے۔ قرآن مجید کے ختم کے لیے کسی کو بلوانا ہے تو بلاؤ۔ ورنہ مرنے والی کو تو مرنا ہی ہے۔"

سرور جاتے ہوئے ڈاکٹر کو دیر تک دیکھتا رہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی اماں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ پھر اچانک اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور وہ اماں کی کھاٹ کی پٹی پر سر رکھ کر رونے لگا۔ اس کی پگڑی اور لمبے بھوسلے بال ادھر ادھر لٹک گئے۔ کمالاں بھی رونے لگی اور باپ بیٹی نے جب روتے روتے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو جیسے ایک دوسرے کی آنکھوں میں کچھ پڑھ کر دونوں نے ایک ساتھ بڑھیا کی طرف دیکھا۔ سرور اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے پگڑی اٹھا کر آنسو پونچھے اور اٹھ کر بڑھیا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ پگڑی کا ایک پلو پھاڑ کر بڑھیا کی ٹھوڑی کے نیچے سے گزارا۔ اور سر پر کس کر گرہ باندھ دی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم یہیں اپنی دادی کے پاس بیٹھو بیٹی! کچھ یاد ہو تو پڑھتی رہو، میں کسی موچی دھوبی سے قبر کے لیے کہہ آؤں۔ جلدی سے جنازہ ٹھکانے لگ جائے تو کہتے ہیں قبر حساب نہیں لیتی" ــــ اس نے ایک بار پھر آنسو

پڑ بچھی پلنگڑی کو سر سے پاں سے لپیٹی اور باہر جاتے ہوئے دروازہ [illegible] اور [illegible] جیسے اسے مردے کے جاگ اٹھنے کا اندیشہ تھا۔

کمالاں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو مرتے دیکھا تھا۔ [illegible] دادی کی موت ڈرتے [illegible] نیم وا آنکھوں میں سفیدی [illegible] تھا میلی زرد رنگت کو چراغ کی [illegible] زرد روشنی نے نمایاں کر دیا تھا۔ [illegible] جیسے دادی کے لبوں میں حرکت ہوئی اور [illegible] اوپر اٹھے ہیں [illegible] زمین کو دیکھنے لگی، پھر [illegible] کی طرف۔ دیکھتے ہوئے دادی کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ [illegible] اس کا ہاتھ دادی [illegible] کو چھو گیا اور اس کے جسم میں کپکپی [illegible] کتنا ٹھنڈا تھا دادی کا ماتھا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر سورۂ اخلاص پڑھنے [illegible] کے ہاتھ چادر کے نیچے ہلے ہیں۔ "دادی!" وہ چیخ کی حد تک چلائی۔

"بابا!" وہ دروازہ کھول کر پوری شدت سے پکاری۔ باہر گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے اور کہیں دور سے ڈھول اور شہنائی بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ آنگن میں دروازے کے قریب ہی دادی کی [illegible] ایکا ایکی اس پر ایک سایہ سا آ کر چھا گیا، یہ بوڑھی دادی تھی۔ کمالاں نے اس زور سے کواڑ بند کیے [illegible] نکل کر گر پڑیں۔ وہ پسینے میں یوں شرابور ہو رہی تھی جیسے پگھلی جا رہی ہے۔ [illegible] دادی [illegible] چادر نوچ لی۔ نیم وا آنکھوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی اور پھر اسے کچھ ایسا لگا جیسے دادی [illegible] "دادی!" وہ ایک بار پھر پوری شدت سے چیخی اور دھڑام سے زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو مولوی اس پر جھکا ہوا تھا۔ "[illegible] آنکھیں کھولو [illegible] کیا ہوا تھا؟"

"میں ڈر گئی تھی بابا!" [illegible] مولوی صاحب [illegible] یسین پڑھ رہے تھے [illegible] کمالاں [illegible] مسکرائے [illegible] اپنے پاس بلایا۔ وہ اٹھی اور دادی [illegible] مولوی صاحب [illegible] سورۂ اخلاص کا ورد [illegible] لگی۔ پھر مولوی صاحب [illegible] کا اشارہ [illegible] چند لیے۔

[illegible] کفن وغیرہ کے [illegible] تو آنگن میں موجود [illegible] کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں۔ [illegible] کوٹھے میں چلا گیا [illegible] چلی گئیں تو [illegible] آواز [illegible] "بابا!" اور پھر جواب نہ پا کر اس پر [illegible] جا کر [illegible] چہرے پر [illegible] جیسے اب بس چیخنے ہی والی ہے۔ [illegible] اور مسکرانے لگی۔ "بابا!" وہ [illegible] خوشی کے پکار اٹھی۔ مولوی نے آنکھیں کھولیں [illegible]

"میں تو ڈر گئی تھی بابا!" کمالاں اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تو کیا مجھے بھی مردہ سمجھ لیا تھا تم نے؟" سرور بولا۔

کمالاں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی اور بہت دیر کے بعد بڑے پیار سے بولی "بابا"

سرور بے اختیار رونے لگا، اور جب بہت سے آنسو اس کی آنکھوں کے گڑھوں میں بھر گئے تو وہ ایک مسلسل دھارا کی طرح بہہ نکلے، اور پھر وہ بڑی ملائم مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "بیٹی! دیکھو مجھے معاف کر دو۔ میں بڑا کمینہ ہوں، بڑا کمینہ ہوں میں!" اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ لیے اور سر پیٹ لیا۔ "میں بڑا ذلیل، کتا، خبیث، کمینہ ہوں کمالو! میں نے اپنی بیٹی کو ـــــ اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو کنجری بنانا چاہا۔ تم مجھے مار دو، میری بیٹی! میرا گلا گھونٹ دو۔" پھر اس نے کمالاں کے ہاتھوں کو جکڑا اور انھیں اپنی گردن پر رکھ دیا۔ "میرا گلا گھونٹ دو کمالو بیٹی!۔ مجھ پر احسان کرو۔ میں کتنا کمینہ باپ ہوں، کتنا کمینہ، سچ مچ کا کنجر!" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

کمالاں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے مگر اسے اپنے بابا کو تسلی دینے کے لیے کوئی لفظ نہ سوجھا۔ بابا کے حق میں اسے کوئی بات مل ہی نہ رہی تھی کہ اسے بہلا بہلا کر تھپکتی۔ تو کیا اب وہ یہ کہتی کہ نہیں بابا! تم نے بہت اچھا کیا۔ تم نے کون سی بری بات کی۔ بس وہ چپ چاپ بیٹھی روتی رہی اور پھر اس کا سر دبانے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ بڑی نرمی اور پیار سے وہ اس کے ماتھے کی ہڈی دباتی رہی۔ پھر جیسے کچھ سوچنے لگی اور ماتھے پر سے ہاتھ اٹھا کر سرور کے گالوں پر رکھ دیے۔ تیزی سے جیسے چونک کر اس نے چادر کے اندر سے اس کا ہاتھ ڈھونڈ ھ نکالا اور اس کی نبض دیکھنے لگی۔ پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے گھورنے لگی اور کچھ دیر کے بعد جیسے کہیں بہت دور سے بولی۔ "تمھیں تو بخار ہے بابا!" ـــــ

"ہاں بیٹی!" وہ بولا۔ "ادھر دونوں پسلیوں میں چبھن سی بھی ہے۔"

کمالاں سناٹے میں آ گئی۔ کھاٹ پر لیٹا ہوا بابا اچانک دادی میں بدل گیا۔ اس کی آنکھیں منجمد ہو گئیں۔ چہرے پر میلی میلی زردی کھنڈ گئی اور اسے بابا کی ٹھوڑی تلے سے ایک نبض بھی گزرتی دکھائی دے گئی! وہ ایک چیخ مار کر سرور سے لپٹ گئی۔ اس کے سر اور ماتھے پر اپنا چہرہ ملنے لگی اور رو رو کر پکارتی گئی۔ "نہیں بابا! تم نہیں مرو گے۔ تم نہیں مرو گے بابا۔ میں تمھیں نہیں مرنے دوں گی۔ نہیں بابا ـــ نہیں۔ نہیں۔"

وہ بچوں کی طرح مچل گئی۔ سرور اس کے سر پر شفقت بھرے ہاتھ پھیرتا رہا اور ساتھ ساتھ روتے روتے کہتا رہا۔ "نہیں نہیں بیٹی! میں مروں گا نہیں۔ تم مجھے بخش دو تو میں جیوں گا۔ پھر جینے پر حق ہوگا میرا۔"

کمالاں کے سوجے سوجے ہونٹوں اور سرخ گالوں پر آنسوؤں کی وجہ سے بال چمٹ گئے تھے۔ وہ انھی بالوں میں سے اپنے بابا کو دیکھنے لگی اور دیکھتی رہی۔

"بخش دو بیٹیا!" سرور نے چادر میں سے ہاتھ نکالے اور انھیں جوڑ لیا۔

اور آنسوؤں میں نہائی ہوئی کمالاں مسکرا دی۔

سرور کھاٹ پر اٹھ بیٹھا۔ "اب میں نہیں مر سکتا بیٹی! تم ڈاکٹر کے پاس جا کر ذرا سا وہ سفوف تو لیتی آؤ ـــ کہنا پسلی کا درد ہے، دونوں طرف، ٹیکے کا کہے تو کہنا ہم غریب ہیں۔ جاؤ میری بیٹی! پر جانے سے پہلے مجھے ایک بار پھر اسی طرح دیکھ لو مسکرا کر۔"

کمالاں پھر مسکرائی۔ "یوں" اس نے خوش ہو کر کہا اور پھر اوپر چھت کی طرف دیکھ کر بولا "الٰہی تیرا شکر ہے۔"

کمالاں نے باہر جا کر منہ دھویا، اور ڈاکٹر کے ہاں چلی گئی۔ ڈاکٹر نے سفوف تو دے دیے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ "آج کل نمونیہ کے مریض تابڑ توڑ مر رہے ہیں۔ پر ہو سکے تو ٹیکا لگوا لے۔ دو روپے کا آتا ہے۔ بابے کی زندگی چاہیے تو کہیں سے ٹیکا پیدا کر دے، سمجھیں؟"

"کتنے میں آئے گا ٹیکا؟" کمالاں نے پوچھا۔

"بس یہی کوئی چالیس پچاس میں" ڈاکٹر بولا۔ "ہسپتال میں [illegible] قصبے میں مل جائے گا۔"

واپس گھر آ کر اس نے بابا کو پانی کے ساتھ سفوف تو کھلا دیا مگر ٹیکے کا خیال اس کے ذہن میں سوئیاں سی چبھوتا رہا۔ شام تک سرور کو اس زور کا بخار چڑھا کہ دور سے آنچ آنے لگی۔ کمالاں پھر ڈاکٹر کے پاس دوڑی گئی۔ سفوف تو لے آئی مگر ٹیکے کی رٹ جاری تھی۔

رات بھر وہ سرور کے پاس بیٹھی [illegible] انکار کر دیتی۔

صبح ہوتے تک سرور بے حال ہو چکا تھا۔ کمالاں ڈاکٹر سے سفوف کی تیسری خوراک لینے گئی تو لوگ اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ سوجی سوجی، سرخ سرخ آنکھیں، بکھرے بال، خشک ہونٹ، جیسے کہیں سے پٹ کر آ رہی ہے۔

ڈاکٹر اس کے ساتھ چلا آیا۔ سرور کی نبضیں دیکھیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمالاں کو دیکھنے لگا۔ "تو کیا اپنے باپ کو مارنے کے ارادے ہیں تمہارے؟" وہ بڑے غصے سے بولا۔ "میں ٹیکا کہہ گیا تھا۔ جب تک ٹیکا لائے گی تو میرے پاس نہ آنا" اور وہ تھیلا اٹھا کر چلا گیا۔

سرور ہنسنے لگا۔ "ٹیکا!" وہ بولا اور پھر کراہتے ہوئے سمٹ گیا۔

اور کمالاں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیے کھاٹ کے پائے کا سہارا لیے باہر دھوپ میں کھیلتی ہوئی چڑیوں کو دیکھتی رہی۔

دن ڈھلے وہ اٹھی اور ایک گلی کا چکر لگا کر یوں واپس آ گئی جیسے محض ٹہلنے نکلی تھی۔ وہ پھر اسی طرح کھاٹ سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"ٹیکا!" سرور پھر سے ہنسا۔ "کہتے ہیں ٹیکا۔ ڈاکٹر بڑا بجھکڑ ہے۔ ٹیکے سے ٹھیک کر دے گا تو۔ اوں۔ او دیکھ! دیکھو میری طرف دیکھو۔ میں مروں وروں گا نہیں۔"

"میں تمہیں نہیں مرنے دوں گی بابا۔" کمالاں نے جیسے سرور سے کوئی راز کی بات کی۔

شام سے پہلے وہ سرور کو چائے پلا رہی تھی کہ اچانک باہر چلی گئی۔ گاؤں بھر کی گلیوں میں وحشت زدہ گھومتی رہی اور جب گاؤں کی مسجد میں شام کی نماز پڑھی گئی تو اسے گلی میں مسجد کی باہر نکلی ہوئی محراب کے پیچھے ابراہیم مل گیا اور وہ یوں بولی جیسے غیر ارادی طور پر یہ الفاظ اس کے منہ سے برس پڑے۔ "تم تو ہم سے دور دور رہتے ہو۔ ملتے ہی نہیں۔"

ابراہیم جیسے ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ بڑی دیر کے بعد ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں بولا۔ "تمہارا حکم

کا انتظار تھا۔

"تو پھر آج ملو گے" وہ اسی سپاٹ لہجے میں بولی۔

"کہاں؟"

"میرے گھر میں۔" پھر دبا سا ایک قہقہہ [illegible] "دادی تو مر گئی ہے نا!"

"کب آؤں؟"

"بس اندھیرا ہوتے ہی آ جانا۔ میں گھڑا الٹوں گی [illegible] بے دھڑک آ جانا [illegible] پہلے ہوش پڑے ہے"

ابراہیم [illegible] پر ٹک گئے" اور وہ کی [illegible] اٹھتی ہوئی گھر پہنچی [illegible] پیالی مرو سے ہاتھ سے گر [illegible]

چکی تھی اور وہ "پانی پانی" پکار رہا تھا۔

پانی کے چند گھونٹ پلا کر وہ بڑے دکھ سے بولا "اتنی دیر [illegible] کو [illegible] ہے"

کالاں کچھ نہ بولی۔ اس کا سر دبانے لگی اور جب اس [illegible] ہوتی ہوئی دوسری کوٹھڑی میں [illegible] اور وہاں ٹھیکریوں کو میلے گدے کے نیچے چھپا کر [illegible] کی [illegible] دروازہ کھول کر وہاں بیٹھ رہے کو وہ دونوں ہاتھوں میں رکھ کر بیٹھ گئی [illegible]

ابراہیم [illegible] یاد آیا تو جب بھی وہ اسی طرح بیٹھی ہے [illegible] کمالاں"

"ایں!" وہ چونکی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی [illegible] آگئے!" وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے آئی۔

اور پھر سرور "پانی پانی" کراہنے لگا۔ پھر چلانے لگا [illegible] تک اِدھر اُدھر [illegible] دیر کے بعد جب ابراہیم

اٹھ کر جانے لگا تو کمالاں لپک کر آئی اور دروازے سے چمٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"پانی!" سرور دوسرے کوٹھے میں رویا۔

ابراہیم کچھ دیر کھڑا کمالاں کی وحشت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر بولا "اب چلیں پیاری!"

لیکن کمالاں اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"پانی!" سرور اُدھر سے چلایا۔

ابراہیم نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھولنے کی کوشش کی۔

"کل پھر ملیں گے میری جان!" ——

اور آخر کمالاں بولی "کل تو ملیں گے [illegible] کہاں ہے؟"

"اجرت [illegible] ابراہیم غصے میں بولا "اجرت [illegible] اجرت مانگتی ہے؟ [illegible] آئی؟

[illegible] کنجری!!" ——

[illegible] کمالاں کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ندیم

ثواب

مسجد میں ادھر صبح کی نماز ختم ہوئی، اُدھر نقارہ بجنے لگا۔

اذان سن کر جو لوگ کروٹیں بدلنے لگے تھے، نقارہ سنتے ہی تڑپ کر اٹھے اور گلیوں میں آ گئے۔

"یا الٰہی خیر" کہہ کر عورتوں نے کھاٹوں پر سے پاؤں لٹکا لیے۔

نقارہ بجے جا رہا تھا اور فضاؤں کو گونج رہی تھی جیسے نقارے کے بجائے فضا بج رہی ہے۔ ایک مسلسل "ہم ہُم ہم" کی آواز جیسے گاؤں کو چاروں طرف سے محاصرے میں لینے کے بعد [illegible] قدم بہ قدم بڑھی آ رہی تھی۔

"ہائے کس کا گھر اجڑ گیا نور پیر کے وقت؟" عورتوں نے گلیوں میں آ کر پوچھا۔

معلوم ہوا چنگا جھیور کنوئیں میں گر گیا ہے۔

ماں بیٹا دونوں پانی کھینچ رہے تھے کہ [illegible] ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ڈھیر سی رسی جو اس کے آس پاس جمع ہوئی تھی، بھاری بوکے کے گرنے سے ایک دم کھنچی تو چنگے کا ایک ٹخنہ رسی کے پھندے میں آ گیا اور وہ اپنی ماں کی آنکھوں کے سامنے جھپاک سے کنوئیں میں گر گیا۔ اسے چیخنے تک کی مہلت نہ ملی۔

"ہائے لٹ گئی بے چاری کرماں! کرماں جی!" عورتوں نے [illegible] آہیں بھریں اور چھتوں پر چڑھ گئیں۔ مرد کنوئیں کی طرف بھاگنے لگے۔ نقارہ رک گیا۔ [illegible]

کرماں کا میاں جیرا گاؤں کے عقب میں میلوں تک پھیلی ہوئی ڈھلان کا رخ کرتا جہاں وہ دوپہر تک بیری اور سینتھے کی جھاڑیاں اکھیڑتا رہتا۔ یہ سرکاری رکھ تھی۔ اس لیے وہاں کلہاڑی لے جانا منع تھا۔ دوپہر کو واپس آتا تو اس کے سر پر اتنی بہت سی جھاڑ جھنکاڑوں کا انبار ہوتا کہ دور سے یوں معلوم ہوتا جیسے ایک گھنا درخت چلا آ رہا ہے۔

کرماں ان جھاڑیوں سے تنور گرم کرتی اور [illegible] کی روٹیاں پکاتی۔ کبھی جوار اور کبھی باجرے کی پوٹلیوں میں بندھے ہوئے [illegible] اور چنے کے دانے بھونتی۔ آٹے اور دانوں میں [illegible] اور یوں ان کا پیٹ پلتا۔

دوپہر کو میاں [illegible] واپس آتے اور تنور کو ٹھنڈا [illegible] گدھوں پر [illegible] گھروں سے

گھڑے بھرے کرتے اور کنوئیں پر جاکر پانی بھرتے۔ کنوئیں کی جگت پر چار طرف رکھے ہوئے شیشم اور توت کے تنوں پر رسیوں کے جو لمبے لمبے نشان پڑ گئے تھے، ان میں سے سب سے گہرا نشان انہی میاں بیوی کے بوکے کی رسی کا تھا، کیونکہ گاؤں میں وہ سب سے زیادہ پانی بھرتے تھے۔ ہر پھیرے میں چھ گھڑے گدھے اٹھاتے، دو کرماں کے سر پر ہوتے اور ایک گھڑا اس کا میاں کبھی اپنے سر پر اور کبھی کندھے پر رکھ لیتا۔ ہر روز دو پھیروں میں اٹھارہ گھڑے بھر کر وہ مہینے میں اٹھارہ دونے چھتیس آنے کما لیتے اور شاید اسی لیے انھیں اپنے بیٹے کو پڑھانے کا شوق چرایا!

وہ کہتے تھے کہ ہم بابر بادشاہ کے زمانے سے پانی بھرتے آ رہے ہیں اور اب تھک گئے ہیں۔ اب ہمارا چنگا منشی بنے گا اور اگلی نسل تک ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ دوسرے لوگ ہمارا پانی بھریں۔

چنگا چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ گھڑوں کا حساب جوڑ لیتا تھا اور ہر رات سونے سے پہلے ماں باپ کو کتابوں میں لکھی ہوئی باتیں سناتا تھا تو وہ ان باتوں کو سمجھے بغیر یہ سوچ کر خوش ہوتے رہتے تھے کہ ان کا بیٹا یہ باتیں سمجھتا ہے

پھر ایک روز جب کرماں کا میاں سرکاری رکھ میں ایک کگر پر کھڑا بیکڑ کی ایک جھاڑی کو جھٹکے دے دے کر جڑ سے اکھاڑ رہا تھا تو اچانک اس کی توقع سے پہلے ہی جھاڑی اکھڑ آئی۔ اس کے ساتھ ہی خود اس کے پاؤں بھی اکھڑ گئے۔ اور وہ کگر سے نیچے ایک چٹان پر یوں گرا کہ آس پاس اس کے خون اور بھیجے کا چھڑکاؤ ہو گیا۔

بیوہ ہو کر بھی ماں نے چنگے کو مدرسے سے نہ اٹھوایا۔ البتہ اس نے تنور کو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیا۔ بھٹی جلانے کے لیے وہ خود ہی کسانوں کے ہاں جا کر ناندوں کھولوں میں سے بڑے بڑے ڈنٹھل اور میلا کچیلا بھوسہ سمیٹ لاتی۔ یا پھر ماں بیٹا کنوئیں پر جاتے اور گاؤں کے کھاتے پیتے گھروں کے لیے پانی بھرتے۔ بھیڑ سے بچنے کے لیے دونوں منہ اندھیرے سے پانی بھرنا شروع کرتے اور سورج کے نیزہ بھر اونچا ہونے تک فارغ ہو جاتے۔ پھر چنگا مدرسے کی راہ لیتا اور کرماں بھٹی کے لیے ایندھن سمیٹنے نکل جاتی۔

اور ابھی کرماں کے میاں کو مرے تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے اور وہ اپنے بیٹے کو بوکا لٹکاتے یا کھینچتے ہوئے رسی سے ہٹ کر کھڑا ہونے کا سلیقہ بھی نہیں سکھا پائی تھی کہ چنگے کو بجلی کی سی تیزی سے کھلتی ہوئی رسی نے اپنی لپیٹ میں لے کر پہلے تو کنوئیں کے سامنے والے حصے پر پٹخا اور کرماں وہیں کنوئیں کی جگت پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ اس نے کنوئیں کے پانی میں اپنے بیٹے کے چھپاک سے گرنے کی بھی آواز نہ سنی۔ دو اور جھیور بھی وہاں پانی بھر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کرماں کے پاس بیٹھ گیا کہ کہیں جوش میں آ کر کرماں بھی کنوئیں میں نہ کود جائے، دوسرا سرپٹ بھاگتا ہوا گاؤں میں آیا، گلی گلی میں لوگوں کو اس حادثے کی اطلاع دیتا چلا گیا، پھر مسجد میں پہنچ کر حجرے سے نقارہ اٹھایا اور وہیں دہلیز پر بیٹھ کر اسے پاگلوں کی طرح پیٹنے لگا۔

کنواں، پہاڑی پر بسے ہوئے گاؤں کے قدموں میں تھا، لوگ جب کنوئیں کی طرف بڑھے تو جیسے انھیں راستے بھول گئے۔ کھیتوں میں کود کر وہ بھری بھری فصلوں میں سے بھاگے اور پھر اونچی اونچی مینڈوں پر سے لٹکتے ہوئے کنوئیں کی سمت لپکے۔ پورے گاؤں کی عورتیں چھتوں کی منڈیروں پر آ بیٹھی تھیں اور کنوئیں کے قریب سے کالی کالی گٹھریوں کی قطاریں معلوم ہوتی تھیں۔ بچے گلیوں میں سے بھاگے آ رہے تھے۔ پورا گاؤں کنوئیں پر امڈ پڑا تھا۔

کنوئیں پر سب سے پہلے جھیور، کمہار، موچی، مراثی، نائی اور دھوبی پہنچے۔ اس وقت ایک جھیور چنگے کی ماں کے پاس بیٹھا لوگوں کی طرف یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔

چیخیں اور چیخے اکٹھے بہت سے لوگوں نے کنوئیں کی منڈیر پر ہجوم کر دیا۔

ان آوازوں گہرے کنوئیں کی گولائی میں چکر کھاتی ہوئی جیسے نیچے گئی تھیں۔ پانی میں ایک گونج سی لرز گئی اور دودھ میں بالائی کی ایک تھالی کی طرح چمکتے ہوئے پانی کی سطح جوں کی توں رہی۔

رسّے کے سرے پر ایک گز لمبی مضبوط لکڑی باندھ کر اسے ایک نوجوان غوطہ خور کو پکڑا دیا گیا۔ رسّہ سامنے اس کے ہاتھوں میں تھا۔ رانیں لکڑی پر تھیں اور پاؤں لٹک رہے تھے۔ پھر تین آدمیوں نے رسّے کو مضبوطی سے تھاما۔ نوجوان غوطہ خور نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر ایک بار کنوئیں میں دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ نیچے اتارا جانے لگا۔

لوگوں کا ہجوم مسلسل بڑھ رہا تھا۔ چند جیسر کی عورتیں بھی روتی چلاتی آ پہنچی تھیں اور کرماں کے منہ پہ پانی کے چھینٹے دینے لگی تھیں۔ چند لوگ بچوں کو کنوئیں کے قریب آنے سے روک رہے تھے۔ اور نوجوان غوطہ خور کنوئیں کے نصف تک پہنچ گیا تھا۔

یکلخت کرماں ہوش میں آگئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ پھر اس کی پتلیوں میں وحشت بھر گئی اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی مگر عورتوں نے اسے مضبوطی سے جکڑ لیا۔ پھر وہ ایک دم بچوں کی طرح رونے لگی اور اپنی رانیں کوٹ کوٹ کر پکارنے لگی۔

"ہائے میرا بچہ۔ میرا لال۔ میرا چاند کا ٹکڑا۔ میرا سونے کا دانہ۔ چنگے دے چنگے۔ تجھے خدا رسول کا واسطہ مرنا نہیں۔ یوں ہنستا ہنستا باہر آجا۔ جیسے تو مدرسے سے آتا ہے۔ مرنا نہیں میرے بیٹے۔ تو مر گیا تو خدا کی خدائی میں زندہ کون رہے گا؟"

وہ روتی پیٹتی اور بین کرتی رہی۔ عورتیں اس کی ڈھارس بندھانے کی بجائے خود بھی روتی رہیں۔ کنوئیں کے گرد اتنا ہجوم ہو گیا تھا کہ نمبردار کو مداخلت کرنی پڑی۔ تین چار لمبے آدمی کنوئیں کے چاروں طرف جھک جھک کر ایک دوسرے کو جھک جھک کر دیکھنے سے منع کر رہے تھے اور تاکید بھی کر رہے تھے کہ ایک ذرا سا کنکر بھی نیچے نہ گرنے پائے۔ ورنہ غوطہ خور کو گولی کی طرح لگے گا۔

کنوئیں میں سے غوطہ خور کی گونجتی ہوئی آواز آئی "تہہ میں پہنچ گیا ہوں۔ رسّے کو ذرا ڈھیلا چھوڑ دو۔ میں غوطہ لگاتا ہوں۔"

سارے ہجوم نے جیسے سانس روک لی۔ کرماں تک خاموش ہو گئی۔

ادھر ہوا میں ایک ٹٹیری "پیاسی ہوں۔ پیاسی ہوں" پکارتی ہوئی نکل گئی۔

کنوئیں پر جھکی ہوئی شیشم کی ایک شاخ سے ایک زرد پتا ٹوٹا اور پیرکی کی طرح چکراتا ہوا کنوئیں میں اتر گیا۔

"کچھ نہیں ملا۔" پاتال سے آواز آئی "پھر سے غوطہ لگاتا ہوں!"

لوگ پھر سرگوشیاں کرنے لگے۔ کرماں نے بڑی وحشت سے ان کی طرف دیکھا اور پھر اپنے سر کے بال نوچنے لگی۔

"پانی بہت گہرا ہے" غوطہ خور پکارا۔ "میں تہہ کو نہیں چھو سکا۔ سانس ٹوٹ جاتی ہے۔ مجھے کھینچ لو۔"

"ہائے بیٹے ذرا ادھر اُدھر تو ٹٹول۔ کنارے تو دیکھ۔" کرماں کنوئیں پر جھک کر پکاری۔ عورتوں نے اسے بازوؤں سے تھام رکھا تھا۔ "ابھی واپس نہ آ۔ میری تو ساری خوشیاں دیکھے۔" ایک اور غوطہ لگا۔ پھر وہ رونے لگی اور اس کے آنسو کنوئیں میں گرنے لگے۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ نقارہ بجانے والا میرو جھیور سر پر ایک کٹورا رکھے بھاگا بھاگا آ پہنچا۔

"نکلا؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی نہیں" کسی نے کہا۔

"نہیں ماسی- کوئی نشان نہیں" غوطہ خور کنویں میں سے بولا- "پانی نیزہ نیزہ گہرا ہے- میرے قدم تو تہہ پر لگتے ہی نہیں- مجھے کھینچ لو"

کرماں سینے پر دو ہتڑ مار کر پیٹنے اور چیخنے لگی اور لوگ غوطہ خور کو کھینچنے لگے-

وہ باہر آیا تو ایک اور غوطہ خور نیچے اتارا گیا اسی طرح باری باری چھ غوطہ خور کنویں میں اترے اور یہ کہتے ہوئے واپس آ گئے کہ نہ جانے کنویں میں ایک دم اتنا بہت سا پانی کہاں سے آ گیا ہے- تھاہ ملتی ہی نہیں-

لوگ چار چار پانچ پانچ کی ٹولیوں میں بٹ کر ادھر ادھر بکھر گئے اور کرماں روتی پیٹتی رہی-

ایک آدمی قریب کے گاؤں کو دوڑا کہ وہاں کے مشہور غوطہ خور کو بلا لائے- جھیو ما در کمھار کنویں پر سے ہٹ آئے اور شیشم کے تنے سے لگ کر بیٹھ گئے- کرماں کو بھی عورتیں پھر پرے لے گئیں اور تازہ دھوپ میں کنویں کا دہانہ معمول سے زیادہ پھیل گیا- کچھ لوگ ٹہلتے ہوئے کنویں سے دور نکل گئے- اور پھر گاؤں کے رستے پر ہو لیے- گاؤں کی چھتوں کی منڈیروں پر گٹھڑیوں کی تعداد بھی کم ہو گئی تھی-

ملک رحمان خاں صاحب جب نماز اور درود وظائف سے فارغ ہو کر کنویں پر آئے تو کرماں کنویں کی پرلی طرف اسی طرح رو پیٹ رہی تھی، ان کے ہاتھ میں تسبیح اور ماتھے پر سجدے کی مٹی تھی- آتے ہی انھوں نے کہا- "کرماں بیچاری کو پیٹنے سے روکو، روئے بے شک- پر پیٹنا جائز نہیں ہے"

کسی نے ان کی طرف توجہ نہ دی- ملک رحمان خاں نے بھی یہ مشورہ شاید رسماً دیا تھا، کیونکہ وہ بھی کسی کے جواب کا انتظار کیے بغیر کنویں کی جگت پر آ گئے اور نیچے جھانکا- پھر جیسے اپنے آپ کو دھکا مار کر پیچھے ہٹ گئے اور بولے- "ہمارے پہاڑی علاقے کی یہ بڑی بدبختی ہے کہ پانی بہت گہرائی میں ملتا ہے- میدانی علاقوں کے کنوؤں میں تو گبرو شرطیں لگا کر چھلانگیں مارتے ہیں، ہمارے کنویں میں تو کوئی گرے تو آدھے راستے ہی میں مارے خوف کے روح قبض ہو جائے"

"آہستہ بولیے ملک جی" میرو جمیور بولا- "کرماں بہن کا تو خیال کیجیے"

"تم بھی یہیں ہو میرو" ملک جی نے اس کے پاس جا کر کہا- "نہیں ملا بے چارا؟"

"جی ابھی نہیں" میرو بولا-

"یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے" وہ بولے-

میرو ہوا میں دیکھتا رہ گیا-

پھر ملک جی نے کہا- "اور بھئی وہ ریت کے تین بورے جو میں نے تم سے لانے کو کہے تھے؟ وہ اگر اگلی صدی میں لانے کے ارادے میں تو بھیا اگلی صدی آئے گی ہی نہیں- قیامت آ جائے گی اسی صدی میں"

"جی اچھا" میرو بولا اور اس نوجوان کی طرف بڑھ گیا جو ابھی ابھی گاؤں سے آیا تھا- اور کنویں میں اترنے کے لیے لنگوٹ باندھ رہا تھا-

غوطہ خور کو کنویں میں اتارنے والے کنویں کے قریب آ گئے مگر باقی لوگ ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے باتیں کرتے اور ٹہلتے رہے جیسے پلیٹ فارم پر ہیں اور گاڑی لیٹ ہے-

کرماں نئے غوطہ خور کو دعائیں دینے لگی اور ملک رحمان میرو سے یہ کہہ کر گاؤں کی طرف چل پڑے کہ "نکل آئے تو قبر کی جلدی کرنا شام نہ ہو جائے۔ میت دن کو دفن ہو تو اس کی قبر میں روشنی رہتی ہے۔"

ملک رحمان خاں گاؤں کی بڑی گلی کی چوٹی والے موڑ پر پہنچ گئے تھے جب غوطہ خور کے قدموں نے پانی کو چھوا۔ مگر یہ غوطہ خور بھی ناکام واپس آیا۔ اور جب تک وہ کنویں میں سے نکلتا، ملحقہ گاؤں کا نامی غوطہ خور وہاں پہنچ چکا تھا

دوپہر قریب تھی۔ شیشم کا تنا جیسے شاخوں کے بکھرے ہوئے سائے کو اپنی طرف سمیٹ رہا تھا۔

کرماں نے نامی غوطہ خور کو یوں دیکھا جیسے عقیدت مند کسی ولی اللہ کو دیکھتے ہیں "بڑا مشکل کام ہوتا ہے" اس نے پہلی بار آس پاس کی عورتوں سے بات کی۔ "یہ غوطہ مارنے والے ماؤں سے بتیس دھاریں بخشوائے پھرتے ہیں۔ خدا ان کا بخت سلطان سکندر جیسا کرے۔ خدا ان کی عمر خواجہ خضرؑ جتنی کرے۔ یہ اپنی ماؤں کے حلالی بیٹے ہیں۔" ذرا سا رک کر وہ بولی "میرے چنگے جیسے۔" اور پھر بے تحاشا رونے لگی۔

غوطہ خور چھوٹے قد کا دبلا پتلا جوان تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں رسہ پکڑ کر کنویں کی اساری کے ساتھ ساتھ یوں تیزی سے قدم رکھ کر اترنا شروع کیا۔ جیسے گلی میں چل رہا ہے۔

"رسہ ڈھیلا چھوڑ دو" نیچے پہنچ کر اس نے پکارا۔

رسے کو ڈھیلا چھوڑ دیا گیا۔

کنویں کی جگت پر فضا کا سنّاٹا طاری ہوا اور کرماں سجدے میں گر گئی۔

"پانی بہت گہرا ہے بھلا تو۔ دوسرا غوطہ لگا رہا ہوں" غوطہ خور نے اطلاع دی۔

غوطہ خور نے چار غوطے مارے اور جب پانچویں غوطے کے بعد اس نے آواز دی "مل گیا لڑکا" تو دعائیں مانگتی ہوئی کرماں کے چہرے پر ایک چمک سی آ گئی۔ پھر یہ چمک بجھ گئی۔ اور اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا۔

کسی نے غوطہ خور سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ لڑکا زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ غوطہ خور نے بھی اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

آنے والے خطرے کے نیچے دبی ہوئی کرماں یکایک چلا اٹھی "کیسا ہے میرا بچہ؟"

غوطہ خور نے کوئی جواب نہ دیا اور کرماں کی آواز گہرے کنویں کی گولائی میں چکر کھا کر جیسی نیچے گئی تھی، ویسی ہی ایک گونج بن کر اوپر آ گئی۔

"ڈھیل کھینچ لو" غوطہ خور نے آواز دی۔ "میں لکڑی پر بیٹھ کر لاش کو رانوں پر رکھ لوں گا۔"

رسہ کھینچنے والے تین آدمیوں نے پہلی بار پلٹ کر دیکھا تو کنویں کے مضافات خالی ہو چکے تھے۔ وہ جہاں ایک میلہ سا لگ گیا تھا۔ اب وہاں شیشم کے پتے اڑ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے سارے گاؤں کی آبادی چپکے سے کنویں میں اتر گئی ہے۔ بس چند بچے ایک طرف سہمے ہوئے کھڑے تھے اور دور گاؤں کے مکانوں کی منڈیریں نیلے آسمان کو خطِ مستقیم میں کاٹ رہی تھیں۔

"لوگ کہاں گئے؟" میرو جمیدے نے حیران ہو کر پوچھا۔

پھر ایک آدمی نے غوطہ خور کو اطلاع دی "نہ جانے لوگ ایک دم کہاں چلے گئے ہیں۔ ہم کل تین آدمی ہیں۔ دو کو کیسے کھینچیں؟"

"لوگ؟" کرما ... بولا "میں تو جب آیا تھا تو تین تھے یا ماسی تھی یا کچھ بچے تھے۔"

کسی کو پتہ بھی نہیں چلا تھا اور لوگ گاؤں واپس جا کر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔ گھروں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ ریوڑ آس پاس کی پہاڑیوں پر چر رہے تھے۔ اور دور ایک چھت پر کوئی عورت دُھلے ہوئے کپڑے سُکھانے کے لیے پھیلا رہی تھی۔

کرماں کچھ دیر تک گاؤں کو اپنی دھندلائی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ پھر وہ نچلے ہونٹوں کو دانتوں میں لے کر روتے دولو کے پاس آئی۔ "لاؤ میں تمہیں ..."

تینوں بچے رونے لگے۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر ایک نے ... بلایا۔ وہ بھاگتے ہوئے آئے اور رستے سے ... وہاں سینے پر ہاتھ رکھے ایک طرف کھڑی رہی۔

آہستہ آہستہ رستہ کھنچتا رہا۔ کنویں ... اور غوطہ خوروں نے چنگے کی لاش اپنی راتوں بدستے اٹھائی مگر اب اسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ سب رستے کو کھینچ کر رہے تھے۔

کرماں آگے بڑھی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اور بانہیں پھیلا کر بولی۔ "میرے اس پھول کو یہاں میری جھولی میں ڈال دو میرے بیٹے۔"

کرماں چنگے کی لاش کو اپنے بازوؤں میں ... اٹھا کر ... اور گاؤں کی طرف یہ کہتی ہوئی چل پڑی۔ "چل ... بیٹے ... دیر ہو جائے گی۔"

... اٹھ کر جس کا بھاگا آیا اور کرماں کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ کرماں نے چنگے کو بچے کے ماں باپ کی طرح بڑے دھیان سے کھٹولے پر رکھا۔ پھر بولا:

"تم تو تین ہو۔ جنازہ تو چار اٹھاتے ہیں۔"

پھر کسی کو سامنے سے ملک رحمان خاں آتے دکھائی دیے۔ قریب آ کر وہ بولے۔ "میں سمجھا تھا بہت سے لوگ ہوں گے۔ وہاں سے بات کروں گا۔ مگر یہاں تو تم ہی تین چار ہو۔ سب چلے گئے تھک کر۔ صبح سے آئے ہوئے تھے۔ اور اب تو ظہر کی اذان ہونے والی ہے۔"

اب ملک رحمان خاں کھٹولے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ "بات یہ ہے بھئی" انھوں نے کہا۔ "کہنا یہ تھا کہ کل دس ... بعد ہم لوگ ... کنویں ... جناب ... لوگوں سے ... کہہ دوں کہ صدر کنویں ... لاش نکلا آئی ... کنویں کو پاک ... کر لینا چاہیے ... تم مجبور لوگ ... ہو ... لیے تم سے کہہ رہا ہوں اور پھر یہ تو ثواب کا کام بھی ہے۔"

سکوں میں رقص کناں، رقص میں سکون پذیر
خرام حسن کا آئینہ ہے خرام حیات

—— ندیم

ندیم

خربوزے

وہ تھکا ماندہ روتا بسورتا سوگیا۔ اور سوتے میں اس نے ایک خواب دیکھا کہ آسمان کے ستارے ہولے ہولے خربوزوں کی شکل اختیار کررہے ہیں اور یہ آسمانی خربوزے جھم جھم کرتے اس کی جھولی میں آگرتے ہیں۔ خود کٹ جاتے ہیں۔ بیج خود ہی الگ ہوجاتے ہیں۔ خود اس کے منہ میں اپنا گودا تراش کر ڈال دیتے ہیں اور چھلکے اچھل کر خود ہی پرے جا گرتے ہیں۔ اور اس کی ماں جس نے شام سے اس وقت تک چیخنے چلانے کے باوجود اسے ایک خربوزے کے لیے دو پیسے نہیں دیے تھے، کولہڑ کا سہارا لیے بیٹھی مسکرا رہی ہے! اور اس کے ہم جولی پست دیوار پر سے اپنے گرد آلود سر اٹھا کر اسے تعجب اور رشک سے دیکھ رہے ہیں کہ اچانک ایک خربوزہ اس کے سر پر آن گرا۔ اور وہ بلبلا کر اٹھ بیٹھا —— ہائے ماں —۔ خربوزہ —— اور اس کی ماں اچانک نیند سے چونک کر پکاری "تیرے دشمنوں کو موت آئے تو کیا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے، یہ اللہ مارے خربوزے کیا آئے میرے لیے آفت آگئی۔ چند روز ہوئے تجھے ایک گول گول پیلا پیلا خربوزہ نہیں خرید دیا تھا؟ سو جا" اور اس نے اندھیرے میں اِدھر اُدھر آنکھیں جھپکا کر آسمانی خربوزے دیکھنا چاہے مگر بوڑھی بکری کے مدھم دھبے اور کڑے نیم کے چپ چاپ سائے کے سوا اسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس پر اسے خربوزے کا گمان ہوسکتا!

ساری رات اسے خربوزوں بھرے خواب نظر آتے رہے اور جب صبح کو اٹھا تو آنکھیں ملتا اپنی ماں کے پاس جا بیٹھا اور اس کے اٹھے ہوئے گھٹنے پر اپنی ننھی سی ٹھوڑی رکھ کر مسکین آواز میں بولا —"ماں!"

اور وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی :—"کیا ——؟"

"خربوزہ!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اور اس کی حقیقی ماں کی آنکھیں سوتیلی ماؤں کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھیں۔ اس نے ہونٹ کاٹ کر بچے کے گال پر الٹے ہاتھ سے اس زور سے طمانچہ مارا کہ وہ لڑھک کر چولھے کے پاس جا گرا۔ زار و قطار روتا وہ اپنے گھر سے باہر نکل گیا اور سوچنے لگا۔ اس دنیا میں پہلے سے ہی میرا باپ نہ تھا۔ اب میری ماں بھی کوئی نہیں۔ میں تو کوئی آوارہ بھکاری چھوکرا ہوں، جس گلی میں جاتا ہوں کتے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں اور جس سے بات کرتا ہوں وہ تیوری چڑھا لیتا ہے! بس اب آج کے بعد

"لوگ [illegible] " تو مولا بخش بولا "میں تو جب آیا تھا تو تین تھے یا ماسی تھی یا کچھ بچے تھے۔"
کسی کو پتہ بھی نہیں چلا تھا اور لوگ گاؤں واپس آکر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔ گھروں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ بوڑھے [illegible] پاس کی چارپائیوں پر چڑھ رہے تھے۔ اور دور ایک چھت پر کوئی عورت دھلے ہوئے کپڑے سکھانے کے لیے پھیلا رہی تھی۔

ماسی کچھ دیر تک گاؤں کو اپنی پھیلی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ پھر وہ نچلے ہونٹوں کو دانتوں میں لے کر رستے [illegible] کے پاس آئی [illegible] لاؤ میں کھینچوں گی۔"

تینوں [illegible] کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر ایک [illegible] بچوں کو بلایا۔ وہ بھاگتے ہوئے آئے اور رستے سے [illegible]
[illegible] ہاتھ رکھے ایک طرف کھڑا رہا۔

آہستہ آہستہ رستہ [illegible] مولا بخش نے جگے کی لاش اپنی رانوں پر سے اٹھائی [illegible] اسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ سب رستے کو کھینچ کر [illegible]۔

پھر ماسی آگے بڑھی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اور [illegible] لاکر بولی "میرے اس پھول کو یہاں میری جھولی میں ڈال دے میرے بیٹے۔"

مولا بخش جگے کی لاش کو اپنے بازوؤں [illegible] اور [illegible] کی طرف بڑھا کہ ماسی چل پڑی۔ "[illegible] دیر ہو جائے گی۔"

[illegible] اٹھ کر جگے کا [illegible] ذرا سستا کر کھڑا ہو گیا۔ [illegible] جگے کو [illegible] کے ماما کی طرح بڑا [illegible] کھٹولے پر رکھا۔ پھر بولی:
"تم تو تین ہو۔ جنازہ تو چار اٹھاتے ہیں۔"

پھر کسی کو سامنے سے ملک رحمان خان آتے دکھائی دیے۔ قریب آکر وہ بولے۔ "میں سمجھا تھا بہت سے لوگ ہوں گے۔ تو ان سے بات کروں گا۔ مگر یہاں تو تم ہی تین چار ہو۔ سب چلے گئے تھک کر۔ صبح سے آئے ہوئے تھے۔ اور اب تو ظہر کی اذان ہونے والی ہے۔"

[illegible] ملک رحمان خان کھٹولے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ "بات یہ ہے بھئی" انہوں نے کہا۔ "کہنا یہ تھا کہ کفن دفن کے بعد تم لوگ [illegible] جنازے [illegible] لوگوں سے [illegible] لاش نکل آئی ہے تو کنویں کو پاک بھی کر لینا چاہیے [illegible] بو کے نکالنے [illegible] تم سمجھ لو گے۔ بو کا خوب [illegible] یہ تم سے کہہ رہا ہوں اور پھر یہ ثواب کا کام بھی ہے۔"

سکوں میں رقص کناں، رقص میں سکوں پذیر
خرام حسن کا آئینہ ہے خرام حیات

—— ندیم

ندیم

خربوزے

وہ تھکا ماندہ روتا بسورتا سو گیا۔ اور سوتے میں اس نے ایک خواب دیکھا کہ آسمان کے ستارے ہولے ہولے خربوزوں کی شکل اختیار کر رہے ہیں اور یہ آسمانی خربوزے جھم جھم کرتے اس کی جھولی میں آ گرتے ہیں۔ خود کٹ جاتے ہیں۔ بیج خود ہی الگ ہو جاتے ہیں۔ خود اس کے منہ میں اپنا گودا تراش کر ڈال دیتے ہیں اور چھلکے اچھل کر خود ہی پرے جا گرتے ہیں۔ اور اس کی ماں جس نے شام سے اس وقت تک چیخنے چلانے کے باوجود اسے ایک خربوزے کے لیے دو پیسے نہیں دیے تھے اکواڑ کا سہارا لیے بیٹھی مسکرا رہی ہے! اور اس کے ہم جولی پست دیوار پر سے اپنے گرد آلود سر اٹھا کر اسے تعجب اور رشک سے دیکھ رہے ہیں کہ اچانک ایک خربوزہ اس کے سر پر آن گرا اور وہ بلبلا کر اٹھ بیٹھا ——— ہائے ماں —— خربوزہ —— اور اس کی ماں اچانک نیند سے چونک کر پکاری "تیرے دشمنوں کو موت آئے تو کیا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے! یہ اللہ مارے خربوزے کیا آئے میرے لیے آفت آ گئی۔ چند روز ہوئے تجھے ایک گول گول پیلا پیلا خربوزہ نہیں خرید دیا تھا؟ سو جا" اور اس نے اندھیرے میں اِدھر اُدھر آنکھیں جھپکا کر آسمانی خربوزے دیکھنا چاہے مگر بوڑھی بکری کے مدھم دھبے اور کریلے نیم کے چپ چاپ سائے کے سوا اسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس پر اسے خربوزے کا گمان ہو سکتا!

ساری رات اسے خربوزوں بھرے خواب نظر آتے رہے اور جب صبح کو اٹھا تو آنکھیں ملتا اپنی ماں کے پاس جا بیٹھا اور اس کے اٹھے ہوئے گھٹنے پر اپنی ننھی سی ٹھوڑی رکھ کر مسکین آواز میں بولا — "ماں!"

اور وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی: — "کیا ——؟"

"خربوزہ!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اور اس کی حقیقی ماں کی آنکھیں سوتیلی ماؤں کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھیں۔ اس نے ہونٹ کاٹ کر ننھے کے گال پر الٹے ہاتھ سے اس زور سے طمانچہ مارا کہ وہ لڑھک کر چولھے کے پاس جا گرا۔ زار و قطار روتا وہ اپنے گھر سے باہر نکل گیا اور سوچنے لگا۔ اس دنیا میں پہلے سے ہی میرا باپ نہ تھا۔ اب میری ماں بھی کوئی نہیں۔ میں تو کوئی آوارہ بھکاری چھوکرا ہوں، جس گلی میں جاتا ہوں کتے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں اور جس سے بات کرتا ہوں وہ تیوری چڑھا لیتا ہے! بس اب آج کے بعد

گھر نہیں جاؤں گا۔ ان کھیتوں سے نکل کر بہت دور چلا جاؤں گا۔ وہ جہاں اڑتی ہوئی کونجیں چڑیاں سی نظر آرہی ہیں، جہاں ریلیں اور لاریاں چلتی ہیں۔ بس وہاں ——— نہ کسی سے کچھ مانگوں گا۔ نہ کسی کی چوری کروں گا۔ دن کو چلتے چلتے تھک جاؤں گا تو شیشموں تلے لیٹ رہوں گا۔ رات کو تھکوں گا تو نرم گھاس کے قطعوں پر سو رہوں گا۔ ماں کہا کرتی ہے کہ ہم سب کو رزق دینے والا خدا ہے۔ بس اسی سے مانگوں گا۔ وہی میرا پیٹ بھر دے گا۔ ——— وہی خربوزے بھی لا دے گا ——— ! اور خربوزوں کا خیال آتے ہی وہ رُک گیا۔ بھیگی ہوئی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مل کر اس نے ہاتھ بلند کیے اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اے میرے اچھے خدا ———! میں تجھے بہت یاد کیا کرتا ہوں۔ پرسوں مولوی جی سے میں نے نماز کا سبق بھی لیا تھا اور مجھے کلمہ بھی آتا ہے اور میں بہت اچھا ہوں اچھے خدا۔ اور تو یوں کر کہ مجھے آج اچھے اچھے پیلے پیلے خربوزے لا دے کہیں سے، اور نہیں تو یہ سامنے بخشو کا کھیت ہے، یہیں سے سہی۔ لیکن خربوزے لا دے ضرور۔ میں آج ساری رات کلمہ پڑھتا رہوں گا اور پھر کبھی خربوزے نہ مانگوں گا ——— میرے اچھے خدا ——— اب میں آنکھیں بند کرتا ہوں۔ تو میرے سامنے خربوزے رکھ جا۔ لے"———

اور اس نے وہیں کھڑے کھڑے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس کے لبوں کے گوشے کانپنے لگے۔ نتھنے پھڑک گئے اور وہ مسکرانے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اللہ میاں اس کے لیے خربوزوں کی گٹھڑی باندھے آ رہے ہیں۔ قدموں کی چاپ نہایت تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ اس کے ذہن پر اللہ میاں کا پاکیزہ ہیولیٰ اُبھرا۔ سفید لباس، سفید بال، نورانی چہرہ، ایک سفید کپڑے میں پیلے پیلے خربوزوں کا ایک انبار باندھے وہ اس کے قریب آئے اور پھر اور پھر تڑاخ کی آواز آئی۔ اس کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ دھب سے نکیلے پتھروں پر گر گیا۔ سکتہ چھا گیا بے چارے پر۔ پلٹ کر دیکھا تو اللہ میاں کی جگہ سفید لباس پہنے سفید ریش بخشو کھڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں اور پریشانی میں وہ اپنی داڑھی کو بار بار کھجلاتا تھا۔ گرج کر بولا "شیطان کہیں کا۔ مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کر کے یوں چپ چاپ کھڑا ہو گیا جیسے کچھ خبر ہی نہیں۔ یوں کھیت میں گھسا آ رہا تھا جیسے اپنے باپ کی ریاست میں اینڈتا پھر رہا ہے۔ شیطان کہیں کا"———

ننھا، جو خدا اور بخشو کے اس ہولناک تصادم سے گھبرا سا گیا تھا، روتی صورت بنا کر بولا "میں تو خربوزوں کی ———"

اور بخشو اس کی بات کاٹ کر کہنے لگا "اور میں کب کہتا ہوں کہ تو یہاں نماز پڑھنے آیا ہے۔ خربوزوں کی تلاش ہی تو تجھے یہاں کھینچ لائی۔ پچھلے چند دنوں سے میں سوچ رہا تھا کہ وہ کون ہے جس نے میرے کھیت کا پورا ایک گوشہ تباہ کر ڈالا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ حضرت ہیں"———

اور وہ روتا ہوا بولا "میں تو آج ہی ——— "

"اور کل، اور پرسوں؟" بخشو نے اپنا سر دائیں کاندھے پر جھکا کر کہا "کل پرسوں میں نے تجھے نہیں دیکھا، اس لیے؟ اُٹھ۔ بھاگ جا یہاں سے۔ اگر آج کے بعد تو پھر اِدھر آیا تو نِگل جاؤں گا تجھے۔ بڑا آیا خربوزوں کا رسیا۔ اتنا شوق ہے تو ماں سے دو پیسے لے اور خرید لے جا خربوزہ!"

ننھا اٹھا۔ اٹھتے ہوئے اس کی نظریں سامنے سارے کھیت میں گھوم گئیں۔ اور بے شمار پیلے پیلے دھبے اس کے سامنے تیرتے ہوئے کہیں کھو گئے۔ سر جھکائے وہ پلٹا اور بہت دور جا کر ایک ننھی سی بیری کے تنے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور

سوچنے لگا — اس دنیا میں نہ تو اس کا کوئی باپ ہے اور نہ ماں۔ اور نہ ——— اور نہ خدا ——— ! اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ سسکیاں بھرتا ہوا وہیں سو گیا۔

بہت دیر تک وہ خربوزوں بھرے خواب دیکھتا رہا مگر اچانک جیسے اس کے منہ پر اللہ بخش نے تھپڑ مار دیا ہڑبڑا کر اٹھا۔ دیکھا تو ماں کھڑی ہانپ رہی ہے۔ بڑی بڑی لال آنکھیں۔ پسینے سے تر آلود چہرہ۔ پاؤں پر گرد جمی ہوئی۔ ہاتھ دوسرے طمانچے کے لیے تُلا ہوا "لگاؤں دوسرا؟" وہ پکاری "لگاؤں یا گھر چلے گا؟ ارے اُچکّے۔ تو بخشو کا کھیت اُجاڑتا رہا ہے اور پھر بھی ہر وقت خربوزہ خربوزہ کی رٹ لگائے رکھتا ہے۔ ارے چوٹّے۔ تجھے شرم نہ آئی؟ اللہ بخشے تیرے باپ کو تو ایک روز پانچ روپے کا ایک نوٹ گلی میں پڑا تھا تو بھاگا بھاگا چوپال پر گیا۔ پوچھ گچھ کی اور جس کا نوٹ تھا اسے دے دیا۔ ایک کوڑی تک نہ لی۔ گھر لے آتا تو بھیڑ بکری خریدی جاتی۔ لیکن اس کے من میں کھوٹ نہ تھا۔ اور تو ایسا ناخلف، ایسا کپوت کہ خربوزے چراتا پھر رہا ہے۔ زبان کا چسکا پورا کرنے کے لیے خاندان بھر کے نام کو بٹہ لگا رہا ہے۔ بخشو ابھی ابھی میرے ہاں گیا اور ساری عورتوں کے سامنے میری ناک کاٹ کر دے پھینکی ——— "

ماں کی کف آلود ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن ماں کی ناک کٹ جانے کی خبر سُن کر اس نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں۔ ماں کی ناک اسی طرح قائم تھی۔ اسی طرح لمبی اور جھکی ہوئی۔ اور پھر اسے وہ سوراخ بھی نظر آ گیا۔ جو شاید بچپن میں بلاق ڈالنے کے لیے نکالا گیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس کی ماں بھی عجیب ہے۔ اس پر ایک جھوٹا الزام دھر رہی ہے اور خود اتنا بڑا جھوٹ بول رہی ہے ! ———

"اسے چلتا ہے گھر یا ——— " ماں کا ہاتھ اور بلند ہو کر تن گیا۔ انگلیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑ گئیں۔ وہ اُٹھا اور ہولے سے بولا — "چلتا ہوں!"

"چل میرے آگے" ماں نے اس کی گردن کو اپنے پنجے میں جکڑ لیا۔ اور جب وہ بخشو کے کھیت کے قریب سے گزرا تو اس کی آنکھوں کے سامنے پیلے پیلے تارے سے تیرنے لگے جو آہستہ آہستہ رنگ بدلتے گئے اور جب وہ گھر پہنچا تو وہ تارے صحن میں بٹے ہوئے کنکروں میں تبدیل ہو گئے۔

گھر آ کر ماں نے اسے دلاسا دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے لون مرچ کے علاوہ اس کے سامنے گڑ بھی تھا۔ ماں اُسے پنکھا بھی جھلتی رہی اور یہ بھی کہا "تُو تو میرا سب کچھ ہے۔ تو میرا دھن دولت ہے۔ تجھی کے سہارے تو میں جی رہی ہوں۔ ورنہ کب کی کسی گھاٹی میں چھلانگ لگا گئی ہوتی۔ تو بڑا ہو گا۔ نوکر ہو جائے گا فوج میں۔"

"میں تھانے میں سپاہی بنوں گا۔" اس نے لقمہ چباتے ہوئے ہونٹ لٹکا کر کہا۔

"ہاں ہاں!" ماں مسکرا کر بولی "میرا ننھا تھانے کا سپاہی بنے گا۔ سر پر لال پگڑی۔ ہاتھ میں ننھی سی چھڑی۔ پاؤں میں کالے کالے بوٹ، جدھر جائے گا لوگ زمین پر بچھتے جائیں گے۔ اور پھر میرا لال چھٹی پر آئے گا تو میرے لیے اچھی اچھی چیزیں لائے گا۔ ریشمی کپڑے اور مٹھائیاں اور ———

"اور خربوزے بھی ———!" اس نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ماں کے چہرے کی جھریاں گہری ہو گئیں اور پھر وہ بولی "ہاں خربوزے بھی!" ———

اور ان باتوں کے دوران میں ننھا سوچتا رہا کہ ماں اس وقت بہت مہربان معلوم ہوتی ہے۔ اب میری ماں پچھلی ماں کے روپ میں ہے، کیوں نہ میں اسے ایک خربوزہ لانے کے لیے کہہ دوں۔ لیکن اس کی نظریں اچانک اپنی ماں کے سوکھے ہوئے ہاتھ پر جا پڑیں جس کی انگلیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑی ہوئی تھیں ——— تھوک نگل کر چپکا ہو رہا!

لیکن خربوزوں کا بھوت اس کے سر پر بری طرح سوار رہا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ ماں کو ایک خربوزے کے پیسے کہہ دے۔ پر سوں ذیلدار جی کے گھر کی چکی پیس کر ایک آنہ لائی ہے۔ کیا ان چار پیسوں میں سے وہ ایک پیسے کا بھی حق دار نہیں۔ آخر اس کا چھپا ہوا آدھا آنہ اگر دی تو ذیلدار جی کی بیٹی کو دے آیا تھا۔ اور اگر یوں نہیں تو کیوں نہ وہ بخشو والے جھوٹے الزام کو سچ کر دکھائے۔ چپکے سے گھس جائے کھیت میں اور اتنے خربوزے کھائے کہ ساری عمر اسے خربوزوں ہی کی ڈکاریں آتی رہیں۔ لیکن یہ سب کچھ سوچنے کے بعد اچانک اس کے دماغ میں ماں کا اکڑا ہوا ہاتھ کلبلانے لگتا اور اس کے سارے ارادے ننھے ننھے ذرے سے بن کر ہواؤں میں کھو جاتے۔

ایک روز وہ ایک گلی میں خربوزے کے چھلکے دیکھتا گزر رہا تھا کہ اسے ذیلدار جی کی آواز سنائی دی "اے ننھے ادھر آ!" اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے کئی ہم عمر چوپال پر اکٹھے تھے۔ آنکھیں جھپکاتا وہ ذیلدار جی کے پلنگ تک گیا اور بولا "جی!"

ذیلدار جی بولے "ہمارا بھوسہ آیا ہے آج۔ اس کو ٹھے میں پڑا ہے۔ تم سب لڑکے اسے اچھی طرح لتاڑ دو، تاکہ وہ نیچے بیٹھ جائے اور بھوسے کا ایک اور بورا بھی کوٹھے میں آ سکے، دو دو پیسے ملیں گے تم سب کو، لتاڑ دو گے؟"

"لتاڑ دوں گا!" ننھا بولا اور ہر طرف خربوزوں کا موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔

سب لڑکے اندھیرے کوٹھے میں گھس کر بھوسے پر چڑھ گئے۔ بہت دیر تک کودتے ناچتے رہے، بھوسے کی مہین دھول نکل کر ان کے بالوں، بھنوؤں، آنکھوں، ناک اور منہ میں گھستی رہی، مگر دو پیسوں کا جادو انھیں اسی طرح نچاتا رہا۔ کسی کو ریوڑیاں یاد آ رہی تھیں تو کسی کو پیپرمنٹ، کوئی مصالحہ دار گڑ کے نواب دیکھ رہا تھا تو کوئی رنگ برنگی پتنگوں کے۔ لیکن صرف ایک دماغ میں خربوزے لڑھک رہے تھے۔ قدموں کی ہر دھمک کے ساتھ کوئی اس کے کان میں کہتا "خربوزہ!"

اور وہ خوش ہو کر اپنے ہی جی میں کہتا "خربوزہ نہیں تو کیا ریوڑیاں؟ دانت ٹوٹ جاتے ہیں چباتے چباتے۔ اور پیپرمنٹوں سے کچی کچی بو آتی ہے اور مصالحہ دار گڑ میں مصالحے کی جگہ مکوڑے پڑے ہوتے ہیں۔ اور پتنگ ایک جھٹکے سے کٹ جاتے ہیں کم بخت۔ ہم تو خربوزہ خریدیں گے۔ باہر سے پیلا اور اندر سے سبز۔ ایک ایک پھانک میں لاکھ لاکھ مزے!"

بہت دیر تک وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ کودتا رہا۔ ناچتا رہا۔ اور مہین دھول اس کی آنکھوں اور نتھنوں اور گلے میں گھستی رہی اور آخر جب ذیلدار جی مطمئن ہو گئے کہ بھوسا اس سے زیادہ نہ دب سکے گا، تو سب ننھے ننھے بھتنوں کی طرح باہر نکلے۔ دو دو پیسے سب کی ہتھیلیوں پر رکھے جانے لگے۔ ننھا سب سے آخر میں تھا۔ وہ جونہی ہاتھ پھیلائے ذیلدار جی کے قریب آیا اور انھوں نے جیب سے ہاتھ نکالا تو وہ مٹھی بند کر کے قلانچیں بھرتا چوپال سے بھاگ نکلا "ارے ننھے پیسے تو لیتا جا!" ذیلدار جی ہنستے ہوئے بولے۔ اس نے رک کر مٹھی کھولی تو خالی تھی۔ اسے ذیلدار جی بڑے سست اور نالائق معلوم ہونے لگے۔ جنھوں نے دو پیسے نکال کر ہتھیلی پر رکھنے میں تین گھنٹے لگا دیے تھے۔

واپس آ کر اس نے ذیلدار جی سے پیسے لیے مگر اس کا ہاتھ کانپ گیا اور پیسے نیچے گھوڑے کی لید میں گر گئے۔

نہایت پھرتی سے اس نے لید سے پیسے اٹھائے اور ڈھلوان پر سے لڑھکتے ہوئے کھلونے کی طرح خربوزوں والے شاموں کی دکان کی طرف لپکا!

دور سے شاموں کو پکارا "چچا شاموں! ایک خربوزہ، دو پیسے کا ایک اچھا سا بڑا سا پیلا سا خربوزہ!"

اور جب وہ چچا شاموں کے قریب پہنچا تو خربوزہ منتخب ہو چکا تھا۔ دو پیسے شاموں کے آگے پھینک کر وہ خربوزے کو بغل میں دبائے گھر کی طرف دوڑا۔ ایک جگہ اس نے ٹھوکر بھی کھائی اور گرتے گرتے بچا۔ حلق پر جمی ہوئی دھول تیز تیز سانس لینے کی وجہ سے "چیں چاں" بجنے لگی۔ گھر کے صحن میں قدم دھرتے ہی پکارا "ماں ——— ! خربوزہ۔!"

اور اس کا حلق فرطِ مسرت سے گھٹ گیا۔ "خربوزہ ——— !" وہ ایک بار پھر چلایا۔

اندر سے آواز آئی ——— "پھر وہی خربوزہ؟ تیرا باپ دے گیا ہے مجھے خربوزے کہ تو ——— ارے خربوزہ لایا ———"

اور ماں نے بڑھ کر خربوزہ اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر گھمایا۔ "کہاں سے لایا ———؟"

ننھے نے جب ماں کو سارا حال کہہ سنایا تو وہ بولی "پیسے گھر لے آتا تو اچار خرید لیتے جو دس دن تک چلتا۔ مگر خیر۔ تجھے شوق تھا ——— شکر ہے تیرے من کی آگ تو ٹھنڈی ہوئی ——— لے ذری چھری تو اٹھا لا ——— چولھے کے پاس پڑی ہوگی ———"

ننھا کودتا پھاندتا چولھے کے پاس گیا۔ چھری کے دھوکے میں دستِ پناہ اٹھا لایا۔ رستے میں پلٹ کر دستِ پناہ وہ پھینکا اور چھری اٹھالی۔ ماں کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ چھری خربوزہ پر جھکی اور جب اس کی نوک خربوزے کے کلیجے میں داخل ہونے لگی تو ماں بولی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؕ" اور جی ہی جی میں ننھے نے بھی تین بار بسم اللہ شریف پڑھی ——— اور پھر ———!

پھر دونوں ٹکڑے الگ ہو گئے اور پانی کی ایک ندی کاسی فرش پر بہنے لگی ——— بدبو سے دونوں کے دماغ پھٹنے لگے۔ خربوزے کا سارا گودا پانی بن چکا تھا اور بیج کالے رنگ کے ہو گئے تھے اور چھلکے پر لمبے لمبے سفید رنگ کے کیڑے بل کھا رہے تھے۔ خربوزے کو فرش پر پٹخ کر ماں نے انگلیوں کی پانچ سلاخوں سے ننھے کے گال پر اس زور کا طمانچہ مارا کہ وہ لڑھکتا لڑھکتا دیوار کے قریب جا رکا۔ چھلکے بوڑھی بکری نے بھی قبول نہ کیے!

وہ روتا بلکتا سو گیا۔ اور جب صبح کو اٹھا تو اس کے گلے میں "چیں چاں" سی ہو رہی تھی۔ اور اس کے بدن سے آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔

اور خربوزے کے چھلکے سے کالے کالے لمبے چیونٹے چمٹ رہے تھے اور بخشو کے کھیت میں ——— ہر طرف پیلے پیلے دھبے سے ناچنے لگے۔ وہ چیخ مار کر تڑپا اور کھٹولے سے نیچے آ رہا ———!

ایک صحرائے بیکراں ہے جہاں
وقت اک بے قرار آہو ہے

——— ندیم

ندیم

پہاڑوں کی برف

میں نے قلم کو کاغذ پر جھکایا ہی تھا کہ آواز آئی — "اے بی بی۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ تیرا بچہ جیوے"
میں نے قلم کو واپس قلمدان میں رکھ دیا۔ اگر اس قلم کی قیمت چالیس پچاس روپے نہ ہوتی تو میں اسے یقیناً پٹخ دیتا
صبح سے بارہ ایک بجے تک کی سوچ بچار کے بعد مجھے مزے کا یہ فقرہ سوجھا تھا مگر بھکارن کی آواز نے اسے یوں
نوچ لیا تھا جیسے پھونک مارنے سے چراغ کی لو غائب ہو جاتی ہے ——

کیا عمدہ سا فقرہ تھا۔ — میرے افسانے کا یہ پہلا فقرہ قاری کے ذہن کو جکڑ لیتا —
میرا مکان کی تیسری منزل میں تھا۔ بھکارن کی آواز اس تک شاید نہ پہنچ سکی تھی — ورنہ میری ہدایت کے مطابق
بھکارن کو اس کی طرف سے دفع ہو جانے کا مشورہ فوراً ملتا۔ بھکارن بھی ایک ہی آواز لگا کر شاید چلی دی تھی۔۔
یکا یک کھوئے ہوئے فقرے کے چند الفاظ کٹی پھٹی صورت میں میرے ذہن میں ابھرے۔ ایک جلتی ہوئی دیا سلائی بجھے
ہوئے چراغ کی طرف بڑھی ——— اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا — مگر نہیں — میں نے برف کے
رنگ میں کوئی اور رنگ بھی ملایا تھا — لالۂ صحرائی کا رنگ۔ یا شاید شفق شام کا رنگ۔ یا ممکن ہے ——

"اے بی بی۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ تیرا بچہ جیوے۔ ———

تو وہ کم بخت ابھی تک وہیں نیچے صدر دروازے میں کھڑی تھی ——

دیا سلائی دھوئیں کی ایک ننھی لکیر چھوڑ کر بجھ گئی۔ اور میں پکارا ——

"بی بیاں گھر میں نہیں ہیں"——

"بی بی نہیں تو بابو تو ہی خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ اے سخی تیرا بچہ جیوے ——

میں خاموش رہا۔ بھکاریوں سے زبان لڑانا میرا شیوہ نہیں۔ ان کے پاس سب سے بڑی دلیل بھوک کی ہوتی
ہے۔ اور مجھے اس دلیل کا کوئی جواب نہیں سوجھ سکا ——

کچھ دیر کے بعد ذہن کی دھند میں حرکت پیدا ہوئی اور افسانے کا ابتدائی فقرہ جیسے آنکھیں ملنے لگا۔ اس کا رنگ

پہاڑوں کی برف کی طرح ——

"دے دے ناسخی۔ تیری دے دے نا۔" اپ کے بھکارن کی آواز جیسے میرے عین سر پہ گونجی۔ میں نے دیکھا تو وہ میرے کمرے کے دروازے میں یوں کھڑی تھی کہ اس کا پورا دھڑ [illegible] ہر سبز شے پہ تھا۔ مجھے اس کا صرف ایک ہاتھ نظر آیا جس سے اس نے کواڑ کو پکڑ رکھا تھا۔ اس ہاتھ کا رنگ پہاڑوں کی برف کا سا تھا، بلکہ برا سفید۔ کہیں کہیں ہلکی سی نیلاہٹ دیتا ہوا۔ یہ شاید اس کی رگوں کا رنگ تھا۔ مگر اس کے ناخنوں نے مجھے زیادہ سوچنے کی مہلت نہ دی۔ یہ ناخن میل سے اٹے ہوئے تھے اور کٹے پھٹے دندانہ دار تھے۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے اس کی انگلیوں میں ایک نہایت متوازن حرکت پیدا ہوئی۔ تو یہ ایسی بے فکری بھکارن ہے کہ بھیک لینے تک کا وقت نزاکت سے [illegible] لگی ہے! — کیا اس کو بھیک دینا جائز ہے؟ — مگر کیا ان سفید ہاتھوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دینا جائز ہے؟ — لیکن کیا یہ مجبوری جائز ہو سکتی ہے؟ ——

میں نے تکیے کے نیچے سے ایک آنہ اٹھایا اور بولا — "یہ لے"۔

وہ بولی — "ادھر پھینک دے بابو"۔

نہ جانے مجھے اس بھکارن کے طرزِ عمل پر غصہ سا کیوں آنے لگا تھا۔ میں نے [illegible] آنہ [illegible] کواڑ پہ بج کر کمرے کے اندر دہلیز سے کوئی ایک گز کے فاصلے پر گرا۔ بھکارن نے [illegible] جھک کر ہاتھ بڑھایا یوں اس کے چہرے کا ایک رخ بھی میرے سامنے آ گیا۔ مگر یہ سب کچھ ایک سیکنڈ کے [illegible] میں ہوا [illegible] بجلی سی میرے کمرے میں کوند کر رہ گئی ہے۔ مجھے دروازے تک پہنچنے میں دو سیکنڈ لگے ہوں گے مگر سیڑھیاں خالی تھیں۔ میں چھت کی منڈیر سے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس آیا۔ وہ گلی کے [illegible] جا رہی تھی۔ [illegible] رنگ کی شلوار پر اس نے سیاہ رنگ کی گھیرے دار قمیص پہن رکھی تھی۔ اور اس کے سر اور پیٹھ پر شربتی رنگ کی چادر لپٹی ہوئی تھی۔ پھر وہ دوسری گلی میں مڑ گئی ——

بھکارن کے چہرے کی یک رخی جھلک نے مجھے اپنے افسانے کی ہیروئن [illegible] سائیکی اور ایفروڈائٹ —— بہ ساطیری خاتون کے ساتھ [illegible] تھا۔ بھکارن کا چہرہ صرف ایک رخ سے میرے سامنے آیا تھا۔ اور جتنی دیر میں "سامنے" کا لفظ بولا جا سکتا ہے، غائب ہو گیا تھا۔ [illegible] میرے ذہن نے اس چہرے کی کتنی تفصیلیں محفوظ کر لی تھیں۔ پتلی اور بے حد سیاہ بھویں۔ موٹی [illegible] بے حد سیاہ آنکھیں۔ بڑی اور بہت سیاہ پلکیں۔ ستواں ناک میں نتھنوں کا بے حد خفیف ابھار۔ بے حد سرخ ہونٹ۔ بے حد نکیلی ٹھوڑی۔ بے حد سفید گال بالکل پہاڑوں کی برف کی طرح۔

پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی۔ دراصل یہ سب کچھ میری ذہنی فضا کا نتیجہ تھا جو میں نے اپنے افسانے کا تذکرہ کرتے ہوئے قائم کر لی تھی۔ انسان بھی کتنا بے اختیار جانور ہے! — اس پر خود اپنے ذہن کا جبر کتنا شدید ہوتا ہے! لاحول ولا قوۃ — میں قلم اٹھا کر افسانے کا پہلا لکھا ہوا فقرہ ڈھونڈنے لگا۔

مگر چراغ کی بجھی ہوئی لو پہلے کسی کو لگی ہے جو مجھے لگتی۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں افسانے کا یہ فقرہ نہ لکھ سکا

تو ایک بھی افسانہ کیا میں کبھی کوئی افسانہ نہیں لکھ سکوں گا۔ جیسے یہی ایک کھونٹی تھی جس پر مجھے اپنے خیالوں کا سارا پشتارا لٹکانا تھا۔ اور اب یہ کھونٹی ٹوٹ گئی ہے تو میرا ہر خیال پتھر بن گیا ہے۔ اور میں پتھروں کے اس بوجھ تلے دوہرا ہوا جا رہا ہوں۔

پھر ردّی خریدنے والے نے گلی میں ایک سانس میں کوئی بیس الفاظ کا فقرہ نہایت کراری آواز میں ادا کیا۔ اور مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ یہ ردّی والا پچھلے کئی برس سے ہر روز ایک دو بار اس گلی میں سے گزرتا تھا اور میرے مکان کے سامنے ضرور رکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں پڑھنے لکھنے والا آدمی ہوں۔ اور ایسے آدمیوں کے ہاں ردّی بہت عام مل جاتی ہے۔ میں اس آواز کا عادی تھا۔ افسانہ لکھتے ہوئے بھی میں نے یہ آواز کئی بار سُنی تھی اور میرے افسانے کی روانی میں اس نے کبھی کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ مگر آج مجھے ردّی والے پر اتنا غصہ آیا کہ میں قلم رکھ کر اٹھا کھڑکی میں سے نہایت قہر آلود نظروں سے دیکھنا چاہا۔ مگر میری نظر سب سے پہلے گلی کے نکڑ پر پڑی اور مجھے پہلی بار تجربہ ہوا کہ تصویر محسوس بھی ہو سکتی ہے ——— بھکارن دوسری گلی میں مڑ رہی تھی ——

میں جیسے اس کے تعاقب میں بھاگا۔ میں کتنی گلیوں اور سڑکوں کو طے کرتا ہوا نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔ نہ جانے میں ٹریفک سے کیسے بچا اور چوراہوں کو کیسے پار کیا۔ نہ جانے میں نے کتنے سگریٹ کب جلائے اور کہاں پھینکے۔ پھر جب میں مال روڈ کے ایک چوک میں ٹریفک سگنل کی سرخ بتی دیکھ کر رُکا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں کہیں جا رہا ہوں۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟ ——
"کیوں بھئی! میں کہاں جا رہا ہوں؟" —— میں نے اپنے آپ سے پوچھا ——

میں عشق کے سب مرحلوں اور تمام منزلوں سے آگاہ ہوں۔ میں ذرا ذرا سی بات پر رو بھی دیا ہوں اور بڑے بڑے دکھوں کو پی بھی گیا ہوں۔ مگر مجھے ایسی وحشت کا تجربہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ ایک میلی کچیلی، بدبودار، ورا ﷲ بھکارن کی صرف ایک نیم رُخی جھلک نے میرے خون کو جنون کے نقطے پر پہنچ دیا ہے اور میں وہاں جا رہا ہوں جہاں سے اگر واپس نہ آ سکوں تو شہر کے بچے مجھ پر پتھراؤ کر دیں۔ تو کیا یہ سچ ہے کہ ہر انسان میں تھوڑا سا جنون ضرور ہوتا ہے؟ مگر میرا یہی جنون کیا کم ہے کہ جب لوگ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہوتے ہیں تو میں سوچ رہا ہوتا ہوں کہ ان کے لاشعور میں کس قیامت کے رن پڑ رہے ہوں گے۔ مجھے جنون کی اسی مقدار پر قانع رہنا چاہیے ——

میں گھر لوٹ آیا۔ میں نے رات کا ایک بہت بڑا حصہ اپنے نئے ہوئے افسانے کا پہلا فقرہ سوچنے میں کاٹا۔ مگر جہاں پہاڑوں کی برف میرے ذہن میں آئی، میں بھکارن نے سیڑھی پر سے ہاتھ بڑھا کر آنہ اٹھایا اور کشتِ خیال میں یونانی اصنام کے چہروں کی ندیاں اُمڈ پڑیں۔

میں صبح کو یوں بروقت اٹھا جیسے رات پوری نیند سویا ہوں۔ پھر اپنے کمرے میں اس اہتمام سے آ بیٹھا جیسے سورج کے نکلتے ہی دوپہر ہو گئی ہے اور بھکارن اب آتی ہی ہو گی۔ اس مسئلے پر دیر تک میرے اور میرے ذہن کے درمیان خاصی تلخ بحث ہوتی رہی۔ میں کہتا تھا کہ دیکھو تو میرے ہاتھ میں قلم ہے۔ میں تو افسانہ لکھنے بیٹھا ہوں۔ مگر میرا ذہن کہتا تھا کہ نہیں۔ تم جھوٹے ہو۔ تم تو بھکارن کا انتظار کر رہے ہو۔ اس وقت تو میں نے اُلٹا اپنے ذہن کو جھوٹا ثابت کر دیا تھا۔ مگر جب دوپہر کو بھکارن آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں اسی کا منتظر ہوں۔

آواز آئی —— "ہے نی۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ تیرا بچہ جیوے"

اور میں نے سوچا کہ کیا کسی شاعر نے کبھی اس سے بہتر شعر بھی کہا ہے ۔؟

عجیب بات ہے کہ نہ تو میں پلنگ پر سے کود کر اٹھا اور نہ میں نے قلم کو قلمدان میں رکھا۔ میں نے بڑے ٹھنڈے انداز میں صرف اتنا کہا۔ "ارے تو آج پھر آگئی ۔؟"

اس پر مجھے لگا جیسے وہ ہنسی ہے۔ نہایت مختصر مگر نہایت سُریلی ہنسی۔ جیسے چینی کی پیالی کو چینی کی پیالی چھو جائے۔ پھر وہ میرے کمرے کے دروازے پر سے بولی ـــ "بابو تیرا بچہ جیوے"۔

میں نے دیکھا تو وہ کمرے کے دروازے میں یوں کھڑی تھی کہ اس کا پورا دھڑ باہر سیڑھی پر تھا۔ مجھے صرف اُس کا ایک ہاتھ نظر آیا جس سے اس نے کواڑ پکڑ رکھا تھا۔ اس ہاتھ کا رنگ پہاڑوں کی برف کا سا تھا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کل سے یہیں کھڑی ہے۔ وہ ازل سے یہیں کھڑی ہے۔

یکایک میں ڈرا کہ کہیں وہ کواڑ پر ڈھولک نہ بجانے لگے۔ کل میں نے اس کی انگلیوں کی متوازن حرکت سے اپنی شدید ہتک محسوس کی تھی۔ بھیک اتنی بے نیازی سے نہیں مانگی جاتی۔ بھکارن کو بھیک سامنے آکر مانگنی چاہیے طوعاً و کرہاً سب نے اپنے لیے اخلاق کا ایک ضابطہ مقرر کر رکھا ہے۔ بھکارنوں کو کم سے کم بھیک مانگنے کا تو سلیقہ آنا چاہیے۔ سو شاید اس کی بے نیازی کو شکست دینے کے لیے، یا گزشتہ آٹھ پہر کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے کے لیے یا یونہی بے ارادہ میرے منہ سے نکلا۔

"لے۔ لے جا"۔

"لا"۔ وہ بولی ـــ "اللہ تجھے بہت دیوے سخی۔ اللہ تیرا بچہ جیوے سخی"۔

ایک دم وہ ساری کی ساری اندر آگئی۔ میں اپنے حکم کی اتنی بھرپور تعمیل کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ میں نے ایک آنہ اتنی تیزی سے اس کی بے حد گلابی ہتھیلی پر گرا دیا جیسے وہ آنے کے انتظار میں ذرا دیر اور اسی طرح میرے سامنے کھڑی رہی تو میں کھڑکی میں سے کود جاؤں گا۔

مگر وہ آنہ لے کر بھی اسی طرح کھڑی رہی۔ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ شیلف پر رکھے ہوئے مٹی کے ایک کھلونے کو دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس ایک لمحے میں اس کے سراپا کا اس نظر سے جائزہ لیا کہ کوئی خامی نظر آئے تو اسے اپنے ذہن میں سے نوچ کر پھینکنے میں آسانی ہو۔ مگر یکایک اُس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا ـــ "ہرن ہے؟"

میں نے کہا ـــ "نہیں۔ ہرنی ہے"۔

وہ بے اختیار چینی کی پیالیوں سے چینی کی پیالیاں بجاتی دروازے میں سے نکل گئی۔

میں تیزی سے کھڑکی میں آیا۔ وہ ایک آنے کو جوں کی طرح اچھالتی اور جھپٹتی ہوئی جا رہی تھی ـــ پھر وہ دوسری گلی میں مڑ گئی۔

عورت فطرت کی نہایت خوبصورت تخلیق ہے مگر حسنِ تخلیق کی داد کا بھی ایک قرینہ ہوتا ہے۔ نوشگفتہ پھول کو دیکھ کر ہمارے احساسات کو ایک انگڑائی سی آتی ہے اور ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ شفق میں رنگے ہوئے بادلوں کو ہم پیار سے دیکھتے ہیں

اور اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔رات کو چھت پر گرتی ہوئی بوندوں کی موسیقی چند لمحوں کے لیے ہمیں آسمانوں سے اُترا سا زینہ معلوم ہوتی ہے اور پھر ہم سو جاتے ہیں۔میں نے خوبصورت عورتوں کو بھی ہمیشہ اسی قرینے سے دیکھا ہے۔حسن کی طرف ذرا سی زیادہ توجہ دیجیے تو پھر آپ کسی اور طرف ذرا مشکل ہی سے متوجہ ہو سکیں گے۔مگر جب کوئی حسن زبردستی پر اُتر آئے تو زندہ رہنے کی دو ہی راہیں باقی رہ جاتی ہیں۔یا تو حسن سے نفرت کرنے لگو اور بھیڑیے کی طرح مار مار کر کھاتے ہوئے مر جاؤ، یا پھر دنیا کے دوسرے تمام کاموں سے ہاتھ کھینچ لو اور سمندر کے ساحل کی سی زندگی گزار دو، کہ وہ فقط ایک کام کرتا ہے۔وہ سمندر کے مچلتے ہوئے حسن کے لیے اپنا آغوش سر سے کھولے رکھتا ہے۔کبھی کبھار موجیں اسے چند سیپیاں دے جاتی ہیں۔مگر پھر ایک اور موج آتی ہے اور ان سیپیوں کو بھی سمیٹ کر لے جاتی ہے اس کے باوجود ساحل کا آغوش ازل سے کھلا ہے اور ظاہر ہے کہ اس ایک طرفہ کاروبار میں کوئی قرینہ نہیں ہے۔

یہ سوچ کر کہ حسن کی یہ موج مجھے بھی ساحل کی سی افتادگی کی طرف لیے جا رہی ہے مجھے اپنے آپ پر ایک بار پھر ہنسی آ گئی۔مجھے تو یہ سوچ کر قلوپطرہ پر ہنسی آ جاتی ہے کہ اس کی ناک ننھی سی تھی۔اتنی بڑی ملکہ اتنی ذرا سی ناک کے ساتھ کیسی عجیب لگتی ہوگی۔اور میں تو اسپارٹا اور ٹرائے کی فوجوں پر بھی یہ سوچ کر مسکرا دیتا ہوں کہ جب ہیلن کی جوانی ڈھل گئی ہوگی تو اسے دیکھ کر طرفین اپنی حماقت پر کیسے کیسے جھینپتے ہوں گے۔ہنستے ہوئے میں نے قلم اٹھایا اور یوں لکھنے بیٹھ گیا جیسے آج افسانے کا ایک پہلا فقرہ ہی کیا آخری فقرہ بھی لکھ ڈالوں گا۔

"اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا"——اس کا رنگ ان پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا۔جن پر——" ——اس کا رنگ پہاڑوں کی اُس برف کی طرح صاف تھا——جو——" ——اُس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح اس حد تک صاف تھا کہ——

اور پھر چینی کی پیالیوں سے چینی کی پیالیاں بجنے لگیں——

ایک موج آئی اور ساحل کو اپنی یادوں کی نمی بخش کر پلٹ گئی——

اتنی گلابی، اس قدر گلابی، اس حد تک گلابی ہتھیلی پر صرف ایک آنہ چمکا اور میں نے اپنے آپ کو گالی دے دی——کمینہ! بڑا حسن کار بنتا ہے۔فطرت کے اس شہ کار کے پھیلے ہوئے ہاتھ کی قیمت کیا صرف ایک آنہ ہے؟ تُف ہے تجھ پر اور تیری حسن کاری پر——

دوسرے دن کی دوپہر تک کا وقت میں نے اس مجرم کی طرح گزارا جو جرم کرنے کے بعد اپنے اندر جھانکے تو اس کا ضمیر اس پر تھوک دے۔ان دنوں تو ایک آنے میں ایک چپاتی بھی نہیں آتی!——

مگر سارے لاہور میں صرف میں ہی تو نہیں ہوں جس سے اس نے ایک آنہ لیا ہوگا۔نہ جانے پورے دن میں اس نے کتنوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوں گے؟ تو کیا جس طرح وہ میرے پاس آتی ہے اسی طرح دوسروں کے ہاں بھی جاتی ہوگی——؟ سارا شہر مجھے اپنا دشمن نظر آنے لگا——اچھا تو ذہن میں مزاحمت یوں پیدا ہوتی ہے——

کل رات میری کشتِ خیال میں صرف یونانی اصنام کے چہروں کی ندیاں اُمڈتی رہی تھیں، مگر آج رات تو ادھر ایک چہرہ نمودار ہوتا، اُدھر ایک شعلہ سا بھڑک اٹھتا۔پھر دھواں سا چھا جاتا۔پھر پتھر سے برستے۔پھر ایسی آوازیں سی آتیں

جیسے کوئی شیشے کی کرچیاں پیس رہا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کل سارا دن گھر سے باہر ہوں گا کہ کل کسی ڈاکٹر سے بھی مشورہ کروں گا کل نماز بھی پڑھوں گا۔

مگر صبح بہت دیر سے آنکھ کھلی۔ نماز کا وقت نکل چکا تھا۔ نہانے اور ناشتہ کرنے میں بھی خاصی دیر لگی۔ اوپر ہی کی منزل میں بیٹھا اخبار پڑھنا شروع کیا تو دوپہر تک پڑھتا رہا۔ جب ملازم نے آکر کہا کہ پڑوسی چند منٹ کے لیے اخبار مانگ رہا ہے تو میں نے وقت دیکھا۔ یکایک کسی چیز نے جیسے میرے اندر چھلک کر مجھے کمرے سے باہر دے مارا۔ اور میں سیڑھیوں پر سے اتنی تیزی سے اترا کہ بچے بھی یوں نہیں اترتے ہوں گے۔ پھر کمرہ کھول کر میں سیدھا کھڑکی کے پاس گیا اور گلی میں جھانکا۔ دو بچے سگرٹ کی ڈبیوں سے مکان بنا رہے تھے۔ اور گلی میں سے ایک بڑھیا گزر رہی تھی جو ہوا سے بھرے ہوئے برقعے میں بہت چھوٹی سی لگ رہی تھی۔

میں پھر کمرے کی طرف لپکا اور ملازم سے پوچھا۔ "کوئی مجھ سے ملنے تو نہیں آیا تھا؟"

وہ بولا۔ "آپ سو تو نہیں رہے تھے صاحب، کہ کوئی آتا تو میں نہ بتاتا۔"

مزید کریدنے کے لیے مجھے کوئی دوسرا قرینے کا سوال نہ سوجھ سکا اور ملازم جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا۔ "بس صبح صبح ایک سبزی والا آیا تھا، یا اخبار والا، یا پھر ابھی ابھی وہ منگتی آئی تھی۔" مجھے پتھر کھوتا دیکھ کر وہ بولا۔ "کوئی بھی تو نہیں آیا صاحب۔ کیا آپ نے کسی کو وقت دے رکھا تھا۔؟"

میں جواب دیے بغیر پلٹ آیا۔ تو وہ آئی بھی اور چلی بھی گئی! تو وہ اتنی غیر اہم تھی کہ اس کے آنے کے باوجود کوئی نہیں آیا تھا۔

کیا فرشتوں کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ آج کے دن کو بھی میری زندگی میں شمار کریں۔

سیڑھیوں پر سے آہستہ آہستہ اترتا ہوا میں گلی میں آیا۔ پھر دوسری گلی میں سے ہوتا ہوا سڑک پر آیا۔ اور دور دور تک نظریں دوڑائیں کہ شاید وہ کسی راہگیر کا دامن تھامے کھڑی ہو۔ شاید کسی دکان کے سامنے پڑی ہوئی سڑی چیزوں میں سے کوئی کم سڑی ہوئی چیز چن رہی ہو۔ شاید وہ کسی درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر اداس کھڑی ہو کہ آج اس کی گنی بندھی آمدنی میں سے ایک آنہ کٹ گیا۔

سڑک پر معمول کی زندگی رواں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اور واقعی کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ انسانوں کے اندر کے طوفان ان کے اندر ہی چلتے رہتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر سے اس کا طوفان باہر آجائے تو کیسی قیامت برپا ہو جائے۔

میں واپس اپنی گلی میں آیا تو بچوں نے سگرٹ کی ڈبیوں سے پنج منزلہ مکان تعمیر کر لیا تھا۔ اور میرے ساتھ والے مکان کے دروازے پر ایک بی بی روٹی والے کے ہاتھ اپنی اولاد کی پرانی کاپیاں بیچ رہی تھی۔

اور وہ میرے مکان کی دہلیز پر بیٹھی تھی۔ تو میری خیریت اس کے لیے اتنی اہم ہے؟ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بیٹھے بیٹھے ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دے دیا۔ اس کے پاؤں اتنے میلے تھے جیسے وہ غلطی سے کسی دوسرے کے پاؤں لگا کر چلی آئی ہے۔ البتہ آج اس کے ہاتھ دھلے ہوئے تھے اور ناخن کٹے ہوئے تھے۔

"آج تو تمھارے ناخن کٹے ہوئے ہیں۔" میں نے یوں فاتحانہ انداز میں کہا، جیسے محض میرے پاس آنے کی تقریب میں اُس نے اپنے پیکر میں یہ خاص اصلاح کی ہے۔

اور اس نے اپنے ہاتھ یوں گود میں چھپا لیے جیسے کہیں سے چرا لائی ہے اور اب پکڑی گئی ہے۔ پھر چینی کی پیالی سے چینی کی پیالی چھو گئی اور بس اوپر لپکا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے اُسے بلانا چاہا، مگر پھر رُک گیا۔ جیسے میرے منہ سے ایک بھی لفظ نکلا تو سارے شہر میں گونج جائے گا۔ پھر میں نے اشارتاً اسے اوپر آنے کو کہا اور وہ ادھر آنے لگی، مگر مجھے دروازے میں کھڑا دیکھ تو دو سیڑھیاں چھوڑ کر رُک گئی۔ اُس نے بھویں، اٹھا کر اوپر میری طرف دیکھا اور میں یوں ایک طرف ہٹ گیا جیسے نہ ہٹا تو کہیں نیچے ڈوب جاؤں گا۔

میں نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک اٹھنی اٹھائی اور اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا مگر اٹھنی دیکھ کر کھینچ لیا۔ "نہیں بابو میرے پاس بھان نہیں۔"

"تم اٹھنی لے لو۔" میں نے اس کے بھولپن سے خوش ہو کر کہا۔

"پوری ---؟" اُس نے پوچھا

میں نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں۔ تمھارے پاس بھان جو نہیں ہے۔"

ایک آنہ لینے والی بھکارن کے لیے، اٹھنی ایسی ہے جیسے ایک افسانہ نگار کی ایک لاکھ کی لاٹری نکل آئے۔ سو میں نے طے کر لیا کہ اس نے اٹھنی کے لیے ہاتھ پھیلایا تو میں اسے کلائی سے پکڑ لوں گا۔ اور ظاہر ہے جائز طور سے پکڑوں گا کیونکہ میرے پورے آٹھ آنے اس کے پاس ہوں گے۔ پھر جب میں اس کی کلائی اپنی گرفت میں لے لوں گا، تو اس سے کہوں گا ۔۔ میں اس سے کہوں گا ـــــ میرے افسانے کا پہلا فقرہ ایک کوندے کی طرح میرے ذہن میں چمکا اور پہاڑوں کی برف پر شفق برس پڑی۔ مگر قبل اس کے کہ میرا ذہن پورے فقرے کو سنبھالتا میں نے دیکھا کہ وہ جا رہی ہے۔

"اٹھنی تو لیتی جاؤ۔" میں کچھ ایسے لہجے میں بولا جیسے کوئی ننگا عشقیہ شعر پڑھ رہا ہوں۔

وہ پلٹ کر اور دروازے میں سے جھانک کر بولی ـــ "لے تو لی تھی۔"

یہ میں نے بہت بعد میں سوچا کہ میرے اٹھنی دکھانے اور اس کے جانے کی ایک صدی میں وہ ایک لمحہ کب وارد ہوا تھا جب میں نے اٹھنی دی تھی۔ اور جب میں نے یہ سکہ اس کے ہاتھ پر رکھا تھا، تو اس کی کلائی پکڑ لینے کا فیصلہ کیوں یاد نہیں آیا تھا۔

پھر ایک دم مجھے احساس ہوا کہ میرا کچھ کھو گیا ہے۔ اٹھنی کے علاوہ وہ میرے افسانے کا پہلا فقرہ بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ وہ مجھے صرف اپنا چہرہ دے گئی تھی۔ جو اس کے جانے کے بعد دیر تک دروازے میں سے جھانکتا رہا۔ پھر وقفے وقفے سے دکھائی دینے لگا۔ پھر دھندلا گیا۔ پانچویں دن تو وہ بالکل غائب ہو گیا۔

میں نے چھٹے اور ساتویں دن شہر کی سب لائبریریوں میں یونانی سنگ تراشی پر لکھی ہوئی ضخیم کتابیں چھان ماریں مگر مجھے وینس، سائیکی، اور افروڈائیٹ کے چہروں میں وہ چہرہ نظر نہ آیا، جو ان سب سے کسی نہ کسی تفصیل میں مختلف تھا۔ شاید بھکارن کے نتھنوں کے خفیف اُبھار نے اس کی ناک کے دونوں طرف، وینس کی ناک کے مقابلے میں زیادہ متناسب

توسیں پیدا کر دی تھیں۔ یا شاید سادگی کی گردن بھکارن کی گردن کے مقابلے میں کوتاہ تھی اور میلی بھی۔ یا ممکن ہے فردوس کے مقابلے میں بھکارن کے ہونٹوں کے گوشے زیادہ گہرے، زیادہ جذباتی تھے۔ میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بھکارن کا چہرہ اپنے مجموعی تاثر کی صورت میں مجھے ضرور یاد تھا۔ مگر جب میں اس کی صرف آنکھوں یا صرف گالوں یا صرف ہونٹوں کے بارے میں سوچتا تو سارا چہرہ برف کی طرح پگھلنے لگتا۔

ساتویں دن شام کے قریب مجھ پر یہ ایک انکشاف ہوا کہ میں نہایت بے معنی زندگی گزار رہا ہوں۔ چہرے غالب کے شعر نہیں ہوتے کہ جب چاہا اٹھا کر پڑھ لو۔ یہ تو سامنے آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ چہرے تو لمحے ہیں اور لمحے کب واپس آتے ہیں۔ میں نے ایک چہرہ دیکھا۔ مانا کہ یہ بے حد حسین، بے حد عجیب چہرہ تھا، لیکن جیسے یہ چہرہ، جس کے بارے میں تم سوچ تک نہ سکتے تھے کہ کسی عورت کا ایسا چہرہ بھی ہوگا۔ یکایک تمہارے سامنے آیا اور گزر گیا، اسی طرح کئی اور چہرے سامنے آتے رہیں گے اور گزرتے رہیں گے، اور اگر تم ہر چہرے پر سے نظریں ہٹانا بھول گئے تو آخر ایک روز تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے ہمدردوں نے تمہیں پاگل خانے بھجوا دیا ہے۔

ہفتے میں یہ پہلی رات تھی جب میں سکون سے سویا۔ جب میں اٹھا تو سورج کافی چڑھ آیا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے افسانے کا پہلا فقرہ لکھنے بیٹھ گیا۔ جلتی ہوئی ایک دیا سلائی، بجھے ہوئے چراغ کی طرف بڑھی اور پہاڑوں پر برف چمکنے لگی۔ ہر طرف ہزاروں آئینے لگ گئے۔ جن میں ہزاروں سورج چمک رہے تھے۔ پھر خیرگی کے اس طوفان میں ایک چہرہ ابھرا اور آواز آئی ——— ہٹ گئی!۔۔۔

میں پلنگ پر سے کود کر اٹھا اور دروازے میں سے جھانکا، پھر بجلی کی سی تیزی سے سیڑھیاں اتر کر گلی میں پہنچ گیا۔ پھر دوسری گلی میں چلا گیا۔ پھر سڑک پر آ گیا۔ وہاں معمول کی زندگی رواں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اور واقعی کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ صرف اتنی سی بات ہوئی کہ محلے کے ایک تانگے والے نے میرے پاس آ کر حیرت سے پوچھا "کیوں بابو جی، خیریت تو ہے؟ آپ ننگے پاؤں کیوں کھڑے ہیں؟" ——

تانگے والے نے میرے ننگے پاؤں دیکھ لیے تھے، مگر میرے ذہن کو، جو زخم زخم ہو رہا تھا، ایک تانگے والا کیا، کسی نے بھی نہ دیکھا۔ کوئی کسی کے زخم نہیں دیکھتا۔ شاید اس لیے کہ زخم دیکھنے دکھانے کی چیز نہیں ہیں۔ شاید اس لیے کہ سب کے اپنے اپنے زخم ہوتے ہیں ——

تو کیا یہ زخم جو میرے ذہن میں ہے کسی اور کے ذہن میں بھی ہے؟ اگر ہے تو وہ کہاں ہے کہ میں اسے اپنے سینے سے لگا کر ذرا سا رو لوں۔ انسان آخر زخموں کے ان ناتوں کو کیوں چھپائے پھرتے ہیں، جو ظاہر ہوں تو سب انسان پیارے ایک دوسرے کو پہچانیں ——

تانگے والے کو کوئی جواب دیے بغیر میں واپس اپنے کمرے میں آیا۔ اور بستر پر سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر یوں پھیل کر لیٹ گیا جیسے کروڑوں کوسوں کا سفر طے کر کے آیا ہوں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ذہن سے رجوع کیا۔ مگر اس نے بھی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ سب سو رہے تھے۔ چاروں طرف نہایت خوفناک سناٹا مسلط تھا۔ آج [illegible] والا بھی کہیں مر گیا تھا۔

میں نے غنودگی کے عالم میں دیکھا کہ بھکارن میرے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے —"خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے سخی — تیرا بچہ جیوے۔"

میں نے چادر نوچ کر پھینک دی۔ وہ دروازے پر سچ مچ کھڑی تھی — اور کہہ رہی تھی۔

"خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے سخی، تیرا بچہ جیوے۔"

بس کچھ ایسے لہجے میں بولی، جیسے وہ باقاعدہ میرے نکاح میں ہے اور میں اس سے ہر قسم کی جواب طلبی کر سکتا ہوں۔

"تم اتنے دنوں کہاں تھیں؟" میں نے ڈانٹ کر پوچھا:

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ آج تم پورے ایک ہفتہ کے بعد میرے پاس آئی ہو—؟"

میرے لہجے کا اثر صرف اس کی آنکھوں پر ہوا جو کسی گدلی دوا کے حلقے میں بجھی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی، وہ چمک جو انتہائی پیار یا انتہائی غصے یا انتہائی ڈر کی حالت میں پیدا ہوتی ہے۔

"بولو، کہاں تھیں تم؟" میں گرجا۔

"میں یہیں تھی بابو، اور کہاں تھی۔" وہ بچے کی طرح بولی۔

"تو پھر تم ایک ہفتے تک آئیں کیوں نہیں؟" میں نے اسی لہجے میں پوچھا۔

اور وہ بولی — "بس اگتی ہوتے لگی تھی گی۔ ایک — اس دن کا باقی سات آتے سات دنوں کے۔ آج آٹھواں دن تھا تو آگئی بابو —"

بھکارن کا چہرہ بھری کی طرح کھوکھلا ہو گیا — پہاڑوں کی برف تڑخ پڑخ کر کے چٹخی اور اس کے بڑے بڑے چٹانوں کے سے تودے بیچتے چنگھاڑتے ہوئے آئے اور میرے سر پر ٹوٹنے لگے ———

وحشیوں کی طرح میں نے بستر پر سے تکیہ اٹھا کر دور پھینک دیا اور اس کے نیچے پانچ پانچ دس دس روپے کے جتنے بھی نوٹ رکھے تھے انھیں مٹھی میں لے کر بھکارن کی طرف بڑھا، اس کی کلائی کو لکڑی کی طرح پکڑ کر میں نے یہ نوٹ اس کی مٹھی میں ٹھونس دیے اور چیخا ——

"ان روپوں میں جتنے بھی آنے ہیں، اتنے دنوں سے اگر تم ایک دن بھی پہلے یہاں آئیں تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ جا، دفع ہو جا ——"

ندیم

پاگل

صفیہ اور اس کی اماں، عارف کے کمرے کے بند دروازے پر دم بخود کھڑی تھیں اور اندر عارف خاصے جذبے کے ساتھ بول رہا تھا۔

"ابو جی کو پتہ چل گیا تو مار ڈالیں گے" صفیہ نے بڑی تشویش سے کہا۔

"پر یہ کمبخت اندر گیا کیسے؟" اماں حیران تھیں۔

عارف کے کسی دوست کا، چپکے سے عارف کے کمرے میں پہنچ جانا، ناممکن تھا۔ ایک مہینہ ہوا ہے، جب عارف کالج گیا ہوا تھا، چوہدری صاحب نے اس کا سب سامان اس کمرے میں منتقل کرا دیا تھا۔ اس کمرے تک پہنچنے کے لیے عارف کو وسیع بنگلے کے تین کمرے طے کرنے پڑتے تھے۔ چودھری صاحب کا کمرہ، ان کی بیگم کا کمرہ اور صفیہ کا کمرہ، عارف کے اس کمرے کا واحد دروازہ صفیہ کے کمرے میں کھلتا تھا۔ در جو دو کھڑکیاں باہر کھلتی تھیں، ان کے چوکھٹے میں لوہے کی مضبوط جالی منڈھی ہوئی تھی۔ کمرے سے ملحقہ غسل خانے کا ایک دروازہ تو کمرے ہی میں تھا مگر باہر کھلنے والے ایک دروازے کو باہر ہی سے بند کر کے چودھری صاحب نے اس میں اپنے ملکے کے بڑا تالا ڈال دیا تھا۔ جو صرف مہترانی کے آنے پر کھلتا تھا اور پھر تالے کی چابی چودھری صاحب کے پاس پہنچ جاتی تھی۔

ایک گھنٹہ پہلے عارف کو اس کے باپ، اماں اور بہن نے، اپنے اپنے کمروں میں سے گزرتا ہوا دیکھا تھا۔ چودھری صاحب نے ٹھوڑی کو سینے میں گاڑ کر اور بھویں اچکا کر عینک کے فریم کے اوپر سے عارف پر ایک نظر ڈالی تھی اور اخبار کو ذرا سا ہلا کر کہا تھا۔ "آ گئے؟"

"جی" عارف، ان کی طرف دیکھے بغیر ماں کے کمرے میں چلا گیا تھا۔

"آ گئے بیٹا؟" کھڑکی کے پاس انتظار میں کھڑی ہوئی ماں نے اس کی طرف بڑھ کر پوچھا تھا۔

"جی" عارف بہن کے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔

"آ گئے بھائی جان؟" صفیہ اچھل پڑی تھی۔ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے بڑے پیار سے کہا تھا۔

"دیکھیے بھائی جان۔ اگر آج کیرم کی بازی نہ ہوئی تو میں ـــ تو میں آپ سے ہمیشہ کے لیے کُٹی کر لوں گی۔"

"گڈ نائٹ آپ" عارف نے کہا تھا اور اپنے کمرے کا دروازہ کھٹ سے بند کر دیا تھا۔

جب سے اب تک تینوں کمرے سے باہر نہیں نکلے تھے، مگر اب عارف اندر اپنے کمرے میں کسی سے مسلسل بحث کر رہا تھا۔ اور مارے ڈر کے صفیہ کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے اور ماں کی آنکھوں کے پپوٹے جیسے ہمیشہ کے لیے پھیل گئے تھے۔

پچھلے ایک مہینے بھر، قریب قریب ہر روز عارف کی ماں نے چودھری صاحب کی منتیں کی تھیں کہ عارف کو اس حد تک پابند نہ کیجیے۔ آپ تو اس کے ساتھ کتے کا سا سلوک کر رہے ہیں۔ کتے کے گلے میں پٹا ڈالتے ہیں۔ آپ نے اپنے بیٹے کو ایک کمرے ہی میں بند کر دیا ہے۔ بات ذرا سی تو ہوئی۔

مگر چودھری صاحب ہر بار اپنی بیوی کو جھڑک دیتے تھے۔ "پھر بھی کتا تمہارے بیٹے سے اچھا ہے۔ وہ مجھے دیکھتا ہے تو دم تو ہلاتا ہے۔ تمہارا بیٹا تو سلام تک کرنا بھول گیا ہے۔ وہ تو مجھ سے باقاعدہ نفرت کرتا ہے بدبخت۔" پہلوان کا بچہ بنا پھرتا ہے اور وہ بڑے عزم سے کہتے۔ "مگر میں اسے صراطِ مستقیم پر لا کر رہوں گا۔ دیکھ لینا۔"

[illegible] چودھری صاحب کے [illegible] رو رو پڑی تھی۔ "بھائی جان کو اتنی سخت سزا نہ دیجیے ابو جی۔ وہ بہت اچھے ہیں ابو جی۔ وہ ذرا زیادہ سوچتے ہیں اس لیے عجیب سے لگتے ہیں ورنہ وہ تو بڑے ہی اچھے ہیں ابو جی۔"

چودھری صاحب صرف اتنا کرتے کہ اپنے رومال سے بیٹی کے آنسو پونچھ دیتے اور پھر اس کے سر کو دھیرے سے تھپتھپا کر مشورہ دیتے کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے۔ "باپ اگر بیٹوں سے آج اتنی آسانی سے شکست مان لیں تو بیٹے کل انہیں تانگے میں جوت لیں۔ پہلے زمانہ آہستہ آہستہ بدلتا تھا بیٹی۔ اب یکایک ایک دم تلپٹ ہو رہا ہے۔ مگر ہوتا پھرے۔ میں اپنے بیٹے کو یہ اجازت کبھی نہیں دوں گا کہ وہ اپنے بزرگوں کے نام پر تھوکتے پھرے۔ تم بھائی کی بہن بن کر سوچتی ہو۔ باپ کی بیٹی بن کر بھی سوچو۔ مگر نہیں۔ تم نہیں سمجھو گی۔ تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔ تم کل سولہ سترہ برس کی تو ہو۔ میں تم سے تگنا بڑا ہوں۔ میں نے دنیا کو تم سے تگنا زیادہ دیکھا ہے بیٹی۔"

اور اب عارف کسی کو اپنے کمرے میں لے آیا تھا اور اس سے مسلسل باتیں کیے جا رہا تھا اور پھر اتنی اونچی آواز میں باتیں کر رہا تھا کہ اگر چودھری صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے اخبار بینی میں محو نہ ہوتے تو کب کے یہاں پہنچ چکے ہوتے۔

"دیکھیے امی جی۔ یوں کرتے ہیں" صفیہ نے کنپٹیوں کے کہیں آس پاس تک پھیلی ہوئی آنکھیں جھپکیں۔ "آپ اپنے کمرے میں چلی جائیے۔ میں دروازے پر ذرا سی دستک دے کر کہوں گی ——"

"دستک میں دوں گا" چودھری صاحب بولے۔ نہ جانے وہ کب وہاں پہنچ گئے تھے۔ صفیہ کا سارا خون اس کے پیروں میں جمع ہو کر اس کے دماغ پر ہتھوڑے سے برسانے لگا اور اس کی ماں دیوار کا سہارا لیتے ہوئے دیوار کی طرح سفید ہو گئیں۔

چودھری صاحب نے دروازے پر تین بار زور سے ہاتھ مارا اور پکارے۔ "عارف!"

عارف نے فوراً سے دروازہ کھول دیا۔ "جی" اس نے کہا، مگر اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی [illegible] تھی۔ [illegible] صفیہ نے آہستہ [illegible] مسکراہٹ قرار دیا تھا جو اس [illegible] کی ترجمانی کرتی ہے کہ آپ [illegible] سمجھ نہیں پا سکتے۔

چودھری صاحب نے کچھ کہے بغیر ایک لمبا ڈگ بھرا اور عارف کے کمرے میں چلے گئے۔ مگر عارف [illegible] کر دیکھا تک نہیں۔

چند سیکنڈ کے بعد غسل خانے کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ اور چودھری صاحب [illegible] کمرے سے صفیہ کے کمرے میں یوں داخل ہوئے جیسے —— بعد میں صفیہ نے عارف کو بتایا تھا کہ —— جیسے راجہ پورس پہلی بار سکندر [illegible] کے سامنے آیا ہوگا شکست خوردہ اور مغرور۔

"وہ کہاں چلا گیا؟" انھوں نے بھویں سکیڑ کر عارف سے پوچھا۔

"کون؟" عارف نے مسکراہٹ چھپانے اور حیرت زدہ نظر آنے کی کوشش کی۔

"جو اندر تمھارے کمرے میں تھا" چودھری صاحب اسی لہجے میں بولے۔

"اندر تو میں تھا ابو" [illegible] عارف کی مسکراہٹ مونا لیزا کی مسکراہٹ سے کچھ آگے نکل رہی تھی۔

"اور کون تھا؟" چودھری صاحب کڑکے۔

"میں، صرف میں تھا" عارف نے اسی ٹھنڈے لہجے میں [illegible] صفیہ کی طرف [illegible] بیٹے کی طرف دیکھ کر [illegible] چہرہ تو کچھ [illegible] لگ رہا تھا کہ اس کے آنسو اچھے ہوتے [illegible]

"پھر تم باتیں کس سے کر رہے تھے؟" چودھری صاحب نے [illegible] سے پوچھا جیسے [illegible] جھوٹا ثابت ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔

"میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا" عارف نے صفیہ کی طرف دیکھا۔

"اپنے آپ سے؟" چودھری صاحب نے اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں" عارف بولا۔ "میں نے اپنے سامنے آئینہ رکھ لیا تھا [illegible] جیسے [illegible] میرے سامنے آ بیٹھا اور ہم دیر تک اونچی آواز میں باتیں کرتے رہے۔"

اب چودھری صاحب کے لہجے میں تضحیک تھی "اپنے آپ سے باتیں [illegible] پاگل [illegible]"

"میں تھوڑا سا ادبی بھی ہوں اور تھوڑا سا پاگل بھی" عارف بولا اور [illegible] اور صفیہ کو جیسے ایک ساتھ بجلی کا جھٹکا لگا۔ دونوں کانپ سی گئیں۔ [illegible] زندگی میں پہلی بار چودھری صاحب کو اپنے بیٹے کی طرف سے ایک [illegible] جواب [illegible] تھا جس [illegible] نہیں گستاخی جیسی بھی نظر آ گئی تھی۔ وہ عارف کی طرف یوں [illegible] کی طرح [illegible] ایک آدھ [illegible] تو باپ بیٹے کے ماتھے ٹکرا جاتے۔ "اپنے لہجے کو سنبھالو برخوردار" وہ [illegible] "میں تمھارا باپ ہوں، کلاس فیلو نہیں ہوں"

عارف نے پہلی بار اماں کی طرف دیکھا اور ماں پہلی بار دیوار سے جیسے [illegible] طرح [illegible] سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ باپ بیٹے کے تعلقات کے اس بحران میں وہ اپنے بیٹے کے پاس جا کر کھڑی ہوں یا اپنے شوہر کے پاس۔ ناچار وہ پھر دیوار سے لگ گئیں۔

تب صفیہ نے بھائی کی طرف ایک دو قدم اٹھائے۔ پھر جب عارف بولنے لگا تو وہ وہیں رک گئی۔
"کیا قیدی کو اپنے قید خانے کی دیواروں سے بھی باتیں کرنے کی اجازت نہیں ہوتی؟" — وہ یوں بولنے لگا جیسے سٹیج پر کھڑا ہے اور ہیرو کا کردار ادا کر رہا ہے۔ "مجھے کالج سے ایک وقت پر واپس آنے کا حکم ہے۔ اور آپ نے میرے پرنسپل سے مل کر ڈائری میں یہ بات نوٹ کر رکھی ہے کہ میرے پیریڈ کب شروع ہوتے اور کب ختم ہوتے ہیں۔ راستے میں میری سائیکل کو کوئی حادثہ ہو جائے تو آپ میری مرہم پٹی بعد میں کرائیں گے اور جواب طلبی پہلے فرمائیں گے کہ مجھے گھر آنے میں دیر کیوں ہوئی۔ آپ نے مجھے اتنے بڑے بنگلے کے جنگل میں اس کمرے کے غار میں ڈال رکھا ہے تاکہ آپ اور امی اور صفیہ مجھ پر پہرہ دیں۔ آئی ڈی کرتے رہیں۔ میرے گھر میں کوئی دوست مجھ سے ملنے نہیں آ سکتا۔ کیونکہ اگر میرا دوست باتوں باتوں میں ذرا [illegible] بول دے گا تو آپ مجھ پر [illegible] کا مقدمہ چلا دیں گے۔ پھر میں اپنے کمرے کی دیواروں سے باتیں نہ کروں تو کس سے کروں؟"

وہ رُک گیا اور ایک لمحے کے لیے چودھری صاحب کے بنگلے پر جیسے سنسناتا سناٹا چھا گیا۔

"صفیہ سے کیوں باتیں نہیں کرتے؟ یہ بھی تو [illegible] ہے۔" چودھری صاحب نے پوچھا مگر اب کے اُن کے لہجے میں پچھتاوا سا تھا۔

عارف بولا۔ "تو کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں اپنی بہن سے ٹینس اور نیوڈسٹ کلبوں اور ٹائپ لیس لکھنی اور بیلی ڈانسرز کی باتیں کروں؟"

"بکواس مت کرو۔" ایک لمحہ پہلے کا بچہ پھر سے باپ بن گیا تھا۔ "تمہیں شرم آنی چاہیے کہ اپنی ماں اور بہن کی موجودگی میں ایسی باتیں کر رہے ہو۔ اور پھر کیا ایسی واہیات چیزوں کے بارے میں کسی سے باتیں کیے بغیر تمہارے دل کی حرکت رک جائے گی؟"

"جی ہاں، یہی خطرہ ہے۔" عارف نے آج اپنے کمرے میں سے جیسے سارے ادب آداب کو بالائے طاق رکھ کر نکالا تھا۔ "میں اٹامک انرجی اور ٹائپ لیس لکھنی کے زمانے کی پیداوار ہوں۔ یہ جیٹ طیاروں اور مصنوعی سیاروں کا زمانہ ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ حماقت ہے کہ آج میں [illegible] گاڑی میں یا اپنے [illegible] کی بخشی ہوئی سائیکل پر بیٹھ کر گزروں۔ جب آپ بچے کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ آپ کے کمرے میں [illegible] ہوئے پھول کو نوچ کر اپنے معیاروں کے مطابق [illegible] اور اس کا تجزیہ کرے تو مجھے بھی یہ سوچنے کی اجازت دیجیے کہ کلاسیکل ڈانس کے مقابلے میں [illegible] کیوں اچھا لگتا ہے اور ہمارے کلاسیکل ڈانس میں کیا کمی ہے۔ یا چلیے ہم میں کیا کمی ہے؟"

"بیڑا غرق۔" چودھری صاحب نے اپنی بیگم اور بیٹی کی طرف دیکھ کر جیسے ڈوبتے ہوئے کہا اور عارف کو قہر بھری نظروں سے گھورتے ہوئے بولے۔ "تم تو اوّل درجے کے بدذات ہو چکے ہو۔" اور کچھ تیزی سے چلے گئے۔

عارف مسکرانے لگا۔ پھر نہ جانے اُسے کیا ہوا کہ وہ زور زور سے قہقہے مارنے لگا۔ صفیہ اور امّاں گھبرا کر اس کی طرف بڑھیں، مگر عارف نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا اور چیخ چیخ کر ہنسنے لگا۔

وہ دیر تک اسی طرح ہنستا رہا۔ پھر جیسے نڈھال ہو گیا اور جب اس کی آواز بند ہو گئی تو صفیہ اور اماں حواس باختہ ہو کر چودھری صاحب کے کمرے کی طرف لپکیں۔

چودھری صاحب اب تک سامنے کی دیوار پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے۔ اس دیوار پر عجیب عجیب نقوش بن رہے تھے۔ [illegible] اندر سے گزر کر آپس میں گتھ رہے تھے اور بے معنی ہو رہے تھے اور چودھری صاحب کا چہرہ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہیں کسی نے ہاتھوں سے پکڑ کر خلا میں [illegible] ہو۔

وہ چھوٹے سے بچے [illegible] جب وہ [illegible] بیٹھے تھے [illegible] آگے گئے اور کوئی [illegible] نہ ملی تو انھوں نے صوفے پر سے کشن [illegible] رکھ لیا تھا [illegible] کا شبہ [illegible] کچھ بھی [illegible] گیا۔ [illegible] چودھری صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر [illegible] میں بے حس ہو [illegible]

اب سامنے دیوار پر [illegible] سے [illegible] جیسے شیشے کی کوئی چیز [illegible] اور بار بار ٹوٹ رہی ہے اور کرچی کرچی ہو رہی ہے اور اب یہ کرچیاں [illegible] صفیہ اور اماں [illegible] کمرے میں داخل ہوئیں تو ان کرچیوں کے چند ذرات چودھری صاحب کی آنکھوں [illegible] رہے تھے۔

[illegible] کر انھوں نے فوراً اخبار اٹھایا اور اپنے [illegible] جیسے [illegible] سے پردہ کرنے لگے ہیں۔ اور وہ اخبار نہیں دیکھ رہے تھے۔ کہیں اپنے اندر کچھ دیکھ رہے تھے۔ [illegible] بچے کی سی معصومیت تھی جو کسی کو بیٹھے بیٹھے اور پھر گر جانے۔ اپنے سامنے اخبار پھیلائے [illegible] سامنے سے اخبار [illegible] تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو ان کے سامنے اخبار کا وہ صفحہ کیوں ہوتا جس پر کسی [illegible] اس [illegible] کے جو آگ سے بھرے ہوئے [illegible] کی عمر کی ایک لڑکی بیٹھی [illegible] تھی اور [illegible] گوشے رک گئے تھے اور اگر اس کا جسم [illegible] ایک آدھ زخم اور [illegible] ہوتا تو [illegible] ہوتا اور چودھری صاحب نے بظاہر اسی لڑکی پر نگاہیں گاڑ رکھی تھیں۔

پھر یہ ہوا کہ اماں اور بیٹی [illegible] کے چیخ چیخ کر ہنستے چلے جانے کی کسی کو بھی وجہ [illegible] ہوئی اس لڑکی کو دیکھا گیا۔

پھر ایک دم انھوں نے اخبار کو ایک طرف پھینک کر ہاتھ بڑھایا اور اپنے نا خلفی ڈاکٹر کا نمبر گھما دیا۔

ڈاکٹر کی کار چند [illegible] بعد چودھری صاحب کے بنگلے میں آ رکی۔ آتے ہی اس نے پوچھا۔ ”کس کی طرف سے بیماری؟“

”وہ اپنے کمرے میں بند بیٹھا ہے“ چودھری صاحب نے کہا۔ پھر انھوں نے اخبار کو دلائی میں لپیٹا اور اسے دائیں ہاتھ میں پکڑ کر تین چار بار [illegible] ”پہلے تو اپنے آپ سے اونچی اونچی باتیں کرتا رہا۔ پھر اپنے آپ زور زور سے ہنستا رہا۔ پھر چپ ہو گیا۔ اور اب تک چپ ہے۔ نہ جانے کیوں چپ ہے۔ کیوں ہنسنے کے بعد وہ بالکل چپ ہو گیا ہے؟“

چودھری صاحب نے یوں آنکھیں پھاڑ کر [illegible] کہ صفیہ کوئی جواب دینے کی بجائے دیکھنے لگی اور عارف کے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور اس کے پیچھے [illegible] مگر پھر چودھری صاحب گرجے ”کھڑ جانے میں پکارو گا؟“

دونوں رک گئیں۔ چودھری صاحب تیز تیز چلتے ان کے پاس سے گزرے۔ ان کے پکارنے کی کوئی آواز نہ آئی تو اماں چونکیں۔ سرگوشی میں بولیں۔ "ذرا دیکھوں تو کیا بات ہے۔" دو قدم اٹھائے مگر رک گئیں اور ڈاکٹر سے، اپنے آنسو چھپاتے ہوئے بولیں — "جاؤ صفو۔ تم جا کر دیکھو۔"

صفیہ جانے لگی تو چودھری صاحب آ گئے۔ جب وہ بولے — تو کچھ عجیب سی آواز میں بولے۔ چودھری صاحب کی یہ آواز آج تک کسی نے نہ سنی تھی —

"ڈاکٹر صاحب۔ اسے آپ جا کر پکاریے۔"

"میں ابھی بلائے لاتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا —

"مگر چودھری صاحب آپ کیوں نہیں بلاتے؟" —

چودھری صاحب کے ہونٹ کانپنے لگے۔ "اگر ادھر سے کوئی جواب نہ آیا تو؟"

اماں اور صفیہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ایک ساتھ اونچی آواز سے رو پڑیں اور گھبرایا ہوا ڈاکٹر بولا۔ "مجھے عارف میاں کا کمرہ تو دکھایئے۔ پہلے تو آپ نے انہیں ادھر پوری انیکسی دے رکھی تھی مگر اب آپ ادھر اندر کے گئے تھے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔" چودھری صاحب بالکل جذباتی ہو گئے۔ "اسے آپ بھی نہیں بلائیں گے۔ اسے کوئی نہیں بلائے گا۔ اگر کسی نے پکارا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا تو؟ —" ان کا گلا بھر آیا اور پلنگ پر گر سے پڑے۔ فوراً بعد مدھم سی ہوئی اماں اور چیخ پڑیں۔ صفیہ نے عارف کا دروازہ کھول ڈالا۔

عارف نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ "ارے ارے کیا ہوا؟ اری صفو پاگل تو نہیں ہو گئیں تم؟"

مگر صفیہ کوئی جواب دیئے بغیر وہاں سے بھاگی اور چیخی۔ "عارف جان نے دروازہ کھول دیا ابو جی۔ وہ ادھر آ رہے ہیں بھائی جان ادھر ہی آ رہے ہیں۔" اس وقت صفیہ کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ اس چاند کی طرح عجیب سی لگ رہی تھی جو برستی ہوئی کالی گھٹا کے کسی روزن میں سے یکایک چمک اٹھے۔

چودھری صاحب گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور جب اماں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا عارف ان کے کمرے میں داخل ہوا تو ان کے تیور ایک دم بدل گئے۔

"السلام علیکم ڈاکٹر صاحب۔" عارف بولا۔ "خیریت تو ہے؟"

"یہی سوال تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ خیریت تو ہے۔" ڈاکٹر مسکرایا۔ "چودھری صاحب نے تو مجھے آپ کو دیکھنے کے لیے بلایا ہے۔"

"مجھے؟" وہ قدرے حیران ہو کر اپنے والدین کی طرف دیکھا۔ "کیا ہوا ہے مجھے؟"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔" چودھری صاحب گرجے۔

"حد ہو گئی۔" عارف مسکرانے لگا۔ "یعنی میں پاگل ہو چکا ہوں اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔"

"پاگل کو اپنے پاگل پن کا پتہ نہیں چلتا۔" چودھری صاحب کے لہجے میں ذرا سی لرزش تھی۔

"تو ڈاکٹر صاحب۔ آپ مجھے پاگل خانے لے جانے آئے ہیں۔" عارف نے پوچھا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ پاگل خانے میں آپ سے پہلے مجھے داخلہ لینا پڑے گا۔" ڈاکٹر مسکرایا۔ پھر سنجیدہ ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

چودھری صاحب بھی پلنگ پر بیٹھ گئے اور بولے۔ "سنیئے ڈاکٹر صاحب۔ یہ لڑکا آوارہ ہو رہا تھا۔ رات کو بارہ بارہ بجے واپس آنے لگا تھا۔ اپنے ساتھ غنڈا صورت کے دوست لگا لاتا تھا۔ اور وہ رات رات بھر بکتے رہتے تھے۔ انیکسی سے یہاں میرے کمرے میں ان کی آوازیں پہنچتی رہتی تھیں اور اسے انیکسی میں نے اس کی ماں اور بہن کی سفارش پر دی تھی کہ اس کی پڑھائی میں حرج نہ ہو۔ اور وہاں پڑھائی یہ ہونے لگی کہ ایک دن اس کے ساتھ دو لڑکیاں بھی آئیں۔ مجھے شاید پتہ نہ چلتا۔ کیونکہ میرا کمرہ انیکسی سے بہت دور ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ میری اولاد کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا ہے۔ اس روز کسی ضرورت سے میرا گزر انیکسی کے پاس سے ہوا تو وہاں سے عجیب عجیب آوازیں آرہی تھیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ یہ لڑکا ایک لڑکی سے مغربی ناچ کے اسٹپ سیکھ رہا ہے۔ غور کیجیے۔ میرے اس گھر میں جہاں میلاد کی محفلیں ہوتی ہیں، ناچ کی کلاس کھل گئی تھی۔ میں وہاں سے چپ چاپ چلا آیا اور جب دوسرے دن صبح کو عارف کالج گیا تو میں نے اس کا سامان اٹھوا کر ادھر ایک کمرے میں رکھوا دیا۔ تاکہ وہ اپنے باپ اور ماں اور بہن کے کمرے میں سے گزر کر وہاں تک جائے اور کسی لفنگے کو اپنے ساتھ لانے کا حوصلہ نہ کرے۔۔۔۔۔ بس اتنی سی بات ہے۔ اور اب یہ اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے اور اپنے آپ ہنستا ہے۔"

کچھ دیر تک کمرے میں سناٹا رہا۔ ڈاکٹر فرش کو گھورتا رہا۔ صفیہ کھڑی اپنے پچلے ہونٹ کو انگوٹھے اور ایک انگلی کی پوروں سے کبھی مِلاتی اور کبھی موٹائی میں دباتی رہی۔ اماں دیوار کے پاس ایک کرسی کے بازو پر بیٹھی رہیں اور چودھری صاحب رومال سے اپنا چہرہ پونچھتے رہے۔

پھر ڈاکٹر نے عارف کی طرف دیکھا۔ "عارف میاں۔ آپ کو سینما جانے کی تو اجازت ہوگی؟"

"جی نہیں۔" عارف نے جواب دیا۔

"یہ سب سینما ہی کا تو کیا دھرا ہے۔" چودھری صاحب نے وضاحت کی۔

ڈاکٹر نے پھر پوچھا۔ "آپ کے کمرے میں ریڈیو سیٹ ہے؟"

"جی نہیں۔" عارف بولا۔

"گھر میں تو ہے۔" چودھری صاحب نے کہا

"جی ہاں۔ ہے۔ مگر میرے کمرے میں نہیں۔" عارف نے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے چودھری صاحب کو جواب دیا۔

"آپ روزانہ اخبار پڑھتے ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"کیوں؟"

"ابو جی اردو اخبار پڑھتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں، اخبار انگریزی میں نہ ہو تو اخبار ہی نہیں ہوتا۔"

"سُن رہے ہیں آپ؟" چودھری صاحب نے ڈاکٹر سے فریاد کی۔

ڈاکٹر نے ایک بار چودھری صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر عارف سے پوچھا "کسی وقت چودھری صاحب کے پاس آکر بیٹھتے ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"کیوں؟"

"چپ چاپ بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔"

چودھری صاحب نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پھر پہلو بدل کر اسی رخ بیٹھ گئے جس رخ بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کالج سے آنے کے بعد دن بھر کیا کرتے رہتے ہیں؟"

"پاگل پن کرتا رہتا ہوں" عارف نے ذرا سا مسکرا کر صفیہ کی طرف دیکھا۔

چودھری صاحب تلملا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر ساتھ ہی ڈاکٹر بھی اٹھا اور فوراً بولا "آپ کھل کر کیوں بات نہیں کرتے عارف میاں؟"

عارف بولا "ابھی میرا پاگل پن مکمل نہیں ہوا۔ ابھی مجھ میں اتنی عقل موجود ہے کہ اپنے ابو جی کے سامنے۔"

"میری طرف سے تمہیں کھلی چھٹی ہے" چودھری صاحب گرجے۔

"اگر یہ بات ہے تو میں عرض کرتا ہوں" عارف تن گیا۔

اچانک صفیہ بڑھ کر عارف کے بازو سے چمٹ گئی اور کچھ کہے بغیر اس نے عارف کی طرف یوں دیکھا کہ عارف کے کپکپاتے ہونٹ بھینچ گئے۔ دونوں کے کانوں کی لوؤں کے پاس، جبڑوں کی ہڈیاں مسلسل ابھرنے اور دبنے لگیں۔

پھر اماں کرسی کے بازو پر سے اٹھیں اور کچھ اس طرح ڈاکٹر کے سامنے کھڑی ہو گئیں کہ چودھری صاحب، ڈاکٹر کی نظروں سے چھپ گئے۔ وہ بولیں "عارف بیمار ویمار کچھ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔ اور اگر یہ بیمار ہے تو ہم سب بیمار ہیں۔ آپ ہمارے نئے ڈاکٹر ہیں۔ آپ سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں اس لیے دیکھیے۔ ذرا میری بچی کی طرف دیکھیے۔ اس نے بالوں کو لڑکوں کی طرح سر پر سجا رکھا ہے۔ آج سے دس پندرہ سال پہلے ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی اپنے بالوں کے ساتھ یہ سلوک کرے گی۔ مگر آج صرف سوچا کیا، ہم برداشت بھی کرتے ہیں، اور ڈاکٹر صاحب آپ کی لڑکیاں تو صفیہ سے بھی آگے ہیں اور میں جانتی ہوں کہ آپ شریف آدمی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر آج صفیہ سیدھی مانگ نکال کر اور سیدھی کنگھی کرنے کا رواج جائے گی تو اس کا مذاق اڑے گا اور وہ عمر بھر کے لیے احساس کمتری کی مریض ہو جائے گی۔ اس لیے اب تو صفیہ کے بال میں خود بنانے لگی ہوں۔ دیکھیے ڈاکٹر صاحب۔ ہمارا لباس دھوتی اور کرتا یا چلیے شلوار اور کرتا ہے۔ لیکن کیا عارف شلوار کرتا پہن کر کالج جا سکتا ہے؟ نہیں جا سکتا۔ پھر جب ہم صفیہ کے لڑکوں سے بال اور عارف کی تنگ پتلون برداشت کر لیتے ہیں تو ہمیں یہ بھی برداشت کرنا پڑے گا کہ ہمارا بیٹا جو بھی کچھ کرے جو ۱۹۷۴ء کے نوجوان کرتے ہیں۔ چودھری صاحب جب ۱۹۳۴ء میں عارف کی عمر کے تھے تو لمبا ہی لباس پہنتے تھے جو عارف کے دادا ۱۹۰۴ء میں پہنا کرتے تھے؟ اور کیا چودھری صاحب ——"

چودھری صاحب نے اخبار کو فرش پر پٹخ دیا اور کمرے سے نکل گئے۔ ڈاکٹر نے حیران ہو کر تینوں کو دیکھا اور

پھر چودھری صاحب کے پیچھے چل لیں۔ عارف صفیہ کی گرفت سے [illegible] جھٹک کر [illegible] پاس آ [illegible] آپ نے
اچھا نہیں کیا امی جی۔ باپ بیٹے کی لڑائی میں جب ماں [illegible] بیٹا [illegible] میں بول پڑے تو [illegible] نے نہیں پڑھا ہے کہ باپ
یا تو خودکشی کر لیتے ہیں یا پاگل ہو جاتے ہیں۔"

ماں ذرا سی پریشان ہو گئیں۔

"تو پھر آپ انھیں تنگ کیوں کرتے ہیں؟" صفیہ نے [illegible] کر پوچھا۔

"تم چپ رہو۔" عارف نے [illegible] بال [illegible]

پھر ماں سے کہنے لگا۔ "میں جانتا ہوں امی جی، وہ [illegible] ہیں۔ وہ [illegible] بیل گاڑی کے پہیے فٹ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر آخر وہ میرے باپ ہیں، [illegible] تو [illegible] نہیں چاہتا کہ وہ اپنے [illegible] گھر کی [illegible] میں نے ان سے کچھ نہیں مانگا۔ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں تو [illegible] آپ سے کر لیتا ہوں [illegible] چاہتا ہوں تو [illegible] آپ پر [illegible] ہوں۔ اور ابھی [illegible] کے بعد میں [illegible] مگر آپ کی قسم، مجھے کچھ معلوم نہ [illegible] میں کیوں [illegible] گلا بھر آیا اور میں نے سوچ کر چلو [illegible] تھوڑا سا رو بھی لینا چاہیے۔"

[illegible] اپنے آنسو پونچھنے لگیں [illegible] صفیہ [illegible] اور عارف کرسی پر بیٹھ گیا۔ تینوں خاموشی [illegible] چپ چاپ بیٹھے رہے، جیسے ایک دوسرے سے چھپے بیٹھے ہیں۔ پھر ڈاکٹر [illegible] چودھری صاحب [illegible] بوڑھا سا تھا۔ آتے ہی وہ بولا۔ "دیکھیے عارف میاں۔ میں نے آپ کا [illegible] نفسیات کا ماہر نہیں ہوں مگر [illegible] بھی جوان بیٹوں بیٹیوں کا باپ ہوں، [illegible] نسخہ مجرب ہے۔ [illegible] میں رہی ہے [illegible] صرف یہ پابندی ہے کہ آپ دس بجے تک [illegible] بہر صورت گھر پہنچ جایا کریں۔ [illegible] بعد بھی [illegible] تو چودھری صاحب سے [illegible] لیا کریں۔ [illegible] یاد رکھیں کہ آپ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں [illegible] بزرگ [illegible] قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی، اور پھر ایک اور بزرگ سید احمد شہید کے [illegible] بالا کوٹ میں دفن ہوئے۔

ڈاکٹر خاموش ہوا تو [illegible] کوئی کچھ نہ بولا۔ پھر چودھری صاحب [illegible] ڈاکٹر سے کہا۔ "[illegible] یہ [illegible] ایک [illegible] میرے پاس [illegible] بیٹھے اور ادھر ادھر کی باتیں کر لیا کرے۔"

عارف نے یہ سن کر سر جھکا لیا [illegible] چودھری صاحب [illegible] مسکراتے [illegible] پھیر کر شاید آنکھیں پونچھنے لگیں، اور صفیہ آنسوؤں میں مسکرانے لگی۔ پھر ڈاکٹر [illegible] نکالی اور اس کی سوئی کو اسپرٹ سے صاف کرتے ہوئے بولا۔ "اور اب عارف [illegible] آپ کے دماغ میں [illegible] انجکشن [illegible] رہ گیا ہے ———"

عارف نے چونک کر ڈاکٹر کو دیکھا [illegible] پھر سب ہنسنے لگے اور ڈاکٹر [illegible] کو واپس [illegible] یہ کمبخت [illegible]

پھر چودھری صاحب، ڈاکٹر کو ان کی کار تک چھوڑنے چلے گئے اور صفیہ نے اماں سے پوچھا "بھائی جان کا کمرہ بدلے گا تو امی جی، مجھے بھی میرا پرانا کمرہ مل جائے گا نا۔" "مجھے تو ابو جی یہاں اس لیے لائے ہیں تاکہ ۔۔۔"
"کہ تم میری چوکیداری کر سکو۔" عارف نے ہنس کر کہا۔ "چوکیدار ملاحظہ ہو!" اس نے بڑھ کر صفیہ کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ "چاہوں تو اچھال کر سپوتنک بنا دوں۔" پھر اس نے صفیہ کو ایک دو بار یوں گھمایا جیسے اسے سچ مچ اوپر اچھال دے گا اور صفیہ چیخنے لگی۔ "بھائی جان، دیکھیے نا میرے بال خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ پورا ایک گھنٹہ لگایا ہے انھیں بنانے میں۔ مجھے چھوڑ دیجیے ورنہ آپ کا بازو میرے دانتوں کی زد میں ہے۔"
"آپ رے۔" عارف نے جیسے ڈر کر صفیہ کو صوفے پر پھینک دیا۔
اور اماں ہنسے جا رہی تھیں اور روئے جا رہی تھیں۔

عارف اپنے وعدے پر قائم رہا۔ وہ ہر روز چودھری صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر دنیا جہان کی باتیں کرتا۔ کشمیر سے لے کر کیوبا تک کے مسائل کا ذکر آتا اور جب بھی چودھری صاحب اس کی کسی رائے سے اختلاف کرتے، وہ فوراً ان سے متفق ہو جاتا۔ "آپ درست فرماتے ہیں۔" وہ کہتا "کیوبا کو امریکہ ہی کے زیر اثر رہنا چاہیے، اس لیے کہ وہ امریکہ کے اس قدر قریب ہے۔ ویسے اس طرح تو لنکا کو ہندوستان کے زیر اثر اور مڈغاسکر کو جنوبی افریقہ کے زیر اثر اور جاپان کو چین کے زیر اثر رہنا چاہیے کیونکہ یہ سب بھی تو ان سب سے اس قدر قریب ہیں، مگر نہیں، آپ درست فرماتے ہیں۔ امریکہ کی بات ہی اور ہے۔"
چودھری صاحب کے اس قدر نادر کے سلسلے میں عارف میں بہت بڑا انقلاب آ گیا تھا اور چودھری صاحب اپنے بیٹے کے اس سلوک سے نہ صرف خوش تھے بلکہ مدہوش تھے۔ تنہائی میں ان دنوں کے متعلق سوچ کر انھیں ندامت محسوس ہوتی تھی جب انھوں نے عارف کو ہمدرد کے ایک کمرے میں نظر بند کر دیا تھا اور اسے پاگل بناتے بناتے رہ گئے تھے۔
"سوچتا ہوں۔" وہ اپنی بیوی سے کہتے "شاید میں ہی پاگل ہو گیا تھا۔ تم بالکل ٹھیک کہتی تھیں، مگر اس وقت مجھے ایسا لگتا تھا کہ جو شخص مجھے عارف کے سلسلے میں ٹوکتا ہے، وہ میرا دشمن ہے۔ اب دیکھو کہ میں نے اس پر اعتماد کیا ہے تو سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ میں تو اب اسی ڈر سے صفیہ کے کمرے میں بھی نہیں جاتا۔ کہیں وہ بھی یہ نہ سمجھ لے کہ مجھے اس پر خدانخواستہ کوئی شبہ ہے۔ دونوں خوش ہیں نا؟"
"صفو تو خیر سدا کی خوش باش ہے۔" اماں کہتیں۔ "مگر میں نے اس کے اور عارف کو بھی کبھی اداس نہیں دیکھا۔ مجال ہے جو وہ نو دس بجے کے بعد گھر سے باہر رہے۔ رات کے دو دو بجے تک انیکسی کے باہر اس کے دوستوں کی کاریں اور سکوٹر جمع رہتے، مگر یہ سب عارف کے پاس آتے ہیں نا۔ وہ تو کسی کے پاس نہیں جاتا۔ میں کہتی ہوں نا، وہ تو قوم کا لیڈر بنے گا۔ اتنا ہر دل عزیز ہے۔ ایسی شخصیت ہے اس کی کہ سب کھنچے چلے آتے ہیں۔ آپ ہی نے تو ایک بار کہا تھا کہ شخصیت کے بغیر بندہ اسی طرح ہے جیسے بالوں کے بغیر عورت ۔۔۔ وہ جب

محنت کے بعد میرے بال گرنے لگے تھے۔"

اس پر چودھری صاحب تیج چیخ کر ہنسنے لگتے جیسے کوئی انھیں مسلسل گدگدائے جا رہا ہے اور ہم ان کا ساتھ دیتیں۔ یوں چودھری صاحب کی کوٹھری پر ہر وقت کھلتے ہوئے درخت کی سی آسودگی طاری تھی۔ حد یہ ہے کہ عارف اب تک سائیکل چلاتا تھا۔ در اصل شروع شروع میں جب اس نے چودھری صاحب کو سکوٹر خرید دینے کے لیے کہا تھا تو چودھری صاحب کو بڑی تکلیف ہوئی تھی۔ "سکوٹر تو نہایت مختصر سواری ہے۔" انھوں نے کہا تھا۔ "سواری وہ رکھو جس سے وقار وابستہ ہے۔ اونٹ اور ہاتھی سے وابستہ ہے اور ظاہر ہے کہ ان پر سوار آدمی زمین سے اونچا ہوتا ہے۔ مگر سکوٹر دیکھ کر تو مجھے لگتا ہے جیسے انسان ابھی کیچوے کی طرح پیٹ کے بل رینگ رہا ہے۔" گھٹنوں پر اٹھ نہیں سکتا۔ اسکوٹر نہ ہونے کے باوجود اسکوٹروں اور کاروں والے اس کے گرد پروانوں کی طرح جمع رہتے ہیں اور چودھری صاحب اسی پہ سرشار تھے۔

پھر ایک روز عارف نے چودھری صاحب سے رانا مطلوب الحق کے ہاں ایک دعوت میں جانے کی اجازت مانگی۔ رانا صاحب کا بنگلہ چودھری صاحب کے بنگلے سے چند ہی بنگلے ادھر تھا۔ رانا صاحب کسی زمانے میں ایک سرکاری افسر تھے۔ پھر کسی وجہ سے برطرف کر دیے گئے۔ برطرف ہوتے ہی انھوں نے دس لاکھ کے صرف سے یہ بنگلہ بنوایا۔ اس رقم کو اگر ان کی ملازمت کے بیس برس پر تقسیم کیا جائے تو ماہانہ چار ہزار سے بھی زیادہ روپیہ بنتا ہے اور انھوں نے زیادہ سے زیادہ بارہ سو تک تنخواہ لی تھی۔ سو جب بنگلہ بن رہا تھا تو لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ یہ اتنا بہت سا روپیہ کہاں سے آ گیا۔ مگر پھر بڑے بوڑھوں نے انھیں سمجھایا کہ روپیہ ہر شخص کا نجی مسئلہ ہوتا ہے اور دوسروں کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ سو قصہ ختم۔ مگر جب بھی جاری رہی مگر جس شخص نے اتنا عالی شان بنگلہ بنوا لیا ہو اور جس کے پاس دو چوڑی چکلی لمبی لمبی کاریں اور ایک اسٹیشن ویگن اور ایک جیپ ہو اسے معززینِ شہر میں شمار ہونے سے کون روک سکتا ہے۔ سو رانا صاحب چند ہی دنوں میں اس مرتبے پر جا پہنچے کہ ان سے تعارف بھی اونچے سماجی مرتبے کی نشانی سمجھا جاتا تھا اور جو لوگ ملازمت کے دوران میں ان کے سپرنٹنڈنٹ تھے وہ رانا صاحب کے ہاں مدعو ہونے کو اپنا بڑا اعزاز سمجھنے لگے تھے۔ اور اگرچہ چودھری صاحب افسر نہیں تھے، کنٹریکٹر تھے اور پانچوں نمازیں پڑھتے اور میلاد کی محفلیں برپا کرتے تھے اور ہر مہینے کی گیارھویں کو یتیم خانے میں دو دیگ زردہ بھیجتے تھے۔ مگر بہر حال وہ امیر آدمی تھے اس لیے رانا صاحب کے ساتھ ان کی بھی یاد اللہ تھی۔ بس اتنا تھا کہ چودھری صاحب رانا صاحب کی ڈرنک پارٹیوں میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ ایک بار ان کے ہاں مجرے کی ایک محفل میں پھنس گئے تھے مگر سارا وقت یوں جھینپے بیٹھے رہے جیسے غلطی سے پشواز پہن کر آ گئے ہیں۔

عارف نے چودھری صاحب کو بتایا کہ رانا صاحب کی بڑی بیٹی روشن نے ایم۔ اے پاس کیا ہے۔ اس کے پاس ہونے کی بھی توقع نہیں تھی مگر ایک دم اس کی فرسٹ ڈویژن آ گئی ہے اس لیے رانا صاحب نے اپنے بیٹوں بیٹیوں کے سب دوستوں اور سہیلیوں کو دعوت پر بلایا ہے۔ "اجازت ہو تو میں اور صفیہ چلے جائیں؟"

"صفیہ بھی؟" چودھری صاحب کہہ بیٹھے

"عارف نے آہستہ سے کہا۔" وہ اپنی سہیلیوں میں رہے گی۔ میں اپنے دوستوں میں رہوں گا۔ رانا صاحب

کے ہاں ہوتی تو مکسڈ پارٹیاں ہی ہیں مگر ایسی مکسڈ بھی نہیں کہ ۔۔۔۔۔۔" عارف رک گیا۔

چودھری صاحب کو ایک دم جیسے کچھ یاد آ گیا۔ بولے "ہاں ہاں ۔ وہ بھی چلی جائے ۔ آخر ایسی بھی کیا بات ہے ۔ رور وکر آخر اس نے برقع اتار دیا ہے تو اب اعتراض کیا! متصبہ ۔ بے شک جائے۔"

"ابو جی" عارف نے پھر کہا "اگر ہمارے ساتھ ای نی بھی چلی چلیں تو کیا حرج ہے؟"

"کوئی حرج نہیں" چودھری صاحب بولے ۔ "مگر وہ کس کی سہیلی ہیں؟" وہ ہنسے ۔۔ "وہ تو صرف میری سہیلی ہیں بیٹا"

عارف مسکرایا۔ پھر انھیں بتایا کہ رانا صاحب نے سب ابا زادوں کو بھی مدعو کیا ہے ۔

"تو بے چارے اباؤں نے کیا قصور کیا ہے؟" چودھری صاحب نے خوش دلی سے پوچھا۔

"بس رانا صاحب کا اپنا خیال ہے" عارف ذرا سا جھینپا۔

"تو بچہ سے لے جاؤ ۔ سے جاؤ ۔ اپنی امی جی کو بھی لے جاؤ" چودھری صاحب نے بڑے سکون کے ساتھ کہا۔ دراصل وہ اپنی بیگم کے جانے سے بہت خوش تھے ۔ نوجوانوں کی اتنی بڑی پارٹی میں عارف اور صفیہ کو بھیجتے ہوئے ان کے ذہن میں جو ذرا سی کھٹک پیدا ہوئی تھی وہ بیگم کے ذکر کے ساتھ ہی مٹ گئی تھی ۔

پھر رات کے کوئی ساڑھے گیارہ بجے تھے ۔ چودھری صاحب ترجمان القرآن میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر کی روح نواز گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے تھے ۔ جب باہر ایک کار رکی ۔ پھر گھنٹی بجی اور پھر ملازم نے آکر اطلاع دی کہ رانا صاحب تشریف لائے ہیں ۔

چودھری صاحب نے انھیں اپنے کمرے ہی میں بلا لیا۔

رانا صاحب آتے ہی بولے "معاف کیجیے گا بے وقت تکلیف دے رہا ہوں، مگر دیکھیے چودھری صاحب ۔ میرے ہاں ہر طرح درجہ بدرجہ خیریت ہے ۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میرے ہاں دعوت تو صرف لڑکیوں کی تھی ۔ مگر پھر روشن نے کہا تو محفل کا لڑکے بھی ہونے چاہئیں ۔ میں نے کہا چلو لڑکوں کو بھی بلا لو ۔ پھر ہماری مسز نے ضد کی کہ سب کی ممیز بھی آئیں ۔ میں نے مان لیا چلو آ جائیں ۔ ممیز بھی آ گئیں ۔ اور اب وہاں ہجوم ہوا ہے اور قہقہے لگ رہے ہیں اور کھیل ہو رہے ہیں تو میری غیرت نے جوش مارا ۔ میں نے سوچا آخر ڈیڈیز نے بے چاروں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے ۔ وہ کیوں گھروں میں پڑے اونگھتے رہیں" رانا صاحب ہنسے ۔

"میں اونگھ تو نہیں رہا تھا" چودھری صاحب مسکرا کر بولے ۔

"آپ کی بات اور ہے" رانا صاحب نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔ "آپ اللہ والے لوگ ہیں ملر ڈیڈیز تو سب کبھی ہیں نا ۔ سو اب میں لڑکیوں، لڑکوں اور ممیز کو بہلائے بغیر سب کے ڈیڈیز جمع کرتا پھرتا ہوں، تین پھیروں میں الگ الگ ڈیڈیز کو پہنچا آیا ہوں۔ آپ نے دیکھا ہوگا، میرے بنگلے کے اندرونی حصے میں ایک لمبا ورانڈا ہے ۔ وہاں میں نے بیزی بیری کی ایک دوکان لگا دی ہے ۔ اور ایک کینڈل پاور کے صرف دو یا شاید تین کاسنی رنگ کے بلبوں کے سوا وہاں کوئی روشنی نہیں ۔ ممیوں میں سے کوئی تھک جاتا ہے تو وہاں آ کر ذرا سستا

لیتا ہے۔ ڈیڈیز کو میں نے انہی کرسیوں پر ادھر ادھر بکھیر دیا ہے۔ سب سمجھتے ہیں ان کرسیوں پر بنی جیسے تھکے ماندے لوگ بڑے ریلیکس کر رہے ہیں۔ سو بڑا مزا آ رہا ہے۔ آپ بھی چلیے۔"

"مگر میں تو کھانا کھا چکا ہوں" چودھری صاحب کو کوئی اور بہانہ نہ سوجھا۔

"ہمیشہ کی طرح آج بھی آپ نے حد کر دی چودھری صاحب" رانا صاحب ہنسے۔

"ارے بھائی کھانے کو تو ماریے گولی۔ کھانا سب لوگ کھا چکے ہیں۔ ذرا آ کر دیکھیے۔ جب ہم لوگ جوان تھے تو ہم نے وہ کیا کیا نہیں کیا جو ہمیں کرنا چاہیے تھا۔"

چودھری صاحب یوں بولے جیسے بگڑ گئے ہیں مگر چھپا رہے ہیں۔

"مجھے معاف ہی رکھیے تو آپ کا احسان ہو گا۔"

رانا صاحب ایک دم اٹھ کر باہر چلے گئے۔ درقبل اس کے کہ چودھری صاحب سلیپر پہن کر انھیں منانے باہر لپکتے، رانا صاحب دو تنومند ڈیڈیز کو ساتھ لیے اندر آئے اور بولے:۔

"لیجیے اولڈ بوائز۔ میری مدد کیجیے اور چودھری صاحب کو باڈی اٹھا کر کار میں ڈال آئیے۔"

"چلتا ہوں بھئی چلتا ہوں۔" چودھری صاحب کچھ مسکراتے کچھ جھینپتے شیروانی پہننے لگے۔

"مگر اس میں تک کیا ہے آخر؟"

"ہم اس بے تکی دنیا کے اندر ہر چیز میں تک ڈھونڈنے بیٹھے تو جی لیے۔" ایک ڈیڈی نے پائپ کو دانتوں تلے دبا کر کہا۔ "چلیے۔"

چودھری صاحب بحث کے موڈ میں نہ تھے

بنگلے کے لمبے برآمدے میں داخل ہونے سے پہلے رانا صاحب نے سب کو خبردار کیا کہ اس نیم تاریکی میں ڈیڈیز کی سب سے بڑی پہچان ان کی چیخیں مارتی ہوئی کھانسی ہے۔ سو جسے کھانسنا ہو یا تم ردم میں جا کر کھانس لے۔

"اگر کوئی برآمدے میں کھانس دیا اور لڑکیاں لڑکے کانشس ہو گئے تو دوسرے ہی دن اسے اتنی ہی بڑی دعوت کا انتظام کرنا پڑے گا۔ ابھی بھی میں مسٹر توفیق نورانی کو واپس ان کے گھر پہنچا کر آ رہا ہوں۔ وہ غسل خانے میں جا کر کھانسے اور کھانستے ہی چلے گئے۔ پھر کسی نے مجھ سے پوچھا کہ انکل، یہ اتنی بوڑھی کھانسی کون کھانس رہا ہے؟۔ اور مجھے فوراً خدا نے ہمت دی۔ میں نے کہا۔ کچھ نہیں۔ ریڈیو پر ڈرامہ ہو رہا ہے۔ سوا کیا ہے انھیں ـــــ"

سب نے ذرا ذرا سا کھنکار کر گلے صاف کیے اور پھر برآمدے میں داخل ہوئے۔ وسیع لان کے پرلے گوشے میں ہلکی نیلی ٹیوب لائٹوں کے دائرے میں، دھیمی دھیمی لے میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ نہ جانے یہ آرکسٹرا کہاں چھپا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سازوں کی آوازیں زمین سے اُگ رہی ہیں اور آسمان سے برس رہی ہیں اور ہوا میں اڑ رہی ہیں۔ سازوں کی دھن پر لڑکوں اور لڑکیوں کے جوڑے ایک نہایت نرم اور خوابناک انداز میں یوں ناچ رہے تھے جیسے ناچتے ناچتے انھیں نیند آ گئی ہے اور وہ اپنے وجودوں کی دوئی کی حدیں پار کر گئے ہیں۔

چودھری صاحب نے دور دور لگے ہوئے ایک ایک کینڈل پاور کے دو بلبوں کے درمیان اپنے لیے ایک کرسی پسند کی تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ تاریکی میں رہیں اور ڈیڈیز بھی انھیں نہ پہچان پائیں۔

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انھوں نے ان غنودہ جوڑوں میں عارف اور صفیہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کی، اور جب ناکام ہوئے تو مسکرانے لگے۔

ایک دم انھوں نے اپنی مسکراہٹ سمیٹ لی۔ لڑکیوں نے لڑکوں کے سینے پر اپنے سر رکھ دیے تھے اور آنکھیں بند کر لی تھیں ـــــــ

پھر چودھری صاحب نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔

آرکسٹرا رکا تو انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ جوڑے الگ الگ ہو گئے تھے اور ہر طرف سے تالیاں بجنے لگی تھیں۔ لان کے ایک دور کونے میں مصنوعی پہاڑ نما پر سے آتی ہوئی تالیوں کی آواز سب سے اونچی تھی۔

"وہ ممیز کا مورچہ ہے" رانا صاحب نے قریب سے گزرتے ہوئے آہستہ سے اطلاع دی۔

اچھا تو عارف کی ماں وہاں بیٹھی ہیں! ــــ "عارف کی اماں" وہ پکارتے پکارتے رہ گئے۔ پکار بیٹھتے تو کیسی بھد ہوتی۔ انھوں نے سوچا ــ کاش بیگم کو کوئی وہاں سے بلا دے۔ یہ قریب والی کرسی خالی بھی تو پڑی ہے۔ پھر وہ اپنی کرسی ان کی طرف کھسکا کر ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں رکھ لیں اور ـــــــ

ایک دم آرکسٹرا نے ایک تیز ردھم ٹیون بجانی شروع کر دی اور پھر چمٹی ہوئی پتلونوں والے لڑکے اور منڈھے ہوئے جمپروں والی لڑکیاں ٹوسٹ ناچنے لگیں۔

لاحول ولا قوۃ۔ چودھری صاحب نے سوچا۔ انسان تو واپس اپنے آغاز کی طرف جا رہا ہے۔ جب انسان نے ابھی گانا نہیں گایا تھا اور شعر نہیں کہے تھے تو اپنے اندر کے شیطان کو اس سے زیادہ وحشت کے ساتھ کیا نکالتا ہوگا۔ ہم نے تو کہیں پڑھا تھا کہ رقص روح کے کرب کی تصویر ہے، مگر یہاں تو صرف جسم ہی جسم ہے۔ اور ان بدبختوں کے جسم کیسے خوبصورت ہیں۔

"عارف کی اماں!" ــــ جی چاہا پکار دیں، مگر پھر وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ ویسے تو وہ بیٹھے رہے مگر انھیں کچھ ایسا لگا کہ وہ تڑپ کر اٹھے ہیں۔ لان میں لپکے ہیں، صفیہ کے گال پر زناٹے کا ایک تھپڑ دے مارا ہے۔ اور صفیہ روتی چیختی بھاگ نکلی ہے اور وہ مٹھیاں بھینچے اس کا پیچھا کر رہے ہیں ـ اس بدنصیب نے یہ جمپر کب سلوایا تھا؟ ــ اور درزی کو ناپ دیتے ہوئے اسے شرم نہیں آئی تھی؟ اور اسے اتنی بھرپور، اتنی پاگل جوانی کب مل گئی؟ ــ یہ اسی طرح آگے پیچھے، دائیں بائیں بل کھاتی، اور کنڈل مارتی رہی تو بے حیا کا جمپر کہیں نہ کہیں سے مسک جائے گا۔ پھر کیا ہوگا؟ سیاہ جمپر میں سے اس کے جسم کی شعاع نکلی تو پھر کیا ہوگا؟

عارف کی اماں! ــــ اے عارف کی اماں! سنتی ہو؟ یہ تمھارے سامنے تمھاری بیٹی ناچ رہی ہے۔ یہ وہ ہے جسے نرسری کلاس میں بھی دس سورتیں ازبر تھیں ـ یاد ہے جب یہ ہاتھ بھر کی ننھی سی دوزانو ہو کر اور ماتھے تک دوپٹہ کھینچ کر ـــــــ

کم سے کم دوپٹہ تو اس کے کندھے پر ضرور ہونا چاہیے تھا۔ دوپٹے تو سب کے پاس بہت سے ہیں پانچ دوپٹے تو بھی کچھ دن پہلے میں اس کے لیے ڈھاکے سے لایا تھا۔ اور وہ کراچی والے تین دوپٹے! کراچی کے ایک ہوٹل میں بھی ایک ڈانسٹ دیکھنا پڑ گیا تھا مگر اس میں یہ بات نہیں تھی۔ شاید [illegible] یہ کہ اس میں صفیہ نہیں تھی۔

اب تو سب تھک تھکا کر الگ جا کھڑے ہوتے ہیں۔ صرف دو جوڑے باقی ہیں۔ صفیہ کے سامنے شاید [illegible] صاحب کا بیٹا ناچ رہا ہے۔ کیسا بے معنی چہرہ ہے! آج کل کے مصور بھی تو ایسی ہی تصویریں بناتے ہیں۔ دوسرے جوڑے کی لڑکی شاید روشن ہے۔ ہاں روشن ہی تو ہے۔ لڑکیوں کو اتنا خوبصورت نہیں ہونا چاہیے۔ یہ خوبصورتی ناقابل برداشت ہے۔ یہ تو کچل دینے والی خوبصورتی ہے۔ [illegible] کو کیا ہو گیا ہے؟۔ یہ یہاں [illegible] ہے؟ عارف کی اماں! اے عارف کی اماں!———

روشن کے مقابل جوڑا کا ———

چودھری صاحب ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوتے۔ ویسے تو وہ بیٹھے رہے مگر انھیں پتہ ایسا لگا جیسے وہ اٹھ گئے ہیں۔ [illegible] پیٹ میں اور [illegible] کو گردن سے دبوچ [illegible] کھینچے لیے جا رہے ہیں۔ [illegible] بدذات کہیں کا۔

عارف کی اماں! اری او عارف کی اماں! سنتی ہو؟ یہ تمھارے سامنے تمھارا عارف ناچ رہا ہے۔ یہ وہ ہے جو ہر تعریف اس خدا کی۔ گاتا تھا تو بڑے بڑے نمازی بھی توبہ تائب ہو کر نماز پڑھنے لگے تھے۔ یاد ہے جب اس نے [illegible] کے لونڈے نے بڑی مسجد میں کہہ دیا تھا کہ میرا [illegible] نماز نہیں [illegible] کا۔

اسے یہ پتلون پہنے ہوئے میں نے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ [illegible] بھی ہو مگر اس وقت ناچ نہیں رہا ہوگا۔ [illegible] اب تو عارف پتلون نظر آ رہی ہے۔ کپڑوں میں اسی طرح تو ننگا پھرا جاتا ہے۔

اور اب اس کے سامنے اس کی بہن ناچ رہی ہے۔ [illegible] اپنی بہن کے سامنے ناچ رہا ہے۔

[illegible] صاحب۔ میں غسل خانے [illegible] جانا چاہتی ہوں۔

آ کر [illegible] گئے۔۔۔ کیوں صاحب۔ مسٹر اکیولا [illegible] کیا ہے؟

چودھری صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب کے ہج مچ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈانسٹ ختم ہو گئی [illegible] پھر ادھر [illegible] کی بیگم اٹھ رہی ہیں۔ یہ سارا [illegible] شادی کی تھی۔ ہر طرف آتش بازی سی چھوٹ رہی ہے۔ آنکھیں چندھیائی جا رہی ہیں۔ [illegible] کی اماں! کیا تمھی عارف کی اماں ہو؟ ہم تو آج پہلی بار ملاقات ہو رہی ہے۔

اگر تم عارف کی اماں ہی ہو تو یقیناً [illegible] کے [illegible] ہو۔ مگر تم تو صفیہ کی ماں ہو۔ تم تو [illegible] گئی ہو اور پھر ایک [illegible] ہو؟ اپنے [illegible] وہ شاخ گل کا سا [illegible] وہ کہاں چھپ گئی [illegible] زمانوں میں جنگیں جیت کر آتے [illegible] گری ہوتی ہوں گی۔

"بیٹھ جائیے، بیٹھ جائیے چودھری صاحب [illegible] ایک کرسی پر سے کوئی ڈیڈی آہستہ سے بولا۔

چودھری صاحب فوراً بیٹھ گئے۔

پھر کسی طرف سے رانا صاحب ایک چمکتے دمکتے اسکوٹر پر بیٹھ کر تیزی سے آئے اور ٹیوب لائٹوں کے دائرے میں زور سے بریکیں لگائیں تو چودھری صاحب یوں گھبرا سے گئے جیسے رانا صاحب کی چیخ نکل گئی ہے۔

فوراً بعد مسز رانا ایک اور اسکوٹر پر بیٹھ کر خوب ہنستی ہوئی آئیں اور روشنی کے دائرے میں آکر رک گئیں۔

پھر رانا صاحب نے ایک کرسی اٹھائی اور اس پر کھڑے ہو کر بولے:

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! گرلز اینڈ بوائز! میں مس صفیہ چودھری اور مسٹر عارف چودھری کو ایشیا کے سب سے بڑے ٹوسٹر جوڑے کا ٹائٹل دیتا ہوں۔"

قہقہوں اور تالیوں سے فضا گونج اٹھی اور ممتیر نے بیگم چودھری کو گھیرے میں لے لیا اور صفیہ عارف سے چمٹ گئی۔

پھر رانا صاحب تالیاں روکنے کے لیے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "اور میں اس خوشی میں صفیہ کو ایک اسکوٹر کا گفٹ دیتا ہوں۔"

تالیوں میں وہ کرسی پر سے کود گرا تریں اور عارف کو گال پر اور صفیہ کو ماتھے پر پیار دے کر بیگم چودھری کے پاس جا کر مسکرانے لگیں۔

تالیوں کے بے پناہ شور میں صفیہ اور عارف نے آپس میں کوئی بات کی۔ پھر دونوں اپنے اپنے اسکوٹروں پر بیٹھے اور وسیع لان میں اس تیزی سے اسکوٹر دوڑانے لگے اور ایک دوسرے کے پہلو میں سے گزرنے لگے اور ایک دوسرے کا راستہ کاٹنے لگے جیسے اسکوٹروں پر ٹوسٹ ناچ رہے ہوں۔

گر جاؤ گے نا ہنجارو۔ پہیہ رپٹ گیا تو ایک سو گز تک لڑھکتے چلے جاؤ گے اور جہنم رسید ہو جاؤ گے پاگل کے بچو۔

پھر جیسے رانا صاحب نے چودھری صاحب کے دل کی بات کہہ دی ۔ "بس بھئی۔ بس۔ تم نے ایسے ہی دو چار چکر اور لگائے تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا!"

سب ہنسے ۔ صفیہ اور عارف نے اسکوٹر روک لیے۔ پھر سب ادھر ادھر ٹولیوں میں بٹنے لگے۔

"کنگریچولیشنز چودھری صاحب" ایک ڈیڈی نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کے بچے تو جینئیس نکلے!"

رانا صاحب مجھے کھانسی آنے والی ہے ۔۔ مجھے خون کی کھانسی آنے والی ہے ۔ میرا حلق نمکین ہو رہا ہے۔ میرے اندر کچھ بکھر رہا ہے۔

صفیہ، عارف اور ان کی اماں دس پندرہ لڑکوں لڑکیوں میں گھرے ہوئے برآمدے کی طرف آنے لگے۔

رانا صاحب ۔آپ کہاں مر گئے؟ مجھے کھانسنے لے جائیے۔

چودھری صاحب کی کرسی کے بالکل قریب رک کر اس ٹولے نے صفیہ اور عارف کے ٹوسٹ کی تعریف میں انگریزی زبان کے تمام اسمائے صفت استعمال کر ڈالے ۔ پھر صفیہ بڑی تشویش سے بولی:

"ریفی۔ اگر ابوجی نے "

"ابوجی:" ایک لڑکی پہلے حیران ہوئی اور پھر ہنس پڑی۔ پھر ایک لڑکا بولا:

"ابوجی، اردو کا ڈیڈی ہوتا ہے!"

زوردار قہقہے میں صفیہ اور عارف اور حد یہ کہ ان کی اماں نے بھی شرکت کی۔

رانا صاحب: آپ بڑے ذلیل آدمی نکلے۔ اب آ بھی چکیے نا۔

"سنو ریفی" صفیہ پھر بولی "اگر ابوجی نے پوچھ کہ سپا سکورز کیا لے کر آئے ہو تو کیا کہو گے۔"

"کہنا لاٹری نکلی ہے" اماں نے مشورہ دیا۔

عارف کی اماں! کیا تم نے عشا کی نماز پڑھ لی ہے؟

"کہہ دیں گے" عارف بولا "کہ کالج میں ہم دونوں نے تحریری ٹیسٹ میں سبقت کر انعام پایا ہے۔"

"اوکے، اوکے" سب نے شور مچایا۔

"ریسوں میں کبھی اسکورز بھی انعام میں ملے ہیں؟" صفیہ بولی "ابا بالکل نہیں مانیں گے"

"کیسے نہیں مانیں گے" عارف بولا "جب وہ کالج میں پڑھتے تھے تو اسکورز کہاں ہوتے تھے؟"

"صرف کتابیں ہوتی تھیں" اماں نے دل لگی کی۔

سب ایک بار پھر زور سے ہنسے۔

عارف کی اماں! تمہاری بد ذوقی ترقی کرکے ادھر جا رہی ہے۔

"اور اگر کسی نے انھیں بتا دیا کہ یہ ٹوئسٹ ناچنے کا انعام ہے؟" صفیہ پر اکٹھی بہت سی نظریں ٹوٹ پڑی تھیں ———

"تو کیا؟" عارف بولا "کہہ دیں گے کہ ہاں ناچے ہیں۔"

"خبردار کوئی ..." عارف کی اماں سنجیدہ ہو گئیں۔ "ایسا مت کہنا۔"

صفیہ نے اماں کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔

"مگر انھیں کیسے یقین دلائیں گے کہ آج کے زمانے میں ناچنا کوئی بری بات نہیں ہے؟"

عارف نے فوراً جواب دیا:

"سر سید نے مسلمانوں کو کیسے یقین دلا دیا تھا کہ انگریزی پڑھنا کوئی بری بات نہیں ہے؟"

سب خاموش ہو گئے۔ بحث ختم ہو گئی

رانا صاحب۔ سنیے تو۔ ایک بات سنیے۔ ارے آپ کہاں جا رہے ہیں؟

رانا صاحب برآمدے کی دیوار کے پاس جا کر رک گئے۔ اور بولے،

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! گرلز اینڈ بوائز! یور اٹینشن پلیز — میں پہلے سے خبردار کیے دیتا ہوں کہ ہمارے پروگرام کی آخری آئٹم پر اگر کسی نے چیخ ماردی تو اس سے ایک گھنٹہ تک گانا سنا جائے گا۔ ریڈی؟"

"یس۔ ریڈی" پُرشوق آوازیں آئیں۔

اور رانا صاحب نے کٹ کٹ کی آواز سے بجلی کے پانچ چھ بٹن دبا کر برآمدے کو بقعۂ نور بنا دیا۔

چودھری صاحب ہڑبڑا کر اٹھے جیسے کسی کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔

"رانا صاحب۔ یہ۔ یہ۔ رانا صاحب، یہ۔۔۔" چودھری صاحب ہکلانے لگے۔

دس بارہ ڈیڈیز نے چودھری صاحب کے گرد جمع ہو کر ایک تال پر تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

صفیہ اور عارف میں زندگی کی صرف اتنی سی رمق باقی رہ گئی تھی کہ وہ سانس لے رہے تھے

ان کی اماں یوں منجمد کھڑی تھیں جیسے رانا صاحب کپڑے کی کسی دکان سے سیلولائیڈ کی ڈمی اٹھا لائے ہیں۔

"چودھری صاحب۔" رانا صاحب نے چودھری صاحب کے کندھے پر کچھ ایسے انداز سے ہاتھ رکھا جیسے وہ مذاق میں ایک چہیتی عورت کو چھیڑ رہے ہیں۔ "میں آپ کو صفیہ اور عارف کی الیشیئن چیمپئن شپ کی مبارکباد دیتا ہوں۔"

چودھری صاحب ایک لمحے کے لیے لکڑی کے بن گئے۔ پھر پسینہ انھیں اپنے پیٹ اور پیٹھ پر کنکھجوروں کی صورت رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ ان کی آنکھوں میں پاگلوں کی آنکھوں کی سی چمک پیدا ہوئی۔ یکایک انھوں نے یوں چونک کر دیکھا جیسے صبح ہو گئی ہے اور وہ دیر تک سوتے رہے ہیں۔ انھوں نے پلٹ کر ایک قدم اٹھایا تو رانا صاحب ان کے سامنے آ گئے۔

"آپ اس طرح نہیں جا سکتے۔ پہلے صفیہ اور عارف کو مبارکباد دیجیے۔ پھر بے شک چلے جائیے گا۔"

چودھری صاحب نے جو قدم اٹھایا تھا وہ پیچھے لیا اور بیٹے کے بالکل سامنے آ گئے۔ ان کے ہونٹ ذرا سے کانپے۔ مگر اس کپکپی کو انھوں نے بے انتہا مشقت کے ساتھ جمع کی ہوئی مسکراہٹ میں چھپا لیا اور سب کی توقع سے کہیں زیادہ بلند آواز میں بولے۔

"سبحان اللہ!۔۔۔۔"

اور جب پُرزور تالیاں رکیں تو رانا صاحب بولے:

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین، گرلز اینڈ بوائز! سبحان اللہ، اردو کا ونڈرفل ورڈ ہے۔"

ندیم

کپاس کا پھول

مائی تاجو ہر رات ایک دو گھنٹے تو ضرور سو لیتی تھی۔ لیکن اس رات غصے نے اُسے اتنا سا بھی سونے کی مہلت نہ دی۔ پو پھٹے جب وہ کھاٹ پر سے اُتر کر پانی پینے کے لیے گھڑے کی طرف جانے لگی تو دوسرے ہی قدم پر اسے چکر آ گیا تھا اور وہ گر پڑی تھی۔ گرتے ہوئے اس کا سر کھاٹ کے پائے سے ٹکرا گیا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

یہ بڑا عجیب منظر تھا۔ رات کے اندھیرے میں صبح ہولے ہولے گھل رہی تھی۔ چڑیاں ایک دوسرے کو رات کے خواب سنانے لگی تھیں۔ بعض پرندے پر ہلائے بغیر فضا میں یوں تیر رہے تھے جیسے مصنوعی ہیں اور کوک ختم ہو گی تو گر پڑیں گے۔ ہوا بہت نرم تھی اور اس میں ہلکی ہلکی لطیف سی خنکی تھی۔ مسجد میں وارث علی اذان دے رہا تھا۔ یہ وہی وارث علی کی اذان تھی جس کے بارے میں ایک سکھ ستمگر نے یہ کہہ کر پورے گاؤں کو ہنسا دیا تھا کہ اگر میں نے وارث علی کی تین چار اذانیں اور سن لیں تو واہگورو کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میرے مسلمان ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اذان کی آواز پر گھروں میں گھمر گھمر چلتی ہوئی مدھانیاں روک لی گئی تھیں۔ چاروں طرف صرف اذان حکمران تھی اور اس ماحول میں مائی تاجو اپنی کھاٹ کے پاس ڈھیر پڑی تھی۔ اس کی کنپٹی کے پاس اس کے سفید بال اپنے ہی خون سے لال ہو رہے تھے۔

مگر یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ مائی تاجو کو تو جیسے بے ہوش ہونے کی عادت تھی۔ ہر آٹھویں دسویں روز وہ صبح کو کھاٹ سے اٹھتے ہی بے ہوش ہو جاتی تھی۔ ایک بار تو وہ صبح سے دوپہر تک بے ہوش پڑی رہی تھی اور چند چیونٹیاں بھی اسے مردہ سمجھ کر اس پر چڑھ آئی تھیں اور اس کی جھریوں میں بھٹکنے لگی تھیں۔ تب پڑوس سے چودھری فتح دین کی بیٹی راحتاں پنجوں کے بل کھڑی ہو کر دیوار پر سے جھانکی تھی اور پوچھا تھا "مائی! آج لسی نہیں لو گی کیا؟" پھر اس کی نظر بے ہوش مائی پر پڑی تھی اور اس کی چیخ سن کر اس کا باپ اور بھائی دیوار پھاند کر آئے تھے اور مائی کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اور اس کے منہ میں شکر ڈال ڈال کر خاصی دیر کے بعد اسے ہوش میں لائے تھے۔ حکیم منور علی کی تشخیص یہ تھی کہ مائی خالی پیٹ سوتی ہے۔

اس دن سے راحتاں کا معمول ہو گیا تھا کہ وہ شام کو ایک روٹی پر دال ترکاری رکھ کر لاتی اور جب تک مائی

کھانے سے فارغ نہ ہو جاتی، وہیں بیٹھی مائی کی باتیں سنتی رہتی۔ ایک دن مائی نے کہا تھا "میں تو ہر وقت تیار رہتی ہوں۔ بیٹی کہ جانے کب اوپر سے بلاوا آجائے۔ جس دن میں صبح کو تمھارے گھر لسی لینے نہ آئی تو سمجھ لینا میں چلی گئی۔ تب تم آنا اور ادھر وہ چارپائی تلے صندوق رکھا ہے نا، اس میں سے میرا کفن نکال لینا۔ کبھی دکھاؤں گی تمھیں۔ وارث علی سے کہہ کر مولوی عبدالمجید سے اس پر خاک پاک سے کلمۂ شہادت بھی لکھوا لیا تھا۔ ڈرتی ہوں اسے بار بار نکالوں گی تو کہیں خاک پاک جھڑ ہی نہ جائے۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ وہ لٹھا ہے جس سے بادشاہ زادیاں برقعے سلاتی ہوں گی۔ کپاس کے خاص پھولوں کی روئی سے تیار ہوتا ہے یہ کپڑا۔ ٹین کے پترے کی طرح کھڑ کھڑ بولتا ہے۔ چکی پیس پیس کر کمایا ہے۔ میں لوگوں کو عمر بھر آٹا دیتی رہی ہوں اور ان سے کفن لیتی رہی ہوں۔ کیوں بیٹی یہ کوئی گھاٹے کا سودا تھا؟ نہیں تھا نا؟ میں ڈرتی تھی کہ کہیں کھدر کا کفن پہن کر جاؤں تو لوگ جنت میں بھی مجھ سے چکی ہی نہ پسوانے لگیں" پھر اپنے پوپلے منہ سے مسکرا کر اس نے پوچھا تھا "تمھیں دکھاؤں؟"

"نا مائی" راحتاں نے ڈر کر کہا تھا "خاک پاک جھڑ گئی تو؟" پھر اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ "ابھی تو تم بیس سال اور جیو گی۔ تمھارے ماتھے پر تو پانچ لکیریں ہیں پانچ بیسیاں لو!"

مائی کا ہاتھ فوراً اپنے ماتھے کی طرف اٹھ گیا "ہائے پانچ کہاں ہیں بیٹی۔ کل چار ہیں۔ پانچویں تو یہاں سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ تو چھری کی نوک سے دونوں ٹکڑوں کو ملا دے تو شاید ذرا سا اور جی لوں۔ تیرے گھر کی لسی تھوڑی سی اور پی لوں" مائی کے پوپلے منہ پر ایک بار پھر گول سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

اس پر راحتاں نے زور سے ہنس کر آس پاس پھیلی ہوئی کفن اور کافور کی بو سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی مگر کفن اور جنازے سے مفر نہ تھا۔ یہی تو مائی کے محبوب موضوع تھے۔

ویسے راحتاں کو مائی تاجو سے انس ہی اس لیے تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے مرنے ہی کی باتیں کرتی تھی جیسے مرنا ہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اور جب راحتاں نے ایک بار مذاق مذاق میں مائی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد وہ اسے یہی کفن پہنا کر اپنے باپ کی منت کرے گی کہ مائی کا بڑا ہی شان دار جنازہ نکالا جائے، تو مائی اتنی خوش ہوئی تھی کہ جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہے۔ راحتاں سوچتی تھی کہ یہ کیسی بدنصیب ہے جس کا پوری دنیا میں کوئی بھی اپنا نہیں ہے۔ اور جب یہ مری تو کسی آنکھ سے ایک بھی تو آنسو نہیں ٹپکے گا۔ بعض موتیں کتنی آباد اور بعض کتنی ویران ہوتی ہیں۔ خود راحتاں کا ننھا بھائی کنویں میں گر کر مر گیا تھا تو کیا شان دار ماتم ہوا تھا! کئی دن تک بین ہوتے رہے تھے۔ اور گھر سے باہر چوپال پر دور دور سے فاتحہ خوانی کے لیے آنے والوں کے ٹھٹ لگے رہے تھے اور پھر انہی دنوں کریمے نائی کا بچہ نمونیے سے مرا تو بس اتنا ہوا کہ اس روز کریمے کے گھر کا چولہا ٹھنڈا رہا۔ اور تیسرے ہی روز وہ چوپال پر بیٹھ چودھری فتح دین کا خط بنا رہا تھا۔ موت میں ایسا فرق نہیں ہونا چاہیے۔ مر کر تو سب برابر ہو جاتے ہیں۔ سب مٹی میں دفن ہوتے ہیں۔ امیروں کی قبروں کے لیے مٹی ولایت سے تو نہیں منگائی جاتی سب کے لیے یہی پاکستان کی مٹی ہوتی ہے۔

"کیوں مائی" ایک دن راحتاں نے پوچھا تھا "کیا اس دنیا میں سچ مچ تمھارا کوئی نہیں ہے؟"

"واہ، کیوں نہیں ہے!" مائی مسکرائی۔

"اچھا!" راحتاں کو بڑی حیرت ہوئی۔

"ہاں ایک ہے" مائی بولی۔

راحتاں بہت خوش ہوئی کہ مائی نے اسے ایک ایسا راز بتا دیا جس کا گاؤں کے بڑے بوڑھوں تک کو علم نہیں —

"کہاں رہتا ہے وہ؟" اس نے بڑے شوق سے پوچھا۔

"وہ؟" مائی مسکرائے جا رہی تھی "وہ یہاں بھی رہتا ہے وہاں بھی رہتا ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ایسی جگہ نہیں جہاں وہ نہ رہتا ہو۔ وہ بارڈر کے اِدھر بھی رہتا ہے بارڈر کے اُدھر بھی رہتا ہے۔ وہ تو ——"

راحتاں نے بے قرار ہو کر مائی کی بات کاٹی "ہائے ایسا کون ہے وہ؟"

اور مائی نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ "خدا ہے بیٹی، اور کون ہے!" ——

راحتاں کو اس کے باپ کے ذریعے پتہ چلا تھا کہ آج سے کوئی آدھی صدی اُدھر کی بات ہے۔ گاؤں کا ایک نوجوان پٹواری مائی تاجو کو یہاں لے آیا تھا۔ کہتے ہیں مائی تاجو ان دنوں اتنی خوبصورت تھی کہ اگر وہ بادشاہوں کا زمانہ ہوتا تو مائی ملکہ ہوتی۔ اُس کے حسن کا چرچا پھیلا تو اس گاؤں سے نکل کر پٹواری کے آبائی گاؤں تک جا پہنچا۔ جہاں سے اس کی پہلی بیوی اپنے دو بچوں کے ساتھ یہاں آدھمکی۔ پٹواری نے مائی تاجو کو دھوکا دیا تھا کہ وہ کنوارا ہے۔ تاجو نے اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف رو پیٹ کر اور نہر میں کود جانے کی دھمکی دے کر شادی کی تھی۔ اوپر سے پہلی بیوی نے جب اپنا سینہ دوہتڑوں سے پیٹنا شروع کیا اور ہر دوہتڑ پر تاجو کو ایک گندی لبانڈی گالی تھما دی تو تاجو چپکا چور ہو کر یہاں سے بھاگی اور اپنے گاؤں میں جا کر دم لیا۔ ماں نے تو اسے لپٹا لیا مگر باپ آیا تو اسے بازو سے پکڑ کر باہر صحن میں لے گیا اور بولا۔

"چاہے پٹواری کی تین بیویاں اور ہوں، تجھے اسی کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ تم نے اپنی مرضی کی شادی کی ہے۔ ہمارے لیے یہی بے عزتی بہت ہے، اب یہاں بیٹھنا ہے تو طلاق لے کر آؤ ورنہ وہیں رہو چاہے نوکرانی بن کر رہو۔ ہمارے لیے تو تم اسی دن مر گئی تھیں جب تم نے پوری برادری کی عورتوں کے سامنے چھوکروں کی طرح اکڑ کر کہہ دیا تھا کہ شادی کروں گی تو پٹواری سے کروں گی ورنہ کنواری مروں گی۔ جاؤ ہم یہی سمجھیں گے کہ ہمارے ہاں کوئی اولاد ہی نہیں تھی۔"

اس کی ماں روتی پیٹتی رہی مگر باپ نے ایک نہ مانی اور جب تاجو آدھی رات کو واپس اس گاؤں میں پہنچ کر پٹواری کے دروازے پر آئی تو اس میں تالا پڑا ہوا تھا۔ رات وہیں دروازے سے لگی بیٹھی رہی۔ صبح لوگوں نے اسے دیکھا تو پنچایت سے فیصلہ کیا کہ تاجو پٹواری کی باقاعدہ منکوحہ ہے اس لیے اس کا پٹواری کے گھر پر حق ہے اور اس لیے تالا توڑ دو۔

گاؤں والوں نے چند روز تک تو پٹواری کا انتظار کیا مگر اس کی جگہ ایک نیا پٹواری آ نکلا۔ معلوم ہوا کہ اس نے کسی اور گاؤں میں تبادلہ کرا لیا ہے۔ گاؤں کے دو آدمی اسے ڈھونڈنے نکلے۔ اور جب وہ مل گیا تو پٹواری نے انھیں بتایا کہ اس نے ان کے گاؤں کا رخ کیا تو اس کی پہلی بیوی کے چھ فٹے بھائی اسے قتل کر دیں گے۔ "میں نے یہ بات اپنی پہلی بیوی کو بھی نہیں بتائی کہ میں تمھارے گاؤں کے جس مکان میں رہتا تھا وہ میں نے خرید لیا تھا اور وہ میری ملکیت ہے۔ یہ مکان میں اپنی دوسری بیوی تاجو کے نام لکھے دیتا ہوں۔ میں اسے طلاق نہیں دوں گا۔ مجھے اس سے محبت ہے" یہ

کہہ کر وہ رونے لگا تھا۔

سوگا دیں والوں کی مہربانی سے پٹواری نے اسے طلاق کے بدلے مکان دے دیا۔ اور وہ بھی صبر شکر کر کے بیٹھ گئی کیونکہ اس کے پیٹ میں بچہ تھا۔ یہ بچہ جب پیدا ہوا تو اس کا نام اس نے حسن دین رکھا۔ محنت مزدوری کر کے اسے پالتی پوستی رہی مڈل تک پڑھایا بھی مگر اس کے بعد ہمت نہ رہی۔ تاجو کے حسن کی وجہ سے اس پر ترس تو سب کو آتا تھا مگر پٹواری سے جدا ہونے کے بعد وہ اپنی جوانی پر سانپ بن کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک بھلے آدمی نے حسن دین کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا لالچ دے کر تاجو سے عقد کرنے کی خواہش ظاہر کی تو تاجو نے اس کی سات پشتوں کو تو ڈالا اور حسن دین کلہاڑی لے کر اس خدا ترس کے پیچھے پڑ گیا۔ اس کے بعد کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ ہی نہ ہوا۔ حسن دین چند برس آوارہ پھرتا رہا ——— پھر جب اس کے عشق کرنے کا زمانہ آیا تو وہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس کے بعد مائی تاجو کے چند برس اچھے گزرے۔ حسن دین حوالداری تک پہنچا۔ اس کے رشتے کی بھی بات ہو گئی۔ مگر پھر دوسری بڑی جنگ چھڑ گئی اور حسن دین ادھر بن غازی میں مارا گیا۔ تب مائی تاجو نے چکی پیسی شروع کی۔ اور اس وقت تک پیستی رہی جب وہ ایک دن چکی کے پاٹ پر سر رکھے بے ہوش پائی گئی۔ اس روز جب وہ ہوش میں آئی تھی تو حکیم کے ہاتھ کو چکی کی ہتھی سمجھ کر گھما دیا تھا۔

اگر اس کے پڑوس میں چودھری فتح دین کی بیٹی راحتاں نہ ہوتی تو وہ اپنی بار بار کی بے ہوشیوں میں سے کسی بے ہوشی کے دوران کوچ کر جاتی۔ وہ راحتاں سے کہا کرتی تھی کہ ”بیٹی اگر میرا حسن دین ہوتا تو میں تجھے تیری شادی پر سونے کا ست لڑا ہار دیتی۔ اسے خدا نے اپنے پاس بلا لیا۔ سو اب میں ہر وقت تیرے لیے دعا کرتی ہوں کہ تو جُگ جُگ جیے اور شادی کے بعد بھی اسی طرح سکھی رہے جیسی اپنے باپ کے گھر سکھی ہے۔“

اس رات مائی تاجو کو اس بات کا غصہ تھا کہ جب اندھیری شام تک راحتاں اس کی روزانہ کی روٹی نہ لائی تو وہ خود ہی لاٹھی ٹیکتی فتح دین کے گھر چلی گئی۔ فتح دین کی بیوی سے راحتاں کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی سہیلی کی شادی میں گئی ہے اور آدھی رات تک واپس آئے گی۔ پھر اس نے روٹی مانگی تو راحتاں کی ماں نے صرف اتنا کہا ”دیتی ہوں۔ پہلے گھر والے تو کھا لیں۔“

راحتاں کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو فتح دین کے گھر والوں ہی میں شامل سمجھتی تھی۔ اس لیے ضبط نہ کر سکی۔ بولی ”تو بی بی کیا میں بھکارن ہوں؟“

سونے کی بالیوں سے بھرے ہوئے کانوں والی بی بی کو بھی مائی تاجو کی سی مسکین عورت کے منہ سے یہ بات سن کر تکلیف ہوئی۔ اس نے کہا ”نہیں مائی، بھکارن تو خیر نہیں ہو، مگر محتاج تو ہو نا۔“

اور مائی کو کپکپی سی چھوٹ گئی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔ ایک دو بار راحتاں کی ماں نے اسے بلایا بھی مگر اس کے کانوں میں تو شاں شاں ہو رہی تھی۔ گھر آ کر آنگن میں پڑی ہوئی کھاٹ پر گر پڑی اور روتی رہی۔ اور اپنی موت کو یوں پکارتی رہی جیسے وہ دیوار سے ادھر بیٹھی ہوئی اس کی باتیں سن رہی ہے۔

آدھی رات کو جب چاند زرد پڑ گیا تھا۔ دیوار پر سے راحتاں نے اسے پکا

"مائی، جاگ رہی ہو؟"

"میں سوتی کب ہوں بیٹی" اس نے کہا۔

"اِدھر آ کر روٹی لے لو دیوار پر سے" راحتاں بولی۔

"نہیں بیٹی۔ اب نہیں لوں گی" مائی کی آواز بھرانے لگی "آدمی زندہ رہنے کے لیے کھاتا ہے نا۔ تو میں کب تک زندہ رہوں گی۔ جب کہ میں جدھر جاتی ہوں میری قبر میرے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ میں کیوں تمھارا اناج ضائع کروں بیٹی!"

راحتاں دیوار کے پاس کچھ دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ پھر پنجوں کے بل ہو کر بڑی منت سے کہا۔ "لے لو مائی۔ میرے خاطر سے لے لو"

"نہیں بیٹی۔" مائی اب کھل کر رو رہی تھی "۔۔۔ سے لیتی پر آج تمھاری ماں نے مجھے بتایا ہے کہ میں محتاج ہوں۔ اور چکی پیس پیس کر میرے ہاتھوں پر جو گٹے پڑ گئے ہیں وہ مجھے کچھ اور بتاتے ہیں۔ سو بیٹی یہ روٹی نہیں لوں گی۔ اب کبھی نہیں لوں گی۔ تمھاری لائی ہوئی کل شام والی روٹی میری آخری روٹی تھی۔ یہ روٹی اپنے کتے کے آگے ڈال دو۔"

اس کے بعد اس نے سنا کہ راحتاں اور اس کی ماں کے درمیان کچھ تیز تیز باتیں ہوئیں۔ پھر راحتاں رونے لگی اور ماں اسے ڈانٹنے لگی۔ اس کے بعد فتح دین کی آواز آئی۔

"سونے دو گی یا میں چوپال پر جا کر پڑ رہوں۔؟"

پھر جب سب خاموش ہو گئے تو مائی تاجو اٹھ بیٹھی۔ اسے لگا کہ راحتاں اپنے بستر پر پڑی آنسو بہا رہی ہے وہ دیوار تک گئی بھی، مگر فتح دین کے ڈر سے پلٹ آئی۔ گھڑے میں سے پانی پیا اور دیر تک ایلومینیم کا کٹورا اپنے چہرے پر پھیرتی رہی۔ آج وہ کتنی تپ رہی تھی اور یہ پیالہ کتنا ٹھنڈا تھا۔ اب گرمیاں ختم سمجھو۔ اسے اپنے لحاف کا خیال آیا، جس کی روئی لکڑی کی طرح سخت ہو گئی تھی۔ اب کے اسے دھنکواؤں گی۔ پر اللہ کرے دھنکوانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اللہ کرے اب کے لحاف کی بجائے میں اپنا کفن اوڑھوں ——!

وہ گھڑے کے پاس سے اٹھ کر چارپائی پر آ گئی۔ کچھ دیر تک پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ پھر اسے ایک لمبی سانس سنائی دی۔ یہ راحتاں کی سانس ہو گی —— ہائے خدا کرے وہ سدا سکھی رہے۔ ایسی پیاری بچی اس نک چڑھی کے ہاں کیسے پیدا ہو گئی! اسے تو میرے ہاں پیدا ہونا چاہیے تھا —— اسے اپنا حسن دین یاد آ گیا اور وہ رونے لگی۔ پھر آنسو پونچھ کر لیٹی تو آسمان پر سے ستارے جیسے نیچے لٹک آئے اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہلنے لگے۔ فتح دین کا کتا غرّا کر ایک بلی پر جھپٹا اور بلی دیوار پر سے پھاند کر اس کے سامنے سے گولی کی طرح نکل گئی۔ کسی گھر میں مرغے نے بانگ دی اور پھر بانگوں کا مقابلہ شروع ہو گیا ——

یکایک سب مرغے ایک دم یوں خاموش ہو گئے جیسے ان کے گلے ایک ساتھ گھونٹ دیے گئے ہیں۔ پورے گاؤں کے کتے بھونکنے لگے۔ پھر مشرق کی طرف سے ایسی آوازیں آئیں جیسے قریب قریب ہر رات آتی تھیں۔ بارڈر پر رینجر اسمگلروں کے تعاقب میں ہوں گے۔ پھر اس پر غنودگی سی چھانے لگی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر ایک دم کھول دیں —— بڑی آئی وہاں سے مجھے محتاج کہنے والی۔ چکی پیستے پیستے ہاتھوں کی جلد ہڈی بن گئی ہے اور مجھے محتاج کہتی ہے! قیامت کے دن خدا سے کہوں گی

کہ اسے پکڑ دا اس نے مجھ پر بہتان باندھا ہے ـــــ مگر وہاں کہیں یہ میری راحتاں بیچ میں نہ بول پڑے۔

اُٹھ کر اس نے پانی پیا اور واپس جا کر چارپائی پر پڑ رہی۔ پھر جب پو پھٹی تو اس کا حلق اس کے جوتے کے چمڑے کی طرح خشک ہو رہا تھا۔ وہ پھر پانی پینے کے لیے اٹھی مگر دوسرے ہی قدم پر چکرا کر گر پڑی۔ سر کھاٹ کے پائے سے ٹکرایا اور بے ہوش ہو گئی ـــ

جب مائی تاجو ہوش میں آئی تو اسے پہلا احساس یہ ہوا کہ نماز قضا ہو گئی ہے۔ پھر ایک دم وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور دیوار کی طرف بھاگی۔ ہر طرف گولیاں چل رہی تھیں اور عورتیں چیخ رہی تھیں اور بچے بلبلا رہے تھے اور دھوپ میں جیسے سوراخ ہو گئے تھے جن میں سے دھواں داخل ہو رہا تھا۔ دور سے گڑگڑاہٹ اور دھماکوں کی مسلسل آوازیں آ رہی تھیں اور گلی میں سے لوگ بھاگتے ہوئے گزر رہے تھے۔

"راحتاں! ـــ اے بیٹی راحتاں!!" وہ پکاری۔

راحتاں اندر کوٹھے سے نکلی۔ اس کا چہرہ زنگ مٹی ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس کی آواز میں چیخیں، آنسو اور کپکپی اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ "جلدی سے نکل جاؤ مائی۔ گاؤں میں سے نکل جاؤ۔ لاہور کی طرف بھاگو۔ ہم بھی لاہور جا رہے ہیں۔ تم بھی لاہور چلو۔ ہندوستان کی فوج آ گئی ہے" یہ کہہ کر وہ پھر اندر بھاگ گئی۔

ہندوستان کی فوج آ گئی ہے! یہاں ہمارے گاؤں میں کیوں آ گئی ہے؟ سرحد تو تین میل ادھر ہے!

"یہ فوج یہاں کیوں آئی ہے بیٹی؟" مائی حیران ہو کر پکاری۔ "کہیں غلطی سے تو نہیں آ گئی؟ بھائی فتح دین کہاں ہے؟ اسے بھیجو نا۔ وہ انہیں سمجھائے کہ یہ پاکستان ہے"

مگر راحتاں کا کوئی جواب نہ آیا۔ شور بڑھ رہا تھا۔ مشرق کی طرف کوئی گھر جلنے بھی لگا تھا۔ چند گولیاں اس کے کوٹھے کے دروازے کے اوپر والے حصے پر تڑاخ تڑاخ سے لگیں اور مٹی کی لپائی کے بڑے بڑے ٹکڑے زمین پر آ رہے۔ چند گولیاں ہوا کو چیر دینے والی سیٹیاں بجاتی چھت پر سے گزر گئیں۔ فتح دین کے صحن کی ٹاہلی پر سے پاگلوں کی طرح اڑتا ہوا ایک کوا اچانک ہوا میں لڑھکنیاں کھاتا ہوا آیا اور مائی تاجو کے گھڑے کے پاس پتھر کی طرح گر پڑا۔

پھر دور کا ایک دھماکا ہوا اور مائی جو دیوار سے ہٹ آئی تھی، چولہے کی طرف بڑھی۔ ایک دم چوہدری فتح دین کے دروازے کو کسی نے کوٹ ڈالا۔ پھر کواڑ دھڑام سے گرے۔ اکٹھی بہت سی گولیاں چلیں اور اکٹھی بہت سی چیخیں بلند ہوئیں۔ مائی نے ان میں سے راحتاں کی چیخ کو صاف پہچان لیا۔ "راحتاں بیٹی!" وہ چلائی۔ لاٹھی ٹیکتی ہوئی لپکی اور اپنے دروازے کی کنڈی کھول کر باہر گلی میں آ گئی۔

گلی میں شہاب دین، نور الٰہی، محمد بشیر، حمید خاں اور جانے کس کس کی لاشیں پڑی تھیں۔ چودھری فتح دین کے گرے ہوئے دروازے کے پاس مولوی عبدالمجید مردہ پڑے تھے۔ ان کا آدھا چہرہ اڑ گیا تھا۔ مائی نے مولوی صاحب کو ان کی نورانی داڑھی سے پہچانا۔

چودھری فتح دین کے صحن میں خود فتح دین اور اس کے بیٹے مرے پڑے تھے۔ فتح دین کی بیوی کے بالیوں بھرے

کان غائب تھے۔ مدرکوتھوں میں اٹھ پٹخ مچی ہوئی تھی اور باہر راحتاں۔ بہت سے لوجیوں میں گھری اپنی عمر سے چودہ پندرہ سال چھوٹے بچوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ پھر ایک سپاہی نے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر جھٹکا دیا تو کرتا پھٹ گیا اور وہ ننگی ہوگئی۔ فوراً ہی وہ گٹھڑی سی بن کر بیٹھ گئی۔ مگر پھر ایک سپاہی نے اس کے کرتے کا باقی حصہ بھی نوچ لیا اور قہقہے لگاتا ہوا اس سے اپنے جوتے پونچھنے لگا۔ پھر مائی تاجو آئی۔ راحتاں پر گر پڑی اور اسے آسمان کی طرح ڈھانپ لیا۔ وہ ایک عجیب سی آواز میں، جو اس کی اپنی نہ تھی، بولی: "اللہ تیرا پردہ رکھے بیٹی، اللہ تیری حیا قائم رکھے۔"

ایک سپاہی نے مائی کا سفید چونڈا پکڑ کر اسے راحتاں پر سے کھینچنا چاہا تو خون سے اس کا ہاتھ بھیگ گیا۔ اور مائی وہیں راحتاں کو ڈھانپے ہوئے بولی۔ "یہ لڑکی تم میں سے کسی کی بہن بیٹی ہوتی تو کیا تم جب بھی اس کے ساتھ یہی کرتے؟ ——— یہ لڑکی تو ———"

کسی نے یہ کہہ کر مائی تاجو کی پسلیوں میں زور کی ٹھوکر مار دی کہ "ہٹو یہاں سے ہمیں دیر ہو رہی ہے اور ابھی دوپہر تک ہمیں لاہور بھی پہنچنا ہے ———" اور مائی یوں ایک طرف لڑھک گئی۔ جیسے چیتھڑوں سے بنی ہوئی گڑیا تھی۔ پھر سب کے ہاتھ راحتاں کی طرف بڑھے۔ جو اب چیخ نہیں رہی تھی۔ اب وہ ننگی کھڑی تھی اور یوں کھڑی تھی جیسے کپڑے پہنے کھڑی ہے۔ اس کا رنگ مائی تاجو کے کفن کے لٹھے کا سا ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں اتنی پھیل گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا ان میں پتلیاں کبھی تھیں ہی نہیں۔

مائی تاجو ہوش میں آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کے پاس وارث علی مؤذن کھڑا ہے۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا تو گاؤں کے چہرے ڈھنپے ہوئے تھے۔ "راحتاں کہاں ہے؟" وہ یوں چیخ کر بولی جیسے اس کے جسم کی رگیں ٹوٹ گئی ہیں۔ وارث علی سر جھکائے ایک طرف جانے لگا۔ "میری راحتاں بیٹی کہاں ہے؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور وارث علی کی طرف یوں قدم اٹھایا جیسے اسے قتل کرنے چلی ہے۔ "کہاں ہے وہ؟"

وارث علی کے پاس آکر وہ جیسے سُن ہو کر رہ گئی۔ وارث علی کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا اور اس کے ایک بازو سے اس کا گوشت ایک طرف کٹ کر لٹک رہا تھا۔ وہ بولا تو مائی تاجو نے دیکھ کر اس کے ہونٹ بھی کٹے ہوئے ہیں اور اس کے منہ میں بھی خون ہے۔

"کسی کو کچھ پتہ نہیں مائی کہ کون کہاں گیا۔ بس اب تو یہاں سے چلی جا۔ ہندوستانی فوج یہاں سے آگے نکل گئی ہے اور گاؤں کے گرد ان کے آدمی گھیرا ڈالے بیٹھے ہیں۔ تو کماد کے کھیتوں میں چھپتی چھپاتی لاہور کی طرف چلی جا۔ تو پہنچ جائے، وہاں مرے گی تو کوئی تیرا جنازہ تو پڑھے گا۔ اب جا مجھے کام کرنے دے۔"

"دیکھ بیٹا" مائی بولی "میں پانی لاتی ہوں۔ تو ذرا کلی کرلے۔ تو مؤذن ہے اور منہ میں اتنا بہت سا خون لیے کھڑا ہے! خون تو حرام ہوتا ہے بیٹا۔"

"میں سب کرلوں گا" وارث علی چلایا مگر پھر ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے بولا "خدا کے لیے مائی، اب چلی جا یہاں سے۔ میں نے اتنے بہت سے لوگ مرتے دیکھے ہیں کہ اب تو مرے گی تو میں سمجھوں گا پوری دنیا مرگئی۔ چلی جا خدا کے لیے!"

"پہلے بتا میری راحتاں بیٹی کدھر گئی"۔ مائی نے ضد کی۔

وارث علی نے پوچھا۔ "تجھے یاد ہے نا اسے ننگا کر دیا گیا تھا؟"

"ہاں"۔ مائی نے سر ہلایا۔ اور اس کی ایک خون آلود لٹ رسی کی طرح اس کے منہ پر لٹک آئی۔

"تو پھر تو یہ کیوں پوچھتی ہے کہ وہ کدھر گئی"۔

اور مائی نے اپنے سینے پر اس زور کا دوہتڑ مارا جیسے چودھری فتح دین کی حویلی کا دروازہ ٹوٹا ہے۔ وہ دھب سے بیٹھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔

وارث علی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کسی نے سن لیا تو آجائے گا"۔ وہ بولا۔ پھر اسے بڑی مشکل سے کھینچ کر اٹھایا۔ "تو میری حالت دیکھ رہی ہے مائی میں صرف اپنے خدا کی قدرت اور اپنے ایمان کی طاقت سے زندہ ہوں ورنہ میرے اندر کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ میں گلیوں میں سے لاشیں گھسیٹ گھسیٹ کر ایک گڑھے میں جمع کر رہا ہوں۔ ابھی مجھے فتح دین اور لال دین اور نورالدین اور ماسی جنت کی لاشیں وہاں پہنچانی ہیں۔ پھر میں ان پر مٹی ڈال کر ان کا جنازہ پڑھوں گا۔ اور مر جاؤں گا۔ مائی بے جنازہ نہ مر۔ لاہور چلی جا ـــ ہندوستانی فوج ادھر سے گئی ہے تو ادھر سے کھیتوں میں چھپتی چھپاتی نکل جا۔ میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ دیکھ تو میرے تو جوتے بھی خون سے بھر گئے ہیں"۔

لوٹتے ہوئے دروازے پر سے گزرتے ہوئے وہ رک گئی۔ "وارث بیٹے"۔ وہ بولی۔ "لاہور تو چلا جا۔ جنازہ میں پڑھ دوں گی۔ میں بچ گئی تو یونہی کسی کو روز ایک روٹی حرام کرنی پڑے گی تو مر گیا تو تیرے ساتھ تیری اذان بھی مر جائے گی"۔

"نہیں مائی"۔ وارث علی جلدی سے بولا۔ "اذان بھی کبھی مری ہے۔ خدا کے لیے اب تو چلی جا"۔

گلی میں قدم رکھتے ہوئے اس نے پلٹ کر پوچھا۔ "تیرا کیا خیال ہے بیٹا، راحتاں کو انھوں نے مار تو نہیں ڈالا ہوگا ـــ؟"

وارث علی نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا دی اور چودھری فتح دین کی لاش پر جھک گیا۔

مائی تاجو گلی میں سے گزر رہی تھی اس نے ایک ہاتھ میں لاٹھی تھام رکھی تھی۔ دوسرا ہاتھ پیٹھ پر تھا اور وہ یوں جھکی ہوئی چل رہی تھی جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی ڈھونڈنے نکلی ہے۔

مائی تاجو گاؤں کی آخری گلی میں سے نکل کر کھیت میں قدم رکھنے لگی تھی کہ جیسے ہر طرف سے گولیاں چلنے لگیں اور وہ ایک کھالے میں لڑھک کر لیٹ گئی۔ ہائے کہیں وہ وارث علی کو نہ مار رہے ہوں! مگر کیا ایک آدمی کو مارنے کے لیے اتنی بہت سی گولیوں کی ضرورت ہوتی ہے! کھالے میں سے اس نے کھیت کے کئی گنے گولیوں کی زد میں ٹوٹتے ہوئے دیکھے۔ اس نے یہ نکتہ دیکھا کہ جہاں سے گنا ٹوٹتا ہے وہاں سے رس کی ایک دھار نکل کر جڑ کی طرف بہنے لگتی ہے ـــ اور اسے راحتاں یاد آگئی۔ اور وہ کھالے میں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک گولا اس کے سر کے پاس سے گزر کر پیچھے ایک درخت کے تنے میں جا لگا اور پورا درخت جیسے جھرجھری لے کر رہ گیا۔ وہ پھر کھالے میں لیٹ گئی اور اسے ایسا لگا کہ وہ مر گئی ہے اور قبر میں پڑی ہے۔ تب اسے اپنا کفن یاد آیا۔ اور وہ اتنی تیزی سے کھالے میں سے نکل کر گلی میں داخل ہوئی جیسے اس کے اندر کوئی مشین چلنے لگی ہے۔ اسے پہلی بار یاد آیا کہ وہ تو خالی ہاتھ لاہور جا رہی تھی۔ وہ تو اپنی کمائی گھر ہی میں بھول آئی تھی۔ اس کا کفن تو وہیں

بکسے میں رکھ رہ گیا تھا۔ زندگی سے اتنی محبت بھی کیا کہ انسان اسے بچا نے کے لیے بھاگے تو اپنا کفن ہی بھول جائے۔ اور یہ کفن اس نے کتنی مشقت سے تیار کیا تھا۔ اور اس پر کتنے چاؤ سے کلمہ شہادت لکھوایا تھا خاک پاک سے۔ اچھے کفن اور اچھے جنازے ہی کے لیے تو وہ اب تک زندہ تھی۔

اب وہ اتنی تیزی سے چل رہی تھی کہ جوانی میں بھی یوں نہیں چلی ہو گی۔ اس کے قد کا خم بھی ایک دم ٹھیک ہو گیا تھا اور لاٹھی کو ٹیکنے کی بجائے اسے تلوار کی طرح اٹھا رکھا تھا۔ راحتاں کے گھر کے سامنے سے بھی وہ آگے نکل چلی گئی۔ مگر پھر جیسے اس کے قدم جکڑے گئے۔ پلٹی۔ لوٹے ہوئے دروازے میں سے جھانکا۔ وارث علی سب لاشیں سمیٹ لے گیا تھا۔ بس راحتاں کے کرتے کی ایک دھجی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ پورے صحن میں یہاں سے وہاں ایک بے چین روح کی طرح بھٹکتی پھرتی تھی۔

مائی تاجو کا جی چاہا کہ وہ یہیں بیٹھ کر اپنا سینہ ادھیڑ دے مگر ساتھ ہی اسے وارث علی یاد آ گیا۔ جس نے کہا تھا—— فوراً اسے اپنا کفن یاد آیا۔ اس کے کوٹھے کا دروازہ کھلا تھا۔ گھڑے کے پاس کوا اسی طرح پڑا تھا۔ اس کا کھٹولا اسی طرح بچھا تھا۔ اندر اس کا بکسا کھلا پڑا تھا مگر اس میں کفن موجود تھا۔ کیسی منہ کی کھائی ہو گی انھوں نے جب بکسا کھولا ہو گا اور اس میں سے صرف کفن نکلا ہو گا۔

مائی کفن کو سر کی چادر میں چھپا کر باہر آئی تو چودھری فتح دین کا کتا بھاگتا ہوا آیا۔ اور اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہنس نہیں سکتا ورنہ خوب ہنستا۔

"چل ہٹ" مائی نے اسے ڈانٹا "میرے نمازی کپڑے پلید نہ کر"

کتا اٹھ کھڑا ہوا۔

مائی نے دوسری گلی میں مڑتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تو کتا وہیں کھڑا تھا اور اسی طرح کھڑا تھا جیسے لکڑی کا بن کر رہ گیا ہے۔ "پچ پچ" مائی نے کتے کو اپنی طرف بلانا چاہا۔ مگر وہ پلٹا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک دیوار کے سائے میں ایک دم یوں بیٹھ گیا جیسے گر پڑا ہے "ہائے بے چارا" مائی کا احساسِ جرم پکارا۔

مگر پھر اوپر فضا میں اس زور کے دو دھماکے ہوئے کہ مائی تاجو کو زمین اپنے قدموں تلے ٹکڑے ٹکڑے ہوتی محسوس ہوئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی وہ پھر سے کھالے میں جا گری۔ اب زمین ہل رہی تھی۔ فضا میں جیسے بہت سے شیر ایک ساتھ دھاڑے جا رہے تھے اور دھماکوں اور گونجوں اور گڑگڑاہٹوں کا شور قریب آتا جا رہا تھا۔ اب وہ کفن کو اپنے سینے سے چمٹائے کھالے میں رینگنے لگی۔ برسوں پہلے چراغوں کا میلہ دیکھنے کے لیے وہ گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ اسی کھالے کے کنارے کنارے چلتی ہوئی لاہور چھاؤنی میں جا نکلی تھی۔ اور وہاں کیسا غضب ہوا تھا۔ بے چاری شہابی ایک ٹانگے کے پہیے تلے آ کر وہیں شالامار کے دروازے پر ہی مر گئی تھی۔ تو کیا راحتاں مر گئی ہو گی۔ کیا راحتاں مرنے کے لائق تھی؟ لا بیٹی! میں تیرے ہاتھ کی روٹی واپس نہیں کروں گی۔ روٹھ مت مجھ سے راحتاں۔ اے راحتاں بیٹی!

اس نے سنا کہ وہ اونچی اونچی بول رہی ہے —— مگر اتنے شور میں اس کی آواز کون سنے گا —— راحتاں —— اے میری اچھی، میری نیک، میری خوبصورت راحتاں! ——

ہائے یہ کپاس بھی عجیب پودا ہے ۔ اس کے پھول کا رنگ کیسا الگ ہوتا ہے دوسرے پھولوں سے ـــــ اے راحتاں بیٹی!ـــــ

کھالے سے کپاس کے کھیت میں اور وہاں سے وہ گنّے کے کھیت میں گھس گئی ۔ دھماکے اتنے تیز ہو رہے تھے جیسے اس کے اندر ہو رہے ہیں ۔ کہتے ہیں گولا لگے تو انسان گولے کی طرح پھٹ جاتا ہے ۔ کون چنتا پھرے گا میری ٹڈیاں اور پھر میرا کفن جس پر خاکِ پاک سے کلمۂ شہادت لکھا ہے ۔

کتنا گھنا ہے گنّے کا یہ کھیت! یہ چودھری فتح دین کا کھیت ہے ۔ راحتاں اسی کھیت کے گنّے چوس چوس کر کہتی تھی کہ مائی مجھے بڑھاپے سے صرف اس لیے ڈر لگتا ہے کہ منہ پوپلا ہو جاتا ہے اور گنّا نہیں چوسا جا سکتا ۔

مائی تاجو مسکرائی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ـــــ راحتاں بیٹی ـــــ اے میری راحتاں بیٹی! ـــــ

"مائی" آواز جیسے پاتال سے آئی تھی ۔

انسان بھی عجیب مخلوق ہے ۔ چاہے زمین اور آسمان بج رہے ہوں مگر اس کے کان بجنے سے باز نہیں آتے ۔

"مائی ـــــ!"

ہائے یہ آواز تو جیسے میری پسلی سے آئی ہے ۔

وہ کفن کو سینے سے چمٹا کر دبک گئی ۔ اس کی انگلیوں نے محسوس کیا کہ اس کا دل اس کے سینے سے نکل کر کفن میں آ گیا ہے اور یوں دھڑک رہا ہے جیسے توپیں چل رہی ہیں ۔

"مائی"! اس کے سر پر کوئی بولا ۔

مائی بڑبڑائی اور اوپر دیکھا ۔

پھر وہ دیکھتی رہ گئی ۔ کفن اس کی گرفت سے نکل کر گر گیا اور وہ دیکھتی چلی گئی ۔

"مائی!" راحتاں کہہ رہی تھی ۔ "تم تو میری طرف بس دیکھتے ہی جا رہی ہو ۔ دیکھتی نہیں ہو میں ننگی ہوں ۔ مجھے کچھ دو ۔"

مائی نے زور زور سے ہنستے ہوئے اور زور زور سے روتے ہوئے راحتاں کو یوں اپنی گود میں کھینچ لیا ۔ جیسے ننھے سے حسن دین کو دودھ پلانے چلی ہے ۔

اب دھماکے جیسے کھیتوں کی چاروں مینڈوں پر ہو رہے تھے ۔ مگر مائی ان سے بے نیاز راحتاں کا ماتھا چومے جا رہی تھی ۔ ہائے تو تو زندہ ہے میری بیٹی ۔ جبھی میں کہوں میں مرتی کیوں نہیں ۔ ہائے میں تو اب کبھی نہ مروں ۔ ہائے مجھے یہ اپنا کفن کیسا فالتو فالتو سا لگنے لگا ہے ۔"

"کفن؟" راحتاں تڑپ کر مائی کی گود میں سے نکلی ۔ کفن اٹھا کر اسے جلدی سے کھولا، اور اپنے پورے جسم پر لپیٹ کر یوں مسکرائی جیسے وہ دیوار پر سے مائی کو روٹی تھمانے آئی ہے ۔

اور مائی نے دیکھا کہ راحتاں اس کے کفن میں بڑی خوبصورت لگ رہی ہے ۔

"ہائے میری بیٹی اللہ تیرا پردہ رکھے۔ اللہ تیری حیا قایم رکھے میری بیٹی!"

پھر راحتاں نے مائی کو بتایا کہ جب دہ اسے ملنے جارہے تھے تو اوپر سے پاکستان کے ہوائی جہاز آئے اور وہ لوگ اِدھر اُدھر کھالوں اور گڑھوں میں جاڈبکے ——

"اور میں بھاگ آئی۔ مجھے پتہ تھا کہ میرے وطن کے جہاز مجھے پہچانتے ہیں، وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ تب میں گاؤں پار کرکے یہاں آگئی۔ اور جب سے یہیں بیٹھی ہوں اور جب سے میں یہاں آکر بیٹھی ہوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میری مائی مجھے پکار رہی ہے —— راحتاں —— اے راحتاں بیٹی!!"——

کفن پر جگہ جگہ خون کے دھبے نمایاں ہونے لگے تھے۔ نوچی کھسوٹی ہوئی راحتاں کا جسم اپنا لہو کفن کو منتقل کر رہا تھا۔ اور خاکِ پاک نے اس خون کے لیے جگہ خالی کر دی تھی۔

اور اب مورکے کہیں آس پاس مائی نے کہا —— "راحتاں بیٹی تو کتنی سچی ہے۔ تو نے میرا شان دار جنازہ نکالنے کا وعدہ کیا تھا۔ تو نے یہ وعدہ سچ سچ پورا کیا۔ تو میرے کفن میں کتنی پیاری لگ رہی ہے۔ میری اچھی، میری نیک، میری خوبصورت راحتاں!"

ہم سفر

ہم سفر ہیں تمہارے ہم اہلِ قلم

رئیس امروہوی

شاعرِ آگاہ

مایۂ اظہارِ حق ہے شاعری تیرے لیے
شعرا اے احمد ندیم قاسمی تیرے لیے

اللہ اللہ امتحانِ جذبۂ عرفانِ ذات
اک مسلسل کربِ پیہم زندگی تیرے لیے

فکرِ تابندہ تری شمعِ شبستانِ حیات
موجِ ظلمت ہے شعاعِ روشنی تیرے لیے

شاعرِ آگاہ! تو ہے محرمِ رازِ وجود
آگہی کے واسطے تو، آگہی تیرے لیے

شعر، افسانہ، مقالہ، نقدِ فن، شرحِ سخن
خاص ہے فکر و نظر کی تازگی تیرے لیے

تو ہے اے احمد ندیم قاسمی وہ سحر کار
شاعری جس کے لیے ہے ساحری جس کے لیے

کثرتِ افکار اور یہ جذبۂ تکمیلِ کار
اور کیا لکھتا رئیس امروہوی تیرے لیے

عدمؔ

دو فن کار

مُصوّر ایک گیا ۔ قاسمی کے ڈیرے پر
فراخ حوصلے والے ۔ سخی کے ڈیرے پر

بُلا کے صاحبِ خانہ کو عرض کی اُس نے
جو کہنے آیا تھا ۔ وہ بات یوں کہی اُس نے

میں سخت علیل ہوں ۔ اور تنگ دست و محزوں ہوں
نحیف جسم کے اندر ۔ کھِلا ہوا خوں ہوں

بلا توقف و تاخیر ۔ سُن کے یہ کلمات
بنا کے ذہن میں ۔ تصویرِ صورتِ حالات

درونِ خانہ گیا قاسمی ۔ بہ قلبِ فگار
کہ جا کے کر سکے دریافت ۔ کوئی شکلِ قرار

بڑے ادب سے کیا ۔ سَو کا نوٹ پیش اُسے
کہ کر سکے وہ رواں ۔ کام کاج سب گھر کے

مگر سوالی ۔ بڑا باوقار سائل تھا!
غریب تھا ۔ مگر اُس کی بغل میں بھی دل تھا

میں بھیک تو نہیں لینے حضور سے آیا
یہ لفظ اپنی زباں پر ۔ وہ کرب سے لایا

میں اِک ہُنر در مُشّاق ہوں ۔ مصوّر ہوں
کرشمہ سازیٔ نقش و نمو کا ۔ ماہر ہوں

ہیں میرے پاس ۔ نمونے مری بناوٹ کے
یہ دُھندلے گُوز ہیں ۔ محنت کی جگمگاہٹ کے

یہ میرے ذہن کی اولاد ۔ آپ رکھوا دیں!
اور اُس سے میرے گھرانے میں شانتی لا دیں

ملے گا جو بھی ۔ مسرّت سے ہم وہ لے لیں گے
بڑے خلوص سے ۔ جیون کی ناؤ کھے لیں گے

حساب سُن کے مصوّر کے ۔ محنتانے کا
خیال آ گیا ۔ ممتاز دولتانے کا

بڑے مصمّم ارادے سے ۔ قاسمی صاحب
امیرِ شہر سے ۔ تاوان کے ہوئے طالب

ہوئی وصول جو گاہک سے ۔ سات سَو کی رقم
وہ نقش گر کے لیے تھی ۔ خزانۂ اعظم

گیا جو لے کے ۔ وہ اپنے نصیب کی مایا
تو اُس کے بعد ۔ مصوّر نظر نہیں آیا

قتیل شفائی

ندیم ایک چاند ہے

مٹے مٹے ہیں راستے، قدم قدم پہ دُھول ہے — کہیں کوئی چٹان ہے، کہیں کوئی ببول ہے
وہ تھک کے بیٹھ جائے گا، یہ راستوں کی بھول ہے — نہ وہ کبھی اُداس تھا، نہ وہ کبھی ملول ہے

ندیم ایک چاند ہے، ندیم ایک پھول ہے

کوئی ہے نام کے لیے، کوئی نسب کے واسطے — ندیم کی ہیں نکہتیں، چمن میں سب کے واسطے
وہ جل رہا ہے آج تک زوالِ شب کے واسطے — وہ روشنی کا ہے خدا، وہ صبح کا رسول ہے

ندیم ایک چاند ہے، ندیم ایک پھول ہے

چلا نہ دو قدم کبھی وہ مصلحت کی راہ پر — نظر نہ اس کی جم سکی کسی بھی کج کلاہ پر
وہ خندہ زن رہا سدا ہر اک جہاں پناہ پر — اس ایک جرم پر اُسے ہر اک سزا قبول ہے

ندیم ایک چاند ہے، ندیم ایک پھول ہے

کٹھن تھے راہِ شوق میں اگرچہ لاکھ مرحلے — تراشیں اس نے منزلیں، بنائے اس نے قافلے
نہ سو سکا وہ شب گئے، نہ رُک سکا وہ دن ڈھلے — مسلسل ایک جستجو ندیم کا اُصول ہے

ندیم ایک چاند ہے، ندیم ایک پھول ہے

فارغ بخاری

دھرتی کا شاعر

میرے ذہنی ہم سفر
تجھ سے رشتہ ہے مرا فن کا، قلم کا، پیار کا
تو مرا ساتھی بھی ہے، ہمدم بھی ہے
میں نے چاہا ہے تجھے محبوبۂ فن کی طرح
غم ہمارے مشترک
سوچ کی رو مشترک
افکار کی ضو مشترک
ذہنوں کے دھارے مشترک
ہیں رقم سارے مشترک
لہلہاتی کھیتیاں
جھومتے چوپال
گاتے ناچتے پنگھٹ
تیرا موضوعِ فن

زرد چہرے
نیم جاں گھائل بدن
ریزہ ریزہ دل
تیرے فن کی اساس
مسکراتی جھومتی دھرتی کے شاعر
ظلمتوں کی آگ میں جلتی ہوئی دھرتی کے شاعر
تو دھڑکتی زندگی کا رازداں
تو دکھی انسانیت کا ترجماں
تیرے نغمے، تیرا فن، تیرے صحیفے جاوداں

ظہور نظر

احمد ندیم قاسمی

اُسے کتابوں میں دیکھا تو ایک شہر تھا وہ
اک ایسا شہر ــــــ
کہ تہذیب و فن کے تاج محل
قدم قدم پہ جہاں دعوتِ نظارا دیں
قدم قدم پہ جہاں جذب و عزم کے مینار
سنبھلتی گرتی ہوئی خلق کو سہارا دیں
قدم قدم پہ ہیں آثار خواہشوں کے جہاں
قدم قدم پہ جہاں مقبرے ہیں حسرت کے
قدم قدم پہ جہاں میکدے ہیں جذبوں کے
قدم قدم پہ ہیں معبد جہاں محبت کے
قدم قدم پہ جہاں بے شمار تحریریں
پڑی ہیں حسن کی شطرنجیاں بچھائے ہوئے
قدم قدم پہ جہاں رنگ رنگ کے اشعار
کھڑے ہیں صورتِ اشجار ــــــ
جن کے سائے میں ــــــ
خیال و خواب کے وہ قافلے اُترتے ہیں
جو دشتِ زیست سے آتے ہیں زندگی کرنے
لدا ہے بوجھ حقیقت کا جن کے شانوں پر
طرح طرح کے فسانے ہیں جن کی آنکھوں میں
عجیب شہر ہے یہ ــــــ
عجیب حسن ہے اس شہر کی فضاؤں میں
عجیب حزن ہے اس شہر کی ہواؤں میں

ہر ایک موڑ پہ آباد ہیں فراق کے گھر
ہر ایک موڑ پہ ملتی ہیں وصل کی گلیاں
گلی گلی میں ہیں ویران موت کے مسکن
گلی گلی میں ہیں گنجان زندگی کے مکاں
دروں پہ جن کے لٹکتی ہیں تختیاں دُکھ کی
لکھا ہے سُرخ سیاہی سے جن پہ نامِ حیات
کُھلے دریچوں سے جن کے رجائیں جھانکتی ہیں
دھڑکتے دل پہ دھرے اَن چھوئے سُکھوں کا ہات
چھتوں میں جن کے ——
سیہ رات کے نشیمن ہیں
چھتوں پہ جن کے ——
چراغِ اُمید روشن ہیں

اُسے سرابوں میں دیکھا تو ایک بحر تھا وہ
اک ایسا بحر ——
کہ گہرائیاں ہیں جس کی اتھاہ
اک ایسا بحر ——
کہ پانی ہے جس کا شہد آگیں
ستم کے دشت میں دم توڑتے غزالوں کو
ملی ہے جس کے توسط سے آبنائے نجات
ہیں جس کے ایک طرف کوہ آدمیت کے
ہے جس کے ایک کنارے پہ شاہراہِ حیات

اُسے قریب سے دیکھا تو ایک شخص تھا وہ
اک ایسا شخص ——
کہ جو انجمن سا لگتا ہے
مگر جو غور سے دیکھو —— تو اتنا تنہا ہے
کہ جیسے بامِ فلک پر ہو صبح کا تارا

خاطر غزنوی

درویش باصفا

وہ کوزہ گر ہے نہ آئینہ ساز ہے لیکن
گِلِ حروف کی کوزہ گری میں رنگ اس سے
اسی کے فن سے جلا آنسوؤں نے پائی ہے
وہ آئینے
کہ نظر آئیں جن میں روح کے زخم
بدن کے داغ
جنھیں حُسن کا نشاں سمجھوں
مرے ضمیر کی لاشیں
مرے گناہ کا زنگ
مری ہوس کا بہیمانہ رقص
پیاس کے رنگ
وہ اس کا دل کہ عبادت گہِ ملائک ہے
نظر ورائے نظر جلوہ ہائے پنہاں پر
وہ اس کی فکر کہ خورشید کا سفر تھک جائے

سخن کی دنیا کا درویشِ باصفا
جس نے
کیا قلم و قرطاس پر رواں سکّہ
جہانِ سفلہ کے ہر آدمی کی عظمت کا
ہزار بار ہوئیں اُنگلیاں فگار اس کی
ہزار بار قلم ہاتھ اُس کے ہو کے رہے
اسی کے خونِ جگر نے بصیرتیں بخشیں
اُسی کے خون سے تابندہ فنِ شعر ہوا
بفیضِ فکر و نظر، تنگنائے نوکِ قلم
لیے ہے قلزمِ الزار اپنے سینے میں
اسی کے عزمِ جواں کے سبک سفینے میں
نئی رتوں کے مسافر
علم اُٹھائے ہوئے
اُتر گئے اُس پار

حمایت علی شاعر

ثلاثیاں

(منذر ندیم)

شخصیت

قاسمی صاحب میں یوں تو خوبیاں ہیں بے شمار
مختصر الفاظ میں سوچا تو یہ دل نے کہا
اچھے انساں، اچھے شاعر، اچھے افسانہ نگار

اسلوب

اک امتزاج بھی ہے جدید و قدیم کا
لیکن فقط یہی نہیں حسنِ کمالِ فن
اوروں سے مختلف بھی ہے لہجہ ندیم کا

کردار

افسانہ ہو کہ شعر و سخن، ایک رنگ ہے
ہر ظلم کے خلاف ادب کے محاذ پر
احمد ندیم قاسمی مصروفِ جنگ ہے

قمر ہاشمی

نغمہ و نکہت کی آبرو

احمد ندیم قاسمی اس دور کا قسم
احمد ندیم قاسمی اردو کا شب چراغ
احمد ندیم قاسمی دھرتی کا سوندھا پن
احمد ندیم قاسمی پنجاب کی مٹھاس
احمد ندیم قاسمی ہر چند ایک نام
احمد ندیم قاسمی لیکن دلوں پہ نقش
انساں کی عظمتوں کی جھلک
پیار کی دھنک
کاغذ پہ جب یہ نام کسی کو دکھائی دے
سمجھو کہ آدمی کی کہانی
دلوں کا شعر

کچھ نام ایسے بھی نظر آئے جو دھوپ چھاؤں
دیکھو تو سرو قد
در دانش کے پاسباں
اس کھردری زمین پہ تشبیہ آسماں
لیکن جب آزماؤ تو کم ظرف و کم عیار

احمد ندیم قاسمی انسانیت کا راگ
احمد ندیم قاسمی ماحول کا سہاگ

انسان دوست
شاعر و ناقد
فسانہ ساز
وہ سرزمینِ نغمہ و نکہت کی آبرو
وہ زندگی کے مہرِ درخشاں کی گفتگو
گفتار میں شعور و متانت کی شعلگی
اشعار میں صداقت و رعنائیِ خیال
یا یوں کہوں تو اس میں تعلّی نہ مصلحت
بولے تو پھول جھڑتے ہیں لہجے کی شاخ سے
نظمیں پڑھے تو حسنِ سماعت بھی گنگنائے
قطعات کا جمال باحساسِ تازگی
رِم جھم، پڑے پھوار
تاثر یہ ذہن پر

اس کی کہانیوں کا ہے موضوع دل پذیر
دیہات کی حیات کم آمیز سادگی
فردا کا اک لطیف و جلال آفریں شعور
ہر تازہ انقلاب کے قدموں کی آہٹیں
احمد ندیم کے لب و لہجہ میں ڈھل گئیں



سیّد فیضی

نقیبِ سحر

صورت گرِ جلال و جمال اور کون ہے — احمد ندیم گلشنِ معنی کا عندلیب
جس نے حریمِ شوق میں شمعیں جلائی ہیں — بن کر عوام دوست تمناؤں کا نقیب
فکر و نظر کی جس نے بہاریں لٹائی ہیں

ہے جس کی فکر تازہ بہاروں کا اہتمام — فن جس کا ارتقائے مسلسل کا نام ہے
حکمت کو جس نے دی ہے ضیائے خود آگہی — جس کا نثرادِ نو کے لیے یہ پیام ہے
انساں ہے وجہِ ناز بھی وقفِ نیاز بھی

وہ عصرِ نو کی جدتِ تعمیر کا نقیب — دل کو بچا سکا نہ کبھی درد و داغ سے
اُس کی نظر نظر میں اُجالوں کا نور تھا — مانگی نہ اُس نے لو کبھی دودِ چراغ سے
اسلام کے مزاج کا اُس کو شعور تھا

کہنہ روایت اس کو نہ پابند کر سکی — پائی ہے اُس نے بوذر و سلمان کی نظر
خونِ جگر سے لکھی ہے اُس نے جو داستاں — وہ آج بھی رقم ہے پرِ جبرئیل پر
پھر بھی ستم نصیب ہے کیوں عظمتِ بشر

کیوں کر نہ اُس کو حریتِ فکر ہو عزیز — دل اس کے پاس بھی ہے مگر زار و دردمند
ظلمت نے لاکھ لاکھ دیے ہیں اُسے فریب — لیکن نہ کر سکی اُسے مجبورِ قید و بند
تاریکیوں میں گھُٹ کے وہ اک چیخ بن گیا
یوں دورِ انتشار کی تاریخ بن گیا

عزیز اختر وارثی

زندگی کا مزاج داں

وہ زیست کا مزاج داں وہ زندگی کا راز داں
وہ علم کا جہاں، جہانِ علم و فن کا آسماں
وہ جس کے دم قدم سے زندگی کی نزہتیں جواں
وہ جس کے راستے میں آسماں مثالِ کہکشاں
وہ اک حکیم نکتہ داں وہ اک پیمبرِ زماں
جہانِ علم و فن میں جس کی انفرادیت عیاں
فراست و خرد میں فرد انتقادیات میں
جلو میں جس کے کاروانِ علم و فن رواں دواں
میں اُس کی بات کر رہا ہوں آج ذوق و شوق سے
محبت و خلوص جس کی گفتگو سے ہے عیاں
وہ جس کی بات بات میں شعورِ زندگی ملے
وہ جس کا ایک ایک شعر زندگی کا ترجماں
غلط معاشرے پہ جس نے طنزِ بے اماں کیا
وہ جس نے بخش دی ہے گنگ ذہن کو نئی زباں
مدد تلاشِ روشنی میں اُس نے کی ہر ایک کی
لگائے راستے پہ اُس نے کارواں کے کارواں
کیا ہے اُس نے خود شناس دل رُبائے زیست کو
وہ بانٹ کر مے نشاط، پی رہا ہے تلخیاں
وہ زیست کا مزاج داں، وہ زندگی کا ترجماں
وہ علم کا جہاں، جہانِ علم و فن کا آسماں

اظہر سعید

وارثِ لوح و قلم

ندیم تجھ کو تری کائناتِ فن کو سلام
جنم دیا تجھے جس خاک نے اُسے بوسہ
زہے نصیب کہ تجھ کو ملا ہے سوزِ جگر
تجھے وراثتِ لوح و قلم ہوئی ہے عطا
قلم امانتِ یزداں قلم ثبات دلقیں
قلم وراثتِ پیغمبرانِ با توقیر
رکھلائے ہیں تری تحریر نے چمن کیا کیا
جہانِ شورش و شر میں یہی گلِ صد رنگ
یہ تیرے شعر، دلِ درد آشنا کی پکار
رفیق و ہمدم و دم ساز، غم گسار و انیس
نہ تھے فسانے حقیقت سے اس قدر نزدیک
یہ سلسلہ بھی ترے عہد کی ودیعت ہے

شعور و فکر کی تابندہ انجمن کو سلام
تو جس چمن کا ہے گُل اس حسین چمن کو سلام
متاعِ اہلِ وفا غم ہے مال و جاہ نہیں
خوشا کہ وارثِ سلطان میر و شاہ نہیں
ضمیرِ دہر قلم روحِ کائنات قلم
شعورِ زیست قلم گرمیٔ حیات قلم
ترے قلم سے ہوئے مَس تو لفظ پھول بنے
نقیبِ صبح بنے امن کے رسول بنے
یہ شعر تیرہ فضاؤں میں روشنی کی کرن
یہ غم زدوں کے سہارے یہ بے گھروں کے وطن
یہ سادگی یہ خلوصِ بیاں نہ تھا پہلے
ادب عوام کا یوں ترجماں نہ تھا پہلے

تری نگاہ حقیقت شناسِ غیب و شہود
ترے خیال کی زد کائناتِ لامحدود
'جہانِ تازہ' کی پنہاں نہ رہ سکے گی نمود
کہ ہے ضمانتِ 'افکارِ تازہ' تیرا وجود

حزیں لدھیانوی

ترجمانِ فطرت

تُو کہ شاعر بھی ہے، ندیم بھی ہے
تُو کہ حادث بھی ہے، قدیم بھی ہے
آدمی کا وقار ہے تجھ سے
زندگی کی بہار ہے تجھ سے
"شعلۂ گل" بھی ہے، نسیم بھی ہے

تجھ سے "امروز" تابناک ہوا
دامنِ گردِ راہ چاک ہوا
خواب زاروں میں زندگی جاگی
خامشی ٹوٹی؛ نغمگی جاگی
سب فسونِ جمود خاک ہوا

○

شاعرِ صاحبِ "جلال و جمال"
ہے ستارہ شکار تیرا خیال
ابنِ آدم کی داستاں تُو ہے
رازدارِ غمِ جہاں تُو ہے
تجھ سے تاباں ہیں زیست کے خد و خال

تجھ کو انسان سے محبت ہے
تجھ سے پھولوں میں رنگ و نکہت ہے
تجھ سے "دشتِ وفا" ہے رشکِ ارم
تجھ سے قایم ہے عظمتِ آدم
در حقیقت تُو ترجمانِ فطرت ہے

○

تیرے ناوک سے چاک سینۂ شب
تیری "رم جھم" سے سبز کشتِ ادب
ہے صدائے جرس نوا تیری
تیرگی سوز ہے ضیا تیری
تُو نقیبِ بہارِ عہدِ طرب

تجھ سے روشن چراغِ شعر و ادب
تجھ سے پُرکیف ایاغِ شعر و ادب
تیرے ساغر میں ہے شرابِ جنوں
میں ترے فن سے پیار کرتا ہوں
تیرا فن ہے بلاغِ شعر و ادب

گوہر ہوشیارپوری

ندیم

رموزِ فن کے تقاضوں سے بہرہ ور کہیے
عظیم ادب کا ادیبِ عظیم تر کہیئے

نکاتِ نطق سے وہ نکتہ نکتہ بہرہ فروز
مقامِ شعر سے آسودۂ خبر کہیے

وہ لفظ لفظ تیقن کا آفتابِ اُمید
دلوں میں جس سے نزولِ شعاعِ زر کہیے

وہ سطر سطر میں تاثیرِ درد کا محرم
وہ حرف حرف نمایندۂ اثر کہیے

سیاہیوں میں اُفق تاب ہے کلام اُس کا
اُسے ندیم کہ صورت گرِ سحر کہیے

لوا ہے اُس کی ہر اہلِ لوا، لوا پیرا
ہنر ہے اُس کے عبارت ہوا ہنر کہیے

وہ اپنے عہد کا غالب وہ زخم خوردۂ خلق
وہ اپنے وقت کا منصورِ دار پر کہیے

وہ "گُل کو دیکھ کے تخلیقِ گُل کی سوچتا" ہے
نظر نظر اُسے شائستۂ نظر کہیے

شگفتہ روح و شگفتہ دل و شگفتہ دماغ
اُسے بہار — کہ اُس کو بہار گر کہیے

وہ نفرتوں کا مخالف، محبتوں کا ندیم
سخن سخن اُسے عرفانِ خیر و شر کہیے

ادیب سُہیل

سرِ شہرِ ادب

نظر یہ ایسا ہوا ہے قاتل
کہ سرِ شہرِ ادب
ہر کوئی سنگ بدست
سب کے تیور ہیں عجب

ایسا برگشتہ کہ جس پیڑ کے نیچے اس کے
دھیان کو گیان ملا
فکر بالیدہ ہوئی
بس چلے تو وہ جڑیں کھود کے رکھ دے اس کی

اختلافات کسی ــــ ذات کی تعمیر ہیں
تخریب نہیں
چاند میں داغ ہے
یہ پھر بھی حسیں لگتا ہے
داغ میں حسن نظر آتا ہے
انھیں معنوں میں ــــ دل آرا ہے ندیم

شبنم رومانی

عظیم انساں

نہ وہ پیمبر نہ وہ فرشتہ
مگر وہ آنکھیں
مگر وہ چہرہ
ادب کی شمعیں، وفا کا رشتہ
میں اُس کی آنکھوں میں اُس کے چہرے پہ
زندگی کا جمالِ نادیدہ دیکھتا ہوں
میں اُس کے رشتے سے
اُس حقیقت کا نکتہ داں ہوں
غزل سرا ہوں، فسانہ خواں ہوں
جو عصرِ نو کا شعور بھی ہے
کروروں آنکھوں
کروروں چہروں کا رنگ و آہنگ و نور بھی ہے

نہ وہ پیمبر نہ وہ فرشتہ
وہ ایک انساں
وہ ایک رشتہ
کہ جس کے بارے میں یہ نوشتہ ہی معتبر ہے
"مرا ہنر ہے، ترا ہنر ہے
یہی نوشتہ ہے میری فکر و نظر کا سایہ
یہی نوشتہ ہے آرزو کے شجر کا سایہ
عظیم انسان ہے خدایا
عظیم انسان ہے خدایا"

محسن بھوپالی

شریف آدمی

(نظمانہ)

ندیم نے جسے اُصولِ فن سے،
آشنا کیا!
تسلسلِ خیال دے کے جس کی فکر کو،
اثر سے بہرہ ور کیا!
جھجک کی برف کاٹ کر زباں کو حوصلہ دیا!

جب ایک دن رپورٹر نے
شعر و شخصیت پہ گفتگو سمیٹتے ہوئے،
یہ آخری سوال اُس سے کر دیا:
ندیم قاسمی پہ کوئی رائے دیں
تو اُس نے مسکرا کے صرف چار لفظ کہہ دیے
وہ آدمی شریف ہیں!!!

مُحسن احسان

ایک بڑا انسان

وہ تو اک گہرا سمندر ہے کہ جس کی تہہ میں
درد کی لہر بھی ہے شوق کا طوفان بھی ہے
اُس کے سینے پہ سفینے ہیں کئی رقص کناں
جن کی ساحل پہ رسائی کا نگہبان بھی ہے
اس کی اک ذات میں ہیں قوس قزح کے کئی رنگ
جن کو پہچاننا مشکل بھی ہے آسان بھی ہے
اُس کے زخموں میں ہے آفاق کے زخموں کی نمود
وہ جہاں دار بھی ہے، بے سروسامان بھی ہے
اُفقِ فنِ صداقت پہ چمکنے والا
اک قلمکار نہیں اک بڑا انسان بھی ہے



وہ تو ہے حسنِ اخوت کا وہ تاریخ نگار
جس نے آزادیٔ افکار کی تفسیر لکھی
جس نے جمہور کے آئینوں کے ریزے چن کر
اُن کے مٹی میں ملے خوابوں کی تعبیر لکھی
جس نے گرتی ہوئی دیوار کو کاندھا دے کر
شہرِ تخریب میں رعنائیٔ تعمیر لکھی
سرخیٔ چہرۂ انساں نکھر آئی جس سے
نوکِ مژگاں سے سرِ عرش وہ تحریر لکھی
جس کے ہر لفظ میں ہے نورِ جہاں کا پرتو
جس نے ہر بات باندازِ جہاں گیر لکھی

منظر ایوبی

وہ مرے عہد کا سورج...

وہ مرے عہد کا سورج ہے، اُسے دیکھو تو
اس کے آورش کو، اے ہم نفسو، سمجھو تو

ذہن در ذہن، پرافشاں ہیں، اُجالے اُس کے
شہر در شہر، بہت چاہنے والے اُس کے
نغمۂ و شعر کی دنیا کا وہ روشن مینار
شہرِ افسانہ و تمثیل کا زندہ کردار
آدمیت کی بقا، اس کی اساسِ ایماں
حرمتِ خاکِ وطن، دولت و سرمایۂ جاں
زیست کے ٹھوس حقایق سے عقیدت اُس کو
فن کے تابندہ اُصولوں سے محبت اُس کو
شخصیت اُس کی ہے اربابِ جنوں میں ممتاز
منفرد ساری صداؤں میں ہے اُس کی آواز
اُس نے دیکھے ہیں بہت نظمِ جہاں کے انداز
وہ سمجھتا ہے زمانے کے نشیب اور فراز

سالہا سال سے وہ نغمہ سرا ہے لوگو
اُس کی آواز زمانے کی صدا ہے لوگو

اُس کا موضوعِ سخن، نوعِ بشر کی عظمت
حریت، امن، مساوات، دیانت، چاہت
آئینہ دارِ شب و روز ہے اسلوب اس کا
ترجمانِ غمِ امروز و نشاطِ فردا

اُس کا ہر شعر ہے سچائی کا مظہر لوگو
ایک اک کوزے میں ہے بند سمندر لوگو

قصۂ زلف بھی ہے تذکرۂ دار بھی ہے
روح کا کرب بھی ہے، جسم کی چہکار بھی ہے
تلخیٔ لب بھی ہے، شیرینیٔ گفتار کے ساتھ
زیست کی شرح بھی ہے مدحتِ رخسار کے ساتھ

وہ سمجھتا ہے قلم کار کی قیمت لوگو
اُس کو معلوم ہے الفاظ کی طاقت لوگو

دھوپ غم کی رہی سر پر، کہ خوشی کا سایا
شیشۂ دل پہ مگر میل نہ ہرگز آیا
خلقتِ چرخ سے ناتہ نہیں جوڑا اُس نے
اپنی دھرتی سے نہ رشتہ کبھی توڑا اُس نے
بدگماں اُس سے رہے برہمن و شیخ مگر
سر جھکایا نہ کبھی اُس نے کسی چوکھٹ پر

عمر بھر اُس نے سہے طنز کے پتھر لوگو
حرف آنے نہ دیا حرمتِ فن پر لوگو

آج بھی کاخِ ادب کا ہے وہ مضبوط ستون
پیکرِ ہوش و خرد، مظہرِ ایثار و جنون
آج بھی زیست کے صحرا میں ہے وہ زمزمہ خواں
وہی آہنگ، وہی لَے، وہی اندازِ بیاں
خونِ دل، زینتِ عنوانِ حدیثِ دَوراں
زہر آلود فضاؤں میں محبت کا نشاں
اُس کی آنکھوں کی چمک، قصد و ارادے کی دلیل
اُس کے چہرے کی دمک، عزم و یقیں کی قندیل
جسم، اندیشۂ آزار سے یک سر آزاد
دل میں خوش رنگ اُمیدوں کا حسیں شہر آباد

اُس نے بخشا ہے نئی نسل کو پندارِ دوام
اُس کی جرأت کو دعا، اُس کے تخیل کو سلام

مظفر وارثی

شاعرِ گرامی سے

رواں ہے نبضِ سخن جس کی خوش کلامی سے
مرا خطاب ہے اُس شاعرِ گرامی سے

مہک سی جس کی طبیعت، صبا سا جس کا چلن
وہ جس کے سانس ہیں انسانیت کا پیراہن

ہیں دشتِ شعر میں جس کے شعور کی نہریں
غزالِ فکر و نظر جس کے سائے میں ٹھہریں

نگاہ جس کی ہے خلّاق شاہکاروں کی
اُچھالتی ہے دیئے روپ آبشاروں کی

سخن وری جسے جُھک کر سلام کرتی ہے
وہ جس کے روپ میں فطرت کلام کرتی ہے

وہ جس کے فن سے نئے راستے نکلتے ہیں
ادب میں جس کے لہو کے چراغ جلتے ہیں

کبھی اُفق، کبھی شبنم، کبھی ستارہ ہے
جو اپنی ذات میں اِک عالمی ادارہ ہے

فسانہ، شعر، صحافت، مدار ہیں جس کے
وہ ایسا لفظ ہے، معنی ہزار ہیں جس کے

یہ کائناتِ دل آویز جس میں رہتی ہے
اُسی وجود کو دُنیا ندیمؔ کہتی ہے

مقبولِ نقش

یوسفِ بازارِ حیات

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہاں سے ذکر چلے
مرے ندیم تری شخصیت کے رُخ ہیں بہت
تو اپنے عہد کا شاعر بھی ہے ادیب بھی ہے
فسونِ درد، طلسمِ خیال تیرا فن
کہیں سے دور، کہیں سے بہت قریب بھی ہے

ہے وجہِ نازِ صحافت، کہ تو صحافی[1] ہے
ہے باوقارِ ادارت، کہ تو مدیر[2] بھی ہے
بنامِ حق و صداقت بہ پیشِ دار و رسن
بہر مقام تو اک مردِ باضمیر بھی ہے

سنائی دیتی ہیں شعروں میں دھڑکنیں دل کی
ترے فسانوں میں روحِ حیات رقصاں ہے
یہ حرف و لفظ و معانی کہ مہر و ماہ و نجوم
یہ تیرا فن ہے کہ اک کائنات رقصاں ہے

دلوں میں گونجنے لگتا ہے جب بھی سناٹا
تو معتبر کوئی صوت و صدا نہیں ہوتی
نہ جانے ہم کیسے کہتے صداقتِ اظہار
جو فکرِ شوخ تری لب کشا نہیں ہوتی

رہے گی آج کا موضوعِ گفتگو رِم جھم
کہ گم، نظر کو جلال و جمال میں رکھوں
بیان شعلہ و گل کی لطافتوں کا رہے
کہ صرف دشتِ وفا کو خیال میں رکھوں

یہ ایک درد کا رشتہ ہے گھر سے گھر تک ہے
متاعِ قلب و نظر ہے دھنک دھنک آنچل
بگولے ناچتے ہیں آبلے تھرکتے ہیں
زبانِ برگِ حنا پر ہے قاسمی کی غزل

یہ آس پاس یہ چوپال یہ در و دیوار
اور اس پہ حسنِ طلوع و غروب کیا کم ہے
یہ رقصِ حلقۂ گرداب و دامنِ سیلاب
(عجیب کشمکشِ ذہن و دل کا عالم ہے)

کہ اک چراغ بجھے دوسرا چراغ جلے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہاں سے ذکر چلے

---

[1] عنقا (امروز) [2] فنون

پیرا کرمؔ

محبّت کا پیغامبر

کیسے الفاظ کے
آئینوں میں سجاؤں تری بات کو
کیسی آواز کے
نور سے جگمگاؤں تری ذات کو
پیکرِ مہر و صدق و صفا!
جاگتی، بولتی تیری تصویر میں
کون سے رنگ بھر دوں، بتا!
بربطِ دردِ دل پر سناؤں تجھے
کون سا گیت، نغمہ، ترانہ، خیال؟
شاعرِ آدمیت کہوں
یا کہ انسانیت کے دکھوں میں سلگتا ہوا
ایک فن کار کہہ کر پکاروں تجھے؟
دوستی، آشتی، روشنی، زندگی
صلح و امن و محبت کے پیغامبر!
کون سا پھول تجھ کو عقیدت کا محبوب ہے؟

میرے حسّاس، بے باک شاعر، سلام!
تو، کہ اقلیم شعر و سخن میں ہے
مردانِ حق و صداقت کا زندہ نشاں
اک لگن، اک تڑپ
تجھ میں آزادئ فکر و اظہار کی
تو، کہ سچائیوں کا پرستار ہے
دیدۂ فکر و فن تیرا بیدار ہے
پرتوِ شعلۂ حسنِ احساس ہے
سرخ رو تیرا ذوقِ جمال و جلال

تو نے گائے ہیں شام و سحر
شعلۂ گل کو رم جھم کا مژدہ سناتی ہوئی
گنگناتی مہکتی بہاروں کے گیت
درسِ جہدِ مسلسل ہے تیری حیات
خود شناسی و خود آگہی کی کٹھن منزلوں
اور دشتِ وفا، کے سفر
پا پیادہ کیے تو نے طے آج تک
گو زمانے نے برسائے پتھر، مگر
تو، فرازِ صلیبِ شبِ تار پر
ایستادہ رہا
اپنے بازو کشادہ کیے
مسکراتا رہا اک مقدس کرن کی طرح

○

امجد اسلام امجد

اس کی تحریر کی خوشبو

میں نے اُس شخص کی آنکھوں میں فروزاں دیکھی
اُس کے نکھرے ہوئے باطن کی چمک
اُس کی تحریر کی خوشبو میں گل افشاں دیکھی
اُس کے مہکے ہوئے لہجے کی کھنک
اُس کے کردار کے پردے میں نمایاں دیکھی
عظمتِ آدمِ خاکی کی جھلک!
اُس نے بتلایا مجھے
کیسے فن کار کا فن اُس کے احساس کی قوت سے
جنم لیتا ہے
اُس نے سکھلایا مجھے
کس طرح کوئی زمانے کو مسرت دے کر
اپنے حصے میں الم لیتا ہے
آسماں کون سے لوگوں کے قدم لیتا ہے!!

حسن اکبر کمال

ندیم دشتِ وفا

نقیبِ عظمتِ انساں، امینِ اوجِ ہنر
عروجِ علم و بصیرت، کمالِ فکر و نظر

جو رنگ و نکہت و رعنائی کا ہے شیدائی
طلوعِ صبحِ طرب کا جو ہے تمنائی
جہاں نما ہے جہاں کی ہر ایک شے اُس کو
کہ ذرّے ذرّے کی دھڑکن کا علم ہے اُس کو

جسے شعور ہے انساں کے حسرت و غم کا
مثالِ شمع جو مظہر ہے سوزِ پیہم کا
کہانیوں میں وہ ہر ذہن کے فسانے لکھے
کبھی خود اپنے ہی دُکھ غیر کے بہانے لکھے

لہو جو روتا ہے ہر شخص کی خوشی کے لیے
جو وقف ہو چکا انسان دوستی کے لیے
غزل میں اُس نے ہی زندہ ہمارے خواب کیے
جو یادِ یار کے تھے زخم، سب گلاب کیے

وہ جاں گداز و دلِ درد مند رکھتا ہے
خلوص و مہر و نگاہِ بلند رکھتا ہے
اس اِک چراغ سے روشن چراغ کتنے ہوئے
اسی کے فیض سے عالی دماغ کتنے ہوئے

وہ آدمی بھی ہے بے مثل، اُس کا فن بھی عظیم
ہے اُس کی فقر پسندی کا بانکپن بھی عظیم
دُعا ہے، شمع یہ سب محفلوں میں روشن ہو
مقام و نام اسی کا دلوں میں روشن ہو!

خالد احمد

ندیم

تیری بلندیوں سے سو آبشار نکلے
سب کم کنار آئے، سب بے کنار نکلے

تیرے حریمِ فن سے، سچائی کے گگن سے
تارے پہن پہن کر، ہالوں کے ہار نکلے

تو عصر کا جھکاؤ، تو زیست کا سبھاؤ
تیرے سخن سخن سے لہجے ہزار نکلے

حُسنِ نظر سے تیرے پھوٹیں نئے سویرے
پت جھڑ کے پربتوں سے رودِ بہار نکلے

ہر رُت میں رنگ تیرے، ہر لے میں ڈھنگ تیرے
سپتک کوئی بھی چھیڑیں تیری پکار نکلے

افکار کی لپک بھی، اظہار کی گمک بھی
میرے قلم پہ تیرے کیا کیا اُدھار نکلے

خالد[۱]، نجیب[۲]، گوہر[۳]، تائب[۴]، قتیل[۵]، جعفر[۶]
سب کم کنار آئے، سب بے کنار نکلے



[۱] خالد احمد، [۲] نجیب احمد، [۳] گوہر ہوشیارپوری، [۴] حفیظ تائب، [۵] قتیل شفائی ـــــ [۶] جعفر طاہر

پروین شاکر

سرِ شاخِ گُل

وہ سایہ دار شجر
جو مجھ سے دور، بہت دور ہے، مگر اس کی،
لطیف چھاؤں،
سجل، نرم چاندنی کی طرح،
مرے وجود، مری شخصیت پہ چھائی ہے!
وہ ماں کی باہوں کی مانند، مہرباں شاخیں،
جو ہر عذاب میں مجھ کو سمیٹ لیتی ہیں
وہ ایک مشفقِ دیرینہ کی دعا کی طرح،
شریر جھونکوں سے پتّوں کی نرم سرگوشی
کلام کرنے کا لہجہ مجھے سکھاتی ہے!
وہ دوستوں کی حسیں مسکراہٹوں کی طرح
شفق عذار، دھنک پیرہن، شگوفے، جو
مجھے زمیں سے محبت کا درس دیتے ہیں!

اُداسیوں کی کسی جاں گداز ساعت میں،
میں اُس کی شاخ پہ سر رکھ کے روئی ہوں جب بھی
تو میری پلکوں نے محسوس کر لیا فوراً،
بہت ہی نرم سی اک پنکھڑی کا شیریں لمس!
رُکی تھی آنکھوں میں، لیکن میں مُسکرائی ہوں!
کڑی ہو دھوپ،
تو پھر برگ برگ ہے شبنم

تپاں ہوں لہجے،
تو پھر بھی پھول پھول ہے ریشم
ہرے ہوں زخم
تو سب کو نیلوں کا رس مرہم
جو فرقتیں ہوں
تو پھر شاخ شاخ ہے سنگم!

وہ ایک جھونکا،
جو اُس شہرِ گُل سے آیا ہے،
اب اُس کے ساتھ بہت دور جا چکی ہوں میں،
میں ایک ننھی سی بچّی ہوں، اور خموشی ہے،
بس اُس کی اُنگلیاں تھامے، اور آنکھیں بند کیے،
جہاں جہاں لیے جاتا ہے، جا رہی ہوں میں!

وہ ایک خوشبو،
جو میرے وجود کے اندر،
صداقتوں کی طرح زینہ زینہ اُتری ہے،
کرن کرن، مری سوچوں میں جگمگاتی ہے،
(مجھے قبول کہ وجدان نہیں یہ چاند مرا،
یہ روشنی مجھے ادراک دے رہی ہے مگر!)

وہ سایہ دار شجر
جو دن میں میرے لیے ماں کا نرم آنچل ہے،
وہ رات میں، مرے آنگن پہ ٹھہرنے والا،
شفیق، نرم زباں، مہربان بادل ہے!

مرے دریچوں میں جب چاندنی نہیں آتی،
جو بے چراغ کوئی، تب اُترنے لگتی ہے،
تو میری آنکھیں، کرن کے شجر کو سوچتی ہیں،
دبیز پردے نگاہوں سے ہٹنے لگتے ہیں،
ہزار چاند، سرِ شاخِ گُل اُبھرتے ہیں!

اختر حسین جعفری

نصف صدی کا نغمہ

(جناب احمد ندیم قاسمی کی نذر)

دن کے پیلے پتے تیرے دامن میں ہیں
رات کے آنسو تیری روشن آنکھوں میں ــــ!
وقت کا گُنگ آئینہ آنے والی کل کو
تیرا عکس دکھاتا ہے
جن کھیتوں پر دھوپ اُتری ہے
جن باغوں میں پھول کھلے ہیں
اُن کھیتوں پر
اُن باغوں میں
تیری فکر کا سورج چمکا، تیری سوچ کے آنسو ٹپکے
تو ہے نصف صدی کا نغمہ
اس نغمے کی ناؤ جب کل کے ساحل پر ٹھہرے گی
بچے شور کریں گے ــــ "دیکھو!
دور دیس سے نئے کھلونے
ہیرے، موتی،
رنگ برنگے کاغذ کے تھیلوں میں بھر کر آئے ہیں
جن پر کوئی محافظ،
پہرے دار نہیں ہے"

سید عبدالعلی شوکت

ایک شاعر ایک انسان

عرصۂ شعر و ادب میں اب بھی
ہیں نگارِ ادبستاں کے پرستار ایسے
جن کی تخئیل سے روشن ہے نظامِ ہستی
جن کے افکار کسی مول نہیں بک سکتے
خود تو مٹ جاتے ہیں یہ حق و صداقت کے امیں
حسن و اخلاص کا معیار بڑھا دیتے ہیں
انہی فن کاروں میں ہے "دشتِ وفا" کا فن کار
جس کے نغموں میں نہاں رنگِ حیات
مرغزاروں کی مہک اور ستاروں کی چمک
آبشاروں کی بہاروں کی مسلسل "رم جھم"
اس کا فن "شعلۂ گل" "برگِ حنا"
اس کے اشعار رہے عظمتِ آدم کے امیں
جب کہیں ظلم کا ہاتھ
چاند کی ضو کو چراغوں کی سنہری لو کو
آتشیں عزم سے اٹھتا ہے بجھانے کے لیے
میرے شاعر کا قلم شعلہ بدست
ظلم کے ہاتھ کو اس طرح جلا دیتا ہے
آدمیت کی جبیں پھر سے دمک اٹھتی ہے
روشِ لالہ و گل پھر سے مہک اٹھتی ہے

○

احمد رئیس

ایک چاند

(قاسمی صاحب کے نام)

ورق ورق تری خوشبو تو ہر کتاب کا پھول
ترا ہی نام چمکتا ہے ہر صحیفے میں

ترے ہی عکس سے آئینہ ساز جلتے ہیں
کہ تیرا روپ تو بجتا ہے دل کے شیشے میں

تری ہی فکر سے دشتِ سخن ہے لالہ زار
ترے ہی ذکر سے مہکا ہے زندگی کا دیار

ترے نقوشِ قدم سے جو روشنی پھوٹی
وہی تو عارضِ گیتی کا اب بھی غازہ ہے

مرے وطن کو ملی تجھ سے یہ شگفتہ لبی
ترا وجود گل و یاسمن کے جیسا ہے

ترا ہی رنگ جھلکتا ہے حسنِ ادبی میں
تو ایک چاند ہے لاہور جیسی بستی میں

احمد طاہر

شاعرِ بے مثل

احمد ندیم
شاعرِ بے مثل و باکمال
احمد ندیم
شہرِ ادب کا حسین باب
وہ فکر و فن کی زندہ روایات کا امین
جس نے دیا ہے
نظم و غزل کو نیا شعور
ہے ایک نام اور یہ معجز نمائیاں
اُس کو پڑھوں تو
ذہن کو آسودگی ملے
احمد ندیم علم کی تابندہ تر کتاب

صبا اکرام

ترے لب ہلے تو
(احمد ندیم قاسمی کی نذر)

ترے لب ہلے تو جہاں نے
کئی خوں شدہ داستانیں سُنی ہیں
تری انگلیاں
شب کی دیوار پر
صبح کی داستاں لکھ رہی ہیں

احمد ضیاء

ترے حروف

ترے حروف ترے آئینے ہیں
جن میں ترے
تمام رنگوں کی پرچھائیاں جھلکتی ہیں
ترا خیال ہے خوشبو کہ سوکھے پھولوں میں
نئی بہار کا احساس اب بھی باقی ہے
ترا وجود ہے سورج کہ جس کی کرنوں سے
مرے وجود کی تنہائیاں منوّر ہیں
ترا شعور ہے زندہ پُرانے موسم کے
گھنے اُداس اندھیروں میں
روشنی کی طرح

حافظ بشیر آزاد

اک انجمن ہے ندیم

وفا کے گیت ترے غم کی داستانوں میں
بلندیاں ترے افکار کی اُڑانوں میں
صبا، ستارے، گلستاں، ہوا، زمین، فلک
یہ ارمغاں ہیں تری سوچ کی دکانوں میں
سُلگتے اشک، سسکتی ہوا، طلسمِ جنوں
زمانے بھر کے فسانے ترے فسانوں میں
زبانِ شعر کو بخشی ہے تو نے تازہ حیات
ترے خلوص کے چرچے ہیں آسمانوں میں
تو اپنی ذات کے اندر — اک انجمن ہے ندیم
ہیں تیرے فن کے گُہر — فکر کے خزانوں میں

شجاعت علی رَاہی

سَایہ دَار درخت

ندیم سب کے لیے ہے برادروں جیسا
وہ دشمنوں کے لیے بھی ہے دوستوں جیسا

پُراز رموز ہے گنجان جنگلوں جیسا
عظیم ہے وہ پہاڑوں کے سلسلوں جیسا

مُسافروں کے لیے جیسے سایہ دار درخت
وہ بے گھروں کے لیے ہے نئے گھروں جیسا

ہر ایک شکل کو وہ آئینہ دکھاتا ہے
ہر اک صدا کے لیے ہے وہ گنبدوں جیسا

وہ ایک دل ہے کہ ہر شخص میں دھڑکتا ہے
وہ منفرد ہے مگر پھر بھی ہے سبھوں جیسا

خورشید احمد

حُسنِ چمن

تو عظمت کردار کی تابندہ کرن ہے
روشن ترے افکار سے ہر بزم سخن ہے
شائستہ خیالات کی مظہر ہے تری ذات
تو موجِ صبا، شوخیٔ گُل، حسنِ چمن ہے
اشعار ترے زندۂ جاوید رہیں گے
مانندِ قمر صورتِ خورشید رہیں گے

تو صاحبِ اسلوب ہے تو اہلِ قلم ہے
افسانہ ترے ذہن کا ممنونِ کرم ہے
کیا طبع رسا بخشی ہے تجھ کو بھی خدا نے
جتنا بھی کوئی تجھ پہ کرے ناز وہ کم ہے
تو مجھ سے ہے واقف نہ کبھی مجھ سے ملا ہے
کیا جانیے کس بات پہ دل میرا فدا ہے

زہیر کنجاہی

زندہ ہے ترا فن

زندہ ہے ترا فن تری تخئیل فلک رس
ہے سب سے جُدا گانہ تری شعلہ بیانی
پہنائے صحافت کا ہے تو کوکبِ تاباں
میدانِ ادب میں نہیں تیرا کوئی ثانی

کالم میں ترے سالک و حسرت کی روانی
لیکن ہے جداگانہ ترے فکر کی پرواز
ہم عصر ادیبوں سے جدا تیری طبیعت
ہے منفرد ان سب سے تری سوچ کا انداز

افسانہ نویسی میں ہے تو کامل و یکتا
ہے شعر و سخن میں بھی ترا رنگ یگانہ
ہر دل میں نہ کیوں ہو ترے افکار کی عزت
ہر لب پہ نہ کیوں ہو تری عظمت کا فسانہ



رحمٰن پاشا

نقیبِ روشنی

احمد ندیم اس دَور کا
ایسا نقیبِ روشنی
ہے جس کی ہر تخلیق میں
بس زندگی ہی زندگی ——!

احمد ندیم افکار کا
اک ضو فشاں خورشید ہے
ہے جس سے روشن شہرِ فن
ہے جس سے زندہ شاعری ——!

احمد ندیم اس دَور کا
ہے اک نقیبِ روشنی ——!



ہلال جعفری

امن کا پیغامبر

ریت، ویران پہاڑی، کفِ قاتل صحرا
دُھند، بارود کی بو، آگ، ببول
زہر آلودہ سا اِک تیر، دہکتا ہوا پھول
آئینہ دیکھے تو انسان چھپالے چہرا

رنگ اور نور کے پیکر نہ تراشے کوئی
خواب کی جھیل میں ہیں سُرخ کنول
تو وہ شاعر کہ نہیں جس کا بدل
تیرے افسانوں میں دیکھے بھی تو لاشے کوئی

ایک اِک حرف محبت کا، صداقت کا پیام
اے مغنّی ترے جذبات کا کیا کہنا ہے
تو نمایاں ہے، نمایاں ہی تجھے رہنا ہے
ترے فن کو، ترے افکار کی دنیا کو سلام۔

گرچہ ہے حلقۂ یاراں میں سخنور کی طرح
اُفقِ شعر پہ تو ہے شہِ خاور کی طرح

خلیل باصر

فن کارِ عظیم

رہبر دانِ شعر وفن کے واسطے بانگِ رحیل
اس کی ہر تخلیق اُس کے عظمتِ فن کی دلیل

سوچ کے صحراؤں میں سایہ فگن مانندِ ابر
اور تفکّر کے چمن میں ہے مثالِ سلسبیل

زندگانی کی صداقت کا علم بردار رہے
نفرتوں کی آندھیوں میں مہر والفت کی فصیل

عصرِ حاضر میں وہ اپنی ذات سے اِک انجمن
اُس کے فن پارے ادب کی راہیں ہیں سنگِ میل

بزمِ فن میں ہے مسلّم عظمتِ احمد ندیم
شک نہیں اس میں کہ باصرؔ ہے وہ فن کارِ عظیم

نذرِ ندیم

(احمد ندیم قاسمی کی چند زمینوں میں شعرا کی غزلوں کا انتخاب)

شیر افضل جعفری

شعلہ شعلہ ہے بدن آدم کا
زیست اک وار ہے ایٹم بم کا

روح کے "سائنس محل" پہ اکثر
سایہ رہتا ہے سیہ پرچم کا

دیکھ کر باؤں میں سہراب کی لاش
حوصلہ پست ہوا رستم کا

خرمی آکے دلِ انساں میں
کھول دیتی ہے دریچہ غم کا

پتی پتی ہیں گلوں کے دامن
زخم خوردہ ہے چمن موسم کا

عقل آنے کو ہے دل بستی میں
عشق مہمان ہے کوئی دم کا

حسن حمیدی

اک سانپ بھی خوش نما لگا ہے
جنگل کا عجیب راستہ ہے

تاریکیِ شب کو کیا گلہ ہے
"میں نے تو دیا بجھا دیا ہے"

ہو سنگ زنی نہ بت کدوں پر
دیوارِ حرم بنا ہوا ہے

لاشوں کی فصیل بن رہی ہے
کہنے کو یہ سرحدِ وفا ہے

کرنوں سے الجھ رہی ہیں آنکھیں
خوابوں کا طویل سلسلہ ہے

تھا زعم شناوری کا جس کو
دیکھو تو کہاں پہ ڈوبتا ہے

کیا اس کو شعورِ نغمہ سنجی
جو شخص خلا میں بولتا ہے

تاج سعید

خوبصورت چاند سا جب کوئی ہمسایہ نہ تھا
دل کی دنیا پر اجالا اس طرح چھایا نہ تھا

رُت بدلتے ہی چمن میں حادثہ دیکھا گیا　　پیڑ تھے ہر سو مگر کوئی وہاں سایا نہ تھا
دور تک سبزہ تھا گل تھے، جھومتے تھے پیڑ بھی　　کوئی منظر بھی مرے دل کو مگر بھایا نہ تھا
جس کی جانب ہاتھ پھیلایا اُسی نے دُکھ دیا　　اس بھری دنیا میں میرا کوئی ماں جایا نہ تھا
کیا قیامت ہے کہ دنیا برسرِ پیکار ہے　　شہرِ غم میں دُکھ بٹانے کیا کوئی آیا نہ تھا

رفعت سلطان

زندگی کے کہیں آثار نہیں　　پھر بھی جینے سے تو انکار نہیں
کتنی بے رحم ہے دنیا کی ہوا　　میرے سر پر مری دستار نہیں
یہ زمانہ ہے وہ زنداں جس میں　　کوئی بھی روزنِ دیوار نہیں
بات یہ ہے کہ تہی دست ہوں میں　　ورنہ ملنا ترا دشوار نہیں
تیرا مسلک ہے محبت رفعت　　سیم و زر کا میں پرستار نہیں

سہیل اختر

مرا فسانۂ غم اُس نے جب سُنا ہوگا　　تو ایک پل کو سہی وہ بھی رو دیا ہوگا
فلک پہ ٹوٹتے تاروں کا دیکھ کر منظر　　اندھیری شب میں ترا دل بھی کانپ اُٹھا ہوگا
مجھے تو تھام لیا دستِ شعر نے لیکن　　ہجومِ غم میں تجھے کس کا آسرا ہوگا
جو سانپ بن کے مرے راستے میں بیٹھا ہے　　وہ ایک لمحہ تجھے بھی تو ڈس گیا ہوگا
زمانہ بیت گیا ہے مگر سہیل کا دل　　تمھارے سینے میں اب بھی دھڑک رہا ہوگا

وفا براہی

"مرنا تری طلب میں مرا رائیگاں نہ ہو"　　اونچی نگاہ بھی طرفِ آسماں نہ ہو
دل سے نکال پھینکیے کمبخت زخم کو　　ناموسِ عشق کو یہ اگر پاسباں نہ ہو
دکھلاؤ تو مرے دلِ پُرداغ کے سوا　　وہ باغ جس میں فرق بہار و خزاں نہ ہو
رنگِ رُخ و نگاہ بھی ہو جائیں ہم نوا　　گر عرضِ غم کے واسطے کافی زباں نہ ہو
دل جس طرح ہے کینہ، بغض و حسد سے پاک　　لب پر بھی اے وفا! گلۂ دوستاں نہ ہو

اکبر حمیدی

اب کہاں تابِ سخن تیرے طلب گاروں میں　　دم گھٹا جاتا ہے اس شہر کی دیواروں میں

میری خاموشی ترے ظرف کی غماز نہ ہو — گھر گیا ہوں میں ترے حاشیہ برداروں میں
اور اب دوستو تذلیلِ چمن کیا ہوگی — پھول بکنے کو چلے آئے ہیں بازاروں میں

تشنہ عالمتاب

حرفِ اظہار ہوں میں دل میں اُتر جاؤں گا — رنگ بن کر ترے چہرے پہ بکھر جاؤں گا
اوڑھ کے نکلوں گا کرنوں کی سجیلی چادر — شب کی دہلیز سے تا بامِ سحر جاؤں گا
وقت کی دھوپ میں اک وادیٔ آغوش ملے — دشتِ بے سایہ کے آشوب سے مر جاؤں گا
تو مجھے ڈھونڈتا رہ جائے گا منزل منزل — میں تو جھونکا ہوں دبے پاؤں گزر جاؤں گا
لے اُڑے گا مجھے پھر کوئی ہوا کا جھونکا — موجۂ ریگِ رواں بن کے بکھر جاؤں گا
شب کی آنکھوں سے ہوں ٹپکا ہوا آنسو تشنہ — میں کسی پھول سے عارض پہ ٹھہر جاؤں گا

حامد سروش

اک چیخ تھی فلک کی زمیں کا دھماکا تھا — دیکھا جو غور سے تو وہ ریزہ ہوا کا تھا
الفاظ بھیگے بھیگے تھے مفہوم زرد زرد — لہجہ دُکھا دُکھا مرے درد آشنا کا تھا
جھونکا سا ایک روح کو چھو کر گزر گیا — تیرا خیال تھا کہ تصور خدا کا تھا
اک تشنگی ازل سے ابد تک تنی رہی — منظر اُفق سے تا بہ اُفق کربلا کا تھا
کوئی تو شخص تھا جو مرے ساتھ تھا صرفِ رقص — سایا اگر نہیں تھا تو پیکر ہوا کا تھا

زہیر کنجاہی

کس نے کہا تھا تم سے کہ سی لو دہانِ زخم — مر جاؤں گھٹ کے مشورہ کس آشنا کا تھا
بیٹھا رہا میں ذات کے گنبد میں ہو کے بند — کچھ اس طرح اسیر میں اپنی انا کا تھا
سب کچھ اُڑا کے لے گیا جو کچھ تھا میرے پاس — کہنے کو صرف ایک ہی جھونکا ہوا کا تھا

رحمان خاور

خدا کا ذکر بھی ہو جائے ذکرِ یار کے ساتھ — یہ مشغلہ بھی سہی دل کے کاروبار کے ساتھ
اکیلا ہو کے بھی دل مطمئن ہے یوں جیسے — معاہدہ ہو کوئی رُت ہم انتظار کے ساتھ
شبِ وصال کی صورت شبِ فراق کٹی — تمام رات رہے ہم خیالِ یار کے ساتھ
سکونِ قلب سے اس زندگی کو کیا نسبت — جو کٹ رہی ہو غمِ جبر و اختیار کے ساتھ

بہار آئی تو گلشن سے تا بہ دشتِ جنوں　　نبھائی رسمِ جنوں ہم نے خار خار کے ساتھ

مختار کریمی

دُھند میں بھی کئی منظر دیکھے　　تیری آواز کے پیکر دیکھے
ہر طرف شور ہے تنہائی کا　　خامشی سے کوئی ستن کر دیکھے
نیند اب اور دکھائے گی کیا　　جاگ کر خواب ہی اکثر دیکھے
پیاس کو زیست سمجھ بیٹھے جب　　ریگ زاروں میں سمندر دیکھے

منصور عاقل

فصلِ گُل آئی ہے اب کے عجب انداز کے ساتھ　　ایک ہی نغمۂ جاں سوز ہے ہر ساز کے ساتھ
کچھ تو ارشاد ہو اے محوِ تماشائے بہار　　خود بکھر جائیں گے نغمے تری آواز کے ساتھ
خامشی میں بھی تکلّم کی ادا ہو جیسے　　لاکھ پہلو ہیں سخن کے لبِ اعجاز کے ساتھ
ہے نظامِ دل و جاں آج بھی برہم برہم　　اُس نے دیکھا تھا نگاہِ غلط انداز کے ساتھ
سامنے جشنِ بہاراں تھا نشیمن کے قریب　　حسرتیں اور بھی تھیں حسرتِ پرواز کے ساتھ
پتھروں کو بھی عطا کی ہے سماعت تو نے　　دل پگھلتے ہیں تری گرمیٔ آواز کے ساتھ
محوِ پرواز ہے شاہینِ تخیل عاقلؔ　　رقص میں صیدِ معانی بھی ہے شہباز کے ساتھ

اطہر نادر

کبھی خیال کی صورت کبھی ادا بن کر　　شمیم دل میں وہ رہتا ہے دل رُبا بن کر
نہ جانے کون تھا جو مجھ کو کر گیا تنہا　　وہ اجنبی کہ ملا تھا اِک آشنا بن کر
نہ جانے کون سی منزل ہے یہ محبت کی　　ترا خیال بھی آیا ہے حوصلا بن کر
ہمارے دل کی صدا جب صدا بصحرا ہے　　پکارتا ہے یہ پھر کون ہم نوا بن کر
ہمارے حال کی سب کو خبر ہے اے نادرؔ　　مگر نہ آیا کوئی درد کی دوا بن کر

ستیدہ حنا

بزمِ یارانِ وطن یاد آئی　　گرمیٔ شعر و سخن یاد آئی
یاد آئی وہ تخیل کی اُڑان　　اپنے پیروں کی تھکن یاد آئی
روح میں پھر کئی نشتر اُترے　　اُس کے لہجے کی چُبھن یاد آئی

یاد آیا وہ بہاروں کا غرور
لالہ و گل کی پھبن یاد آئی

رب نواز مائل

صدا و صوت کا اک حسنِ صد نشاں بن کر
لبوں سے پھول برستے ہیں ہچکیاں بن کر

نشاں ہمیں سے تو پاؤ گے ایسے کتنوں کے
زمیں ملی جنھیں ہر سمت آسماں بن کر

زمیں کو نیند کی حالت میں پھر نہ دیکھو گے
ہم اپنے آپ میں جاگیں جو آندھیاں بن کر

تعینات کی حد کام کیا سفر میں دے
کہ دشت دشت گزرنا ہے بدلیاں بن کر

کٹے جو زیست تو اس طور سے کٹے مائل
رہیں زمانے میں پُرشوق داستاں بن کر

نورالزماں احمد اوج

اشک پلکوں پہ جو ٹھہرا ہوگا
حاصلِ عرضِ تمنا ہوگا

ذرے ذرے میں بسی ہے خوشبو
کوئی اِس راہ سے گزرا ہوگا

ایک دل ہوگا شریکِ شبِ غم
دوسرا صبح کا تارا ہوگا

آپ دامن نہ چھڑائیں مجھ سے
میں نہ ہوں گا مرا سایا ہوگا

تیرے قدموں کی وہ آہٹ ہوگی
دل مرا یوں ہی نہ دھڑکا ہوگا

راشد مفتی

ایک ہی دام کے حلقے نظر آتے ہیں مجھے
اپنی گردن سے جو تیری رگِ جاں تک دیکھوں

دیکھنی ہے مجھے ہر سمت یہی پھیلتی آگ
اپنے گھر تک نہ سہی تیرے مکاں تک دیکھوں

ہاں اسی سمت سے پھوٹے گا اُجالا لیکن
ٹکٹکی باندھ کے اس سمت کہاں تک دیکھوں

اپنے ہی خوں سے ابھاروں کوئی سورج راشد
انتظارِ سحرِ تازہ کہاں تک دیکھوں

شفیق بانو

دور تک پھیلا ہوا ہے میری آہوں کا دھواں
آپ کہتے ہیں کہ بادل آسماں پر چھائے ہیں

چیختی چمگادڑیں ہیں اور لپکتے اژدہے
کس قدر ہیبت زدہ ان برگدوں کے سائے ہیں

وقت کی آندھی اُڑا کر لے گئی دیوار و در
اب بھی گہری نیند میں بیٹھے مرے ہمسائے ہیں

گونج اٹھی ہیں سکوتِ شب میں میری خلوتیں
کس نے اپنی یاد کے کنگن مجھے پہنائے ہیں

ہم نے رکھی ہے بنائے عظمتِ انساں شفیق
ہم نے اپنے غم بھلا کر سب کے دکھ اپنائے ہیں

توصیف تبسّم

کیا تیز زمانے کی ہوا ہے
دل صورتِ برگ کانپتا ہے

کھلتے ہوئے پھول سے نگاہیں
پلٹی ہیں تو زخم سا لگا ہے

پہلو میں نہیں قرار دل کو
گر ہو بھی تو اعتبار کیا ہے

رہ رو کو پکارتی ہے منزل
ہر فاصلہ دور کی صدا ہے

دل جس میں ہزار ہا بھنور ہیں
ساحل کا سکون ڈھونڈتا ہے

آذر تمنّا

ڈوب کر مجھ میں کوئی میرا پتہ لا سکتا
میں جو دراصل ہوں اسے کاش نظر آ سکتا

بڑھ چکی پیاس تو پانی کی حدوں سے آگے
اب مجھے تیرا سمندر نہیں ترسا سکتا

زاد بیلے لاکھ عذابوں کا یہ سورج بدلے
چاند احساس کا لیکن نہیں گہنا سکتا

ایسے بادل سے تعلق ہی عبث ہے آذر
میرے کھیتوں میں جو بارش نہیں برسا سکتا

جاذب قریشی

تو کرن بھی ہے، ستارہ بھی ہے، جگنو بھی ہے
میں تجھے ڈھونڈنے تا حدِ نظر جاؤں گا

اپنی آواز کے تابوت میں زندہ ہوں مگر
زندگی مجھ کو پکارے گی تو مر جاؤں گا

حرفِ غم لذتِ اظہار اگر چاہے گا
دھوپ بن کر ترے آنگن سے گزر جاؤں گا

میں سفر بھی ہوں، مسافر بھی ہوں، سایہ بھی ہوں
تو ملے گا تو شجر بن کے ٹھہر جاؤں گا

سرور سودائی

تو ہی تو ہے مرے احساس کے ویرانے میں
اپنے زخموں میں تجھے اور کہاں تک دیکھوں

دشتِ بے آب لگے قلزمِ پایاب کبھی
دل کے صحرا میں کبھی آب رواں تک دیکھوں

جس کی آغوش سکوں بخش تھی، اب تیرے بعد
شعلۂ درد میں لپٹا وہ مکاں تک دیکھوں

شریف منور

نہ اس کا گھر وہ عمارت، نہ میں مکینوں میں
ہمارا ساتھ رہا تھوڑی دور زینوں میں

کوئی سنے نہ سنے ہم تو سامنے لائے
وہ رازہائے جنوں دفن تھے جو سینوں میں

یہ تیز و تند ہوا یہ مہیب سناٹا — اداس سماں ہیں مکانوں میں یا مکینوں میں
سمندروں پہ منوّر وہ طنز کرتے ہیں — کنارِ آب بھی بیٹھے ہیں جو سفینوں میں

کبیر انور جعفری

نہ آرزو ہے چمن کی، نہ آشیانے کی — مجھے تو راس نہ آئی ہوا زمانے کی
کسی کے عشق میں مٹ کر یہ مرتبہ پایا — اُڑائے پھرتی ہے مجھ کو ہوا زمانے کی
قفس نصیب نگاہیں خزاں میں اُلجھی ہیں — ہوئی خبر بھی نہ ہم کو بہار آنے کی

نجم الحسن نجمی

اپنے سائے کو بھی دیکھوں گا تو ڈر جاؤں گا — میں تو اس شدتِ احساس سے مر جاؤں گا
راکھ بن جاؤں گا اک روز تری یادوں کی — ایک دن میں ترے دل سے بھی اتر جاؤں گا
کیسے چہرے پہ سجاؤں گا یہ اندھی آنکھیں — ڈھلتے سورج! میں ترے ساتھ ہی مر جاؤں گا
ایک سایا ہوں مرا ساتھ کوئی کیا دے گا — ایک جھونکا ہوں میں پل بھر میں بکھر جاؤں گا
جسم گرتی ہوئی دیوار رہا ہے نجمی — ایک ٹھوکر بھی لگے گی تو بکھر جاؤں گا

اصغر مہدی

با وفا خار سدا رہتے ہیں گلزاروں میں — بے وفا گُل ہیں جو آ جاتے ہیں بازاروں میں
دل کو نیلام نہ کرتا میں بھری محفل میں — آپ کا نام نہ سُنتا جو خریداروں میں

محمد اظہار الحق

رخصتی ہے کسی ارمان کی دل کے گھر سے — آنکھ کے در کو چراغوں سے سجایا جائے
رات لمحوں کی صلیبیں لیے اُتری اظہار — سوگ نیندوں کی شہادت کا منایا جائے

زمان ملک

جو دل کی جھیل میں اُترا ہے چاند کی صورت — اُسے میں ڈھونڈنے نکلوں مگر کدھر جاؤں
مرا بھی عکس تجھے آئینے میں آئے نظر — میں اشک بن کے تری آنکھ میں اتر جاؤں
مری جبیں پہ بہار و خزاں کے رنگ جمے — یہ موسموں کا سفر ختم ہو تو گھر جاؤں

مقبول قریشی

نہ سہی خندۂ گل زخم ہی چٹکا ہوتا　　کوئی ہنگامہ تو اس حبس میں برپا ہوتا
ڈس گئیں صبحِ تمنا کی رو پہلی کرنیں　　میں سیہ بخت ہی رہتا تو یہ اچھا ہوتا
چاندنی اب بھی مچلتی ہے سرِ آبِ رواں　　کتنا اچھا تھا جو تو بھی سرِ دریا ہوتا

صابر ظفر

مجھ کو تو صرف اپنے کیے کا صلا ملا　　میں سوچتا ہوں تیری وساطت سے کیا ملا
تجھ سے بچھڑ کے مجھ پہ کچھ ایسے بُرے دن آئے　　میں اپنی صف کو چھوڑ کے دشمن سے جا ملا
میں ہم سفر نہ بن سکا اُس کا کسی طرح　　وہ راہ میں ملا بھی تو مثلِ صبا ملا

معیارِ وفا

وقت بدلا پہ نہ بدلا مرا معیارِ وفا

احمد ندیم قاسمی

غیر مطبوعہ خطوط

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام

(۱)

مکتبۂ اردو، لاہور۔ ۱۰ مارچ ۱۹۴۴ء

برادر مکرم ــــ سلام مسنون!

اب تک آپ کے گرامی نامے کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن جناب شوکت صدیقی صاحب کے خط سے یہ پڑھ کر بے حد صدمہ ہوا، کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں، میں کبھی شبہ تک نہیں کر سکتا تھا، کہ عبادت بھائی، مجھ سے روٹھ جائیں گے، میں تو کچھ اور سمجھے بیٹھا تھا، اور اپنے ذہن میں ایسے تعلقات استوار کر رکھے تھے، جو مدیرانہ یا ادیبانہ ہونے کے بجائے دوستانہ اور برادرانہ تھے۔

اس ناراضی کی وجہ کا بھی مجھے شوکت صاحب کے خط ہی سے علم ہوا۔ بلاشبہ میں نے آپ کے مضمون میں چند اضافے کیے تھے، لیکن اس کے متعلق میری گذارشات سُن لیجیے۔

آپ نے ہی فرمایا تھا کہ چونکہ یہ مضمون اکتوبر کے مضامین اور کتب تک محدود ہے، اس لیے تم مناسب اضافہ کر دینا۔ اس کے علاوہ (جیسا کہ میں نے پہلے عریضہ ہی میں لکھ دیا تھا) آپ نے چند کتابوں کے پبلشروں کے نام ٹھیک نہیں لکھے تھے، خود میری کتاب "دھڑکن" دارالاشاعت والوں نے نہیں چھاپی۔ اردو اکیڈیمی والوں نے شایع کی تھی، اسی طرح آپ نے "زندگی کے موڑ پر" کے متعلق تحریر فرمایا تھا کہ ابھی تک نہیں چھپی۔ لیکن آپ کا مضمون ملا تو وہ تیار ہو چکی تھی، یقیناً آپ گر غور فرمائیں گے۔ تو مجھے اس ضمن میں بے گناہ پائیں گے۔

میں نے اپنے افسانوں یا نظموں کے عنوان بڑھا دیے تھے، تو صرف اس لیے کہ آپ نے وہاں جگہ خالی چھوڑ دی تھی، مکتبۂ اردو کے متعلق آپ نہایت اچھی رائے کا اظہار فرما رہے تھے، میں نے گرد پوشوں اور آٹھ آنہ سیریز کا نہایت مختصر سا ذکر کر دیا۔ اور اس کے علاوہ مستقبل کے شعرا میں فکر تونسوی صاحب کا نام لکھ دیا ہے۔ ان تمام تبدیلیوں کی ذمہ داری مجھ پر عاید ہوتی ہے، اگر آپ نے واقعی محسوس کیا ہے تو میں نہایت عاجزی سے عفو کا طلب گار ہوں۔ یہ عرض کر دوں، کہ اگر ان افسانوں

کسی نوع کا پروپیگنڈا مدنظر ہوتا تو کیا میں آپ کو یہ لکھتا کہ آپ ساغر نظامی اور علی عباس حسینی وغیرہ کے متعلق کچھ بہتر الفاظ لکھیں، کیونکہ مکتبۂ اردو والوں نے ان کے مجموعے خریدے ہیں" اور ان کتابوں پر بُرا اثر پڑے گا۔ لیکن یہ ایک نقاد کی ذاتی رائے تھی، جس میں تبدیلی کا نہ مجھے حق تھا، نہ میں نے کوئی تبدیلی کی۔ باور فرمایئے، کہ جن حضرات کے متعلق آپ نے مایوسی کا اظہار کیا تھا، انھوں نے لمبے لمبے خطوں میں میری وہ خبر لی ہے، کہ کیا عرض کروں ایسے ایسے الفاظ تحریر کیے ہیں، کہ یہاں لکھتے ہوئے جھجکتا ہوں، لیکن میں نے سب کو یہی جواب دیا ہے کہ یہ عبادت صاحب کی اپنی رائے ہے، وہ نہایت کامیاب نقاد ہیں، اور ایک کامیاب نقاد کی ذاتی رائے میں ایڈیٹر کسی قسم کا تعرض نہیں کرسکتا۔

یہ میں حقیقت بیان کررہا ہوں، اور میرا خط محض اس لیے طول کھینچ رہا ہے، کہ آپ جملہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے معاف کردیں۔ میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے ذہنی طور پر بے حد تکلیف ہوگی۔ مجھے بواپسی ڈاک یہ لکھیے کہ آپ اسی طرح میرے قریب ہیں جیسے پہلے تھے، ساتھ ہی سال: ۴۵ء ادب لطیف کا مکمل جائزہ لیں۔ اور اُسے ایک مقالہ کی صورت میں بھیج دیں، تو مجھ پر احسان ہوگا، اور میں آپ کی رائے، آپ کے مقالے، اور آپ کے گرامی نامے کا نہایت شوق سے انتظار کروں گا۔

میں جناب احتشام حسین صاحب کی خدمت میں بھی لکھ رہا ہوں، کہ یہاں لاہور میں "عالمگیر" اور "خیام" کے ایڈیٹر اور ان کے ناکام ادیب دوستوں نے ایک محاذ قائم کیا ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے ہر نمبر میں خصوصاً "ادب لطیف" پر لعن طعن کرتے ہیں۔ تازہ خیام میں تو حکومت کو اُکسایا گیا ہے، کہ وہ "بو" کی عریانی کے مدنظر قانونی کارروائی کرے۔ ان خدائی فوجداروں کا مقصد محض یہ ہے کہ ان کا ذکر بھی ترقی پسند حلقوں میں ہونے لگے۔ ادھر "ادبی دنیا" کی بدلتی ہوئی روش کا آپ نے بخوبی اندازہ لگا لیا ہوگا۔ اور پھر اگر آپ غور کریں گے تو آپ محسوس فرمائیں گے، کہ میں یہاں بالکل اکیلا ہوں۔ حلقۂ ارباب ذوق والوں نے بھی اب کے ایک چُھری لی ہے، اور ترقی پسندوں کے زمرے سے خارج ہونے کا اعلان کردیا ہے۔ اب آپ ہی فرمایئے، میں احتشام حسین۔ عبادت بریلوی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی وغیرہ کی امداد کے بغیر کیا کرسکوں گا۔ مجھے آپ کی دستگیری درکار ہے۔ مجھے آپ کبھی ناامید نہ پائیں گے، اور میں نئے ادب کی ہمیشہ ہمیشہ وکالت کرتا رہوں گا۔ لیکن آپ سب حضرات کی توجہ، فوری توجہ کی بھی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے، کہ آپ نے اب تک مجھے معاف کردیا ہوگا، اور مجھے ان تمام باتوں کا مفصل اور تسلی بخش جواب مرحمت فرمائیں گے، جن کا ذکر میں اوپر کرچکا ہوں۔ کیا آپ یقین کریں گے، کہ سالنامے کے متعلق مجھے سب سے اول آپ کی اور احتشام صاحب کی رائے کی تلاش رہی، لیکن بری طرح ناکام رہا۔ یہ بیگانگی میرے لیے بہت نقصان دہ ہے۔ کیونکہ میں بندۂ خلوص ہوں، اور آپ حضرات ہی میں میرے خلوص کو کچھ پناہ ملی تھی۔

والسلام　　طالب التفات

احمد ندیم

(۲)

۳۱۔ ملک بلڈنگ۔ میورروڈ۔ لاہور

۱۴راپریل ۴۵ء ۱۹ء

عبادت بھائی!۔۔۔ سلام مسنون!

میرا کارڈ آپ کو مل چکا ہوگا۔ بہت شرمندہ ہوں، کہ آپ کے مفصل گرامی نامے کے جواب میں اتنی تاخیر کا مرتکب ہوا۔ دراصل عدالت، سستی اور گاہے گاہے سالنامے کے سلسلہ میں مصروفیت حائل رہی، نہایت عاجزی سے معافی خواہ ہوں۔

آپ نے مجھے لکھنؤ آنے کے لیے بھی کہا تھا، اور اب دلّی آنے کی دعوت بھی دے رہے ہیں، لیکن میری حالت اور دیگر حالات اس نوع کے ہیں، کہ مقدمہ کے انجام کے بعد مجھے فوراً گاؤں چلے جانا چاہیے۔ ویسے یقین فرمائیے کہ آپ کی دعوت سے مجھے روحانی مسرت حاصل ہوئی ہے۔ میں خلوص اور محبت کا بھوکا ہوں، اور آپ کے وجود میں مجھے اس جنس نایاب کے خزانے ملتے نظر آتے ہیں، اللہ کرے میں بھی آپ کی کسی خدمت کے قابل ہو سکوں۔

ساحر صاحب کے خط کے متعلق میں نے شاید پہلے عرض کر دیا تھا۔ ساحر صاحب بڑے اچھے دوست اور مخلص نوجوان ہیں، ناتجربہ کاری کے باعث تیزی کر بیٹھے، حالانکہ میں نے سب دفتر والوں کو منع کر دیا تھا، کہ مجھے عبادت بھائی سے اس معاملے کے بارے میں پوچھ لینے دو، میری موجودگی میں ادبِ لطیف کے متعلق عبادت بھائی کا یہ "رزیہ" ناقابلِ یقین ہے، مگر ان سے لغزش ہوئی، امید ہے آپ نے ہم سب کو معاف کر دیا ہوگا۔

"تنقید نگاری" سالنامہ کے لیے لکھا جا چکا ہے، میرا ارادہ تھا کہ اب کے بھی سالنامہ کو اس شان و شوکت سے شائع کروں، لیکن محترمی احتشام صاحب علالت کی وجہ سے مقالہ نہیں روانہ فرما سکے اور مجھے اس کا بے انتہا دکھ ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ عبادت صاحب نے بھی مجھے مقالہ کے لیے کہا ہے، لیکن میں بیماری کے باعث معذور ہوں۔ اب آپ ہی بتائیے احتشام صاحب کا مقالہ کس طرح حاصل کیا جائے، مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی چیز تیار ہوتی تو وہ ضرور مرحمت فرماتے۔ ان کی غیر موجودگی سالنامہ کو بے رونق بنا دے گی، کیا کروں؟

"تنقید نگاری" بڑا عالمانہ مقالہ ہے۔ میں خود ہی اسے پڑھوں گا اور کوشش کروں گا کہ کتابت کی کوئی غلطی نہ رہے۔ میری غیر موجودگی میں کتابت کی غلطیوں نے کئی معاونین کو بدظن کر دیا ہے۔

عربک کالج کی ملازمت مستقل ہے، یا آپ نے کوئی اور پروگرام سوچ رکھا ہے؟ ذرا لکھیے تو کہ آپ آئندہ یہیں رہیں گے یا کہیں اور بھی کوشش جاری ہے۔ اگر آپ لاہور میں تشریف لانا چاہیں، تو (یہ بات صرف آپ تک محدود رہے) آپ یہاں بحیثیت ایڈیٹر ادبِ لطیف تشریف لا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی مکتبۂ اردو کے دوسرے بے شمار کام ہیں، یعنی مسودوں کے بارے میں رائے دینا وغیرہ۔ ان کا بھی معقول معاوضہ ہو سکتا ہے۔ چودھری صاحبان نے ایک مرتبہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ اگر عبادت صاحب یہاں ہوتے تو کیا اچھا ہوتا۔ چونکہ مئی کے شروع میں چار پانچ ماہ کے لیے گاؤں چلا جاؤں گا، اور گاؤں سے واپسی پر خدا جانے کہاں جاؤں، اس لیے ادبِ لطیف کی ادارت، سالنامہ کی اشاعت کے بعد ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ بہر صورت اگر یہ معاملہ آپ کے مستقبل کے پروگرام میں حارج نہ ہو، تو ضرور غور فرمائیے، ورنہ مجھے فوراً مطلع کیجیے، اور یہ بات محض اپنے تک محدود رکھیے۔۔۔

"اردو شاعری میں عریانی" میرے پاس محفوظ ہے، کتابت شدہ کاپیاں بھی پڑی ہیں، موقع ہی نہیں ملا۔ اگر آپ فرمائیں، تو مئی نمبر کے لیے رکھ لوں، ورنہ مسودہ محفوظ ہے، بے فکر رہیں۔۔۔

مئی سے ہم ادبِ لطیف میں "ادبی باتیں" یا کسی اور مناسب عنوان سے ایک سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ آپ نے بھی لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے، اور فراق صاحب نے بھی، سو تیار رہیے۔

آپ نے لکھا تھا کہ موسم کی تبدیلی کے باعث آپ کی طبیعت بھی خراب رہتی ہے۔ اللہ کرے آپ اب بالکل تندرست ہوں، اپنی صحت کے بارے میں ضرور لکھیے۔

میں اب پہلے سے اچھا ہوں، لیکن دماغی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ جب یہ عریضہ شروع کیا تھا تو بالکل ٹھیک تھا، اور اب یہاں تک پہنچا ہوں، تو دماغ مخمص ہو چکا ہے۔ حیران ہوں کیا کروں؟

آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔۔۔۔۔ والسلام آپ کا بھائی

احمد ندیم

(۳)

انگہ، تحصیل خوشاب، ضلع سرگودھا (پنجاب)

۲۴ر اگست ۱۹۴۵ء

برادر محترم ۔۔۔۔۔۔۔۔ السلام علیکم!

نامۂ گرامی ورود فرما ہوا، شکریہ، ساتھ ہی مقالے کے لیے بے انتہا شکریہ، بیشتر حضرات ایسے ہی جنھیں ادبِ لطیف کے لیے لکھوں، تو وہ محض یہی کہتے ہیں، کہ تمھاری وجہ سے ادبِ لطیف سے ہمارا تعلق قایم تھا، ورنہ دفتر کے اصول اور دیگر زیادتیاں ہمیں ادبِ لطیف میں لکھنے سے ہمیشہ روکتے رہے ہیں۔ میں چودھری صاحب سے زبانی بھی اکثر گفتگو کرتا رہا ہوں اور اب انھیں لکھا بھی ہے، کہ دفتر کے نظام میں انقلاب برپا کیجیے اور اپنے معاونین کرام کو ناراض نہ کیجیے۔ اگر لاہور جا کر مجھے پھر ادبِ لطیف کی ادارت سنبھالنا پڑی، تو انشاء اللہ اس ضمن میں خاص سعی کروں گا۔ اب تو خیر افسانہ نمبر کی ترتیب پیشِ نظر ہے۔ اس کے فوراً بعد مجھے آپ کی "تنقیدی جھلکیاں" کی ضرورت پڑے گی، مجھے افسوس ہے کہ مکتبہ والوں کے تغافل نے آپ کو اتنے اچھے تعمیری اور مفید ادبی کام سے روک دیا۔

مکتبہ کھولنے اور رسالہ جاری کرنے کا عزم بالجزم کر چکا ہوں۔ لیکن چاہتا ہوں، کہ شروع ہی میں اتنا سرمایہ فراہم کر لوں، کہ پانچ چھ مہینوں کے نقصان کو بہ آسانی برداشت کر لیا جائے۔ رسالے کے متعلق اگر میرے خواب حقیقت کا روپ بدل سکیں، تو اردو جرنلزم کا رخ ہی بدل جائے گا۔ مجھے آپ ایسے بھیوں اور محبوں پر جو غیر فانی اعتماد ہے، وہ مجھے بار بار اس کام کو جلد از جلد شروع کرنے پر اُکساتا ہے۔ آپ کو جملہ حالات سے باقاعدہ مطلع کرتا رہوں گا۔

دلی والے تو اپنے شہر کی تعریف میں، زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں، اور آپ ان کا شکوہ کر رہے ہیں۔ مگر بھائی، حقیقت یہ ہے کہ جس طرح (میرے ذاتی خیال میں) صوبجاتی تعصب، دروطنی دیوانگی گردن زدنی ہیں، بالکل اسی طرح شہری تعصب کو بھی نابود ہو جانا چاہیے۔ اپنے شہر کو ایک دنیا سمجھ لینا، اور پھر اپنی اس سمجھ پر ناز کرنا اور اس سے اِدھر اُدھر نہ ہونا خصوصیت سے دلی والوں کا عقیدہ ہے۔ لکھنؤ تو قطعی طور سے (ایک بڑی حد تک) ادبی لحاظ سے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ یہی حال لاہور کا ہے، حیدر آباد میں ابھی تک "حیدر آبادیت" کے جراثیم موجود ہیں، جنھیں ترقی پسند نشتروں

سے خارج کر دینا چاہیے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سے دفتر ادب لطیف میں ملاقات ہوئی تھی، محض سرسری، مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ نئے ادیبوں کو پسند کرتے ہیں، یہ تو آپ نے بہت خوشی کی بات سنائی۔

نجمہ تصدق کے متعلق میں بار بار اس لیے پوچھتا ہوں، کہ ان سے کئی لڑکیاں خط و کتابت کرتی ہیں، اور اکثر کے نہایت گہرے (نادیدہ) تعلقات ہیں، نجمہ تصدق "نجم تصدق" کا شبہ پڑتے ہی وہ سب مخمصے میں پڑی ہوئی ہیں۔ ان میں سے اکثر نے مجھ سے پوچھا ہے، اور میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ ہو سکے تو "ریسرچ" کو مکمل کیجیے، اور اگر کچھ مشکل ہو تو رہنے دیجیے۔ گر وہ جہلم میں تشریف فرما ہیں تو جہلم میرے زیادہ قریب ہے، میں سلام کر لوں گا۔

چندر کانت کو ایک مرتبہ میں نے دفتر ادب لطیف میں دیکھا تھا۔ ایک افسانہ لے کر آئے تھے۔ میں نے اس کو قابلِ اعتراض سمجھ کر یہاں سے واپس بھیج دیا۔ مگر چودھری نذیر صاحب کو ان کی خاطر داری منظور تھی، انھوں نے چند فقرات حذف کر کے افسانہ شایع کر دیا۔ البتہ ساحر لدھیانوی صاحب سے اس کے تعلقات ہیں، میں ساحر کو لکھوں گا، اور چندر کانت نوٹس واپس لے گا، معمولی بات ہے، نہ جانے اسے کیا خیال آیا، حالانکہ اس کا درجہ بحیثیت افسانہ نویس ابھی قابل اعتنا ہی نہیں، ــــ شاید اسے کتاب ہی نہ بھیجی گئی ہو، یہی ایک وجہ اس کی ناراضی کی ہو سکتی ہے۔

یہاں کا موسم نہایت خوش گوار ہے، لیکن رومانی نظمیں؟ــــ میں تو جی بھر کر خط بھی نہیں لکھ سکتا، اب آپ کو نہ جانے کیا کیا لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن دماغ کے ٹھس ہو جانے کے باعث بہت تیزی سے کام لے رہا ہوں، دعا کیجیے۔

دسمبر میں انشاء اللہ ضرور لاہور میں ہوں گا، ترقی پسند کانفرنس میں شمولیت کی بڑی خواہش تھی مگر صحت اجازت نہیں دیتی کیا کروں؟

اور ہاں ــ میں اپنی تازہ کتاب "رم جھم" آپ کو بذریعہ پارسل بھجوا رہا ہوں، ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو بھی ناشر صاحب ایک جلد بھیجیں گے۔ ان سے ذکر بھی کر دیجیے گا، اور اس کے متعلق اپنی رائے بھی لکھیے گا۔ یہ کتاب مجھے بہت عزیز ہے، "اردو شاعری میں عریانی" افسانہ نمبر کے فوراً بعد چھپ جائے گا، اب کے کوتاہی نہ ہوگی۔

والسلام

آپ کا بھائی احمد ندیم

(۴)

انگہ، تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا (پنجاب)

۲۱ اکتوبر ۱۹۴۵ء

مکرم بھائی ــــ السلام علیکم!

گرامی نامہ ملا۔ عنایت فرمائی کا شکریہ ــــ

علیم صاحب اور احتشام صاحب سے حیدرآباد کانفرنس کے متعلق کچھ حالات معلوم ہوئے ہوں تو مجھے ضرور لکھیے گا۔

"رم جھم" کے متعلق اگر مضمون "ادبی دنیا" میں شایع ہو تو بہتر رہے گا، کیونکہ میرے قطعات "نیرنگ" میں چھپتے ہیں۔

اور اگر ادبی دنیا میں نہ بھیج سکیں، تو پھر "ساقی" ہی سہی۔

اپنی شاعری کے متعلق میں کیا عرض کروں ۔۔ میرے بھائی! بس اتنی سی بات ہے، کہ میں تمام ترقی پسند شعرا کے برخلاف مشرق کی روحانیت کا قائل ہوں، مادہ غیر فانی سہی، لیکن مادہ پرستی کے کرشمے آپ کے سامنے ہیں، مگر میں اس روحانیت سے دور بھاگتا ہوں۔ جو ایشیائی تصوف سے وابستہ ہے اور جس پر ہندو علم الاصنام کا اثر اسلام سے زیادہ ہے۔ میں حسن و عشق کو ہر فن کی بنیاد سمجھتا ہوں۔ اور حسن و عشق زندگی کی بہت عظیم حقیقتیں ہیں۔ آپ کو میری ان باتوں پر حیرت تو نہیں ہو رہی؟ بہر صورت مجھے یقین ہے، کہ آپ نے میری شاعری کے متعلق جو رائے قایم کر رکھی ہوگی، وہ ضرور صائب اور بلند ہوگی ۔۔

اپنے مضامین کے مجموعہ کی اشاعت کے لیے آپ نے کیا کیا؟ میں تو علالت کے باعث کچھ نہ کر سکا، اور آج تک شرمندہ ہوں، میرے خیال میں "ساقی" یا "چمنستان" والوں سے اس معاملہ میں بات چیت کیجیے، اور مضامین جلد چھپوائیے۔

دلی میں ادیب اور شاعر حضرات تو لاتعداد ہیں، نہ جانے لکھنؤ کا سا ماحول کیوں نہیں مل سکتا! آپ کو اگر فرصت ہو تو ایک ننھی سی انجمن بنا لیجیے، ہر اتوار کو جلسے کیجیے، اس انجمن کا ماحول ہی لکھنؤ کی محفلوں کا ایک حد تک بدل ثابت ہوگا ۔۔

میں جب بھی لاہور آیا آپ کو مطلع کروں گا۔ کاش آپ میری موجودگی میں وہاں تشریف لائیں ۔۔

ایک طویل مختصر افسانہ "کفارہ" لکھا ہے، جو میرے خیال میں اچھا خاصا ہے، بہر صورت میری علالت کی یادگار ہے ۔۔۔ آپ کی تصویر؟

آپ کا بھائی

۔۔۔۔ احمد ندیم

(۵)

انگہ تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا (پنجاب)

۱۹/۱۲/۱۹۴۵ء

برادر محترم ۔۔۔۔ السلام علیکم!

گرامی نامہ ملا، تاخیر انتقاماً نہیں ہوئی، مجبوراً ہوئی، میں مسلم لیگ کا عقیدت مند ہوں، اور ان دنوں الیکشن کے پروپیگنڈے زور شور سے جاری ہیں۔ دیہات میں ادھر ادھر گھومنا بھی پڑتا ہے۔ پھر چودھری نذیر احمد صاحب یہاں آنکلے۔ ان کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اٹھارہ طلبہ کا وفد آگیا۔ کل فارغ ہو سکا ہوں۔ ہر روز ارادہ کرتا تھا کہ بھائی عبادت کو مفصل خط لکھتا ہوں۔ مگر اچانک کوئی نہ کوئی کام آپڑتا تھا۔

اچھا تو آپ بھی MOODY ہیں اور MOODS میں یقین رکھتے ہیں، مجھے اس کا علم نہ تھا، اگرچہ ہر انسان موڈی ہے۔ مگر میں اپنے اوپر موڈ کو اس حد تک طاری نہیں کرتا کہ میں مٹ جاؤں اور موڈ باقی رہ جائے۔ خدا میرے معاملہ میں موڈ کو اتنی اہمیت نہ دیجیے گا۔

ڈاکٹر تاثیر صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے یہی فرمایا تھا کہ تمھیں وہم کی بیماری ہے۔ ان کے کان میرے کرم دوست سجاد سرور صاحب نیازی ڈائرکٹر پشاور ریڈیو نے بھرے ہیں۔ انھیں بھی وہم ہے کہ میں وہم زدہ ہوں۔

NERVOUS BREAKDOWN کا مرض وہم ہی سے پھوٹتا پھیلتا ہے۔ میں سچ مچ اس کا شکار رہا ہوں اور ایک مرتبہ تو وہم کی افراط مجھے پاگل بنانے لگی تھی، مگر اب یہ بات نہیں۔ بہر صورت آپ کے مخلصانہ مشورہ کے مطابق کوشش کروں گا کہ تندرست رہوں اور محسوس کروں کہ تندرست ہوں۔

چودھری نذیر صاحب مجھے ادب لطیف کی ادارت کے لیے مجبور کرتے ہیں، سالنامہ پر میرا نام لکھنے دے ہیں۔۔۔ (آپ کا مقالہ ہندوستانی میں عریانی) سالنامہ میں شامل ہوگا)۔ بہرکیف ابھی معاملہ میرے زیر غور ہے۔ آپ کا کیا مشورہ ہے؟ میرا تازہ طویل مختصر افسانہ ہاجرہ مسرور صاحبہ کے ایک منتخب مجموعہ "یہ ہندوستان ہے" میں شایع ہوگا۔ ایک افسانہ ساقی میں شایع ہو رہا ہے۔ تازہ نظمیں ساقی، چمنستان، ہمایوں وغیرہ میں نکل رہی ہیں۔ ایک تازہ شعر عرض کرتا ہوں ؎

تصور آپ کا، احساس اپنا، ہم ہی دل کی   محبت کی اسی تقسیم نے منزل سے بہکایا

میری خوش نصیبی ہوگی اگر آپ میری شاعری پر مضمون تحریر فرمائیں، لیکن سب سے اول "دھڑکنیں" پر ایک مضمون کو فراموش نہیں فرمایئے گا، جس کا آپ نے وعدہ فرمایا تھا، اور جس کو "ادبی دنیا" میں شایع ہونا تھا۔ میں اس کا منتظر ہوں۔

جلال و جمال انشاء اللہ مارچ تک چھپ جائے گی۔ میں نے انتخاب تقریباً مکمل کر لیا ہے۔ تنقیدی جھنکیوں کا سلسلہ آپ ہی کے مشورہ سے ادب لطیف میں شروع ہوا تھا۔ نیا مضمون ادب لطیف کو بھیج چکا ہوں۔ بہر صورت میں ادب لطیف میں آگیا تو یہ سمجھیے کہ آپ کے مضامین کا ٹھیکہ لے لوں گا۔۔۔ ہمیشہ کی طرح۔

آپ نے اب تک اپنی تصویر نہ بھجوائی۔

بڑا بے ربط خط لکھا ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔

اللہ تعالےٰ آپ کو ہمیشہ خوش اور تندرست رکھے، میرے دل میں آپ کی محبت بے انتہا اور بے اندازہ ہے۔ کاش ہم مل سکتے!۔۔۔۔

آپ کا بھائی

۔۔۔۔۔ احمد ندیم

پروفیسر مجتبیٰ حسین کے نام

عقب دیال سنگھ لائبریری۔ نسبت روڈ۔ لاہور۔

۶ ستمبر ۱۹۵۹ء۔

محبی مجتبیٰ صاحب ۔۔۔۔ سلام مسنون!

یقین فرمایئے آپ کا خط پاکر بے حد مسرت ہوئی۔

گزشتہ چند برس میں کراچی سے آنے والے متعدد احباب کچھ اس قسم کی خبریں لاتے رہے جن سے مترشح ہوتا تھا کہ آپ مجھ سے خفا ہیں اور ادھر آپ کے مضامین میں اپنی ذات اور اپنے فن کو قطعی طور سے غائب پاکر کچھ یقین سا ہو چلا تھا کہ بات کچھ ایسی ہی ہے۔ اب آپ کا خط ملا تو یقین کیجیے، سب کدورت دور ہوگئی۔ میں اپنے نظریے اور اپنے فن پر

تنقید کا حق آپ کو نہیں دوں گا تو کیا ایم۔ اسلم کو دوں گا؟ آپ متوازن اور معتدل نقاد ہیں۔ آپ کے پاس خود اعتمادی کا جوہر بھی ہے۔ اس صورت میں مجھے تو آپ کی تنقید سے خوش ہونا چاہیے۔ میں تو ایک بالکل نو آموز ادیب کو بھی تنقید کا حق دیتا ہوں اور آپ تو ماشاءاللہ مسلّمہ نقاد ہیں۔ اگر آپ میرے فن کو اپنی تنقیدوں میں تذکرے کے لائق نہیں پاتے تو مجھے قطعی شکایت نہیں ہے۔ میں اپنی دھن میں لگا رہوں گا۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ میں سامنے کی بات کہنے کے بجائے فکر کی چمک پیدا کرنے میں کوشاں ہوں۔ اور میں فن میں ڈھول پیٹنے کا عادی نہیں ہوں۔ مجھے تو فکر و فن کا ایک جمالیاتی امتزاج درکار ہے اور اگر آپ ایسے سلجھے ہوئے نقاد بھی کبھی میری اس سعی کی طرف خود بخود متوجہ ہو سکیں تو یہ میری خوش قسمتی ہو گی، مگر میں نقادوں سے داد بٹورنے کا عادی نہیں ہوں۔ اس لیے باور فرمائیے کہ مجھے آپ کے کسی تنقیدی جملے سے شکایت نہیں ہے۔ مجھے بعض احباب نے چند باتیں آکر بتائیں۔ اس دوران میں آپ سے ملاقات نہ ہو سکی ورنہ سب باتیں صاف ہو جاتیں۔ اب آپ کا گرامی نامہ ملا ہے تو سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے سلسلے میں غلط قسم کے شبہات اتنے عرصے تک ذہن میں بسے رہے۔ آیندہ کوئی بات ہوئی تو فوراً آپ سے رجوع کروں گا۔

خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔ ان دنوں آپ کیا کر رہے ہیں۔

آپ کی کتاب کے بارے میں اسی مہینے کے آخر تک برادرم صہبا کو تفصیل سے لکھوں گا۔

آپ کا مخلص

ندیم

حمید الدین شاہد کے نام

ملتان ۲۶ $\frac{1}{۴۶}$

محترم و مکرم ——— السلام علیکم!

بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے جناب ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں میری معروضات پیش کر دیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور میری امداد فرمائیں گے۔ یہ مجموعہ جنوری کے اوائل میں پریس میں جائے گا، چونکہ یہ سلسلہ جنبانی ابھی ابھی شروع ہوئی ہے۔ اس لیے فی الحال جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے اپنا مضمون۔ جناب شاہد احمد صاحب دہلوی نے ڈرامہ، محمد حسن عسکری، منٹو اور شفیق الرحمٰن نے اپنے افسانے اور اختر شیرانی، حامد علی خاں اور مجاز نے اپنی نظمیں بھیجی ہیں۔ جناب فراق گورکھپوری صاحب نے ایک مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے، نیز پروفیسر فیض احمد صاحب کے مضمون کی توقع ہے مضامین کے عنوان میں نے مقرر نہیں کیے۔ یہ لکھنے والے کی مرضی پر موقوف۔ موجودہ رجحانات کے مطابق وہ خود ہی سرخیاں انتخاب فرمائیں گے، شعرا اور افسانہ نگار وہی ہیں جن پر اردو کو ناز ہے اور رہے گا، مضمون نگاروں کی فہرست میں مندرجہ ذیل اصحاب ہیں (۱) ڈاکٹر زور صاحب (۲) پروفیسر فراق گورکھپوری (۳) پروفیسر حمید احمد خاں (۴) پروفیسر فیض احمد صاحب فیض (۵) ن۔م۔ راشد ایم۔اے (۶) مولانا عبدالمجید سالک مدیر انقلاب۔

مجھے یقین ہے کہ میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب سے بھی ایک مضمون حاصل کر لوں گا۔

جناب ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں تاکیداً عرض کریں۔ کہ اُن کے مضمون کے بغیر میری کتاب میں ایک ایسا خلا پیدا ہو جائے گا، جو ہر پڑھنے والے کو کھٹکے گا "موجودہ اردو ادب کے متعلق اُن کی رائے صائب ترین ہے" اگر آپ اُن کا پتہ مجھے تحریر کر سکیں تو بڑا احسان ہو گا۔

میں آپ کے تسلی بخش گرامی نامے کا شدت سے انتظار کروں گا، قبلہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں نیاز، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے ———

والسلام　　نیاز کیش

——— احمد ندیم

فتح محمد ملک کے نام

۱۴۰۔ انارکلی۔ لاہور

۸ رمئی ۱۹۶۵ء

بہت پیارے بھائی——محبت!

سمجھ میں نہیں آتا کہ اظہار معذرت کا آغاز کیسے کروں یا اگر اظہار معذرت کر دوں تو کیا میرے گناہ دُھل جائیں گے! کیا اس تمام عرصے میں میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ میں آپ کو مفصل نہ سہی، مختصر سا خیریت نامہ ہی لکھ دیتا؟ یقیناً اتنا وقت تھا مگر آپ کو خط لکھنے کے لیے نہ جانے مجھ پر یہ جنون کیوں سوار رہتا ہے کہ بہت سا وقت ہونا چاہیے اور بہت مفصل لکھنا چاہیے۔ نہ اتنا وقت ملتا ہے، نہ اتنا مفصل لکھتا ہوں، بلکہ مفصل تو رہا ایک طرف، اب کے شاید تین مہینوں سے میں آپ کو ایک پوسٹ کارڈ تک نہ لکھ سکا۔ مجھے معاف کر دیجیے اور فوری طور پر معاف کر دیجیے اور اب مختصراً میرے حالات سنیے:۔

میں اور میرے چچا زاد بھائی عباس، جو یہاں کی ایک فرم میں منیجر ہیں، چھاؤنی میں اکٹھے رہتے تھے۔ ان سے میرا دوہرا رشتہ ہے۔ ایک تو میرے سگے چچا کے بیٹے ہیں اور دوسرے میری سگی بھانجی کے شوہر۔ ان کا ایک بچہ شفقت عباس پیدائشی دل کا مریض تھا۔ میاں بیوی نے اس کے علاج معالجے اور پرورش و تربیت پر بڑی محنت کی۔ اپنی دولت اور اپنی صحت اس پر قربان کر دی، اور وہ اس قابل ہو گیا کہ چلنے پھرنے لگے۔ آخر وہ اسکول بھی جانے لگا۔ بے حد ذہین اور بے حد شریف بچہ تھا۔ میرے ساتھ تو اسے باقاعدہ عشق تھا۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ امریکہ میں اس کے دل کا اپریشن ہو گا تو ٹھیک ہو گا، ورنہ گیارہ برس کی عمر سے آگے نہ بڑھے گا۔ اب وہ آٹھ سال کا تھا۔ اتفاق سے جنوری میں یہاں کے مشن ہسپتال میں امریکی ڈاکٹروں کی ایک پارٹی آئی، جو بچوں کے امراضِ قلب کے اسپیشلسٹ تھے۔ بھائی عباس نے یہ موقع غنیمت جانا۔ ہم سب نے بھی اسے یہی مشورہ دیا سو وہ شفقت کو ڈاکٹروں کے پاس لے گیا اور انھوں نے اس کے دل کے اپریشن کے لیے ۱۸ رفروری کی تاریخ مقرر کی۔ فروری کے شروع میں عیدالفطر تھی۔ فوراً بعد میں شفقت کے لیے خون جمع کرنے میں لگ گیا۔ آخر دوستوں کی مہربانی سے اس کے نمبر کا کافی خون دستیاب ہو گیا، جو ہسپتال میں محفوظ کر لیا گیا۔ پھر ۱۷ رفروری کو شفقت کو ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ عباس بھائی اس کے پاس رہے۔ اس لیے اپنے بچے اور عباس کے چھوٹے بچے (شاہد) کو اسکول پہنچانا اور لانا، پھر

خواتین کو ہسپتال لے جانا اور لے آنا، دوائیں خرید کر لانا، گھر کے دوسرے بے شمار کام کرنا میرے ذمے تھے۔ عباس بھائی کی بڑی بہن ٹی بی کی مریضہ ہیں۔ وہ گلاب دیوی ہسپتال میں تھیں۔ عباس اپنے بچے میں مصروف تھا۔ اس لیے ایک ہسپتال سے نکل کر میں دوسرے ہسپتال کا رخ کرتا تھا۔ اپریشن کامیاب رہا۔ ہم سب بہت خوش تھے، مگر ۲۵ فروری کو جب شفقت ہسپتال ہی تھا اسے نمونیہ ہوگیا اور ۲۶ کو چل بسا۔ پورے گھر پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ راتوں رات ہم سب لوگ اس کی میت لے کر انگہ پہنچے۔ میرے بچے یہاں رہ گئے۔ البتہ بیوی میرے ساتھ تھی۔ وہاں ایک دو روز رہ کر ہم دونوں واپس آگئے، مگر پھر مریضہ بہن کو اس حادثے کا علم ہوگیا اور انھوں نے کہا کہ مجھے بھی انگہ پہنچاؤ۔ پھر انھیں لے کر گیا۔ ادھر لاہور میں تعزیت کرنے والوں کا تانتا لگ گیا۔ ۹ مارچ کو عباس اور عزیزہ نور واپس آگئے مگر شفقت کی جدائی نے سب مجھے بے حد پریشان کر دیا تھا، اس لیے چند روز نکما پڑا سوچتا رہا۔ یکایک مشاعروں کا چکر شروع ہوگیا۔ مارچ اور اپریل کے مہینوں میں میں نے کراچی سے پشاور تک کے دورے کیے۔ چار پانچ بار تو یوں بھی ہوا کہ رات بھر جاگنا پڑا اور سورج جو ہمارے سامنے ڈوبا تھا ہمارے سامنے طلوع ہوا۔ ٹھٹھہ، کراچی، سکھر، رحیم یار خاں، بہاولپور، ملتان، جہلم، لائل پور، سیالکوٹ، پشاور، حسن ابدال اور نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرا۔ میں مشاعرہ باز کبھی نہیں تھا مگر فنون کا ڈیکلریشن مل گیا تھا اور ایک کوڑی تک پاس نہیں تھی۔ مشاعرے "کما" کر کاغذ خریدا، کاتبوں کو مطمئن کیا اور یوں بعض کام نکالے۔ اسی دوران میں عباس بھائی کو کوٹھی کے مالک کا نوٹس ملا کہ اپریل ہی میں کوٹھی خالی کر دیجیے۔ اب نئے مکان کی تلاش شروع ہوئی، مگر کوئی ایسا مکان نہ ملا جس میں ہم دونوں بھائی اکٹھا رہ سکیں۔ ناچار الگ الگ مکانوں میں منتقل ہونا پڑا۔ اب وہ لاہور صدر کے ایک مکان میں ہیں۔ میں گڑھی شاہو کے ایک مکان میں آگیا ہوں۔ مکان کی تلاش اور تبدیلی میں بے حد پریشان رہا۔ کیونکہ شادی کے بعد پہلی بار مجھے لاہور میں الگ مکان لے کر رہنے کا تجربہ ہوا ہے۔ ساتھ ساتھ مشاعرہ بازی بھی ہوتی رہی۔ فنون کو بھی مرتب کرتا رہا۔ کتاب نما کا بھی کام چلاتا رہا۔ کالم بھی لکھتا رہا۔ بیمار دوستوں اور رشتہ داروں کی بھی مزاج پرسی کرتا رہا۔ ہمسایوں کے چھوٹے چھوٹے کام بھی کیے۔ غرض ایسے ایسے عالم گزرے کہ بعض اوقات اپنی ہمت کو داد دیتا تھا اور بعض اوقات اپنی قسمت پر رونا سا آنے لگتا تھا کہ کیا میں انہی کاموں کے لائق تھا؟ کیا مجھے پڑھنے لکھنے کا وقت اب کبھی نہیں ملے گا؟

پچھلے دو ہفتے "فنون" نے گرفتار رکھا۔ کل آخری کاپیاں مکمل کر کے بھجوائی ہیں۔ چھپائی ہو رہی ہے۔ پرچہ شاید ۱۵ ار تک چھپے، مگر ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ۱۵ ار ہی کو ریلیز کر دوں یا اس مہینے کے آخر تک کے لیے روک لوں۔

ایک پریشانی تو "فنون" کے لیے بذریعہ مشاعرہ پیسے جمع کرنے کی تھی۔ ایک اور پریشانی یہ لاحق ہوئی کہ مجھے گڑھی شاہو میں جو مکان ملا ہے اس کا کرایہ ڈھائی سو روپیہ ماہانہ ہے۔ پچاس روپے بجلی، پانی، صفائی کے بڑھا لیجیے تین سو ہو گئے۔ پچاس روپے ماہانہ بچوں کی فیسیں۔ ڈیڑھ سو روپیہ ان کے آنے جانے پر اٹھ جاتا ہے۔ پانچ سو ہو گئے۔ اب گھر بھی چلانا ہے۔ سگرٹ چائے کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ کپڑے ہیں، علاج ہے، کبھی کبھی کی عیاشی ہے۔ غرض یہ تمام اخراجات شامل کر کے ایک ہزار ماہانہ تک جا پہنچتے ہیں، اور میں صرف چھ سو روپے کماتا ہوں۔ سوچتا ہوں، اگر خرچ اور آمدنی میں توازن قائم کرنے کے لیے کوئی اور کام لے لوں تو لکھوں گا کب، پڑھوں گا کیسے، اور رسالے اور ادارے کی طرف کب متوجہ ہوں گا۔ اور اگر یہ نہیں کروں گا تو زندہ کیسے رہوں گا۔

بہرحال، میرے عزیز بھائی! یہ حالات تھے جنھوں نے مجھے ان دنوں اتنا حواس باختہ اور ژولیدہ دماغ بنائے رکھا۔ آپ یقین کیجیے، مجھے آپ ایک دن کے لیے بھی نہیں بھولے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ ان گنے چنے قریبیوں میں سے ہیں جن کے بارے میں سوچ کر ہمت بڑھتی ہے اور زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے۔

اس دوران میں آپ کے متعدد خط ملے۔ ہر نیا خط میرے اس جنون میں اضافہ کرجاتا تھا کہ اب اور بھی مفصل خط لکھوں گا۔ مگر اوپر کے حالات نے مجبور کیے رکھا۔ یہ بے حد مختصر حالات ہیں ورنہ اور چھوٹی چھوٹی مصروفیتیں اتنی رہیں کہ تفصیل میں جاؤں گا تو یہ خط شاید ایک مہینے تک پوسٹ نہیں کرسکوں گا۔

(یہ اوپر کا پیرا میں نے آج لکھا ہے۔ اس سے پہلے کا خط کل رات کو لکھا تھا۔ ارادہ تھا دن کو اطمینان سے اسے مکمل کروں گا، مگر اب رات کے پورے بارہ بجے ہیں۔ دن کا ایک لمحہ بھی میرے نصیب میں نہ تھا۔ بس یونہی اڑ گیا)

اس دوران میں نہ کچھ لکھا ہے اور نہ کچھ پڑھا ہے اور اس لیے نہ کچھ سوچا ہے۔ نہایت بے رس اور بے رنگ زندگی گزاری ہے مگر میری یہ تمنا ابھی زندہ ہے کہ اتنی بے رسی اور بے رنگی سے زندگی نہیں گزاروں گا۔ سو یہ سب عارضی بے چارگیاں تھیں — کوشاں ہوں کہ آہستہ آہستہ سب حالات سمیٹ کر ان کو درست کرلوں۔

چند روز پہلے حمید بہن لاہور میں تھیں۔ سلمیٰ بہن کے ہاں ٹھہری تھیں۔ مجھے اس روز سیالکوٹ جانا تھا اس لیے صرف ایک گھنٹے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خاصی کمزور لگ رہی تھیں (اگرچہ وہ مجھے خاصا کمزور کہہ رہی تھیں۔) انھوں نے بتایا کہ جنوری کے بعد انھیں آپ کا کوئی خط نہیں ملا، میں نے کہا اسی طرح جیسے جنوری کے بعد مجھے آپ کا کوئی خط نہیں ملا۔ بہرحال دونوں بہنیں آپ کے سلسلے میں متفکر تھیں۔ ان سے بہت سرسری ملاقات ہوئی۔ اتنی سرسری کہ میں ان سے یہ شکوہ تک نہ کرسکا کہ آپ نے فنون کے لیے اب تک کچھ کیوں نہیں لکھا۔

یہ آپ نے محکمہ تعلیم کو نہ چھوڑنے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ مجھے پسند آیا۔ اگر آپ کسی اور محکمے سے منسلک ہوگئے تو میرے والی حالت ہوگی کہ کتابیں خرید کر ڈھیر کر رکھی ہیں اور پڑھنے کو ایک لمحہ تک میسر نہیں آتا۔ آپ کو اس عمر میں زیادہ سے زیادہ وقت درکار ہے اور وہ آپ کو اس ملازمت میں بافراط میسر ہے۔ روپیہ بھی یقیناً ضروری چیز ہے۔ مگر اس حد تک، جہاں تک احتیاج کا خطرہ ختم ہوجائے۔ آپ اسی محکمے میں ڈٹے رہیے۔ آپ نے ان دنوں کچھ لکھا ہے یا نہیں؟ خدا کرے آپ دردِ سر سے چھٹکارا پاچکے ہوں۔ "پریم چند اور ہمارا عہد" کس منزل میں ہے دستِ تہ سنگ اور جائزہ کے فیض نمبر پر ریویو کہاں تک پہنچا۔

(یہ عرض کردوں کہ جائزہ میں میرا جو مضمون درج ہے، وہ میں نے فیض صاحب کی اسیری کے دنوں میں "دستِ صبا" کی رسمِ اشاعت کے ایک بڑے جلسے میں پڑھا تھا اور ریڈرس)۔ بخاری صاحب نے اسے اتنا پسند کیا تھا کہ اسے دستِ صبا کے آیندہ دیباچے کے طور پر استعمال کرنے کی رائے ظاہر کی تھی، مگر ایسا کس طرح ممکن تھا! بہرحال کہنا یہ ہے کہ اس مضمون کے ساتھ "دستِ صبا" کی جو "تاریخیں" میرے نام سے درج ہیں وہ میری نہیں ہیں۔ مجھے جمع تفریق ہی نہیں آتی۔ میں تاریخ کیسے نکالوں گا (یہ "امروز" میں میرے مضمون کے "پیسٹ" "ایک" "باکس" کی صورت میں درج ہوئی تھیں۔ ان سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے) عثمان صاحب کی کتاب پر ریویو کہاں تک پہنچا۔

مگر اس سے پہلے یہ بتائیے کہ آپ کی صحت کیسی ہے۔ کہاں تو آپ نے مطلع کیا تھا کہ آپ موٹے ہو رہے ہیں اور تو ند

نکلنے کا خطرہ ہے اور اسی لیے آپ ٹینس کھیلنے لگے ہیں۔ اور کہاں یہ اطلاع ہے کہ ریح کا کا فرد ہے جو آپ کو نڈھال کر دیتا ہے۔ بعد کے خطوں میں آپ نے اس علالت کا ذکر تک نہیں کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ اب آپ تندرست ہیں (آخری خط سے تندرستی خاص طور سے جھلکتی ہے) مگر مجھے اپنے ہاتھ سے لکھیے کہ اب آپ کیسے ہیں؟

"شاہکار" میں احتشام صاحب کا جو تبصرہ چھپا تھا اس کا تراشا بھیج رہا ہوں۔ میری شاعری پر اعتراضات تو متعدد ہوئے ہیں مگر اب مضامین نہیں مل رہے۔ البتہ حال ہی میں پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے جو مجموعہ خیابان کے نام سے چھاپا ہے۔ اس میں سید عبداللہ کا مضمون ضرور پڑھیے جس میں انھوں نے میری شاعری پر خاصے اعتراضات کیے ہیں۔

نسوار باقاعدگی سے مل رہی ہے۔ بلکہ ہفتہ بھر پہلے جب بیوی نے اطلاع دی کہ وہ "خالی ہاتھ" ہو گئی ہے تو اسی روز آپ کا پارسل مل گیا اور بیوی کی باچھیں کھِل گئیں۔ مگر میں سوچتا ہوں اس ٹنٹنے کو آپ کہاں تک چلائیں گے۔ مجھے بعض وقت خاصی کوفت محسوس ہونے لگتی ہے کہ میں نے یہ کیسی مصیبت آپ کے سر ڈال دی۔ میں یہ اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ کا پیسہ خرچ ہوتا ہے اس کی کوئی بات نہیں۔ بڑے بھائیوں کے اتنے حقوق تو ضرور ہوتے ہیں۔ مگر آپ کو جو پریشانی ہوتی ہوگی، اس کی وجہ سے پریشان ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اب کچھ دیر کے لیے رُک جائیں تو میں قاسم کو لکھوں۔ وہ سرگودھا سے بھجواتا رہے گا؟

میں اس قطعی بے ربط خط کی معافی چاہتا ہوں، مگر خوش ہوں کہ مدتوں کے بعد آپ کو کچھ لکھا تو ہے۔ اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ کوتاہی نہیں کروں گا یا اتنی بڑی کوتاہی نہیں کروں گا۔ ایک پل کے لیے بھی ایسا نہ سوچا کیجیے کہ مجھے آپ کا کوئی لفظ گراں گزرا ہے، یا آپ فنون کے لیے کچھ نہیں لکھ سکے اس لیے میں خفا ہوں، یا کوئی ایسی ہی بات۔ آپ کو پوری طرح اندازہ نہیں ہے کہ آپ مجھے کتنے پیارے ہیں۔

پچھلے دنوں پاکستان کونسل (راولپنڈی) کی طرف سے خط آیا تھا کہ مئی، جون، جولائی میں سے کسی مہینے کی کوئی تاریخ دیجیے، ہم آپ کے ساتھ شام منانا چاہتے ہیں۔ میں جواب نہ دے سکا۔ پھر ایوب محسن صاحب (رائٹرز گلڈ) کا خط آیا کہ پاکستان کونسل اور ہم مل کر "مصنف سے ملیے" کی سیریز شروع کر رہے ہیں۔ اس لیے تم ضرور آؤ۔ میں نے عرض کیا ہے کہ مجھے اس فہرست میں کاٹ دیجیے تاکہ یہ نہ (ہو) کہ آپ میرے ساتھ شام منائیں اور پھر آپ کو اپنی پوزیشن واضح کرنی پڑے اور آپ اپنی بے گناہی ثابت کرتے پھریں کہ ہم تو ندیم کو رواروی میں بلا بیٹھے تھے۔ میرا مقصد یہ تھا کہ جب بعض سرکاری تہذیبی ادارے (از قسم ریڈیو) میرے ساتھ تعاون نہیں کرتے تو میں بعض تہذیبی اداروں کے ساتھ ایسا کیوں نہ کروں۔ سو میں نے انکار کر دیا ہے۔ کیا میں نے ٹھیک کیا ہے؟

خدا کرے آپ ٹھیک ہوں اور آپ نے مجھے دل سے معاف کر دیا ہو۔

والد صاحب قبلہ کی خدمت میں آداب۔ بھائیوں کو دعائیں۔

میری بیوی آداب کہہ رہی ہے۔

آپ کا اپنا

———— ندیم

انور سدید کے نام

رسالہ فنون

۴۷۔عـ انارکلی لاہور ۔۔ ۲۶ر نومبر ۷۶ ۱۹ء

محبی، عزیز ـــــ سلام مسنون!

آپ کے ۱۹ر اکتوبر کے کرم نامے کا جواب آج ۲۶ر نومبر کو دے رہا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ معذرت کے لیے مناسب الفاظ کہاں سے لاؤں۔ دراصل محبتوں کے خطوط کے جواب میں انہی تاخیروں نے مجھے برصغیر کے قریب قریب ہر ادیب سے نادم کیا ہے۔ اور اب تو عزیز بھی مجھ سے نالاں رہنے لگے ہیں۔ کیا کروں۔ اختر شیرانی مرحوم نے کہا تھا کہ ؎

اک درد ہو تو حضرتِ نیّر دوا کریں

مگر میرا تو کوئی "حضرتِ نیّر" بھی نہیں ہے۔ بہرحال میری اندھا دھند مصروفیتوں سے آپ کو کیا دلچسپی ہو گی۔ مجھے سیدھی طرح معافی مانگنی چاہیے اور آپ کو فراخ دلی سے کام لے کر معاف کر دینا چاہیے۔

شاد مرحوم کے بارے میں آپ کا تاثر نہایت موثر ہے مگر اسے جنوری فروری کے شمارے میں شامل کروں گا۔ میں نے راجہ مہدی علی مرحوم کے لیے ایک کاپی وقف کی مگر پھر شاد چل بسے۔ ۔ ۔ ابھی اس صدمے سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ شکیب کا سا پیارا شاعر اور پیارا انسان رخصت ہو گیا۔ سو ان صفحات کو ان تینوں کی آخری تحریروں کے لیے وقف کر دیا ہے اور آئندہ شمارے میں ان کے لیے ایک الگ سیکشن وقف کر دوں گا۔ اسی میں آپ کا مضمون شامل ہو گا۔

کرم فرمائی کا مکرر شکریہ ـــــ

مخلص

ندیم ـــــ

ایوب صابر کے نام

۲۳ر اکتوبر ـــ ۷۸ ۱۹ء

محبی مکرم ـــــ تسلیم!

کرم نامہ ملا اور اطمینان حاصل ہوا۔ برادرم عزیز اختر اور شعیب صاحب پچھلے دنوں لاہور تشریف لائے تو تھے مگر مجھ سے نہیں مل سکے۔ شاید مصروف تھے۔ بہرحال آپ مجھے موعودہ تبصرہ جلد بھجوا دیجئے تاکہ دسمبر نمبر میں شریک کر سکوں۔ (نومبر کا شمارہ پریس میں ہے)

مجھے اپنی محبتوں کے سلسلے میں کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ میرے اپنے معیار ہیں اور میں انسانی رشتوں کو انسانی زندگی کی بڑی دولت سمجھتا ہوں۔ یہ نہ ہوں تو ساری زندگی بیابان میں کٹ جائے۔ آپ کے بارے میں لاہور یا پشاور کے کسی دوست نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ ویسے مجھے کشیدگی کا علم ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ دو چار روز کے لیے پشاور جانا ہو تو کوہاٹ آکر آپ کو بھی ملتا جاؤں اور احباب کے درمیان یہ غلط فہمیاں دور کرا دوں۔ آپ لوگ تو اتنے شدید محبت کرنے والے ہیں۔

آپ کو تو ایک دوسرے کی خامیوں سے درگزر کرنا چاہیے۔

دعا اور محبت　　　　آپ کا

ندیم

حزیں لدھیانوی کے نام

۴۷۔ انارکلی، لاہور
۵ رمئی ۱۹۷۳ء

برادرم حزیں صاحب ــــــ تسلیم!

مجھے ان "پالٹیکس" کا علم نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے آپ کو ہال میں موجود دیکھا تو منتظر رہا کہ آپ کا نام ضرور پکارا جائے گا۔ ایک آدھ چٹ بھی موصول ہوئی مگر اس میں آپ کا اسم گرامی نہیں تھا۔ صرف یہ درج تھا کہ لائل پور کے کئی معروف شعرا یہاں موجود ہیں انھیں بھی تکلیف دی جائے۔

میں وہاں مہمان تھا اور زندگی میں پہلی بار حلقۂ ارباب ذوق کے کسی سالانہ جلسے کی صدارت کر رہا تھا۔ میرا قطعی یہ حق نہیں تھا کہ میں شعرا کے معاملے میں یا ان کے ناموں کی ترتیب میں کوئی مشورہ دیتا۔ بلکہ فہرست میں نے دیکھی ہی نہیں تھی۔ میں ایک ترقی پسند مصنف کی حیثیت سے اس میں شریک ہوا اور اپنے خطبے میں اس کی غیر مبہم وضاحت کردی۔ جب اجلاس ختم ہوا تو آپ کی جستجو شروع کی۔ ایک دو اصحاب سے پوچھا بھی۔ معلوم ہوا کہ آپ تشریف لے جا چکے ہیں۔ حیرت ہوئی کہ آپ ملاقات کے بغیر کیسے چلے گئے۔ یہاں حلقۂ ارباب ذوق کے سالانہ اجلاسوں میں جب بھی شریک ہوا ہوں۔ ہم ترقی پسند شعرا نہیں پڑھتے، کیونکہ یہ ان کا اصول ہی نہیں ہے۔ لائل پور کی روایت کا مجھے علم نہیں تھا مگر بہرحال آپ کو چلے نہیں جانا چاہیے تھا۔ کیا حرج تھا اگر آپ موجود رہتے۔ بہرحال یہ آپ کا اپنا معاملہ ہے۔ کہنا یہ تھا کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکنے کا افسوس ہوا۔

دعا ہے آپ بخیر و عافیت ہوں ــــ　　　　مخلص

احمد ندیم

قمر ہاشمی کے نام

ماہنامہ فنون

۴۷۔ انارکلی، لاہور۔ ۸ راپریل ۱۹۷۳ء

برادرم ــــــ سلام محبت!

علالت نے بے بس کر رکھا ہے۔ جب بھی کراچی کا ارادہ کیا۔ درد گردہ بیدار ہو گیا۔ اب کے ۶ راپریل کے نعتیہ مشاعرے میں اور اس کے بعد انجمن ادبی رسائل کے اجتماع میں شرکت کا پختہ ارادہ تھا۔ مگر یہی علالت حارج

ہوئی اور نہایت افسوس کے ساتھ سفر منسوخ کر دیا۔ آپ کی محبت کا دل سے قدردان ہوں۔ اتنے برسوں کے بعد بھی آپ میں رفاقت اور محبت کا جو جذبہ موجود ہے، وہ آج کل کے زمانے میں شاذ ہی نظر آتا ہے۔ کتنے ہی پُرانے "ہم سفر" اس وقت ACTIVE مخالفین کی صف میں ہیں۔ میرا ایک شعر ہے ؎

وہ پھول توڑتے ہیں اور میں خار چُنتا ہوں

بچھڑتے جاتے ہیں یوں مجھ سے ہم سفر میرے

"مثنوی آشوبِ قرطاس و قلم" کا اقتباس دیکھا اور مزید زندہ رہنے کو جی چاہا۔ اگر آپ کے سے ایک دو مخلصین بھی زندگی میں میسر آجائیں تو اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی۔ آپ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔

صحت مند ہونے کے بعد کراچی آؤں گا تو انشاءاللہ دس بارہ روز کے لیے آؤں گا۔ تب مفصل گفتگو ہوگی۔

آپ کا ــــــ ندیم

محسن بھوپالی کے نام

ماہنامہ فنون۔ ۴۷۔ انارکلی، لاہور

۱۰ر جولائی ۱۹۷۳ء

محب عزیز محسن صاحب ــــــ سلام محبت!

خدا کا شکر ہے کہ آپ نے فون پر گلہ کر کے فوراً بعد خط لکھ دیا، ورنہ میں بہت پریشان تھا کہ مجھ سے آپ کو کیا شکایت پیدا ہوئی۔ آپ کو یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ آپ مجھے کتنے عزیز ہیں اور میرے کتنے قریب ہیں۔ چنانچہ جنھیں "اپنوں" میں شمار کیا جائے، ان کی طرف سے گلہ ایک پہاڑ کی طرح گراں ہوتا ہے۔ پھر آپ کے گلے کا مفہوم معلوم ہو کر تو خوشی بھی ہوئی کہ بات کی وضاحت ہو گئی اور ذرا سا افسوس بھی ہوا کہ آپ کو تو خود بھی پرچے کی ادارت کا تجربہ حاصل ہے، آپ کو شکایت نہیں ہونی چاہیے تھی، جب کہ مجھ پر آپ کو اعتماد بھی ہے اور میری نیت پر شبہ بھی نہیں ہے۔ دو چار بہت سینیئر لوگوں سے قطع نظر میں نے شعرا و ادبا کی ترتیب میں ہمیشہ گڑبڑ کی ہے۔ کبھی کوئی آگے کبھی کوئی پیچھے، تاکہ توجہ تخلیق کی نوعیت پر رہے، نمبر شمار پر نہ رہے۔ اس کے باوجود احباب کو شکایت ہوئی (اور صرف آپ کو نہیں ہوئی، بہت سی شکایات موصول ہوئیں) یہ شمارہ تو چھپ گیا ہے اور آج پوسٹ ہو رہا ہے۔ آیندہ شمارے میں اس موضوع پر ایک شذرہ لکھوں گا اور احباب سے مشورہ لوں گا کہ ان شکایات کے ازالے کے لیے کیا طریقہ اختیار کروں۔ کیا حروفِ تہجی کے لحاظ سے اندراج کیا کروں یا کوئی اور نظام سوچا جائے۔ بہرحال یقین کیجیے کہ آپ کی شکایت کا تو ہر صورت میں ازالہ یعنی تلافی کروں گا۔

آج ہی اپنے ڈاکیے کو تاکید کر دیجیے گا کہ وہ پرچہ آپ تک بہر صورت پہنچا دے۔ میں نے اپنے سامنے آپ کا پتہ پیکٹ پر چسپاں کرایا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ پرچہ آپ کو نہ بھیجا جائے۔ کیا آپ ایسا سوچ بھی سکتے ہیں؟

گذشتہ شمارے کے بارے میں آپ نے جو اظہارِ رائے کیا وہ آیندہ (جولائی) کے شمارے میں درج کروں گا۔ تازہ پرچہ بھی دیکھ لیجیے۔ اگر کچھ اضافہ کرنا چاہیں تو میں آپ کے ارشادات میں اس کا اضافہ کر دوں۔ منتظر رہوں گا۔

"منظوم افسانچے" کا دلی شکریہ۔ مگر "افسانچے" کیوں؟ ۔۔"افسانے" کیوں نہیں؟ "افسانچہ" اسم تصغیر سہی مگر
اس کا استعمال اب تک بطور تضحیک بنا رہا ہے کہ فلاں افسانے کیا لکھتا ہے افسانچے لکھتا ہے۔ اجازت دیجیے کہ عنوان
"منظوم افسانے" کر دوں۔ یہ نظمیں آیندہ شمارے میں نمایاں طور پر درج ہوں گی۔

شکیب کی غزل بھجوانے کا دلی شکریہ۔ احباب کو سلام۔

محبت کے ساتھ　　مخلص ندیم

ریاض صدیقی کے نام

ماہنامہ فنون

۲۱ر فروری ۱۹۷۲ء - ۴۷ - انارکلی - لاہور

محب مکرم ــــ تسلیم!

یاد فرمائی کا شکریہ۔ مجھے بھی محترمی رفیق چودھری صاحب کی طرف سے وہی گشتی مراسلہ موصول ہوا ہے۔ میں
نے آج ہی شوکت صدیقی صاحب کو لکھا ہے کہ انجمن کا احیا، بہت عمدہ بات ہے مگر پورے ملک کے پرانے ترقی پسند مصنفین سے
پیشگی مشورے کے بغیر اور کوئی متحدہ بنیاد تلاش کیے بغیر ارباب کراچی کا ایک ڈھانچا کھڑا کر دینا بیشتر احباب کے نزدیک قابلِ اعتراض
ہوگا، وہ یہ سوچیں گے کہ انھیں نظر انداز کیا گیا ہے۔ پھر اتنی عجلت کی بھی کیا ضرورت ہے۔ اتنی بڑی تحریک کا اگر تنظیمی شیرازہ
بکھر اتھا، تو اس کے اسباب کا کھوج لگانے کے بعد ہی آگے بڑھنا چاہیے۔ میں نے ان سے عرض کیا ہے کہ فی الحال کنونشن کی نہ
سوچیے بلکہ پورے ملک کے ترقی پسندوں سے خط و کتابت کے ذریعے مشورہ کیجیے اور اس کے بعد کنونشن بلا کر اس انجمن کی ک[illegible]
تنظیمی صورت پیدا کرنے کی کوشش کیجیے۔ کمیٹی کے ارکان یقیناً بیشتر مسلمہ ترقی پسند ادیب ہیں۔ مثلاً شوکت صدیقی صاحب،
حسن عابدی صاحب، کمانڈر انور صاحب، سحر انصاری صاحب۔ ان کی نیت پر شبہ تو یقیناً نہیں کیا جا سکتا مگر اس عجلت
کا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ بہر حال ان سے تعاون کرنا چاہیے مگر اس شرط پر کہ عجلت نہ برتیں، تاکہ انجمن میں ایسے عناصر شامل
نہ ہو پائیں جو کسی ابتلا میں ہمیں چھوڑ کر تنظیم کے شیرازے کو ایک بار پھر منتشر کر دیں۔ پھر ہمیں اپنے تمام تر گروہوں کا محور پاکستان
کی بقا کو بنانا ہے۔ ہمیں ایسے "دوست" درکار نہیں ہیں جنھوں نے گذشتہ دسمبر کی جنگ میں ہماری جڑوں پر علی الاعلان
کلھاڑا چلایا ہے۔ میرا مطلب بھارت اور سوویٹ روس سے ہے۔

آپ نے مجھ سے استفسار فرمایا، اس کے لیے آپ کا دل سے ممنون ہوں۔

دعا ہے آپ بخیریت ہوں ــــ　　مخلص احمد ندیم

آصف ثاقب کے نام

ماہنامہ فنون ـــ ۴۷ ـــ انارکلی، لاہور

۱۹ر جون ـــ ۱۹۷۱ء

محترم ثاقب صاحب ـــــ تسلیم!

کرم نامہ ملا۔ بے حد ممنون ہوں۔ آپ جس توجہ اور اپنائیت اور محبت سے فنون کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ میرے لیے بے انتہا حوصلہ افزا ہے۔ یوں میری ہمت افزائی ہوتی ہے اور میں مالی لحاظ سے اس سراسر گھاٹے کے سودے کو، اپنی بے مایگی کے باوصف، برداشت کر جانے کا حوصلہ پیدا کر لیتا ہوں۔

آپ سے خط و کتابت کے ذریعے اتنا قریبی تعلق پیدا ہو گیا ہے تو اپنا تعارف بھی تو کرا دیجیے۔ آپ کے مشاغل کیا ہیں؟ عمر کیا ہے؟ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ ایبٹ آباد میں کب سے مقیم ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

دعاؤں کے ساتھ ـــــ　　آپ کا ندیم

شاہین کے نام

۴۷ ـــ انارکلی ـ لاہور

۲۱ر فروری ۲ ۔ ۹ ۶ء

برادرم شاہین صاحب ـــــ تسلیم!

مجھے اندازہ ہے کہ آپ کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ میں تو مشرقی پاکستان کی غیر بنگالی آبادی کے لیے "حریت" میں مسلسل لکھ رہا ہوں۔ ابھی کل کے سنڈے ایڈیشن میں بھی اسی موضوع پر میرا کالم درج ہوا ہے۔ میری رائے میں یہ صرف ہماری انسانیت کا مسئلہ نہیں ہے، ہماری ملی غیرت کا مسئلہ ہے ـــــ آپ کے خط سے برادرم صلاح الدین محمد وغیرہ کی خیریت کی خبر پا کر بے انتہا سکون پہنچا۔ اللہ کرے سب احباب زندہ ہوں اور یہاں ان کی منتقلی کا فوری اور معقول بندوبست ہو جائے۔

آپ کا مضمون مارچ کے شمارے میں شامل ہوگا ـــــ دعا ہے آپ تندرست ہوں ـــــ

ـــــ مخلص ندیم

صہبا لکھنوی کے نام

عقب دیال سنگھ لائبریری۔ نسبت روڈ۔ لاہور ۔۷

۶ر ستمبر ـ ۱۹۵۹ء ـ

(۱)

برادر عزیز صہبا صاحب ـــــ سلام شوق!

تین روز پہلے گاؤں سے واپس آیا ہوں تو آپ کے اور محترمی مجتبیٰ صاحب کے گرامی نامے ملے ـ ممنون ہوں۔ اس دوران میں کسی نے بتایا کہ "افکار" کا آزادی نمبر شایع ہو گیا ہے اور اس میں میری کتاب پر مجتبیٰ صاحب کا لکھا ہوا تبصرہ بھی شامل ہے۔ حیرت ہے اب کے پرچہ کیوں نہیں ملا۔ شاید راستے میں ضایع ہو گیا ہے۔ ممکن ہو تو ایک پرچہ بھجوا دیجیے۔ عزیزہ شاہدہ کی کہانی کی اشاعت کے وعدے کا شکریہ۔ اس کی ہمت افزائی ہوئی تو مزید لکھے گی۔ ذہین لڑکی ہے

اور ایک روایت کی وارث ہے۔

مجتبیٰ صاحب کا خط پاکر بہت خوشی ہوئی۔ میں انھیں الگ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ میری طرف سے ان کی خدمت میں پیش کر دیجیے گا۔ ان کا پتہ معلوم نہیں ورنہ براہِ راست لکھتا۔

مجھے مجتبیٰ صاحب کے خلوصِ نیت پر شبہ نہیں ہے۔ اگر میں بحیثیت شاعر و افسانہ نگار ان کے تنقیدی مضامین میں بار نہیں پا سکتا۔ یا اگر وہ خواتین افسانہ نگاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کی درمیانی کڑی یعنی ہاجرہ، خدیجہ کو فراموش کر جاتے ہیں تو یہ ممکن ہے وہ ہم لوگوں کو اسی قابل سمجھتے ہوں اور نیک نیت اور مخلص نقادوں کو تخلیقات ہی متاثر کر سکتی ہیں، شخصیتیں نہیں۔ اس لیے مجھے ان کی تنقیدوں سے شکوہ نہیں۔ محض چند سُنی سنائی باتیں تھیں، جو شکر ہے کہ غلط نکلیں۔

مجتبیٰ صاحب کا اتنا پیارا خط ہی تمام شبہات کو دور کر دینے کے لیے کافی ہے۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں ——　　　　آپ کا مخلص

ندیم ——

(۲)

۴۷۔ انارکلی۔ لاہور

۱۸ر فروری ۔ ۷۲ ۱۹ء

برادرم صہبا صاحب ——

خدا کرے اب آپ بالکل تندرست ہوں۔ آپ کا مفصل خط ملا تھا۔ میں ان دنوں درد گردہ کی مصیبت میں مبتلا رہا۔ (میرے گردوں میں بھی پتھری ہے) چنانچہ دفتر تو آتا جاتا رہا، مگر اطمینان سے بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ اب دو روز سے افاقہ ہے تو یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔

نظم بھی ملی۔ بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے پھر سے تخلیقی سفر کی طرف توجہ کی ہے۔ یہ نظم فنون کی زینت بنے گی۔ آپ نے تو "افکار" کی باقاعدگی بیماری کے دنوں میں بھی قایم رکھی ہے، مگر میں اس معاملے میں بالکل نااہل ہوں۔ دسمبر، جنوری اور فروری کے پرچے بہت عرصہ پہلے کتابت بھی کرا لیے اور مرتب بھی کر دیے، مگر ان کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ اب دسمبر کا پرچہ آج پوسٹ ہو رہا ہے۔ جنوری، فروری کا مشترکہ شمارہ اس مہینے کے آخر میں پوسٹ ہوگا۔ اور مارچ کا پرچہ مارچ کے اواخر میں لانے کی کوشش کروں گا۔ اسی میں آپ کی نظم درج ہوگی۔

آپ کے ساتھ زیادہ طویل ملاقات کا موقع کبھی نہیں آیا۔ برادرم ظہور نظر نے آپ کی دوست نوازی کے پُر لطف حالات سُنائے۔ پھر اب برادرم فوق صاحب کے ساتھ آپ کا جو سلوک ہے وہ اس دور میں عنقا ہے۔ یہ آپ کی شرافت اور خلوص کی دلیل ہے۔ اس گئے گزرے زمانے میں تعلقات کی ایسی پاکیزہ نوعیت اور کہاں ملے گی۔

آپ کی صحت یابی کی دعاؤں کے ساتھ ——　　　　مخلص

ندیم ——

راہِ انتظار

بجھا نہیں ہے سرِ راہِ انتظار چراغ

احمد ندیم قاسمی

ڈاکٹر اقبالؒ سے پہلی اور آخری ملاقات

(ایک یادگار مضمون)

ندیم صاحب کا یہ مضمون اُن کی ابتدائی، یادگار اور نایاب تخلیقات میں شامل ہے جسے ہم محمد علی صدیقی کے شکریے کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے علامہ اقبالؒ کی اس خواہش کے احترام میں کہ اردو میں سوانح عمریاں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ کوئی خدا کا بندہ اس کام کا بیڑا اٹھائے اور مسلمان فرماں رواؤں، عالموں، شاعروں اور ادیبوں کے حالات سیدھی سادی زبان میں اس طرح بیان کر دے کہ عام لوگ بھی اُنھیں ذوق و شوق سے پڑھیں۔ انھوں نے سب سے پہلے علامہ اقبالؒ پر سوانحی مضامین "شیرازہ" کے خاص نمبر میں شایع کیے۔ اسی میں ندیم صاحب کا یہ مضمون بھی شامل تھا۔ "شیرازہ" کے مضامین بعد میں کتابی صورت میں "اقبال نامہ" کے عنوان سے ۱۹۴۰ء میں ہونہار بک ڈپو۔ لاہور نے شایع کر دیے۔ یہ کتاب اب تقریباً نایاب ہے۔

——————— صہبا

میں مرتے دم تک اس بات پر فخر کروں گا کہ زندگی میں ایک بار تو میرے ہاتھ اقبال کے ہاتھوں سے مس ہوئے۔ زندگی میں ایک بار تو میں نے اُس جلیل القدر فلسفی کو جی بھر کر دیکھا۔ زندگی میں ایک بار تو میں نے اس منبع حکمت سے کسبِ فیض کیا۔

۲۸ جون ۱۹۳۷ء کا دن تھا۔ میں شام کے چار بجے دفتر روزنامہ انقلاب میں قبلہ سالک صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سالک صاحب قبلہ میری چند تازہ نظمیں "لمتمیرلو" "توحید کا دھارا" وغیرہ ملاحظہ فرما رہے تھے کہ مولانا حسرت کاشمیری بھی تشریف لے آئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر فیصلہ ہوا کہ آج دو ڈھائی گھنٹے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دولت کدے پر گزارنے چاہئیں۔

تم بھی کبھی ڈاکٹر صاحب کے ہاں گئے ہو ندیم؟

سالک صاحب نے مجھ سے پوچھا:

جی نہیں ۔۔ میں نے جواب دیا۔

" تو چلو ۔۔۔۔ آج اکٹھے چلیں ۔۔۔۔ اندھے کو تو دو آنکھیں چاہئیں ۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں تنہا جانے کی مجھ میں ہمت نہ تھی ۔ جس صاحب اعجاز کے قلم سے " جاوید نامہ " جیسی آسمانی چیز نکل گئی ہو اُسے دیکھنا میرے بس میں نہ تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ میرے حواس گُم ہو جائیں گے ۔ مجھے کوئی سہارا چاہیے تھا ۔ سو بخوشی تیار ہو گیا ۔

سالک صاحب قبلہ ۔۔۔ اور میں ۔۔ حسرت صاحب کی جائے قیام پر گئے ۔ حسرت صاحب کو کچھ کام کرنا تھا ۔۔ حسن اتفاق سے مولانا اختر شیرانی تانگہ پھر جاتے ہوئے نظر آئے ۔ سالک صاحب کو اور مجھے دیکھ کر انھوں نے تانگہ روکا ۔ وہ حکیم نیر واسطی صاحب کے ہاں جا رہے تھے ۔ ہم تینوں اُن کے ہمراہ تانگے پر سوار ہو گئے ۔ کیونکہ اختر صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ ہمیں " جاوید منزل " پہنچا دیں گے ۔ رستے میں افکار و حوادث اور مطائبات کے متعلق دلچسپ بحث جاری رہی ۔

آخر ہم " جاوید منزل " کے سامنے پہنچے ۔ اختر صاحب نے دور سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر کہا ۔ اُف ڈاکٹر صاحب تو بہت کمزور ہو گئے ہیں ! وہ نیر صاحب کے ہاں تشریف لے گئے اور ہم تینوں آگے بڑھے ۔ پلاٹ کے سرے پر کوٹھی کے برآمدے کے سامنے مشرق کا عظیم المرتبت مفکر ایک چھوٹے سے تکیے پر اپنی دائیں کہنی دھرے سات آٹھ اصحاب سے محو گفتگو تھا ۔۔ دُرانی صاحب کے سوا تمام ان صاحبان میں سے کسی کو نہ جانتا تھا ۔ ہمارے جانے پر اُن سب نے ڈاکٹر صاحب سے اجازت چاہی اور رخصت ہو گئے ۔ انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے میں میں نے ڈاکٹر صاحب کو بہت دُور سے ایک بار دیکھا تھا ۔ اب اتنی بڑی ہستی کو اپنے اس قدر نزدیک دیکھ کر میں نے محسوس کیا ۔۔ میرا دماغ مسرت ۔ تعجب اور احترام کے لامتناہی جذبات کے سیلاب سے گھومنے لگا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے ہلکے سبز رنگ کے شیشوں کی ایک عینک لگا رکھی تھی ۔ چارپائی پر آلتی پالتی بیٹھ کر آپ نے فرمایا ۔۔ " آئیے سالک صاحب ۔ حسرت صاحب کیا حال ہے " ؟ اور ان ہر دو حضرات سے مصافحہ کر کے آپ نے میری طرف دیکھا " احمد ندیم قاسمی " سالک صاحب نے فرمایا ۔ آپ مسکرائے ۔ مصافحہ فرمایا ۔ اور پوچھا " خیریت ہے " ؟ ۔۔ میں نے رُکتے رُکتے عرض کی ۔۔ " آپ کی عنایت ہے حضور ۔۔۔ اُس وقت میں نے سمجھا کہ مجھ جیسا خوش قسمت انسان شاید ہی اس دنیا میں ہو ۔۔ شاید ہر عظیم الشان ہستی سے پہلی بار مل کر ہر شخص کے احساسات اس قسم کے ہی ہوتے ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب آہستہ آہستہ حقے کے کش لگا رہے تھے ۔ فرمانے لگے ۔ سنائیے حسرت صاحب مطائبات کا کیا حال ہے ؟

حسرت صاحب ۔ زوروں پر ہیں جناب ، پچھلے دنوں میں نے آپ کے حُقے کی خودی پر بھی دو کالم لکھے تھے ۔ شاید آپ کی نظر سے نہیں گزرے ۔

ڈاکٹر صاحب (مسکراتے ہوئے) ڈاکٹر نے مطالعہ سے روک رکھا ہے ۔ کبھی کبھی شفیع (کچھ ایسا ہی نام تھا) سے اخبار کا کوئی حصہ پڑھوا لیتا ہوں ۔ خود نہیں پڑھ سکتا ۔

حسرت صاحب ۔ آج کل " افکار " اور " مطائبات " تو آموں کے لیے وقف ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب ۔ سالک صاحب آپ کو تو یاد ہوں گے وہ دن جب آموں کی دعوتیں ہوا کرتی تھیں ۔ اور رات کے بارہ بارہ ایک ایک بجے تک محفل گرم رہتی تھی ۔

سالک صاحب: خوب یاد ہیں جناب۔ انھیں کی یاد تو زندگی کا سرمایہ ہے۔

یہاں سے نہ جانے کس طرح گفتگو کا رُخ مولانا ظفر علی خاں صاحب مدظلہ کی طرف پھر گیا۔

ڈاکٹر صاحب: مولانا کی خداداد قابلیت میں کسے شُبہ ہو سکتا ہے۔ لیکن کاش خیالی مہموں کی بجائے وہ ٹھوس کاموں کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے۔ انھوں نے مسلمانوں کے لیے جو کچھ کیا ہے۔ وہ اس سے زیادہ کر سکتے تھے۔

سالک صاحب: پچھلے دنوں مولانا فرما رہے تھے کہ وہ "زمیندار" میں مختصر کہانیوں کا سلسلہ شروع کریں گے اور چونکہ اوریجنل افسانوں کی ہندوستان میں کمی ہے اس لیے اوّل اوّل انگریزی۔ امریکن۔ فرانسیسی۔ روسی اور جرمن افسانہ نگاروں کے ترجمے شایع کریں گے۔ میں نے کہا۔ یورپین افسانوں میں مقامی رنگ اس قدر ہوتا ہے کہ ہندوستانی قارئین بوکھلا جاتے ہیں۔ نیز اُن افسانوں کی طوالت کی ہمارے روزناموں کی محدود گنجایش متحمل نہیں ہو سکتی۔

ڈاکٹر صاحب: (اپنی مخصوص مسکراہٹ سے) کیا مولانا نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں ڈیوما کے کاؤنٹ آف مانٹی کرسٹو کا ترجمہ بھی شایع کروں گا۔ وہ بھی تو مختصر افسانہ ہے!

اس پر ایک طویل قہقہہ پڑا اور ڈاکٹر صاحب دھیرے دھیرے حقّے کے کش لگانے لگے۔

ڈاکٹر صاحب: افسانوں کے نفسیاتی پہلو کی لذت کا تو میں بھی معترف ہوں۔ لیکن اگر اُن کی جگہ کوئی ایسی چیز پیش کی جائے جو افسانے کا افسانہ ہو اور سبق کا سبق، تو بہتر رہے گا۔ دیکھیے اسلام کے اولوالعزم فرزندایسی ایسی مہمیں سر کر گئے ہیں۔ ایسے ایسے معرکے طے کر چکے ہیں کہ ان کا تذکرہ بہترین سے بہترین افسانوں سے دلچسپ رہے گا۔ میری تو مدت سے یہ خواہش ہے کہ کسی باہمت ادیب یا مورخ سے کہوں کہ وہ مختلف تذکروں کا سلسلہ شروع کرے۔ تذکروں کا یہ سلسلہ مسلمانوں کے لیے بے حد مفید رہے گا۔ اور پھر مواد بھی کافی ہے۔ مثلاً تذکرۂ صوفیائے اسلام۔ تذکرۂ غازیانِ اسلام۔ تذکرۂ فلسفیانِ اسلام۔ تذکرۂ شعرائے اسلام۔ تذکرہ مجاہدین وغیرہ۔ ایک ایک کتاب کے لیے بس سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو صفحے کافی ہوں گے۔

سالک صاحب: تذکرۂ بلادِ اسلامیہ۔ تذکرۂ غزوات اسلام۔

ڈاکٹر صاحب: ہاں یہ موضوع بھی نہایت شاداب ہیں۔ بلادِ اسلامیہ پر تو میں نے بھی ایک نظم کہی تھی۔

حسرت صاحب: جی ہاں! بانگِ درا میں موجود ہے۔

ڈاکٹر صاحب: بھئی مصیبت تو یہ ہے کہ ہمارے ادیب اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ آج کل کے مسلمانوں کو دیکھ کر اگلے لوگوں کے متعلق بھی اُن کا خیال کچھ اچھا نہیں رہا۔

سالک صاحب: کتنا زوال ہے۔ اتنی زبردست بلندی۔ پھر اتنی ہولناک پستی۔ کتنا بڑا زوال ہے!

ڈاکٹر صاحب: ہاں۔ پچھلے دنوں کسی جذباتی ایڈیٹر نے اپنے اخبار میں لکھا تھا کہ اگر آج گاندھی جی اور نہرو مسلمان ہو جائیں تو ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ میں نے کہا۔ اس غلام آباد میں نو کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ دو غلام اور مسلمان ہو جائیں، تو یہ کیا کریں گے۔

(باقی صفحہ ۹۵۹ پر)

پروفیسر ممتاز حسین

ایک خط۔ ایک معذرت

برادرم صہبا صاحب ۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کئی کامیاب نمبروں کے بعد اب قاسمی نمبر نکال رہے ہیں۔ آفریں ہے آپ کے اس حوصلے پر کہ آپ اتنا بڑا کام اس مہنگائی میں کر رہے ہیں۔ اس موقعے پر جیسا کہ آپ تقاضا بھی کرتے رہے ہیں، قاعدے سے مجھے کوئی سیر حاصل مضمون قاسمی صاحب کے فن اور شخصیت سے متعلق لکھنا چاہیے تھا۔ لیکن چونکہ میں ان دنوں حضرت امیر خسرو پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں، علی الرغم ان مصروفیتوں کے جو ایک تعلیمی ادارے کے ایک سربراہ کی حیثیت سے مجھ پر عاید ہیں۔ اس لیے میں اس کام کے لیے کوئی وقت نکال نہ سکا۔ بہرحال وہ مضمون مجھ پر قرض رہے گا۔ یہ مختصر سا خط جو میں لکھ رہا ہوں، اس سے نہ تو اس کی تلافی ہوتی ہے اور نہ وہ دوہری ندامت ہی مٹتی ہے، جو اس وقت مجھے ایک چھوڑ دو ندیموں سے ہو رہی ہے، ایک قاسمی صاحب سے اور ایک آپ سے۔ ہاں اس خط کے ذریعے یہ کہنے کو ضرور ہو جائے گا کہ جس وقت اتنے بہت سے احباب کے خراجِ عقیدت کا یہ گلدستہ، آپ قاسمی صاحب کی خدمت میں پیش کریں گے، تو اس میں اس کی کسی نہ کسی پتّی پر میری جانب سے بھی آپ کو مبارک باد لکھا ہوا ملے گا۔

ایک رشتہ اُن سے رفاقت اور اُخوت کا ترقی پسند ادب کی تحریک میں حصہ لینے اور سالہا سال تک اس انجمن کے جنرل سکریٹری رہنے کا ہے۔ لیکن ایک رشتہ ان سے ذاتی مہر و وفا کا بھی ہے۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں، تقریباً تین چار ماہ تک میں نے لاہور میں قیام کیا، ان دنوں ان سے روز کا ملنا جلنا تھا۔ وہ ساری ملاقاتیں اور ان کی کرم فرمائیاں ناقابلِ فراموش ہیں۔ انھیں دنوں کی بات ہے کہ ان کی ملنسار اور غم گسار شخصیت نے میرے دل میں ایک ایسی جگہ بنالی جسے محبت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ اسی محبت کا نتیجہ ہے کہ جب کوئی شخص مجھے یہ خبر سُناتا ہے کہ وہ آج اپنے ترقی پسند مسلک سے ہٹ گئے ہیں تو مجھے یقین نہیں آتا ہے۔ اول تو یہ کہ ترقی پسندی کوئی جامد شے نہیں۔ ہر دور میں اس کے اظہار کے نئے طریقے ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی کالم نویسی کو زیادہ اہمیت دینا بھی درست نہیں، کیونکہ وہ ہنگامی موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں اور جلد جلد بدلتے رہتے ہیں۔ بہرحال چونکہ یہ بات سامنے آ ہی گئی ہے۔ اس لیے ان میں سے چند شکایات کا ذکر کر رہا ہوں جو ان کے ترقی پسند احباب مجھ سے بطورِ خاص کیا کرتے ہیں۔ میں چونکہ خود کم فرصتی کے باعث بہت سے اخبار نہیں پڑھتا ہوں۔ اس لیے یہاں بیشتر

سُنی سنائی ہوئی باتیں لکھ رہا ہوں۔

ایک شکایت ان کے دوستوں کو یہ ہے کہ وہ ہم لوگوں کو امرتسر ٹی۔ وی اسٹیشن کی تصویریں دیکھنے نہیں دیتے ہیں۔ دن رات اس کے خلاف لکھا کرتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ قاسمی صاحب اس کا کیا جواب دیں گے۔ لیکن آج کے "ڈان" مورخہ ۵ دسمبر میں لاہور کی ڈائری میں جو باتیں لکھی ہوئی ہیں ان سے دو ایک اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔ نامہ نگار لکھتا ہے کہ ہفتے میں دو دن، ہندوستانی فلموں کے دیکھنے کے شوق میں لوگ سرِ شام امرتسر ٹی۔ وی سے لگ کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اب امرتسر نے کوئی دھماکہ قسم کی ایک فلم "تباہی" نام کی یہاں شہر پر ایسی چھوڑ رکھی ہے کہ اس کو بار بار دیکھنے کی آرزو میں لوگ مرے جا رہے ہیں۔ چنانچہ امرتسر کے ٹی وی نے لاہور کے لوگوں کے ایسے بعض خطوط بھی سُنائے ہیں، جن میں اس فلم کو بار بار دکھانے کی استدعا کی گئی ہے، اور ایک صاحب نے تو خودکشی کی بھی دھمکی دی ہے۔ اسی ڈائری میں ملکہ پکھراج کے اس بیان پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے کہ آرٹسٹ نہ فیض آبادی ہوتا ہے، اور نہ لاہوری۔ بلکہ ساری دنیا کا ہوتا ہے۔ یہ اشارہ اختری بائی فیض آبادی کی طرف ہے جن کی موت پر غالباً کوئی ٹی وی پروگرام لاہور کے ٹی وی اسٹیشن سے نہیں کیا گیا۔ ان دو اقتباسات کے بعد مزید اس کے بارے میں کچھ کہنا بیکار ہے۔ اور اگر یہ ساری باتیں معمولی ہیں تو ایک سنگین بات سنیے۔ قاسمی صاحب کے ایک جواں سال ادیب کا یہ نظریہ ہے کہ "ساری دنیا کو ترقی اور پاکستان کو رجعت کی ضرورت ہے۔" چونکہ انھوں نے یہ جملہ اپنے ایک ایسے مضمون میں لکھا ہے جس کا تعلق قاسمی صاحب کی شاعری سے تھا اس لیے بعض حضرات کو یہ گمان گزرا کہ شاید وہ بھی اسی نظریے کے ہو سکتے ہیں۔ یہ سراسر اسکینڈل ہے۔ ہر شخص اپنے ممدوح کو اپنے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ اس سے ممدوح کا رنگ نہیں بدلتا ہے۔ خدا کی حمد سبھی مذہب کے لوگ کرتے ہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنی بے رنگی ہی میں رہتا ہے۔ بھائی، دوسروں کے جملے کو قاسمی صاحب سے کیوں منسوب کرتے ہو! ان کے عقیدت مندوں کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اس میں ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی، رجعت پسند اور ترقی پسند بھی سبھی شامل ہیں۔ ہر شخص کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کی تعریف اپنے رنگ میں کرے۔

جہاں تک کہ میری ذات کا تعلق ہے وہ میری نظر میں آج بھی ویسے ہیں جیسے کہ وہ کل تھے۔ ان کا فن عالمگیر انسانی اقدار کا حامل ہے۔ وہ کوئی ایک قوم کے نہیں بلکہ پوری بنی نوع انسان کے شاعر اور فن کار ہیں۔ ان کا مذہب عشق رسمِ کافری سے بھی آشنا ہے، وہ ایک صنم خانۂ عشق اپنے دل میں پنہاں رکھتے ہیں، جس کا ثبوت ان کی شاعری ہے۔ آؤ آج ہم سب ان کی خدمت میں چلیں اور ان کے اسی صنم خانۂ عشق کی غزلیں اور نظمیں ان سے سُنیں، جنھیں انھوں نے اپنے خونِ جگر سے تعمیر کیا ہے۔ لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ تو خود "نفسِ واحد" کی مستی میں سرشار سوئے مے خانہ چلے آ رہے ہیں۔ آؤ ہم سب ان کی تعظیم کریں تکریم کریں۔

مخلص

ممتاز حسین

ہاجرہ مسرور

میرے بھیّا۔ میرے لالہ

ہر انسانی رشتہ خون کا رشتہ نہیں ہوتا، لیکن ہر رشتے کی تخلیق خون سے ہوتی ہے۔ کسی کو بہن یا بھائی، ماں! بیٹا بیٹی کہہ دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ ہمارے یہاں شائستہ لوگوں میں یہ عام اندازِ تخاطب ہے۔ اس طرح مخاطب مرد یا عورت سے بات چیت میں آسانی رہتی ہے، لیکن انھیں رشتہ نہیں کہنا چاہیے۔ کچھ رشتے موروثی ہیں۔ ان میں آبا کا خون شامل ہوتا ہے، لیکن اس سے کم شدید اور بے پایاں وہ رشتہ نہیں ہوتا، جس کی تشکیل میں ہمارے خون کی حرارت بلکہ ہمارا سارا جذباتی اور روحانی وجود شامل ہوتا ہے۔ ایک ہی گھر میں، ایک ہی والدین کے سایے میں پلنے والے بھائی اور بہن آبائی محبت کے بہاؤ میں زندگی کے سمندروں کا سفر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آرام سے طے کر لیتے ہیں لیکن اچھی خاصی بالغ زندگی گزارنے کے بعد جب ہم کسی کو آگے بڑھ کر بھائی یا بہن کہتے ہیں تو بہت کم سوچتے ہیں کہ ہم دونوں کے ساتھ اپنا اپنا ماضی ہے۔ اپنا اپنا حال اور مستقبل ہے۔ اپنا اپنے ذہنی سفر کے بُرے بھلے اثاثے اور تجربے ہیں۔ اپنے اپنے ماں باپ، بھائی بہن، رشتے داریاں، قرابت داریاں، نفرتیں اور محبتیں اور وہ سارے افراد اور عناصر موجود ہیں جن سے ہمارے کردار و مزاج نے یہ صورت اختیار کی مثلاً میں! ایک ہاجرہ مسرور ہی تو نہیں ہوں، بیٹی ہوں، بھانجی ہوں، بہنوں اور بھائیوں کی بہن ہوں، بیوی ہوں، ماں ہوں، نند ہوں، دوستوں اور دشمنوں کی محبتوں اور نفرتوں کی حق دار یا سزاوار ہوں، لیکن جب لالہ نے تین چار سال تک خطوط کے تبادلے کے بعد میری زندگی کے سب سے زیادہ اذیت ناک دور کی پکار سن کر جواب میں ایک تڑپ کے ساتھ بہن کہا تو اس حرفِ ندائیہ میں اپنی بہن کا تمام ماضی، حال اور مستقبل، سب رشتے ناتے، رفاقت اور قرابت، وہ تمام واسطے لپیٹ لیے۔ اور اس رشتے کو اس کی ساری نزاکتوں کے ساتھ نباہتے ہوئے وہ نہ صرف ہم دونوں بہنوں کے بڑے بھائی بنے، بلکہ میرے بھائیوں کے بھی بڑے بھائی اور سارے کنبے کے سرپرست بن گئے۔ حالانکہ دو افسانہ نگار ان دیکھی لڑکیوں کو بہن کہہ کر زیادہ سے زیادہ ان کو بہلا کر سارے جھنجھٹ سے نجات پائی جا سکتی تھی۔ لیکن لالہ کی فطرت میں کوئی دلدل نہیں کہ اس میں کوئی چیز گرے تو چند بلبلے اٹھا کر وہ میں غرق ہو جائے، وہ تو پُرسکون دریا ہیں جس میں گرنے والی شے سے لہروں کے وہ حلقے بنتے ہیں جو دُور دور تک پھیل جاتے ہیں، ان حلقوں کی آغوش میں ہمارے سارے عزیز، سب رشتے ناتے، حتیٰ کہ ہماری دوستیاں تک آ گئیں۔

ہمارے اور لالہ کے اس تعلق کی ابتدا بڑے سرسری انداز سے اُس وقت ہوئی جب میں نے اور خدیجہ نے اپنے افسانے 'ادبِ لطیف' میں چھپنے کے لیے بھیجے تو "محترمہ و مکرمہ" اور "محترم و مکرم" کے درمیان رسمی اور کاروباری خطوط کا تبادلہ شروع ہوا۔ اپنی زندگی کے اس دَور کی طرف مڑ کر دیکھتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ افسانہ نگاری، ہماری محدود زندگی پر رکھے ہوئے دُکھوں کے گنبد میں ایک ایسا روزن تھی، جس سے باہر کی تازہ ہوا کے جھونکے، کتابوں، رسالوں اور خطوں کی صورت میں

آجاتے اور ہم ایک بے نام سی سرشاری محسوس کرتے۔ یہ حروف اور ان کے لکھنے والے بڑے جانے پہچانے اور اپنے سے لوگ محسوس ہوتے، چنانچہ ہمارے گھر میں خصوصیت کے ساتھ خطوط کا استقبال ایک عزیز مہمان کی طرح ہوتا۔ گھر کے سب چھوٹے بڑے خطوط کے مطالعے کے لیے اکٹھا ہو جاتے۔ اب یہ دوسری بات کہ یہ "مہمان" اکثر بڑے چھچھورے اور تکلیف دہ بھی نکلتے۔

اپنا ایک دُکھتا پہلو سامنے رکھ دوں تو شاید ہماری اس کیفیت کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے اور وہ یہ کہ بہت سے لوگ بھرے پُرے خاندانوں اور رشتے داریوں سے عاجز ہوا کرتے ہیں، مگر ہم اپنے خاندان کے محدود ہونے کو اپنی بدقسمتی سمجھتے تھے۔ دادیہال اور نانیہال دونوں طرف سے ہی ہمارے بزرگ دو تین نسلوں سے "اکلوتے" رہے اور خاندان سُکڑتا ہی چلا چلا گیا، اس لیے چچا، تایا، پھوپی، یا چچا زاد، تایا زاد اور پھوپھی زاد قسم کی کوئی مخلوق ہمارے حصے میں نہیں آئی (یہ وہ مخلوق تھی، جس کو ہمارے نامیاں زندگی کے اڑتیس سال اپنے دوستوں کی روحوں میں تلاش کرتے رہے، اور جب وہ نمونیہ میں مبتلا ہوئے تو صرف اپنے ایک دوست کو تار بھجوایا اور وصیت بھی انہی کے لیے کی)

ہاں تو میں لالہ کے خطوط کا ذکر کر رہی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے اکلوتے نوجوان ماموں بھی ہماری آنکھوں کے سامنے دم توڑ چکے تھے، اور ہمارے بھائیوں میں توصیف کو ابھی مارکٹائی اور شرارتوں میں زندگی کی کڑواہٹ کا احساس نہ ہوا تھا۔ اور خالد ابھی پاؤں چلنا سیکھ رہے تھے۔ ایک دن خدیجہ اور میں جلتی دوپہریا میں تانے آئے ہوئے رسالوں میں غرق تھے، اچانک خدیجہ نے پوچھا:

"ہاجرہ، اگر کبھی اتنے بہت سے لکھنے والوں میں سے کسی سے اپنا دُکھ سُکھ کہنا پڑے تو کس سے کہوگی؟ اور یہ سمجھ کر کہ وہی کچھ سمجھا جائے گا، جو تم نے کہا ہوگا؟"

"احمد ندیم قاسمی سے ــــ ان کے افسانوں میں عورت، محترم ہے۔"

اور ــــ؟ خدیجہ نے پوچھا:

کرشن چندر سے بھی کہا جا سکتا ہے اور بیدی سے بھی۔ منٹو اور عصمت سے تو ہرگز نہ کہوں گی، وہ جانے کیا مطلب نکال لیں گے، مذاق اڑائیں گے۔ (اور اب سوچتی ہوں تو لگتا ہے جیسے منٹو اور عصمت سے اس وقت انصاف کرنے کی موڈ میں ہو ہی نہیں سکتی تھی)

اس کے بعد ہم نے محترمی و مکرمی احمد ندیم قاسمی کو جو خط لکھا تو "بھائی" کا لفظ بے ارادہ ہی ٹپک پڑا۔ اور کیسی عجیب، کیسی سنسنی خیز بات تھی کہ ہمارے اس محترم و مکرم بھائی نے اس لفظ کو اٹھا کر اپنے سینے میں محفوظ کر لیا، اور جواب میں غالباً پہلی بار کسی لکھنے والے نے ہمیں بہن کے القاب سے یاد کیا۔ ہماری خط و کتابت کا یہ دور کوئی تین سال رہا۔ پھر جب اپنی بے دست و پائی سے نجات پانے کے لیے ہم نے باہر کی دنیا میں جھانکنا شروع کیا، تو سمجھ میں آیا کہ مردم گزیدہ ہونے کا مطلب کیا ہے؟ انتہائی کرب کے عالم میں، میں نے ندیم بھائی کو ایک خط لکھا اور اس میں اپنے سارے دکھ درد کی داستان بیان کر دی۔ لکھ لینے کے بعد بہت۔ بہت۔ یوں محسوس ہوا جیسے سمندر کی لہروں سے لڑتے لڑتے ایک دم ساحل نے اپنے سینے کی نرمی اور گرمی بخش دی ہو۔ مگر بہت جلدی اپنی اس حرکت سے میں خوف زدہ ہو گئی۔ خدیجہ کا ردِ عمل بھی ایسا ہی تھا۔ مگر

اب کیا ہو سکتا تھا۔ کیونکہ لفافہ تو ڈاک کے سپرد ہو چکا تھا۔ یہ کیفیت ابھی جوں کی توں تھی کہ چند دنوں میں لالہ کا ایک رجسٹرڈ لفافہ موصول ہوا۔ اور اس لفافے میں ہماری خود نوشت داستانِ غم بھی موجود تھی اور لالہ کا مشوروں سے بھرپور ایک خط بھی۔ کوئی "اور" بھائی" ہوتا تو ہمارے اس کمزور لمحے کی سرگزشت کو کسی مناسب موقع پر استعمال کے لیے احتیاطاً اپنے پاس محفوظ رکھتا، لیکن یہ کوئی "اور" نہ تھا۔ پنجاب کے دُور دراز علاقے کے پہاڑی گاؤں انگہ کے احمد شاہ تھے جنھوں نے نو عمری ہی میں ننھی سی عمر سے یتیمی، عسرت اور ماحول کی بے رحمی کا زہر پینا شروع کیا تھا۔ ایسے بہت سے لوگ جب ٹوٹ پھوٹ کر اُٹھتے ہیں تو خود بھی بڑے بے رحم اور منتقم مزاج بن جاتے ہیں۔ لیکن احمد شاہ ایسے نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ جن مصیبت زدہ گھروں میں صابر مائیں اور ٹوٹ کر محبت کرنے والی بہنیں ہوتی ہیں، وہاں یہ زہر بھی بچے کی روح میں امرت بن جاتا ہے، اور لالہ کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں ایک بے حد صابر ماں اور اپنے سے سات سال بڑی بہن سیدہ ملیں، جن کا دامن پکڑ کر انھوں نے پاؤں چلنا سیکھا تھا اور جو اپنے اس چھوٹے بھائی سے عشق کرتی تھیں، یہاں تک کہ لالہ امتناعی نظربندی کے دوران جب تک جیل کے ٹھنڈے فرش پر سوتے رہے، انھوں نے گھر کو سی کلاس کی کال کوٹھری سمجھا اور فرش پر سوتی رہیں۔

بات ہمارے اور لالہ کے درمیان بہن اور بھائی کے رشتے پر ہو رہی تھی۔ ان کے پہلے ہی خط نے اس رشتے کی پائیداری پر ہمارا اعتماد مستحکم کر دیا تھا۔ ابھی ہم لکھنؤ میں تھے اور لالہ پشاور میں کہ منھ بولے بھائی بہن کے رشتے پر کسے جانے والے فقرے ہم تک پہنچنے لگے۔ اس پر لالہ نے ۲۹ جولائی ۱۹۴۶ء کو خدیجہ کے نام ایک خط میں لکھا۔

"اور یہ فن کار لوگ جنھیں انسانیت و مشیت کا نباض سمجھا جاتا ہے، یہ غیر معمولی حد تک ریاکار اور فریبی ہیں۔ سب اس لپیٹ میں نہیں آ جاتے، لیکن اکثریت، بہت بڑی اکثریت ایسی ہے جو متلون مزاج ہے، جو دوسرے کی ترقی دیکھ کر کُڑھتی ہے، جو کسی سے محبت نہیں کر سکتی۔ جس کے نزدیک فرائیڈ کا جنسیاتی نظریہ سمجھنا آسان ہے، جو یہ اندازہ ہی نہیں کر سکتی کہ لکھنؤ کی دو لڑکیاں، پنجاب کے ایک لڑکے کی سچی بہن بن سکتی ہیں۔ سو میری بہن ایسے لوگوں سے بچے رہنا ہی بہتر ہے۔ میں خود فن کاروں کی جماعت کا ایک ادنیٰ ممبر ہوں، لیکن دُکھی ہوں کہ میرا تعلق ایسی جماعت سے کیوں ہے، جو ہر عورت کو محبوبہ تصور کرنے پر مجبور ہے، جو انسانی فطرت کے شرف کا احساس نہیں رکھتی ــــــ"

ــــ اور اسی خط میں دوسری جگہ لکھا:

"ــــ آپ کا خیال درست ہے کہ [illegible] دنیا میں [illegible] زیادہ ہے اور خلوص کم۔ اسی زبردست کمی کے باعث ہم کسی اچھے آدمی پر اعتماد [illegible] [illegible] اور پھر جب تک [illegible] کا کوئی [illegible] ثبوت بھی تو نہیں [illegible] باتیں تو [illegible] ہیں۔ ایک جھوٹا آدمی بھی [illegible] باتیں اسی روانی اور نرمی سے کر سکتا ہے جیسے اچھا آدمی [illegible] اسی لیے ہماری محبتیں [illegible] اور ہمارے [illegible] ظلمت زدہ رہتے ہیں ــ لیکن [illegible] ہیں، ہم دونوں [illegible] [illegible] دوسروں کی ــــ [illegible] رہ گئے ہیں اور اسی لیے

> ہم میں اتنی قوت موجود ہے کہ الفاظ کا تانا بانا اٹھا کر سچائی کا دیدار کر سکیں، بشرطیکہ سچائی وہاں موجود ہو۔ آپ میری پیاری بہن ہیں، آپ سے کیا پردہ، مجھے خواتین کے اتنے خطوط آتے رہتے ہیں، اتنے بے شمار کہ آپ حیران ہوں گی۔ ان میں فن کار عورتیں بھی تھیں اور پڑھنے والیاں بھی، مگر خدا نے مجھے اتنی قوت ضرور دی ہے کہ الفاظ کے پردے اٹھا سکوں، میں نے ہر ایسے مشکوک خط کا جواب دو سطروں میں دیا کہ آپ کی قدر افزائی کا شکریہ۔ امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گی ——— اور ۹۹ فی صدی خواتین نے دوبارہ خط لکھنے کی جرأت نہ کی ——"

ندیم لالہ کی فطرت کا یہ پہلو پون صدی سے زیادہ عرصے سے ہمارے کتنے ہی اہلِ قلم حضرات کی نجی محفلوں میں طنزیہ گفتگو کا ایک موضوع بنا رہا ہے۔ اگر لالہ کسی عورت کو اغوا کر لیتے، کسی کو قتل کر دیتے یا ڈکیتی کی واردات میں ملوث ہوتے تو شاید کچھ لوگوں کے نزدیک یہ حرکت قابلِ معافی ہوتی۔ لیکن لالہ کے اکثر نکتہ چیں ان کے مزاج کی شائستگی کو قطعی غیر شاعرانہ بلکہ غیر انسانی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ڈھاکہ کی ایک محفل کا یہ چٹ پٹا فقرہ لمبا سفر طے کر کے ہم تک پہنچا جو ہمارے ایک مہربان دانشور فن کار نے عالمِ سرور میں ادا فرمایا ——— اور ——— اور یہ ندیم ——— یہ ندیم فراڈ ہے یا فرشتہ، بھلا کوئی انسان اتنا اچھا کیسے ہو سکتا ہے کہ نئی لڑکیوں کو بہن کہے بھی اور بہن سمجھے بھی ——"

خیر یہ تو اپنے اپنے پیمانے ہیں، بہرحال لالہ ان لوگوں میں نہیں جو صحرا میں پیاس سے تڑپتے انسان کے منہ میں پانی ٹپکانے کے بجائے بیٹھ کر اس کے لیے کباب بھونیں کہ خود انھیں یہ کباب ذائقے میں سب سے بہتر لگتے ہیں۔

اسی خط میں وہ آگے چل کر ان دیکھی بہنوں کو کس انداز سے دیکھتے ہیں:۔

> "—— آپ کی اور میری خط و کتابت محض کاروباری تھی۔ لیکن ان خطوط میں آپ دونوں بہنوں کی پاکیزہ طبعی کا اندازہ لگا لیا۔ اور اس روز مجھے کتنی خوشی ہوئی جب آپ دونوں کے اکٹھے خط آتے، اور آپ نے مجھے "بھائی" سے مخاطب کیا اور میری عزیز متاعوں میں اضافہ ہو گیا۔ آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آتے گئے اور آج ہم سگے بہن بھائی کی طرح زندہ ہیں۔ ہم علی الاعلان اپنے اس تعلق پر خوشی کا اظہار کرنے کو تیار ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے دلوں میں صداقت ہے، اور وہ محبت جو مجھے تسنیم اور ستیزہ سے ہے، وہ بدستور قائم ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں آنے پائی اور نہ کبھی آ سکتی ہے، بہنیں، محترمہ خدیجہ اور ہاجرہ بھی اسی پاکیزگی اور بلند نگہی اور خلوصِ بے کراں کا ہالہ لیے موجود ہیں، اور میں ایمان اور یقین کی پوری شدت سے کام لے کر کہہ سکتا ہوں کہ میری بہنو! تم پر تصدق ہوں اور میں تمھارا ہوں۔ مجھ پر تمھارے بے شمار حقوق ہیں۔ خدا وہ دن لائے جب میں عملی طور پر کسی خدمت کے لائق ہو سکوں۔ میری محبت کا جو حصہ آپ کو ملا ہے، صرف آپ کا ہے، اس میں کوئی کمی نہیں آ سکتی ——"

اور یہ کیسی عجیب و غریب، کیسی خواب ناک سی حقیقت ہے کہ لالہ نے قیامِ پاکستان سے پہلے اپنی منہ بولی بہنوں سے جو عہدِ وفا باندھا تھا، اس پر مہ و سال کی کوئی گرد آج تک نہ جم سکی۔ قیامِ پاکستان کے فوراً ہی بعد کے ہم

اچانک کراچی پہنچے اور پھر لاہور۔ یہ تمام سفر بظاہر جذباتی سطح پر جاری تھا، مگر ذہن اُجڑے ہوئے تھے۔ ہم نے لکھنؤ چھوڑنے سے قبل لالہ کو جو خط لکھا، کراچی سے جو اطلاع دی، وہ اس زمانے میں ڈاک کی گڑبڑ کی وجہ سے انھیں بہت دیر سے ملی۔ لالہ 'سویرا' کے ڈیکلریشن والے مقدمہ کی پیشی بھگتنے لاہور آئے تو بھائی محمد طفیل کے ساتھ لسبت روڈ والے گھر میں ہم تک پہنچ گئے۔ یہ لمحہ کیسا عجیب تھا، اس وقت کے تاثرات میں خود بیان نہیں کر سکتی۔ لیکن اس لمحے کو لالہ نے جس طرح اپنی گرفت میں لیا، وہ خدیجہ کے نام اس خط کے اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے۔

"——کیا کہوں تمھارے پاس جو دن کاٹے، انھوں نے مجھے کس حد تک متاثر کیا ہے! تم سب بہنوں کی محبت نے مجھے اس قدر مسرت بخشی ہے کہ ہاجرہ کے نام خط لکھتے ہوئے میں نے اس تفصیل میں جانا چاہا، مگر ناکام رہا۔ وہ سب کچھ نہ لکھ سکا جو لکھنا چاہتا تھا۔ اگرچہ اب سے پہلے بھی تم بہنوں کے بارے میں میرا نظریہ مکمل تھا، مگر اب ملاقات کے بعد تو میں اپنے آپ کو حد درجہ خوش نصیب پاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے توفیق دے کہ میں آخری ہچکی تک سچے بھائیوں کی طرح تمھاری خدمت کر سکوں اور کبھی تمھیں فریب نہ دوں۔ اپنی ذہنیت کا نہایت گہرا تجزیہ کرنے کے بعد میرا یہ یقین تو پختہ ہے کہ میں تمھیں فریب دینے پر قادر نہیں ہوں۔ لیکن دعا یہ ہے کہ تمھیں کوئی دُکھ نہ پہنچاؤں اور تمھاری زندگیوں کو ان مسرتوں اور آسائشوں سے شاداب کرنے میں میرا بھی حصہ ہو، جو ابھی تک مستقبل کی امانتیں ہیں——

جب میں نو برس کا تھا تو مجھے پہلی بار امی سے جدا ہونے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت میرے دل و دماغ کی وہی کیفیت تھی جو پرسوں صبح سات بج کر آٹھ منٹ سے ہے۔ اس کے بعد جب میں پندرہ برس کا تھا، تو بھائی جان کالج سے چھٹیوں پر آئے۔ اور پھر چلے گئے اور مجھ پر یہی قیامت گذر گئی۔ اس کے بعد ایسا تجربہ یاد نہیں، لیکن پرسوں اسٹیشن کے ہجوم میں تمھیں الوداع کہنے کے بعد پلٹتے ہی، پہلا قدم اٹھاتے ہی مجھ پر اسی کیفیت کا حملہ ہوا——" (پشاور۔۱۲ر نومبر ۱۹۴۷ء)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:——

"——آج سے تین چار سال پہلے اس دنیا میں میری صرف ایک بہن تھی۔ سیدہ۔ ان دنوں میں تم دونوں کی طرف خط لکھتا تھا تو خواہر محترمہ یا عزیز بہن کے القاب سے یاد کرتا تھا۔ بہت کم خواتین ایسی ہیں، جن کو ان القاب سے یاد نہیں کرتا۔ میں مکرمہ محترمہ سے گھبراتا ہوں۔ اس لیے کہ ان لفظوں میں گنجائشیں ہیں اور میں گنجائشوں کا متلاشی کبھی نہیں رہا—— ایک سگی بہن کی موجودگی میں ایک اور بہن بنا لینا، میری بے دست و پائی کا ردِ عمل نہ تھا، بلکہ یہ خلوص کی پکار تھی جو ہم نے ہزاروں میل کے فاصلے سے سن لی تھی۔"

(پشاور ۲۵ر نومبر ۱۹۴۷ء)

عجیب سی بات ہے مگر ایسا ہے کہ لالہ کی محبت کی گرم جوشی اور والہانہ پن ان کے ذہن سے رشتوں کا فرق مٹا

دیتے ہیں۔ اکثر اوقات وہ تمام رشتے جو ان کے محترم رشتے ہیں، گڈمڈ ہو کر ایک ہی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک دفعہ میں کچھ عرصے کے لیے کراچی آئی تو لالہ نے لاہور سے لکھا:-

"آج ایک ہفتے سے تم باقاعدہ خواب میں آتی ہو۔ اور خوب خوب گپیں ہوتی ہیں۔ اور جب آنکھ کھلتی ہے تو غلام محمد جو میانوالی سے واپسی پر پہلے سے زیادہ گورا ہو گیا ہے، اخبار لیے موجود ہوتا ہے۔ تم اور امی التزاماً نظر آتی رہی ہو، تم اور امی التزاماً اکٹھی یاد آتی رہی ہو"۔

وہ اپنے خطوط میں خدیجہ کو اور مجھے اور میری چھوٹی بہنوں کو کبھی ماں جائی کہتے ہیں، کبھی بیٹیا اور زیادہ لاڈ مقصود ہو تو "جو" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ کبھی پوچھتے ہیں، کیا میں تم لوگوں کو توصیف اور خالد کی طرح عزیز نہیں؟ ایک بار مجھے شاید پچیس تیس روپوں کی ضرورت تھی۔ لالہ نے یہ روپے مجھے دیے، مجھے اس پُرخلوص تعلق میں روپے کی موجودگی ناقابلِ برداشت محسوس ہوئی۔ میں نے چپکے سے وہ روپے لالہ کے سوٹ کیس میں رکھ دیے، جب لالہ نے پشاور پہنچ کر یہ روپے دیکھے تو اپنے خط میں جیسے رو دیے" اور پوچھا، کیا میں تمھارا ماں جایا نہیں؟ کیا میں تہور احمد خاں کی اولاد نہیں؟

اس کے ساتھ ہی لالہ کے کردار کا ایک اور عجیب سا پہلو ہے۔ عموماً باپ اپنے بچوں کے سامنے، بڑے بھائی اپنی بہنوں کے روبرو، اور بیٹے اپنی ماں کے حضور کچھ دبے دبے رہتے ہیں۔ اور مارے احترام کے ذرا کم درے سے ہو جاتے ہیں اور پھر وہ آدمی جو غیروں سے بھی خون کے رشتے نبھاتا ہو، جو اپنے افعال و اقوال کی باگیں مضبوطی سے تھامے رکھتا ہو، اور جو اتنا پُرخلوص اور نیک ہو، اسے اصولاً خاصا اکتا دینے والا ہونا چاہیے۔ مگر لالہ کی نیکی اور محبت کے چہرے پر یبوست کا کوئی سایہ نہیں۔ وہ جہاں بیٹھتے ہیں، وہاں مسکراہٹوں اور قہقہوں کے پھول کھل جاتے ہیں۔ ان کا ایک ایک لفظ سننے کے لیے ہر شخص گوش برآواز ہوتا ہے۔ میں نے ہمیشہ دیکھا کہ میری بچیاں اپنے سے بڑے لوگوں کو گھر میں دیکھ کر اپنے کمرے میں پناہ گزین ہو جاتی ہیں، مگر لالہ کو دیکھ کر سارے کنبے کی پرانی اور نئی نسل ان کو گھیر لیتی ہے۔ جنریشن گیپ تو کیا اس وقت ماضی و حال کا فرق بھی رخصت ہو جاتا ہے۔

مجھے اپنی اور خدیجہ کی شادیوں کے سلسلے میں، مہندی کی رات کا وہ لمحہ کبھی نہیں بھولے گا، جب ہماری باجی اماں اور ہم بہنیں اس موقع پر آبا میاں اور ماموں کی کمی کو شدت سے محسوس کر کے ایک دم رونے لگے۔ رشتے کے دولہا اور خود لالہ ہمارے سروں پر ہاتھ رکھ کر اس محرومی کے غم کو ہلکا کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر تھک ہار کر وہ سب کمرے سے چلے گئے، محلے کی لڑکیاں بھی ڈھولک چھوڑ کر آنسو پونچھنے لگیں، یہ کیفیت بہت دیر تک قائم رہتی کہ اتنے میں ایک گری ہوئی مونچھوں والا ایک توندیل بنیا، بغل میں پوتھی دبائے، ناک کی پھننگ پر عینک جمائے، پگڑی میں پنسل اڑسے، نیم تاریک راہ داری میں سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور عجیب و غریب آوازیں ہمارے آنسوؤں کا سود در سود مانگنے لگا۔ یہ ہمارے لالہ تھے جنھوں نے واقعی سارا سود مسکراہٹوں میں وصول بھی کیا، اس رات انھوں نے دیر تک اپنے کالج کے ڈراموں کے سارے مزاحیہ کردار، سارے گانے اور لطیفے سنا ڈالے اور سب کو ہنسا ہنسا کر اتنا تھکا دیا کہ ہم میٹھی نیند سو گئے۔

مگر لالہ نے اتنی مسکراہٹیں وصول کرنے سے ایک دن پہلے مجھے رلایا بھی ہے۔ میرے چہرے کو اپنے آبا میاں کی صرف ایک چپت یاد ہے، جو توصیف کی جھوٹی شکایت کے صلے میں میرے گال پر اب بھی میٹھی سی جلن کی طرح جاگ رہی ہے۔

بالکل اسی طرح لالہ کی ایک ہلکی سی چپت کا درد مجھے عمر بھر اپنے بائیں کندھے پر محسوس ہوتا رہے گا، اور میں اس چڑیا کی طرح فخر کرتی رہوں گی، جسے زمین پر چمکتے چمکتے ایک موتی مل گیا تھا، اور وہ راج محل کے کنگرے پر بیٹھ کر بولی۔ "جو میرے پاس ہے، وہ راجہ کے پاس نہیں"۔ ہاں میں بھی کہتی ہوں کہ وہ درد لالہ کی کسی بہن کو نصیب نہیں۔ شادی کے انتظامات کے سلسلے میں میری باجی اماں، کراچی سے آئے ہوئے میرے رشتے کے ایک ماموں اور لالہ کی میٹنگ زور شور سے جاری تھی۔ فیصلے لالہ کاغذ پر لکھ رہے تھے۔ اتنی کرسیاں، اتنی میزیں، قناتیں، اور برتن۔ میں بھی جا کر وہیں ایک پلنگ کی پٹی پر ٹک گئی اور مہمانوں کو کھانا کھلانے کے سلسلے میں اپنی قیمتی رائے دے بیٹھی۔ باجی اماں نے مجھے گھور کر دیکھا، لالہ چونکے اور میری "بے حیائی" پر میرے کاندھے پر ایک چپت جڑتے ہوئے زور سے کہا، "بھاگ جاؤ یہاں سے"۔ میں اس وقت ابا میاں کے غصے اور لالہ کے غصے میں کوئی فرق نہ محسوس کر سکی اور خوف سے اس طرح سن ہو گئی، جس طرح ابا میاں کی چپت سے سن ہو گئی تھی۔ اور جب میں بمشکل دوسرے کمرے میں جا کر گری تو پیچھے آتے ہوئے توصیف سے بے تحاشا آنسوؤں کی رو میں صرف اتنا کہہ سکی۔ "میں خدیجہ کی شادی پر بول بھی نہیں سکتی"؟ اب اسے کیا کیجیے کہ خدیجہ کی شادی کے ساتھ ساتھ لالہ نے جلدی جلدی مجھے بھی گھر سے "دھکیلنے" کا انتظام کر لیا تھا، یعنی میری شادی بھی اسی دن تھی اور لالہ کے اسی چپت لگانے والے ہاتھ نے تیسرے دن مجھے اسی کندھے سے پکڑ کر احمد کے ساتھ رخصت کر دیا۔ اس کے بعد اسی نرم گرم روشن لیکن مضبوط ہاتھ نے میری باقی بہنوں کو بھی مائیکے سے رخصت کیا۔

(میری ایک بہن عابدہ کنواری ہی اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ لالہ نے اپنی ایک کتاب اس کے نام معنون کرتے ہوئے لکھا، تمھارے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی)

کوئی پندرہ سال کے عرصے میں اتنے پہاڑ سر کرنے کے بعد لالہ نے اس وقت ہم سب سے الگ ہونے کی اجازت طلب کی جب توصیف کی شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ لالہ نے نسبت روڈ کے اس بے تکے مکان کے تین کمروں میں بھابی اور بچوں کے ساتھ بہت تکلیف کی زندگی بسر کی ہے۔ جہاں چوتھی منزل تک پانی پہنچانے میں نل بھی ناکام رہتے اور اوپر سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے سانس پھول جاتا، لیکن لالہ کے عہد وفا نے تھک کر ہانپنا قبول نہ کیا اور وہ اپنے خود عائد کردہ فرائض سے سبک دوش ہونے کے بعد ہی الگ ہوئے۔

لالہ نسبت روڈ پر ہمارے گھر میں رہتے تھے تو کچھ مہربان پوچھتے تھے کہ یہ یہاں رہتے کیوں ہیں؟ اور جب وہ چلے گئے تو انھیں یہ کرید ہوئی کہ چلے کیوں گئے؟ لیکن میرے لالہ نسبت روڈ پر رہ کر بھی میرے کنبے کے سب سے زیادہ محترم اور سربراہ تھے اور الگ جا کر بھی ویسے ہی سب سے زیادہ محترم اور سربراہ ہیں۔ ہم سب بہنیں، اور توصیف شادی شدہ اور بچوں والے ہیں، بلکہ اب تو ہم میں سے کئی بہنوں کے بچے اپنے آپ کو بڑوں میں شمار کروانے پر مصر رہتے ہیں، اس کے باوجود ہماری زندگیوں کی ہر الجھن، ہر مشکل، ہر فیصلہ لالہ کی رائے کا محتاج رہتا ہے۔ ہماری آپس کی شکایتیں، فریادیں، کبھی لالہ کی عدالت میں پہنچتی ہیں۔ وہ توصیف کی شادی ہو، یا خالد میاں کی اپنے مستقبل سے بے پروائی کی شاعرانہ ادا۔ ہماری باجی اماں کو اپنے بچوں سے شکایت ہے تو لالہ سنیں۔ حتیٰ کہ میری اکلوتی خالہ بھی چھٹیوں میں گھر آتی ہیں، تو جہاں کسی سے شکایت ہو جائے تو لالہ سے شکایت کرنے کی دھمکی دیتی ہیں، ہم بہنوں کو اپنے شوہروں سے شکایت ہو یا ہمارے شوہروں کو ہم سے،

تو فریاد لالہ سے، اور یہ کیسی عجیب بات ہے کہ لالہ کی بات ہم سبھی بے چون وچرا تسلیم کر لیتے ہیں اور اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان کے ہر اہم فیصلے میں رابعہ بھابی بھی اسی طرح اور اسی اختیار سے شامل ہوتی ہیں، جیسے سگی بھاوج کو ہونا چاہیے۔ وہ توصیف اور میری سب سے بڑی بھابی کی شادی پر میری ماں کے بعد وہی سلامی دینے کے لیے آگے بڑھیں انھیں ہم سے اسی طرح گلے شکوے ہوتے ہیں، جس طرح سب بھاوجوں اور بہوؤں کو ہوتے ہیں اور اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ عموماً لڑکیاں تو اپنے شوہر کے خون کے رشتوں تک کو ناقابلِ برداشت سمجھتی ہیں، وہاں گاؤں کی رابعہ بھابی نے منہ بولے رشتوں کو بھی برداشت کر لیا۔ کیا یہ خود رابعہ بھابی کی وسعتِ قلب نہیں، ورنہ ۲۶، ۲۷ سال کی بیاہی بیوی کو کوئی شوہر زبردستی کوئی رشتہ نباہنے پر کیا مجبور کر سکتا ہے؟

لالہ نے ملاقات کے بعد سے آج تک ہمارے لیے اور ہمارے پورے خاندان کی بہتری کے لیے کیا کچھ کیا، اس کی تفصیل لکھوں تو مجھے ڈر ہے کہ یہ مضمون (جس کے لیے بھائی صبا کا حکم ہے کہ مختصر ہو) ایک خاصی ضخیم کتاب کی شکل اختیار کرے گا، صرف اتنا کہوں گی کہ لالہ کی شفقت کے سائے میں اتنے بہت سے دن یوں گذارے ہیں، جیسے یہ میرا پیدائشی حق ہو، مگر آج جب لکھنے بیٹھی ہوں اور مڑ کر ان گذرے دنوں پر نظر ڈالتی ہوں تو حیران ہوتی ہوں، بالکل اسی طرح جس طرح بچپن میں پرانی داستانوں کے بہادروں کے کارناموں پر حیران ہوتی تھی۔ رزم گاہِ حیات میں لالہ مجھے ایک ایسا مثالی کردار نظر آتے ہیں جو اپنا قول نبھانے کے لیے ہر مشکل، ہر دکھ کا مقابلہ کرتے ہیں، جن کے کردار میں کوئی سرنگ، کوئی چور دروازہ نہیں۔

لکھتے لکھتے، جانے کیسے مجھے بچپن میں دیکھا ہوا ایک قصبے کا وہ عظیم الشان درخت یاد آنے لگا ہے، جو نیم پختہ سڑک کے کنارے ہمارے گھر سے ذرا ہی فاصلے پر تھا۔ ہمارے ہاں کی ماما بی خاص طور پر سب بچوں کو اس کی طرف جانے سے منع کرتیں کہ وہاں چڑیلیں اور بھوت رہتے ہیں — ایک جلتی دوپہریا میں جب سب سو رہے تھے، تو میں خدیجہ اور توصیف چپکے سے نکل کر اس درخت کے تلے چلے گئے۔ شاخوں اور تنوں کی ایک عجیب سی دنیا، یہاں ہر شاخ کے اوپر سے تنے پھوٹ کر زمین میں پیوست تھے۔ یہاں اتنی خنکی اور خوشگوار سایہ تھا کہ جلتی دوپہریا کا احساس ہی ختم ہو گیا۔ شاید مجھے یہ درخت اس لیے یاد آرہا ہے کہ میرے منہ بولے بھائی نے بھی میرے احساسات کو ایسا ہی چھتنار سایہ دیا۔ وہ داستان ام لکھنے والی حرکت جسے ہم اپنے یقین کی کمزوری کی وجہ سے چند دنوں تک اپنی حماقت سمجھتے رہے تھے، وہی ہماری زندگی کا ایک ایسا پڑاؤ تھا، جہاں باپ، چچا، تایا، ماموں اور ایک بڑے بھائی کے نہ ہونے کا سلگتا ہوا احساس ٹھنڈک پا گیا اور لالہ کے ایک تن میں اتنے بہت سے مضبوط تنوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ انھوں نے اتنی محبت دی، اتنا احترام کیا کہ اس کے بعد میرے دل میں اس سے زیادہ کی ہوس نہ رہی۔

اور ہاں، میں اس درخت کے تنے میں رکھے ہوئے ان چند چھوٹے چھوٹے پتھروں کا ذکر کرنا تو بھولی ہی جا رہی ہوں — وہ پتھر جو ہندوستان کے اکثر درختوں تلے، جڑوں میں رکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان پر سیندور کا ٹیکہ ہوتا اور کوئی بجھا ہوا مٹی کا دیا بھی۔ یہ ان غریب ہندوؤں کے ان گھڑ دیوی دیوتا ہوتے، جنھیں شاید مندر میں جانے کی اجازت نہ تھی، یا پھر ان کو دو چار پیسے کی مٹی کی مورت خریدنے کی استطاعت بھی نہ ہوتی۔ اس عمر میں جب ان پتھروں کی وجہ تسمیہ ہمیں معلوم ہوئی تو اس اندھے یقین پر بے تحاشہ ہنسی آتی تھی۔ مگر اب ہنسنے کا حوصلہ نہیں، اس لیے کہ ہمارے اور لالہ

کے درمیان کبھی منہ بولا رشتہ درحقیقت مانو تو دیوی ورنہ پتھر والی مثال ہے۔ شجرے اور خون کے رشتوں کا حساب کرنے والوں کے نزدیک منہ بولا رشتہ کچھ نہیں ہوتا۔ خدیجہ کے ظہیر سے بیاہنے کے بعد زیادہ سے زیادہ لالہ ہمارے گھرانے کے سمدھیانے والے ہوتے ہیں، مگر یہاں تو معاملہ "ترا شیدم، پرستیدم" والا ہے۔

اور درمیان بڑے بڑے امتحان کے موقعوں پر بھی "شکستم" والا لمحہ کبھی نہیں آیا اور نہ ہماری زندگیوں میں آ سکتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف کی فکروں، سخت کوششوں، قربانیوں اور انتہائی ایمان داری سے خون پسینے کی روزی کمانے والے لالہ کا نظریۂ زندگی کبھی ڈانواڈول نہیں ہوا۔ اور ان کی خواہش ہے کہ جو ان کے اردگرد ہیں وہ بھی کبھی ڈانواڈول نہ ہوں۔

"— خوش رہا کرو ہجو — زندگی بڑی ہی مختصر ہے۔ اپنی زندگی کے ۴۹ ویں برس میں سوچتا ہوں، اس نصف صدی میں کون سا بڑا تیر مارا ہے اور وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے —
پھر اس مختصر مدت کو حسن و مسرت، نیکی اور طمانیت کی نذر کیوں نہ کریں —"

(لاہور — ۷ر فروری ۱۹۶۵ء)

یہ ہمارے لالہ سب سے وہی کچھ کیوں طلب کرتے ہیں جو دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ شاید اس لیے:-

"— میں جس سے محبت کرتا ہوں اُس کا محتاج ہو جاتا ہوں — میں اپنی ماں، اپنی آپا، اپنے بھائی جان اور ہجی اور تسنیم اور تمہارا، اور اپنے دو چار پیارے دوستوں کا محتاج ہوں —"

(خدیجہ کے نام — پشاور — ۲۵ر نومبر ۱۹۶۷ء)

لالہ کے پیاروں کی فہرست اُس وقت نامکمل تھی۔ کیونکہ اُس وقت وہ شوہر اور "اباجی" نہیں بنے تھے — اُن کی "محتاجی" کا سب سے پُرلطف تماشا تو اُن کے گھر بیٹھ کر اُس وقت دیکھا جا سکتا ہے، جب وہ اپنی بیوی اور بچوں میں گھرے ہوتے ہیں۔ اپنے ان پیاروں کے ہر لفظ اور ہر جنبش پر لالہ کی آنکھوں میں جو پھول کھلتے ہیں اُن کی خوشبو سے دیکھنے والے کی روح تک مہک جاتی ہے۔

اور میں جانتی ہوں کہ ۴۹ سال کی عمر تک پہنچ کر میرے لالہ — میرے بھیا کو حسن، مسرت، نیکی اور طمانیت کی جو پیاس محسوس ہوئی تھی وہ اپنی زندگی کے ۶۰ سال گزارنے کے بعد بھی اور شدت سے محسوس ہوگی اور وہ اس خواہش کا اظہار اپنے اور ہمارے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں سے اسی طرح کرتے رہیں گے۔

جمیل الدین عالی

یہ ناتمام خراجِ تحسین

یہ کیو کیسا ہے ـــــ کیا یہ تمام قطار سچی ہے یا ہم لوگ مصلحتوں یا اخلاقی دباؤ یا شوقِ اظہار کی وجہ سے اس میں شامل ہوگئے ہیں۔

مگر شاید اس طرح کا جنرلائزیشن بھی درست نہیں۔ ؏

کیا تجھ کو خبر کون کہاں جھوم رہا ہے

تکلف برطرف: ـ میرے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ لیکن بارہ برس سے ایک ہفتہ وار کالم لکھنے کی عادت نے زبان و بیان کی نعمتوں میں سے اتنا کچھ چھین لیا ہے کہ ایسی محفلوں میں شامل ہونے سے ڈر لگتا ہے۔ عادت یک نشستی مضامین کی پڑ گئی ہے ـــــ موضوع بہت ہی دلچسپ، اہم اور بلند ہے۔

بہرحال ـــــ

اب میں حیران ہوں کہ اس مضمون میں وہ طبقاتی تجزیہ والا۔ نقطۂ نظر کیسے بروئے کار آئے گا۔ اُردو روایت بڑی قاتل شے ہے۔ تازہ ایمان کو بھی کرپٹ کرنے کے درپے ہے۔

اچھا تو بھئی اس وقت صرف کیو میں کھڑے ہی ہو جاؤ۔ مکمل غیر حاضری سے بہتر ہے کہ خاموشی یا نیم خاموشی سے اس صف میں شمولیت ہو جائے۔ ایک نماز میں ہر مقتدی تو امامت نہیں کر سکتا۔

پاکستان کے ۲۷ سالہ پس منظر میں دیکھتا ہوں تو جناب احمد ندیم قاسمی ایک حیرت انگیز شخصیت نظر آتے ہیں۔ یہ مضمون قاسمی صاحب کی ادبی تخلیقات کا جائزہ یا ان پر تبصرہ نہیں ہے۔ گو انھیں میں سب لکھنے والوں کی طرح ادبی ناتے سے ہی جانتا ہوں۔ لیکن اس مضمون میں ان کی ذات سے متعلق چند ذاتی تاثرات ہی آسکیں گے۔

مجھے اقرار ہے کہ میں ان کے شعری عیوب سے بالکل ہی ناواقف ہوں۔ دراصل میرا ان سے زیادہ واسطہ نہیں رہا۔ ادبی تعارف ہمیشہ سے ہے، بلکہ اپنے لڑکپن سے۔ ان کے ادبی بچپن کا ایک شعر بھی اب تک یاد ہے۔ میں میٹرک میں تھا یا فرسٹ ایئر میں ـــ رسالہ "ادبی دنیا" تھا یا "ادبِ لطیف" ـــ موٹے قلم میں ایک نظم چھپی تھی۔ ایک دیہات پر سامراجی مظالم کا

خاکہ سا تھا ہے

چوپال پہ رونق ہے شاید تھانے کے سپاہی آئے ہیں
مظلوم غریب کسانوں کے وارنٹ بنا کر لائے ہیں

نہ جانے مجھے اس تمام نظم میں یہی شعر کیوں یاد ہوا۔ شاید اس لیے کہ "وارنٹ بنا کر" کا ٹکڑا بہت ہی بُرا لگا ہو۔ یا اللہ کیا شعر میں نے صحیح یاد رکھا۔ نہیں میں "جلال و جمال" سے چیک نہیں کروں گا۔ بہرحال صحیح یاد رہا یا غلط۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کا نام اس وقت سے یاد ہے۔۔

ذاتی ملاقات شاید ۱۹۵۰ء میں ہوئی تھی۔ سرسری سی۔ خیر میں اس سے زیادہ کے قابل بھی نہ تھا۔ ایک زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین (شاخ کراچی) کے جلسوں میں جاتا تھا وہاں کسی نہ کسی عنوان قاسمی صاحب کا ذکر ادبی یا تنظیمی حوالوں سے آتا رہتا تھا۔ جب اسے سیاسی پارٹی قرار دیدیا گیا اور سرکاری ملازموں پر اس سے تعلق ممنوع قرار پایا تو جانا چھوڑ دیا۔ ان کے ذکر اذکار کم ہو گئے، مگر رسائل اور کتابوں کا واسطہ باقی رہا۔ انھیں پڑھنا نہیں چھوٹا۔ اس سے پہلے یا اسی زمانے میں "نیا دور" کراچی اور ان کے ترقی پسند گروپ میں لڑائی ٹھنی تھی تو "نیا دور" کے صمد شاہین اور ممتاز شیریں مرحومہ سے کسی حد تک ذاتی نیازمندی کے باوجود "نیا دور" کے حملوں کو ناپسند کرتا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ دوسرے گروپ کی طرف سے ایک اتنے کم عمر آدمی کو عظیم ترین ادیب عظیم ترین شاعر اور عظیم ترین انسان (یا کچھ ملتے جلتے) القاب کا عطا ہونا بھی عجیب سا لگتا تھا۔ اچھا نہیں لگتا تھا۔ آج بُرا نہیں لگتا۔

پھر مشاعروں میں دیکھا۔ اچھے لگے۔ مگر بہت متاثر نہ ہوا۔ پھر گلڈ بنایا تو وہ جیل میں تھے۔ ہم لوگوں نے احتجاج کی قرارداد یں منظور کیں (بڑا کمال کیا) پھر وہ چھوٹ کر آئے اور خود گلڈ کے رکن بن گئے (غالباً جولائی ۱۹۵۹ء میں۔ انہی کے ساتھ فیض صاحب اور سبطِ حسن صاحب کے فارم رکنیت آئے۔ وہ بھی ممبر بنے۔ ہم پہ الزام لگا کہ کمیونسٹوں کو گلڈ کی محفوظ چھتری کے نیچے پناہ دے رہے ہیں۔ ان سب پر الزام لگا کہ ہمیں کمیونسٹ بنانے آئے ہیں۔ خود پناہ بھی لینے آئے ہیں ۔۔ پھر چند ملاقاتیں ہوئیں۔ کوئی خاص نیا تاثر یاد نہیں۔ ہمیشہ ایک اچھے انسان لگے۔ پھر ۱۹۶۷ء میں اُن سے ایک نیم لسانی نیم ثقافتی نیم قومی موضوع پر اخبار "جنگ" کے کالموں میں کئی ہفتے ایک شدید اختلافی مباحثہ چلا۔ اور پھر ان سے ملنا جلنا زیادہ ہو گیا۔ اب کیفیت یہ ہے کہ جب لاہور جاتا ہوں، دو کوششیں ضرور کرتا ہوں۔ داتا صاحب کے یہاں فاتحہ پڑھنے کی اور قاسمی صاحب سے ملنے کی۔ دونوں جگہ جا کر کچھ نہ کچھ سکون ہوتا ہے ـــــــ یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہم "دوست" ہیں۔ انتہائی پیچیدہ اقتصادی رشتوں کے مارے ہوئے اس موجودہ سرکس میں دوستی جیسی پُرانی اصطلاحات کو پُرانے (اور تقریباً عشقیہ) معانی میں استعمال کرنے سے اصل مطلب خبط بھی ہو سکتا ہے۔ یوں بھی عمر کے اس حصے میں دوستی و دوستی کی روایتی کہانیوں سے مزا نہیں آتا۔ یہ بھی سُنا ہے کہ دوست برابر کے ہوتے ہیں ـــــ لیکن! یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ ہم دوست نہیں ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے میرے ساتھ کوئی بُرائی کی حالانکہ کوئی آدمی کسی کے ساتھ کبھی بُرائی کر سکتا ہے۔ خود میرے ساتھ غیر متوقع طور پر بُرائی ہوئی ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ مجھے ذاتی طور پر تو ان کی مدد کی ضرورت کبھی نہیں پڑی۔ لیکن تنظیمی طور پر (جب تک میں گلڈ سے متعلق تھا) اُن سے جب بھی کوئی مدد مانگی ـــ اور خاصی مانگی ـــ انھوں نے وہ سب کچھ کیا ـــ خاصی تکلیف اٹھا کر بھی کیا۔ جو وہ کر سکتے

تھے اور کبھی کوئی راست یا بالواسطہ معاوضہ نہ طلب کیا نہ چاہا نہ قبول کیا۔ کسی بھی قسم کا معاوضہ۔ جواب۔ جوابی سند۔ اظہارِ تشکر۔

جی ہاں میں نے انھیں ہمیشہ اچھی باتیں اور اچھے کام کرتے دیکھا۔ بے ربطی کے ساتھ آگے چلنے کی اجازت ہو تو کئی باتیں کہنے کو دل چاہتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں بے اقتدار لوگوں کے لیے کسی کی سفارش کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ سب سے پہلے تو اپنی اَنا کا خون ہوتا ہے۔ آپ ایک فرسٹ یا سیکنڈ کلاس افسر کے آگے جو عام طور پر (مستثنیات چھوڑ کر) ایک تھرڈ کلاس انسان ہوتا ہے۔ گھگھیا رہے ہیں۔ فکری زندگی میں وہ کتا اس برابر نہ ہو۔ اس کی زندگی اس کے کرہ راس کی باتوں اس کے تعلق سے گھن تک آجائے۔ اپنے لیے اس سے کچھ کہنے پر موت کو ترجیح دیں۔ مگر اس سے دوسروں کی سفارش کر رہے ہیں۔ جوش صاحب کی طرح منہ دیکھے کی باتیں نہیں کہ ایک ہی نوکری کے لیے دس دس آدمیوں کو ایک ہی قسم کے رقعے دیدیے، بلکہ جم کر اور پوری کوشش کیے جاتے ہیں کہ اہلِ غرض کا کام ہو جائے۔ جناب ایسی باتوں پہ اونہہ کہہ کر منہ پھیر لینا اور بات ہے۔ ایسے کام بڑی جگر کاوی کے کام ہوتے ہیں۔

سچ کہ صدر ماؤ نے انفرادی سفارشیں نہیں کیں اور اپنی تمام تر توجہ ایک بنیادی انقلاب پر رکھی لیکن یہ موازنہ احمد ندیم قاسمی اور ماؤ زے تنگ کا نہیں۔ ایک پاکستانی شاعر احمد ندیم قاسمی اور بہت سے پاکستانی مشاہیر کا ہے جو نہ تو ماؤ کی طرح انقلاب کے لیے راست سیاسی کام کر رہے ہیں، نہ قاسمی کی طرح افراد ہی کے زخموں پر پھاہے رکھ رہے ہیں، بلکہ یا آٹھ آٹھ وہسکی روز پیتے ہیں، یا جاگیرداری کرتے ہیں، یا اپنا بیشتر وقت غیر تخلیقی غیبت، سازش، عیب جوئی اور فضولیات میں گزارتے ہیں۔

آہ میں یہ کیسی معمولی باتیں کر رہا ہوں۔ ایک فرد کو چھوٹی سی نوکری یا معمولی کاروبار دلانے سے کیا ہوتا ہے، بلکہ جناب شاید اس طرح بقول کسے غلط بخشی بھی ہو جاتی ہو۔ لیکن یاد رہے غلط بخشی کی تھیوری بھی عام صورت سے کام چور لوگ چلاتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنی اَنا کے سامنے افراد کی مسائل کی کوئی حیثیت نہیں سمجھتے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ایک چھوٹے سے کنبے کو رزق مہیا ہو جانا بھی بڑی بات ہے۔

جب میں گلڈ چلاتا تھا تو چند وفد باہر گئے تھے۔ آخری فیصلہ ہمیشہ کی طرح حکومت وقت کرتی تھی مگر ناموں کی سفارش مرکزی دفتر صوبائی دفتروں سے مشورے کے بعد کرتا تھا۔ سمجھ لیجیے کہ قدرت اللہ شہاب کے سامنے میں ہی کرتا تھا۔ وہ بھی دو تین برس۔ پھر تو ساری ذمہ داری میری ہی ہو گئی تھی کہ شہاب باہر چلے گئے تھے۔ وفد کی تشکیل پر ہمیشہ کراچی لاہور اور ڈھاکے میں خاص طور پر اور دوسرے شہروں میں بھی عام طور پر خوب تلوار چلتی تھی۔ وہ بڑی مزے کی کہانیاں ہیں۔ کچھ باتیں گلڈ کے ریکارڈ میں درج ہیں کچھ میرے سینے میں ہیں۔ بہت سی جائز اور ناجائز خفگیوں کا بوجھ آج تک میرے سر سے نہیں اترا۔ مگر بہرحال یہ سب ایک منتظم کے بیلنس شیٹ میں ناگزیر اندراجات ہوتے ہیں۔ جب تاریخ کے آگے ان کی پڑتال ہوگی۔ تب دیکھا جائے گا۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ قاسمی صاحب نے قدرت اللہ شہاب اور مجھ پر اپنے گہرے اثر کے باوجود کہیں جانے کی آرزو اشارتاً بھی ظاہر نہیں کی۔ کہنے کی دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے کئی بار خود ان سے کہا کہ فلاں وفد میں جایئے اور انھوں نے

ہمیشہ یہ جواب دیا کہ اس بار میں شامل نہ ہوا تو آپ سے شکایت بھی نہ کروں گا اور آپ کم از کم ایک ممکنہ شاکی فرد اور گروپ سے تو نجات پا سکیں گے۔ کسی اور کو بھیج دیجیے۔

کہنے کی تیسری بات نسبتاً زیادہ دلچسپ ہے۔

سوویت ادیبوں کی یونین سے ادھر آنے والے کئی سوویت ادیبوں کی معرفت اور جب ہمارے وفد ادھر گئے تو اس کے عہدہ داروں نے خود ان سے بار بار کہا کہ ایک بار قاسمی صاحب کو بھی تو بھیجیے وہ خود آ کر یہ ملک دیکھیں، ہم سے ملیں اور اپنے ان بے شمار مداحوں سے ملاقات کریں جنھوں نے ان کے روسی ترجمے پڑھے ہیں۔ ذکر بطورِ خاص ان کی کہانیوں کا ہوتا تھا۔

یاد رہے کہ سوویت ادیبوں کی یونین سے باقاعدہ طور پر یعنی ادارے کے ادارے سے تعلقات گلڈ بننے کے بعد ہوئے تھے۔ یہ سلسلہ افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس اکتوبر ۱۹۵۸ء سے شروع ہوا تھا۔ مگر بے ضابطہ طور پر۔ بس حفیظ صاحب اور فیض صاحب کو حکومتِ وقت نے تاشقند بھیج دیا تھا۔ یہ عاجز ۱۹۶۰ء میں گیا۔ پھر فیض صاحب ۱۹۶۲ء میں لینن انعام لینے گئے۔ پھر ذرا آنا جانا شروع ہوا تھا کہ ہند چین جنگ آ گئی۔ اُدھر روس کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت پر ویٹو کا حق استعمال کرتا رہتا تھا اور قاسمی صاحب اپنی تمام تر ترقی پسندی کے باوجود یا شاید اسی کی وجہ سے روسی پالیسی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کئی بار موقع ملا مگر نہیں گئے۔

آخر آخر غالباً ۱۹۶۶ء میں ایک سہ رکنی یا شاید چار رکنی وفد روس بھیجا گیا۔ یہاں سے قتیل شفائی صاحب (جو اس وقت مغربی پاکستان علاقائی گلڈ کے معتمد اعزازی تھے اس میں شامل تھے) ہم نے۔ میں نے قاسمی پر بہت زور دیا کہ چلے جائیں ـــــ وہ نہ گئے۔

پھر خبریں آئیں کہ ان کے اور شوکت صدیقی کے ترجموں کی رائلٹی ہزاروں ڈالر ہو چکی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہاں سے آنے والے دو سوویت ادیبوں یعنی علیم جانوف اور کوچی توف نے مجھ سے بطورِ خاص کہا کہ وہاں احمد ندیم قاسمی کی خاصی بڑی رقم پڑی ہوئی ہے مگر ایک تو سوویت یونین کسی انٹرنیشنل کاپی رائٹ معاہدے کی رکن نہیں۔ اس لیے اس رقم کی ادائیگی کی پابند نہیں ـــ دوسرے وہ زرِ مبادلہ بہت احتیاط سے خرچ کرتی ہے۔ آپ انھیں بھیجیے تو سہی۔ یہ جائیں تو ممکن ہے ان کی رقم انھیں مل جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک اچھا خاصہ حصہ زرِ مبادلہ کی صورت میں بھی مل جائے۔ یہ نہ گئے مجھ سے پوری کہانی سن کر کہا میرے گردوں میں درد ہوتا ہے اور وہاں کا موسم نہ جانے کیسا ہو۔ ویسے وہ اعلانِ تاشقند کے خلاف قومی جذبات کا موسم بھی تھا مگر وہ موسم تو سبھی پاکستانیوں کے لیے ایک سا تھا۔ شاید اب بھی سب کے لیے ایک سا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد تو تحت شعوری فضا بہت ہی گرم رہتی ہے۔

۱۹۶۸ء میں پھر ایک دفعہ۔ اس بار مجھ پر کئی طرف سے زور ڈالا گیا کہ انھیں بھیجا جائے میں خود انھیں راضی کرنے لاہور گیا۔ اس وقت یہ مکان بننے کے چکر میں تھے کوئی پلاٹ مل گیا تھا یا مل رہا تھا اور روپیہ نہ تھا نہ مل رہا تھا۔ بولے ایک دن سوچ لوں۔ دوسرے دن فرمایا آپ مجھ سے لیٹر آف اتھارٹی لیجیے اور براہِ خدا اس دفعہ آپ خود چلے جائیے۔ میری خاطر جائیے۔ کیونکہ آپ معاہدوں پر گفتگو کر سکتے ہیں۔ وہاں میرا حساب دیکھیے۔ رقم وصول کیجیے۔ اگر کچھ زرِ مبادلہ میں دیدیں ـــ تو سبحان اللہ، ورنہ ٹریکٹر یا کوئی کار یا رقم کافی ہو تو دونوں خرید کر ادھر امپورٹ کر دیجیے میں جھگڑ لوں گا۔ بیچ دوں گا اور کام میں

لاؤں گا۔۔۔۔ " آپ خود کیوں نہیں جاتے۔ حضرت آپ کوئی ایسی تقریر نہ کیجیے گا جس سے آپ کا موقف کمپرومائز ہوتا ہو۔ ملنے جلنے۔ دیکھنے۔ جاننے میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ آخر وہ ملک ایک اتنی بڑی حقیقت ہے۔ اتنا بڑا علاقہ ہے عظیم طاقت ہے"۔ میں نے ایک خاصی لمبی تقریر کی ۔" اور آپ اپنا حق ہی تو لیں گے مادر کھل کریں گے۔ سفارت خانے کو درمیان میں رکھیے گا"۔

سوچ میں پڑ گئے " فنون" اس وقت بھی خسارے کا سودا تھا۔ کالم سے جو ملتا ہوگا وہ چھوڑیے۔ بال بچے۔ بڑھاپا سامنے۔

بولے میں کیا میرے جذبات کیا' مجھے اس بات سے اختلاف کبھی نہیں کہ بہرحال سوویت عوام اور ادیبوں سے تعلقات بڑھائے جائیں۔ دیکھیے جب سوویت ادیب یہاں آتے ہیں تو میں ہر ملاقات میں ہر دعوت میں آجاتا ہوں۔ انھیں جاننے سے گہری دلچسپی رکھتا ہوں اور اس بات کا بھی قائل ہوں کہ ہمیں قومی اور بین الاقوامی سطح پر سوویت یونین سے افہام و تفہیم کرتے رہنا چاہیے۔ کیونکہ وہ ایک بڑی عالمی طاقت ہے۔ مگر حضرت بس کیا بتلاؤں۔ پھر چپ ہو گئے (مجھے خوب یاد ہے) ۔۔۔ پھر بولے مگر بس یوں سمجھیے کہ میری صحت اچھی نہیں۔ میرا جی نہیں چاہتا۔ مگر ہاں آپ یہ لیٹر آف اتھارٹی ضرور لے جائیے اور میری جانب سے حساب فہمی کیجیے اور سفارت خانے سے مل کر ایک ٹرمیٹر اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں خود اس وفد میں گیا۔ ان کا اور شوکت صدیقی کا لیٹر آف اتھارٹی بھی لے لیا۔ مگر ناشرین نے مجھے پر ہاتھ ہی نہ دھرنے دیا۔

شاید بلکہ یقیناً یہ کہانی بور ہوگئی۔ اس میں کوئی انٹلکچوئل بحث نہیں ہے نا۔

ایک بار ان سے کہا چین جائیے۔ تیار ہو گئے بلکہ شوق سے تیار ہوئے۔ لیکن عین وقت پر تشکیلِ وفد کے معاملے میں مرکزی اور سوبائی دفتر لاہور کے مابین جھگڑا فساد ہو گیا۔ کوئی ان کی شمولیت کے خلاف نہ تھا مگر دوسرے کئی نام زیر بحث آرہے تھے انھوں نے از خود مجھے فون کیا کہ میں پھر کبھی سہی آپ کسی اور کو لے جائیے۔ میں ایک بار انقلاب کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اُدھر سو بھی آیا ہوں۔ دوبارہ جانے کو جی بہت چاہتا ہے کہ عرصہ گذر گیا' مگر پھر کبھی سہی۔

اب ان واقعات کو آپ جو بھی اہمیت دیں۔ میں بہت اہمیت دیتا ہوں۔ میں اس بات کو بھی بہت اہمیت دیتا ہوں کہ جب مشاعروں میں آتے جاتے' یا دوسری نشستوں میں شاعر لوگ۔ ہم لوگ شراب پیتے ہیں۔ تو وہ نہیں پیتے اور بحث ہو تو یہ بھی نہیں کہتے کہ میں شراب کو بُرا نہیں سمجھتا بس پیتا نہیں۔ وہ جتا ضرور دیتے ہیں کہ یہ کوئی بڑی خوبی کی بات نہیں ہے۔ ہاں اگر صحبت اچھی ہو جائے تو اس صحبت کے مزے بھی لینے لگتے ہیں۔ اپنے پُرانے دوست شرابیوں' مثلاً مجاز مرحوم اور اختر شیرانی کے دو چار لطیفے سُنا دیتے ہیں۔ ویسے ان کی ناپسندیدگی ان کی مسکراہٹوں سے بھی عیاں ہو جاتی ہے۔

جس حد تک میں نے دیکھا وہ مشاعروں میں تقدیم و تاخیر کی کوتاہیوں پر کنایتاً بھی بدمزگی یا احتجاج کا اظہار نہیں کرتے۔ ضرورت مند اہلِ قلم اور اُن کے لواحقین کے لیے خاصی مشقت اٹھا کر مالی امداد کا انتظام کرتے ہیں۔ اس عمل میں نہ جانے کس کس سے کیا کچھ تلو تو کرتے ہیں۔ ان پر فراخ دلانہ تبصرے کرتے ہیں۔ جناب فراخ دلی بھی ان کے خلاف نہیں ہوتی۔

۱۹۷۱ء میں جب لندن میں قدرت اللہ شہاب (جو اس وقت جلاوطن تھے) ملور میں اور پاک ہائی کمیشن کے ایجوکیشن کونسلر منوبر حمد خاں اور بہت سے دوسرے لوگ' ایک محفل گرم کیے ہوئے تھے۔ فہمیدہ ریاض اس وقت بنگلہ دیش تحریک کے ہمدردوں میں تھیں۔ اُن کے اس رویے کے گواہ اے۔ پی۔ پی کے مختار زمن بھی ہیں۔ اُس وقت بی۔ بی۔ سی۔ میں تھے۔ فہمیدہ

غلطی پر تھیں، یا ان کا رویہ صحیح تھا۔ اس وقت مجھے اس سے تعارض نہیں۔ اس محفل میں کچھ بات پاکستانی ادیبوں کے رویے پہ ہو رہی تھی۔ میں نے کہا مثلاً قاسمی صاحب یحییٰ حکومت کو جابر سمجھتے ہوئے بھی اس بات کے حامی نہیں کہ پاکستان ٹوٹ جائے۔ اور بنگلہ دیش بن جائے۔ بولیں: ہائے اللہ ان کا ذکر کہاں سے آ گیا وہ تو ایک گُڈّی گُڈّی آدمی ہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ فیض صاحب کا رویہ کیا ہے۔

اہلِ محفل نے اس کا بہت بُرا مانا تھا۔ بی بی فہمیدہ کی (راست گوئی نہیں) صاف گوئی اپنی جگہ، مگر سب جانتے ہیں کہ ان کی ہمت بڑھانے میں انھیں منظرِ عام پر اتنی جلد لانے میں قاسمی صاحب کا کیا حصہ ہے۔ میں انھیں کبھی کبھی خط لکھ کر پاکستانی حالات پر اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑا کرتا تھا۔ ایک بار یہ واقعہ بھی لکھ دیا۔ انھوں نے بُرا نہیں مانا، بلکہ خط کتابت کے ذریعہ فہمیدہ کو اپنا موقف سمجھانا چاہا۔ پھر وہ یہاں آگئیں تو معلوم ہوا کہ انھوں نے فہمیدہ سے کوئی ذاتی شکوہ بھی نہیں کیا۔ انھیں VICTIMIZE کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اسی طرح اُن کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ یقیناً فہمیدہ ریاض ایک نہایت قابلِ ذکر ٹیلنٹ ہیں۔ مگر ہم لوگ فرشتے تو نہیں ہیں۔ آہ کافی باؤسوں کے عظیم ناقدینِ حیات یہ بھی کتنی معمولی بات ہے۔ افسوس میں برابر ایسی ہی معمولی باتیں بتائے جاتا ہوں۔ میں بھی کیا کروں، میرا موضوع محدود ہے۔ اُن کے بارے میں میرا مطالعۂ ذات بھی محدود ہے، ورنہ میں انسانی خوبیوں کو اعمال کے پیمانے سے ناپتا ہوں۔ محض لفاظی کے پیمانے سے نہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ اب وہ اتنے دن کے ہوئے ورا ب انھیں ایک مکمل وقتی سوانح نگار مل جانا چاہیے۔ وہ بوڈرک نہ ہو باسوں تو ہو سکتا ہے، کوئی مرزا ظفر الحسن ہی مل جائے۔ معلوم نہیں اس نمبر کے لیے کون کیا کچھ لکھے گا۔ مجھے یوں ہی کچھ وہم سا ہوتا ہے کہ ان سے پوری طرح انصاف نہ ہو سکے گا۔ میں خود اپنے عجز کا اقرار کر رہا ہوں۔

بہت دن سے ایک بوگس لطیفہ یہ چل رہا ہے کہ کوئی انھیں نثر کا آدمی کہتا ہے اور کوئی نظم کا۔ وہ اتنی کتابوں کے مصنف ہوئے۔ مگر اُن کا محاکمہ قومی پیمانے پر نہیں ہوا۔ جمیل ملک صاحب نے ایک کتاب لکھی۔ فتح محمد ملک نے چند بار لکھا مگر یہ دو ہی تو ہوئے۔ پاکستان تو بہت سے ناقدین سے بھرا ہوا ہے۔ اور قاسمی صاحب ایک بہت ہی بڑے اور پھیلے ہوئے موضوع بن چکے ہیں۔ بہت دن انھیں اُدھر کی گروہ بندی نے بھی خراب کیا۔ ادھر ہم حیران ہو ہو کر دیکھتے تھے کہ ایسے خوبصورت، نفیس اور بڑے ادیب کے لیے آج کے جدید زمانے میں ایسی فضول باتیں بھی کہی جا سکتی ہیں۔ خیر شکر ہے وہ سب اینٹی گروپ ان کے سامنے ہی ٹھنڈے پڑ گئے۔

چند بار میں نے قاسمی صاحب سے اُن کے "دشمن" من و عن پر تبصرے بھی سنے ہیں۔ ان میں وہ ولی اللہ تو ثابت نہیں ہوئے۔ لیکن ایک ایسے شخص ضرور لگے جو کچھ یوں کہتا تھا کہ اللہ انھیں معاف کرے وہ میرے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔

مجھ سے ہنری ملر نے لوزان میں اپنے نہایت ہی برے زمانے کے ایک بڑے جاں نثار ادھی ادیب گلینوے ویسٹ کاٹ کے بارے میں یہ کہا۔ "وہ بالکل بوگس آدمی ہے۔ حرامی پلّا۔ جب ہم بھاگ کر پیرس آئے تھے تو ساتھ ساتھ آیا اور مجھ پر خوب رقم خرچ کی۔ اس لیے کہ وہ میری ذہانت سے رُعب کھاتا تھا۔ میں اس وقت بڑا ادیب نہیں تھا، مگر وہ ضرور جانتا ہوگا کہ میں کتنا بڑا ادیب بنوں گا۔ پھر سالا میری برابری کرنے لگا۔ میں نے بھی ایک رات سے ایک بڑا چکمہ دیا۔ اور

اُسے اکیلا چھوڑ کر چل دیا۔" اسی سال (سنہ ۱۹۶۱ء) امریکہ میں یہی گلینوے ویسٹ کاٹ امریکی ادیبوں کی انجمن کے صدر تھے۔ اُن سے نیویارک میں ملا۔ بڑے مرنجان مرنج، شگفتہ، معزز، مگر میری باتیں سن کر بولے "وہ بڑا سور کا بچہ ہے۔ وہ طینت میں ایک ارذل ترین نسل کی لومڑی سے بھی بدتر ہے۔ نمک حرام۔ ہوگا سالا ادیب۔ جب ہم ساتھ تھے اس وقت تو نہیں تھا۔ اس وقت بھی اتنا کمینہ ثابت ہونے کی کیا ضرورت تھی۔"

ایک اور پکے انگلش جنٹلمین سی۔ ڈے۔ لیوس صاحب نے مجھ ناچیز سے صرف دوسری ملاقات میں کہا تم لوگ ہی نہیں، بہت سے انگریز بھی ایلیٹ صاحب کو دیوانوں کی طرح پوجتے ہیں۔ میاں وہ بڑے شاعر سہی، مگر اُن کے پیچھے امریکی قوم کا ایک خاص متعصبانہ پروپیگنڈا بھی شامل ہے۔ اب ذرا کسی اور کا ذکر بھی کرو۔ کیا ہم عصر انگریزی شاعری کی عمارت ایک ہی ستون پر کھڑی ہوئی ہے۔

ناظم حکمت صاحب یوں بڑی فروتنی دکھاتے تھے۔ مگر ایک دن مزے میں آ کر پابلو نرودا تک کے بارے میں کہنے لگے۔ ہم سیاسی طور پر جو بھی تعریفی کلمات تحریر کریں، ترجموں کا ہینڈی کیپ شمار کرنے کے باوجود دراصل وہ اتنا بڑا شاعر نہیں جتنا یہ سوشلسٹ دنیا اسے قرار دے رہی ہے۔ میں کسی قابل نہیں اور میرا اصل محاکمہ بھی یہاں کے پروپیگنڈے CELL میں نہیں، بلکہ ایک دن ترکی کی جامعات کے ادبی شعبے میں ہوگا۔ مگر برخوردار اگر تم دونوں کے ترجمے غور سے پڑھو تو اب بھی ہم دونوں میں بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔

"یعنی کیا" میں نے پوچھا۔ جس پر وہ جھلا گئے تھے اور منہ پھیر لیا تھا۔

کومورو (کوموجو) صاحب کو چھیڑا تو بولے "یہ تو یوں سمجھو کہ پورے تین ہزار برس میں صد رہا چینی زبان کے عظیم اور بہت ہی نمایاں شاعر ہیں اور آج اس صدی کے سب سے بڑے چینی شاعر ہیں۔ مگر ان کی صفات اور مراتب بے حد اور بے شمار ہیں۔ عام محاکموں میں ان کا ذکر آنا ہی نہیں چاہیے۔ سوا کھیں چھوڑ کر اگر تم تین ہزار برس میں دو تین چینی شاعروں کے نام جاننا چاہو تو برخوردار ایک نام ضرور مشترک ہوگا۔ چاہو تو یہ سامنے لِن یو آن بیٹھے ہیں ان سے ابھی پوچھ لو۔

لِن یو آن میرا بڑا دوست ہو گیا تھا۔ ثقافتی انقلاب میں ایک مستعد کارکن بھی تھا۔ اب پتہ نہیں کہاں ہے۔ کھی کھی کرکے مسکرایا اور اُن کا نام لے دیا۔

میں نے دیکھا کہ بڑے میاں نے اپنا سفید سر بڑے اطمینان سے ہلا دیا۔ اثبات میں۔ پھر مجھے اس طرح دیکھا کہ جیسے میں پورے تین ہزار برس کا چینی ادب گھول کر پی چکا ہوں۔

بولے اب تو سمجھے۔۔ میں نے قاسمی صاحب سے کبھی ایسی باتیں نہیں سنیں، نہ یاد پڑتا ہے کہ ان کی تحریروں میں دیکھی ہوں۔ اس رویے کا EVALUATION آپ کیجیے۔ میری رائے میں یہ ایک خوف زدہ یا منافق آدمی کا رویہ نہیں۔ بڑائی اور فراخ دلی کی نشانی ہے۔

بچّو اور نوجوانو! میں نے پاکستانی مثالیں جان بوجھ کر نہیں دی ہیں۔

پاکستان کے کچھ ادیب ہر قیمت پر بھارتی حلقوں میں پاپولر رہنا چاہتے ہیں اور رہتے بھی ہیں۔ یہ میکنزم کچھ ایسا ہے کہ وہ یہاں بھی غیر مقبول نہیں ہو پاتے اور وہاں بھی نمبر بڑھائے جاتے ہیں۔ کچھ اس کا سبب ان کی ٹیلنٹ بھی ہے

لیکن بڑا سبب "آفاقیت" کی چھتری ہے۔ قاسمی صاحب کسی سے کم آفاقی نہیں، مگر اپنی پاکستانیت کو باعثِ عار نہیں سمجھتے جب بھارت ظلم کرے، کھُلا احتجاج کرتے ہیں۔ وہاں کے ایسے ادیبوں سے بھی بھِڑ جاتے ہیں جو ان کے ہم مسلک اور پُرانے دوست رہے ہیں۔

یہ ایک بڑا موضوع تھا۔ میں اس پر بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔ فی الحال یہ کہوں گا کہ ان سے میری محبت کی سب سے بڑی وجہ صرف اُن کا ادب نہیں۔ ادیب تو دنیا میں بڑے بڑے ہوئے ہیں۔ بلکہ اُن کی پاکستانیت ہے۔ پاکستان رہا تو ایک دن بھارت والے بھی ان کی RATING میں سچی تبدیلیاں کرنے پر مجبور ہوں گے۔

چند اور باتیں کہنی چاہتا ہوں، مگر اب جگہ نہیں رہی۔ ایک اتنی کوانٹٹی اور ایسی کوالٹی کے ادیب۔ سوچنے والے اور نہایت بڑی خصوصیتوں والے انسان کے لیے میں نے یہ کچھ پیش کیا۔ تُف مجھ پر۔

مگر میں ایک ناتمام اور کمزور مضمون کی بدنامی اٹھانے پر تیار ہوں۔ اس کے لیے تیار نہیں کہ اس رجسٹر میں میرا نام آنے سے رہ جائے۔

کیونکہ ایک رجسٹر ایک بڑے آدمی کی خدمت میں پیش کیا جانے والا ہے۔

ڈاکٹر اقبال سے پہلی اور آخری ملاقات

(صفحہ ۹۴۰ سے آگے)

یہاں ڈاکٹر صاحب کے لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ نمودار ہوئی جس کو اچھے اچھے قیافہ شناس نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اس کے بعد کسی قادیانی بزرگ کے متعلق باتیں ہوتی رہیں جو مصر کے سفر میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ تھے۔ آپ نے فرمایا کہ جب مصریوں کو معلوم ہوا کہ ایک قادیانی اقبال کے ہمراہ تھا تو انھوں نے اخباروں اور خطوط سے اس عجیب بات کے متعلق مجھ سے استفسار کیا۔ میں نے انھیں تسلی بخش جواب دے دیا۔

ہم تین گھنٹے وہاں بیٹھے اور آخر ہم تینوں نے رخصت چاہی۔

آہ! ــــ کتنی زبردست شخصیت تھی۔ علامہ اقبال کی! ــــ

اور کتنی عظیم الشان قابلیت کا مالک تھا شاعرِ مشرق ــ نوار کا پلنگ۔ ایک سادہ سا تکیہ۔ تکیہ کا سہارا لیے علامہ اقبال ــ بھورے بال ــ چوڑا ماتھا۔ گہری سوچتی ہوئی آنکھیں۔ سفید زردی مائل ــــ ہنس مکھ چہرہ! ــــ مجھے یہ نقشہ تادمِ مرگ نہ بھولے گا! اور جب ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ آگے بڑھایا اور میرا ہاتھ کانپتا ہوا اُس سے مَس ہوا تو میں سمجھا کائنات کا مقدس ترین خزانہ میں نے اپنی ناتواں انگلیوں میں تھام رکھا ہے ــــ

(مطبوعہ اقبال نمبر شیرازہ ــ لاہور ــ مئی ۱۹۳۸ء)

سیّد انور

میرے ہمدم! میرے ندیم!

جب بچپن میں ایک دفعہ میں نے اختر شیرانی کا رسالہ رومان دیکھا تو مجھے فہرست مضامین میں ایک نظم کے نیچے پیرزادہ احمد شاہ ندیم قاسمی کا نام نظر آیا۔ میں نے سوچا ایسے غیر شاعرانہ نام کا مالک کیا شاعری کرے گا۔

مجھ سے پہلے نیاز فتح پوری نے بھی یہ غلطی کی تھی۔ نگار کے ایک شمارے میں اُنھوں نے علاّمہ اقبال سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کیا تھا۔ اُنھوں نے لکھا تھا کہ اقبال حد درجہ غیر شاعرانہ لباس میں، حد درجہ غیر شاعرانہ مصطفےٰ کمال کیپ میں، حد درجہ غیر شاعرانہ شلوار قمیص میں، حد درجہ غیر شاعرانہ کشمیری شال میں، حد درجہ غیر شاعرانہ انداز میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ جب گفتگو کے دوران میں وہ پنجابی میں اُردو بولنے لگے تو میں بڑا حیران ہوا، یا خدا! یہ شاعر ہے یا منڈیا سیالکوٹیا۔

مُنڈیا سیالکوٹیا میرے الفاظ ہیں۔۔ نیاز فتح پوری نے کچھ اور کہا تھا۔

نیاز فتح پوری نے تو اس سے بڑی ایک اور غلطی کی تھی۔ مدّت تک نگار کے ہر شمارے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جوش ملیح آبادی شاعر نہیں ہے۔ یا یہ کہ بڑا شاعر نہیں ہے۔

تو جانے دو نیاز فتح پوری کو معاف کردو۔ اُنھوں نے میرا پہلا افسانہ نگار میں چھپایا تھا۔

اور مجھے بھی معاف کردو۔ کیونکہ میرا پہلا افسانہ نگار میں چھپا تھا۔

میں نے رومان میں نظم کا صفحہ کھولا۔ اُس زمانے میں ادبی رسالے ادیب اور شاعر کے نام ان کی تخلیقات کے بعد میں چھاپتے تھے۔ پیرزادہ احمد ندیم قاسمی اس کی نظم کے نیچے مصرعے کی طرح بچھا ہوا تھا۔ اوہو یہ ادیب تو اپنے سارے قبیلے کے ساتھ ادب کی سرحدوں پر چڑھ آیا ہے۔ کیا ایوانِ ادب اس قبائلی حملے کی تاب لاسکے گا؟

اور یہ بات بھی تھی کہ مجھے رسالہ رومان پسند نہیں تھا۔ میں اختر شیرانی کو اور اختر شیرانی کی شاعری کو اردو ادب کے لیے انتہائی نقصان دہ سمجھتا تھا۔ میرے نزدیک غزل کی شاعری اور عشقیہ نظمیں سوسائٹی کی صحت کے لیے نہایت مضر تھیں۔ غزل شاعر کی شخصیت کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس کو اجزا میں تقسیم کردیتی ہے اور اس کو کل سے کبھی ہم کنار ہونے نہیں دیتی۔ وہ اس کو الفاظ کا ماہر میکنک بنا کر چھوڑ دیتی ہے اور فن کار کے مرتبے تک پہنچنے نہیں دیتی۔ خالص عشقیہ شاعری ایک نشہ ہے۔ ایک

ڈرگ ہے۔عورت کا نشہ، شراب کا نشہ، روایتی غزل اور عشقیہ نظم کا شاعر نشے کا عادی ہوتا ہے۔ڈرگ ایڈیکٹ ہوتا ہے۔ وہ عورت کا نشہ استعمال کرتا ہے۔ وہ عورت کے نشے کو تیز کرنے کے لیے شراب کا نشہ استعمال کرتا ہے۔ وہ زندگی کے گلی کوچوں میں نشے سے شرابور پھرتا رہتا ہے۔ اور جب سوسائٹی کے تقاضے اُس کو آواز دیتے ہیں، تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔ اختر شیرانی اور اُس کی شاعری زندگی سے فرار کی ایک عبرت ناک مثال تھی۔ اُس کے رسالے رومان میں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو بھول کر لڑکیوں کے عشق کی نشہ آور باتوں کی دعوت تھی۔ مجھے رومان میں اپنے افسانے شایع کرنے کا خیال کبھی پیدا نہ ہوا۔ اور میں نے پیرزادہ احمد شاہ ندیم قاسمی کو پہلی دفعہ رسالہ رومان میں دیکھا۔

جس طرح محبت کی ایک مثلث ہوتی ہے۔ اسی طرح زندگی کی ایک مثلث ہوتی ہے۔ محبت کی مثلث کے تین ضلعے ہیرو، ہیروئن اور رقیب سے بنتے ہیں۔ زندگی کی مثلث کے تین ضلعوں کے نام زن، زر اور زمین ہیں۔ زندگی ایک سمندر ہے۔ محبت ایک ندی ہے۔ بہت سے ادیب اس ندی کے کنارے بیٹھ کر اپنی زندگی گذار دیتے ہیں۔ ندی کے ساتھ بہہ کر سمندر تک نہیں پہنچتے۔ جزو سے کُل کی طرف سفر نہیں کرتے۔ وہ زندگی کے صرف ایک تہائی حصے سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ زن سے، عورت ان کے اعصاب پر سوار رہتی ہے۔ عورت ان کے اعصاب کو تباہ کر دیتی ہے۔ تباہ شدہ اعصاب کی تسکین کے لیے وہ شراب کی بے خودی سے مدد مانگتے ہیں۔ آخر شراب کے گرداب میں گم ہو جاتے ہیں۔ تمام عمر وہ زن کی سحر کاریوں کے گیت گاتے ہیں۔ اُن کو زر کی طبقاتی تقسیم اور زمینوں کے استحصال کے قضیوں پر غور کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔

پیرزادہ احمد شاہ ندیم قاسمی کو اختر شیرانی کے رومان میں دیکھ کر میں نے سوچا ایک اور اختر شیرانی پیدا ہو رہا ہے۔ اختر شیرانی جو انیسویں صدی کی انگریزی شاعری کی رومانیت کی تحریک سے متاثر تھا۔ رومانیت کی تحریک، جس نے شیلے کیٹس اور بائرن جیسے بڑے شاعر پیدا کیے۔ لیکن پھر انہی کے ہاتھوں وائن اور وومن کی تحریک بن کر تباہ ہو گئی۔ شیلے کیٹس اور بائرن نے پہلے رومانیت کی تحریک کو بلندیوں پر پہنچایا پھر وائن اور وومن[1] کی پستیوں میں گر گئے۔ اختر شیرانی پہلے عورت اور شراب کی پستیوں میں بھٹکتا پھرا اور پھر رومانیت کی بلندیاں حاصل کرنے سے پہلے ختم ہو گیا۔ میں نے سوچا یا خدا کہیں پیرزادہ احمد شاہ ندیم قاسمی میں پھر سے اختر شیرانی کی ٹریجڈی تو رونما نہیں ہو گی۔

——— لیکن نہیں، میں غلط تھا۔

بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا، کہ ندیم ادب برائے عورت اور ادب برائے شراب اور فن برائے فن کا ادیب نہیں تھا وہ ادب برائے زندگی کا پیغام لے کر آیا تھا۔ ― ― ― ― ― ― ― اور اُس وقت یہ پیغام دیا تھا، جب نیاز فتح پوری جو غزل کو عورتوں سے باتیں کرنا قرار دیتے تھے۔ اور مجنوں گورکھپوری جو سستے رومانی افسانے لکھ کر عوامی مقبولیت حاصل کر رہے تھے، دونوں ادب میں رومانیت کی ایک بے معنی روایت قایم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور اختر شیرانی پنجاب میں اس روایت کی جڑیں مضبوط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو اس سال پیرزادہ احمد شاہ ندیم قاسمی نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں اپنے ادب پر رومانیت کا رنگ چڑھنے کی اجازت دے دی۔ لیکن یہ کوئی پکا رنگ نہیں تھا، جب اس کو

---

[1] WINE AND WOMAN

سجاد ظہیر اور پریم چند کی ترقی پسند ادبی تحریک سے ادب برائے زندگی کی آواز آئی تو وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کیونکہ وہ بنیادی طور پر عورت کا شاعر نہیں تھا۔ زندگی کا شاعر تھا۔

وہ زندگی کا شاعر ہے۔ زن۔ زر۔ زمین کی مثلث کا شاعر۔ زن۔ زر۔ زمین کی مثلث جس کو انسان بنتا اور بگاڑتا رہتا ہے۔ وہ انسان کا اور انسانیت کا شاعر ہے۔ اُس کی زن وہ عورت نہیں تھی جس کو پنجابی میں رن کہتے ہیں۔ اُس کی زن ایک انسان ہے، جس سے ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے مقدس رشتے پھوٹتے ہیں۔ اُس کا زر وہ شے ہے جس کی غلط تقسیم انسان کو کشت و خون پر آمادہ کرتی ہے۔ اُس کی زمین وہ چیز ہے جس پر استحصال اور قبضے کی کوششیں انسان کو جنگ و جدل میں دھکیل دیتی ہیں۔

سرگودھے کے نو دس اور زرخیز ضلع میں، خوشاب کی خوش حال اور بے علم تحصیل میں، جفاکش کسانوں سے آباد گاؤں انگہ میں ایک اونچی گدی پر ایک پیر بیٹھا تھا۔ اس کے اردگرد اس کے ہزاروں مرید اُس کے حلقہ بگوش بیٹھے تھے۔ سارے دیہاتی علاقہ میں انگریزوں کے پیدا کیے ہوئے فیوڈل سسٹم کے نمائندے جاگیردار اور زمیندار اپنے اپنے وسیع ڈیروں میں حقے کی مجلس دہکائے ہوئے تھے۔ غریب کسانوں کے ذہنوں پر پیر کا قبضہ تھا اور اُن کے ہاتھوں پر زمیندار کا۔ بے چارہ کسان یا تو مرید تھا یا مزارع یا دونوں۔ ذہنوں اور ہاتھوں کا استحصال زوروں پر تھا۔ منظر امریکہ کی انیسویں صدی کی انسانی غلامی کی طرح دردناک تھا۔ پیرزادہ احمد شاہ ندیم قاسمی نے اپنے نام میں سے پیرزادہ اور شاہ کے مقدس الفاظ الگ کر دیے۔ اور وہ احمد ندیم قاسمی رہ گیا۔ اور انگہ کے کسان سے نیا انسان پیدا ہوا۔

شمال میں احمد ندیم قاسمی تھا۔ جنوب میں سید سجاد ظہیر تھا۔ سید سجاد ظہیر نے بھی سادات کی سجادہ نشینی کو پس پشت پھینک کر مزدوروں اور کسانوں کے کانٹوں کا تاج پہن لیا تھا۔ اس طرح ہندوستان کے شمال اور جنوب اور طول اور عرض میں قدروں کا اشتراک پیدا ہو گیا، اور ادب میں اشتراکیت نے جنم لیا۔ اشتراکیت ایسا معاشرہ جس میں غریب اور امیر کسان، زمیندار، مزدور اور سرمایہ دار برابر کے شریک ہوں گے، اور جس میں طبقاتی امتیاز نابود ہو جائے گا۔

جب سجاد ظہیر کے سیاسی ذہن نے ادب کی ترقی پسند تحریک کو سیاست کی ترقی پسند تحریک میں تبدیل کر دیا اور ماسکو کو اپنی سیاست کا مکہ بنا لیا اور ترقی پسندی کو روسی نظریات کی اندھی تقلید قرار دے دیا تو ترقی پسند ادبی تحریک کا زوال شروع ہو گیا۔ ادب تدریجی ارتقائی اشتراکیت کو چھوڑ کر روس کی خونی انقلابی کمیونزم کا پراپیگنڈا بن گیا اور ادیب سیاسی کارکن بن کر حکومت کے عتاب میں آ گئے۔

اور احمد ندیم قاسمی کو بھی جیل کی غار حرا میں پھینک دیا گیا۔

جب احمد ندیم قاسمی جیل کی غار حرا سے باہر آیا تو میرے دل میں اس کی زیارت کا خیال شدت اختیار کر گیا۔

اُس وقت تک وہ ادب کے اُفق پر شاعر اور افسانہ نگار کی حیثیت سے بڑی آب و تاب کے ساتھ اُبھر آیا تھا۔ اس کا فن ایک رواں دواں ندی کے شفاف پانی کی مانند تھا جو شاعری کے آبگینے میں بھی سما جاتا تھا۔ اور افسانے کے سمندروں میں بھی پھیل جاتا تھا۔ اور اُس کے کئی شعری اور افسانوی مجموعے شایع ہو چکے تھے۔ اور وہ ایسے مقام پر پہنچ گیا تھا، جہاں پہنچ کر شخصیتیں لیجنڈ بن جاتی ہیں۔ اور رائیں آپس میں ٹکرا کر اُس شخصیت کو معرکہ آرا بنا دیتی ہیں۔

اس طرح جب افسانہ نگاروں سے یہ پوچھا جاتا کہ قاسمی کے بارے میں اُن کی کیا رائے ہے۔ تو وہ کہتے:

"اچھا شاعر ہے۔"

اور جب شاعروں سے پوچھا جاتا کہ وہ قاسمی کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، تو وہ کہتے:

"اچھا افسانہ نگار ہے۔"

اور جب کسی ایسے مجمعے میں جہاں شاعر اور افسانہ نگار موجود ہوتے۔ قاسمی کے بارے میں رائے زنی کا سوال پیدا ہوتا تو سب یک زبان ہو کر کہتے:

"اچھا آدمی ہے۔"

قاسمی کی شرافت اُس کے ادب کی طرح ضرب المثل ہے۔ وہ ایک مثالی انسان ہے۔ وہ ایسی بلند و بالا ذہنیت کا انسان ہے۔ جس کی جھلکیاں قاسمی کی ادبی تخلیقات میں نظر آتی ہیں۔ معاشرے کا ایسا شریف النفس اور ذمہ دار انسان جو قاسمی کا ادب تخلیق کرنا چاہتا ہے۔ آدمی جب شاعر اور افسانہ نگار بن جاتا ہے تو یہ ایک اچھی بات ہے۔ اور جب آدمی اپنے آپ سے بلند ہو کر انسان بن جاتا ہے تو یہ اُس سے بھی اچھی بات ہے۔

میں ایسے اچھے شاعر، ایسے اچھے افسانہ نگار اور ایسے اچھے انسان کو دیکھنے کے لیے بے قرار رہنے لگا۔

بمبئی میں ساحر لدھیانوی نے قاسمی کی شرافت اور نجابت اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور دوسروں کی دل آزاری سے بچنے کی ایک بڑی خوش گوار مثال بیان کی۔ منٹو اور کرشن چندر بمبئی میں آ گئے تھے۔ اور قاسمی لاہور میں "ادبِ لطیف" کا ایڈیٹر تھا۔ ایڈیٹر کی خط و کتابت ادیبوں سے ہوتی رہتی ہے۔ قاسمی کی خط و کتابت کرشن چندر اور منٹو سے بھی تھی۔

ایک دن منٹو نے برانڈی کی بوتل کے اوپر سے کرشن چندر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"میں ہندوستان کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہوں۔ معلوم ہے مجھے قاسمی نے کیا لکھا ہے؟"

کرشن چندر نے پوچھا:

"کیا لکھا ہے؟"

منٹو بولا۔

"قاسمی نے مجھے ایک خط میں لکھا ہے: تم افسانے کے بادشاہ ہو۔"

کرشن چندر نے ہنستے ہوئے اپنی جیب سے ایک خط نکالا اور بولا:

"اور معلوم ہے قاسمی نے میرے بارے میں کیا لکھا ہے؟"

منٹو نے پوچھا:

"کیا لکھا ہے؟"

کرشن چندر نے جواب دیا:۔

"قاسمی نے مجھے اس خط میں لکھا ہے": "تم افسانے کے شہنشاہ ہو"۔

تقسیم ہند کے فوراً بعد جب آزاد پاکستان نمودار ہوا ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور اپنی تین بہنوں، دو بھائیوں اور بنی امی کے ساتھ لکھنو سے لاہور آ گئیں۔ یہ اہم واقعہ احمد ندیم قاسمی کی زندگی میں ایک اہم موڑ بن کر آیا۔ مذہبی اور سیاسی تعصبات کا زخم خوردہ خاندان لکھنؤ سے ہجرت کر کے احمد ندیم قاسمی کے وسیع و عریض قلب کی وادیوں میں آباد ہو گیا۔ اور اس کی زرخیز زمین نے ان کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا۔

اس بلند مقام پر پہنچ کر احمد ندیم قاسمی اور اختر شیرانی کا فرق واضح ہوا۔ پیرزادہ احمد شاہ ندیم قاسمی راستہ بھول گیا تھا۔ احمد ندیم قاسمی اختر شیرانی کے رومان کی دنیا سے باہر اور بلند تھا۔ احمد ندیم قاسمی زندگی کی عظیم مثلث (جس کے اضلاع زن۔ زر۔ اور زمین سے بنے تھے) کے آفاقی مسائل ڈسکس کرنے والا تھا۔ اختر شیرانی زندگی کے صرف ایک پہلو زن کا شاعر تھا۔ اس کے محدود کینوس پر صرف زن سے متعلق محبت کی مثلث کے بارے میں تصویریں تھیں۔ اس کے نزدیک عورت صرف ایک ہونے والی محبوبہ تھی (ہونے والی بیوی نہیں) احمد ندیم قاسمی کے نزدیک عورت ایک آفاقی کردار ہے۔ انسان کے کائناتی نقش کا سب سے شوخ رنگ، اختر شیرانی کے نزدیک عورت سلمیٰ اور ریحانہ تھی، احمد ندیم قاسمی کی عورت ہاجرہ اور خدیجہ ہے بہن ہے، بیٹی ہے، ماں ہے، بیوی ہے (محبوبہ نہیں ہے)

میں کشاں کشاں احمد ندیم قاسمی کو دیکھنے کے لیے لاہور گیا۔

ہاجرہ بہن اور ندیم بھائی نے ادبی ماہنامے نقوش کا اجرا کر دیا تھا۔ ہاجرہ مسرور کو اور خدیجہ مستور کو میں بمبئی میں دیکھ چکا تھا۔ اس وقت وہ بیڈی ہیملٹن کے کاسے برتنوں میں بیٹی لیڈی لاجونتی کے لونیز بوروں کے۔ نند تھیں۔ احمد ندیم قاسمی مجھے اس طرح ملا جیسے میں اُس کا برسوں کا دوست ہوں۔

ہاجرہ مسرور نے بتایا کہ ترقی پسند ادیبوں کے اجلاس میں اس بات پر بحث ہوئی کہ انور کی افسانہ نگاری ترقی پسند ہے یا نہیں۔ ندیم بھائی اور ہاجرہ بہن کے اصرار پر انور کو ترقی پسند افسانہ نگار قرار دیا گیا۔

میں ترقی پسند ادیب ہوں۔ سوشلزم کا قائل ہوں۔ طبقاتی تفرقوں کے خلاف ہوں۔ علمی، مذہبی، اقتصادی اور سماجی پسماندگی کا دشمن ہوں۔ فری تھنکر ہوں۔ ریشنلسٹ ہوں۔ زندگی کے ہر شعبے میں خود آزادخیالی سے سوچنے کا عادی ہوں۔ میں ترقی پسند تحریک کی پہلی کتاب "انگارے" سے باہر آیا ہوا بے باک، منہ پھٹ کردار ہوں۔ میں کسانوں مزدوروں اور عام عاشقوں کے حقوق کے لیے قلمی محاذ کی ہر صعوبت اور مصیبت برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن میں اس ترقی پسندی کا قائل نہیں ہوں جو صرف سیاسی اور پروپیگنڈ اٹی ادب کا مطالبہ کرتا ہے۔ سیاست دوسرے موضوعات کی طرح ادب کا ایک موضوع ہے۔ ہمکن ادب سیاست نہیں ہے۔ سجاد ظہیر نے جس کی شخصیت سیاسی زیادہ اور ادبی کم تھی۔ ایک مقبول ادبی تحریک کو سیاسی تحریک میں تبدیل کر کے اس تحریک کے زوال کے دروازے کھول دیے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کا سلوگن ادب برائے زندگی ہے۔ ادب برائے سیاست نہیں۔ ہمارے سوشلزم کو ہمارے دھرتی کی خوشبو سے انسپریشن لینی چاہیے۔ روس سے نہیں۔

اب پاکستان میں اس وقت بھی ایسے نام نہاد ادیب موجود ہیں جو سیاسی کارکن زیادہ اور ادبی فنکار کم ہیں یا بالکل

نہیں ہیں۔ وہ اپنے آپ کو سجاد ظہیر کا جانشین اور ــــــــــ ترقی پسند تحریک کا مورث سمجھتے ہیں۔ وہ طبقاتی تفرقوں کے خلاف ہیں۔ لیکن علاقائی منافرت کے حق میں ہیں، وہ ملک کی سالمیت کو ٹھکرا کر اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے کتوں کے سامنے ڈال دینا چاہتے ہیں)

احمد ندیم قاسمی نے میرے ادبی نظریوں سے اتفاق کیا۔ اور اپنے اکھڑ دیہاتی لہجے میں وقت کے ادبی مسائل پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں کہا:

"مجھے بھی سجاد ظہیر کی انتہا پسند سیاسی تحریک جس کو وہ ادب کی ترقی پسند تحریک کہنے پر مُصر تھے، اختلاف تھا۔ اسی لیے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی سیکرٹری شپ سے مستعفی ہو گیا تھا۔"

ملاقات کے آخر میں ہاجرہ مسرور نے انتہائی مؤثر پر خلوص لہجے میں کہا۔

"میرے دو بھائی ہیں۔ لاہور میں ندیم بھائی، کراچی میں انور بھائی۔"

اور ایک بہن نے دو بھائیوں کے رشتے کو غیر فانی کر دیا۔

اور اب اتنے بہت سے سالوں کے بعد شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، صحافی ان گنت کتابوں کا مصنف ندیم اپنی ذات میں ایک انسٹی ٹیوشن بن گیا ہے۔ جب بھی لاہور جاتا ہوں، اس کو فنون کے دفتر میں یا مجلس ترقی ادب کے دفتر میں مداحوں کے اندر گھرا ہوا پاتا ہوں۔ وہاں شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، صحافی اور مصنف ندیم کے علاوہ ایک اور ندیم ملتا ہے۔ لطیفہ گو ندیم۔ پچھلی ایک ملاقات میں اس نے یہ لطیفہ سنایا۔

ایک صاحب ش۔م۔ کو ملنے کے لیے اُن کے گھر پر گئے۔ آواز دی۔ اندر سے جواب آیا۔ ش۔م گھر پر نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا:

اچھا ان سے کہہ دیجیے گا کہ ل۔ن۔ اُن کو ملنے کے لیے آیا تھا۔

محسن احسان

ندیم صاحب پشاور میں

(چند یادیں)

شاعری کا چسکا بھی عجیب چسکا ہے جس وقت شعر سے لطف اندوز ہونا شروع کیا، تو ذہن بھی عمر کی طرح بہت کچا تھا۔ پشاور کی ادبی محفلوں میں شعرائے کرام کے کلام سے محفوظ ہونے کے لیے، اکثر گھر سے غائب ہوکر پہنچ جاتا۔ اور بساط کے مطابق ان بزرگوں کے اشعار سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا۔ جن میں سے اب اکثر اس دنیا سے اُٹھ گئے ہیں۔ اس وقت پشاور کی ادبی فضا پر قاضی محمد عمر قضا، جعفری مرحوم، جگر کاظمی، محمود الحسن کوکب، مخدوم یوسف، سید ضیا جعفری، مظہر گیلانی، عشرت ملک، مرزا محمود سرحدی، برق کوہاٹی اور بعض دوسرے بزرگ چھائے ہوئے تھے۔ نئے لکھنے والوں میں فارغ بخاری، شوکت واسطی، رضا ہمدانی، حفیظ اثر، خاطر غزنوی، مجید شاہد، فرید عرش، عارف ندا اور دیگر کئی نوجوان نمایاں تھے۔ شوکت واسطی اور حفیظ اثر اردو سبھا کے کرتا دھرتا تھے۔ فارغ بخاری، رضا ہمدانی اور ان کے بعض رفیقانِ کار دائرۂ ادبیہ میں سخن آرائی کا بندوبست کرتے۔ اس وقت یہ دو حریف ادارے ادب کے میدان میں بڑی سرگرمی سے ادبی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ ان کی معاصرانہ چپقلش اور شاعرانہ مخاصمتیں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے لیے تازیانہ ثابت ہوئیں۔ مجھے سخن گوئی کا شوق ہوا تو اردو سبھا کے ساتھ منسلک ہوگیا۔ اور شوکت واسطی سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ دائرہ ادبیہ کی ایک نشست تھی اور میں اردو سبھائیوں کے ہمراہ اس میں حاضر ہوا۔ قصہ خوانی بازار کے بیچ ایک محلہ شاہ ولی قتال کی ایک چھوٹی سی بیٹھک میں دائرہ ادبیہ سٹ آتا تھا۔ میں جب پہلی مرتبہ وہاں پہنچا تو بیٹھک کے ایک کونے میں کمبل اوڑھے ایک نوجوان جو مجھے چار دن پہلے اپنی دو لوٹی ہوئی کرسیاں دکان پر مرمت کے لیے دے گیا تھا۔ نظر آیا۔ اُسے وہاں دیکھ کر مجھے کچھ اچنبھا ہوا۔ اُس نے اشارا کرکے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ یہ ۱۱ رجنوری ۱۹۴۷ء کی ایک خنک شام تھی۔ ایسی خنکی جو ہڈیوں میں سرایت کر جائے۔ اس نوجوان نے جو کمبل اوڑھا تھا۔ میری طرف بھی سرکا دیا۔ اور ہم دونوں دوستی کے اس کمبل میں اس وقت سے ایسے لپٹے ہیں کہ کمبل گذشتہ رُبع صدی میں چیتھڑے چیتھڑے ہوچکا ہے۔ لیکن ہم ابھی تک جدا نہیں ہوئے۔ آپ نے اس شخص کو پہچانا یہ کون تھا۔ یہ شرر برقی ـــ شرر تخلص اور برقی اپنے والد برق کوہاٹی کی رعایت سے اس وقت کا شرر برقی ـــ آج کا احمد فراز ـــ اس ادبی محفل میں شریک تھا۔ وہاں بیٹھنے کے بعد پتہ چلا کہ آج کی اس نشست کی صدارت احمد ندیم قاسمی کر رہے ہیں، جو ان دنوں پشاور ریڈیو سے منسلک تھے۔ ابھی میں شرر برقی سے احوال

ہی پوچھ رہا تھا کہ احباب کے ہمراہ گھنگھریالے بالوں والا ایک شخص چہرے پر دبیز شیشوں کی عینک لگائے ایک پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھک میں داخل ہوا۔ سبھی لوگ آنے والے کے احترام میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب کا تعارف ہوا اور مجھے پہلی مرتبہ ندیم صاحب سے ہاتھ ملانے کا شرف حاصل ہوا۔ میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ احمد ندیم قاسمی جس کی تحریریں اور جس کا کلام بے شمار مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تھے۔ سانولا رنگ، چہرے پر کشمکش حیات کا کرب ٹھوڑی کے قریب ایک نمایاں نشان، پُرخلوص آواز ــــ ندیم صاحب کی صدارت میں نشست کا آغاز ہوا۔ جمیل راز بنگش نے اپنے افسانے سے تنقیدی نشست کا آغاز کیا۔ افسانے کا عنوان اور موضوع مجھے قطعاً یاد نہیں۔ ہاں البتہ ایک بات ضرور یاد رہ گئی ہے کہ افسانہ نگار نے پڑھتے پڑھتے کہا۔ اُس نے محبوبہ کو "بھینچ بھینچ" لیا۔ اس پر تمام محفل میں مسکراہٹ تیر گئی۔ افسانہ ختم ہوا۔ اور تنقید کا آغاز تلفظ سے ہوا۔ یہ لفظ بھینچ بھینچ تھا۔ اس کے بعد کسی صاحب کی غزل تنقید کے لیے پیش ہوئی، اور "مجموعی طور" پر غزل کامیاب قرار دی گئی۔ اس کے بعد مشاعرے کا دور چلا۔ اور قاسمی صاحب نے احسان منیر کا نام پکارا اور اس خاکسار نے اپنی جیب سے اکلوتی غزل نکالی۔ غزل تو شاید اب پُرانے کاغذوں میں بھی دستیاب نہیں۔ ہاں البتہ اس کا مقطع تھا ؎

ہمارے شعر ہیں احسان دھڑکنیں دل کی
یہ نغمے ساز محبت پہ گائے جاتے ہیں

میرے بعد شرر برقی (احمد فراز) نے کلام پڑھا۔ اور آخر میں قاسمی صاحب نے اپنی یہ غزل سنائی ؎

یہ بھی شبِ تار، وہ بھی شبِ تار　　　جینا بھی دشوار مرنا بھی دشوار
ہونٹوں کی لرزش کچھ کہہ رہی ہے　　　اک مدعا ہے محتاجِ اظہار
سانسوں میں رم ہے، آنکھوں میں دم ہے　　　کس نے بلایا دھارے کے اس پار
اے ذوقِ پرواز اب ضبط کیسا　　　اٹھتی رہے گی زنداں کی دیوار
شاید ہی ٹوٹے یہ ربط باہم　　　بندہ گنہگار، آقا سبک سار
شہکار فطرت، اے وائے فطرت　　　ہر چیز معصوم انسان عیار
حکمِ مساوات اور امتیازات　　　تارے دل افروز کلیاں دل افگار
انسان اب کچھ نکھرے، تو نکھرے　　　سونے پڑے ہیں شاہوں کے دربار

ہم تو ندیم اکتا چلے ہیں
الزار ظلمات تکرار، تکرار

اس وقت سے کر آج تک یعنی گذشتہ ۲۷ برس سے میں قاسمی صاحب کو بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں۔ اور ان کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ ممنون، مجھے بے حد عزیز ہے۔ اور میں اس کے باقاعدہ لکھنے والوں میں سے ہوں۔ ایک دلچسپ بات جس کا تذکرہ میں کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ قاسمی صاحب مجھے جب بھی خط لکھتے ہیں۔ لفافے پر "سید محسن احسان" تحریر کرتے ہیں۔ میں سید نہیں ہوں۔ لیکن قاسمی صاحب آج تک اس خوش فہمی میں مبتلا رہے۔ میں ان کی یہ خوش فہمی دور نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ مجھے ان کی وجہ سے "عزت سادات" مل گئی۔


افکار
افکار
افکار
افکار
افکار
افکار
مصطفیٰ
زیدی
ایڈیشن